بانی: سرسید احمد خاں

ماہنامہ

تہذیب الاخلاق

جنوری ۱۹۸۸

ین ہزاروں بلکہ لاکھوں ایسے سمجھدار
جود ہیں جو پرانی بیہودہ رسموں کو
تے ہیں. شادی اور غمی میں جو بیدریغ
ف ہوتا ہے اس کو محض فضول اور لغو
اور معصیت سمجھتے ہیں. جو لوگ
عوں پر سودی روپیہ قرض لے کر خرچ
ں ان پر نہایت افسوس کے ساتھ ہاتھ
ں. مگر جب ویسا ہی موقع خود ان کو
ہے تو آنکھیں بند کرکے اسی اندھے
ہیں آپ بھی کود پڑتے ہیں جس میں
و گرتے دیکھ کر افسوس کرتے تھے.

ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

Rs. 3/-

اغراض و مقاصد

1. [illegible] اور [illegible] کے مطابق جدوجہد [illegible] اور [illegible] کی روایت کا احیاء۔ [illegible]

2. مذہب، تہذیب، اخلاق، انسانی اقدار اور تعلیم کے زیادہ جامع زیادہ [illegible] تصورات کی ترویج و اشاعت۔

3. ملک کے مختلف مذہبی فرقوں میں باہمی ربط و اتحاد کا فروغ اور اردو ہندی کو [illegible] کرنے کی کوشش۔

4. ملک بالخصوص مسلم اقلیت کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی۔

5. [illegible] اور [illegible] سائنسی علوم کی تحصیل اور تحقیق کی اہمیت کا چرچا۔

6. سائنسی علوم و فنون اور جدید علمی انکشافات کی عام فہم زبان میں اشاعت۔

7. علوم و فنون اور تہذیب کے فروغ میں ہندوستان اور مسلمانوں کے کارناموں کا تعارف۔

مقالہ نگاروں کیلیے

تہذیب الاخلاق کے اغراض و مقاصد سے مطابقت رکھنے والے مضامین ہی قابل قبول ہوں گے۔

عام فہم سائنسی، [illegible]، اصلاحی، اخلاقی اور تعلیمی [illegible] کو ترجیح دی جائے گی۔

ناول، افسانہ، نظم، [illegible] اور خالص ادبی مقالہ ارسال کرنے کی زحمت نہ کریں۔

مختصر مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔ کتابوں پر تبصرے [illegible] کیے جائیں گے۔

مسودے [illegible] 20 cm x 30 cm [illegible] سفید [illegible] ایک طرف [illegible] سطروں میں صاف صاف [illegible] اور [illegible] مسودات رد کر دیے جائیں گے۔

مقالے میں وضاحت کے لیے دی جانے والی تصویریں اور [illegible] الگ سے دی جائیں۔ شکلیں [illegible] پر سیاہ روشنائی سے بنی ہوں اور [illegible] ہوں۔ [illegible] اور شکلوں پر ترتیب وار نمبر پڑے ہوں اور تحریری مسودے کے حاشیے میں ان مقامات کی نشاندہی کر دی جائے جہاں انہیں لگانا ہو۔

اشاعت کی غرض سے آنے والے کسی بھی مقالے کو [illegible] رد کیا جا سکتا ہے۔ باہر سے آنے والے صرف انہیں مقالوں کو واپس کیا جائے گا جن کے ساتھ پتہ لکھا معہ ٹکٹ لفافہ بھی ہو۔

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۷ — جنوری ۱۹۸۸ء — شمارہ ۱

سرپرست: جناب سید ہاشم علی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

ایڈیٹر

اسرار احمد

جوائنٹ ایڈیٹر

کبیر احمد جائسی

اسسٹنٹ ایڈیٹر

شباب الدین

تزئین

سرفراز

انچارج سرکولیشن

مستقیم احمد خان

ترسیل زر کا پتہ

ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔

Editor: TAHZIBUL AKHLAQ & NISHANT,
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY.

زرِ سالانہ

انڈیا ... RS. 30.00

بیرونی ممالک۔ US $ 20.00 ہوائی ڈاک

US $ 8.00 عام ڈاک

مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی

ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ۔

انڈیا ______

مندرجات

اداریہ

۲؍دسمبر ۱۹۸۰ء کی دوپہر میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایک ہوسٹل میں ایسا سانحہ ہوا جو پوری یونیورسٹی کو اداس کر گیا۔ ڈپلوما انجینئرنگ سالِ دوم کے ایک طالب علم شاہ نواز علی خاں عرف روفی نے اپنے کمرے میں گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کرلی۔ خودکشی کی وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ اسی دن اس کا نتیجہ آیا تھا اور وہ امتحان میں ناکام قرار دیا گیا تھا۔ یوں تو دنیا میں ہر لمحے سیکڑوں بچے پیدا ہوتے ہیں اور اتنی ہی تعداد میں ہر عمر کے لوگ مرتے رہتے ہیں مگر کسی طالب علم کا امتحان میں ناکام ہو کر اپنے چراغِ زندگی کا اذیت ناک عمل سے گل کر دینا ایک ایسا سانحہ ہے جس کے اسباب و عوامل پر ہم سب کو سنجیدگی سے غور و فکر کرنا چاہیے اور نوجوان نسل میں زندگی اور اس کے مسایل سے نبرد آزما ہونے کا ایک ایسا جذبہ پیدا کرنا چاہیے کہ کوئی دوسرا نوجوان کسی بھی امتحان میں ناکام ہونے کے بعد یا اپنے خانگی مسایل سے تنگ آ کر اپنا چراغِ زندگی گل کرنے کی بات تک نہ سوچے۔

خودکشی کا جذبہ ایک مرض ہے جو مختلف وجوہ کی بنا پر انسان میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر ابتدا ہی میں اس کا مناسب تدارک کرلیا جاتا ہے تو یہ جذبہ یکسر ختم ہو جاتا ہے اور انسان اپنی طبعی حالت میں زندگی گزارنے لگتا ہے لیکن اگر اس کی طرف سے ذرا بھی بے توجہی برتی گئی تو یہ دھیرے دھیرے اندرونی جنون کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے جس کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ برقی سرعت کے ساتھ اس جنون کا شکار فرد نہ صرف ایک فیصلہ کرلیتا ہے بلکہ اسی سرعت کے ساتھ اس کو کر بھی گزرتا ہے۔ یہ جنون اتنا لمحاتی ہوتا ہے کہ ہر وقت کے ساتھ رہنے والے بھی اس سے واقف نہیں ہو پاتے کہ خودکشی کرنے والا اگلے لمحے کیا کر گزرے گا۔

خودکشی کا اگر نفسیاتی تحلیل و تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جو لوگ اس انتہا پسندانہ اقدام کے مرتکب ہوتے ہیں، ان کے نہاں خانۂ دل میں کہیں نہ کہیں کارسازِ مطلق کی کارسازی پر شک و شبہ ضرور ہوتا ہے اور وہ اپنی خواہشوں اور خوابوں ہی کو اپنا منتہائے حیات سمجھتے ہیں۔ انسانی زندگی میں خواہشوں اور خوابوں کی حیثیت وہی ہے جو ایک معصوم اور ناسمجھ بچے کی زندگی میں چراغ کی لو یا دہکتے ہوئے انگارے کو چھو لینے کی خواہش کی ہوتی ہے۔ بچہ خواہ کتنا ہی کیوں نہ مچلے، ضد کرے، سر پٹکے، آسمان سر پر اُٹھا لے، ماں باپ اس کی خواہش کی راہ میں سدِّ راہ بن جاتے ہیں اور اس کے ہاتھوں کو دہکتے ہوئے انگارے یا چراغ کی دلکش مگر جلا دینے والی لو تک نہیں جانے دیتے۔ جب ماں باپ کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے لاڈلے کا رونا دھونا برداشت کرلیتے ہیں مگر اس کو کسی ایسی چیز تک پہنچنے نہیں دیتے جو اس کے لیے مضرت رساں ہو تو پھر کارسازِ حقیقی سے اس بات کی امید کیوں رکھی جائے کہ وہ ہماری ساری خواہشوں اور خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کردے اور ہم کو ایسی چیزیں حاصل کرنے دے جو نہ صرف ہمارے لیے بلکہ پورے سماج کے لیے مضرت رساں ہوں۔ اگر صرف اس حقیقت کا عرفان حاصل کرلیا جائے تو زندگی کی ساری نامرادیاں، ساری ناکامیاں اور ساری محرومیاں نہ صرف گوارا ہو جائیں گی بلکہ انہی کے ذریعے حصولِ مقصد کی کڑی راہیں طے کرنے کا عزم و حوصلہ بھی پیدا ہوگا۔

تعلیمی درس گاہوں میں جو امتحان ہوتے ہیں، زندگی کے لمحہ بہ لمحہ امتحان کے سامنے ان کی حقیقت پرِ کاہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ تعلیمی امتحان میں ناکام ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ یا تو امتحان دینے والے نے پوری تیاری نہیں کی ہے اور وہ اُن تقاضوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکا ہے جو کسی امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں یا پھر یہ کہ اس نے غلط راستے کا انتخاب کیا ہے۔ قدرت اس سے کوئی اور کام لینا چاہتی ہے

لیے اس کو تنبیہ کے طور پر ناکامی سے دوچار کیا گیا ہے تاکہ وہ اپنا راستہ تبدیل کر کے اپنی صلاحیتوں کا رُخ کسی دوسری سمت پھیر دے۔
ہ طبائع جو کارسازِ حقیقی پر کامل ایمان و یقین رکھتے ہیں، ناکامیوں سے سبق سیکھتے ہیں، ان سے بد دل، پریشان یا ہراساں ہو کر اپنے
تھوں سے اپنی زندگی کا خاتمہ نہیں کر لیا کرتے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ طلبہ کے اندر اس بات کو فروغ دیا جائے کہ ایمان داری سے بھرپور
نت کرنے کے باوجود اگر وہ کسی مقصد کے حصول میں کامیاب نہیں ہوتے تو چند بار کی کوشش کے بعد ان کو اپنا مقصد بدل دینا چاہیے اور
اس کو حاصل کرنے کے لیے اپنی پوری صلاحیت صرف کر دینی چاہیے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر ہمارے سارے طلبہ ایک ہی پیشہ اختیار کر لیں گے تو زندگی
کے دوسرے شعبوں کا کام کس طرح چلے گا؟ تعلیم گاہوں کا نظم و نسق کون سنبھالے گا؟ عدلیہ کس کے دم قدم سے آباد ہو گا؟ انتظامیہ کی دیکھ ریکھ
کون کرے گا؟ کارخانے کون چلائے گا؟ رفاہِ عامہ کے شعبوں کی رہنمائی کون کرے گا؟ آخر ان شعبوں کو چلانے اور ملک کو پیش رفت
کی راہوں پر گامزن کرنے کے لیے بھی تو افرادی قوت کی ضرورت ہے۔ اگر یہ شعبے نہ ہوں گے اور ملک میں نرے انجینئر ہی انجینئر ہوں گے
تو سماج کس بل بوتے پر پیش رفت کی راہوں پر گامزن ہو گا؟ ہمیں امید ہے کہ نوجوان نسل ہماری ان باتوں پر سنجیدگی سے غور کرے
گی اور جب کبھی اس پر جنون کی پرچھائیں منڈلانے کے آثار نظر آئیں گے وہ اسے جھٹک کر اس طرح پھینک دے گی جس طرح کپڑوں
سے گرد جھاڑی جاتی ہے۔

دسمبر ہی کے مہینے میں علیگ برادری کو پنڈت ہربنس لال شرما، سابق صدر شعبۂ ہندی کی مفارقت کا صدمہ بھی
برداشت کرنا پڑا۔ ۱۹۴۷ء کی قیامتِ صغریٰ کے بعد جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی بزم ازسرِ نو سجائی گئی تو شرما جی بھی علیگ برادری
میں شامل ہوئے اور اس میں اس طرح جذب ہوئے کہ اسی کا ایک حصہ بن گئے۔ پنڈت جی بڑے خلیق، بامروت اور رکھ رکھاؤ والے
انسان تھے۔ ان کے عہدِ صدارت میں یونیورسٹی کے شعبۂ ہندی نے روزافزوں ترقی کی جس کے اثرات آج تک باقی ہیں۔ یونیورسٹی کی ملازمت
سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ حکومتِ ہند کے ہندی ڈائرکٹریٹ کے صدر بھی رہے اور بعدازاں ایک صوبائی یونیورسٹی کے وائس
چانسلر بھی، مگر انہوں نے علی گڑھ سے اپنا رشتہ برقرار رکھا اور جب کبھی ان کو موقع ملتا، وہ یہاں آکر پرانی یادیں تازہ کر لیتے۔ ان کی
رحلت سے علی گڑھ کی بزمِ رفتہ کی ایسی نشانی ختم ہو گئی جس کے نمونے اب خال خال ہی رہ گئے ہیں۔

[illegible]

علم

سر سید احمد خاںؒ

جہاں اور بہت سے عجائباتِ قدرتِ الٰہی ہیں، اُنہی میں سے انسان کے خیالات بھی نہایت عجیب ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک قسم کی مخلوقات ایک ہی سا خیال رکھتی ہے۔ جانوروں کی وہ حرکات اور افعال جو جاندار ہونے کے سبب سے ہیں اور وہ چیز جو محرک ان افعال یا حرکات کی بالواسطہ یا بلاواسطہ ہے، اس کا کچھ ہی نام رکھو، مگر وہ وہی چیز ہے، جس کو انسانی حالت میں خیال کہتے ہیں۔

تمام افعال اور حرکات جانوروں کی بلاشبہ ارادی ہیں، اور کچھ شک نہیں کہ وہ متحرک بالارادہ ہیں۔ ان کی تمام حرکتوں کا باعث "بالواسطہ یا بلاواسطہ" ایک خیال جلبِ منفعت مادی، جیسے غذا اور مسکن وغیرہ؛ یا غیر مادی، جیسے فرحت وانبساط اور بشاشت یا خیال دفعِ مضرّت مادی و غیر مادی کا ہوتا ہے۔ ہم نہیں پاتے کہ انسان میں اور کوئی چیز اس سے زیادہ ہے۔ بلاشبہ اتنا فرق پاتے ہیں کہ جانور میں وہ خیالات محدود، اور انسان میں نامحدود ہیں۔

مگر تعجب تو ہم کو اس بات سے ہوتا ہے کہ ہر گاہ ایک قسم کے جانوروں میں ایک ہی سے خیالات ہیں، اور ان پر وہ سب ایک ہی سا یقین کامل رکھتے ہیں، تو تمام انسان بھی باوجودیکہ ایک قسم کے جاندار ہیں، ایک سے خیالات اور ایک ہی سا یقین کیوں نہیں رکھتے ہیں!

کبھی یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جانوروں کے خیالات محدود ہونے کے سبب متفق ہیں؛ اور انسان کے خیالات میں نامحدود ہونے کے سبب وہ صفت نہیں ہے۔ مگر یہ بات تسلیم نہیں کی جاسکتی، اس لیے کہ نامحدود ہونے کے لیے مختلف ہونا ضرور نہیں ہے۔ پس انسانوں کے خیالات سے جہاں تک ہم کو واقفیت ہو، اسی قدر عجائباتِ قدرتِ الٰہی سے ہم کو زیادہ واقفیت ہوتی ہے اور ان خیالات کا صحیح ہونا یا غیر صحیح ہونا ہمارے اس فائدے میں کچھ نقصان نہیں پہنچاتا؛ بلکہ در صورت مختلف ہونے کے اور بھی زیادہ فائدہ دیتا ہے۔ اس لیے ہم اپنے اس آرٹیکل میں ایک انسان کے خیالات بیان کرتے ہیں جن کو وہ اس طرح پر کہتا ہے۔

"مجھکو خیال آیا کہ جس قدر اور جانوروں کو کرنا ہے، اتنا ہی مجھکو بھی کرنا ہے یا اس سے زیادہ کرنا ہے۔ مگر میرے خیال میں یہ آیا کہ انسان کے سوا تمام جاندار مخلوقات کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے ان کے بنانے والے کاریگر نے سب کچھ ان کے ساتھ بنادی ہیں۔ ان کو ان چیزوں کے بہم پہنچانے یا پیدا کرنے کی حاجت نہیں ہے

تمام جانداروں کی خوراک بغیر ان کی سعی و تدبیر کے پیدا ہوتی ہے۔ سرد ملکوں کے جانوروں کے لیے نہایت عمدہ پشمینہ کا گرم لباس ان کے بدنوں پر پیدا کیا ہے۔ پرند جانوروں کے لیے مینہ سے بچنے کا باران کوٹ انہی کے بدنوں پر سیا ہے۔ گرم ملکوں کے جانوروں کے لیے اسی آب و ہوا کے مناسب اُن کا جامہ قطع کیا ہے۔ مگر انسانوں کے لیے کچھ نہیں کیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو یہ سب کچھ خود کرنا ہے۔

پھر میں نے خیال کیا کہ حیوان اپنے کاموں کے کرنے کے لیے، کسی سے کچھ سیکھنے یا تعلیم پانے کے محتاج نہیں ہوتے، خود سیکھے سکھائے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ شہد کی مکھی کو رس چوسنے کے لیے عمدہ قسم کے ماخذوں کی شناخت کوئی نہیں بتاتا اور اپنے گھروں کو ایسی عمدہ تقسیم سے نکالنا جس میں ایک بڑا مہندس بھی حیران ہو جاوے، کوئی نہیں پڑھاتا۔ بئے کو ایسا عمدہ اور محفوظ کاشانہ بنانا کوئی نہیں سکھاتا مگر انسان کو بغیر سیکھے کچھ بھی نہیں آتا۔

پھر میں نے خیال کیا کہ حیوان کے کام، خواہ افعال جوارح سے ہوں یا دوسری قسم سے؛ اور خواہ وہ از خود ان کو آئے ہوں، یا تعلیم سے، نہایت محدود ہیں۔ مگر انسان کے ہر قسم کے کام نامحدود ہیں۔ ان سب باتوں سے میں نے خیال کیا کہ انسان کو اور جانوروں سے بہت کچھ زیادہ کرنا ہے۔

پھر میں نے خیال کیا کہ ایسے بڑے کارگیر نے جو انسانوں کو اور جانوروں سے بھی زیادہ درندہ بنایا ہے اور طرح طرح کی مشکلات میں ڈالا ہے، تو کیا چیز اس کو دی ہے جس سے وہ یہ سب چیزیں کرسکتا ہے اور تمام مشکلوں پر فتح پاسکتا ہے؟ اتنے میں میرا دل بول اٹھا کہ "عقل"۔

میں یہ بات سن کر سوچ میں گیا کہ کیا یہ بات سچ ہے؟ مگر میں نے خیال کیا کہ عقل سے تو یہ کام نہیں نکل سکتا۔ نہ تو وہ خود یہ کام نکال سکتی ہے، اور نہ اس کے بغیر یہ مشکل حل ہو سکتی ہے۔ یہ تو کسی دوسری چیز کے حاصل کرنے کو بطور ایک آلہ کے ہے، جیسے کہ سونا چاندی ہماری بھوک نہیں کھو سکتا، مگر اس چیز کو ہم پہنچا دیتا ہے، جو ہماری بھوک کھو دیتی ہے۔ بہت سی تلاش اور جستجو میں نے کی، اور خیال دوڑایا کہ وہ کیا چیز ہے، جس کے حاصل کرنے کے لیے عقل بھی صرف آلہ ہے، تو خیال میں آیا کہ وہ چیز "علم" ہے جس کے معنی دانستن (جاننا) ہیں۔ تب میں سمجھا کہ مجھ کو اور جانوروں سے زیادہ جو کچھ کرنا ہے، وہ صرف تمام باتوں کی اصلیت دریافت کرنا ہے۔

ہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد۷ - شمارہ ۱ (جنوری ۸۸ء)

وقت کی سب سے بڑی ضرورت

سیّد حامد

جمہوری حکومت میں رائے عامّہ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ رائے عامّہ خباروں سے بنتی ہے اور اخباروں سے ہی ظاہر ہوتی ہے۔ بالخصوص ان اخباروں ے جو سنجیدہ اور معتبر ہوں، جنھیں ملک کے ہر حصّے میں پڑھا جائے اور جنھیں وہ لوگ پڑھتے ہوں جو ملک کی پالیسی اور خواص وعوام کے زاویۂ نگاہ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کی ایک بڑی محرومی اور کمزوری یہ ہے کہ اس زمانے میں جو کہ ابلاغ اور میڈیا کا دور ہے، ان کے پاس انگریزی کا ایک روزنامہ بھی نہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کی بات خود ان کے اہلِ وطن تک نہیں پہنچ پاتی۔ لہٰذا ہمارے ملک کی حکومت (مرکزی اور ریاستی) اس کی اکثریت اور دوسرے فرقوں کو اس بات کا صحیح اندازہ نہیں ہونے پاتا کہ مسلمان کس حال میں ہیں؛ ان کے مسائل، تکلیفیں اور مجبوریاں اور محرومیاں کیا ہیں؛ انھیں کس قسم کی ناانصافیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے؛ وہ خوشحالی اور ترقی کی دوڑ میں ملک کا ساتھ کیوں نہیں دے پا رہے ہیں، کیا وجہ ہے کہ وہ ارتقائی، فلاحی اور امدادی اسکیموں کا فائدہ ٹھیک سے نہیں اٹھا رہے ہیں؛ ان کے نقطۂ نظر کا جواز اگر ہے تو کیا ہے؛ ان کو پسماندگی سے نکالنے کے لیے کیا اقدامات درکار ہوں گے؟

بدقسمتی سے بیشتر انگریزی اخباروں نے مسلمانوں کے مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے اور ان کے حالات اور موقف کو بے کم و کاست بیان کرنے کی کوئی منصفانہ کوشش نہیں کی۔ انھوں نے تاثراتی (اور کبھی کبھی تعصباتی) انداز سے یہ فیصلہ کر لیا کہ مسلمان علاحدگی پسند ہیں، رجعت پرست ہیں، قومی دھارے سے الگ اور حبِّ وطن اور عہدِ جدید کے علوم اور پیشرفت سے بے تعلق ہیں۔ لہٰذا ایسے لوگوں کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کیوں کی جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف حکومت، دوسری طرف اکثریت ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق طرح طرح کی بدگمانیوں میں اسیر رہتی ہے۔ خود ان (مسلمانوں) کے بہت سے نمائندے اکثر مہر بہ لب رہتے ہیں۔ بالعموم ان کو عوام سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اور وہ حکومت کی خوشنودی کو عوام کے مفاد پر کھلی ترجیح دیتے ہیں۔ ایسے میں حکومت کو مسلمانوں کی حالتِ زار کا علم ہو تو کیوں کر ہو؟ اب تک یہ ہوتا چلا آیا ہے کہ مسلمانوں کا ہر وہ موقف جسے برادرانِ وطن (لاعلمی یا بدگمانی کی بنا پر) پسند نہیں کرتے، انگریزی اخباروں تک پہنچ ہی نہیں پاتا۔ اپنے مواقف اور اپنے مخصوص مفادات کی تائید میں اور اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی دادرسی کے لیے مسلمان اجتماعی طور پر جلسے، جلوس اور احتجاج کی شکل میں جو اظہارِ رائے کرتے ہیں انھیں قومی اخباروں میں جگہ نہیں ملتی۔ اس لیے جنتا اور حکومت اکثر مسلمانوں کے موقف کے جواز اور ان کے احساسات کی شدّت کا اندازہ کر ہی نہیں پاتی۔ لہٰذا حکومت غلط فیصلے کرتی ہے اور ہمارے اہلِ وطن مسلمانوں کے متعلق بدگمانیوں کو ہوا دیتے رہتے ہیں۔ اس طرح فضا میں کدورت اور تناؤ فروغ پاتا ہے اور اکثریت اور سب سے بڑی اقلیت کے درمیان دوری بڑھتی جاتی ہے۔

قومی سطح کے اخباروں میں جب ہندوستانی مسلمانوں کی صورت حال اور ان کے مسایل کو منصفانہ اظہار نہیں ملتا تو وہ کڑھنے اور سلگنے لگتے ہیں اور اردو روزناموں میں اپنا دکھڑا رو لیتے ہیں۔ ان اخباروں میں بالعموم مسلمان لکھتے ہیں اور انھیں بالعموم مسلمان ہی پڑھتے ہیں

ن اخباروں کی رسائی نہ غیر مسلم عوام تک ہوتی ہے، نہ حکومت کے ایوان تک۔ وہاں پہنچتی ہے تو ان کی تلخیص پہنچتی ہے، جسے غیر معتدل اور انتہا پسندانہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح اکثریت اور حکومت کی پالیسی ساز سطح سے مسلمانوں کا فاصلہ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ اور اس بڑھتے ہوئے فاصلے کا نقصان مسلمانوں کو اور ان کے بعد جمہوریۂ ہند کو پہنچ رہا ہے۔

جہاں تک کہ زبانوں کا تعلق ہے، انگریزی زبان ہندوستان کی مختلف زبان بولنے والی ریاستوں کے درمیان رابطہ کی واحد زبان ہے۔ جہاں اردو اور ہندی ہتھیار ڈال دیتی ہیں وہاں کام انگریزی سے ہی چلتا ہے۔ انگریزی ہنوز ہندوستان میں سائنس اور علوم کی زبان ہے۔ ہندوستان ہی کیا، دنیا بھر میں علوم کی ہوش ربا ترقی کا ساتھ اگر کوئی زبان دے پاتی ہے تو وہ یہی زبان ہے۔ بین الاقوامی رابطہ کی زبانوں میں انگریزی ہی سب سے زیادہ موثر اور کثیر الاستعمال ہے۔ بیشتر ترقی یافتہ ممالک میں انگریزی پڑھائی جا رہی ہے۔ غور کیجیے، اس پس منظر میں ایک انگریزی اخبار کیسی ہمہ جہت اہمیت حاصل کر لیتا ہے۔ انگریزی اخبار نکل آیا تو ہماری بات اپنے اہل وطن تک پہنچے گی تو اس کو وہ وزن کتنا دیتے ہیں، اس بات کا فیصلہ وہی کریں گے، لیکن اگر واقعات اور احساسات کی صحیح ترجمانی متواتر توازن اور اعتدال کے ساتھ ہوتی رہی تو کوئی انصاف پسند انسان اور کوئی جمہوری حکومت اس سے اغماض نہیں برت سکتی۔ اخبار رائے عامّہ کی تشکیل کرتا ہے اور اس کا اظہار بھی۔

ہمیں یہ مان کر چلنا ہوگا کہ ضرورت صرف ایک انگریزی روزنامے کی نہیں ہے۔ ایک ہفتہ وار انگریزی رسالہ بھی ہماری صورت حال کو درکار ہے اور ایک اعلیٰ معیار کا ہندی اخبار اور ان کے علاوہ ہندی (یا اردو) ریاستوں کو چھوڑ کر ہر ریاست کی علاقائی زبان میں ایک روزنامہ۔ لیکن یہ سارے اخبار ایک ساتھ نہیں نکالے جا سکتے۔ پہلے مرکز سے انگریزی اخبار، پھر وہیں سے ہندی اخبار اور اس کے بعد ریاستی راج دھانیوں سے علاقائی زبانوں کے روزنامے۔

ہمارے اخبار کو جانب داری، انتہا پسندی اور ردّعمل سے گریز کرنا چاہیے۔ اگر یہ لایعنی بحثوں میں پڑ گیا تو اس کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ کیا عجب کہ لوگ اسے صحیح راستے سے ہٹانے کے لیے اُسے بحث و مباحثہ اور شدّتِ اظہار میں الجھانے کی کوشش کریں۔ اس اخبار کی پالیسی یہ ہونا چاہیے کہ اس کے زیر اثر ملک بھر میں اتحاد اور خیر اندیشی کی فضا بنے اور سب مل کر ہندوستان کو ترقی کی شاہراہ پر لے جائیں جو لوگ پیچھے رہ گئے ہیں انہیں آگے بڑھایا جائے۔ جن کے ساتھ ناانصافی اور ظلم ہوا ہو، ان کی چارہ جوئی کے جتن کیے جائیں۔ اخبار اقلیتوں کی صورتِ حالات کی ترجمانی جرأت اور دانش کے ساتھ کرے اور ان کے دُکھ درد کے مُداوا اور ان کی پسماندگی کے ازالہ کی طرف ملک کو متوجہ کرے۔ اقلیتوں کے جو مشترک مسایل ہیں اور انہیں جن مشکلات کا بعض اوقات سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان سے ملک اور حکومت اور اکثریت کو آگاہ کیا جائے تاکہ، منجملہ اور نتائج کے، اکثریت کے روشن خیال اور سیکولر اور قومی ذہن والے افراد ان کی دادرسی کرانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں، یا کم از کم بعض اقلیتوں کے متعلق جو بدگمانیاں ہیں وہ دور ہو جائیں۔

اب عام طور پر تسلیم کیا جانے لگا ہے کہ تعلیمی اعتبار سے ہندوستان کا سب سے پچھڑا ہوا طبقہ مسلمانوں کا ہے۔ اقتصادی اور سماجی اعتبار سے بھی وہ پسماندہ ہیں۔ یہ اخبار ملک کے ضمیر اور اقلیتوں کی ترجمانی تو بالعموم کرے گا ہی، مسلمان اقلیت کے مسایل، مشکلات اور نقطۂ نظر کو بالخصوص وطنِ عزیز کے سامنے لائے گا۔ لیکن اس کا انداز جارحانہ نہیں ہوگا شارحانہ ہوگا۔ اپیل اور دلائل اور اعداد و شمار سے قایل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ملک کے ضمیر کو، جو زندہ ہے لیکن اونگھنے لگتا ہے، بیدار کیا جائے گا اس بات کو ذہن نشین کرایا جائے گا کہ ملک کی ترقی اور خوشحالی ناقابلِ تقسیم ہے۔ اگر کوئی اقلیت پسماندہ رہ گئی تو ملک کی پیش رفت معرضِ خطر میں پڑ جائے گی۔ انصاف پر یقین نہیں رہتا تو جمہوریت بنیادیں ہل جاتی ہیں، امن و سکون برہم ہو جاتے ہیں اور اخلاقی تہذیبی قدریں جڑ سے اُکھڑ جاتی ہیں۔

تلخی، ترشی، عداوت، فاصلہ، ناانصافی، بدگمانی۔ یہ سب کچھ ہو چکا۔ اس تشدد اور دہشت گردی کے دور میں بغ

ئے اور ایک دوسرے کو سمجھے ہوئے کام نہیں چلے گا۔ بدگمانی کو
یر اور بیر کو خوں ریزی کی شکل اختیار کرتے دیر نہیں لگتی۔ ہر وہ
گروہ جو نا انصافی کے احساس سے سلگ رہا ہو اور اپنی بات ابنائے
وطن اور ارباب اختیار تک نہ پہنچا سکتا ہو، ملک کی سلامتی اور
ترقی کے لیے خطرہ بن جاتا ہے۔ ہمارے ملک نے صرف ارتقاء پر کمر
نہیں باندھی، اس نے ارتقاء کی ٹانگ سماجی انصاف کے ساتھ باندھی
ہے۔ ہماری منصوبہ بندی کا مدعا یہ ہے کہ ملک ترقی کرے لیکن
سماجی انصاف کے ساتھ۔ یعنی ترقی کے پھل سارے طبقوں کو برابر
ملیں اور ترقی حاصل کرنے میں بھی سب کی شرکت ہو۔ وہ ترقی کس کام
کی جس میں نا انصافیاں پروان چڑھیں اور خوشحال اور کنگال کا
درمیانی فاصلہ بڑھتا چلا جائے۔ منصوبہ بند ارتقاء کا ہدف یہ ہے
کہ دولت پیدا کرنے کے وسائل بڑھیں اور دولت کی منصفانہ
تقسیم ہو۔ مجوزہ اخبار جو اقلیتوں کی ترجمانی کرے گا، اس کا موقف
یہ ہوگا کہ ہمارا ملک ارتقاء کے مراحل سماجی انصاف کے ساتھ طے
کرے تاکہ اکیسویں صدی میں داخل ہوتے وقت اس کا شمار دنیا کے
ترقی یافتہ ترین ممالک میں ہونے لگے، جس کے باشندے انصاف کے
سایے میں بے خوف و خطر زندگی گزار رہے ہوں۔

ملک کی آزادی کے بعد انگریزی روزنامہ نکالنے کی مسلمانوں
نے کئی بار کوشش کی۔ حالات کا ستم کہیے یا بے حسی یا استقامت
کی کمی کہ یہ کوششیں بار آور نہ ہو سکیں لیکن مایوسی کفر ہے اور
جن اقوام و ملل میں جان ہوتی ہے وہ پچھلی ناکامیوں سے مہمیز کا کام
لیتی ہیں۔ علاوہ بریں تیس چالیس سال پہلے، بلکہ پندرہ سال پہلے تک اخبارات
کی وہ اہمیت نہیں تھی جو اب ہو گئی ہے۔ انگریزی اخباروں کے لیے رائے
عامہ گل کوزہ گر کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ اسے جو چاہیں شکل دے
دیں، جس طرح چاہیں ڈھالیں۔ گذشتہ دو سال کے اندر ہم نے
اخباروں کے غیر معمولی نفوذ و اثر کی شہادتیں بار بار دیکھی ہیں۔ کیا
مسلمان اپنے آپ کو اتنے موثر آلۂ ابلاغ اور ذریعۂ اقتدار سے
جان بوجھ کر محروم رکھیں گے؟ یہ زمانہ اظہار و ابلاغ اور نشر و
اشاعت کا ہے۔ جو فرد یا جماعت ان سے محروم ہو گئی اس کا جینا
یا نہ جینا برابر ہے۔ اس کی بات کسی کے کانوں تک نہیں پہنچے گی، کوئی
اس کی داد رسی اور دستگیری کو نہیں آئے گا۔ کوئی اس کا ساتھ
نہیں دے گا۔ جمہوریت میں پنپنے کے آداب یہ ہیں کہ اپنی بات ان
سارے افراد تک پہنچائی جائے، حکومت جن کی رائے سے بنتی ہے
اور یہ کام ایک اچھا معیاری اور متوازن پیشہ اور مدلل انگریزی
اخبار ہی کر سکتا ہے۔

حکومت اور ابنائے وطن کو متاثر کرنے کے علاوہ یہ اخبار
خود مسلمانوں میں آگہی، سوجھ بوجھ، بصیرت اور حمیت اور صلح اندیشی
آشتی اور نگہداری اور باخبری کو فروغ دے گا۔

آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمان بالعموم انتشار اور نفاق
کا شکار رہے۔ لیکن جب کبھی کوئی سنگین خطرہ لاحق ہوا وہ متحد
ہو گئے۔ گذشتہ دو سال میں تو ایسا کئی بار ہوا۔ اس سے یہ نتیجہ
نکلتا ہے کہ اس گئے گزرے زمانے میں بھی مسلمانوں میں کسی بڑے
مقصد کے لیے متحد ہونے کی صلاحیت باقی ہے۔ لیکن غور کیجیے ہمیں
متحد اور سرگرم عمل ہونے کے لیے خطرے کی ضرورت کیوں ہو؟ ہم
تعلیمی تعمیری آگاہی اور دور رس اور دیر طلب کاموں کے لیے اتفاق
اور عمل اور مداومت کو شعار کیوں نہ بنائیں؟ ہماری نگاہ ماضی
اور حال سے مستقبل کی طرف کیوں نہ جائے؟ ہم اس مہلک کمی کو دور
کرنے کے لیے سرگرم عمل کیوں نہ ہو جائیں جس کا احساس بڑی بے بسی
کے ساتھ ہمیں ہر آڑے وقت میں ہوتا ہے اور جو ہماری بیداری اور
پیشرفت کا راستہ روک رہی ہے، یعنی ایک انگریزی روزنامے کی کمی۔

ہمیں اس کمی کو دور کرنا ہے اور جلد دور کرنا ہے، انفرادی
کوشش سے دور کرنا ہے، اجتماعی کوشش سے دور کرنا ہے۔ وقت
محیر العقول تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ وہ ہمارا انتظار نہیں کرے گا۔
ہم نے اور دیر کر دی تو پھر کبھی دوڑ کر اسے پکڑ
نہیں سکیں گے۔ اب جو پیچھے رہ گیا وہ دوڑنے والوں کے پاؤں تلے
روندا جائے گا، کچلا جائے گا۔ خدا نہ کرے کہ ہمارا ایسا
حشر ہو۔

سائنس اور پاکستان

عبدالسلام

پاکستانی قوم کوئی چھوٹی قوم نہیں۔ اس ملک کی آبادی ساڑھے نو کروڑ سے بھی زیادہ ہے جو جاپان کے برابر اور فرانس اور برطانیہ سے دوگنی۔

جہاں تک سائنسی علوم کا تعلق ہے، پاکستانی قوم نے امت مسلمہ کی حیثیت سے ماضی میں سائنس کی ترقی و ترویج میں شاندار کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بعض لوگ، جن میں کچھ مسلمان بھی شامل ہیں، اسلامی سائنس کے سنہری زمانے میں ریاضی، طبعیات، کیمیا اور طب میں مسلمان سائنس دانوں کے عظیم اور شاندار کارناموں کو محض یونانی روایت کا تسلسل، کہہ کر اُن کی عظمت کو گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن یہ نک چڑھے لوگ بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ مسلمان سائنس دانوں ہی نے دنیا کو پہلی بار اس خیال سے روشناس کرایا تھا کہ سائنس اپنی ابتدا و انتہا میں ایک عملی اور تجربی علم ہے۔ بریفالٹ کی بات یاد آرہی ہے۔ اس نے کہا تھا:

"اہل یونان نے ضابطہ بندی کی، عام اصول وضع کیے اور نظریے بنائے۔ مفصل اور طویل مشاہدے اور عملی و تجرباتی تحقیق کے صبر آزما مراحل کو طے کرنا یونانی مزاج کے یکسر خلاف تھا۔ جس چیز کو ہم سائنس کہتے ہیں، وہ مشاہدے، تجربے اور پیمایش کے اُن نئے نئے طریقوں سے پیدا ہوئی جو یورپ میں مسلمانوں نے متعارف کرائے تھے۔ جدید سائنس اسلامی تہذیب کا انتہائی اہم اور مہتم بالشان کارنامہ ہے۔"

بریفالٹ کی اس رائے کی تصدیق سائنس کے عظیم مورخ جارج سارٹن نے بھی کی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"ازمنہ وسطیٰ کا اہم ترین کارنامہ تجرباتی اسپرٹ کی تخلیق تھا اور یہ بنیادی طور پر مسلمانوں نے پیدا کیا تھا اور بارھویں صدی تک جاری و ساری رکھا۔"

تجرباتی علم و مہارت پر اصرار کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا بھر کے مسلمانو[ں] اور بالخصوص پاکستان، انڈیا اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں نے روایت[ی] کاریگری اور ہنرمندی میں ہمیشہ درجہ کمال حاصل کیا تھا۔

بدقسمتی سے سائنسی علوم میں ہمارا حال شاندار تو کیا انتہائی ناگ[فتہ بہ] ہے۔ اس وقت کرۂ ارض پر جتنی بھی تہذیبیں موجود ہیں، سائنس اسلا[می] ممالک میں سب سے زیادہ کمزور ہے، جن میں اپنا پاکستان بھی شامل [ہے۔] تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ برصغیر پاک و ہند [کی] مسلمان قوم کسی بھی دور میں سائنسی علوم میں پُرمایہ نہیں تھی۔ ہم اپنی [تاریخ] کے افغان اور مغل ادوار میں کسی ایک بھی بڑے سائنس داں کا نام [نہیں لے] سکتے، سوائے البیرونی کے جو ۱۰۰۰ کے لگ بھگ ہندوستان آیا [تھا۔] ہمارے حکمرانوں اور ان کی فوجی حکومتوں کو علمی ادارے یا سائنس اک[ادمیاں] اور یونیورسٹیاں وغیرہ قایم کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انہیں [اگر] دلچسپی تھی تو صرف اپنے مقبرے تعمیر کرانے سے دلچسپی تھی جو اُن کی عظیم [الشان] سلطنتوں کی یادگار کہلائیں۔ افسوس صد افسوس۔ ان کی چھوڑی [ہوئی] یہ روایت اب تک کسی نہ کسی طور جاری ہے۔

پاکستانی سائنس کی حالت خراب کیوں ہے

میرے خیال میں تین چیزیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے پاک

ائنس اور ٹکنالوجی کی حالت خراب و خستہ ہے۔

(ا) سائنسی علم کے حصول و ترقی کے لیے کوئی قومی پیمان نہیں ہے ئی اجتماعی احساس نہیں ہے کہ قوم کے اقتصادی اور دیگر مسایل حل کرنے لیے سائنس کے علمی اطلاق سے فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے، جیسا کہ اپان میں شہنشاہ میجی کے دور میں ہوا تھا۔ شہنشاہ نے جاپان کے نئے ئین کے جزو کی حیثیت سے پانچ حلف اُٹھائے تھے جن میں سے ایک یہ تھا

"جاپان کی عظمت و جلالت کی خاطر پوری صلاحیت و
استطاعت سے علم حاصل کیا جائے گا خواہ وہ کہیں سے بھی
حاصل ہو۔"

قومی عزم و پیمان کے نہ ہونے کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان میں عملی اور فعّال سائنس دانوں کا قحط الرجال ہے اور صورتِ حال اچھی ہونے کے بجائے سال بہ سال بد سے بدتر ہوتی جارہی ہے۔

(ب) ہمارے ملکوں میں کارگر سائنس کا نظام نوجوان، پُرجوش فعّال اور عملی سائنس دانوں کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ جیسا کہ دوسرے بڑے ملکوں کی یہ عام روایت ہے۔ چند مستثنیات سے قطع نظر ہماری یونیورسٹیوں میں سائنس کا تخلیقی سرچشمہ خشک پڑا ہے۔ یونیورسٹیوں سے باہر پاکستان کاغذی قسم کی تحقیقی تنظیموں کی حقیقی جنت ہے جن میں زندہ رہنے کی سکت نہیں اور اگر ہو بھی تو اُن کے درمیان رابطے کا کوئی موثر نظام نہیں۔

(ج) ٹکنالوجی میں کیے بعد دیگرے آنے والی حکومتوں میں سے ایک نے بھی خود اعتمادی حتیٰ کہ دفاعی ٹکنالوجی میں بھی۔ پیدا کرنے کو قومی مقصد قرار نہیں دیا۔ ہم نے ٹکنالوجی کی سائنسی بنیاد پر بھی کوئی توجہ نہیں دی۔

پاکستان کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ۔ (پی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ آر) کو لعن طعن کرنے سے پہلے کہ اس نے فارمیسی کی دنیا میں تحقیق کیوں نہیں کی، یہ امر فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ گذشتہ چالیس سال میں ہماری پے در پے آنے والی حکومتوں نے گویا یہ طے کر رکھا تھا کہ ہمیں درآمدی کیمیات سے گولیاں بنانے اور پیک کرنے کے سوا اور نہ کچھ کرنا چاہیے۔ ملکی کارخانوں میں اسپرین یا وٹامن وغیرہ بنانے کی صنعت شروع بھی ہوئی تو مناسب تحفظات نہ ہونے کے باعث بند ہو گئی۔ پی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ آر کو حقیقی معنوں میں کوئی موقع ملا بھی تو ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران، جب کہ جنگی کیمیات کی درآمد فوراً رک گئی۔ کونسل سے وابستہ کیمیا دانوں نے اس چیلنج کو مردانہ وار اور کامیابی کے ساتھ قبول کیا۔ ہم سب یہ سمجھتے تھے کہ جنگ کے بعد بھی یہ تمام کیمیات ہم خود پاکستان میں بنایا کریں گے اور درآمد کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ لیکن جنگ کے ختم ہونے کے چند ماہ بعد ہی درآمد کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔

اب میں ان تین نکات کی تشریح کروں گا۔

۱۔ **قومی عزم و پیمان کا فقدان**۔ پاکستان کی کوئی واضح خارجہ پالیسی ہو گی۔ درآمدی برآمدی پالیسی بھی ممکن ہے کہ واضح ہو۔ دفاع کی پالیسی بھی شاید واضح ہو، لیکن سائنس یا ٹکنالوجی کی قطعاً کوئی پالیسی نہیں ہے اور اگر ہے تو اب تک اس کا اعلان نہیں کیا گیا۔ پچھلے نیشنل کمیشن کی رپورٹ میں ۱۹۵۹ء میں اس کا محض حوالہ دیکھنے میں آیا تھا۔

اس معاملے کا ایک پہلو یہ ہے کہ سائنسی علوم کی سرپرستی کے لیے سرکاری یا نجی سطح پر کسی قسم کا کوئی قومی عزم و پیمان نہیں ہے۔ ذہین و فطین دانش وروں کو سائنس اور سائنسی پیشوں کی طرف لانے کی کوئی ترغیب، کوئی پالیسی نہیں ہے۔ ہم سائنس کی ترقی۔ حتیٰ کہ دفاعی سائنس کو بھی۔ کوئی ترجیح نہیں دیتے۔ حالاں کہ میرے ذاتی خیال میں سائنس کو اتنی ہی ترجیح دینی چاہیے جتنی دفاع کو دی جاتی ہے۔ قومی زرعی کونسل یا سپارکو یا اٹامک انرجی کمیشن جیسے اداروں میں جو تھوڑی بہت سائنس اور ٹکنالوجی ہمیں نظر آتی ہے یا جس کا چرچا ہوتا رہتا ہے، وہ افراد کی ذاتی اور انفرادی کوششوں کا ماحصل ہے۔

حوصلہ افزائی اور سرپرستی سے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں، اس کی مثال دیکھنی ہو تو آیئے روس کی اکیڈمی آف سائنسز کی تاریخ اُٹھا کر دیکھتے ہیں۔ یہ اکیڈمی پیٹر اعظم نے قایم کی تھی۔ چالیس سال پہلے اکیڈمی سے کہا گیا کہ وہ اپنے ارکان کی تعداد بڑھائے اور تمام سائنسی علوم کی یکساں ترقی کا خصوصی پروگرام بنائے۔ آج اکاڈمی ڈھائی لاکھ سائنس دانوں پر مشتمل ایک خود مختار مقتدرہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ڈھائی لاکھ سائنس داں مختلف اداروں اور شعبوں میں تحقیقی و علمی کام کر رہے ہیں اور ان کو روس جیسے سخت گیرانہ نظام میں بھی ایسی ترجیحات اور مراعات حاصل ہیں کہ دوسرے ملکوں کے سائنس داں ان پر رشک کرتے ہیں۔ اکیڈمی کے ایک

سوز رکن مسٹر مالکیو کے خیال میں یہ ذہنی انقلاب ۱۹۴۵ء میں آیا تھا جب کہ روس کی اقتصادیات جنگِ عظیم کے باعث تباہ ہو چکی تھی۔ اسٹالن نے فیصلہ کیا کہ وزن ان ذہین جوان مردوں اور عورتوں پر ڈالا جائے جو سائنسی علوم سے وابستہ ہیں۔ چنانچہ ان کی زیادہ سے زیادہ بھرتی کا فیصلہ کیا گیا۔ افسر شاہی نے اس فیصلے کی مخالفت کی، لیکن اسٹالن نے ان کے ماہرانہ مشوروں کی پرواہ کیے بغیر ایک روز سرکاری طور پر اعلان کر دیا کہ اکیڈمی سے وابستہ تمام سائنس دانوں کی تنخواہ میں تین سو فیصد کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ بقول مسٹر مالکیو:

"ڈاکٹروں یا انجینیروں کی تنخواہ میں نہیں، صرف سائنس دانوں کی تنخواہ میں اضافہ کیا گیا۔"

اُس وقت سے لے کر آج تک روسی سائنس کو کچھ اور مسایل کا سامنا ہو تو ہو، لیکن حوصلہ افزائی اور سرپرستی کا فقدان ان کا مسئلہ نہیں ہے۔"

یہ بات مشرقی یورپ کے ملکوں پر بھی صادق آتی ہے۔ وہاں سائنس کے احترام کو مذہبی تقدس کا درجہ حاصل ہے۔ حال ہی میں مَیں صوفیہ گیا تھا۔ وہاں میں نے شہر کے عین قلب میں، ایک بڑے چوک میں اکیڈمی آف سائنسز کی عالی شان عمارت کا پُر وقار منظر دیکھا۔ ملک کے بیشتر تحقیقی سائنسی ادارے اکیڈمی کے ماتحت ہیں۔ یہ اکیڈمی تقریباً ۱۲۵ سال پہلے بلغاریہ کے جلاوطن سائنس دانوں نے اس وقت قایم کی تھی، جب بلغاریہ ابھی سلطنت ترکیہ کا ایک حصہ تھا اور ابھی اسے آزادی و خود مختاری حاصل نہ ہوئی تھی

اس معاملے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ پاکستانی سائنس اپنی تعداد و مقدار کے اعتبار سے بھی چھوٹی، بہت چھوٹی ہے۔ مجاہد کامران صاحب نے رسالہ "کونسیپٹ" میں لکھا ہے کہ

"پاکستان کی یونیورسٹی میں طبیعیات پڑھانے والے اساتذہ کی کل تعداد ۸۶ ہے، جن میں سے صرف ۴۶ پی ایچ ڈی ہیں۔"

مجاہد کامران صاحب مزید لکھتے ہیں:

"پلازما طبیعیات کے شعبے میں انڈیا کے پاس ۱۵۰ سائنسدان ہیں، جب کہ پاکستان کے پاس فقط تین ہیں۔ لیزر طبیعیات میں درک رکھنے والے سائنس دانوں کی تعداد پاکستان میں پندرہ، انڈیا میں دو سو سے زائد اور چین میں دو ہزار سے زائد ہے۔ انڈیا میں سائنس دانوں کی تعداد پاکستان سے اسی گنا زیادہ ہے۔ جب کہ انڈیا کی آبادی پاکستان سے صرف آٹھ گنا زیادہ ہے۔"

۱۹۷۰ء کے بعد سے تو، جب سے پاکستانی ذہانت مشرقِ وسطیٰ میں منتقل ہونا شروع ہوئی ہے، اس تعداد میں تیزی سے کمی آ رہی ہے۔ پروفیسر مائیکل موراوسِلک کے اندازے کے مطابق:

"پاکستان تیسری دنیا کے ان چند ملکوں میں شامل ہے، جہاں تحقیقی اشاعت تیزی سے گھٹ رہی ہے، جب کہ دوسرے زیرِ ترقی ممالک میں اوسطاً ۴۰ فی صد اضافہ ہوا ہے۔"

ایک اشارہ کافی ہے۔ انڈیا میں، جس کی آبادی پاکستان سے آٹھ گنا زیادہ ہے، سالانہ وہاں کی یونیورسٹیوں میں طبیعیات میں ... پی ایچ۔ ڈی والے سائنس دان پیدا ہو رہے ہیں۔ اس کا موازنہ پاکستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی، لاہور کی پنجاب کی یونیورسٹی نے اپنی ... سال کی عمر میں ریاضی میں ایک بھی پی ایچ۔ ڈی پیدا نہیں کیا اور طبیعیات میں بھی فقط تین ڈاکٹر سائنس دان پیدا کیے ہیں۔

مجاہد کامران صاحب نے اس قحط الرجال کا تجزیہ کرتے ہوئے ... ہے:

"اس کی بنیادی وجہ تو یہ ہے کہ سیاسی (اور فوجی) قیادت کی توجہ میں سائنس کے کردار کا اندازہ کرنے سے قاصر رہی ہے دوسری وجہ ہماری افسر شاہی کی تنگ دلی اور پست ذہنیت ہے۔ ۔ ۔ اعلیٰ ملازمتوں پر زیادہ تر ایسے لوگوں کا تسلط ہے، جن کو تعلیم (سائنس) کوئی دلچسپی نہیں۔ ۔ ۔ جن کی اپنی علمی سطح بس اوسط درجے کی ہے۔ ۔ ۔ میں تحیّر و تجسس کا جذبہ نہیں، تحقیق کی امنگ نہیں۔ نئے نئے خیالات کی پیرورو لولا نگریزی نہیں۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ نظم و نسق کے ڈھانچے میں جس طرح کے انتظامی محکمے اور ہیں، ویسا ہی تعلیم (سائنس) کا محکمہ ہے۔ ایک غیر اہم سا محکمہ۔"

سائنس دانوں کے لیے افسرانِ بالا کے دل میں جو نفرت و حقارت بیٹھی ہوئی ہے اس کا ایک چشم دید گواہ میں بھی ہوں۔ مجھے پاکستان کے پلاننگ کمیشن کا ایک سابق چیرمین یاد آتا ہے۔ میں نے ان سے سائنس دانوں کے رہائشی مسئلے کو حل کرنے کی درخواست کی تھی۔ انہوں نے فرمایا تھا

"آدھا کراچی فٹ پاتھ پر سوتا ہے۔ سائنس داں فٹ پاتھ پر کیوں نہیں سو سکتے؟"

ب میں نے ان کی خدمت میں گزارش کی کہ سائنس پر مبنی صنعتوں کی بندی کرتے وقت سائنس دانوں سے مشورہ کر لیجیے گا تو انہوں نے تنک مزاجی

ہا۔

"مجھے سائنس دانوں سے مشورہ لینے کی کیا ضرورت ہے۔ میں اپنا چلانے کے لیے اپنے باورچی سے مشورہ نہیں لیا کرتا۔"

ں انہوں نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ وہ اپنے کون سے قدرتی حق کی بنا پر پلاننگ شن کے سربراہ بنے بیٹھے تھے۔

ب) کار گہ سائنسی کا نظام۔ سائنس اپنی ترقی اور ں رفت کے لیے بلند پرواز اونچی شخصیتوں کی محتاج ہے۔ ایسے حالات دا کیے جانے چاہیں کہ ایسے لوگ ملک سے باہر نہ جانے پائیں۔ بلکہ ملک اندر ہی رہ کر اس کی خدمت کرتے رہیں۔ کارگہ سائنس کا نظام خود ائنس دانوں کے ہاتھ میں رہنا چاہیے۔ اسرائیل کے سائنس داں آنجہانی وس ڈی شلیط سے (اس وقت وہ وائز مین انسٹی ٹیوٹ، یروشلم کے ائرکٹر تھے) اقوام متحدہ کی ایک کمیٹی میں بر سر اجلاس یہ پوچھا گیا کہ اسرائیل سائنسی پالیسی کیا ہے۔ تو انہوں نے یہ جواب دیا تھا:

"ہماری سائنسی پالیسی بہت سادہ ہے۔ اس کے صرف دو اصول یں۔ اول یہ کہ ایک عملی سائنس داں کبھی غلط نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ صحیح وتا ہے اور وہ جتنا کم عمر اور نوجوان ہو گا، اتنا ہی زیادہ صحیح ہو گا۔ دوسرا صول یہ ہے کہ ہم اپنی یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں سے وابستہ سائنسدانوں و ترغیب دیتے ہیں کہ وہ اپنے تحقیقی کام کے سلسلے میں جب چاہیں، جہاں چاہیں، چلے جائیں۔ ان کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ اسی طرح وہ اپنی تحقیق ی خاطر ملک سے باہر بھی (عارضی طور پر) جا سکتے ہیں۔ باہر جانے کی صورت میں صرف ایک شرط عاید کی جاتی ہے کہ وہ اسرائیلی لڑکی سے شادی کر کے جائے۔ تاکہ واپسی کا راستہ کھلا رہے۔"

اہل پاکستان کے لیے اس میں درس عبرت پنہاں ہے

اب میں پھر اپنی گفتگو کی طرف آتا ہوں۔ پہلے اپنی یونیورسٹیوں حال دیکھیے۔

(ا) ہماری جامعات کا سارا زور تحقیق پر ڈالنا چاہیے۔ ہمیں اس اصول کا احترام کرنا چاہیے کہ یونیورسٹی کے استاد کا آدھا وقت تحقیق پر اور آدھا وقت تدریس پر صرف ہونا چاہیے۔ فی الحال ہمارا طریق کار یہ ہے کہ ہمارے قومی تحقیقی ادارے اطلاقی مضامین کے یونیورسٹی سے استمداد نہیں کرتے۔ اس طریقے سے ہمارے نوجوان طلبا ر اداروں کے بڑے سائنسدانوں کے علم اور تجربے سے مستفید نہیں ہو پاتے۔ ہمیں یہ طریقہ فوراً ترک کر دینا چاہیے۔

(ب) پاکستانی جامعات میں مسلسل ہڑتالیں ہوتی رہتی ہیں۔ مسلح گروہوں میں لڑائیاں ہوتی ہیں۔ اکثر قتل ہو جاتے ہیں۔ یہ صورت حال انتہائی خطرناک ہے۔ یقین نہیں آتا کہ مارشل لا کی حکمرانی بھی ان طلباء کو جو سکون و اطمینان سے پڑھنا چاہتے ہیں۔ حق مطالعہ کی ضمانت نہیں دے سکی۔ جب کہ ایسے طلباء میں اکثریت سائنس کے طلباء کی ہوتی ہے۔ حق مطالعہ کی ضمانت دینا ہر حکومت پر واجب ہے۔

(ج) پاکستانی سائنس کو بین الاقوامی سائنس سے ایک زندہ تعلق اور ربط ضبط رکھنا چاہیے۔ آج ملک میں کام کرنے والے سائنسداں بہت کم ایسے ہیں کہ بیرونی ممالک کے سائنسی اداروں میں جائیں اور ان سے بالمشافہ مکالمہ کریں۔ اس نوعیت کے علمی سفر کو پر تعیش ضیاع خیال کیا جاتا ہے۔ اس علیحدگی پسندی کے رجحان کو ختم کرنے کے لیے ہی میں نے 'بین الاقوامی مرکز برائے نظری طبعیات' قایم کرنے کی تجویز کی تھی۔ تاکہ زیر ترقی ممالک کے طبعیات داں اپنے مضمون میں تازہ ترین تحقیقات سے مستفید ہونے کے لیے جلا وطنی کی زندگی بسر نہ کریں۔ یہ مرکز اٹلی کے شہر ٹریستے میں اقوام متحدہ کی دو ایجنسیوں یعنی بین الاقوامی ایٹمی انرجی ایجنسی اور یونسکو کے باہمی اشتراک سے کام کر رہا ہے۔ صرف ایک سال ۱۹۸۵ء میں (اٹلی یا سویڈن کی مالی اعانت سے) ۵۷ پاکستانی طبعیات دانوں نے مرکز میں آ کر تحقیقی سہولتوں سے فائدہ اٹھایا۔

(د) ہم نے سائنس دانوں کو صرف انفرادی طور پر ہی تنہا نہیں کر دیا بلکہ بقول مسٹر زیلان:

"ہم نے بین الاقوامی سائنس کے عام معیاروں سے بھی قطع تعلق کر لیا ہے۔"

ربیا روس میں سائنس کا نظام خود مختاری کی بنیاد پر چلتا ہے۔ ہمارا انداز
ا ہے۔ ہمارے ہاں تو پیشہ ورانہ تنظیموں کا بھی کوئی نظام پیدا نہیں ہو سکا ۔
بصرے و تجزیے کے لیے مجلسیں برپا نہیں ہوتیں۔ معیار کی کیفیت کا مطالعہ
لمنے اور جائزہ لینے کا آزادانہ انتظام نہیں۔ علمی جلسے منعقد نہیں ہوتے۔ سائنس
فاونڈیشن نہیں، جو سائنس والوں کے ہاتھ میں فعّال طریقے سے چل رہی ہوں گرانٹ
اور مالی امداد کے آزاد سرچشمے نہیں (پیشہ ورانہ تنظیموں کے فقدان کا الزام
خود سائنس والوں کے سر ہے۔ انہوں نے کبھی سر جوڑ کر بیٹھنے اور متحد ہونے
کی کوشش نہیں کی)۔

(۵) ایک اور اہم بات جس سے تحقیق پر بُرا اثر پڑتا ہے، مجاہد کامران کے لفظوں میں یہ ہے کہ

"تعلیمی اداروں اور تحقیقی تنظیموں کا سربراہ نا اہل لوگوں کو مقرر کیا جاتا ہے۔" ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر محمود حسین اور ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی سے قطع نظر، ایک بھی اچھا اور بڑا ریسرچ اسکالر ایسا نظر نہیں آتا، جسے ہماری جامعات کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا ہو۔ اکثر کا کیریر تھرڈ کلاس رہا ہے اور اگر انہوں نے کبھی تحقیقی کام کیا بھی تھا تو اس وقت جب وہ خود طالب علم تھے۔ اداروں کے اس قسم کے سربراہوں نے تدریس و تالیف و تحقیق کو ایک معزز پیشہ بنانے کی تدبیریں کرنے کے بجائے، اپنی پوری صلاحیتیں اس کے الٹ ثابت کرنے میں صرف کر دی ہیں۔۔۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ذہین و فطین افراد یا تو ملک چھوڑ کر بیرونی ممالک میں چلے گئے ہیں یا شدید اعصابی اذیت اور ذہنی کوفت نے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو مفلوج کر دیا ہے۔ اس لیے اگر وائس چانسلروں کے خلاف غیظ و غضب پایا جاتا ہے تو تعجب نہ ہونا چاہیے۔"

اس صورتِ حال کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ تقریباً ہر یونیورسٹی میں وائس چانسلر اور اساتذہ کے درمیان تخریبی نوعیت کی آویزش پائی جاتی ہے جو اساتذہ کی تدریسی صلاحیت کو زنگ لگا دیتی ہے، علمی ماحول خراب کر دیتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قحط الرجال کا سبب بن جاتی ہے۔

اس سیاق و سباق میں اوریگون یونیورسٹی کے فاضل پروفیسر مائیکل موراوسکک کی رائے کا حوالہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"علاوہ ازیں یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ جو لوگ پاکستان کی سائنسی پالیسی بنانے اور چلانے کے ذمہ دار ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس امر کا احسا[س] ہی نہیں ہے کہ کوئی مسئلہ ہے۔ جب احساس ہی نہیں تو اعتراف کی کیا حقیقت [م]یں دیکھتا ہوں کہ آج پاکستان میں سائنس کا نظم و نسق بہت کمزور ہے۔ معاملات ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہیں جن کو امور سائنس سے نمٹنے کا ذاتی تجربہ نہیں، جن کو یہ ادراک حاصل نہیں کہ ایک ملک کی ترقی میں سائنس کیا کردار ادا کر سکتی ہے۔ جن کو نہ بصیرت حاصل ہے نہ تخیل۔"

پروفیسر مائیکل نے حال ہی میں مجھے ایک خط بھیجا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ صدر پاکستان سے ان کی کئی برس سے مکاتبت چل رہی ہے۔ انہوں نے صدر صاحب کو لکھا ہے کہ پاکستان کی جامعات سے کوئی نیا علم تخلیق نہیں ہو رہا اور نہ وہ اپنے طلبا و طالبات میں نیا علم منتقل کر رہی ہیں۔ چنانچہ پاکستانی سائ[نس] شدید خطرے میں ہے۔ پروفیسر صاحب نے صدر مملکت کو تین امور کی نشاند[ہی] کرائی ہے۔ وہ صدر صاحب کے نام یوں لکھتے ہیں:

"میں اپنے اس مقالے کی کاپی آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں، جو میں نے اسلامی سائنس کے موضوع پر اسلام آباد کانفرنس میں پڑھ[ا] تھا۔ اگرچہ میرے اپنے مقالے کا موضوع یہ نہیں تھا، تاہم اس کی فراہم کرد[ہ] معلومات کی مدد سے پاکستانی سائنس کا موازنہ دوسرے ملکوں کی سائنس سے کیا جا سکتا ہے۔ پاکستانی معلومات خاکہ نمبر ا اور نمبر ۷ میں درج ہیں میں نے آپ کی سہولت کی خاطر آپ کی کاپی میں سُرخ نشان لگا دیا ہے۔ ی[ہ] کے لیے ماہر ریاضی داں ہونا ضروری نہیں کہ بیشتر ممالک کے خطوط اوسط سے ا[وپر] کی طرف گئے ہیں۔ اور ۴۰ فیصد اور بعض صورتوں میں اس سے بھی زیاد[ہ] ترقی ہوئی ہے۔ جب کہ اسی مدت میں پاکستان کے خطوط اوسط سے نیچے گر[ے] ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سائنسی مصنفین کی تعداد ہی کسی ملک کی سائنسی ... کا واحد اشارہ ہے۔ لیکن جب ہم اوپر جاتے ہوئے اور نیچے گرتے ہوئے خ[طوط] کو دیکھتے ہیں تو سوچنا ہی پڑتا ہے۔

دوسرا اشارہ زیادہ شماریاتی نہیں ہے۔ میں "فزکس انٹر دیو پرو[جیکٹ]" کا خالق ہوں اور اس پروجیکٹ سے شروع ہی سے میرا رابطہ برابر ق[ائم] ہے۔ اس پروجیکٹ کے تحت ایشیا کے ان طلبا کی ذہانت کا مطالعہ و موا[زنہ] کیا جاتا ہے جو امریکا میں طبعیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے مالی ا[مداد] کی درخواست کرتے ہیں۔ اس پروجیکٹ کے اکثر ایشیائی ممالک میں ج[و]

سے بہ نفسِ نفیس انٹرویو کرتے ہیں اور ہر طالب علم کے لیے یک صفحاتی
نیص نامہ تیار کرتے ہیں۔ ۱۹۰۳ء میں اس پروجیکٹ کے تحت پاکستان
ال، بنگلہ دیش، سری لنکا، سنگاپور، انڈونیشیا، ملائشیا، تھائی لینڈ،
ائن، ہانگ کانگ اور جنوبی کوریا کے ۱۰،۷ طلبا کے انٹرویو لیے گئے۔
با، کی ذہانت و معیار کو جانچنے کے لیے ہر ملک میں ایک جداگانہ پیمانہ
ر کیا گیا۔ جس کے مطابق ان گیارہ ملکوں کی درجہ بندی کی گئی۔ ان گیارہ
لکوں میں پاکستان نویں نمبر پر نکلا۔

تیسرا اشارہ اگرچہ زیادہ داخلی ہے، لیکن افادیت کے لحاظ سے کم
ہیں۔ پاکستان کی سائنسی افرادی قوت کا جائزہ لیا جائے تو یہ دیکھ کر
یرت ہوتی ہے کہ اس پر بوڑھوں کا قبضہ ہے۔ جب ۱۹۶۲ء میں پہلی مرتبہ
کستانی سائنس سے میرا رابطہ قائم ہوا تھا تو سائنسی علوم میں بہت سے روشن
یال، ذہین اور فطین نوجوان کام کر رہے تھے۔ بہت سے ابھی اعلیٰ سطحوں پر
تعلیم حاصل کر رہے تھے، لیکن غضب کی صلاحیت ظاہر کرتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نہ
کوئی شاندار کارنامہ کر دکھائیں گے۔ ان میں سے بہت سوں نے آنے والے برسوں میں سائنس کی
نمایاں خدمات بھی کیں۔ اب اس نسل کے لوگ چالیس کے پیٹے میں ہیں۔ اُن سے
زرخیزی اور تخلیق کی بُو اب تک آ رہی ہے، لیکن یہ نسل مجموعی طور پر تحقیق کے باب
میں برابر کمزور پڑ رہی ہے۔ غالباً معاشرے کے چلن سے تھک گئی ہے۔ غالباً
انتظامیہ کے رویے نے مایوس کر دیا ہے۔ تکلیف کی بات یہ ہے کہ سائنس
دانوں کی نئی نسل اِس پرانی نسل کی جگہ لینے کے لیے تیار نہیں ہوئی۔ اس سے
نہ صرف یہ کہ حال گہنا گیا ہے، بلکہ مستقبل کے بارے میں بھی پیشین گوئی کی
جا سکتی ہے کہ تاریک ہے''۔

(ج) **ٹکنالوجی میں خود اعتمادی۔** پاکستان میں سائنس و
ٹکنالوجی کی خرابی کا تیسرا بڑا سبب یہ ہے کہ ٹکنالوجی کی کوئی واضح پالیسی موجود
نہیں ہے اور اس امر کا بھی احساس موجود نہیں ہے کہ سائنس کی منتقلی کے
ساتھ ساتھ ٹکنالوجی کی منتقلی ہونی چاہیے۔ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ہم تو
ٹکنالوجی کی منتقلی کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ حالاں کہ اس کا مطلب فقط
اتنا ہوتا ہے کہ ہم مشینیں، ڈیزائن، کاریگر، انجینیر اور بعض صورتوں میں
قدرے صاف شدہ خام مواد درآمد کرتے ہیں۔ ٹکنالوجی کی ایسی منتقلی
کی بے اثری کو پروفیسر سی۔ جی اولڈ ہام نے ایک مثال سے واضح کیا ہے

پروفیسر اولڈ ہام سسکس یونیورسٹی کے ''سائنس پالیسی ریسرچ یونٹ''
کے بانی ہیں، جس نے عالمگیر شہرت حاصل کر لی ہے۔ پروفیسر ۱۹۶۳ء میں
ہانگ کانگ میں ارضی طبیعات داں کے طور پر کام کرتے تھے۔ وہ اقوامِ متحدہ
کے زیرِ اہتمام سائنس و ٹکنالوجی کی ایک عالمی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے
جنیوا آئے۔ کانفرنس سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ''سائنس پالیسی ریسرچ
یونٹ'' قائم کر ڈالا۔ ہانگ کانگ واپس جاتے ہوئے حکومتِ اسرائیل
نے انہیں ایک دو روز تل ابیب میں قیام کرنے کی دعوت دی۔ اسرائیل
میں قیام سے انہیں اس خلیج کا احساس ہوا، جس نے ہانگ کانگ اور اسرائیل
کی دو مملکتوں کو ایک دوسرے سے معنوی لحاظ سے ممیز کر رکھا ہے۔ دونوں
ملکوں کی آبادی پناہ گیروں پر مشتمل ہے۔ آبادی اور وسائل کے لحاظ
سے تقریباً یکساں ہیں۔ لیکن ایک ملک میں زیادہ زور ٹکنالوجی پر دیا گیا
ہے (ہانگ کانگ) جب کہ دوسرے ملک میں ٹکنالوجی کے ساتھ ساتھ اعلیٰ
درجے کی سائنس پر بھی تکیہ کیا گیا ہے (اسرائیل)۔ ان میں سے اسرائیل
ایک طاقتور ملک بن کر ابھرا ہے، جب کہ ہانگ کانگ ابھی ترقی پذیر ہے''۔

میرا خیال ہے کہ پروفیسر اولڈ ہام نے بعض دوسرے عوامل کو
پیشِ نظر نہیں رکھا جو اسرائیل کے لیے مددگار ثابت ہوئے اور ہانگ کانگ
کے خلاف گئے۔ البتہ وہ اس امر کی نشان دہی کرنے میں حق بجانب ہیں
کہ ''ٹکنالوجی بغیر سائنس'' اور ''ٹکنالوجی مع سائنس'' کے درمیان زمین
آسمان کا فرق ہے۔

سفارشات

لیکن اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ سائنس کی
اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی کے لیے بھی زیادہ سے زیادہ نسل دو نسل کی ضرورت
پڑتی ہے، جیسا کہ امریکہ، روس، جاپان اور اب برازیل، انڈیا، چین اور کچھ
عرصے سے کوریا کی مثالوں سے ظاہر ہے۔ پاکستانی سائنس کی ترقی کے
لیے چند سفارشات پیشِ خدمت ہیں:

۱۔ ہمیں ضرورت ہے ایسی پالیسی کی، جس کے تحت اعلیٰ درجے کی سائنس
ترویج پائے اور قومی مسائل پر اس کا اطلاق کیا جائے، نیز اس قومی عزم و
پیمان کا اعلان کیا جائے کہ سائنس پر مبنی ٹکنالوجی میں خود اعتمادی حاصل

کی جائے گی۔ اس پالیسی کو اس امر کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ٹکنالوجی کی منتقلی کے پہلو بہ پہلو سائنس کی منتقلی بھی ضروری ہے۔ نیز یہ کہ سائنس قومی مسائل کے حل کرنے میں، طب وصحت میں، زراعت میں، منصوبہ بندی میں، صنعت وحرفت میں اور دفاع میں انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ سائنس کی تعمیری پالیسی بناتے وقت ہمیں جاپان کی مثال کو سامنے رکھنا چاہیے۔ جس کے قابلِ ذکر عوامل درج ذیل ہیں:

۱۔ تعلیم وتحقیق کی ہر سطح پر سائنس اور ٹکنالوجی کے تمام شعبوں میں نوجوان نسل کو وسیع اور سخت تربیت دینا۔ تحقیق میں وسیع پیمانے کی تربیت کی مثال کے لیے برطانیہ کی طرف دیکھیے۔ جس کی سائنس اور انجینئرنگ ریسرچ کونسل پی ایچ۔ ڈی ٹریننگ کے لیے پانچ ہزار جوانوں کو گرانٹ دیتی ہے۔ مزید پانچ ہزار جوانوں کو گرانٹ دوسری ریسرچ کونسلوں۔ مثلاً زرعی تحقیق کونسل، طبی تحقیق کونسل، ماحولیاتی تحقیقی کونسل وغیرہ کی طرف سے ملتی ہے۔ پی ایچ۔ ڈی کے بعد اعلیٰ تربیت کے لیے برطانیہ میں ہر سال ایک ہزار افراد کو گرانٹ دی جاتی ہے۔ یاد رہے کہ برطانیہ کی آبادی پاکستان کی آبادی سے نصف ہے۔

حکومت پاکستان نے اس سال ۴۰۰ طلبا کو پی ایچ۔ ڈی کی تربیت حاصل کرنے کے لیے بیرونی ممالک میں بھیجنے کا بندوبست کیا ہے۔ یہ انتہائی قابلِ تعریف اقدام ہے۔ اور آئندہ برسوں میں بھی جاری رہنا چاہیے۔ تاکہ گزشتہ ربع صدی کی غفلت کی تلافی ہو سکے۔ اب پی ایچ۔ ڈی کے بعد اعلیٰ تربیت کے لیے بھی ایوارڈ دینے کا سلسلہ شروع ہو جانا چاہیے اور اگر ضروری ہو تو بیرونی ممالک جانے والے منتخب طلبا کو سینیئر سائنسدانوں سے خصوصی تربیت دلوانے کا انتظام کیا جائے جیسا کہ ۱۹۱۸ء میں روس میں کیا گیا تھا۔ جن طلبا و طالبات کو بیرونی تربیت کے لیے منتخب کیا گیا تھا، اُن کو سینیئر سائنس دانوں سے خصوصی تربیت دلوائی گئی تھی اور یہ سارا انتظام جنگی بنیادوں پر کیا گیا تھا، تاکہ سائنس دانوں کا قحط الرجال جلد از جلد ختم کیا جا سکے۔

(ب) طویل المیعاد منصوبے کے طور پر اعلیٰ درجے کے تدریسی و تحقیقی ادارے قائم کیے جائیں جن کو بعد میں جامعات سے ملحق کر دیا جائے جامعات کی سائنس کو ترقی دینے کے لیے اور جامعات اور سرکاری تحقیقی اداروں کی باہمی رقابت کو دور کرنے کے لیے ہمیں امریکی نظام کو اختیار کر لینا چاہیے، جہاں وفاقی مالی امداد سے چلنے والے تحقیقی ادارے بھی لازماً جامعات سے ملحق ہوتے ہیں۔

(ج) سائنس کے نظم ونسق کا پرانا ڈھانچہ تبدیل ہو جانا چاہیے۔ سائنس کو فعال سائنس دانوں کو فعال سائنس دانوں کے لیے چلانا چاہیے۔ افسر شاہی کو سائنس کے انتظام سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہیے۔ ان بوڑھوں کو بھی سائنس کی گدی سے ہٹ جانا چاہیے جن کی سائنس پر جمود آ چکا ہے۔

۳۔ ملک میں سائنس کی متعدد فاونڈیشنیں قائم ہونی چاہییں جو سرکاری امداد سے بھی چلیں اور نجی عطیات اور اوقاف فنڈ سے بھی۔ تاکہ تحقیق کے لیے ہر ممکن ذریعے سے گرانٹ حاصل ہو سکیں۔

۴۔ ہمیں اس امر کو یقینی بنانا چاہیے کہ سائنس کے لیے ہماری تحریک اپنی نوعیت کے اعتبار سے بین الاقوامی ہو۔ اس کے لیے بین الاقوامی مذاکرے، سمینار، کانفرنس وغیرہ میں شرکت کے لیے عام آزادی، ترغیبات، رخصت باتنخواہ، آنے جانے کے اخراجات، قیام وطعام کے اخراجات کا انتظام سرکاری طور پر ہونا چاہیے۔

۵۔ ہائی ٹکنالوجی کی ترقی کے لیے بہتر ہوگا کہ پاکستان میں جاپان کی طرز پر "متی" (وزارت صنعت وتجارت) قائم کی جائے۔ نام کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ وزارت عملاً جاپان میں ہائی ٹکنالوجی کی ترقی کے لیے وقف ہو کر کام کرتی ہے۔ اس وزارت کے تحت مستقبل کے سائنسی رجحانات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ ہر ممکن طریقے سے سائنسی تحقیق کی حوصلہ افزائی کا اہتمام کرتی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سائنس دانوں کا قریبی اور مضبوط رابطہ صنعت کاروں، سرمایہ کاروں اور سرکاری مالیاتی اداروں سے پیدا کرتی ہے۔

۱۹۷۳ء میں اس وقت پاکستانی حکومت نے میری تجویز پر لاہور میں منعقد ہونے والی اسلامی سربراہی کانفرنس سے درخواست کی کہ عالمِ اسلام کے لیے کم از کم ایک "سائنس فاؤنڈیشن" قائم کی جائے جو اپنے رتبے اور سائز کے لحاظ سے فورڈ فاؤنڈیشن کے ہم پلہ ہو اور کم از کم ایک بلین ڈالر سے شروع کی جائے۔ درخواست کو منظور کر لیا گیا۔ آئندہ آٹھ سال خالی گئے۔ ۱۹۸۱ء میں سائنس فاؤنڈیشن بجائے ایک بلین کے ۵۰ ملین ڈالر کے وعدے سے قائم کی گئی اور جہاں تک میرے علم میں ہے، اب تک صرف ساڑھے چھ ملین

فاؤنڈیشن کو ملے ہیں۔ خود کو فریب دینے سے کہیں بہتر تھا کہ فاؤنڈیشن قائم ہی نہ کی جاتی۔

۶۔ جہاں تک ہائی ٹکنالوجی کے سوا عام صنعتی تحقیق کا تعلق ہے، چوں کہ ہماری بیشتر صنعتیں چھوٹی ہیں۔ اس لیے ہمیں چھوٹی صنعتی اکائیوں۔ مثلاً چمڑے بنانا، کھیلوں کا سامان، چھری، چمچے، کانٹوں کی صنعت اور ایسی ہی دوسری چھوٹی صنعتوں کی ضرورتوں کا جائزہ لینا چاہیے۔ ہمیں برطانیہ اور مغربی یورپ کی طرح مشترکہ سرکاری اور نجی امداد باہمی کے تحقیقی ادارے قائم کر لینے چاہئیں (رنگ روغن، کاسٹ آئرن، کٹلری، جیلاٹن اور گلیو، شیشہ، اسپرنگ، جوتے، فیتے، ہوزری، ویلڈنگ اور اون وغیرہ کی صنعتوں کی تحقیق و ترقی کے لیے) برطانیہ میں ایسے مشترکہ اداروں میں چھ ہزار سائنس داں اور ہنرمند کام کرتے ہیں۔ یہ ادارے صنعتوں کی ضروریات و مفادات و خدمات کی بجا آوری پر ۱۰۰ ملین ڈالر خرچ کرتے ہیں اور ۱۰۰ بلین کما کر دیتے ہیں۔ کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ ہم کیوں ملتان میں ٹائلوں کے لیے، بہاولپور میں ظروف سازی کے لیے، گجرات میں سرامکس کے لیے، سیالکوٹ میں آلاتِ جراحی کے لیے ایسے ادارے قائم نہیں کر سکتے۔ جو حکومت اور صنعت کاروں کے مشترکہ سرمایے اور امداد باہمی سے خوش اسلوبی سے چلتے ہیں۔

۷۔ پاکستان کی دنیائے دانش پر شاعری اور غزل کی ادبی روایت کا مکمل قبضہ رہا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم "حلقہ ارباب سائنس" کی تحریک زور شور سے شروع کریں اور اس کو نظریے، تجربے اور تخلیق و ایجاد کی سائنسی سرگرمیوں کا یکساں خیال رکھتے ہوئے ایک قومی علمی تحریک بنا دیں۔

بنیادی اور پہلی بات یہ ہے کہ حکومت وقت واضح طور پر سائنسی پالیسی کا اعلان کرے۔ مثال کے طور پر جنوبی کوریا کی طرح ہم بھی قومی طور پر یہ عزم کر سکتے ہیں کہ رواں صدی کے اختتام تک ہم برطانیہ کی ہمسری کرنے لگیں گے۔

پاکستان کے لیے سائنس کی افادیت

میں سائنس اختیار کرنے اور سائنسی علم حاصل کرنے کے بارے میں اتنا جذباتی کیوں ہو رہا ہوں؟ محض اس لیے نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں علم حاصل کرنے کی آرزو ودیعت کر رکھی ہے۔ اس لیے بھی نہیں کہ نئی زمانہ سائنس طاقت ہے اور مادی خوشحالی اور با مقصد دفاع کا سب سے بڑا وسیلہ ہے۔ بلکہ اس لیے بھی کہ عالمی برادری کے، ایک عزت نفس رکھنے والے رکن ملک کی حیثیت سے پاکستان کو اپنی ذمہ داریوں سے کما حقہ عہدہ برا ہونا چاہیے۔ عالمی سائنس کے تحقیقی و تخلیقی ذخائر سے ہم دیرینے مستفید ہو رہے ہیں۔ یہ ہم پر دوسروں کا قرضہ ہے جو ہمیں بے باق کر دینا چاہیے۔ ہمیں اس خاموش توہین کے تازیانوں سے بچنا ہوگا جو علم تخلیق کرنے والوں کی طرف سے ہم پر پڑتے رہتے ہیں۔

ایک یورپی ملک کے ایک نوبل یافتہ طبیعیات داں کی ایک بات ہر وقت میرے دل کو کچوکے دیتی رہتی ہے۔ چند سال پہلے اس نے اچانک مجھ پر ایک سوال لاد دیا:

"سلام! کیا آپ کے خیال میں یہ واقعی ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ان اقوام کی دستگیری کرتے رہیں، ان کو مالی امداد دیتے رہیں، انہیں خوراک فراہم کرتے رہیں، ان کو زندہ رہنے میں ہر وقت مدد دیتے رہیں، جنھوں نے انسانی علمی ذخیرے میں ایک ذرہ کا بھی اضافہ نہیں کیا۔"

اس نے مجھ سے یہ سوال نہ کیا ہوتا، تب بھی میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہتا ہے، جب بھی میں کسی اسپتال میں داخل ہوتا ہوں اور سوچتا رہ جاتا ہوں کہ آج کی زندگی بچانے والی تمام دوائیں دوسروں نے بنائی ہیں اور پاکستان کے سائنس داں کا ان کی ساخت و تشکیل میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اس تناظر میں میں نے بھارت، بنگلہ دیش اور ملائیشیا کے علمائے کرام سے حال ہی میں سوال کیا تھا۔ قرآن مجید کا آٹھواں حصہ۔ تقریباً ۷۵۰ آیات ایسی ہیں جن میں اہل ایمان کو قدرت کا مطالعہ کرنے، غور و فکر کرنے، عقل سے کام لینے اور حکمت و تدبر والی اجتماعی زندگی اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ تو کیا آپ اپنے آٹھ خطبات جمعہ میں سے ایک خطبہ سائنس کے بارے میں دیتے ہیں؟ سب نے مجھے ایک ہی جواب دیا،

"ہم چاہتے تو ہیں لیکن ہم خود سائنس نہیں جانتے تو خطبہ کیا دیں گے۔"

قرآن میں سائنس کے حوالے سے مجھے ایک عیسائی مصنف ہسٹن اسمتھ کی خوب صورت رائے یاد آگئی ہے۔ آپ بھی ملاحظہ کیجیے۔

ملتا ہے:

"ایک ایسے عہد میں جب دنیا پر فوق الفطرت کا رنگ چڑھا ہوا تھا، جب کرامتوں اور معجزوں کو معمولی سے معمولی صوفی سینٹ کا بھی حق سمجھا جاتا تھا، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انسانی کمزوری اور ضعیف الاعتقادی سے فائدہ اُٹھانے سے انکار کر دیا۔ فال، شگون، بشارت، اشارۂ غیبی، کرامات اور معجزوں کے شوقین بت پرستوں کے لیے آپؐ نے یہ کہہ کر معاملے کو بالکل صاف اور سیدھا کر دیا" اللہ نے مجھے معجزے دکھانے کے لیے نہیں بھیجا۔ اس نے مجھے نیکی کی ہدایت اور صداقت کی تبلیغ کے لیے بھیجا ہے۔ سب تعریفیں اسی کو سزاوار ہیں کیا میں آدمی سے زیادہ کچھ ہوں جسے رسول کی حیثیت سے بھیجا گیا ہے"؟ اپنی پوری زندگی میں، شروع سے آخر تک آپؐ نے اپنی ذات کو آگے لانے کی ہر خواہش اور ہر تحریک کی مزاحمت کی۔ آپؐ نے فرمایا "میں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ اللہ کے خزانے میرے ہاتھ میں ہیں، یا یہ کہ میں علمِ غیب رکھتا ہوں یا یہ کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے۔" اگر معجزوں ہی کی طرف دیکھنا ہے تو یہ محمدؐ کی بڑائی نہیں، اللہ کی بڑائی ہے اور اللہ کی بڑائی کو دیکھنے کے لیے آنکھوں کا کھلا رکھنا ضروری ہے۔ آسمان کی پنہائی میں اجرامِ فلکی کا اپنے لگے بندھے ہموار رستوں پہ چپ چاپ چلتے رہنا، کائنات کا حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین حسنِ ترتیب، بارش جو مٹی کی پیاس بجھانے کو برستی ہے، درخت جن کی شاخیں سنہری پھول سے لدی جھکی رہتی ہیں، جہاز جو انسان کے فائدے کی چیزوں کو بوجھ اُٹھائے سمندروں کے سینے پر تیرتے رہتے ہیں۔ کیا یہ سب کسی پتھر کے خدا کی بنائی ہوئی چیزیں ہیں؟ ان چیزوں کے ہوتے ہوئے کسی اور کرامات کی خواہش کرنا پرلے درجے کی حماقت ہے۔ فوق الفطرت اور ضعیف الاعتقادی کے عہد میں محمدؐ نے دنیا کے مسلّمات کا احترام کرنا سکھایا، جس نے مسلمانوں کو عیسائیوں سے بہت پہلے) سائنس کی طرف مائل و بیدار کیا محمدؐ نے صرف ایک معجزے کا دعویٰ کیا اور وہ معجزہ خود قرآن ہے۔"

ہسٹن اسمتھ کی رائے کا اقتباس پیش کرنے کے بعد ایک سوال میں بھی کرتا ہوں:

"کیا وقت نہیں آگیا ہے کہ دینی مدارس کے نصاب میں جدید سائنس کے غیر متنازعہ فیہ حصوں کو شامل کر لیا جائے؟ - مثلاً نیوٹن کے قوانین، ستاروں اور کہکشاؤں کی فلکی طبعیات، قدرت کی بنیادی قوتوں کا علم، جینی کوڈ اور زمین کی ساخت وغیرہ۔"

اب میں اس رام کہانی کو وہیں ختم کرتا ہوں، جہاں سے میں نے شروع کی تھی۔ یہ کہ ہماری قوم اپنی صلاحیت و امکان کے اعتبار سے ایک عظیم قوم ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمیں اپنی قوم کی عظمت کا احساس نہیں ہے۔ اور ہم ایک چھوٹی قوم کے سے چھوٹے انداز میں عمل کرتے ہیں۔

ہمارے لوگ سائنسی علوم میں اعلیٰ درجے کی قدرتی صلاحیت رکھتے ہیں، صرف اس کو ترقی دینے کی ضرورت ہے۔ میں ستارہ آنکھوں والے طوطے کی طرح رٹی رٹائی بات نہیں کہہ رہا۔ میں یہ بات پورے وثوق سے زندگی بھر کے طویل تجربے کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں جو مجھے مختلف اقوام کے سائنس دانوں کی تربیت اور رہنمائی کرنے سے حاصل ہوا ہے۔

اسی طرح اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ٹکنالوجی کے باب میں بھی ہم زبردست صلاحیت کے مالک ہیں۔ جاپان کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ انہوں نے اپنی مہارت کا اطلاق، جو انہیں اپنے فنِ کتابت سے ورثے میں ملی تھی، آج کی ٹکنالوجی پر کیا ہے۔ کیا ایک ایسی قوم جو قرآن مجید کی پوری آیت چاول کے دانے پر لکھ سکتی ہے، جب وہ مائکرو الیکٹرونکس کے میدان میں اُترے گی تو کیا وہ جاپان جیسی ترقی حاصل نہیں کر سکتی؟

جب میں بچّہ تھا تو یہ بات عام سننے میں آتی تھی کہ ہندوستان

سلمان حساب میں کامیابی حاصل نہیں کرسکتے۔ آج صورت حال بدل
ی ہے۔ آج مشرق وسطیٰ کا بنک کاری کا تمام انتظام پاکستانی چلا رہے
ں۔ یہ درست ہے کہ ہمارے پاکستانی بھائی فرانسیسیوں کی طرح انفرادیت
سند ہوتے ہیں اور ہمیشہ سے اپنی ذات کی تشہیر اور بڑائی ان کے
ے مہمیز کا کام دیتی رہی ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ دانا حکومت اپنی
لیسی اس ترکیب سے بنا سکتی ہے کہ اس قدرتی انفرادیت پسندی
کچلنے کے بجائے، اس کی حوصلہ افزائی کرے۔ یاد رہے کہ جب پاکستانی
ملک سے باہر ہوتے ہیں تو انفرادیت پسندی کا لبادہ اُتار پھینکتے
ہیں اور مل جل کر اور ایک دوسرے کے تعاون سے کام کرنے کی
شہرت پاتے ہیں۔

قوم کے کردار میں سائنس اور ٹکنالوجی کی اہمیت و افادیت جتانے کی کیا ضرورت ہے۔ جب کہ سب جانتے ہیں کہ سائنس آدمی میں کیا کیا اوصاف حمیدہ پیدا کرتی ہے۔ تکمیل، تحمل، عمل پیرا افتخار، باریک بینی اور سب سے زیادہ رواداری اور دوسروں کی رائے کا احترام کرنے کی قابلیت۔

اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ کوشش کرنے والوں کی محنت ضایع نہیں کرتا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم ایک دفعہ اپنی نوجوان نسل کو آتشِ شوق کا فتیلہ دکھانے میں کامیاب ہوگئے تو پھر سائنس کا سلسلۂ تخلیق پھر کبھی رُکے گا نہیں۔ جمال عبدالناصر کی طرح میں بھی اپنے نوجوانوں سے یہ کہنا چاہتا ہوں "اپنا سر بلند کرو میرے بھائی، فخر و افتخار سے اور عزتِ نفس سے۔"

"... جن لوگوں نے مردم آزاری بہت کی ہے، لوگوں کو ستایا ہے، ان کے ساتھ ناانصافی کی ہے، ظلم کیا ہے، لوگوں کا حق مارا ہے، غریبوں اور سائلوں اور غرض مندوں کو دھتکارا ہے، بزرگوں کے ساتھ گستاخی کی ہے، محسنوں کو آنکھیں دکھائی ہیں، فریب، ریاکاری، اور حرص و حسد کو شعار بنایا ہے، انہیں موت سے زیادہ ڈر لگتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں یہ ساری خود غرضیاں، دل آزاریاں حرص و فریب ان کو سانپ کی طرح ڈسیں گے، زہر رگ و پے میں سرایت کر جائے گا۔ معلوم ہوگا کہ جسم پھٹا جا رہا ہے، ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر رہا ہے، ان کا نامۂ اعمال جس وقت پیش ہوگا وہ شرم سے پانی پانی ہو جائیں گے۔ وہ چاہتے ہیں کہ انہیں تلافیٔ مافات کا موقع مل جائے۔ وہ اپنی جفاؤں کو مظلوموں سے معاف کرالیں۔ گناہوں سے توبہ کرلیں اور پاک و صاف زندگی گزار لیں اول تو ہماری زندگی کی بناوٹ ایسی ہے کہ موقع ملتا ہی نہیں۔ جو گھڑی ایک بار آکے گئی وہ کبھی لوٹ کر نہیں آتی۔ زندگی کو ایک سفر جانیے تو ایک اسٹیشن جیسے گاڑی چھوڑ چکی ہے، دوڑ کر گاڑی کو نہیں پکڑ سکتا۔ یہی حال مواقع کا ہے۔ ایک بار ایک موقع ہاتھ سے گیا، پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔ چاہے زندگی بھر حسرت میں ہاتھ ملتے رہیے اور اگر کسی کو مہلت مل گئی تو وہ اپنے دیرینہ مشاغل میں لگ جاتا ہے۔ کفارے اور تلافی کا خیال بھی اس کے دامنِ دل کو نہیں چھوتا۔ اسی لیے ایسی توبہ معتبر نہیں ہوگی جو اس وقت کی جائے جب انسان زندگی سے جدا ہو رہا ہے۔ اس توبہ کا وزن ہی کیا جو مجاہدہ اور ضبط کی ترازو میں نہ تولی جا سکے جسے کڑی آزمائش سے گزرنا نہ پڑے۔"

سید حامد

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ج ۷، ش ۱ (جنوری ۸۸ء)

غم اور اس کا علاج

بختیار فاطمی

ہم خواب میں بھی کسی ایسے معاشرے کا تصور نہیں کر سکتے جس میں صرف مسرت کا ہی راج ہو، کیوں کہ جس طرح سفید کا وجود سیاہ سے ہے، خوشی کا وجود غم کی بنیادوں پر ہے۔ اگر غم نہ ہو تو خوشی کا احساس بھی نہیں ہو سکتا، کیوں کہ بلندی کو بلندی اسی وقت کہا جا سکتا ہے جب پستی بھی موجود ہو۔ بہر حال غم کی اس زبردست اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے اسباب پر غور کر کے اسے کم کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ غم کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ جیسے کسی عزیز کی موت، معاشی تکالیف، ترقی میں ناکامی وغیرہ۔ یہ عام اسباب ہیں جو بیشتر لوگوں کو غم پہنچاتے ہیں لیکن ان عام لوگوں سے ہٹ کر ایک قسم ان لوگوں کی ہے جو ہر وقت خود بینی کے پھندوں میں پھنسے رہتے ہیں۔ وہ اپنی ذات کے شکنجوں میں کچھ اس طرح گھر جاتے ہیں کہ کارزارِ حیات میں اپنی انفرادی اور عارضی ناکامی کو پھیلا کر کائنات پر منطبق کر دیتے ہیں اور پھر اس عینک میں سے زندگی کو دیکھتے ہیں جو باوجود اپنی بسیط رنگارنگی کے انہیں ایک سیاہ نقطہ نظر آتی ہے۔ اپنی ذاتی شکست کے باعث زندگی کو کارگاہ شکست قرار دے لیتے ہیں۔ زندگی ان کے لیے وبال جان بن جاتی ہے اور قیدِ حیات سے جلد سے جلد چھٹکارا پانے کے لیے خودکشی کی آرزو کرنے لگتے ہیں۔ کیوں کہ اس کی وجہ اکثر ان کے ساتھیوں کی کامیابی کے مقابلے میں ان کی ناکامی ہوا کرتی ہے وہ بجائے اپنی کمزوری دیکھنے کے اسے مقدر کے اندھے ہاتھوں تعبیر کرنے لگتے ہیں۔ ایسے لوگ انہیں پست کر دینے والے خیالات کے باعث بھی اپنی امیدوں کے ساتھ مر جاتے ہیں اور انہیں یہ کہنے میں لطف آنے لگتا ہے کہ

"اب اپنی لاش کو ہر سو اٹھائے پھرتا ہوں"

ان کے پاس زندگی کسی متحرک چیز کا نام نہیں ہے۔ وہ کائنات میں اپنی ہی ذات کو اہم ترین تصور کرتے ہیں۔ وہ ہمہ وقت اپنے آپ میں غلطاں رہتے ہیں۔

ایسے لوگ زیادہ تر افسانوں اور تخیلات میں ڈوبے رہتے ہیں۔ انہیں اسی میں لطف آتا ہے کہ ایک نہ ایک غم ان کے اوپر سوار رہے اور غم میں انہیں لذت محسوس ہونے لگتی ہے۔ غم کو نہ صرف اثباتی حقیقت سمجھ لیتے ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان کی زندگی مجسمۂ غم بن جاتی ہے۔ وہ چلا اٹھتے ہیں ؎

سوز دل، سوز جگر غم کا نتیجہ ہی تو ہیں!
جب کبھی سوتا ہے دل غم کو جگا لیتا ہوں میں!!

لیکن اس خود شعوری کے پس منظر میں دیکھا جائے تو وہ حالات نظر آتے ہیں جن کی وجہ سے ایسے اشخاص میں احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ شاید ان کا وجود دنیا کے لیے عبرت کا سامان ہے۔ میں ایک دوست سے واقف ہوں جو پڑھے لکھے ہونے کے باوجود اپنی ذات کے کنویں میں محصور رہتا تھا۔ اسے ہر وقت ایسے ہی لوگ نظر آتے تھے جو اس سے کم پڑھے لکھے ہونے کے باوجود اس سے زیادہ حیثیت رکھتے تھے۔ اسے ہمیشہ ایک ہی مناظر نظر آتے تھے جو اس کی آرزوؤں کے خلاف ہوئے تھے۔ اس وجہ سے بہت سی خوبیاں رکھتے ہوئے وہ زندگی بھر ناکام رہا۔

ایسے لوگ عموماً مطالعۂ باطن میں مصروف رہتے ہیں اور انہیں ہار رہنے کی خواہش ہوا کرتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ چیز خلوص دل ے ساتھ ہوتی ہے۔ لیکن یہ عادت کم سے کم انسانی زندگی کے لیے مفید ہیں ہوتی۔

ان اسباب پر غور کرنے کے بعد ہم یہ دیکھیں گے کہ انہیں کس طرح ور کیا جاسکتا ہے۔ سب سے پہلے اس قسم کے اشخاص کو اپنی ذات کے ندھے کنویں سے نکل کر باہر آنا چاہیے تاکہ دنیا میں مختلف اشخاص سے یل ملاپ کرکے بیرونی اثرات کی عدم دلچسپی کو ختم کیا جاسکے اور ساتھ ہی دوسروں کے خیالات سے فیضیاب ہوکر اپنی زندگی کامیاب بنائی جاسکے۔

جانسن نے اپنے مضمون "ON SORROW" میں اس چیز کو ح کیا ہے کہ اگر غم کو ذرا بھی پنپنے کا موقع دیا جائے تو دل و دماغ اعصاب پر چھا جاتا ہے اور اس تاریکی میں دل و دماغ ترقی کی راہ یکھنے سے محروم ہو جاتے ہیں اور انسان پر ایک یاسیت کی کیفیت ا جاتی ہے جس سے وہ بڑی مشکل سے ہی نکل سکتا ہے۔ اس لیے شیہ رجائیت ہی کو اپنا رہنما سمجھتے رہنا ضروری ہے۔ تاکہ غم زہر نہ پھیلا سکے۔ جانسن کے نزدیک غم سے نجات پانے کا سب سے اچھا ریقہ مصروفیت ہے کیوں کہ انسان اگر اپنے کو کسی نہ کسی کام میں مصروف کھے گا تو غم اس پر کم اثر کرے گا۔ چنانچہ عموماً دیکھا گیا ہے کہ فوجیوں ہ غم کا احساس بہت کم ہوتا ہے۔ ان کے سامنے ان کے ساتھی دم ڑ جاتے ہیں انہیں ان کے ماتم کی فرصت نہیں ہوتی۔ اسی طرح اگر بالات کو بھی کسی کام میں مشغول رکھا جائے تو غم بہت کم بار پا سکے گا ر اس دوران میں وقت اس کی تلافی کر چکا ہوگا۔ کیوں کہ غم کرنا زندگی ے ٹھہراؤ کی دلیل ہے جہاں انسان اپنے غم کے اسباب اور اس کے مذاکرات پر سوچنے لگتا ہے۔ اس میں بیکار وقت ضائع کرکے اپنی رقی میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ اس لیے حرکت اور مشغولیت سے ہی انسان اس پر قابو پا سکتا ہے۔

گولڈ اسمتھ کہتا ہے کہ اس میں شک نہیں کہ انسان کو پنا ماضی یاد کرکے اور موجودہ حالات میں بہت سی وہ چیزیں جن کی تمنا لیے وہ پھرتا ہے اور مستقبل کی تاریکی دیکھ کر وہ ضرور کڑھتا ہے۔ لیکن اسے ایسے وقت میں یہ ضرور خیال کرنا چاہیے کہ یہ تو لازمی امر ہے کہ زندگی میں نشیب و فراز ضرور رہیں گے اور اسے اپنے غمگین لمحوں میں اپنے آپ کو ثابت قدم رکھنا چاہیے۔ اگر ان موقعوں پر اپنی بے بسی اپنے اوپر کچھ اس طرح ظاہر کی جائے کہ دل ہل جائے تو انسان ضرور بھٹک جائے گا اور اس طرح غم کا مقابلہ کرنے میں اسے کچھ ضرور زخم آئیں گے۔ اگر وہ ان سے نپٹ سکے تو بہتر ورنہ سب سے آسان ذریعہ ان حالات سے نکل جانا ہے۔ اگر دنیا کو ایسا تھیٹر تصور کر لیا جائے جس پر صرف طربیہ ہی پیش کیا جاسکتا ہے اور غم کو معکوس خوشی قرار دے لیا جائے، تو ایک حد تک انسان کی زندگی سہل ہو سکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس قدر زبردست صحت والے چند ہی انسان ہو سکتے ہیں۔ اس لیے غم کو دور کرنے کا عام طریقہ یہی ہے کہ مصروفیت و مشغولیت میں وقت گزارا جائے اور خود احساسی کی باتوں سے نکل کر احساس کمتری کو ختم کیا جائے۔ دوسروں سے میل جول بڑھا کر خود اعتمادی پیدا کی جائے اور ظاہر ہے کہ خود اعتمادی پیدا ہو جانے کے بعد ہم وقت کے دھارے کو موڑ سکتے ہیں اور وہ کارنامے انجام دے سکتے ہیں جو ہمارے لیے موجودہ صورت میں ناممکن نظر آتے ہیں۔

"اب نئے دور نے جنم لیا ہے۔ نئے حالات کے ساتھ
نئے خیالات امڈے چلے آرہے ہیں اور اس کے ساتھ
نئی نئی مصیبتیں اور آفتیں بھی ہمارے سر پر کھڑی ہیں
ان مصیبتوں کے ٹالنے اور ان آفتوں کا مقابلہ کرنے
کے لیے ہمیں طرح طرح کی قربانیاں اور طرح طرح کی
جدوجہد کی ضرورت ہے اور اس جدوجہد کے لیے
نئے آلات اور حکمتوں کی ضرورت ہے"

مولانا عبدالحق

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ج ۷ ۔ نمبر ۱ ۔ (جنوری ۱۹۸۸ء)

جوابِ دوست

جہانِ نو

نسیم انصاری

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
می نہ دانی اول آں بنیاد را ویراں کنند

اردو انسائیکلوپیڈیا کے لیے سرجری پہ مضمون لکھنے کے سلسلے میں سرجری کی تاریخ پہ بھی نظر ڈالنا پڑی۔ جو کچھ نظر سے گزرا، اس کا مجھ پہ بہت اثر ہوا۔ اوّل تو یہ بات دل میں بیٹھ گئی کہ اگر فلسفہ اور سائنس کو عرب اور دوسرے علماء نہ اپنا لیتے تو ساری دنیا ان میدانوں میں بہت پیچھے رہ جاتی ۔ ان لوگوں نے موجودہ سائنٹفک طرزِ فکر پہ خاص طور سے زور دیا۔ مثلاً ابنِ سینا کا کہنا ہے کہ طب کی بنیاد سائنس پہ ہے اور اس لیے طب پڑھنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ سائنس کے بنیادی اصول تسلیم کر کے چلے۔ ان اصولوں پہ سائنس کی کتابوں میں تو بحث ہو سکتی ہے لیکن طب کی کتابوں میں نہیں۔ چنانچہ اپنی عظیم الشان تصنیف القانون فی الطب کے پہلے حصّے میں اس زمانے کی سائنس کے بنیادی اصول بتائے ہیں اور پھر جسمِ انسانی کی ساخت اور افعال سمجھائے ہیں۔ یعنی اناٹمی اور فزیالوجی۔ اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ بیماریاں کیوں ہوتی ہیں۔ اور ان کے ہونے سے بدن میں کیا تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ یعنی جنرل پیتھالوجی، پھر امراض کا بیان ہے ۔ اس میں پہلے تو مرض کی وجہ، پھر بدن میں ہونے والی تبدیلیاں یعنی پیتھالوجی اور اس کے بعد مرض کی علامات اور آخر میں اس کے علاج کا بیان ہے۔ آخری حصّے میں اس زمانے میں رائج دواؤں کا ذکر بڑی تفصیل سے ہے۔ آج کل بھی میڈیکل کالجوں میں تعلیم تقریبًا انھی بنیادوں پر ہوتی ہے۔ اگرچہ آج کل کی سائنس اور ابنِ سینا کے زمانے کی سائنس میں زمین و آسمان کا فرق ہے، جیسے ہوائی جہاز اور رتھ میں ۔

ابنِ سینا بڑے رنگین مزاج تھے۔ دن کے ایک حصّے میں وہ وزارت کے کاموں میں مشغول رہتے۔ اس کے بعد مطب کرتے اور پڑھاتے پھر تصنیف تالیف کا کام ہوتا اور پھر رات کی محفل میں اگر کوئی جاتا تو دیکھتا کہ

ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے ۔

ابنِ سینا کا زمانہ (دسویں اور گیارہویں صدی عیسوی) بڑا مردم خیز زمانہ تھا۔ خود ان کے دوستوں میں البیرونی اور عمر خیام کا شمار کیا جاتا ہے۔ ان لوگوں کے تقریبًا ہم عصر لیکن ہزاروں میل دور اسپین میں ابو القاسم زہراوی سرجری کی تعلیم دے رہے تھے۔ سرجری کے ذریعے مریضوں کا علاج کر رہے تھے اور سرجری پہ کتابیں لکھ رہے تھے۔ ان کی کتاب التصریف کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا کی سب سے پہلی بالتصویر سرجری کی کتاب ہے۔ میں نے اس کتاب کا اردو اور انگریزی ترجمہ دیکھا ہے۔ اردو ترجمہ تو میرے ایک ننہالی عزیز حکیم نثار احمد صاحب نے کیا تھا جن کا ابھی حال ہی میں کراچی میں انتقال ہوا ہے اور انگریزی ترجمہ ویلکم فاؤنڈیشن نے لندن سے شایع کیا ہے۔ کتاب میں بار بار ایسے واقعات بیان کیے ہیں جن میں اپنی کم علمی اور ناکامی کا ذکر ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ کس طرح عملی سرجری سے علمی باتیں نکلی ہیں۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ کسی مریض کے گلے میں ایسا زخم آیا جس سے کہ ہوا نکل رہی تھی۔ میں سمجھا کہ وہ ہلاک ہو جائے گا۔ لیکن میں نے زخم صاف کر کے اس کا علاج عام زخموں کی طرح کیا۔ مریض کچھ دنوں کے بعد اچھا ہو گیا۔ اس سے میں نے نتیجہ نکالا کہ اگر حلق کے اوپری حصّے میں کوئی رکاوٹ مرض کی وجہ سے یا کسی چیز کے پھنس جانے سے ہو تو زندگی بچانے کا طریقہ یہ ہے کہ نرخرے میں ایک سوراخ کر دیا جائے۔ اس کے بعد اس سوراخ کرنے کے آپریشن کا ذکر ہے۔

ربوں کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے علم کو جادو ٹونوں اور
ے توہمات سے علیحدہ رکھ کر ان یونانی روایات کو مستحکم کیا جن کی بنیاد ایک
سال قبل رکھی جا چکی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کام میں عربوں کو
ے نئے مذہب اسلام سے بہت مدد ملی کہ اس مذہب میں جادو ٹونوں
ا مقام نہیں ہے اور انہیں جادوگروں اور کاہنوں سے دور رہنے کی
ن کی گئی ہے۔

جس زمانے میں میں سرجری کی تاریخ پڑھنے میں مصروف تھا اس زمانے
یک بات اور ہوئی جس نے زندگی کا لطف دوبالا کر دیا۔ اسپتال کے انتظام
رصت ملنے کے بعد میرے پاس بہت وقت بچ گیا۔ سوچا کہ پچھلے دس گیارہ
ں میں جو لیکچر اپنے طالب علموں کو دیے ہیں، انہیں اکٹھا کر کے کتابی شکل دی
ے۔ بس ایک بات دل میں کھٹکتی تھی کہ مجھے انگلستان سے واپس ہوئے اتنا
ہ گزر گیا تھا کہ اس عرصے میں وہاں سرجری میں بہت سی نئی باتیں داخل
لی ہوں گی جن کا ذکر اس کتاب میں ضروری ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے
ب استاد مسٹر ایچ۔ ٹی جان کو اپنے ارادے سے مطلع کیا۔ جب میں انگلستان
ں زیر تربیت تھا تو ۱۹۵۸ء سے ۱۹۵۹ء تک وہ رائل ڈیون اینڈ
ز لیسٹر ہاسپٹل میں سینئر سرجیکل رجسٹرار تھے اور میں ریذیڈنٹ سرجیکل
فیسر۔ اب وہ انگلستان کے مشہور باتھ ہاسپٹل میں کام کرتے تھے۔ انہوں
ے بخوشی میری درخواست قبول کر لی۔ یہ طے ہوا کہ میں انہیں اپنا تیار کردہ مسودہ
بھیجوں گا اور وہ اس پر اپنی رائے کا اظہار کر کے مجھے بھیج دیں گے۔
رح کچھ مضامین وہ خود لکھ کر مجھے بھیجیں گے اور میں انہیں اپنی رائے سے مطلع
روں گا۔ یوں ہم دونوں مل کر سرجری کی ایک کتاب تیار کریں گے۔

یہ کام تقریباً پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا اور ہم لوگ اس فکر میں تھے کہ
وئی اچھا ناشر مل جائے تو طباعت شروع کر دی جائے کہ ناگہاں ۱۹۷۹ء
یں مسٹر جان کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میں کیا بتاؤں
ہ کیسی مایوسی ہوئی۔ سال بھر تک تو یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ اتفاق
سے اسی زمانے میں یعنی ۱۹۸۰ء میں مجھے بن غازی (لیبیا) کے میڈیکل کالج
میں بحیثیت وزیٹنگ پروفیسر کے بلایا گیا۔ شروع میں پندرہ دن کا پروگرام
تھا لیکن وہاں پہنچ کر جب پڑھانا شروع کیا تو طلباء کے اصرار پر کچھ دن
اور روک لیا گیا۔ واپسی کے وقت وہاں کے صدر شعبہ پروفیسر عبد الرزاق زوادی

نے درخواست کی کہ امتحان لینے کے لیے بھی تین مہینے بعد آجاؤں۔ میں نے ان کا
شکریہ ادا کیا اور یہ عرض کیا کہ اگر یونیورسٹی سے چھٹی ملی تو ضرور حاضر
ہوں گا۔

مجھے یونیورسٹی سے چھٹی مل گئی اور میں امتحان لینے کے لیے جنوری
۱۹۸۱ء میں بن غازی گیا۔ وہاں پہنچ کر امتحان کا جو نقشہ دیکھا تو آنکھیں کھلی
رہ گئیں۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس (جسے وہ لوگ ایم بی: بی سی۔ ایچ کہتے ہیں)
کا امتحان لینے کے لیے انگلستان کے مشہور کالجوں اور اسپتالوں کے
پروفیسر، یونان کے شہرہ آفاق سرجن اور یوگو سلاویہ کے سرجری کے پروفیسران مدعو
تھے۔ ہندوستان سے ہم دو آدمی تھے، ایک آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ
کے ڈین پروفیسر پرکاش چندر اور دوسرے میں۔ اور امتحان
اسی انداز سے ہوا جس طرح ہم لوگوں کا امتحان رائل کالج آف
سرجنس میں ہوا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ لندن میں سرجری کی مہارت
کا امتحان تھا اور بن غازی میں اس سے واقفیت کا۔ مجھے ہندوستان
کی بہت سی یونیورسٹیوں میں امتحان لینے کا تجربہ ہے جیسے کلکتہ، بمبئی،
سری نگر، چنڈی گڑھ وغیرہ لیکن کہیں اس معیار کا امتحان نہیں دیکھا۔

اس کے بعد تو میرا رابطہ نہ صرف بن غازی کی قاریونس یونیورسٹی
سے بلکہ طرابلس کی الفتح یونیورسٹی سے بھی قایم ہو گیا اور مجھے سال میں کئی
دفعہ ان یونیورسٹیوں میں پڑھانے اور امتحان لینے کے لیے جانا پڑتا ہے
وہاں میری ملاقات مینچسٹر یونیورسٹی کے شعبۂ سرجری کے صدر اور
میڈیکل فیکلٹی کے ڈین پروفیسر ای این گیلسپی رائل کالج آف سرجنس
کے امتحان کے بورڈ کے چیرمین ایڈرین ہنری اور لندن کے مشہور
ہڈیوں کے سرجن مسٹر چن سے ہوئی۔ میں نے ان سے اپنی کتاب کا تذکرہ
کیا۔ ان لوگوں کی رائے ہوئی کہ اسے ضرور شایع کیا جائے اور اپنی طرف
سے ہر مدد کا وعدہ کیا۔ یہ باتیں پروفیسر عبد الرزاق زوادی کے علم
میں ہو رہی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر آپ سب لوگ مل کر کتاب تیار کریں
تو بن غازی یونیورسٹی اس کی طباعت کی ذمہ داری لینے کے لیے تیار ہے
اس مضمون کا ایک تحریری معاہدہ بھی ہوا جس پر ہم سب نے اور قاریونس
یونیورسٹی کے شعبۂ اشاعت کے سربراہ مسٹر شریدی کے دستخط ہوئے۔
چلیے اس طرح ایک نیا منصوبہ بن گیا کتاب کی تیاریاں شروع ہو گئیں

فیصلہ ہوا کہ جو مواد میں نے اور جان نے تیار کیا ہے، اسی کو بنیاد مان کر کام کو آگے بڑھایا جائے۔ یہ فیصلہ ۱۹۸۳ء میں ہوا اور مجھے اس سلسلے میں کئی بار لندن اور مینچسٹر جانا پڑا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا کام کی وسعت میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہڈیوں کی سرجری کے بارے میں مسٹر لے ڈریو ہنری اور مسٹر جین، سینہ کی سرجری کے لیے ایک مصری نژاد سرجن مسٹر سلامت جو انگلستان میں مقیم ہیں، سر اور دماغ کی سرجری کے لیے آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ کے پروفیسر بی۔ این ٹنڈن اور پروفیسر بنرجی، بچوں کی سرجری کے لیے دہلی کے پروفیسر اپادھیا اور گردوں کی سرجری کے لیے مینچسٹر کے مسٹر جانسن نے حامی بھر لی۔

یہ ایک عظیم الشان کام ہے جو تین براعظموں کے سرجن مل کر کر رہے ہیں۔ ابھی تک ایسی کوئی کتاب شایع نہیں ہوئی ہے لیکن افسوس صد افسوس کہ ابھی چند مہینے ہوئے کہ پروفیسر عبدالرازق زوادی کا انتقال ہو گیا اب کتاب کی اشاعت پھر معرض التوا میں پڑ گئی۔ دیکھیے کیا صورت نکلتی ہے۔

لیبیا کی یونیورسٹیوں سے تعلق کے بعد مجھے عربوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ایک عام احساس یہ پایا کہ پچھلے چار پانچ سو برسوں کی پس ماندگی کو جلد از جلد دور کرنا چاہیے۔ ہر جگہ تعلیم پر زور ہے۔ نئی نئی یونیورسٹیاں کھل رہی ہیں اور ملک کی آمدنی کا ایک بڑا حصّہ تعلیم پر خرچ کیا جا رہا ہے۔ ایک حوصلہ افزا بات یہ دیکھی کہ عورتوں کی تعلیم پر خاص توجہ ہے۔ تین چار برس پہلے بن غازی کی میڈیکل فیکلٹی کی ڈین یورپ کی تعلیم یافتہ ایک لیبین خاتون ڈاکٹر مبروکہ تھیں۔

سب سے زیادہ مسرت مجھے مکہ معظمہ جا کر ہوئی کہ جو سڑک شہر کے حدود سے خانۂ کعبہ تک جاتی ہے، اس کا نام شارع ابن خلدون رکھا گیا ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ جب سعودی عرب کے حکمراں ابن خلدون کو یاد کرنے لگیں تو واقعی عربوں کے دن پھر جائیں گے۔

تھوڑے دنوں کے بعد (شاید ۱۹۸۳ء میں) طرابلس میں ایک بین الاقوامی کانفرنس بچوں کی طب کے متعلق ہوئی۔ زینت اور مجھے دونوں کو بلایا گیا۔ زینت نے مصروفیت کی وجہ سے شرکت سے معذرت کر لی لیکن ایک مضمون بھیج دیا۔ جب مجھ سے اصرار کیا تو میں نے پوچھا کہ آخر ایک سرجن کی اس کانفرنس میں کیا ضرورت ہے۔ ارباب حلّ و عقد نے کہا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں طب پر عربی زبان میں جو مخطوطات ہیں، ان کے متعلق آپ ایک مضمون پڑھ دیجیے۔ میں راضی ہو گیا۔ علی گڑھ واپس آ کر میں نے یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں موجود مخطوطات کی ایک فہرست مرتب کی۔ اس کے علاوہ حکیم ظل الرحمان کے کتب خانے میں موجود جو مخطوطات تھے، انھیں بھی دیکھا۔ اب جو لکھنے والوں کے ناموں پر نظر ڈالی تو سوائے چند کے میں کسی کے نام سے واقف نہ تھا۔ انسائیکلوپیڈیا بلکہ انسائیکلوپیڈیائیں دیکھیں ہسٹری آف سائنس اور ہسٹری آف میڈیسن کی کتابیں بھی دیکھیں، تو یہ انکشاف ہوا کہ جن لکھنے والوں کے مخطوطات ہیں ان میں سے اکثر اپنے فن میں عالم کا درجہ رکھتے ہیں۔ آٹھویں صدی سے سولہویں صدی عیسوی تک کوئی صدی ایسی نہیں گزری جس میں کم سے کم دو مسلمان عالم ایسے نہ ہوں جنھوں نے قابل ذکر کام یادگار نہ چھوڑا ہو۔ میں نے اس فہرست کے ساتھ عالموں کے مختصر حالات اپنے مضمون میں شامل کر لیے۔

کانفرنس میں جب میں مضمون پڑھ چکا تو میں نے عرب ماہرین فن سے پوچھا کہ سولہویں صدی کے بعد سے آپ لوگ کیوں خاموش ہو گئے۔ میں نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں کہ آپ لوگ اس کی کیا وجہ سمجھتے ہیں لیکن میرے خیال میں تو اس کی ذمہ داری بڑی حد تک غزالی پر ہے کہ انھوں نے یہ تعلیم دی کہ اگر سائنس اور قرآن میں کوئی اختلاف ہو تو قرآن کو صحیح مانا جائے اور سائنس کو غلط۔ بظاہر تو یہ بات عام مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے بے ضرر معلوم ہوتی ہے لیکن ذرا غور تو کیجیے کہ کیا مطلب نکلتا ہے اس سے۔ گو قرآن بھی سائنس کی ایک کتاب ہے۔ لیکن یہ مفروضہ صحیح نہیں ہے۔ سائنس کے نظریات تو روز بدلتے رہتے ہیں تو کیا قرآن کے معنیٰ بھی روز بدلے جائیں گے۔ سائنس کا ہر نظریہ عارضی طور سے مانا جاتا ہے ہمیشہ اس کی گنجائش رہتی ہے کہ نئی تحقیق کی روشنی میں اس کے بجائے کوئی دوسرا نظریہ بن جائے لیکن قرآن میں جو لکھا ہے وہ دائمی ہے اور کبھی نہیں بدل سکتا۔ اس لیے قرآن کو سائنس کی کتاب نہیں مانا جا سکتا۔ اس میں تو ایک اچھی زندگی بسر کرنے کا راستہ بتایا گیا ہے اور الجبرا، جیومیٹری اور علم الھیئت کے پیچیدہ مسائل سے کوئی بحث نہیں کی گئی ہے۔ زبان اس کی عربی ہے اور وہ استعارے استعمال کیے گئے ہیں جو اس زمانے کے لوگ سمجھ سکتے تھے۔ اگر سات آسمانوں

کے بجائے الیکٹرون اور نیوٹران کا ذکر ہوتا تو اس زمانے میں اور کے صدیوں بعد تک کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ افسوس کہ ہمارے علماء سئلہ کے اس رخ پر غور نہیں کیا اور وہ غزالی کی باتوں میں آگئے۔ ہوا کہ لوگوں کو ڈر لگنے لگا کہ کہیں سائنس پڑھکر ہمارے عقاید خراب جائیں۔

یہ بات مغربی اقوام کے تسلط کے بعد تو اور بھی دلوں میں بیٹھ گئی کہ ان نے ملک پر تو قبضہ کر ہی لیا ہے اور اب دین پر بھی نظر ہے۔ چنانچہ سائنس اور دوری شروع ہو گئی۔

ایک اور خراب اثر یہ پڑا کہ لوگوں میں ایک طرح کی ذہنی قناعت ا ہو گئی کہ ہماری تعلیم کے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے اور اس کتاب ہماری تمام علمی ضرورتیں پوری ہو جائیں گی اور اب ہمیں کسی ذہنی مشقت وئی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اس کا تماشا خود اپنے گھر میں دیکھا ہے چار سو برسوں کے حالات میں نے پڑھے ہیں۔ ان بارہ تیرہ پشتوں میں ت سے ذہین لوگ پیدا ہوئے اور علم و فن میں اپنا نام پیدا کیا لیکن یں سے کسی نے سائنس کی طرف توجہ نہیں کی۔ جب یورپ میں نیوٹن، گلیلو پرنیکس، مارکس، فرائڈ، ڈارون اور آئن اسٹائن اپنے نظریات علمی دنیا میں انقلابات برپا کر رہے تھے تو میرے وہ بزرگ بھی جنہیں قولات سے دلچسپی تھی، محض فلسفہ، علم کلام اور پرانے زمانے کی منطق سے اپنا دل بہلاتے رہے۔ یہ خیال رہے کہ ان بزرگوں کا پڑھنے لکھنے علاوہ اور کوئی مشغلہ نہیں تھا اور سب کے سب غزالی کے بڑے مداح ے بلکہ انہیں تو ادب سے امام غزالی کہا جاتا تھا۔

میرا اس طرح غزالی پر اعتراض کرنا تھا کہ جلسے میں جیسے کوئی طوفان گیا۔ شام کے ایک فاضل نے فرمایا کہ آپ کی بات کا جواب تو آپ سے پہلے لنے والے جرمن مقرر دے چکے ہیں۔

جرمن مقرر نے یہ کہا تھا کہ اگر اسلام کی روشنی نہ ہوتی تو یورپ لے بہت دنوں تک جہالت کی تاریکیوں میں رہ جاتے۔ اسلام نے وں کو توہمات سے آزاد کر کے عقل کے راستے پر ڈالا۔

میں نے جواب دیا کہ میرا اعتراض غزالی پر تھا، اسلام پر نہیں۔ ن بہت دیر تک بحث ہوتی رہی۔ بہت سے فضلاء نے میری رائے سے اتفاق کیا۔

کئی برس ہوئے میں نے علی گڑھ میں ایک فلسطینی لڑکے کا آپریشن کیا تھا۔ آپریشن کے بعد ایسی پیچیدگی پیدا ہوئی کہ اس کی جان پر بن گئی علاج معالجے کے بعد وہ ٹھیک ہو گیا۔ شکریہ ادا کرنے کے لیے دہلی میں مقیم فلسطینی وفد کے سربراہ میرے پاس آئے۔ میں نے تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا اور گفتگو کے دوران اپنے اس یقین کا اظہار کیا کہ فتح آخر میں فلسطینیوں کی ہو گی۔ کہنے لگے کہ بڑی سخت لڑائی ہے۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ بھی تو تعداد میں دشمنوں سے کئی گنا ہیں۔ کہنے لگے کہ آپ کا مطلب اسرائیل سے ہے۔ میں نے کہا جی ہاں! فرمایا کہ اسرائیل کا معاملہ تو بالکل عارضی نوعیت کا ہے۔ ہماری اصل لڑائی تو غزالی سے ہے، جن کی وجہ سے ہم آج اتنی مشکلوں میں گرفتار ہیں۔ مجھے یہ سن کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ خوشی اس بات کی کہ اور بھی بہت سے لوگ میری طرح اسی نتیجے پر پہنچے ہیں۔

غزالی کے متعلق مجھے ابن رشد کی رائے سے اتفاق ہے کہ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اس سے ان کا مقصد اپنے مخالف فلسفیوں پر اپنی علمیت جتانا تھا کہ خود فلسفہ کے اصولوں کی مدد سے ان کی باتوں کو غلط ثابت کیا جا سکتا ہے۔

مجھے سب سے زیادہ مایوسی احیاء العلوم پڑھ کر ہوئی۔ بظاہر تو وہ اخلاقیات کی کتاب معلوم ہوتی ہے لیکن پڑھنے کے بعد یہ تاثر ہوتا ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق اتنے تفصیل سے احکام شریعت موجود ہیں کہ بس ایک تنگ راستہ پر ہی بسر ہو سکتی ہے اور پھر ایسی ایسی حدیثیں بیان کی گئی ہیں کہ جنہیں پڑھ کر تعجب ہوتا ہے۔ مجھ سے میرے بزرگ مولانا جمال میاں نے فرمایا کہ بہت سے علماء کا خیال ہے کہ کئی ضعیف حدیثیں بھی احیاء العلوم میں شامل کر لی گئی ہیں لیکن انہوں نے مجھ سے یہ بھی فرمایا تھا کہ غزالی کے متعلق رائے دینے میں محتاط رہیے گا۔ کیوں کہ اول تو آپ نے اصل تصنیفات کے محض ترجمے پڑھے ہیں اور پھر آپ فلسفے کے آدمی بھی تو نہیں ہیں۔

یہ بھی محض اتفاق تھا کہ غزالی ایسے زمانے میں آئے جب مسلمان فلسفی اور سائنس داں اپنے عروج پر تھے۔ ابن سینا اور البیرونی تو شاید ایک پشت پہلے کے لوگ تھے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد یعنی

موجودہ دور میں علی گڑھ تحریک کی معنویت
تعلیم کے میدان میں

محمد یٰسین

علی گڑھ تحریک انیسویں صدی ہندوستان کی تاریخ میں محض ایک سنگِ ا ہی نہیں بلکہ اس نشاۃ الثانیہ کا نقطۂ عروج ہے جس کی ابتدا بنگال میں ریزی سلطنت کے قیام کے بعد ہو چکی تھی اور جس کے ارتعاشات برصغیر میں طرف محسوس کیے جانے لگے تھے۔ سرسید نے مغلیہ حکومت کے زوال ر غدر کی تباہ کاریوں کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کو احساس کمتری، معاشی حالی اور تعلیمی و اخلاقی پستی سے نکالنے کے لیے سرزمین علی گڑھ سے ہ جامع تحریک شروع کی جس کی تکمیل مختلف مرحلوں میں گزشتہ سو برسوں ں ہوتی رہی ہے۔ سرسید کے بعد ان کے رفقائے کرام، وقار الملک، سن الملک اور دیگر اکابرین نے بہت حد تک ان کے مشن کو پایۂ تکمیل لک پہنچانے کی کوشش کی اور یونیورسٹی کے قیام کے بعد سر راس مسعود، سر ضیاء الدین اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے نئے جوش اور ولولے کے ساتھ علی گڑھ تحریک کی روشنی میں بانی ادارہ کے کام کو آگے بڑھایا۔ یہ محض اتفاق نہیں بلکہ تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی تقدیر بہت حد تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے منسلک رہی ہے اور آئندہ بھی یہ ادارہ ہماری آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز رہے گا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے بالکل سچ کہا ہے کہ:

> "علی گڑھ جس طرح کام کرے گا، علی گڑھ جس اسلوب پہ سوچے گا، اس سے متعین ہوگا ہندوستان میں مسلمانوں کا مقام۔ ہندوستان علی گڑھ کے ساتھ جو سلوک کرے گا، اس پر، ہاں بڑی حد تک اس پر منحصر ہوگی وہ شکل جو ہماری قومی زندگی مستقبل میں اختیار کرے گی۔"

علی گڑھ تحریک کے محرکات پر غور کرنے پر ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ قدرت نے سرسید کو ایک عظیم قومی خدمت کے لیے پیدا کیا تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی جب انہوں نے اپنے ماحول کا جائزہ لیا تو انہیں مغلیہ خاندان کا چراغ ٹمٹماتا نظر آیا۔ پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد سرسیدؒ کو بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی کا اتنا رنج نہ تھا جتنا انہیں مسلمانوں کی سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی زوال کا صدمہ تھا۔ انہوں نے "اسباب بغاوتِ ہند" لکھ کر ایک حد تک انگریزوں کی بدگمانی ختم کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے ذہن میں قومی اصلاح کے لیے ایک تعمیری منصوبہ کا خاکہ بھی ابھر رہا تھا جس نے انہیں فرار کی راہ اختیار کرنے سے باز رکھا اور بقیہ زندگی گوشۂ عافیت میں نہ بیٹھنے دیا۔ سرسیدؒ نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مسلمان قوم میں اخلاقی، علمی، عسکری، انتظامی کسی طرح کی ایسی صلاحیت باقی نہیں رہی تھی جس کے سہارے وہ ترقی کی دوڑ میں اپنے ہم وطنوں کا مقابلہ کر سکیں لیکن ان کے دل میں امید کی شمع روشن تھی۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات کے بعد انگریزی حکومت ایک اٹل حقیقت بن چکی تھی۔ لہٰذا سرسید نے اپنی حکمت عملی سے مسلمانوں کے اندر احساس کمتری کو ختم کر کے وہ اسپرٹ پیدا کرنے کی کوشش کی جس کے ذریعے انہیں ہر کھوئی چیز واپس مل جائے اور وہ بھی عزت و وقار کی زندگی بسر کر سکیں۔ اس عظیم مقصد کے حصول کا واحد ذریعہ تعلیم تھا۔ سرسید کا نظام تعلیم اس زمانے کے معیار سے جدید، بامقصد، جامع اور وقیع کہا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ انہوں نے نہ صرف علم کے قدیم تصور اور تعلیم کے پرانے نظام کو بدلنے کی تلقین کی۔ بلکہ ان کی خواہش تھی کہ جدید تعلیم کے ذریعے مسلمانوں میں اپنے حقوق حاصل کرنے کی قدرت ہو جائے۔

راقم الحروف کے نزدیک علی گڑھ تحریک کی اہم خصوصیات ہیں — پرخلوص فعالیت، مصلحت آمیز مفاہمت، صحت مند مقابلہ کا جذبہ، سائنسی اسپرٹ کا احیاء، اور جائز حقوق کے لیے پرامن جدوجہد۔ ظاہر

ہے سرسید جمود، مجہولیت اور فراریت میں قومی تباہی کا منظر دیکھتے تھے وہ قوم کو قدامت پرستی کے اندھیرے سے نکال کر عہد نو کے تیز اجالے سے آنکھیں ملانے کی تلقین کر رہے تھے اور ملک کے عظیم تر مفادات کی خاطر تصادم یا تشدد کے بجائے دوسرے فرقوں کے ساتھ اتحاد بھی برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ سرسید کا نظریہ تعلیم کئی اعتبار سے علی گڑھ تحریک کا نقطۂ آغاز کہا جاسکتا ہے۔ اس کی بنیاد حسب ذیل امور پر قائم تھی ۔

۱۔ جدید تعلیم کی اشاعت اور فروغ۔
۲۔ انگریزی تعلیم کے ساتھ صنعت و دستکاری کے علوم کی ترویج۔
۳۔ اسلامی تہذیب و ثقافت کا تحفظ۔
۴۔ سائنسی اسپرٹ کا احیاء۔
۵۔ ذہنی رواداری اور دوسری ترقی یافتہ قوموں کے علوم سے استفادہ۔
۶۔ مردہ روایات اور فرسودہ رسومات سے اجتناب اور توہمات و ضعیف الاعتقادی کے بجائے عقلیت کی تلقین۔

علی گڑھ تحریک کی ایک خاصیت یہ بھی تھی کہ علمی میدان میں انقلابی اقدامات کے بجائے اعتدال کو ترجیح دی جائے "مردہ ماضی" پر ماتم کرنے کے بجائے "زندہ ماضی" پر فخر، حال کے معروضی جائزے کے ساتھ مستقبل کے لیے واضح علمی و تعمیری منصوبہ ہی سرسید کی تحریک کا جزء لاینفک ہے۔ اس تحریک کے ڈانڈے قومی سطح پر اگر ایک طرف راجہ رام موہن رائے کی تحریک سے ملتے ہیں تو دوسری طرف اس کا رابطہ مہاتما گاندھی کی قومی تحریک سے نظر آتا ہے۔ دراصل ہندوستان میں تعلیمی اصلاح کی ان تحریکوں میں بہت سی قدریں مشترک ہیں۔

علی گڑھ تحریک اور سرسید کے خوابوں کی حسین ترین تعبیر مسلم یونیورسٹی ہے جس نے برصغیر کے مسلمانوں کو وہ سب کچھ دیا جس کی بانیٔ ادارہ نے پیشین گوئی کی تھی۔ تقریباً نصف صدی کی مسلسل جدوجہد کے بعد تعلیمی اعتبار سے مسلمان بھی ہندوستان کے دوسرے ترقی یافتہ فرقوں کے شانہ بشانہ چلنے لگے تھے کہ یکایک آزادیٔ ہند کے تاریخی فیصلے نے انہیں پھر وہیں لا کھڑا کیا جہاں وہ نوّے سال پہلے تھے۔ مسلم اکثریت کے صوبے مملکت پاکستان میں شامل کر دیے گئے اور مسلمان علماء، مفکرین، اساتذہ، افسران اور فوجی عملہ ہجرت کر کے ہمسایہ ملک کی سرحدوں میں داخل ہو گئے۔ مسلما آزادی سے پہلے بھی اقلیت میں تھے لیکن تقسیم ہند کے بعد "بدنام ا ہو کر رہ گئے۔ یہی نہیں بلکہ ۱۹۴۷ء کے قتل وخون اور ہنگامہ و فسا بعد وہ کہیں کہیں ایسے اجڑے کہ ان کی بستیاں بستے بستے بھی ویران آزادی کے چالیس سال بعد یعنی بیسویں صدی کی آخری دہائیوں تک پہنچ بھی ہمارے سامنے کئی سوالیہ نشان ہیں۔ ہم سب سے بڑی اقلیت ہو کے باوجود عملاً دوم درجے کے شہری ہیں۔ دستور ہند نے ہماری جان مال، عزت و ناموس اور زبان و کلچر کے تحفظ کی ضمانت دی ہے' گزشتہ چند برسوں میں ہم پر جس طرح پے در پے یلغار ہوئی۔ اس سے ہمارے حوصلے پست ہونے لگے ہیں۔ آج حکومت کی تمام تر یقین د کے باوجود ہم اپنے ہی ملک میں خود کو غیر محفوظ محسوس کرنے لگے ہیں۔

بنائیں کیا سمجھ کر شاخ گل پہ آشیاں اپنا
چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا

مگر ملت کی گزشتہ تاریخ کی روشنی میں اس مایوسی کا کوئی مستقل جواز ہمارے سامنے روشنی کا ایک مینارہ آج بھی اپنی تمام آب و تاب کے ہمیں دعوت عمل دے رہا ہے۔ موجودہ نامساعد حالات کے باوجود مدرسۃ اور اس کی تاریخ ہماری رہنما ہو سکتی ہے۔ علی گڑھ تحریک کا ایک اہم نکتہ یہ مسلمانوں کے اندر خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہو جائے اور وہ عملی سیاست بجائے مذہبی، معاشرتی اور تعلیمی اصلاح کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ شاید بھی ہمارے لیے اس سے بہتر "نسخۂ کیمیا" کوئی حکیم حاذق تجویز نہیں کر سرسید نے اپنے ہم قوموں کے علاج کے لیے مرض کی تشخیص جس بے جگری کی اس سے زیادہ خلوص و محبت کے ساتھ نسخۂ شفا بھی پیش کی۔ آج تشخیص کے لیے حکماء و اطباء کے ساتھ کچھ جوشیلے نیم حکیم بھی سامنے آنے لگے ہیں جن کی ناعاقبت اندیشی کے باعث خطرۂ جان و ایمان کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ مگر نئی تعلیمی پالیسی کے سلسلے میں مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر کچھ دانشورو نے جو جائزے پیش کیے ہیں ان کی روشنی میں ہمیں صورت حال کا صحیح اندا ہونے لگا ہے اور مسلمانوں کے سنجیدہ طبقے میں ایک طرح کی بیداری پیدا ہوئی ہے جس سے کچھ امیدیں بندھنے لگی ہیں۔

مسلمانوں کی تعلیمی پستی اور اس کے اسباب کو بخوبی سمجھنے کے لیے

ہنداموں کی طرف اشارہ ضروری ہے۔

۱- اگرچہ ملک کی آبادی میں خاصہ اضافہ ہوا ہے اور شرح خواندگی بھی بڑھی ہے لیکن مسلمان مندرجہ قبایل اور پست اقوام کے علاوہ دوسرے ترقی یافتہ فرقوں کے مقابلے میں بہت پیچھے ہیں۔ اعلیٰ ذات ہندوؤں کے علاوہ وہ سکھوں، پارسیوں اور عیسائیوں سے اس قدر پچھڑے ہوئے ہیں کہ مستقبل قریب میں ان کے قریب پہنچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ہر سرکاری وغیر سرکاری جائزے میں مسلمان خط افلاس (Poverty Line) اور خط ناخواندگی" (Illiteracy Line) کے بین بین ہی نظر آتے ہیں۔

۲- آزادی کے بعد شہروں اور دیہاتوں میں عام مسلمانوں کی معاشی حالت بہتر نہیں رہی ہے۔ زمین داری کے خاتمے اور آبائی پیشوں میں دوسروں سے مقابلہ، سرمایہ کی کمی اور انتظامی صلاحیتوں کے فقدان کے باعث ان کے وسایل محدود ہیں اور وہ موجودہ ہوشربا گرانی کے دور میں اپنے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کی طرف توجہ نہیں کر پاتے۔

۳- آبادی کے تناسب کے لحاظ سے تعلیمی اداروں میں مسلمانوں کے داخلے کی عام شرح بہت کم ہے مگر تعلیم نسواں کی حالت سب سے ابتر ہے۔ شہروں اور قصبوں میں لڑکیوں کی تعلیم کی طرف کچھ توجہ ضرور ہوئی ہے لیکن دیہاتوں میں تعلیم نسواں تقریباً برائے نام ہے۔

۴- ملک میں پست اقوام یا درج فہرست قبایل کو جو وظایف اور دیگر مراعات حاصل ہیں وہ مسلمانوں کو میسر نہیں۔ تعلیم کے لیے مالی امداد، سیاسی مفادات کے تحت دی جاتی ہے نہ کہ معاشی حالات کے مطابق۔ ظاہر ہے غریب مسلمان طالب علم اپنی ذہانت کے باوجود ایک خاص مرحلے کے بعد روٹی روزی کے چکر میں پڑ جاتا ہے اور اعلیٰ تعلیم سے محروم رہ جاتا ہے۔ اگر کچھ طالب علم آگے بڑھتے ہیں تو سرکاری یا نجی نوعیت کی ملازمتوں میں اُن کا حصہ "بقدر اشک بلبل" رہ جاتا ہے جس سے دوسروں کو عبرت ہوتی ہے۔

مسلمانوں کے تعلیمی مسایل کی فہرست خاصی طویل ہے۔ ان کے حل کے سلسلے میں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اگر نئی تعلیمی پالیسی کو پورے طور پر نافذ کیا جائے تو مسلمانوں کی حالت سدھر سکتی ہے۔ شرط زبردست ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ "کمیونٹی خود دیکھے کہ پالیسی کے فوائد اس تک پہنچے ہیں کہ نہیں"۔ گذشتہ دہائیوں میں ہمیں جو کچھ ملا ہے وہ سب پر عیاں ہے۔ اس پر بحث لایعنی ہے۔

ع آنکھیں اپنی، باقی اُن کا

مسلمانوں سے ہمدردی کا دم بھرتے ہوئے موجودہ حالات میں یہ کہنا کہ "اقلیتوں کے مسایل ملک کے مسایل ہیں اور انہیں الگ الگ کرکے نہیں دیکھنا چاہیے"، حقیقت سے چشم پوشی ہے۔ بہر حال ہمیں حکومت کی دست نگری سے زیادہ اپنی داخلی توانائی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

علی گڑھ تحریک کی معنویت سمجھنے کے لیے اب سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے تعلیمی مسایل پر "ملت اور سرکار" کے رول پر غور کیجیے تو کچھ عبرت انگیز انکشافات ہوتے ہیں۔ ۱۸۲۴ء میں راجہ رام موہن رائے نے بنگال میں سنسکرت کالج کے بجائے انگلش کالج قایم کرنے کی پر زور سفارش کی۔ اس کے برخلاف ۱۸۳۵ء میں علماء کے آٹھ ہزار دستخطو کے ساتھ یہ عرض داشت پیش کی گئی تھی کہ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم نہیں چاہ دلیل یہ تھی کہ "انگریز بندوق، توپ اچھی بنا لیتا ہے مگر علم سے بے بہ ہے"۔ ظاہر ہے اکابرین ملت کے اجتماعی ہٹ دھرمی کے نتیجے میں مسلما دوسری قوموں سے تعلیمی میدان میں پچاس سال پیچھے رہ گئے۔ جب سر س نے علی گڑھ تحریک کے ذریعے انہیں اس غفلت سے بیدار کرنا چاہا تو ا پر کفر کے فتوے صادر ہونے لگے مگر انہوں نے مخالفین کی پرواہ بغیر اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جان کی بازی لگا دی۔ سر سید کا ایمان تھا کہ صحیح تعلیمی نظام کے ذریعے ہی مسلمانوں کی معا معاشرتی، ذہنی اور اخلاقی اصلاح ممکن ہے۔ اپنے مضمون "تعلیم کا نظ میں انہوں نے واضح طور پر کہہ دیا تھا:

> "ہمیں ایسی تعلیم کو اختیار کرنا چاہیے جو اندرونی قویٰ کو شگفتہ اور شاداب کرے"۔

سر سید نے یہ بات مسلمانوں کو ذہن نشین کرانی چاہی کہ مس ہند ہر طرح اپنی خودداری برقرار رکھیں اور حکومت سے کسی غلا کی امداد اور خوشنودی کے امیدوار نہ ہوں۔ آزاد ہندوستان میں ک

ی مشورہ" کی افادیت سے انکار نہیں۔ البتہ حکومت کو اپنی ذمہ داریوں
غفلت برتنے کے نتائج پورے ملک کے لیے مضر ہو سکتے ہیں۔

علی گڑھ تحریک جو مسلم یونیورسٹی کی شکل میں زیادہ واضح ہو کر عمل
ساتھ ہمارے سامنے آئی، محض علی گڑھ تک ہی محدود نہیں رہی۔ اس
ریک نے پورے ہندوستان میں مسلمانوں کو بیدار کیا۔ بیسویں صدی
درمیانی دہائیوں میں سر ضیاء الدین اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے جو مادرِ
س گاہ کے مایۂ ناز فرزند تھے، اپنے اپنے انداز سے مسلمانوں کے تعلیمی
معاملات پر غور کر کے لائحۂ عمل تیار کیے۔ سر ضیاء الدین نے مسلم یونیورسٹی
ں سائنس فیکلٹی اور انجینئرنگ کالج کے علاوہ اگریکلچر کالج اور میڈیکل
الج کے لیے بھی کوششیں کیں۔ ان کے بعد خدا خدا کر کے میڈیکل کالج
قایم ہو گیا لیکن اگریکلچر کالج کا خواب اب تک شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔
اکٹر ذاکر حسین نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کو اپنے تعلیمی مشن کا مرکز بنایا اور
پنے تعلیمی منصوبوں کے ذریعے قومی آرزوؤں اور امنگوں کو دوسرے
لاحی منصوبوں سے ہم آہنگ کر دیا۔ ان کے رفیقوں میں پروفیسر محمد مجیب
ور ڈاکٹر عابد حسین کی خدمات بھی لائقِ تحسین ہیں۔

آزادی کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں کافی توسیع ہوئی ہے
اب یہاں دس فیکلٹیاں ہیں جن کے ذریعے مختلف علوم کی تدریس ہوتی
ہے۔ دینیات، آرٹس، سوشل سائنس، کامرس، قانون، طب،
انجینئرنگ، میڈیکل، نیچرل سائنس اور لائف سائنس جیسے اہم علوم کی
درس و تدریس اور تحقیق و تفتیش کے لیے یہاں وافر سہولتیں مہیا ہیں۔
جو کسی بھی عظیم درس گاہ کے لیے قابلِ فخر ہیں۔ علی گڑھ تحریک نے نہ صرف
شمالی ہند میں عام بیداری کی لہر پیدا کی بلکہ اس کے اثرات جنوبی ہند
کی ریاستوں میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحق مرحوم
اور دیگر ہمدردانِ قوم کی کوششوں سے سرزمین دکن میں نہ صرف
عام تعلیم کے لیے اسکول اور کالج کھولے گئے ہیں بلکہ تعلیم نسواں اور تکنیکی و
پیشہ ورانہ تربیت کے لیے بھی ادارے قایم ہوئے ہیں۔ علی گڑھ اسپرٹ
آج بھی ہمدرد، حساس اور وطن دوست مسلمانوں کے لیے سرمایۂ حیات
ہے۔

علی گڑھ تحریک کو ذرا دوسرے زاویے سے دیکھیے تو اس کی
افادیت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ آج ہمیں کئی محاذوں پر اپنے حریفوں
سے نبرد آزمائی کرنی پڑ رہی ہے۔ انگریزوں نے اپنے دورِ حکومت میں
جو زہر بویا ہے یا جہاں خود ہماری قیادت نے ہمیں گمراہ کیا ہے، اس کے
خمیازے ہمیں ہی بھگتنا ہے۔ لیکن آزمایش کی گھڑیوں میں سرسید کی
زندگی اور علی گڑھ تحریک سے کئی امید افزا سبق ملتے ہیں۔ ہم یہ بات
بخوبی جانتے ہیں کہ سرسید بحث و مباحثہ اور منطقی استدلال کے
ذریعے اپنے حریفوں کو قایل کرنے اور اپنا ہم خیال بنانے کے حق میں
تھے۔ "اسباب بغاوت ہند" اور "خطباتِ احمدیہ" ان کے وہ تاریخی
کارنامے ہیں جن سے آج بھی ہم انسپریشن حاصل کر سکتے ہیں۔ کاش
ہم میں کسی کو "اسبابِ تقسیم ہند" لکھنے کی توفیق ہوتی۔ کاش ہم
حکومت اور اکثریتی فرقے کو مدلل طور پر یقین دلا سکتے کہ ہماری
ترقی ملک کی ترقی ہے اور ہماری تباہی ملک کی تباہی کا پیش خیمہ ہے
"ستیارتھ پرکاش" کا جواب "حق پرکاش" لکھوا کر ہی دیا جا سکتا ہے
ہلڑ بازی اور دھرنوں سے نہیں۔ سرسیدؒ نے اپنے زمانے میں ہندو
مسلم انتہا پسندوں کا یکساں طور پر مقابلہ کیا۔ آج کے دور میں مختلف
ذرائع ابلاغ سے کام لے کر مسلمان ادیب اور فن کار قومی یکجہتی اور
باہمی رواداری کا شعور پیدا کر سکتے ہیں۔

علی گڑھ تحریک کوئی جامد یا وقتی تحریک نہ تھی۔ سرسید کا
خاندانی تعلق اس پیغمبرِ اسلام سے ہے جس نے کفر و الحاد کی تاریکیوں
کو ختم کر کے نورِ حق سے سارے عالم کو جگمگا دیا۔ سرسید کی تحریک بھی اپنے
محدود دائرے میں ہمارے لیے شاہراہِ ہدایت متعین کرتی ہے۔ مسلم
یونیورسٹی میں تعلیم بالغان، تعلیم نسواں، مقابلے کے امتحانوں کے لیے
تدریسی مرکز اور سائنس کی ترقی و فروغ کے مرکز کا قیام ہمارے لیے
فالِ نیک ہے۔ یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ ہمارا کارواں ٹھہرا نہیں اور
نہ ہم جمود کے شکار ہیں۔ ہماری رفتار مدھم سہی مگر ہم یقین محکم کے ساتھ
منزل کی جانب گامزن ہیں۔

آخر میں ہم علی گڑھ تحریک کی موجودہ دور میں معنویت چند تجاویز
کے ذریعے واضح کرنا چاہتے ہیں جن سے شاید آئندہ مسلمانوں کی تعلیمی
ترقی میں کچھ مدد مل سکے۔

علی گڑھ ہندوستان کے پندرہ کروڑ مسلمانوں کے تعلیمی مسایل حل کرنے سے قاصر ہے۔ لہذا ہر ریاست میں ایک چھوٹے علی گڑھ (Mini - Aligarh) کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں اسکول یا کالج قایم کرنے سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہر صوبے میں ایک ایسا مرکز قایم کیا جائے جہاں سے علی گڑھ تحریک کی تجدید و اشاعت ہوتی رہے اور عام مسلمانوں میں بیداری پیدا کی جا سکے۔ یہ کام ہمارے اولڈ بوائز بخوبی کر سکتے ہیں۔

۲۔ ان مرکزوں میں ملک کے اندر تعلیمی سہولتوں کے بارے میں علاقائی زبانوں میں لٹریچر مہیا کیا جائے تاکہ ہر علاقے میں مسلمان روزگاری مضامین اور ملازمتی مواقع سے واقف ہو سکیں۔ ان تمام مرکزوں کا علی گڑھ سے رابطہ رہے۔ تاکہ مرکزی مجلس سال میں کم سے کم ایک دفعہ اپنے اجلاس میں ان مسئلوں کو زیر غور لائے جن کا حل اشد ضروری ہے۔ انھیں مراکز کے ذریعے ایسے اعداد و شمار بھی فراہم کیے جا سکتے ہیں جن سے آئندہ منصوبہ بندی میں مدد مل سکے۔ کسی زمانے میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے اس ضمن میں اہم کارنامے انجام دیے تھے لیکن اب نئے مرکزوں کی اشد ضرورت ہے۔

۳۔ یہ مراکز مسلمانوں کے دینی، تعلیمی، تہذیبی و ثقافتی امور سے متعلق ہوں ان کو سیاسی مقاصد کے لیے ہرگز نہ استعمال کیا جائے۔ سیاسی مقاصد کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں مسلم لیگ، مجلس اتحاد المسلمین اور مسلم مجلس مشاورت جیسی تنظیمیں موجود ہیں۔ ہمارے لیے سیاسی کامیابی سے زیادہ اپنا تشخص عزیز ہے۔ لہذا اس کے لیے ہمیں برابر جدوجہد کرنا چاہیے۔

۴۔ سرسید کی طرح ہمارا بھی یہ ایمان ہے کہ مسلمان تعلیم کے ذریعے ہی اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر سکتا ہے اور اپنے حال و مستقبل کو سنوار سکتا ہے۔ بقول ڈاکٹر ذاکر حسین:

"تعلیم پیشہ نہیں، قوم کی پاسبانی ہے۔"

لہذا اس کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے لیے لایق اساتذہ کی ہمت افزائی ہونی چاہیے۔

۵۔ آج کل ملک میں ہر طرف نئی تعلیمی پالیسی کے تحت ماڈل اسکول اور اوپن یونیورسٹی (Open University) کے چرچے ہیں۔ سرکاری پروپیگنڈے سے قطع نظر ہمیں بھی ان نئے تعلیمی تجربوں پر غور کرنا چاہیے ہمارے اسکول کب ماڈل یا آئیڈیل اسکول بنیں گے، یہ بات تو ارباب حل و عقد جانیں لیکن ہمیں یہ بات کہنے میں بالکل تامل نہیں کہ گزشتہ چند سالوں میں ہم نے سکنڈری اسکول لیول تک کوئی قابل فخر کارنامہ نہیں انجام دیا ہے۔

جہاں تک اوپن یونیورسٹی کا تعلق ہے، پاکستان میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اور ہندوستان میں اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی دونوں وقت کی اہم ضروریات کے مطابق ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں خواتین اور اساتذہ کو کچھ امتحانوں میں شریک ہونے کی اجازت دیتے ہیں۔ سمسٹر سسٹم کے دور میں ۱۹۶۸ء سے ۱۹۸۰ء تک ہم امیدوار کو تعلیمی مشورے بھی دیتے تھے۔ ہمیں قوم کے ان افراد کی تعلیم کے اس رابطے کو باقی رکھنا ہے۔ جو بدقسمتی سے اعلی تعلیم سے محروم ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ہم آرٹس، سوشل سائنس اور کامرس میں تعلیم کے مراسلاتی کورس (Correspondence Course) بھی شروع کر سکتے ہیں۔ یہ علی گڑھ تحریک کی نئی دین ہوگی۔ ہند کے مسلمان آج بھی مسلم یونیورسٹی کی طرف امید کی نگاہیں لگائے ہوئے ہیں۔ ہمیں انھیں مایوس نہیں کرنا ہے۔

ہمارا ایمان ہے کہ

ع یہ ابر ہمیشہ برستا ہے، یہ ابر ہمیشہ برسے گا۔

آبی آلودگی اور گنگا

سید مفتاح العارفین رضوی

آنجہانی وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "ڈسکوری آف انڈیا" میں گنگا کی عظمت اور اس کی تاریخی اہمیت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

"بھارت کی تمام ندیوں میں گنگا سب سے اعلیٰ ہے۔ جو
ہندوستان کے قلب سے ہوکر بہتی ہے۔ اپنے کنارے
رہنے والے کروڑوں لوگوں کو یہ زندگی بخشتی ہے۔
گنگا گنگوتری سے لے کر مہاساگر میں ختم ہونے تک دورِ
ماضی سے لے کر آج تک ہندوستانی تہذیب و ثقافت
کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتی ہے۔"

بے شک گنگا جیسی مقدس ندی ہمارے ملک کے تہذیب و ثقافت کی زندہ مثال ہے جس کے ساتھ ہزاروں سال پرانی تاریخ پنہاں ہے۔ اس ندی کا پانی جہاں ہماری پاکیزگی کی روشن علامت ہے، وہیں دوسری جانب اس کی روانی میں مسلسل جدوجہد، امن و راستی اور قومی یک جہتی کا پیغام بھی موجود ہے۔ اس ندی نے نہ معلوم کتنے انقلابات و تغیرات کے دور دیکھے۔ کبھی ملک کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑتے تو کبھی آزادی کے متوالوں کو پھانسی کے پھندوں پر لٹکتے دیکھا۔ شاید یہی وجہ رہی ہو کہ وطنِ عزیز کے ادبا اور شعراء نے بھی گنگا کی شان میں خوب گنگنایا۔ بقول علامہ اقبالؒ:

اے آبِ رود گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

لیکن آج ہم نے اس ندی کے پانی کو صاف و شفاف نہ رکھ کر آلودگی کی تہہ سے روپوش کر دیا ہے۔ شہروں اور بڑی بڑی فیکٹریوں کے آلودہ عناصر اس میں مل کر پورے پانی کو بھی آلودہ اور مضر بنا دیا ہے۔

حکومت ہند نے ایک صحت مند ماحول کے قیام کے لیے دریاؤں کی آلودگی دور کرنے کی طرف پہل گنگا ندی کی صفائی سے کیا ہے۔ اس نئے منصوبے کے تحت صفائی میں ۲۹۲ کروڑ روپیے خرچ ہونے کا تخمینہ ہے۔ دراصل ایسی اہمیت اس لیے بھی نظر آئی کہ یہ ندی ملک کے ۲۱ فیصد زمین پر بہتی ہے۔ گزرگاہ ۲۵۲۵ کلومیٹر اور طاس ۹ لاکھ مربع کلومیٹر ہے۔

غیر ممالک میں بھی ندیوں کی صفائی مہم کی شروعات ہو چکی ہے اور کئی ایسے اقدام اٹھائے گئے ہیں جس سے ان ندیوں کی آلودگی دور ہو سکے۔ لیکن یہ تمام ندیاں گنگا سے چھوٹی ہیں۔ اس لیے گنگا کی صفائی پروجیکٹ کو پوری دنیا دلچسپی سے دیکھ رہی ہے۔

گنگا ندی کے کنارے تقریباً ۱۰۰ شہر مثلاً بہار میں ۱۵، مغربی بنگال میں ۵۹ اور اترپردیش میں ۴۶ شہر آباد ہیں۔ صفائی مہم کا آغاز بھی ان ہی شہروں سے کیا گیا ہے۔ کیوں کہ ایسا کرنے پر ۸۶ فی صد آلودگی پر آسانی سے کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ اوّل درجے کے شہر وہ ہیں جہاں ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق کل آبادی ایک لاکھ سے زیادہ ہو۔ ۲۹ اول درجے کے شہروں میں صرف دس ہی میں گندے پانی کے نکاس کا معقول انتظام ہے۔ ایک سروے کے مطابق ندی کے ساحل پر ۵۰ ہزار سے ایک لاکھ کی آبادی والے ۲۳ شہر اور ۵۰ ہزار سے کم آبادی والے ۴۰ شہر آباد ہیں۔

وزیراعظم ہند جناب راجیو گاندھی نے گنگا کی صفائی مہم کی شروعات ۱۴ جون ۱۹۸۶ء کو بنارس سے کی۔ اس موقع پر اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

"The Ganga Action Plan is not just a Government Plan. It is a plan for all the people of India One is which they can come forward and participate ...."

وزیراعظم کی باتوں میں دور اندیشی پوشیدہ ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ جب تک اہلِ وطن بیدار ہو کر عمل کے میدان میں آگے نہیں آئیں گے، اس وقت تک کسی بھی پروگرام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا غیر ممکن ہے۔ موصوف کے اس ایکشن پلان پر زور دینے کی وجہ ایک یہ بھی ہے کہ ہمارا ملک زرعی پیداوار ملک ہے، جہاں کے بیشتر شہری کھیتوں پر ہی انحصار کرتے ہیں۔ گنگا سے بے شمار نہریں نکلی ہیں جن سے آب پاشی کی جاتی ہے ملک کے کل ۴۳ فی صد حصے گنگا گھاٹی میں ہیں۔ اسی گھاٹی میں ۱۸ بڑے نہری پروجیکٹ ہیں۔ اُن میں سے ہری دوار میں اوپری گنگا نہر اور علی گڑھ کے پاس نچلی گنگا نہر خاص ہیں۔ گنگا گھاٹی میں بہت سے ڈیم بھی بنائے گئے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر گنگا کے پانی میں کیمیاوی عناصر بڑھ گئے تو پھر یہ فصل پر بھی خراب اثر ڈال سکتے ہیں۔

سینٹرل گنگا اتھارٹی ۱۶ فروری ۱۹۸۶ء کو قایم کی گئی جس کے چیئرمین وزیراعظم مسٹر راجیو گاندھی ہیں۔ اتھارٹی کے مطابق ۱۹۹۰ء تک گنگا کی آلودگی کو دور کرنے پر تقریباً ۲۵۰ کروڑ روپیے خرچ ہونے کا حساب لگایا گیا ہے۔ گنگا کے ساحل پر بسے ۲۹ اضلاع میں کام کا آغاز بھی ہو چکا ہے۔

صوبۂ بہار کے پٹنہ، مونگیر، بھاگلپور اور چھپرہ میں بھی پروگرام کے تحت گندے نالوں کے بہاؤ کے رُخ کو موڑ کر Sewage Treatment Plant میں کر دیا گیا ہے۔ پمپنگ اسٹیشن کی صلاحیت بڑھانے اور نئے STP کے لگنے کا کام بھی جاری ہے۔ Existing Sewage Treatment Plant کے لگانے کے ساتھ بعض جو پہلے سے ہیں انہیں درست بھی کیا جا رہا ہے۔

راجدھانی پٹنہ کے سید پور اور بیور کے بیکار پڑے ہوئے E.S.T.P. کو بھی دوبارہ استعمال کے لائق بنایا جا رہا ہے۔ جو ایک ملک کا سب سے بڑا پلانٹ (۶.۲ ملین گیلن روزانہ) ہے۔ صوبہ کے دیگر شہروں مثلاً بھاگلپور، چھپرہ اور مونگیر میں بھی گنگا صفائی مہم تیزی سے جاری ہے۔ جس کے لیے Bihar State Water & Sewage Board Patna کی کارکردگی قابلِ صد ستائش ہے۔

Action Plan At A Glance

(ایکشن پلان ایک نظر میں)

جگہ	مقررہ رقم (لاکھوں میں)
پٹنہ	٣١٤٦
بھاگلپور	٤٠٠
چھپرہ	٣٠٠
مونگیر	٤٠٠
کل رقم	٤٢٤٦

اتھارٹی کی تحقیقی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ گنگوتری سے رشی کیش تک پانی A گریڈ کا ہے جو پینے کے لائق ہے مگر رشی کیش سے قنوج تک پانی اس لائق نہیں کہ اس کا استعمال پینے میں کیا جائے بلکہ صرف اس سے غسل ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس پانی کو بی گریڈ میں رکھا گیا ہے۔ صوبۂ بہار کے پٹنہ اور اس کے آگے تو پانی اور بھی زیادہ آلودہ ہے جو پینے اور غسل کرنے کسی کے بھی لائق نہیں رہا۔ بنارس میں جانچ کے بعد پتہ چلا کہ پانی میں زہریلی دھات بھی ہے جو ہماری صحت پر بھی اس کے استعمال سے اثر ڈال سکتے ہیں۔ مرکزی حکومت نے بنارس میں گنگا کی آلودگی دور کرنے کے لیے ۴۳ کروڑ روپیے کی منظوری دی ہے۔ گھاٹوں کے سدھار اور مرمت پر ۶ کروڑ ۸۰ لاکھ روپیے خرچ ہوں گے۔

گنگا کا پانی اس میں غسل کرنے، نہانے دھونے، ہڈیاں بہ

سویشیوں کی گندگی، گندی نالیوں کے بہاؤ اور فیکٹریوں کے فضلے پھینکے جانے کی وجہ سے آلودہ ہوئے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ۱۱ کروڑ گیلن گندہ پانی بہہ کر گنگا کے پانی کو آلودہ بنا دیتا ہے۔ کیمیاوی تجزیے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ پانی میں تانبہ، زنک اور نکل وغیرہ کی مقدار بڑھ گئی ہے۔ جس سے پانی کے اندر مچھلیوں کا رہنا بھی اب ناممکن سا نظر آرہا ہے۔

اترپردیش کے شہر بنارس، کانپور اور الہ آباد میں فیکٹریوں و دیگر آبادی والے حصے سے تقریباً ۲۰ سے ۲۵ لاکھ ٹن فضلات ندی میں ڈالے جاتے ہیں جس کی وجہ سے پانی آلودہ تر ہوتا جا رہا ہے۔ متھرا ریفائنری اور کانپور کے چمڑے کے کارخانے وغیرہ کے فضلات سے ایسے جراثیم جنم لیتے ہیں جو آکسیجن کی مقدار کو کم کر دیتے ہیں۔ ان فیکٹریوں کے فضلے سے کینسر، پارے سے سستی، اندھاپن، بہرے پن اور کوما کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ دیگر بیماریوں میں پولیو، پیچش جگر کا درد وغیرہ بھی ہونے کا خدشہ بنا رہتا ہے۔

ان تمام باتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج ہم لوگوں کو اس اہم مسئلے پر دھیان دینا نہایت ضروری ہے اور اس سلسلے میں حکومت ہند کے اٹھائے گئے اقدام خوشگوار ماحول پیدا کرنے میں مددگار و معاون ثابت ہوں گے۔ ورنہ انسانی زندگی کو خطرہ لاحق ہے۔

واٹر کوالٹی:- (Water Quality)

پانی کی کوالٹی جانچ کے لیے مختلف اسکیل استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ اول پانی میں موجود آکسیجن کی مقدار سے کیا جاتا ہے (D.O) Dissolved Oxygen جتنا زیادہ ہوگا، ندی کا پانی اتنا ہی زیادہ صاف و شفاف اور آلودگی سے پاک ہوگا۔ دوسرا بایوکیمیکل آکسیجن ڈیمانڈ (B.O.D) کی مدد سے Organic matter کو ناپا جاتا ہے۔ B.O.D کی مقدار جتنی کم ہوگی، پانی اتنا ہی صاف ہوگا — ایک اور اسکیل ہے Coliform (کالی فورم) اس کی تعداد بھی کم ہونے سے پانی صاف سمجھا جاتا ہے۔

لیکن ان تینوں اسکیل کو ملا کر سائنس دانوں نے ایک نئے اسکیل کی ایجاد کی ہے۔ پانی کے استعمال کے مطابق یہ انڈکس بدلتا رہتا ہے۔ گنگا میں زیادہ تر غسل ہی کیا جاتا ہے۔ انڈکس نمبر ۵۰ ہے۔ ندی کے پانی کی کوالٹی Values مختلف موسم میں بدلتی رہتی ہے۔ کیونکہ پانی کے بہاؤ میں بھی تبدیلی آتی رہتی ہے۔ ایسی حالت میں پانی کے نمونے الگ الگ موسم میں رکھے جاتے ہیں۔

گنگا کی آبی آلودگی کو دور کرنے سے جہاں ہمیں مختلف قسم کے امراض اور پیداوار پر پڑنے والے خراب اثرات سے نجات ملے گی، وہیں ہمیں گنگا کو صاف کرنے کے عمل میں کوڑا کرکٹ سے بھی دولت حاصل کرنے کے طریقے معلوم ہو جائیں گے۔

شہروں کی گندی نالیوں کے رخ کو موڑنے کے لیے پائپ لائنوں کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ لیکن اس بات کا خیال رکھا جا رہا ہے کہ پائپ لائنوں کی لمبائی کم ہو تاکہ لاگت کم آئے۔ صوبہ بہار کے پٹنہ اور بنگال کے جنوبی دمدم کے ۲۵ فیصد آبادی کے لیے گندے پانی کی نکاس کی سہولیات فراہم کی گئی ہیں۔ بعض شہروں میں گندے پانی کو دوبارہ استعمال کے لائق بنانے کی غرض سے انہیں ایک سے زیادہ مراکز پر اکٹھا کرنے کی اشد ضرورت ہے، جہاں وہ خام مال سمجھا جائے گا۔

گندے پانی میں تحلیل شدہ ٹھوس مادے Treatment Plants سے الگ کرنے کے بعد Digester نامی مشین سے میتھن گیس اور ڈائجیسٹڈ سولڈ تیار کیے جاتے ہیں۔ حاصل شدہ میتھن گیس سے بجلی پیدا کی جا سکتی ہے اور ڈائجیسٹڈ سولڈ سے کھاد۔ پانی کو تھوڑا اور صاف کر دیے جانے کے بعد مچھلی پالن کیا جا سکتا ہے، کائی مرغیوں کی بہترین غذا ہے اور صاف و شفاف پانی آبپاشی کے لیے مفید ذریعہ ثابت ہوگا۔ جمع شدہ اعداد و شمار سے ایک نہایت ہی حیرت انگیز بات سامنے آئی یعنی جہاں آلودگی دور کرنے والے یونٹ پر فی کس ۲۰ روپیے سالانہ خرچ ہوں گے، وہاں دوسری جانب فی کس ۳۴ روپیے سالانہ آمدنی حاصل ہوگی۔ اس طرح بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ گنگا کی آبی آلودگی کو دور کرنے جیسا منصوبہ ایک نفع بخش سودا ہے۔ جس کے لیے ہم سبھی لوگوں کو حکومت کی مدد کرنی ہوگی، تاکہ پروگرام کامیاب ہو سکے۔

فزکس — ایک سائنس

ثقل کا نظریہ

محمد حبیب الحق انصاری

سیاروں کی حرکت

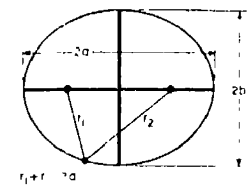
یہ مضمون انسانی ذہن کی ایک نہایت دور رس کاوش کا تذکرہ ہے لیکن جہاں انسانی ذہن کی تعریف کرنی ہے وہاں کچھ دیر رک کر ہمیں قدرت کی ہمہ گیری اور آفاقیت کا اعتراف بھی کرنا چاہیے جو ثقل کے قانون جیسے ایک نہایت سادہ اصول کا اس درجہ تکمیل اور عمومیت کے ساتھ اتباع کرتی ہے تو یہ ثقل کا قانون آخر ہے کیا؟ یہ محض یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز ہر دوسری چیز کو ایک ایسی قوت سے اپنی طرف کھینچتی ہے جو کسی دو چیزوں کے لیے ہر ایک کی کمیت مادے کے ہم تناسب اور چیزوں کے مابین فاصلے کے مربع کے معکوساً متغیر ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اگر ہم یہ بھی کہہ دیں کہ کسی قوت کے عاید کرنے پر کوئی چیز قوت کی سمت میں ایک ایسی مقدار کا تسارع پاتی ہے جو اس چیز کی کمیت مادے کے معکوساً متناسب ہوتا ہے تو محض ان دو اصولوں سے ایک مناسب حد تک ماہر ریاضی داں بہت سارے اہم نتائج اخذ کرسکتا ہے۔ لیکن ہم یہاں ان نتائج کو ایک حد تک تفصیل سے بیان کریں گے نہ کہ آپ کو فقط یہ دو اصول ہی بتا کر چھوڑ دیں گے۔

کہانی کا آغاز عہد قدیم کے لوگوں سے ہوتا ہے جنہوں نے تاروں کے درمیان سیاروں کی گردش کا ایک حد تک مشاہدہ کیا اور آخرکار اس نتیجے پر پہنچے کہ سیارے سورج کے اطراف گردش کرتے ہیں۔ لازمی بات ہے گردش کی زیادہ تفصیل سے وہ ناواقف تھے۔ سورج کے گرد گردش کی بات کوپرنیکس (Copernicus) نے بعد میں دوبارہ دریافت کی۔ پندرھویں صدی عیسوی کے شروع میں زبردست بحثیں ہوئیں کہ آیا سیارے واقعتاً سورج کے گرد گھومتے ہیں یا نہیں۔ ٹائیکو براہے (Tycho Brahe) کا خیال عہد قدیم کے فلسفیوں سے مختلف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سیاروں کی حرکت کی بابت ان بحثوں کا بہترین حل یہ ہوگا کہ آسمان میں سیاروں کی واقعی پوزیشنوں کو مناسب درستگی سے ناپ لیا جائے۔ اگر پیمائشیں بتائیں کہ سیارے ٹھیک ٹھیک کس طرح حرکت کررہے ہیں، تب شاید یہ ممکن ہو کہ سورج کے گرد گردش کی بابت ایک یا دوسرا نقطۂ نظر ثابت کیا جاسکے۔ یہ ایک زبردست خیال تھا۔ یہ خیال کہ کسی چیز کو معلوم کرنا ہو تو یہ بہتر ہے کہ کچھ محتاط طرز کے تجربے کرلیے جائیں۔ بجائے اس کے کہ عمیق فلسفیانہ بحثیں ہوتی رہیں۔ اس خیال کے تحت ٹائیکو براہے نے کوپن ہاگن کے نزدیک ہوین (Hven) کے جزیرے پر واقع اپنی رصد گاہ میں کئی برسوں سیاروں کی پوزیشنوں کا مشاہدہ کیا۔ اس نے ضخیم جدول بنائے جو ٹائیکو کی وفات کے بعد ریاضی داں کیپلر (Kepler) کے زیر مطالعہ آئے۔ کیپلر نے اس مواد کی مدد سے بعض نہایت خوب صورت اور قابل ذکر لیکن سہل قوانین سیاروں کی حرکت سے متعلق دریافت کیے۔

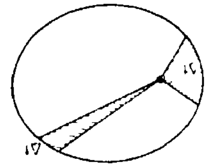
کیپلر کے قوانین

سب سے پہلے کیپلر نے یہ پایا کہ ہر سیارہ سورج کے اطراف ایک ایسے خمیدہ خط پر چلتا ہے جسے ایلپس (Ellipse) کہتے ہیں اور وہ اس طرح کہ سورج ایلپس کے ایک فوکس (Focus)

پر ہوتا ہے۔ ایلپس محض کوئی بھی انڈا نما خمیدہ خط نہیں ہوتا بلکہ ایک نہایت مخصوص اور باقاعدہ خمیدہ خط ہوتا ہے۔ ریاضیاتی طور پر یہ ان سارے نقطوں کا ماحصل ہوتا ہے جن کے دو ثابت نقطوں (فوکسوں) سے فاصلوں کا مجموعہ ایک ہی ہوتا ہے۔ (دیکھیے شکلِ ذیل) اگر آپ چاہیں تو اسے ایسا دائرہ سمجھ لیجیے جو اوپر اور نیچے سے دبا کر ذرا چپٹا کر دیا گیا ہے۔



(ا) ایک ایلپس



(ب) مساوی وقتوں میں مساوی رقبوں کا قانون

شکل (۱) سیاروں کے مدار اور ان کی حرکت۔

کیپلر کا دوسرا مشاہدہ یہ تھا کہ سیارے سورج کے اطراف ایک ہی رفتار سے نہیں چلتے بلکہ جب وہ سورج کے نسبتاً زیادہ نزدیک ہوتے ہیں تو زیادہ تیزی سے چلتے ہیں اور جب سورج سے دور ہوتے ہیں تو آہستہ چلتے ہیں اور وہ بھی کچھ اس طرح کہ مساوی وقتوں میں سورج اور سیارے کو ملانے والی لکیر مساوی رقبہ طے کرتی ہے (ملاحظہ فرمایے شکل (۱) (ب))

آخر میں کیپلر نے کافی عرصے بعد ایک تیسرا قانون بھی دریافت کیا۔ یہ قانون ذرا مختلف نوعیت کا ہے۔ یہ ایک سیارے کی حرکت کا دوسرے سیارے کی حرکت سے موازنہ کرتا ہے۔ یہ قانون یہ کہتا ہے کہ اگر کسی دو سیاروں کے گھوم جانے کے وقفے اور سیارے کے مدار کے سائز کا موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ وقفے مداروں کے سائزوں کی $3/2$ قوت کے متناسب ہوتے ہیں یہاں گھومنے کے وقفے سے مراد سیارے کا اپنے مدار پہ پورا ایک چکر کاٹنے میں لگنے والا وقت ہے۔ اور سائز کے لیے ہم ایلپٹک مدار کے سب سے بڑے قطر کو لے سکتے ہیں جسے ٹیکنیکی اصطلاح میں بڑا محور کہا جاتا ہے۔ سیاروں کے مدار ویسے چپٹے ایلپسوں کی بجائے تقریباً تقریباً دائرے نما ہی ہوتے ہیں۔

اس طرح کیپلر کے تین قوانین تھے:۔

۱۔ ہر سیارہ سورج کے اطراف ایک ایلپس پر ایسے حرکت کرتا ہے کہ سورج ایک فوکس پر ہوتا ہے۔

۲۔ سورج کو سیارے سے چلانے والی لکیر وقت کے مساوی وقفوں میں مساوی رقبے طے کرتی ہے۔

۳۔ کسی دو سیاروں کے پورا چکر لگانے کے وقتوں کے مربعے سیاروں کے آدھے بڑے محوروں کے مکعبوں کے ہم تناسب ہوتے ہیں۔

ڈینامکس کا فروغ

یہاں بھی مسئلہ یہ تھا کہ وہ کیا ہے جس کی بنا پر سیارے حرکت کرتے ہیں؟ (اس زمانے کا مثلاً ایک نظریہ یہ تھا کہ سیارے اس لیے گھومتے ہیں کہ دکھائی نہ دینے والے فرشتے ان کے پیچھے ہوتے ہیں اور اپنے پر ہلاتے ہیں جس سے سیارے آگے بڑھتے جاتے ہیں!) خیر تو گلیلیو (Galileo) نے حرکت سے متعلق ایک نہایت قابلِ ذکر بات دریافت کی جو حرکت کو سمجھنے کے لیے بہت ضروری ہے۔ یہ بات تھی جمود کا اصول —— اگر کوئی چیز حرکت کر رہی ہے اور کوئی اور چیز اسے چھو نہیں رہی ہے نہ ہی اس میں کوئی گڑبڑ ہوتی ہے تو وہ اسی طرح ہموار رفتار سے ایک ہی سیدھی لکیر پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلتی چلی جائے گی۔ نیوٹن نے اس خیال میں یہ کہہ کر ترمیم کی کہ کسی جسم کی حرکت کو تبدیل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ طاقت استعمال کی جائے۔ نیوٹن نے وضاحت کی کہ نہ صرف حرکت کی رفتار بلکہ حرکت کی سمت دونوں کو بدلنے کے لیے طاقت استعمال کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ سیاروں کو سورج کے اطراف گردش میں رکھنے کے لیے جو قوت ضروری ہے وہ سورج کے اطراف نہیں بلکہ سورج کی طرف ہونی چاہیے!

نیوٹن کا ثقل کا قانون

چوں کہ وہ حرکت کے نظریے کی بہتر سمجھ رکھتا تھا، اس لیے نیوٹن کو یہ بات بھی سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ سورج ہی ان قوتوں کا مرکز ہے جو سیاروں کی حرکت کا باعث ہیں۔ اس نے اپنے لیے ثابت کرکے دیکھ لیا کہ رقبوں سے متعلق کیپلر کا دوسرا قانون اس بات کا راست نتیجہ ہے کہ سب قوتوں کا رُخ بالکل سورج کی طرف ہی ہوتا ہے۔

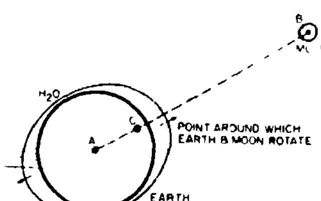
اس کے بعد کیپلر کے تیسرے قانون کے تجزیے سے یہ بات ثابت کی جاسکتی ہے کہ قوتیں متعلقہ فاصلوں کے مربعوں کے معکوساً متناسب ہوتی ہیں۔ پس کیپلر کے دونوں قوانین کے تجزیے سے نیوٹن نے یہ نتیجہ نکالا کہ ایک قوت ہونی چاہیے جو دو چیزوں کے فاصلے کے مربع کے معکوس کی طرح بدلتی ہے اور جو دونوں چیزوں کے مابین لکیر کی سمت میں رائج ہوتی ہے۔

سیارے مشتری کی بابت معلوم تھا اس کے اطراف بھی اس کے چاند ہوتے ہیں اور نیوٹن کو یقین ہو گیا کہ سیارے اپنے چاندوں کو بھی ایک قوت سے جکڑے رہتے ہیں۔ اسے پہلے ہی پتہ تھا کہ ایک قوت خود ہم کو زمین سے جکڑے ہوئے ہے۔ اس بنا پر اس نے تجویز کیا کہ یہ ایک آفاقی یا کائناتی قوت ہے۔ یعنی ہر چیز ہر دوسری چیز کو کھینچتی ہے۔

اس کے بعد مسئلہ یہ تھا کہ آیا لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے کی زمین کی قوت ویسی ہی ہے جیسے زمین کی چاند کو کھینچنے کی قوت ہے۔ یعنی کیا وہ بھی فاصلے کے مربعے کے ساتھ معکوساً بدلتی ہے۔ ایک سرسری حساب یہ بتاتا ہے کہ ہاں ایسا ہی ہے۔ لیکن جب نیوٹن نے پوری احتیاط سے حساب لگایا تو پایا کہ دونوں جوابوں میں اتنا فرق باقی رہا کہ نیوٹن نے سمجھا حقائق اس کے نظریے کی تردید کرتے ہیں اور اس نے اپنے نتائج شائع نہیں کیے۔ چھ سال بعد زمین کے سائز کی ایک نئی پیمائش نے بتایا کہ ہیئت داں چاند کا جو فاصلہ زمین سے لے رہے تھے، وہ غلط تھا۔ جب نیوٹن نے اس کے بارے میں سنا تو اس نے تصحیح شدہ فاصلے کو لے کر دوبارہ محاسبہ کیا اور پایا کہ دونوں جوابوں میں بہترین مطابقت پائی جاتی ہے!

کسی نئے قانون کی ایک بڑی دریافت کو اُسی وقت کارآمد سمجھا جاسکتا ہے جب ہم اس میں جو مواد ڈالیں اس سے زیادہ اس سے حاصل کر سکیں۔ اب نیوٹن نے کیپلر کے دوسرے اور تیسرے قانونوں کو استعمال کرکے اپنا ثقل کا قانون اخذ تو کر لیا لیکن اس کی پیش گوئی کیا کی؟ سب سے پہلے تو یہ کہ اس نے چاند کی حرکت کا تجزیہ کیا اور اس کو زمین پر چیزوں کے گرنے کے عمل سے جوڑا۔ دوم یہ کہ اس نے بتایا کہ مدار ایک ایلپس ہی ہوتا ہے۔ یعنی کیپلر کے پہلے قانون کو سمجھانے کے لیے کوئی بات مزید درکار نہیں ہوتی۔ اس طرح نیوٹن نے اپنی پہلی قابلِ لحاظ پیش گوئی کی۔

ثقل کا قانون کئی باتوں کو سمجھاتا ہے جو پہلے سمجھی نہیں جاسکی تھیں۔ مثلاً لوگ پہلے سے جانتے تھے کہ چاند سمندر کے پانی کو کھینچتا ہے۔ لیکن ان کا خیال تھا کہ چوبیس گھنٹوں میں فقط ایک مدوجزر ہی ہونا چاہیے۔ لیکن واقعتاً ایک کے بجائے دو دو مدوجزر چوبیس گھنٹوں میں ہو جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ نیوٹن نے بتایا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ چاند کی زمین پر قوت تو زمین کے مرکز پر متوازن ہو جاتی ہے لیکن جو پانی سمندر کا زمین کی سطح پر چاند کے قریب ہوتا ہے وہ ذرا زیادہ کھینچا جاتا ہے اور جو چاند سے دور ہوتا ہے وہ کم کھینچا جاتا ہے۔ جب کہ پانی سطح پر بہہ کر اِدھر اُدھر بھی ہو سکتا ہے تو اس لیے ایسا ہوتا ہے کہ ایک کے بجائے دو دو ابھار ہوتے ہیں۔ (دیکھیے شکلِ ذیل)



شکل (۲) چوبیس گھنٹوں میں دو مدوجزر۔

آفاقی ثقل

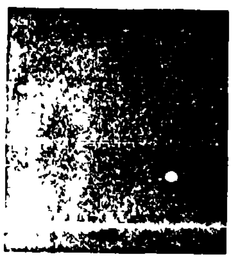
تو جب ہم ثقل کو سمجھ لیتے ہیں تو کیا کیا سمجھ سکتے ہیں؟ ہر کوئی جا ہے کہ زمین گول ہے۔ زمین گول کیوں ہے؟ یہ بہت آسان —

یہ ثقل کے باعث ہے۔ ویسے زمین تھوڑی بہت ایلپس نما ہے۔ کیونکہ یہ گھوم بھی رہی ہے۔ ثقل سے ہم ایلپس کی صحیح بناوٹ حاصل کر سکتے ہیں۔ اس طرح فقط ثقل کے قانون سے ہی ہم اخذ کر سکتے ہیں کہ سورج، چاند، زمین سب (تقریباً) گول کُرے ہیں۔

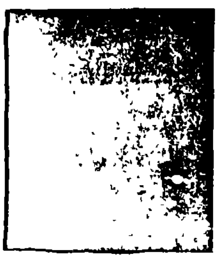
ثقل کے قانون سے ہم اور کیا کر سکتے ہیں؟ ایک تو یہ کہ اگر آپ مشتری کے چاندوں کو دیکھیں تو آپ اُن کے بارے میں سب کچھ معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ مشتری کے اطراف کس کس طرح حرکت کرتے ہیں۔

اب اگر سب سیّارے ایک دوسرے کو بھی کھینچتے ڈھکیلتے ہیں تو جو قوت مثلاً مشتری کو سورج کے اطراف حرکت کرنے میں کنٹرول کرتی ہے وہ فقط سورج کی قوت نہیں ہو سکتی۔ بلکہ مثلاً زحل کا کھنچاؤ بھی اس میں شامل ہوتا ہے۔ اس بنا پر مشتری، زحل اور یورانس کی حرکتوں کا تجزیہ کیا گیا۔ ان سیّاروں کے ایک دوسرے پر اثرات کا حساب لگایا گیا کہ دیکھیں آیا اس ایک قانون سے اُن کی حرکتوں میں انحرافات اور بے قاعدگیوں کو پوری طرح سمجھا جا سکتا ہے یا نہیں۔ تو کیا پاتے ہیں کہ مشتری اور زحل کے لیے تو سب ٹھیک تھا لیکن یورانس کا مدار 'عجیب و غریب' ہی بنا رہا۔ یورانس کا برتاؤ بڑے عجیب ڈھنگ کا تھا۔ یہ بالکل ایلپس پر تو نہیں حرکت کر رہا تھا جو ویسے کوئی عجیب بات نہیں تھی لیکن مشتری اور زحل دونوں کے کھنچاؤ شامل کرنے کے بعد بھی اس کی حرکت عجیب ہی بنی رہی۔ کیا اس سے یہ مطلب نکلتا تھا کہ ثقل کا قانون غلط ہے؟ دو آدمیوں ایڈمس اور لیوریئٹر علی الترتیب انگلستان اور فرانس میں آزادانہ طور پر ایک اور امکان پر پہنچے جو یہ تھا کہ شاید ایک اور سیّارہ بھی ہے۔ تاریک اور غیر مرئی سا۔ جسے انسان اب تک دیکھ نہیں پائے تھے یہ سیارہ یورانس کو کھینچ سکتا ہے۔ انہوں نے حساب لگایا کہ ایسا سیارہ کہاں ہو سکتا ہے۔ انہوں نے متعلقہ رصدگاہوں کو پیغامات ارسال کیے اور کہا "حضرات! اپنی دوربینوں کا رُخ فلاں جگہ کی طرف کیجیے اور آپ ایک نیا سیارہ دیکھیں گے"۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ اس پر منحصر ہوتا ہے کہ آپ کس کے ساتھ کام کر رہے ہیں کہ وہ آپ کو سنتے بھی ہیں یا نہیں۔ انہوں نے لیوریئٹیر کو سنا۔ انہوں نے دیکھا اور پایا کہ نیا سیارہ موجود ہے۔ تب دوسری رصدگاہ نے بھی جلدی سے اگلے چند دنوں میں دیکھا اور انہوں نے بھی اسے پا لیا۔

اس دریافت سے پتہ چلتا ہے کہ پورے نظام شمسی میں نیوٹن کے قانون درست ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن کیا وہ سیّاروں کے نسبتاً نزدیک کے فاصلوں سے آگے تک بھی درست ہوتے ہیں؟ پہلی بات تو یہ کہ کیا تارے بھی سیّاروں کی طرح ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں؟ دوہرے تاروں کے منظر میں ہمیں قطعی ثبوت اس بات کا ملتا ہے کہ وہ بھی ایسا کرتے ہیں۔ ذیل کی شکل میں ایک دوہرا تارا (یعنی دو تارے قریب قریب) دیکھا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی وہی تارے کئی سال بعد کیسے دکھائی دیے، اس کی تصویر بھی ہے دیکھا جا سکتا ہے کہ تیسرے تارے کی نسبت سے (جو خود نہیں ہلا ہے) دوہرے تارے کے دونوں تاروں کو ملانے والا محور گھوم گیا ہے۔



(ا) ایک دوہرا تارہ

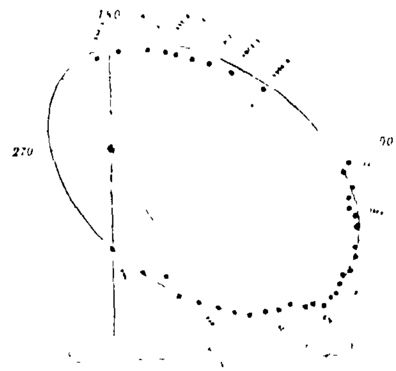


(ب) وہی دوہرا تارہ کئی سال بعد

شکل ۳۰ تاروں میں کشش ثقل۔

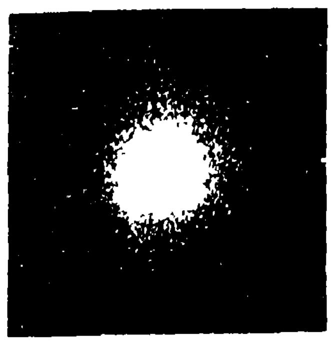
کیا یہ تارے نیوٹن کے قانون کے مطابق گھومتے ہیں؟ ایک ایسے ہی دوہرا تارہ نظام کے تاروں کی باہمی نسبی پوزیشن شکل ۴ میں ذیل میں دکھائی گئی ہیں۔ اس طرح ایک خوب صورت ایلپس حاصل ہوتا ہے۔ ہر چیز نیوٹن کے قانون کے مطابق ہے۔ سوائے اس کے کہ تارہ سیریس A ایلپس کے فوکس پر نہیں ہے! ایسا کیوں ہے؟ اس وجہ سے کہ ایلپس کا مستوی آسمان کے مستوی میں نہیں

ہے یعنی ہم ایلپس کو بالکل عمودی سمت سے نہیں دیکھ رہے ہیں۔ جب ایک ایلپس کو ٹیڑھا کر کے دیکھا جاتا ہے تو وہ ایک ایلپس تو رہتا ہے لیکن پھر فوکس اپنی اسی جگہ نہیں رہتا۔



شکل (۴) دوہیرے تارے سیریئس میں سیریئس A کی نسبت سے سیریئس B کا مدار۔

اس طرح ہم دوہیرے تاروں کا، ان کے باہم ایک دوسرے کے اطراف گھومنے کا، ثقل کے قانون کے مطابق تجزیہ کر سکتے ہیں۔
شکل نمبر ۵ میں دکھایا گیا ہے کہ ثقل کا قانون اور بھی زیادہ بڑے فاصلوں پر بھی صحیح ہوتا ہے۔



شکل (۵) ایک کروی تارہ گچھا۔

اس شکل میں آسمان میں دکھائی دینے والی خوبصورت ترین چیزوں میں سے ایک دیکھی جا سکتی ہے۔ اسے ایک کروی تارہ گچھا (globular star cluster) کہتے ہیں۔ تصویر کے سارے سفید نقطے الگ الگ تارے ہیں اور سب سے اندر کے تاروں کے مابین بھی دراصل باہمی فاصلے کافی ہیں۔ تصویر سے ظاہر ہے کہ تاروں کے مابین ایک تجاذب ہے۔ یہیں زیادہ تارے گچھے کے بیچ میں اور مقابلتاً کم تارے گچھے کے باہری حصے میں ملتے ہیں۔ اس تصویر سے ہم نتیجہ نکالتے ہیں کہ ہمارے نظام شمسی سے کوئی ایک لاکھ گنا زیادہ دوریوں تک بھی ثقل کا وہی قانون عمل کرتا ملتا ہے۔

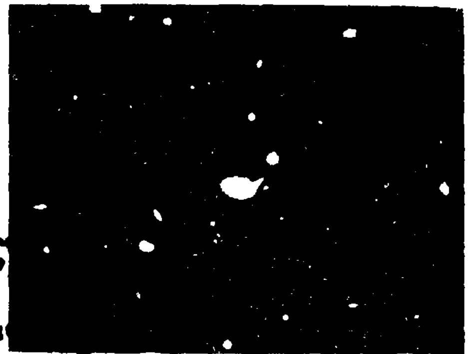
لیجیے اور آگے بڑھیں اور ایک پورے مجرّے (Galaxy) کو دیکھیں جسے حسب ذیل شکل میں دکھایا گیا ہے۔



شکل (۶) ایک مجرّہ (کہکشاں)

شکل سے ظاہر ہے کہ مادّے میں یکجا ہونے کا رجحان ہے۔ سوال کیا جا سکتا ہے کہ پھر یہ مجرّہ ایک گولے کی شکل میں کیوں نہیں ہے؟ اس کی وجہ ہے اس کا گھماؤ یعنی یہ گھوم رہا ہے اور زاویائی تحرک رکھتا جو وہ سکڑتے وقت جھٹک کر الگ نہیں کر سکتا۔ اسے زیادہ تر ایک مستوی میں ہی سکڑنا ہوتا ہے۔ ان مجرّوں کی وضع قطع دراصل کیسے متعین ہوتی ہے یا ان کے بازو کیسے بنتے ہیں، وغیرہ ابھی پوری طرح سمجھے نہیں جا سکے ہیں لیکن یہ پھر بھی واضح ہے کہ مجرّے کی شکل کا تعلق ثقل سے ہے۔ اگرچہ کہ اس کی ساخت کی پیچیدگیاں اس کے پورے طرح تجزیے کی اجازت نہیں دیتیں۔ جہاں تک فاصلوں کا تعلق ہے جو ایک مجرّہ ہوتا ہے اس میں ہم پچاس ہزار یا ایک لاکھ نوری سالو کے پیمانوں کے فاصلوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ یہ فاصلے دراصل کتنے بڑے ہیں اس بات سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ زمین کی سورج سے دوری فقط $8\frac{1}{3}$ نوری منٹ ہی ہے۔

شکل نمبر ۶ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ثقلی تجاذب اور بھی زیادہ بڑے پیمانے پر پایا جاتا ہے۔



شکل (۷) مجرّوں کا گچھا۔

اس شکل میں کئی چھوٹی چیزیں ایک جگہ ہونے کی کوشش کرتی معلوم دیتی ہیں۔ ایک تازہ گچھے کی طرح یہ ایک مجرّوں کا گچھا ہے۔ یعنی پورے پورے مجرّے ایک دوسرے کو ایسے فاصلوں سے کھینچتے ہیں کہ یہ بھی گچھوں کی شکل میں اکٹھے سے ہو جاتے ہیں!

شاید ثقل کی کشش اس سے بھی زیادہ یعنی کروروں نوری سالوں سے بھی زیادہ دوریوں پر عمل کرتی ہے۔ بلکہ جہاں تک ہم جانتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کشش ثقل فاصلے کے مربعے سے معکوسی طور پر بس ہوتی ہی چلی جاتی ہے۔

اس طرح ہم نہ صرف دھندلکوں (Nebulae) کو سمجھ سکتے ہیں بلکہ ثقل کے قانون سے ہم تاروں کے آغاز کی بابت بھی کچھ باتیں معلوم کر لیتے ہیں۔ بین نجمی دھول اور گیس کے بادلوں کو ثقل اس طرح اکٹھا کر دیتا ہے اور وہ اس درجہ بڑے گولے ہو جاتے ہیں کہ ان میں حرنووی تفاعلات ہونے لگتے ہیں اور وہ تارے بن جاتے ہیں۔ پھر تاروں کے پورے ارتقاء کے ہر دور میں ثقل ایک رول ادا کرتا پایا جاتا ہے۔ اس طرح ثقل سے ہم تاروں کے بننے اور پھر لوٹنے تک کے سارے مدارج کی بابت بہت کچھ معلوم کر سکتے ہیں۔

ثقل کیا ہے

بظاہر ثقل کا قانون بہت سہل اور سادہ ہے لیکن اس کے پیچھے جو مشینری کار فرما ہے وہ ہے کیا؟ ہم نے بتا دیا کہ زمین سورج کے گرد کیسے گھومتی ہے۔ لیکن اسے کیا چیز چلاتی ہے اس کی بابت کچھ نہیں کہا۔ نیوٹن نے اس کی بابت کوئی مفروضہ نہیں دیا بلکہ آج تک کسی نے ثقل کی مشنیری نہیں بتائی۔ ثقل کی ویسے کئی وجہیں تجویز کی گئیں ان میں سے ایک کا جو ۱۷۵۰ء میں پہلے دریافت ہوئی ذکر یوں ہے کہ کئی ذرّے فرض کیے جاتے ہیں جو سب سمتوں میں بڑی تیزی سے چل رہے ہیں اور مادّے سے گزرنے میں بہت کم جذب ہوتے ہیں۔ لیکن جب وہ جذب ہوتے ہیں تو وہ ایک دھکا دیتے ہیں۔ بہرحال چوں کہ وہ تعداد میں ایک طرف بھی اتنے ہی ہیں جتنی دوسری طرف تو مثلاً زمین پر اُن کے دھکے ایک دوسرے کو متوازن کر دیتے ہیں۔ لیکن سورج سے ہو کر زمین تک آنے والے ذرّے جزدی طور پر جذب ہو جاتے ہیں۔ اس لیے بمقابلہ سورج کی طرف جاتے ذرّوں کے سورج کی طرف سے آتے ذرّے کم ہوتے ہیں۔ اس لیے کل ملا کر زمین سورج کی طرف ایک دھکا محسوس کرتی ہے اور یہ دکھانا آسان ہوتا ہے کہ یہ دھکا فاصلے کے مربع کے معکوس کی طرح ہوتا ہے۔ اس مشنیری میں کیا غلطی ہے؟ اس خاص مفروضے کی غلطی یہ ہے کہ سورج کے اطراف گھومنے میں زمین پر بمقابلہ پیچھے کے سامنے سے ذرّے زیادہ گرتے ہیں (جیسے بارش میں بھاگنے میں زیادہ قطرے سامنے سے چہرے پر اور کم پیچھے سر کی پشت پر پڑتے ہیں) اس لیے سامنے سے زمین کو زیادہ دھکا لگے گا اور زمین کو چلنے میں مزاحمت ہوگی اور وہ رفتہ رفتہ رُک جائے گی۔ اس کا حساب لگایا جا سکتا ہے کہ زمین کو اس طرح رُک جانے میں کتنی دیر لگے گی اور پتہ چلتا ہے کہ اس کو اتنا زیادہ وقت نہیں لگتا کہ وہ ابھی تک اپنے مدار پر چلتی ہوتی۔ اس لیے یہ مشینری کام نہیں دیتی۔ آج تک کوئی مشنیری ایسی نہیں دریافت ہو سکی جو ثقل کو سمجھانے کے ساتھ ساتھ کسی ایسے مظہر کی پیش گوئی اور نہیں کر دیتی جن کا کوئی وجود نہیں ہوتا! یہ مسئلہ ابھی باقی ہے۔

آیئے ثقل کا دوسری قوتوں سے جو رشتہ ہے اُن کی بابت ایک دلچسپ بات کا ذکر کریں۔ دو برقیوں کے بیچ برقی تنافر اور ثقلی تجاذب کی نسبت (Ratio) برقیوں کے بیچ کے فاصلے پر انحصار

نہیں کرتی بلکہ قدرت کا جیسا کہ کہتے ہیں ایک بنیادی ثابت ہوتی ہے۔ دو برقیوں کے درمیان ثقلی تجاذب بمقابلہ برقی تنافر کے ایک بٹے 4.17×10^{42} ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اتنا بڑا عدد آتا کہاں سے ہے؟ کئی امکان ہوسکتے ہیں۔ ان میں ایک وہ ہے جس کا تعلق کائنات کی عمر سے ہے۔ اگر ہم روشنی کا ایک پروٹان پر سے ہو کر گزرنے کا وقت لیں جو 10^{-24} سیکنڈ ہے اور اس کا موازنہ کائنات کی عمر سے کریں جو تقریباً 10^{10} سال ہے تو جواب وہی 10^{42} آتا ہے۔ اس لیے یہ تجویز ہوا کہ ثقلی ثابت Gravitational Constant کا تعلق کائنات کی عمر سے ہے۔ لیکن اگر ایسا ہے تو ثقلی ثابت کو وقت کے ساتھ بدلنا چاہیے کیونکہ کائنات کی عمر بدلتی رہی ہے۔ تو کیا ثقلی ثابت وقت کے ساتھ بدل رہا ہے؟ ایک ٹسٹ یہ ہوسکتا ہے کہ پچھلے 10^{9} سالوں میں ایسی تبدیلی کے اثر کا حساب لگایا جائے۔ یہ 10^{9} سال وہ عرصہ ہے جب زمین پر سب سے پہلے حیات کے آثار ابھرے اور یہ وقفہ کائنات کی عمر کا دس فیصد ہے۔ تو اگر اس وقت ثقلی ثابت کو دس فیصد بڑا لیں تو سورج دس فیصد سے کہیں زیادہ بڑھ کر روشن ہوتا ہے اور زمین بھی سورج کے زیادہ نزدیک ہوگئی ہے۔ سب ملا کر معلوم ہوگا کہ زمین کوئی سو درجے زیادہ گرم ہوگی اور سارا پانی سمندر میں رہنے کے بجائے بخار بن کر ہوا میں جا چکا ہوگا۔ چنانچہ زمین پر پانی کے اندر زندگی کا ابھر کر ارتقا پانا ناممکن ہوگا۔ اس لیے ہم نہیں مانتے کہ ثقل کا ثابت یعنی ثقلی قوت کی شدت کا پیمانہ کائنات کی عمر کے ساتھ بدل رہا ہے، لیکن ہم یہ بھی نہیں مانتے کہ جو وجوہات ہم نے دی ہیں وہ اس قدر قطعی ہیں کہ اس موضوع پر غور و فکر کو ختم ہی سمجھا جائے۔ اس موضوع پر بحث ابھی جاری ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ثقل کی قوت کمیت مادہ کے متناسب ہوتی ہے جب کہ کمیت مادہ خود وہ مقدار ہے جو بنیادی طور پر جمود کا ایک پیمانہ ہوتا ہے۔ یعنی اس کا پیمانہ کہ کوئی چیز جو کسی رسی میں بندھی دائروں میں گھوم رہی ہو، پکڑے رہنے میں کتنی مشکل یا آسانی ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک وزنی اور ایک ہلکی چیز دونوں کسی اور چیز کے اطراف ایک ہی رفتار سے چل رہے ہوں تو ایک ساتھ ہی رہتے ہیں۔ یہ بہت دلچسپ بات ہے۔ یعنی ثقل کی قوت کا کمیت مادہ کے حد درجہ درستگی کے ساتھ ہم تناسب ہونا۔ کیوں کہ اگر ایسا نہیں ہوتا تو کوئی اثر ایسا ہوتا جس سے جمود اور وزن مختلف ہوجاتے۔ ایسے کسی اثر کا نہ ہونا ایک تجربے کے ذریعے بڑی درستگی کے ساتھ جانچا گیا جس کو پہلے ۱۹۰۹ء میں ایوٹواس (Eötvös) نے اور حال میں ڈکے (Dicke) نے دہرایا۔ ساری چیزوں کے لیے جن کو پرکھا گیا کمیات مادہ اور اوزان ایک ارب میں ایک حصے سے بھی کم غلطی کی حد تک بالکل ہم تناسب پائے گئے! یہ درستگی کی حد دیکھتے ہوئے ایک واقعی قابل ذکر تجربہ ہے۔

ثقل اور نسبیت

اس سارے ہنگامے کے باوجود جو اس سے پیدا ہوا یہ پتہ چلا کہ نیوٹن کا ثقل کا قانون دراصل درست نہیں ہے! نیوٹن کے مطابق ثقل کا اثر فوری ہوتا ہے یعنی ہم اشاروں کو لامحدود رفتار سے بھیج سکتے ہیں۔ آئن اسٹائن نے بتایا کہ ہم اشاروں کو روشنی کی رفتار سے زیادہ تیز نہیں بھیج سکتے۔ اس لیے ثقل کے قانون کو غلط ہونا چاہیے۔ ثقل کے قانون کی آئن اسٹائن نے نسبیت کے نظریے کو ملحوظ رکھ کر تعمیم کی۔ اس کی اس طرح تعمیم کرنے سے ہمارے پاس ایک نیا قانون ہوجاتا ہے جسے آئن اسٹائن کا ثقلی قانون کہتے ہیں۔ اس نئے قانون کا ایک نیا پہلو جس کا سمجھنا قدرے آسان ہے یہ ہے کہ آئن اسٹائن کے نظریے میں ہر وہ چیز جو طاقت رکھتی ہے، کمیت مادہ بھی رکھتی ہے اور اس لیے ثقلی طور سے تجاذب پا سکتی ہے جتنی کہ روشنی بھی طاقت رکھتی ہے، کمیت مادہ بھی رکھتی ہے۔ جب روشنی کی شعاع جو طاقت رکھتی ہے، سورج کے قریب سے ہو کر آتی ہے تو اس پر سورج کا کھنچاؤ ہوتا ہے۔ اس طرح روشنی سیدھی نہیں چلتی بلکہ مڑ جاتی ہے۔ سورج گہن کے دوران مثلاً وہ تارے جو سورج کے اطراف نظر آتے ہیں اپنی ان جگہوں سے ہٹے ہوئے نظر آنے چاہیں جہاں وہ ہوتے اگر سورج وہاں نہ ہوتا اور یہ بات مشاہدہ ہو چکی ہے۔

آخر میں آیئے ثقل کا موازنہ دوسرے نظریوں

باقی صفحہ نمبر ۵۶ پر ملاحظہ فرمائیں

ایڈس ـــــ جدید سائنسی نقطۂ نظر

یا خلیوں کا اکتسابی دفاعی ردِّ عمل

صفی اختر

آج کے اس ترقی یافتہ دور میں جسے صنعتی اور مشینی دور بھی کہا جاتا ہے، یورپ اور امریکہ والے ایک طرف جہاں خلائی تحقیق پر ملینوں ڈالر خرچ کر رہے ہیں اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے معاملے میں اپنے کو اور زیادہ ایڈوانس ثابت کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں، وہیں دوسری طرف حقیقی دماغی سکون و اطمینان سے یہ لوگ محروم ہوتے نظر آتے ہیں اور جن نئی نئی آفات اور پیچیدہ بیماریوں کا یہ لوگ شکار ہیں ان میں سے ایک بھیانک اور مہلک مرض "ایڈس" ہے۔ ایسے ترقی پذیر ممالک میں ایڈس جس تیزی کے ساتھ بالکل وبائی طور پر پھیل رہا ہے اس سے وہاں کے طبی ماہرین کو بڑی تشویش ہے۔

ان دنوں ایڈس کا نام سنتے ہی جہاں خوف طاری ہونے لگتا ہے وہیں طبی ماہرین اضطراب میں پڑ جاتے ہیں کہ انہیں اس کے اسباب و علل کا پتہ چل جائے کہ یہ مرض کیوں اور کیسے ہوا؟ مغربی ملکوں میں اس سلسلے میں بڑی بحثیں چل رہی ہیں اور زور و شور کے ساتھ اس پر تحقیقات ہو رہی ہیں

ایڈس سے متعلق ایک امریکی اتھارٹی کا کہنا ہے کہ گذشتہ ۵ سال قبل ایڈس کے مریضوں کی تعداد ۲۸،۰۰۰ ہزار کے قریب تھی لیکن ۱۹۹۱ء کے آخر تک صرف ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ۲۷۰،۰۰۰ تک ہو سکتی ہے۔

اٹلانٹا (Atlanta) میں ایڈس کو کنٹرول کرنے سے متعلق مرکزی پروگرام کے ڈائریکٹر ڈاکٹر والٹر ڈاؤڈلے (Dr Walter Dowdle) کا کہنا ہے کہ ایڈس کے واقعات ۱۹۷۰ء کے بعد سے ہی یورپ، افریقہ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ہونا شروع ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ اگر یہ بیماری خود پیدا کی ہوئی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کی شروعات امریکہ میں ہوئی۔ انہوں نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اس کی ٹکنالوجی میں دو سال لگ گئے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر کوئی شخص پہلے ایڈس وائرس کی دریافت میں لگا ہوا تھا تو یقیناً اسے اس کی ٹکنالوجی معلوم ہوگی کہ کم سے کم کتنی مدت میں ان کا پتہ لگ سکتا ہے۔ اس بات کے پوچھے جانے پر کہ زمانۂ قدیم میں ایڈس کے لیے پرانا طریقۂ علاج رہا ہوگا اور تبتی طریقے (Tibetan System) میں دوائیں رہی ہوں گی۔ ڈاکٹر ڈاڈلے نے کہا کہ اس کے سائنسی ثبوت فراہم کرنے کی کوششیں جاری ہیں

اس دعوے کے بارے میں پوچھے جانے پر کہ کیا ایڈس کے سستی مادے لیباریٹری میں مینوفیکچر ہوتے ہیں تو ڈاکٹر ڈاڈلے نے کہا کہ یہ صرف قیاس آرائیاں ہیں جو سراسر مضحکہ خیز ہیں۔

باوجودیکہ سائنس داں حضرات ایڈس کے خاتمہ اور اس بیماری سے لوگوں کو نجات دلانے کے لیے موثر دواؤں اور ویکسینس (vaccines) کی تلاش میں ہیں پھر بھی ایسے مریضوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہی جا رہا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ اب تک اس کا کوئی علاج مکمل طور پر نہیں ڈھونڈا جا سکا ہے۔ ایک موثر ویکسین کے آنے میں کم از کم ۱۰ برس ہے بلکہ یہ امید ہے کہ اس سے قبل دوائیں آ جائیں گی۔ بعض دواؤں نے دکھایا ہے کہ ایڈس کے مریضوں کی زندگیاں بڑھی ہیں جیسا کہ تحقیقات کی روشنی میں بتایا جاتا ہے۔ ان دواؤں سے کچھ امید ضرور ہو جاتی ہے لیکن یہ دوائیں نہ تو مرض کو ختم کرتی ہیں اور نہ ہی ایڈس کے جراثیم ہی مرتے ہیں۔

ایڈس ہے کیا اور اس کے کیا اسباب ہیں؟

آج ساری دنیا میں ایڈس کی تحقیق پر ایک کثیر رقم خرچ ہو رہی ہے تاکہ اس کا موثر علاج معلوم ہو سکے ایشیائی ممالک میں تو لوگ امراض وبائی کے علم (Epidemiology) سے بھی ناواقف ہیں اور حد تو یہ ہے کہ اس لفظ "ایڈس" کی اصطلاح عام طور پر لوگ جانتے ہی نہیں۔

لفظ ایڈس (A.I.D.S) اکوائرڈ امیون ڈیفی شینسی سینڈروم (Acquired Immune Deficiency Syndrome) کا مخفف ہے۔ ایڈس کا مسئلہ ابھی برسوں تک تشویش، پیچیدگی اور مشکلات کا شکار رہے گا۔ کیوں کہ بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ملک کے زیادہ تر لوگ غیر تعلیم یافتہ ہیں۔ یورپ اور امریکہ وغیرہ میں چوں کہ لوگ عام طور پر تعلیم یافتہ ہیں اس لیے وہاں کے زیادہ تر لوگ اس وبائی بیماری کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتے ہیں۔ ابھی تک دنیا کو اس مرض کے حقیقی اسباب وعلل کا پتہ نہیں چلا ہے۔ دنیا میں مختلف ملکوں میں شہرت یافتہ تحقیقی تجربہ گاہوں میں اس وبائی بیماری کے اسباب وعلل کا سراغ لگانے کے لیے مختلف سائنس داں تحقیقات میں مصروف ہیں۔ یہ بات مگر واضح ہو چکی ہے اور سبھوں کا اس پر اتفاق بھی ہے کہ ایڈس جسم میں قوت مدافعت کی کمی (Immunity Deficiency) سے بھی ہو رہا ہے۔ اگر جسم میں قوت مدافعت نہیں ہے تو ہلکی پھلکی بیماری بھی ہمارے لیے وبال جان بن جاتی ہے۔

بہت کم بیماریاں ہیں جن میں قوت مدافعت کا دخل ہوتا ہے۔ کچھ نہ کچھ جراثیم سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت جسم میں موجود ہونی چاہیے۔

قوتِ مدافعت (Immunity) دو قسم کی ہوتی ہے،

۱۔ قدرتی قوت مدافعت (Natural Immunity)

۲۔ حاصل شدہ قوت مدافعت (Acquired Immunity)

حاصل شدہ امیونٹی پیدا کرنے کے لیے دو اجزاء کی ضرورت ہے

پہلا اینٹی جن (Antigen) اور دوسرا اینٹی باڈی (Antibody)

بہرحال ایڈس کے بارے میں مختلف سائنس داں مختلف رائے رکھتے ہیں۔ البتہ بنیادی طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ مغربی ممالک میں زیادہ تر ہوموسکسوئلس (Homosexuals) کے سبب ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر والٹر ڈاڈل کا کہنا ہے کہ لوگ خود ہی اس وبائی مرض سے اپنی حفاظت کر سکتے ہیں۔ ایک شخص کا دوسرے شخص کے ساتھ سکسوئل ٹرانسمیشن اور کپاونڈروں کے ذریعے گندی سوئیوں (Needles) کا استعمال ہی ایڈس وائرس کے مخصوص چینل (Channels) ہیں۔ جب ایک سے دوسرے آدمی میں اس کے سمی مادوں کی منتقلی سے حفاظت کی جا سکتی ہے تو یہ بیماری خود ہی کم ہو جائے گی اور تعلیم کے ذریعے لوگوں کو ترغیب دینے کی بھی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر والٹر سے جب یہ پوچھا گیا کہ کیا کیڑوں اور مچھروں کے ذریعے ایڈیس کی بیماری پھیلتی ہے تو انہوں نے کہا کہ اس کے ایپی ڈیمولاجیکل ثبوت (Epidemiological Evidence) نہ تو امریکہ میں ہیں اور نہ افریقہ ہی میں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ افریقہ کے بعض وحشیوں نے سبز بندروں (Green Monkeys) کو مار کر اپنی خوراک بنایا جس کے نتیجے میں ان کے جسم میں سمی مادے پیدا ہو گئے اور پھر دھیرے دھیرے یکے بعد دیگرے لوگوں میں اس کے وائرس منتقل ہوتے گئے۔ اس طرح ایڈس وبائی طور پر عام ہو چلا۔

ہندوستان میں ہوموسیکسوئلس (Homosexuals) میں ایڈس وائرس (Aids Viruses) کے کیریرس (Carriers) کا پتہ لگانے کے لیے۔ آئی۔سی۔ایم۔آر (ہندوستانی میڈیکل کاؤنسل اینڈ ریسرچ) اہم کام کر رہی ہے۔ آئی۔سی۔ایم۔آر جو کہ ایڈس پروگرام سے مستقل جڑی ہے، ان لوگوں کا کہنا ہے کہ ہائی رسک گروپس (High Risk Groups) کی ۲۵،۰۰۰ مختلف کتب کا سروے کیا گیا جس میں سے ۹۰ کتابیں ایسی نکلیں جو ایڈس اینٹی باڈیز (AIDS Antibodies) کے بارے میں اثبات میں جواب دیتی ہیں اور زیادہ فیصد کتابیں یہ بتاتی ہیں کہ یہ بیماری عصمت فروشی اور غلط طور پر جنسی خواہشات پوری کرنے کے نتیجے میں ابھر رہی ہے۔

اس ملک میں ایڈس کے صرف تین واقعات کا علم ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمارے ملک ہندوستان میں ہوموسیکسوئلس کی بڑی تعداد ہے ہی نہیں اور اس لیے کوئی فکر کی بات نہیں۔ اصل بات یہ ہو سکتی ہے کہ یہاں کے لوگ ویسٹرن ممالک کی طرح ہی نہیں۔ ہوموسیکسوئلس عمل

(Homosexual Activity) تو ہمارے ملک میں غیر قانونی ہے۔ اس لیے جو بھی اس جرم میں مبتلا ہوگا وہ کسی طرح بھی قابلِ معافی نہیں اس لیے ایسے لوگ اپنے کو ایڈس کی جانچ کے لیے مارے خوف کے پیش نہیں کر رہے ہیں۔

ایڈس کے جراثیم ایچ۔ٹی۔ایل۔وی۔۳ (HTLV. III) کے اینٹی باڈی کی معلومات کے لیے باہر سے جو Serveillance kits منگائے جاتے ہیں، کے بلڈ سیرم کی جانچ کی جاتی ہے۔ آئی۔سی۔ایم آر۔ ریسرچ آفیسر کے لیے یہ دشوار گزار مسئلہ ہے کہ کٹس (kits) کو کم درجہ حرارت پر کیسے رکھا جائے کیوں کہ ریفریجریشن کی سہولیات ہمیشہ ممکن نہیں۔ جب تک کٹس کو استعمال میں رکھنے کے لیے آئس پیک (Ice-pack) میں رکھا جاتا (Preserve) ہے۔

ایڈس کو اس حد تک ڈراؤنا بنا دیا گیا ہے کہ لوگوں میں سنسنی سی پھیلی ہوئی ہے۔ ابھی حال میں حکومت مہاراشٹر کے اس اعلانیہ پر کہ اس ریاست میں عوام کو ایڈس کے سلسلے میں لوگوں کو قبل سے ہی بیدار کر دیا جائے تاکہ یہ وبا یہاں نہ پھیل سکے، وہاں کے ڈاکٹروں کی سخت مذمت کے بعد نظر انداز کر دیا گیا کہ یہاں ایڈس کلینک کھولنے سے لوگوں میں اور زیادہ خوف و ہراس پھیلے گا۔ جب کہ ایڈس پر کنٹرول کرنے اور اس پر ریسرچ کرنے کے لیے امریکہ نے لگ بھگ ۸۰ ملین ڈالر کا بجٹ رکھا ہے علاوہ ازیں افریقہ اور عالمی ادارۂ صحت (ڈبلو۔ ایچ۔ او) کو تحقیقات کے لیے امریکہ امداد دے رہا ہے۔ اس کے ریسرچ کے لیے امریکہ WHO کو اپنے آدمی بھی دے رہا ہے۔

جی۔ٹی۔ اسپتال کے ڈاکٹر جے۔کے۔ منیار (J.K. Maniar) نے انڈین میڈیکل ایسوسی ایشن کے تحت چلائے جا رہے ریفریشر کورس میں بولتے ہوئے کہا کہ ایڈس وییڈس کوئی چیز ہی نہیں ہے بلکہ اس بیماری کے بارے میں حکومتی سطح پر صرف چرچے ہو رہے ہیں۔

ایک ماہر ڈرماٹولوجسٹ (ماہر جلد) کی حیثیت سے واضح طور پر اس بات کی تردید کی کہ یہ بیماری پسینے سے، لعاب دہن Saliva سے یا ایک شخص کی چھوئی ہوئی چیز کا دوسرے کے ذریعے استعمال کرنے سے ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسٹریلیا میں ایک مطالعہ سے یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ ۸۸٪ واقعات ہم جنسی تعلقات سے ۸٪ ادخال خون سے ۱٪ کے دواؤں کے غلط استعمال سے ۱/۲٪ ہیٹروسکسوئل کے سبب جب کہ ۰.۹٪ نان کریکٹرگروپ (Non-Characteristic Groups) کی وجہ سے یہ بیماری پھیل رہی ہے۔

جسلوک ہسپتال (بمبئی) کے ڈاکٹر آر۔ڈی۔ لیلے کے مطابق امریکہ میں آج ایڈس وائرس کے ۱۰ ملین ایجابی واقعات میں سے ۲۰٪ تو پورے شباب کے ساتھ یہ بیماری بڑھ سکتی ہے۔ کلینکی پہلو اور اس بیماری کی لیباریٹری تشخیص پر ڈاکٹر لیلے نے انکشاف کیا کہ یہ بیماری ۵ یا ۶ اسٹیجوں میں ہے۔

۱۔ اس کا ابتدائی مرحلہ یہ ہے کہ مریض میں وائرس پازیٹیو ہو لیکن اینٹی باڈی نگیٹیو ہو۔
۲۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے جب کہ سچی مادّے منفی ہوں (—) اور اینٹی باڈی مثبت۔
۳۔ تیسرے مرحلے میں پری۔ ایڈس سنڈروم (Pre-Aids-Syndrome) دکھائے
۴۔ چوتھے مرحلے میں بخار ہو۔
۵۔ پانچویں مرحلے میں بیماری زور پکڑلے اور جراثیم لمفو ٹرایک اور نیوروٹرایک ہو جائے۔

امریکہ میں تحقیق کے بعد جو بات ثابت ہوتی ہے اس کا حوالہ دیتے ہوئے کوپر اسپتال (Cooper Hospital) کے ڈاکٹر ایس۔جے۔ پنکر (S.J. Pinker) کا کہنا ہے کہ اگرچہ ۷۳ فیصد لوگ ہوموسیکسوئیلٹی کی وجہ سے اور ۵۶ فیصد خواتین ڈرگ ابوزر (Drug Abusers) ہونے کے سبب ایڈس کے مرض میں مبتلا ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ امریکہ میں ہر ایک مرد کے بعد ایک عورت اس کا شکار ہے۔

واڈیا ہسپتال کے ڈاکٹر این۔سی۔جوشی کا قول ہے کہ نوزائیدہ بچے بھی اس وبائی بیماری کا شکار ہیں، ابھی بتانا مشکل ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بچوں میں وزن کا گھٹ جانا، خلاف معمول جسم کی سست بالیدگی، شدید دست آنا اور بخار کا ایک ماہ سے اوپر رہنا ایک پریشان کن بات ہے اور یہ ایڈس

کی علامات ہوسکتی ہیں۔

مسٹر جوشی کا کہنا ہے بچوں میں ایڈز کے ۵۰ واقعات میں سے ۱۲ واقعات ایسے تھے جو ادخال خون کے نتیجے میں اور ۲۶ واقعات پرخطر ماحول کی بنا پر وقوع پذیر ہوئے جب کہ نامکمل معلومات کی بنا پر ۹ ایسے واقعات کا صحیح صحیح پتا نہیں چلایا جا سکا۔

عالمی پیمانے پر ایڈس کی وبا اتنی گمبھیر ہو جائے گی کہ قبل کی تمام وبائی بیماریاں جیسے طاعون (پلیگ)، سیاہ پلیگ، چیچک اور ٹائیفائڈ اس کے سامنے ماند پڑ جائیں گی۔ یہ بات ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں محکمۂ صحت میں اونچے عہدے پر فائز ایک اعلیٰ افسر نے اس بات کا انکشاف کیا ہے۔

امریکہ کے محکمۂ صحت و انسانی خدمات کے سکریٹری مسٹر اوٹس۔ آر۔ بوئن (Otis. R. Bowen) کا قول ہے کہ اگر ہم لوگ ترقی کر کے موجودہ حالات میں اس خطرناک اور مہیب فضا کا مقابلہ عالمی پیمانہ پر نہیں کرتے ہیں تو اب سے دس سال کے بعد کثیر التعداد لوگ (ڈبیوں ملین) اس وبائی بیماری کے نتیجے میں اموات کا شکار ہوں گے۔ تازہ ترین سائنسی مشاہدے کی بنا پر یہ بتایا جا رہا ہے کہ پچھلے گزرے ہوئے برسوں میں جو ملینوں اموات ہوئی ہیں وہ مستقبل میں ہونے والی اموات کے مقابلے میں کم ہوں گی۔

مسٹر آر۔ بوئن نے انکشاف کیا کہ آئندہ ۲۰ برسوں میں عالمی پیمانے پر ایڈس کے سمّی مادے ۵۰ ملین سے ۱۰۰ ملین لوگوں میں ہوں گے اور اگلے پانچ سال میں صرف امریکہ میں ۲۷۰،۰۰۰ حقیقی واقعات میں سے دس فیصد ہیٹرو سیکسوئل کی بنا پر ہونے کی توقع ہے۔ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ ۱۵-۱۰ لاکھ امریکی ایسے ہیں جن کے اندر ایڈس کے جراثیم ہیں اور اس بھیانک متعدی بیماری کا اثر قبول کرنے والے ہیں۔

جرمن ریسرچ سروس کی رپورٹ کے مطابق عرصۂ دراز تک مطالعہ ہونے کے بعد بھی خاطر خواہ کامیابی اس بیماری سے نجات دلانے میں نہیں مل سکی ہے۔ نتیجتاً اس بیماری کے شکار لوگ مایوس ہو گئے ہیں۔

فرینک فرٹ یونیورسٹی کے محققین کی اسٹڈی کے بعد یہ نتائج سامنے آئے ہیں کہ ۷ برسوں کے اندر ۵۰ فیصد لوگوں میں جو کہ ایچ۔ ٹی۔ ایل۔ وی۔ ۳ وائرس (HTLV — 3Virus) اور پناہ دینے والے اینٹی باڈیز ہیں ایڈس کے پورے طور پر شکار ہوں گے۔ نتیجتاً تحقیقات نے اس عام عقیدے کو ختم کر دیا کہ صرف ۲۰ فیصد لوگوں میں ہی یہ مرض پھیلے گا۔ بقیہ لوگوں میں باوجود کہ ان کے خون میں اینٹی باڈیز موجود ہیں، پھر بھی اس بیماری سے متاثر نہیں ہوں گے اور معمول کے مطابق زندگی گزاریں گے، یہ ایک بھول ہے۔

ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ۱۹۸۲ سے ہی ۲۷۷ ایسے جرمن باشندوں کا جن کے خون میں اینٹی باڈیز ہیں، مستقل مشاہدہ کیا گیا۔ سائنسی مشاہدے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا گیا کہ صرف ان میں ۲۰ فیصد لوگ صحت مند رہے بقیہ لوگوں میں اس بیماری نے زور پکڑ لیا اور دو سال کے بعد وہ لوگ جاں بحق ہو گئے۔

ڈاکٹر اوٹس۔ آر۔ بوئن کا کہنا ہے کہ ایڈس سے نجات کے لیے جلد ہی ویکسین آجائیں گے لیکن اس صورت حال پر قابو پانا بہت مشکل نظر آرہا ہے کیوں کہ ویکسینس بر وقت فراہم ہو سکیں گے یہ کہنا ذرا دشوار ہے۔

حالیہ رجحانات پر مبنی ایک کمپیوٹر فورکاسٹ — Computer (Forecast) سے یہ پتہ چل سکے گا کہ جن کے اندر ہاف اینٹی باڈی (Half anti body) ہیں وہ بھی پانچ برسوں میں ایڈس کے زبردست شکار ہوں گے۔

بہر حال امریکہ کی کیلیفورنیا یونیورسٹی میں اس پر زبردست تحقیقات ہو رہی ہیں اور کئی ممالک مثلاً فرانس، جرمنی اور دوسرے مغربی ملکوں سے توقع ہے کہ وہ جلد از جلد اس سلسلے میں پیش رفت کر کے ایڈس کے علاج کے لیے ویکسینس (Vaccines) اور دوسرے انسدادی وسائل فراہم کر سکیں گے۔ ساتھ ہی ہمارے ہندوستانی سائنس داں، ڈاکٹر اور محققین جلد سے جلد طریقِ علاج پر مشترکہ تحقیق میں تیزی پیدا کر کے وہ سبیل نکال لیں گے کہ جب اس بھیانک اور مہلک مرض سے ہمارا ملک محفوظ رہ سکے۔ تحقیق کے بعد جب دوائیں آجائیں گی تو اس کا علاج نہ صرف آسان بلکہ سستا بھی ہوگا۔ اسی لیے ایڈس سے ڈرنے کی کوئی

ضرورت نہیں

ہے۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ج ۷ - ش ۱ - (جنوری ۸۸ء)

مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی ضرورت

حفیظ اللہ نعیمی

سائنس ہماری معاشرتی زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے۔ اس وقت پوری دنیا سائنسی کمپٹیشن کی جولانگاہ ہے۔ کائنات کی ابدی صداقتیں اسلامی تعلیمات کے بحر ذخار میں چھپی ہوئی ہیں۔ اس سائنسی دور میں اس ریل کو صاف کرنے کی ضرورت ہے۔ کیسٹ کے فیتے میں جو صوتی لہریں چھپی ہوتی ہیں، اسے کسی مشینی نظام پر منطبق کرنے سے نغمے پیدا ہو سکتے ہیں۔ صرف کیسٹ کی برقی لہروں میں جتنی سالمیت ہوگی اسی قدر آواز میں مقناطیسیت اور موزونیت پیدا ہوگی۔

سائنسی تعلیم فیتوں میں چھپی ہوئی آواز ہے جس کی دریافت کے لیے ہمیں ایک مشینی طریقہ کار کی ضرورت ہے اور یہ تعلیم کے بغیر ممکن نہیں۔ ہماری درسگاہیں خواہ مکتب یا مدرسہ یا دارالعلوم، جامعہ کی شکل میں ہوں۔ ان پر قدامت کی چھاپ پڑی ہوئی ہے۔ طرز فکر اور طرز تعلیم میں جدیدیت کا رنگ و روغن نہیں۔ اس لیے ہم علوم عقلیہ جاننے کے باوجود علوم جدیدہ میں دوسری قوموں سے پیچھے ہیں۔ دانشوروں کا تغافل کہیے کہ یہ بُعد دن بدن بڑھتا جا رہا ہے اہل مغرب کی چھلانگ مشرقیوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سائنس کی تعلیم و تدریس کو وسیع بنایا جائے۔ تاکہ عالمی برادری میں ہم دوسری قوموں کے شانہ بشانہ چل سکیں اور اپنا وقار بحال کر سکیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جس کی تربیت گاہ میں نسلیں تیار ہو رہی ہیں، اس سے صرف برصغیر کو نہیں بلکہ متعدد ممالک آس لگائے بیٹھے ہیں۔ مرکز فروغ سائنس کا قیام یہ بھی یونیورسٹی کی پیش رفت ہے۔ یونیورسٹی کے بانی مفکر قوم سر سید احمد خاں نے یونیورسٹی کے یوم تاسیس سے اپنا نصب العین بنایا تھا کہ یہاں سے فکر و آگہی کے متعلم کے ایک ہاتھ میں قرآن ہوگا تو دوسرے ہاتھ میں سائنسی تعلیم۔

اس عظیم درس گاہ میں یوم تاسیس کے موقع پر جو فکر پیش کی گئی ہے، ہم اسی کو عام کرنے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ آج ہم ایک ایسے مقام پر کھڑے ہیں جہاں ہمیں کچھ مستقبل ساز فیصلے کرنے ہیں جن پر عمل کر کے ہم ماضی کی کوتاہیوں کا کفارہ ادا کر سکیں۔

اکتشافات جدیدہ سائنس سے عبارت ہے۔ انسان کی فطری خواہش ہے کہ کائنات کی صداقتوں سے خود کو ہم آہنگ کر سکے۔ مغربی ممالک نے اس میدان میں تیزی دکھائی اور دوسری قوموں پر بالادستی حاصل کر لی۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب آج مشرق کی امامت کا فریضہ انجام دے رہا ہے اور مشرق شیر خوار بچے (INFANT) کے مانند ہے۔ وہ قومیں جو بلندی کا قطب مینار بنا لیتی ہیں، انہیں ایک طرح کی بالادستی حاصل ہو جاتی ہے اور جس قوم کے شعور کی شاخ پر احساس برتری کا نشیمن بنتا ہے وہ سالار قوم بن جاتی ہے۔ جو قومیں فنی اور سائنسی بنیاد پر برتری حاصل کر لیتی ہیں، اس قوم کے ہر فرد کے اندر ایک ایسا احساس برتری جنم لیتا ہے جو انہیں قوموں کی قیادت اور سیادت کے لیے تیار کرتا ہے۔ اقوام ماضیہ میں یونان اور روما اس کی بہترین مثال ہیں۔ موجودہ دور میں یورپ اسی احساس برتری کی بنیاد پر پوری دنیا کی قیادت کر رہا ہے۔ درس گاہیں انسان کو دریافت کرتی ہیں۔ علوم عقلیہ و نقلیہ میں یہ دریافت قدرِ مشترک ہیں۔ کائنات کی دریافت مذہب سے جداگانہ شے نہیں البتہ مذہب کے مخالفین جدید سائنسی تحقیقات کی روشنی میں افکارِ بد کی پیروی کریں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ کائنات کی دریافت کوئی مذموم شے ہے۔ کائنات کی دریافت انگور کا خوشہ ہے۔ اسے بنت عنب بنایا گیا تو حرمت کی ہتھکڑیاں سامنے ہیں۔ سکھا لیا جائے تو کشمش ہے جس میں حلاوت کا جوہر ہے۔ معلوم ہوا کہ سائنسی تعلیم حسن لذاتہ تو ہے البتہ

اسے قبیح لغیرہ نہ ہونے دیا جائے۔
چنانچہ اگر سائنس کی تعلیم صحیح مقصد کے لیے ہو تو نتیجہ مذہب کی بالیدگی
ہے لیکن اگر سائنس کو مذہب سے بیگانہ کر دیا جائے تو الحاد و بے دینی
کا دروازہ کھولنے کے مترادف ہے اور اگر اس کی تدریس بے روح ہو تو
یہ دماغ کو فرسودہ تعلیم سے بوجھل کرتا ہے۔ ہمیں اس مقالے میں محاکمہ کرنا
ہے کہ سائنسی تعلیم کی ضرورت کیوں ہے۔ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ یہ
ایک عصری تقاضا ہے۔ آج کے دور میں وہی قومیں زندہ رہ سکتی ہیں جو
سائنس کی ایجادات سے نہ صرف یہ کہ استفادہ کر سکیں بلکہ تحقیق کے میدان
میں اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کی اہل ہوں۔ جادوئے سامری کے لیے
عصائے کلیم، علمِ طب کے کمال کے لیے دمِ عیسیٰ، فصاحتِ عرب کے لیے قرآن
کا اعجاز کیا اس بات کی روشن دلیل نہیں کہ قومیں جب ہتھیار سے مسلح ہوں
تو دفاع کے لیے اس کا متبادل انتظام ضروری ہے۔

اسلام نہ صرف سائنسی تعلیم کے لیے جواز فراہم کر رہا ہے بلکہ سائنس
کے طالب علم کی بھرپور حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ ہم اگر قرآن عظیم کا مطالعہ کریں
تو ہمیں ایسی سیکڑوں آیات مبارکہ ملیں گی جن میں کائنات کی حقیقتوں اور
فطرت کے سربستہ رازوں کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ ارشاد باری ہے۔

"جو آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے ہیں (وہ
پکار اُٹھے) کہ اے پروردگار تو نے اس مخلوق کو بے فائدہ
نہیں پیدا کیا۔"

دوسری جگہ فرمایا گیا،

"وہ خدا کی ذات ہے جس نے سرسبز درخت سے آگ کو نکالا
جس سے تم روشنی حاصل کرتے ہو۔"

فلسفہ تخلیق پر اس طرح روشنی ڈالی گئی۔

"ہم نے پانی ہی سے ہر ذی روح مٹی کو پیدا فرمایا۔"

خرد و آگہی کو اس طرح مخاطب کیا گیا:

"بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات و دن
کا بدلتے آنا اور کشتی کہ دریا میں لوگوں کے فائدے لے
کر چلتی ہے اور جو اللہ نے آسمان سے پانی اُتار کر مردہ
زمین کو اس سے جلایا اور زمین میں ہر قسم کے جانور
پھیلائے اور ہواؤں کی گردش اور وہ بادل کہ آسمان
زمین کے بیچ میں حکم باندھا۔ ان سب میں عقل مندوں کے
لیے ضرور نشانیاں ہیں۔"

قرآن عظیم نے واعدوا لہم ما استطعتم کا حکم دے کر اور سرورِ
کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے تیراندازی، شمشیرزنی اور پیراکی سیکھنے کی
ضرورت بتا کر عالم اسلام کو پیغام دیا کہ مذہب کے لیے فن کی ضرورت
ہے۔ اس دور کی تمدن یافتہ قومیں ایٹمی توانائیاں رکھتی ہیں۔ برقی توانائیوں
کو استعمال کرتی ہیں۔ ریڈیائی لہروں سے دھڑکنیں ناپتی ہیں، سورج کی
شعاعوں کو گرفتار کرتی ہیں۔ کیا اُن کی ترقیاں ہماری اسلامی ثقافت کے لیے
تازیانہ نہیں ؟

مبادیات کے بعد ہم اپنے مقالے کے عنوان پر مقاصد کی تشریح اور
فکری جائزے پیش کرتے ہیں۔ گوش شنوا کی توجہ کی ضرورت ہے۔

وقت کی رفتار کے ساتھ طلبا، اساتذہ اور ہندوستان کے تمام
سائنسی اداروں کو اس سمت تیز رفتاری سے بڑھنا چاہیے۔
سائنس کی تدریس کو مؤثر بنانے کے لیے میدان عمل میں اترنا ضروری ہے
ہماری درس گاہوں کے طلبا کو سائنس کے اقدار کا قدر شناس ہونا چاہیے
سائنس کی تعلیم اسلامی درس گاہوں کے طلباء کی معاشی، معاشرتی،
تمدنی، فطری اور فنی ضروریات کو پورا کر سکتی ہے۔
سائنس کا مطالعہ بہت سے پیشوں کے لیے کلید کی حیثیت رکھتا ہے۔
سائنس کے ذریعے بہت سے علوم کی داغ بیل پڑتی ہے جو خالصتًا
پیشہ ورانہ نوعیت کے ہیں۔ اس سے اقتصادیات کو مدد مل سکتی ہے
مدارس میں سائنس کی تعلیم طلبا کی معاشرتی زندگی میں بہت سے
فنونِ لطیفہ کا دیباچہ بن سکتی ہے۔
سائنس نے ملکوں کی تمدنی اور تہذیبی معیار کو بلند کرنے کے
سلسلے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔
فلسفہ نظری کا نام حکمت اور فلسفہ عملی کا نام سائنس ہے۔ مدارس
میں صرف فلسفہ نظری داخل نصاب ہے، فلسفہ عملی نہیں جب کہ
فلسفہ نظری سے صرف نظریات کی تلوار صیقل ہوتی ہے اور

فلسفۂ علمی سے تمدن کو زندگی ملتی ہے۔
سائنسی ٹیکنالوجی کے ذریعے معاشرتی تنظیمیں سنور سکتی ہے۔
سائنس کی تسخیرات سے ایک فلسفۂ جدید کی بنیاد پڑتی ہے جو کائنات میں انسان کی پوزیشن کا صحیح تعین کرتی ہے۔
سائنس کے ذریعے ہم اپنی ذہنی و فکری توانائیوں کو جلا بخش سکتے ہیں۔

اس فن میں مہارت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی درسگاہیں سائنس کو باضابطہ مضمون کی حیثیت سے اپنے نصاب میں شامل کریں اور اس کے لیے حتی المقدور تجربہ گاہیں قائم کریں۔

عصر حاضر میں دانشوروں کی طرف سے بار بار یہ سوال اُٹھایا جاتا ہے ...ہ دینی مدارس میں علوم جدیدہ کی تعلیم نہ ہونے کے باعث ملتِ اسلامیہ ...و شدید نقصان اُٹھانا پڑتا ہے۔ قوم و ملت کے لیے سود مند یہی ہوگا ...ہ ان مدارس کے نصاب تعلیم میں عصری علوم کو جلدی ہی شامل کرلیا جائے۔ ...میرے ناقص خیال میں ایسے مفکرین تقسیم کار کی حیثیت سے یا تو صرف نظر ...کرتے ہیں یا پھر اس بارے میں دقت نظر سے کام نہیں لیتے۔ اگر مدارسِ ...دینیہ میں تعلیم پانے والے طلبا کا شمار کیا جائے تو میرے اپنے خیال میں عصری ...علوم کے طلبا کے بہ نسبت ان کی تعداد دو فیصد سے کم ہوگی۔ اس کا واضح ...مطلب یہ ہوا کہ ۹۸ فیصد مسلم طلبا جو عصری علوم کی درس گاہوں میں زیر تعلیم ...رہ کر علوم جدیدہ حاصل کر رہے ہیں اور یہ طلبا مذہبی علوم و فنون سے یا تو ...قطعاً ناواقف ہیں یا بہت معمولی واقفیت رکھتے ہیں۔ ایسی صورت میں ۲ فیصد ...سے کم مسلم طلبا دینی درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اگر ان کو بھی عصری علوم ...کی طرف اس طرح مایل کر دیا جائے کہ دینی درس گاہوں میں سائنس و ٹیکنالوجی ...کا انتظام کر دیا جائے تو اس کا واضح مفہوم یہ ہوا کہ اقل قلیل تعداد میں جو علوم ...دینی حاصل کرنے میں لگے ہوئے تھے، ان کو اس سے پھیر کر مذہبی علوم و فنون ...سے بھی محروم کر دیا جائے۔ اس لیے دانش وروں کا مشورہ اصولی طور ...پر تسلیم کرنے کے بعد میں یہ مناسب تصور کرتا ہوں کہ پہلے مذہبی درسگاہوں ...سے ایسے علوم و فنون کو خارج کر دیا جائے جو اسلامی ذہن و فکر کو پروان ...چڑھانے میں معاون نہیں ہوتے۔ مثلاً قدیم علم ہئیت فلاسفہ کے مابعد ...الطبیعاتی مسایل عنصریات، وغیرہ کے مباحث، منطق قدیم کی وہ بحثیں جس میں لفظی صنعت آرائیاں کے سوا انسانی زندگی کو اور کچھ میسر نہیں آتا۔ یعنی مروجہ نصاب تعلیم کی مکمل اصلاح کے بعد علوم جدیدہ یا سائنسی علوم کی اتنی گنجایش نکالی جائے جس سے طلبا میں عصری علوم کے سمجھنے میں سہولت پیدا ہو۔ اسکولوں اور کالجوں یا یونیورسٹیوں کے طرز پر مدارس میں سائنس کی تعلیم اصلی غرض، غایت، مقاصد کے خلاف ایسی جدوجہد ہے جس کو قلبِ ماہیت کے لفظ سے تعبیر کرنا زیادہ مناسب ہے۔ اس سلسلے میں بہتر یہی ہوگا کہ علوم و فنون کے تبادلے کا انتظام خلوص کار کے ساتھ کرنا چاہیے۔ مذہبی درس گاہوں کے علوم کو معلومات عامہ کے طور پر یا دینی ضرورت کے طور پر اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بقدر ضرورت عام کرنے کی جدوجہد شروع کر دی جائے۔ صرف یہ نعرہ سود مند نہ ہوگا کہ مدارس میں سائنسی علوم کی ضرورت ہے۔ اگر اس ضرورت کو غلو کی حد تک ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہمارے اسلاف نے ہمارے لیے جو ذخیرۂ علوم نہایت محنت و کاوش سے جمع کیا تھا، اس کا وجود محدود زمانے تک لائبریریوں کی زینت بنا رہے، پھر وہ حوادث زمانہ کی دست برد سے ہمیشہ کے لیے ناپید ہو جائے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ سائنسی و مذہبی تعلیم کو ایک متوازن تبادلے کا روپ دیا جائے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ہلاکت ہے اس شخص کے لیے جو داستان سرائی کرتا ہے۔ تاکہ کچھ لوگوں کو ہنسائے اور اس کے لیے وہ جھوٹ کا سہارا لیتا ہے، ہلاکت ہے اس کے لیے، تباہی ہے اس کے لیے۔"

—(ترمذی)—

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ج ۷، ش ۱ (جنوری ۸۸)

سائنس اور اسلام

صغیر افراہیم

قدرتی اور مادی مظاہر کے تعلق سے منضبط یا منظم علم کو جو تجربہ مشاہدہ اور استقرا پر مبنی ہو سائنس کہتے ہیں۔ آج کے عہد میں ہر جانب سائنس کے مختلف شعبہ جات کی جلوہ گری ہے اور ہر لمحہ اس علم کی کرشمہ سازیوں سے ہمارا سابقہ پڑتا ہے۔ علم طبعیات، علم کیمیا، علم حیوانات علم نباتات، علم جمادات، علم ارضیات، علم فلکیات وغیرہ سائنس کی ایسی مختلف شاخیں ہیں جو ذہن انسانی کو روز بہ روز جلا بخش رہی ہیں اور بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود میں معاون ثابت ہو رہی ہیں۔ اس علم کا سلسلہ ابتدائے آفرینش سے ملتا ہے۔ انسان میں سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے کی صلاحیت بیدار ہوئی تو اسی علم کے توسط سے رفتہ رفتہ کائنات کے بے پناہ اسرار و رموز اس پر آشکارا ہوتے گئے۔ نئی نئی باتیں دریافت ہوتی رہیں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں معلومات کا حصول ممکن ہو سکا۔ سائنس کی قدر و قیمت اور وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کے تمام علوم میں یہ شاید واحد علم ہے جو انسانی زندگی میں انقلاب عظیم برپا کرنے کا موجب ہوا ہے۔

عروجِ آدم خاکی آج سائنس کا رہین منت ہے ماہرین فلکیات نظام شمسی میں موجود سیاروں کے راز فاش کر رہے ہیں اور وہاں زندگی کے آثار تلاش کرنے میں مصروف ہیں۔ نیوٹن اور گریگو رمینڈل کے نظریۂ ارتقائے حیات سے ہائزن برگ کے اصول غیر یقینیت اور بگ بینگ تھیوری تک سائنسی علوم کی ترقی نے ذہن انسانی کو نئی سمتوں سے متعارف کرایا ہے۔ مگر اس تلاش و جستجو اور ایجاد و اختراع کی تیز تر رفتار میں مسلمانوں کی شمولیت برائے نام ہے حالاں کہ قرآن مجید میں مظاہر قدرت پر غور کرنے اور ان کے نتائج اخذ کرنے کی تلقین بار بار کی گئی ہے۔ قرآن حکیم کی مختلف سورتوں کی آیتوں سے علم کی غیر معمولی اہمیت کا اظہار ہوتا ہے اور یہ بات بہت واضح ہے کہ ہمارے رب نے ہمیں ان علوم کے حصول کا حکم دیا ہے۔ کائنات سے متعلق مختلف موضوعات و مسایل پر غور و فکر کرنے کا ذکر ہمیں احادیث میں بھی ملتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص علم کی تلاش میں نکلے وہ اس وقت تک خدا کی راہ میں ہے جب تک واپس نہ آجائے۔" (ترمذی)

علم کی فضیلت اور برتری کے متعلق روایت ہے کہ

"اگر کسی شخص کو اس حالت میں موت آجائے کہ وہ علم حاصل کر رہا ہو تو وہ اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ اس کے اور انبیاء کے درمیان صرف نبوت کے درجے کا فرق رہے گا۔" (الطبرانی فی الاوسط)

ایک اور حدیث سے علم کے حصول کی وضاحت ہوتی ہے۔

"ہر اچھی اور دانائی کی بات دانش مند کی گمشدہ پونجی ہے۔ جہاں بھی وہ ملے اس کا وہ زیادہ مستحق ہے۔"

(ابن ماجہ)

ماضی بعید میں مسلم مفکرین نے وسیع الذہنی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے رسول پاک کے فرمان پر عمل کیا کہ

"علم حاصل کرنے اگر چین تک بھی جانا پڑے تو جاؤ۔"

آسمانی کتاب کی روشنی میں بہت سے حقایق کو جاننے کی کوشش

[redacted]

کی، ان کے اسباب وعلل تلاش کیے اور تقریبًا پانچ سو سال تک ایشیا، افریقہ اور یورپ کے عالموں کو فلسفہ، منطق، طب اور فلکیات کا سبق دیتے رہے۔ ہسپانیہ (۱۴۹۲ — ۷۱۲ء) اور بغداد (۱۲۵۸ — ۷۵۰ء) اسلامی تاریخ میں علمی اور سائنسی ترقی کی معراج قرار پائے ہیں۔ جابر بن حیان (۸۱۵ — ۷۲۱ء) دنیا کا پہلا نامور کیمسٹ ہے جس نے علم کیمیا کے بارے میں تقریبًا پانچ سو کتابیں لکھیں اور متعدد کیمیائی مرکب معلوم کیے۔ ابوعبداللہ محمد ابن موسیٰ الخوارزمی (۸۵۱ — ۷۸۳ء) نے علم ہندسہ، طریقۂ شمار، حساب، جیوتش اور علم مثلث کی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ حنین بن اسحاق (۸۷۷ — ۸۰۹ء) نے علم طب سے متعلق یونانی زبان کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ ابوبکر محمد بن زکریا الرازی (۹۲۵ — ۸۴۱ء) نے سب سے پہلے انسائیکلوپیڈیا مرتب کیا۔ مادّے پر تحقیق کی اور علم جغرافیہ کے تحت تمام اشیاء کو مختلف گروہوں میں رکھا۔ ابو القاسم الزہراوی (۱۰۱۳ — ۹۳۶ء) فادر آف سرجری کہلاتا ہے۔ ابن الہیثم (۱۰۳۹ — ۹۶۵ء) نے روشنی کے موضوع پر دنیا کی پہلی کتاب ''المناظر'' لکھی اور مادّے کے جمود کا تصور دیا۔ ابوریحان محمد بن احمد المعروف البیرونی (۱۰۴۸ — ۹۷۳ء) نہ صرف عظیم ماہر لسانیات تھا بلکہ اس نے فارمیسی کی ترقی کے لیے قابل قدر کوششیں کیں۔ بوعلی سینا (۱۰۳۷ — ۹۸۰ء) نے دھاتوں اور معدنیات پر تجربے کیے۔ انہیں طبیبوں کا شہزادہ کہا جاتا ہے۔ عمر خیام (متوفی ۱۱۲۳ء) کی شہرت محض رباعیات کی بدولت نہیں ہے بلکہ وہ ایک ماہر فلکیات تھا اور علم ریاضی پر بھی اس کو بھرپور قدرت حاصل تھی۔ ابومروان عبدالملک بن زہر (۱۱۶۲ — ۱۱۱۳ء)، ماہر نباتات کا اہم کام غذا پر ہے۔ یعقوب بن طارق (متوفی ۷۹۶ء)، البطانی (۹۲۵ — ۸۵۵ء) ابن رشد (۱۱۹۸ — ۱۱۲۶ء) وغیرہ نے اپنی ذہنی کاوشوں سے سائنسی علوم وفنون میں قابل قدر اضافے کیے۔

مسلمانوں میں جب تک حصول علم اور عمل پیہم کا جذبہ موجزن رہا سب نے اس کی سیادت تسلیم کی۔ وہ اپنے علم اور اولوالعزمی کے بل پر دنیا کی تسخیر کرتے رہے اور نئے سے نئے جہان تلاش کرتے گئے۔

لیکن جب وہ علم وفن، تلاش وجستجو، عزم ویقین اور عرق ریزی کی راہ کو چھوڑ کر سہل پسندی، تن آسانی اور عیش پرستی میں مبتلا ہوئے تو ان کا شمار اد نکھتی اداس قوم میں ہونے لگا۔ علمی وعملی زندگی سے بیگانگی نے ان کے ذہن کند، قویٰ سست، دل کمزور اور نفس موٹے کر دیے۔ سائنسی علوم سے بیزاری اور غیبی امداد پر اکتفا نے ان کی شخصیت کو کچل کر رکھ دیا۔ رفتہ رفتہ عجز وانکسار اور فکرو عمل کی جگہ وہ غرور ونخوت، تنگ نظری اور توہم پرستی کا شکار ہو کر ذہنی طور پر اس حد تک مفلوج ہوئے کہ محض پیر و مرشد کی دعاؤں اور تعویذوں پر اکتفا کر بیٹھے اور عمل سے دست کش ہو گئے۔ مولانا ابو الکلام آزاد ''غبار خاطر'' میں دو قوموں کے مدوجزر کو صلیبی جنگ کے تناظر میں پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''یورپ مذہب کے مجنونانہ جوش کا علمبردار تھا، مسلمان علم و دانش کے علم بردار تھے۔ یورپ دعاؤں کے ہتھیار سے لڑنا چاہتا تھا، مسلمان لوہے اور آگ کے ہتھیاروں سے لڑتے تھے۔ یورپ کا اعتماد صرف خدا کی مدد پر تھا، مسلمانوں کا خدا کی مدد پر بھی تھا، لیکن خدا کے پیدا کیے ہوئے سروسامان پر بھی تھا۔ ایک صرف روحانی قوتوں کا معتقد تھا، دوسرا روحانی اور مادّی دونوں کا۔ پہلے نے معجزوں کے ظہور کا انتظار کیا، دوسرے نے نتائج عمل کے ظہور کا۔ معجزے ظاہر نہیں ہوئے، لیکن نتائج عمل نے ظاہر ہو کر فتح وشکست کا فیصلہ کر دیا۔''

مگر اس کے برعکس جب مسلمانوں میں انتھک جدوجہد کا جذبہ سرد پڑ گیا اور وہ کراماتی یا جادوئی عطیے کے مرہون منت ہوئے تو ان کا حشر بھی شکستہ پا قوموں کی طرح ہوا۔

> ''انیسویں صدی کے اوائل میں جب روسیوں نے بخارا کا محاصرہ کیا تھا تو امیر بخارا نے حکم دیا کہ تمام مدرسوں اور مسجدوں میں ختم خواجگان پڑھا جائے۔ ادھر روسیوں کی قلعہ شکن توپیں شہر کا حصار منہدم کر رہی تھیں، ادھر

لوگ ختمِ خواجگان کے حلقوں میں بیٹھے یا مقلب القلوب یا محول الاحوال کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ بالآخر وہی نتیجہ نکلا، جو ایک ایسے مقابلے کا نکلنا تھا جس میں ایک طرف گولہ بارود ہو، دوسری طرف ختمِ خواجگان دعائیں ضرور فائدہ پہنچاتی ہیں، مگر انہی کو پہنچاتی ہیں جو عزم وہمت رکھتے ہیں۔ بے ہمتوں کے لیے تو وہ ترکِ عمل اور تعطلِ قویٰ کا حیلہ بن جاتی ہیں۔" (غبارِ خاطر)

اِسلامی دنیا میں سائنسی علوم وفنون کا زوال۔ ۱۲۵۰ء میں طلیطلہ قرطبہ، اشبیلیہ پر عیسائیوں کے قبضہ اور ۱۲۵۸ء میں ہلاکو خاں کے ہاتھوں بغداد کی تاراجی سے شروع ہوا اور ۱۴۹۲ء میں زوال غرناطہ پر مکمل ہوگیا۔ جب شاہ فرڈی ننڈ اور ملکہ ازابیلا یورپ اسپین کے مالک و مختار ہو گئے۔ اس علمی زوال کے پیدا ہونے کے اسباب کے سلسلے میں پروفیسر عبدالسلام لکھتے ہیں:

" مسلم دنیا نے علمی لحاظ سے خود کو ایک خول میں بند کر لیا تھا، جس سے باقی دنیا سے اس کا علمی رشتہ ٹوٹ گیا۔ دوسرے سخت قسم کی مذہبی گروہ بندی اور سیاست دانوں کی شہ پر تنگ نظری کی روش عام تھی۔ تیسرے تخلیقی طرزِ فکر کی حوصلہ شکنی اور تقلیدی طرزِ فکر کا چلن زوروں پر تھا۔........ ہر طرف کٹر پن کا رواج اور بالغ نظری کا فقدان۔ نتیجتاً تقلید عام ہوئی اور اجتہاد کا دروازہ بشمول سائنس ہر قسم کے علوم پر بند ہوگیا۔" (تہذیب الاخلاق)

قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ میں مختلف عناصر کی کارفرمائیاں نظر آتی ہیں۔ وہ قوم جو علم کے حصول اور عمل پیہم میں سرگرم ہوئی، جس نے بالغ النظری اپنا شعار بنایا اور مشاہدات و تجربات میں اپنے کو مصروف کیا، شہرت، عظمت اور سرخروئی نے اس کے قدم چومے دیگر قوموں پر اقتدار بھی اس کو نصیب ہوا، لیکن اس کے برعکس جب وہی قوم اندھی عقیدت اور قدامت پرستی کی مرتکب ہوئی تو زوال پذیر ہوئی۔ ایشیا کے باشندوں میں علوم وفنون کی ناقدری شروع ہوئی تو یورپ میں احیائے علوم کی تحریک کا آغاز ہوا اور وہ دن بدن کارہائے نمایاں انجام دیے گئے۔ یہ تبدیلی تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز سے وقوع پذیر ہوئی جب مسلمانوں کی درس گاہوں کے دروازے جدید علوم وفنون پر بند ہوئے اور انگلستان میں آکسفورڈ کا قیام عمل میں آیا۔ راجر بیکن (۱۲۱۴-۱۲۹۴ء) پہلا مغربی سائنس داں ہے جس نے دلائل اور تجربوں پر زور دیتے ہوئے نتائج اخذ کرنے کی طرف اہل یورپ کو متوجہ کیا۔ ۱۴۵۴ء کیکسٹن نے ایجادات کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے پرنٹنگ مشین ایجاد کی۔ ۱۴۹۲ء میں کولمبس نے طوفان سے نبرد آزما ہو کر جزائر غرب الہند کو تلاش کیا اور ۲۷ مئی ۱۴۹۸ء میں پامردی کا ثبوت دیتے ہوئے واسکو ڈی گاما نے ہندوستان کا ایک نیا بحری راستہ دریافت کیا۔ ۱۵۵۶ء میں اگریکولا نے کان کنی اور دھاتوں کے بارے میں باتصویر کتاب شائع کی۔ ۱۵۹۰ء میں جان سین نے خوردبین ایجاد کی۔ ۱۵۹۷ء میں لیباولیس نے جدید کیمیا پر کتاب لکھی۔ ۱۶۴۲ء میں بی۔ پاسل نے کمپیوٹر کی شروعات کی۔ ۱۶۵۷ء میں ڈینیئینس نے پنڈولم گھڑی بنائی۔ ۱۷۳۶ء میں ٹرپین نے کمانی دار گھڑی بنائی۔ ۱۷۷۴ء میں جوزف پریسٹلے نے آکسیجن دریافت کی۔ ۱۷۸۱ء میں ہنری کیونڈش نے مختلف گیسوں سے واقف کرایا۔ ۱۸۰۷ء میں ہمفری ڈیوی نے ایلومینیم کو صاف کیا۔ ۱۸۵۵ء میں فرانس کے ہنری کلیڈوال نے اس دھات کو صنعت وحرفت کے لیے استعمال کیا اور ۱۸۸۹ء میں جرمنی کے ماہر کیمیا جوزف بائرنے ایلومینیم کو سائنٹفک انداز میں پیش کیا۔ ۱۸۶۶ء میں الفریڈ برنہارڈ نوبل نے ڈائنامائٹ کی ایجاد کی۔ ۱۸۸۸ء میں ڈنلپ نے ربر کے ٹائر ٹیوب ایجاد کیے۔ ۱۸۹۶ء میں فرانس کے ماہر طبعیات ہنری بیکوریل نے یورینیم کی تاب کاری کے عمل کی دریافت کی اور ان سے نکلنے والی شعاعوں کو الفا، بیٹا، گاما کا نام دیا۔ بہر حال ان غیر ایشیائی و افریقی اقوام بالخصوص سفید نسل کے عیسائیوں اور یہودیوں کی اس علمی تلاش وجستجو اور سائنسی تحقیقات وایجادات کا سلسلہ آج

کی تاریخ تک دراز ہے کہ دیگر اقوامِ عالم اس مقابلے میں پیچھے ہوئے اور مسلمانوں کی پسماندگی کا تو یہ عالم ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں آج ان کے دست نگر ہیں ۔

آٹھویں صدی عیسوی سے تیرھویں صدی عیسوی تک علوم و فنون کے تمام مراکز ایشیا اور افریقہ میں مسلمانوں کے زیرِ سایہ پروان چڑھتے رہے ۔ اور وہ نت نئے تجربات میں مصروف رہے۔ لیکن اس کے بعد رفتہ رفتہ علم و ہنر کو حاصل کرنے کا یہ جذبہ اُن میں سرد پڑتا گیا۔ اس کے برعکس یورپ کی اقوام خاص کر عیسائیوں میں اس کے حصول کی لگن بڑھتی گئی اور وہ نئے سے نئے جہان تلاش کرتے گئے۔ علوم وفنون کی جو قندیلیں پانچ سو سال تک وسیع النظری اور عرق ریزی کی بدولت جگمگاتی رہیں وہ توہم پرستی اور تن آسانی کی آندھیوں سے اس طرح بجھیں کہ پوری مسلم قوم تاریکی میں غرق ہو گئی۔ ایک طویل عرصے کے بعد ہندوستان کی سرزمین سے سرسید احمد خاں نے سائنسی علوم وفنون کو اپنانے کی تحریک شروع کی۔ خوابِ غفلت میں پڑی ہوئی قوم کو انہوں نے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کرنے کے لیے امکانی جتن کیے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے مدرسے اور سوسائٹیاں بنائیں، تحریر و تقریر سے کام لیا ۔ گو کہ ان کی جدوجہد کا دائرہ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے مخصوص تھا، پھر بھی براہ راست نہ سہی تو بالواسطہ ان کی تحریک نے عالمی سطح پر مسلمانوں کو علمی فیض ضرور پہنچایا۔ اس کے باوجود مسلمان سائنسی علوم میں کوئی بھی قابلِ قدر کارنامہ انجام نہیں دے سکے اور نہ ہی ان میں کوئی نمایاں سائنس داں پیدا ہو سکا۔ ماسوا پروفیسر عبدالسلام کے۔ کتنی عبرت کا مقام ہے کہ دنیا میں آبادی کے تناسب کے لحاظ سے مسلمان غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اور دنیا کے ایک بڑے رقبہ پر آباد اور قابض ہے کہ جہاں اس کی حکمرانی ہے اور اس کے رب نے اس کو قدرتی وسائل سے بھی نواز رکھا ہے۔ پھر بھی وہ سائنسی علوم و فنون سے چشم پوشی اختیار کیے ہوئے ہے اپنی تنگ نظری، تن آسانی اور عصبیت پرستی کی بنا پر ذلیل و خوار ہو رہا ہے۔ علمی و سائنسی شعبوں میں ہر سال متعدد نوبل انعام تقسیم کیے جاتے ہیں، لیکن عبدالسلام صاحب عالمِ اسلام کے واحد فرد ہیں جنہوں نے یہ اعزاز حاصل کیا ہے۔ علمی نقطۂ نظر سے بکھری ہوئی اس تیرگی میں ان کی شخصیت ایک روشن منارہ کی طرح جگمگائی ہے۔ اور انسانی برادری بالخصوص مسلمانوں کے لیے ان کی دردمندی کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے دنیا کے مختلف مقامات کے دورے کیے اور سائنسی علوم کے حصول کی ترغیب دی۔ نئی نسل کے ذہنوں پر آج وہ ایک تحریک بن کر اُبھر رہے ہیں

مغربی تہذیب اور عیسائی مذہب سائنس کے دوش بدوش پروان چڑھ رہے ہیں۔ ان کے درمیان مذہب اور سائنس کی کشمکش ختم ہو چکی ہے۔ انہوں نے دونوں کی اہمیت اور ضرورت کو بخوبی سمجھ لیا ہے۔ اسی لیے روز بروز سائنسی علوم کے لیے ان کی روش اور طرزِ فکر میں پختگی آتی جا رہی ہے۔ وہ وقت کی نزاکتوں کو محسوس کر چکے ہیں۔ جب کہ مسلمانوں کی اکثریت سائنسی علوم سے بے بہرہ ہے اور اس اعتبار سے عالمِ اسلام کے سارے افراد بے حد پسماندہ ہیں۔ آخر ایسا کیوں اور اس کے اسباب کیا ہیں؟ اس کا بڑا سبب تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ مسلمانوں کا ذہن ان علوم کی جانب سے صاف نہیں ہے وہ مشکوک ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ سائنسی علوم مذہبی طرزِ فکر و عمل کے متوازی ان نظریوں کو پیش کرتے ہیں جو انسان کو مذہب سے بیگانہ بناتا ہے۔ اپنی تنگ نظری، اندھی عقیدت مندی اور بے جا رسوم کی تقلید کی بنا پر وہ خوف محسوس کرتے ہیں کہ سائنس کی ترقی مذہبی روایتوں کو مجروح کرے گی۔ بقول پروفیسر عبدالسلام:۔

"کچھ لوگوں کو تشویش ہے کہ موجودہ سائنس کا اسلام پر کیا اثر پڑے گا۔ ان سے عرض ہے کہ سائنس کے حدود کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم عصرِ حاضر کی سائنس میں پوری طرح سے شامل ہو جائیں۔ اگر یہ نہ ہوا تو ہم ماضی کی فلسفیانہ بحثوں میں ہی الجھے رہیں گے۔ آپ لوگ نوجوان سائنس دانوں پر بھروسہ رکھیے۔ سائنسی علوم کے حصول میں ان کی مدد کیجیے، ان کے ایمان کو محفوظ سمجھیے۔ اس لیے کہ مذہب اور سائنس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔"

(تہذیب الاخلاق)

یہ دونوں ایک دوسرے کے حریف نہیں بلکہ بڑی حد تک معاون اور

مددگار ہیں۔ ایک یقین محکم کی راہ دکھاتا ہے تو دوسرا عمل پیہم کی تحریک دیتا ہے۔ قرآن حکیم اور احادیث کی روشنی میں اور عملی زندگی کے مشاہدے اور تجربے سے سبق لے کر مسلمانوں کو جدید علوم و فنون کے حصول میں پوری دلچسپی لینی چاہیے اور پھر وہ دیکھیں کہ ان کا رب کس طرح ان کو نوازتا ہے۔ کلام الٰہی خود سائنسی طرز فکر عطا کرتا ہے اور علوم کے تحصیل کی ترغیب دیتا ہے۔ بقول سر سید احمد خاں:

"مذہب اسلام ایسا مستحکم اور سچا مذہب ہے کہ جس قدر دینی اور دنیاوی علوم کی ترقی ہوتی جائے گی اسی قدر اس کی سچائی زیادہ تر ثابت ہوگی۔"

حواشی

۱؎ سورہ بقر (آیت ۱۶۴) آل عمران (۱۹۰-۱۹۱)، انعام (۳۸، ۹۶، ۹۹) اعراف (۵۴)، انفال (۲۲)، الرعد (۲، ۳، ۴) الحجر (۱۹)۔ نحل (۱۰ تا ۱۲، ۲۸، ۲۹، ۶۱، ۶۵، ۶۹) الانبیاء (۳۰، ۳۱، ۳۳)، حج (۵، ۴۶، ۶۵)، نور (۴۵)، فرقان (۴۴)، روم (۸، ۲۱، ۲۲، ۲۳)، لقمان (۱۰، ۱۱، ۲۹)، فاطر (۲۷، ۲۸) یٰسین (۳۶ تا ۴۰)، زمر (۶)، مومنون (۲ تا ۱۴) ذاریات (۴۷)، رحمٰن (۵ تا ۸، ۳۲ تا ۳۸)، معارج (۸، ۹)، نوح (۱۵ تا ۲۰)، قیامہ (۴ تا ۹) مرسلات (۲۵ تا ۲۷)، تکویر (۱ تا ۲)، طارق (۵ تا ۸) اور سورۂ علق کی آیت نمبر ایک سے ۸ تک ہیں

۲؎ پہلی صلیبی جنگ ۱۰۹۹-۱۰۹۶ء، دوسری ۱۱۴۹-۱۱۴۷ء، تیسری ۱۱۹۱-۱۱۸۹ء، چوتھی ۱۲۰۴-۱۲۰۱ء، پانچویں ۱۲۲۱-۱۲۱۷ء، چھٹی ۱۲۲۹-۱۲۲۸ء اور ساتویں جنگ ۱۲۵۴-۱۲۴۸ء میں ہوئی۔

۳؎ جاپان کو چھوڑ کر جو ایشائی خطہ زمین ہے اور جہاں بودھ مذہب کی حکمرانی ہے۔

۴؎ ہر سال ماہ اکتوبر میں یہ انعام علم طبیعات، علم کیمیا، علم اجسام و ادویہ، علم معاشیات، علم ادب اور امن کے میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے والوں کو دیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی یہ اعزاز ایک سے زائد لوگوں کو بیک وقت دیا جاتا ہے۔ جیسے فزکس میں ۱۹۷۹ء کا نوبل انعام تین سائنس دانوں پروفیسر عبدالسلام (پاکستان)، شیلڈن ایگل گلیشو امریکہ اور اسٹیو وینبرگ (امریکہ) کو مشترکہ طور پر "یونائیٹڈ فیلڈ تھیوری" پر دیا گیا۔

۵؎ مصر کے انور السادات کو امن کے لیے اس اعزاز سے نوازا گیا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

ان کے گھر میں ایک بکری ذبح کی گئی جب وہ گھر آئے تو پوچھا کہ ہمارے پڑوسی یہودی کو ہدیہ بھیجا گیا یا نہیں؟ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ "جبرئیل مجھے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کی برابر تاکید کرتے رہے حتی کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ وراثت میں اسے بھی حق دار بنا دیں گے"۔

سائنس نامہ

اسرار حسین

اس سال علم اجسام اور ادویہ کا نوبل انعام ڈاکٹر سوسو مو ٹونیگاوا کو دیا گیا ہے۔ آپ کا کام "اسٹرکچر آف دی باڈیز امیون ڈفنس" پر ہے۔ یہ ایک بہت ہی اہم کام بتایا جاتا ہے۔

مارس سیارہ کی تحقیقات کے بعد سائنس داں اب مرکزی سیارہ پر توجہ دے رہے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ اس سیارے کا درجہ حرارت بہت کم ہے اور کچھ زندگی کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔ پانی اور ضروری دوسری اشیاء بھی موجود ہیں۔

انگلستان کے سائنس دانوں نے کمپیوٹر پر کافی تحقیقی کام کیے ہیں۔ ان کے تحقیقی کاموں سے آج کی بورڈ کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک خاص قسم کے قلم سے کمپیوٹر ٹرمنل اسکرین پر لکھا جاتا ہے اور وہ اس کو پڑھ لیتا ہے۔

سائنس دانوں کا یہ کہنا ہے کہ جو بچے آج کے زمانے میں پیدا ہو رہے ہیں، ان کی عمر اب ۱۳۵ سال تک ہو سکتی ہے۔ ایسا سائنس کی ترقیات کی وجہ سے ممکن ہو سکا ہے۔ سائنس میں نئے نئے تجربوں کی بنا پر اچھا کھانا، کم آلودگی، شراب اور سگریٹ نوشی سے پرہیز کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔ اس طرح بچوں کی عمر میں اضافہ ممکن ہو سکے گا۔

امریکہ کے ڈاکٹر رابرٹ کے تحقیقی کاموں کے نتائج سے یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ شادی شدہ جوڑے جو طویل عمر تک ایک ساتھ پیار و محبت سے رہتے ہیں، ان کی شکلیں بھی ایک جیسی لگنے لگتی ہیں۔ ابھی اس موضوع پر تحقیقات جاری ہیں۔ نتیجے کا انتظار ہے۔

دنیا بھر میں ملیریا، ایڈیس وغیرہ جیسی بیماریوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے سائنس داں ٹیکے بنانے میں مصروف ہیں۔ امید ہے دو یا تین سالوں میں ان بیماریوں سے نجات پانے کے لیے یہ ٹیکہ معالجوں کو دستیاب ہو سکے گا۔

گردے کے ٹرانس پلان ٹیشن کے لیے دنیا بھر کے سرجن تحقیقی کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ امریکہ اور روس اس قسم کی سرجری میں بہت حد تک کامیاب ہو چکے ہیں۔ ہندوستان میں بھی اس پر تحقیقی کام جاری ہے۔ احمد آباد کے ایک ہسپتال میں ایک مردہ آدمی کے گردے کو ایک عورت میں ٹرانس پلانٹ کرنے میں کامیابی ملی ہے۔

جاپان کے ایک سائنس داں ڈاکٹر کوٹارو سکائی نے لہسن کی ایک بہتر شکل تیار کی ہے۔ اس میں کسی بھی قسم

کی مہک نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے اس کا استعمال اب وہ لوگ بھی کرسکتے ہیں جو اس کی مہک سے پرہیز رکھتے ہیں۔

سگریٹ کی پیکنگ پر
"سگریٹ اسموکنگ اِز انجوریس ٹو ہیلتھ"
لکھا دیکھا گیا ہے لیکن سگریٹ پینے والوں میں اضافہ روز بروز ہوتا جارہا ہے اور یہ خطرے کی علامت ہے۔ ایک سگریٹ پینے سے زندگی کے چھ منٹ کم ہو جاتے ہیں اور بیس سگریٹ پینے سے پھیپھڑے میں ۱۰۰ اگرام تار پہنچتا ہے، جس سے کینسر ہو جانے میں سات سو فیصد امکان زیادہ ہوتا ہے بمقابلہ ان لوگوں کے جو سگریٹ نوشی نہیں کرتے۔ اس لیے سگریٹ کا استعمال نہ کیا جائے تو بہتر ہے۔

نیویارک کے سائنس داں ڈاکٹر ہارڈی نے یہ بتایا ہے کہ ایڈس کے مریضوں کی زندگی تین سال سے بھی کم ہوتی ہے۔ صرف دو فیصد مریض ایسے مل جاتے ہیں جن کی عمر تین یا اس سے زیادہ ہو۔

بقیہ۔ فزکس۔ ایک سائنس۔ "ثقل کا نظریہ" متعلقہ صفحہ نمبر ۴۲

سے کریں۔ ادھر حالیہ برسوں میں ہم نے دریافت کیا کہ کل کمیتِ مادہ چھوٹے ذروں سے مل کر بنتی ہے اور یہ بھی کہ کئی طرح کے تبادلاتِ فعل ہوتے ہیں۔ جیسے نیوکلیر طاقتیں وغیرہ۔ ان نیوکلیر یا برقی قوتوں سے ثقل کو سمجھایا نہیں جاسکتا ہے اس کے علاوہ کوانٹم میکانکی اعتبارات بھی ابھی ثقل پر پوری طرح لاگو نہیں کیے جاسکے ہیں۔ کائنات کے کچھ فطری مظاہر اس بات کے متقاضی ہیں کہ دیکھا جائے آیا نیوٹن کا قانون جس کی تعمیم آئن اسٹائن کے قانون میں کی گئی مزید تعمیم پاکر کوانٹم میکانکس کے عدم یقین کے اصول کے متوافق کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ یہ کام ابھی تکمیل طلب ہے۔

مہاتما گاندھی امن و سلامتی کے نقیب

محمد ظفر محفوظ نعمانی

گاندھی جی کی شخصیت ہندوستان کی چند مایہ ناز شخصیتوں میں سے ایک ہے۔ تحریک آزادی اور حصول آزادی کے سلسلے میں اُن کی کدّ و کاوش لائقِ صد تحسین ہے۔ ہندوستانی تاریخ کا ایک سنہری باب ان کے دست مبارک سے تحریر کیا ہوا ہے۔ گاندھی جی کے سلسلے میں اگر یہ کہا جائے تو ہرگز مبالغہ نہ ہوگا۔

ع جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

ہمارا ملک ہمیشہ سے امن و سلامتی کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں کی مٹی سے ایسی ایسی شخصیتیں پیدا ہوئیں، جن پر ہم جتنا ناز کریں، کم ہے۔ ہندوستان ہمیشہ سے ولیوں، صوفیوں، سنتوں کا مسکن رہا ہے اس لیے یہاں کی مٹی میں قومی یک جہتی، امن و سلامتی کی روایت مکمل طور پر سرایت کر چکی ہے۔ گاندھی جی نے اس روایت کو اور بھی جلا بخشی ہے اور ڈاکٹر ایس۔ رادھا کرشنن کے دیے گیے روایت کی تعریف پر پورے اترے ہیں۔ ڈاکٹر ایس۔ رادھا کرشنن نے ایک جگہ لکھا ہے۔

"ہم کسی روایت کو صرف زبانی اور اپنی کارکردگی کے ذریعے برقرار نہیں رکھ سکتے ہیں۔ اس طرح کرنے سے ہماری روایت کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ کوئی بھی روایت تنقیدی اور تخلیقی تبدیلیوں سے الگ نہیں رہ سکتی ہے بلکہ شعوری طور پر اس کی تجدید ہوتی رہنی چاہیے۔"

روایت کی پاسداری کے اس مفہوم کے پیش نظر ہم گاندھی جی کی اس کوشش کو جدیدیت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

دنیا کی تاریخ میں ایسی مثالیں ناپید ہیں جن میں جنگ آزادی کے حصول کی بنیاد عدم تشدد (Non Violence) پر رکھی گئی ہو۔ اس فتح نے ہندوستانیت کو جلا بخشی ہے، یہاں کی اعلیٰ قدروں کو روشن کیا ہے اور مغرب کے مقابلے میں مشرق کی برتری ثابت کی ہے۔ روحانیت کے اس پیکر جمیل نے رواداری، نرم دلی، وسیع النظری، سچائی، سادگی اور محبت کا ایسا سبق پڑھایا کہ جسے پڑھ کر تمام ہندوستانی بلا تفریق مذہب و ملت ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے تھے انہی قابلِ قدر اور زریں کارناموں کی بنیاد پر قوم نے انہیں "بابائے قوم" کے نام سے یاد کرنا شروع کر دیا۔

گاندھی جی کی شخصیت اپنے تمام رفقار کے مابین سب سے زیادہ ممتاز اور منفرد ہے۔ بعض لوگ میکدے میں جا کر مے نوشی کرتے ہیں اور بعض لوگ جہاں بیٹھ کر مے نوشی کرتے ہیں وہیں میکدہ بن جاتا ہے۔ کچھ شخصیتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو اکیلے ہونے کے باوجود بھی ایک کارواں معلوم ہوتی ہیں۔ میرے نزدیک گاندھی جی کی شخصیت انہیں خوبیوں کی حامل ہے۔ جس طرح لینن کے نام سے انسانی مساوات، سقراط کے حوالے سے 'حق گوئی' کا تصور ذہن میں جاگ اٹھتا ہے، ٹھیک اسی طرح گاندھی جی کے نام سے امن و سلامتی اور عدم تشدد جیسی خوبیوں کی طرف ذہن خود بخود منتقل ہو جاتا ہے۔

انگریز قوم کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ کسی بھی قیمت پر شیکسپیر سے الگ ہونا پسند نہیں کرتی خواہ اسے برطانوی حکومت سے دستبردار ہونا پڑے۔ یہی بات ہندوستانیوں پر گاندھی جی کے سلسلے میں صادق آتی ہے۔

گاندھی جی ایک گوناگوں شخصیت کے مالک تھے۔ سر دست میں ان کے مخصوص نظریات اور خیالات سے بحث کروں گا۔ ان کے ان تمام نظریات، افکار اور خیالات کو بیان کرنے کے لیے دفتر کے دفتر درکار ہوں گے۔ بقول شاعر

وقت کوتاہ، قصہ طولانی

مہاتما گاندھی کی شناخت کے بہت سارے عنوانات ہیں۔ ایک مصلحِ قوم،

ایک مذہبی رہنما، مجاہد آزادی، ایک عظیم صحافی وغیرہ وغیرہ
یوں تو مہاتما گاندھی نہ کوئی جنگجو تھے اور نہ ہی بادشاہت کا تاج ان کے پاس تھا۔ لیکن اس کے باوجود بھی اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر ان سب پر حاوی تھے۔

مہاتما گاندھی ۲؍اکتوبر ۱۸۶۹ء میں پور بندر میں پیدا ہوئے ۔ مذہبی تعلیم انہوں نے اپنی والدہ پتلی بائی سے حاصل کی، جو نہایت مذہبی خاتون تھیں۔ پانچ برس کی عمر میں وہ اسکول میں داخل ہوئے۔ اس کے دو برس بعد راجکوٹ گئے۔ وہاں قیام کے دوران انہوں نے ’’راجہ ہریش چندر‘‘ ڈرامہ دیکھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس ڈرامے کا ان پر کافی اثر پڑا ۔ وہ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ کیوں نہ ہم ہریش چندر جیسے سچائی پسند بن جائیں؟ اسی دن انہوں نے سچائی کو اپنی گرہ میں باندھ لیا ۔ ۱۳ برس کی عمر میں ان کی شادی بی بی کستوربا سے ہوئی ۔ ۱۶ برس کی عمر میں ان کے والد کا سایہ ان کے سر سے اُٹھ گیا۔ ۱۸ برس کی عمر میں انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد ہی وہ انگلستان روانہ ہو گئے۔ وہاں سے واپسی کے بعد انہوں نے وکالت کا آغاز بمبئی سے کیا۔

کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ جس آدمی کے لیے سبزی، پانی، پھل اور دودھ سے بنی ہوئی غذا کے علاوہ ہر کھانا حرام ہو وہ یہ سوچ بھی کیسے سکتا تھا کہ ہندوستان میں ایسے لوگوں سے بھی محبت کی جا سکتی ہے جو ایسی کسی پابندی کے ماننے کو تیار نہ ہوں۔ گاندھی جی ۱۸۹۳ء میں افریقہ کے لیے روانہ ہوئے اور تقریباً ۲۰ سال سے زیادہ وہاں مقیم رہے ۔ وہاں جاکر ان کی شخصیت میں کافی تبدیلی آئی اور وہ عوام کے رہنما کی شکل میں نمودار ہوئے۔ یورپ اور افریقہ میں برسوں رہنے کے بعد جب ہندوستان واپس آئے تو انہیں دوسرا ہندوستان نظر آیا۔ ملک تو وہی تھا لیکن گاندھی جی کی نظر بدل چکی تھی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک ویشی خاندان سے تعلق رکھنے والا شخص ہندوستان کی قسمت کا کاتب ہو گا ۔

گاندھی جی کے جو نظریات زیادہ مقبول تھے وہ سچائی، عدم تشدد، ذات پات کا خاتمہ، وحدت ادیان، وحدتِ ذات وغیرہ تھے۔ یہ تمام خوبیاں اس روحانیت کے پیکر جمیل میں مجسم ہو گئی تھیں۔ گاندھی جی کے خیالات مذاہب سے متعلق کافی دور رس تھے۔ وہ اپنی خود نوشت سوانح حیات میں گویا ہیں:

’’میرے نزدیک مذہب کے وسیع معنی اپنے آپ کا علم یا علم خودی ہے‘‘۔

مذہب کے سلسلے میں وہ ایک سیکولر نظریہ رکھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ دنیا کے تمام مذاہب سچائی اور عدم تشدد کا سبق دیتے ہیں۔ انہوں نے انسانیت کو بطورِ مجموعی اس کی تلقین و اشاعت کی دعوت دی۔ مذہبی معاملات میں وہ کبھی متعصب نہیں رہے۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ

’’باوجود یہ کہ میں ایک ویشی خاندان میں پیدا ہوا میں اکثر حویلی جایا کرتا تھا‘‘۔

یہ وہی سیکولر نظریہ تھا جس کی وجہ سے انہوں نے بہت سے ادیان کے مقدس صحیفوں کا مطالعہ کیا۔ مثال کے طور پر اپنیشد، رامائن، بھگوت گیتا، انجیل، قرآن شریف وغیرہ۔ اس کے علاوہ انہوں نے فلسفہ اور مختلف موضوعات پر بھی کافی کتابیں پڑھیں۔

شروع میں وہ عیسائی مذہب کو کچھ اچھا تصور نہیں کرتے تھے لیکن بعد میں انہوں نے اس سے بھی اپنا رشتہ قائم کیا اور اس کے قریب ہوئے۔ وہ خود ایک جگہ رقم طراز ہیں:

’’میں تمام مذاہب سے متعلق تھا لیکن عیسائیت اس سے مستثنیٰ تھی۔ میرے اندر ایک قسم کی ناپسندیدگی فروغ پا گئی تھی۔ کیوں کہ اس زمانے میں عیسائیوں کے جو اسکول تھے وہ ہندو مذہب کے خلاف باتیں کہتے تھے‘‘۔

لیکن اپنے انگلستان کے قیام کے دوران انہوں نے اسے بہت قریب سے دیکھا اور ان کے تمام شبہات دور ہو گئے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ تمام ادیان اور مذاہب کے تقابلی مطالعے کا حد درجہ ذوق رکھتے تھے۔ جب وہ انگلستان میں تھے تو ان کے انگریز ساتھیوں نے تھیوسوفیکل تحریک میں شامل ہونے کے لیے ان سے اصرار کیا۔ جب ان کے دوستوں نے ان کو اس سوسائٹی میں شریک ہونے کے لیے مشورہ دیا تو انہوں نے نہایت نرمی سے کہا کہ:

’’میرا مطالعہ اس وقت اپنے ہی مذہب کے متعلق کم ہے۔

> اس وجہ سے فی الوقت میں کسی اور مذہبی تنظیم سے منسلک ہونا نہیں چاہوں گا[11]"

یہ ان کی خاکساری اور انکساری تھی اور ان کے نزدیک مطالعے کی اہمیت کا احساس بھی تھا۔ باوجود اس کے وہ اچھا مطالعہ اپنے مذہب کا رکھتے تھے لیکن وہ اسے بدرجہ کمال حاصل کرنا چاہتے تھے۔

وہ اپنے وقت کا اچھا خاصہ حصّہ اپنے مختلف المذاہب دوستوں سے گفتگو میں صرف کرتے تھے۔ ان کے دوستوں میں ہندوؤں کے مختلف فرقوں کے ماننے والوں کے علاوہ مسلمان اور پارسی دوست بھی تھے جن سے وہ انکے مذہبی عقاید سے متعلق خیالات نہایت دلچسپی سے سنتے تھے۔ یہی تمام چیزیں تھیں جنہوں نے ان کے اندر دوسرے مذاہب کے معتقدین کے لیے ایک قوت برداشت کا جذبہ پیدا کیا[12]۔

ان تمام باتوں کے پس منظر میں ہم گاندھی جی کے نظریۂ ادیان کا بخوبی علم حاصل کر سکتے ہیں۔

"گاندھی جی کے نزدیک ملک میں اتحاد، فلاح وبہبود قایم کرنے کا واحد ذریعہ عدم تشدد کی تلقین تھا۔ قوم کی کامیابی کا راز عدم تشدد کے ہی اصولوں میں مضمر تھا۔ ان کے اندر عدم تشدد کا جذبہ یورپ کے قیام کے دوران پیدا ہوا۔ ایک بار وہ وہاں ریل کا سفر فرسٹ کلاس میں کر رہے تھے۔ ایک یورپین گارڈ نے انہیں فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ سے نکال دیا جب کہ ان کے پاس فرسٹ کلاس کا ٹکٹ تھا۔ اس کے نتیجے میں گاندھی جی کو وہ رات ٹھنڈک میں گزارنی پڑی۔ انہوں نے اس واقعے کو اس طرح ایک خط میں لکھا ہے۔

> " وہاں ایک سفیدفام آدمی تھا۔ مجھے اس سے خوف ہے۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میرا کیا فرض ہے، میں اپنے آپ سے پوچھوں گا۔ کیا مجھے ہندوستان واپس جانا چاہیے یا مجھے آگے کی طرف جانا چاہیے۔ خدا کی مدد میرے ساتھ ہے۔ میرے مقدر میں جو سزا معین ہے، میں اسے بھگتوں گا[13]"

آخر کار انہوں نے وہیں رہنے کا ارادہ کیا۔ گویا اپنے آگے کے سفر کے لیے رواں دواں ہوئے۔ اسی دن اُن کی عدم تشدد کی خفیہ تحریک کا آغاز ہوتا ہے۔ اس چھوٹے سے واقعے سے ہمیں اور بھی بہت سی باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ اپنے اس نظریے کے سلسلے میں وہ خود رقم طراز ہیں:

> "میرے پاس دنیا کو نیا سبق دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ سچائی اور عدم تشدد اتنا ہی قدیم ہے جتنا کوہستان[14]"

جب دوسری جنگ عظیم ستمبر ۱۹۳۹ء میں واقع ہوئی تو کانگریس کے رہنماؤں نے اس کے بائیکاٹ کا ارادہ کیا۔ لیکن ۱۹۴۰ء میں گاندھی جی نے یہ بات واضح کر دی کہ ایسی کوئی پارٹی منظم نہیں ہوسکتی جو تشدد کو اپنائے انہوں نے مزید کہا کہ کانگریس پارٹی کو بھی عدم تشدد کا رویہ اپنانا چاہیے[15] وہ یہ چاہتے تھے کہ تمام کانگریسی رہنما عدم تشدد کے مبلغ ہوں اور اس کی تلقین میں بھرپور حصّہ لیں۔ وہ چاہتے تھے کہ کانگریس اس بات کا اعلان کرے کہ وہ عدم تشدد کے اصولوں پر ہی جنگ آزادی کی تحریک چلائے گی[16]۔ گاندھی جی کا ذہن کسی اور طریقۂ کار کے لیے راضی نہیں ہوتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ فرقہ وارانہ فسادات کو روکنے کے لیے پولس کی مدد کسی طریقے سے بھی نہ لی جائے۔ بلکہ یہ کام سب لوگوں کو مل جل کر کرنا چاہیے اور اس فرقہ وارانہ منافرت کا کوئی حل نکالنا چاہیے[17]۔

گاندھی جی نے اس بات کو محسوس کیا کہ حکومت ہند عدم تشدد کے اصولوں کو نظر انداز کر دے گی۔ جب دفاعی مسائل سے بحث ہوگی جب بحری، بری اور ہوائی دفاعی اکائیاں تشکیل دی جائیں گی اس وقت حکومت کا فرض ہونا چاہیے کہ عوام کے دلوں سے نفرت نکال کر ان کو ایک اکائی میں تبدیل کر دے اور دلوں کی نفرت دور کر دے گاندھی جی نے یہ خواب دیکھا تھا کہ ہندوستان عدم تشدد کا ایک مثالی ملک ہو[18]۔ گاندھی جی کے نظریات میں ہمیں ایک اعلیٰ درجے کا اعتدال ملتا ہے۔ انہوں نے کبھی بھی دوسری پالیسی نہیں اپنائی۔ انہوں نے جو باتیں ایک مصلح قوم کے ناطے کہیں وہی باتیں ایک سیاست داں کی حیثیت سے عوام کے گوش گزار کیں۔ وہ سیاست کو عدم تشدد کی عینک سے دیکھتے تھے اور سیاست دانوں کو سماجی اور انسانی قدروں کے پس منظر میں پرکھتے تھے۔ گاندھی جی اور ملک کی سیاست میں ایک کشمکش کی سی کیفیت رہتی تھی۔ یہ کشمکش گاندھی جی کے امن کے پیامبر اور قومی رہنما ہونے

کی وجہ سے تھی[19]

گاندھی جی نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب ہند سوراجیہ (Hind Swaraj) میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے ایک ایسے معاشرے کا خواب دیکھا تھا کہ جس ظلم و ستم، استحصال و استبداد کو سوں دور ہو۔ مشہور روسی عالم ٹالسٹائی نے اس کتاب کو پڑھ کر گاندھی جی کو خراج عقیدت پیش کیا[20] گاندھی جی کو ظلم و ستم، استبداد و استحصال، ذات پات کا نفاق، تعصب (علاقائی، نسلی، لسانی) باہمی منافرت سے بے پناہ نفرت تھی۔ ان کے نزدیک قوم کی کامیابی کا راز صرف اور صرف عدم تشدد کے اصولوں کی پیروی میں مضمر تھا۔

گاندھی جی کا دل خالص ہندوستانی تھا۔ وہ خاک وطن کے ہر ذرے کو دیوتا سمجھتے تھے۔ وطن پرستی اور حب الوطنی ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ افریقہ اور یورپ میں تقریباً ۲۰ سال سے زاید قیام کے بعد جب وہ ہندوستان واپس آئے تو انہوں نے اسی ہندوستانیت کا مظاہرہ کیا۔ ۱۹۱۵ء میں حیدرآباد میں ایک آشرم کی بنیاد رکھی۔ اور اس کے ذریعے سے وہ لوگوں تک اپنے خیالات پہنچاتے رہے۔ لوگ ان کے خیالات میں دلچسپی لینے لگے کیوں کہ آشرم میں خود احتسابی، ذات پات کے خاتمے، عدم تشدد، بیباکی، راست گوئی، پاکیزگی، حصول علم اور ملکی چیزوں کے استعمال کے سلسلے میں آمادہ کیا جاتا تھا۔ یہ تمام باتیں آگے چل کر انڈین نیشنل کانگریس کے مقاصد میں شامل کر لی گئیں[21]

اس آشرم میں دو سال قیام کے بعد وہ ملک کے دورے پر نکل گئے۔ اسی اثنا میں ۱۹۱۷ء میں چمپارن کے کسانوں پر ہو رہے ظلم و ستم کو دور کرنے کے لیے وہاں پہنچے۔ اپنی باتیں برطانوی حکومت سے منوانے کے لیے انہوں نے ستیہ گرہ شروع کر دی۔ حکومت نے احکام شکنی کی بنا پر انہیں چمپارن چھوڑنے کے لیے مجبور کیا لیکن گاندھی جی جیسے مرد آہن کو یہ کب گوارا تھا کہ وہ ظلم و ستم کے خاتمہ کے بغیر اپنی ستیہ گرہ کو ختم کر دیں۔ اس کے دوران جو تجربہ انہیں ہوا، اس کے متعلق وہ تحریر کرتے ہیں۔

"اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے بلکہ صحیح معنوں میں میں ان کسانوں سے ملاقات کے دوران بھگوان، اہنسا، عدم تشدد اور سچائی کے بالمقابل تھا"[22]

جب رولٹ ایکٹ (Rowlatt Act) کا نفاذ ہوا تو لوگوں کے درمیان ایک بے چینی محسوس کی جانے لگی۔ اس ایکٹ کے تحت تمام مشتبہ لوگوں کو نظر بند کیا جا سکتا تھا۔ اسی درمیان پہلی جنگ عظیم بھی جاری تھی۔ جب ایکٹ نے عملی صورت اختیار کی تو گاندھی جی نے اس کے خلاف ایک ہڑتال کے لیے عوام سے اپیل کی، جس کے نتیجے میں وہ نظر بند بھی ہوئے۔ ان کے نظر بند ہونے سے عوام میں اور بھی بے چینی محسوس کی جانے لگی اور اسی بنا پر تشدد کے بھی کچھ واقعات ہوئے۔ گاندھی جی نے ایسی صورت حال میں، جب کہ عدم تشدد کے اصولوں کی پامالی ہو رہی تھی، اپنی ہڑتال واپس لے لی۔ لیکن وہ عوام میں بڑھتی ہوئی کشمکش اور انتشار کو نہیں روک سکے۔ عوام حکومت سے دل برداشتہ ہو چکے تھے۔ اس کے بعد امرتسر کے جلیانوالہ باغ کا اندوہناک حادثہ پیش آگیا۔ اس میں بے قصور اور نہتے لوگ ظلم و ستم کا ہدف بنے۔ ملک کی سالمیت کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا اور ہر تحریک اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیاب ہوتی معلوم نہیں ہو رہی تھی لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بھی گاندھی جی نے عدم تشدد کے اصولوں سے کبھی گریز نہیں کیا۔

وقت کی ضرورت کے پیش نظر اس مرد آہن اور مرد مجاہد نے اپنی پاکیزہ صحافت کا زبردست مظاہرہ کیا۔ انگریزی زبان میں انہوں نے Young India اور گجراتی زبان میں نوجیون (نئی زندگی) Nau Jiwan نامی ہفتہ وار جرائد جاری کیے[23] اس کا بنیادی مقصد لوگوں میں اپنے خیالات کی تلقین کرنا تھا۔ ایسے نازک وقت میں جب کہ عوام حکومت سے دل برداشتہ ہو چکے تھے اور ملک کے اتحاد و سالمیت کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا ان کے ان جرائد نے ایک موثر رول ادا کیا۔ اس کے علاوہ بھی وہ ایک جریدہ نکالنا چاہتے تھے جس کا نام (Indian Opinion) تجویز کیا گیا تھا۔ لیکن اس کی اشاعت کیلیے ایک پریس درکار تھا۔ چوں کہ اس وقت کا پریس قانون کچھ ایسا تھا کہ اگر وہ اپنے خیالات کا اظہار من و عن کرتے تو اسے پریس نہیں چھاپتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پریس تجارتی پہلوؤں سے قایم کیے گئے تھے[24]

اس کے بعد عدم تعاون کی تحریک ــ Non Co opration Movement) کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے مطابق غیر ملکی چیزوں کے استعمال کا بائیکاٹ کرنا تھا اور دوسری طرف ہندوستانی معیشت کو فروغ دینا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۲۰ء میں خلافت تحریک شروع ہوئی۔ اس نے عدم تعاون تحریک کے مقاصد کو اور بھی وسیع معنوں میں لیا۔ انگریزی دانش گاہوں، مقننہ (Legislative) عدلیہ (Judicial) اور انتظامیہ (Administrative) کا بائیکاٹ کیا گیا۔ یہ تحریک مسلمانوں کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس تحریک سے وابستہ ترقی پسندوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی اور ایم۔ اے۔ او۔ کالج مسلم یونیورسٹی بن گیا۔[25]

فروری ۱۹۲۲ء میں گاندھی جی نے Civil Disobidience تحریک کا آغاز کیا۔ اس کے لیے وہ نظر بند بھی ہوئے۔ جب ان کی پیشی انگریز افسران کے سامنے ہوئی تو انہوں نے کہا:

> "مجھے یہاں آنے کی دعوت دی گئی ہے اور میں اپنے آپ کو قانون کے حوالے کرتا ہوں۔ جو سزا تجویز ہو وہ مجھے دی جائے لیکن یہ سزا قانون کی نظر میں خود ایک جرم ہے لیکن میرا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ میں اس کو پورا کروں۔"

اس کے نتیجے میں انہیں چھ سال کی قید بامشقت کی سزا سنائی گئی لیکن انہوں نے خوشی خوشی زنداں کی سلاخوں کے پیچھے رہنا گوارا کر لیا۔ نظربندی کے دوران ان کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی اور اپنی اس علالت کی بنا پر وہ دو سال میں ہی رہا ہو گئے۔

۱۹۳۰ء میں انہوں نے دوسرا ــ Civil Dis Obidience Movement شروع کیا۔ اس بار انہوں نے حکومت کے ذریعے نمک پر لگائے گئے ٹیکس کی مخالفت کی ــ احمد آباد سے لے کر ڈانڈی تک ایک جلوس کی رہنمائی کرتے ہوئے گئے۔ یہ پیدل مارچ تقریباً ۴۰۰ کلو میٹر کا تھا۔[26] ان باتوں سے ہم ان کی جواں مردی، ایثار و قربانی کا بخوبی انداز لگا سکتے ہیں۔ اس پیدل مارچ کے ... سے وہ دوبارہ نظر بند ہوئے۔ زنداں کی سلاخیں ان کا مقدر بن چکی تھیں لیکن وہ ہر ظلم و ستم کو ہنس کر سہتے رہے۔ نہ زمانے کا نشیب و فراز، نہ حکومت کا ظلم و استبداد اور نہ ان پیری ان کے کاموں میں رکاوٹ بنی۔ جوں جوں پیری کی منزلوں میں قدم رکھتے گئے ان کے حوصلے اور عزائم مزید جوان ہوتے گئے۔ ایسا محسوس ہوتا کہ انہوں نے اس بات کا حتمی فیصلہ کر لیا تھا کہ

> پگھلا کے ہی چھوڑیں گے حوادث کی ان زنجیروں کو

لیکن ان سب کے باوجود ان کی کوششیں ثمر آور ثابت نہیں ہو رہی تھیں پھر بھی وہ امن و سلامتی اور عدم تشدد کے پرچم کو لہراتے رہے۔ ایسی تحمل کی مثال، کہ جہاں ظلم پر ظلم ڈھائے جا رہے ہوں اور لوگ امن دامن کو پکڑے ہوئے ہوں، دنیا کی تاریخ میں شاید و باید ہی ملتی ہے۔ اپنی سابقہ تحریکوں کو موثر اور ثمر آور بنانے کے لیے انہوں نے بھارت چھوڑو تحریک (Quit India Movement) کا آغاز ۱۹۴۲ء میں کیا۔ آخر کار ۱۹۴۶ء میں ــ Cabinet Mission ہندوستان آیا اور ہندوستان کو آزاد کرنے کے مسئلے پر غور و خوض کرنے لگا۔ لیکن اس وقت ملک کی حالت بہت سنگین تھی۔ گردش زمانہ کی کوکھ سے نت نئے مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ اگست ۱۹۴۶ء میں مغربی بنگال میں فرقہ وارانہ فساد ہو گیا۔ دھیرے دھیرے بہار بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ گاندھی جی کو کب یہ گوارا ہو سکتا تھا کہ ایسے موقع پر سیاسی امور میں الجھتے رہیں اور ان کے مسائل سے گریز کریں۔ چنانچہ وقتی طور پر وہ ان سیاسی امور سے قطع تعلق کر کے مغربی بنگال کے دورے پر روانہ ہو گئے۔ انہیں نے فساد زدگان کی مصیبتوں کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ گاندھی جی کا یہ عزم یقیناً قابل ستائش ہے کہ انہوں نے تمام گاؤں کا سروے کیا اور امن و سکون بحال کر کے دم لیا۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی صبح آزادی کا سورج طلوع ہوا اور وہ حکومت جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ "برطانوی حکومت میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا ہے۔" ایک پھٹی چٹائی کی طرح ایک کونے میں سمٹ کر رہ گئی۔ بالآخر جبر و استبداد کا یہ قلعہ تاش کے پتوں سے بنے ہوئے گھروندے کی طرح منہدم ہو گیا۔ حکومت برطانیہ نے اپنے منصوبے کے تحت ملک کو دو حصوں میں منقسم کر دیا جسے مسلم لیگ اور کانگریس نے

اِس شمارے کے مقالہ نگار

جناب سیّد حامد	سابق وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
پروفیسر عبدالسلام	نوبل انعام یافتہ مشہور سائنس داں
پروفیسر نسیم انصاری	سرجری ڈپارٹمنٹ، جواہرلال نہرو میڈیکل کالج، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ
ڈاکٹر محمد یٰسین	ریڈر انگلش ڈپارٹمنٹ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
جناب محمد حبیب الحق انصاری	ڈپارٹمنٹ آف فزکس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
ڈاکٹر اسرار حسین	ڈپارٹمنٹ آف فزکس۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
ڈاکٹر صغیر افراہیم	ڈپارٹمنٹ آف اردو۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
مولانا حفیظ اللہ نعیمی	استاد دارالعلوم فضل رحمانیہ، بیچپڑوا۔ گونڈہ، یو۔پی
جناب صفی اختر	حسن منزل۔ مہدولی، دربھنگہ۔ بہار
ڈاکٹر بختیار فاطمی	نیو کریم گنج۔ گیا۔ بہار
جناب سید مفتاح العارفین رضوی	ہسپورہ، اورنگ آباد
جناب محمد ظفر محفوظ نعمانی	۱۵ صدر یار جنگ ہوسٹل، راس مسعود ہال، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مالک: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پرنٹر پبلشر: اسرار احمد۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
پریس: ایس۔ کے۔ آفسیٹ پریس۔ دہلی

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۷ فروری ۱۹۸۸ء شمارہ ۲

ترسیل زر کا پتہ

ایڈیٹر، تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

Editor: TAHZIBUL AKHLAQ &

NISHANT,

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY.

زر سالانہ

انڈیا ...	RS. 30·00
بیرونی ممالک	20·00 US $ ہوائی ڈاک
	8·00 US $ عام ڈاک

مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی

ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ۔

انڈیا ______

مندرجات

[تہذیب الاخلاق میں جو مضامین شایع کیے جاتے ہیں ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہرحال ان سے متفق ہو]

اداریہ

الحمدللہ، زیر نظر شمارے کی اشاعت کے ساتھ ہی تہذیب الاخلاق اپنی عمر کے ساتویں سال میں داخل ہو گیا ہے۔ سو برسوں سے زیادہ کی ایک طویل خاموشی کے بعد جناب سید حامد کے عزم جواں نے فروری ۱۹۸۲ء میں پندرہ روزہ تہذیب الاخلاق کے اجرا کی جرأت رندانہ کا مظاہرہ کیا اور قاضی معز الدین احمد صاحب کو مدیر مسئول کے فرائض سونپ کر خود تہذیب الاخلاق کو خوب سے خوب تر بنانے میں ہمہ تن سرگرم عمل ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے خلوص اور دلسوزی کو شرف قبولیت بخشا اور تہذیب الاخلاق پیش رفت کی راہوں پر گامزن ہو گیا۔ قاضی معز الدین احمد صاحب اس جریدے کے اٹھارہ شمارے نکالنے کے بعد خرابیٔ صحت کی بنا پر ادارت سے سبکدوش ہو گئے۔ ان کی جگہ پر مدیر مسئول کے فرائض ڈاکٹر نور الحسن نقوی نے انجام دینے شروع کیے۔ جب تہذیب الاخلاق کا کام وسعت اختیار کر گیا تو ڈاکٹر نقوی کی نیابت کے لیے قمر الہدیٰ فریدی صاحب کو مقرر کیا گیا اور یہ حضرات مئی ۱۹۸۶ء تک اپنی انتھک محنت اور کاوش کے ذریعے تہذیب الاخلاق کو پروان چڑھاتے رہے۔

۱۹۸۶ء کے اوائل ہی سے ڈاکٹر نور الحسن نقوی کی صحت خراب رہنے لگی جس کی وجہ سے اُن کو تہذیب الاخلاق کے الجھے ہوئے کاموں کو سلجھانے میں خاصی دقت محسوس ہوتی۔ ان کے باربار کے اصرار پر ایک بار پھر تہذیب الاخلاق کے ادارتی عملے میں تبدیلی کی گئی اور جون ۱۹۸۶ء میں اس کی ادارت کا قرعۂ فال پروفیسر اسرار احمد صاحب ڈائرکٹر فار ریپروموشن آف سائنس کے نام نکلا اور اُن کی معاونت اور نیابت کے لیے راقم الحروف اور شہاب الدین صاحب نامزد کیے گئے۔

موجودہ وائس چانسلر سید ہاشم علی صاحب نے اپنے پیش روؤں کی طرح تہذیب الاخلاق کے مسائل کو سلجھانے میں گہری دلچسپی لی۔ یہ انہی کی مساعی کا نتیجہ ہے کہ اب تہذیب الاخلاق یونیورسٹی کے بجٹ پر آ چکا ہے جو اس کی بقائے عمر کا ضامن ہے۔ سید ہاشم علی صاحب کے دور میں ایک تبدیلی یہ بھی کی گئی کہ رسالے کو پندرہ روزہ کے بجائے ماہانہ کر دیا گیا اور یہ جون ۱۹۸۶ء سے ماہانہ کی شکل میں سید ہاشم علی صاحب کی سرپرستی میں شائع ہو رہا ہے۔ ماہنامہ ہو جانے کی وجہ سے رسالے کی ضخامت دوگنی کر دی گئی ہے اور مقالات بھی قدرے طویل شائع کیے جانے لگے ہیں جو اپنے موضوع کا مکمل طور سے احاطہ کرتے ہیں۔

موجودہ ادارتی ٹیم نے جس دن سے تہذیب الاخلاق کی ذمہ داریاں سنبھالی ہیں اسی دن سے اس کے پیش نظر تہذیب الاخلاق کو دلچسپ نہیں بلکہ مفید بنانے کی بات رہی ہے۔ موجودہ ادارتی عملے کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ ہمارے وہ دینی مکاتب اور مدارس خاص طور سے توجہ کے مستحق ہیں جو وقت اور ضرورت کے تحت اپنے نصابِ تعلیم میں قدرے ردّ و بدل کرنا چاہتے

ہیں مگر مناسب وسائل کے نہ ہونے کی وجہ سے اپنے ارادے کو عملی جامہ نہیں پہنا پاتے۔ اسی احساس کے تحت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سینٹر فار پروموشن آف سائنس نے ۲۶ مارچ سے ۲۸ مارچ ۸۷ء تک ایک سمینار کا انعقاد کیا جس میں ملک کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے دینی مکاتب و مدارس کے علماء نے شرکت کر کے ایک لائحۂ عمل مرتب کیا۔ اس سمینار میں علما اور دانشوروں نے جو مقالات پڑھے تھے اور جو تجاویز پاس کی تھیں ان سب کو مئی ۱۹۸۷ء کے تہذیب الاخلاق کے خصوصی نمبر میں شایع کر دیا گیا ہے۔

اس نمبر کی اشاعت کے بعد دو طرح کے ردِ عمل سامنے آئے۔ علما کے ایک قابلِ لحاظ طبقے نے تو اس کانفرنس میں پاس ہونے والی تجویزوں کو نہ صرف پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا بلکہ ان کی روشنی میں اپنے یہاں کے نصاب تعلیم میں قدرے رد و بدل بھی کرنا شروع کیا۔ ایک چھوٹے سے طبقے میں جس میں دینی مدارس کے وہ فضلا ہیں جو خود انگریزی کی تعلیم حاصل کر چکے ہیں یا کر رہے ہیں، نہ صرف کانفرنس میں پاس ہونے والی تجویزوں سے اختلاف کیا بلکہ ہماری نیتوں پر شبہ کرتے ہوئے ہم کو حکومت کا ایجنٹ تک قرار دے دیا اور ہماری سعی و کاوش کو ان حضرات نے

ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

قرار دیا۔ جن حضرات نے تہذیب الاخلاق کی اس روش سے اختلاف کیا ہمارے نزدیک ان کا ملی خلوص شک و شبہ سے بالاتر ہے اور اُن کو اپنا یہ خیال برقرار رکھنے کا پورا پورا حق حاصل ہے کہ دینی مدارس کے موجودہ نصاب تعلیم میں کسی قسم کی تبدیلی ان کے لیے مضر ہوگی۔ لیکن ہم کو ان حضرات سے ضرور شکایت ہے جو دلوں کا حال جان لینے کے دعوے دار ہیں اور ہماری اس سعی و جہد کو حکومت کے چشم و آبرو کا اشارہ سمجھتے ہیں۔ ہم اپنے قارئین کو اس بات کا واشگاف الفاظ میں یقین دلاتے ہیں کہ ہم جو کچھ لکھتے ہیں اور ہمارا جو کچھ بھی عمل ہوتا ہے وہ ہمارے دل کی آواز اور تقاضا ہوتا ہے اس میں کسی کا بھی اشارۂ چشم و ابرو شامل نہیں ہے۔

تہذیب الاخلاق کو مفید بنانے کے لیے اس میں ایسے مقالات بھی شایع کیے جاتے ہیں جن کا ہماری روزمرہ کی زندگی کے مسائل سے تعلق ہوتا ہے۔ خواہ ان کا تعلق ہماری سماجی زندگی سے ہو خواہ ذاتی زندگی سے۔ علاوہ بریں اس لمحہ بہ لمحہ بدلتی ہوئی دنیا میں جو جدید ترین انکشافات اور اکتشافات ہوتے ہیں ان سے بھی ہم قارئین کو روشناس کرانے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ "جدید کا مکمل عرفان" قدیم سے آگاہ و آشنا ہوئے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اسی لیے ہم نے قدیم سے بھی اپنے رشتے کو مستحکم کر رکھا ہے اور قدیم موضوعات پر بھی ہم اپنے قارئین کے مطالعے کے لیے اچھا خاصہ مواد فراہم کرنے کی کوشش میں سرگرداں رہتے ہیں لیکن ہماری ساری کد و کاوش ساری سعی و جہد اس وقت تک بے معنیٰ رہے گی جب تک ان پر ردِ عمل کی ابتدا نہ ہو جائے۔ ہمارے قارئین ہمارے پیش کردہ مسائل پر کھلے دل و دماغ سے غور کریں ان کا تحلیل و تجزیہ کر کے مسئلہ کی کنہ و حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کریں اور اگر ہم نے کہیں بھی مسائل کے سمجھنے میں یا ان کی توجیہ و تعبیر اور تشریح کرنے میں بر بنائے بشریت کوئی غلطی کی ہے تو اس کی نشاندہی کریں۔ جس دن لوگوں نے ہم سے اس طرح کا اختلاف کرنا شروع کر دیا اور ہماری بات کی تردید کے لیے عقلی و نقلی دلائل کے انبار لگانے لگے، اس دن ہم سمجھیں گے کہ ہماری تحریک کامیابی کے پہلے مرحلے میں داخل ہونا شروع ہو گئی ہے اور تہذیب الاخلاق کے اجرا کا مقصد پورا ہونے لگا ہے۔

کبیر احمد جائسی

ہمدردی

سر سید احمد خاںؒ

کیا دھوکے کی چیز ہے! کیا بھلاوے میں پڑے ہیں! جو سمجھتے ہیں کہ دوسروں کی مصیبت میں مدد کرنا، ہمدردی کرنا ہے۔ کیا ہم اس فائدے میں شریک نہیں؟ نہیں! بے شک واسطہ، یا بلا واسطہ، یا واسطہ در واسطہ شریک ہیں! پھر دوسرے کی مدد کرنا کہاں رہا، بلکہ آسائش کے وسیلے سے اپنی مدد آپ کرنا ہوا۔ اس لیے جو لوگ ہمدردی کرتے ہیں، وہ حقیقت میں اپنی آپ مدد کرتے ہیں؛ اور جو نہیں کرتے، وہ خود اپنی آسائش کے وسیلے کو نقصان پہونچاتے ہیں۔

ہمدردی کا لفظ ہمارے خیال کو ایسی امداد کی طرف لے جاتا ہے جو رنج و مصیبت کی حالت میں ہو؛ لیکن اگر ہم مصیبت کے لفظ کی اصلی مراد پر غور نہ کریں، تو ضرور غلطی میں پڑیں۔ عام مفہوم مصیبت کا جو اس لفظ سے ہماری سمجھ میں آتا ہے کوئی مستقل مفہوم نہیں ہے بلکہ ایک نسبتی مفہوم معلوم ہوتا ہے۔ جو چیز کہ ایک کے لیے مصیبت ہو، ممکن ہے کہ دوسرے کے لیے مصیبت نہ ہو۔ وہ عادت و استعمال سے ایسی مختلف ہو جاتی ہے کہ مصیبت نہیں معلوم ہوتی۔ وہ کسی جوش کے سبب سے ایسی بدل جاتی ہے کہ بالکل راحت سمجھ میں آتی ہے۔ بے شک، یہ تمام مفہوم نسبتی ہیں؛ اور جو اصلی مفہوم ہے وہ ایسی حالت کا ہونا، یا واقع ہونا ہے، جو قدرتی فرحت اور راحت کے برخلاف ہو۔

اس حالت کا ہونا، غیر اختیاری حالتوں کا ہونا ہے؛ اور واقع ہونا، اختیاری حالتوں کا۔ مگر پچھلی حالت، اگر نتیجہ کی لاعلمی یا نقصانات غیر متعدی کے سبب سے ہے، تو مجازاً وہ پہلی ہی سی ہے، ورنہ حقیقت میں وہ مصیبت نہیں بلکہ سزا ہے اور اس لیے اس میں ہمدردی نہیں؛ پس اصلی یا اصلی سی مصیبت میں کسی کی مدد کرنا البتہ سچی ہمدردی ہے۔

رحم اور موانست اور ہمدردی شاید نتیجہ میں متحد ہوں، مگر ہر ایک کا منشاء مختلف ہے۔ رحم ایک فطری نیکی ہے جو ہم جنس اور غیر ہم جنس دونوں کے ساتھ برتی جاتی ہے؛ موانست کا اثر صرف ہم جنسوں میں پایا جاتا ہے۔ ہمدردی جو عقل کے نتیجوں میں سے ہے، ذی عقل ہی میں ہو سکتی ہے، اور اس لیے صرف انسان ہی میں منحصر ہے۔ پس جس میں ہمدردی نہیں، اس کی انسانیت میں نقصان ہے۔

قدرتی قاعدے کے مطابق ہمدردی کے، بقدر تفاوت اپنی آسائش کے وسیلوں کے، متفاوت درجے ہیں۔ جس طرح کہ باپ، بھائی، جورو، بچے پھر اور درجہ بدرجہ کے رشتہ مند، پھر اپنے ملک کے، پھر اپنے ہمسایہ ملک کے، پھر اس سے دور کے ملک کے باشندے درجہ بدرجہ ہماری آسائش کے وسیلے ہیں۔ اسی طرح اس قادر مطلق کی کامل قدرت نے ہمدردی کے رشتہ کی مضبوطی اور استواری کو بھی درجہ بدرجہ بنایا ہے۔ باپ کو بیٹے سے جو جوش ہمدردی ہے، وہ پوتے سے نہیں، اور جو پوتے سے ہے وہ پڑپوتے سے نہیں۔ اسی طرح یہ رشتہ جتنا کہ بڑھتا جاتا ہے، اتنا ہی گھٹتا جاتا ہے اور جب وہ اپنے ملک، یا اپنے ہمسایہ ملک، یا اس سے دور کے ملک تک پہونچتا ہے، تو اور بھی پتلا ہو جاتا ہے۔

بعضے کہتے ہیں کہ یہ ایک دھوکا ہے؛ اور اگر یہ دھوکا نہیں ہے، اور یہ متفاوت درجے قدرتی ہیں، تو ابجان بیٹے، اور ان بہیجان باپ میں کیوں وہ ہمدردی نہیں؟ حقیقت میں یہ صرف ایک خیال ہے جس سے موانست پیدا ہوتی ہے، اور وہی باعث ہمدردی ہے۔ نفرت جو اس کی ضد ہے اس کا بخوبی ثبوت فراہم کرتی ہے کہ جب وہ پیدا ہوتی ہے تو باوجود موجود ہونے قدرتی رشتہ کے، کچھ بھی ہمدردی نہیں رہتی۔

بے شک ایسا، یا ایسا سا، ہوتا ہے، مگر اس میں کچھ غلطی بھی ہے
قریب رشتہ والا بہ نسبت دور کے رشتے والے کے بلاشبہ ہم سے زیادہ تر جزئیت رکھتا ہے؛ اور اسی طرح بعید بہ نسبت ابعد کے۔ پھر اگر وہ جزئیت قدرتی ہے، تو ہمدردی بھی قدرتی ہے۔ ہاں موانست اس کو نہایت تیز کر دیتی ہے؛ اور کبھی ایسی جو قدرتی سی معلوم ہوتی ہے، انجان بیٹے اور ان پہچان باپ میں جو وہ چمکتی نہیں، نہ اس لیے کہ وہ نہیں ہے، بلکہ اس لیے کہ ان میں انسانیت کا ایک بڑا جزو علم یعنی دانستن ہے، نہیں ہے۔

قریبوں سے ہمدردی نہ کرنی نہایت بدخصلت قابل سزا کے ہے۔ اس لیے کہ قدرت کے نہایت مستحکم قاعدے کو توڑنا ہے، اور کرنی کچھ بڑی صفت نہیں۔ کیوں کہ قدرت نے اس کے کرنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ بعیدوں سے ویسی نہ کرنی کچھ سخت مذمت نہیں، اس لیے کہ قدرت کے کسی مستحکم قاعدے کی برخلافی نہیں؛ اور کرنی نہایت عمدہ صفت ہے، کیوں کہ قدرت کے منشاء کا بدرجۂ اتم کامل کرنا ہے۔

افسوس ہے کہ عمدہ صفت کبھی دھوکا کھا کر معیوب بھی کر دی جاتی ہے، جب کہ پہلی کو ادنیٰ صفت سمجھ کر چھوڑتے ہیں، اور دوسری کو اعلیٰ صفت سمجھ کر پکڑتے ہیں۔ مگر پہلی کے چھوڑنے کی برائی دوسری کی بھلائی کو بھی لے ڈوبتی ہے۔ پس سچی ہمدردی وہی ہے جو قدرت کے قانون کے مطابق اور قدرت کے منشاء کی تکمیل کے لیے ہو۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے اپنے کسی بھائی کی حق تلفی کی ہو یا اس کی عزت پر ظلم کیا ہو تو آج ہی اسے راضی کر لے قبل اس کے کہ وہ دن آئے جب اس کے پاس درہم ہوگا نہ دینار ہوگا۔ اگر اس کے پاس نیک عمل ہوں گے تو اس کے ظلم کے بقدر انھیں لیا جائے گا۔ اور اگر اس کے پاس اچھائیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی برائیاں لے کر اس کے اوپر لاد دی جائیں گی۔"

(بخاری)

"جس نے اپنے بھائی سے معذرت کی لیکن اس نے قبول نہ کیا تو اس پر وہی گناہ ہوگا جو ناروا ٹیکس وصول کرنے والے پر ہوتا ہے۔"

(ابن ماجہ)

"جس نے کسی آدمی کے اندر عیب نکالنے کے لیے ایسی بات کہی جو اس کے اندر موجود نہ تھی تو اللہ تعالیٰ اسے جہنم کی آگ میں ڈال دے گا تا آنکہ جو کچھ اس نے گڑھا ہے، اس کا پورا مزہ نہ چکھا دے۔"

(طبرانی)

"چغل خور جنت میں داخل نہیں ہو سکتا۔"

(بخاری)

شیخ الجامعہ کے نام ایک سرپرست کے خط کا اقتباس

مکرمی و محترمی وائس چانسلر صاحب

السلام علیکم

ڈین صاحب انجینئرنگ کا خط مورخہ ۲۴ر دسمبر ۸۰ء میرے لڑکے کے سلسلے میں موصول ہوا۔ جس کو پڑھ کر سخت افسوس اور شرمندگی ہوئی کہ طلباء انجینئرنگ کالج نے اپنی مرضی سے چھٹیاں لے کر یونیورسٹی کے احکام کی خلاف ورزی کی اور مجھ جیسے والدین جو اپنے خون پسینے کی گاڑھی کمائی اُن کی تعلیم پر خرچ کر رہے ہیں، اس کی قدر کرنے کے بجائے تعلیم سے فرار اختیار کیا، جس سے والدین کی امیدوں پر پانی ہی پھیرنے کی سعی نہیں کی بلکہ اپنے مفاد اور فرائض سے بھی پہلو تہی کی۔

-/25 روپیے جرمانے کی سزا بہت کم ہے کاش طلباء کو احساس ہو کہ ان کی زندگی کا ہر ہر لمحہ قیمتی ہے برخلاف اس کے کافی دن ضائع کیے اور پڑھنے کے خواہش مند طلباء کو بھی پڑھنے سے محروم رکھا۔

میں آپ کے فیصلے کو بسر و چشم قبول کرتا ہوں۔ اور دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے عزم و ارادے میں پختگی عطا فرمائے اور طلباء کے مفاد کو ہمیشہ ہمیشہ پیش نظر رکھے۔

ناگاہی

خوشہ چیں

خوشہ چیں: ناگاہی، کیا خوب، اللہ تیری شان، ناگاہی، کیا خوب۔

جویا: بھائی خوشہ چیں، میں دیکھ رہا ہوں کہ عمر کا اثر آپ کے شفاف ذہن پر سایہ کی صورت پڑنے لگا ہے۔ اسے عرف عام میں سٹھیانا کہتے ہیں۔ بڑا زعم تھا آپ کو کہ عمر کی ملکہ، جس کے چہرے پر ان گنت جھریاں پڑی ہوئی ہیں، آپ سے خراج نہیں لے سکتی۔ لے کر رہی آخر۔ خود سے باتیں کیا کرتے ہو۔ مجذوب کی طرح بڑبڑاتے رہتے ہو۔

خوشہ چیں: تم کسی سے لڑ کر آئے ہو جویا کہ آتے ہی مجھ پر برس پڑے۔ مجذوبوں کا دور کب کا ختم ہوا۔ آج کل تو سب لوگ ذہنی انتشار کا شکار ہیں۔ جذب کا عالم اب کہاں۔ میرا جیسا سست رو انسان جس کے پیروں میں حزم و احتیاط کی بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں، آفات ارضی و سماوی کی لپیٹ میں آ کر مجنوں تو بن سکتا ہے، مجذوب نہیں بن سکتا۔ ہمارے بچپن میں ہر قصبہ ہر قریہ میں مجذوب نظر آتے تھے اب نسخہ میں ضرورت ہو تو عطار کے یہاں بھی نہیں ملیں گے۔

جویا: کہاں گئے آخر وہ مجذوب؟

خوشہ چیں: اس زمانے کی آنکھوں میں نئے علم اور کوری عقل کی روشنی سے ایسی چکاچوند ہو گئی ہے کہ حواس کے ماورا کسی بات کو تسلیم کرنے کے لیے یہ عہد تیار ہی نہیں ہے۔ عقل اور علم نے بہت سے دلنواز طلسموں کو توڑ دیا ہے۔

جویا: گویا آپ ہوش و گوش سے زیادہ جذب و جنوں کے گرویدہ ہیں؟

خوشہ چیں: غلط نتیجہ نکالنے کے آداب کوئی تم سے سیکھے۔ بات پوری نہیں ہونے دیتے اور چھلانگ لگا کر خود ساختہ نتائج تک پہنچ جاتے ہو۔ معاف کرو مجھے ایک مصرع یاد آ رہا ہے شاعر نے جس کے حقوق واعظ کے لیے محفوظ کر دئے تھے

بر جست چو بوزینہ و بنشست بہ منبر

یعنی بندر کی طرح اُچکا اور منبر پر بیٹھ گیا۔ ، تم بھی اسی تیزی کے ساتھ نتیجہ کے ممبر پر بیٹھ جاتے ہو۔

جویا: بھائی صاحب! آپ کا حق ہے ہمیں چاہے بندر بنائیں چاہے لنگور کہیں۔ ہم نے مان لیا صاحب کہ لنکا نواسوں کی طرح آپ باون گز کے ہیں۔ لیکن اپنی لنکا کی خیر منایئے۔

خوشہ چیں: حضرت عقل جب تقسیم ہو رہی تھی تو آپ کہاں تھے! میں نے آپ کی ایک ذہنی روش کو (اور وہ بھی ایک شاعر کے حوالے اور ایک واعظ کے وسیلے سے) بندر کی حیثیت سے تشبیہ دی تھی خدانخواستہ آپ کو بندر نہیں بنایا تھا۔ مان لیجیے کہ میں نے آپ کو بندر کہہ بھی دیا تھا تو آپ کو یہ حق کہاں سے پہنچ گیا کہ خود لنگور بتائیں اور میری لنکا کو خاکستر بنانے کی دھمکی دینے لگائی نہ آپ نے ایک اور جست۔۔ اب کی بار سلسلہ ارتقا میں۔

جویا: دھمکی وھمکی میں نے ہرگز نہیں دی؛ میرا خدا شاہد ہے کہو تو قرآن شریف اُٹھا لوں۔

خوشہ چیں: خدا کے بندے اس کی کتاب کا احترام کرنا سیکھو۔ ذرا اختلاف آپس میں ہوا اور لگے قرآن شریف اٹھانے۔ تم جانتے نہیں، گمان غالب ہے کہ یہی حق تعالیٰ کی وہ امانت تھی جسے

پہاڑوں اور صحراؤں نے اُٹھانے سے انکار کر دیا تھا، انسان نے اپنی جہالت میں بڑا ظلم کیا کہ اسے اُٹھا لیا۔ تم نہیں سمجھتے کہ اُٹھانے کا مفہوم کیا تھا۔ راستی اور ہمدردی کی راہ پر چلنا۔ کہنے کو تو یہ چھوٹی سی، سیدھی سی بات ہے لیکن عمل کرنے چلیے تو پسینے چھوٹ جائیں دیکھو نہ اُن کا وطیرہ کیا ہے جو خود کو حاملِ قرآن کہتے ہیں۔ قرآن کا مصرف کیا رہ گیا ہے، طاق (نسیاں) کی زینت بنا رہے، موت دستک دے رہی ہو تو بقول شاعر سورہ یٰسین سے نزع کی تکلیف کم ہو جائے اور جب جانے والا آخری ہچکی لے چکے تو قرآن پڑھ کر اس کی روح کو ثواب پہنچایا جائے۔ ظالموں نے اس کتاب کا رشتہ جو زندگی کا پیغام اور ضابطۂ ہدایت ہے، موت کے ساتھ اس طرح جوڑ لیا ہے کہ ہمارے زیادہ تر گھروں میں قرآن جزدان سے جبھی نکلتا ہے جب کسی کا دم نکل رہا ہو یا نکل چکا ہو۔

یا : دیکھو بھائی مان لیا میں بندر کی طرح جست لگاتا ہوں لیکن کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگتا کون ہے؟ ایک بات ہاتھ آگئی، گھٹنوں اسی کو لے کر رینگتے رہے۔ بات کا وصف یہ ہے کہو اور ختم کرو یہ کیا کہ کاتتے چلے جا رہے ہیں، پھیلاتے چلے جا رہے ہیں۔ انگریزی زبان میں داستان کے لیے وہ لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے جسے سوت کا دھاگہ کہتے ہیں۔ بات میں سے بات نکالتے جانا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ میں نے تو یہ پوچھنا چاہا تھا کہ آپ ہی آپ کیا باتیں کر رہے ہو۔ میں نے تو جذب کا شبہ کیا کوئی دوسرا ہوتا تو جنون پر یقین لے آتا۔ "ناگاہی، کیا خوب، ناگاہی کیا خوب" کیا مطلب تھا آپ کا اور یہ ناگاہی یعنی چہ؟ گہا نی" تو سنا تھا، آگاہی سے بھی باخبر تھا لیکن یہ "ناگاہی" کیا۔ حضرت کیا آپ کو حکومت نے یہ اختیار بھی دے دیا کہ زبان کی ٹکسال کا اہتمام آپ کریں اور نئے الفاظ، حسب دلخواہ وضع کرتے چلے جائیں۔ اگر وضع الفاظ کے عمل میں آپ نے ناسک کی ٹکسالی پر بسی کی پیروی کی تو نئے الفاظ کی بھیڑ لگ جائے گی اور پرانے الفاظ مٹ میلے اور پھٹے ہوئے نوٹوں کی طرح شہر بدر کر دیے جائیں گے۔

خوشہ چیں : مان لیا، میں رینگتا ہوں، تمہاری برق رفتاری کے آگے میری فکر پابہ حنا ہے۔ حضرت آپ "تار باجا اور راگ بوجھا" کا تازہ ترین ایڈیشن ہیں۔ آپ راگ کو اسی وقت بوجھ لیتے ہیں جب مضراب اور تار میں دو انگل کا فاصلہ ہوتا ہے۔ جو لوگ بات کو سیاق و سباق سے توڑ کر سمجھتے یا سمجھاتے ہیں، ان کو دو گروہوں میں بانٹنا پڑے گا۔ ایک تو وہ جن کی برق رفتار بے صبری انھیں بات کو پورا ہو جانے کی مہلت ہی نہیں دیتی، وہ فصل اس وقت کاٹ لیتے ہیں جب دانے ہی نہیں پڑے ہوتے ہیں بالیوں میں۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو بات پوری سنتے ہیں لیکن اس کے دو ٹکڑے اپنے کسی مقصد کے تحت کر ڈالتے ہیں اور ایک ٹکڑے کو اس طرح اچھالتے ہیں جیسے حلوائی دودھ کو اچھالتا ہے اور سادہ دل گاہک سے کہلواتا ہے کہ ایک گز یا دو گز (حسب مقدرت) دودھ دے دو۔ اس کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ دودھ پر جھاگ اور بعض لبوں پر مسکراہٹ آجاتی ہے لیکن بات کے ٹکڑے کو اچھالنے کے نتائج خطرناک ہو سکتے ہیں اور اکثر ہوتے ہیں۔ بات بیر من مٹاو، دشمنی، ہاتھا پائی، بدگمانی، فوجداری اور خون خرابے تک پہنچ جاتی ہے۔

جویا : یہ راگ کب تک الاپو گے، میرے بھائی۔ کیا کہنا چاہتے ہو۔

خوشہ چیں : کہوں جب کہ تم کہنے دو۔ میں اور الفاظ وضع کروں۔ توبہ کرو بھائی۔ میں نے ترکیبیں البتہ کچھ تراشی تھیں۔ کسی نے انہیں قبول ہی نہیں کیا۔ ان کا وہ حشر ہوا جو اس بچے کا ہوتا ہے جو مردہ پیدا ہو اور ایسے بے درد انسان یہ بھی تو سوچ کہ جو زبان دم توڑ رہی ہو، اس کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کی کوشش سعی لاحاصل نہیں تو کیا ہے۔ نیکی کے لیے کہا گیا ہے کہ اور کنویں میں ڈال، زبان کی متاع اور ذخیرۂ الفاظ کے لیے تو کسی نے یہ نہیں کہا کہ الفاظ وضع کرو اور انھیں سیلاب کے راستے میں بٹھا دو۔ میاں ہوش کے ناخن لو۔ جو زبان تم بول رہے ہو وہ اب کچھ دنوں کی مہمان ہے۔ میری مراد ہے بہ حیثیت زبان کے۔ جس حیثیت پر لوگ اسے لانا چاہتے ہیں، اس پر تو اس کے حقوق ہمیشہ محفوظ

رہیں گے۔ بولی کی حیثیت سے تو یہ اس وقت تک زندہ رہے گی جب تک کہ دنیا قائم ہے اور ہماری روحیں شاد کام رہیں گی کہ ہماری اردو زبانوں پر ابھی تک چڑھی ہوئی ہے۔

جویا: تمہیں آج کیا ہوا ہے بھائی صاحب۔ طولِ کلام اور درازنفسی کبھی تمہارے ساتھ منسوب نہیں کی جاتی تھی۔

خوشہ چیں: دل بھر آتا ہے تو ہوش و حواس کام نہیں دیتے۔ اردو کا ذکر چھڑ گیا اور میں بے قابو ہوا۔

جویا: لیکن آپ اردو کی طرف سے اس قدر فکرمند کیوں ہیں؟ ہماری سرکار نے کتنے ادارے اردو کی ترویج اور اردو اہلِ قلم کی جزا اور پرورش کے لیے کھول رکھے ہیں۔ بے شمار یونیورسٹیوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے۔ اردو کے اساتذہ کو بڑی بڑی تنخواہیں ملتی ہیں اردو رسایل اور اخبارات کی بھرمار ہے اردو میں کتابیں چھپتی چلی جا رہی ہیں۔

خوشہ چیں: قرآن اور سورۂ یٰسین والی بات (بلا تشبیہ) یاد آگئی۔ ان ساری کاروائیوں کی جن کا تم نے ستایش کے ساتھ ذکر کیا ہے، اہمیت اتنی ہی تو ہے کہ اردو کے تابوت پر آخری نقش و نگار بنائے جا رہے ہیں۔ کوئی کچھ کہے ہم تو نتائج سے اعمال و نیّات و محرکات کا اندازہ لگاتے ہیں۔ اردو کو نظامِ تعلیم سے نکال دیا گیا ہے۔ برائے نام بھی نہ رکھتے تو اچھا تھا۔

جویا: تو آپ سمجھتے ہیں کہ یہ خوب صورت اور ہونہار زبان اربابِ اقتدار کی کشتۂ تغافل ہے۔

خوشہ چیں: اردو کے ساتھ ناانصافی بھی ہوئی ہے اور ظلم بھی لیکن میں اربابِ حل و عقد سے زیادہ خود مسلمانوں کو الزام دیتا ہوں۔ وہ چاہتے تو اس زبان کو زندہ رکھ سکتے تھے۔ دراصل اردو اور اس کے رسم خط میں مسلمانانِ ہند کی بقا پنہاں ہے۔ اردو کی وفاداری کا جھوٹا حلف اٹھانے کے بجائے اگر وہ اسے خونِ جگر سے سینچتے۔ گھر گھر اردو پڑھانے کا اہتمام کرتے تو وہ یہ دن کیوں دیکھتی۔ اس وقت عالم یہ ہے کہ اتر پردیش میں جو اس کا گہوارہ اور قلعہ ہے، اردو سے نئی نسل بالکل بے بہرہ اٹھ

رہی ہے۔ خود علی گڑھ کے طلبا کی اکثریت اردو سے بیگانہ ہے

جویا: بھیا خوشہ چیں کیا آپ بھی ان تنگ نظر لوگوں کی صف میں آگئے جو اردو کو مسلمانوں کی زبان کہتے ہیں۔ کیا آپ یہ نہیں جانتے کہ ہندوستان میں باہمی اتحاد اور قومی یک جہتی کا سب سے بڑا مرقع، سب سے موثر علامت یہی زبان ہے۔

خوشہ چیں: پھر بہک رہے ہو تم۔ مدعا میرا صرف یہ تھا کہ اردو اگر ختم ہوتی ہے تو سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کا ہوگا لسانی اور ادبی کے علاوہ ثقافتی، تہذیبی، علمی اور دینی اعتبار سے لہٰذا مسلمانوں کو پسینہ بہا کر، دن رات ایک کر کے اس زبان کو زندہ رکھنا ہے۔ زندہ رکھنے کے معنی ہیں اگلی پیڑھی تک اسے سالم و ثابت پہنچا دینا، اگلی پیڑھی کے ہر فرد تک۔ شمالی ہندستان کے ہر مسلمان کو اردو میں دستگاہ ہونا لازمی ہے۔

جویا: مگر آپ بھول گئے کہ اردو بحیثیت ایک تحریری و تقریری زبان کے پوری آب و تاب کے ساتھ پاکستان میں بہرحال زندہ رہے گی۔

خوشہ چیں: دوسرے کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلانا خطرے سے خالی نہیں۔ خطرہ اس کندھے کی سلامتی کو بھی ہے جس رکھ کر بندوق چلائی جا رہی ہے اور بندوق چلانے وا کی عزت اور ہمت کو بھی۔ پاکستان والے اردو کے ساتھ جو چاہے کریں، ہماری قومی غیرت کیا یہ گوارا کرے گی کہ ہماری زبان بقا کے لیے پردیسیوں کی محتاج ہو، غیروں کی دست نگر ہو اور اگر تم مجھے پھر تنگ نظر نہ کہو تو یہ بھی سن لو کہ ہم ہندستان وا (میں یہاں ہندوستان اس جغرافیائی مفہوم میں استعمال کر ہوں جس میں یہ لفظ کبھی استعمال ہوتا تھا یعنی دلی، یوپی ا بہار کا خطہ) پاکستانی اردو خصوصاً وہاں کے تلفظ اور لہ لہجہ کو ٹکسال باہر بد رنگ سمجھتے چلے آئے ہیں۔ "ٹی ق" پر اتنا ہی زور دیتے تھے اتنا ہی فخر کرتے ہیں جتنا عرب "حق" پر د اور کرتے تھے۔ ان کے لیے حق کا صحیح تلفظ مابہ الافتخار او مابہ الامتیاز تھا۔

یا : یہ تو تقسیم کار کی بات ہو گئی۔ پاکستان اردو میں کارِ دو بار چلائے تخلیقات کرے۔ آپ تلفظ اور شین قاف کو سنبھالیے۔ وہ تحریر کے مالک آپ تقریر کے۔

بیں، کبھی تو سنجیدہ ہونا سیکھو۔ یہاں جان کے لالے پڑے ہیں اور آپ کو تقسیم کار کی بے دردی بھبتی سوجھ رہی ہے۔

یا : اچھا تو بتائیے یہ "ناگاہی" کیا بلا ہے۔ یا کوئی وظیفہ ہے جسے پڑھ کر آپ تسکینِ قلب حاصل کرتے ہیں۔

بیں: "ناگاہی" کا بھونڈا لفظ میں نے وضع ضرور کیا ہے لیکن یہ انگریزی کے لیک اتنے ہی بھونڈے لفظ کا ترجمہ ہے۔ پرانا انگریز تو شاید اسے مرتے دم تک قبول نہ کرے لیکن "او ای ڈی" یعنی آکسفورڈ انگلش ڈکشنری ۸۸ء تک اسے ضرور تسلیم کر لے گی۔ بے چین کیوں ہو رہے ہو، سن لو یہ لفظ ہے "ڈِس انفارمیشن" (DIS INFORMATION) اور اسے امریکہ کے ارباب اقتدار نے حال ہی میں ایجاد کیا ہے۔ اس کا مفہوم ہے غلط اطلاعات پھیلانا۔ سچ پوچھیے تو مِس اِنفارمیشن ۔ (MIS - INFORMATION) اس فعل کے لیے زیادہ موزوں ہوتا۔ مگر ابھی (گوئبلس کے چالیس سال بعد بھی) وہ حکومت وجود میں نہیں آئی جو جرأت کے ساتھ یہ مان لے کہ اس کے فرائضِ منصبی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اپنے عوام یا دوسرے ملک کے عوام و خواص کو واقعات کے متعلق گمراہ کرتی رہے۔ "ڈِس انفارمیشن" میں ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ یہ غلط اطلاع برجستہ نہ دی جائے بلکہ متواتر ایک منصوبے کے تحت، اپنے ملک کے مفاد کی خاطر۔

: سبحان اللہ۔ لے طبیبِ اخلاق، نسخہ تو آپ نے لکھوا دیا اس کی ترکیب استعمال بھی سمجھا دیجیے۔ مثال دے کر۔

بیں: تمہاری نظر چوک گئی۔ ۹ر اکتوبر ۸۶ء کے ٹائمز آف انڈیا کے صفحہ ۱۶ پر یہ خبر چھپی ہے کہ حکومتِ امریکہ کے خصوصی ترجمان برنارڈ کلب نے کل اپنا استعفیٰ داخل کر دیا۔ وجہ یہ بتائی کہ رونالڈ ریگن کی حکومت لیبیا کے سربراہ کرنل قذافی کو جھوٹ بول بول کر اُکھاڑنا چاہ رہی ہے۔ کلب نے کہا کہ ایسی صورتِ حالات میں انسان یا تو خاموش رہ سکتا ہے یا اپنی بساط کے مطابق احتجاج کر سکتا ہے۔ اس نے آخر الذکر طریق کار اختیار کیا۔

جویا : حکومتیں ضمیروں کا سودا کیا ہی کرتی ہیں لیکن کبھی کبھی ان کا سابقہ برنارڈ کلب جیسے سرپھروں اور ضدیوں سے ہو جاتا ہے۔ برنارڈ کا کیا جا رہا تھا۔ جھوٹ کا جو تانا بانا پریس اور پبلک کے لیے ریگن صاحب کے حسبِ ہدایت حکومت بن رہی تھی، اس سے اس خصوصی ترجمان کو کیا جراحت پہنچ رہی تھی اور پھر حکومتیں جھوٹ تو بولا ہی کرتی ہیں۔ حکومتیں سیاست کے سہارے قائم ہوتی ہیں اور سیاست کو دروغ سے کون جدا کر سکا ہے۔ انگریزی میں تو ایک مثل ہے کہ سفیر کا کام یہ ہے کہ دوسرے ممالک میں اپنے آقائے ولیِ نعمت کی خاطر جھوٹ بولتا رہے۔ سیاست اور سفارت کا دروغ بافی کے ساتھ پرانا رشتہ ہے۔ سیاست کے متعلق اُسی زبان کے ایک بذلہ سنج نے کہا ہے کہ وہ بدمعاشوں کی آخری پناہ گاہ ہے۔

خوشہ بیں: یہ تو اندازِ بیان ہے لیکن یہاں جس بات پر طبیعت ٹھٹھکتی ہے اسے اس طرح سمجھو۔ اب تک بین اقوامی سیاست میں سفارت کار دل کا طریقہ یہ رہا ہے کہ افعال و واقعات کے محرکات کے بارے میں جہاں ضرورت پڑے جھوٹ بول دیں۔ مثلاً اگر دو ملکوں میں شکر رنجی ہو گئی اور اگر ان کے سربراہوں کی متوقع ملاقات کو اس بنا پر ملتوی کرنا ہے تو بے تکلفی کے ساتھ اُن میں سے کسی ایک کو بیمار ڈال دیا جائے گا۔ اس سے آگے بڑھیے تو ایسی غلط نیت یا فیصلے پر جھوٹ کا پردہ ڈالا جائے گا جس سے ملک کی ساکھ اور اس کے مفاد کو نقصان پہنچنے کا ڈر ہو۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر جنگ کے دوران ایسی شکستوں کو فتح میں بدل دیا جائے گا جس سے افواج اور عوام کے حوصلے کو جراحت پہنچنے کا کھٹکا ہو۔ لیکن یہ امریکہ اور جناب ریگن کی اولیات اور اختراعاتِ فائقہ میں سے ایک ہے کہ کسی ملک کے بارے

میں ایک بیرونی حکومت اور اس کے آلۂ کار کی طرف سے متواتر غلط بیانی اور دروغ بافی کی جائے۔ واقعات کو یا تو بدلا جائے یا بنایا جائے یا گھڑا جائے۔ انگریز محبت اور لڑائی میں جھوٹ کو جائز سمجھتے تھے۔ یہاں نہ محبت ہے نہ لڑائی اور دروغ کو ایسا فروغ ہوا ہے کہ باید و شاید۔

جویا : کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ امریکہ اور لیبیا کے درمیان لڑائی نہیں ہے جناب لڑائی کی دو صورتیں ہوتی ہیں گرم اور سرد اور جو لوگ سرد و گرم روزگار دیکھ چکے ہوتے ہیں وہ اکثر سرد لڑائی کو گرم لڑائی پر ترجیح دیتے ہیں، یا کم از کم ٹھنڈی لڑائی کو گرم لڑائی کا پیش خیمہ بناتے ہیں۔

خوشہ میں : لڑائی میں بولا جائے یا امن میں، گرم لڑائی میں بولا جائے یا ٹھنڈی لڑائی میں، جھوٹ بہرحال جھوٹ ہے۔ "ناگہی" یا "ناگاہی" کے جس پروگرام سے ریگن کی حکومت نے پریس اور پبلک کو نوازا ہے سوچو تو کیا ایک ملک کو وہ زیب دیتا ہے، کیا روایتی سفیروں کی جگہ اصلی وزیروں نے نئی دنیا میں یہ دھندا اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ کوئی انسان جھوٹ بولتا ہے اور رینڈ و غلے کی اڑاتا ہے تو اقران و امثال کے نزدیک اس کی ساکھ مٹی میں مل جاتی ہے۔ اگر کسی ملک کا سربراہ ایسا کرنے لگا تو اس ملک کے متعلق دوسرے ممالک کیا رائے قایم کریں گے۔

جویا : یہی کہ وہ ملک فراست اور الحاد و اختراع میں دوسرے ملکوں کے کان کاٹتا ہے۔ وہ ملک تو غبی ہوں گے جو واقعات کے پابند ہو جاتے ہیں ذہین وہ ممالک ہیں جو واقعات ایجاد کریں اور سچائی اور حقیقت کے فرسودہ اور تکلیف دہ بندھنوں سے خود کو چٹکی بجاتے آزاد کر لیں۔

خوشہ میں : جویا اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو پھر برنارڈ کلب نے استعفیٰ

کیوں دیا؟ اسے گھٹن کیوں محسوس ہوئی۔ اس نے تو لپنے بیا[ن میں] یہ کہا ہے کہ "جھوٹ اور آدھے سچ کو شایع کرنے کے پروگرام نے امریکہ کی ساکھ اور اس پر عالمی اعتماد کو مٹی ملا دیا ہے اور سچائی کی شہرت نئی دنیا کی اس بڑی جمہو[ریت] کے دل کی دھڑکن ہے۔" ۲۵ اگست کو وال اسٹریٹ جر[نل میں] یہ خبر شاہ سرخی کے ساتھ چھپی کہ ریاست ہائے متحدہ کی حکوم[ت] لیبیا کے خلاف پھر کوئی عملی قدم اُٹھانے والی ہے۔ وہائٹ ہاؤس کے ترجمان لاری اسپیکس (…RRY SPEAKES) نے اس خبر کی تردید کرتے ہوئے ندرت کا ثبوت دیا، کہ "اس خبر کو چھاپنے کی سرکار نے اجازت نہیں دی تھی لیکن خبر بہت مستند۔ گذشتہ ہفتے واشنگٹن پوسٹ نے یہ ح[یرت] انگیز انکشاف کیا کہ وہ خبر جو وال اسٹریٹ جرنل میں اور [اس] کے بعد دوسرے اخباروں میں چھپی تھی اور ٹی۔ وی پر مشتہر [ہوئی] تھی وہ فریب دہی کی ایک خفیہ کوشش تھی جس کا مقصد [کرنل] قذافی کو غیر مستحکم کر دینا — ترکیب یہ کی گئی تھی کہ افسانہ اور [حقیقت] کو اس طرح شیر و شکر کر دیا جائے تاکہ کرنل قذافی یہ سو[چنے پر] مجبور ہو جائے کہ خود اس کے ملک میں اس کی مخالفت زو[ر پکڑ رہی] ہے۔ دروغ اور فریب کاری کا یہ منصوبہ ۱۴ اگست کو قو[می] سلامتی کی منصوبہ ساز انجمن کے سامنے پیش ہو کر منظور ہوا [اور] اس کے بعد صدر ریگن نے اس دستاویز پر دستخط کر[کے] اس منصوبے پر مہر نفاذ ثبت [کی]۔ صدر محترم سے جب سوال کیا گیا تو انہوں نے صاف انکار کیا لیک[ن بعد] میں انہیں تسلیم کرنا پڑا وہ یہ اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ کچھ [میمو] (میمو) ادھر سے ادھر فرد[…] ملک بھر میں بحث چھڑی ہ[ے] کہ ملک اور پریس کے ساتھ اس دروغ گوئی میں کیا سیاسی یا اخلاقی مصلحت مضمر ہو سکتی ہے۔ نیویارک

> "اخلاقی تعلیم صرف کتابوں کی تعلیم سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ عمدہ سوسائٹی اس کی تعلیم دیتی ہے۔"
>
> سرسید

ے تبصرے میں اس غم و غصہ کی جھلک ملتی ہے جو امریکہ بھر میں محسوس کیا جا رہا ہے۔ "جان بوجھ کر اعتبار کو مجروح کرنے کی یہ مثال بھیانک اخلاق سوزی کا ایک مظاہرہ ہے۔"

ناگاہی (ڈس انفارمیشن) سچائی کی تلبیس' پری دے ری کیشن" ان سب الفاظ کا سادہ ترجمہ جھوٹ اور دروغ اور مکر و فریب ہے۔

: انگریزی زبان کے پاس بدنما مضمون کو خوبصورت لباس پہنانے کا بڑا موثر ہتھیار ہے۔ اس ہنر کا نام انگریزوں نے یونی مزم (EUPHEMISM) رکھ چھوڑا ہے۔

ہیں: زبان جو بھلائی کے لیے بنی ہے، گمراہ ہو جاتی ہے تو بڑا غضب ڈھاتی ہے۔ دوسروں کو اور خود کو فریب دینے کے کام آتی ہے۔

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ

زبان سچائی اور ہمدردی اور پاکی کے لیے بنی ہے۔ لوگ اسے جھوٹ گندگی اور فریب کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

یہ بھی سوچا تم نے جویا کہ دروغ کا یہ شرمناک کاروبار اُس ملک میں ہو رہا ہے جس نے سچائی اور جمہوریت کا علم بلند کیا تھا۔ جس نے نئی دنیا کی بنیاد بظاہر صداقت اور انصاف پر رکھی تھی۔ یہ بے باک اور فتنہ پرداز دروغ گوئی اس شخص سے اور اس کی ایما پر سرزد ہو رہی ہے جو واشنگٹن، جیفرسن اور لنکن کا جانشین ہے۔ کیا ریاست ہائے متحدہ امریکہ اپنے بانی کی پیروی کا حق اس انوکھے انداز سے ادا کرتی رہے گی۔

خوشہ چیں: بھیّا۔ آپ ناحق حیرت اور حسرت میں پڑ گئے۔ اتنی دور کیوں جاتے ہیں۔ سات سمندر پار، اپنے گھر [illegible] دیکھیے۔ کیا ہم لوگ مہاتما گاندھی کے دکھائے ہوئے راستے پر چل رہے ہیں؟ کیا ہمارے یہاں جھوٹ، ریاکاری اور ملاوٹ کا دور دورہ نہیں ہے؟ کیا باوجود رواداری کے دعووں کے ہم تشدد اور کینہ میں سر سے پاؤں تک بسے ہوئے نہیں ہیں؟ کہتے ہیں کہ باپو اہنسا کے اوتار تھے، یہ کہہ کر اور باپو کو شردھانجلی دے کر ہم اپنے حق میں ہنسا کا پٹہ لکھوا لیتے ہیں۔ گجرات پر نظر ڈالیے جہاں باپو نے جنم لیا، جہاں انہوں نے سابرمتی کے کنارے اپنا آشرم بنایا، اسی گجرات میں تعصب اور تشدد اپنی انتہا کو پہنچ گئے ہیں اور رکنے کا نام نہیں لیتے۔ ریگن کی طرح جھوٹ بول کر ظلم کے لیے راستہ ہموار کر لیتے ہیں۔

خوشہ چیں: معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں کوئی خاص عقیدت نئی دنیا سے ہے، اس پر فردِ جرم لگی تو اپنے ملک کو الزام دینے لگے۔

جویا: یہاں میں آپ کی ایک نہیں سنوں گا۔ جرم بہر حال جرم ہے۔ جھوٹ بہر حال جھوٹ ہے خواہ وہ نئی دنیا میں کہا یا کیا جائے یا پرانی دنیا میں۔ باہر کیا جائے یا گھر میں۔ اگر میں یہ پوچھوں کہ آپ کو قذافی سے کیا انسیت ہے تو آپ کیا جواب دیں گے؟

خوشہ چیں: مجھے قذافی سے انسیت کیوں ہونے لگی۔ ابتدا میں اس کے متعلق حسنِ ظن تھا، لیکن جب اس نے اپنی حدود سے نکل کر ہری کتابوں کے انبار پر کھڑے ہو کر اپنے قد کو اونچا کرنا شروع کیا تو یہ حسنِ ظن پگھل کر بہہ گیا۔ لیکن قذافی سے تو یہاں بحث ہے ہی نہیں۔ یہاں ذکر ریگن کی دو رُخی غلط بیانی اور دروغ گوئی کا تھا جسے اس نے اپنا سیاسی الو سیدھا کرنے کے لیے اختیار کیا ہے۔

> "ملت کے ملی تقاضوں سے غفلت کہ ہر شخص اپنے کام میں مگن ہو، اپنی دولت اور تجارت کی فکر کرے، ملی مسائل سے کوئی دلچسپی نہ ہو، اپنے ذاتی مفادات کو ملی مفادات پر ترجیح دے، یہ خود غرضی اور انانیت قوموں کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے۔"
>
> (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

جویا: لیکن بات ابھی تک وہیں کی وہیں ہے۔ یہ تو سمجھا دیجیے گا کہ "ناگاہی" کا لفظ آپ نے وضع

کس طرح کیا۔ زبان کی طاقت کا مجھے آج اندازہ ہو گیا ہے
گر آ جائے تو میں بھی الفاظ سازی شروع کر دوں۔

خوشہ چیں: آگاہی سے پہلے "نا" لگا دو تو ایک الف خود بخود گم ہو جائے گا۔ ناگاہی (یعنی واقف نہ ہونا) بن جائے گا۔ آگہی کے ساتھ یہی عمل کرو تو ناگہی بن جائے گا۔ "واقف نہ ہونا" کے علاوہ امریکی سانچے میں اس کے مفہوم کو ڈھالیے تو مطلب وہی نکلیں گے، اصلی حقیقت کو ہٹا کر ایک نقلی حقیقت سامنے لے آنا جسے ڈس انفارمیشن کا پردہ پوش نام دیا گیا ہے۔ اس طرح ناگاہی کا مطلب ہوا آگاہی سے دیدہ و دانستہ محروم کر دینا۔

جویا: اگر حکومتیں اس طرز عمل کو اپنی سیاسی مصلحتوں کے لیے عام طور پر اختیار کر لیں تو جھوٹ کا بول بالا ہو جائے گا — ایک دولت فائقہ (سپر پاور) نے اس ہنر کو فن لطیف کا مرتبہ دے دیا ہے، دوسری دولت فائقہ نے لوہے کی ایک دیوار کھڑی کر دی ہے۔ عام آدمی کیا کرے، کیا سمجھے کدھر جائے۔

خوشہ چیں: اب یہ دنیا عام آدمی کے لیے رہی بھی نہیں۔ افراد
عالمگیر شکنجے میں جکڑ گئے ہیں۔ یہ شکنجہ سیاست کا
ہے اور جیسے جیسے دنیا آگے بڑھتی جائے گی فرد کی سا
اور سچائی کی قدریں ٹوٹتی جائیں گی۔ ریزہ ریزہ
گی۔ دین ہی ایک ایسی طاقت ہے جو عقل کو فریب کاری
دروغ بافیوں سے روکتی ہے۔ ورنہ ہر برائی کا جواز
کے لیے عقل ڈھونڈھ نکالتی ہے۔ سیاست سے دین کو
وہ صداقت، راستی اور انصاف سے بھی محروم ہو جا

جویا: مجھے کیا پتہ تھا حضرت کہ ناگاہی کی تان اس تفر
ٹوٹے گی۔ مبارک ہے وہ ناگاہی جو آگاہی کی
لے جائے۔

خوشہ چیں: تمہاری کج بحثی اور کٹ حجتی سے

سر سید احمد خاں ہندو مسلم سیاسی تعاون میں یقین رکھتے تھے۔ یہ کہنا حقیقت کا منہ چڑانا ہے کہ وہ دو قومی نظریے کے بانی تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے اور اس اتحاد کی راہ میں وہ مذہب یا ضمیر کے نام پر کسی رکاوٹ یا اعتراض کے قایل نہ تھے۔ کانگریس سے ان کا اختلاف محض سیاسی مصلحت اور حکمت عملی کی بنیاد پر تھا اور اس قسم کے اختلافات ہندوؤں میں بھی موجود تھے۔ مثلاً زمین داروں اور تعلیم یافتہ متوسط طبقے کے مابین۔

(ڈاکٹر تارا چند)

مسلم طلبا کے لیے کوچنگ سینٹرس کے قیام کی اہمیت

محمد اسحاق

مسلمانوں کے تعلیمی مسایل پر چند دنوں سے اچھے مضامین شایع ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں کی تعلیمی و معاشی پستی کے اسباب اعداد و شمار کی روشنی میں تجزیہ کیا جاتا رہا ہے۔ اس سلسلے کی ایک کڑی کے طور پر یہ دیکھنا ضروری ہے کہ عملاً اس وقت کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ جاننا ضروری ہے کہ تعلیم کا مسئلہ، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی زبان میں سیاست کی طرح کوئی پہاڑی نالا نہیں ہے جو اچھلتا کودتا کہیں وادی میں جا گرتا ہے۔ تعلیم تو ایک خاموش دریا ہے جو اطراف و اکناف کی وادیوں کو لہلہاتی کھیتیوں میں تبدیل کر دیتا ہے، مگر اس کے لیے ایک عرصہ درکار ہوتا ہے۔ تعلیم کا کام بڑا صبر آزما ہوتا ہے اور برسوں کی مسلسل کوشش کے بعد اس کے نتائج سامنے آتے ہیں۔ اس میں بعض حضرات جتنی جلد بازی دکھانے کی کوشش کرتے ہیں، اتنا ہی انھیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جہاں تعلیم نہیں وہاں جہالت و غربت، افلاس و نکبت بے روزگاری و بے کاری، بد قسمتی اور فاقہ مستی، وقت گزاری و نامرادی، تنگ نظری و تعصب، ایک ہی مقام سے وابستگی و پابہ زنجیری عام روگ ہیں اور یہی وہ اسباب ہیں جو کئی ایک معاشی و معاشرتی اور سیاسی مسایل کو جنم دیتے ہیں۔ ان کا مداوا حکومت اور لیڈران قوم وقتی مسایل کے طور پر حل کرنے میں بہت وقت اور توانائی ضایع کرتے ہیں لیکن مسایل جوں کے توں رہ جاتے ہیں۔ ان سب کا علاج صرف ایک اور ایک ہی ہے، وہ ہے تعلیم کا عام کرنا تعلیم ہی ایک ایسا پارس ہے جو خود انسان کو بدل دیتا ہے اور ایسا کمال پیدا کر دیتا ہے کہ وہ جوہر قابل دوسروں کو بھی پارس بنا سکتا ہے۔ کچھ دنوں پہلے

جناب سید حامد صاحب، سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ مدینہ پبلک اسکول میں "مسلمانوں کے تعلیمی مسایل" پر ایک نہایت جامع اور پُر مغز تقریر کی تھی جس میں ایک بات تو کہنے کی یہ ہے کہ سر سید کے انتقال کو آج ۸۸ برس ہو گئے لیکن سر سید کے بعد پھر کسی مسلم دانشور یا لیڈر نے کبھی مسلمانوں کی تعلیم پر کوئی توجہ نہیں دی۔ آپ نے بتلایا کہ ایک عرصے سے تعلیم کے شعبے سے وابستگی کی وجہ اور سارے ہندوستان کی سیر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کے اہم تعلیمی مسایل کیا ہیں۔ موصوف نے مندرجہ ذیل مسایل کی نشان دہی کی ۔

۱۔ مسلم طلبا کے لیے کوچنگ سینٹرس کا قیام

۲۔ مسلمان لڑکیوں کی تعلیم پر خاص توجہ دینا۔

۳۔ مسلمان ماں باپ اپنے بچوں کو گھر پر پڑھانے کے لیے اپنی دوسری مصروفیات کو کاٹ کر کم از کم ایک گھنٹے کا وقت روز دینا۔

۴۔ پرائمری اسٹیج پر مسلم طلبا کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ کرنا ۔

دوسرے الفاظ میں جتنا BASE یا بنیادی تعلیم کا پھیلاؤ وسیع ہوگا، اتنا ہی اوپر اعلیٰ تعلیم اور مسابقتی امیدواروں کی تعداد بڑھے گی اور بھی بہت سی کام کی باتوں کے ساتھ یہ کہا کہ اس وقت سارے ہندوستان

جناب محمد اسحاق، پرنسپل سلطان العلوم کالج آف ایجوکیشن، بنجارہ ہلز۔ حیدرآباد۔

ین مسلمانوں کے تعلیمی مسایل میں وہ "کوچنگ سنٹرس" کے قیام کو نمبر ایک مسئلہ قرار دیتے ہیں۔ یہ بات ذرا چونکا دینے والی تھی کیوں کہ عام طور پر اس طرف کبھی ذہن گیا نہیں تھا۔ غور کرنے کے بعد یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس دانش ور کی نظر اس بنیادی مسئلہ پر گئی۔ آپ نے یہ بھی بتلایا کہ آئی۔ اے۔ ایس، آئی۔ پی۔ ایس بنکنگ وغیرہ کے لیے کوچنگ کا انتظام گریجویشن کے بعد نہیں بلکہ انٹرمیڈیٹ کے بعد ہی سے شروع ہونا چاہیے۔ یہاں پر جناب سید حامد صاحب کی پرزور تائید کے ساتھ کوچنگ سینٹرس کی بات کو اور ذرا پھیلا کر پیش کرنا مقصود ہے تاکہ مسلم ادارے اور با اثر شخصیتیں جن میں مسلمانوں کے تعلیمی مسایل سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ اس پہلو پر سنجیدگی سے غور فرمائیں۔ "کوچنگ سینٹرس" دراصل متوازی تعلیمی نظام کی ایک شکل ہے۔ حکومت اور مختلف اداروں کی جانب سے جن اسکولوں میں فارمل یا روایتی تعلیم دی جاتی ہے، وہاں پر طالب علم پر انفرادی توجہ جتنی دی جانی چاہیے وہ کسی حال ممکن نہیں۔ سبق کے بعد سبق آگے پڑھتے جاتے ہیں، چند بنیادی کمزوریاں ابتدائی تعلیم کے زمانے میں کچھ ایسی رہ جاتی ہیں کہ وہ پوسٹ گریجویٹ کی سطح پر پہنچنے کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ خصوصًا ریاضی، انگریزی اور سائنس، یہ تینوں مضامین کچھ اس نوعیت کے ہیں کہ اگر ابتدائی جماعتوں میں خاص طور پر پرائمری اور سکنڈری درجوں میں ان مضامین کی خاطر خواہ تعلیم اور کمزوریاں دور نہ ہوں تو پھر آگے کی تعلیم کی ہر منزل پر یہ نقص کسی نہ کسی طرح سامنے آتا رہتا ہے اور خوبی یہ ہے کہ جو خلا یا نقص بنیادی تعلیم کے زمانے میں ایک معمولی نقطہ معلوم ہوتا ہے، وہ پھیل کر رفتہ رفتہ ایک دائرے میں تبدیل ہو جاتا ہے اور ساری تعلیمی ترقی کو متاثر کر دیتا ہے۔ یہ سب کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کوچنگ سینٹرس دراصل ساتویں جماعت ہی سے شروع کرنا ضروری ہے جب کہ طلباء کی عمر ۱۲ اور ۱۴ سال کے درمیان ہوتی ہے۔ اور انہیں اہم مضامین کے کوچنگ دینے کا مناسب زمانہ یہی ہے اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کے سامنے ۴ سال بعد میٹرک کا امتحان پاس کرنا ہوتا ہے۔ اس عمر کے طلباء کے لیے یہ ایک نہایت اہم امتحان ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ طلباء اپنی چند ایک کمزوریوں کی اصلاح کرتے ہیں، اپنے ہم جماعت طلباء کے مقابل میں تیز ہو جاتے ہیں جو انہیں کلاس میں ممتاز بنا دیتا ہے اور یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو طالب علم کو آگے بڑھانے میں بجلی کے کرنٹ کے طور پر کام کرتا ہے۔ ماہرین تعلیم جانتے ہیں کہ یہ شوق اور جذبہ کا پیدا کرنا ہی تعلیم کی اصل روح ہے۔ یہ پیدا ہو گیا تو پھر آگے کا کام آسان ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ طالب علم کی کمزوریاں ابتدائی جماعتوں ہی میں د[ور] کرنے کی کوشش کی جائے۔ تاکہ اس میں وہ خود اعتمادی پیدا ہو جو ایک طالب علم کا طرۂ امتیاز ہے۔ اسکولوں میں اتنا وقت کہاں، وہاں تو مقررہ نص[اب] پورا کرنے کی دھن رہتی ہے۔ اوسط طالب علم اس دوڑ میں پیچھے رہ جاتے [ہیں] کمزور تو کبھی کے ہمت ہار بیٹھتے ہیں۔ ذہین طالب علم بھی اپنی تشنہ کامی [سے] کچھ مایوس سا ہو جاتا ہے۔ بہرحال اسکول کی تعلیم سے کوئی بھی خوش نہیں دیکھتے ہی دیکھتے امتحان آجاتا ہے جس کے نام سے ہمارے طلباء کے اوسا[ن] خطا ہو جاتے ہیں۔ ان حالات میں جب تک گھر پر روزانہ دو گھنٹے طلباء [کی] تعلیم پر خاص توجہ نہ دی جائے، خاطر خواہ نتائج نکلنے کی توقع رکھنا عبث [ہے]۔

لیکن یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ جو ماں باپ خود تعلیم یافتہ ہیں و[ہ] بچوں کی تعلیم پر کسی نہ کسی طرح توجہ دیتے ہیں، ٹیوشن کا انتظام کرتے [ہیں] کبھی کبھی تعلیمی ریکارڈ کا حال بھی پوچھ لیتے ہیں۔ بعض مائیں، باپ سے [زیادہ] بچوں کی تعلیم پر توجہ دیتی ہیں اور خود پڑھاتی ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں [ماں] باپ خود پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ گھر کا تنگ و تاریک ماحول پڑھنے لکھنے کی اجازت نہیں دیتا، غربت اور جہالت کا سایہ غریب مگر [ذہین] طلباء پر کچھ ایسا منڈلاتا رہتا ہے کہ ان کا دم گھٹ کر رہ جاتا ہے [ایسے] طلباء کے لیے اچھے کوچنگ سینٹرس ہی کچھ کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایجوکیشنل سوسائٹی محبوب نگر کے کوچنگ سینٹر کی مثال قا[بل ذکر] ہے۔ کوئی چھ سال قبل تک مستقر محبوب نگر کے ۱۳ فوقانی اسکولوں [سے] دو چار مسلمان طلباء، مشکل سے میٹرک میں کامیاب ہوتے تھے۔ بلکہ بعض [اوقات] ان کا نتیجہ صفر تک جاتا تھا۔ اس سوسائٹی نے بڑی دور اندیشی سے کوچنگ سینٹر قایم کیا، جہاں پر ساتویں سے دسویں تک کی جماعتیں [طلباء و] طالبات کے لیے باضابطہ شام میں ۵ تا ۹ بجے رات تک چلائی جاتی [ہیں] ۱۷ اساتذہ جو اپنے مضمونوں کے ماہر ہیں، پڑھاتے ہیں۔ طلباء سے ف[یس] لی جاتی ہے اور اساتذہ کو معاوضہ بھی دیا جاتا ہے۔ چند ہی برسوں میں طلباء کی تعلیم کا معیار مستقر کے اسکولوں میں بہتر ہو گیا۔ گزشتہ سا[ل] طلباء میں ۱۳ درجہ اول اور کوئی ۱۵ درجہ دوم اور طالبات میں [درجہ] اوّل اور نصف کے قریب درجہ دوم رہے۔ اردو ماڈل اسکول کے

جماعت کا نتیجہ ڈسٹرکٹ میں اوّل رہا اور صد فی صد رہا۔ —— اس اسکول کی تعلیم مثالی ہے اور نقل کرنے کا کوئی خیال بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن اس سوسائٹی نے خاموش کام کو ترجیح دی ہے۔ اس کی مثال دینا ضروری تھا تاکہ دوسرے کام کرنے والوں کی مناسب رہنمائی ہو۔ اسی طرح کا کام محترمہ عائشہ بیگم صاحبہ کی نگرانی میں چند سال قبل "محفل علم و فن" کی جانب سے شروع کیا گیا ہے لیکن اس کام کو بہت تیزی سے مختلف سینٹرس پر ایک ساتھ پھیلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ میٹرک کے طلباء کے لیے چار چھ مہینوں کی کوچنگ سے اس پتھر میں جونک لگنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ یہ کوشش قابلِ داد ہے اور قدم صحیح سمت پر ہے لیکن نتائج صرف اسی وقت بہتر ہو سکتے ہیں جب کہ سینٹرس کی تعداد محدود کر کے کام میں باضابطگی پیدا کی جائے۔ مسابقتی امتحانات میں اکثر نوجوان باوجود تعلیمی شاندار ریکارڈ رکھنے کے وہ اپنی کمزوریوں سے واقف رہتے ہیں، اس لیے شریک ہونے سے ہی گریز کرتے ہیں۔ ان میں دوسری کمزوری یہ ہوتی ہے کہ وہ زبانی انٹرویو سے بہت گھبراتے ہیں۔ انہیں اس کی ٹریننگ نہ تو اسکول یا کالج میں دی جاتی ہے اور نہ اس طرف عام طور پر توجہ دی جاتی ہے۔
کالج اور اسکول کی تعلیم ہر بات کی گہرائی اور گیرائی کا احاطہ کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اطراف و اکناف جو کچھ دیکھتے ہیں، ان کے متعلق بھی معلومات بہت مایوس کن ہوتی ہیں۔ اعلیٰ امتحانات میں انٹرویوز میں امیدواروں کو اتنا کھنگالا جاتا ہے کہ کوئی جوہر آبدار ہو تو تہہ سے اوپر آجاتا ہے اور کہیں کنکر پتھر رہ گئے ہیں تو وہ سب سے پہلے اچھل کود کر سامنے آجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اچھے طالب علم بھی جن سے توقعات تھیں، مایوس کر دیتے ہیں۔ یہاں پر یہ بات قابلِ غور ہے کہ کوچنگ کے لیے چاہے مضامین میں کمزوریاں دور کرنا ہو یا انہیں اعلیٰ مسابقتی امتحانات کے لیے تیار کرنا ہو، اس کی پلاننگ انٹرمیڈیٹ یا گریجویشن کے بعد نہیں بلکہ آٹھویں جماعت ہی سے شروع ہونا ہے۔ یہ کام ضرور مشکل ہے لیکن جب تک اس کی بنیادی اہمیت کو نہ سمجھا جائے کوئی زیادہ مفید نتائج کی امید نہیں رکھی جا سکتی۔ جب تک پودوں کی نشوونما کے وقت جڑوں کی کھاد اور آبیاری کا انتظام نہیں ہوتا، وہ محض موسم کے رحم و کرم پر اُگ آنے والے درختوں کی چند ہری بھری شاخوں اور پھول پتیوں پر توجہ دینے سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے مندرجہ ذیل چند باتیں درج ہیں جو عملی کام کرنے والوں کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتی ہیں:

۱۔ ہر بڑے شہر اور ضلع کے مستقر پر دو چار چھ محلوں کو ملا کر کسی مرکزی مقام پر ایک کوچنگ سینٹر قائم کیا جائے اور ہر تعلقہ کے مستقر پر کم از کم ایک ایسا کوچنگ سینٹر تو ضرور ہو۔

۲۔ اس اسکیم کے لیے سرمایہ اور کام کرنے والوں کی ایک فوج درکار ہوگی۔ سرمایے کے لیے مسلم وقف بورڈ فلاحی ادارے اور ایجوکیشن سوسائٹیز اس طرف توجہ دیں۔ البتہ کام کرنے والوں کا ملنا مشکل ہے۔ ایسی ہر اسکیموں پر ہم نظری حیثیت سے تو بہت کچھ کہہ سکتے ہیں، لیکن اصل کام آکر کرنے والوں کے پاس رک جاتا ہے۔ خود کرنے والوں میں ضروری قابلیت، صلاحیت، دیانت داری اور اخلاص کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے سب وظیفہ یاب حضرات چاہے ان کا تعلق کسی محکمے سے رہا ہو، ان میں بہت سے قابل ترین لوگ پائے جاتے ہیں۔ انہیں وقت بھی ہے، فرصت بھی ہے اور فراغت بھی ہے۔ اگر وہ بچوں کی تعلیم کے کام کو اپنے ہی مقام پر اپنے ہاتھ میں لیں تو یہ ملت پر بڑا احسان ہوگا۔ دیکھنے میں یہ کام بظاہر چھوٹا معلوم ہوتا ہے، لیکن یقینی مانیے بنیادی طور پر اس سے زیادہ عظیم الشان کام اس وقت کچھ اور نہیں ہے۔ اب ہم میں کوئی بہت جلد سرسید کے پیدا ہونے کی توقع بھی بہت کم ہے۔ لیکن اس عظیم دانشور "سید" کے کام سے اپنا نام وابستہ کیا جا سکتا ہے۔

> "کوئی قوم جس کو اپنے بچوں اور قوم کی تعلیم کی خواہش ہو جب تک وہ تعلیم اپنے ہاتھ میں نہ لیوے، اس کا پورا ہونا غیر ممکن ہے۔"
>
> سرسید

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ ج ۷ ش ۲ (فروری ۱۹۸۸ء)

مادّے پر غور و خوض کی تاریخ

احمد حسین کمال

۱۔ مادے پر غور و خوض اور اس کے ذکر کا واضح سراغ اس قدیم نظریے کی صورت میں ملتا ہے، جس میں قدرتی عناصر، پانی، ہوا، آگ اور مٹی کو مادّے کی بنیادی اور ٹھوس صورت قرار دیا گیا تھا۔

۲۔ قدیم ہندوستان کے "چرواک فلسفیوں" نے کہا تھا کہ دنیا میں موجود ہر شے ان چار عناصر پر مشتمل ہے۔

۳ ہندوستان کے قدیم "چرواک فلسفیوں کا دور دوسری صدی قبل مسیح تک رہا ہے۔

۴۔ چرواک فلسفی خدا کے قائل نہیں تھے

۵۔ ان کا کہنا تھا کہ دنیا اپنی فطرت اور اپنے اندرونی اسباب کے نتیجے میں نشو و نما پاتی ہے۔

۶۔ قدیم ہندوستان کے دوسرے مکاتیب فلسفہ سنکھ، نیائے، ویسے شک وغیرہ بھی مادّیت کے رجحانات رکھتے تھے۔

۷ یونانی فلسفی دمقراط (۴۶۰ — ۳۷۰ ق م) نے یہ خیال پیش کیا تھا کہ دنیا "ایٹموں" پر مشتمل ہے۔

۸ — دمقراط کا خیال تھا کہ :-

ایٹم نظر نہ آنے والے ذرّات ہیں۔

ایٹم اپنی شکلوں اور جسامت کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔

ایٹم ایک دوسرے سے مل کر اشیاء کے تمام تر تنوع کی تخلیق کرتے ہیں۔

خود ایٹم ناقابلِ تبدیل ہیں۔

ایٹم ناقابل تقسیم ہیں۔

ایٹم میں کوئی چیز داخل نہیں ہوسکتی۔

۹۔ یونانی فلسفی "ہرقلیطس" (۵۴۰ - ۴۸۰ ق م) نے آگ ک

منبع قرار دیا۔ اس نے کہا :

دنیا کو کسی نے تخلیق نہیں کیا

یہ آگ ہے، آگ تھی اور آگ رہے گی جو ہمیشہ

رہنے والی، باقاعدگی کے ساتھ جلنے اور بجھنے

یہی دائمی اصول ہے۔

یہی فعال ہے۔

ہر چیز بہتی ہے۔

ہر چیز بدلتی ہے۔

ہر چیز جد و جہد کے ذریعے اور ضرورت کے

آگے بڑھتی ہے۔

سرد گرم سے بدل جاتا ہے، گرم سرد ہو جا

خشک اور خشک تر ہو جاتا ہے۔



(ارسطو)

۱۰۔ اس طرح اشیا میں تضاد کے پہلوؤں
اور اشیاء کے اندرونی منبع کی حیثیت
کی جد و جہد کو ان فلسفیوں نے نمایاں ک

۱۱۔ ارسطو (۳۸۴ — ۳۲۲ ق م) نے کہ
— قدرت کی تمام اشیاء مسلسل حرکت
حرکتیں تین ہیں۔ ظہور کی حرکت، تبدیلی کی حرکت

جناب احمد حسین کمال - ماہنامہ طالب علم - کراچی۔

کی حرکت۔

علوم تین قسم کے ہیں۔ نظریاتی، علمی، تخلیقی۔

۱۲۔ قدیم فلسفیوں نے دنیا کی مادی نوعیت اور قدرت میں حرکت وغیرہ کے سوالات اٹھا کر فکر کو زبردست حرکت آفرینی بخشی۔

۱۳۔ سولہویں صدی (۱۶۲۶ء۔ ۱۵۶۱ ق م) انگریز فلسفی بیکن نے کہا:

فلسفہ اور سائنس کا فرض ہے کہ قدرت کو سمجھا جائے۔ اس کی قوتوں کو مسخر کرنے کے لیے انسان کی مدد کی جائے، بیکن نے کہا۔

۔ مادہ کا کیفیتی یا باطنی تنوع لامحدود ہے۔

۱۴۔ تھامس ہابس (۱۶۷۹ء) نے مابعد الطبیعیات مادیت کا ایک پورا نظام ترتیب دیا۔

زندہ عضویوں سمیت قدرت میں موجود تمام اجسام کو اس نے مشینوں سے تشبیہ دی۔ اس نے مذہب کو اپنے نظام سے باہر رکھا اور کہا کہ مذہب کا تعلق عقیدے سے ہے۔ یہ سائنس کا موضوع نہیں ہے۔

۱۵۔ جون لاک (۱۷۰۴ء۔ ۱۶۳۲ء) نے کہا کہ، انسان کا سارا علم حسی معلومات یعنی حسوں سے جنم لیتا ہے۔

۱۶۔ فرانس کے فلسفی ڈیکارٹ (۱۶۵۰ - ۱۵۹۶) نے عقل کو علم کا واحد سرچشمہ قرار دیا۔

۱۷۔ ہالینڈ کے فلسفی اسپائی نوزا (۱۶۷۷ - ۱۶۳۲) نے یہ دعویٰ کیا کہ:

ایک واحد جوہر، یعنی قدرتِ دنیا کی تمام اشیاء کی بنیادی تشکیل کرتی ہے۔

یہ جوہر زمان میں دائمی اور مکان میں لامحدود ہے۔"
قدرت خود اپنے قوانین کے مطابق نشوونما پاتی ہے۔
"قدرت خود اپنی علت ہے"
اسے کسی مافوق الفطرت قوت کی ضرورت نہیں ہے۔

۱۸۔ اٹھارویں صدی کے فرانسیسی فلسفیوں نے مادے کے بارے میں مزید نظریات پیش کیے۔ بالخصوص، مادہ اور حرکت کی وحدت کا اصول۔

۱۹۔ فلسفی ہولباخ (۱۷۸۹ء۔ ۱۷۲۳ء) نے کہا

"کائنات" یہ ہر موجود چیز کا زبردست امتزاج ہر جگہ ہمارے سامنے صرف مادے اور حرکت کو ہی پیش کرتی ہے۔"

۲۰۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں جرمن فلسفیوں نے مادے کے بارے میں نئے نظریات پیش کیے۔

۲۱۔ کانٹ (۱۸۰۴ - ۱۷۲۴) نے کہا

ہم سے باہر چیزوں کا وجود ہے جو ہمارے اعضائے حسی پر عمل کرکے حس پیدا کرتی ہیں۔ زمین اور نظام شمسی کے دیگر سیارے نیبولا سے قدرتی انداز میں نکلے تھے۔

۲۲۔ فلسفی ہیگل (۱۸۳۱ء۔ ۱۷۷۰ء) نے کہا کہ:

دنیا ایک قسم کی معروضی شعور کی تخلیق کاری کا نتیجہ ہے۔

یہ معروضی شعور انسان کے باہر وجود رکھتا ہے، "یہ خیال مطلق" اور "روح کلی" ہے۔

"خیال پہلے خود اپنے اندر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اشیاء اور مظاہر کی تمام کثرت کو جنم دیتا ہے۔ خیال بعد کے مرحلے پر انسانی سماج کو وجود بخشتا ہے جس کی تاریخ خیال مطلق سے آگاہی حاصل کرنے کا ایک سلسلۂ عمل ہے۔ نشوونما ایک بند دائرے میں عمل میں نہیں آتا۔ یہ ترقی پسندانہ انداز میں ہوتا ہے۔ ادنیٰ شکلوں سے اعلیٰ شکلوں کی جانب ہوتا ہے سلسلۂ عمل کے دوران کمیتی تبدیلیاں، کیفیتی تبدیلیوں میں ڈھل جاتی ہیں۔ اندرونی تضادات نشوونما کا منبع ہیں۔

۲۳۔ فیورباخ (۱۸۷۲ء۔ ۱۸۰۴ء) نے کہا کہ:

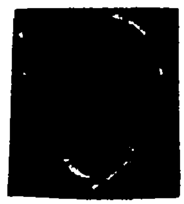
فلسفہ کو فکر خالص تک محدود نہیں رکھنا چاہیے۔ فلسفہ کا مشن ہے قدرت اور انسان کا مطالعہ۔ قدرت انسان کے باہر وجود رکھتی ہے۔

قدرت اولین بنیادی معروضی صداقت ہے۔ انسان قدرت کا حصہ ہے۔

• انسان قدرت کی طویل نشوونما کی پیداوار ہے۔

شعور کو قدرت پر تقویم حاصل نہیں۔
شعور مادے کی محض عکاسی کرتا ہے۔
مادے کو یعنی قدرت کو جانا جا سکتا ہے۔"
انسان کے تمام ادراک حسی اس کا ادراک کرتے ہیں۔

۲۴۔ انیسویں صدی کے آغاز تک، قدرتی سائنس نے خود کو صرف حقایق جمع کرنے اور الگ الگ اشیاء کا مطالعہ کرنے تک محدود نہیں رکھا۔ بلکہ اب وہ حقایق کی تشریح کرنے اور ان کے درمیان ربط اور تعلق قایم کرنے کی کوشش کرنے لگی تھی اور اس طرح اس نے نظریاتی سائنس کی حیثیت اختیار کرلی۔


ڈیکارٹ

۲۵۔ قدرت کے مابعد الطبیعیات نظریات پر پہلا حملہ کانٹ نے یہ کہہ کر کیا کہ
زمین اور نظامِ شمسی ازلی نہیں ہیں، مادے کے طویل نشوونما کا نتیجہ ہیں۔

۲۶ اس کے بعد علم ارضیات ظہور پذیر ہوا۔

۲۷۔ بعد میں طبیعیات، کیمیا، حیاتیات اور دوسری سائنسوں میں تیز رفتاری کے ساتھ ترقی ہوتی۔

۲۸۔ اس دوران قدرتی سائنس نے تین اہم دریافتیں کیں، ایک حرارت (توانائی) کی تبدیلی کا قانون، مادہ اور حرکت کیفیتی لحاظ سے متنوع ہیں، تبدیل پذیر ہیں، ایک شکل سے دوسری شکل میں ڈھل جانے کے اہل ہیں۔

۲۹۔ دوم: زندہ بافت کے خلیہ دار ڈھانچے کی دریافت جس سے ثابت ہوا کہ ایک مادی عنصر، خلیہ کی بھی کم یا زیادہ پیچیدہ عضوے کی بنیاد ہے اور خلیے میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ بدل سکتا ہے۔

سوم: ارتقاء کا نظریہ کہ پیچیدہ اور اعلیٰ تر عضویوں نے سا اور ادنیٰ تر عضویوں سے انتخاب کے قوانین کے تحت نشوونما پائی۔


کانٹ

۳۰۔ انیسویں صدی تک کے فلسفیانہ افکار اور سائنسی نظریات اور انکشافات نے جدلی مادیت کے وہ تصورات پیدا کیے جنھیں ما اور اینگلز نے بنیاد بنا کر تاریخی مادیت کا نظام فکر پیش کیا۔

۳۱۔ مادیت اور جدلیت کے نظریات مارکس سے پہلے موجود تھے۔

۳۲۔ پرانے فلسفے میں ان دونوں کو الگ الگ رکھا گیا تھا۔


ہیگل

۳۳۔ ہیگل جدلیات پسند تھا، لیکن مادیت پسند نہیں تھا۔

۳۴۔ فیورباخ مادیت پسند تھا لیکن جدلیات کو نہیں مانتا تھا۔


اسپائی نوزا

۳۵ مارکس اور اینگلز نے جدلیات اور مادیات کے درمیان کا

کو تبدیل کیا اور ایک جدلیاتی مادی عالمی نقطۂ نظر میں ان کو متحد کر دیا۔

۳۔ سماجی نشو و نما کو مارکس سے پہلے کے فلسفی آئیڈیلزم کے انداز میں دیکھتے تھے۔



جان لاک

۳۔ وہ انسانوں کے خیالات کو اور ان کے شعور کو اس نشو و نما کی قوتِ متحرکہ کہتے تھے۔

۴ مارکس اینگلز نے پہلی مرتبہ وجود کے ساتھ خیال کے تعلق کا سوال اٹھایا۔

۳۔ اور فلسفے کے اس بنیادی سوال کا سماج کے ناتے سے حل پیش کیا۔

۴۔ انہوں نے ثابت کیا کہ:

مادی اقدار کی پیداوار، سماجی شعور کا تعین کرتی ہے۔ سماج کا نشو و نما مادی اسباب پر ہوتا ہے۔ لوگوں کے خیالات، خواہشات اور ارادوں پر نہیں۔ سماج کی تاریخ امظاہر کا گڈمڈ مجموعہ نہیں ہے، بلکہ قوانین کا پابند سلسلۂ عمل ہے۔

۱۔ اس میں بعض ادنیٰ تر طرز ہائے پیداوار کی جگہ اعلیٰ تر طرز ہائے پیداوار لے لیتے ہیں۔

۱۔ سماج میں تبدیلی اتفاقی نہیں بلکہ معروضی قوانین کے مطابق ہوتی ہے۔

۱۔ معروضی قوانین انسان کی خواہش اور شعور کے پابند نہیں ہوتے اور یہی مارکسزم ہے۔

۱۔ زمان و مکان کا جدید نظریہ، جسے "نظریہ اضافیت" کے عنوان سے البرٹ آئن اسٹائن (۱۹۵۵ — ۱۸۷۹ء) نے ثابت کیا تھا کہ یہ ہے کہ :-

اجسام کے زمانی اور مکانی خواص کا انحصار، ان کی حرکت کی رفتار پر ہے۔ کم رفتار پر اس انحصار کو تلاش کرنا ناممکن ہے۔ مکان و زمان کے خواص اسی رفتار پر بدلتے ہیں جو عملی طور پر صرف ضیا کی رفتار کے قریب قریب ہوتی ہے۔

ان رفتاروں پر جو ضیا کی رفتاروں کے قریب ہوتی ہیں، ایک حرکت کرتے ہوئے جسم کی لمبائی، ایک ایسے جسم کے مقابلے میں جو حالتِ سکون میں ہو، رفتار کے بڑھنے کے ساتھ گھٹتی جاتی ہے۔

وقت (زمان) غیر تغیر پذیر نہیں رہتا۔

رفتار کے اضافے کے ساتھ وقت کی رفتار آہستہ ہو جاتی ہے۔

میسن (MESON) ذرہ جو ایٹم کے انشقاق کے وقت نمودار ہوتا ہے، اس کی زندگی بہت مختصر ہوتی ہے، لیکن اگر اس کی رفتار کو بڑھا دیا جائے تو اس کے عرصۂ حیات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

مکان و زمان خود نہیں بدلتے بلکہ وہ غیر منفک ربط باہمی کے ساتھ بدلتے ہیں۔

یہ ربط اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ وہ ایک ناقابلِ شکست کل بن جاتے ہیں۔

وقت (زمان) گویا مکان کے تین ابعاد کے علاوہ چوتھے "بعد" کا رول اختیار کر لیتا ہے۔ مکان و زمان کے خواص مادے کی کمیت کی موجودگی پر بھی منحصر ہوتے ہیں۔

ایسے اجسام جو زیادہ کمیت اور زیادہ قوتِ کشش کے حامل ہوتے ہیں، اپنے قریب کے مکان (space) میں ایک تبدیلی یا طبیعیات کی اصطلاح میں خمیدگی پیدا کرتے ہیں۔

وقت یا زمان (TIME) بھی اسی مناسبت سے بدل جاتا ہے۔

نظریہ اضافیت مکان و زمان کے نامیاتی ربط کو قطعی ریاضیاتی صورت میں بھی پیش کرتا ہے

دماغ اور شعور

قدرت ہمیشہ سے وجود میں ہے۔

۲۔ انسان مادی دنیا کے نسبتاً بعد کے نشوونما کا نتیجہ ہے۔

۳۔ مادے کے طویل نشوونما سے انسان سوچنے کی صلاحیت رکھنے والے حیوان کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔

۴۔ شعور انسانی دماغ جیسے اعلیٰ تنظیم یافتہ مادّے کا خاصّہ ہے۔

۵۔ شعور قدرت کی پیداوار ہے۔

۶۔ تمام تر دماغی فعل خاص مادی سلسلہ ہائے عمل پر مبنی ہے۔

۷۔ بیماری، چوٹ یا کسی اور سبب سے دماغ کو پہنچنے والے صدمے سے انسان کی صورت میں گہری پراگندگی اور دماغی بے قاعدگی پیدا ہو جاتی ہے۔

۸۔ دماغ گرد و پیش کی دنیا سے آزاد رہ کر نہیں سوچ سکتا۔

۹۔ انسانی دماغ تنہا شعور کا کام پوری طرح انجام نہیں دے سکتا۔

۱۰۔ دماغ میں بصارت، سماعت، بو اور ذائقہ وغیرہ کی حس معروضی طور پر موجود ان اشیاء کے اثر و نفوذ کے تحت ہی پیدا ہوتی ہے۔ جو آواز، رنگوں، بوؤں اور دیگر خواص کی حامل ہوتی ہیں جو اُن میں خلقی طور پر موجود رہتے ہیں۔

۱۱۔ یہ اشیاء اور ان کے خواص انسان کے حسی اعضاء پر عمل کرتے ہیں۔

۱۲۔ اس عمل کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مہیجات اعصاب کے ذریعے دماغی نصف کروں کے قشر (دماغ کی بیرونی تہہ) تک پہنچتے ہیں۔ جہاں متعلقہ حس پیدا ہوتی ہے۔

۱۳۔ حسوں کی بنیاد پر ادراک، خیالات، تصورات، نیز خیال کی دیگر شکلیں تشکیل پاتی ہیں۔

۱۴ یہ شکلیں صرف شبیہوں (IMAGES) کو یعنی معروضی طور پر موجود اشیاء، اور مظاہر کے کم و بیش بالکل صحیح عکسوں کو پیش کرتی ہیں۔

۱۵۔ چنانچہ ان اشیاء اور مظاہر کے باہر یہ شبیہیں، انسان کے شعور میں پیدا نہیں ہو سکتیں۔

۱۶۔ مادی دنیا کا انعکاس کرنے کی صلاحیت شعور کی ایک ممتاز خصوصیت ہے جو دماغ کا ایک خاصّہ ہے

۱۷۔ انسان کے دماغ میں جو شبیہیں پیدا ہوتی ہیں، وہ صرف ان اشیاء اور مظاہر کی ہی شبیہیں نہیں ہوتیں جن کا فی الحقیقت وجود ہے۔

۱۸۔ دماغ میں ایسی چیزوں کی شبیہیں بھی پیدا ہو سکتی ہیں جو ابھی تک وجود نہیں رکھتیں۔

۱۹۔ لیکن وہ شبیہیں بھی ایسی چیز کے عکس کی بنیاد پر اُبھرتی ہیں جو پہلے سے موجود رہے۔

۲۰۔ دراصل وہ اپنے گرد و پیش کی دنیا کے بارے میں انسان کے علم پر مبنی ہوتی ہیں۔

۲۱۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کا شعور دماغ کا ایک منفرد خاصہ ہے۔

۲۲۔ تاہم شعور اور مادہ ایک نہیں ہیں۔

۲۳۔ اگرچہ شعور کا تعلق خاص مادیاتی عضویاتی سلسلہ ہائے عمل سے ہے، لیکن اسے مادہ ہی قرار دینا غلط ہے۔

۲۴ لینن نے یہ بھی کہا ہے کہ خیال کو مادی سمجھنا ایک غلط عمل ہے، جو مادیت اور عینیت کے الجھاؤ کی جانب لے جائے گا۔



ہربرٹ سپنسر

۲۵۔ خیال ایک شئے نہیں ہے۔ خیال کو دیکھا نہیں جا سکتا۔ خیال کی تصویریں نہیں اتاری جا سکتیں۔

۲۶۔ خیال دنیا کی اشیاء اور مظاہر کی شبیہ ہے۔

۲۷۔ مادی شبیہ نہیں، بلکہ مثالی یا عینی (آئیڈیل) ہے۔

۲۸۔ خیال حقیقت کی تصویر نہیں ہوتا اور نہ اس کی بے جان نقل ہوتا ہے۔

۲۹۔ بلکہ یہ انسانی دماغ میں مناسب طور پر منتقل شدہ حقیقت ہے

۳۰۔ خیال کے کسی خصوصی قوانین، تجزیہ، تحلیل اور تعلیم ہیں۔

۳۱۔ سوچنے کی صلاحیت یہ ہے کہ حقیقت کی سرگرمی کے ساتھ عکاسی

کرنے، اس پر اثر انداز ہونے، اپنے سامنے بعض مقاصد متعین کرنے اور ان کے حصول کے لیے کام کرنے کی صلاحیت۔

۴ - یہی صلاحیت انسان کو جانوروں سے ممتاز کرتی ہے۔

۴۱ - حس تمام تر مادہ کی نامیاتی شکلوں میں خلقی طور پر موجود ہے۔

۴ - مادہ میں صرف انعکاس کا خاصہ پایا جاتا ہے (یعنی بیرونی اثر و نفوذ پر) ایک خاص انداز میں جوابی عمل اور ردعمل کرنے کی صلاحیت۔

۴ - شعور ان دونوں سے بلند تر چیز ہے۔ اس لیے یہ سارے مادے کا خاصہ نہیں ہے اور اسی لیے یہ غیر مادی ہے۔

۴ - علم کی ایک شاخ، مشینی دماغ کا علم، جس نے بے جان اشیاء میں سوچنے کا نظام پیدا کیا ہے۔

۴ - بعض مشینیں، ریل اور طیاروں وغیرہ کی رہنمائی کرسکتی ہیں بعض ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرسکتی ہیں۔ بعض ریاضیاتی مشکل سوالات حل کرسکتی ہیں۔ بعض باہر سے اطلاع موصول کرسکتی ہیں۔ اسے یاد کرسکتی ہیں۔ اس کی چھان بین کرسکتی ہیں اور بہترین حل و جواب پیش کرسکتی ہیں۔

- لیکن یہ مشینیں کتنا ہی کمال حاصل کرلیں، حسی ادراک کی حامل نہیں ہوسکتی ہیں۔ سوچنے کی صلاحیت حاصل نہیں کرسکتیں۔

- انسان اپنے گرد و پیش کی صداقت سے آگاہی حاصل کرسکتا ہے اس پر اثر ڈالتا ہے اور اسے بدلتا ہے۔ مشین ایسا نہیں کرسکتی۔

- انسان کبھی ختم نہ ہونے والی صلاحیت کا مالک ہے۔ وہ ثقافتی دولت کا خالق ہے۔ مشین ایسا کوئی کام نہیں کرسکتی۔

- مشین چاہے کیسا ہی پیچیدہ اور شاندار کام کیوں نہ انجام دے، بہرحال وہ انسان کے ذہن اور ہنرمند ہاتھوں کی تخلیق ہے۔ اس کے ذریعے انسان کی جسمانی محنت تو ہلکی ہوجاتی ہے لیکن وہ انسان کی جگہ نہیں لے سکتی۔

- مشین انسانی خیالات کی حامل نہیں ہوسکتی وہ صرف ایک آلہ اور وسیلہ ہے۔

- چنانچہ شعور اور مادے کو ہرگز ایک چیز قرار نہیں دیا جاسکتا۔

- لیکن شعور دماغ سے آزاد وجود نہیں رکھتا۔

وہ دماغ کا ایک وظیفہ اور بیرونی دنیا کا ایک انعکاس ہے۔

۴۵ - مادے میں انعکاس کا ذاتی معمول خاصہ موجود ہوتا ہے۔

۴۶ - مادے میں بیرونی اثر و نفوذ کے مطابق ردّ عمل کی صلاحیت ہوتی ہے۔

۴۷ مادہ بیرونی اثر و نفوذ کے تحت اپنی اندرونی تعمیر نو کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔



برکلے

۴۸ - انعکاس (Reflection) ہمیشہ دو یا زیادہ اجسام یعنی فعلی اور انفعالی اجسام کے تفاعل (interaction) سے وابستہ ہوتا ہے۔

۴۹ - انعکاس کے کردار کا انحصار بیرونی اثر و نفوذ پر اور اس اثر و نفوذ پر تعامل (ردعمل) کرنے والے جسم کی اندرونی حالت پر، دونوں پر ہوتا ہے۔

۵۰ بے جان جسم، زندہ عضویے اور انسان پر دنیا کا انعکاس مختلف طور پر ہوتا ہے۔



شوپنہار

۵۱ - ایک بے جان شے میں، مادہ انفعالی انعکاس خلقی طور پر موجود ہوتا ہے۔ بے جان جسم ماحول کے عوامل میں امتیاز نہیں کرتا۔ نہ تو وہ سازگار عوامل کا انتخاب کرتا ہے اور نہ اس کا اصل ہوتا ہے۔ نہ وہ ناسازگار عوامل سے اپنے آپ کو محفوظ

رکھنے کا اہل ہوتا ہے۔

۵۲۔ زندہ عضویہ (Organism) بیرونی اثر و نفوذ پر مختلف انداز میں تعامل (ردعمل) کرتا ہے۔ یہ اپنے آپ کو ماحول کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ غیر ضروری نقصان دہ عوامل سے بچنے کے لیے، سازگار عوامل کو استعمال کرتا ہے اور اسی لیے وہ زندہ رہتا ہے اور نشو و نما پاتا ہے۔



جان سٹوارٹ مل

۵۳۔ انسان میں کیفیتی لحاظ سے انعکاس کی ایک نئی شکل پائی جاتی ہے۔ یہ صداقت (REALITY) کو شعوری طور پر انعکاس کرنے کی صلاحیت ہے۔ انسان اپنے آپ کو نہ صرف ماحول کے مطابق ڈھالتا ہے، بلکہ وہ ماحول پر عمل کرتا ہے اور اپنے حاصل شدہ علم و تجربے کی بنیاد پر اسے بدل دیتا ہے۔



جیری بینتھم

۵۴۔ شعور انفعالی نہیں رہتا۔ بلکہ دنیا پر سرگرمی کے ساتھ اثر ڈالتا ہے۔

انسان کے اچھے خیال، اچھی باتیں، اچھے کام عزت کو ایسا کھینچ لیتے ہیں جیسا کہ مقناطیس لوہے کو یا کہربا گھاس کو۔ وہ کسی سے اپنی بزرگی کا طالب نہیں ہوتا، مگر لوگ خود بخود اس کی عزت کرتے ہیں، وہ کسی سے اپنی تعریف نہیں چاہتا مگر سب اس کی صفت خود کہتے ہیں۔ کیوں کہ انسان کی اچھی حالتوں کا یہ قدرتی خاصہ اور ذاتی تاثیر ہے، جسے کوئی تبدیل نہیں کر سکتا"

محسن الملک

مگرمچھ

محمد یعقوب

صاف بات ہے کہ پانی میں رہ کر مگرمچھ سے بیر کرنا گویا اپنی موت کو خود دعوت دینا ہے۔ لیکن سیانوں نے کہا ہے کہ خشکی پہ رہیے یا پانی میں مگرمچھ کے مکر سے بچ کے رہیے۔ دلدل میں ہو تو یوں پڑا رہتا ہے، گویا اسی کا ایک حصّہ ہو اور پانی میں ہو تو سوائے چھوٹی چھوٹی لہروں کے اور کچھ نظر نہیں آتا خدا جانے اس کا وجود کہاں ختم ہوتا ہے اور لہریں شروع کہاں ہوتی ہیں۔

مگرمچھ افریقہ، آسٹریلیا، ویسٹ انڈیز، ہندوستان اور پاکستان کے سوا دنیا کے اور کسی حصے میں نہیں ملتا پانی میں رہنے والے جانوروں میں سے دریائی گھوڑے (ہپو) کو چھوڑ کر مگرمچھ سب سے زیادہ مکروہ، بدہیئت اور بدوضع جانور ہے۔ نہ اس کی جلد میں کوئی جاذبیت ہے نہ اس کے جسمانی تناسب میں کوئی ترتیب۔ سر مثلث نما، دھڑ مستطیل، نہ بیلن اور دُم مخروطی نہ چپٹی۔ اس کی بدصورتی کی سب سے بڑی وجہ اس کے بھونڈے اور بے ترتیب دانت ہیں جو ہونٹ نہ ہونے کی وجہ سے ہر وقت نظر آیا کرتے ہیں۔ جب کبھی ان دانتوں میں سے کوئی دانت ٹوٹ کر گر جاتا ہے قدرت چند ہی دنوں کے اندر اندر اس کی جگہ ایک اور دانت پیدا کر دیتی ہے اور یہ نیا دانت پہلے سے کہیں زیادہ تیز، نوکیلا اور مضبوط ہوتا ہے۔



ایک شکاری کا کہنا ہے کہ ایک مرتبہ اس نے مگرمچھ کا ایک بچہ سدھانے کی ناکام کوشش کی۔ ابھی یہ بچہ مشکل سے ایک فٹ کا بھی نہ ہوا ہوگا کہ اپنے پنجرے پر منہ چلانے لگا اور اس کے دانتوں سے لوہے کی سلاخوں پر گہری خراشیں پڑ گئیں۔ جب ایک مگرمچھ اپنے دانتوں کا جبڑا بند کرتا ہے تو یوں آواز آتی ہے جیسے کسی نے چوبی پھاٹک کھٹاک سے بند کیا ہو۔

قدرت نے رینگنے والے جانوروں کا دل کچھ اس انداز کا بنایا ہے کہ جسم کا سارا خون صاف نہیں کر سکتا، بلکہ تھوڑا تھوڑا لہو پھیپھڑوں میں بھیج کر معطر کرتا رہتا ہے اور باقی کا غلیظ لہو ویسے ہی جسم میں گردش کرتا رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ رینگنے والے جانور کاہل اور سست ہوتے ہیں۔ ان جانوروں میں سرد خون والا مگرمچھ کبھی کبھی بھونڈی بن چھوڑ کر چوکس بھی ہو جاتا ہے اور شکار پر اس ہوشیاری سے حملہ کرتا ہے کہ اسے جان چھڑانی مشکل ہو جاتی ہے۔ شکار مارنے کے بعد مگرمچھ اسے پانی میں لے جاتا ہے اور اپنے ساتھیوں کی نظر بچا کر دلدل میں چھپا دیتا ہے۔ دو تین روز بعد جب شکار کا گوشت گل سڑ جاتا ہے تو مگرمچھ اسے بڑے سلیقے سے نوش جان کرتا ہے اور کنارے پر پہنچ کر دھوپ میں لیٹ کر ماحضر ہضم کرنے میں

جناب ڈاکٹر محمد یعقوب ۔ معرفت سید قاسم محمود ایڈیٹر طالب علم ۔ کراچی۔

مصروف ہو جاتا ہے۔ یہ وقت ایسا ہوتا ہے جب اس کے دل کی رفتار اور بھی سست ہو جاتی ہے اور جسم کا سارا لہو غذا کے پیچھے پڑ جاتا ہے کہ کسی طور ہضم ہو جائے۔ شکاری ایسے موقعے کی تاڑ میں رہتے ہیں اور اس کاہل اور سست الوجود جانور کا تاک کر نشانہ بناتے ہیں۔ جہاں قدرت نے مگرمچھ کو سست روی اور کاہلی عطا کی ہے، وہاں اس کے لیے جان بچانے کو مستقل ایک چوکیدار بھی مقرر کر دیا ہے جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے کبوتر کی جسامت کا ایک سفید پرندہ زک زیک ہمیشہ مگرمچھ کے سر پر اُچھلتا پھدکتا رہتا ہے۔ مگرمچھ اس پرندے کی دست درازیوں بلکہ پادرازیوں سے پریشان نہیں ہوتا۔ اس پرندے کی خوبی یا خرابی یہ ہے کہ جوں ہی کسی کو مگرمچھ کی طرف بڑھتے دیکھتا ہے، اونچے اونچے "زک زیک! زک زیک!" کی رٹ لگا دیتا ہے اور اپنے پیروں کو مگرمچھ کے منہ اور آنکھوں پر یوں مارتا ہے کہ وہ بیدار ہو کر پانی میں پھسل جاتا ہے۔ زک زیک اپنے دوست کو بچا کر بڑی شان اور رعونت سے ریت پر پھدکتا ہے اور پھر اسی آواز میں شکاری کی ہنسی اُڑا کر اوپر ہوا میں اُڑ جاتا ہے۔

چھوٹی بڑی مچھلیوں اور دیگر دریائی جانوروں کے علاوہ مگرمچھ گائے، سانڈ اور گھوڑے کا شکار بھی کرتا ہے۔ دریائے برہمپتر کے گرد و نواح میں بسنے والوں کا کہنا ہے کہ مون سون کی رت میں مگرمچھ بڑے شوق سے شکار کرنے لگتا ہے۔ پوتی گھاٹ کے ایک زمین دار نے مون سون کے ایک ہی موسم میں اپنی دو دھیل گائے اور چودہ گھوڑے مگرمچھ کے ہاتھوں کھو ڈالے۔ اس کا بیان ہے کہ مگرمچھ دریا سے نکل کر اس کے چوپائے جھونپڑیوں سے کھینچ کر لے جاتے تھے اور ہم ان کا کچھ نہ بگاڑ سکتے تھے۔ گھوڑے اور زیبرے کا گوشت مگرمچھ کا من بھاتی کھاجا ہے، جوں ہی ان میں سے کوئی گھاٹ پر پانی پینے جھکتا ہے، مگرمچھ پانی ہی پانی میں آگے بڑھ کر اس کی تھوتھنی اپنے تیز نوکیلے دانتوں میں جکڑ لیتا ہے اور پھر آسانی سے اسے پانی میں کھینچ لاتا ہے۔ چھوٹے جانوروں کا شکار وہ اپنے منہ سے نہیں کرتا، بلکہ اپنی دم سے کرتا ہے۔ نشانہ باندھ کر اس زور سے دُم کی ضرب لگاتا ہے کہ شکار وہیں ختم ہو جاتا ہے۔

اس موذی جانور سے بچنے کی بس ایک ہی صورت ہے کہ کسی طرح اس کی دیکھتی ہوئی آنکھوں کو پھوڑ دیا جائے۔ ایک بنگالی ماہی گیر نے کم گہرے پانی میں کھڑے ہو کر مچھلیوں پر جال پھینکا تو اسے ٹخنوں کے قریب کوئی سرسراتی ہوئی سی چیز محسوس ہوئی۔ پیشتر اس کے کہ اسے اس بلا کا پتہ چلتا، اس کی پوری پنڈلی مگرمچھ کے جبڑے میں آ چکی تھی۔ ماہی گیر زندگی اور موت کے درمیان تڑپتا ہوا مگرمچھ کے سر پر گرا اور جلدی سے اپنے دونوں انگوٹھے اس کی آنکھوں میں ٹھونس دیے۔ مگرمچھ نے بیکل ہو کر ماہی گیر کی ٹانگ تو چھوڑ دی لیکن گھوم کر اس زور سے دم ماری کہ ماہی گیر کا کوہا ٹوٹ گیا۔

اس مخلوق کے بارے میں پاکستان اور ہندوستان میں یہ بات بھی مشہور ہے کہ اگر کوئی آدمی مادر زاد برہنہ پانی میں اُتر جائے تو مگرمچھ اس پر حملہ نہیں کرتا، بشرطیکہ وہ آدمی کسی قسم کی حرکت نہ کرے، مگر یہ خیال جنتر منتر کی حد تک درست ہے۔ حقیقت سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں۔ آدمی ننگا ہو یا ڈنر سوٹ میں ملبوس، مگرمچھ اس پر حملہ کرنے سے نہیں چوکتا۔

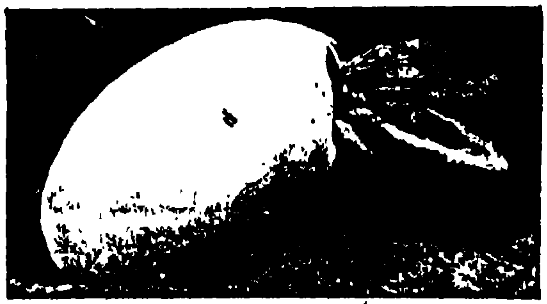
دوسرے جانوروں کے برعکس نر مگرمچھ اپنی مادہ سے کچھ ایسی دلبستگی نہیں رکھتا، ماہرین حیوانیات کا خیال ہے کہ یہ بے توجہی ان کی سستی اور کاہلی کی وجہ سے ہے۔ مگرمچھ نہ اپنی مادہ میں دلچسپی لیتا ہے، نہ بچوں میں۔ ساری دیکھ بھال مادائیں کرتی ہیں۔ جوں ہی انڈوں سے بچے نکلتے ہیں، مادہ مگرمچھ انہیں اپنی حفاظت میں لے کر پانی کی طرف جاتی ہے اور انہیں زندہ رہنے کے گر سکھاتی ہے۔ یہ چھوٹے بچے گدھوں کے لذیذ ترین غذا ہوتے ہیں۔ یہ انڈوں پر نگاہیں جمائے کئی کئی دن درختوں کی چوٹیوں پر گزار دیتے ہیں کہ کب بچے نکلیں اور کب ہم ان کی ضیافت اُڑائیں۔ گو مادہ بڑی چوکسی کے ساتھ اپنی تھوتھنی اُٹھائے گرگوں اور گدھوں کو دور رکھتی ہے، پھر بھی اس کے کئی بچے ضایع ہو جاتے ہیں جو بچے رہتے ہیں، پہلے ان پر نر مگرمچھ حملہ آور ہوتے ہیں اور پھر بڑی بڑی مچھلیاں اور خونخوار قسم کے کچھوے!

افریقہ، آسٹریلیا، بنگال اور آسام کے علاقوں میں کچھ قومیں ایسی آباد ہیں، جو مگرمچھ کا گوشت کھاتی ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ مگرمچھ کا سارا گوشت تو لذیذ نہیں ہوتا، البتہ دُم بے حد مزیدار ہوتی ہے لیکن عادی نہنگ خور کے علاوہ اور کوئی اس جانور کا گوشت نہیں کھا سکتا۔ آہوئے ختن کی طرح مگرمچھ کے جسم میں بھی ایسی غدودیں ہوتی ہیں، جن سے مشک کی سی تیز خوشبو نکلتی ہے یہ خوشبو مشک نافہ سے کئی گنا تیز ہوتی ہے اور اس کے اثر سے سر چکرانے لگتا ہے۔ یہ خوشبو مگرمچھ کے سارے گوشت میں اس شدت سے ملی ہوتی ہے کہ کھانے والے سے برداشت نہیں ہو سکتی۔ عادی نہنگ خور بھی ناک بھینچے

بنا اس کا گوشت نہیں کھا سکتے۔
مگرمچھ کا شکار درندوں سے کہیں مشکل ہے۔ کیوں کہ اس کے جسم کے کسی بھی
گولی کا کوئی جانکاہ اثر نہیں ہوتا۔ زخم ہو جاتا ہے لیکن دل کی رفتار سست
کی وجہ سے بہت کم خون نکلتا ہے اور مگرمچھ مرتا نہیں لہروں کے درمیان تیرتے
ے مگرمچھ پر شکاری اس وقت تک نشانہ نہیں باندھتے جب تک کہ اس کی
ن نہ دیکھ لیں۔ اس کی ابھری ہوئی آنکھوں کے عین پیچھے نرم کھوپڑی تلے پاؤ
پاؤ مغز ہوتا ہے اور یہی جگہ اس کا کمزور ترین حصہ ہوتی ہے۔ شکاری بس
دو مربع انچ جگہ پر شست باندھ کر بندوق داغتے ہیں۔ اگر نشانہ ٹھیک
ائے تو مگرمچھ اپنی جگہ سے بالشت بھر بھی نہیں ہل سکتا۔ مرتا ہے اور
جسم بڑی سرعت سے ڈوبنے
ہے۔ اس کے علاوہ مگرمچھ کا شکار
ے سے بھی کیا جاتا ہے۔ وہ مچھلی پکڑنے
ہارپون میں گوشت کا بڑا سا لوتھڑا
ر پھینکتے ہیں۔ مگرمچھ گوشت کے ساتھ
نگلتا ہے تو کنارے پر شکاری
ہارپون کا رسہ کھینچنا شروع کر دیتے
یہ بڑا صبر آزما شکار ہوتا ہے۔ کبھی
پر کنارے پر اور کبھی شکاری پانی میں۔ دس بارہ گھنٹے کی مسلسل رسہ کشی
بعد شکار کی شکل دیکھنی نصیب ہوتی ہے۔ بعض اوقات اس گوشت میں زہر
کر کانٹا پھینکتے ہیں، لیکن اس سے رسہ کشی کی مدت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔
ردہی دل کی سست روی آڑے آتی ہے اور زہر جسم میں تیزی سے
یت نہیں کر پاتا! کچھ نڈر شکاری ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی جان جوکھوں
ڈال کر پانی میں کود جاتے ہیں اور اندر ہی اندر تیرتے ہوئے مگرمچھ
ین نیچے پہنچ کر دو دھاری کٹار سے اس کا پیٹ چاک کر دیتے ہیں۔
ن شکار کا یہ طریقہ اول تو بہت خطرناک ہے، دوسرے اس سے نفع
کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ مگرمچھ کا پیٹ ہی ایک ایسی چیز ہے جس کی
ر دور تک مانگ ہے اور جو اعلیٰ قیمت پر بکتا ہے۔
مگرمچھ عام طور پر چودہ پندرہ فٹ لمبا ہوتا ہے اور اس کا وزن
ل چوبیس من سے کسی قدر زیادہ ہوتا ہے۔ دنیا میں سب سے لمبے مگرمچھ

دریائے گنگا میں پائے جاتے ہیں جو بیس سے ستائیس فٹ تک طویل ہوتے ہیں۔ اس جانور کے انڈے بڑی بطخوں کے انڈوں سے مشابہ ہوتے ہیں لیکن کسی قدر لمبوترے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ایک مادہ ایک ہی وقت میں سو سے بھی زیادہ انڈے دیتی ہے۔ یہ انڈے سخت، کرکیلے اور بیحد چمکدار ہوتے ہیں اور ان کا چھلکا کھوپڑی کی ہڈی ایسا ہوتا ہے۔ گرم ریت سے حرارت پا کر انڈے خود بخود چٹختے ہیں اور ان سے بچے نکل کر ادھر ادھر پھیل جاتے ہیں۔ مادہ انڈوں کے چٹخنے سے ایک دن پہلے وہاں آن موجود ہوتی ہے اور جونہی سارے بچے نکل آتے ہیں، انہیں گھیر کر پانی میں لے جاتی ہے۔

انسان نے تقریباً ہر جانور کو سدھانے کی کوشش کی ہے، لیکن مگرمچھ پر اس کا زور نہیں چلا۔ میں نے میلان کے ایک سرکس "جیرو تونی" میں مگرمچھوں کا کھیل دیکھا ہے۔ لیکن اسے کھیل نہیں کہا جا سکتا، مگرمچھوں کی نمائش کہنا پڑتا ہے۔ چھ مگرمچھ سرکس کے اکھاڑے میں لائے گئے۔ رنگ ماسٹر برہمنوں کا لباس پہنے قشقہ کھینچے ان کے سامنے آکھڑا ہوا۔ مگرمچھ ادھر ادھر بھاگنے کی کوشش کرتے تھے اور وہ انہیں بزور "سحر" یا مسمریزم کے زور سے روکنے کی کوشش کرتا تھا۔ ہاتھ ہوا میں بلند کر کے وہ رام رام پکارتا۔ کوئی مگرمچھ تھم جاتا۔ کوئی اس کے پہلو سے نکل کر اکھاڑے کا احاطہ عبور کرنے کی کوشش کرتا۔ سرکس کے ملازم انہیں لاٹھیوں سے ہانک کر پھر بیچ میں لے آتے۔


مگرمچھ کا بچہ انڈے سے نکل رہا ہے

بنگال سفر مینا کے ایک کپتان نے ایک مگرمچھ پالا تھا۔ وہ سارا دن بنگلے کے برآمدے میں لیٹا رہتا اور کپتان صاحب کی آواز پر یوں لپکتا جیسے پالتو کتا مالک کی آواز پر۔ اس مگرمچھ کو گھر میں صرف کپتان صاحب کی بلی سے پیار تھا۔ سردیوں کی راتوں میں وہ آتش دان کے سامنے قالین پر دراز ہو جاتا اور بلی کے جسم پر اپنی تھوتھنی ٹکا کر سوتا۔ جب تک بلی نہ آتی، بیچارہ گھڑیال سو نہ سکتا۔ ایک بار کپتان صاحب کو دورے پر جانا پڑا۔ اردلی نے ان کی غیر موجودگی میں نہ تو ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا اور نہ آتشدان ہی میں آگ روشن کی۔ پوری ایک رات اور ایک دن برآمدے میں گزارنے کے بعد مگرمچھ سردی کی تاب نہ لا کر مر گیا۔ کپتان صاحب ابھی تک اس خیال کے حامی ہیں کہ مگرمچھ کو سردی نے نہیں مارا، بلکہ بلی کی مفارقت نے مارا ہے، جو آتشدان روشن نہ ہونے کی وجہ سے باورچی خانے میں گھس کر سو گئی تھی۔

جوابِ دوست

اظہارِ تمنا

نسیم انصاری

شاید آپ کہیں کہ سارے جواب دوست میں کہیں ان کا ذکر نہیں ہے جو ہمیں اپنی جان سے زیادہ پیارے ہیں اور جو ۴۷ء کے بعد ہم سے جدا ہو گئے۔ ہائے ان کا کیا ذکر کروں جو مشرقی پاکستان گئے تھے ان میں سے بہت سے برباد ہو گئے لٹ گئے اور بال بچوں کو لے کر کسی طرح مغربی پاکستان چلے گئے۔ ایک دفعہ ہندوستان کا گھر چھوڑا تھا اور دوسری دفعہ پھر ڈھاکہ اور چٹاگانگ والا گھر بھی چھوٹ گیا۔ لٹ لٹا کر جب کراچی پہنچے تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے زبردستی کسی دوسرے کے گھر میں گھس رہے ہوں۔ دین اور مذہب کی دہائی دی۔ بار بار یہ کہا کہ پاکستان بنانے کی اصل جد و جہد تو ہم ہی نے کی تھی ورنہ صوبہ سرحد والے تو آخر وقت تک خلاف رہے۔ بلوچستان والوں سے تو رائے ہی نہیں لی گئی، سندھ اور پنجاب میں بھی بہت سے لوگ مذبذب تھے۔ البتہ بنگال والوں نے یکسر ہامی بھری تھی لیکن ان کا جو حشر ہوا وہ سب جانتے ہیں۔

ادھر جن لوگوں کے گھروں میں پاکستان بنا تھا وہ کہتے ہیں کہ ہمارے وطن میں جو سیاسی تبدیلیاں ہوئیں ان کا تعلق تو مقامی باشندوں سے ہے، سرحد پار سے آئے ہوئے ہمارے مہمان تو ہو سکتے ہیں لیکن حصہ دار نہیں۔ یہ صاف صاف کہا تو نہیں جاتا لیکن بین السطور میں بات یہی نکلتی ہے۔

اس آپس کی تکرار میں اقبال پر بری بنتی، باہر سے آئے ہوئے لوگ اس اقبال کی یاد دلاتے ہیں جس نے کہا تھا ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ ملت کا کفن ہے

اور خود اقبال کے وطن کے لوگ اس اقبال کی تصویر کھینچتے ہیں جس نے شلوار قمیص پہن کر اور خالص پنجابی لہجہ میں اردو بول کر ان لوگوں کو ادب سے بولنا سکھایا تھا جو گنگا جمنا کے دوآبے میں رہ کر اپنے کو تہذیب کا اکیلا وارث جانتے تھے۔

بہرحال۔ اقبال کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے وہ ایکیلنگسازہ کی روشن تصویر ہے کہ جس نے اسے جس رنگ میں دیکھنا چاہا دیکھ لیا، لیکن اس میں شک نہیں کہ مشرق کے اس شاعر کا اثر ہم لوگوں کی نسل والوں پر زبردست ہے۔ گو بہت سے مقامات ایسے آتے ہیں جہاں اُن لوگوں کی زبان ذرا اٹکتی ہے۔ جو اصحاب رسول میں سے بعض کو زیادہ اور بعض کو کم پسند کرتے ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ مذہب اور سیاست کا جہاں جہاں بھی میل ہوا ہے پیچیدگیاں پیدا ہوئی ہیں۔ بظاہر اقبال کے مذہب اور سیاست کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا، لیکن اگر یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ اقبال کی شاعری میں ان اقوام مشرق کے دل کی پکار ہے جو مغربی شہنشاہیت کے زیر نگیں آ گئے تھے تو بہت سی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں۔ مردِ مومن گویا کہ ان کا نمائندہ ہے جو شہنشاہیت کو للکار رہے تھے۔ بظاہر ہر چیز آزادی کے علم برداروں کے خلاف تھی۔

پروفیسر نسیم انصاری، ڈپارٹمنٹ آف سرجری، جے۔ این میڈیکل کالج ۔ اے۔ ایم۔ یو ۔ علی گڑھ

ایک طرف توپیں تھیں، بندوقیں تھیں، دوسری طرف محض کدالیں۔ ایک طرف جدید ترین سائنس کی مدد سے ملک گیری کے انتظامات تو دوسری طرف کی اکثریت حروف شناس بھی نہیں تھی۔ اگر ایسی حالت میں غلاموں کا لہو گرمانے کے لیے کوئی کہتا تھا

نگاہ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ تقدیرِ الٰہی بدل جاتی ہے۔ مطلب صرف اتنا ہے کہ نہتے عوام دل میں ٹھان لیں تو شہنشاہیت کی بساط پلٹ سکتے ہیں اور جس غلامی کو ابدی سمجھا جاتا ہے وہ ختم ہو سکتی ہے۔ اقبال کی آنکھیں بند ہونے کے بعد یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اور ۱۹۴۶ء میں انڈونیشیا کے عوام نے ولندیزی سامراج کا تختہ پلٹ دیا۔ اس کے بعد تو ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور ایشیا اور افریقہ کے زیادہ تر ملک آزاد ہو گئے۔

اقبال کے ساتھ شاید سب سے بڑی زیادتی یہ کی گئی کہ انھیں سیاسی فلسفی کا درجہ دے دیا گیا۔ میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ وہ فلسفی ضرور تھے اور سیاست سے بھی انہیں دلچسپی تھی اور مذہب سے بھی انہیں گہرا لگاؤ تھا لیکن سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ شاعر تھے اور انہوں نے اپنی شاعرانہ فکر کو کسی فلسفیانہ، سیاسی یا مذہبی شکنجے میں نہیں جکڑنے دیا۔ انہوں نے آزادانہ طور پر ان تمام مسائل پر اپنی رائے دی ہے لیکن جو شاعر ابلیس کی زبان میں جبرئیل سے کہے

گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو

سے آپ کس مذہب کا پیرو کہیں گے اور پھر

یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

عبودیت کے کس درجے میں آتا ہے۔

یہ سب اس فکری آزادی کی دین ہے جس کا رواج مسلمانوں کی عری میں پچھلے چودہ سو برسوں سے چلا آ رہا ہے۔ اسی وجہ سے کسی اقبال کی مذہبی گرفت کرنے کی جرأت نہیں کی۔

مسلمانوں کی سیاست سے تھوڑا بہت تعلق رکھنے والا بھی حبش کی جنگِ آزادی کو کچلنے والے مسولینی کی تعریف کیسے کر سکتا۔ لیکن اقبال کے مسولینی کے دو چہرے ہیں۔ ایک وہ جو افریقہ کی نو آبادیوں میں نظر آتا ہے اور ایک وہ جو روم کے بازاروں میں۔ یہ تفریق اقبال کی شاعرانہ ندرتِ فکر کا نتیجہ تھی اور اسے سیاسی نظریات کے پیمانے پر نہیں تولنا چاہیے۔

ایک روز یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے زیرِ انتظام اقبال پر سیمینار ہوا۔ وہاں کسی نے اقبال اور مارکس، کے عنوان کا مقالہ پڑھا۔ میں بھی اس محفل میں تھا۔ میں نے رائے دی کہ اقبال اور مارکس میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اقبال قدر کے اور مارکس جبر کے قایل تھے۔ اسلوب صاحب انصاری نے اثبات میں سر ہلایا لیکن میرے کچھ دوست مجھ سے خفا ہو گئے۔ آخر مارکس کے یہاں جبر کہاں۔ اسٹالن نے تو اپنے مقالے میں یہ بات صاف کر دی ہے کہ تاریخی مادیت کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ فرد کے تاریخ سازی کے کردار سے انکار کیا جائے۔ جواب میں عرض کیا کہ ذرا یہ بھی تو دیکھیے کتنی آزادی دی گئی ہے فرد کو۔ بس اس حد تک جس حد تک وہ معیشت کے قوانین کی پابندی کرتا ہے۔ وہ کسی قانون کو بدل نہیں سکتا۔ دوسری طرف ذرا اقبال کے تیور دیکھیے

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے !
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اور اس معاملے میں جیسا کہ میں نے جوابِ دوست کے شروع میں عرض کیا تھا میں بالکل جبر کا قایل ہوں اور کہیں کہیں تو اس معاملے میں مجھے اقبال کی ہم نوائی کا بھی شرف حاصل رہا ہے۔ آخر

ہم بندِ شب و روز میں جکڑے ہوئے بندے

ہمارے علاوہ اور کون ہیں ؟

عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ یکتائی معشوق کی دلکشی بڑھتی جاتی ہے اور ایسا خیال ہے کہ اس منزل میں جبر و قدر کے جھگڑے شاید مٹ جائیں اور پھر ہم جیسے گنہگاروں کی نجات ہمہ اوست کے علاوہ اور ہے بھی کہاں ؟ یقیناً اس کا پہلا درجہ ہمہ از اوست ہے جو جبر کی منزل ہے ابھی تک اس منزل میں بھٹک رہا ہوں۔ آگے دیکھیے کیا ہوتا ہے۔

کر سکے کون کہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اُٹھائے نہ بنے

ذکر ہو رہا تھا ان کا جنھوں نے ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان کو اپنا

وطن بنایا۔ مغلیہ سلطنت کو ختم کر کے جب انگریز ہندوستان سے سدھارے تو پاکستان کی حکومت ملک کے ایک ایسے حصے میں بنی جو ہر لحاظ سے کم ترقی یافتہ تھا۔ مغربی پاکستان میں لاہور کی یونیورسٹی تھی اور مشرقی پاکستان میں ڈھاکہ کی۔ جب کہ ہندوستان کے صرف ایک صوبے میں پانچ یونیورسٹیاں تھیں۔ صنعت و حرفت کے نام سے سیالکوٹ کے علاوہ بس اللہ کا فضل تھا۔ زراعت کے میدان میں البتہ آپ لوگ کچھ آگے تھے۔ انتظامیہ کی حالت یہ تھی کہ میز کرسی تک سب جگہ میسر نہیں تھی۔ ایک ایک میز پر دو دو افسر لکھتے پڑھتے تھے۔ مشرقی پاکستان کی حالت تو اور بھی خراب تھی، گنجان آبادی، غربت، جہالت اور بیماریوں کی افراط غرض یہ تھی وہ کائنات جو آپ کے حصے میں آئی۔ آپ لوگوں نے اپنی محنت اور مشقت سے اس نئے ملک کی صورت ہی بدل دی۔

میں نے سب سے پہلے مشرقی پاکستان دیکھا تھا۔ ۵۰-۱۹۴۹ء میں۔ جب میں روپوشی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ وہاں غربت، افلاس اور بیماری کے علاوہ جو چیز متوجہ کرتی تھی وہ لوگوں کا جوش و خروش تھا۔۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے آشیاں بندی کا ڈنکا بج رہا ہو۔ ہر شخص روشن مستقبل کے خواب دیکھ رہا تھا۔

اس کے بعد بھی کلکتہ کی طالب علمی کے زمانے میں دو ایک بار جانا ہوا اور یہی رنگ دیکھا لیکن ۶۴ء میں جب انگلستان سے تعلیم ختم کر کے اپنے عزیزوں سے ملنے ڈھاکہ گیا تو وہاں کی دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔

میں زینت کے ایک قریبی عزیز سے ملنے گیا۔ وہ کلکتہ میں ۴۷ء سے پہلے مسلم لیگ کے بہت اہم نوجوان لیڈر تھے، اب ڈھاکہ میں آباد ہو گئے تھے اور کئی ملوں اور چائے کے باغات کے مالک تھے۔ مجھ سے ہمیشہ بہت اخلاق سے ملتے تھے۔ میں نے حسب معمول آداب عرض کیا اور مزاج پوچھا۔ مسکرا کر بنگلہ میں فرمایا کہ اس گھر میں لوگ بنگلہ بولتے اور انگریزی سمجھتے ہیں۔ آپ دونوں سے واقف ہیں، جو زبان آپ بول رہے ہیں وہ شاید اردو ہے جو یہاں نہ بولی جاتی ہے اور نہ سمجھی جاتی ہے۔ میں نے بنگلہ میں پوچھا کہ یہ تبدیلی کب سے آئی۔ کہنے لگے کہ میں نے سنہ ۶۱ء میں انگلستان میں آپ سے کہہ دیا تھا کہ حالات خراب ہو رہے ہیں اور اگر ہمارے رہنما معاملہ کو نہ سلجھا پائے تو بہت مشکل ہو جائے گی۔ چنا[نچہ] پیدا ہو رہی ہیں۔ بنگالی شرفا یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ساتھ باعزت بر[تاؤ] نہیں ہو رہا ہے۔ صنعتی ترقی میں بھی رکاوٹیں پڑتی ہیں۔ ہمارے مغربی ہم[وطنوں] کے مقابل ہمیں لائسنس مشکل سے ملتے ہیں۔ زبان کا معاملہ تو اور بھی ت[لخ] ہے۔ آخر یہ اصرار کیوں کہ اردو اسلامی زبان ہے اور بنگلہ غیر اسلا[می]۔ ایران کے لوگ فارسی بول کر اور چین کے مسلمان چینی بول کر اپنا مذہب ب[رقرار] رکھ سکتے ہیں تو آخر پاکستان کی اکثریت سے کیوں کہا جا رہا ہے کہ ا[س کی] زبان غیر اسلامی ہے۔

۷۹ ۱۹ء کے دسمبر میں میرا پھر ڈھاکہ جانا ہوا اس وقت ما[رشل لاء] کے خلاف تحریک اپنے نقطۂ عروج پر تھی، ٹیلی ویژن پر بڑے دلچ[سپ] مباحثے ہوتے تھے۔ مجھے ایک گفتگو یاد ہے۔ ایک بہت باریش بنگا[لی] فرما رہے تھے کہ جب آپ لوگ کہتے ہیں کہ ہم خدا کے لیے نماز پڑھتے ہ[یں تو] ہم کوئی اعتراض نہیں کرتے۔ حالانکہ نہ خدا عربی لفظ ہے اور نہ نماز۔ پھر اگر کوئی کہے کہ ہم ایشور کی پرارتھنا کرتے ہیں تو لوگوں کو کیوں برا معلوم ہوتا ہے۔ مجھے یہ بات بہت معقول معلوم ہوئی۔ آخر ہم نے تو بھی[...] ہے۔

ہندیاں را اصطلاح ہند دادہ اند

۱۹۷۱ء میں سرحد پار کر کے ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں [...] بنگال اور آسام میں داخل ہوئے تو وہ رفیوجی کیمپس میں رکھے گئے۔ [...] کی دیکھ بھال کے لیے ڈاکٹروں کی ضرورت پڑی۔ میں نے میڈیکل [...] لکے نوجوان ڈاکٹروں کا ایک طبی وفد ڈاکٹر محمد بشیر الدین خاں کی [...] میں مرشد آباد روانہ کیا۔ سنا ہے کہ جب یہ وفد وہاں پہنچا تو لوگوں [نے] کہا خوب ایک خان صاحب سے بھاگ کر تو ہم ہندوستان آئے ا[ور] یہاں ایک دوسرے خان صاحب موجود ہیں۔

اس کشمکش میں میرے بہت سے عزیز سخت مشکلوں میں [مبتلا] ہوئے۔ بعضوں کی تو جانوں پر بن گئی، زینت کے ایک بہنوئی ہلاک کر[دیے] گئے۔ نہ جانے اور کتنے مارے گئے۔ کتنے گھر اجڑ گئے اور کتنے خو[ش آب و تاب کے] خواب چکنا چور ہو گئے۔

اب اتنے برسوں کے بعد کے جو ان واقعات کے متعلق سوچتا

تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی یونانی المیہ کی طرح ناگزیر تھا۔ مغربی پاکستان کے ایک بہت بااثر طبقے کا خیال تھا کہ جب تک مشرقی پاکستان کی کثیر آبادی پاکستان سے متعلق رہے گی، وہ نہ صرف پورے پاکستان کی خوش حالی میں رکاوٹ بنے گی بلکہ کسی بھی جمہوری نظام میں ملک کی سیاست پر فیصلہ کن اثر ڈالتی رہے گی۔ غالباً مغربی پاکستان کا یہ طبقہ اپنے کندھوں سے اس بوجھ کو اُتارنا چاہتا تھا۔ دوسری طرف مشرقی پاکستان کے لوگ یہ محسوس کر رہے تھے کہ مغربی پاکستان والے انہیں اپنے زیرِ اقتدار رکھنا چاہتے ہیں۔ تیسری طرف ہندوستان میں تو ایک بہت بڑا طبقہ پاکستان کے تصور کو ایک سامراجی سازش جانتا تھا اور اسے پاکستان کی سالمیت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، ۷۲-۱۹۷۱ء میں یہ تینوں متحد ہو گئے تھے۔ گو بظاہر آپس میں تیغ آزمائی ہو رہی تھی، لیکن اس وقت بہت کم لوگ سمجھتے تھے کہ

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا۔

قسمت کی ستم ظریفی کہ اس المیہ کے تینوں اہم کردار اپنے ہی ہم وطن لوگوں کے ہاتھوں مارے گئے اور تینوں کے قتل کے ذمہ دار وہ لوگ تھے جن کی وجہ سے مرنے والوں کو اس بحران میں سیاسی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ دیکھیے

آسماں بھی کیا ستم ایجاد ہے۔

جسے ہم کہتے تھے سارے جہاں سے اچھا اس ہندوستان کے پہلے دو اور اب تین ٹکڑے ہو گئے۔ دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں ان ٹکڑوں کو اپنی سیاسی بساط کے مہروں کی طرح استعمال کر رہی ہیں۔ ہندوستان کے تعلقات روسیوں سے اور پاکستان کے امریکنوں سے ایسے ہی ہیں جیسے اٹھارھویں صدی میں نظام دکن کے انگریزوں سے اور ٹیپو سلطان کے فرانسیسیوں سے تھے۔ انگریز اور فرانسیسی تو کچھ دنوں کے بعد ایک دوسرے کے دوست ہو گئے لیکن اس بد قسمت ملک پر جو بیتی وہ سب کو معلوم ہے۔ دل یہ سوچ کر کانپ جاتا ہے کہ کہیں قسمت وہ دن پھر نہ دکھا دے۔

میں بار بار اپنے دل سے یہ سوال کرتا ہوں کہ مستقبل کیا ہے! کوئی صاف صاف جواب نہیں ملتا، ہاں یہ خوب جانتا ہوں کہ دل کیا چاہتا ہے اور آپ سے دل کی کہتا ہوں کہ سیاسی سرحدوں کو باقی رہنے دیجیے لیکن تہذیب کے جو دھارے صدیوں سے ساتھ بہہ رہے ہیں انھیں الگ الگ رکھنے کی کوشش نہ کیجیے۔ ہمارے ملکوں میں اس وحدت کو نہ تلاش کیجیے جو یہاں نہیں ہے۔ یہاں کی وحدت تو ایک خوب صورت باغ کی وحدت ہے، جہاں رنگ برنگی کلیاں اور ہر خوشبو کے پھول چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر آپ چاہیں کہ ایک ہی رنگ کی کلیاں کھلیں اور ہر پھول سے ایک ہی سی خوشبو آئے تو اوّل تو یہ ناممکن ہے اور دوسرے اس کوشش میں چمن کی غارت گری ہو جائے گی۔

پچھلے چالیس برسوں میں دو دفعہ ایسا ہو بھی چکا ہے۔ اگر ہم ہوشیار نہیں رہے تو شاید پھر ایسا ہو جائے۔ خبردار رہنے کی ضرورت ہے۔ لوگوں کو یاد دلانا ہوگا کہ آزادی سے پہلے کانگریس اور مسلم لیگ دو بڑی سیاسی پارٹیاں تھیں۔ ان میں سے کسی نے ملک میں ایک مضبوط مرکز والی حکومت نہیں بنانا چاہی تھی۔ خیال یہ تھا کہ دونوں پارٹیاں کسی طرح کے وفاقی نظام کو پسند کرتی ہیں۔ کانگریس کے صدر نے تو یہ اعلان سارے ملک کے لیے کیا تھا اور مسلم لیگ نے ۱۹۴۰ء کے لاہور ریزولیوشن میں یہی بات پاکستان کے لیے کہی تھی۔ اس کا مطالبہ تھا کہ ملک کے شمال مشرق اور شمال مغرب میں خود مختار ریاستیں بنائی جائیں۔ کاش کانگریس والے اپنی ہی بات مان لیتے اور لاہور والے لاہور کے ریزولیوشن پر عمل کرتے تو پھر شاید سینوں میں اتنے داغ نہ لگتے۔

جن مشکلوں میں ہم گھرے ہوئے ہیں وہ بہت حد تک ہماری ہی غلطیوں کا نتیجہ ہیں۔ ماضی کے تجربہ میں ہم بھول گئے کہ مسلمانوں کی عظیم الشان سلطنتیں جب بنی تھیں وہ دور ہی شہنشاہیت کا تھا اور اب وہ دور کبھی واپس نہیں آئے گا۔ اس زمانے کے بہرو باجبروت بادشاہ اور ان کے لائق جنرل ہوتے تھے۔ لیکن بادشاہوں اور جنرلوں کی کامیابی کے پیچھے نہ معلوم کتنی بیواؤں کی آہیں اور یتیموں کی پکاریں چھپی رہتی تھیں۔ لڑائی میں چاہے فتح ہو یا شکست زخمی تو دونوں طرف کے لوگ ہوتے ہیں، سپاہیوں کے سینے میں زخم آتے ہیں اور ان کے پیاروں کے دل گھایل ہوتے ہیں۔ آج کی دنیا میں ایک طرف تو تباہی کے ایسے سامان ہیں کہ پلک جھپکتے ہی سب کچھ تباہ ہو سکتا ہے اور دوسری طرف ایسے سامان بھی مہیا ہیں کہ انسان بغیر ایک دوسرے پر ظلم کیے

خوش حالی اور فراغت کے دن گزار سکتے نہیں۔ آیئے اس نئی دنیا کو ہم سلام کریں
نئی دنیا کو برتنے کے لیے سبھی کو تیاری کرنا ہوگی، ہر گروہ کی تیاری اس کے مخصوص حالات اور تاریخی پس منظر میں ہوگی۔ مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے کا سلیقہ آنا چاہیے، ان پر یہ تہمت لگائی جاتی ہے کہ وہ اپنے علاوہ کسی کو بخشش کے قابل نہیں سمجھتے۔ انہیں کافر کہتے ہیں اور کافروں کے ساتھ تو انہیں قتال کا حکم دیا گیا ہے جب تک وہ اپنے کو مسلمانوں کے سپرد نہ کردیں۔ جو بات سمجھنے اور سمجھانے کی ہے وہ یہ کہ ہر غیر مسلم اس زمرے میں نہیں آتا۔ صرف ان لوگوں سے سختی سے پیش آنے کے لیے کہا گیا ہے اور لڑائی کی اجازت دی گئی ہے جو مسلمانوں کو ان کے مذہب کے مطابق زندگی نہیں بسر کرنے دیتے اور جو ان کی عبادت میں رکاوٹ ڈالتے ہیں یا انہیں ان کے گھروں سے نکالتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے خلاف ضرور لڑنا چاہیے اور لڑائی اس وقت تک جاری رہے گی جب تک یہ لوگ ظلم سے باز نہ آجائیں۔
لیکن ان کے علاوہ اور کسی گروہ کا شمار ان کافروں میں نہیں ہے جن سے قتال کا حکم دیا گیا ہے۔ باقی سب لوگوں سے ایسا برتاؤ کرنا ہے کہ اُن کے دلوں میں جگہ بن جائے۔

کسی کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ مسلمان اللہ کے خاص بندے ہیں اور باقی لوگ قدرت کی نگاہ میں دوسرے درجے کے ہیں۔ حاشا و کلا، قدرت کے قوانین سب کے لیے یکساں ہیں۔ تصور تو رب العالمین کا ہے، رب المومنین کا نہیں جو بھی اچھی باتیں کرے اچھا ہے اور بُری باتیں کرنے والا بُرا۔ خوشی اس بات کی البتہ ہے کہ اخوت، مساوات اور حریت کی باتیں ہمارے لیے نئی نہیں ہیں۔

اِسلام کے ماننے والوں کے لیے بہت کم باتیں فرض کی گئی ہیں اور ان میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جس سے عوام کو کوئی نقصان پہنچے اور بہت کم باتیں حرام کی گئی ہیں اور کوئی ایسی بات حرام نہیں ہے جس سے عوام کو فائدہ ہو۔ پھر یہ بھی بار بار واضح کر دیا گیا ہے کہ کوئی نئی تعلیم نہیں دی جا رہی ہے۔ تعلیم تو وہی ہے جو ساری دنیا کو اِسلام سے قبل دی جاتی رہی ہے۔ اس طرح سے گویا بنیاد ڈالی گئی عالمی برادری کی۔ مجھے یقین ہے کہ "تو برائے وصل کردن آمدی" صرف موسیٰ سے نہیں کہا گیا تھا بلکہ مخاطب وہ سب ہیں جن کے لیے موسیٰ قابل احترام ہیں۔ ہندوستان میں اس تعلیم کی اشاعت صوفیائے کرام نے کی۔ ان کے دربار میں سب ہی طرح کے لوگ جاتے تھے۔ روایت ہے کہ ایک روز حضرت نظام اولیا کوٹھے پر کھڑے تھے۔ دیکھا کہ نیچے سے لوگ ایک مورتی کو اپنے جلوس لیے جا رہے ہیں۔ بیساختہ فرمایا:

ہر قوم راست دینے، رسمے و قبلہ گاہے۔

پاس کھڑے ہوئے عاشق نے مرشد کی طرف اشارہ کر کے مصرع لگایا:

من قبلہ راست کردم بر طرف کج کلاہے

میں نے اپنے بہت سے دوستوں سے پوچھا کہ دنیا میں کسی موومنٹ کو اتنی مقبولیت ہوئی ہے جتنی کہ صوفیاء کی تحریک کو؟ جواب ہمیشہ نفی میں ملا یورپ کی سب تحریکیں بہت حد تک صرف پڑھے لکھے خاص لوگوں تک محدود ر حتیٰ کہ کوئیکر تحریک کو بھی یورپ اور امریکہ میں اتنی مقبولیت نہ حاصل ہو سکی صوفیاء کی تحریک کو ہندوستان، ایران اور ترکستان میں ہوئی۔

میرا یقین ہے کہ قرون وسطیٰ کی فضا میں جب اسلام ہندوستان آ تو اس کے ماننے والے سلاطین نے تخت و تاج کے لیے جیسی سفاک روایتیں چھوڑی ہیں اگر صرف وہی رہ جاتیں تو آج نام لینے کو اس برصغیر میں مسلما ملتے۔ ان سفاک روایتوں کے باوجود بھی اگر کروڑوں مسلمان یہاں نظ آتے ہیں تو یہ سب صوفیاء کا اعجاز ہے۔

صوفیا کی تحریک کے ساتھ سب سے بڑی زیادتی یہ ہوئی کہ ا خانقاہی نظام کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ صوفیا نے تو یہ کوشش کی کہ جتنی فضول باتیں مذہب سے منسوب کر دی گئی ہیں انہیں نظر انداز کر مذہب کو اس طرح پیش کیا جائے جس سے دکھی دلوں کی تسکین ہو سکے ان ہی صوفیا کے جانشین اتنی سخت روایت پرستی میں مبتلا ہو گئے کہ جن کا نہیں۔

بہر حال اس قسم کی متضاد باتیں تو غالباً ہر عوامی تحریک کے سا جڑ جاتی ہیں لیکن ان کے باوجود صوفیا کا سہارا بڑا سہارا ہے۔

دیکھیے بار بار صوفیا کا ذکر آ جاتا ہے، گو میں حتی الامکان ا تذکرے سے بچنا چاہتا ہوں کہ اپنے دل پر بھروسہ نہیں، بھروسے کا تو یہ کمبخت کبھی تھا بھی نہیں۔

قبل اس کے کہ جوابِ دوست ختم کروں میں یہ عرض کرنا چاہتا کہ ہمارے ملک کے مستقبل کے بارے میں ہمارے بچپن میں ہمارے بنا

فکرمند تھے، اب ہم فکرمند ہیں۔ چنانچہ گزشتہ سال علی گڑھ میں پروفیسر جمال خواجہ صاحب کے دولت کدے پر ایک نشست ہوئی جس میں پروفیسر آل احمد صاحب سرور اور ان کے چھوٹے بھائی پروفیسر اولاد احمد صاحب، مشہور تاریخ داں پروفیسر محب الحسن صاحب، پرانے اشتراکی کارکن جناب علی اشرف صاحب، ہمارے آپ کے دوست انگریزی کے پروفیسر مسعود الحسن صاحب اور عربی کے پروفیسر ریاض الرحمان صاحب اور شعبۂ تاریخ سے متعلق جناب فرخ جلالی صاحب جنھیں ہماری سیاسی تاریخ سے بہت واقفیت ہے اور ان کے ساتھ میں بھی شریک تھا۔ رائے یہ ہوئی کہ موجودہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ علی گڑھ سے ایک تحریک شروع کی جائے جس کا مقصد سرسید اور ان کے ساتھیوں کے کام کو آگے لے جانا ہو۔ سیاست، ادب، فلسفہ اور معاشرت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ پچھلے سو برسوں کے تجربات کی روشنی میں لیا جائے۔ چنانچہ علی گڑھ کی تحریکِ نو کے نام سے ایک انجمن بنائی اور یہ طے کیا کہ انجمن کے لوگ اپنے دل کی باتیں لکھنا شروع کریں۔ چاہے انگریزی میں چاہے اردو میں۔ ظاہر ہے کہ سب موضوعات تو وہ نہیں ہوں گے جو سرسید کے زمانے میں تھے لیکن کوشش یہ ہوگی کہ لوگوں کے دلوں میں یہ تمنا پیدا کریں کہ جس باغ کے ہم خوشہ چیں ہیں اس کی آبیاری اور چمن بندی میں ہمارا بھی حصّہ ہو۔

میں نے عمر بھر خواب دیکھے ہیں، اب بھی دیکھ رہا ہوں کہ جیسے پنجاب میل پھر کلکتہ سے لاہور تک جا رہا ہے اور پیشاور اور بمبئی کے بیچ بھی سیدھی ریل چل رہی ہے۔ سیالدہ اسٹیشن سے مشرقی بنگال کا سہانا سفر پھر شروع ہو گیا ہے۔ درگا پوجا کا زمانہ ہے اور اسٹیمر سے دریائے برہمپترا پار کیا جا رہا ہے۔ دور سے کوئی بھٹیالی گیت گاتا ہے

" آگے جانے تو رے بھانگا نوکا دھرتم نا "

یعنی اگر محبت کا انجام معلوم ہوتا تو ایسی ٹوٹی ہوئی کشتی میں کیوں بیٹھتا۔ ادھر کشمیر کی حسیناؤں کے لیے سرحد پار سے باراتیں آ رہی ہیں اور آپ کے بچوں میں سے کوئی آپ سے پوچھ رہا ہے کہ ابا اپنے بیٹے کو ڈاکٹری پڑھانے کہاں بھیجوں اور آپ جواب دیتے ہیں کہ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ علی گڑھ بھیجو جہاں اس کے پردادا نے برسوں پڑھایا اور جہاں سے پڑھ کر اس کے دادا اس قابل ہوئے کہ ملک کے ایسے حصّے میں باغ لگائیں جس میں صدیوں سے خشک سالی تھی۔ ہاں وہی علی گڑھ جسے لوگ اسلام کا بت خانہ اور تہذیب کا میخانہ جانتے ہیں اور جہاں کی محفلوں میں وہ شمعیں روشن ہیں جنھیں ٹکسلا، ایتھنز، قرطبہ
بغداد اور آکسفورڈ سے
لائے ہیں۔

" اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کا احتساب کریں اور اس کے ازالے کی قرار واقعی کوشش کریں۔ ہندوستان کے بیشتر اخبارات ہم کو پسماندہ، قدامت پسند، بنیاد پرست اور دوسرے تضحیکی خطابات سے نوازتے رہتے ہیں اور اکثر وہ حد سے آگے بڑھ جاتے ہیں، مگر ہم پر بھی لازم ہے کہ ہم اپنی کمزوریوں اور خرابیوں سے باخبر رہیں۔ اپنی خرابیوں کا احساس ہم کو ہونا چاہیے اور پھر اپنی سعیِ مسلسل سے اور مثبت رویے کو بنیاد بنا کر اپنی برائیوں کو اچھائیوں میں تبدیل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔"

سیّد ہاشم علی

انسانی فضلہ سے بجلی کی تیاری

مختار الحق

گائے اور بھینس کے فضلے (گوبر) سے تیار کی جانے والی گوبر گیس کے متعلق آپ نے سنا اور پڑھا ہوگا یا ممکن ہے کسی نہ کسی صورت آپ کا اس سے سابقہ بھی پڑا ہوگا لیکن آپ کو شاید یہ معلوم نہ ہو کہ انسانی فضلہ (جسے عرف عام میں پاخانہ کہا جاتا ہے) سے بھی ایسا کام لیا جا سکتا ہے۔ جی ہاں! یہ حقیقت ہے کہ اپنے ہی ملک کے ۴۴ سالہ بندیشور پاٹھک نے انسانی فضلے سے بائیو گیس (BIO-GAS) اور بجلی تیار کر کے باقاعدہ اس سے بلب بھی روشن کرنے کا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اس طرح بندیشور پاٹھک نے ایک انتہائی گندی چیز سے بجلی جیسی کارآمد شے تیار کر کے یقیناً عالم انسانیت کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔

ہمارے ملک کی آبادی کا فضلہ عام طور پر ضائع ہو جاتا ہے۔ ۱۹۸۱ء میں لیے گئے ایک جائزے کے مطابق ملکی آبادی کے ۹۴ فیصد حصے کا فضلہ جہاں تہاں گندگیاں اور بیماریاں پھیلانے کا باعث بنتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ دیہاتوں میں رفع حاجت کے معقول انتظام کی کمی ہے ملک کا ۸۰ فیصد حصہ دیہاتوں پر مشتمل ہے جہاں فراغت کے لیے کھلے میدان یا کھیت وغیرہ ہیں۔ بہت کم جگہیں ایسی ہیں، جہاں فضلہ کو مختلف مراحل سے گزار کر کھاد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ جہاں تک چھوٹے موٹے قصبوں اور شہروں کی بات ہے تو وہاں کی صورتِ حال بھی خاصی مایوس کن ہے۔ جدید ڈھنگ کے پائخانوں (LATRINES) کے باوجود اب بھی بیشتر مقامات پر گندگیاں پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں اور جو قدیم طرز کے پائخانے ہیں تو اُن کا انتظام انتہائی ذلت آمیز ہے کہ انسان انسان کے پائخانے کو لے کر سر پر ڈھوتا ہے۔ عالمی ادارۂ صحت (WHO) کے اعداد و شمار کے مطابق ہندوستان میں چھ لاکھ افراد سروں پر پاخانہ ڈھوتے ہیں اور اس طرح اپنی روزی روٹی حاصل کرتے ہیں۔

یہ ہے وہ صورتِ حال جس کے زیر اثر رہ کر بندیشور پاٹھک کو اپنا کام شروع کرنا پڑا۔ پاٹھک غالباً دنیا کے وہ پہلے انسان ہیں جنھوں نے انسانی فضلے سے بائیو گیس اور پھر اس سے بجلی تیار کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے بہار کی راجدھانی پٹنہ میں بائیو گیس پلانٹ قایم کیا۔ جہاں سے بجلی تیار کر کے پٹنہ کے بیلی روڈ اور تاریخی گاندھی میدان میں لگے لیمپوں کو روشن کیا۔ وہ ۸۰ فیصد بائیو گیس میں ۲۰ فیصد ڈیزل ملا کر بجلی تیار کرتے ہیں۔ ۸۰ فیصد بائیو گیس تیار کرنے کے لیے کافی مقدار میں فضلہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ پاٹھک یہ تجربہ آج سے نہیں بلکہ گزشتہ ۱۷ برسوں سے کر رہے ہیں۔ اس غرض سے انہوں نے "سلبھ سوچالیہ سنگٹھن" نامی ایک ادارہ قایم کیا ہے۔ جو عام طور پر سلبھ انٹرنیشنل کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی شاخیں ملک کی ۱۷ ریاستوں میں پھیلی ہوئی ہیں جن میں کوئی پندرہ ہزار افراد برسر روزگار ہیں سلبھ انٹرنیشنل نے ۱۹۸۶ء میں ۶۰ کروڑ روپے کا بزنس کیا۔ ۱۷ ریاستوں میں اس کے زیر انتظام ۷۰۰ اجتماعی پائخانے (Community Latrines) قایم ہیں، جہاں فضلے کو تجربہ گاہ (LABORATORY) کے ذریعے کیمیاوی مرحلوں سے گزار کر اس سے بائیو گیس، بجلی اور کھاد تیار کی جاتی ہے۔ ایسے پاخانے کو استعمال کرنے والے ہر شخص سے محض ۲۰ پیسے لیے

جناب مختار الحق، کانکی نارا ۔ مغربی بنگال

جاتے ہیں۔ صرف پٹنہ میں ایسے ۴۴ پاخانے قایم ہیں جہاں روزانہ ۳۰ ہزار کے قریب لوگ اُن کا استعمال کرتے ہیں اور اس طرح ہر روز چھ ہزار روپیے کی آمدنی ہوتی ہے۔ پاٹھک کا کہنا ہے کہ اس رقم سے وہ عملے کے لوگوں کی تنخواہیں دیتے ہیں اور صفائی ستھرائی کا نظم وضبط بہتر بنائے رکھتے ہیں۔ ان کا یہ تجربہ دیہاتوں کی بہ نسبت شہروں میں زیادہ کامیاب ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دیہی علاقوں میں انسانی فضلے سے بائیو گیس اور بجلی تیار کرنے کی بات کرنا اپنی ذلت و رسوائی کو دعوت دینا ہے۔ وہاں مختلف ذات پات اور برادریوں کے لوگ اتنے خانوں میں بٹے ہوئے ہیں کہ اجتماعی پاخانوں کو استعمال کرنا وہ اپنی کسر شان سمجھتے ہیں۔ یعنی ایک برادری کے لوگ دوسرے برادری والوں کا پاخانہ ہرگز استعمال نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں بائیو گیس پلانٹ قایم کرنا مشکل ہے کیوں کہ اس کے لیے وافر مقدار میں فضلہ درکار ہے۔ بندیشور پاٹھک کا خیال ہے کہ سرمایہ دار حضرات دیہاتوں میں جس طرح پولٹری اور ڈیری وغیرہ قایم کرتے ہیں اسی طرح اگر عوامی پاخانے (Public Latrines) قایم کریں تو اُن سے تیار کردہ بجلی اور کھاد فروخت کر کے وہ اچھا خاصا منافع کما سکتے ہیں اور اس سے دیہی عوام کی ایک بہت بڑی ضرورت بھی پوری ہوگی۔ ایک تو انہیں رفع حاجت کی مناسب جگہ مل جائے گی اور دوسرے یہ کہ فضلے سے حاصل کردہ بجلی اور کھاد سے انہیں

کا بھلا ہے۔ پاٹھک کا کہنا ہے کہ اگر حکومت انہیں (Community Latrines) بنانے کی ساری رقم ایڈوانس کی شکل میں دے دے تو وہ ملک گیر سطح پر بڑے پیمانے پر اپنا کام شروع کرنے کو تیار ہیں۔

بندیشور پاٹھک نے جو پاخانہ قایم کیا ہے اس میں Flush System کے مقابلے میں کم پانی کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان کے Public Latrines بڑے شہروں میں مخصوص عوامی مقامات پر قایم ہیں۔ مزدوروں کی بین الاقوامی تنظیم (I.L.O) کا کہنا ہے کہ پاٹھک نے پہلی بار یہ ثابت کیا کہ عوامی پاخانوں میں اگر مناسب اور ضروری سہولتیں موجود ہوں تو لوگوں کو پیسہ دے کر رفع حاجت کرنا بالکل گراں نہیں گزرے گا۔

سچ پوچھیے تو مصروف ترین اور بھاگ دوڑ والے شہروں میں ایسے پاخانوں کی اشد ضرورت ہے۔ جہاں مختلف ضرورتوں کے تحت روزانہ ہزاروں افراد کا آنا ہوتا ہے۔ ایسے پاخانے اگر عام ہو گئے تو وہ دن دور نہیں جب بجلی کی قلت کا رونا نہیں سننا پڑے گا۔



عدالت گنج میں بندیشور پاٹھک کی لیبارٹری۔ کونے میں وہ خود نظر آ رہے ہیں۔

" جہاں ہم کو دھوکہ کھانے کا احتمال ہے، وہاں ہم کو نہایت ہوشیاری اور بہت خبرداری سے کام کرنا چاہیے۔ حد سے زیادہ سرگرمی اور تعصب اور کسی خاص فرقے کو یا کسی خاص رائے کے لوگوں کو بُرا اور حقیر سمجھنا، یہ ایسی باتیں ہیں جن سے ہزاروں آفتیں پیدا ہوتی ہیں وہ فی نفسہٖ نہایت ہی بُری ہیں "

———— سر سیدؒ

ہندوستان میں
اسلامی علم الہیئت کا آغاز و ارتقا

شبیر احمد خان غوری

برصغیر پاک و ہند میں اسلامی علم الہیئت کا آغاز پانچویں صدی ہجری (گیارہویں صدی مسیحی) کی ابتدا سے ہوتا ہے اور اس کے ساتھ اعتناء کسی نہ کسی صورت میں آج کے دن تک باقی ہے۔ اس ایک ہزار سال پر پھیلے ہوئے جائزے کو چار ادوار میں منقسم کیا جا سکتا ہے:۔

۱۔ برصغیر میں اسلامی علم الہیئت کی ابتدا۔
۲۔ قبل مغل ہندوستان میں اسلامی علم الہیئت کی ترقی۔
۳۔ بعد مغل ہندوستان میں اسلامی علم الہیئت کی ترقی اور
۴۔ اسلامی علم الہیئت کی موجودہ صورت حال۔

(۱) برصغیر میں اسلامی علم الہیئت کی ابتدا۔

برصغیر میں اسلامی علم الہیئت کا آغاز ابو ریحان البیرونی نے ۴۰۸ھ (۱۰۱۷ء) کے قریب کیا جب کہ اسے اس کے وطن مالوف خوارزم سے شمالی مغربی ہندوستان میں جلا وطن کیا گیا۔(۱) یہاں اس نے اس علاقے کے مختلف شہروں کا عرض البلد دریافت کیا، جس کی تفصیل اس نے اپنی کتاب "تحقیق ما للهند من مقولة مقبولة في العقل او مرذولة" میں دی ہے(۲) اس کے علاوہ اس نے محیط زمین۔ (Earth Circumference) کی پیمائش کی(۳) جو ہیئت اور جغرافیہ کی تاریخ میں اپنی نوعیت کی تیسری کوشش تھی۔ پہلی کوشش تیسری صدی قبل مسیح میں Eratosthenes نے کی تھی، دوسری رصدگاہ مامونی کے ہیئت دانوں نے اور تیسری البیرونی نے ہندوستان میں۔

بعد میں لاہور کے دیوان کتابت (Secretariat) کا عملہ اس علم کے ساتھ اعتناء کرتا ہوا ملتا ہے، مثلاً مسعود سعد سلمان نے یہ فن ایک قیدی بہرامی سے سیکھا تھا، جس کے ساتھ وہ کسی زمانے میں قلعہ میں قید تھا(۴) اس زمانے میں تعلیم یافتہ طبقہ مسلم علم الہیئت کے عظیم شاہکاروں جیسے محمد بن جابر البتانی کی "الزیج الصابی" اور البیرونی کی "کتاب التفہیم" سے واقف ہو چکا تھا۔ چنانچہ مسعود سعد سلمان اپنے ایک قصیدے میں ان کتابوں کا نام جانی پہچانی حقیقت کی طرح لیتا ہے۔ (۵)

(۲) قبل مغل ہندوستان میں اسلامی علم الہیئت کی ترقی۔

غزنوی اور غوری عہد کی ان روایات کو دہلی سلطنت کے زمانے کی کتاب نے باقی رکھا۔ چنانچہ امیر خسرو اس عہد کے ایک کاتب شاعر شہاب مہرہ کی تعریف میں کہتے ہیں۔

در ریاضی بیک ضربہ قلم
پاک کردہ است گوش جذر اصم

اس صدی کے وسط میں محمود بن عمر الرازی نے ایک زیج (Astronomical Tables) التمش کے بیٹے ناصر الدین محمود کے نام معنون کی اور اس کا نام "زیج ناصری" رکھا(۶) لہٰذا خواجہ نصیر الدین طوسی کی "زیج ایلخانی" سے پہلے ہی ہندوستان میں ایک زیج مرتب ہو چکی تھی۔ اس طرح زیج سازی میں ہندوستان کو ایران پر سبقت حاصل ہے۔ اس زیج کے واحد نسخے کی نشان دہی اسٹوری نے مشہد میں کی ہے(۷)

اسی (ساتویں صدی ہجری یا تیرھویں صدی مسیحی) کے آخر میں

جناب شبیر احمد خان غوری، سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی، الٰہ آباد بورڈ، الٰہ آباد۔

امیر خسرو نے "قِران السعدین" میں

صفت سیر بروج و روش منزلہا

کہ ہمہ کار گزار فلک اندر دوران (۸)

کے زیرِ عنوان چاند کی اٹھائیس منزلوں (Lunar Mansions) کی کیفیت قلم بند کی ہے جو علم ہیئت کے اس مبحث پر اُن کی گہری نظر کی دلیل ہے۔

مورخ ضیاء الدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ علاء الدین خلجی کے عہد کے منجم خود رصد گاہیں قایم کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ محمد تغلق دوسرے علوم کے علاوہ ریاضی و ہیئت میں بھی ید طولیٰ رکھتا تھا (۱۰) لیکن اس کے جانشین فیروز تغلق کو حسب تصریح "سیرۃ فیروز شاہی" اسطرلاب (astrolabe) بنانے میں دستگاہ کامل حاصل تھی اس کا بنایا ہوا ایک اسطرلاب فیروز آباد کے منارہ پر نصب تھا (۱۱) اس کا نتیجہ تھا کہ نہ صرف اس کی مسلمان رعایا، بلکہ ہندو رعایا بھی اس فن میں دلچسپی لینے لگی۔ چنانچہ سنسکرت زبان میں مہندر سوری نے ینتر راجہ کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جو اس موضوع پر سنسکرت زبان میں سب سے پہلی کتاب ہے (۱۲)

اگلی صدی میں دکن کا فیروز شاہ بہمنی امور سلطنت میں مشغولیت کے باوجود ہفتہ میں تین دن کتب متداولہ کے علاوہ "شرح تذکرہ" بھی پڑھایا کرتا تھا جو (۱۳) اس فن کی اہم تصنیف تھی۔ اس نے بالاگھاٹ پر ایک رصدگاہ بنوانی بھی شروع کی تھی مگر جس فاضل کو یہ خدمت تفویض کی گئی تھی، اس کی موت کی وجہ سے مکمل نہ ہو سکی (۱۴)

اسی صدی میں مالوہ کے خلجی سلطان محمود شاہ کے ایک درباری ہیئت داں نے ایک زیج لکھ کر بادشاہ کے نام معنون کی۔ اسی لیے یہ "زیج جامع محمود شاہی" کہلاتی ہے۔ اس کا واحد نسخہ بوڈلیان لائبریری میں ہے (۱۵) جس کا مائکرو فلم حاصل کر لیا گیا ہے۔ بشرط توفیق الٰہی کسی آئندہ اشاعت میں اس کا تعارف کرایا جائے گا۔

بدقسمتی سے اس طوائف الملوکی کے دور میں ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں جن فضلاء کا نبوغ ہوا، ان کی تفصیل نہیں مل سکی۔

۳۔ بعد مغل ہندوستان میں اسلامی علم الہیئت کی ترقی

بعد مغل دور کا افتتاح بابر نے کیا مگر اسے نجومیوں کی پیشین گوئیوں سے زیادہ اپنی تلوار پر بھروسہ تھا۔ بایں ہمہ خاندانی روایات کے احترام میں وہ بھی دربار کی زینت کے لیے ایک نجومی محمد شریف کو ملازم رکھے ہوئے تھا (۱۶)

مگر بابر کا بیٹا اور جانشین ہمایوں تو گویا ریاضی و ہیئت کا مظہر اتم تھا، چنانچہ ابو الفضل "اکبر نامہ" میں اس کے ذکر کا افتتاح بدیں طور کرتا ہے۔

"کرمئی کرہ اسرار ابدی و ازلی، عضادہ اصطرلاب
حکمت علمی و عملی .... افلاطون یونانی در حکمت و مسالک
ہمت اسکندر ثانی۔" (۱۷)

دوسری جگہ وہ ریاضیاتی علوم میں اس کی دستگاہ عالی کے بارے میں لکھتا ہے:

از اقسام علوم عقلی و نقلی آگاہی تمام داشتند علی الخصوص
در اقسام علوم ریاضی آنحضرت را پایہ بلند بود۔" (۱۸)

اس کی مجلس میں صرف انہیں فضلاء کو بار ملتا تھا جو ریاضی اور ہیئت میں ید طولیٰ رکھتے تھے، چنانچہ حسب روایت بایزید بیات ملا پیر محمد کو باریابی کی اجازت صرف اس لیے نہیں مل سکی کہ وہ ریاضی میں مہارت نہیں رکھتا تھا۔ (۱۹) اس کے برعکس اس نے شیخ ابو القاسم استرآبادی کو بڑے عزت و احترام سے بلا کر اپنے یہاں رکھا (۲۰) اور ان سے "درۃ التاج" پڑھی۔ اس نے کرۂ افلاک کا ایک ([illegible]) بھی تیار کرایا تھا (۲۱) اس کے علاوہ رصدگاہ قایم کرنے کا بھی ارادہ کیا تھا۔ اس کے لیے جگہ کا بھی انتخاب کر لیا تھا اور آلات رصدیہ کی فراہمی بھی شروع کر دی تھی (۲۲) مگر موت نے فرصت نہ دی۔ ایک شام جب وہ ستارہ زہرہ کے طلوع کا منتظر تھا، زینے سے گرا اور وفات پائی۔

اس کے عہد کے ایک عالم ملّا محمد فاضل سکیتی نے مختلف عقلی و نقلی علوم کا ایک مخزن العلوم مدوّن کر کے اس کے نام معنون کیا۔ (۲۳) اس کا ایک اہم جزء ہیئت بھی ہے (۲۴) ایک دوسرے عالم مصلح الدین لاری نے ہیئت کے مشہور رسالہ "قوشجیہ" کی شرح لکھ کر بادشاہ کے

نام معنون کی۔ اسی لیے اس شرح کا نام "ھمایوں نامہ" ہے۔ ٢٥

ہمایوں کے بیٹے اکبر نے جب دینِ الٰہی جاری کیا تو علوم دینیہ کے علی الرغم علوم حکمیہ بالخصوص حساب و نجوم پر خصوصی زور دیا۔ بقول مصنف "دبستان المذاھب"

حکم شد کہ الٰہییں از علوم غیر نجوم و حساب و طب و فلسفہ
نخوانند و عمر گرامی صرف آنچہ معقول نیست صرف نکنند" (٢٦)

ابوالفضل نے "آئینِ اکبری" کا معتد بہ حصہ علم ہیئت کے لیے وقف کیا ہے ٢٧۔ اس نے امیر فتح اللہ شیرازی کی زیر نگرانی زیج الغ بیگ کا سنسکرت میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ ٢٨

مگر علوم ریاضیہ کے تعلیم و تعلم کا باقاعدہ سلسلہ شاہ جہاں کے عہد سے شروع ہوا۔ اس کے زمانے کے مشہور ماہران ریاضی و ہیئت ملّا فرید منجم، ملّا طیب، ملّا علاء الملک لونی اور ملّا محمود جونپوری تھے۔

ملّا فرید نے جو آخر عمر میں امیر فتح اللہ شیرازی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کر چکے تھے (٢٩) شاہ جہاں کی تخت نشینی کے دوسرے سال وزیر اعظم آصف خاں کی نگرانی میں اپنے بھائی ملّا طیب نیز اسلامی علم الہیئت اور ہند و جوتش کے دوسرے ماہرین کی مدد سے ایک زیج مرتب کر کے بادشاہ کے نام معنون کی (٣٠) اسی لیے اس کا نام "کارنامۂ صاحبقرانی زیج شاہ جہانی" ہے۔ معاصر مورخ محمد صالح کنبو لکھتا ہے کہ اس زیج نے "زیج الغ بیگ" کو بھی گوشۂ گمنامی میں ڈھکیل دیا (٣١) مگر خود مصنف یعنی ملّا فرید کا کہنا ہے کہ چوں کہ نئی رصدگاہ قایم کرنے کا وقت نہیں تھا اسی لیے میں نے "زیج الغ بیگ" ہی کی جداول پر نظر ثانی کی ہے (٣٢) محمد صالح کنبو یہ بھی لکھتا ہے کہ بادشاہ شاہ جہاں نے ہندو عوام کے فائدے کے لیے اس کا ہندی (یعنی سنسکرت) میں بھی ترجمہ کرایا تھا (٣٣) ملّا فرید زیج شاہ جہانی مرتب کرنے سے کوئی پچیس سال قبل ہیئت کا ایک اہم شاہکار "سراج الاستخراج" لکھ کر والی گجرات عبدالرحیم خانخاناں کے نام معنون کر چکے تھے (٣٤) (١٠٠٦ھ)

ملّا محمود جونپوری کا "شمس بازغہ" ہندوستان کی فلسفیانہ عبقریت کا شاہکار ہے مگر انہیں ریاضیات و ہیئت میں بھی تبحر و تمہر حاصل تھا۔ انہوں نے بادشاہ شاہ جہاں کے حضور میں رصدگاہ قایم کرنے کا منصوبہ پیش کیا تھا مگر وزیر نے اس کی تکمیل میں روڑا اٹکا دیا کہ اس کے لیے خزانے میں رقم نہیں ہے (٣٥) کیوں کہ بلخ کی مہم در پیش ہے۔

لیکن جس فاضل سے ریاضی و ہیئت کی تعلیم کا سلسلۂ جاریہ شروع ہوا، وہ نو وارد ایرانی فاضل ملّا مرشد شیرازی تھے۔ انہوں نے ان علوم کی تعلیم اپنے وطن میں ملا روزبہان شیرازی سے حاصل کی تھی (٣٦) بعد میں وہ ہندوستان آئے جہاں شاہ جہاں کی مردم شناس نگاہوں نے اُن کے جوہر ذاتی کا اندازہ لگا کر ایک کے بعد دوسرے ذمہ داری کے منصب پر انہیں ترقی دی۔ مگر ان سرکاری خدمات کی انجام دہی کے باوجود انہوں نے تعلیم کا مشغلہ جاری رکھا اور بہت سے شاگردوں نے ان سے کسب کمال کیا۔ ان میں سب سے اہم ان کے دوست استاد احمد معمار کے خلف الرشید عطاء اللہ رشدی تھے (٣٧) ان سے ان کے برادر اصغر لطف اللہ مہندس نے علوم ریاضیہ کی تعلیم حاصل کی (٣٨) ان سے ان کے صاحب زادے امام الدین ریاضی نے (٣٩) اور اس طرح کئی پشت تک اس خاندان میں ریاضی و ہیئت کی گرم بازاری رہی

عطاء اللہ رشدی نے حساب میں خلاصۂ راز لکھا اور بھاسکر آچاریہ کی "بیج گڑت" کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ دوسرے بھائی لطف اللہ نے بھی حساب میں کئی کتابیں لکھیں جن میں سب سے اہم "خواص الاعداد" ہے۔ انہوں نے اپنے پدر بزرگوار کی ایما سے مشہور مسلمان ہیئت داں عبدالرحمٰن الصوفی کی کتاب "صور الکواکب" کا فارسی میں ترجمہ کیا (٤٠) تیسرے بھائی شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی صوفی صافی مشرب کی حیثیت سے مشہور ہیں، ان کی "عشرۂ کاملہ" اپنے موضوع پر خصوصی اہمیت کی حامل ہے، مگر دوسرے بھائیوں کی طرح انہیں بھی علم الہیئت میں دستگاہ عالی حاصل تھی۔ چنانچہ "سبع شداد" پر جو اس فن کی عمدہ تصنیف ہے، ان کے حواشی چھپے ہیں (٤١)

امام الدین ریاضی نے مختلف علوم و فنون میں کتابیں لکھیں (٤٢) لیکن سب سے زیادہ قبول عام ان کی کتاب "التصریح" کو حاصل ہوا جو بہاء الدین عاملی کے "تشریح الافلاک" کی شرح ہے اور آج کے دن تک ہیئت کے نصاب میں مقرر ہے۔ حالاں کہ ان سے کوئی سترہ سال پہلے ایک اور فاضل عصمت اللہ سہارن پوری باب تشریح الافلا

کے نام سے اس کی شرح لکھ چکے تھے[٤٣] مگر قبول عام "التصریح" ہی کو نصیب ہوا۔ عصمۃ اللہ نے بطلیموس کی "المجسطی" کی بھی شرح لکھی ہے (٤٤)۔

مرزا خیر اللہ امام الدین ریاضی کے چھوٹے بھائی تھے۔ انہوں نے حسب تصریح مصنف "سیر المتاخرین" مولانا محمد عابد دہلوی کے ساتھ راجہ جے سنگھ کی نگرانی میں دہلی کی مشہور رصدگاہ کو قایم کیا جو آج کل جنتر منتر کہلاتی ہے۔ پھر اس کی دریافتوں کو ایک زیج میں مدون کر کے[٤٥] بادشاہ محمد شاہ کے نام معنون کیا۔ اس لیے اس کا نام "زیج محمد شاہی" ہے۔ اس کی تائید مرزا سنگین بیگ کی "سیر المنازل" سے بھی ہوتی ہے جو سر سید کی "آثار الصنادید" سے کوئی بیس پچیس سال پہلے تصنیف ہوئی تھی۔ سنگین بیگ نے لکھا ہے کہ جب دربار کے منجم مبشر خان کی پیشین گوئیاں غلط ثابت ہونے لگیں اور ان سے بازپرس کی گئی تو اس نے کہا نجومی پیشین گوئی (Astrological Predictions) کے لیے کسی زیج پر اعتماد کرنا پڑتا ہے۔ میرا اعتماد "زیج الغ بیگ" پر تھا مگر اسے مرتب ہوئے تین سو سال ہو چکے ہیں اور وہ ناکارہ ہو گئی ہے۔ کیوں کہ اجرام سماوی کی اوضاع و حرکات الغ بیگ کے زمانے کے مقابلے میں بہت زیادہ بدل گئی ہیں۔ اس کا تدارک صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ بادشاہ سلامت راجہ جے سنگھ کو لکھیں کہ وہ مرزا خیر اللہ مہندس سے (جو اس وقت راجہ کی سرکار میں ملازم تھے) ایک نئی زیج مرتب کرا لے (٤٦)۔ دوسری وجہ خود راجہ نے "زیج محمد شاہی" کے دیباچے میں لکھی ہے کہ جب میں نے دیکھا کہ مختلف مظاہر فلکی (جیسے سورج گرہن، چاند گرہن یا دوسرے ستاروں کے اتصالات و نظرات) کا وقت جو الغ بیگ کی زیج یا دوسری زیجوں کی مدد سے محسوب کیا جاتا ہے، وہ اُن کے واقعی اور مرصودہ اوقات سے مختلف ہوتا ہے اور یہ بات مذہبی اور غیر مذہبی فرائض کی انجام دہی میں "مخل" ہوتی ہے تو میں نے اس کی شکایت بادشاہ سے کی۔ انہوں نے مجھے حکم دیا کہ دوسرے ماہرین فن کی مدد سے ایک نئی رصدگاہ قایم کروں۔ اس حکم کی تعمیل میں میں نے یہ رصدگاہ قایم کی (٤٧)۔

تعمیر کی وجہ جو بھی رہی ہو، مشکل یہ تھی کہ اس کے لیے اس ملک میں کوئی نمونہ نہ تھا کہ ہندوستان سے باہر بھی کوئی نمونہ نہ تھا۔ اس لیے ان کتابوں کی مدد سے جو مسلمان ہیئت دانوں نے آلات رصدیہ (Astronomical Instruments) کی تیاری پر لکھی تھیں، فنا آلات جیسے ذات الحلق، ذات الشعبتین، ذات الثقبتین، شاملہ، سدس فخری وغیرہ تیار کرائے۔ مگر یہ آلات جو پیتل کے تھے، کثرتِ استعمال سے خراب ہو جاتے تھے۔ اس لیے پتھر اور چونے سے آلات تیار کرائے۔ (Masonry Instruments) ان میں تین آلے جن کا راجہ نے ہندی نام رکھا، زیادہ مشہور ہیں۔ سمراٹ جنتر، جے پرکاش، رام جنتر۔ یہ آلے بہت مفید ثابت ہوئے (٤٨)۔ ان کی مدد سے مختلف کواکب کی حرکات کی تحقیق کی گئی۔ ان دریافتوں کی مزید جانچ کے لیے چار اور شہروں یعنی جے پور، بنارس، اجین اور متھرا میں بھی اسی قسم کی رصدگاہیں قایم کی گئیں (٤٩) اور پھر ان دریافتوں کو ایک زیج میں مدون کیا گیا۔ یہی زیج محمد شاہی ہے (٥٠)۔

بہر حال یہ رصدگاہ ہندوستان کی تاریخ میں انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ کیوں کہ خود راجہ نے اس زیج کے دیباچے میں لکھا ہے کہ عرصۂ دراز سے اس ملک میں کوئی رصدگاہ قایم نہیں ہوئی (٥١) اور جارج ابیٹی تو یہاں تک کہتا ہے کہ اس ملک میں کوئی رصدگاہ کبھی تھی ہی نہیں[٥٢] جی۔ آر۔ کے بھی جسے گورنمنٹ آف انڈیا نے ١٩١٨ء میں اس رصدگاہ "جنتر منتر" کی تحقیق کے لیے بلایا تھا، کہتا ہے کہ ہندوؤں نے کوئی رصدگاہ کبھی بنائی ہی نہیں[٥٣] رہے مسلمان تو اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ علاء الدین کے عہد کے منجم رصدگاہ قایم کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے، مگر عملاً کوئی رصدگاہ بنی نہیں۔ ٨١٠ھ میں فیروز شاہ بہمنی نے بالاگھاٹ پر رصدگاہ بنوانا شروع کی تھی، مگر حکیم حسن گیلانی کی موت کی وجہ سے، جسے یہ خدمت سپرد کی گئی تھی، رصدگاہ مکمل نہ ہو سکی۔ ہمایوں نے رصدگاہ بنانے کا ارادہ کیا تھا، جگہ کا انتخاب کر لیا تھا، آلات رصدیہ بھی فراہم کرنا شروع کر دیے تھے، مگر موت نے اس منصوبے کو بروے کار لانے کی فرصت نہیں دی۔ اکبر کے زمانے میں حسب تصریح "منتخب التواریخ" امیر فتح اللہ شیرازی رصدگاہ قایم کر سکتے تھے[٥٤] مگر قایم نہیں کی۔ شاہجہاں کے عہد میں ملا محمود جون پوری نے رصدگاہ کے قیام کا منصوبہ بادشاہ کے سامنے پیش کیا مگر وزیر نے خزانۂ عامرہ میں ضروری رقم نہ ہونے کا عذر کر کے اسے مسترد کرا دیا۔ قسام ازل نے یہ شرف صرف محمد شاہ کے عہد ہی کے لیے مقرر کر رکھا تھا اور اس نے اس سنہ میں اس کی تعمیر

کے لیے حسب تصریح سبحۃ المرجان تیس لاکھ روپے دیے[۵۵] پھر جس طرح یہ اس ملک پہلی رصدگاہ تھی، اپنی نوعیت کی آخری رصدگاہ بھی تھی کیونکہ ہرچند اس کے بعد اس ملک میں متعدد رصدگاہیں قایم ہوئیں، مگر یہ سب یورپی رصدگاہوں کے انداز پر تعمیر کی گئیں۔

اس رصدگاہ کی ایک دوسری تاریخی خصوصیت یہ ہے کہ اسلامی علم الهیئت کی تاریخ میں خلیفہ المامون (۸۱۳ - ۸۳۳ء) کے زمانے سے الغ بیگ (وفات ۱۴۵۰ء) کے زمانے تک جتنی رصدگاہیں قایم ہوئیں صفحۂ دہر سے ایسی نابود ہوئیں کہ آج ان میں سے اکثر کی جائے وقوع کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ اگر بادِ حوادث کے تھپیڑے کھا کھا کر بھی کوئی رصدگاہ زندہ رہ سکی ہے تو وہ یہی رصدگاہ محمد شاہی یا جنتر منتر ہے۔

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
باقی ہے لیکن اب تک نام ونشاں ہمارا

اس کی فنی خصوصیت یہ ہے کہ مشرق میں یہ پہلی رصدگاہ ہے جہاں (Telescope) کا استعمال کیا گیا اور اس کی مدد سے گلیلو کی دریافتوں کی تصدیق کی گئی کہ عطارد و زھرہ بھی سورج کی روشنی سے زمین کی طرح روشن ہیں، مشتری کے گرد چار چاند (یا Satellites) چکر لگاتے ہیں جیسے ماہتاب زمین کے گرد چکر لگاتا ہے، سورج کی سطح پر داغ ہیں، نیز زحل کی شکل کروی نہیں ہے بلکہ اہلیلجی (Ellipsoidal) ہے[۵۶] دوسری فنی خصوصیت یہ ہے کہ زیج محمد شاہی اسلامی مشرق کی پہلی زیج ہے جس پر کیپلر (Kepler) کا اثر نمایاں ہے۔ اس سے پہلے اسلامی ہیئت کا بنیادی اصول یہ تھا کہ تمام اجرام سماوی متشابہ حرکت دوری (Uniform circular motion) کے ساتھ حرکت کرتے ہیں۔ اس رصدگاہ کے کارکنوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ ان کے مدار (Orbits) بیضی (ELLIPTIC) ہیں۔

اس سلسلے کا اختتام مولانا غلام حسین جون پوری کی 'جامع بہادر خانی' پر ہوا (۱۸۳۵ء) جو ریاضی اور ہیئت کا ایک ضخیم اور انتہائی اہم مخزن العلوم ہے[۵۷] کم از کم اتنا ہی اہم جتنا البیرونی کی کتاب "التفہیم لاوائل صناعۃ التنجیم" مگر البیرونی کا نبوغ قوم کے عہد عروج میں ہوا تھا۔ اور مولانا غلام حسین جون پوری، عہد زوال و اضمحلال میں پیدا ہوئے ان کی جگر کاوی کی داد کون دے۔

جامع بہادر خانی کی تصنیف کے کوئی پندرہ برس بعد مولانا غلام نے راجہ ٹکاری کے یہاں کے نیز نئے فراہم کردہ آلات رصدیہ کی مدد سے آزادانہ تحقیقات کیں اور انہیں ایک نئی زیج میں مدون کرکے راجہ بہادر خا کے نام معنون کیا اور اسی لیے یہ 'زیج بہادر خانی' کہلاتی ہے اور جسے اِس ہند کی آخری زیج سمجھنا چاہیے۔

(۴) اِسلامی علم الهیئت کی موجودہ صورت حال

مغل حکومت کے آخری زمانے میں اعلیٰ تعلیم کا مرکز پورب (اود اور بہار) میں منتقل ہوگیا، جہاں ریاضی و ہیئت جیسے علوم قطعیہ (EXACT SCIENCES) کے علی الرغم "معقولات" (فلسفہ وکلام) ساتھ مزید شدت سے اہتمام برتا گیا۔ لہٰذا ریاضی و ہیئت کے ع شاہکاروں کے مطالعے پر جو زور دیا جاتا تھا، وہ کمزور پڑتا گیا۔ اس سے زیادہ مصیبت عظمیٰ لے کر نام نہاد "غدر" آیا۔ جس کی کے نتیجے میں مغل اقتدار کو برطانوی ملوکیت کے لیے جگہ خالی کرنا پڑی آقاؤں کو محکوموں کے ثقافتی ماضی سے کوئی دلچسپی نہ تھی، وہ تو اس کو بھی ان کے ذہن سے نسیاً منسیا کر دینا چاہتے تھے۔ لہٰذا بہی خوا ملت نے جو قدیم ثقافتی ورثہ کی بقا و تحفظ چاہتے تھے، بغوا مالا یدرک کلہ لایترک کلہ علوم متداولہ میں سے علوم کے باقی رکھنے پر ہی زور دیا۔ رہے علوم حکمیہ، بالخصوص ریاضی و تو اُن کے ساتھ بے اعتنائی بڑھنے لگی۔ یہاں تک کہ آخر میں ہیئت اندر دو کتابیں رہ گئیں۔ تصریح اور شرح چغمنی۔ موخر الذکر نص نصاب میں ضرور مشمول ہے، مگر عملاً اس کی تعلیم شاید ہی ہوتی ہو مقدم الذکر یعنی التصریح فی الهیئت' تو اس کی تعلیم امتحانی ضرور رہین منت ہے، کیوں کہ یہ اتر پردیش کے امتحان عالم کے نص میں داخل ہے[۵۸]

لیکن اس مایوسی کی تاریکی میں امید کی کرن ایک غیر متوقع سے نمودار ہوئی۔ یہ ایک عالم دین کا حلقہ تھا، جنہوں نے افتاء او عقائد کا فریضہ اپنے ذمے لے لیا تھا۔ مگر اس مشغولیت کے باو نے محقق طوسی کی "زیج ایلخانی" پر جو بعد تاتاری تاریخ اِس

اہم ترین زیچ ہے، تعلیقات لکھیں، اس میں انہوں نے نظام الدین نیشاپوری کی اس زیچ کی شرح سے استفادہ کیا ہے۔(۶۰) باینہمہ اس میں بہت سے افادات ایسے بھی ہیں جو نظام اعرج تو درکنار ملا فرید منجم تک کے زمانے میں نہیں تھے۔[۶۱] انہوں نے "زیچ بہادر خانی" پر بھی جو اس ملک کی آخری اہم زیچ ہے، تعلیقات لکھی ہیں(۶۲)

مگر ریاضی وہیئت مدارس میں جس زبوں حالی کا شکار ہوئے تھے، یونیورسٹیوں نے اس کا تدارک کر دیا:

سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد مرحوم کے ایما سے اس وقت کے شعبۂ ریاضیات کے ایک استاد محمد فاروق (پدر بزرگوار مجنوں گورکھپوری) نے "قانون مسعودی" کے ایک باب کو بطور نمونہ ایڈٹ کر کے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا[۶۳]

سر شاہ سلیمان کے ایما سے مولانا یعقوب بخش راغب بدایونی اور مولانا سید محمد المہدی جعفری جون پوری نے "قانون مسعودی" کا اردو میں ترجمہ کیا[۶۴] راغب صاحب مرحوم نے رسائل متوسطات میں سے حکیم ابستلاؤس کی کتاب المطالع "کا بھی اردو میں ترجمہ کیا تھا۔

ڈاکٹر اے۔ رحمٰن اور ان کے رفقاء نے جن میں ڈاکٹر ایم۔ اے علوی اور مسٹر شمشاد احمد خاں غوری خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، Science and Technology in Medieval India کے عنوان سے ان علوم کی ایک اہم Bibliography تیار کی[۶۵]

پروفیسر عرفان حبیب کے زیر نگرانی اور انڈین کونسل فار ہسٹوریکل ریسرچ کی زیر سرپرستی، راقم السطور نے Astronomy in the Islamic East from Al Beruni to Raja Jai Singh کے منصوبے پر ریسرچ کی۔

لکھنؤ میں پروفیسر وزیر حسن عابدی "شمس بازغہ" کے طبیعیاتی اور ہیئتی افادات پر ریسرچ کرا رہے ہیں۔

کلکتہ میں پروفیسر محمد صابر خاں مسلم علم الھیئۃ پر سنسکرت کتابوں کے اثرات پر تحقیقات کر رہے ہیں۔

اس جائزے کو ختم کرنے سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد کا ذکر ضروری ہے جنھیں بچپن ہی سے "قانون مسعودی" کے ساتھ عشق تھا اور انھیں کے ایما سے یہ کتاب شائع ہو کر منظر عام پر آسکی(۶۶)، اس کے ساتھ دائرۃ المعارف حیدر آباد کی خدمات جلیلہ بھی اہل فن کے شکریہ کی مستحق ہیں جن کی سعی مشکور سے اسلامی ریاضی وہیئت کے بہت سے نوادر شائع ہو کر اہل علم کی دسترس میں آگئے ہیں[۶۷]

فجزاھم اللہ عنا خیر الجزاء

تعلیقات و مراجع

۱- یاقوت: معجم الادباء، جلد ۱۷ صفحہ ۱۸۶
۲- ابوریحان البیرونی: تحقیق ما للھند من مقولۃ مقبولۃ فی العقل او مرذولۃ (مشہور بکتاب الھند) ص ۲۷۰
۳- ابوریحان البیرونی: القانون المسعودی، ج ۲ ص ۵۳۰
۴- مسعود سعد سلمان: دیوان (تہران ۱۳۳۹ خورشیدی) ص ۴۰۴
۵- ایضاً ص ۲۳۲ — ۲۳۳
۶ Storey: Persian Literature Vol. II Part I. P. 52
۷ "
۸ امیر خسرو: قران السعدین ص ۱۲۵
۹ ضیاء الدین برنی: تاریخ فیروز شاہی ص ۳۶۳
۱۰ فرشتہ (ملا محمد قاسم ہندو شاہ): گلشن ابراہیمی (مشہور بتاریخ فرشتہ) جلد اول۔ ص۔ ۲۶۳
۱۱ سیرۃ فیروز شاہی (مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ۔ یونیورسٹی کلکشن فارسیہ اخبار ۱۷۱) ص ۲۹۵
۱۲- G.R. Kaye: Astronomical Observatories of Jai Singh. P. 3
۱۳- فرشتہ: تاریخ فرشتہ ج اول ص ۳۰۸
۱۴- " " " ص ۳۱۲
۱۵- Catalogue of the Persian .... Manuscripts in Bodleian Library. P. 926. MS No 1522

۱۶- ظہیر الدین بابر: بابر نامہ - ص ۲۱۴

۱۷- ابوالفضل: اکبرنامہ ج اول ص ۱۲۱

۱۸- " " " ص ۳۶۸

۱۹- بایزید بیات: تذکرہ ہمایوں و اکبر ص ۶۷

۲۰- ابوالفضل: اکبرنامہ ج اول ص ۸۲

۲۱- میرخواند: قانون ہمایونی: ص ۶۸ و ۱۱۰

۲۲- ابوالفضل: اکبرنامہ ج اول ص ۳۶۸

۲۳- محمد فاضل بن علی بن محمد المسکینی السمرقندی: جواہر العلوم ہمایونی مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ - فارسیہ علوم نمبر ۸۷ ص اب - ۱۲ الف -

۲۴- ایضاً: مقالہ (سوم. قسم دوم. باب چہارم در علم ہیئت) از ورق ۶۸۰ ب تا ورق ۶۸۸ الف

۲۵- مصلح الدین لاری: ہمایوں نامہ (جو ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم کے ہمایوں نامہ گلبدن بیگم کے علاوہ ہیئت کی کتاب ہے۔ مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ - سبحان اللہ کلکشن نمبر ۵۲۰/۱۲ ورق اب تا ۲ الف۔

۲۶- دبستان المذاہب (مصنف مختلف فیہ، عام طور پر ملا محسن فانی مشہور ہے) ص ۳۲۸ -

۲۷- ابوالفضل: آئین اکبری جلد سوم ص ۸ و مابعد- ابتداً "گزارش سفلی و علوی" دوسرے اہم مباحث: ترتیب کرات ص ۱۰، اندازہ مدارات ص ۱۲ منازل قمر ص ۱۲، بخش کردن زمین بکشورہا اور جغرافیائی گزیٹر بعنوان جدول طول و عرض بلاد از صفحہ ۲۸ تا صفحہ ۵۵ جلد دوم میں بعض ہیئتی مباحث ہیں جیسے آئین الٰہی تاریخ ص ۲۱، جدول زیجہا ص ۲۱۱، تواریخ ص ۲۱۷ تا ۲۲۳

۲۸- ایضاً: ص ۸۲

۲۹- عبدالباقی نہاوندی: مآثر رحیمی جلد سوم ص ۹

۳۰- محمد صالح کنبو: عمل صالح جلد اول ص ۳۲۱

۳۱- ایضاً ص ۳۶۲

۳۲- ملا فرید منجم: زیج شاہجہانی (مخطوطہ برٹش میوزیم لائبریری نمبر Or 372 ورق ۴-ب

۳۳- محمد صالح کنبو: عمل صالح جلد اول ص ۳۶۱

۳۴- ملا فرید منجم: سراج الاستخراج (مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری فارسی نمبر 2225/ جس کا زیروکس مولانا آزاد لائبریری میں ہے نمبر 378

۳۵- غلام علی آزاد بلگرامی: مآثر الکرام ص ۳۰۰ -

۳۶- امام الدین ریاضی: تذکرہ باغستان (واحد اور مصنف کا خود نوشت مخطوطہ لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری) ورق ۶۸۱ الف

۳۷- ایضاً. ورق ۶۸۱ الف

۳۸- لطف اللہ مہندس: منتخب خلاصۃ الحساب (مولانا مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ - یونیورسٹی کلکشن فارسیہ علوم نمبر ۱۷) ورق ۴۲ الف

۳۹- امام الدین ریاضی: تذکرہ باغستان ورق ۶۸۱ الف

۴۰- لطف اللہ مہندس: صور الکواکب (مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ - یونیورسٹی کلکشن فارسیہ علوم نمبر ۳۱) ورق اب

۴۱- طباطبائی: السبع الشداد (مجتبائی پریس- دہلی) ص ۱۳ - حاشیہ ۴ و ۵

۴۲- امام الدین ریاضی: تذکرہ باغستان ورق ۶۸۳ ب

۴۳- عصمۃ اللہ سہارنپوری: باب تشریح الافلاک (مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ - یونیورسٹی کلکشن - عربیہ علوم نمبر ۹۱)

۴۴- Catalogue of the Arabic Manuscripts in the Buhar Library P.381. M.No.346

۴۵- غلام حسین: سیر المتاخرین جلد سوم ص ۸۴۸

۴۶- مرزا سنگین بیگ: سیر المنازل ص ۱۱۷

۴۷- زیج محمد شاہی (مصنف مختلف فیہ، دیباچے سے تو راجہ جے سنگھ سوائی معلوم ہوتا ہے، لیکن بخیال اغلب مرزا خیر اللہ کی تصنیف ہے۔ مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ - یونیورسٹی کلکشن فارسیہ علوم نمبر ۳۰ - ورق ۲ الف -

۴۔ زیج محمد شاہی (مصنف مختلف فیہ، دیباچے سے تو راجہ جے سنگھ سوائی معلوم ہوتا ہے لیکن بخیال اغلب مرزا خیر اللہ کی تصنیف ہے۔ مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ۔ یونیورسٹی کلکشن فارسیہ علوم ۳۰/۲ ورق ۲ الف

۴۔ ایضاً : ورق ۲ الف۔

۵ ″ ورق ۲ ب۔

۱ ″ ورق ۲ ب۔

"ومدت مدید شدہ کہ از راجہائے ذوی الاقتدار کسے پیرامون آن مگردیدہ .... ودر فرقہ اہل اسلام ہم ..... ہیچ کسے از سلاطین ذی شان وصاحب قردتان..... باین کار متوجہ نشدہ"

۵ Gorgeo Abetti : History of Astronomy, P. 28.

"Among the ruins of the cities of Hindustan, no trace of observatories are found as in Babylonia. The Science of the Hindus, then must have been purely inspiration and imagination."

۵۱ G. R. Kaye : Astronomical Observatories of Jai Singh P. 48.

" They (the Hindus) built observatories and they made no systematic records of observatories."

۵۱۔ عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، جلد سوم ص ۱۵۴

۵۱۔ غلام علی آزاد بلگرامی؛ سبحۃ المرجان ص ۱۳۴ – ۱۳۵

۵۔ زیج محمد شاہی : ورق ۸۲ الف

۵۔ ″ ورق ۴۶ الف

۵ "اول باید دانست کہ مدار خارج المرکز آفتاب از رصد کردن بشکل بیضی معلوم شدہ۔"

نیز جامع بہادر خانی ص ۵۷۹۔

"و مرزا خیر اللہ مہندس در شرح زیج محمد شاہی دعویٰ فرمودہ است کہ ما مدار خارج المرکز شمس بلکہ مدارات جمیع حوامل را بر شکل بیضوی یافتہ ایم۔"

۵۸ غلام حسین جون پوری : جامع بہادر خانی (کلکتہ ۱۸۳۵ء)

یہ ضخیم کتاب جس میں ۷۱۲ صفحات ہیں، چھ حصوں پر مشتمل ہے، بتفصیل ذیل

خزینہ اول : درعلم ہندسہ۔ ص ۶- ۱۵۶

خزینہ دوم : درعلم الابصار۔ ص ۱۵۷- ۱۹۸

خزینہ سوم : درعلم حساب ص ۱۹۹ - ۳۳۳

خزینہ چہارم : درمنتخبات فنون ثلثہ ص ۳۳۳- ۴۵۲

خزینہ پنجم : درعلم ہیئت ص ۴۵۲- ۶۸۸

خزینہ ششم : درتبیین مو امرات زیج و تقویم ص ۶۸۹-۷۱۴

۵۹ - قواعد امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش ص ۱۴

۶۰ - تعلیقات علی الزیج الایلخانی کا واحد مصنف علیہ الرحمہ کا خود نوشت مخطوطہ ان کے اخلاف کے پاس ہے۔ اس کا زیروکس مولانا محمد احمد مصباحی نے راقم السطور کو ایڈٹ کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ مگر اس سے کہیں پہلے نظام الدین نیشاپوری نے "زیج ایلخانی" پر شرح لکھی تھی، وہ ہنوز مجھے نہیں مل سکی اور نہیں کہا جا سکتا کہ "تعلیقات علی الزیج الایلخانی" میں کتنا حصہ مصنف رحمہ اللہ کا ہے اور کتنا نیشاپوری کی شرح سے ماخوذ ہے۔ مگر فاضل مصنف (مولانا احمد رضا خاں قدس سرہ العزیز) کی دیانت داری قابل ذکر ہے کہ انہوں نے اپنی "تعلیقات" کے دیباچے میں نظام اعرج سے اکتساب وخوشہ چینی کا اعتراف کیا ہے۔

" ہذہ تعلیقات علی الزیج الایلخانی ..... اعترفتہا من الشرح المشہور والبحر المسجور لعلامۃ نیشاپور"

۶۱ - پچھلے ہیئت دانوں کا خیال تھا کہ ثوابت حرکت نہیں کرتے

سب سے پہلے "زیج محمد شاہی" میں اس کے علی الرغم کیا گیا کہ
نام نہاد ثوابت بھی حرکت کرتے ہیں اور مختلف ستاروں کی شرح
حرکت و گردش مختلف ہوتی ہے مگر اس کی مقدار نہیں بتاتی ۔
مولانائے بریلوی نے "الکلمۃ الملہمہ" میں بعض ستاروں کی شرح
رفتار بھی دی ہے ۔

"کوئی ۶۳ برس میں ایک درجہ طے کرتا ہے جیسے
عرقوب الرامی ...... کوئی ۶۵ میں جیسے رکبۃ الرامی
کوئی ۶۶ میں جیسے سہیل یمانی ...... کوئی، میں
جیسے نیر الفلک" (ص ۹)

حضرت مولانا کا ماخذ کیا تھا، اس کی ہنوز تحقیق نہیں ہو سکی ممکن
ہے "زیج بہادر خانی" ہو، مگر اس کی زیارت نہیں ہو سکی ۔

۶۲۔ "زیج بہادر خانی" پر مولانا احمد رضا خاں قدس سرہ العزیز
نے جو تعلیقات لکھی تھیں، خوش قسمتی سے اس کا واحد نسخہ ان کے
اخلاف کے پاس ہے ۔ مکرمی مولانا محمد احمد مصباحی نے اس کا
زیروکس بھی اس عاجز کے مطالعے کے لیے بھیجا ہے ۔ فجزاہ اللہ
عنی خیر الجزاء ۔

۶۳۔ بدقسمتی سے اس ترجمے کے مطبوعہ نسخے کمیاب نہیں تو کم از کم
نایاب ہیں ۔ آج سے کوئی ستاون سال پہلے اس کی ایک
کاپی استاد مرحوم محمد عزیز صاحب نے اس عاجز کو مرحمت فرمائی
تھی، مگر وہ کہیں گم ہو گئی ۔ ایک اور نسخہ کسی طرح ایران سے
پہنچ گیا، جس کا پروفیسر حسین نصر نے حوالہ دیا ہے ۔ مو
آزاد لائبریری میں بھی اس کا کوئی نسخہ نہیں ملا ۔ و
یونیورسٹی کلکشن میں اس کے انگریزی ترجمے کی ایک
بوسیدہ ٹائپ شدہ نقل محفوظ ہے ۔ (اردو مخطو
نمبر ۷۵)

۶۴۔ یہ تراجم اپنے مترجمین کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مو
آزاد لائبریری کے شعبۂ مخطوطات میں محفوظ ہیں (یونی
کلکشن ۔ اردو مخطوطات نمبر ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲،
۷۴)

۶۵۔ اس ببلیوگرافی کو انڈین نیشنل اکیڈمی دہلی نے ۲
میں

Science and Technology in Medieval India (A Bibliography Source material)

کے عنوان سے شائع کر دیا ہے ۔

۶۶ چنانچہ ناشرین نے قانون مسعودی (مطبوعہ) کے سرورق پر اس کا اعتراف

۶۷ *Catalogue of the Arabic Publications of the Dairat'l Ma'arif'l-Osmania* pp. 41-44
۱۹۷۲ء میں اس ادارے نے ریاضی و ہیئت کی کوئی بارہ کتابیں شائع کی تھیں
البیرونی کی القانون المسعودی، عبد الرحمٰن الصوفی کی صور الکواکب،
ابن الہیثم، البیرونی، طوسی وغیرہم کے رسائل کے مجموعے ۔

"ہمیں چاہیے کہ اپنے بچوں کو ایسی تربیت دیں کہ ان کا ردعمل جذباتی ہونے کے بجائے
عقلی، ان کی گفتگو پرجوش ہونے کے بجائے مدلل ہو ۔ وہ سادہ دلی سے ہر بات کو
باور کرنے کی جگہ تحقیق کے خوگر ہو جائیں، ہر بات، ہر افواہ، ہر دعویٰ کو پہلے
عقل کی کسوٹی پر پرکھیں ۔ پھر اس پر یقین کریں ۔"

(سید حامد)

انسانی جسم میں نظامِ تنفس

کے ـ ایس صدیقی

زندگی کے لیے آکسیجن نہایت ضروری ہے۔ یہ آکسیجن سانس کی شکل میں جسم میں داخل ہوتی ہے۔ یہ سمجھنے کے لیے کہ جسم میں داخل ہو کر آکسیجن کس طرح نظامِ تنفس کو برقرار رکھتی ہے۔ ہیموگلوبین کی ساخت کا جاننا ضروری ہے ـ ———— ہیموگلوبین کا اہم جز لوہا ہے جو Fe(II) کی شکل میں ہوتا ہے مگر یہی لوہا جب Fe(III) کی شکل میں ہوتا ہے تو آکسیجن کو ملحق کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ ہیموگلوبین کا لوہا بذاتِ خود آکسیجن اور پانی دونوں کی موجودگی میں بھی آکسیجن لے جانے میں ناکام رہتا ہے۔ کیونکہ پانی لوہے کو مزید آکسی ڈائز (Oxidise) کر دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے یہی لوہا آکسیجن کو ملحق کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے۔

حیاتیاتی نظام کے لیے ایسی نازک صورتِ حال بہت مہلک ہوتی ہے۔ بہرحال عام حالات میں شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے۔ ہیموگلوبین کے گرد جھلی نما پروٹین لپٹی ہوتی ہے۔ جو پانی کے داخلے کو روکتی ہے۔ لیکن یہ آکسیجن کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کرتی۔ ان حالات میں آکسیجن ہیموگلوبین کے لوہے سے ملحق ہو جاتی ہے اور خلیوں میں ترسیل کے لیے چلی جاتی ہے ——

ہیموگلوبین میں جھلی کے ذریعے پانی نہ جا سکنے کا مظاہرہ ایک مصنوعی تجربے کے ذریعے بھی کیا گیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جھلی ہیموگلوبین کو پانی سے تو محفوظ رکھتی ہے مگر آکسیجن کو نہیں روکتی۔ کیوں کہ یہ گیس ہونے کے ناتے چھن چھن کر ہیموگلوبین تک پہنچتی رہتی ہے۔ بہرحال اس تجربے سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ پانی کی موجودگی میں بھی یہ مصنوعی ہیموگلوبین آکسیجن سے مربوط ہو جاتا ہے اور اسے جسم کے مختلف حصوں میں پہنچاتا ہے۔ جب کہ حیاتیاتی نظام میں اس طرح کی صورتِ حال مہلک ہوتی ہے۔ اس طرح کا مظاہرہ اور دوسرے تجربے سے بھی کیا گیا ہے جو پانی کے داخلے میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں اور بغیر کسی تبدیلی کے قابلِ تبادلہ آکسیجن کے لینے اور چھوڑنے کے عمل کو ظاہر کرتے ہیں۔ اگر ہم مندرجہ اہم نکات کو پیشِ نظر رکھیں تو آکسیجن کی ترسیل کا نظام اس مصنوعی ماڈل سے بخوبی سمجھ میں آ سکتا ہے۔

۱۔ یہ پانی کے داخلے کو روکتا ہے جس کی وجہ سے (Fe(II) → Fe(III) میں تبدیل نہیں ہو پاتا۔

۲۔ قدرتی طور پر ہیموگلوبین ایک دوسرے کے قریب نہیں آ پاتے ورنہ آکسیجن سے مل کر دونوں ایک مرکب بنا لیں گے جو جسم کے لیے بے کار ثابت ہوتا ہے۔

ہیموگلوبین عام طور پر چار چار کے گروپ میں ہوتے ہیں۔ یہ صرف اکیلا ہی آکسیجن کو نہیں لے جا سکتا۔ آکسیجن سے مربوط ہوتے وقت یہ چار کا گروپ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ جس میں سے دو تو ایک دوسرے

ل لوہے کے ایٹم کو سائنسی زبان میں Fe سے ظاہر کیا جاتا ہے (Fe(II) اور (Fe(III) لوہے کے ایٹم کی مختلف ذات ہیں۔

ڈاکٹر کے۔ ایس۔ صدیقی ڈپارٹمنٹ آف کیمسٹری اے۔ ایم۔ یو علی گڑھ

سے قریب ہوتے ہیں اور دو ایک دوسرے سے کافی دور ہوتے ہیں۔ ہیموگلوبن کی یہ تقسیم دو عناصر پر مبنی ہے مثلاً

۱۔ آکسیجن کا ارتکاز

۲۔ تیزابیت۔

قدرت نے ایسا نظام بنا رکھا ہے کہ ہیموگلوبن آکسیجن کو لے کر ان خلیوں کی طرف جاتا ہے، جہاں زیادہ سے زیادہ کام ہو رہا ہے۔ یعنی اس جگہ زیادہ سے زیادہ کاربن ڈائی آکسائڈ بن رہی ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس جگہ کی تیزابیت بھی بڑھ جاتی ہے۔ ہیموگلوبن پھیپھڑوں کے ذریعے آکسیجن لیتا ہے اور وہاں سے ان خلیوں کو پہنچاتا ہے جہاں کاربن ڈائی آکسائڈ کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ اسی طرح ہیموگلوبن آکسیجن کو خلیوں تک پہنچاتا ہے اور کاربن ڈائی آکسائڈ کو اپنے ساتھ پھیپھڑوں میں واپس لے آتا ہے جہاں سے ناک کے ذریعے کاربن ڈائی آکسائڈ باہر نکل جاتی ہے۔ دوبارہ پھر ہیموگلوبن آکسیجن سے ملحق ہو کر خلیوں میں واپس چلا جاتا ہے اور سانس لینے کا یہ سلسلہ تاحیات جاری رہتا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

بدگمانی سے بچو اس لیے کہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے اور تجسس نہ کرو، بہت زیادہ ٹوہ میں نہ پڑو۔ مقابلہ آرائی نہ کرو۔ ایک دوسرے سے حسد نہ کرو، ایک دوسرے سے نفرت نہ کرو، باہمی عداوت نہ کرو اور بن جاؤ اللہ کے بندے بھائی بھائی جس طرح اس نے حکم دیا ہے۔ ایک مسلم دوسرے مسلم کا بھائی ہے وہ اس پر ظلم نہ کرے اسے یک وتنہا نہ چھوڑے، اسے حقیر نہ سمجھے، ایک آدمی کے برا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ اپنے کسی مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔ ہر مسلمان کا مال، اس کا خون اور اس کی آبرو دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے جسموں کو نہیں دیکھے گا بلکہ تمہارے اعمال کو دیکھے گا۔ (سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) تقویٰ یہاں ہوتا ہے، تقویٰ یہاں ہوتا ہے، تقویٰ یہاں ہوتا ہے۔ آگاہ رہو تم میں سے کوئی کسی کے بیع پر بیع نہ کرے کہ اس کا نقصان ہو جائے اور ہو جاؤ اللہ کے بندے بھائی بھائی اور کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ قطع تعلق باقی رکھے۔

(مسلم)

اردو تحریر میں آوازوں کا اظہار

محمد انصار اللہ*

ہندوستان میں غیر ملکیوں کی آمد و رفت کا سلسلہ زمانۂ قدیم سے جاری ہے۔ اکثر غیر ملکیوں نے یہاں آکر اپنی سلطنتیں قایم کی ہیں اور اُن کے تسلط نے یہاں کی تہذیب، معاشرت، بول چال اور پھر تحریر کو بھی مختلف زمانوں میں مختلف انداز سے متاثر کیا ہے۔ یہاں کے تحریری یا تقریری کسی بھی سلسلے کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کوئی دعوا کرنا آسان نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس برصغیر کے بہترین آثار وہ ہیں جو بہترین انداز سے مخلوط ہیں۔ کسی ایک جز کو کل سے الگ کرکے، اُس کے بارے میں کوئی حکم لگانا بیجا ہے۔

پہلی صدی عیسوی کے آغاز میں شمالی ہند میں کشن خاندان کی سلطنت قایم ہو چکی تھی۔ اِس خاندان کا گل سرسبد کِنشک[1] ہوا جس نے ۷۸ء میں ایک نیا سنہ جاری کیا جسے سَک سنبت کہتے ہیں۔ کُنشک بُدھ مذہب کی اشاعت میں نہایت سرگرم تھا اور اُس نے اس مذہب کو منضبط[2] اور مستحکم کرنے میں پوری کوشش کی تھی۔ کُشَن خاندان کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ اصلاً ترک تھے[3]۔ اگر یہ صحیح ہے تو تسلیم کرنا چاہیے کہ یہاں کی زبان کے بعض لفظوں کو اُن ترکوں نے اپنے لب و لہجے کے مطابق ڈھال لیا تھا اور اُن کی زبان کے کچھ لفظ، بلکہ شاید بعض آوازیں بھی یہاں کی بول چال میں دخیل ہو گئی ہوں گی۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ترکستان کے علاقوں میں اسلام سے پہلے بدھ مذہب پوری طرح راسخ تھا۔ قدرتی طور پر بدھ مذہب سے متعلق خطے کا تقدس ترکوں کے ذہنوں میں رہا ہوگا اور وہ یہاں کی معاشرت اور زبان سے ایک حد تک مانوس بھی ہوں گے۔

زمانۂ مابعد میں جب مسلمان ترک ہندوستان میں آئے تو اُن کے لیے بدھ مذہب اور اُس کے خطے کی کچھ معاشرت اور زبان میں شعوری اور غیر شعوری طور پر کشش رہی ہوگی۔ انھوں نے اسی علاقے کی زبان کو ہندیہ[4]، ہندوی یا ہندکی[5] کے نام سے بول چال کے لیے اپنا لیا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اُس زمانے تک ترکی اور ہندوی دونوں نے باضابطہ تحریری زبان کا درجہ حاصل نہیں کیا تھا۔ مسلمانوں کی علمی اور تہذیبی زبان فارسی تھی اور پہلوی کے واسطے سے فارسی ہزوارش[6] الفاظ سے آشنا تھی۔ اس روایت نے فارسی میں ترکی اور ہندوی دونوں کے لفظوں کے قلم بند کیے جانے کی گنجایش اور صورت پیدا کردی۔ اِس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ فارسی خط میں موجود حرفوں کی مدد سے ہندوستان کی ایسی آوازیں بھی قلم بند کی جانے لگیں جن کے لیے براہمی اور دیوناگری خطوں میں کوئی شکل مقرر نہیں تھی۔

زبان ہندوی اصلاً ہندوستانی ہے۔ اس کا امکان ہے کہ زمانۂ ماقبل اِسلام ہی میں اِس زبان میں ترکی کی کوئی آواز داخل ہو گئی ہو لیکن غالب گمان یہ ہے کہ اس میں عربی کی مخصوص آوازیں شامل نہیں تھیں۔ البیرونی نے کتاب الہند[7] میں میلے ٹھیلے کے معنی میں لفظ "زاتر" لکھا ہے۔ فارسی خط میں 'ج' کا وجود قدیمی ہے اِس لیے البیرونی کا جاتر (جاترا - یاترا) نہ لکھنا معنی خیز ہے۔ زبانِ ہندوی سے قریب ترین مرہٹی زبان ہے اور اس زبان

* ڈاکٹر محمد انصار اللہ۔ ریڈر شعبۂ اردو۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

میں بھی جنترا لکھ کر " زنترا " بولتے ہیں۔ بعض مقامی لفظوں میں ' ج ' پر ' ز ' کی آواز کو ترجیح دینے کا چلن پورب کے خطے میں رہا ہے۔

میر علی اوسط رشک نے بیاج کو بیاز اور بیاجو کو بیازو لکھا ہے:

" بیاز۔ موحدہ مکسور باشباع تحتانی بالف و زائے
معجمہ کشیدہ، بروزن راز ...."

اسی صورتِ حال کا اثر یہ ہے کہ ہندوستان کے ناخواندہ باشندے انتہائی معصومیت سے اکثر جلیل کو ' زلیل ' بنا دیتے ہیں۔

اردو میں ٹھیٹھ ہندوستانی مفرد آوازیں تین ہیں۔ ٹ، ڈ، ڑ۔

یہ تینوں آوازیں دراوڑ خاندان کی چاروں بڑی زبانوں تمل، ملایالم، کنڑ اور تیلگو میں موجود ہیں۔ ان زبانوں کے عالموں کا دعوا ہے کہ یہ آوازیں سنسکرت نے انہی سے لی ہیں۔ دیوناگری خط میں ان کے اظہار کے لیے جو شکلیں مقرر ہیں وہ بھی مذکورہ دعوے کی موید معلوم ہوتی ہیں۔ اتنی بات میں تو شبہ نہیں کہ تیسری آواز یعنی ' ڑ ' اب تک بھی سنسکرت اور جدید ہندی میں غیر موجود ہے

ان زبانوں میں بنیادی شکل ट (ٹ) کی معلوم ہوتی ہے۔ اسی میں برائے نام سی تبدیلی کر کے باقی حروف بنا لیے گئے ہیں، اس طرح:

ठ (ٹھ)، ड (ڈ)، ढ (ڈھ)، ड़ (ڑ)، ढ़ (ڑھ)

حرف ٹ سے ہندی میں یہ پانچ حرف کب بنائے گئے، اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا، البتہ اتنا معلوم ہے کہ اٹھارھویں صدی عیسوی کے عشرۂ اول تک آخر الذکر دو حرف وجود میں نہیں آئے تھے۔

علمائے فارسی نے 'ٹ' کی آواز کے اظہار کے لیے ' ت ' کا استعمال کیا۔ البیرونی نے کوٹلا کو ' کوت ' لکھا ہے اور فارسی میں کوتوال (کوٹ + والا) کو زمانۂ قدیم سے کوتوال کہتے آئے ہیں۔

فردوسی بھی کہتا ہے کہ

برآمد براد کوتوالِ حصار

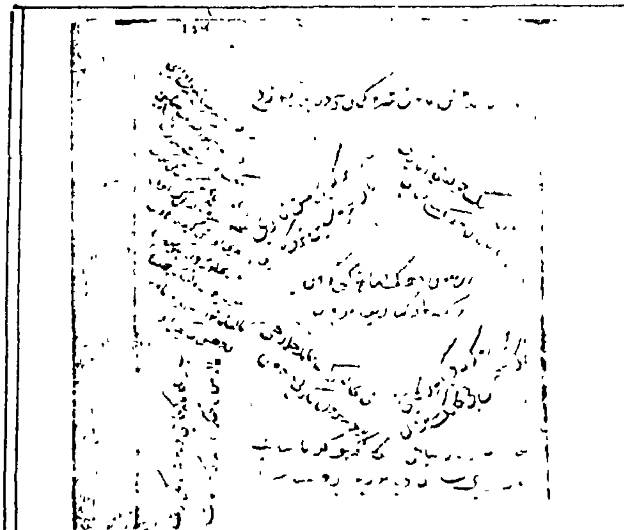
حرف ڈ کو انھوں نے دال کا بدل قرار دیا اور ڑ کے اظہار کے لیے ' ر ' کو کام میں لائے۔ البیرونی کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان دونوں آوازوں میں فرق کرتا تھا۔ کتاب الہند میں:

کندہ (گندہ۔ گینڈا)، دوم (ڈوم)، جندال (چنڈال)
ہادی (ہاڈی۔ ہڈی)

اور

توہر (ٹھوہڑ)، تاری (تاڑی)، کری (گھری۔ گھڑی)

وغیرہ الفاظ آئے ہیں۔ اس تفریق سے درجِ ذیل حقیقتیں سامنے آتی ہیں:



چنداین از مولانا داؤد کے نسخۂ منیر کا ایک ورق، مشمولۂ چنداین مرتبہ ڈاکٹر پرمیشوری لال گپت

۱۔ مسلمانوں نے جس زبان کو ہندی کے نام سے اپنایا تھا، اس میں ٹ، ڈ، ڑ کی آوازیں زمانۂ قدیم سے موجود تھیں۔

۲۔ وہ ان تینوں آوازوں میں فرق کرتے تھے اور

۳۔ ٹ کو ت سے، ڈ کو د سے اور ڑ کو ر سے قریب تر خیال کرتے تھے۔

جدید ہندی کے بدوانوں نے ان میں سے تیسری آواز کی شناخت کئی سو برس کے بعد کی اور اس کو لکھنے کے لیے انھوں نے ر کے بجائے ڈ (ड) کے نیچے ایک نقطہ بنانا شروع کیا۔ نقلوں کے واسطے حرفوں میں امتیاز پیدا کرنا فارسی خط کا فیض ہے۔ اپنے حروفِ اصلی

یعنی ت (थ)، د (ध)، ر (ढ) کو چھوڑ کر ایک نئی صورت یعنی ٹ (ठ) سے باقی حرف بنانا بھی اردو سے جدید ہندی کے مزاج کے اختلاف کا پتا دیتا ہے۔

عربی، فارسی میں کوئی ہائیہ آواز نہیں ہے۔ سنسکرت اور جدید ہندی میں کئی ہیں۔ لیکن اردو میں ان زبانوں کے برخلاف تمام ہائیہ آوازوں کے اظہار کا طریقہ موجود ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اردو لکھنے والوں کے سامنے ہائیہ آوازوں کے اظہار کا مسئلہ شروع سے تھا۔ انھوں نے اس کی صورت یہ نکالی کہ حرف اصلی کے ساتھ ہائے ہوز بھی لکھنے لگے۔ غالباً اٹھارھویں صدی عیسوی کے آغاز سے پہلے ہی تحریر میں بھی ان آوازوں کی جداگانہ حیثیت کو تسلیم کیا جا چکا تھا۔ مرزا روشن ضمیر نے اپنے رسالہ ضابطۂ ہندی (تالیف ۱۷۰۰-۱۷۰۹ء) میں کھ، گھ، جھ، چھ وغیرہ کو تحریر میں لانے کا ضابطہ بھی بیان کیا ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں گلکرسٹ اور سید احمد علی یکتا نے دستور الفصاحت کے دیباچے میں ان حرفوں کی الگ حیثیت کا ذکر کیا ہے۔ انیسویں صدی کے وسط میں غالباً یہ بات متعین ہو چکی تھی کہ ان حرفوں کو ہائے دوچشمی کے ساتھ لکھا جائے اور اس ہائے دوچشمی کو ہائے مخلوط تسلیم کر لیا گیا۔ شیخ محمد ابراہیم ذوق نے ایک شعر میں کلمہ ہائے کو ہائے دوچشمی کے ساتھ لکھنے پر شاعرانہ انداز سے اعتراض کیا ہے ؎

ہائے رے حسرتِ دیدار مری ہائے کو بھی
لکھتے ہیں ہائے دوچشمی سے کتابت والے

ہائے مخلوط کے ساتھ ہائیہ آوازوں کے لکھنے کے طریقے نے اردو کو بہت فائدہ پہنچایا۔ اب کوئی بھی ہائیہ آواز ایسی نہیں جو اردو خط میں لکھی نہ جا سکتی ہو، بلکہ اردو میں چھ ہائیہ آوازیں ایسی ہیں جو دیوناگری خط میں باضابطہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ یعنی:

نھ، لھ، مھ، نھ، وھ، یھ۔

دیوناگری خط میں ان آوازوں کے اظہار کی صورت یہ نکالی گئی کہ حرف اصلی کو نصف اور ہا کو مکمل لکھتے ہیں۔ لیکن اس صورت سے بھی تلفظ کا قطعیت اور صحت کے ساتھ اظہار نہیں ہوتا۔ دیوناگری خط میں کنھیا کو کن ہیا اور الھڑ کو ال ہڑ لکھا جاتا ہے۔

ہائیہ آوازوں کے معاملے میں بھی اردو اور ہندی کا مزاج مختلف ہے۔ دیوناگری خط میں حرف म (م) کا سر کھولنے سے (भ) (بھ) بنتا ہے اور پھر اس بھ کے سیدھی طرف دایرہ نما خط کا اضافہ کرنے سے झ (جھ) کی شکل حاصل ہوتی ہے۔ شکلوں کا یہ تعلق ان تینوں حرفوں کے مابین کسی نہ کسی نوعیت کے تعلق کا غماز ہے۔ اردو میں اس کے برخلاف م، بھ، جھ، میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ اسی طرح دیوناگری خط میں ی (य) اور تھ थ کی صورتیں مماثل ہیں۔ سب سے زیادہ عجیب حرف کھ (ख) ہے جو ر اور و کو یکجا لکھنے سے بنتا ہے اور جسے حرفِ اصلی یعنی ک سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔

اردو (ہندوی) میں ہائیہ آوازوں کو تحریر میں لانے کا سلسلہ کسی قدر بعد میں شروع ہوا تھا۔ ابتدا میں ایسے موقعوں پر بغیر 'ہا' کے ہی کام چلاتے تھے۔ مثلاً خواجہ مسعود سعد سلمان نے کہا ہے ؏

چو مُنگُل غفور بر تختم و طور بر کت

اس میں لفظ کت، کھٹ (کھاٹ) ہے۔ کھ کی جگہ ک اور ٹ کی جگہ ت سے کام لیا گیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں ہندوی کی عبارتوں کے لیے صرف عربی کے حروف سے ہی کام لیا جا رہا تھا۔ مگہر والے کبیرؔ نے اپنی نظم الف نامہ میں ہمزہ اور لام الف کو بھی شامل کر کے حرفوں کی تعداد تیس پوری کی ہے اور ہر حرف سے ایک شعر شروع کیا ہے۔ کبیرؔ نے نویں صدی ہجری/پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں انتقال کیا تھا۔ افسوس ہے کہ اس زمانے کی کوئی تحریر اب دستیاب نہیں ہے۔ الف نامے میں فارسی کے مخصوص چاروں حرفوں یعنی پ، چ، ژ، گ سے شروع ہونے والے کسی شعر کا نہ ہونا غالباً اس حقیقت کا غماز ہے کہ اس وقت تک ان حرفوں کا چلن نہیں ہوا تھا۔ زمانۂ مابعد میں بھی چاندا کو جاندا وغیرہ لکھنا اسی خیال کا مؤید ہے۔

باوجود اس کے کہ کبیرؔ کے وقت تک ہندوی (قدیم اردو) کی تحریروں میں عربی کے حروفِ تہجی کام میں لائے جاتے تھے۔ عربی، ترکی اور فارسی کے لفظوں کو ہندوستانی تلفظ کے مطابق ڈھالا

ۃ لگا تھا۔ کبیر نے اپنے ایک مصرع میں ... کو "سرتان" نظم
ہے ؎

سوی سرتان جو دو دی سُسر تانے

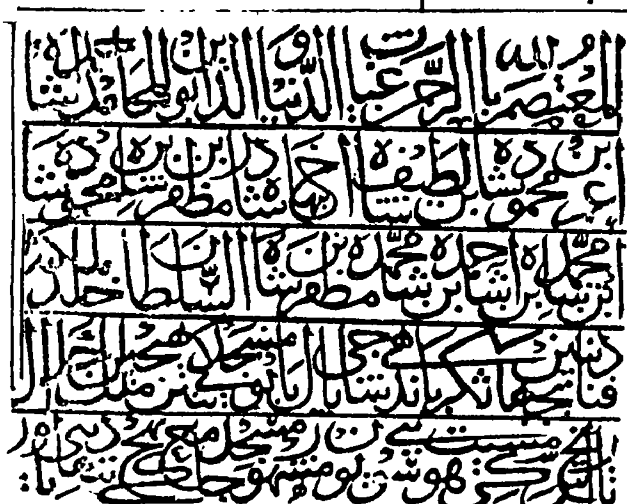
ُکے الفنامے میں بھی اس نوعیت کی تبدیلی کی متعدد مثالیں دیکھی جا سکتی
۔ ترکی اور دوسری غیر ملکی زبانوں کے لفظوں میں تبدیلی اور تصرف
سلسلہ بہت پہلے سے جاری تھا۔ البتہ مسلمانوں کی آمد کے بعد اُن
م بند بھی کیا جانے لگا تھا۔

عربی حروف کے استعمال کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ خالص ہندوستانی
ۃ بدستور عربی اور فارسی کے سانچے میں ڈھلنے لگے۔ آم جو ٹھیٹھ
ہندوستانی میوہ ہے، مسلمانوں
قدیم ترین تحریروں میں بھی
ب یا انب یا انبا کی صورت
ملتا ہے۔ بلکہ فارسی میں یہ انبہ
.وزن شنبہ) ہو گیا ہے۔ البیرونی
بھی دیوالی (دیپالی، دیپ آولی)
دیپالی اور درشا کال (درش کال)
بر شکال لکھا ہے۔ اس مقام پر یہ
مغالطہ بے محل نہیں ہوگا کہ سنسکرت
بعد بدیسی ہندی میں واؤ کی آواز
لی ہے۔ ب کی آواز کو ظاہر کرنے
لیے انھوں نے زمانۂ مابعد میں
(واو) کی گھنڈی میں ایک ترچھا خط بنانا شروع کر دیا تھا، باوجود
ن کے ان زبانوں میں ب (ب) کو ایک مستقل آواز (مصوتہ) کا درجہ
صل نہیں ہے اور سان میں وِش اور بِس، وستو اور بست وغیرہ الفاظ
دونوں صورتوں میں درست ہیں۔ عربی، فارسی، اردو میں ب اور و
الگ باضابطہ، مستقل اور مختلف آوازیں ہیں اور ان کی تبدیلی سے لفظ
کے معنی بدل جاتے ہیں۔ اردو میں خالص ہندوستانی لفظوں میں 'واو'
ر 'ب' کو ترجیح حاصل ہے۔ البیرونی وغیرہ کی تحریریں بھی اسی طریقے
ستی ہیں۔

یہ افسوس ناک حقیقت ہے کہ اردو کی قدیم تحریریں اب محفوظ نہیں ہیں، سب سے پرانی تحریر غالباً وہ ہے جو رائے کھیڑ (احمد آباد) میں شاہ جی کی مسجد کے کتبے کی صورت میں محفوظ رہ گئی ہے۔ اس کتبے میں اردو کے دو شعر اس طرح لکھے ہیں ؎

فنا دینی بچھا نکر باندھے شاہی بال
بانی مسجد کے تئیں جیں ملک جلال
تاریخ اس مسیت کی ہوی سو یوں مشہور
مسجد جامع کے بیچ بٹھا دیا ہے نور ۹۶۰ھ

مصرع آخر سے ۹۶۰ کے عدد برآمد ہوتے ہیں۔ یعنی یہ اشعار ۱۵۵۲ء / ۱۵۵۳ء میں موزوں کیے گئے ہوں گے۔ ان کی کتابت بھی بہ گمان غالب اسی سال میں عمل میں آئی ہوگی۔ اس کتبے سے درج ذیل امور کا علم ہوتا ہے:



ساے کھیڑ (احمد آباد) کی مسجد کا کتبہ جو ... ناگپور میں محفوظ ہے۔

۱۔ اس زمانے تک فارسی کے مخصوص حروف تحریر میں لائے جانے لگے تھے۔ لیکن نقطوں کے مقررہ تعداد میں بنانے کا التزام نہیں تھا۔

۲۔ ہائیہ آوازوں کو نہ صرف شناخت کیا جا چکا تھا بلکہ ہائے مخلوط کی مدد سے ان کو لکھا بھی جانے لگا تھا۔

۳۔ مقامی آوازوں ٹ، ڈ، ڑ کے لیے الگ شکلیں یا تو وجود ہی میں نہیں آئی تھیں یا کم سے کم اُن کا چلن نہیں ہوا تھا۔ اُن کو متبادل حروف ت، د، ر سے ظاہر کیا جاتا تھا۔

۴۔ جُمل کے قاعدے کے مطابق فارسی اور ہندوی کے حروف کی عددی قیمت عربی کے متبادل حرفوں کے مساوی مقرر کی جا چکی تھی اور وہ اس طرح تھی۔

ا، ء	ب، پ	ج، چ	د، ڈ	ہ، ھ
۱	۲	۳	۴	۵

د	ز، ژ	ح	ط	ی، ے	ک، گ	
۴	۷	۸	۹	۱۰	۲۰	
ل	م	ن، ں	س	ع	ف	ص
۳۰	۴۰	۵۰	۶۰	۷۰	۸۰	۹۰
ق	ر، ڑ	ش	ت، ٹ	ث	خ	ذ
۱۰۰	۲۰۰	۳۰۰	۴۰۰	۵۰۰	۶۰۰	۷۰۰
ض	ظ	غ				
۸۰۰	۹۰۰	۱۰۰۰				

۵۔ سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ باوجودیکہ یہ کتبہ عربی خط میں ہے اور عربی میں ہمزہ کا وجود مسلم ہے، کبیرؔ نے بھی الف نامہ میں اسے ایک مستقل حرف کی حیثیت دی ہے، اس کتبہ میں ہمزہ نہیں لکھا گیا ہے، حالانکہ الفاظ تیئں اور ہوئی میں اس کی گنجائش تھی۔

معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں ہندوی کی تحریروں کے لیے عربی[۲۱] خط (ثلث، رقا، وغیرہ) کا استعمال ہوتا تھا۔ جنوبی ہند میں بھی اس کا اثر تا دیر رہا ہے۔ ملک میں ایرانیوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کے نتیجے میں بتدریج فارسی خط (جس میں نستعلیق اور شکست بھی شامل ہیں) کا چلن عام ہوا۔

زبان اردو کو اس کی موجودہ ہیئت (صوری، صوتی اور معنوی) عطا کرنے میں اس کے رسم خط کو بھی پورا دخل رہا ہے۔ اردو کے علما نے اس خط کو بہتر سے بہتر بنانے کی ہمیشہ کوشش اور فکر کی ہے۔ انھوں نے نئی آوازوں کے اظہار کی صورتیں نکالی ہیں۔ پرانے حرفوں کی وضع اور ساخت میں تبدیلی بھی کی ہے۔ قدیم تحریروں کے دستیاب نہ ہونے کے سبب ان کے عہد بہ عہد ارتقا کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ البتہ اتنا معلوم ہے[۲۲] کہ گیارھویں صدی ہجری / سترھویں صدی عیسوی کے مخطوطوں میں ٹ، ڈ، ڑ کے اوپر تین نقطے بھی بنائے گئے تھے۔

اردو تحریر میں اصلاح و ترمیم کا سلسلہ شروع سے جاری ہے لیکن عالمگیر اورنگ زیب کے وقت سے جب اس طویل و عریض ملک نے ایک سیاسی وحدت کی صورت اختیار کی، اس کی زبان کو بھی مختلف پہلوؤں سے منضبط کرنے کی کوششیں تیز تر ہو گئی تھیں۔ حافظ محمود خاں شیرانی نے ضمناً ایک واقعہ اس طرح نقل کیا ہے:

"عالمگیرؒ[۲۲] کے عہد میں فضائل خاں کے عرض کرنے پر کہ ہندی رسم الخط میں اسم اور کلمہ کے آخر میں 'ہے' نہیں آیا کرتی بلکہ الف ہوتا ہے جیسے 'کانا' کہا جاتا ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایسے الفاظ الف کے ساتھ لکھے جائیں۔ عالمگیر نے یہ تجویز پسند کی اور حکم دے دیا کہ آئندہ ایسے کلمے الف کے ساتھ لکھے جائیں۔ یعنی مالوہ کو مالوا، بنگالہ کو بنگالا وقس علی ہذا۔ اس فرمان کی تعمیل نہ صرف شاہی دفتروں اور ٹکسالوں میں ہوئی بلکہ اردو خواں لوگوں نے بھی یہی املا اختیار کیا اور آئندہ گھسوڑا، چونا، سہرا سہجنا اور رہیرا لکھا جانے لگا۔"

اس فرمان نے نتیجے کے طور پر گویا اردو کی کایا پلٹ کر دی۔ اب راجہ کو راجا باجہ کو باجا، پیسہ کو پیسا لکھا، پڑھا اور بولا جانے لگا۔

ہندوی (قدیم اردو) تصانیف کے مخطوطے راقم نے دیکھے ہیں[۲۳]۔ جن میں کَ، کِ وغیرہ کو محض فتحہ اور کسرہ کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ بعد میں ان کلموں کو کا اور کی (الف اور ی کے اضافے کے ساتھ) لکھا جانے لگا۔ اسی طرح ہوت، دیکھت وغیرہ کو بھی ہوتا اور دیکھتے لکھنے لگے۔ اس صورت حال نے بالآخر اردو کو "آ" والی زبان بنا دیا جس میں اکثر کلمات الف کشیدہ کے ساتھ لکھے جاتے ہیں۔ بلکہ یہ الف اب مذکر واحد کی علامت بن گیا ہے۔ یاد رہے کہ کبیرؔ وغیرہ کے عہد میں بھی اکثر اسما کے آخر میں الف لایا کرتے تھے۔ مثلاً کبیرا، وجودا، دَرودا وغیرہ۔ چنانچہ کا، تا، یا وغیرہ کا چلن اس زبان کے قدیمی مزاج سے مطابقت بھی رکھتا تھا۔

عربی اور اس کے اثر سے فارسی میں بھی نون بالاعلان اور نون بالادغام کی صورتیں تھیں لیکن اردو میں ثانی الذکر صورت بہت عام رہی ہے۔ یہاں نون کی دو قسمیں مقرر کی گئیں۔ یعنی نون منقوط (ن) اور نون غیر منقوطہ یا نون غنہ (ں)۔ پہلی صورت یعنی نون بالاعلان کی تحریر میں تو کوئی دشواری نہیں تھی لیکن نون بالادغام یا نون غنہ نے ایک مسئلہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی عالمگیر اورنگ زیب کے فوراً بعد مرزا روشن ضمیر نے اپنے رسالہ ضابطۂ ہندی میں اس مسئلہ سے بحث کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ[۲۴]:

" کنول را جنیں باید نگاشت ۔ کوّل دکنغ راجنیں ۔ کنج "۔
اس میں شبہ نہیں کہ مرزا روشن ضمیر کی یہ تجویز آسان بھی تھی اور قابل عمل بھی، لیکن کسی وجہ سے اسے رواج حاصل نہ ہو سکا ۔ البتہ فی زمانہ بعض لوگوں نے اپنی جدّت قرار دے کر اس طریقے کو اختیار کر لیا ہے ۔

فارسی اور عربی میں 'ہ' محض ایک حرف ہے اردو میں یہ کبھی آزادانہ آتا ہے اور کبھی حرف ماقبل کے ساتھ مخلوط ہو کر ۔ اسی لیے یہاں اس کی بھی دو صورتیں مقرر ہوئیں۔ یعنی ہائے ہوز اور ہائے مخلوط یا ہائے دوچشمی اور ہائے مخلوط کا ذکر پہلے آ چکا ہے ۔

عربی میں یائے مجہول کا کوئی تصور نہیں ہے ۔ قرآن پاک میں صرف ایک جگہ کسرۂ مجہول کشیدہ آیا ہے ۔

بِسْمِ اللّٰہِ مَجْرٖیہَا وَ مُرْسٰہَا

فارسی میں بھی یائے مجہول گویا معدوم ہے۔ لیکن اردو میں اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں شروع شروع میں یائے معروف (چھوٹی "ی") کو نصف لکھ کر اس سے یائے مجہول کا کام لیتے تھے ۔ قدیم مخطوطوں میں

[مرگاوت از قطبن کا ورق [نسخہ مملوکہ ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی، نوشتہ قبل ۱۲۱۱ھ]



اس نے صرف کا سب سے واضح استعمال کلمہ 'ہے' میں ملتا ہے۔ 'یہ ہے'
بھی بہت قدیم معلوم نہیں ہوتا۔ پروفیسر سید حسن عسکری نے ایک ایسے
نسخے کے حوالے سے جس کی کتابت بقول اُن کے عہدِ شاہ جہانی میں ہوئی تھی
اور جو ۹۱۱ھ/۰۶-۱۵۰۵ء کے لکھے ہوئے کسی قدیم مخطوطے کی نقل ہے
لکھا ہے کہ:

"سارے مجموعے میں کسی جگہ 'ہَے' ہائے ہوز کے بعد یائے
مجہول یا لمبی 'ے' کے ساتھ نہیں ملتی۔ اکھراوت ایک
چھوٹی سی کتاب ہے، اس میں شکل اور گیتے نے بارہ
جگہ 'ہے' کا استعمال کیا ہے، لیکن پیشِ نظر نسخوں میں
یہ لفظ یا تو سرے سے غائب ہے یا کوئی اور لفظ اس کی
جگہ مستعمل ہوا ہے۔"

کلمہ 'ہے' کا سب سے قدیمی وجود غالباً میاں سادھن کی مینا ست میں
ملتا ہے۔

[۲۶] نت ٹھاوں آن دیت ہے گاری

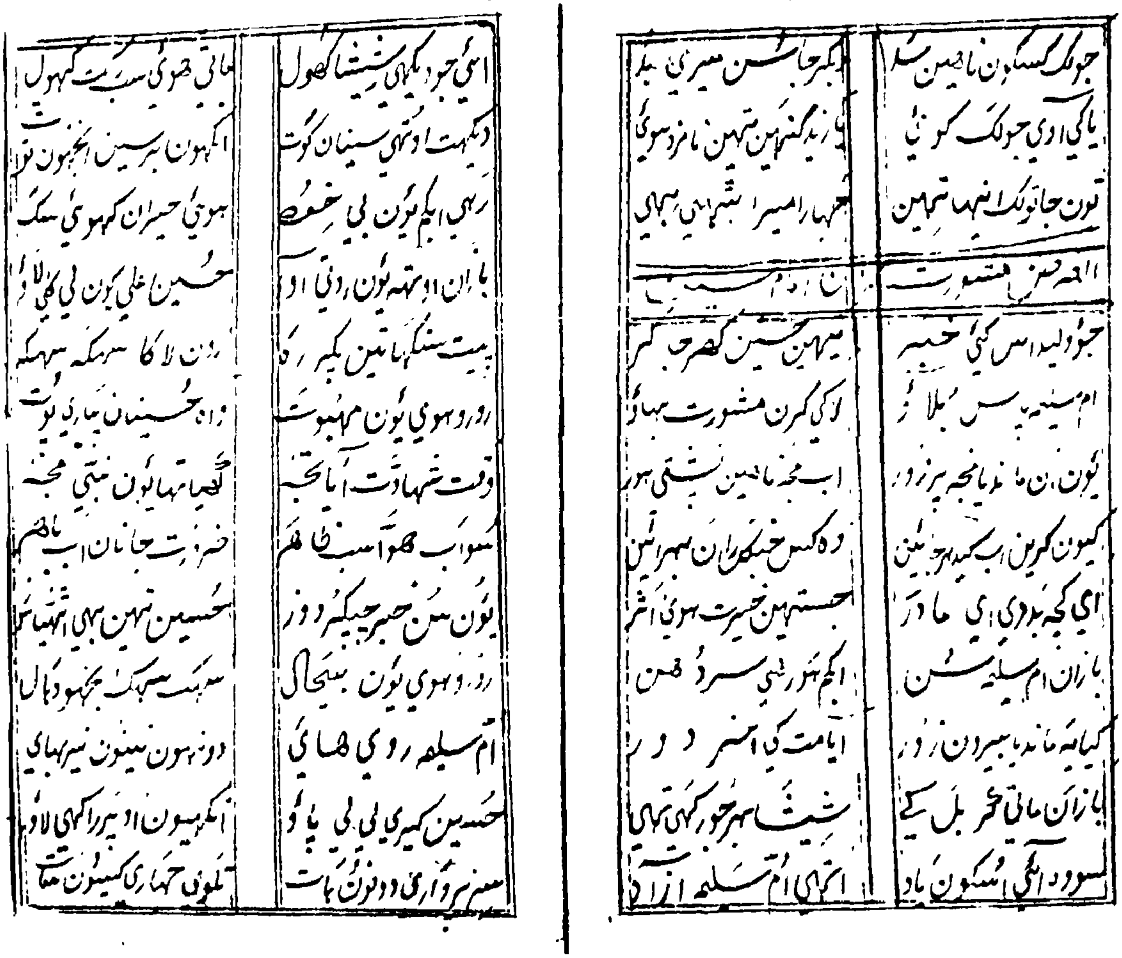
اس کے بعد حضرت مخدوم جہانیاں (متوفی ۷۸۵ھ/۱۳۸۳ء) سے منسوب
اس فقرے میں ہے کہ:

کھندا ہے پھندا کہاں

یہ لفظ بھی ملک محمد جائسی کی پدماوت میں آیا ہے۔ بقول پروفیسر سید حسن عسکری:

"صرف ایک جگہ منیر کے نسخہ 'پدماوت' میں ہَے یائے مجہول
کے ساتھ مرقوم ہے۔"

نو سرہار کے مخطوطہ حیدرآباد کا ایک ورق



جہاں نہ رات دیوس ہے نہ پون پکھان

رفتہ رفتہ اس کلمہ کا چلن زیادہ ہوا اور اب یہ اردو کے افعالِ امدادی میں سب سے زیادہ کثیر الاستعمال ہے۔

جس طرح عربی فارسی میں یائے مجہول کی آواز کے تقریباً نہ ہونے کے باوجود اِن زبانوں کے قدیم ترین نوشتوں میں بھی بڑی 'ے' کی شکل دیکھی جاسکتی ہے اُسی طرح قدیم اردو (ہندوی) کا بھی معاملہ ہے — شروع میں مخاطب کی تذکیر و تانیث سے افعال، اسما اور حروف کی حالت کمتر متاثر ہوتی تھی۔ چنانچہ اِس زبان کے قدیم ترین دو فقرے اس طرح ہیں؛[۲۸]

"ارے مولانا یہ بدبو سی"

اور

"جو مند اسا باندھی سو پاین پسری"

ان فقروں کی قدیم تحریری صورت ہمیں دستیاب نہیں ہے لیکن بول چال کی رو سے اِن میں صرف پہلا کلمہ "ارے" ایسا ہے جس میں یائے مجہول موجود ہے۔

بتدریج یائے مجہول کا صَرف زیادہ ہوا۔ رائے کھیڑ کی مسجد کے مذکورہ کتبے میں جس کا ذکر کیا جا چکا، چار مصرعوں میں 'بڑی ے' موجود ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس حرف کا استعمال زیادہ ہوا انیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک اِس نے اردو قواعد میں کلیدی حیثیت حاصل کرلی۔ تذکیر و تانیث اور وحدت و جمع وغیرہ کے متعدد مسائل اس حرف سے متعلق ہیں۔ مذکورہ صدی کے وسط تک تحریر میں بھی چھوٹی 'ی' اور بڑی 'ے' کے محلِ استعمال کے بارے میں کسی نہ کسی درجے میں احساس بیدار ہونے لگا تھا۔[۲۹] مرزا اسداللہ خاں غالب نے بھی، ۱۰ اپریل ۱۸۶۱ء کے ایک خط میں 'فارسے' لکھ کر اُسے 'فارسی' بنایا ہے۔

اردو رسمِ خط نے اس زبان کے لفظوں کے تلفظ کو بھی متاثر بلکہ تبدیل کیا ہے۔ چنانچہ اِملی اور اِمِلی، سنبھال اور سمھال، کنبھار اور کمہار وغیرہ کی مثال سے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ سلاطینِ اودھ کے زمانے کا 'کوے بہار' موجود

ضلع سلطان پور میں 'کورے بہار' (کوڑے بہار) ہے۔

مرزا اسداللہ خاں غالب نے ۵ رذی حجہ کو نواب یو[سف]

علی خاں کے نام ایک خط میں لکھا تھا؛

"لفافہ مجھ تک پہونچا"

لفظ پہنچا کا یہ املا شاذ ہے پونچھا بالکل مختلف لفظ ہے یعنی صاف کیا۔ پہنچا بھی تبدیل و تقسیم کے کئی مراحل سے گذر چکا ہے۔ سودا اور ان کے م[عاصر] اسے پہونچا کہتے تھے۔ ذیل کے شعروں میں یہ اسی طرح آیا ہے۔

تمھارے ساتھ جس کا دل لگا ہے
اُسے یوں منع کرنا پہونچتا ہے۔ آبرو

تیرے فیضِ نگاہ کو پہر گاہ
پہونچ کر چاہیے نہ ہو مغرور — سود[ا]

تلفظ کی یہ صورت غالب اور مومن کے وقت تک بھی جاری رہی ہے۔

میر علی اوسط رشک جو الفاظ کے نبض شناس تھے، اس نکتہ [سے] بخوبی واقف تھے کہ تلفظ اور املا میں بلاواسطہ تعلق ہے۔ انھوں نے لفظ کے تلفظ میں تبدیلی چاہی اور لکھا؛

پوہنچا[۳۰]۔ این لغت ہمیں است، چہ اگر ہائے ہوز بعد بائے فارسی نویسند بائے فارسی مخلوط الہا شود، متامل"

دراصل میر صاحب نے پ اور ہ میں فرق پیدا کرنے کے لیے واو کو داخل کیا تھا اور اسی لیے وہ واؤ کشیدہ نہیں تھا۔ ان کے استا[د] یہاں ہجر نے بھی کہا ہے ؎

ہرگز نہ رُک سکے گا جو روکیں گے دو پہاڑ
پوہنچیگا بحر جو ہے تمھارے نصیب کا

معلوم ہوتا ہے کہ میر رشک کے بعض ہم عصروں نے اس واؤ معدولہ [کو] کشیدہ پڑھ لیے جانے کے امکان پر نظر کرکے املا کی اس صورت [کو] قبول نہیں کیا۔ انھوں نے ہائے ہوز کے بعد واو کو جگہ دی۔ نواب سیا[دت] خاں رند کہتے ہیں ؎

پہونچتے ہے شکست اک دن تجھی سے شیشۂ دل پر
لڑایا جاتا ہے یہ آبگینہ روز پتھر سے

لیکن اِس صورت میں واو کو کھینچ کر پڑھ لیے جانے کا امکان زیادہ [تھا]

اِسی لیے جدید املا میں اس واو کو بالکل حذف کر دیا گیا۔

اسی کلمہ سے ایک دوسرا لفظ پونہچا بمعنی بند دست نکلا۔ پھر اسی سے پہنچی ایک زیور کا نام ہوا۔ بہادر شاہ ظفر نے جو ملک سخن کے بھی بادشاہ ہوئے، ایک شعر میں اِن تینوں لفظوں کو اپنے زمانے کے مروجہ تلفظ کے ساتھ نظم کیا ہے ؎

مجھے ڈر ہے نہ پہنچے پنہچیوں تک بوجھ سے صدمہ
کہ نازک ہے نہایت ہی ترا اے نازنیں پونہچا

املا اور تلفظ میں ترمیم اور تقسیم کی اور بھی مثالیں مل سکتی ہیں۔

زبان اردو میں بعض لفظوں کا تلفظ جدید ہندی سے مختلف ہے مثلاً ہندی میں جس لفظ کو رِتُ (بہ کسرۂ اول و ضمۂ ثانی) بولتے ہیں اردو میں وہ رُت (بہ ضمۂ اول و سکونِ ثانی) ہے۔ دراصل ہندی کے حروفِ تہجی کے تلفظ میں بھی واضح اختلاف موجود ہے۔ میرٹھ اور مظفر نگر وغیرہ میں ک کے، گ گے کہتے ہیں۔ وسط یو۔پی میں یہ کَ گَ، گَ گَہ (مفتوح) ہیں اور پورب کے خطے میں کو کھو، گو گھو بولتے ہیں۔ اردو نے اصلاً پورب کے تلفظ (ضمہ) کو قبول کیا۔ چنانچہ ہندی کے حرف (رِ) کو رُ کہا گیا۔ راقم کو بتایا گیا ہے کہ مہاراشٹر کی طرف اِس حرف کا تلفظ آخر الذکر صورت ہی میں ہے۔ تلفظ کے اِن اختلافوں پر بھی توجہ کی ضرورت ہے۔

سطورِ بالا میں صرف بعض اشارے کیے گئے ہیں۔ تحریر کے ارتقا سے متعلق مفصل تحقیق کی ضرورت ہے۔ اِس سے زبان کی اصل اور ارتقا کی تفہیم میں ہی مدد نہیں ملے گی بلکہ تحریر کے موجودہ طریقے کو بھی بہتر بنانے میں مدد ملے گی۔

حواشی و ماخذ

۱۔ ہندی ساہتیہ کوش حصہ ۲، شائع کردہ گیان منڈل لمیٹڈ بنارس سنہ [illegible] ص ۶۴

۲۔ گوتم بدھ ڈاکٹر م۔ حفیظ سید، انجمن ترقی اردو ہند اورنگ آباد سنہ [illegible] ص ۱۲۲

۳۔ ٹھک تارتنگ کورہو، اکرہ، جنوری ۱۹۰۲ء (انگریزی)

۴۔۵۔ سہ ماہی نوائے ادب، بمبئی جولائی ۶۶ ۱۹ء

۶۔ مولانا داؤد نے چنداین (تصنیف ۷۷۹ھ/۱۳۷۷ء یا ۷۸۱ھ/۱۳۷۹ء) میں کہا ہے ؎

پون میں اکھری سُدھ ہائی
ترکی لکھ لکھو ہندی کی گائی

(چنداین مرتبہ ماتا پرشاد گپت، وشو ودیالیہ پرکاشن، بنارس ۱۹۶۷ء ہندی)

۷۔ نقدِ قاطع برہان۔ پروفیسر نذیر احمد، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی ۱۹۸۵ء ص ۲۵۳

۸۔ مقالاتِ شیرانی (مرتب مظہر محمود شیرانی مجلس ترقی ادب لاہور جلد ۱۔ ص ۱۰۰

۹ نفس اللغہ۔ میر علی اوسط رشک، نیر پریس لکھنؤ طبع اول حصہ ۱ ص ۸۸

۱۰ اردو کے حروفِ تہجی محمد انصار اللہ علی گڑھ ۱۹۷۲ء ص ۶۶

۱۱ مقالاتِ شیرانی ج ۱ ص ۱۰۰

۱۲۔ ایضاً " ص ۱۰۱

۱۳ اردو کے حروفِ تہجی ص ۶۴

۱۴ مقالاتِ شیرانی جلد ۱۔ ص ۵۰

۱۵ عکس نمبر ۱۔

۱۶ مقالاتِ شیرانی جلد ۲ ص ۴

۱۷ ایضاً جلد ۱ ص ۱۰۰، ۱۰۱

۱۸۔ عکس نمبر ۲ جو ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی کے توسط سے موصول ہوا ہے۔

۱۹۔ یہ قرات ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی کی ہے۔ اس کتبہ میں ہر جگہ ہائے ہوز کو دو چشمی ہے (ھ) کی صورت میں لکھا ہے۔ اِس لیے راقم کے نزدیک " بنّھا دیے یا نور " (یا " بہ ہّیا) بہتر ہوگا۔ عکس میں بھی 'د' کا تعلق 'یا' کے ساتھ نہیں معلوم ہوتا۔ اس صورت میں اس طرح سے ۹۶۰ کے بجائے ۹۶۵ کے عدد بر آمد ہوں گے۔

٢٠۔ مانومنٹل اسلامک کیلیگرافی فروم انڈیا۔ (مرتب) ڈبلو۔ ای۔ بگلے۔ اسلامک فاؤنڈیشن، ولاپارک، الی نوئس، ١٩٨٥ء ص ١٢٣

٢١۔ اردو کے حروفِ تہجی ص ٤٠ تا ٤٦۔، پنجاب میں اردو از حافظ محمود خاں شیرانی، سرفراز قومی پریس لکھنو ١٩٦٠ء ص ٢٧

٢٢۔ پنجاب میں اردو ص ٢٨

٢٣۔ عکس نمبر ٣

٢٤ اردو کے حروفِ تہجی ص ٦٤

٢٥ معاصر پٹنہ حصہ ٤ ص ١٠٦

٢٦ ایضاً حصہ ١٧ ص ٩

٢٧ ایضاً ج۔ ٤ ص ١٠٨

٢٨ خیرالمجالس، حمید قلندر (مرتب) پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ١٩٥٩ء ص۔ ١٩١۔

٢٩۔ مرقع غالب پرتھوی چندر لکشمی پرنٹنگ ورکس، دہلی، ١٩٦٦ء

٣٠ ایضاً

٣١۔ نفس اللغہ ص ١١٨

اِس مضمون کے ساتھ جو عکس منسلک ہیں اُن کے لیے راقم آرکیالوجکل سروے آف انڈیا ناگپور، کے عربی فارسی کتبات کے سپرنٹنڈنگ ایپی گرافسٹ، ڈاکٹر ضیاءالدین ڈیسائی (احمد آباد)، ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ (حیدر آباد) اور ڈاکٹر پرمیشوری لال گپت صاحبان کا ممنون ہے۔

"اپنی کوششوں ہی کی بدولت ہم نے بدلے ہوئے حالات میں سخت سے سخت مشکلات پر قابو پایا ہے اور بڑے بڑے معرکے سر کیے ہیں اور کبھی شکست بھی کھائی ہے تو عزت قایم رکھی ہے لیکن علی گڑھ اسی وقت کامیاب ہوا ہے جب اس کے دیوانوں اور فرزانوں نے اپنی صفوں کو سیدھا اور استوار رکھا ہے اور کامل اتحاد کا ثبوت دیا ہے۔ علی گڑھ کے لیے یہ گھڑی محشر کی ہے اور ہم سب عرصۂ محشر میں ہیں۔ آیئے مل کر بیٹھیں، مل کر سوچیں، مل کر فیصلہ کریں اور مل کر اس فیصلے پر قایم رہیں اور نتیجے کو خدا پر چھوڑ دیں۔"

رشید احمد صدیقی

دینی مدارس اور سائنسی تعلیم

یونس عثمانی

دینی مدارس اور سائنسی تعلیم کا موضوع اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت وسعت رکھتا ہے۔ اس کے تمام گوشوں پر مکمل بحث ممکن نہیں ہے اس لیے اس کے بنیادی مسایل پر ہی گفتگو کی جاتی ہے۔

اس وقت بھارت میں چھوٹے بڑے دینی مدارس کی تعداد ۱۳۸۶ ہے لیکن باضابطہ اور قابل ذکر دینی مدارس صرف ۳۰ ہیں۔ ان تمام دینی مدارس میں نصاب تعلیم میں ہم آہنگی اور یکسانیت نہیں ہے۔ جہاں تک دینیات اور علوم اسلامیہ کے موجودہ طریق تعلیم کا تعلق ہے، اس کے ناقابل اطمینان ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور جو بھانت بھانت کے نصاب اس وقت رائج ہیں وہ یقیناً ناقص ہیں۔ گزشتہ دس سال سے دینی نظام تعلیم پر جو کچھ لکھا گیا ان کے مطالعے سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ اب تک ہمارے دینی رہنماؤں کے پیش نظر صرف مروجہ نصاب میں ترمیم کا سوال رہا ہے اور غالباً یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ چند کتابوں کا اضافہ کر دینے سے دینی مدارس کا صحیح سمت سفر متعین ہو سکے گا۔ اگر میرا قیاس درست ہے تو میں عرض کروں گا کہ یہ موجودہ حالات کا نامکمل اندازہ ہے۔ دراصل ہم زیادہ گہرائی میں دیکھیں کہ قرآن، حدیث، فقہ اور عقائد کی تعلیم کے باوجود ہمارے طلبا میں حقیقی اور مقصدی زندگی کا جذبہ کیوں مفقود ہے؟ قومی خدمت اور ملی تشخص کا احساس کیوں نہیں ابھرتا؟ اگر محض نصاب تعلیم کا نقص ہی اصل سبب ہے تو اس نقص کو فوراً رفع کرنا چاہیے۔ لیکن اس کے اسباب زیادہ وسیع ہیں اور ہماری ملکی تعلیمی پالیسی میں بنیادی نقائص موجود ہیں تو اصلاح کے لیے صرف دینی نصاب میں ترمیم ہرگز ہرگز کافی نہیں ہو سکتی۔ لہذا اصلاحات کا دائرہ زیادہ وسیع کرنا ہوگا۔ خواہ اس کام میں محنت و مشکلات کا ہی سامنا کرنا پڑے۔

(۱)

ملک کی آزادی کو چالیس سال ہوئے اس مدت میں ہمارا تعلیمی نظام روایتی رہا، ہم علم کو متحرک اور ترقی پذیر عمل کی شکل نہیں دے سکے۔ ہم بے مقصد حوصلہ شکنی کی کیفیت میں خود مبتلا رہے اور اپنے شاگردوں کو صرف رٹو کی میکانکی تعلیم دیتے رہے۔ ہم جن کتابوں کے ذریعے تعلیم دیتے رہے وہ صدیوں پیشتر لکھی گئی تھیں۔ ان کی ترتیب ایسی نہیں جو عصری دماغوں کو اپیل کر سکے اور عصر حاضر کے مسائل کو حل کر سکے۔ نیز اس تعلیم کی پشت پر کوئی تربیت کوئی زندہ ماحول اور کوئی عملی برتاؤ نہیں ہے۔ اس تعلیم کی حیثیت بس اسی قدر ہے کہ آثار قدیمہ کی طرح ان کا احترام کیا جائے۔

دراصل تاریخی اعتبار سے بنو امیہ کے آخری دور میں مجوسی اور مسیحی بکثرت مسلمان ہوئے تو ان کے مجوسی و مسیحی رہنماؤں کو سخت پریشانی ہوئی چنانچہ انہوں نے مسلمانوں سے مناظرہ کرنا شروع کیا۔ عرب ان کے فلسفیانہ سوالات سے آشنا نہ تھے۔ چنانچہ ابتدا میں ان کو شکست کا سامنا کرنا پڑا لیکن پھر جلد ہی انھوں نے منطق اور فلسفہ پڑھا اور اپنے حریفوں کو واضح شکست دی۔ یہ انداز قرآن و حدیث کی طرح سادہ نہ تھا۔ اس کی حیثیت محض وقتی ہتھیار کی تھی۔ مگر ایک بہت بڑی غلطی یہ ہوئی کہ یہ یونانی فلسفہ اپنی تمام خرابیوں کے ساتھ داخل نصاب کر دیا گیا۔ اس طرح یہ اسلامی تعلیمات کا جزو بن گیا۔ اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ علم العقائد، علم الفقہ، علم الکلام

ڈاکٹر یونس عثمانی۔ استاد مرکزی درس گاہ اسلامی۔ رامپور۔ یو۔پی

اسی مخصوص فنی زبان میں مرتب کر دیے گئے جس علم کو اسلام کی برتری اور غیر مسلموں کو قریب لانے کے لیے بطور علمی ہتھیار استعمال کیا گیا تھا وہی علم قرآنی اسلام سے دوری کا سبب بننے لگا۔

اسلام مسیحیت کی طرح دینی اور دنیوی تعلیم کو جدا نہیں کرتا۔ اسلام کا اصل مقصد انسان کو دنیا میں رہنے اور دنیا کے معاملات انجام دینے کے لیے ایک ایسا اصول بتاتا ہے جو یہاں سے آخرت کی زندگی تک سلامتی عزت اور برتری حاصل کرنے کا طریقہ ہے۔ اس مقصد کے لیے صحیح اور صحت مند فکر و نظر، اخلاق حسنہ، کردار کی بلندی مطلوب ہے۔ وہ مقصد کے حصول کے لیے واضح حقوق اور فرائض متعین کرتا ہے۔ اس طرح اجتماعیت حقیقی کا نظام وضع کرتا ہے۔ افراد کی فکری و عملی تربیت کے باب میں اسلام دوسرے مذاہب سے بالکل مختلف ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسی تعلیم موجود ہو جہاں زندگی اور اس کے معاملات سے اس کا کوئی ربط باقی نہ ہو تو وہ بے روح اور بے معنی ہے۔ سیکڑوں درسگاہوں سے فارغ ہونے والے عالم دین بے کار ہیں جو اسلام کے عقائد اور اصول سے تو واقف ہیں لیکن علم و عمل کے میدان میں بڑھنا اور زندگی کے موجودہ دور میں ان کو برتنا نہیں جانتے ہیں۔

ڈاکٹر حسن ترابی فرماتے ہیں:

"اسلام کی بنیاد علم پر قائم ہے۔ ظاہر ہے سارا کا سارا علم نقلی نہیں ہے۔ نقلی علم صرف شریعت کا علم ہوتا ہے جسے رسول ہم تک پہنچاتا ہے اور ہم اسے اس سے لیتے ہیں۔ علم کی ایک قسم وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے کان، آنکھ، دل اور عقل سے حاصل کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس علم کا تعلق اشیا اور ان کے (NATURE) سے ہے مثلاً نباتات و حیوانات کے نیچر، مادہ کے خواص اور سماج کی خصوصیات۔

اللہ تعالیٰ نے ہم کو عقل سے نوازا ہے تاکہ ہم اس علم تک پہنچ سکیں۔ عقل کبھی کبھار غلطی کر سکتی ہے لیکن وہ برابر آگے بڑھتی اور اپنی غلطیوں کی اصلاح کرتی رہتی ہے۔ اس علم کا تعلق ان احوال و ظروف کے سمجھنے سے ہے جن میں ہم اپنی سمجھ کے مطابق شریعت کو نافذ کرتے ہیں۔ اگر ہم اس علم سے کام نہ لے سکے تو ہم ان حالات کو جاننے کے قابل نہ ہو سکیں گے جن میں ہم اُن احکام کو عملاً منطبق کرنا چاہتے ہیں۔ اس واقفیت کے بغیر ہماری تطبیق بالکل غلط ہوگی اور یہ ناواقفیت زبردست غلطی اور اپنے نتائج کے اعتبار سے انتہائی مہلک ہوگی۔ دراصل دین کے نئے فہم میں علوم جدیدہ کا پورا اصل دخل ہونا چاہیے۔ (اس وقت) شریعت کا علم پیچھے رہ گیا جب کہ عقلی علوم، غیروں کے یہاں مسلسل ترقی کی منزلیں طے کرتے رہے۔ یہاں تک کہ علمی زندگی سے ہمارا تعلق بالکل ٹوٹ گیا اور ہم نے علوم عقلیہ کو چھوڑ دیا۔ اس کے برعکس دوسرے لوگ ان میں بہت آگے بڑھ گئے۔ اور ان میں اہم ترین نتائج تک پہنچ گئے، جن سے کسی بھی صورت میں ہم بے نیاز نہیں ہو سکتے۔"

اقتباس از المجتمع کویت ۶ فروری ۱۹۷۳ء

مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے جمعیۃ علماء کے اجلاس میں خطبہ صدارت میں فرمایا تھا کہ:

"ہم کو چاہیے کہ یورپ کا مقابلہ کرنے سے پہلے یورپ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔"

اس سے زیادہ واضح طور پر مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنے مضمون "مسلمانوں کی آئندہ تعلیم" میں اس بات پر زور دیا ہے کہ

"مسلمانوں کو سائنس اور ٹکنالوجی پر کافی توجہ دینی چاہیے غیر مسلم اقوام کے مقابلے میں ان کی کمزوری گناہ کے مترادف ہوگی۔"

مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب نے نہایت کرب کے ساتھ فرمایا:

"ماضی قریب کی تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مغرب کے فکر و فلسفہ نے ہماری ملت کو چیلنج کیا ہے تو اس کے باوجود کہ ہمارے ہاں مسجدیں اور خانقاہیں آباد تھیں، مدرسے اور کتب خانے بڑی تعداد میں موجود

تھے، تبلیغی ادارے قائم تھے، یہ چیزیں ملت کو بچا نہ سکیں مغربی تہذیب کا جو سیلاب آیا وہ ملت کے تمام آثار کو اپنے ساتھ بہا لے گیا۔"

("تدبر" فروری ۱۹۸۳ء - لاہور)

تاریخ کے ان المناک حادثات سے محفوظ رہنے کے لیے شبلی مرحوم لکھتے ہیں:

"علماء کو ــ اس بات کا مطلق خوف نہیں کرنا چاہیے کہ علوم جدیدہ مذہب اسلام کے بخلاف ہیں اور اُن کی تعلیم سے عقائد مذہبی میں خلل آجاتا ہے، کیوں کہ جب امام غزالیؒ کی طرح وہ ان علوم کو خود حاصل کریں گے تو اُن کو وہ مسائل معلوم ہو جائیں گے جن میں مذہبی مخالفت کا احتمال پیدا ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں وہ ان مسائل کی تردید یا اسلام سے ان کی مطابقت بخوبی کر سکیں گے. اور جدید تعلیم یافتوں کو مذہبی شکوک و شبہات سے محفوظ رکھ سکیں گے۔ صاف ظاہر ہے کہ جب تک ہماری قوم کے علماء جدید فلسفہ اور جدید علوم کو بذات خود حاصل نہ کریں ناممکن ہے کہ وہ ان اعتراضات کا جواب دے سکیں جو یورپ کے ملاحدہ مذہب اسلام پر کرتے ہیں اور جن کا اثر ہماری قوم کے جدید تعلیم یافتوں پر پڑتا ہے"

(خطبات شبلی ص ۹۰-).

ہمارے علمائے کرام کے یہ اقوال زریں ہیں جو ٹاکویلی (Tocqueville) کے ان الفاظ کی تشریح کرتے ہیں:

A NEW SCIENCE OF POLITICS IS INDISPENSABLE TO A NEW WORLD.

(نئی دنیا کے لیے ایک جدید سیاسی سائنس ضروری ہے)

ہم اگر اپنے ماضی پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ جابر بن حیان سے لے کر رشید الدین السوری تک نہایت درجہ ترقی کا دور تھا۔ یہی دور ملت اسلامیہ کا تابناک دور کہلاتا ہے۔ اس پورے دور میں کہیں بھی علم کی تفریق یا سائنس اور مذہب کا ٹکراؤ نظر نہیں آتا۔ یقیناً اس کی وجہ یہ تھی کہ تمام علوم، علوم الٰہیہ سمجھے جاتے تھے لیکن پندرھویں صدی تک جب مسلمانوں سے یہ تمام علوم مغرب کی طرف منتقل ہو گئے تو مسیحی علوم کی غلطیاں واضح ہونے لگیں۔ پھر جب جدید تحقیقات شائع ہونے لگیں تو مسیحی حلقوں میں کہرام مچ گیا۔ چرچ نے ابتداء میں تو ان علمائے سائنس کو گمراہ کہا پھر پوپ کے خاص حکم سے عدالتی کارروائی ہوئی جس کے نتیجے میں تقریباً تین لاکھ افراد کو سزائیں دی گئیں اور تیس ہزار افراد کو زندہ جلا دیا گیا۔ ان سزا پانے والوں میں گلیلیو اور برونو (BRUNOE) جیسے اہم لوگ شامل تھے۔ چوں کہ مذہب ہی غیر فطری ہو چکا تھا۔ لہذا یہ ٹکراؤ چرچ اور سائنس کے درمیان واقع ہوا جو بالآخر ڈارون کی کتاب (Origin of Species) کے شائع ہونے کے بعد Secularism کی صورت میں ختم ہو گیا۔

اب منصب امامت پر مغرب فائز تھا اور مسلمان اس سے تہی دامن تھے لہذا یہاں بھی علم کو UNITS میں منقسم کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سائنس رضائے الٰہی کا ذریعہ نہیں بنا، جب کہ علم سائنس سراپا رضائے الٰہی کا وسیلہ ہے۔ اسی لیے اس کی تحصیل فرض کفایہ ہے۔ غلط ہاتھوں میں کسی علم کا ہونا ہمیشہ ہولناک ہوتا ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ رحم مادر اور نطفے کا کاروبار ہو رہا ہے اور برتھ کنٹرول سسٹم نے انسانیت کو مسخ کر رکھا ہے۔ ہم بحیثیت مسلمان تمام علوم کے وارث ہیں ہم پر اسلامی اور انسانی اعتبار سے جو ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں ان میں پہلوتہی ہم سب کو گنہگار بنانے کے مترادف ہوگا۔ اس لیے ایک انقلابی نظام تعلیم ناگزیر ہے۔

(۲)

اس نئے نظام تعلیم میں دینی اور دنیوی علوم کی تفریق مٹا کر یک جان کر دیا جائے۔ تاکہ طالب علم اس وسیع کائنات میں خدا کی حکمت، قدرت اور عظمت کے آثار کا مشاہدہ کر سکے۔ اس کے ذہن میں کائنات اور مقصدی زندگی کا مومنانہ خاکہ بٹھا دیا جائے۔ اپنی مادری زبان، عربی، قومی زبان، انگریزی، سائنس، ریاضی، تاریخ اسلام، جغرافیہ آرٹ اور کرافٹ اس قدر جان لے کہ جو کہ ایک آدمی کو ضرورت ہوتی ہے۔ عملی خاکہ اگر یوں بنا لیا جائے تو مناسب ہوگا۔

(ا) ابتدائی تعلیم: I اول تا پنجم۔ یہاں درجہ اول و دوم میں مادری زبان میں (۱) اسلامیات II ریاضی III جنرل سائنس زبانی
IV آرٹ و کرافٹ۔

II سوم میں قومی زبان اور انگریزی کا اضافہ کر دیا جائے باقی مذکورۂ بالا مضامین پڑھائے جائیں۔

III چہارم و پنجم درجات میں عربی کا اضافہ کر دیا جائے۔

(ب) ششم و ہفتم: اس میں مندرجہ ذیل مضامین ہوں گے۔
اسلامیات، مادری زبان، قومی زبان، انگریزی، عربی، ریاضی، سائنس، تاریخ اسلام، جغرافیہ۔

(ج) ہشتم تا دہم:
۱۔ اسلامیات (فقہ و عقاید، سیرت، تاریخ اسلام)
۲۔ قرآن (ترجمہ و تشریح)
۳۔ عربی ادب
۴۔ حدیث و اصول حدیث
۵۔ تاریخ ہند و جغرافیہ
۶ سائنس (تاریخ کے ساتھ)
۷ حساب، الجبرا، جیومیٹری
۸۔ انگریزی
۹ مطالعۂ سماج و تمدن

(د) یازدہم و دوازدہم:
۱۔ اسلامیات
I- قرآن (تفسیر و اصول تفسیر)
II حدیث منتخبات و اصول حدیث
III فقہ (مع اصول)
۲۔ ادیان عالم
تقابلی مطالعہ
۳۔ تاریخ اسلام
۴۔ سیرت صحابہؓ مع ثقافت اسلامی و معاشرت
۵۔ سائنس (انٹر کے معیار کے مطابق فزکس، کیمسٹری، بایولوجی) سے منتخب اجزا، نیز فرسٹ ایڈ اور نرسنگ
۶۔ عربی ادب مع تاریخ۔

تشریحات و تجاویز:۔

۱۔ اسلامیات میں پنجم تک ناظرہ، سیرت، فقہ اور تاریخ شامل ہے اور ششم و ہفتم تک اخلاق و معاشرت، فقہ و عقاید، سیرت تاریخ اسلام شامل ہے۔

۲۔ سائنس میں فزکس، کیمسٹری، بایولوجی شامل ہے۔ یہاں ہفتم تا دوازدہم پریکٹیکل کا نظم بھی ہونا چاہیے۔

۳۔ حساب سے مراد ریاضی، الجبرا، جیومیٹری، مساحت اور گراف ہے۔

۴۔ مادری زبان سے مراد اردو ہو سکتی ہے اور قومی زبان کا مطلب ہندی ہے۔

۵۔ مختلف مدارس میں گھنٹوں کی تعداد مختلف ہے۔ مناسب ہوگا کہ روزانہ آٹھ گھنٹے ہوں اور ہفتے میں ۴۸ گھنٹے ہوں۔

۶۔ فی الحال یہ مناسب ہوگا کہ ترقی اردو بورڈ یا یو۔پی بورڈ کی سائنس کی کتابیں داخل نصاب کر لی جائیں اور یونیورسٹی میں داخلے کی شرط کم از کم ہائی اسکول کے معیار کے مطابق سائنس سے واقفیت ہونی چاہیے جس میں کچھ پریکٹیکلس (practicals) بھی شامل ہوں۔

دوازدہم کے بعد اختصاصی تعلیم کا وہ طریقہ اختیار کیا جائے جو کو طویل تجربات کے بعد دنیا نے مفید پایا ہے۔ دورِ حاضر میں علوم اس قدر وسعت اختیار کر چکے ہیں کہ کسی شعبۂ علم میں بھی کامل ہونا ممکن نہیں ہے۔

> کسی قوم کے لیے اس سے زیادہ بے عزتی نہیں کہ وہ اپنی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے بزرگوں کی کمائی کو کھو دے۔
>
> سرسید

یو۔پی کے پچیس انٹر کالجوں میں انٹر اور ہائی اسکول بورڈ امتحانوں کے نتائج پر

اکیاسی ہونہار طلباء کو شیروانی انعامات ۱۹۸۷ء

احمد رشید شیروانی

الحاجہ بیگم تارا رشید شیروانی (چیرمین بھارت سیوا ٹرسٹ چیرمین
انڈسٹریل سنڈیکیٹ لمیٹڈ اور منیجنگ ڈائرکٹر شیروانی شوگر سنڈیکیٹ
ر) کی طرف سے یو۔پی کے پچیس ۲۵ بوائز انٹر کالجوں کے اکیاسی ہونہار طلباء
یے انٹر بورڈ امتحان اور ہائی اسکول بورڈ امتحان ۱۹۸۷ء کے نتائج پر شیروانی
مات ہر ایک کالج کے پرنسپل صاحب کی معرفت بھیجے گئے۔ ان کے نام
کیے جا رہے ہیں۔

صرف چار بوائز انٹر کالج ہیں جہاں دونوں بورڈ امتحانوں میں
یا اس سے زیادہ فرسٹ ڈویژن آئیں اور اس طرح ان کالجوں میں سے
ایک میں پورے ایک ایک ہزار روپیے کے انعامات بھیجے گئے۔ نمبر ۱ کو
ائی سو روپیے۔ نمبر ۲ کو ڈیڑھ سو روپیے۔ نمبر ۳ کو سو روپیے۔

مفتاح العلوم مسلم کالج۔ چاندپور۔ ضلع بجنور۔

انٹر۔ نمبر ۱ فیروز راٹھور سلمہٗ نمبر ۲ کلدیپ سنگھ سلمہٗ نمبر ۳ احمد حسن سلمہٗ
اسکول۔ نمبر ۱ سمر پال سنگھ سلمہٗ نمبر ۲ عبدالستار سلمہٗ نمبر ۳ سرتاج احمد سلمہٗ

حافظ محمد صدیق اسلامیہ انٹر کالج اٹاوہ۔

انٹر: نمبر ۱ بھینش کمار سلمہٗ۔ نمبر ۲ سنتوش کمار دوبے سلمہٗ نمبر ۳ راہل
ری سلمہٗ۔ ہائی اسکول: نمبر ۱ انوپم چترویدی سلمہٗ نمبر ۲ اشیش
بے سلمہٗ نمبر ۳ مہندر سنگھ پال سلمہٗ۔

مسلم قدرت انٹر کالج سیوہارہ۔ ضلع بجنور۔

انٹر: نمبر ۱ وجے کمار دراگ سلمہٗ نمبر ۲ عبدالقادر سلمہٗ نمبر ۳ جاوید
اقبال صدیقی سلمہٗ۔ ہائی اسکول۔ نمبر ۱ سنجیو کمار تیاگی سلمہٗ نمبر ۲ اشوک
چودھری سلمہٗ نمبر ۳ ستیش کمار شرما سلمہٗ۔

اسلامیہ انٹر کالج۔ فیروز آباد۔ ضلع آگرہ۔

انٹر: نمبر ۱ محمد رئیس سلمہٗ نمبر ۲ سیف اللہ سلمہٗ نمبر ۳ محمد ندیم سلمہٗ
ہائی اسکول: نمبر ۱ محمد عثمان سلمہٗ نمبر ۲ ارشد علی سلمہٗ نمبر ۳ (الف) محمد
یوسف سلمہٗ نمبر ۳ (ب) ایس ریحان حیدر نقوی سلمہٗ۔ (اس کالج میں ہائی اسکول
میں تیسرا انعام دو طلباء میں برابر برابر تقسیم کیا گیا)۔

دو کالج ایسے ہیں جہاں پانچ پانچ طلباء نے انعامات جیتے۔

مجیدیہ اسلامیہ انٹر کالج۔ الہ آباد۔

انٹر: نمبر ۱ محمود علی فاروقی سلمہٗ نمبر ۲ فیصل نتین سلمہٗ۔ نمبر ۳ رام کرشن
پانڈے سلمہٗ۔ ہائی اسکول نمبر ۱ محمد شکیل سلمہٗ نمبر ۲ شوکت علی خاں سلمہٗ
نمبر ۳ فضل الرحمٰن اسلامیہ انٹر کالج۔ بریلی۔

انٹر: نمبر ۱ اجے کھنہ سلمہٗ نمبر ۲ ونیت سکسینہ سلمہٗ۔ ہائی اسکول
نمبر ۱ آشتوش گپتا سلمہٗ نمبر ۲ پردیپ کمار یادو سلمہٗ نمبر ۳ اوم پرکاش پاریکھ سلمہٗ

چار کالج ایسے ہیں جہاں چار چار طلباء نے انعامات جیتے۔

احمد سعید خاں رفاہ عام کالج۔ خورجہ۔ ضلع بلند شہر۔

انٹر: نمبر ۱ کالی چرن سلمہٗ نمبر ۲ کوشل کمار گپتا سلمہٗ۔

جناب احمد رشید شیروانی ۱۲۔ اے کناٹ پلیس۔ نئی دہلی۔

ہائی اسکول : م۱ غلام رسول سلمہ، م۲ ایم۔ پرویز انصاری سلمہ۔
ایم۔ ایم انٹر کالج۔ نگینہ ضلع بجنور
انٹر م۱ اروند شرما سلمہ۔
ہائی اسکول م۱ نیل کمل رائے زادہ سلمہ، م۲ شری رام سلمہ، م۳ ضیغم حسین سلمہ۔
مسلم انٹر کالج اساره۔ ضلع میرٹھ
انٹر : م۱ رئیس احمد سلمہ۔
ہائی اسکول : م۱ محمد خالد خاں سلمہ۔ م۲ سبھاش چند سلمہ
م۳ جمیل احمد سلمہ۔
نیشنل انٹر کالج۔ محمد آباد گوہنہ ضلع اعظم گڑھ
انٹر : م۱ نظام الدین سلمہ۔
ہائی اسکول م۱ ریحانہ خاتون سلمہا۔ م۲ انجم افشاں سلمہا
م۳ پونم جے سریا سلمہا۔
چار کالج ایسے ہیں جہاں تین تین طلباء نے انعامات جیتے۔
شیروانی کالج نیولی ضلع ایٹہ
انٹر م۱ ہری شنکر ورما سلمہ، م۲ مدھو سلمہا۔
ہائی اسکول : م۱ دیپک کمار شرما سلمہ۔
امام المدارس انٹر کالج۔ امروہہ ضلع مرادآباد۔
انٹر : م۱ سیّد جعفر نقوی سلمہ، م۲ اسرار احمد سلمہ۔
ہائی اسکول : دیویندر پال سنگھ سلمہ۔
ھکبر میموریل انٹر کالج۔ گونڈہ
انٹر : صفر۔
ہائی اسکول : م۱ محمد اجمل خاں سلمہ، م۲ نسیم اختر خاں سلمہ، م۳ عزیز الرحمٰن سلمہ
مولانا آزاد انٹر کالج قادرآباد ضلع بستی۔
انٹر صفر۔ ہائی اسکول م۱ وسیم احمد سلمہ، م۲ رام گوپال سلمہ، م۳ سیّد رازداں اختر رضوی سلمہ۔
سات کالج ایسے ہیں جہاں دو دو طلباء نے انعامات جیتے
ہند انٹر کالج سنبھل ضلع مرادآباد۔

انٹر : م۱ دیپک گپتا سلمہ۔
ہائی اسکول م۱ فیروز اختر سلمہ
صدیق نیشنل کالج۔ پیلی بھیت
انٹر م۱ عقیل احمد سلمہ، ہائی اسکول م۱ آلوک سنگھ سلمہ
صدیق فیض عام انٹر کالج۔ کانپور
انٹر : م۱ عبدالصمد سلمہ۔ ہائی اسکول م۱ ظفر عالم سلمہ۔
عبدالکریم خاں انٹر کالج۔ امروہہ ضلع مرادآباد
انٹر : صفر۔ ہائی اسکول : م۱ رئیس الدین سلمہ م۲ ناصر حسین سلمہ۔
آزاد گاندھی انٹر کالج۔ کاسگنج۔ ضلع ایٹہ۔
انٹر : م۱ عظیم تفسیر خاں سلمہ، ہائی اسکول : م۱ محمد طارق خاں سلمہ۔
سنی انٹر کالج۔ لکھنؤ۔
انٹر : صفر۔ ہائی اسکول م۱ اجتبیٰ حسین سلمہ، م۲ عرفان صدیقی سلمہ۔
اسلامیہ انٹر کالج۔ سہارنپور۔
انٹر : م۱ ولی محمد سلمہ۔ م۲ ساجد علی سلمہ۔ ہائی اسکول : صفر
چار کالج ایسے ہیں جہاں ایک ایک طالب علم نے فرسٹ ڈویژن حاصل کی اور ڈھائی سو روپے کا انعام جیتا۔
بجنور انٹر کالج۔ بجنور
انٹر م۱ ندیم ناہد سلمہ۔ ہائی اسکول : صفر
ممتاز انٹر کالج۔ لکھنؤ۔
انٹر : صفر۔ ہائی اسکول : م۱ محمد عارف سلمہ۔
انصار انٹر کالج۔ مرادآباد
انٹر : صفر۔ ہائی اسکول م۱ محمد عارف سلمہ۔
مولانا آزاد انٹر کالج۔ انجان شہید۔ اعظم گڑھ
انٹر : صفر۔ ہائی اسکول م۱ رام جی گپتا سلمہ۔

ان اکیاسی میں سے تینتیس نے انٹر امتحان میں انعامات جیتے۔ ان میں سے بیس مسلم طلباء ہیں اور بارہ غیر مسلم طلباء اور ایک غیر مسلم طالبہ۔ اڑتالیس نے ہائی اسکول امتحان میں انعامات جیتے۔ ان میں سے ستائیس مسلم طلباء ہیں۔ دو مسلم طالبات۔ اٹھارہ غیر مسلم طلباء اور ایک غیر مسلم طالبہ۔

مولانا ابوالکلام آزاد

سید مشرف علی

۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء مولانا آزاد کی تاریخ وفات ہے۔ دوسرے
الفاظ میں یہ وہ تاریخ ہے جس دن علم و دانش، فکر و صحافت، تقریر و تالیف کا
یہ مجسم سپرد خاک ہوا۔ مولانا کی شخصیت ان خصوصیات سے ایسی منور تھی کہ
ن کی زندگی کا تو ذکر ہی کیا موت کے بعد بھی ہندوستان کی علمی ادبی اور سیاسی
فضا اُن کے ان نقوش سے روشن و معطر ہے۔ مولانا کی زندگی میں ممکن ہے کہ
ان کی خصوصیات و خدمات کا اعتراف اتنا ہمہ گیر نہ ہوا ہو مگر اب اُن کی شخصیت
کا عہد آفریں ہونا ایک مسلمہ حقیقت بن چکا ہے جس کا شاید ہی کوئی شخص منکر
ہو۔ مولانا کی ادبی و سیاسی خدمات ملک و قوم کی خدمت کے جذبے
کے تحت تھیں۔ انہوں نے جو بھی خدمات انجام دیں، اُن کا مقصد ذاتی
نام و نمود نہیں بلکہ قومی فلاح اور عوام کا ذہنی و فکری معیار بلند کرنا تھا۔

مولانا نے اپنی سیاسی کاوشوں میں ملک کے ہر فرقے اور مذہب
کے لوگوں کا یکساں خیال رکھا اور اپنے سیاسی افکار کے ذریعے باہمی اتحاد
دوستی اور برادرانہ یگانگت کے جذبات کی آبیاری کرتے رہے۔ یہ وہ
جزائے سیاست ہیں جن پر آزادی حاصل ہونے کے بعد نئے ہندوستان
کی تعمیر ہوئی اور اس کا دستور مرتب ہوا۔

مولانا پورے عزم اور استقامت کے ساتھ کانگریسی اور نیشنلسٹ
تھے۔ مخالفت اور اعتراضات کے باوجود مولانا اپنے سیاسی مسلک پر پختگی
سے قائم رہے۔ مولانا کی کانگریس میں شمولیت کا اہم مقصد ہند و مسلم
اتحاد کو برقرار رکھنا تھا۔ مولانا کو بحیثیت مسلمان کانگریس کے رکن جب کبھی
شک و شبہ سے دیکھتے تو اُن کے جذبات کو بے انتہا ٹھیس پہنچی۔ محکمہ تعلیم
کی وزارت کے دوران مولانا نے دارالمصنفین اعظم گڑھ کو پچاس ہزار کی
رقم حکومت سے دلوائی۔ اس پر پارلیمنٹ میں اعتراضات ہوئے جن کے
جواب میں مولانا نے ایسی معرکتہ الآرا تقریر کی کہ اس کی مثال پارلیمنٹ
کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے، جو اس وقت
ہندوستان کے وزیر اعظم ہونے کے ساتھ دنیا کی عظیم شخصیت بھی تھے۔
مولانا کی علمیت، وطن دوستی اور غیر جانب داری کا واشگاف الفاظ میں
اعتراف کیا۔ شاید یہ پہلا موقع تھا جب پنڈت نہرو نے مولانا کی تقریر
ختم ہونے پر بے اختیار تالیاں بجائی تھیں۔ بعض اخباروں نے یہ بھی لکھا تھا
کہ تالیاں بجاتے بجاتے پنڈت جی کھڑے ہو گئے تھے۔

مولانا کا اصل نام محی الدین احمد ہے، ۱۲ر نومبر ۱۸۸۸ء میں مکہ معظمہ
میں پیدا ہوئے، ان کے والد کا نام مولانا خیر الدین تھا جو اپنے وقت کے
عرب کے مشہور عالم اور بزرگ انسان تھے۔ علاج کے سلسلے میں ۱۸۹۰ء
میں مولانا کے والد کلکتہ گئے تھے جہاں اپنے معتقدین کے اصرار پر رُک
گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہ مولانا کے لڑکپن کا زمانہ تھا
انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ نوعمری میں تصنیف و
تالیف کی طرف راغب ہوئے۔ ابھی اٹھارہ ہی سال کے تھے کہ ان کی تحریروں
کا ڈنکا ہر طرف بجنے لگا۔ ان کے لسان الصدق اور الہلال کے
مضامین پڑھ کر مولانا حالی اتنے متاثر ہوئے کہ ان سے ملنے کا اشتیاق
ظاہر کیا۔ مولانا آزاد جب مولانا حالی سے ملنے گئے تو انہوں نے مولانا آزاد
سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ

" آپ کے والد صاحب کی تالیفات سے میں بہت
متاثر ہوں"

ڈاکٹر سید مشرف علی، ریڈر ڈپارٹمنٹ آف لا - اے - ایم - یو - علی گڑھ

مولانا آزاد نے جب حقیقت بتائی تو مولانا حالی کو سخت حیرت ہوئی کہ یہ اٹھارہ سال کی عمر کا لڑکا اور صحافت کا اتنا بلند معیار۔

مولانا قدرتی طور پر انتہائی بلند صحافی اور عالی ہمت انسان تھے۔ اسی لیے موصوف نے اپنے نام کے ساتھ آزاد کا اضافہ پسند کیا۔ ان کا تعقل، آزادانہ اور بے لاگ تحریر، حق گوئی و حق شناسی یہ وہ جوہر ہیں جو ان کی شخصیت کی تکمیل کرتے ہیں۔ اپنی اسی انفرادی شخصیت کے اظہار کے لیے انہوں نے کلکتہ سے ایک ہفت روزہ الہلال نکالنا شروع کیا لیکن برطانوی حکومت ان کے طرز تحریر اور خیالات کی متحمل نہ ہو سکی اور اس نے ان سے دو ہزار روپیے کی ضمانت طلب کی۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کو بنگال چھوڑنے کا بھی حکم دے دیا۔ اس پر مولانا کو مجبوراً رانچی آنا پڑا جہاں وہ تقریباً دو سال تک رہے۔ اس کے بعد مولانا نے اپنا دوسرا اخبار البلاغ کے نام سے نکالنا شروع کیا مگر اس کی اشاعت بھی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔ حکومت برطانیہ کے اس رویے سے مولانا کا ذہن باغی بن گیا۔ ۱۹۲۰ء میں حکیم اجمل خاں کے یہاں دہلی میں مولانا کی گاندھی جی سے پہلی ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات مولانا کی زندگی کا ایک اہم موڑ ہے۔ اس موڑ نے ان کو گاندھی جی کا نہایت قریبی ساتھی بنا دیا اور وہ جد وجہد آزادی کے محاذ پر تن من دھن سے لگ گئے۔ اس سلسلے میں مولانا متعدد بار جیل گئے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ایام اسیری میں بھی ان کا تصنیفی کام جاری رہا۔ غبار خاطر جو جناب حبیب الرحمن خاں شیروانی کے نام مولانا کے خطوط کا مجموعہ ہے، احمد نگر کے ایام اسیری کی یادگار ہے۔ غبار خاطر صرف مولانا کے خطوط کا ایک مجموعہ ہی نہیں ہے ایک ادبی شاہکار بھی ہے جس کی ہر ہر سطر سے دانائی و حکمت کے نکات اخذ کیے جا سکتے ہیں۔

یہ ضرور ہے کہ مولانا نے غبار خاطر میں اشعار کا بے انتہا سہارا لیا ہے جس کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے خیالات کی روانی پر اثر پڑتا ہے اور یہ عمل فن نثر نگاری کے انتہائی نازک اصولوں کے خلاف کہلانے کا مستحق ہے۔ ممکن ہے کہ اہل قلم اس کو فنی اعتبار سے نثر نگاری پر ہلکی سی ضرب محسوس کریں مگر غبار خاطر میں اشعار کا ایسا برجستہ استعمال کیا گیا ہے کہ وہ نثر کا ایک حصہ بن کر رہ گئے ہیں۔

مولانا کی تصانیف میں غبار خاطر کے علاوہ تذکرہ اور ترجمان القرآن انتہائی امتیازی حیثیت کی حامل اور اعلیٰ تصانیف ہیں۔ یہ دونوں کتابیں اس دور کی ادبی اور تفسیری شہ پارے ہیں جن کے مطالعے سے خیالات کی گزرگاہیں منور ہو جاتی ہیں۔ مولانا کی آخری تصنیف "انڈیا ونس فریڈم" ہے یہ کتاب مولانا نے اردو میں املا کرائی تھی جس کا انگریزی ترجمہ پروفیسر ہمایوں کبیر نے کیا۔

مولانا کی سیاسی زندگی سے ان کے ادبی مشاغل ضرور متاثر ہوتے مگر اس کے باوجود مولانا نے ادب کی جو خدمت انجام دی ہے، وہ موجودہ ادب کا انتہائی بیش قیمت سرمایہ ہے۔

مولانا کی سیاسی زندگی ادبی زندگی سے زیادہ واضح اور نمایاں ہے۔ مولانا ہندوستان کی جنگ آزادی میں جس ایثار و جانفشانی اور استقلال کے ساتھ شریک رہے وہ جد وجہد آزادی کی تاریخ کا ایک زریں باب ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے علی گڑھ میں مولانا آزاد لائبریری کا سنگِ بنیاد رکھنے کے بعد اپنی تقریر میں کہا تھا

"مولانا کی قربت میں قید خانوں میں رہ کر جتنا پڑھا اور سیکھا اتنا یونیورسٹی میں نہیں پڑھا۔"

مولانا آزاد یقیناً علم و دانش کے پیکر مجسم تھے جس کو بھی ان کی قربت حاصل ہوتی وہ اُن کی صفات سے ضرور فیض یاب ضرور ہوتا۔

آزادی کے بعد مولانا آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔ مولانا کا انتقال بحیثیت وزیر ہوا اور جامع مسجد دہلی کے سامنے ایک کشادہ میدان کے بیچ میں سپرد خاک کیے گئے۔

بظاہر مولانا تہہ خاک ہیں مگر مرحوم کی امتیازی خصوصیات اور ادبی و سیاسی خدمات زمانۂ دراز تک ہندوستان کی فضا کو منور رکھیں گی۔

> جب تک ہماری قوم سے کاہلی یعنی دل کو بیکار پڑا رکھنا نہ چھوٹے گا
> اس وقت تک ہم کو اپنی قوم کی بہتری کی کچھ توقع نہیں ہے۔"
> سرسیدؒ

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۷ | مارچ ۸۸ | شمارہ ۳

سرپرست: جناب سید ہاشم علی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

ایڈیٹر
اسرار احمد

جوائنٹ ایڈیٹر
کبیر احمد جائسی

اسسٹنٹ ایڈیٹر
شباب الدین

تزئین
سرفراز

انچارج سرکولیشن
مستقیم احمد خاں

مقالہ وخط بھیجنے کا پتہ
ڈاکٹر کبیر احمد جائسی
ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ۔
انڈیا ______

زر سالانہ

انڈیا ...	RS.	30·00
بیرونی ممالک	US $	20·00 ہوائی ڈاک
	US $	8·00 عام ڈاک

ترسیل زر کا پتہ
ایڈیٹر، تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

Editor: TAHZIBUL AKHLAQ & NISHANT,
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY.

مندرجات

اداریہ

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تہذیب الاخلاق کو اپنے مشن میں کچھ کچھ کامیابی ہونے لگی ہے۔ اس احساس کی دو وجہیں ہیں، اول تو یہ کہ اب تہذیب الاخلاق ہندوستان کے اُن دور دراز اور کور دہ علاقوں میں جانے لگا ہے جہاں اردو کے بہت کم رسالے اور اخبارات پہنچ پاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ نئی نسل، خواہ وہ دینی مدرسوں میں زیرِ تعلیم ہو یا سیکولر اسکولوں میں، تہذیب الاخلاق کا نہ صرف مطالعہ کرتی ہے بلکہ اس کا بے چینی سے انتظار بھی کیا کرتی ہے۔ اس کے وہ چھوٹے چھوٹے عام معلوماتی مقالے طلبا میں خاص طور سے مقبول ہیں، جن کا تعلق سائنسی موضوعات کے کسی نہ کسی پہلو سے ہوتا ہے۔ دوم یہ کہ اس کی مقبولیت سے کچھ لوگ پریشان ہونے لگے ہیں، ان کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ جن تعصبات و تاملات کے اسیر ہیں، ان کی دیواریں اب زمین پر آنے ہی والی ہیں۔ اسی وجہ سے وہ لاادریوں کی طرح اول فول بکنے لگے ہیں۔ ایسے حضرات جب علمی اور منطقی انداز سے ہماری کوئی گرفت نہیں کر پاتے تو اپنا وہی پرانا نسخہ ہم پر آزمانا چاہتے ہیں جو اُن کے ہم قبیل حضرات صدیوں سے عامۃ المسلمین پر آزماتے رہے ہیں۔ یعنی ہم کو منافق اور حسن بن صباح کی اولاد قرار دینے کو اپنا دین و ایمان سمجھتے ہیں۔

آج کے دور میں منافق کون ہے اور کون نہیں؟ اس بات کو جاننے کے لیے ہمارے پاس کوئی واضح پیمانہ یا معیار نہیں ہے اس کا فیصلہ تو اللہ ہی کرے گا کہ منافق کون ہے اور مومن کون؟ البتہ اپنے بارے میں ہم اتنی بات ضرور عرض کریں گے کہ ہم اتنی جرات اور ہمت رکھتے ہیں کہ جس بات کو درست سمجھتے ہیں، اس کا بہ بانگ دہل اعلان کرتے ہیں۔ "ہوائے مصلحت" آج تک ہمارا رخ موڑنے میں کامیاب نہیں ہوئی ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کا کرم اسی طرح ہمارے شامل حال رہا تو مصلحت کی کوئی آندھی ہم کو جادۂ مستقیم سے نہ ہٹا سکے گی۔ اب رہی حسن بن صباح کی اولاد ہونے کی بات تو ہماری طرف سے علمائے انساب کو کھلی ہوئی دعوت ہے کہ وہ خوب چھان پھٹک کر اور بال کی کھال نکال کر اس بات کی تحقیق فرمالیں کہ حسن بن صباح اور اُس کی ذریات سے ہمارا کوئی نسبی تعلق نہیں ہے اور جو حضرات ہم کو حسن بن صباح کی اولاد قرار دے رہے ہیں، وہ جان بوجھ کر ہم پر اتہام لگا رہے ہیں۔ جان بوجھ کر کسی کو متہم کرنے کی سزا اللہ تعالیٰ نے کیا مقرر کر رکھی ہے، اس سے ہم دنیاداروں سے کہیں زیادہ وہ حضرات واقف ہیں جو اپنی انا کے طلسم میں گرفتار، اتہام سازی کے "کارِ خیر" میں مصروف ہیں۔

بات پرانی سہی لیکن یہاں اس کا ذکر بے محل نہ ہوگا، ایک بار کا ذکر ہے۔ ایک دور افتادہ گاؤں کے

لوگوں میں یہ جذبہ بیدار ہوا کہ ان کے گاؤں سے سڑک نکالی جائے. تاکہ وہ گاؤں نزدیکی قصبہ کے مزید قریب ہو جائے اور اس طرح وہاں کے رہنے والوں کو قصبہ تک اور پھر وہاں سے شہر جانے میں کوئی خاص دقت نہ ہو۔ اس وقت تک اس گاؤں کی حالت یہ تھی کہ تازی تو کجا تین دن کی باسی سبزی بھی وہاں کے رہنے والوں کو نہ مل پاتی۔ گاؤں کا سبزی اُگانے والا اتنی سبزی نہ اُگا پاتا جو پورے گاؤں کی ضرورت کو پورا کر سکے۔ اس لیے ناچار دال روٹی پر ہی لوگ گزارا کرتے۔ رسل و رسائل کے ذرائع سے محروم ہونے کی وجہ سے وہاں نہ تو روز ڈاکیہ آپاتا اور نہ ہی کوئی اخبار۔ جو بچے تعلیم حاصل کرنے قصبہ جایا کرتے وہ ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں سے گرتے پڑتے آیا جایا کرتے۔ اسی لیے لوگ تن دہی سے اس بات میں لگ گئے کہ کسی طرح سڑک بن جائے تاکہ پاس پڑوس کے لوگوں سے رابطہ بڑھے، ڈاک برابر آسکے، طالبان علم بلا کسی دقت کے آتے جاتے رہیں اور رسل و رسائل کے ذرائع حاصل ہونے کے فوائد سے پورا گاؤں بہرہ ور ہو سکے۔ مگر نہ جانے کیوں چند لوگ ایسے سامنے آگئے، جو کسی قیمت پر اس بات کے لیے تیار نہ تھے کہ گاؤں سے کوئی سڑک نکلے۔ پہلے تو پردھان زچ ہو ہو کر ان لوگوں کو سمجھاتا رہا مگر جب وہ لوگ ٹس سے مس نہ ہوئے تو اس نے پنچایت بلائی۔ پنچایت جب اپنے شباب پہ پہنچی اور بحث و مباحثہ کا بازار گرم ہوا تو یہ عقدہ کھلا کہ لوگ سڑک نکلنے کے کیوں مخالف ہیں۔ اصل بات یہ تھی کہ یہ وہ لوگ تھے جن کا خیال تھا کہ سڑک بننے کے بعد اُسی راستے سے گاؤں میں چور آنے لگیں گے اور اُن کے یہاں چوریوں کی وارداتیں بڑھ جائیں گی

بعینہٖ حال ان لوگوں کا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اگر دینی مدارس میں علوم جدیدہ کی تعلیم دی جائے گی تو اس سے ان کے عقائد معرض خطر میں پڑ جائیں گے۔ یعنی اُن کے عقاید اتنے کمزور ہیں کہ ایک نظریاتی علم جو وقتاً فوقتاً بدلتا رہتا ہے، ان کے ابدی عقاید کو ملیامیٹ کر دے گا۔ اگر ایسا ہوا بھی تو اس میں قصور کسی نظریاتی علم کا نہ ہوگا بلکہ کھوٹ اپنے ہی ایمان و یقین میں ہوگا۔

قارئین تہذیب الاخلاق میں سے بہتوں کو اس بات کا علم ہو چکا ہوگا کہ اس بار کا اردو زبان کا ساہتیہ اکاڈمی انعام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایک استاد اور برصغیر ہند و پاک کے نامور شاعر پروفیسر شہریار کو ملا ہے۔ اس انعام سے صرف پروفیسر شہریار ہی کی توقیر میں اضافہ نہیں ہوا ہے، بلکہ ان کی مادر علمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا نام بھی اونچا ہوا ہے۔ ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت پروفیسر شہریار کو اس انعام کے حصول کے ساتھ ساتھ اپنی مادر علمی کا نام اونچا کرنے پر ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ وہ اسی طرح علمی فتوحات میں منہمک رہیں گے

این دعا از من و از جملہ جہان آمین باد

کبیر احمد جائسی

گزرا ہوا زمانہ

سر سید احمد خاںؒ

برس کی اخیر رات کو ایک بڈھا اپنے اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا ہے۔ رات بھی ڈراؤنی اور اندھیری ہے۔ گھٹا چھا رہی ہے، بجلی تڑپ تڑپ کر کڑکتی ہے آندھی بڑے زور سے چلتی ہے۔ دل کانپتا ہے، اور دم گھبراتا ہے۔ بڈھا نہایت غمگین ہے؛ مگر اس کا غم، نہ اندھیرے گھر پر ہے، نہ اکیلے پن پر، اور نہ اندھیری رات، بجلی کی کڑک اور آندھی کی گونج پر، اور نہ برس کی اخیر رات پر۔ وہ اپنے پچھلے زمانہ کو یاد کرتا ہے اور جتنا زیادہ یاد آتا ہے، اتنا ہی غم بڑھتا ہے۔ ہاتھوں سے ڈھکے ہوئے منہ پر، آنکھوں سے آنسو بھی بہے چلے جاتے ہیں۔

پچھلا زمانہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے۔ اپنا لڑکپن اس کو یاد آتا ہے جبکہ: اس کو کسی چیز کا غم اور کسی بات کی فکر، دل میں نہ تھی۔ روپیہ اشرفی کے بدلے ریوڑی اور مٹھائی اچھی لگتی تھی۔ سارا گھر، ماں باپ، بھائی بہن اس کو پیار کرتے تھے۔ پڑھنے کے لیے، چھٹی کا وقت جلد آنے کی خوشی میں، کتابیں بغل میں لے مکتب میں چلا جاتا تھا۔ مکتب کا خیال آتے ہی اس کو اپنے ہم مکتب یاد آتے تھے۔ وہ اور زیادہ غمگین ہوتا تھا اور بے اختیار چلا اٹھتا تھا:

”ہائے وقت! ہائے وقت!! ہائے گزرے ہوئے زمانے!!
افسوس کہ میں نے تجھے بہت دیر میں یاد کیا!“

پھر وہ اپنی جوانی کا زمانہ یاد کرتا تھا: اپنا سرخ و سفید چہرہ، سڈول ڈیل، بھرا بھرا بدن، رسیلی آنکھیں، موتی کی لڑی سے دانت، امنگ سے بھرا ہوا دل، جذباتِ انسانی کے جوشوں کی خوشی، اُسے یاد آتی تھی۔ اس کی آنکھیں میں اندھیرا چھائے ہوئے زمانہ میں، ماں باپ جو نصیحت کہتے تھے، اور نیکی اور خدا پرستی کی بات بتلاتے تھے، وہ یہ کہتا تھا:

”او! ابھی بہت وقت ہے۔“

بڑھاپا آنے کا کبھی خیال بھی نہ کرتا تھا۔ اس کو یاد آتا تھا، اور افسوس کرتا تھا کہ:

”کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی میں اس وقت کا خیال کرتا، اور خدا پرستی اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا، اور موت کے لیے طیار رہتا! آہ! وقت گزر گیا! آہ وقت گزر گیا۔ اب پچھتائے کیا ہوتا ہے؟ افسوس! میں نے آپ اپنے تئیں ہمیشہ یہ کہہ کر برباد کیا کہ ابھی وقت بہت ہے۔“

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور ٹٹول ٹٹول کر کھڑکی تک آیا۔ کھڑکی کھولی۔ دیکھا کہ رات ویسی ہی ڈراؤنی ہے۔ اندھیری گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی کی کڑک سے دل پھٹا جاتا ہے۔ ہولناک آندھی چل رہی ہے۔ درختوں کے پتے اڑتے ہیں اور ٹہنے ٹوٹتے ہیں۔ تب وہ چلا کر بولا:

”ہائے! ہائے!! میری گزری ہوئی زندگی بھی ویسی ہی ڈراؤنی ہے، جیسی یہ رات۔“

یہ کہہ کر پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنے ماں باپ، بھائی بہن، دوست آشنا یاد آئے، جن کی ہڈیاں قبروں میں گل کر خاک ہو چکی تھیں۔ ماں گویا محبت سے اس کو چھاتی سے لگائے، آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑی ہے، یہ کہتی ہوئی کہ:

”ہائے بیٹا! وقت گزر گیا!“

باپ کا نورانی چہرہ اس کے سامنے ہے اور اس میں سے یہ آواز آتی ہے کہ:

”کیوں بیٹا! ہم تمہارے ہی بھلے کے لیے نہ کہتے تھے۔“

بھائی بہن دانتوں میں انگلی دیے ہوئے خاموش ہیں، اور اُن کی آنکھوں سے

آنسوؤں کی لڑی جاری ہے۔ دوست آشنا سب غمگین کھڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ:

"اب ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

ایسی حالت میں اس کو اپنی وہ باتیں یاد آتی تھیں جو اس نے نہایت بے پروائی، بے مروّتی اور کج خلقی سے اپنے ماں باپ، بھائی بہن، دوست آشنا کے ساتھ برتی تھیں۔ ماں کو رنجیدہ رکھنا، باپ کو ناراض کرنا، بھائی بہن سے بے مروّت رہنا، دوست آشنا کے ساتھ ہمدردی نہ کرنا، یاد آتا تھا۔ اور اس پیران گلی ہڈیوں میں سے ایسی محبت کا دیکھنا اس کے دل کو پاش پاش کرتا تھا۔ اس کا دم چھاتی میں گھٹ جاتا تھا، اور یہ کہہ کر چلّا اٹھتا تھا:

"ہائے وقت نکل گیا! ہائے وقت نکل گیا!! اب کیوں کر اس کا بدلہ ہوگا!"

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا اور ٹکراتا لڑکھڑاتا کھڑکی تک پہنچا۔ اس کو کھولا اور دیکھا کہ ہوا کچھ ٹھہری ہے، اور بجلی کی کڑک کچھ تھمی ہے، پر رات ویسی ہی اندھیری ہے۔ اس کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی، اور پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنا ادھیڑپن یاد آیا جس میں نہ وہ جوانی رہی تھی، اور نہ وہ جوانی کا جوبن؛ نہ وہ دل رہا تھا اور نہ دل کے ولولوں کا وہ جوش۔ اس نے اپنی اس نیکی کے زمانے کو یاد کیا، جس میں وہ بہ نسبت بدی کے، نیکی کی طرف زیادہ مائل تھا۔ وہ اپنا روزہ رکھنا، نمازیں پڑھنی، حج کرنا، زکوٰۃ دینی، بھوکوں کو کھلانا، مسجدیں اور کنوئیں بنوانا یاد کر کر اپنے دل کو تسلی دیتا تھا۔ فقیروں اور درویشوں کو جن کی خدمت کی تھی، اپنے پیروں کو جن سے بیعت کی تھی، اپنی مدد کو پکارتا تھا، مگر دل کی بے قراری نہیں جاتی تھی۔

وہ دیکھتا تھا کہ اس کے ذاتی اعمال کا اس تک خاتمہ ہے۔ بھوکے پھر ویسے ہی بھوکے ہیں۔ مسجدیں ٹوٹ کر یا تو کھنڈر ہیں یا پھر ویسے ہی جنگل ہیں۔ کنوئیں اندھے پڑے ہیں۔ نہ پیر نہ فقیر، کوئی اس کی آواز نہیں سنتا، اور نہ مدد کرتا ہے۔ اس کا دل گھبراتا اور سوچتا کہ

"میں نے کیا کیا، جو تمام فانی چیزوں پر دل لگایا! یہ کچھ سمجھ پہلے ہی کیوں نہ سوجھی؟ اب کچھ بس نہیں چلتا۔"

اور پھر یہ کہہ کر چلّا اٹھتا:

"ہائے وقت! ہائے وقت!! میں نے تجھ کو کیوں کھو دیا؟"

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اس کے پٹ کھولے تو دیکھا کہ آسمان صاف ہے۔ آندھی تھم گئی ہے۔ گھٹا کھل گئی ہے، تارے نکل آئے ہیں۔ ان کی چمک سے اندھیرا بھی کچھ کم ہوگیا ہے۔ وہ دل بہلانے کے لیے تاروں بھری رات کو دیکھ رہا تھا کہ یکایک اس کو آسمان کے بیچ میں ایک روشنی دکھائی دی اور اس میں ایک خوب صورت دلہن نظر آئی۔ اس نے ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنا شروع کیا۔

جوں جوں وہ اسے دیکھتا تھا، وہ قریب ہوتی جاتی تھی، یہاں تک کہ وہ اس کے بہت پاس آگئی۔ وہ اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیران ہوگیا اور نہایت پاک دل اور محبت کے لہجے سے اس سے پوچھا کہ:

"تم کون ہو؟"

وہ بولی:

"میں ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی ہوں۔"

اس نے پوچھا کہ:

"تمہاری تسخیر کا بھی کوئی عمل ہے؟"

وہ بولی:

"ہاں ہے! نہایت آسان پر بہت مشکل: جو مجھ کو تسخیر کرنا چاہے، انسان کی بھلائی میں کوشش کرے، کم سے کم اپنی قوم کی بھلائی میں دل و جان و مال سے ساعی ہو۔"

یہ کہہ کر وہ دلہن غائب ہوگئی، اور بڈھا پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اب پھر اس نے اپنا پچھلا زمانہ یاد کیا، اور دیکھا کہ اس نے اپنی پچپن برس کی عمر میں کوئی کام انسان کی بھلائی، اور کم سے کم اپنی قومی بھلائی کا، نہیں کیا تھا۔ اس کے تمام کام ذاتی غرض پر مبنی تھے۔ نیک کام جو کیے تھے ثواب کے لالچ، اور گویا خدا کو رشوت دینے کی نظر سے کیے تھے۔ خالص قومی بھلائی کی خالص نیت سے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

اپنا حال سوچ کر وہ اس دلفریب دلہن کے ملنے سے مایوس ہوا۔ اپنا اخیر زمانہ دیکھ کر آئندہ کرنے کی بھی کچھ امید نہ پائی۔ تب تو نہایت مایوسی کی حالت میں بیقرار چلّا اٹھا:

ہائے وقت ! ہائے وقت!! کیا پھر تجھے میں بلا سکتا ہوں ؟
ہائے میں دس ہزار دیناریں دیتا، اگر وقت پھر آتا' اور
میں جوان ہو سکتا!"

یہ کہہ کر اس نے ایک آہ سرد بھری اور بے ہوش ہو گیا۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ اس کے کانوں میں میٹھی میٹھی باتوں کی آواز آنے لگی۔ اس کی پیاری ماں اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اس کو گلے لگا کر، اس کی بلّی لی۔ اس کا باپ اس کو دکھائی دیا۔ چھوٹے چھوٹے بھائی بہن اس کے گرد آ کھڑے ہوئے۔

ماں نے کہا کہ :

" بیٹا! کیوں برس کے برس دن روتا ہے؟ کیوں تو بے قرار
ہے؟ کس لئے تیری ہچکی بندھ گئی ہے ؟ اُٹھ ! منہ ہاتھ
دھو! کپڑے پہن! نوروز کی خوشی منا! تیرے بھائی
بہن تیرے منتظر کھڑے ہیں۔"

تب وہ لڑکا جاگا اور سمجھا کہ میں نے خواب دیکھا' اور خواب میں بڈھا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا سارا خواب اپنی ماں سے کہا۔ اس نے سن کر اس کو جواب دیا :

" بیٹا! بس تو ایسا مت کرنا' جیسا اس پشیمان بڈھے نے
کیا، بلکہ ایسا کرنا جیسا تیری دلہن نے تجھ سے کہا۔"

یہ سن کر وہ لڑکا پلنگ پر سے کود پڑا' اور نہایت خوشی سے پکارا :

"او ! یہی میری زندگی کا پہلا دن ہے۔ میں کبھی اس بڈھے
کی طرح نہ پچھتاؤں گا' اور ضرور اس دلہن کو بیاہوں گا
جس نے ایسا خوبصورت اپنا چہرہ مجھ کو دکھلایا' اور
ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی اپنا نام بتلایا۔ او خدا !
او خدا !! تو میری مدد کر ! آمین !!"

پس اے میرے پیارے نوجوان ہموطنو ! اور اے میری قوم کے بچو !! اپنی قوم کی بھلائی پر کوشش کرو ! تاکہ اخیر وقت اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤ ! ہمارا زمانہ تو اخیر ہے۔ اب خدا سے یہ دعا ہے کہ کوئی نوجوان اُٹھے ، اور اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے

آمین !!

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور پھر اس کے ذریعے سے ہم طرح طرح کے پھل نکال لاتے ہیں' جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں' پہاڑوں میں بھی سفید سرخ اور گہری سیاہ دھاریاں پائی جاتی ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں۔ بے شک اللہ زبردست اور درگزر فرمانے والا ہے۔

(سورہ فاطر ۲۷ — ۲۸)

آئینہ میں بھی دیکھ لینا

سید حامد*

علی گڑھ میں ایک بزرگ رہتے ہیں۔ عمر اسی سے تجاوز کر چکی ہے۔ قوار ضعیف ہو چکے ہیں لیکن نہ ہوش و گوش میں کوئی کمی ہے نہ خیر سگالی کے دلولے میں نہ وفا شعاری کی آب و تاب میں۔ سہ لفظی نام کے پہلے دو اجزا مجھے یاد نہیں رہے، آخری نام بھٹاچاریہ ہے۔ "نیلی چھتری" میں رہتے ہیں۔ وہی "نیلی چھتری" جس کا ذکر بچپن میں سنتے تھے (شاید پڑھی نہیں، پڑھنی چاہیے تھی) اردو میں جاسوسی کی یہ اُن پہلی کتابوں میں سے تھی جنھیں شہرت نصیب ہوئی اور جو ہاتھوں ہاتھ لی گئیں۔ جہاں تک حافظہ کام کرتا ہے، اس جاسوسی ناول کے مصنف ظفر عمر صاحب تھے۔ روایت ہے کہ اس کتاب کی آمدنی سے انہوں نے کوٹھی تعمیر کی جس کا نام اعتراف اور تشکر کے بطور "نیلی چھتری" رکھا اسی نیلی چھتری کی کاٹیج میں پروفیسر بھٹاچاریہ رہتے ہیں، جن کی خدمات و خلوص کا اعتراف و تشکر ان سطور کا مقصود ہے۔

قیاس کہتا ہے کہ یونیورسٹی کی خدمت سے سبکدوش ہوئے انھیں ۱۵، ۲۰ برس ضرور ہو گئے ہوں گے لیکن اس سے وابستگی کا یہ عالم ہے کہ علی گڑھ کو وطن بنا لیا ہے۔ یونیورسٹی پر کوئی مصیبت آئے تو انہیں مغموم کر دیتی ہے۔ یونیورسٹی کو امتیازات حاصل ہوں تو یہ شاداں و فرحاں نظر آتے ہیں گویا خود انھیں کو یہ امتیازات ملے ہیں۔

انجینرنگ کے طالب علموں کو مقابلے کے امتحانات کے لیے تیار کرنے کا بیڑہ بھٹاچاریہ صاحب نے اُٹھا لیا ہے۔ ایک سال، تیاری کا جو خاص زمانہ ہوتا ہے، اس میں، انہیں دل کا دورہ پڑا۔ تلملاتے رہے، پیچ و تاب کھا رہے، کفِ افسوس ملتے رہے۔ بس نہیں چلتا تھا کہ بیماری کے بستر سے کھڑے ہوں۔ انہیں فکر تھی تو یہی کہ ان بچوں کا کیا ہوگا۔ اور کوئی ہوتا اس عالم میں دنیا ہی سے دل برداشتہ ہو جاتا۔ سوچتا کہ چل چلاؤ کا ہے۔ اب کیسی دنیا، کیسی یونیورسٹی اور کیسے اس کے طالب علم۔ لیکن بھٹا صاحب اور ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ محبت، ہمدردی، خدمت خیر اندیشی، وفا شعاری ان کا مذہب ہے۔ چنانچہ ان کی بے تابی کے آ بیماری بھی زیادہ دلوں تک نہ ٹک سکی۔ وہ دامن جھاڑ کر اُٹھ کھڑے ہو بیماری کی گرد راہ ابھی فضا میں ہی تھی کہ انہوں نے اپنے طالب علموں کی تر شروع کر دی۔

میں نے اس بوڑھے آدمی کی آنکھوں میں، موٹے شیشوں کے یونیورسٹی کے تعلق سے سدا خوشی اور فخر کی چمک دیکھی ہے۔ ہر بار اللہ کی قدرت کا قایل ہونا پڑا کہ اس نے حقیر سے انسان میں یہ صلاحیت ہے کہ اپنے ماحول سے اوپر اُٹھ سکے، جہاں خود غرضی کا دور دورہ وہاں بے نفسی کی صبر آزما روش اختیار کر سکے۔ جس زمانے میں تعص اور بدگمانیاں ہر طرف پھیلی ہوئی ہوں وہاں محبت اور خدمت کو شعار

میں نے علی گڑھ میں چاروں طرف نظر دوڑانی شروع کی۔ اسا اور طلبا کے جم غفیر میں کوئی دوسرا بھٹاچاریہ ہے۔ کوئی ہے جسے علی گ

* سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ہمدرد نگر، تغلق آباد، نئی دہلی۔

ان کے طلبا سے اسی قسم اور اسی درجۂ حرارت کی بے لوث محبت ہو۔ پہلے اُن طالب علموں کو ٹٹولا جو علی گڑھ کے تاریخی اور اقلیتی کردار، اس کی روایات اور اس کے اسلامی رنگ ڈھنگ کا ذکر کرتے نہیں تھکتے۔ میری نگاہ طالب علم رہنماؤں اور ان کے متبعین کے اس گروہ پر گئی جو خود روزے نہیں رکھتا لیکن رمضان کے زمانے میں کھانے پینے کی ساری دکانوں کو زبردستی بند کروانے کو جہادِ اکبر سمجھتا ہے۔ ان سربراہوں کو بھی دیکھا جو سرسید کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے بعد خود کو ہر جبرہ دستی اور ضابطہ شکنی اور شائستگی سے آزاد سمجھتے ہیں اور ان ہنگامہ آراؤں پر بھی نظر ڈالی جو (وائے تیرہ بختی) تلاوتِ کلام پاک کے بعد دشنام و الزام کا آغاز کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ ایک بات بار بار دہراتے تھے، اسلام اور علی گڑھ کو بچانے کے لیے وہ اپنے خون کا آخری قطرہ بہا دیں گے علی گڑھ کے لیے کبھی انہوں نے پسینہ کا ایک قطرہ بھی نہیں بہایا۔ اس قسم کی کھوکھلی لفظ آرائی سے اسلام اور علی گڑھ کے یہ نام نہاد حامی اسلام اور علی گڑھ دونوں کو بدنام کرتے چلے آئے ہیں۔

رہنما طلبا سے نظر ہٹائی اور اساتذہ کی قیادت کو ٹٹولنا چاہا۔ وہاں ان لوگوں کو پیش پیش پایا جو طالب علموں کو آگے آگے رکھتے ہیں اور ان کی ہنگامہ آرائی کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ایسے استاد بھی دکھائی دیے جو تعلیم و تدریس چھوڑ کر کسب زر بفت کے لیے خاردرمیانہ کی طرف رہسپار ہوئے۔ ان کے طالب علموں کا کیا حشر ہو گا، یہ ان کی بلا جانے۔ ایسے حضرات بھی نظر آئے جنھوں نے ایک طرف یونیورسٹی کے کردار کی بازیابی کا علم بلند کیا اور دوسری طرف اپنی نجی اغراض کے لیے یونیورسٹی پر مقدمات دائر کرنے کا ریکارڈ قایم کر دیا۔ انھی میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے علی گڑھ کی خودمختاری کی تحریک میں اتنا وقت صرف کر دیا کہ تحقیق کی فرصت نہ رہی۔ لیکن تحقیق یا تحقیق کا ریکارڈ نہ ہو تو ترقی کیسے ملے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے تصنیفی سرقہ کیا اور دوسروں کے تحقیقی اور تصنیفی کام کو بلا آنکھ جھپکائے اپنا لیا۔

یہ سب لوگ اپنے عیوب کو اسلام کی چادر سے ڈھانکنا چاہتے ہیں۔ اساتذہ اور طلبا دونوں میں ایسے باکمال نفوس کی تعداد بہت کم ہے لیکن وہ پیش قدم ہیں، پُر صدا ہیں، قہرمان ہیں۔ لہٰذا نام اُنھی کا لیا جاتا ہے سند انھی کو دی جاتی ہے اور یونیورسٹی سے تو ام انہیں ہی سمجھا جاتا ہے۔

ان لوگوں کو چھوڑیے۔ اساتذہ کا بیشتر طبقہ جو خاموشی سے کام کر رہا ہے، وہ بھی اپنے کام سے کام رکھتا ہے اور، چند کو چھوڑ کر، اسے اس کی فکر نہیں کہ طالب علموں کی زندگی کو سنوارنے کی کوشش کرے یا مشاہرے کے عاید کردہ فرایض سے ایک قدم بھی اخلاص اور خدمت کی راہ میں آگے بڑھائے۔

دوسری طرف ایک برہمن زادہ ہے جو اپنی لڑکھڑاتی ہوئی سانسیں اس عظیم دارالعلوم کے سپوتوں کی خدمت کے لیے وقف کر چکا ہے۔

راقم سطور نے پھر خود سے کہا "سیّد صاحب! خود تمہیں تو بڑا زعم ہے علی گڑھ کے جاں نثار ہونے کا۔ کیا تم خود کو اس برہمن کے روبرو رکھ سکتے ہو۔ تسلیم کہ تم نے علی گڑھ میں دریائے شور کو عبور کیا۔ الزامات سہے، گالیاں سنیں، خطرات سے عہدہ برآ ہوئے۔ ہر طرف سے مخالفت کی لہریں اُٹھیں اور تم چٹان کی طرح اپنی جگہ پر اڑے رہے۔ زندگی بھر کی کمائی ہوئی نام نہاد عزت اور شہرت کو دروغ طرازوں کے ہاتھوں چاک میں ملتے دیکھا اور اُف نہ کی۔"

ابھی یہ لن ترانی ختم نہ ہوئی تھی کہ کانوں میں صدا آئی "لیکن تم نے علی گڑھ کے لیے اگر تکلیفیں اور گالیاں سہ لیں تو کون سی بڑی بات ہے۔ علی گڑھ کے جو تم پر ہزاروں احسان ہیں ان کو تم پھر بھی ادا نہ کر پائے۔ تم اسی درس گاہ کے فرزند ہو، اس نے تمہیں نکھارا، تم پر صیقل کی، تمہیں کسی لایق بنایا۔ علاوہ بریں تم نے اپنی ذاتی اغراض کو یونیورسٹی کی خدمت سے جدا تو نہیں کیا۔ ہم تو جب مانتے جب تم اس خدمت کے لیے کوئی مشاہرہ نہ لیتے۔ تم تو وہی تنخواہ لیتے رہے جو تمہیں بہ حیثیت اسٹاف سلیکشن کمیشن کے صدر کی مل رہی تھی۔ جس منصب کو چھوڑ کر تم یہاں آئے تھے۔ تم کہو گے تم نے ایک آرام دہ جگہ کو چھوڑ کر ایک پُر خار وادی میں قدم رکھا۔ گویا تم اپنی آبلہ پائی کا احسان کانٹوں کی زبان پر رکھ رہے ہو۔ میاں حامد، سیّد والا گہر کی جانشینی خواہ وہ کتنی بعید کیوں نہ ہو ایک شانِ امتیاز رکھتی ہے علی گڑھ آ کر تم نے ایثار کیا یا امتیاز حاصل کیا؟ اپنے گریبان میں منہ ڈالو اور انصاف کرو۔ تم انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس میں تھے۔ حکومت کی مشین کے ایک پُرزہ کی حیثیت سے حکومت کے حلقوں کے باہر تمہیں کون جانتا تھا۔ علی گڑھ کیا آئے، ہندوستان بھر میں مشہور یا بدنام ہو گئے۔ کیا یہ شہرت اس بے آبروئی اور پریشانی پر بھاری نہیں پڑتی۔ تم کہو گے کہ تم نے علی گڑھ تحریک میں نئی جان ڈال

دی۔ بہ حیثیت وائس چانسلر کے تمہارا یہ فرض نہیں تھا۔ تم نے تہذیب الاخلاق کا احیا کیا۔ تم نے ہندوستان بھر میں گشت کی۔ مدرسوں، اسکولوں اور حلقوں میں گئے اور تعلیم اور روشنی کے سرے کو تم نے وہاں سے پکڑا جہاں سید والا گہر نے اسے چھوڑا تھا لیکن سوچو تو تم نے کون سا احسان علی گڑھ پر کیا ؟ ملت کو کس طرح زیر بار کیا ؟ اس میں بھی تمہیں شہرت ہی ملی۔ لوگ سمجھنے لگے کہ مسلمانوں میں ایک نئی وضع کا دانشور پیدا ہوا ہے جو عوام سے خود کو کاٹنے کے بجائے ان کو سدھارنا اور سنوارنا چاہتا ہے اور ان کی ہم نوائی کے لیے کوشاں ہے۔

پروفیسر بھٹا چاریہ تلافی اور جزا کی مذکورہ شکلوں سے محروم رہے۔ لیکن انہوں نے نہ ستایش کی تمنا کی نہ صلہ کی پروا کی۔ تمہیں جہاں لوگوں نے جابر، ظالم اور بیوروکریٹ کہا وہاں تمہیں مرد آہن اور علی گڑھ کا نجات دہندہ اور محسن بھی قرار دیا گیا۔ ناشکری کی بات الگ ہے ورنہ تمہیں جو کچھ تم نے کیا اس سے بہت زیادہ مل گیا اور مورخ تو غالباً تمہارے ساتھ مکمل انصاف کرے گا۔"

قارئین کرام! راقم نے گرد و پیش میں نظر دوڑائی پھر آئینے میں بھی دیکھ لیا، اسے ایسا کوئی شخص نظر نہ آیا جو علی گڑھ اور اس کے طلبا سے ایسی پُرخلوص، پرکار اور بے لوث اور بے غرض محبت کرتا ہو جیسے وہ بوڑھا جو کمزوری کے باعث قدم گن گن کر رکھتا ہے لیکن جس نے خدمت کی راہ میں نہ عمر سے ہار مانی نہ قویٰ کے اضمحلال سے۔ اس نے اخلاص اور محبت اور انسانیت کی جو شمع روشن کی ہے وہ دراصل مشعلِ راہ ہے۔ علی گڑھ کو اس پر سدا فخر رہے گا۔

مضمون ختم کر چکا تھا کہ بھٹا چاریہ صاحب کے بارے میں مطلوبہ اطلاعات موصول ہوئیں۔ ان کا نام شیام چرن بھٹا چاریہ ہے۔ ان کی سال گرہ اسی روز پڑتی ہے جس دن بیسویں صدی کے تہذیب الاخلاق کا اجرا ہوا۔ ۲۵ فروری ۱۹۰۳ء میں اس علاقے کے جو فی زمانہ بنگلہ دیش کا حصہ ہے، پیدا ہوئے۔ ہر امتحان میں امتیازی حیثیت حاصل کی۔ چٹا گانگ گورنمنٹ کالج سے انٹر سائنس اور بی۔ ایس سی کرنے کے بعد انھوں نے پریزیڈنسی کالج کلکتہ سے ایم ایس سی پری لیس اور بنارس ہندو یونیورسٹی سے الیکٹریکل اور میکینکل انجینرنگ میں بی ایس سی کیا اور ۱۹۳۱-۱۹۳۵ء تک اس یونیورسٹی کی انجینرنگ کالج میں بہ حیثیت اسسٹنٹ پروفیسر کے کام کیا۔ اس کے بعد وہ چار سال تک دلی کے انسٹی ٹیوٹ میں الیکٹریکل انجینرنگ پڑھاتے رہے۔ ۱۹۳۸ء میں ڈاکٹر ضیاء الدین کی صلاحیت شناس نگاہ ان پر پڑی اور وہ دلی سے کھینچ کر انھیں علی گڑھ لے آئے۔ ذاکر حسین انجینرنگ کالج کے بانی ارکین میں ان کا نام ہمیشہ عزت کے ساتھ لیا جاتا رہا ہے۔ باقی دونوں بانی ارکین میں سے ایک (مسٹر میتھو) ڈھاکہ چلے گئے اور دوسرے (ڈاکٹر درانی) مغربی پاکستان سدھار گئے لیکن بھٹا چاریہ صاحب کے پائے ثبات کو جنبش نہیں ہوئی۔ انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کے ساتھ عمر بھر کو پیمان وفا باندھا تھا، جسے وہ باہر جانے کی ساری ترغیبات اور ضروریات کا مقابلہ کرتے ہوئے ابھی تک نبھا رہے ہیں اور نبھانا بھی کیسا نبھانا۔ انھوں نے انجینرنگ کالج کو اس کی طفولیت کے دوران اپنے خون جگر سے سینچا۔ اس کے طالب علموں پر اپنی جان چھڑکی، ان کے لیے پسینہ بہایا۔ اپنے کو آسائش، فرصت اور خور و خواب کی لذتوں سے محروم رکھا تاکہ انجینرنگ کالج کے نونہالوں کا ذہن سنور جائے، مستقبل سدھر جائے۔ غریب طالب علموں کی روپیے پیسے سے مدد کی اور اپنے سارے طالب علموں کو اپنا قیمتی وقت دیا، اپنی بے لوث محبت دی اور اپنی قابل قدر اور انمول ہدایت اور تربیت سے نوازا۔ ان کے شاگردوں نے ملک کے مختلف حصوں اور شعبوں میں بڑے بڑے امتیازات حاصل کیے۔ ان کے امتیازات اور اپنی خدمات کو وہ بوڑھی آنکھوں کی چمک کا خراج ادا کرتے ہیں۔ راقم سطور کو ایسا استاد ملتا تو وہ اس کی آنکھوں کی چمک پر سب کچھ نچھاور کر دیتا۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"تم مومن نہیں ہو سکتے جب تک آپس میں رحم نہ کرو"۔ صحابہؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! ہم سب رحیم ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: "رحمت یہ نہیں ہے کہ تم اپنے ساتھی کے ساتھ ہمدردی کرو بلکہ رحمت یہ ہے کہ تمام انسانوں کو اس کا مستحق سمجھو۔"

(طبرانی)

دینی مدارس میں سائنس کی تعلیم

عبد العلی فاروقی*

مندرجہ بالا عنوان سے جناب مولانا اسیر ادروی صاحب استاذ جامعہ اسلامیہ بنارس کا ایک مضمون ماہنامہ "دارالعلوم" دیوبند کے جنوری ۱۹۸۸ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں مولانا نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے "مرکز فروغ سائنس" کے زیر اہتمام مارچ ۱۹۸۷ء میں "دینی مدارس اور سائنسی تعلیم" کے عنوان سے منعقد ہونے والی کانفرنس کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور "مرکز فروغ سائنس" کی دینی مدارس میں سائنسی تعلیم کو رائج کرنے کی کوششوں کو "دینی مدارس پر شب خون مارنے کی تیاری" سے تعبیر کرتے ہوئے بہت ہی پُر زور الفاظ میں اس بات کی مخالفت کی ہے کہ دینی مدارس میں سائنس کی تعلیم دی جائے۔

دینی مدارس میں سائنس کی تعلیم ایک مضمون کی حیثیت سے دیا جانا مناسب ہے یا نہیں ؟ اس میں اختلاف رائے کی گنجائش بھی ہے اور اخلاص کے ساتھ مثبت اور منفی دونوں رائیں بھی ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس بات پر زورِ تحریر صرف کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے کہ دینی مدارس میں سائنس کی تعلیم رائج کرنے کی ضرورت کا احساس کرنے والے ملت فروش اور دینی مدارس کا حلیہ بگاڑنے کے آرزو مند ہی ہو سکتے ہیں۔

مولانا نے اپنے اس مضمون کی ابتدا یوں کی ہے :

"دینی مدارس اور سائنسی تعلیم" کے نام سے پچھلے دنوں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک کانفرنس ہوئی تھی، جس میں چالیس کے قریب مضامین اور مقالے پڑھے گئے تھے۔ مقالہ نگاروں میں کچھ تو جدید تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور کچھ وہ لوگ تھے جو گاؤں اور قصبوں کے دینی مدارس میں درس و تدریس کا کام کرتے ہیں، ان سارے مضامین کو مسلم یونیورسٹی کے رسالے "تہذیب الاخلاق" کے ماہ مئی کے شمارے میں یکجا کر کے شائع کر دیا گیا ہے"

میرے خیال میں "جدید تعلیم یافتہ طبقہ" اور "گاؤں اور قصبوں کے دینی مدارس میں تدریسی کام کرنے والوں" میں اس کانفرنس کو محدود کر کے مولانا نے یہ تاثر دینا چاہا ہے کہ "شہری مدارس" کے علماء کی نمائندگی کے بغیر کانفرنس کا وزن یوں ہی کم ہو گیا ــــ اگر مولانا واقعی کچھ ایسا ہی محسوس کرتے ہوں تو ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس کانفرنس میں بھوپال، جون پور اور الٰہ آباد جیسے شہروں کے مدارس کے اساتذہ یا ذمہ داروں نے بھی شرکت کی تھی ــــ نیز ایک تیسرے طبقے کی بھی اچھی خاصی نمائندگی تھی جسے آپ "جدید و قدیم دونوں قسم کے تعلیم یافتہ طبقہ" قرار دے سکتے ہیں۔

راقم الحروف نے چوں کہ اس کانفرنس میں شرکت کی تھی اور مولانا کے الفاظ میں "ان علوم (سائنس) کی اہمیت و ضرورت پر پورا زورِ قلم اور زورِ بیان صرف کیا تھا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ قرآن و حدیث میں ان علوم کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے" اس لیے اس نے مولانا کی

---

* صدر المدرسین دار العلوم فاروقیہ، کاکوری، لکھنؤ۔

تنقید یا تغلیط پر اپنی غور و فکر کی بہترین صلاحیتیں خرچ کیں لیکن مولانا کی عظمت و احترام کے اعتراف کے باوجود اسے یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ آں محترم کی تنقید نہ باوزن ہے نہ ہی مدلل —— بلکہ پورے مضمون کا لب لباب یہ ہے کہ " تم کہتے ہو، اس لیے یہ بات غلط ہے۔"

مولانا نے تہذیب الاخلاق کے مدیر کی جن دو تحریروں کو پیش کر کے "تضاد" کا دعویٰ کیا ہے اور یوں تبصرہ فرمایا ہے کہ :

" پہلے جو بات کہی تھی اور جس بات کی پرزور الفاظ میں تردید کی گئی تھی اسی کے برعکس ساری باتوں کا خود اعتراف کر لیا گیا اور اس کے ثبوت میں سائنس اور مذہب کے ٹکراؤ کی تاریخ بھی پیش کر دی گئی اور یہ بات ثابت کر دی کہ سائنس کا ابتدا ہی سے مذہب سے ٹکراؤ رہا ہے۔"

" تضاد " اور سائنس و مذہب کے درمیان ابتدا ہی سے ٹکراؤ کا اعتراف ان دونوں تحریروں سے مولانا ہی کو نظر آسکتا ہے۔ کیوں کہ انھوں نے یہ بات پہلے سے طے کر رکھی ہے کہ سائنس اور مذہب کے درمیان ٹکراؤ ہے —— ورنہ مدیر "تہذیب الاخلاق" نے تو سائنس اور اسلام کے درمیان ٹکراؤ کے خیال کی پرزور الفاظ میں تردید کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اس خیال کا سرچشمہ ماضی میں ہونے والا سائنس اور روایتی عیسائیت کے درمیان کا ٹکراؤ ہے۔

میں مولانا جیسے صاحب علم کے بارے میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہ روایتی عیسائیت" کے اشارے کو نہ سمجھ سکے ہوں گے — پھر بھی انھوں نے روایتی عیسائیت اور سائنس کے درمیان ہونے والے ٹکراؤ کے بیان کو سائنس اور مذہب کے درمیان ٹکراؤ کا اعتراف قرار دیتے ہوئے "تجاہل عارفانہ" سے کام لے کر تحریر فرمایا کہ

" اگر مدیر گرامی نے اصلی عیسائیت اور روایتی عیسائیت کے درمیان خط فاصل کھینچ کر بتا دیا ہوتا تو جواب زیادہ باوزن ہو جاتا۔"

میں کیوں کر باور کر لوں کہ مولانا " اصلی عیسائیت اور روایتی عیسائیت کے درمیان خط فاصل کھینچنے کا مطالبہ واقعی اس لیے کر رہے ہیں کہ وہ اس فرق سے بے خبر ہیں ؟ لیکن اب جب کہ یہ مطالبہ ہو ہی گیا تو " مدیر گرامی " نے بھی میں ہی اسے پورا کیے دیتا ہوں۔

" روایتی عیسائیت" وہی ہے جس کے خلاف خود یورپ کے عیسائیوں کی طرف سے مارٹن لوتھر کی قیادت میں اصلاحی تحریک چلی تھی اور جس کے نتیجے میں عیسائی دو فرقوں "کیتھولک" اور "پروٹسٹنٹ" میں تقسیم ہو گئے تھے اور یہ تقسیم آج تک قائم ہے۔ روایتی عیسائیت وہی ہے جس میں "پوپ" کو خدائی کا درجہ دے کر اسے لامحدود اختیارات عطا کر دیے گئے تھے اور پوپ کے "معافی نامے" اس کے ایجنٹوں کے ذریعے گاؤں گاؤں بستی بستی گھوم گھوم کر فروخت کیے جا رہے تھے۔ اور پوپ نے اپنے ان "اختیارات" کو باقی رکھنے کی خاطر تحصیل علم کی ہر کوشش کو ممنوع قرار دے دیا تھا۔

اور " اصلی عیسائیت" وہ ہے جس کا آج دنیا میں کہیں وجود نہیں ہے۔ کیوں کہ خدائی فیصلے کے مطابق وہ اسلام کے ذریعے منسوخ ہو چکی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ "روایتی عیسائیت" اور سائنس کے درمیان ٹکراؤ کی وجہ یہی ہے کہ اصلی عیسائیت' پائی ہی نہیں جاتی اور عیسائیوں کا مذہبی طبقہ کل سے لے کر آج تک "پاپائیت" ہی کو اصلی عیسائیت باور کرانے میں سرگرداں رہا ہے۔ جسے نہ صرف سائنس دانوں بلکہ تمام حقیقت شناسوں نے قبول کرنے سے انکار کیا اور کر رہے ہیں —— جب کہ اسلام کے لیے بفضل خدا اس قسم کا کوئی خطرہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے کیوں کہ اسلام اپنی اصلی شکل و صورت کے ساتھ کل بھی موجود تھا، آج بھی ہے اور قیامت تک موجود رہے گا کہ وہ

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون

کی پناہ میں ہے۔ پھر اس بے بنیاد اندیشے کی گنجائش ہی کہاں رہ جاتی ہے جس کا ذکر مولانا نے یوں فرمایا ہے۔

" جب دینی مدارس میں سائنس کے رواج کے بعد مسلمانوں میں ذہنی ارتداد و الحاد پیدا ہوگا اور مسلم دانش وران کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں گے تو حامیان سائنس یہی کہیں گے کہ سائنس کا ٹکراؤ اصلی اسلام سے نہیں بلکہ روایتی اسلام اور مسلم دانش وروں کی تشریح سے ہے۔"

اگر واقعی مولانا کا یہ خیال ہے کہ اسلام اور سائنس کے درمیان ٹکراؤ ہے اور اسی بنیاد پر وہ مدارس دینیہ میں سائنسی تعلیم کی ترویج کے مخالف ہیں تو اُن کو اپنا موقف دلائل کے ساتھ پیش کرنا چاہیے تھا تاکہ مجھ جیسے طالب علموں کو اپنے موقف پر نظر ثانی کرنے اور اطمینان کی صورت میں رجوع کرنے کا موقع فراہم ہوتا ـــــ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ مولانا ہی کے بیان کے مطابق مسلم یونیورسٹی کی اس "کانفرنس" میں چالیس کے قریب مضامین مقالے پڑھے گئے" اور ان سب میں سائنس کی اہمیت و ضرورت پر زور دینے کے ساتھ ساتھ یہ ثابت کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن و حدیث میں بھی علوم سائنس کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔

خود راقم الحروف کو اس بات کا اعتراف ہے کہ اس نے اس کانفرنس میں جو مقالہ پڑھا اور جو تہذیب الاخلاق کے اسی شمارے میں شایع بھی ہوا ہے اس میں متعدد قرآنی آیات سے استدلال کرتے ہوئے یہ بات پیش کی گئی ہے کہ خدا اپنے بندوں سے اس علم کو حاصل کرنے کا مطالبہ کرتا ہے جس کا نام "سائنس" رکھا گیا ہے اور بنیادی طور پر خدا کی اپنی کائنات میں غور وفکر کی دعوت ہی "سائنس" کے مسلم کی میراث ہونے کی کافی دلیل ہے۔

اب اگر اس طرز فکر میں کچھ کجی ہے تو مولانا کو بھی قرآن وحدیث ہی کی روشنی میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے یہ ثابت کرنا چاہیے تھا کہ سائنس اور اسلام ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ لہٰذا اسلام پسندوں کو سائنس سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہیے۔

جب تک مولانا اسلام کی واضح تعلیمات کی روشنی میں سائنس اور اسلام کے درمیان ٹکراؤ ثابت نہیں کر دیں گے، اس وقت تک ہم اپنے ماضی کے "لائق صد افتخار" سرمایہ کی بنیاد پر سائنس کو مومن کی "متاعِ گم شدہ" سمجھتے رہنے میں حق بجانب ہوں گے۔

جہاں تک دینی مدارس میں سائنس کی تعلیم دینے کا معاملہ ہے تو اس سلسلے میں مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ

> "دینی مدارس وہ لوگ چلاتے ہیں جو اسلامی تعلیمات و روایات اور اس کے عملی مظاہر کو حقیقی اور اصلی اسلام سمجھتے ہیں۔ ان کا اسلام جدید تعلیم یافتہ طبقے کی طرح قلم کی نوک اور زبان کی لفاظیوں تک محدود نہیں ہے۔ اس لیے دینی تعلیم کے ساتھ کسی ایسے علم کی تعلیم کو کس طرح گوارا کر سکتے ہیں جو ان کے دین کی نفی کرتا ہے اور عقیدے کی جڑوں میں کھولتا ہوا پانی دے کر اس کے استیصال کی کوشش کرتا ہے۔"

تعجب ہے کہ مولانا نے کس تحقیق سے سائنس کو دین کی نفی کرنے والا اور عقیدے کی جڑوں میں کھولتا ہوا پانی دے کر اس کا استیصال کرنے والا علم باور کر رکھا ہے؟ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی ہے کہ مولانا جیسے ذمہ دار صاحب قلم نے سائنس کی مخالفت کی رو میں بہتے ہوئے ایسی خلافِ واقعہ باتیں کیوں کر سپرد قلم کر دیں کہ ـــــ ؟

> "سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مرکز فروغ سائنس نے خصوصیت کے ساتھ دینی مدارس ہی کو کیوں نشانہ بنایا؟ جب کہ وہ جانتے ہیں کہ یہاں خالص دینی تعلیم دی جاتی ہے اور وہ بھی صرف عربی زبان میں، یہاں نہ انگریزی زبان پڑھائی جاتی ہے اور نہ عصری علوم کی تعلیم دی جاتی ہے۔"

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے الٰہیات المدارس مثلاً دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلماء وغیرہ میں عصری علوم کی بھی تعلیم دی جاتی ہے اور انگریزی زبان بھی پڑھائی جاتی ہے۔

خود میرے زمانۂ طالب علمی، ۱۹۶۰ء تا ۱۹۷۰ء میں ازہر الہند دارالعلوم دیوبند میں عصری علوم کی باقاعدہ تعلیم ہوتی تھی اور اس کے لیے دو استاد مولانا عزیز احمد صاحب قاسمی بی۔ اے اور ڈاکٹر عزیز الحسن صاحب مقرر تھے اور مولانا عزیز احمد صاحب قاسمی کی "جنرل سائنس" بہ تصنیف داخل نصاب تھی۔

میرا یہ خیال ہے کہ مولانا کو کچھ "خود غلط قسم کے "سائنس دانوں کے "افکار پریشاں" نے اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے کہ "سائنس" بذات خود اسلام اور مذہب کی مخالف ہے اور ایک اچھا سائنس داں اچھا مسلمان نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ واقعہ ایسا نہیں ہے جس کے ثبوت میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سائنس و ٹکنالوجی کے مختلف شعبوں (فزکس، باٹنی، میڈیکل سائنس اور انجینئرنگ کالج وغیرہ) سے وابستہ متعدد سائنس دانوں کو پیش

ا جاسکتا ہے جو اچھے سائنس داں ہونے کے ساتھ ساتھ فکری اور عملی طور پر
ے اور اچھے مسلمان بھی ہیں۔ راقم الحروف کو ایسے متعدد حضرات سے ذاتی طور پر
اقفیت حاصل ہے، اب اگر کوئی ملحد بے دین سائنس داں بن جائے تو
ن میں علم سائنس کا کیا قصور ہے۔

اور اگر اس بات کو کسی درجے میں تسلیم بھی کر لیا جائے کہ سائنس کی
علیم حاصل کرنے کے نتیجے میں بہکنے کا خطرہ ہوتا ہے تب تو اور بھی مدارس
ینیہ میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی ضرورت بڑھ جاتی ہے تاکہ سائنس سے
س کا "زہر" نکال کر اور اسے مسلمان کر کے اس کی تعلیم دی جا سکے۔ اس طرح
سائنس کے خطرناک پہلوؤں سے بچ کر اس کے بے ضرر پہلوؤں سے مسلمان
استفادہ کر سکیں گے۔

رہ گیا یہ سوال کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے
اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے بجائے ہمارے دینی مدارس کے ذریعے مسلمانوں
میں سائنس کو فروغ دینے پر کیوں زور دیا جا رہا ہے اور وہ ہم مولویوں سے اس
سلسلے میں مدد کیوں چاہ رہے ہیں؟

تو اس سلسلے میں کسی بدگمانی میں مبتلا ہونے اور "شب خون مارنے
کی تیاری" قرار دینے کے بجائے اسے اس اعتراف پر کیوں نہ محمول کیا جائے کہ دینی
مدارس اور اُن سے وابستہ علمائے کرام کے تعاون کے بغیر وہ اپنے اس تعمیری کام
میں کامیابی کی امید نہیں کر سکتے ــــــ اور یہ سبق ان کو اس تجربے سے
حاصل ہوا کہ وہ اپنی درس گاہوں کے ذریعے سائنس کے ماہر بنانے میں تو
کامیاب ہو گئے، لیکن سائنس کے ذریعے دین کو فروغ دینے والے افراد نہ تیار
کر سکے ــ؟ پس اگر کچھ لوگوں کے دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا ہے کہ سائنس کو
ملحد سائنس دانوں کے چنگل سے چھڑا کر اس کے اصلی مالکوں اور مستحقین تک
پہنچانے کی کوشش کی جائے اور وہ اس سلسلے میں ہماری طرف استعانت
کے لیے ہاتھ بڑھا رہے ہیں تو کیا محض بدگمانی اور بے بنیاد الزامات کے ذریعے
ان کے بڑھے ہوئے ہاتھوں کو جھٹک دینا مناسب ہوگا؟

مولانا نے سائنس کے ذریعے مدارس میں الحاد داخل کیے جانے کی "کھٹک"
کے لیے آج سے چالیس سال پہلے جدید تعلیم یافتہ طبقے کی طرف سے چلائی جانے والی تحریک
پاکستان اور پھر تقسیم ملک اور اس کے نتیجے میں آنے والی تباہیوں کو بنیاد بتلاتے ہوئے
یہ فرمایا ہے کہ یہی جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہے جو ایک مرتبہ اسلام اور مذہب کا نام
لے کر "اپنے مستقبل کو محفوظ کر کے" پوری ملت اسلامیہ کے سینے میں خنجر
اتار چکا ہے ــــ اور اب پھر یہی طبقہ سائنس کی ترویج کے بہانے ہمارے دینی مدارس
کی راہ سے ہماری متاع ایمانی کو داؤں پر لگا دینے کے درپے ہے، اس لیے آنکھیں
کھلی رکھنے کی ضرورت ہے۔

مولانا کے اس "استشہاد" کے سلسلے میں میری دو گزارشیں ہیں۔

اول تو یہ تقسیم ملک یا تحریک پاکستان کو ہمالیہ جیسی سیاسی غلطی تو کہا جا سکتا ہے
لیکن واقعاتی اعتبار سے اس میں "علماء کا قائدانہ کردار" کا انکار نہیں کیا
جا سکتا۔ پھر "جدید تعلیم یافتہ طبقہ" ہی اس کے لیے ذمہ دار کیوں؟ پھر وہ بھی
اس صورت میں جب کہ حقائق کی روشنی میں بار بار یہ بات بھی سامنے آ چکی ہے
کہ تقسیم ملک کے ذمہ دار نہ مسلمان علماء ہیں نہ ہی ان کا جدید تعلیم یافتہ
طبقہ ـ بلکہ اس میں اصل کردار تو ہمارے سیاست دانوں کا
ہے ــــــــ؟

دوم یہ کہ اگر واقعی "جدید تعلیم یافتہ طبقہ" کے کچھ لوگ اس
غلطی کے مرتکب ہوئے بھی تو کیا آئندہ کے لیے "پورا جدید تعلیم یافتہ
طبقہ" "شجر ممنوعہ" ہو گیا کہ اب اس کی کسی بات پر بھی کان نہیں دھرا
جائے گا اور اس کی ہر بات کی تغلیط ہی کی جائے گی۔ چاہے وہ رات
کو رات اور دن کو دن کہہ رہا ہو؟ کیا ہمارا یہ انداز فکر خدائی
فرمان

لا تزر وازرة وزر اخرىٰ

کی صریح خلاف ورزی نہ ہوگی ــــــ؟ اور امت کو جدید
قدیم تعلیم کے دو خانوں میں بانٹ کر "دو طبقوں" میں تقسیم کر دینے کا
نتیجہ کیا ہوگا ــــــ؟

> ہمارے دائیں ہاتھ میں قرآن ہوگا، بائیں ہاتھ میں
> سائنس اور پیشانی پر کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہوگا
>
> سرسیدؒ

کینسر ـــــ ایک مہلک مرض

سید مفتاح العارفین رضوی*

میڈیکل سائنس کو انسانی زندگی میں بڑا اہم مقام حاصل ہے۔ زمانہ قدیم میں مختلف امراض جڑی بوٹیوں کے علاج سے ہی دور ہو جایا کرتے تھے۔ مگر جیوں جیوں سائنس نے ترقی کی، امراض بھی بتدریج پیچیدہ مسئلہ بنتے گئے۔ آج ہم سائنسی دور میں سانس لے رہے ہیں۔ جہاں سائنسی تحقیق و تجسس نے انسانی دشواریوں کو بہت آسان طور پر حل کر دیا ہے، لیکن اس کے باوجود بہت سارے امراض ایسے بھی ہیں جس پر میڈیکل سائنس دانوں کو شب و روز کی انتھک کوششوں کے بعد بھی جزدی کامیابی ہی حاصل ہو سکی ہے۔ مرض کینسر بھی اُن میں ایک ہے۔ دُنیا کے بڑے بڑے نوبل لاریٹ نے بھی کینسر پر تحقیق کی مگر اب تک کے برآمد نتائج سے یہ باتیں واضح ہو چکی ہیں کہ ان کی تحقیق میں متضاد رائے کارفرما ہیں اور جن سے خود بھی سائنس داں متفق نہیں۔

کینسر لاطینی لفظ ہے جس کے معنی کیکڑے کے ہوتے ہیں۔ آیور ویدک میں کارکارا یعنی دس پیروں والے کیکڑے کو کہتے ہیں۔ طب یونانی میں اسے سرطان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ دراصل یہ ایک قسم کا ورم ہے جو جلے ہوئے سودا سے پیدا ہوتا ہے۔

عالمی صحت تنظیم (W.H.O) کے اعداد و شمار سے دنیا میں اوسط ہر سال ۶۰ لاکھ لوگ کینسر کے شکار ہوتے ہیں جن میں سے ۵۰ لاکھ موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔

مرض کینسر کے قابل قبول اسباب موروثی اور اکتسابی ہیں۔ اب ہم دیکھیں کہ ان میں بھی کس طرح متضاد رائے موجود ہیں۔

مثلاً ایسے والدین کی مثال بھی سامنے ہے جو خود کینسر کے شکار تو ہوئے مگر اُن کی اولاد اس موذی مرض سے دور رہے۔ دوئم تمباکو نوشی کے اثرات تو خاص طور سے بیحد خطرناک ثابت ہوتے ہیں جو بعد میں کینسر کی شکل اختیار کر لیتے ہیں لیکن بعض ایسے بھی ہیں جو اس کے عادی ہیں مگر انہیں کچھ بھی نہیں ہوا۔

حالیہ تحقیقات سے تمباکو کے مضر اجزا کی جانکاری حاصل ہوئی ہے جو بعد میں کینسر کے باعث بنتے ہیں، جن میں نکوٹین ایک خطرناک زہریلا مادہ ہے ۴۰ سے ۶۰ ملی گرام نکوٹین ایک نوجوان کے عمل تنفس کو مفلوج کرنے کے لیے کافی ہے۔ ۵۰۰ ملی گرام نکوٹین انجکشن سے سیدھے خون میں پہنچنے پر اس شخص کی موت یقینی ہے۔ ایک سگریٹ میں تقریباً ایک ملی گرام پائپ میں ۲۰۷ ملی گرام اور سگار میں ۳۰۶ ملی گرام سے ۹۰۷ ملی گرام تک نکوٹین پائی جاتی ہے۔

جرمن اور امریکہ کی ایک تحقیقی رپورٹ سے ثابت ہو چکا ہے کہ تمباکو نوشی سے ہی زبان گلے اور پھیپھڑے کے کینسر ہوا کرتے ہیں۔ یہ مادے پھیپھڑے سے خون اور تب گردوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں چھننے کے بعد مثانہ میں آکر مثانہ کے کینسر میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پائرڈین مادہ بھی کینسر پیدا کرتا ہے۔ بنزو پائرن مادہ کولتار سے مشابہ ہے جو کینسر پیدا کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ کاربالک ایسڈ سے عموماً منھ کا کینسر ہوا کرتا ہے۔

دنیا کے مختلف خطوں میں، خصوصاً افریقی اور ایشیائی ممالک میں

* ڈائرکٹر رضوی میموریل لائبریری، رضوی ہاؤس، پوسٹ سپورہ، اورنگ آباد، بہار

ے گینسر نے ایک بھیانک مسئلہ پیدا کر دیا ہے، جس کے لیے ٹیکوں کے
ستعمال پر زور دیا جا رہا ہے۔ عالمی شہرت یافتہ سائنس داں اور
ل لاریٹ پروفیسر بلوک برگ نے آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل
ائنس میں اپنے لکچر کے دوران بتایا کہ ہیپاٹٹس بی نام کے وائرس جگر کینسر
لیے ذمہ دار ہیں۔ اس وائرس سے الگ کیے گئے "سرفیس اینٹی زن"
ی مزاحمتی عنصر سے جو ٹیکہ تیار کیا گیا ہے وہ بڑا ہی کار آمد ثابت ہوا ہے
یکن اس سے صرف ایک مرتبہ بیماری ہونے سے سرطانی خلیات کے بڑھنے
ی رفتار کو کم کیا جا سکتا ہے، لیکن پوری طرح کنٹرول کرنا ممکن نہیں ۔
پروفیسر برگ کو اسی "سرفیس اینٹی زن" کے لیے نوبل انعام ملا تھا۔ اسے
آسٹریلین اینٹی زن کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

ایسے وائرس بتدریج بڑھتے ہیں جس میں کافی وقت لگتا ہے
ڈاکٹر برگ کے مطابق مردوں میں عورتوں کے نسبتاً یہ مرض زیادہ
پایا جاتا ہے۔ مگر کینسر سینیگل اور موزابنک جیسے افریقی ممالک اور
ایشیا میں چین، جاپان اور تائیوان میں خطرناک اور پیچیدہ مسئلہ
بن گیا ہے۔ سینیگل میں ایک ہزار لوگوں میں سے ۳۰ اور موزابنک
میں ۱۰۰ لوگ اس مرض سے دوچار ہیں۔ ایسے ممالک میں ٹیکہ لگانے
کا زور ہے۔ مزید تحقیق سے پتہ چلا کہ مچھر اور کھٹمل وغیرہ سے افریقی ممالک
میں اس طرح کے کینسر زیادہ ہوا کرتے ہیں۔ کیوں کہ وائرس کے یہ پروموٹر
ہیں۔ پروفیسر موصوف نے ہندوستان کے متعلق بتایا کہ یہاں اس
وائرس سے زیادہ نان A اور نان B وائرس ایکٹیو ہیں، جس پر تحقیق
کی جا رہی ہے۔

نئی تحقیق سے کچھ اور اہم باتوں کا انکشاف ہوا ہے کہ بعض قسم کے
کینسر مخصوص جگہ پر ہی ہوا کرتے ہیں۔ برطانیہ میں پھیپھڑے کا کینسر ہندوستان
سے چھ گنا زیادہ ہے جب کہ ایسافیزیل کینسر آنتری فرانس میں ہنگری سے ۶۰ گنا
زیادہ ہے۔ حالیہ سروے کے مطابق اترپردیش کے ضلع اعظم گڑھ میں سوڑھے
کے کینسر کے مریضوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ کیوں کہ وہاں تمباکو نوشی کا رواج
عام ہے۔ جاپان میں پیٹ کا کینسر مسئلہ بنا ہوا ہے۔ تقریباً ایک لاکھ کی
آبادی پر وہاں ۹۰ لوگ اس مرض کے شکار ہیں۔ جب کہ امریکہ میں ان کی
تعداد ۱۵ ہے۔ مختصر یہ کہ جن جگہوں پر کارسینوجینس ذرے (کینسر پیدا
کرنے والے ذرے) کرۂ ہوا میں زیادہ ہیں، وہاں اس طرح کے کینسر
زیادہ ہوں گے

سائنس دانوں نے کینسر پیدا کرنے والے عناصر کا پتہ لگانے
کے لیے کچھ اور تجربے کیے ہیں جن میں چوہوں پر کیے گئے عمل بڑے ہی مفید
ثابت ہوئے ہیں۔ اس تحقیق سے چوہوں میں کینسر کے عناصر کی وجہ ایک
جین بتایا گیا ہے جو ان چوہوں کے وائرس سے حاصل کیا گیا۔ ٹھیک
اسی طرح کی بات انسان کے سرطانی خلیات میں بھی پائی گئی۔ انسانی جسم میں
موجود (D.N.A) میں جہاں لاکھوں اقسام کے جین ہیں وہی سرطانی بیج
بھی ہوتے ہیں۔

چوہوں کے ان وائرس کے اندر ایک چھوٹا قطعہ ہوتا ہے جو جینیاتی
خبریں فراہم کرتا ہے جس سے بے ترتیبی کی شکل پیدا ہو جاتی ہے اور عام
خلیات ابنارمل ہو کر ایک دوسرے پر چڑھ جاتے ہیں۔ چوہوں کے خلیات
میں ہدایات قطعہ کے دبیز حصے سے پہنچتی ہے جب کہ دوسرے حصے سے مخصوص
قطعے ریگولیٹ کیے جاتے ہیں جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ کینسر کے لیے
صرف جین ہی ذمہ دار نہیں ہے۔ کیوں کہ چوہوں میں وائرس سے بغیر رابطہ
بنائے کینسر کا ہونا غیر یقینی ہے۔

بیشتر ماہرین طب نے کینسر کی اہم وجہ تابکاری اور کیمیات بھی
بتایا ہے۔ تجربے کے دوران دیکھا گیا کہ ایک نارمل چوہے کے خلیات کو
کارسینوجین نامی کیمیا میں بدلا جائے اور پھر سرطان شدہ خلیات کے
(D.N.A) کو غیر سرطانی چوہوں کے خلیات میں ملایا جائے تو یہ خلیات بھی
سرطانی ہو جاتے ہیں۔ دوسری جانب انسانی مثانہ سے سرطانی خلیات
کے متعلق پایا گیا کہ یہ چوہوں کے خلیات میں کینسر پیدا کرنے میں معاون ہے۔
کروموسوم کی ابنارمل تعداد ہی کینسر کی سب سے بڑی وجہ ہے۔
اس لیے سائنس داں اس بات کے لیے بھی کوشاں ہیں کہ ابتدائی دور میں ہی
اگر خلیات میں پیدا ہونے والے غیر ضروری پروٹین پر روک لگ جائے
تو کسی حد تک اس تاریک پہلو میں امید کی نئی کرنیں نظر آ سکتی ہیں۔

آج عام طور پر ٹی اسٹالوں یا دوران سفر پلیٹ فارم پر چینی کی
جگہ سیکرین ملی چائے زیادہ تر پینے کو ملتی ہے۔ دراصل سیکرین میں چینی
سے ۵۰۰ گنی زیادہ مٹھاس پائی جاتی ہے۔ ۱۹۶۰ء سے اس کا استعمال زیادہ

ہونے لگا ہے۔ جب کہ کیمیائی نقطۂ نظر سے سیکرین آرتھو سلفو بینزوئیک ایسڈ امائیڈ ہے۔ اس کے زیادہ استعمال سے کبھی عموماً پیشاب کے راستے میں کینسر ہوا کرتا ہے۔ کیوں کہ کیمیاوی بناوٹ ہی کچھ ایسی ہے جس سے پیشاب کے راستے کے حصے میں آسانی سے پہنچ جاتا ہے۔

امریکہ کے نیشنل کینسر انسٹی ٹیوٹ کے سائنس داں درج بالا باتوں سے متفق نہیں ہیں۔ بلکہ ان کا کہنا ہے کہ سیکرین کے کم استعمال سے ایسا کوئی خدشہ نہیں رہتا۔ لیکن پورے دن اگر کوئی شخص قریب سات مرتبہ سیکرین ملی سیال اشیاء کا استعمال کرے تو کینسر ہونے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کی رپورٹ کے مطابق یہ Permoter کا کام کرتی ہے۔ اور براہ راست موذی مرض کو بھیانک شکل میں بدل دیتی ہے۔

ہر نئی تحقیق کے بعد امیدیں بڑھ جاتی ہیں اور ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ کینسر جیسے مہلک مرض پر فتح حاصل کر لی گئی ہے لیکن آہستہ آہستہ تمام باتیں مایوسیوں میں تبدیل ہوتی جاتی ہیں جب دوبارہ یہ سننے کو ملتا ہے کہ فلاں تحقیق سے مرض کا مکمل علاج ممکن نہیں۔

ہماری معلومات اب تک یہیں تک ہیں کہ حیاتین (وٹامن) ہر انسان کو صحت مند رہنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ وٹامن سی ایک بالغ کے لیے ۶۰ ملی گرام روزآنہ استعمال کرنا چاہیے۔ سائنس دانوں نے اب یہ مقدار ۴۵ ملی گرام بتائی ہے۔ لیکن نوبل انعام یافتہ سائنس داں لنس پاؤلنگ کی تحقیق سے اس وقت سنسنی پھیل گئی جب انہوں نے بتایا کہ حیاتین (وٹامن) سی کف، سردی اور کینسر کے لیے بھی مفید ہے۔ اس کی ۱۰،۰۰۰ ملی گرام مقدار تک کھانے کا مشورہ دیا مگر بعد میں خود انہوں نے دیکھا کہ زیادہ مقدار سے کینسر ہونے کا خدشہ بنا رہتا ہے۔ کیوں کہ زیادہ مقدار خلیات میں میوٹیشن پیدا کرتا ہے۔

مندرجہ بالا باتوں کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کینسر کا دائرۂ اثر جہاں محدود تھا اب دن بہ دن بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ لوگ اسے ہلاکت آفریں اور دائمی تصور کرنے لگے ہیں۔ عالمی سطح پر موضوعِ بحث اور تحقیق و تجسس کا مرکزہ بنا ہوا ہے۔ طب جدید نے بہت ساری دوائیں اور تشخیص آلات تو ایجاد کر دیے مگر سب ہی کینسر جیسی بیماری کے سامنے گھٹنے ٹیکتے نظر آ رہے ہیں۔

ڈاکٹر امان ڈائریکٹر انڈو ارکین اسپتال میسور اور عالمی شہرت یافتہ ادسکر پروفیسر نے کینسر پر بڑی اہم تحقیق کر کے دنیا کو حیران کر دیا ہے۔ انہوں نے قرآن پاک کی آیات کی بنیاد پر کینسر کے لیے دوائیں ایجاد کی ہیں۔ اس مفید تحقیق سے متاثر ہو کر اقوام متحدہ کا ادارہ عالمی صحت تنظیم (W.H.O) نے انہیں ڈاکٹر آف سائنس کی اعزازی ڈگری دی ہے۔

سائنس دانوں کی اس سعی و جستجو سے اندازہ ہوتا ہے کہ جلد ہی اس موذی مرض پر قابو حاصل کر لیا جائے گا اور

مستقبلِ قریب میں کینسر کا مرض
صرف ایک بھیانک کہانی
کی شکل میں لوگوں
کو یاد رہے گا۔

"قرونِ وسطیٰ کا اصلی لیکن سب سے کم معروف کارنامہ تجرباتی طریقے کی تخلیق ہے اور یہ دراصل مسلمانوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے جو بارہویں صدی عیسوی تک جاری رہا۔"

جارج سارٹن

طبعیات کے جدید نظریے

سید قاسم محمود*

جب ہم طبعیات کی مروجہ درسی کتابیں — اردو یا انگریزی میں — دیکھتے ہیں تو محض فہرستِ مضامین پر نظر ڈالنے ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہم سائنس کے اس اہم اور ضروری شعبے میں کس قدر پیچھے ہیں۔ طبعیات اس ربع صدی میں کہیں سے کہیں جا پہنچی ہے اور ہمارے ہاں طبعیات کی تدریس و تالیف کا وہی عالم ہے جو سو پچاس سال پہلے تھا۔ طبعیات کو آج بھی قدیم زمانے کی طرح حرارت، روشنی، آواز، برق اور مقناطیس کی اقسام میں تقسیم کر کے پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے۔

طبعیات نے دورِ جدید میں جو ترقیاں کی ہیں اور جو نئے اسلوب اور پیرائے اختیار کیے ہیں ان کو بھی شامل نصاب کرنے کی ضرورت ہے۔ آج طبعیات واضح طور پر دو بڑے شعبوں میں منقسم نظر آتی ہے۔ اگرچہ ایک شعبہ کا وجود دوسرے کے وجود پر منحصر ہے۔

ایک طبعیات وہ ہے جس کا تعلق مادّے کے خواص سے ہے، ٹھوس اشیاء، مائعات اور گیسوں سے، اور ان عجیب و غریب مگر انتہائی اہم چیزوں سے جو نہ تو ٹھوس ہیں نہ مائع مثلاً پینٹ، پلاسٹک کے محلولات اور جیلی کی قسم کے مواد۔ اس شعبے میں اس قسم کے سوال اُبھرتے ہیں:

- لوہا کیوں مقناطیس کی طرف کشش رکھتا ہے، تانبا کیوں نہیں؟
- جب ٹھوس اشیا پگھلتی ہیں تو کیا ہوتا ہے؟
- بعض مائع آسانی سے بہتے ہیں، بعض مشکل سے۔ کیوں؟
- بعض چیزوں سے بجلی تیزی سے سرایت کر جاتی ہے بعض میں سے مشکل سے۔ اور بعض میں بالکل نہیں۔ کیوں؟

موجودہ صدی کے دوران میں اور بالخصوص گزشتہ پچیس تیس برسوں میں دنیا بھر کے طبعیات دانوں نے مل جل کر یا تنہا تنہا جو تحقیقات کی ہیں، اُن سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ان سوالات کا جواب اس وقت معلوم ہوتا ہے جب دو بنیادی سوالوں کے حل پر غور کیا جاتا ہے:

ا۔ جن غیر مرئی ذرّات سے مل کر مادّہ بنتا ہے، اُن کی ماہیت کیا ہے؟

ب۔ یہ ذرّات مادّے میں کیوں کر باہم ترتیب پائے ہوئے ہیں؟

پہلے سوال سے جدید طبعیات کے دوسرے شعبے نے جنم لیا ہے، جسے عرفِ عام میں "ذراتی طبعیات" کہا جاتا ہے اس کے تحت ذرّات کی ماہیت کے علاوہ اُن قوتوں کا بھی مطالعہ کیا جاتا ہے جو ذرّوں کے درمیان ایک دوسرے کے لیے وجہِ کشش یا بنائے مخاصمت کی صورت میں پائی جاتی ہیں۔ اس شعبے میں جہاں سائنس اپنی معراج کو پہنچی ہوئی محسوس ہوتی ہے، اس نوعیت کے سوالات عاید کیے جاتے ہیں:—

ا۔ اگر مادّہ چھوٹے چھوٹے ذرّوں کی ترکیب خاص سے بنا ہے، تو پھر ذرّے خود کیوں کر بنتے ہیں اور وہ کیسے وجود میں آتے ہیں؟

ب۔ ذرّے کتنی قسم کے ہوتے ہیں؟

ج۔ کیا ذرّوں کی بھی کمیت، جسامت، لمبائی، چوڑائی ہوتی ہے؟ کتنی؟

د۔ کیا ذرّوں میں بھی برق اور مقناطیست ہوتی ہے؟

ہ۔ ذرّے ایک دوسرے پر کن کن قوتوں سے اثر انداز ہوتے ہیں؟

---

* حاجی بلڈنگ، حسن علی آفندی روڈ، کراچی ۱

۹۔ ذرّے کیوں کر حرکت کرتے ہیں؟ کیا اُن کی حرکت کے بارے میں پیش بینی یا پیش گوئی ہو سکتی ہے؟

پہلا حصہ —— ذرات اور قوتیں

یہ نظریہ کہ مادّہ چھوٹے چھوٹے ذرّوں یا اینٹوں سے مل کر بنا ہے، آج کا نہیں ہے، بلکہ زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ نظریۂ جوہریت فی الحقیقت ایک فارمولا یا اصول یا مفروضہ نہیں، بلکہ ایک علمی کوشش ہے۔ مادّے کو سمجھنے کی۔ مادّے کی نوعیت، ماہیت اور خواص کو سمجھنے کی کلیدی اور مرکزی کوشش یہی نظریہ ہے جس کی بنیاد جوہریت ہے۔ زمانہ قدیم کے سائنس دانوں کے سامنے مادّے کو سمجھنے کے دو حل تھے:۔

۱۔ مادّے کے چار بنیادی عناصر ہیں۔ مٹی، آگ، ہوا، پانی۔ دنیا کی ہر مادّی چیز ان چاروں عناصر کی، مختلف نسبتوں سے، ترکیب باہمی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ کسی چیز میں پانی زیادہ ہوتا ہے اور ہوا کم۔ اس نظریے کو روایتی فلسفے میں صدیوں تک مہر تصدیق کی حیثیت حاصل رہی۔ ارسطو کا بھی یہی نظریہ تھا۔

۲۔ نظریۂ جوہریت، جس کی رو سے ایٹم اور خلا کی موجودگی کا اثبات ہوا۔

موجودہ زمانے میں وہ تمام سائنٹفک تحقیقات جو ایٹم پر ہو رہی ہیں اور جن کے حیرت انگیز نتائج تمام عالم کو مبہوت کیے ہوئے ہیں۔ ان تمام تحقیقات کی داغ بیل آج سے دو ہزار سال پہلے یونان میں پڑ چکی تھی۔ یونانی زبان میں ٹوم (TOM) تقسیم کرنے کو کہتے ہیں۔ آریائی زبانوں میں "آ" نفی کا کلمہ ہے۔ چنانچہ ہندی زبان میں جس طرح 'اٹل' کے معنی 'نہ ٹلنے والا' کے ہیں اسی طرح یونانی زبان میں "ایٹم" کے معنی ہیں "نہ تقسیم ہونے والا۔ ناقابلِ تقسیم"۔ یونان کے فلسفی زینو ایلیائی نے بتایا کہ کائنات کا مادّہ ایک مسلسل اور ناقابلِ تغیر چیز ہے۔ اس کے بعد دمقراطس آیا جس نے دنیا کو پہلی بار "ایٹم" سے روشناس کرایا تھا۔ ایٹم کا نام بھی دمقراطس ہی کا وضع کردہ ہے۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ دنیا کی ہر شے نہایت چھوٹے چھوٹے، ناقابلِ تقسیم ذرّوں یعنی اینٹوں سے بنی ہے۔ اس کے خیال میں ہر ایٹم کا ایک سائز ہے لیکن وہ اتنا کم ہے کہ ایٹم آنکھوں کو دکھائی نہیں دے سکتا۔ ہلکی اشیاء کے ایٹم ہلکے اور بھاری اینٹوں کے ایٹم بھاری ہوتے ہیں۔ دمقراطس کے خیال میں انسان اور دوسرے جانداروں کی روح بھی اینٹوں کی بنی ہوتی ہے اور روح کے ایٹم باقی تمام اشیاء کے ایٹموں سے چھوٹے اور ہلکے ہوتے ہیں۔ کائنات میں صرف ایٹم ہی ایٹم ہیں ایٹم کے ارد گرد جو جگہ رہ جاتی ہے، وہاں کوئی شے نہیں ہے اور اس لیے وہ مکمل ایک خلا ہے۔ اس خلا میں ایٹم گھومتے پھرتے ہیں۔ دمقراطس باقی امراض کے بارے میں کہتا تھا کہ یہ فضا سے آئے ہوئے بعض اینٹوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ نیند کے متعلق اس کا خیال تھا کہ جب انسان کے بدن سے روح کے بعض ایٹم نکل جاتے ہیں تو انسان پر نیند کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس حالت میں روح کے باقی ایٹم ان خارج شدہ باقی اینٹوں کو واپس لانے کے لیے کوشاں رہتے ہیں اور جوں ہی یہ ایٹم واپس آجاتے ہیں، انسان نیند سے جاگ اُٹھتا ہے۔ موت کے بارے میں دمقراطس کا خیال تھا کہ جب روح کے تمام ایٹم انسانی بدن سے نکل جاتے ہیں تو اس کی موت واقع ہو جاتی ہے اس حالت میں چوں کہ بدن میں روح کے کوئی ایٹم باقی نہیں ہوتے جو خارج شدہ اینٹوں کو واپس لاسکیں، اس لیے مرنے کے بعد آدمی زندہ نہیں رہ سکتا۔

دمقراطس نے یہ نظریہ دو ہزار سال سے بھی پہلے پیش کیا تھا۔ اس مدت کے دوران میں زیادہ تر اسی نظریے کی توثیق ہوتی رہی ہے۔ اگرچہ اس کے خلاف بھی خاصا کچھ لکھا گیا سب سے پہلے تو افلاطون اور ارسطو ہی نے اس کی مخالفت میں لکھا۔ پھر اپی کیورس نے اس میں اتنا اضافہ کیا کہ ایٹم کا وزنی ہونا بھی بیان کیا۔ اس نے کہا کہ ایٹم اپنے وزن سے گرتے ہیں لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ یہ آپس میں ٹکراتے کیوں ہیں۔ قدیم ہندوستان میں بدھ مت اور جین مت کے ماننے والے عالموں نے — تقریباً وہی نظریہ پیش کیا جو دمقراطس نے پیش کیا تھا۔ یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ انہوں نے اپنا نظریہ یونان سے اخذ کیا تھا یا اپنے طور پر خود وضع کیا تھا۔

ایٹم کا جدید نظریہ برطانیہ کے ماہر طبعیات جان ڈالٹن نے ۱۸۰۸ء میں پیش کیا تھا۔ ڈالٹن نے کہا کہ مادہ خواہ کسی بھی شکل میں ہو، ایٹموں سے بنا ہوتا ہے۔ کسی عنصر کے تمام ایٹم سائز اور وزن میں ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اور جو خصوصیات عنصر کی ہوتی ہیں، وہی تمام خصوصیات ہو بہو اس کے ہر ایٹم کی

ہی ہوتی ہیں۔ ایٹموں کی باہمی ترکیب اور اتحاد سے "سالمہ" بنتا ہے۔ اگرچہ ایٹموں کے مختلف مرکبات سے مختلف اشیاء بنتی ہیں لیکن سالمے کے ایٹم کبھی تبدیل نہیں ہوتے۔ ڈالٹن نے بتایا کہ خاص اشیاء بنانے کے لیے ایٹم خاص مرکبات کی صورت میں یکجا اور متحد ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہائیڈروجن کے دو ایٹم آکسیجن کے ایک ایٹم کے ساتھ مل کر پانی بناتے ہیں۔ ہائیڈروجن کے تین ایٹم نائٹروجن کے ایک ایٹم کے ساتھ مل کر امونیا بناتے ہیں۔ ایٹم کی اندرونی ساخت کے بارے میں ڈالٹن کے نظریات سائنس کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کا یہ خیال بالکل درست ثابت ہوا کہ پیچیدہ سے پیچیدہ سالمات بھی ایٹموں کے مرکبات سے بنتے ہیں لیکن ایٹموں کے صحیح توازن کے بارے میں اس کا خیال درست نہیں تھا۔

برطانیہ ہی کا مشہور طبیعات دان سر جے۔ جے تھامسن پہلا شخص تھا جس نے طویل تحقیقات کے بعد بتایا کہ یقیناً ایٹم کے اندر برقی لحاظ سے مثبت میدان ہونا چاہیے جس میں منفی الیکٹرون باہم گتھے ہوئے نکلیں گے۔ تھامسن ہی نے "الیکٹرون" دریافت کیا تھا۔ اس کے بعد لارڈ رتھرفورڈ آیا۔ اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ایٹم کے قلب میں ایک "مرکزہ" ہوتا ہے جو بہت مثبت برقی دار ہوتا ہے اور یہ کہ ایٹم زیادہ تر کھوکھلا ہوتا ہے۔ اس کی جو بھی اصلیت و قوت ہے، وہ مرکزہ ہے۔ رتھرفورڈ نے یہ بھی بتایا کہ ہر ایٹم کے مرکزے میں اتنے ہی پروٹون ہوتے ہیں جتنے الیکٹرون اس کے مدار میں ہوتے ہیں۔

رتھرفورڈ کا یہ قول سائنس دانوں کے لیے ایسا لقمہ بن گیا جو نہ نگلا جاتا تھا نہ اُگلا جاتا تھا۔ اس کے قول کے مطابق انہوں نے عناصر کے ایٹموں کا شمار منطقی ترتیب سے یوں کیا۔

ایٹم نمبر ۱ ہائیڈروجن : ایک الیکٹرون اور ایک پروٹون
ایٹم نمبر ۲ ہیلیم : ۲ الیکٹرون اور ۲ پروٹون
ایٹم نمبر ۳ لیتھیم : ۳ الیکٹرون اور ۳ پروٹون

وہ اس ترتیب سے ایٹم نمبر ۹۲ یعنی یورانیم تک پہنچ گئے جس میں ۹۲ الیکٹرون اور ۹۲ پروٹون ہوتے ہیں۔

چونکہ ایٹم کا تمام کا تمام وزن فی الحقیقت اس کے پروٹون میں ہوتا ہے اس لیے یہ فرض کر لیا گیا کہ ہیلیم کے ایٹم کا وزن ہائیڈروجن کے ایٹم سے دگنا ہونا چاہیے اور لیتھیم کے ایٹم کا وزن ہائیڈروجن کے ایٹم سے تین گنا ہونا چاہیے

چوتھا عنصر بیری لیم جو چار پروٹون اور چار الیکٹرون پر مشتمل ہوتا ہے، اسے ہائیڈروجن سے چار گنا وزنی ہونا چاہیے لیکن صورت حال مختلف ہے۔ اس کا وزن نو گنا زیادہ ہے۔

اب سائنس دانوں کے سامنے یہ سوال درپیش تھا کہ یہ فالتو وزن کہاں سے آگیا؟ اس کے جواب میں سر جیمز چیڈوک نے "نیوٹرون" پیش کر دیا۔ یہ تحت ایٹمی ذرہ ہے اور ایٹمی (جوہری) توانائی کا پورا نظریہ اس ذرے پر منحصر ہے۔ سر چیڈوک نے دریافت کیا کہ نیوٹرون کا وزن لگ بھگ وہی ہے جو پروٹون کا ہے لیکن یہ برقبار نہیں ہوتا۔ ایٹم کے اندرونی نظام میں اس کا کام کمیت بڑھانا ہے۔ اس صورت میں کہ کمیت بڑھانے کے معاوضے میں فالتو الیکٹرون کا تقاضا نہ کرے۔ اس دریافت پر اسے ۱۹۳۵ء میں طبیعات کا نوبل انعام دیا گیا۔ اس کی دریافت کے بعد دنیا بھر میں ایٹمی طبیعات سے غیر معمولی دلچسپی لی جانے لگی۔ اب ایٹم سے توانائی حاصل کرنے کے ہلکے ہلکے امکانات نظر آنے لگے۔ بہت سے پیچیدہ امور و رموز جو مدت مدید سے سائنس دانوں کے لیے الجھن کا باعث بنے ہوئے تھے، اب کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگے۔

مختلف ایٹموں کا مختلف وزن کا ہونے کا راز بھی فاش ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ سوائے ہائیڈروجن کے باقی تمام عناصر کے مرکزوں میں نیوٹران کی تعداد کم از کم اتنی ضرور ہوتی ہے جتنی پروٹونوں کی ہوتی ہے۔ زیادہ بھاری عناصر میں نیوٹرون کی تعداد پروٹونوں سے کبھی کبھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر یورانیم میں ۹۲ پروٹون اور ۱۴۶ نیوٹرون ہوتے ہیں جس کی وجہ سے یورانیم ہائیڈروجن سے ۲۳۸ گنا زیادہ بھاری ہوتا ہے۔ بیری لیم چار پروٹونوں پر مشتمل ہونے کے باوجود ہائیڈروجن سے نو گنا زیادہ کیوں ہے۔ اس سوال کا جواب یہ معلوم ہوا کہ اس کے مرکزے میں چار پروٹونوں کے ساتھ ساتھ پانچ نیوٹرون بھی ہوتے ہیں جن کا وزن پروٹون کے لگ بھگ ہوتا ہے۔ پروٹون کے وزن کا تصور کرنا بھی بہت مشکل ہے۔ پروٹون کا وزن یہ ہے:

۰.۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰ ۱۷ گرام

یا ۱۰۷×10^{-24} گرام

ایٹم کے اندرونی نظام کی ایک اور دلچسپ اور مفید سراغ رسانی سوویت روس کے سائنس دان دمتری مندلیف نے کی۔ اس نے دریافت کیا کہ عناصر میں باقاعدہ کیمیائی مشابہت پائی جاتی ہے۔ اس نے عناصر کا

یادی نقشہ" مرتب کیا جس سے ظاہر ہوا کہ عناصر کے بعض گروپ یکساں قسم
نصوصیات کے حامل ہوتے ہیں. حالاں کہ ان کے ایٹمی وزن بالکل مختلف ہوتے
۔ عناصر کے ان گروپوں کا نام خاندان رکھا گیا۔ مثال کے طور پر تمام جامد گیسیں
ہیلیم، نیون، آرگن، کرپٹیان، ریڈون) مقررہ سانچے کے خاندان سے تعلق
ی ہیں۔ تانبے، چاندی اور سونے کا اپنا اپنا خاندان ہے۔

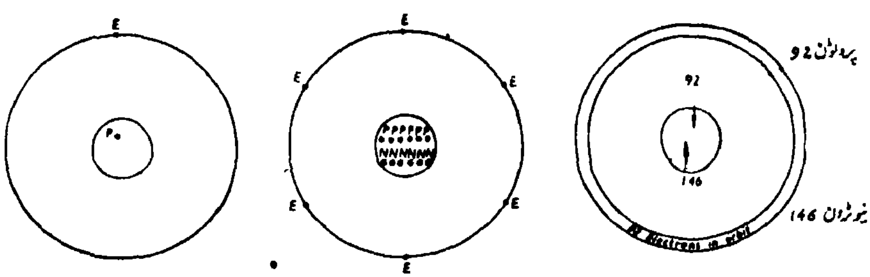
جس زمانے میں منڈلیف نے "معیادی نقشہ" بنایا تھا، اس وقت
۔ اکثر عناصر دریافت بھی نہ ہوئے تھے. لیکن اسے پختہ یقین تھا کہ مزید نئے
اصر جلد یا بدیر لازما
یافت ہوں گے۔ اس
ان کے لیے نقشے میں خالی
ہیں چھوڑ دی تھیں اور
ح تک وہ خالی جگہیں
ری ہو رہی ہیں۔ اس نے
شین گوئی کی تھی کہ ایک
ائب عنصر یعنی نمبر ۳۲
ب بھی دریافت ہوگا
ہ خاکستری سفید رنگ
ا ایک دھات ہوگی جس
ر کسی ترشے یا القلی کا کوئی
ثر نہ ہوگا اور جس کو
بلانے سے سفید رنگ
کا اوکسائڈ پیدا ہوگا
اس نے اس کا ایٹمی وزن بھی بتایا اور اسے ایٹموں کے اس خاندان میں لکھا جس
میں سلیکون، ٹن اور سیسہ شامل ہیں۔ پندرہ برس کے بعد عنصر نمبر ۳۲ یعنی
جرمانیم دریافت ہوا تو اس میں عین مین وہی خصوصیات موجود تھیں جن کی اس
نے پیشین گوئی کی تھی۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ ہر ایٹم میں الیکٹرون کی تعداد مختلف ہوتی ہے
یہ الیکٹرون مرکزے کے ارد گرد یونہی بلا مقصد اور بے ہنگم و بے ترتیبی سے بکھرے
ہوئے نہیں ہیں۔ نظریہ یہ کہتا ہے کہ الیکٹرون انتہائی خوبصورت ترتیب اور
حسین امتزاج کے ساتھ ننھے ننھے مداروں کے ساتھ تہ در تہ گندھے ہوئے ہیں
مرکزے کے قریب والی تہ دو الیکٹرونوں پر مشتمل ہے. اس کے ساتھ والی دوسری
تہ میں آٹھ الیکٹرون، اور تیسری تہ میں آٹھ الیکٹرون ہوتے ہیں لیکن نظریے کی
رو سے ایٹم کو اپنی بیرونی سطح میں آٹھ الیکٹرونوں ہی کا مرکب پسند ہے۔ یعنی
آٹھ، سولہ، بتیس۔

اگر ایٹم میں حسن ترتیب کے لحاظ سے الیکٹرونوں کی صحیح تعداد موجود نہ
ہوگی، تاکہ اس کا بیرونی خول ہر لحاظ سے صحیح اور مکمل بنے تو پھر وہ کسی اور
عنصر کے ایٹم کی جستجو
میں رہے گا تاکہ اس
کے الیکٹرونوں کی شراکت
اور ملاپ سے بیرونی
خول صحیح معنوں میں
مکمل بنا سکے۔

کاربن کے ایٹم
میں چھ الیکٹرون ہوتے
ہیں۔ دو اندرونی خول
میں اور چار بیرونی
خول میں ہوتے ہیں۔
بیرونی خول کو مکمل بنانے
کے لیے آٹھ الیکٹرون
درکار ہیں۔ وہ دوسرے
عناصر سے لین دین کر کے
اپنی مطلوبہ تعداد پوری کر لیتا ہے۔ آکسیجن میں آٹھ الیکٹرون ہیں۔ دو اندرونی
خول میں، چھ بیرونی خول میں۔ اس کے باوجود وہ مزید دو الیکٹرونوں کی جستجو
میں بیتاب رہتا ہے۔ تاکہ اپنے بیرونی خول میں لگا سکے۔

کوئلے میں آگ سلگتی ہے جو ہوا میں بھڑک اٹھتی ہے۔ آکسیجن کا ہر ایٹم
مزید دو دو الیکٹرونوں کی جستجو میں ہے لیکن یاد رہے کہ خوش قسمتی سے
آکسیجن کے ایٹموں میں ایک اور خاصیت بھی ہے وہ یہ کہ دو دو ایٹم مل کر
ایک دوسرے کو دو دو الیکٹرون دے دیتے ہیں اور یوں آکسیجن کے



سادہ ترین ایٹم ہائیڈروجن کا ہوتا ہے. (بائیں تصویر) اس کے مرکزے میں ایک پروٹون ہوتا ہے جو مثبت برق دار ہوتا ہے جس کا توازن منفی برق دار الیکٹرون قائم رکھتا ہے. کاربن ایٹم (درمیانی تصویر) کا نظام قدرے پیچیدہ ہوتا ہے۔ مرکزے میں چھ پروٹون اور چھ نیوٹرون ہوتے ہیں۔ اس لیے اس کا ایٹمی وزن ۱۲ ہے۔ ۶ پروٹونوں کے مثبت برقی بار کا توازن مدار میں گھومنے والے ۶ الیکٹرون قائم کرتے ہیں۔ یورانیم کا ایٹم (دائیں تصویر) سب سے بھاری ہوتا ہے۔ اس کا ایٹمی وزن ۲۳۸ ہے۔ اس کے مرکزے میں ۹۲ پروٹون اور ۱۴۶ نیوٹرون ہوتے ہیں۔ مدار میں ۹۲ الیکٹرون موجود ہوتے ہیں۔

سالمے آسانی سے بن جاتے ہیں۔ صرف حرارت کے سالمے زیر اثر سالمے کے سالمے ٹوٹتے پھوٹتے ہیں اور پھر کوئلے کے کاربن کے ایٹموں میں مل جاتے ہیں۔ اس ملاپ سے حرارت سے توانائی پیدا ہوتی ہے۔

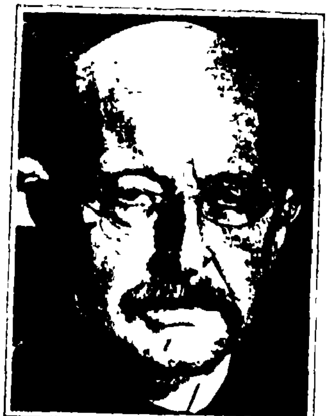
ہائیڈروجن کے دو ایٹم اور آکسیجن کا ایک ایٹم مل کر پانی کا ایک سالمہ بناتے ہیں جیسے H_2O کہا جاتا ہے۔ مگر کیوں؟ ہائیڈروجن کے ایٹم میں فقط ایک الیکٹرون ہوتا ہے جب کہ اندرونی خول کی صحت اور تکمیل کے لیے ان میں دو الیکٹرون ہونے چاہییں (جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا۔ اندرونی خول میں ہمیشہ دو الیکٹرون کی موجودگی ضروری ہے)۔ اب ہائیڈروجن دو کام کر سکتا ہے۔ یا تو وہ اپنا یہ الیکٹرون بھی کسی دوسرے ایٹم کو دے دے گا جو خود بھی ایک الیکٹرون ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ یا پھر وہ کسی اور عنصر کا ایٹم تلاش کرے گا جس کے پاس فالتو الیکٹرون ہوں۔

اب آکسیجن کی صورتِ حال پر غور کیجیے۔ اُس کے ایٹم میں آٹھ الیکٹرون ہوتے ہیں۔ دو الیکٹرون اندرونی خول میں ہوتے ہیں۔ دو ہی ہونے چاہییں اس لیے اندرونی خول تو مکمل ہے۔ چھ الیکٹرون بیرونی خول میں ہیں۔ اس لیے وہ ادھورا اور نامکمل ہے۔ کیوں کہ اس میں آٹھ الیکٹرون ہونے چاہییں۔ اس لیے آکسیجن کا ایٹم ہائیڈروجن کے دو ایٹموں سے مل کر حصہ داری کر لیتا ہے اور تینوں مل کر ہنسی خوشی اچھلتے پھرتے ہیں۔



روسی سائنس دان مینڈلیف

الیکٹرون کا یہ نظریہ کہ وہ اپنے مدار میں ترتیب سے جڑے ہوئے ہیں۔ اُس وقت مفید اور مددگار ثابت ہوتا ہے۔ جب ہم ایٹم کو ایک کیمیائی شے خیال کرتے ہیں لیکن یہ نظریہ ایٹم کے طبعی خواص کی وضاحت نہیں کرتا۔ مثال کے طور پر یہ سوال ذہن میں آتے ہیں کہ الیکٹرون وقت کے ساتھ ساتھ بتدریج تھکتے کیوں نہیں۔ اُن کی توانائی میں کمی کیوں نہیں آتی۔ وہ تھک کر ٹوٹ پھوٹ کر نڈھال ہو کر ایٹم کے مرکزے میں گر کیوں نہیں جاتے۔ ان سوالات کا جواب ڈنمارک کے ماہر طبیعیات نیلز بوہر نے معلوم کیا۔ بوہر لارڈ رتھر فورڈ کا رفیق کار بھی تھا۔ اس نے ایک خاصہ پیچیدہ نظریہ پیش کیا جسے آج دنیا بھر میں قبولیت عامہ حاصل ہو چکی ہے۔ اس نے کہا کہ الیکٹرون مرکزے کے گرداگرد توانائی کی مختلف سطحوں پر" ایک خاص ترتیب سے بکھرے ہوئے گھوم رہے ہیں۔ وہ ایک سطح سے چھلانگ لگا کر دوسری سطح میں داخل ہو سکتے ہیں لیکن دو سطحوں کے درمیان معلق نہیں رہ سکتے۔ جب کوئی ایٹم کسی بھی قسم کی اشعاع۔ حرارت کو سمک ریز' روشنی کی شعاعوں۔ کے زیر اثر آ جاتا ہے تو اُس کے الیکٹرونوں میں توانائی آ جاتی ہے اور وہ چھلانگ لگا کر اونچی سطح میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جب بیرونی توانائی ختم ہو جاتی ہے تو الیکٹرون چھلانگ لگا کر واپس قریب کی نچلی سطح میں آ جاتے ہیں۔



نظریۂ کوانٹم کا بانی — میکس پلانک

توانائی ضائع اور غائب نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ روشنی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ کتنی روشنی؟ اس کا طول موج توانائی کی اس مقدار کے مطابق ہوتا ہے جو الیکٹرون نے قبول کی تھی۔ قبول شدہ توانائی کی مقدار کو اصطلاح میں "پیکٹ" کہا جاتا ہے۔ ایک عنصر کے ایٹم توانائی کے پیکٹ جو قبول کرتے ہیں وہ کسی دوسرے عنصر کی قبول کردہ توانائی سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے توانائی کے تغیر کے دوران میں جو روشنی جذب یا پیدا ہوتی ہے' اس کی موجوں کا طول ہر عنصر میں منفرد اور مختلف ہوتا ہے۔ اگر دو ایٹموں کو لیں

میں دیکھا جائے (جو روشنی کی موجوں کو الگ الگ کر کے دکھاتا ہے) تو معلوم ہوگا کہ دونوں کا منظر منفرد اور الگ ہے۔ چونکہ ہر عنصر اپنے الیکٹرونی نظام کی وجہ سے دوسرے عناصر سے مختلف و منفرد ہے۔ اس لیے طیف نما میں اس کا منظر بھی مختلف و منفرد نظر آتا ہے۔ سادہ لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ طیف نما میں ہر حصے کی شناخت و تمیز ہو سکتی ہے۔ اسی وجہ سے ماہرین فلکیات بتا سکتے ہیں کہ ستارے کس چیز سے بنے ہوئے ہیں۔

اب تک صرف قایم ایٹموں کا ذکر ہوا ایٹم کی کہانی میں سب سے دلچسپ اور سنسنی خیز موڑ وہ آتا ہے جب یہ انکشاف ہوا کہ بعض عناصر سے توانائی اشاع کی صورت میں خود بخود خارج ہوتی رہتی ہے۔ ایسے عناصر میں سب سے پہلا عنصر جو دریافت ہوا وہ یورانیم تھا لیکن توانائی کا اس سے بھی بڑا منبع ریڈیم ثابت ہوا جس کی دریافت کا سہرا پائرے کیوری اور مادام کیوری کے سر ہے۔ ان کی تحقیق تجسس اور کامیابی کی داستان سائنس کی تاریخ میں ناقابل فراموش باب کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔



جدید ایٹمی نظریے کا بانی نیلز بوھر

انہوں نے دریافت کیا کہ ریڈیم سے شعاعیں نکلتی ہیں۔ یعنی یہ تابکار عنصر ہے۔ یہ شعاعیں دیکھی بھی جا سکتی ہیں اور ان کی پیمائش کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے حرارت کی معمولی مقدار حاصل کی' جس کی پیمائش بھی ہو سکتی تھی۔ بعض دوسرے سائنسدانوں نے جو ایک مدت سے ریڈیم کا مطالعہ کر رہے تھے' دریافت کیا کہ ریڈیم کی شعاعیں مائل بھی جا سکتی ہیں اور مقناطیسی میدان کے ذریعے اُن کا رخ بھی موڑا جا سکتا ہے اور اس عمل کے دوران میں ریڈیم سے ایک گیس نکلتی ہے جو ہیلیم سے مشابہ معلوم ہوتی ہے۔ ایسی گیس جس کے دو الیکٹرون ضایع ہو چکے ہوں' اس کا ذرہ اتنا چھوٹا اور تیز رفتار ہوتا ہے کہ پتلے شیشے میں سے گزر سکتا ہے۔

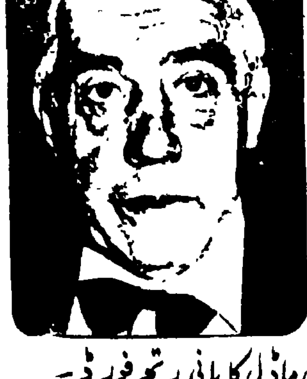
لارڈ رتھر فورڈ اور فریڈریک سوڈی نے جرأت سے کام لے کر ایک ایسا نظریہ پیش کیا' جسے ایٹم کی دنیا میں "کفر" کہنا چاہیے۔ ہزاروں برس سے یہ کہا جا رہا تھا کہ ایٹم ناقابل تقسیم ہے انہوں نے کہا نہیں ایٹم قابل تقسیم ہے۔ انہوں نے ثابت کر دکھایا کہ ریڈیم کا ایٹم مسلسل انتشار اور تقسیم در تقسیم کی حالت میں رہتا ہے۔ فعّال ذرات ایک طرف ہٹ جاتے ہیں اور ایک ہلکا پھلکا ایٹم باقی رہ جاتا ہے جو طبعی اور کیمیائی لحاظ سے اصل ریڈیم سے بالکل مختلف ہوتا ہے یہ باقی ماندہ ایٹم ایک عام سے عنصر کا رہ جاتا ہے جسے سیسہ کہا جاتا ہے۔

ایٹم کی الیکٹرونی ساخت کے بارے میں جدید نظریات نے مندرجہ ذیل صورتوں میں الگ الگ راہیں اختیار کر لی ہیں:

۱۔ الیکٹرون اپنے وجود کے لیے کسی اور کے محتاج نہیں بلکہ وہ مستقل بالذات ہیں۔ آج کل الیکٹرون کی شعاعوں کا مطالعہ بجائے خود ایک ٹکنالوجی بن چکا ہے جس کے تحت مختلف سائز اور شدت کی شعاعوں (BEAMS) کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

۲۔ ایٹم کا مرکزہ بھی اتنی اہم چیز ہے کہ اس کے خصوصی مطالعے کے لیے ایک خصوصی شعبہ الگ قایم ہونا چاہیے۔ چنانچہ موجودہ صدی کے تقریباً نصف میں مرکزائی یا بنائی یا نوائی یا نکلیئر طبیعات خوب پھلی پھولی۔ جس کے ایک شاخسانے کے طور پر ایٹم بم وجود میں آیا اور نکلیئر طاقت سامنے آئی۔

۳۔ ایٹم کے بطن میں الیکٹرون کا رویہ کیا ہوتا ہے' اس کا بھی تجزیہ ہونا چاہیے۔ یہ تجزیہ کرنے کے لیے طبیعات کی ایک نئی شاخ پیدا ہو گئی' جسے "جوہری طبیعات" کہا جاتا ہے۔ اس شاخ سے کئی دوسرے طبعی علوم کے شگوفے پھوٹے ہیں۔



ایٹمی ماڈل کا بانی رتھر فورڈ۔

نائجیریا میں ادارۂ امارت کا ارتقاء

سید احتشام ندوی*

نائجیریا میں اسلام کو سمجھنے کے لیے امارت اور امیر کو سمجھنا ضروری ہے عجیب بات ہے کہ مسلمانوں میں ہندوستان میں امیر کا تصور باقی نہیں رہا۔ امیر کے تصور سے مسلم معاشرے میں مرکزیت پیدا ہوتی ہے۔ نائجیریا میں یہ مرکزیت مسلمانوں میں پوری طرح قایم ہے۔ پہلے انگریزوں کی حکومت تھی اور اب سیکولر حکومت ہے مگر کسی کی مجال نہیں کہ امیر اور امارت پر ضرب لگا سکے۔ ہر علاقے کا اور ہر شہر کا اپنا امیر ہے۔ سارے مسلمان اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ مسلم عوام میں اس کا غیر معمولی اثر ہے۔ یعنی اگر حکومت اور امیر کے درمیان اختلاف واقع ہو تو ہمیشہ حکومت کو اس کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ عوامی مقبولیت اور اس کے نتیجے میں عوامی طاقت امیر کے پاس ہے۔ اگرچہ اب اس کے پاس حکومت نہیں ہے مگر پرانا وقار اور دبدبہ باقی ہے۔ چنانچہ ایک بار جب ریاست کانو کے گورنر اور شہر کانو کے امیر میں اختلافات رونما ہوئے تو گورنر کو استعفیٰ دینا پڑا۔ پورے نائجیریا میں ہر شہر میں امیر ہے اور ان امیروں پر ایک سلطان ہے جو سکوٹو میں رہتا ہے۔ اس سلطان کا تعلق امیر المومنین عثمان ڈان فوڈیو کے خاندان سے ہے جنھوں نے اٹھارھویں صدی عیسوی میں نائجیریا میں خلافت قایم کی تھی۔ عثمان ڈان فوڈیو کو عربی میں عثمان بن فودی لکھا جاتا ہے۔ انکا زمانہ ۱۷۵۴ تا ۱۸۱۷ء ہے۔ انہوں نے جہاد کر کے خلافت قایم کی۔ یہ خلافت ۱۰۰ برس تک قایم رہی۔

انگریزوں نے ۱۸۵۱ء میں لاگوس پر قبضہ کر لیا۔ پھر انہوں نے ۱۹۰۲ء میں شمالی نائجیریا پر قبضہ کر کے اصل حکمرانوں کو باقی رکھا اور اُن سے ٹیکس وصول کرتے رہے۔ گویا وہ بالواسطہ حکومت کرتے رہے۔ اس شمالی نائجیریا میں جو مسلم علاقہ ہے اس پر قدیم حکمراں باقی رہے اور انگریزوں کو ان کا حصہ پہنچاتے رہے۔ اس طرح ان امیروں کی قوت اور شان و دبدبہ انگریزوں کے زمانے میں بھی باقی رہا۔ انگریزوں نے عوامی طاقت اور جہاد سے مرعوب ہو کر براہِ راست حکومت کرنے کے خطرات کو محسوس کر لیا اور فتح حاصل کرنے کے بعد بھی پایۂ تخت سکوٹو میں امیر المومنین عثمان بن فودی کی اولاد کو سلطان سکوٹو کا لقب دے کر ان کو حاکم تسلیم کر لیا۔ اسی طرح بورنو میں جہاں پہلے سے شیخ محمد امین کانمی کی اولاد میں حکومت چلی آ رہی تھی، انھیں میں سے ایک شخص کو منتخب کر کے حکومت اس کے سپرد کر دی۔ اس طرح پورے نائجیریا میں امیر اور امارت کا دور دورہ رہا۔ جب ۱۹۶۰ء میں انگریزوں نے ملک کو آزاد کیا تو سیاسی اتحاد قایم کرنے کے لیے انھوں نے ملک کو سیکولر بنا کر آزادی دی۔ مگر لطف کی بات یہ ہے کہ یہاں انگریزوں کی پالیسی بر خلاف دوسرے ملکوں کے جنوب اور شمال کے اتحاد کی تھی۔ جنوبی نائجیریا کو انھوں نے عیسائی بنا دیا تھا اور شمالی نائجیریا پورا مسلم آبادی پر مشتمل تھا۔ مشہور مصلح احمد بلّو اور دوسرے سربرآوردہ مسلمان چاہتے تھے کہ جنوبی نائجیریا ایک ملک بن جائے اور شمالی نائجیریا دوسرا آزاد ملک بنا دیا جائے۔

عیسائی بھی یہی چاہتے تھے کہ شمالی اور جنوبی دونوں دو الگ الگ ملک قرار پائیں مگر انگریزوں کی مصلحت یہ تھی کہ شمالی حصّے کو انھوں نے غیر تعلیم یافتہ اور انحطاط پذیر رکھا تھا اور جنوبی حصہ کو عیسائی بنا کر ترقی یافتہ اور جدید تعلیم سے لیس کر دیا تھا۔ لہذا وہ چاہتے تھے کہ یہ لوگ جا کر مسلمانوں پر حکومت کریں اور ان کا منصوبہ بالکل صحیح ثابت ہوا اور اب عملاً یہی

---

* صدر شعبۂ عربی، کالی کٹ یونیورسٹی۔ کیرالا۔

ورہاہے کہ سارا علم آفسوں میں، بینکوں میں اور کارخانوں میں عیسائی
ہے، اسپتالوں میں تو سارے ملازم عیسائی ہوتے ہیں۔ حتی کہ ڈاکٹا نہ
ں بھی یہی حال ہے۔ بہرحال جنوبی اور شمالی حصّوں کے اتحاد سے مسلمانوں
و یہ نفع پہنچا کہ جب جنوب میں تیل کے عظیم ذخیرے نکلے تو اُن سے مسلمانوں
د بھی فیض پہنچا۔ مسلمان اکثریت میں ہیں اور حاکم ہیں۔

جب انگریزوں نے ملک کو آزاد کیا تو حکومت منتخب نمائندوں
کے ذریعے پارلیمنٹ اور کیبنیٹ کے ہاتھ میں آگئی مگر قدیم امراء باقی ہیں، ان
پاس عوامی اثر ہے۔ ہر مسلمان اپنا مذہبی فرض تصور کرتا ہے کہ امیر کی اطاعت
ے۔ ہر شہر میں امیر کا قصر بنا ہوا ہے۔ عید، بقرعید اور میلاد النبی
ی اللہ علیہ وسلم کے موقع پر عوام الناس کثرت سے قصرِ امیر میں جمع ہوتے
ں۔ وہیں سے جلوس نکلتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے امراء گھوڑوں پر سوار ہو کر
لی شاہی لباس پہن کر سر پر عمامہ اور کمر پر پٹکا باندھ کر دف اور رباجے
ساتھ عید، بقرعید اور میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سلام کے
بڑے امیر کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ بچیاں رقص کرتی ہیں اور
ن بجاتی ہیں، طویل بانس کے بھونپو بجائے جاتے ہیں۔ عوام الناس اتنی بڑی
داد میں جمع ہوتے ہیں کہ قصرِ امیر کے قریب جانا ممکن نہیں رہتا۔ امیر کی عظمت
رشان کا یہ عالم ہے کہ وہ چھتر تان کر نکلتا ہے۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوتا ہے
ب پارٹی اس پر چھتر تانے رہتی ہے۔ اللہ اکبر کے نعرے بلند ہوتے رہتے
یں۔ امیر کی اپنی پولیس ہوتی ہے جو لوگوں کو کنٹرول کرتی ہے اور کوڑے مارتی
ہے، مگر لوگ امیر کو دیکھنے کے لیے ٹوٹ ٹوٹ پڑتے ہیں۔

نمازِ جمعہ کے لیے امیر مسجد آتا ہے۔ اس وقت عوام دونوں طرف قطار
اندھ لیتے ہیں۔ پہلے ایک پارٹی نعرے لگاتی ہوئی نکلتی ہے۔ پھر امیر کبھی پیدل
ور کبھی کار میں برآمد ہوتا ہے۔ عوام اس کو گھیر لیتے ہیں۔ رمضان میں سحری
یں امیر کے قصر سے توپ داغی جاتی ہے۔ وعظ کے جلسے اور میلاد النبیؐ
کے جلسے بھی امیر کے قصر میں منعقد ہوتے ہیں۔

امیر کی رائے کا اثر ووٹ پر بھی پڑتا ہے۔ اس کے خلاف کوئی
پارٹی ووٹ حاصل نہیں کر سکتی۔ سیاسی حکمران چاہتے ہیں کہ امیروں کو
وش رکھیں اور اُن کو اپنے قابو میں رکھیں۔ جب شیخ عثمان تنگاری (الحاج
شہید تنگاری) صدرِ حکومت نائیجیریا تھے تو اکثر سکوٹو جا کر سلطانِ سکوٹو

سے ملتے اس لیے کہ سارے ملک کے امیروں پر سلطان سکوٹو کا اثر ہے
یہ اثر عوامی ہے۔ قصر کا پورا خرچ، باڈی گارڈس، ملازمین اور پورے عملے
کی تنخواہ حکومت دیتی ہے۔ حکومت ہی امیر کو منتخب کرتی ہے مگر اس کے انتخاب
کے کچھ اصول ہیں۔ امیر کے نیچے ایک اور امیر ہوتا ہے اور پھر اس کے ماتحت
بھی ایک امیر ہوتا ہے۔ یعنی امیر کے دو نائب ہوتے ہیں۔ نائب اول اور
نائب دوم۔ اس طرح اکثر مواقع پر وہ اپنے نائبین کو مقرر کر دیتا ہے مگر
خود بہت کم قصر سے باہر نکلتا ہے۔ اس کی عظمت اور اہمیت غیر معمولی ہے
اس کے پاس بہت سی کاریں ہوتی ہیں۔ کاریں کبھی نائیجیریا میں عام ہے۔ ہر
کھاتا پیتا گھرانہ کار ضرور رکھتا ہے

ادارۂ امارت کا نفع یہ ہے کہ امراء اپنے احکام کے ذریعے سارے
مسلمانوں کو آن واحد میں متحد کر سکتے ہیں۔ امیر کے حکم کو عوام حکمِ اسلام
تصور کرتے ہیں اور اس کی مخالفت گویا شریعت کی مخالفت ہے۔ وہ اتحادِ
اسلام کا رمز تصور کیا جاتا ہے۔ جب ایبو قبیلے نے بیافرا کے نام سے
الگ ایک عیسائی ملک بنانا چاہا تو دراصل امراء نے جہاد میں بڑا اہم
رول ادا کیا اور عوام ان کے گرد جمع ہو گئے۔

میرے دورانِ قیام امیر حدیجہ کا انتقال ہو گیا۔ حدیجہ درحقیقت
خدیجہ ہے مگر وہاں کی مقامی زبان ہاوسا میں "خ" کی آواز نہیں
ہے، اس لیے اس کو "ح" سے ادا کرتے ہیں۔ جب بُخاری کو بحاری
کہتے ہیں۔ بہرحال نئے امیر کی جانشینی پر زبردست جشن منایا گیا۔ حکومت
نے پہلے امیر کا انتخاب کیا مگر یہ انتخاب اسی خاندان سے ہوتا ہے جس میں
امارت پہلے سے چلی آرہی ہے۔ اتفاق سے شہر کا عظیم اسٹیڈیم میرے
کالج کے متوازی واقع ہوا تھا۔ لہٰذا ہم لوگوں نے جا کر جشن بڑی آسانی
سے دیکھا۔ ایک فرلانگ تک تو کاروں کا ہجوم تھا۔ کچھ یورپی لوگ بھی
جشن دیکھنے آئے تھے۔ جشن تلاوت قرآن مجید سے شروع ہوا۔ پھر عصا
اور پگڑی امیر کو پیش کی گئی اور قرآن مجید بھی۔ ان تبرکات سے گویا
اس کی تخت نشینی مکمل ہو گئی ہے۔ اس سلسلے میں اور بھی رسمیں ادا
کی گئیں۔ نئے امیر نے بہت سی اصلاحیں کیں۔ اس لیے کہ پرانے امیر
۱۰۰ برس کے تھے، بس اُن کا نام ہی نام تھا۔

امیر کی شان و شوکت اس دیار میں گویا اسلام کی شان و شوکت

ہے۔ لطف یہ ہے کہ غیر مسلم بھی ان جلسوں میں بڑے شوق سے شریک ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ یہاں کی اجتماعی زندگی میں یہی چیزیں باعث کشش ہیں۔

ہر تیوہار میں امیر کا قصر مسلمانوں کا مرکز توجہ بن جاتا ہے۔ جلوس یہیں سے نکلتا ہے اور سارے اہم قابلِ ذکر اجتماعی زندگی کے کام قصرِ امیر سے تعلق رکھتے ہیں۔

عید اور بقرعید میں اصل دلکشی عیدگاہ میں امیر کی آمد ہوتی ہے وہ ایک بڑے جلوس کی شکل میں عیدگاہ میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے لیے ایک چھتر پہلی صف میں لگایا جاتا ہے۔ حالاں کہ یہ امتیاز اسلامی تعلیمات کی روح کے خلاف ہے۔ بقرعید میں امام پہلی قربانی عیدگاہ میں کرتا ہے، پھر امیر قصر کی طرف واپس ہوجاتا ہے۔ امیروں کے بارے میں خبریں اخباروں میں اہتمام سے شایع ہوتی ہیں۔ امیر اسلامی لباس میں رہتا ہے اور سر پہ عمامہ باندھتا ہے۔ نائیجیریا کے ہر مسلم شہر میں دو شخصیتیں نہایت ممتاز اور بااثر تصور کی جاتی ہیں۔ ایک امیر کی اور دوسری شخصیت جامع مسجد کے امام کی۔ چوں کہ امام مالکؒ کے مذہب میں جمعہ کی نماز صرف ایک مسجد میں ہونی چاہیے، اس لیے اس مرکزیت کے باعث امام کی شخصیت کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ سارا شہر معطل ہو جاتا ہے، سڑکیں بند ہو جاتی ہیں، کاریں ٹھہر جاتی ہیں۔ ایک عجیب سماں ہوتا ہے۔ ہر جمعہ عید معلوم ہوتا ہے اور اس مجمع سے جب امیر گزرتا ہے تو اسلامی شان و دلکشی بڑھ جاتی ہے۔

خدا کرے نائیجیریا میں امارت اور امیر باقی رہیں
کہ اُن کی اہمیت کا راز اسلام سے
وابستگی ہی میں پوشیدہ ہے
اور اس طرح اسلامی
اتحاد کی روح
قایم ہے۔

> ”عیسائی نمائندوں کی استعداد، صلاحیت اور انداز بحث و گفتگو خاص طور سے ہمارے مذہبی حلقے کے لیے قابلِ غور ہے۔ راقم الحروف کو خود کئی بار بین المذاہب کانفرنسوں میں شرکت کا موقع ملا ہے اور ہر مرتبہ یہی احساس ہوا کہ ہمارے مذہبی رہنما دوسرے مذاہب کے رہنماؤں کے مقابلے میں، نہ صرف عصر حاضر کے علوم سے کم واقف ہیں بلکہ تحقیق کے جدید معیار اور تعبیر کے نئے انداز سے بھی زیادہ باخبر نہیں ہیں اور اکثر مواقع پر علما کے بجائے اسلام کی وکالت یونیورسٹیوں کے پروفیسروں ہی کو کرنی پڑی۔ یہ صورت حال مذہبی مدارس کے لیے قابل غور ہے۔ نصاب و نظام تعلیم میں دور رس تبدیلیوں کے بغیر عصر حاضر کے تقاضوں سے عہدہ برا ہونا ناممکن ہے۔“
>
> مولانا عبدالسلام ندوی

مولانا امتیاز علی خاں عرشی

سید بہاء الحق رضوی*

مولانا امتیاز علی خاں عرشی (متوفی ۲۵ رفروری ۱۹۸۱ء) مطابق ۱۹ ربیع الثانی ۱۴۰۱ھ ابن ڈاکٹر مختار علی خاں (متوفی ۸ رجنوری ۱۹۵۱ء) ابن مولوی اکبر علی خاں (متوفی ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۴ء) ابن رحم باز خاں رام پور محلہ چوک محمد سعید خاں میں ۲۹ ررمضان ۱۳۲۲ھ مطابق ۸ ردسمبر ۱۹۰۴ء بروز جمعرات عصر و مغرب کے درمیان پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب پٹھانوں کے مشہور اور معزز قبیلۂ یوسف زئی سے ملتا ہے۔

امتیاز علی خاں عرشی نے اپنی ابتدائی تعلیم مولوی جعفر علی خاں کے مکتب باغ پختہ سے شروع کی۔ اس کے بعد پرائمری اسکول میں داخل ہوئے اور چند سال اسکول کی تعلیم جاری رہی اور اس کے ساتھ نجی طور پر بھی انگریزی فارسی اور عربی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی زمانے میں مولانا عرشی کو حکیم عبدالرشید خاں (متوفی ۳۰ رمارچ ۱۹۳۱ء) سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔ حکیم عبدالرشید خاں منطق و فلسفہ و طب کے جیّد عالم تھے۔ مولانا عرشی نے ان سے صرف و نحو کی کتابیں پڑھیں اور تعلیم کے مقابلے میں ان کی صحبت سے زیادہ فائدہ حاصل کیا۔

اس کے بعد مولانا عرشی مدرسہ مطلع العلوم میں داخل ہو گئے اور مولانا سیّد احمد ہزاروی سے ان کو شرف تلمذ حاصل ہوا۔ مولانا سیّد احمد ہزاروی ایک جیّد عالم تھے اور علوم نقلیہ اور عقلیہ میں ان کو اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ عرشی صاحب کو مولانا موصوف سے جہاں علمی فوائد حاصل ہوئے وہاں ان کے فیض صحبت سے سیرت کی پختگی، سادگی، انکسار اور تواضع نفس کی خوبیاں ان کے مزاج میں پیدا ہو گئیں۔

۱۹۲۳ء میں مولانا عرشی نے پنجاب یونیورسٹی سے مولوی عالم کی سند حاصل کی اور پھر اسی سال مدرسۂ عالیہ رام پور میں داخلہ حاصل کر لیا اور مولوی فاضل کے امتحان کی تیاری کے لیے پروفیسر اولاد حسین شاداں بلگرامی کے ہمراہ لاہور چلے گئے اورینٹل کالج میں مولانا نجم الدین، مولوی سیّد طلحہ اور علامہ عبدالعزیز المیمنی سے ان کو شرف تلمذ حاصل ہوا۔ امتیاز علی خاں عرشی پر ان حضرات نے توجہ فرمائی اور ان حضرات کے تلمذ سے امتیاز علی خاں کو معقولات، ادب اور تفسیر سے خصوصی دلچسپی پیدا ہو گئی جس نے ان کی آئندہ زندگی میں مشعل راہ کا کام دیا۔ اس کے بعد عرشی صاحب نے مولانا فضل حق رام پوری کے سامنے زانوئے ادب طے کیا۔ مولانا فضل حق فلسفہ اور منطق کے اہم اور لائق فخر استاد تھے اور ان کو کمال کا درجہ حاصل تھا۔ مولانا فضل حق رامپوری شمس العلماء مولانا ہدایت علی کے شاگرد رشید تھے اور مولانا ہدایت علی مولانا فضل حق خیرآبادی کے شاگرد رشید تھے۔

شاید ہی کسی تذکرہ نویس نے کسی اہل علم کا تذکرہ اس کے طالب علمی کے زمانے میں اپنے تذکرے میں کیا ہو۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کو یہ فخر حاصل ہے۔ جب احمد علی خاں شوق اپنا تذکرہ "کاملان رام پور" مرتب کر رہے تھے تو مولانا عرشی طالب علم تھے لیکن مصنف کی دور رس نگاہوں نے سمجھ لیا کہ یہ طالب علم کچھ کر کے رہے گا۔ اس لیے صفحہ ۸۹ پر لکھتے ہیں:

"مختار علی خاں کے فرزند (عرشی) نے علوم عربیہ اور فارسی کی خوب تکمیل کی ہے۔"

یہ حسن اتفاق ہے کہ اسٹیٹ لائبریری جس کے احمد علی خاں ناظم تھے، ایک عرصے

---

* (علیگ) ایڈوکیٹ، محلہ راجدوارہ۔ رام پور۔

کے بعد مولانا عرشی ان ہی کی جگہ پر ناظم مقرر ہوئے۔

مولانا عرشی کے دادا[۱] اکبر علی خاں علمی حیثیت سے ممتاز تھے اور ان کے والد کے بڑے بھائی مولوی جعفر علی خاں بھی علمی اعتبار سے ممتاز تھے۔ علوم عقلیہ اور نقلیہ میں کافی اہم مقام رکھتے تھے اور محدث تھے۔ علم حدیث میں اپنے زمانے کے ممتاز محدث مولوی سید حسن شاہؒ کے شاگرد تھے۔

تصنیف و تالیف : مولانا عرشی ابتدائے عمر سے تصنیف و تالیف کا ذوق و شوق رکھتے تھے۔ رضا لائبریری میں آنے کے بعد جہاں اُن کے ذوق و شوق میں اضافہ ہوا، وہاں اس کی تکمیل کے مواقع بھی اُن کو زائد حاصل ہوئے۔ مولانا عرشی کی تصانیف کا احاطہ کرنا مختصر سے مضمون میں مشکل ہے ان کی تصانیف کثیر ہیں اور مختلف موضوعات پر ہیں۔ ان کے مقالات کی تعداد بھی کم نہیں ہے جن میں سے اکثر شائع ہو چکے ہیں۔ ایک کثیر التصانیف مصنف کے بارے میں یہ طے کرنا کہ اس کی کون سی تصنیف سب سے پہلی ہے، جہاں ایک طرف دلچسپی سے خالی نہیں ہے وہاں مشکل بھی بہت ہے۔ اسی طرح مولانا عرشی کے بارے میں یہ طے کرنا بھی مشکل ہے کہ اُن کی کون سی تصنیف پہلی ہے اور کون سا مضمون سب سے پہلے لکھا گیا ہے۔ جہاں تک معلوم ہو سکا ان کے پہلے مضمون کا عنوان غالبؔ کا یہ شعر تھا ؎

شیشہ بغیر مے نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

یہ مضمون رسالہ "نیرنگ" ۱۹۲۴ء رام پور میں چھپا تھا لیکن افسوس کہ مضمون تلاش کے باوجود نہ مل سکا۔

مولوی عرشی کی پہلی عربی تصنیف تسہیل المیزان فی صناعۃ المیزان ہے جو اٹھارہ[۱۸] سال کی عمر میں لکھی گئی۔ اس کا صرف ایک خطی نسخہ رمضان المبارک ۱۳۴۰ھ کا نقل کردہ موجود ہے اور یہی اس کا سن تصنیف ہے اور عربی مخطوطات رضا لائبریری میں نمبر ۳۴۴۵ پر موجود ہے۔

مولانا عرشی کی تصنیفات اور تالیفات کی تفصیل نگارشات عرشی مرتبہ اکبر علی خاں نذر عرشی صفحہ ۳ پر درج ہے۔ حالانکہ وہ بھی مکمل نہیں ہے۔ مولانا کی تصانیف اور مضامین اس کے علاوہ بھی ہیں۔

مولانا عرشی کی شہرت غالبیات کے ماہر کی حیثیت سے ہے۔ غالبؔ پر عرشی صاحب نے مکاتیب غالب مرتب کر کے ایک اہم کارنامہ انجام دیا۔ غالبؔ کے وہ تمام خطوط جو انہوں نے نواب یوسف علی خاں ناظمؔ والیٔ رام پور اور اُن کے جانشین جناب کلب علی خاں کو لکھے تھے گمنامی سے نکال کر منظر عام پر پیش کر دیے اور ایک اہم مبسوط مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔ بقول مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اگر مکاتیب غالب منظر عام پر نہیں آتے تو غالب کے پرستاران کی زندگی کے بہت سے گوشوں سے واقف نہ ہوتے۔ کسی دور میں بھی مکاتیب غالب کی عظمت سے انکار نہیں کیا جا سکے گا۔ مکاتیب غالبؔ کے ایڈیشن ۱۹۳۷ء، ۱۹۴۳ء، ۱۹۴۵ء، ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئے۔ رضا لائبریری میں غالبیات الف کلام میں نمبر ۲۵، ۲۶، ۴۲، ۳۶ اور ۷۰ پر موجود ہیں۔

دیوان غالبؔ[۹]۔ غالب کے تمام اردو کلام۔ اس کی بنیاد اسی نسخے پر ہے جو ۱۸۵۰ء میں غالبؔ نے خود لکھوا کر نواب یوسف علی خاں ناظمؔ کی خدمت میں ارسال کیا۔ دیوان نہایت دیدہ زیب ہے مبسوط مقدمہ و حواشی کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ مولانا عرشی کو اس دیوان پر ساہتیہ اکاڈمی سے انعام ملا ہے۔

انتخاب غالب۔ غالبؔ[۱۰] کا وہ منتخب اردو فارسی کا کلام جو انہوں نے نواب کلب علی خاں کو ۱۸۶۶ء میں بھیجا تھا۔

فرہنگ غالبؔ[۱۱] : غالب نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں، ان پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

ان کی تصنیفات جہاں نئی معلومات سے دنیا کو آشنا کرتی ہیں اور تاریخی اور علمی حیثیت سے سند کا درجہ رکھتی ہیں، وہاں انہوں نے مولانا عرشی کی تحقیقی صلاحیتوں سے نئی دنیا کو روشناس کرایا ہے۔

غالبیات کے ماہر کی حیثیت سے غالب کی ابدی خدمت کے علاوہ مولانا عرشی کی تالیفات کثیر ہیں جن میں ترجمہ مجلس رنگین مشہور ریختی گو شاعر رنگین کی فارسی کلیات کا اردو ترجمہ۔

نادرات شاہی شاہ عالم ثانی کا فارسی، ہندی اور اردو کا دیوان
محاورات بیگمات از سعادت یار خاں رنگین۔
. اردو اور افغان۔
دستور الفصاحت از حکیم احمد علی یکتا لکھنوی۔
وقائع عالم شاہی از پریم کشور فراقی

تاریخ محمدی از مرزا محمد حارثی بدخشی دہلوی۔
تاریخ اکبری۔ کتاب الاجناس۔ دیوان الجادرہ لایۃ الہند
دیوان ابی محجن ۔ الامثال السائرہ من شعر متنبی

مولانا عرشی غالبیات کے ماہر کی حیثیت سے ادبی دنیا میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں لیکن امتیاز علی خاں کو صرف ماہر غالبیات تصور کرنا ایک بہت بڑی غلطی ہوگی۔ انہوں نے اس کے علاوہ بھی علم و ادب کی خدمت کا اہم فریضہ انجام دیا ہے اور ان میں سے بعض تصانیف یقیناً مولانا عرشی کی شہرت اور عزت کا باعث ہیں۔ چند تصانیف کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا۔

تفسیر القرآن۔ تصنیف امام سفیان بن سعید بن مسروق الثوری الکوفی (متوفی ۱۶۱ھ مطابق ۷۷۸ء)۔ اصل کتاب اٹھارہ صفحات پر مشتمل ہے اور عربی نسخ میں تحریر ہے۔ اس کتاب کی روایت ابوجعفر محمد عن ابی حذیفہ عن الہندی نے کی ہے۔ اس تفسیر کو مولانا عرشی نے نہایت محنت اور جانفشانی سے تلاش کیا اور اس کے حواشی مرتب کیے۔ اس کتاب کی اشاعت مولانا عرشی کا اہم کارنامہ ہے اور یہ تالیف تنہا مولانا عرشی کی شہرت دوام کے لیے کافی ہے۔ یہ کتاب ۱۳۸۵ھ مطابق ۱۹۶۵ء میں شائع کی گئی ہے۔ علمی دنیا کے مختلف گوشوں سے خراج تحسین حاصل کیا۔ مجلۃ اللغۃ العربیہ (دمشق) کے شمارے جولائی ۱۹۶۶ء کے صفحہ ۵۱۷ پر مستند عالم اور نقاد بہجۃ البیطار نے نہ صرف اظہار خیال کیا، بلکہ ان کو شاندار الفاظ سے یاد بھی کیا:

والحق اقول انی لم ارکتابا
شرقیا لا غربیا اوسع استیعابا۔

اسی طرح مشہور مستشرق پروفیسر ڈبلو منٹگمری واٹ (Prof. W. Montgomery Watt) پروفیسر لندن یونیورسٹی نے بلیٹن آف دی اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز آف لندن جلد سوم (مطبوعہ ۱۹۶۷ء) میں اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عرشی کی تحقیق کو شاندار الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ۱۹۵۰ء میں جب کہ علامہ عبدالعزیز المیمنی عربی شعبے کے استاد اور چیرمین تھے، ان سے مجھے شرف تلمذ حاصل ہوا استاد محترم علامہ عبدالعزیز المیمنی کو عرشی صاحب کی تعریف کرتے اور ان کی علمی خدمات کو سراہتے سنا ہے۔ علامہ کی تصانیف عربی زبان میں سند کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس موقع پر یہ بے جا نہ ہوگا اگر میں اپنے استاد محترم علامہ پروفیسر عبدالعزیز المیمنی کے اس خط کو نقل کر دوں جو استاد محترم نے عرشی صاحب کے بارے میں جناب راز یزدانی کو تحریر فرمایا تھا۔ علامہ عبدالعزیز المیمنی بذات خود عربی زبان و ادب کے جید اور مستند عالم تھے اور ان کی تصانیف کثیر ہیں جن کو مستشرقین اور علمائے مصر و شام سند کا درجہ دیتے ہیں۔ موصوف جہاں ایک طرف جید عالم تھے، دوسری طرف وہ دوسروں کی ادبی خدمات کو صحیح طور پر سراہنے کے عادی تھے۔ عرشی صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:

مکتوب ۱۴ر دسمبر ۶۲ء

.... عرشی صاحب اور ان کے علمی مشاغل دوسروں کے لیے مشعل ہدایت ہیں اور میرے لیے باعث فخر و مباہات۔ اللہ ان کی عمر میں برکت دے۔ میں ۷۴ سال کا ہو رہا ہوں۔ اپنے روزمرہ کے فرائض ادا کرنے سے بھی عاجز ہوں لیکن وہ مجھ کو "تلاشیٔ امتد قدخلتہ" میں سمجھ نہ لیں جس سے ان کی علمی مراسلت جو میرے لیے واحد دلچسپی رہ گئی ہے، منقطع نہ ہو جائے اور اس طرح کہیں کا نہ رہوں۔ اس امر کا اظہار اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ جناب عرشی صاحب نے اردو، فارسی، عربی بلکہ پشتو کی بھی جو علمی خدمت کی ہے وہ اس آخری دور میں اپنی مثال نہیں رکھتی۔ اگر مادر ہندوستان ایسے دو چار فرزند اور جن ڈالتی تو آج ہماری بے مائیگی کا یہ عالم نہ ہوتا۔ ان کی زندگی ہمارے ملک کے لیے نمونۂ عبرت ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار میری زندگی کی ۳ — ۴ پیداواروں میں ان کی ذات صف اوّل میں ہے۔ اس لیے میرا سر بلند ہے اور رہے گا۔ فی الواقع منقبت ان ہی کی ہے کہ اپنی مسلسل کوشش اور ایثار سے اس مقام کو پہنچے۔

اللھم زد فزد ۔ والسلام
میمن عبدالعزیز

مولانا عرشی کی تالیفات کا مطالعہ بھی ایک طرف اہلِ علم اور باذوق حضرات کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا، وہاں تحقیق کرنے والوں کے لیے بھی مشعلِ راہ کا کام دے گا اور ظاہر ہوگا کہ کس طرح ایک طالب علم نے ساری عمر علم کی خدمت میں گزار دی اور کس طرح ایک ایک لفظ کی تحقیق میں بحرِ ناپیداکنار میں غوطے لگائے۔ اس کے علاوہ اس بزرگ مصنف نے اپنے علم و تحقیقات کے ذریعے صرف اہلِ علم کو ہی فائدہ نہیں پہنچایا بلکہ طلباء کو بھی اپنی علمی خدمات سے محروم نہیں رکھا۔ بی۔اے عربی کورس پنجاب یونیورسٹی ترجمہ ایف۔ اے عربی کورس پنجاب یونیورسٹی۔ مرقاۃ الادب، مرقاۃ العربیہ لڑکے اور لڑکیوں کے لیے اردو کورس شکرستان۔ انجمن حمایت اسلام لاہور میں چھپے اور ساتویں درجوں کے فارسی نصاب راہِ ہدایت تعلیم القرآن لکھ کر طلباء کا پورا حق ادا کر دیا۔ ان کتب کے علاوہ مولانا عرشی کی غیر مطبوعہ کتابوں کی ایک طویل فہرست ہے جو نگارشاتِ عرشی مرتبہ اکبر علی خاں عرشی زادہ نذرِ عرشی کے صفحہ ، پر درج ہے۔

عرشی صاحب کی تصانیف اور تالیفات جہاں اہم مقام رکھتی ہیں وہاں ان کے مقالات بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ مقالاتِ عرشی کو مجلس ترقی ادب (کلب روڈ) لاہور نے کتابی شکل میں شایع کیا ہے۔ مقالات مذکورہ نہایت اہمیت کے مالک ہیں۔ ان میں سے اکثر مقالات اردو کے مستند جرائد و رسائل میں شایع ہو چکے ہیں۔

مقالاتِ عرشی میں ۱۴ مقالات ہیں۔ مولانا عرشی کے پرانے مقالات بھی شامل ہیں۔ مثلاً مولانا صفی اور ان کی شاعری۔ یہ مقالہ سب سے پہلے رسالہ نیرنگ رام پور میں شایع ہوا اور ۱۹۲۶ء ـــ ۱۹۲۷ء کا لکھا ہوا ہے جب کہ مولانا کی عمر ۲۲، ۲۳ سال سے زائد نہ تھی۔

ان تصانیف کے علاوہ مولانا عرشی نے رضا لائبریری رام پور کی جو خدمت انجام دی ہے وہ ہمیشہ یاد رہے گی۔ انھوں نے ایک عظیم کیٹلاگر کی حیثیت سے ایک اہم مقام حاصل کر لیا ہے۔ عربی، فارسی اور اردو کے مخطوطات کی جو فہرستیں مرتب کی ہیں، وہ ایک طرف ان کی علمی کوشش و کاوش تلاش و جستجو کی آئینہ دار ہیں تو دوسروں کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انہوں نے عربی مخطوطات کی ۶ جلدیں، اردو کی ایک جلد اور فارسی مخطوطات کی متعدد جلدیں مرتب فرمائی ہیں، جن میں سے عربی اور اردو مخطوطات کی فہرستیں شایع ہو چکی ہیں، فارسی کی ابھی شایع نہیں ہوئی ہیں۔ مسٹر چیسبین کے قول کے مطابق عرشی صاحب کا شمار دنیا کے اعلیٰ کیٹلاگرس میں ہے اور بعض حیثیتوں سے دیگر کیٹلاگرس سے ممتاز ہیں۔

مولانا عرشی کی ایک اہم تصنیف جو ابھی تک شایع نہیں ہو سکی وہ تالیف ہے جو انہوں نے رضا لائبریری کی ملازمت سے پہلے غالباً ۱۹۲۸ء میں شروع کر دی تھی جیسا کہ ڈاکٹر حمید اللہ کے نام ایک خط سے واضح ہوتا ہے وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خطوط، خطبات، سرکاری احکام اور فرامین ہیں جو انہوں نے اپنی حیات میں جاری فرمائے تھے۔ وہ کتاب جب شایع ہوگی تو مولانا عرشی کی صحیح شہرت و عظمت علمی دنیا کے سامنے آئے گی۔ یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ غالباً مولانا عرشی کی تحقیقی زندگی اسی تصنیف سے شروع ہوتی ہے اور اپنی زندگی کا آخری علمی کام بھی اسی کتاب پر ہے۔ یعنی مولانا عرشی کی آخری تحریر جو رضا لائبریری میں موجود ہے وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی تحریر کی ایک نقل ہے جو ۱۰ فروری ۱۹۸۱ء کو الیواقیت فی المواقیت میں نقل کی گئی ہے اسی کے ساتھ ساتھ ان کی علمی خدمات کا اختتام ہوتا ہے۔

موصوف ایک عرصے سے بیمار چلے آ رہے تھے۔ ۱۰ فروری کے بعد ان کی بیماری نے شدت پکڑ لی اور بالآخر ۲۵ فروری ۱۹۸۱ء کو وہ قلم جس نے ہزاروں صفحات لکھ کر علمی دنیا کی طویل زمانہ تک خدمت کی تھی ہمیشہ کے لیے رک گیا۔

حوالہ جات

لہ تذکرہ کاملان رام پور میں صفحہ ۸۹ پر ڈاکٹر مختار علی خاں کو غلط طور پر جعفر علی خاں کا فرزند لکھ دیا ہے۔ حالاں کہ مختار علی خاں جعفر علی خاں کے بھائی اور اکبر علی خاں کے سب سے چھوٹے فرزند تھے۔

۲؎ تذکرہ کاملان رام پور میں صفحہ ۴۹ پر رحم باز خاں کو رحیم باز خاں لکھ دیا ہے۔

۳؎ نذر عرشی، جناب مالک رام و ڈاکٹر مختارالدین آرزو۔

۴؎ حکیم عبدالرشید خاں ابن حافظ عبدالمجید خاں مولانا عبدالحق خیرآبادی اور مولانا عبدالعلی رام پوری حکیم عبدالمجید خاں دہلوی اور دیگر علمائے وقت کے شاگرد تھے۔ ان کے کثیر شاگرد ہوئے خاص طور پر مسیح الملک حکیم اجمل خاں دہلوی اور حکیم تصدق حسین مراد آبادی اور حکیم اچھے میاں کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

۵؎ نذر عرشی میں صفحہ ۱۰ پر مولوی سید احمد ہزاروی کو سعید احمد لکھ دیا ہے۔ مدرسہ مطلع العلوم کی اسناد اور دفتر میں ان کا نام سید احمد ہزاروی ہے۔ مولوی عبدالسلام خاں سابق پرنسپل مدرسۂ عالیہ نے جو خود مولانا سید احمد ہزاروی کے شاگرد ہیں اور مولوی صغیر احمد مہتمم اور صدر مدرس مطلع العلوم نے بھی تصدیق فرمائی کہ مولانا کا صحیح نام سید احمد ہزاروی تھا۔

۶؎ غالباً کسی غلط فہمی کی وجہ سے جناب مالک رام نے نذر عرشی میں صفحہ ۱۱ پر مولانا فضل حق خیرآبادی کا شاگرد لکھ دیا ہے۔ حالانکہ یہ ممکن ہی نہیں۔ مولانا فضل حق رام پوری کی سنِ پیدائش اور مولانا فضل حق خیرآبادی کی سن وفات ایک ہی ۱۲۷۸ھ ہے۔

۷؎ مولانا سید حسن شاہؒ مولانا شاہ عالم علی نگینویؒ کے شاگرد تھے اور شاہ عالم علی نگینویؒ مولانا شاہ اسحاق صاحبؒ محدث دہلوی کے شاگرد رشید تھے۔ مولانا سید حسن شاہؒ کا تذکرہ نزہۃ الخواطر جلد ۸ صفحہ ۱۰۰ پر مولانا سید عبدالحئی نے نہایت شاندار الفاظ میں کیا ہے۔

۸؎ نگارشاتِ عرشی مرتبہ اکبر علی خاں عرشی زادہ "نذر عرشی" صفحہ ۵

۹؎ " " " "

۱۰؎ " " " "

۱۱؎ " " " "

"دوسری جگہوں کے مقابلے میں اسلام میں سائنسوں کا پھلنا پھولنا بہت حد تک اس بات کا مرہونِ منت رہا ہے کہ اعلیٰ مرتبوں پر فائز صاحبان سائنسی علوم پر اپنی داد و دہش نچھاور کرتے رہے ہیں۔ جہاں جہاں اسلامی سماج مائل بہ انحطاط ہوا، وہاں سائنس بھی بے جان اور کمزور ہو گئی لیکن جب تک ایک بھی دارالسلطنت ایسا رہا جہاں بادشاہوں اور وزیروں کو سائنس کی سرپرستی کرنے میں لطف آتا تھا یا اس سے ان کو شہرت یا منفعت حاصل ہوتی تھی، تب تک یہ مشعل روشن رہی۔"

ایچ۔ اے۔ آر۔ گب

ڈیوٹی سوسائٹی کا تاریخی جائزہ

ابوالحسن صدیقی*

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی رحمت و برکت کی ایک آیت ہے۔ جسے سرسید احمد خاں ہندوستانی قوم کے لیے آسمان سے اتار کر لائے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد صرف مسلمان ہی نہیں ہندوستان کے سبھی باشندے افراتفری زبوں حالی، جہالت، غربت اور ناداری کا شکار تھے۔ بنگال کی ایک عظیم ہستی آنجہانی راجہ رام موہن رائے نے نئے خیالات کی تبلیغ کا بیڑا اُٹھایا لیکن اُن کی برہمو سماج کا فیض ایک مخصوص طبقے تک محدود ہو کر رہ گیا۔

ہندوستان گیر پیمانے پر جس نے ہر جماعت کو متاثر کیا وہ سرسیّد کی تعلیمی تحریک تھی۔ یہ تعلیمی تحریک ایک ابرِ کرم بن کر ہندوستان کے گوشے گوشے پر برسی اور جہالت کی گھاس پھوس کی جگہ سارے ہندوستان میں تعلیمی ترقی اور روشن خیالی کے لالہ زار لہلہانے لگے۔ رسمی طور پر اُس تعلیمی تحریک کا نام آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس تھا۔ ۱۸۸۶ء میں سرسید احمد خاں نے اس ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ یہ کانفرنس اینگلو محمڈن اورینٹل کالج کو یونیورسٹی کی شکل عطا کر کے سرسیّد کے خوابوں کی تعبیر دیکھنا چاہتی تھی۔

ایک طرف تو کانفرنس اپنی منزل کی طرف تیزی سے بڑھ رہی تھی، لیکن دوسری طرف ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ہونہار طلبا جو کالج سے صحیح طریقے سے مستفید ہو سکتے تھے، مالی حالت کمزور ہونے کی وجہ سے اس کا بھرپور فائدہ نہیں اُٹھا پا رہے تھے اس کا احساس اس وقت کے کالج کے استادوں اور طلبا دونوں میں شدت سے موجود تھا۔ اسی احساس کے تحت کالج کے ایک ہونہار طالب علم نے جو بعد میں یونیورسٹی کا وائس چانسلر بھی ہوا۔ پروفیسر ٹی۔ این۔ آرنلڈ کی زیر نگرانی ۱۸۸۹ء میں ایک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی جس کو آج ہم ڈیوٹی سوسائٹی یا انجمن الفرض کے نام سے جانتے پہچانتے ہیں اور آج ہم اس سوسائٹی کی صد سالہ تقریب میں شریک ہیں۔ اس سوسائٹی کے قیام کا اصل مقصد یہ تھا کہ ہونہار طلبا کالج کی تعلیم سے معاشی کمزوری کی بنا پر محروم نہ رہ جائیں۔

اِس لیے ہونہار طلبا کی معاشی امداد سوسائٹی کا فرض اولین قرار پایا۔ اس کے ساتھ ساتھ سوسائٹی کالج کو یونیورسٹی کی شکل دینے کی کوششوں میں کانفرنس کے ساتھ مکمل تعاون کر رہی تھی۔ سوسائٹی چوں کہ صرف اور صرف خدمت کا جذبہ لے کر اُٹھی تھی، اس لیے اس کے ممبر کو خادم کہا جاتا تھا اور آج بھی کہا جاتا ہے۔ سب سے پہلے ٹی۔ این آرنلڈ سوسائٹی کے صدر ہوئے۔ مس ای۔ جی۔ بک، مظہر الحق، بہادر علی صاحب، عبداللہ خاں صاحب اور مولانا طفیل احمد اس کے اولین خدام تھے۔ اس کے اولین سرپرستوں میں ہزہائی نس آغاخاں، ہزہائی نس مہاراجہ آف پوربندر، رائے بہادر سیٹھ ہیرالال اور سیٹھ لکھم چند قابلِ ذکر ہیں۔

ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم نے کالج میں آتے ہی اپنی وابستگی ڈیوٹی سوسائٹی سے پیدا کر لی اور تا حینِ حیات اس سوسائٹی سے وابستہ رہے۔ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۷ء تک ڈاکٹر صاحب مرحوم سوسائٹی کے کیپر رہے۔ ڈاکٹر صاحب ہی نے اس سوسائٹی کی بنیادوں کو اپنے علمیت پسند ذہن اور نئے نئے منصوبوں سے مضبوط کیا۔ انہی کے مشوروں سے طلبا گرمی کی تعطیلات میں ڈیوٹی سوسائٹی کا وفد بنا کر پورے ملک میں رنگون سے لے کر کابل تک

---

* صدر شعبہ ریاضیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی و کیپر ڈیوٹی سوسائٹی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

رقومات جمع کرنے کے لیے گشت کرتے تھے اور اس طرح سے تعطیلات کے بعد ایک کثیر رقم یونیورسٹی کے خزانے میں یہ طلبا جمع کرتے تھے۔ ان طلبا میں صرف خدمت کا جذبہ ہوتا تھا اور یہی جذبہ زندگی بھر ان میں کارفرما رہتا تھا اور اس زمانے میں کسی طالب علم کو سوسائٹی کے وفد میں شامل ہونے سے ایک نشانِ امتیاز حاصل ہوتا تھا اور وہ طالب علم اس خدمت کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتا تھا طلبا کے ان وفود کا مقصد یہ بھی ہوتا تھا کہ وہ پورے ملک کو علی گڑھ کی تعلیمی ترقیوں سے آشنا کریں اور لوگوں میں جدید تعلیم اور سائنسی علوم کی طرف رغبت پیدا کریں۔ علی گڑھ کی بات تو بہت سے لوگ کرتے ہیں مگر یہ شاید کم لوگ جانتے ہوں گے کہ جس تنظیم نے علی گڑھ کے تعلیمی مشن کو گاؤں گاؤں اور گھر گھر پہنچایا اس کا نام ڈیوٹی سوسائٹی ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آفتاب احمد خاں صاحب نے سوسائٹی کو نہ صرف قایم کیا بلکہ اپنے پورے دورِ حیات میں اس کو بامِ ترقی تک پہنچایا۔ محسن الملک نے بھی اس سوسائٹی کے رول کی اہمیت کا اندازہ کرتے ہوئے اسے خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کی۔ یہ سوسائٹی کی خوش نصیبی تھی کہ جسٹس شاہ سلیمان جیسی دیوقامت شخصیت نے بھی اسے پروان چڑھایا اور اس کے اغراض و مقاصد کی اہمیت کو عملاً سراہا اور ان کے دورِ کارکردگی میں اسے نمایاں فروغ حاصل ہوا اور شاید یہی وجہ ہے کہ سوسائٹی نے جس ہال کی تعمیر کی تھی اس کا نام سلیمان ہال رکھا گیا۔

سوسائٹی کے شاندار ماضی پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ یہی نہیں کہ ہم نے اٹھارہ ہزار سے زیادہ طالب علموں کی مدد کی ہے بلکہ مزید خوشی اس بات کی ہے کہ ان میں ایک بہت بڑی تعداد ان لایق اور فایق طالب علموں کی ہے جنھوں نے دنیا کے مختلف ملکوں میں اپنا نام پیدا کیا اور ان طلبا میں سے ایک تو ایسے ہیں جنھوں نے نیشنل ایوارڈ حاصل کیا جو مسلم ممالک میں اعلیٰ ترین ایوارڈ مانا جاتا ہے۔

> "دنیا کی ترقی کی رفتار دن بدن تیز ہوتی جا رہی ہے۔ یہ سب کچھ سائنس کے علوم اور ٹکنولوجی کے زیر اثر ہو رہا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ دنیاوی علوم کے ذخیرے کو دوگنا ہونے میں قرنہا قرن لگتے تھے اور اب یہ عالم ہے کہ عالمی علوم ہر سات سال کے اندر دو چند ہو جاتے ہیں۔ اس دور میں جانبر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ علوم کی ترقی کی اس رفتار کا ساتھ دیا جائے۔"
>
> سید حامد۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کی دنیا میں بھی بے شمار طلبا ایسے ہیں جو سوسائٹی کے دامنِ فیض سے وابستہ رہے ہیں۔

سوسائٹی نے یونیورسٹی میں ایک بڑی عمارت بنائی جس میں ۱۹۳۰ء سے یونیورسٹی کا پوسٹ آفس ہے۔ ۱۹۳۲ء اور ۱۹۴۷ء کے بیچ میں سوسائٹی نے انجینئرنگ کالج اور میڈیکل کالج کے لیے اٹھارہ لاکھ سے زائد رقم اکٹھا کر دی۔

۱۹۴۵ء میں سوسائٹی نے طلبا کی معاشی امداد کے ساتھ ساتھ دوسرے رہائشی ہال کی تعمیر کا منصوبہ بنایا اور کام بھی شروع کر دیا گیا لیکن تقسیم وطن کے ناخوشگوار حادثے نے سوسائٹی کے منصوبوں پر پانی پھیر دیا اور جس طرح وطن کے دوسرے اداروں پر اس حادثے کا اثر ہوا یہ سوسائٹی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور کچھ مدت کے لیے بے اثر ہو کر رہ گئی۔ خدا کا شکر ہے کہ آزادیٔ وطن کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین بہ حیثیت وائس چانسلر یونیورسٹی میں تشریف لائے اور انھوں نے سوسائٹی کی طرف خصوصی توجہ فرمائی۔ یہ مزید خوش نصیبی تھی کہ اس دور میں ذاکر صاحب کے عہدِ طالب علمی کے ساتھی اور اردو کے صاحب طرز انشاء پرداز پروفیسر رشید احمد صدیقی سوسائٹی کے کیپر تھے۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۹ء تک کیمسٹری کے مشہور استاد پروفیسر محمد عمر فاروق اور ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۳ء تک پروفیسر یوسف حسین خاں صاحب جو یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر بھی تھے، سوسائٹی کے کیپر رہے۔ ۱۹۶۱-۱۹۶۰ء میں ڈیوٹی سوسائٹی کے پلیٹ فارم سے جمع کیا ہوا ڈیڑھ لاکھ روپیہ یونیورسٹی کے تعمیری کاموں کے لیے دیا گیا۔ ۱۹۶۵ء کے ناگوار حادثے کے بعد یونیورسٹی کے بہت سے تعمیری کاموں میں رکاوٹ آئی اور اس کا اثر سوسائٹی پر بھی پڑا۔ ۱۹۷۵ء میں اس سوسائٹی کو فعال بنانے کے لیے پروفیسر علی محمد خسرو، اس دور کے وائس چانسلر، نے نئے سرے سے کوشش کی اور بمبئی سے پچاس ہزار روپیے کا گراں قدر عطیہ حاصل کیا جو سوسائٹی کا پہلا

مستقل فنڈ تھا۔

لیکن اس وقت لوگوں کے سامنے سب سے اہم مسئلہ یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بازیابی کا تھا۔ اس لیے شاید سوسائٹی کے بنیادی مقاصد کی جانب لوگوں کی توجہ نہ ہو سکی۔ خدا کا شکر ہے کہ ملّت کی جد و جہد کا قافلہ منزلِ مقصود سے ہم کنار ہوا اور ۱۹۸۲ء میں یونیورسٹی کا اقلیتی کردار بحال ہو گیا۔

سوسائٹی کا ایک بنیادی مقصد یہ بھی تھا کہ سائنسی تعلیم کو اقلیتوں میں فروغ دیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۸۲ء میں نیا ایکٹ ملنے کے بعد اس دور کے وائس چانسلر عالی جناب سیّد حامد صاحب نے ایک سینٹر قایم کیا جس کا پورا نام مرکز فروغ سائنس ہے۔ یہ سینٹر اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے اب بھی سرگرم عمل ہے۔

یہ ہماری انتہائی خوش قسمتی ہے کہ ہماری یونیورسٹی کی سربراہی کے لیے اپریل ۱۹۸۵ء میں عالی جناب سیّد ہاشم علی صاحب تشریف لائے جو اپنے اندر فکر و نظر، علم و عمل اور نظم و نسق کی جملہ توانائیاں رکھتے ہیں۔ سوسائٹی کے احیاءِ ثانی کا دور موجودہ وائس چانسلر کی تشریف آوری کے بعد شروع ہوتا ہے اس سلسلے کی پہلی میٹنگ حبیب منزل کی تاریخی عمارت میں یکم رمضان المبارک کو منعقد ہوئی جس میں عالی جناب ہاشم علی صاحب نے اپنی تنخواہ سے سو روپے ماہوار کا وظیفہ دینے کا اعلان کیا۔ اس کے بعد علی گڑھ کے بہت سے اہلِ خیر حضرات خصوصًا الحاج عبید الرحمٰن خاں شروانی، پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی، نواب رحمت اللہ خاں شروانی نے محترم وائس چانسلر کی تقلید کرتے ہوئے سَو سَو روپیے کے وظیفے کا اعلان کیا۔

۲ ستمبر ۱۹۸۵ء کو حبیب منزل میں علی گڑھ کے ممتاز شہریوں کا ایک جلسہ ہوا جس میں یونیورسٹی کے چانسلر عالی جناب اخلاق الرحمٰن قدوائی صاحب، مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سیّد ہاشم علی صاحب دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب پروفیسر مونس رضا صاحب، مسلم یونیورسٹی کے سابق پرو وائس چانسلر جناب پروفیسر محمد شفیع صاحب، مسلم یونیورسٹی کے موجودہ پرو وائس چانسلر جناب پروفیسر وصی الرحمٰن صاحب اور شہر یار کنور عمار احمد خاں صاحب خصوصیت کے ساتھ شریک ہوئے۔ اس جلسے میں کچھ اہم فیصلے کیے گئے اور کچھ منصوبے بنائے گئے جنھیں پچھلے دو سالوں میں عملی جامہ پہنایا گیا ہے۔ سوسائٹی کو رجسٹرڈ کرایا گیا۔ انکم ٹیکس کی دفعہ ۸۰ جی کے تحت استثنا، حاصل کیا گیا۔ بیرونی ممالک سے عطیات حاصل کرنے کے لیے وزارتِ داخلہ میں رجسٹریشن کرایا گیا۔ مختلف شہروں میں سوسائٹی کے نمائندے مقرر کیے گئے اور ملک کے مختلف شہروں کی ممتاز شخصیتوں سے رابطہ قایم کیا گیا تاکہ وہ سوسائٹی کی مدد کریں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمیں ڈیڑھ سال کی مدت میں بے حد کامیابی حاصل ہوئی ہے اور آج ہم اس قابل ہیں کہ موجودہ تعلیمی سال کے دوران اسی وظائف سَو سَو روپیے ماہوار کے طلبا کو دے رہے ہیں اور ان اسی وظائف کے لیے ہمارے پاس مستقل فنڈ موجود ہے۔

پچھلے سال ماہ دسمبر میں دلی میں "غزل کا سفر" کے عنوان سے ایک جلسہ منعقد ہوا اس موقع پر عزت مآب گیانی ذیل سنگھ صاحب نے راشٹرپتی بھون میں ڈیوٹی سوسائٹی کے مجلے کا اجرا کیا اور انھوں نے سوسائٹی کے دو سَو ممبران کو چائے پر مدعو کیا۔

جن حضرات کے عطیات سے موجودہ فنڈ قایم ہوا ہے، ان میں سرِفہرست مندرجہ ذیل حضرات کے اسمائے گرامی ہیں:۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب، نوبل انعام یافتہ پروفیسر عبدالسلام، عزت مآب محمد عثمان عارف نقشبندی، دنیا کے مشہور ریاضی داں اور ہماری یونیورسٹی کے اولڈ بوائے پروفیسر تقدیر حسین، عالی جناب پروفیسر مونس رضا دہلی یونیورسٹی، پروفیسر آباد صاحب، عالی جناب سماع الحسن جعفری، عالی جناب انور مسعود (فرزند راس مسعود مرحوم) عالی جناب رضوان رشید، عالی جناب حکیم عبدالحمید صاحب، عالی جناب معین الحق صاحب چودھری، ہز ہولی نس ڈاکٹر سیدنا محمد برہان الدین صاحب، مسٹر رضوان فاروقی، مسٹر شکیل احمد، مسٹر کفیل احمد، پروفیسر مقبول احمد صاحب، عالی جناب مقبول لاری، عالی جناب اشتیاق عابدی صاحب، جناب احمد رشید شروانی اور جناب محمد سلیمان صاحب۔

۱۹۸۶ء میں ڈیوٹی سوسائٹی نے ایک انسٹی ٹیوٹ کی تشکیل کی جس کے صدر عالی جناب سید ہاشم علی صاحب ہیں۔ اس ادارے کے پیشِ نظر مادرِ درس گاہ علی گڑھ کے نامور فرزندوں کے کارناموں کی تفصیل شایع کرنے کا منصوبہ ہے اس کے علاوہ اگر حالات سازگار رہے تو جدید ٹکنالوجی کی تربیت کا بندوبست کیا جائے گا اور بیرونی ممالک کی زبانوں کی عملی تدریس کا بھی اہتمام کیا جائے گا۔

ہماری کوشش ہے کہ ملک کے گوشے گوشے سے ان ہونہار طلبا کو یہاں لایا جائے جو معاشی کمزوری کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم سے محروم ہو رہے ہیں۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ ج ۷، ش ۳ (مارچ ۸۸ء)

مسیح الملک حکیم اجمل خاں

سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی*

مسیح الملک کے آباو اجداد ترکستان کے شہر کاشغر کے باشندے تھے شہنشاہ بابر کے ساتھ رہے اور اسی شہنشاہ کے ساتھ وارد ہندوستان ہوئے اور جب ہندوستان میں بابر کی حکومت قایم ہوئی تو اس نے آپ کے بزرگوں کو اعزاز وجاگیر سے نوازا۔

مسیح الملک کے خاندان میں ملاّ علی قاریؒ کے پوتے حکیم فاضل خاں نے سب سے پہلے فن طب میں شہرت حاصل فرمائی۔ محمد شاہ کے عہد میں حکیم محمد شریف خاں ایک ممتاز اور نہایت اعلیٰ مرتبے کے طبیب ہوئے آپ نے فن طب کی علمی مہارت کے علاوہ قانون، شرح اسباب اور نفیسی پر حواشی بھی لکھے۔ ساتھ ہی ویدک پر بھی کتابیں تالیف فرمائیں۔ اور ویدک مرکبات، کشتہ جات اور ہندوستانی جڑی بوٹیوں کا اضافہ بھی کیا۔ نیز آپ نے خاندانی تجربات ومعمولات کو یکجا مدون فرما کر کتاب علاج الامراض میں پیش فرمایا۔



پیدائش: ۱۸۶۷ء وفات: ۱۹۲۸ء

حکیم شریف خاں کے جانشیں حکیم صادق علی خاں ہوئے۔ آپ نے قانون کے حصۂ تشریح اعضائے مرکبہ کی ایک شرح عربی میں لکھی ہے جس سے آپ کی علمی فضیلت واضح ہے۔ حکیم صادق علی خاں کے بعد ان کے نامور فرزند حکیم محمود خاں اُن کے جانشین ہوئے۔ آپ کی نباضی تشخیص اور تجویز کی حکایات مشہور عوام وخواص ہیں۔ حکیم محمود خاں صاحب کے تین صاحبزادے حکیم عبد المجید خاں، حکیم واصل خاں اور حکیم اجمل خاں ہوئے۔ حکیم عبد المجید خاں کی طبی عظمت کے اعتراف میں حکومت نے ان کو حاذق الملک کا موقر خطاب عنایت کیا۔

حکیم عبد المجید خاں نے علم طب کی باقاعدہ درس وتدریس کے لیے ۱۸۰۲ء میں مدرسہ طبیہ جاری کیا اور اس مدرسے میں آپ خود قانون کا درس طلباء کو دیتے رہے۔ انہوں نے اپنے برادر خورد حکیم اجمل خاں کے مشورے سے ایک انڈین میڈیسن کمپنی قایم کی۔

ولادت اور تعلیم:-

حکیم اجمل خاں ۱۷ شوال ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئے۔

* چیرمین شعبۂ کلیات، اجمل خاں طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

معمولی تعلیم کے بعد مدت قلیل میں قرآن مجید حفظ کر لیا اور مسجد شریف خاں میں مجمع حفاظ میں سنایا۔ جس سے واضح ہوا کہ آپ کو غیر معمولی حافظہ خزانۂ قدرت سے عطا ہوا تھا۔ اس کے بعد فارسی و عربی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ حکیم صاحب کا خاندان ابتداء ہی سے ریاست رام پور سے وابستہ رہا اور آپ کے والد اور بھائی ریاست سے وظیفہ پاتے تھے۔ چنانچہ حکیم صاحب نے مولانا محمد طیب صاحب مکی ثم رامپوری اور حکیم عبد الرشید خاں صاحب رام پوری سے تعلیم رام پور میں حاصل کی اور دوران تعلیم میں آپ کی خداداد لیاقتوں کے جوہر کھلنے لگے۔ اٹھارہ سال کی عمر تک آپ نے علوم متداولہ حکیم محمود خاں اور اپنے برادر بزرگ حکیم عبد المجید خاں سے پڑھے۔

آپ کو بچپن ہی سے مطالعے کا بے حد شوق تھا۔ آپ کا خاندانی علمی خزانہ آپ کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا اور اس کے مطالعے میں ہمہ تن مصروف رہنے لگے۔ چوں کہ شریف منزل میں ہجوم مرضیٰ کے لیے گوشۂ تنہائی میسر نہ تھا لہٰذا آپ نے مطالعہ کے لیے مسجد شریف خاں سے متصل بالاخانہ اپنے لیے مخصوص کر لیا۔ حکیم صاحب کا مطالعہ صرف علم طب تک محدود نہ تھا، بلکہ ادب، تفسیر، فلسفہ اور تاریخ وغیرہ علوم کی کتب کا بھی مطالعہ فرماتے رہے لیکن زیادہ توجہ اور وقت علم طب سے متعلق کتب کے مطالعے کی طرف ہی صرف فرماتے رہے۔ آپ نے طب کے جملہ مشکل مسایل کو حل فرمایا اور متعدد کتب پر حواشی بھی درج فرمائے۔

نظریات اور علمی و فنی کارنامے

حکیم اجمل خاں نے محسوس کیا کہ متاخرین نے تقلید محض کا راستہ اختیار فرما کر طب کی ترقی کو روک دیا ہے۔ نیز یہ بھی محسوس فرمایا کہ طب میں فلسفہ اور طبیعیات کی آمیزش نظریہ شیخ الرئیس کے خلاف ہے اور اس سے اجتناب اولیٰ ہے۔ انہوں نے یہ بھی واضح فرمایا کہ حکیم جالینوس اور بوعلی سینا کے اکثر معلومات و نظریات قابل تنقیح ہیں اور اگر ان کی تنقیح جلد نہ کی گئی تو اس سے طب کو بہت نقصان پہنچے گا۔ آپ نے جدید علوم طبیہ کی روشنی میں طب کی تنقیح و تجدید کو ضروری قرار دیا اور اسی ضرورت کے پیش نظر آپ نے تجدید طب کمیٹی مقرر فرمائی اور ساتھ ہی جدید علم تشریح و جراحت کو شامل نصاب تعلیم طب فرمایا۔

۱۸۹۲ء میں بعہد نواب حامد علی خاں بہادر، حکیم صاحب ایک گراں بہا مشاہرہ پر بعہدۂ طبیب خاص مقرر ہو کر رام پور تشریف لے گئے اور وہاں ۹۶-۱۸۹۵ء میں حکیم صاحب ریاست کے کتب خانے کے افسر اعلیٰ بھی مقرر ہوئے۔ آپ نے کتب خانہ پر خصوصی توجہ مبذول فرمائی۔ چھیاسٹھ کامیاب کتب خریدیں اور اکثر کتابوں کو بغور پڑھا اور ان پر نوٹس لکھے۔ کچھ کتابیں جو کرم خوردہ تھیں ان کی دوبارہ نقل کرائی اور کچھ کتابوں کی اشاعت بھی کرائی۔ چنانچہ حکیم صاحب کا عہد کتب خانے کا عہد زریں کہلاتا ہے۔ آپ نے اس کتبخانہ کی فہرست کتب عربی میں مئی ۱۹۰۲ء میں مرتب کرا کے شایع فرمائی جو اخباری سائز کے ۷۱۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے دیباچے میں حکیم صاحب کتب خانے کا تعارف کراتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔ ہندوستان کے کتب خانوں میں تمام فضیلت کا سہرا ریاست رام پور کے کتب خانے کے سر ہے۔ اس کے بعد پٹنہ کے کتب خانہ کا درجہ ہے۔ اس میں بارہ ہزار چار سو اکیاون کتابیں مختلف زبانوں کی موجود ہیں۔ ان کتابوں میں عربی کی خوشخط کتابیں ۲۴۴، فارسی کی ۵۲۳، بخط مصنف ۴۰ اور نایاب کتابوں کی تعداد ۸۳ ہے۔ یکتا نسخے، تصاویر و وصلیات بکثرت ہیں۔ ان میں دنیا کے مشہور فن کاروں کی یادگاریں ہیں۔ حکیم صاحب نے نادرات کی فہرست کافی تفصیل سے مرتب فرمائی ہے۔ حکیم صاحب کے کتب خانے سے متعلق منصوبے کو آپ کی ماتحتی میں حافظ احمد علی خاں شوق نے بہت آگے بڑھایا اور فہرست کتب عربی جلد دوم و سوم ۱۹۲۸ء میں بہت ہی توضیحات کے ساتھ شایع کیں۔

مسیح الملک کے متعلق خاصا مواد رام پور میں موجود ہے۔ نیز آپ کے کچھ اہم دلچسپ خطوط بھی نواب صاحب کے ذاتی ذخیرہ میں محفوظ تھے۔ آپ نے اپنے خاندانی کتب خانے کے لیے اس کتب خانے کے اکثر نوادرات نقل کرائے۔ مثلاً التصریف لمن عجز من التالیف، ترویج الارواح خجندی، المنقذ من المهلکة فی دفع مضار السمائم المهلکة وغیرہ کتب خانہ رام پور سے نقل کرائیں۔

مسیح الملک نے رام پور میں مطب بھی کیا جو مرجع خلائق تھا۔ مطب کے علاوہ حکیم صاحب کو سرکاری شفاخانوں کو بنظر غائر معائنہ کا موقع بھی ملا اور انہوں نے جدید و قدیم طب کی خامیوں اور خوبیوں کا مطالعہ بخوبی فرمایا۔ ہز ہائی نس نواب صاحب رام پور کو حکیم صاحب نے اسی خداداد قابلیت و لیاقت کی بنا پر اپنا گرویدہ بنا لیا تھا

ریاست میں ان کی حیثیت ایک طبیب کی نہیں تھی، بلکہ وہ ریاست کے تمام امور میں نواب صاحب کے مشیر خاص تھے اور ریاست میں آپ نے اپنی سیاسی و انتظامی قابلیت کے جوہر بھی خوب دکھلائے۔ آپ جمہور میں بھی مطب کے باعث نہایت ہر دل عزیز تھے اور باشندگان رام پور آپ کا دلی احترام کرتے تھے۔ ریاست میں کامل اقتدار کے باوجود آپ نے کبھی کسی طرح کا ناجائز فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہ کی۔ وہ پوری کوشش کرتے تھے کہ کوئی امر اُن کے خاندانی وقار کے خلاف سرزد نہ ہو۔

تصانیف

قیام رام پور کے زمانے میں حکیم صاحب نے متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں۔ رسالہ القول المرغوب فی الماء المشروب (اسے بعد میں کسی قدر تصرف کے ساتھ ترجمہ فرما کر مجلہ طبیہ میں شائع فرمایا) رسالہ طاعون، التحفہ حامدیہ فی الصناعۃ التکلیسیہ، ایقاظ النعسان فی اغالیط غایۃ الاستحسان، اوراق مطہرہ اور البیان الحسن لبشرح المعجون المسمیٰ باکسیر البدن رام پور ہی میں تصنیف فرمائیں۔

التحفۃ الحامدیہ ۔ میں کشتہ جات کے استعمال کا جواز اور ان کے فوائد پر بحث کرتے ہوئے ان اصحاب کے اعتراضات کو رفع کیا ہے جو کشتہ جات کے استعمال پر اطباء نے کیے ہیں۔

ایقاظ النعسان ۔ میں حکیم عبدالعزیز لکھنوی کے ان اعتراضات کے جوابات ہیں جو انہوں نے حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں صاحب کے فتویٰ عدم حس جوہر دماغ پر کیے تھے۔

البیان الحسن ۔ میں علاج الامراض کی معجون لنا کے معمے کو نہایت خوبی کے ساتھ حل کیا ہے۔

اوراق مطہرہ ۔ میں بعض طبی استفسارات کے جوابات وضاحت کے ساتھ دیے ہیں۔

مذکورہ جملہ رسالے عربی زبان میں حکیم صاحب نے تصنیف فرمائے ہیں ان میں سلاست بیان، حریت رائے، اصابتِ فکر اور وسعت نظر کی وہ تمام خصوصیات جمع ہیں جو ایک اعلیٰ تصنیف کا حصہ ہی ہو سکتی ہیں۔ البیان الحسن کا ایک حصہ فارسی میں ہے جس سے حکیم صاحب کی فارسی مہارت واضح ہوتی ہے۔

۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۴ء تک حکیم صاحب کا قیام زیادہ تر دہلی میں رہا اور اسی زمانے میں دو طبی کارنامے انجام دیے۔ ایک تو مدرسہ طبیہ دہلی کا میگزین مجلہ طبیہ کے نام سے شائع کیا۔ یہ ایک ماہوار رسالہ تھا، جس میں مدرسہ کی خبروں کے علاوہ طبی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ اس رسالے کی ادارت کے فرائض حکیم سید عبدالرزاق معلم تشریح سے متعلق رہے۔ یہ رسالہ کامیابی کے ساتھ جاری رہا اور اس میں معیاری طبی مضامین شائع ہوتے رہے۔ آپ کا پہلا مضمون پانی پر تھا جس پر حکیم صاحب نے نہایت سیر حاصل بحث کی تھی۔

دوسرا اہم کام مفرد دواؤں کی بہم رسانی اور مرکب دواؤں کی تیاری کے لیے یونانی اینڈ ویدک میڈیسنز کمپنی کا اجراء تھا۔ یہ کمپنی مشترک سرمائے سے قائم ہوئی تھی اور اس کا مقصد صحیح اور عمدہ مفرد و مرکب دواؤں کی بہم رسانی تھا اور اسی سلسلے میں ہندوستانی دواخانہ بلی ماران دہلی میں قائم ہوا جس نے بہت فروغ پایا۔

مطب ــــــــ انھوں نے مطب کو بھی بہت ترقی دی۔ ان کے مطب میں رجوعات کا یہ عالم تھا کہ وہ صبح سے ایک دوپہر تک اور شام کو بھی دو تین گھنٹے مطب فرماتے تھے اور بمشکل مریضوں کا ہجوم ختم ہوتا تھا۔ نہ صرف دور دراز شہروں بلکہ دور دراز ممالک مثلاً افغانستان، ایران، عراق اور ترکستان سے بھی مریض آتے تھے۔ ان کے مطب میں امیر، غریب، ہندو، مسلمان سب کے ساتھ یکساں برتاؤ ہوتا تھا۔ بذریعہ خط و کتابت بھی علاج و معالجہ جاری تھا۔

مدرسہ طبیہ زنانہ ــــــ ہندوستان میں جاہل اور نااہل دائیوں کی وجہ سے عورتوں اور ان کے نومولود بچوں پر غلط تدابیر و علاج سے بڑا ظلم ہوتا تھا۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے اس مصیبتِ عظمیٰ سے اہل ہند کو بچانے کے لیے ایک زنانہ طبی مدرسہ کی تحریک شروع کی اور تھوڑے ہی عرصے میں چالیس ہزار روپیہ فراہم کر لیا۔ اس مدرسہ کا افتتاح ۱۹۰۸ء میں لیڈی سر لوئی ڈین لفٹننٹ گورنر پنجاب نے کیا۔ اس نے حکیم صاحب کے جذبۂ ہمدردئ نسواں کی بہت تعریف کی۔ یہ مدرسہ ابتدا میں صرف دائیوں کی تعلیم کے لیے مخصوص تھا، لیکن کچھ عرصے کے بعد

اس میں مکمل یونانی اور ویدک تعلیم دی جانے لگی اور اس وقت تک سیکڑوں طالبات اس سے فارغ ہو کر اپنی بہنوں کی طبی خدمات انجام دے رہی ہیں۔

انجمن طبیہ ـــــ حکیم صاحب نے اپنے طبی کارناموں کی تنظیم کے لیے ایک اور قدم اٹھایا اور وہ یہ کہ شہر کے تمام رؤساء اور اطباء کی ایک انجمن قایم فرمائی اور مدرسۂ طبیہ، ہندوستانی دواخانہ اور مدرسہ طبیہ زنانہ تینوں اس کے سپرد فرمادیے[1] اس طرح اپنے خاندانی اثرات سے آزاد کرکے ان اداروں میں حقیقی جمہوری روح پھونکی۔

قومی کاموں میں دلچسپی ـــــ حکیم صاحب نے طبی کاموں کے علاوہ دیگر ملکی اور قومی کاموں میں دلچسپی لی۔ بعہد سرسید احمد خاں محمدن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کے وہ ٹرسٹی مقرر ہوئے اور کالج کے اہم انتظامی امور میں دلچسپی لیتے رہتے تھے۔ اینگلو عربک ہائی اسکول دہلی کے بھی وہ رکن تھے۔ حکیم صاحب نے آل انڈیا مسلم لیگ اور ندوۃ العلماء کو بھی دعوت دی اور آپ کی مساعی سے ان دونوں کے جلسے دہلی میں نہایت کامیابی کے ساتھ منعقد ہوئے۔ حکیم صاحب آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس استقبالیہ کے چیرمین بھی تھے اور ندوۃ العلماء کے صدر۔

خطاب ـــــ ۱۹۰۸ء میں حکومت ہند نے ان کو حاذق الملک کا خطاب عنایت فرمایا اور یہ خطاب صرف ان کے خاندان کے لیے مخصوص تھا۔ اس خطاب پر حکیم صاحب کو ہر طرف سے مبارکباد کے پیغامات وصول ہوئے اور متعدد مقامات پر تہنیت کے جلسے منعقد ہوئے۔

طبی کانفرنس دہلی ـــــ حکیم صاحب نے طب کے حقوق کے تحفظ کے لیے آئینی جنگ بھی شروع کی اور اس مقصد کے لیے اطباء اور ویدوں کو متحرک کیا اور بالآخر آپ کی قیادت میں طبیبوں اور ویدوں نے آل انڈیا آیورویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس کے نام سے ایک زبردست کانفرنس قایم کی۔ جس کا پہلا اجلاس ۲۶ و ۲۷ نومبر ۱۹۱۰ء کو دہلی میں منعقد ہوا۔ تین سو کے قریب طبیب اور وید اطراف ہند سے جمع ہوئے۔ ہز ہائی نس نواب حامد علی خاں صاحب آف رام پور نے اس کی سرپرستی قبول فرمائی اور کانفرنس کا نظام عمل مرتب کیا گیا۔ اور میڈیکل رجسٹریشن ایکٹ کے خلاف ایجی ٹیشن کیا گیا۔ پھر اس کانفرنس کے جلسے ہندوستان کے مختلف شہروں میں ہوئے۔ ہندوستان کے جمہور کی ہمدردی اُن کے ساتھ تھی ایسی حکومت کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ سیاست سے کام لے اور حسب معمول قانون پاس کرنے کے وقت یہ وعدہ کرے کہ اس سے متوقع خطرات پیدا نہیں ہوں گے۔ چنانچہ یہ ظاہر کیا گیا کہ اس قانون سے مقصود غیر سندیافتہ ڈاکٹروں کا انسداد ہے اور طبیبوں اور ویدوں سے اسے مطلق تعرض نہ ہوگا۔

کونسلوں کے ذریعے طب قدیم کے تحفظ کے لیے جدوجہد جاری رہی اور بالآخر حکومت نے جمہور اطباء کے مطالبات کو تسلیم کرلیا اور مدراس کمیٹی کی رپورٹ کے بعد طب کی مخالفت اور طب کو ان سائنٹفک علم سمجھنے کی بحث ختم ہوگئی۔ اور ثابت ہوا کہ جس علم و فن کو خلاف سائنس اور غیر معقول بتایا جاتا ہے وہ سائنس کے عین مطابق اور طب جدید کے دوش بدوش ہے۔

مدراس کمیٹی کی رپورٹ کے بعد حکومت مدراس نے طبی اسکول اور حکومت بہار نے یونانی اور ویدک اسکول جاری کردیے۔ حکومت صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ نے بورڈ آف انڈین میڈیسن کا تقرر کیا اور مسلم و ہندو یونیورسٹیوں کو یونانی اور آیورویدک درس گاہوں کے لیے رقم خطیر دینا منظور کیا اور حکومت پنجاب نے بھی طبیہ کالج لاہور اور ویدک کالج لاہور کو گرانٹ دینا منظور کیا اور ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپل کمیٹیوں میں طبیبوں اور ویدوں کی خدمات حاصل کیں اور اس طرح اس آئینی جنگ کا اختتام کامیابی پر ہوا جسے حکیم صاحب نے ۱۹۱۰ء میں شروع کیا تھا۔

بیرونی ممالک کا سفر ـــــ حکیم عبدالمجید صاحب کی وفات ۱۹۰۱ء میں ہوئی تو حکیم صاحب کو اس سے بہت صدمہ ہوا۔ دلی میں خاندانی مطب کی بقا اور مدرسۂ طبیہ کے استحکام کی پوری ذمہ داری حکیم صاحب سے متعلق ہوئی۔ آپ نے اس سے عہدہ برآ ہونے کی انتھک کوشش و کاوش کی جس کے نتیجے میں آپ کو قلبی امراض عارض ہوئے۔ پس تبدیل آب و ہوا کی غرض سے میرٹھ تشریف لے گئے اور وہاں کچھ دن قیام کرکے لاہور گئے اور ۱۹۰۵ء میں عازم عراق ہوئے بصرہ ہوتے ہوئے بغداد پہنچے۔ پھر براہ نجف اشرف کربلا پہنچے اور

زیارت عتبات عالیات سے مشرف ہوئے۔

۱۹۱۱ء میں حکیم صاحب جارج پنجم کی تاج پوشی میں نواب صاحب رام پور کے قائم مقام کی حیثیت سے شریک ہونے کے لیے لندن تشریف لے گئے۔ جہاں شاہی انداز میں آپ کی تعظیم کی گئی۔ حکیم صاحب لندن میں ڈیڑھ ماہ تک قیام پذیر رہے اور سر تھیوڈر ماریسن سابق پرنسپل علی گڑھ کالج کی وساطت سے لندن کے اسپتال اور میڈیکل کالج دیکھے علاوہ ازیں انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کی لائبریریوں سے بھی استفادہ کیا اور مشہور مستشرق پروفیسر لے۔ جی براؤن سے بھی ملاقات کی جو اُن سے تبادلۂ خیال کے بعد بہت متاثر ہوئے۔

لندن سے واپسی پر پیرس تشریف لے گئے اور وہاں کے عظیم الشان اسپتالوں اور تاریخی عمارات کا معائنہ فرمایا۔ پیرس سے برلن تشریف لے گئے اور وہاں بھی انہوں نے سرکاری اسپتال طبی کالج اور فارمیسی سینٹر دیکھے۔ نیز برلن کی اورینٹل لائبریری کا معائنہ بھی فرمایا اور یہاں نادر مخطوطات بھی دیکھے۔ برلن سے وائنا گئے جہاں سرکاری شفاخانوں کا معائنہ فرمایا۔ وائنا سے قسطنطنیہ گئے اور وہاں کے اسپتالوں اور طبی کالجوں کا معائنہ فرماکے قاہرہ تشریف لے گئے۔ جہاں جامعہ ازہر کا معائنہ فرمایا۔ قسطنطنیہ اور قاہرہ میں حکیم صاحب کے قدیم احباب وتلامذہ نے ان کا بڑا پرجوش استقبال کیا۔

جب ہندوستان واپس آئے تو بمبئی اور دہلی میں ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ یورپ سے آنے کے بعد انہوں نے اپنے تجارب و مشاہدات سے فائدہ اُٹھاکر ہندوستانی دواخانہ اور مدرسۂ طبیہ میں اہم اصلاحات فرمائیں۔

طبیہ کالج کا منصوبہ ۱۹۱۲ء میں حکیم صاحب نے مدرسہ طبیہ کو طبیہ کالج کی صورت میں ترقی دینے کا منصوبہ تیار کیا اور اس سلسلے میں انجمن طبیہ کو بورڈ آف ٹرسٹیز کی شکل میں تبدیل کیا اور خود سکریٹری کا عہدہ قبول فرمایا اور جب مشاغل کی کثرت کے باعث ایک معاون کی ضرورت درپیش ہوئی تو خان بہادر پیرزادہ محمد حسین عارف ایم۔ اے رٹائرڈ سیشن جج کو جوائنٹ سکریٹری کے عہدے پر مقرر فرمایا۔ پیرزادہ صاحب حکیم صاحب کے معاون کی حیثیت سے کالج اور دواخانہ کے نظم ونسق میں شریک رہے۔

بورڈ آف ٹرسٹیز کی تشکیل کے بعد حکیم صاحب نے ایک آیور ویدک مدرسہ کا بھی اجرا کیا اور اس میں ویدک کی مکمل تعلیم کا انتظام کیا۔ اس مدرسہ کے اجراء سے حکیم صاحب نے یہ ثابت کردیا کہ وہ ویدوں اور ویدک کے صرف نام کے ہی خواہ نہیں ہیں بلکہ انہیں طب یونانی کے ساتھ ویدک سے بھی حقیقی ہمدردی اور دلچسپی ہے۔

طبیہ کالج کے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے حکیم صاحب نے چندہ جمع کرنا شروع کیا۔ رام پور، گوالیار، بھوپال اور پٹیالہ وغیرہ ریاستوں نے کشادہ دلی کے ساتھ اس میں حصہ لیا اور جب چندہ کی معتد بہ رقم جمع ہوگئی تو حکیم صاحب نے گورنمنٹ آف انڈیا سے زمین کا ایک بڑا رقبہ قرول باغ کے قریب طبیہ کالج کی تعمیر کے لیے حاصل فرمالیا۔ اور لارڈ ہارڈنگ وائسرے ہند کو کالج کا سنگ بنیاد رکھنے کی دعوت بھی دی جسے وائسرائے نے بڑی مسرت کے ساتھ منظور فرمایا اور بالآخر ۲۹ مارچ ۱۹۱۶ء کو طبیہ کالج کی رسم تنصیب سنگ بنیاد ادا کی گئی۔ اس رسم کے بعد ہی کالج کی تعمیر شروع ہوگئی۔ تعلیم گاہ، اسپتال، لائبریری، بورڈنگ ہاؤس وغیرہ عمارات شاہان مغلیہ کی عالی شان عمارات کی مثل تعمیر ہوئیں۔ اساتذہ کے کوارٹرز اور پرنسپل کے لیے کوٹھی بھی عالیشان تعمیر ہوئی۔ ۱۹۲۱ء میں جب کالج کی عمارت مکمل ہوچکی تو حکیم صاحب نے مہاتما گاندھی کو اس طبیہ کالج کی افتتاح کی دعوت دی۔ چنانچہ ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا اور مہاتما گاندھی جی نے افتتاح فرمایا اور افتتاح کے بعد ہی طبی اور ویدک شعبوں کی تعلیم اس میں شروع کردی گئی۔

تجدید طب :۔ بیرونی ممالک کی سیاحت کے بعد حکیم صاحب طبیّ نصاب کی نظرثانی کی طرف متوجہ ہوئے اور اصلاح وتجدید طب اور تدوین نصاب کے مسائل پر غور کیا اور ایک جدید مسلک وضع فرمایا۔ آپ نہ تو مقلد محض کی طرح اصلاح و تجدید طب کے منکر تھے اور نہ ہی نام نہاد مجددین کی طرح طب قدیم سے قطعی مایوس تھے۔ اوّل الذکر کے لیے ان کا جواب یہ تھا کہ وہ بزرگان سلف کے اسوۂ حسنہ سے بے خبر ہیں ورنہ مسلک اصلاح کی وہ مخالفت نہ کرتے اور ثانی الذکر گروہ کے متعلق یہ کہا کرتے تھے کہ ان کی رائے عدم نظر اور قلت فکر کا نتیجہ ہے۔ ورنہ اس شمع شبستان

ں اب بھی اس قدر روشنی موجود ہے کہ مغرب کے برقی قمقمے اس سے کسب ضیا کرسکیں۔

کسیکہ محرم بادصبا ست مے داند
کہ باوجود خزاں بوئے یاسمن باقیست

حکیم صاحب نے اس معتدل مسلک کے مطابق اصلاح و تجدید طب کے لیے ہمیشہ کوشش فرمائی اور اپنی تالیفات میں اسی مسلک کے مطابق حریت فکر در اجتہاد رائے سے کام لیا۔

مسائل خمسہ شائع فرما کر کورانہ تقلید کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ طبی کانفرنس میں تنقیح مسائل کی تجویزیں منظور کرائیں۔ نیز مدرسہ طبیہ کے ساتھ صیغۂ تالیفات قائم کر کے بطرز جدید کتابیں طب کے مختلف شعبوں پر تالیف کرائیں۔ آپ کے شاگردانِ رشید علامہ محمد کبیرالدین صاحب اور زبدۃ الحکماء حکیم محمد حسن قریشی صاحب نے طب کے مختلف شعبوں پر نہایت جامع کتابیں تصنیف و تالیف فرمائیں جو طبی کالجوں میں مقبول ہوئیں اور دورِ حاضر میں بھی بنیاد درس و تدریس ہیں۔

اوائل ۱۹۲۷ء میں حکیم صاحب نے طبی کانفرنس کا عظیم الشان جلسہ رام پور میں منعقد کیا جس کے صدر ہز ہائی نس نواب حامد علی خاں صاحب بہادر تھے۔ اس جلسے میں بھی حکیم صاحب نے اطباء کو اصلاح و تجدید طب کی جانب متوجہ فرمایا اور نصاب تعلیم پر نظرِ ثانی کرنے کے لیے دہلی، لاہور اور لکھنؤ میں کمیٹیوں کا تقرر فرمایا۔

شعبۂ ریسرچ۔ ۱۹۲۶ء میں حکیم صاحب نے طب کی اصلاح و تجدید کے لیے ایک اور قدم اُٹھایا۔ انھوں نے طبیہ کالج کے ساتھ ریسرچ کا محکمہ قایم فرمایا۔ اس محکمہ کا پہلا مقصد نصابِ طب کی قدیم کتابوں کے مسائل کی تنقیح تھی۔ دوسرا مقصد اس شعبہ کا یہ تھا کہ وہ ان جڑی بوٹیوں کی تحقیقات کرے جو ہندوستان میں پیدا ہوتی ہیں اور جدید کیمیاوی اصولوں کی روشنی میں ان کو پرکھے۔ اسی طرح اُن مرکبات کا بھی تحلیل و تجزیہ کرے جو طبِ قدیم میں مروج ہیں۔ حکیم صاحب خود بھی مجلس تحقیق مسائل میں شریک رہے اور اُن کے بعد اُن کے نامور فرزند حکیم محمد جمیل خاں صاحب

اس عظیم کام کی تکمیل کے لیے کوشاں رہے۔

حکیم صاحب کا خیال تھا کہ اگر ریسرچ طب یونانی کے اصول کو پیشِ نظر نہ رکھتے ہوئے کی گئی تو یہ ریسرچ نہ تو طب قدیم کے لیے مفید ہوگی اور نہ آیورویدک کے لیے۔ اس لیے کہ جدید انداز پر دواؤں کی ریسرچ کرنے کے بعد ان کو مغربی دواسازی کی شکل دی جائے گی۔ ان کے حاد جواہر عامل حاصل کیے جائیں گے اور ان میں الکہال کی آمیزش ہوگی اور پھر یہ مغربی طب کی دواؤں کی طرح ہندوستانیوں کے مزاج کے مطابق و موافق نہ رہیں گی۔

جامعہ ملیہ:۔ حکیم صاحب کو اپنی زندگی کے آخری دنوں میں جامعہ ملیہ سے بہت زیادہ دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ انہوں نے محسوس کیا تھا کہ اہلِ ہند کی آزادی کے لیے ذہنی و تعلیمی حریت کی شدید ضرورت ہے۔ اس لیے انھوں نے جامعہ ملیّہ کے چانسلر کا اہم عہدہ قبول کیا اور پوری کوشش کی کہ جامعہ ملیہ کی مالی حیثیت استوار ہوجائے۔ اس غرض کے لیے انہوں نے بہار وغیرہ کا دورہ کیا اور عطیات حاصل کیے۔ انہوں نے اس پر بھی توجہ فرمائی کہ جس طرح ہندوستانی دواخانہ طبیہ کالج دہلی کے اخراجات پورے کر رہا ہے، اسی طرح جامعہ کے ساتھ ایک عظیم الشان مکتبہ کا انتظام کیا جائے جو کچھ عرصے کے بعد جامعہ کے اخراجات کا کفیل ہوجائے۔

سیاسی سرگرمیاں:۔ حکیم صاحب فنی و قومی کاموں میں ابتدا ہی سے دلچسپی لیتے رہے۔ مدرسہ طبیہ، بلازنانہ مدرسہ طبیہ، ہندوستانی دواخانہ، طبی کانفرنس، علی گڑھ کالج، ندوۃ العلماء، عربک ہائی اسکول دہلی وغیرہ اداروں کی سود و بہبود کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ نیز مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی تحریکات میں انہوں نے نمایاں حصّہ لیا اور وہ سیاسی اعتبار سے ایک ماڈریٹ خیال کے مسلمان تسلیم کیے گئے۔

مسلم لیگ کے اجلاس میں دہلی کی مجلس استقبالیہ کے وہ چیرمین منتخب ہوئے اور انہوں نے اپنے فرائض کو عمدگی کے ساتھ ادا کیا۔

> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
> ”حیا اور ایمان دونوں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں اگر ایک رخصت ہوجائے تو دوسرا بھی باقی نہیں رہے گا“

دسمبر ۱۹۱۰ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا جو عظیم الشان اجلاس ہوا اس کی کامیابی کے لیے بھی حکیم صاحب نے بڑی کوشش فرمائی۔ حکیم صاحب اس کانگریس کی مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ ان کی مساعی سے یہ کانفرنس بہت کامیاب ہوئی۔ پھر امرت سر میں ۱۹۱۹ء میں مسلم لیگ اور کانگریس اور خلافت کانفرنس کے اجلاس منعقد ہوئے تو حکیم صاحب نے بحیثیت صدر آل انڈیا مسلم لیگ میں شرکت فرمائی۔ امرت سر میں عظیم الشان طریقے پر اُن کا استقبال کیا گیا۔ امرت سر کے جلسوں کے بعد ۱۹۲۰ء میں مہاتما گاندھی جی نے ہندوستان کی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور بالآخر ترک موالات کا پروگرام پیش کیا۔ جس کا منشا یہ تھا کہ حکومت وقت کو کسی طرح کی مالی، قانونی اور اخلاقی مدد نہ دی جائے۔ اور اس طرح اسے اہل ہند کے مطالبات منظور کرنے پر مجبور کیا جائے۔ حکیم اجمل خاں صاحب نے اس تحریک میں پوری قوت سے حصہ لیا اور انہوں نے سب سے پہلے حاذق الملک جیسا محترم خطاب اور تمغہ طلائی (قیصر ہند) واپس کیا۔ جمہور نے ان کے اس بے نظیر ایثار کو نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور باشندگان کانپور نے جلسہ کر کے ان کی خدمت میں ہدیۂ تہنیت پیش کرتے ہوئے مسیح الملک کا قومی خطاب تجویز کیا۔ جس کی تائید دوسرے شہروں نے بھی کی۔

۱۹۲۱ء میں کانگریس کا جلسہ جو احمد آباد میں منعقد ہوا، اس کے صدر مسٹر سی۔ آر۔ داس مقرر ہوئے تھے۔ مگر ان کے قید ہو جانے سے قرعۂ فال مسیح الملک کے نام پر پڑا۔ حکیم صاحب نے اس جلسے میں کانگریس کی صدارت کے بعد اپنے وقت کا تمام حصہ اس تحریک میں صرف کرنا شروع کر دیا اور غیر معمولی انہماک کے باعث مسیح الملک کی صحت بھی خراب ہو گئی تھی کہ آنکھوں میں پانی اُتر آیا۔ مجبور ہو کر مسیح الملک نے اپنا وقت مسوری وغیرہ میں گزارا اور آنکھوں کا آپریشن کرایا۔

وفات:- ۲۸/۲۹ دسمبر ۱۹۲۷ء مطابق ۱۳۴۶ھ ریاست رام پور میں شب کو دو بجے وفات پائی۔ شب ہی میں جنازہ دہلی پہنچا، ہزارہا مخلوق جنازے کے ساتھ تھی۔ چاندنی چوک سے شریف منزل تک اس قدر ہجوم تھا کہ گزرنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ نماز جنازہ جامع مسجد میں ادا کی گئی اور آپ کی تدفین آپ کے آبائی قبرستان مزار خواجہ حسن رسول نما میں کی گئی۔ تمام اردو و انگریزی اخبارات میں پیام تعزیت اور آپ کے حالات و اوصاف شائع ہوئے۔

مدائح:- مسیح الملک کے مدائح جو آپ کے احباب میں سے مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ العلماء ہند اور حکیم نذیر احمد صاحب پیش کار مسیح الملک نے تحریر فرمائے ہیں۔ ان کا اقتباس درج ذیل ہے۔

مفتی کفایت اللہ صاحب ارقام فرماتے ہیں

"میں نہ صرف دہلی بلکہ سچ پوچھیے تو تمام ہندوستان کے لیے حضرت مسیح الملک حافظ محمد اجمل خاں صاحب مرحوم کی جلیل القدر ہستی مایۂ ناز اور سرمایۂ افتخار تھی۔ مرحوم کو مسلمانوں کے علوم قدیمہ سے اس قدر دلچسپی تھی کہ ہمیشہ علوم اسلامیہ کا ذکر فرماتے رہے۔ اور اُن کی کساد بازاری پر اس قدر متاسف ہوتے کہ بعض اوقات آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے تھے۔ وہ خود جدت پسند تھے مگر ان کی جدت پسندی اس حد تک محدود تھی کہ علوم وفنون اسلامیہ اور مشرقی و ایشیائی تہذیب کو صدمہ نہ پہنچے۔ علم طب میں تو ان کا یگانۂ روزگار ہونا مسلمات میں سے ہے اور ان کی گراں قدر تصنیفات اُن کے طبی کمال کی شاہد عادل ہیں مگر اس کے ساتھ ہی وہ دوسرے علوم میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ عربی ادب کے تو عاشق تھے اور عربیت میں اس قدر کمال تھا کہ بلا تکلف عربی بولتے اور عربی نثر و نظم لکھتے تھے۔ حکیم صاحب کے عربی خطوط کا کافی ذخیرہ میرے پاس تھا مگر افسوس کہ وہ خدا جانے کہاں گم ہو گیا۔ صرف پانچ چھ خطوط باقی رہ گئے ہیں۔ فقہیات میں کبھی کبھی میرے ساتھ گفتگو کرتے

> اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
> "کم علم بہتر ہے اس کثیر عبادت سے جو جہالت کے ساتھ ہو۔"

تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُن کو اصول فقہ اور قواعدِ استنباط پر خاصہ عبور ہے۔ آخری لمحات زندگی میں انہوں نے نہایت دلسوزی کے ساتھ مجھ سے فرمایا تھا کہ مولانا فقہ کا انداز بڑے درجے تک مقتضیات زمانہ پر ہوتا ہے۔ فقہ حنفی نہایت کامل قانون ہے اور میں اس کو دوسرے مذاہب کے فقہ سے بہت اعلیٰ و ... سمجھتا ہوں۔ تاہم میرا خیال ہے کہ اگر آج امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ موجود ہوتے تو زمانۂ موجودہ کی مقتضیات کو دیکھ کر وہ خود اپنی فقہ کو بڑی حد تک بدل دیتے۔ اس لیے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ خدارا علمائے کاملین کی ایک جماعت منتخب کیجیے جو وسعت نظری کے ساتھ زمانہ موجودہ کے مقتضیات کو پیش نظر رکھ کر فقہ حنفی کی تجدید کریں۔

حکیم نذیر احمد صاحب بیش کار مسیح الملک مرحوم تحریر فرماتے ہیں:۔

"آپ کو شروع ہی سے علمی شغف زیادہ تھا۔ چنانچہ علاوہ طبی قابلیت کے دیگر علوم مروجہ فقہ، ریاضی، منطق فلسفہ، عروض، ادب، ہیئت میں تو اپنی نظیر آپ ہی تھے۔ علی گڑھ کالج کے عربی کے چیئرمین پروفیسر جوزف ہورووکس صاحب نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ ہندوستان میں عربی علم و ادب کے ماہر صرف دو شخص ہیں۔ ایک حاذق الملک حکیم اجمل خاں اور دوسرے ایک صاحب کلکتہ میں۔ عربی زبان میں آپ کی تقریر ایسی فصیح و بلیغ اور بے تکان ہوتی تھی کہ میں نے کسی عرب کو بھی اس طرح بولتے نہیں دیکھا۔ اسی طرح عربی کی تحریرات بھی فصاحت کا ایک بہترین نمونہ ہوتی تھیں۔ آپ عربی میں اشعار بھی کہتے تھے۔ چنانچہ عربی کا غیر مطبوعہ کلام اب تک موجود ہے۔ رموز الاطباء جلد اول میں بھی آپ کے بعض عربی اشعار شائع ہوئے ہیں۔ آپ شیدا تخلص فرماتے تھے۔ ریل کے سفر میں عموماً شعر کہا کرتے تھے آپ کا اردو و فارسی کلام کا کچھ حصہ دیوان شیدا کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔ کتب بینی اور مطالعے سے آپ کو اس قدر شغف تھا کہ جس وقت بھی آپ کو موقع ملتا مطالعے میں منہمک رہتے تھے۔ چنانچہ آپ کے ذاتی کتبخانہ اور کتب خانۂ رام پور میں کوئی قابل ذکر کتاب ایسی نہیں ہے جو مسیح الملک نے بالاستیعاب نہ پڑھی۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ اکثر کتابوں پر جا بجا آپ کے قلم کے حاشیے اور نوٹ تحریر کیے ہوئے ہیں۔ خوش نویسی بھی آپ کی بے نظیر تھی۔ اس فن میں آپ میر پنجہ کش دہلوی مشہور خوش نویس کے شاگرد تھے اور خط نسخ و نستعلیق اس قدر بہتر تھا کہ دہلی کے اچھے خوش نویس بھی ان کی خوبیوں کے معترف تھے۔ آپ کے تحریر کردہ اکثر قطعات اور کتبے اب تک موجود ہیں۔

فن طب آپ کا عزیز فن تھا۔ اس کے علمی و عملی دونوں حصوں میں آپ نے چار چاند لگا دیے۔ فن طب میں آپ نے متعدد رسالے لکھے (جس کا ذکر مضمون ہذا کی ابتدا میں گزر چکا ہے۔ اس کے علاوہ صناعۃ التکلیسیہ اور لغات طبیہ بزبان عربی تصنیف فرمائی)۔ رسالہ طاعون آپ نے ۱۸۹۵ء میں اس وقت تصنیف فرمایا جب کہ بمبئی میں یہ وبا نمودار ہوئی۔ یہ رسالہ بہت مقبول ہوا اس کے تراجم متعدد زبانوں میں طبع ہوئے۔ عملی پہلو آپ کا علمی پہلو سے زیادہ روشن رہا۔ سرسری طور پر اندازہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی عمر میں تقریباً ۱۰ لاکھ مریضوں کا علاج کیا۔ یوں روزمرہ سیکڑوں اُلجھے ہوئے اور مایوس العلاج آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور دامن امید گل مراد سے بھر کر واپس جاتے تھے۔ مریض نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرونی ممالک سے بھی آتے تھے۔

عنفوان شباب میں اس عمر کے قبائح سے بالکل محفوظ رہے۔
لباس فاخرہ سے بھی پرہیز کرتے۔ نوجوانوں کی صحبت سے اعراض کرتے
اور پیرانِ عمر رسیدہ سے مجانست فرماتے۔ اس لیے خاندان شریفی
کے دیگر نوجوان ان کو "جوان صورت، پیر سیرت" کہا کرتے تھے اور
ایام شیخوخت میں ان کے خصائل حمیدہ اور اوصاف ستودہ حد احصا
سے باہر تھے۔ دوران شباب صبح سے دس بجے تک حکیم محمود خاں صاحب
کے مطب میں شریک رہتے۔ دس بجے کے بعد اسمٰعیل پہلوان کے
اکھاڑہ میں ورزش کرتے۔ اس کے بعد مدرسہ طبیہ میں دو گھنٹہ تک
درس دیتے اور اس کے بعد طعام تناول فرماتے۔ پھر عصر تک اپنے
مطبع اکمل المطابع میں کتب کی تصحیح اور اکمل الاخبار کے لیے مضمون
تحریر فرماتے اور رات کو طبی و ادبی کتابوں کا مطالعہ فرماتے
اور ارباب علم کی صحبت میں شریک ہو کے علمی
مسائل پر تبادلہ خیالات
کرتے تھے۔

سوانح : مسیح الملک کی وفات کے بعد آپ کی حیات اور کارناموں پر
متعدد کتب و رسائل شائع ہوئے۔ جن میں سے چند حسب ذیل ہیں :-

۱- مسیح الملک نمبر مشیر الاطباء ماہ نومبر و دسمبر ۱۹۲۸ء
۲- اجمل میگزین دہلی۔ ماہ فروری ۱۹۳۶ء
۳ تذکرہ مسیح الملک حکیم محمد حسن قریشی۔
۴- سیرت اجمل مطبوعہ ہندوستانی دواخانہ۔ دہلی۔
۵- حیاتِ اجمل۔ مولفہ قاضی عبدالغفار خاں صاحب
۶- افادات مسیح الملک مولفہ حکیم سید نذر احمد صاحب۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۷ء
میں اور دوسرا ایڈیشن اضافات کے ساتھ ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا۔ یہ ۳۶۰ صفحات
پر مشتمل ہے۔ اس میں امراض سے متعلق حکایات اور اُن کا علاج درج ہے۔
۷- رضا لائبریری رامپور عہد نواب علی محمد خاں سے عزت مآب محمد عثمان عارف صاحب
چیرمین رضا لائبریری بورڈ تک۔ مرتبہ حکیم محمد حسین خاں شفا۔ مطبوعہ رضا لائبریری
۱۹۸۵ء۔

8 Hakim Ajmal Khan. The Versatile Genius written by Hakim Mohd Abdur Razak, Director Central Council for Research in Unani Medicine.

دودھ اور خون کی مماثلت

ابو وارث جمیل*

خون حیض یا وہ خون جو رحم کی دیواروں سے مترشح ہوتا ہے اس کے اندر مختلف الخواص اجزاء پائے جاتے ہیں۔ اس خون کا سرچشمہ وہی عام بدن کا خون ہے جو کہ رگوں میں گردش کرتا رہتا ہے۔ خون مادر جو رحم کی دیواروں سے خارج ہو کر اصل تخم تک پہنچتا ہے۔ ابتداً اسے سامان پرورش مہیا کرتا ہے، جس سے بچہ رحم کے اندر نشو و ارتقاء کے مدارج طے کرتا ہے اور ایک خاص مدت (مدت حمل) کے بعد اپنے مخصوص وزن و حجم اور قوت کو حاصل کر کے رحم سے برآمد ہوتا ہے۔

بچہ رحم مادر میں جن اجزاء غذائیہ سے اب تک تغذیہ حاصل کرتا رہا ہے ان اجزاء غذائیہ سے ماں کا دودھ ہی دوسری غذاؤں کی بہ نسبت زیادہ مشابہ و متجانس ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ وہ خون حیض جو جنین کی حالت میں رحم کے اندر غذا پہنچا رہا تھا، چھاتیوں میں پہنچ کر دودھ بن جاتا ہے جو کہ شیر خوار بچے کے لیے نہایت بہترین و مناسب غذا ہے۔ جسے بچے کی طبیعت و مزاج نہایت توجہ و خوشی سے قبول کر لیتی ہے۔ مدتِ رضاعت کے ابتدائی زمانے میں خون حیض کا آنا بند ہو جاتا ہے اور دودھ کی کثرت جاری ہو جاتی ہے اور بتدریج جیسے جیسے خون حیض کی آمد شروع ہونے لگتی ہے (زمانے کے ساتھ) اسی کے بقدر دودھ میں کمی واقع ہونے لگتی ہے اور ایک وقت آتا ہے کہ دودھ کی آمد بالکل بند ہو جاتی ہے اس سے یہ ثابت ہوا کہ یہ کارخانۂ قدرت ہے: وہ اس پر قادر ہے کہ دودھ کو خون میں اور خون کو دودھ میں تبدیل کر دے جیسا کہ شیر مادر اور خون حیض کے بند ہو جانے اور جاری ہونے سے واضح ہوتا ہے۔

بچپن کے زمانے میں ابتدائی ۹ ماہ بچے کی فطری خوراک محض دود[ھ] ہے۔ اگر اس میں وہ تمام اجزائے غذائیہ مہیا نہ ہوں جن سے خون [کے] تمام اجزا بن سکیں تو بچے کے نشو و نما میں طرح طرح کے خلل واقع ہو[ں] کیوں کہ بچپن میں نمو (بڑھنا) کی رفتار جس حیرت انگیز سرعت کے سا[تھ] جاری رہتی ہے وہ عمر کے کسی دوسرے حصے میں نہیں ہوتی۔ سن نمو کا مزا[ج] حار رطب ہے۔ چوں کہ اس عمر میں رطوبت غریزیہ اور حرارت غریزیہ د[و] غالب ہوتی ہیں اور نمو اس وقت تک ممکن ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ اع[ضاء] میں کھنچاوٹ اور تناؤ نہ ہو اور تناؤ و کھنچاوٹ بغیر وافر رطوبت اور وافر حرارت کے ممکن ہی نہیں۔ اس لیے دودھ کے مزاج میں حرارت و رطوبت کا غلبہ ہونے سے سن نمو کے لیے یہ بہترین فطری غذا ہے۔ وافر رطوبت کی ضرورت تو اس لیے پڑتی ہے کہ رطوبت کی وجہ سے اعضاء [م]یں آسانی سے ہر طرف کھنچ جانے اور ہر شکل کو قبول کرنے کی استعدا[د] پیدا ہو جاتی ہے اور وافر حرارت کی ضرورت اس لیے پڑتی ہے کہ جسم [کے] اندر حرارت ہی تحریک کی باعث ہوتی ہے اور ہر سمت میں جسم میں حرکت دے کر نمو پیدا کرتی ہے۔

دودھ اور اخلاط:۔

نظریہ اخلاط کا بانی ابوالطب بقراط (Hippocrate[s] ہے۔ لفظ اخلاط کے معنی ملی جلی چیز کے ہیں۔ عروق دمویہ کے اندر خالص خو[ن]

---

* ایم۔ ڈی اسکالر، ڈپارٹمنٹ آف کلیات وعلم الامراض۔ اجمل خاں طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ہی نہیں ہوتے بلکہ اس میں خون بلغم، صفرا، وسودا باہم ملے جلے ہوتے ہیں اس لیے اس مجموعے کو اخلاط کہا جاتا ہے۔ ابوسہل مسیحی جو بقراط کے نظریے اخلاط کے پیرو اور امام فن کی حیثیت رکھتے ہیں اور شیخ الرئیس بوعلی سینا کے استاد ہیں، اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "کتاب المئۃ" کی بحث اخلاط میں لکھتے ہیں:

"خون کے اندر مختلف اخلاط آمیزش کی صورت میں پائے جاتے ہیں۔"

اور دوسری دلیل یہ قایم کی ہے کہ

"شکم مادر (رحم) سے باہر آنے کے بعد بچے کی غذا (خون رحم کے بجائے) دودھ ہو جاتی ہے اور دودھ اسی خون سے بنتا ہے (جو عروق میں محصور ہوتا ہے) اور یہ معلوم ہے کہ دودھ میں مختلف اقسام کے جوہر و مواد پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے جُدا ہو سکتے ہیں۔"

(ترجمہ ۶۲/۲ مئۃ مسیحی)

ابوسہل کے اس قول سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ دودھ میں جو کچھ بھی اجزا یا جوہر ہیں وہ سب خون ہی سے حاصل ہوتے ہیں۔ حالاں کہ رنگ و قوام کے لحاظ سے دودھ خون سے مختلف ہوتا ہے اور خون مختلف الماہیت اجزا کا مجموعہ ہے۔

دودھ اور خون میں مشابہت

ابوسہل مسیحی نے دودھ کی خلط محصور فی العروق (خون) سے تشبیہ دی ہے جس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ جس طرح خون متعدد اجزا (اخلاط) کا مجموعہ ہے جو بعض اوقات ایک دوسرے سے جدا بھی ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح دودھ بھی متعدد جواہر سے مرکب ہے جو آمیزش کی صورت میں دودھ کے اندر پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے جدا بھی ہو سکتے ہیں۔" آگے فرماتے ہیں۔ "دودھ جو بچے کی غذا ہے اس خلط سے مشابہ ہے جو عروق میں محصور ہوتی ہے اور جو چاروں اخلاط سے مرکب ہوتی ہے۔ چنانچہ دودھ میں رقیق چیز پانی جیسی (ماء الجبن) ہوتی ہے اور ایک غلیظ چیز (جبن یا پنیر) اور ایک روغنی چیز (زبد یا مکھن) ہوتی ہے۔ یہ ساری چیز دودھ میں ملی جلی ہوتی ہے اور جب اُن میں سے کسی ایک کو دوسرے سے جدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو یہ جُدا ہو جاتی ہے۔"

(ترجمہ ۵۵/۲ مئۃ مسیحی)

مشابہت باعتبار کیفیات

۱۔ خون کی طرح دودھ کا مزاج بھی حار رطب ہے۔
۲۔ شیر مادر اور خون کا یکساں حرارت پر رہنا۔
۳۔ خون کی طرح سے شیر کا استحالہ کے بعد حرارت کا پیدا کرنا۔

باعتبار مادہ

خون بھی دودھ کی طرح باعتبار مادہ مختلف اجزا کا مجموعہ ہے جن کے خواص ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں:

۱۔ خون میں اگر پانی کی مقدار کثیر پائی جاتی ہے تو دودھ میں بھی پانی کی مقدار دوسرے اجزا کے مقابلے میں کثیر ہوتی ہے۔ الغرض دونوں میں رطوبت کا غلبہ ہوتا ہے۔

۲۔ دودھ کے اندر جو اجزا پائے جاتے ہیں، وہ سارے کے سارے خون سے ہی حاصل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر خون میں تین اہم اجزا لحمیت (Proteins) دہنیت (Fats) اور سکریت (Sugar) پائے جاتے ہیں تو دودھ بھی ان میں سے کسی جز سے خالی نہیں۔ ان کے ساتھ اگر کچھ نمکین اجزا (بورقیت) پائے جاتے ہیں تو دودھ میں بھی اسی قسم کے بورقی اجزا موجود ہیں۔ غرضیکہ یہ اجزا خون سے منجذب ہو کر دودھ میں شامل ہو جاتے ہیں جس سے یہ دلیل قایم ہوتی ہے کہ دودھ اور خون مشابہ ہے۔

۳۔ جس طرح خون کا عروق سے نکلنے پر انجماد ہو جاتا ہے، اسی طرح دودھ بھی خاص حالات میں جم جاتا ہے۔

۴۔ خون کی مائیت میں جس طرح مختلف اجزا گھلے ہوتے ہیں، جیسے نمک، شکر وغیرہ، ایسے ہی دودھ کی مائیت بھی نمک و شکر کا محلول ہوا کرتی ہے۔

۵۔ خون جس طرح استحالہ (Metabolism) کے بعد جزو بدن بنتا ہے اور اس سے تمام اعضا کا تغذیہ ہوتا ہے،

اسی طرح بچپن کے زمانے میں بچے کی فطری خوراک یعنی دودھ ہی ہے جس کے استعمال کے بعد بچے کے اندر خون کے تمام اجزا بنتے ہیں اور اعضاء کی نشو ونما ہوتی ہے۔ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اگر غذا کی مقدار ناکافی ہو تو بھی دودھ کی مقدار کم نہیں ہوتی۔ کیوں کہ (Body Tissues) کا استعمال تولید شیر میں ہونے لگتا ہے اور آخر کار دودھ کی مقدار کم ہونے لگتی ہے۔

۲۔ دودھ میں خون کی طرح سے (Anti Bodies IgA) موجود ہوتے ہیں۔

الغرض دودھ اور خون کلیاتی اعتبار سے اور منافع الاعضائی حیثیت سے بھی ایک دوسرے کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں۔

دودھ کی ترکیب

شیر مادر انسانی میں مندرجہ ذیل اجزا کی مقدار اس طرح ہے

پانی	WATER	87%
لحمیات	PROTEINS	1.5%
شحمیات	FATS	3.6%
شکر	LACTOSE SUGAR	7.2%
نمکیات	MINERAL ASH	.2%
کیلشیم	Ca	.12%
فاسفورس	P	.09%
میگنیشیم	Mg	.02%
سوڈیم	Na	.048%
پوٹاشیم	K	.13%
کلورائڈ	Cl	.11%
فولاد	Fe	.0004%

اس کے علاوہ تانبہ (Cu) بھی مختصر مقدار میں ملتا ہے

خون کی طرح سے دودھ کے اجزا بھی بچوں کے مکمل تغذیہ کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ حالاں کہ یہ فولاد اور تانبہ کی مقدار میں کمی کے باعث مکمل غذا نہیں ہے۔ پھر بھی یہ بہت سے اجزائے غذائیہ کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ دودھ کے اندر اجزائے لحمیہ یعنی پروٹین کی زیادتی گلوبولن (Globulin) لحم کی موجودگی کے باعث ہوتی ہے جو کہ خون میں موجود گاما گلوبولن (Y-Globulin) کے بہت مشابہ ہے۔ دودھ کے اندر موجود مخصوص اجزا کی مختصر تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ مواد لحمیہ (PROTEINS)

دودھ کے اندر مواد لحمیہ کیسینوجن (caseinogen) ہی مخصوص جز ہوتی ہے جو کہ درجہ اول کی لحم کہلاتی ہے اور یہی اعلیٰ حیوانیاتی لحم ہے یہ غدہ لبن (MAMMARY GLAND) میں مصل الدم (Blood Plasma) امینو ایسڈ اور پروٹین سے بنتی ہے دودھ میں موجود لبنی بیضی لحم (Lact Albumen) اور لبنی گلوبولن (Lact Globulin) مصل الدم کی لحم بیضہ (Albumin) اور گلوبولن (Globulin) سے بہت زیادہ مشابہت رکھتی ہے گلوبولن بہت کم مقدار میں ہوتی ہے۔ دودھ میں ضروری امینو ایسڈ (Essential Amino Acid) کثیر مقدار میں ہوتے ہیں۔ بچوں میں جب اس لحم کی کمی ہو جاتی ہے تو مرض کواشکر (Kwashiorker) سقیم پیدا ہو جاتا ہے۔

۲۔ شحم (FATS)

دودھ کے اندر شحم ایک پائیدار محلول stable — (Emulsion) کے طور پر ملتی ہے۔ یہ کولسٹرال۔ لیسیتھن شحمی تیزاب اور شحم غیر فعال (Cholestral, Lecithin, Fatty Acid, Neutral Fat) کا مجموعہ ہے جو کہ خون کے اندر موجود ایسی ٹیٹ اور نیوٹرل فیٹ سے بنتے ہیں۔

۳۔ شکر لبنی

اس میں لیکٹوز موجود ہوتا ہے۔ یہی وہ جز ہے جو کہ دودھ کو رکھ دینے پر شیری تیزاب (Lactic Acid) میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ عمل جراثیمی تغیرات کے باعث ظاہر ہوتا ہے۔

۴۔ نمکیات (MINERAL ASH)

دودھ میں یہ اجزاء Ca, K, Na, Cl, P کثیر مقدار میں ملتے ہیں۔ دودھ کے اندر فولاد اور تانبہ کی مقدار ناکافی ہوتی ہے۔ اس

ماہ کے بعد بچے کی غذا میں الگ سے فولاد شامل کر دیا جاتا ہے کیوں کہ
دودھ کی کمی تو مولود فقر الدم (Infantile Anaemia) ہو جاتی ہے۔
سارے نمکیات دودھ میں خون سے حاصل ہوتے ہیں۔ دودھ کا مرکب
فاسفورس کا حصہ خون کے (INORGANIC PHOSPHATE)
سے حاصل ہوتا ہے۔

(۵) حیاتین (VITAMINS)

دودھ میں حیاتین اے (Vit. A) اور کیروٹین (Carotene)
مقدار میں ہوتے ہیں۔ اس میں حیاتین بی کمپلکس کی مقدار رائبوفلیون اور پینٹو
تھینک ایسڈ کے بالمقابل کم ہوتی ہے۔ حیاتین سی کی مقدار حیاتین
ڈی سے بھی کم ہوتی ہے۔

خون کی ترکیب:-

یہ ایک مخصوص قسم کی نسیج الحاقی یا نسیج واصل Connective
Tissue ہے جس میں رقیق بین الخلیات مادہ ہوتے ہیں جن کو
مصل الدم (Blood Plasma) کہتے ہیں۔ اس میں مختلف قسم کے
خلیات جیسے کریات حمرا (Red Corpuscles) کریات بیضا
(White Blood Corpuscles) اقراص دمویہ (Blood Platelets)
معلق پڑے رہتے ہیں۔

خون ایک پیچیدہ رطوبت (Complex Fluid) ہے،
جس کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے،
۱۔ مصل الدم (BLOOD PLASMA)
۲ کریات دمویہ (BLOOD CELLS)

مصل الدم یہ خون کا 55% اور کریات دمویہ یہ 45% حصہ ہوتے
ہیں۔ خون کی اجزائے ترکیبی حسب ذیل ہے۔

الف خلیات دمویہ

۱۔ کریات حمرا۔ مردوں میں (♂) 5.4 million/cu. mm.
عورتوں میں (♀) 4.5 million/cu. mm.
۲۔ کریات بیضا (W.B.Cs) ان کی تعداد اوسطاً 6000-8000/cu mm
ہوتی ہے اور یہ مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔
۳۔ اقراص دمویہ (Blood Platelets) ان کی تعداد اوسطاً فی کل خون
250000 to 450,000/cu. mm کا ہوتی ہے۔

ب۔ مصل الدم (Blood Plasma) اس میں موجود اجزا حسب ذیل ہیں۔

۱۔ پانی WATER 91-92%
۲ جامد اجزا (SOLID) 8—9%
(i) (Inorganic Constituents) .9%
(ii) (Organic Constituents)
A لحمیات 7.5% جیسے
مواد بیضیہ مصلیہ (Serum Albumen) Gm. 4.7-5.7% of Blood
سیرم گلوبولین (Serum Globulin) Gm. 1.3-2.5% "
ام الجود (Fibrinogen) Gm .2-.4% "
مولد الیفین (Phothrombin) 20-39 mg%
B غیر لحمیاتی نائٹروجنی مادہ (Non Protein Intogenous Substances)
مادہ بولیہ Urea 25 mg%
مادہ بولیہ حامض Uric Acid 4 mg% Xanthine Hypoxanthine
کریٹین Creatine 1.2—1.5 mg%
کریٹینین Creatinine 1.5 mg%
امونیا امینو ایسڈ Ammonia Amino Acid
C خون کے شحمیات Fats 150-250 mg%
شحمیات غیر فعال Neutral Fats
Phospholipid (Lipid Phosphorus) 9.7 mg%
کولسترال Cholestrol 154 mg%
کولسٹرائڈس Cholesterides
D خون کی شکر (شکر انگوری) Glucose 85 mg%
E خون کے دیگر اجزا مثلاً مختلف قسم کے انزائم (Enzymes)
E مختلف قسم کے لونی اجزا۔ زنتھین (Xanthine) کیروٹین (Carotene)
Bilrubin 60—100 mg%

تولید شیر (LACTOGENESIS)

عمل تولید شیر ایک مخصوص قسم کے لبنی ہارمون پرولیکٹن کے ذریعے

انجام پاتا ہے جس کا افراز غدہ درقیہ (Pituitary Gland) کے مقدم حصے سے ہوتا ہے۔ بچے کی ولادت کے بعد خون میں اچانک اوسٹروجن اور پروجسٹران ہارمون کی مقدار کم ہوجاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں پرولیکٹن کا ترشح بڑھ جاتا ہے۔ کیوں کہ ان دونوں ہارمون کی مقدار پرولیکٹن ہارمون کے ترشح پر اثر انداز ہوتی ہے۔

پرولیکٹن خلیات غدہ لبن میں دُودھی رَوزمیں دودھ کی تولید کرنیکٹوز، لحمیات اور کیسین کے کثیر مقدار میں بننے کی تحریک کو شروع کردیتا ہے جس کے نتیجے میں پستان سے افراز شیر شروع ہوجاتا ہے۔ تولید شیر میں پرولیکٹن ہی مخصوص فعل انجام دیتا ہے۔ جب کہ سانحہ یہ ہے کہ اسے ابھی تک شیر مادر سے الگ نہیں کیا جاسکا ہے۔

عمل تولید شیر کے مختلف نظریات مندرجہ ذیل ہیں:

نظریۂ فولی (FOLLEY'S THEORY)

اس نظریے کے مطابق اوسٹروجن، عمل تولید شیر میں تحریک کا کام کرتا ہے، لیکن جب خون میں پروجسٹران کی مقدار بڑھ جاتی ہے تو یہ دونوں ہارمون مل کر مانع تولید شیر عمل شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح کا عمل عموماً دوران حمل میں ہوتا ہے۔ بعد ولادت پروجسٹران کی مقـ[دار] خون میں کم ہونے لگتی ہے۔ کیوں کہ پلیسنٹا کا تعلق دیوار رحم سے منقطع ہے۔ پلیسنٹا ہی پروجسٹران کا ترشح کرتا ہے جس سے مانع تولید شیـ[ـر] ختم ہوجاتا ہے اور اوسٹروجن کا مثبت تولید شیر اثر پرولیکٹن افراز میں معاون ہوجاتا ہے جس کے نتیجے میں عمل تولید شیر جا[ری] ہوجاتا ہے۔

نظریہ میٹ: (…IE TS THEORY)

اس نظریے کے مطابق بعد ولادت عمل[…] شیر دوران خون میں اور دوران حمل غدۂ لبن میں پرولیکٹن [کی] مقدار میں اضافہ اور پروجسٹران و اوسٹروجن کے مانع تولید[…] عمل کے باہمی فعل و انفعال کے نتیجے میں ہوتا ہے جو کہ اسے پرولیکٹن کے ترشح کے لائق بنادیتے ہیں۔

"وہ شخص گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ ریاضیاتی علوم کے انکار سے اسلام کا دفاع ہوتا ہے۔ کیوں کہ جو حقیقتیں نازل ہوئی ہیں ان میں سائنسوں کی نہ تو نفی ہے نہ اثبات اور نہ ان سائنسوں میں کوئی بات مذہب کی صداقتوں کے خلاف ہے۔"

امام غزالی

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۷۔ ش ۳ (مارچ ۸۸ء)

طاہر فاروقی

آفاق احمد عرفانی*

اکثر بین الاقوامی سطح پر مشہور و معروف اداروں کی ابتدا ایک نقطے سے ہوتی ہے مگر بے لوث کارکنان کی ایک جماعت اس کو ایک دائرہ بنا دیتی ہے آج کئی ایکڑ زمین پر پھیلی ہوئی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی بلند و بالا اور پرشکوہ عمارات کے تناظر میں اینگلو اورینٹل کالج ایک نقطہ کی سی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس نقطے کی تاریخی اہمیت کبھی کم نہیں ہوتی بلکہ ادارے کی ترقی کے ساتھ ساتھ بانیٔ ادارہ کی عزت لوگوں کے دلوں میں ترقی کے مراحل طے کرتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں سرسیدؒ کو سالانہ خراج عقیدت پیش کرنے کی ایک صالح اور مستحکم رسم پائی جاتی ہے۔

جامعہ اردو علی گڑھ کی شاندار عمارات، اس کا وسیع و عریض احاطہ، اس کے سبزہ زار، اس کے دفاتر نیز ہند اور بیرون ہند میں اس کے بے تعداد مراکز کن نیکوں کی تفسیر نہیں ہیں۔ ظاہر ہے یہ ادارہ بھی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا اس مقام تک آیا ہوگا۔ کائنات کی کوئی شے قانونِ ارتقاء کا استثناء نہیں بن سکی۔ ۱۹۳۹ء میں یہ ادارہ سرزمین اکبرآباد پر معرض وجود میں آیا۔ اس کے بانی پروفیسر مولانا محمد طاہر فاروقی مرحوم تھے۔ تاسیسِ جامعۂ اردو موصوف کا ایک ایسا کارنامہ ہے کہ جس کو محبان اردو کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔ ابھی ہندوستان میں اُدباء اور فضلاء کی ایک نسل موجود ہے کہ جو فاروقی صاحب اور ان کے عظیم الشان کارنامے سے بخوبی واقف ہے۔ البتہ موجودہ نسل کے صرف وہی لوگ ان کے اس کارنامے سے واقف ہوں گے کہ جن کے اذہان محققانہ اور طبیعتیں متجسسانہ ہیں۔ بدنصیبی یہ ہے کہ جامعہ کے دفاتر میں کوئی خارجی شہادت ایسی نہیں ملتی کہ جس کے ذریعے نو وارد کا بانیٔ جامعہ سے خاموش تعارف ہو جائے۔ جامعہ اردو درحقیقت گلبنِ تولائے اقبال کی ایک شاداب گل پوش شاخ ہے کیوں کہ یہ ادارہ بزم اقبال کا ایک ذیلی ادارہ ہے۔ اس اجمال کی تفصیل اس طرح ہے کہ فاروقی صاحب علامہ اقبالؒ سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ علامہ کی وفات (۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء) کے تقریباً ایک ماہ بعد یعنی مئی ۱۹۳۸ء میں اقبال دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے مولانا طاہر فاروقی نے آگرہ میں بزم اقبال قائم کی، جس کے قیام کا مقصد اقبال کی بلا واسطہ اور بالواسطہ ترقی و ترویج کے علاوہ اقبال کے کلام کی افہام و تفہیم اور ان کے پیغام کی اشاعت تھا۔ بزم اقبال نامی کتاب۔ بزم اقبال میں پڑھے گئے مقالات کا انتخاب۔ آگرے کے ایک اشاعتی ادارے شا اینڈ کمپنی نے بڑے تزک و اہتمام سے شائع کی تھی جو اس زمانے میں ہاتھ ہاتھ فروخت ہوئی مگر اب ناپید ہے۔ ۱۹۳۹ء میں بزم اقبال کے ایک تاریخی جلسے میں اراکین بزم اقبال نے مولانا طاہر فاروقی کو جامعہ اردو کا پہلا اعزازی رجسٹرار مقرر کیا۔ جامعہ اردو کا خاکہ بھی موصوف کے تعمیر پسند اور صالح ذہن کا مرہون منت ہے۔ اس لیے ایماندار اہل نظران کو جامعۂ اردو کا مؤسس رجسٹرار تسلیم کرتے ہیں۔ اگست ۱۹۴۴ء سے اپریل ۱۹۴۸ء تک فاروقی صاحب آگرہ کالج کے شعبۂ فارسی اور شعبۂ اردو کے صدر رہے۔ ان کے جذبۂ خلوص اور اس ادارے کی افادیت کے پیش نظر ملک کی سربرآوردہ شخصیتیں اس سے وابستہ ہوئیں۔ فاروقی صاحب ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۸ء تک اس جوبچال بچے کو اپنا خونِ جگر پلاتے رہے۔ ایک مرتبہ امتحانات جامعہ سے متعلق آئے ہوئے دوسو خطوط کے جوابات انہوں نے بہ یک نشست لکھے تھے۔ وہ زمانہ ہر لحاظ سے انتہائی پُرآشوب تھا۔ اسی زمانے میں دوسری جنگِ عظیم شروع

* استاد سٹی ہائی اسکول - اے۔ایم۔یو۔ علی گڑھ

بھی ہوئی اور ختم بھی۔ گو ہندوستان اس جنگ میں براہِ راست ملوث نہیں ہوا تھا تاہم اس کی سرحدوں تک تو جنگ آ ہی گئی تھی۔ ملک کی فضا میں بارود کی بُو بہرحال تھی۔

گاندھی جی کی 'ہندوستان چھوڑو تحریک' کو انگریز اپنے تابوت کی آخری کیل سمجھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے بربریت اور استبدادیت سے اس عوامی تحریک کو دبانا چاہا مگر تحریک دبی نہیں۔ سرفروشانِ ہند کا خون رنگ لایا اور ہندوستان آزاد ہوگیا۔ اس دورِ انتشار میں بھی فاروقی صاحب اس بنت برج بانو (جامعہ اردو) کے توسط سے اردو کی خدمت کرتے رہے یہ زمانہ گرم ہواؤں کا تھا۔ اس لیے فاروقی صاحب اس کی زلف ژولیدہ کی مشاطگی بھی کرتے رہے اور شباب کی دہلیز پہ قدم رکھنے والی اس الھڑسی دوشیزہ کو بوالہوسوں کی زہر آلود اور پُرفتن نظروں سے بچاتے بھی رہے۔ آخر کار وہ وقت آ ہی گیا جس کی پرچھائیاں بہت پہلے سے پڑنی شروع ہوگئی تھیں۔ انتہائی نامساعد حالات کے تحت فاروقی صاحب نے اپریل ۱۹۴۸ء میں پاکستان جانے کا تکلیف دہ مگر ناگزیر فیصلہ کیا چنانچہ مرحوم رشید صاحب کے توسط سے بنت برج بانو کا ہاتھ مرحوم ظہیر الدین علوی صاحب کے مضبوط ہاتھوں میں دیا گیا اور وہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے متعلق ہوکر جب آگرہ سے جانے لگے تو لوگوں نے اُن کو بچشم نم اور بہ آہ سرد الوداع کیا۔ جب فاروقی صاحب اپنے مخلص دیرینہ دوست پنڈت تیواری (صدر شعبۂ ہندی آگرہ کالج) سے رخصت ہوئے تو دونوں کی حالت غیر ہوگئی۔ چنانچہ امڈتے ہوئے آنسوؤں کو سردو کا اذنِ واپسی اور اس حکم کے خلاف آنسوؤں کی بغاوت دیدنی تھی اِن آنسوؤں نے سرزمینِ تاج پر قومی یک جہتی کا جو محل بنایا تھا وہ بفضلہٖ آج بھی قائم ہے۔ آگرہ والے اس معاملے میں خوش نصیب ہیں۔

موصوف کے ڈھاکہ چلے جانے کے بعد علامہ سید محمد علی شاہ صاحب میکش اکبرآبادی، سید معظم علی شاہ اور مغیث الدین فریدی جامعہ اردو کی بے لوث خدمت کرتے رہے۔ بعدہ مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب صدر جمہوریہ ہند اور مرحوم رشید احمد صدیقی صاحب سے گفت و شنید کے بعد جامعہ اردو کو علی گڑھ منتقل کیا گیا اور ظہیر الدین علوی صاحب مرحوم اس کے رجسٹرار مقرر کیے گئے۔ اگر اس عبوری دور میں جامعہ اردو تغافل کا بد انتظامی کا شکار ہو جاتی تو جامعہ اردو اسی زمانہ میں اپنی موت آپ مرگئی ہوتی جامعہ اردو کے رجسٹرار ثانی مرحوم سید ظہیر الدین علوی کی مخلصانہ اور بے لوث مساعی جمیلہ سے جامعہ اردو ایک بین الاقوامی ادارہ بن گیا۔ اس تناظر میں مرحوم کو جامعۂ اردو کا موسسِ ثانی کہنا یقیناً اُن کو حق پر مبنی خراجِ عقیدت پیش کرنے کے مترادف ہے۔ جامعہ اردو کی یہ خوش قسمتی رہی ہے کہ اس کو بے لوث ایمان دار اور ذی حیثیت اور علم دوست رجسٹرار ملتے رہے۔ سید احمد علی شاہ صاحب، مرحوم عظیم الحق جنیدی صاحب اور رعثمانی صاحب نے اپنے تجربات حسنِ انتظام، اصابتِ رائے اور دیانت داری سے جامعہ اردو کی ترقی میں جو خاموش رول ادا کیا ہے اس کا اعتراف جامعۂ اردو کے ہر بہی خواہ کو ہے جامعہ اردو کے موجودہ اربابِ حل و عقد بھی نہایت مخلصانہ اور عادلانہ انداز سے مولانا طاہر فاروقی صاحب مرحوم ومغفور کے تاسیس کردہ ادارے کی ترقی میں شب و روز کوشاں ہیں۔ غیر مناسب نہیں ہوگا اگر عوام کی معلومات کے لیے موسس جامعہ اردو کا ایک مجمل سوانحی خاکہ پیش کیا جائے۔ موصوف کی زندگی کے واقعات تحریر کرنا خاصا مشکل ہے۔ میں نے اس سلسلے میں فاروقی صاحب مرحوم کے جگری دوست حکیم سید مہدی الزماں صاحب، قادری صاحب اور وکیل حاجی سید قیام الدین شاہ صاحب سے قیمتی معلومات حاصل کیں نیز ان دونوں حضرات کے توسط سے ان کے احباب و شاگردان کی آرا بھی دیکھنے کا موقع ملا جن کو بعینہٖ تحریر کر دیا ہے۔

فاروقی صاحب ۱۳ ستمبر ۱۹۰۵ء کو بروز پنجشنبہ ریاست رامپور میں پیدا ہوئے مگر آبائی وطن بچھرایوں ضلع مرادآباد تھا۔ قیام کے لحاظ سے شرعاً و قانوناً وطن ثانی ۱۹۴۸ء تک آگرہ رہا۔ بعدہٗ پیشاور کو یہ شرف حاصل ہوا۔ ان کے والد ماجد مولوی محمد محسن فاروقی ۱۹۱۳ء سے ۱۹۳۰ء تک اسلامیہ کالج پیشاور میں عربی کے پروفیسر رہے۔ اس سے پہلے مشن کالج اندور میں بھی عربی کے پروفیسر رہ چکے تھے۔ ۱۹۱۶ء میں فاروقی صاحب کے برادران عم زاد عابد حسن فریدی اور حامد حسن قادری صاحب ہیڈ ماسٹر اور اردو ٹیچر کی حیثیت سے حلیم مسلم ہائی اسکول میں ملازم ہوئے۔ فاروقی صاحب کے والد نے ان کو مزید تعلیم کے لیے فریدی صاحب اور قادری صاحب کے سپرد کر دیا۔ یہاں انہوں نے مدرسۂ الٰہیات میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۹ء میں ان کا تقرر بھی حلیم مسلم اسکول میں بحیثیت اردو ٹیچر ہوگیا۔ کانپور میں

حضرت ثاقب ان کے ہم سبق ہونے کے علاوہ گہرے دوست بھی تھے۔ مولانا نے تقریباً دو سال کانپور میں گزارے۔ بعدہٗ والد صاحب ان کو اپنے ساتھ پشاور لے گئے۔ ۱۹۲۰ء میں مولوی کا امتحان فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن کے ساتھ پاس کیا۔ پشاور میں انھوں نے مولانا میمن عبدالعزیز پروفیسر ایڈورڈ کالج پشاور اور مولانا قطب شاہ عباسی ناظم دینیات اسلامیہ کالج پشاور کے سامنے زانوئے ادب تہ کیے۔ مولانا عبدالعزیز میمن صاحب عربی ادب کے ان جلیل القدر اکابرین میں سے تھے جن کو عالم عرب میں مستند مانا جاتا تھا بعینہٖ یہی مرتبہ آج کل قبلہ علی میاں کو بھی حاصل ہے۔ عابد حسن فریدی صاحب کا ۱۹۲۰ء میں سینٹ جانسن کالج آگرہ میں فارسی کے پروفیسر کی حیثیت سے تقرر ہوا فاروقی صاحب کے والد نے ۱۹۲۲ء میں ان کو پھر فریدی صاحب کی نگرانی میں مزید حصول علم کے آگرہ بھیج دیا۔ یہاں وہ مدرسۂ عالیہ میں داخل ہوئے اور مولانا سعادت اللہ صاحب، مولانا حبیب اللہ خاں صاحب اور مولانا فضل کریم بہاری سے مستفیض ہوئے۔ درسِ نظامیہ کی تکمیل کے بعد دورۂ حدیث شریف بھی یہیں ہوا۔ بعدہٗ ان کی دستار بندی ہوئی اور عبا بھی ملی۔ ۱۹۳۲ء میں مولانا نے آگرہ یونیورسٹی سے صرف انگریزی میں بی۔ اے کیا۔ اسی سال یعنی ۱۹۳۲ء میں ان کی شادی حضرت مولانا مفتی سعادت اللہ صاحب کی چھوٹی صاحبزادی سے ہوئی۔ اللہ نے ان کو پانچ لڑکے اور تین لڑکیاں عنایت فرمائیں۔ ۱۹۳۴ء میں فارسی اور پھر اردو میں ایم۔ اے کیا۔ ان دونوں امتحانات میں فاروقی صاحب نے اتنے نمبر حاصل کیے کہ تادم تحریر ان کا قائم کردہ ریکارڈ برقرار ہے۔ ۱۲ر اگست ۱۹۳۴ء میں فاروقی صاحب کا تقرر بحیثیت پروفیسر فارسی و صدر شعبۂ اردو، آگرہ کالج آگرہ میں ہوا۔ اور آخر اپریل ۱۹۴۸ء تک وہ یہیں رہے۔ مئی ۱۹۴۸ء میں ان کا تقرر ڈھاکہ یونیورسٹی میں ہو گیا۔ پرنسپل آگرہ کالج ڈاکٹر مہتہ اور پنڈت تیواری (فاروقی صاحب کے محبِ خاص) صدر شعبہ ان کو کسی قیمت پر چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ مگر اس زمانے کے حالات اور ان کے مستقبل کے خاطر یہ حضرات خاموش ہو گئے۔ فاروقی صاحب کو ڈھاکہ کی آب و ہوا موافق نہیں آئی۔ اس لیے انھوں نے اپنے خاندان کو وہاں بلانا مناسب نہیں سمجھا۔ ان کی اہلیہ اپنی بڑی ہمشیرہ کے پاس پشاور چلی گئیں جہاں ان کے بڑے بہنوئی مولانا عبدالحمید کا ذاتی مکان تھا۔ علمی و ادبی اعتبار سے وہ پشاور کی ایک قدآور شخصیت تھے۔ فاروقی صاحب گرمیوں کی چھٹیوں میں پشاور آئے تو پھر وہ ڈھاکہ نہیں گئے بلکہ ان کا استعفیٰ وہاں گیا۔ عندلیب شادانی صدر شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی ان کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے مگر خرابی صحت کے عذر نے ان کو خاموش کر دیا۔ ڈاکٹر عبداللہ پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور نے فاروقی صاحب کا تقرر اپنے کالج میں کر دیا۔ فاروقی صاحب کو پشاور زیادہ پسند تھا۔ چنانچہ کچھ عرصے کے بعد اسلامیہ کالج پشاور میں آگئے۔ بعدہٗ پشاور یونیورسٹی میں پروفیسر، صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۶۰ء میں وہ ترکی گئے اور وہاں انقرہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی تاسیس کی اور اس کے سربراہ کی حیثیت سے ایک عرصے تک کام کرتے رہے۔ ترکی سے آپ حج کرنے بھی گئے ترکی زبان پر بھی خاصی دسترس حاصل کر لی تھی۔ ۱۹۷۱ء میں وہ ترکی سے واپس پشاور آ گئے اور تقریباً گوشہ گیر ہو گئے۔ ذیابیطس اور فشار الدم (بلڈ پریشر) کے باوجود تصنیف و تالیف کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ انجام کار ۱۹۷۸ء میں علم و ادب کا یہ مہر درخشاں ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ شمیم صہبائی کے ایک خوبصورت مصرع سے ان کی تاریخ وفات ۱۹۷۸ء نکلتی ہے۔

مصرع   حاضر بزم جناں طاہر ہوئے۔

پینتالیس سالہ تدریسی زندگی میں وہ اپنے حسنِ عمل، حسنِ اخلاق اور حسنِ کردار کی وجہ سے بلند ترین مدارج پر فائز ہوتے رہے۔ ایثار اور خلوص سے وہ لوگوں کا دل جیتتے رہے، خود پیچھے ہٹتے رہے اور دوسروں کو آگے بڑھاتے رہے۔ وہ نرم دل اور گرم جوش تھے۔ وہ ایسے شخص تھے کہ جن کے بارے میں ماہر نفسیات کو احساسِ کمتری اور احساسِ برتری کی اصطلاحات استعمال کرتے وقت سو بار سوچنا پڑتا۔ علمی و ادبی مقام و مرتبے کے زعم میں مبتلا شخصیتوں کی طرح انھوں نے اپنے اوپر غیر ضروری اور ساختہ ثقاہت کو کبھی طاری نہ ہونے دیا۔ وہ مرنجاں و مرنج قسم کے مجلسی انسان تھے۔ اس لیے ان کو زرہ پوشی کی کبھی ضرورت نہیں ہوئی۔ فاروقی صاحب طلباء کی دل جوئی اور حوصلہ افزائی کے لیے بھی مشہور تھے۔ وہ اپنے معاصرین کی اہمیت کا دل کھول کر اعتراف کرتے تھے۔ وہ ان میں سے نہ تھے کہ جو تعریف و تحسین کے معاملے میں دوسروں کے لیے بخیل اور اپنے لیے سخی ہوتے ہیں۔ ان کو خدا نے ہر جگہ قابلِ رشک عزت عطا فرمائی۔ اس لیے کبھی ان کو عظمت کا منارہ تعمیر کرنے کے لیے چندہ اکٹھا نہیں کرنا پڑا۔

زندہ دلی اور خوش باشی کے باوصف ان کے مزاج میں شعلہ و شبنم کا امتزاج تھا۔ دوران تدریس ان کی شان ہی نرالی ہوتی تھی۔ وہ پڑھاتے تھے کہ جادو جگاتے تھے میں آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکا۔ زیر تدریس شاعر یا نثر نگار طلبا کے اس قدر قریب آجاتا تھا کہ دونوں کی سانسیں ٹکرانے لگتی تھیں۔ ان کی تدریس میں تحقیق، تدقیق، تخلیق، تخیل، تعمیر، تنقید اور تاکید سبھی کچھ ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ان کو شدید غصہ بھی آجاتا تھا۔ ان کے ایک دوست نے مزاحاً اس کیفیت کو اس طرح بیان کیا ہے:

"جب ان پر جبروتی عالم طاری ہوتا تھا تو وہ زیر عتاب شخص
کا اپنی اردوئے معلیٰ سے "عرس" کر دیتے تھے۔"

میرے نزدیک مشفق و مربی استاد کا عتاب ایک منافق اور ریاکار انسان کے شکر خندے سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے۔ مجھے بھی فاروقی صاحب کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے اسی زمانے میں (۱۹۴۶ء) استاذی محمد علی نقوی صاحب کا تقرر بحیثیت لکچرر اردو آگرہ کالج میں ہوا تھا۔ ایک مختصر سی مدت کے لیے خواجہ احمد فاروقی صاحب بھی بحیثیت لکچرر آگرہ کالج سے متعلق رہے مگر قدرت کو ان سے خدمت تم لینی کہیں اور منظور تھی۔ چنانچہ آل محتشم کی جولانگاہ دہلی یونیورسٹی بنی۔

بظاہر فاروقی صاحب مجھ پہ مہربان تھے مگر طلبا میں ڈاکٹر مغیث الدین فریدی (شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی) سے زیادہ اُن کے قریب میں نے کسی اور کو نہیں دیکھا۔

یاد اوصافِ ان محترم مہربان
در دلِ دوستاں داستاں داستاں

علم و ادب کے میدان میں فاروقی صاحب کے کارہائے نمایاں کے ذکر کے بغیر یہ سوانحی خاکہ قابل اعتنا تصور نہیں کیا جائے گا۔ اس لیے مختصراً ہی عرض کرنا ہے۔ مبادا تفصیل خاکے کو مطول کر دے۔

فاروقی صاحب دینیات، نصابیات، اقبالیات اور لسانیات میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ وہ تقریباً ۴۳ کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی معرکۃ الآرا تصنیف "سیرت اقبال" ہے جس کے اب تک پانچ ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں۔ فاروقی صاحب اور علامہ اقبال کے بڑے خصوصی تعلقات تھے۔ وہ علامہ اقبال کے ساتھ ایران جانے والے تھے مگر علامہ کی بیماری کی وجہ سے یہ ارادہ عملی جامہ نہ پہن سکا۔ اقبالیات کی بنیادی اور حوالہ جاتی کتابوں میں سیرت اقبال نہایت معتبر تسلیم کی جاتی ہے

علامہ اقبال کے فکری اور فنی ارتقا کے ساتھ ان کے فن کی تحسین اور فکر کی تفہیم ایک ضرورت بن گئی تھی۔ اس طرح اقبال شناسی کی وہ روایت قائم ہوئی جس نے آگے چل کر اردو ادب کے ایک نئے شعبے کی حیثیت حاصل کر لی۔ اقبال شناسی کے پہلے دور کے حدود ۱۹۲۸ء تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس دور میں مطالعۂ اقبال کی سنجیدہ کوششیں باقاعدہ تصانیف اور بعض رسائل کے اقبال نمبر کی شکل میں نظر آتی ہیں جن میں نواب ذوالفقار علی خاں کی تصنیف بزبان انگریزی "A VOICE OF THE EAST" مولوی احمد دین صاحب کی تصنیف 'اقبال'، اور شیخ اکبر علی صاحب کی تصنیف IQBAL, His Poetry & Message علی الترتیب ۱۹۲۲ء، ۱۹۲۶ء اور ۱۹۳۴ء میں شایع ہوئیں۔ ستمبر و اکتوبر ۱۹۳۲ء کا نیرنگ خیال لاہور اقبال کی زندگی میں شایع ہونے والا انتہائی معتبر اور معروف اقبال نمبر ہے۔ علامہ کے انتقال کے بعد اقبال شناسی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اس زمانے میں سہ ماہی اردو علی گڑھ میگزین اور جوہر (جامعہ ملیہ) جیسے وقیع رسایل کے اقبال نمبر شایع ہوئے۔ اس دور میں اقبالیات کے سلسلے کی پہلی باقاعدہ تصنیف فاروقی صاحب کی سیرت اقبال ہے۔ سلسلۂ اقبالیات کی دوسری اہم اور وقیع کتابیں مثلاً روح اقبال (۱۹۴۲ء) اقبال نئی تشکیل (۱۹۴۷ء)، اقبال کامل (۱۹۴۸ء) ذکر اقبال (۱۹۵۵ء) فکر اقبال (۱۹۵۹ء) اور شعر اقبال (۱۹۶۴ء) سیرت اقبال کے بعد منظر عام پر آئیں۔ پروفیسر حمید احمد خاں سیرت اقبال کے دیباچے میں فرماتے ہیں:

"پوری کتاب پڑھ کر فاروقی صاحب کی فہم سلیم اور کمال انشا، دونوں سے، میں یکساں متاثر ہوا ہوں۔ مصنف نے کوئی بات مدعیانہ انداز میں بلا حجت و دلیل پیش نہیں کی ہے۔ پوری کتاب کا انداز علمی اور استقرائی ہے۔ ہر بیان کے لیے خود علامہ اقبال کے کلام سے استشہاد کیا گیا ہے۔"

سیرت اقبال کا پہلا ایڈیشن نعیم صاحب مالک قومی کتب خانہ لاہور نے جنوری ۱۹۳۹ء میں شائع کیا۔ سیرت اقبال کے علاوہ فاروقی صاحب کی جو کتابیں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں وہ یہ ہیں:

نثر نگاری کا فن۔ اقبال کے افکار۔

فصاحت و بلاغت (علم بیان اور علم بدیع پر ایک لاجواب کتاب)

مختصر تاریخ ادب فارسی،

سرکار دو عالم،

اقبال اور محبت رسول۔

سیرت امیر ملت سید جماعت علی صاحب،

محدث علی پوری (جو سات سو پچاس صفحات پر محیط ہے)

فاروقی صاحب ایک عرصے تک اردو لغت بورڈ کے ممبر رہے۔ ان کو بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ساتھ ادبی کام کرنے کا شرف بھی حاصل رہا۔

پاکستان رائٹرز گلڈ نے ان کو کئی بار آدم جی انعام اور داؤد جی ادبی انعام کے لیے جج مقرر کیا۔ اپنی ہیچ مدانی اور بے بضاعتی کی بنا پر میں فاروقی صاحب کی عالمانہ شخصیت کے تمام پہلوؤں کو اجاگر نہ کر سکا۔ تاہم میرے لیے یہ بھی ایک بڑی سعادت ہے کہ اس سوانحی خاکے کے توسط سے اردو داں طبقے کی نئی نسل ایک نابغۂ روزگار شخصیت سے متعارف ہو سکی۔

جامعہ اردو کے ارباب حل و عقد یوم بانی جامعہ اردو منا کر اس روایات و اقدار کے شہر میں ایک صالح روایت کا اضافہ کر سکتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جس کے دل میں رائی برابر بھی تکبر ہے، اسے اللہ منہ کے بل جہنم میں گرا دے گا۔ [احمد]

آپس میں ایک دوسرے کو ہدیہ کیا کرو، اس لیے کہ ہدیہ سینے کے حسد کو ختم کر دیتا ہے۔ (ترمذی)

وہ مسلمان جو لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہتا ہے اور ان کی ایذا رسانیوں پر صبر کرتا ہے، اس مسلمان سے بہتر ہے جو لوگوں سے نہیں ملتا اور ان کی ایذا رسانیوں پر صبر نہیں کرتا۔ (ترمذی)

آدمی اپنے دوست کے مذہب پر ہوتا ہے۔ اس لیے آدمی کو دیکھ لینا چاہیے کہ وہ کس سے دوستی کر رہا ہے (ابوداؤد)

یو-پی کے پچہتر مسلم جونیئر ہائی اسکولوں میں بورڈ ۱۹۸۷ء میں

ہزار سے زیادہ فرسٹ ڈویژن

احمد رشید شیروانی

اتر پردیش کے پچاس مسلم جونیئر ہائی اسکولوں کے نتائج پہلے پیش کیے جاچکے ہیں پہلے پچیس سے چھیالیس فیصد بچے فرسٹ ڈویژن لائے تھے۔ دوسرے پچیس سے انتالیس فیصد۔ تیسرے پچیس کے نتائج چارٹ میں ملاحظہ فرمایے۔ ان سے ملاکر آٹھ سو ستر بچے بورڈ امتحان میں شریک ہوئے اور ان میں سے دو سو تراسی یعنی تینتیس فیصد فرسٹ ڈویژن لائے۔

جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جاچکا ہے پاس فیصد کی زیادہ اہمیت نہیں کیونکہ اوسطاً قریب بچانوے فیصد بچے بورڈ امتحان میں مسلم جونیئر ہائی اسکولوں سے پاس ہوئے ہیں۔ تمام پچہتر اسکولوں سے ملاکر دو ہزار پانچ سو پچاسی بچے بورڈ امتحان میں شریک ہوئے، ان میں سے دو ہزار چار سو باسٹھ یعنی بچانوے فیصد پاس ہوئے اور ایک ہزار دس یعنی انتالیس فیصد فرسٹ ڈویژن لائے۔

ایک (ظفر میموریل گرلز جونیئر ہائی اسکول سیتاپور) سے سو فیصد فرسٹ ڈویژن۔ پھر پانچ سے نوے فیصد سے لے کر سو فیصد تک فرسٹ ڈویژن۔ پھر چھ سے اسی فیصد سے لے کر نواسی فیصد تک۔ پھر سات سے ستر فیصد سے لے کر اناسی فیصد تک۔ پھر سات سے ساٹھ فیصد سے لے کر انہتر فیصد تک اور پھر پانچ سے ۵۰ فیصد سے لے کر انسٹھ فیصد تک فرسٹ ڈویژن۔ یعنی پچہتر میں سے اکتیس اسکولوں سے آدھے سے زیادہ بچے فرسٹ ڈویژن لائے۔

پھر گیارہ اسکولوں سے تینتیس فیصد سے لے کر انچاس فیصد تک بچے فرسٹ ڈویژن لائے۔ یعنی بیالیس اسکول ایسے ہیں جہاں فرسٹ ڈویژن کا تناسب ایک تہائی سے زیادہ ہے۔ اور دس اسکول ایسے بھی ہیں جہاں فرسٹ ڈویژن صفر۔

بہرحال اس مختصر عبوری رپورٹ میں صرف چند حقائق پیش کر دیے۔ ان پچہتر کے علاوہ ہمارے پاس دس مزید اداروں کے رزلٹ آچکے ہیں۔ مزید پندرہ نتائج کا انتظار ہے۔ تاکہ سو پورے ہوجائیں۔ اس کے بعد ہم ان سو اسکولوں میں مسلم لڑکوں اور مسلم لڑکیوں کے نتائج کا موازنہ اور مسلم بچوں کے نتائج کا موازنہ غیر مسلم بچوں کے نتائج سے کریں گے۔ یو-پی کے جن مسلم جونیئر ہائی اسکولوں کے ہیڈ صاحبان یا صاحباؤں نے ابھی تک ۱۹۸۷ کے نتائج نہیں بھیجے ہیں وہ اب جلد بھیج دیں۔ نوازش ہوگی۔

احمد رشید شیروانی — A.R. Sherwani
۱۲-اے کناٹ پلیس — 12-A Connaught Place,
نئی دہلی — New Delhi 110001.

یو-پی کے پچہتر جونیئر ہائی اسکولوں کے نتائج ۱۹۸۷ء

شریک	پاس	فرسٹ	سکنڈ	تھرڈ	جونیئر ہائی اسکول کا نام ومقام وضلع	فرسٹ فیصد
۱۲	۱۲	۱۱	۱	-	نور حق۔ مبارک پور۔ فیض آباد	بانوے
۸	۸	۷	۱	-	قاسمیہ عربیہ۔ بلند شہر	اٹھاسی

شرکت	پاس	فرسٹ	سکنڈ	تھرڈ	جی نیر ہائی اسکول کا نام و مقام و ضلع	فرسٹ فیصد
۶	۶	۵	۱		انجمن اسلامیہ گرلز - ہلدوانی - نینی تال	تراسی
۲۴	۲۴	۱۹	۵	—	محمدیہ نبکر کانپور	اناسی
۳۴	۳۴	۲۶	۸	—	جنت نشاں بریلی	چھہتر
۲۱	۲۱	۱۵	۶	—	جامع العلوم - کھاتولی مظفرنگر	اکہتر
۳۹	۳۹	۲۵	۱۴	—	عاصم بہاری گرلز مرادآباد	چونسٹھ
۱۱	۱۱	۷	۴	—	مسلم تمبور سیتاپور	چونسٹھ
۴۱	۳۹	۲۶	۱۳	—	مسلم رحمانیہ راجہ کا تاج پور بجنور	ترسٹھ
۵۲	۵۲	۳۱	۲۱	—	اسلامیہ - درگا گنج پرتاب گڑھ	ساٹھ
۳۲	۳۲	۱۸	۱۴	—	سید بدیع الدین بشن پور ٹٹنوا - گونڈہ	چھپن
۱۶	۱۶	۸	۸	—	زیب النساء گرلز بلتھرا روڈ بلیا	پچاس
۳۸	۳۸	۱۶	۲۲	—	مسلم گرلز مرادآباد	بیالیس
۳۸	۳۸	۱۴	۲۴	—	مسلم گرلز بجنور	سینتیس
۳۰	۳۰	۱۰	۲۰	—	جنت نشاں گرلز مرادآباد	تینتیس
۳۸	۲۹	۸	۲۰	۱	نشاط - سرائے ترین سنبھل - مرادآباد	اکیس
۲۸	۲۸	۵	۲۳	—	مرکزی درس گاہ اسلامی - رام پور	اٹھارہ
۵۷	۵۴	۱۰	۴۴	—	بنات القریش گرلز مرادآباد	اٹھارہ
۹۳	۹۳	۱۶	۷۷	—	لوائز - صلاح پور الہ آباد	سترہ
۳۵	۳۳	۳	۳۰	—	سوتنتر سلمانیہ آدرش - اتراسی کلاں - مرادآباد	نو
۲۸	۲۷	۱	۲۵	۱	سینئر بیسک - سرائے ترین سنبھل مرادآباد	چار
۴۴	۴۲	۲	۳۷	۳	راحت مولائی گرلز مرادآباد	دو
۱۶	۱۶	—	۱۵	۱	مونس مسلم گرلز مرادآباد	صفر
۱۵	۱۴	—	۱۴	—	مسلم راجپوت صلابت نگر بلندشہر	صفر
۱۱۴	۱۱۲	—	۱۰۵	۷	فلاح دارین مرادآباد	صفر
۸۸۰	۸۴۸	۲۸۳	۵۵۲	۱۳	اوپر کے پچیس کا ٹوٹل	تینتیس
۱۶۱۵	۱۶۱۴	۷۲۷	۸۳۷	۵۰	پہلے پچاس کا ٹوٹل	بیالیس
۲۵۸۵	۲۴۶۲	۱۰۱۰	۱۳۸۹	۶۳	تمام پچہتر کا ٹوٹل	انتالیس

قومی ترقی

امتیاز احمد*

عالمی سطح پر مسلمان جس پستی، ذلت، رسوائی و بدنامی کے خارزار میں کھڑے ہیں، اس کا احساس اب خود مسلمانوں کو ہونے لگا ہے اس احساس ہی کی وجہ سے اب یہ امید ہو چلی ہے کہ شاید ایک ملت کی حیثیت سے مسلمان اپنی ان تمام کمیوں، خامیوں اور کجیوں کو دور کرنے میں دیر سویر کامیاب ہو جائیں جن کی وجہ سے وہ موجودہ صورت حال سے دوچار ہیں۔

اس وقت اس بات کی ضرورت ہے کہ ان عوامل کا بار بار تذکرہ کیا جائے جن کی وجہ سے مسلمان قعر مذلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کچھ حضرات اس پر معترض ہوں کہ اس طرح کی باتوں سے ہماری ملت میں مزید پستی پیدا ہوگی لیکن ہمارے نزدیک یہ بات درست نہیں ہے ہم ان عوامل کا ذکر کر کے اپنی ملت کے درد مند افراد کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ ماضی کی غلطیوں سے درس عبرت حاصل کیا جائے اور اسی کی روشنی میں مستقبل کی طرف مردانہ وار گامزن ہوا جائے۔

اقبالؔ نے کہا تھا ؎

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

یہ مصرع بہت مشہور ہے اور اس کی مختلف زاویوں سے تفہیم و تشریح ہو چکی ہے لیکن بہت حد تک آج بھی ہم نے اس کے غلط ہی معنی سمجھ رکھے ہیں۔ شجر سے پیوستہ رہنے کے یہ معنی بالکل نہیں ہیں کہ ہم اپنی ساری صلاحیتیں ماضی پرستی اور اسلاف کے کارناموں پر حاشیہ آرائی کرنے میں صرف کردیں۔ جو قومیں ایسا کرتی ہیں وہ تباہ ہو جاتی ہیں۔ ہم نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس لیے تباہ ہو گئے اور اگر پھر ایسا ہی کیا تو حرف غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹا دیے جائیں گے۔ لہٰذا پہلا کام جو قومی ترقی کے لیے ہمیں کرنا چاہیے وہ ہے ماضی کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے اسلاف کے کارناموں کی روشنی میں اپنی تعمیری قوت کے ذریعے تسخیر فطرت کی کوشش۔

۲۔ کسی قوم کی تباہی کا دوسرا سبب وقت ناوقت فریاد کرنا آہیں بھرنا، حرف شکایت زبان پر لانا اور اپنے حال زار پر پیہم ترس کھانا ہوتا ہے۔ شکوہ وشکایت اور فریاد کرنے والا غیرت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ خود پر ترس کھانے والا ایک گھن لگا دینے والے اخلاقی مرض میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ جو قوم گلہ مندی کی خوگر ہو جاتی ہے، حوصلے کی راہیں اس پر بند ہو جاتی ہیں، ولولہ اس سے کترا کر نکل جاتا ہے اور عمل کی قوت شل ہو جاتی ہے اور اس میں جینے کی لگن باقی نہیں رہتی اور وہ سسک سسک کر مر جاتی ہے۔ لہٰذا قومی ترقی کے لیے ہمیں جو دوسرا کام کرنا ہے، وہ شکوہ وشکایت اور آہ و فریاد کا خاتمہ ہے۔

۳۔ تیسرا سبب جو قومی ترقی میں آڑے آتا ہے وہ ہے زبان کا چٹخارہ۔ جو قوم زبان کے چٹخارے پر جان دینے لگتی ہے وہ دراصل جان کھو بیٹھتی ہے۔ زبان کا چلنا زندگی کی علامت ہے مگر زندگی سے عبارت نہیں۔ جو لوگ باتیں بنانے کے عادی ہو جاتے ہیں ان کے اندر کام کرنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ باتیں بنانے سے کام بگڑتے ہیں بنتے نہیں۔ زیادہ باتیں کرنے والے لوگ بہت سی باتیں غلط کہہ جاتے ہیں۔ اپنی بات کا پاس نہیں رکھتے۔ اپنے عہد کو پورا نہیں کرتے اور قول کو

* ۲۷۔ میرس ہوسٹل، وقار الملک ہال، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

قول کا بدل سمجھنے لگتے ہیں۔ ان کی شخصیت مجروح ہو جاتی ہے اور اُن میں جواں مردی کا شائبہ تک باقی نہیں رہتا۔ لہذا قومی ترقی کے لیے جو تیسرا کام اہم ہے وہ قوم کے افراد میں گفتار کی بلندی کے بجائے کردار کی بلندی پیدا کرنا ہے۔

۴۔ چوتھا سبب جو نہ صرف اقوام و ملل کی ترقی کے راستے کا روڑا بنتا ہے بلکہ اُسے ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان، ناک تمام اعضا سے معذور کر کے سسک سسک کر دم توڑ دینے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ وہ ہے علوم و فنون سے وابستگی۔ جو قومیں علوم و فنون سے اپنا ناتہ توڑ لیتی ہیں اور جہالت کے حصار میں جا بیٹھتی ہیں وہ صفحۂ ہستی سے اس طرح نیست و نابود ہو جاتی ہیں جیسے آندھی خس و خاشاک اُڑا دیتی ہے۔ علم طاقت ہے، زندگی ہے۔ جہالت کمزوری ہے، فنا ہے۔ انسان کی تسخیرات اور قدرت پر اس کی بالادستی علم اور عقل کی بدولت ہے۔ لہذا چوتھا کام جو قومی ترقی کے لیے ضروری ہے وہ علوم و فنون سے وابستگی اور اُن میں مہارت و اختصاص حاصل کرنا ہے۔ یہی وہ ذریعہ ہے جس سے تسخیرات ستی کی زمام ہمارے ہاتھ میں آسکتی ہے۔

۵۔ کسی قوم کی تباہی و بربادی کا پانچواں سبب خود غرضی ہے۔ اگر خلوص، ربط باہم اور اشتراک مقاصد کی جگہ خود غرضی نے لی تو یوں سمجھیے کہ قوم فنا کے راستے کی بہت سی مشکلات سے نجات پا گئی۔ جو قومیں پکے ہوئے پھل کی طرح تیار ہیں (جس میں بدقسمتی سے ہماری قوم بھی شامل ہے) ٹٹولیے تو وہ افراد کی خود غرضی کی مرہون احسان ہیں۔ لہذا پانچواں کام جو قومی ترقی کے لیے ضروری ہے وہ قومی ہمدردی، خلوص، ربط باہم اور اشتراک مقاصد کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔

۶۔ چھٹی وجہ کسی قوم کی تباہی کی تکبر، انا اور نخوت ہے۔ ان سب کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں اور سب کی پرچھائیاں عقل و شعور پر پڑتی ہیں۔ نخوت کے نشے میں انسان اجتماعی فلاح کو فراموش کر دیتا ہے۔ نخوت جدھر جاتی ہے عداوت اور نفاق کے بیج بوتی ہے۔ کسی قوم میں نفاق اور انتشار برپا کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس کے کانوں میں تکبر کا منتر پھونک دیا جائے۔ پھر دیکھیے! انا گزیدہ لوگ پھنکارتے اور ڈستے چلے جائیں گے۔ لہذا چھٹا کام جو قومی ترقی کے لیے نہایت اہم ہے۔ وہ قوم کے افراد سے انا، تکبر اور نخوت کا خاتمہ ہے۔

۷۔ ساتواں سبب جو قومی ترقی میں آڑے آتا ہے وہ ہے حسد۔ انا، تکبر اور نخوت کی طرح اس سے بھی قوم کا شیرازہ منتشر ہو جاتا ہے اور پھر سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ حسد اچھائی کو پنپنے نہیں دیتا، برائی کو شہ دیتا ہے اور محبت، خلوص اور اشتراک کی قبا کو پارہ پارہ کر دیتا ہے۔ لہذا قومی ترقی کے لیے آٹھواں کام قوم سے حسد کے مادّے کو ختم کرنا ہے۔

۸۔ اقوام کی تباہی کا آٹھواں سبب سچے اور مخلص رہبر کی کمی ہے جس قوم میں خلوص اور رہبری ایک جگہ جمع نہ ہونے پائے اور اگر جمع ہو جائے تو ایسے رہنما کی بکا فضیحتی کرے۔ اس کی تحقیر اور تذلیل کے اتنے اسباب فراہم کر دے کہ خود اس کی جان پر بن آئے۔ یا تو اصلاح کا سودا اس کے سر سے نکل جائے یا جان تن سے۔ اس کی نیت پر شبہ کرے اور الزاموں کی بوچھار سے اس کی طمانیت کو برہم، اس کے عزائم کو متزلزل اور اس کے جذبۂ اصلاح کو مجروح کر دے۔ جو قوم صالح قیادت کو پنپنے نہیں دیتی اس کے لیے موت مقدر ہو جاتی ہے۔ لہذا قومی ترقی کے لیے آٹھواں کام صالح قیادت کی ترقی اور اس پر اعتماد ہے۔

۹۔ قومی ترقی کے لیے نویں ضرورت اداروں کو چلانے کی صلاحیت ہے۔ جب تک کوئی قوم اپنے اداروں کو ڈھنگ سے چلا سکتی ہے وہ نہیں مر سکتی۔ ادارے انفرادی برائیوں کی روک تھام کرتے ہیں اور اجتماعی ترقی کا انصرام۔ لہذا قومی ترقی کے لیے نواں کام قوم کے افراد میں اداروں کو صحیح ڈھنگ سے چلانے اور خدمات کے صحیح اعتراف کی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔

۱۰۔ کسی قوم کی تباہی کی دسویں وجہ اس کی ذہنی قوت کا فضولیات، توہمات، خرافات اور فروعات میں الجھنا ہے۔ ایک مرتبہ اگر قوم ان کی گرفت میں آ گئی تو ادراک اور بصیرت اس سے بہت دور ہو جاتی ہے اور اس کے افراد کو اس کا یارا ہی نہیں رہتا کہ قوم کو فنا سے بچائیں۔ لہذا قومی ترقی کے لیے دسواں کام قوم کو فضولیات توہمات، خرافات اور فروعات میں الجھنے سے بچانا ہے۔

۱۱ گیارہواں سبب کسی قوم کی تباہی قوم کے ترقی یافتہ طبقہ کا پسماندہ طبقہ کے استحصال پر کمر بستہ ہوتا ہے۔ یہ طبقہ اپنی قوم کی نعش پر کھڑا ہو کر اپنے قد کو اونچا کرتا ہے اور اس کا نمائندہ بن کر اسے دھوکہ دیتا ہے۔ لہذا قومی ترقی کے لیے گیارہواں کام قوم کے ایسے افراد اور جماعتوں کا خاتمہ ہے جو اپنے مفاد کے لیے قوم کا استحصال کرتے ہیں۔

۱۲۔ بارہواں سبب کسی قوم کی تباہی کا؛ کاہلی، تن آسانی اور عیش وعشرت اور لہو ولعب میں پڑا رہنا ہے۔ جو قومیں منزل فنا کے لیے رختِ سفر باندھ لیتی ہیں۔ وہ محنت ومشقت اور حرکت و جدوجہد سے جی چرانے لگتی ہیں اور کاہلی، تن آسانی، عیش و عشرت اور لہو ولعب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتی ہیں۔ لہذا قومی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ قوم کے افراد میں محنت ومشقت اور حرکت و جدوجہد کا جذبہ پیدا کیا جائے۔

۱۳۔ تیرھویں وجہ کسی قوم کی تباہی و بربادی کی جذباتیت اور اندھی تقلید ہے۔ جو قومیں جذباتیت اور اندھی تقلید کو اپنا راہنما بناتی ہیں۔ تباہی و بربادی کے دہانے پر پہنچ جاتی ہیں۔ لہذا تیرھواں کام جو کسی قوم کی ترقی اور بقا کے لیے ضروری ہے وہ جذباتیت اور اندھی تقلید سے احتراز کرتے ہوئے عقلیت اور حقیقت پسندی کو اپنانا ہے۔

۱۴۔ چودھویں وجہ جو اقوام و ملل کی تباہی و بربادی میں ممد و معاون ہوتی ہے۔ وہ اس کا محدود اور منفی انداز فکر ہے۔ جو قومیں محدود اور منفی انداز فکر ونظر کی حامل ہوتی ہیں۔ انہیں ہر چیز اور ہر کام کا صرف منفی پہلو نظر آتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اپنی ترقی کے لیے کوئی مثبت قدم نہیں اٹھا پاتیں۔ لہذا چودھواں کام جو قومی ترقی اور بقا کے لیے ضروری ہے وہ قوم میں وسیع، آزادانہ اور مثبت اندازِ فکر ونظر کا خاتمہ کرنا ہے۔

یہ تھے وہ اسباب جو اقوام و ملل کے عروج و زوال کے ضامن ہوا کرتے ہیں اور جن سے قوموں کی تقدیریں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم اور آپ ان اسباب کی روشنی میں اپنی قوم کا سچائی اور حقیقت پسندی کے ساتھ جائزہ لیں۔ تاکہ ہم پر قوم کی حالت زار واضح ہو جائے اور پھر ہم قومی ترقی اور بقا کی کوششوں کے لیے کمر بستہ ہو جائیں۔

دوسری بات جو مجھے عرض کرنی ہے وہ یہ کہ ہم ایک قوم کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کی ایک بڑی اقلیت بھی ہیں۔ ایک اقلیت جو حقیر و ذلیل اور رسوا و بدنام ہے۔ لہذا یہ ایک پریشان کن بات ہے کہ ایک اقلیت کی حیثیت سے ہم باعزت زندگی کیسے گزار سکتے ہیں؟ اور کس طریقے کو اپنا کر ہم اپنی تحقیر و تذلیل اور رسوائی و بدنامی کو دور کر سکتے ہیں؟

کسی اقلیت کو باعزت زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے کہ:

۱۔ وہ اپنے صحیح مذہب پر پوری سچائی اور ایمان داری کے ساتھ عمل پیرا رہے۔
۲۔ اکثریت کے افراد کے ساتھ وہ اپنے تعلقات خوش گوار رکھے۔
۳۔ اس کے افراد اکثریت کے افراد کی بہ نسبت کم سے کم دوگنی محنت کریں۔

لہذا ہمیں ان ضروریات کو بھی پورا کرنا ہوگا تبھی ہم اپنے ملک میں ایک باعزت اور باوقار زندگی گزار سکیں گے۔

تیسری بات جو مجھے عرض کرنی ہے وہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ:

"کسی قوم کی تباہی کی دسویں وجہ اس کی ذہنی قوت کا فضولیات، توہمات، خرافات اور فروعات میں الجھنا ہوتا ہے۔"

اس لیے ضروری ہے کہ موجودہ دور میں اپنی قومی زندگی کے اصل مسائل و ضروریات سے واقفیت ہو۔ تاکہ فروعات اور ضروریات میں فرق کیا جائے۔ موجودہ دور میں ہماری قومی زندگی کے تین اہم مسایل ہیں جنہیں ضرورت کا درجہ حاصل ہے۔

۱۔ تعلیمی مسایل ۲۔ اقتصادی مسایل۔ ۳۔ سماجی مسایل

موجودہ دور میں ان مسایل کے علاوہ کسی مسئلے میں قوم کو الجھانا قوم کا استحصال کرنا ہے۔ ان مسایل کی روشنی میں ہی ہم اپنے صحیح رہنما کا انتخاب بھی کر سکتے ہیں۔ اپنی ترقی کی راہیں بھی متعین کر سکتے ہیں اور پھر مذکورہ اسباب کی روشنی میں اپنی کمزوریوں کو بھی دور کر سکتے ہیں۔

(یہ مقالہ جناب سید عامر صاحب کی کتابوں "کرب آگہی" اور "ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل" سے ماخوذ ہے)

نئے تعلیمی منصوبے (۱۰ + ۲ + ۳) میں
پرنسپل کا کردار

بدر الاسلام*

نئے تعلیمی منصوبے میں (اسکیم) ابتدا کے ہی باب ۴ میں ہی پرنسپل کا کردار (رول) بہت زیادہ اہم بتایا گیا ہے۔ یہاں تک کہ اگر اس پرنسپل کو اسکیم کی ریڑھ کی ہڈی کہا جائے تو درست ہوگا۔ چوں کہ + ۲ منزل کے طلباء بالعموم اور اس سے ہم رشتہ سکنڈری اسکول کے بالخصوص خام عمر کے ہوتے ہیں اور لوڑکے ہوتے ہیں۔ ان کی عادات، اطوار، جبلت، احساس اور جسم سب کچی کلیوں کی طرح ہوتے ہیں اس لیے ان پر غلط رنگ چڑھنے کا زیادہ امکان ہے۔ نیز یہ صورت حال تعلیمی ماحول و نصاب وادارہ یا یونیورسٹی کے رنگارنگ حالات، مشغولیات اور کوائف میں اپنے کو ضم کرنے کی صلاحیت پورے طور پر بالغ نہیں ہوتی اور ان سب کے اوپر نئے منصوبے میں + ۲ نیا نام ہی خود ان کچی عمر والے بچے / بچیوں کو پریشان کرنے کے لیے کافی ہے۔ اسی لیے پرنسپل جوان کا 'سرپرست' بھی ہے نئی تعلیمی پالیسی (اسکیم) اِن کی اہمیت بہت بڑھاتی ہے۔

نئی تعلیمی پالیسی کسی طرح بھی اس کی منظوری نہیں دیتی ہے کہ غیر تجربہ کار، کم عمر اور سخت مزاج لوگوں کا تقرر اِس نفسیاتی و تعلیمی اہم عہدے پر کیا جائے بلکہ وہی لوگ، تعلیمی پالیسی کا تقاضہ ہے، جو معقول، درمیانی مزاج کے ہوں۔ محض وہی لوگ جو اپنے پورے اسٹاف کو اپنے ہمراہ لے کر چل سکیں اور محض وہی لوگ جو نہ صرف موجودہ سینئر اسٹاف کا دلی تعاون حاصل کرسکیں۔ بلکہ ان کا احترام و عزت بھی کرسکیں، کا تقرر ہونا چاہیے۔ بالخصوص ایسے سینئر ٹیچرس جنھوں نے اپنی جوانی ادارے کی چہار دیواری میں دفن کر رکھی ہو کسی طرح بھی تعاون نئے و ناتجربے کار پرنسپل کو فطری و نفسیاتی طور پر نہ دیں گے اگر پرنسپل ان کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکے۔ لہٰذا نئی تعلیمی پالیسی / اسکیم زور دیتی ہے کہ + ۲ اور اس کے متعلقہ اسکولوں کے پرنسپل بڑی چھان بین کے بعد مقرر کیے جائیں۔

نئی تعلیمی اسکیم ایسے تمام پرنسپلوں کی ہمت افزائی کرتی ہے جو نئی تبدیلیاں ادارہ پر ٹھونستے نہیں بلکہ اس طرح سے اُن کے نفاذ کی ابتدا کرتے ہیں کہ اساتذہ یہ محسوس کریں کہ اسکول کے چلانے میں ان کی بھی آواز اور رائے شامل ہے۔ صرف اور صرف یہ 'طریقۂ کار' ہے جس سے پرنسپل کامیاب اور اسکول اعلیٰ طرح سے چل سکتا ہے۔

نیا تعلیمی منصوبہ بھی کہتا ہے کہ پرنسپل کو چڑچڑا، سخت و بے لوچ دار مزاج ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا عقیدہ مینارہ میں قیام" کرنے کا نہیں ہونا چاہیے۔ اُس کو اپنے اساتذہ سے سماجی تعلق کو منقطع نہیں کرنا چاہیے۔ اس کو صرف افسرانہ وضابطہ کا ہی رویہ ہر وقت نہیں اپنانا چاہیے اور مینارہ میں سے بیٹھ کر احکامات جاری نہیں کرتے رہنا چاہیے

پرنسپل کو — اسکیم کہتی ہے — اپنے کو بادشاہ سلامت نہ سمجھنا چاہیے۔ کیوں کہ ایک تعلیمی ادارہ محترم پرنسپل صاحب کا نجی تعلقہ نہیں ہے بلکہ یہ جمہوری ریاست کی طرح ہے اور اس جمہوری ریاست کو جمہوری نظام سے اور سب کا دلی وخوشی سے دیا ہوا تعاون ہی چلا سکتا ہے۔ جناب پرنسپل کو سختی سے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ادارہ ایک بڑا اور وزنی چھپر ہوتا ہے جس کو وہ خود تنہا یا صرف چند اپنے پسندیدہ اساتذہ کی مدد سے نہیں اُٹھا سکتا۔ بلکہ ہر ایک کے ہاتھ لگانے اور کندھا دینے سے اُٹھے گا اور یہ سب کا سب صرف اسی وقت ممکن ہے جب کہ پرنسپل محترم آمرانہ انداز کے نہ ہوں اور ادارہ کی قدیم مروجہ روایات کو نہ توڑیں۔

---

* استاد سٹی اسکول، مسلم یونیورسٹی، ——— امیر نشاں، علی گڑھ

میں اپنے طویل چونتیس (۳۴) سال کے تعلیمی پیشے کے تجربے کی بنا پر بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ کبھی کبھی روایات اور ضرورت کے تحت۔ کو اجازت دینا ہی ہوتی ہے کہ وہ قوانین ۔ ضوابط اور احکامات کو نہ صرف اپنا تابع بنالے بلکہ ان پر قطعی توجہ ہی نہ دیں۔ کیونکہ قوانین کا روایات کا تابع ہونا اکثر صحت مند نتیجہ برآمد کرتا ہے اور اس طرح سے ادارے کی درسی اور غیر درسی حالت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ بلکہ نتیجتاً ادارہ کا وقار اور شہرت کو بھی چار چاند لگ جاتے ہیں۔ کیوں کہ ایسا کرنے سے ہی طلبا، کی لیاقت وصلاحیت بڑھتی ہے اور اساتذہ کے خوشی خوشی دل سے پڑھانے کی وجہ سے درجوں کے نتائج بھی بہتر ہوتے جاتے ہیں۔ لہذا ۱۰+۲+۳ کے اسکولوں کے پرنسپلوں کو لازم ہے کہ وہ روایات کو بھی اپنی نجی پسند وناپسند یا انا کو تقویت دینے کی خاطر نہ توڑیں۔

اسکولوں کا پرنسپل، نئے تعلیمی منصوبے کی نظر میں، حاکم وقت یا فرماں روا نہیں ہے بلکہ قائد (لیڈر) اپنے اسٹاف کی پوری ٹیم کا ۔ اس ساری کی ساری ٹیم کا حق ہے اور پرنسپل کا فرض کہ وہ مل کر اور سب کی رائے اور تعاون سے ادارے کی شبیہ کو بڑھائے۔ لہذا پرنسپل کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ وہ بھی "سماجی جانور" ہے اور یہ کہ وہ خود بھی اپنے افسران کا ماتحت ہے جیسے اساتذہ اس کے ماتحت ہیں پس لازم ہے تعلیمی منصوبہ مشورہ دیتا ہے کہ پرنسپل اپنے اسٹاف ماتحت سے بھی ویسا ہی عمل روا رکھے جیسا وہ اپنے لیے اپنے افسران سے امید و پسند کرتا ہے۔

پرنسپل اپنے اسٹاف سے ملتا رہے، رواداری رکھے، روابط قایم رکھے کیوں کہ وہ بھی اُن میں سے ہی ایک ہے۔ تعلیمی منصوبہ یہ سب خوبیاں پرنسپل کی پسند کرتا ہے۔ تعلیمی اسکیم اس رویہ کو بھی پسند نہیں کرتی کہ "میں تمہارا نگراں ہوں" ہر وقت پرنسپل یہ کہتا رہے۔ جو پرنسپل یہ کہتا ہے وہ یہ نہیں سمجھتا کہ وہ چنا ہوا لیڈر رہے۔ وہ نہ تو قابل ستایش پرنسپل ہے اور نہ ہی وہ کبھی اپنے اسٹاف کا دل جیت سکتا ہے۔ بے شک کام کی نگرانی کرنا پرنسپل کا فرض اول ہے لیکن سلیقے کے ساتھ ۔ بے شک اساتذہ پابندی سے پڑھاتے ہیں، یہ دیکھنا بھی پرنسپل کا فرض ہے، لیکن اخلاق سے۔ اگر ٹیم ساتھ نہ دے تو کپتان تنہا کچھ نہیں کر سکتا۔

بعض پرنسپل صاحبان، ایسا تجربے میں آیا ہے، اپنے اساتذہ کو بندھوا مزدور سمجھتے ہیں اور یہ کہ کبھی کبھی اساتذہ کو جیل کے قیدی جیسے لوگ تک گردانتے ہیں۔ وہ یوں کہ اسکول کے پھاٹک میں تالا ڈال دیا جائے، یہ کہ اساتذہ کو ان کے خالی گھنٹوں تک میں منٹوں کے لیے بھی باہر بغیر تحریری اجازت کے جانے نہ دیا جائے اور یہ کہ اساتذہ کو ہمیشہ ماتحت کی نظر سے دیکھا جائے اور یہ کہ کبھی اساتذہ کے ساتھ سلام میں سبقت نہ کی جائے بلکہ اساتذہ سے ہی ہمیشہ سلام پہلے کرایا جائے اور اگر کبھی اساتذہ نجی طور پر پریشان ہوں تو اُن سے کبھی بھی ایک لفظ ہمدردی کا نہ کہا جائے اور یہاں تک کہ اگر اساتذہ کے اعزا کا انتقال ہو جائے تو ایک منٹ کو بھی اسکول بند نہ کیا جائے۔ یہ سب عمل کرنے والا پرنسپل تعلیمی منصوبے کی نظر میں جو جمہوری مزاج رکھتا ہے، بے حد ناکام اور نامناسب پرنسپل ہوگا اور تعلیمی پالیسی اس کو پسند کرے گی کہ ایسے پرنسپل کو جتنی جلد ہو سکے ہٹایا جائے، ورنہ ادارہ خود برباد ہو جائے گا۔

مزید نئی تعلیمی پالیسی اس کو بھی پسند نہیں کرتی کہ پرنسپل جلدی جلدی اساتذہ کے پڑھاتے وقت ان کے درجوں میں گھستا رہے معمولی معمولی قابل درگزر باتوں پر اُن کا جواب طلب کرے اور تمام اساتذہ سے، بالخصوص سینئر اساتذہ سے ہمیشہ تیوری پر بل ڈال کر بات کرے ایسا پرنسپل درسی وغیر درسی دونوں مشاغل میں گراوٹ لانے میں خود معاون ہوتا ہے جو نتیجتاً انتظامی مسایل پیدا کرتا ہے اور بالآخر اساتذہ میں دل شکنی پیدا ہوتی ہے جو ادارے کے حق میں مُضر ہے۔

آپ گھوڑے کو پانی تک تو لے جا سکتے ہیں لیکن اُس کو پانی زبردستی پلا نہیں سکتے۔ یہ رویہ اکثر ایسے اسکولوں کے تجربے میں آیا ہے جن کے پرنسپل اپنی ناتجربہ کاری و بدمزاجی کی وجہ سے متذکرہ بالا امور میں اپنے کو ملوث کرتے ہیں اور یہ سب چیزیں نئی قومی تعلیمی پالیسی نے نہایت غیر جمہوری و بُری کیسی ہیں بلکہ تمام غیر ضروری خصوصیات اسکیم نے اس کے برعکس بیان کی ہیں۔

نیا تعلیمی منصوبہ تقاضا کرتا ہے کہ پرنسپل کو شدت سے حفظ مراتب کا خیال اساتذہ کے درمیان رکھنا ہوگا۔ جونیئر اساتذہ کو ترجیحی آزادی سینئر اساتذہ پر ہرگز نہ دی جائے۔ بالخصوص سینئر اساتذہ اور کم مستحق لائق جونیئر اساتذہ بھی یہ تاثر لیں کہ ادارے کے چلانے میں ان کا سبھی

تہ ہے اور یہ کہ ان کو نظر انداز نہیں کیا جا رہا ہے۔ اس نکتہ پر پرنسپل کا رول
یت مثبت لازمی طور پر ہونا چاہیے۔

نیا تعلیمی منصوبہ پرنسپل سے توقع کرتا ہے کہ وہ درسی وغیر درسی
اغل میں صرف وہ خود ہی نہیں بلکہ اہلیت، صلاحیت و مدّتِ ملازمت کی
ایہ متفرق و متعدد کمیٹیاں بنائے۔ اس طرح نئی تعلیمی اسکیم ایسے تمام
نسپلوں کی مذمت کرتی ہے جو اساتذہ کے ساتھ کم سے کم مہینے میں ایک
میٹنگ نہیں کرتے اور کبھی مجبور ہو کر مدّت طویل کے بعد کر بھی لیں تو اپنی
ی کے خلاف اساتذہ کی تجاویز پر یا اگر اساتذہ اپنے ساتھیوں کا جائز
فاع کریں تو اس درجہ اظہار ناراضگی فرمائیں کہ منہ سُرخ ہو جائے اور
مناسب الفاظ سے مقررین اساتذہ کو مخاطب کرے اور ایسے پرنسپلوں
بھی ناپسندیدگی کی نظر سے نئی تعلیمی
سکیم دیکھے گی جو اسکول کی بہتری کے
سلسلے میں نہ صرف یہ کہ اساتذہ کی
ائب رائے نہیں مانتے بلکہ اُن سے
ی و ذاتی پرخاش کی بنا پر اختلاف
کھتے ہیں۔ لہذا پرنسپل پر تقریباً لازم
ار دیا گیا ہے کہ وہ اسٹاف کی میٹنگ
م سے کم مہینے میں ایک بار ضرور کریں۔

اسی کے ساتھ ساتھ طلباء کی
انب بھی پرنسپل کا رول بین طور پر
یان کیا گیا ہے۔ سینئر کلاسوں کے طلباء بالعموم اور بہتر سیکشنوں کے
الخصوص کو یہ سہولت ہونی چاہیے کہ اُن کو زیادہ تجربہ کار، منجھے ہوئے، عمر رسیدہ
ور ایسے اساتذہ پڑھائیں جن کا تقرر ہی ان طلباء کے لیے کیا گیا ہو۔ پرنسپل سے
تعلیمی اسکیم توقع نہیں کرتی کہ وہ سینئر اساتذہ سے اس معاملے میں متعصبانہ اور
منتقمانہ رویے کے تحت اُن کو بڑے درجوں کے پڑھانے سے محروم کر دے
یوں کہ یہ سینئر اساتذہ بدمزاج، ناتجربہ کار و غیر جمہوری پرنسپل کی بالادستی
و قبول نہیں کرتے ہیں۔ پرنسپل کے ایسے عمل، نئی تعلیمی پالیسی امید کرتی
ہے صرف طلباء کے حصول علم کو متاثر کرتی ہے اور اسکول / کالج کو بدنام کریں
گے۔ لہذا پرنسپل کو لازم ہے کہ وہ ان تمام کاموں سے احتراز کرے۔

> "جسے ہم لوگ سائنس کہتے ہیں اس کی بنیاد مشاہدات،
> تجربات اور ناپ تول پر ہے اور ان نئے طریقوں سے
> یورپ والوں کو عربوں نے متعارف کرایا۔ اسلامی تہذیب
> کا سب سے قیمتی عطیہ موجودہ دور کی سائنس ہے"۔
>
> برلیفالٹ۔

سخت مزاجی، بھنویں چڑھا کر بات کرنا، افسرانہ انداز کا اظہار کرنا
اور ہر وقت سزا کا خوف دلانے والا پرنسپل طلباء سے درجوں میں پابندی
سے حاضری کی بھی توقع نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ ہوم ورک و دیگر پڑھائی کے
کام کو بھی طلباء سے دل سے نہیں لے سکتا۔ مزید اگر پرنسپل صرف اپنے
پسندیدہ چند اساتذہ کے ذریعے یہ پیغام طلباء کو دیتے ہیں تو بھی کامیاب
نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ اساتذہ کے بہترین پرکھنے والے طلباء ہیں۔ ان کو
پسندیدہ یا ناپسندیدہ کہنے کا پیمانہ بھی طلباء ہیں اور ایسے اساتذہ جو
پرنسپل متذکرہ بالا قسم کے پسندیدہ ہوتے ہیں کبھی بھی ان کو طلباء پسند
نہیں کرتے۔ کیوں کہ طلباء صرف ایسے ہی اساتذہ کی دلی عزت کرتے ہیں
جو نہ صرف ان کو پابندی سے پڑھائے بلکہ ان کو صحیح و عمیق علم بھی عطا
کرے اور عام طور پر ایسے چند اساتذہ
جو پرنسپل مذکور کے پسندیدہ
ہو جاتے ہیں نہ تو درجوں میں پابندی
سے جاتے ہیں اور نہ ہی پڑھانے کی
لگن رکھتے ہیں۔ اسی لیے طلباء ان
اساتذہ کو پرنسپل کی طرح رد کر دیتے
ہیں۔

ایسے پرنسپلوں، جن کا اوپر
کے پیراگراف میں ذکر کیا گیا، کا مزاج
اور رویہ جب طلباء پر اثر انداز ہونے
کی کوشش کرتا ہے تو طلباء نہ صرف اس کو قبول کرنے سے انکار کرتے
ہیں، بلکہ یہی وہ مقام ہے جب ایسے پرنسپل کو اسی کے سکوں میں طلباء
ادائیگی کرتے ہیں اور پھر یہ عمل در ردّ عمل ایک بار پھر ادارے کی کارکردگی
کو بُری طرح متاثر کرتا ہے۔

پرنسپل کو یہ بھی یاد رکھنا ہو گا کہ طلباء بھی اپنی عزت رکھتے ہیں اور
طلباء میں اس کا احساس بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے ایک ایسے پرنسپل
کو جو ضدّی و غیر معقول ہے تو طلباء اس کے عمل پر اور بھی زیادہ شدید
ردّ عمل کرتے ہیں اور پھر ناقابل تلافی نقصان بالآخر ادارہ کو اور وہاں رہنے
طلباء کو ہی پہنچتا ہے۔ لہذا پرنسپل پر لازم ہے کہ وہ اس باریک نکتہ

اور نفسیاتی پہلو پر بھی نگاہ رکھے ورنہ ناکام ہوگا۔

مختصر یہ کہ تمام پرنسپل بالعموم اور اس +۲ منسلکہ اسکولوں کے بالخصوص، سے نئی قومی تعلیمی اسکیم متقاضی ہے کہ وہ ضدی نہ ہوں، غیر جمہوری نہ ہوں، مغرور نہ ہوں، خود سر نہ ہوں اور سب کے او پر تنگ مزاج نہ ہوں نیز آمرانہ و حاکمانہ رویہ ہر وقت اور ہر لمحہ نہ ظاہر کریں۔ یہ چیز اساتذہ و طلباء دونوں سے روا نہیں رکھتا ہے نئی تعلیمی اسکیم ان پرنسپلوں کو اس کا بھی مشورہ دیتی ہے کہ وہ یاد رکھیں کہ اسکولوں کا چلانا ایک فرد واحد کے بس میں نہیں ہے بلکہ پوری ٹیم کے تعاون سے اسکول چلتے ہیں۔ لہذا پرنسپل تنہا یا چند چہیتو اساتذہ کے ساتھ مل کر اسکول نہیں چلا سکتا۔ تا وقتیکہ خوشی و منسلکہ تعاون تمام اساتذہ مع سینئر اساتذہ کا نہ ملے۔ بصورت دیگر نئی تعلیمی اسکیم کا مقصد فوت ہو جائے گا۔

ایسے احکامات کی تعمیل جو خوف کے بطن سے تولد ہو کبھی بھی کسی تعلیمی ادارے کے لیے نہ مفید ہوتی ہے اور نہ اس کو پروان چڑھا سکتی ہے۔ ناتجربہ کار، بدمزاج پرنسپل کو یہ یاد رکھنا چاہیے۔ پرنسپل کے ایسے عمل صرف ضابطے کی خانہ پری تو کر دیتے ہیں لیکن نئے تعلیمی منصوبہ کا اعلیٰ نشانہ، کہ طلباء میں صحیح کردار، صحیح علم اور صحیح جذبۂ حب الوطنی پیدا ہو کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

لہذا نئی تعلیمی اسکیم کو اگر ہم پورے طور پر نافذ کرنا چاہتے ہیں تو لازم ہے کہ پرنسپل بھی ایسا ہی ہو جیسا کہ اسکیم مانگ کرتی ہے۔

اعلان بابت ملکیت

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
قومیت: ہندوستانی
حصہ دار: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔
ایڈیٹر: پروفیسر اسرار احمد
قومیت: ہندوستانی
پرنٹر، پبلشر: پروفیسر اسرار احمد
پریس: ایس کے۔ آفسیٹ پریس۔ دہلی۔
اشاعت کی مدت: ماہانہ
مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

میں اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا اطلاعات میرے یقین کی حد تک درست ہیں۔

اسرار احمد

تعلیم بالغان

محمد ہارون *

سوشل ایجوکیشن جو اس دور میں تعلیم بالغان کے نام سے موسوم ہے کا واحد مقصد ملک میں جہالت کی جگہ تعلیم کو عام کرنا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ملک کا ہر شہری اسی وقت بہترین شہری بن سکتا ہے جب وہ تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو۔ اس لیے روایتی تعلیم گاہوں کے ساتھ ساتھ ایک ایسے ادارے کی ضرورت بھی ہوتی ہے جو اُن لوگوں کو بھی تعلیم سے روشناس کرا سکے جو کسی وجہ سے اپنی ابتدائی عمر میں تعلیم سے محروم رہے ہیں۔

تعلیم بالغان کی اہمیت اور افادیت کا تو کوئی منکر نہیں ہے مگر اس کو وہ اہمیت نہیں دی جا رہی ہے جو دی جانی چاہیے۔ بلکہ ہو یہ رہا ہے کہ پرائمری، سکنڈری اور یونیورسٹی کی تعلیم پر ہی حکومت ہو یا افراد اپنی توجہ مرکوز کیے ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ سے ابھی تک ہمارے ملک میں خواندگی کی شرح متمدن ممالک کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ آزادی سے قبل سوشل ایجوکیشن یا تعلیم بالغان پر "غیروں" کے ہاتھ سے جو رقم خرچ ہوتی تھی آج اتنی رقم بھی صرف نہیں کی جا رہی ہے۔ ۳۸-۱۹۳۷ء میں سوشل ایجوکیشن پر ۲۰ء۴۴ لاکھ روپے خرچ ہوئے تھے۔ جب کہ ۴۷-۱۹۴۶ء میں یہ رقم ۱۱ لاکھ روپے کر دی گئی تھی۔ لیکن آزادی کے بعد اس پر وہ توجہ نہیں دی گئی جو دی جانی چاہیے تھی۔ حالاں کہ ۴۷-۱۹۴۶ء کے دوران ثانوی تعلیم پر ۸۰ر۴ کروڑ روپے اور ابتدائی پر ۴۸ء۱۸ کروڑ روپے خرچ کیے گئے۔ ان ہی اخراجات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے مقابلے میں تعلیم بالغان کو کس قدر کم اہمیت دی گئی ہے۔

آج تعلیم بالغان کا جو کچھ کام ہو رہا ہے وہ ایسے حضرات کے ذریعے ہو رہا ہے جن کا واحد مقصد یہ ہے کہ تعلیم عام ہو، جہالت کا خاتمہ ہو تاکہ ہمارا ملک کسی بھی ترقی یافتہ ملک سے اس میدان میں بھی پیچھے نہ رہے مثال کے طور پر ہم ایک ادارے کا خاص طور پر ذکر کریں گے جس کا نام "تعلیم گھر" ہے۔ یہ ادارہ "میڈم ویلدی فیشر" کی تمام تر کوششوں کا نتیجہ ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب بھی ہے۔ صوبائی سطح پر بھی کچھ ادارے کام کر رہے ہیں اور این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی نے بھی اپنی کچھ شاخوں میں تعلیم بالغان کا کام شروع کر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ وزارتِ تعلیم نے بھی ڈائرکٹریٹ آف اڈلٹ ایجوکیشن کے نام سے سینٹر کھول رکھا ہے جو تعلیم بالغان کے کام میں مصروف ہے۔

تعلیم بالغان کا یہ سلسلہ دوسرے ملکوں میں بھی چل رہا ہے اور اس پر اچھی خاصی رقم اور وقت صرف کیا جا رہا ہے مثلاً یونیسکو نے تعلیم بالغان کو بڑھاوا دینے کے لیے کئی سینٹر کھول رکھے ہیں، جن کی طرف سے متعدد مجلے اور میگزین بھی شایع ہوتی ہیں اور سمینار، ورکشاپ اور کانفرنسیں وغیرہ بھی منعقد کی جاتی ہیں۔

* ریسرچ اسکالر، سینٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

ہندوستان تعلیمی میدان میں کس قدر پس ماندہ ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۵۱ء میں ان پڑھ لوگوں کی تعداد ۸۰٫۷ فیصد تھی اور ۱۹۶۱ء میں یعنی دس سال کے عرصے میں صرف ۸٫۵ فیصد گھٹ کر ۷۲٫۲ فیصد ہو گئی ہے۔ اس صورتِ حال سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس میدان میں ترقی کی رفتار کس قدر سست ہے۔ اگرچہ آزادی کے بعد ہمارے ملک میں تعلیم پر خاص توجہ دی گئی اور دفعہ ۴۵ کے تحت ۱۴ سال کی عمر تک کے بچوں کے لیے تعلیم حاصل کرنا لازمی قرار دیا گیا لیکن بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر اس دفعہ پر مکمل طور سے عمل نہیں کیا جا سکا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج بھی ہمارے ملک کے ناخواندہ افراد کی شرح ہمارے سروں کو شرم سے جھکا دیتی ہے۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عوا اداروں اور حکومت کو تعلیمِ بالغان کے کام کو فروغ دینے کی ایک مہم شروع کرنی چاہیے۔ تاکہ ہمارے ملک سے جہالت کا اندھ ختم ہو اور علم کی روشنی صرف اپنے ہی ملک کو نہیں بلکہ پوری دنیا کو منوّر کر دے۔

"یہ دنیا دار العمل ہے اور وہ دنیا دار الجزا۔ اس دنیا میں جس قوم نے بھی عمل سے کوتاہی برتی اور خود کو ڈسپلن کا پابند نہ کیا، وہ زوال آمادہ ہونے لگتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ قومیں برابر پیش رفت کی راہ پر گامزن ہیں جو خدائی اصولوں کی پاسداری کرتی ہوئی عملِ پیہم میں مصروف ہیں۔ وہ مذہب نا آشنا یا مذہب بیزار قومیں بھی ترقی کی راہوں پر گامزن ہیں جنہوں نے قادرِ مطلق کی طرف سے اپنی نگاہیں پھیر رکھی ہیں۔ قادرِ مطلق کی طرف سے نگاہیں پھیرنے کی سزا تو ان کو اُس دنیا میں ملے گی لیکن چونکہ وہ اس دنیا کے حصول کے لیے خدائی قوانین کے مطابق اپنی زندگی بسر کرتی ہیں اس لیے آج دنیا کی سیادت ان کو بخش دی گئی ہے۔ ان کی یہ سیادت اُس وقت تک قایم رہے گی جب تک وہ خدائی قوانین کی پابندی کرتی رہیں گی۔"

سید ہاشم علی

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ پرنٹر پبلشر: اسرار احمد۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشریات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
پریس: ایس۔ کے آفسیٹ پریس۔ دہلی۔

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۷ — اپریل ۱۹۸۸ء — شمارہ ۴

سرپرست : جناب سید ہاشم علی
وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

ایڈیٹر
اسرار احمد

جوائنٹ ایڈیٹر
کبیر احمد جائسی

اسسٹنٹ ایڈیٹر
شباب الدین

تزئین
سرفراز

انچارج سرکولیشن
مستقیم احمد خان

ترسیل زر کا پتہ
ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

Editor: TAHZIBUL AKHLAQ & NISHANT,
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY.

زر سالانہ

انڈیا —	Rs. 30·00
بیرونی ممالک ہوائی ڈاک	US $ 20·00
عام ڈاک	US $ 8·00

مقالہ وغیرہ بھیجنے کا پتہ
ڈاکٹر کبیر احمد جائسی
اداریٔ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ۔
انڈیا

مندرجات

[تہذیب الاخلاق میں جو مضامین شائع کیے جاتے ہیں، ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہرحال ان سے متفق ہو -]

اداریہ

صدیوں کے تجربے کے بعد دنیا اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ جمہوریت ہی سب سے اچھا، اعلیٰ اور مفید عام طرزِ حکومت ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے بیشتر ملکوں نے اسی طرزِ حکومت کو اپنا لیا ہے۔ جمہوری طرزِ حکومت افراد کو جو حقوق دیتا ہے ان میں سے ایک اہم حق، احتجاج کا ہے۔ یعنی اگر فرد یا افراد کسی چیز، پالیسی یا واقعے سے کبیدہ خاطر، پریشان یا بدگمان ہوں تو جمہوری طرزِ حکومت ان کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ اپنی ناپسندیدگی یا بے اطمینانی ظاہر کرنے کے لیے احتجاج کریں۔ یہ احتجاج ایک جگہ جمع ہو کر صرف جلسہ کر کے بھی کیا جا سکتا ہے اور سڑکوں پر گھوم پھر کر ہائے وائے کے نعروں اور شور و شغب کے ساتھ بھی۔ کوئی بھی جمہوری حکومت احتجاجوں سے مزاحم نہیں ہوتی لیکن جب احتجاج کرنے والوں کا جوش ان کے ہوش پر غالب آ جاتا ہے اور اُن سے دیوانے پن کا عمل سرزد ہونے لگتا ہے تو حکومت کی مشنری حرکت میں آتی ہے اور انجام کار جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اس طرح عیاں ہے کہ اس کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

تعلیمی ادارے ہمارے سماج کا وہ حصہ ہیں جو نظم حکومت چلانے اور ملک کو پیش رفت کی راہوں پر لے جانے والے افراد کی تربیت کرتے ہیں لیکن جب پورے سماج میں احتجاج کو ایک حربے کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہو تو یہ ممکن نہیں ہے کہ تعلیمی ادارے اس سے محفوظ رہیں اور یہاں کی فضا میں گاہے بگاہے ہائے وائے کے نعرے نہ گونجیں۔ اس طرح کے احتجاجات جمہوری نظام حکومت میں نہ تو قابل اعتراض ہو سکتے ہیں اور نہ ہی قابل تشویش۔ تشویش کا مرحلہ وہاں سے شروع ہوتا ہے جب احتجاج، انتشار اور تشدد میں تبدیل ہو کر پوری فضا کو مسموم کرنے لگتا ہے۔

ہم ہندوستانیوں میں خدا جانے کون سی مایوسی کی لہر دوڑ گئی ہے کہ ہمارا تقریباً ہر احتجاج توڑ پھوڑ، تشدد اور جانوں کے اتلاف پر ختم ہوتا ہے۔ جب یہ تماشہ ختم ہوتا ہے تو پھر کمیشن بٹھائے جاتے ہیں جو دو تین برسوں تک عوامی پیسہ خرچ کرنے کے بعد ایک رپورٹ مرتب کرتے ہیں جس میں نہ تو مسئلہ کا کوئی حل تجویز کیا جاتا ہے اور نہ ہی یہ بتایا جاتا ہے کہ ناخوشگوار واقعات سے کس طرح بچا جا سکتا ہے۔ بعض بعض کمیشنوں کی رپورٹوں کا کچھ دنوں تک اخباروں میں چرچا رہتا ہے اور پھر لوگ اس کو بھی بھولنا شروع کر دیتے ہیں۔ بعض بعض رپورٹیں تو ایسی بھی ہوتی ہیں جو سرد خانوں میں بند ہو جاتی ہیں اور کسی کو بھی یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ ان رپورٹوں میں تھا کیا؟ یہ سب کچھ تو ہوتا ہے مگر جو جانیں چلی جاتی ہیں وہ واپس نہیں لا جا سکتیں، املاک کا جو نقصان ہوتا ہے اس کی تلافی عوامی پیسے کے ذریعے کی جاتی ہے۔ یہ وہی عوامی پیسہ ہوتا ہے جو اگر اس طرح کے کاموں میں نہ لگایا جائے تو اس سے بہت سے رفاہی کام لیے جا سکتے ہیں۔ آزادی کے چالیس برسوں کے بعد بھی ہم اتنی بجلی نہیں پیدا کر پا رہے ہیں کہ اس کے ذریعے کھیتوں تک پانی پہنچانے کا تو ذکر ہی کیا ہمارے گھر قاعدے سے روشن ہو سکیں۔ بسا اوقات بلب کی روشنی ایسی ہوتی ہے کہ اگر موم بتی جلا دی جائے تو وہ

زیادہ روشن معلوم ہوتی ہے۔ اب بھی نہ جانے کتنے دیہات ایسے ہیں جو رسل و رسایل کے ذرایع سے محروم ہیں۔ اب بھی ہمارے ملک میں کروڑوں افراد ایسے بھی بستے ہیں جو غربت کی اسفل ترین سطح پر ہیں۔ اب بھی نہ جانے کتنی بستیاں ایسی ہیں جو پینے کے پانی اور پرائمری اسکول تک سے محروم ہیں۔ توڑ پھوڑ اور تشدد کے ہاتھوں ہر سال ہمارے ملک کو جتنا مالی نقصان پہنچتا ہے اور اس نقصان کی تلافی کے لیے جو سرکاری پیسہ صرف کیا جاتا ہے اگر صرف وہی پیسہ رفاہی کاموں پر لگایا جائے تو سیکڑوں دیہات بجلی سے جگمگانے لگیں گے۔ ہزاروں کورددہ علاقوں میں سڑکیں بن جائیں گی اور لاکھوں بستیوں میں کچھ اور نہ سہی تو پرائمری اسکول ضرور کھل جائیں گے۔

اب رہے تعلیمی اداروں کے احتجاجات' یہاں کے احتجاجات نے بھی معاشرے کا عام چلن اختیار کرتے ہوئے دھیرے دھیرے تشدد کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ اب تو یہ حال ہو گیا ہے کہ احتجاج کرنے والے خفا ہیں ادارے کے سربراہ سے یا کسی استاد سے یا پھر انتظامیہ کے کسی رکن سے اور غصہ اتار رہے ہیں' بے جان پودوں' کھڑکیوں کے شیشوں' چہار دیواریوں' عمارتوں اور سواری گاڑیوں پر۔ اس بات کا جواب کسی کے پاس بھی نہیں ہے کہ جس پودے کو مسل ڈالا گیا' جس شیشے کو چکنا چور کر دیا گیا' جس دیوار کو منہدم کر دیا گیا یا جس سواری گاڑی میں آگ لگا دی گئی' آخر اس کا قصور کیا تھا جس کی اس کو یہ سزا ملی؟

جیسا کہ معلوم ہے آزاد ہندوستان میں بیشتر تعلیمی ادارے حکومت کی دی ہوئی رقم کے ذریعے اپنے اخراجات پورے کرتے ہیں ——— حکومت کے پاس کوئی ایسا پیڑ تو ہے نہیں کہ وہ ہر فصل میں اس پر سے روپیے توڑ کر تعلیمی اداروں کو دے دیا کرے۔ حکومت کی آمدنی کا ذریعہ تو وہ ٹیکس ہے جو ممکن ہے نئی نسل بذات خود نہ دیتی ہو مگر اس کے والدین پابندی کے ساتھ اس کو ادا کرتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو قانون کے ہاتھ ان کو سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیں۔ مطلب یہ ہوا کہ حکومت تعلیمی اداروں پر جو کچھ خرچ کرتی ہے وہ ہمارا ہی وہ سرمایہ ہے جو ہم اس کو ٹیکس کی مختلف صورتوں میں دیتے ہیں۔ حکومت نے ہر تعلیمی ادارے کے لیے سالانہ ایک رقم مقرر کر رکھی ہے۔ اگر مقررہ رقم کا کوئی بھی حصہ لوٹ پھوٹ کی مرمت اور نقصانات کی تلافی میں خرچ کر دیا جائے گا تو ادارے کے دوسرے مصارف میں کمی کیے بغیر ادارہ کا چلنا ممکن نہ ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ سائنس کے شعبوں کو وہ آلات خریدنے کے لیے رقم نہ مل سکے جو ان کے لیے ناگزیر ہیں' میڈیکل کالج کے ایمرجنسی وارڈ میں ایک مریض صرف اس لیے موت و حیات کی کشمکش میں گرفتار ہو جائے کہ بجٹ کی کٹوتی کی وجہ سے کوئی دوا اسٹاک میں نہیں تھی۔ گیمس کمیٹی کے بجٹ میں اتنی تخفیف کرنی پڑے کہ کھیل کے میدان اجاڑ صحرا بن جائیں' ہوسٹل روشنی سے محروم ہونے لگیں۔ کیونکہ برقی سامان خریدنے کی گنجائش ہی کہاں رہی' شعبوں کا بجٹ اس طرح تخفیف کا شکار ہو جائے کہ کلاس سے چاک اور ڈسٹر عنقا ہو جائیں۔

وہ سنجیدہ طبقہ جو ملک کے ہر ادارے اور زمین کے ہر چپہ کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے' اس کا یہ فرض ہے کہ وہ احتجاج کی اس رَو میں اپنے کو بہہ جانے سے روکے تاکہ خود اسی کے ہاتھوں سے اس کا وہ نقصان نہ ہو جس کا بھگتان اس کو برسوں بھگتنا پڑے۔ صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ جو لوگ جذبات کی رو میں راستے سے بھٹک گئے ہوں ان کو بھی غیر جذباتی اور نفسیاتی انداز سے سمجھا بجھا کر اپنے راستے پر گامزن کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور ان پر یہ بات واضح کر دینی چاہیے کہ املاک کا اتلاف خود ہمارا اپنا نقصان ہے اور کوئی بھی عقل مند شخص اپنے ہی ہاتھوں اپنے آپ کو نقصان نہیں پہنچایا کرتا۔

کبیر احمد جائسی

رخصت

سر سید احمد خاںؒ

سوتوں کو جھنجوڑتے ہیں تا کہ جاگ اٹھیں۔ اگر اٹھ کھڑے ہوئے تو مطلب پورا ہو گیا: اور اگر نیند میں اٹھانے سے کچھ بڑبڑائے اور کچھ جھنجھلائے، اِدھر ہاتھ جھٹک دیا، ادھر پیر پٹک دیا، اور جھنجلاہٹ میں اینڈے پڑے رہے، تو بھی توقع ہوئی کہ تھوڑی دیر بعد جاگ اٹھیں گے۔ شاید ہمارے بھائیوں کی اس اخیر درجہ تک نوبت آ گئی ہے۔ اگر یہ خیال ٹھیک ہو، تو ہم کو بھی زیادہ چھیڑنا نہ چاہیے اور "تہذیب الاخلاق" کو بند کر کر، دور سے نیند کے ان خمار آلودوں کا، جو اب صرف جھنجلاہٹ سے اینڈے پڑے ہیں، اٹھنا اور ہوشیار ہونا دیکھنا چاہیے۔

بچے اٹھاتے وقت کہہ اٹھتے ہیں کہ:

ہم کو اٹھائے جاؤ گے، تو ہم اور پڑے رہیں گے۔ تم ٹھہر جاؤ! ہم آپ ہی اٹھ کھڑے ہوں گے۔"

بچہ کڑوی دوا پیتے وقت بسور کر ماں سے کہتا ہے کہ

"بی! یہ مت کہے جاؤ کہ شاباش بیٹا پی لے! پی لے!!

تم چپ ہو رہو۔ میں آپ ہی پی لوں گا۔"

لو بھائیو! اب ہم بھی نہیں کہنے کہ:

"اٹھو! اٹھو!! پی لو! پی لو!!"

اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اپنے کو ناصح مشفق سمجھتا ہوں اور جو حالت قوم کی ہے، اس کو جتلانا چاہتا ہوں۔ ایک دن تھا کہ ہم بھی اسی رنگ میں تھے۔ ایسی گہری نیند سوتے تھے کہ فرشتوں کے بھی اٹھانے سے نہ اٹھتے تھے۔ اب ہماری یہ مثل ہے:

لو آج میرِ مسجدِ جامع کے ہیں امام
داغ شراب دھوتے تھے کل جانماز کا!

کیا کیا خیالات ہماری قوم میں ہیں جو ہم میں نہ تھے؛ اور کیسی کالی گھٹائیں ہماری قوم پہ چھا رہی ہیں جو ہم پہ نہ تھیں۔ جب رند تھے فرہاد سے بڑھ کر تھے، جب زاہدِ خشک تھے، تو نہایت ہی اکھڑ تھے صوفی تھے تو روحی سے برتر تھے۔ اب خاکسار ہیں اور اپنی قوم کے غم خو ہم کو کس نے جگایا؟ دل اور زمانے نے۔ دل کی گھرٹ ایسی تھی، میں ہمیشہ غم خواری تھی پہ سوتا تھا۔ زمانے جھٹکا دیا اور جگا دیا۔

دفعتاً دیکھا کہ دنیا الٹ گئی اور رنگ برنگ کی پھلواڑی سے اجڑ گئی! قوم کی حالت وہ دیکھی کہ خدا کسی کو نہ دکھلائے۔ اس بربادی۔ سبب کا غیر قوم کو تو اور ہی خیال ہوا، یہ غلط ہوا: اور مجھ کو جو ہوا: وہ خو اپنی قوم کی حالت کا ابتر ہونا تھا۔ قوم، کیا دنیا کی باتوں میں اور کیا د کے کاموں میں، ایسے تاریک گڑھے میں پڑی تھی کہ اِدھر اُدھر کی چیزیں درکنار، وہ اس گڑھے کو بھی نہ دیکھ سکتی تھی، جس میں پڑی تھی! پھر دل آخر دل ہی تھا؛ پتھر نہ تھا جو نہ پگھلتا اور اپنی قوم کی حالت پر غم نہ کرتا

ایک مدت تک اسی غم میں پڑا سوچتا رہا کہ کیا کیجیے؟ جو خیالی تدبیر کرتا تھا، کوئی بن پڑتی نہ معلوم ہوتی تھیں۔ جتنی امیدیں کرتا تھا سب ٹوٹ جاتی تھیں۔ آخر یہ سوچا کہ سوچنے سے کرنا بہتر ہے۔ کرو! جو کچھ کر سکو، سوچ نہ سوچو۔ اسی بات پہ دل ٹھہرا، ہمت نے ساتھ دیا، اور صبر نے سہارا اپنی قوم کی بھلائی میں قدم گاڑا۔ اس میں خدا کی طرف کا بدلہ تو نہ جب معلو تھا اور نہ اب معلوم ہے مگر قوم کی طرف کا بدلہ اسی وقت سے معلوم تھا جو اب ظاہر

کافر، مرتد، ملحد، زندیق، اسلام کا دشمن، مسلمانوں کا ہاجی، قوم کا عیب جو، دین دنیا سے آزاد، کہنا اور نام پر دو چار صلواتیں سنا دینا۔ مگر شکر ہے کہ ان کی کسی بات نے ہمارا دل نہیں دکھایا اور ہمیشہ ہمارے دل میں یہی رہا کہ:

" اے خدا! ان پر رحم کر، کیونکہ وہ نہیں جانتے۔"

ان ہی قومی بھلائی کے ولولوں میں سے تہذیب الاخلاق کا نکالنا بھی ایک ولولہ تھا جس کا اصلی مقصود قوم کو اس کی دینی اور دنیاوی ابترحالت کا جتلانا اور سوتوں کا جگانا، بلکہ مردوں کو اٹھانا اور بند سڑے ہوئے پانی میں تحریک پیدا کرنا تھا۔ یقین تھا کہ سڑے ہوئے پانی کو ہلانے سے بو زیادہ پھیلے گی؛ مگر حرکت میں آجانے سے پھر خوشگوار ہو جانے کی توقع ہوتی تھی۔ پس کیا ہم نے جو کچھ کرنا تھا اور پایا ہم نے جو کچھ کہ پانا تھا! خدا سے آرزو ہے کہ اگر ہم نے وہ نہیں کیا جو ہم کو کرنا تھا تو وہ وہی کرے جو اس کو کرنا ہے:

از بندہ خضوع و التجاے زیبد
بخشایش بندہ از خداے زیبد
گر من کنم آنکہ، آں مرا نازیباست
ذکن بہ آنکہ، آں ترا ے زیبد

ہم نے بذریعہ اپنے اس پرچہ کے اپنی قوم کی خدمت کی، مذہبی بیجا جوش سے جس تاریک گڑھے میں وہ چلی جاتی تھی، اس سے خبردار کیا، دنیاوی باتوں میں، جن تاریک خیالات کے اندھیرے میں وہ مبتلا تھی، اس میں ان کو روشنی دکھلائی۔ مذہب اسلام پر نادانی سے جس قدر گھٹائیں چھا رہی تھیں ان کو ہٹایا اور اس کے اصلی نور کو جہاں تک ہم سے ہو سکا چمکایا اردو زبان کا علم و ادب، جو بدخیالات اور موٹے وبھدے الفاظ کا مجمع ہو رہا ہے، اس میں بھی جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اصلاح چاہی۔ یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے اس میں کچھ کیا؛ مگر ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اپنی دانست میں، ان باتوں میں بقدر اپنی طاقت کے کوشش کی۔ قومی ہمد[ردی]، قومی عزت، سلف آنر یعنی اپنے آپ عزت کا خیال اگر ہم نے اپنی قو[م] میں پیدا نہیں کیا، تو ان لفظوں کو تو ضرور اردو زبان کے علم ادب میں داخل کیا۔

ہم نے کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو، مگر ہر طرف سے تہذیب و شائ[ستگی] کا غلغلہ سنا، قومی ہمدردی کی صداؤں کا ہمارے کانوں میں آنا، ا[ردو] زبان کے علم ادب کا ترقی پانا، یہی ہماری مرادیں تھیں، جن کو ہم نے بھر پایا۔ اب بہت لوگ ہیں جو ان باتوں کو پکارتے ہیں گو اس وقت ٹھہری ٹھہری لہریں کھاتے ہیں، مگر پانی میں حرکت ہی کا آجانا کافی ہے۔ [...] وہ خود ہی بنسال میں آپ جو رس ہو رہے گا۔ اس لیے مناسب ہے ک[ہ] بس کریں اور پانی کو آپ ہی آپ جو رس ہونے دیں۔

ہمارے دوست ہماری اس خاموشی کا کوئی سبب دوراز [...] نہ خیال کریں گے بلکہ یہ خیال کریں گے کہ ہم کسی دوسری قومی بھلائی کے [کام] میں معروف ہوں گے جو اس سے بھی زیادہ قوم کو مفید ہوگا۔ خدا تعا[لیٰ] نے فرمایا ہے:

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ۗ

اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے بہت سے ایسے دوست ہیں جو اس پر[چہ] کے بند ہونے سے نہایت ہی شکستہ خاطر ہوں گے، مگر ہم ان سے معذ[رت] کرتے ہیں اور اب اس پرچے کو ان سے رخصت کرتے ہیں اور دن بھی اب آنے والا ہے کہ ہم خود ہی ان سے رخصت ہوں گے

والسلام!!

" بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات، دن کے آنے جانے اور تغیر و مختلف ہونے میں عقل والوں کے لیے قدرت کی بہت سی نشانیاں ہیں۔"

قرآن کریم۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۷، شمارہ ۴ (اپریل ۸۸ء)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار

مفہوم اور تقاضے

سید حامد*

نعرے ذہنوں میں اس طرح پیوست ہو جاتے ہیں کہ چھڑائے نہیں چھوٹتے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بازیابی کا نعرہ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۸۰ء تک فضا میں گونجتا رہا۔ اس کے لیے جان و مال اور وقت کی قربانیاں دی گئیں۔ نہ تقاضا کرنے والوں کو پتہ تھا نہ جان دینے والوں کو کہ اقلیتی کردار سے مراد کیا ہے۔ مسئلہ دراصل تھا یونیورسٹی کے اختیارات اور اس کے روایتی کردار کی بحالی کا۔ راقم السطور کے دور میں ۱۹۸۱ء کا ترمیمی ایکٹ پاس ہوا۔ دونوں ایوانوں میں بل پر بحث کے دوران وہ آفیشیل گیلری میں تھا۔ وزیر تعلیم نے بل کا تعارف کرتے ہوئے اقلیتی کردار کا ذکر نہیں کیا۔ ذکر کیا تو یونیورسٹی کے تاریخی کردار کا۔ مسلمان اس بل سے ایک حد تک مطمئن اس لیے ہو گئے کہ اس میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ مسلمانوں نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قایم کیا تھا جو ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی کے منصب کو پہنچ گیا۔ اس ایکٹ کی رو سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے دائرۂ اختیار میں یہ امر بھی ہے کہ وہ مسلمانوں کی تعلیمی اور ثقافتی پیش رفت کے لیے اقدامات کرے اور پھر اس ایکٹ نے یونیورسٹی کے وہ اختیارات جو سلب کر لیے گئے تھے اور اس کی وہ انجمنیں جو معطل کر دی گئی تھیں، بحال کر دیں۔

اقلیتی کردار پر ملت نے زور اس لیے دیا کہ آئین کے تحت اقلیتی اداروں کو کچھ خصوصی اختیارات حاصل ہیں، لہذا اقلیتی کردار کا روئے سخن حکومتوں، عدالتوں اور ارباب شعبہ ہائے تعلیم کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انہیں دستور ہند کے متعلقہ آرٹیکلوں کا اقلیتی ادارے کے سلسلے میں نفاذ کرنا چاہیے۔ جہاں تک یونیورسٹی، اس کے اساتذہ، انتظامیہ اور طلبا کا تعلق ہے۔ مذکورہ ترمیمی ایکٹ کا ماحصل یونیورسٹی کا اِسلامی کردار ہے۔ یہ ایکٹ جب ہم سے تخاطب کرتا ہے تو اِسلامی کردار کا تقاضا کرتا ہے کسی تعلیمی ادارے کے اندر اقلیتی کردار کا نفاذ کوئی معنی نہیں رکھتا۔

ہاں، اگر اقلیتی کردار پر اصرار ہے تو اس کے تقاضے دوگونہ ہیں:

۱۔ چوں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں مسلمانوں کی اکثریت رہی ہے اور رہے گی، اس لیے ان پر لازم آتا ہے کہ یونیورسٹی میں دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ، خواہ وہ استاد ہوں خواہ عمال، خواہ طالب علم ایسا ہی برتاؤ کریں جیسا کہ وہ چاہتے ہیں کہ بہ حیثیت ایک اقلیت کے ان کے ساتھ ہندوستان بھر میں کیا جائے۔ فیکلٹی، ہوسٹل، کھیل کے میدان، یونین ہال اور دوسری غیر نصابی کارگاہوں میں ان کا برتاؤ اپنے غیر مسلم رفقا کے ساتھ ایسا ہو کہ وہ جب تعلیم سے یا تدریس سے فارغ ہو کر یہاں سے نکلیں تو یونیورسٹی اور مسلمانوں کے گن گاتے ہوئے نکلیں۔ انہیں کبھی جائز طور پر یہ احساس نہ ہو کہ بزور اکثریت ان کے ساتھ ناانصافی کی جا رہی ہے یا اُن کا اور ان کی روایات کا احترام نہیں ہو رہا ہے۔ ان کو ہمارے اقوال اور افعال سے جراحت ہرگز نہ پہنچنی چاہیے

---

* سابق وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہمدرد نگر، دہلی۔

ہماری یونیورسٹی جہاں مختلف فرقوں کے استادوں اور طالب علموں کا بے نظیر اقامتی اور علمی امتزاج ملتا ہے، ہر آئینہ اس کی صلاحیت رکھتی ہے کہ وہ ایک مثل یا لیبارٹری بن جائے جو ہندوستان کے مختلف فرقوں کے درمیان خوش رابطگی اور خیر اندیشی کو تقویت دینے کے لیے مسلسل تجربات کرتی رہے اور نمونے فراہم کرتی رہے۔

۲۔ اقلیت کی صورت حال کا تقاضہ ہے کہ اس کا ہر فرد اپنی بقا، خوش حالی اور پیش رفت کے لیے اکثریت کے افراد سے کہیں زیادہ محنت کرے اور بہ حیثیت ہندوستانی شہری کے خود کو کہیں زیادہ لایق اور کارگزار ثابت کرے۔ ہماری یونیورسٹی کے ہر مسلمان استاد اور طالب علم کا یہ پیدائشی فرض ہے جو اس فرض سے کوتاہی کرے گا، وہ اگر استاد ہے تو گمراہ اور گمراہ ساز کہلائے گا اور اگر طالب علم ہے تو ناخلف اور کپوت گردانا جائے گا۔

ہونا در اصل یہ چاہیے تھا کہ علی گڑھ یونیورسٹی کم از کم حصولِ آزادی کے گزشتہ چالیس سال کے دوران نہ صرف احاطہ یا کیمپس میں اکتسابِ فضیلت کے لیے متواتر ساعی رہتی بلکہ ملک کے مسلمانوں کی تعلیمی اقتصادی اور مدنی پسماندگی کا تجزیہ کرتی اور اسے دور کرنے کے لیے تجویزیں ملک و ملت کے سامنے رکھتی اور پروگرام بناتی۔ اس نے نہ وہ کیا جو اسے احاطہ کے اندر کرنا تھا اور نہ وہ کیا جو اسے احاطہ کے باہر ملک و ملت کی اعانت اور ہدایت کے لیے کرنا چاہیے تھا۔ یہ کہتے ہوئے راقم کو اس بات کا احساس اور اعتراف ہے کہ ان چالیس سالوں میں پانچ سال تک زمامِ اہتمام خود اس کے ہاتھوں میں رہی ہے۔

معلوم نہیں وہ کون سے اوندھے ضوابط اور کون سی ترچھی روایتیں ہیں جنھوں نے اس یونیورسٹی (کے متعلقہ شعبوں) کو اس بات کی اجازت نہیں دی کہ تحقیق اور جائزوں (سروے) کے ذریعے مسلمانوں کی تعلیمی، سماجی، اقتصادی اور اخلاقی حالت کے بارے میں باقاعدہ وقفوں کے ساتھ، دستاویزیں مرتب کرتی، نقشے بناتی، اعداد و شمار اور رجحانات و امکانات کا جائزہ لیتی اور اصلاح اور پیش رفت کے منصوبے بناتی۔ علی گڑھ اور اس کے قرب و جوار بلکہ پورے اتر پردیش میں اہلِ حرفہ کی گنجان آبادیاں ہیں، استحصال، گندگی، جہالت، مفلسی اور لاعلمی کا شکار ہیں۔ توسیعی کا[م] سے ان کی حالت سنبھالنے کے لیے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ یہ توسیعی کا[م] اساتذہ کی رہبری میں طالب علم کر سکتے ہیں۔

اب میں اسلامی کردار کا ذکر کروں گا۔ اس کا تقاضہ یہ ہے کہ جو [مسلم] طلبا یہاں تعلیم پائیں ان کو ایسا ماحول، ایسی فضا اور ایسی صحبتیں ملیں کہ وہ [اپنے] دین، ثقافت، روایات، زبانوں اور ادبیات سے اچھی طرح روشناس ہو[ں۔] دین اور ثقافت سے روشناس ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنے اعمال و ا[فعال] اور اپنی زندگی میں بالعموم اسلام اور 'ہندِ اسلامی' روایات اور تہذ[یب] کی ترجمانی کریں۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات یعنی اخوت، حریت (حریتِ فکر [و] اظہار) اور خدمتِ خلق، رحم، تسلیم، صلح اور آشتی پر کاربند ہوں۔ علی گ[ڑھ] کے مسلمان اساتذہ اور طلبا کو چاہیے کہ مذکورہ بالا اوصاف کو اپ[نے] کردار میں راہ دیں اور جہاں تک اسلامی عبادات و روایات کا تعلق ہے[،] کا احترام کریں۔ غیبت، دروغ گوئی، بہتان اور الزام تراشی سے زبان کے دا[من] کو آلودہ نہ ہونے دیں۔ ورنہ یہ سمجھا جائے گا کہ اسلام یہی باتیں سکھاتا [ہے۔] اسلامی کردار کا تقاضا یہ بھی ہے کہ وطن اور اہلِ وطن کے حقوق بلا تامل [ادا] کیے جائیں اور ان کے ساتھ خیر اندیشی کا برتاؤ کیا جائے۔

اسلام کی نظر میں کسب کرنے والا اللہ کا محبوب ہے۔ کاسب ہے جو روٹی کو حلال کر کے کھاتا ہے۔ اس لیے اس ادارے کے اساتذہ عملے کا فرض ہے کہ وہ کسی صورت میں بھی آسائش طلبی، غیر مخلوط خود غرضی تضیعِ وقت اور بے کار اور بے مصرف باتوں کو پاس نہ پھٹکنے دیں۔ تقرروں اور داخلوں میں اولاد اور اقارب اور خوشامدیوں کی خاطر انص[اف] کا خون نہ ہونے دیں۔

علی گڑھ تحریک نے اردو زبان کو پروان چڑھایا اور خود اس [سے] فروغ پایا۔ علی گڑھ کے روایتی اور ہندِ اسلامی کردار کا تقاضا ہے ک[ہ] یونیورسٹی میں اردو کا چلن ہو اور یہاں کے بہترین ذہن ہندوستان میں اردو کے مسایل کو حل کرنے کے لیے خود کو وقف کر دیں۔ علی گڑھ کو تا[ریخی] اعتبار سے اردو زبان و ادب کے فروغ کا سب سے بڑا مرکز ہونا چاہی[ے]

کوئی طالب علم یہاں سے ایسا نہ نکلے جو اردو اخبار نہ پڑھ سکے اور اردو میں خط نہ لکھ سکے ۔ اردو ادب، تحقیق اور تنقید میں حالیہ علی گڑھ کا تذکرہ نہیں آتا ۔ اردو کے ضمن میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو اس کا کھویا ہوا مقام ملنا چاہیے کہ یہ بات اس کے روایتی، تاریخی اور اسلامی کردار کے عین مطابق ہوگی ۔

مسلم یونیورسٹی میں ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز، سینٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز، شعبۂ عربی، شعبۂ فارسی اور شعبۂ تاریخ (عہد وسطیٰ) سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ یہاں کے اسلامی کردار کے خاکے میں آب و رنگ بھریں گے ۔ یہاں اس معیار کی تحقیق ہوگی جس سے ہندوستان اور دنیا کو اسلامی اور ہند اسلامی تمدن و فنون و السنہ و ادبیات و روایات اور تاریخ کو سمجھنے میں مدد ملے گی ۔

طالب علموں کا جہاں تک تعلق ہے، انہیں اس روایت کو دوبارہ زندہ کرنا چاہیے جو بڑوں کی عزت اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت کی تعلیم دیتی ہے، جو یونیورسٹی کے سربراہ اور اس کے اساتذہ کے احترام کا سبق سکھاتی ہے ۔ حدیث نبویؐ ہے کہ

"جو بڑوں کی عزت نہیں کرتا اور چھوٹوں پر شفقت نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے ۔"

علی گڑھ کی سینیئرٹی کی روایت کھوکھلی ہو چکی ہے اور خوف پر مبنی ہے ۔ اس میں جان ڈالنے اور اسے صالح سمت دینے کی ضرورت ہے ۔

اسلام کے اخلاقی فیوض کا انعکاس کرنے کے علاوہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی اقامتی زندگی اس وضع کی ہونی چاہیے کہ باہر سے آنے والا اسے دیکھ کر ہند اسلامی تہذیب کی صداقتوں اور لطافتوں کا صحیح اندازہ لگا سکے ۔

روایتی اور اسلامی کردار اور یونیورسٹی کے شایانِ شان ماحول ان سب کا مطالبہ ہے کہ یونیورسٹی میں فکر اور اظہار کی آزادی رواج پائے لیکن اظہار اس انداز سے ہو کہ جذبات اور صالح روایات کو جراحت نہ پہنچے ۔

اسلامی، تاریخی اور روایتی کردار کا ذکر کرتے ہوئے، ہمیں اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ گذشتہ ایک سو دس سال میں (جب ایم ۔ اے ۔ او کالج ۱۸۷۷ء میں قائم ہوا تھا) ہندوستان میں تبدیلیاں ہوئی ہیں، انقلاب آئے ہیں ۔ اپنی اساس اور غیرت کو محفوظ رکھتے ہوئے ہمیں بدلے ہوئے حالات کے مطابق خود کو ڈھالنا ہوگا ۔ ہمیں ہندوستان کے دوسرے فرقوں کے ساتھ اپنے تعلقات کو استوار کرنا چاہیے ۔ ہمیں جمہوری حکومت کے آداب سیکھنا اور برتنا ہوں گے ۔ ہمیں الگ تھلگ رہنے کی عادت کو تجنا پڑے گا ۔ ہماری امنگیں، آرزوئیں اور حوصلے ملک کی ہمہ جہت اور منصفانہ ترقی اور خوشحالی کے فریم میں پرکشا ہوں گے ۔ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے کا عمل پُر خطر اور امکان سوز ہوتا ہے ۔ علیحدیت اور جزیریت (Insularity) سے گریز اولیٰ ۔ علی گڑھ کو ملک کی تعمیر اور ملت کی اصلاح میں اہم رول ادا کرنا ہے ۔ اس وقت بدبختانہ یہ عالم ہے

او خویش گم است کرا رہبری کند ۔

علی گڑھ کا روایتی کردار، وہ کردار جو سید والا گہر نے اس کے خمیر میں گوندھا تھا، ٹھنڈے دل سے مسائل کو سمجھنے اور پرکھنے اور تدبر اور تفکر کے بعد کسی نتیجے پر پہنچنے والا کردار تھا ۔ ہماری جذبات پرستی نے عقلیت کا فشار زیادہ دن گوارا نہیں کیا اور اسے یونیورسٹی کی سرشت سے اکھاڑ پھینکا ۔ اسلام نے ہمیں تدبر و تفکر کی تعلیم دی، اعتدال اور توازن، صلح و آشتی کا سبق سکھایا، بھڑکنے اور ابلنے اور عنان جذبات کے ہاتھوں میں دینے سے روکا ۔ اس تعلیم کو رسول اکرمؐ کے خادموں کے ایک خادم سید احمد خاں نے دہرایا ۔ ہم نے یہ سبق جلد ہی بھلا دیا اور جلد مشتعل ہو جانے، بھڑک جانے، بہکاوے میں آ جانے، اپنے نفع و نقصان کو بھول جانے کی روش اختیار کر لی ۔ گزشتہ بیتالیس سال میں یہ رفتار بہت تند و تیز ہو گئی ۔ اس کی وجہ سے ہم نے بار بار نقصان اٹھایا پھر بھی نہ چیتے ۔ گزشتہ بیس سال میں ہماری بدقسمتی سے ایک مہلک آمیزہ تیار ہو گیا ۔ یعنی قیادت کی دوراندیش خود غرضیوں کے تحت عام طلبا کے بھڑکائے ہوئے جذبات ۔ اس پُر آشوب دور سے پہلے بھڑکانے والے پہلے خود بھڑکتے تھے پھر بھڑکاتے تھے ۔ وہ حسن نیت کے ساتھ یہ سمجھتے تھے کہ یونیورسٹی کا مفاد ہنگامہ پرور احتجاج کی مانگ کر رہا ہے ۔ گزشتہ بیس سال کے خطرناک دور میں طلبا کے رہنما اپنے سیاسی مستقبل کو بنانے اور سیاسی پارٹیوں کے منظور نظر بننے کی خاطر یونیورسٹی کو داؤں پر لگا کر ہنگامے برپا کرتے رہے ہیں ۔ ان تیرہ روزوں نے یونیورسٹی کے اصلاحی اور تعمیری کردار کو، جب موقع ملا، تخریبی رخ دیا ہے ۔

یونیورسٹی کا اسلامی کردار امن و امان ادب اور لحاظ، صلح اور آشتی، سنجیدگی اور حلم، تحقیق اور جستجو، ریاضت اور کاوش اور کسبِ فضیلت اور یونیورسٹی کے ساتھ وفاشعاری کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ کردار توڑ پھوڑ، بے تمیزی، چیخ پکار، کھوکھلی نعرے بازی، سیاسی داؤں پیچ، سازش، غیبت دشنام طرازی کی اجازت نہیں دیتا۔ یاد رکھیے کہ علی گڑھ ایک جامد یونیورسٹی نہیں ہے۔ اس کے روایتی کردار نے اس کو تحریک کا رُخ دیا ہے۔ کردار کی لاج رکھنے کے لیے علی گڑھ کو ملک کی تعمیر اور ملت کی اصلاح و بہتری کے لیے اہم رول ادا کرنا ہے۔ جس کردار کی بازیابی اس نے کی ہے ہمیں اس کی تعبیر فراخ دلی اور علمی بصیرت کے ساتھ کرنی چاہیے۔ اس کردار کو آپ جو چاہیں نام دیجیے، اقلیتی یا روایتی یا اسلامی کردار۔ یاد رکھیے کردار گداگری کر کے حاصل نہیں کیا جاتا۔ یہ قوت بازو سے بنایا جاتا ہے۔ جو کردار مجلس قانون ساز نے علی گڑھ کو دیا ہے، وہ ایک خاکہ ہے۔ اس میں آب و رنگ بھرنا، اسے قوت سے فعل میں لانا، خیال سے حقیقت میں بدلنا، آپ کا کام ہے۔ کمر کسیے اور ترمیمی ایکٹ کے خاکے میں عمل، تخلیق اور تشویق کا رنگ بھر دیجیے۔

جب تک ہم اپنی زندگی میں صالح اخلاقی قدروں کو ظاہر نہیں کرتے اسلامی کردار کا دعویٰ کرنا مضحکہ خیز ہوگا۔ اسلامی کردار اس کا بھی تقاضہ کرتا ہے کہ یونیورسٹی میں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور وہاں کا ماحول اسلامی روایات کا آئینہ دار ہو۔ اکثریت حاصل کرنے کے لیے مقابلہ اور ریاضت کے مراحل کو خوش دلی کے ساتھ طے کرنا ہوگا۔ یہ بات ہمارے لیے شرمناک ہے کہ ہم اپنے پروفیشنل کالجوں میں باہر والوں کا مقابلہ نہیں کر پاتے ہیں۔ بدنامی کے اس دھبے کو مٹانے کے لیے زبردست اور منظم کوشش کرنا ہوگی۔ یہ کام اساتذہ کے ایثار اور طلباء کی محنت کے ذریعے ہی انجام پا سکتا ہے اور عبوری دور کے لیے غالباً خاص اہتمام کرنا ہے۔ یونیورسٹی کورٹ جو ملک و ملت کی رائے عامہ کا ترجمان ہے اس کو چاہیے کہ اس مسئلہ پر ہوش مندی کے ساتھ غور و فکر کرے اور کوئی ایسی سبیل نکالے کہ مسلمانوں کی تخفیف تناسب کو اور اس سے پھیلنے والی بددلی کو روکا جا سکے۔

اسلامی کردار انصاف اور فضیلت کی مانگ کرتا ہے اس کا کوئی جواز نہیں ہے کہ یونیورسٹی کے اسکول ساری سہولتوں اور استادوں کی بہت اچھی تنخواہوں کے باوجود یونیورسٹی میں داخلے کے معیار کو برابر گراتے جائیں، حالانکہ ہونا اس کے برعکس چاہیے تھا۔ یہ بات ناروا ہے کہ یونیورسٹی کے اسلامی کردار اور ملک گیر کردار کے علی الرغم اس کے داخلوں پر علاقائی چھاپ لگ جائے اور دور دراز کے لائق مسلمان طالب علموں پر علی گڑھ کے قرب و جوار کے نالائق طالب علموں کو ترجیح دی جائے۔ علی گڑھ کو تاریخی، روایتی، اسلامی اور کل ہند کردار (طلبا کے تعاون سے) اساتذہ دے سکتے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو ہلاک کرنا چاہتا ہے تو اس سے حیا چھین لیتا ہے۔ جب اس سے حیا چھن جاتی ہے تو وہ انتہائی قابل نفرت ہو جاتا ہے اور جب وہ قابل نفرت ہو جاتا ہے تو اس سے امانت چھن جاتی ہے اور جب امانت و دیانت چھن جاتی ہے تو صد درجہ خائن ہو جاتا ہے اس سے اللہ کی رحمت چھن جاتی ہے تو وہ انتہائی ملعون ہو جاتا ہے اور جب وہ لائق ملامت ہو جاتا ہے تو اسلام کا قلادہ اس کی گردن سے نکل جاتا ہے۔

(ابن ماجہ)

علی گڑھ کی کچھ یادیں

اسد اللہ خاں*

تہذیب الاخلاق کے شمارے نظر سے گزرے۔ بڑی خوشی ہوئی پرانی یادیں سب تازہ ہو گئیں۔

مجلس ادارت میں ایک نام پروفیسر اسرار احمد صاحب کا بھی موجود پایا یہ نام میرے ایک ساتھی کا بھی تھا۔ گو یہ میرے ساتھی نہ ہوں گے لیکن نام کی مناسبت سے ایک واقعہ جو میں یہاں درج کر رہا ہوں وہ آپ صاحبان کے لیے باعث دلچسپی ہوگا اساتذہ صاحبان کے لیے قابل تقلید ضرور ہوگا۔

یہ واقعہ شاید ۱۹۲۸ء کا ہوگا۔ میں اور اسرار احمد بی ایس سی میں ساتھ پڑھتے تھے۔ کیمسٹری پریکٹیکل دونوں ایک ہی بنچ پر ادا کرتے تھے۔ واقعہ کے دن اتفاق ایسا ہوا کہ دونوں کے پریکٹیکل کچھ وقت سے پہلے ختم ہو گئے۔ اسرار احمد کب نچلا کھڑا رہ سکتا تھا۔ اہمیت کا اندازہ کیے بغیر اس نے گیس اور پانی کے ربر ٹیوب باہم ملا دیئے اور دونوں ٹیپ کھول دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گیس ہولڈر میں پانی بھر گیا اور گیس کی سپلائی بند ہو گئی۔

دوسرا بیچ جو وہاں پہنچا تو اس نے گیس کو بند پایا۔ جب وجہ کی جستجو ہوئی تو ہمارے کرتوت سامنے آ گئے۔ کرنل حیدر صاحب ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ تھے ان کو اطلاع دی گئی۔ خبر کو نہایت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ سنا گیا۔ اپنے ابدی بلا بل لائے ہوئے گیس ہولڈر تک پہنچے۔ اس کو کھلوایا اور بالٹی لے کر اس میں کود گئے۔ بالٹی بھر بھر کر تمام پانی باہر نکال دیا۔ پھر ٹاٹ کا ٹکڑا مانگا اس سے گیس ہولڈر کو خشک کر دیا اور گیس ہولڈر سے باہر نکل آئے۔

وہ باہر تو نکل آئے لیکن باہر آ کر بے ہوش ہو گئے۔ ڈاکٹر بٹ صاحب کو طلب کیا گیا۔ وہ تشریف لائے۔ قاصر کو بہت برا بھلا کہا اور کرنل صاحب کو اپنے موٹر کی پچھلی سیٹ پر لٹا کر اسپتال لے گئے۔ ہوش میں لانے کی تدابیر اختیار کی گئیں۔ کئی گھنٹے گزر جانے کے بعد اُن کو ہوش آیا۔ ڈاکٹر بٹ صاحب نے اپنے موٹر میں بٹھا کر ان کی اقامت گاہ اولڈ بوائز لاج پہنچایا۔

دوسرے دن ہم لوگ معمول کے مطابق ہوسٹلوں سے نکل کر یونیورسٹی پہنچے۔ پہلا گھنٹہ کیمسٹری تھیوری کا تھا۔ کرنل صاحب ہی لیتے تھے۔ ہم اپنے طور پر بہت خوف زدہ تھے کہ خدا جانے کیا افتاد پڑے گی۔ خاطیوں کی گرفت ہو چکی تھی۔ دونوں کے نام معلوم تھے۔ ہماری سیٹیں خود گواہ تھیں۔ مختصر کچھ بھی ہوتا ہم دونوں ایک دوسرے کا نام نہ بتلاتے۔ ظاہر ہے کہ دونوں کو برابر سزائیں ملتیں۔

پورا بیچ لیکچر تھیٹر میں داخل ہوا۔ کرنل صاحب کو مستعد موجود پایا۔ پوری فضا پر امن۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی حادثہ پیش ہی نہیں آیا۔ معمول کے مطابق لیکچر دینا شروع کر دیا۔ یہ تھی ہمارے زمانے میں استادوں کی کرم فرمائیاں کہ لڑکوں کی شرارت کا کوئی اثر نہ لیتے تھے۔ اس کو لڑکوں کا حق جانتے اور درگزر فرما دیتے۔ یہی وجہ تھی کہ طلبا، استادوں پر اپنی جانیں قربان کرنے پر آمادہ رہتے۔ ان کے ہر حکم کی تعمیل کرتے۔ استاد کی سرکردگی میں اپنے اخراجات پر یونیورسٹی کے لیے چندہ وصول کرنے کے لیے ہمراہ ہو جاتے اور ہزاروں روپیہ چندہ وصول کر کے لاتے۔

کرنل حیدر خاں صاحب کشمیر کے رہنے والے تھے۔ نہایت تندرست سرخ سپید، دراز قامت، سینہ چوڑا چکلا، سپہ سالاری واقعی ان کو زیب دیتی تھی۔ سادگی و پرکاری ایسی کہ لٹھے کی سفید قمیص اور خاکی ڈرل کی

---

* : این/بی- ۱۹۷- نارتھ ناظم آباد، کراچی، پاکستان-

پینٹ۔ فرانس کی تیار شدہ۔ دبیز دھلتیں۔ روزانہ جوڑا بدلا جاتا۔ جسم پر بالکل فٹ۔ دیدہ زیب۔ ہر موسم میں یہی ایک لباس۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کو جاڑا معلوم ہی نہ ہوتا تھا۔

بی۔ اے آکسن تھے۔ یونیورسٹی میں اسٹاف کی بڑی کمی تھی۔ تعلیم سے ایسا شغف کہ جس پیریڈ میں پروفیسر نہ ہوتا خود پہنچ جاتے۔ طالب علموں پر کمی کا احساس ہی نہ ہونے دیتے۔ ہر مضمون اعلیٰ قابلیت کے ساتھ پڑھانے پر آمادہ ہو جاتے یہی حال پروفیسر ہادی حسن صاحب کا بھی تھا۔

یہ تو میں اوپر بتا ہی چکا ہوں کہ کرنل صاحب اولڈ بوائز لاج میں رہتے تھے۔ مجھ کو یہ تو معلوم نہیں کہ اُن کو کیا تنخواہ ملتی تھی۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ اپنے ذاتی اخراجات کا اپنے ملازم کو ۳۸۰/- روپے ماہوار پر ٹھیکہ دے چکے تھے۔ بقیہ جو رقم بچتی اس کو میز کی دراز میں ڈال دیتے تھے اور عام اجازت تھی اور سب لڑکے جانتے بھی تھے کہ جس لڑکے کو جس قدر رقم کی ضرورت ہو بلا اجازت دراز میں سے نکالے اور لے جائے اور جب اس کو اپنی رقم وصول ہو جائے تو دراز سے حاصل کردہ رقم کے مساوی اس میں واپس ڈال دے۔ اس عمل کا مقصد یہ تھا کہ تمام حاجت مند طلبا مسلسل فیض پاتے رہیں۔

اس بے حساب رقم سے بے حساب رقوم نکلتی رہتیں اور خدا کے فیوض اور برکات بے حساب ہوتے رہتے۔ یہ رقم کبھی کم نہ ہوتی بلکہ اس میں اضافہ ہوتا ہی رہتا۔ میں ۱۹۲۹ء تک علی گڑھ میں رہا۔ اس وقت تک یہ عمل برابر جاری رہا بعد کا مجھے معلوم نہیں۔

کرنل صاحب کے والد صاحب کشمیر اسٹیٹ میں سیشن جج تھے۔ وہ وہاں سے ہر ماہ ایک تھیلا ڈرائی فروٹس روانہ کرتے۔ ریلوے رسید ملتے ہی کرنل صاحب اس پر دستخط کرکے ملازم کے حوالے کر دیتے اور وہ اسٹیشن سے تھیلا وصول کرتا۔ اس کو کھولتا اور برآمدے میں رکھ دیتا۔ طلبا، منتظر رہتے۔ آتے ہی ایک ایک مٹھی نکالتے اور جیب میں رکھ کر چلتے پھرتے نظر آتے۔ دس پندرہ دن میں تھیلا ختم کر دیتے۔

وطن سے دور ایسے طالب علموں سے محبت صرف کرنل صاحب کو ہی نہ تھی ایسے ہی اے۔ بی۔ اے۔ حلیم صاحب بھی تھے۔ وہ یونیورسٹی کے پرووسٹ تھے۔ بچوں کے اخلاق پر نگراں۔ لیکن شفقت اس کے برعکس تھی۔ سب بچے ان کو ابا حلیم کہتے اور بڑھتے بڑھتے وہ جگت ابا حلیم ہو گئے۔ سب چھوٹے بڑے اسی نام سے پکارتے۔ حافظہ اس بلا کا کہ جب ایک بچہ یا والد یا سرپرست ایک دفعہ مل لے تو پورے متعلقین کی تفصیلات معلوم کر لیتے اور جب اُن میں سے کوئی ملتا تو پوست کندہ حالات بیان کرنے اور سب کے متعلق خیر و عافیت معلوم کرتے کیجیے کہ ان کو گھر کی مرغیوں کی تعداد، بیل اور بھینسوں کی تعداد تک یاد رہ جب کوئی طالب علم ان سے ملنے جاتا تو سب سے پہلے یہ سوال کرتے تکلیف تو نہیں ہے۔ اور خود ہی اپنی جانب سے فرماتے کہ کوئی کسی قسم کی مت اُٹھانا۔ کوئی بھی تکلیف ہو، آدھی رات ہو، تب بھی مجھے اُٹھانا اور بیان کرنا۔ پھر دریافت کرتے روپے پیسے کی ضرورت تو نہیں ہے سے آنے میں دیر سویر ہو ہی جاتی ہے، ان سے مطالبہ نہ کرنا مجھ سے لے اگر وہ ضرورت کا اظہار کرتا تو فوری دے دیتے اور جب واپس کرنے قبول نہ کرتے۔ فرماتے تمہارے والد صاحب میرے پاس رکھ گئے تھے یہ واقعہ نہ ہوتا۔

یونیورسٹی میں ہمیشہ ایک ہی پوسٹ مین رہا۔ وہ ہمیشہ سے خاں صاحب کہلاتے تھے۔ یونیورسٹی میں ہزاروں طالب علم تھے لیکن سب فرداً فرداً پہچانتے۔ ہر مہینے کے شروع میں منی آرڈر آنا شروع ہوتے لڑکا پکارتا،

"خاں صاحب کیا میرا منی آرڈر آیا؟"

تو اس کو نزدیک بلاتے فرماتے،

"منی آرڈر آتا رہے گا۔ تم یہ بتلاؤ کہ کیا روپے کی ضرورت ہے تو مجھ سے لے لو۔

وہ کہتا دس روپے چاہئیں۔ فوراً نکال کر دے دیتے۔ جب منی آرڈر آتا تو دی ہوئی رقم خود وضع نہ کرتے۔ پوری رقم طالب علم کو دے دیتے جب واپس دیتا تو قبول فرما لیتے۔

اب آپ خود ہی فیصلہ فرما دیجیے کہ ایسا علی گڑھ تمام عمر کیا یاد آتا رہے۔ میں اسی سال سے تجاوز کر چکا ہوں لیکن آج تک اس کی یاد ایسی ہی ہے کہ جیسے پہلے تھی۔

خدا حافظ۔

قدیم مصری فلکیات

سید قاسم محمود*

ر اصولوں، نظریوں، فلسفیانہ قیاس آرائی کے عادی نہیں تھے۔ وہ عمل کے عادی تھے۔ ادت اُن کے مزاج کا خاصہ بن گئی تھی جس کا اظہار ان کی فلکیات میں بھی ۔ ان کے نزدیک فلکیات صرف وقت ا چیز تھی، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ نقطۂ نظر ت کا نتیجہ تھا کہ ان کا درباری نظم و نسق، انتظامیہ بہت لمبی چوڑی تھی۔ اہل کاروں کی ظفر موج تھی جو مقررہ تاریخ پر ٹیکس وصول تھے۔ مقررہ تاریخ پر سرکاری تقریبات کرتی تھیں یا دوسرے کام انجام پاتے تھے چاند، ستارے کیا ہیں، کہاں سے آئے ہیں، ئے ہیں، ان کی حقیقت کیا ہے؟ ایسے نظریوں سے وہ کوئی تعلق نہ رکھتے تھے۔ سیاروں کے بارے میں بھی ان کا کوئی واضح اور یہ نہ تھا۔ وہ صرف اتنا سمجھتے تھے کہ سیارے یا۔ بلاشبہ انہوں نے ستاروں کی قسم بندی وپ بندی کی تھی، فہرستیں بنائی تھیں، لیکن لوں سے قطع نظر ان کی قسم بندی بعد کی کے خلاف ثابت ہوئی۔ صرف ایک مثال ریوں نے شمالی آسمان کے ستاروں کی جو ری کی تھی، اس میں سے صرف ایک "دبِ اکبر" کو آج شناخت کیا جا سکتا ہے۔



فرعون اخناتون اور اس کی بیوی نفرتیتی (آتن) (سورج دیوتا) کی پوجا کر رہے ہیں جو قبول دعا کے طور پر انسانیت پر رحمت کی بارش برسا رہا ہے۔ اخناتون نے تمام پرانے دیوتاؤں کا خاتمہ کر کے صرف آتن دیوتا کی پوجا کو جائز قرار دیا لیکن پروہتوں نے اس کے خلاف بغاوت کر دی اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔

کائنات کی تصویر

قدیم مصریوں کے نظریۂ فلک کی ایک واضح مثال کے طور پر کائنات کی وہ تصویر پیش کی جا سکتی ہے جو گرین فیلڈ پیپرس پر ڈرائنگ کی شکل میں آج بھی محفوظ ہے۔ یہ شہزادی نستنی بتاشو کے وصیت نامے کا حصّہ ہے۔ یہ شہزادی ۹۷۰ ق م کے لگ بھگ تھیبز کے مقام پر دیوتا آمن را کے معبد میں راہبہ تھی۔ گویا یہ کاغذ جدید سلطنت کے عہد زوال سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں کائنات کی محض علامتی تصویر پیش کی گئی ہے۔ آسمان نت دیوی کا جسم ہے۔ نچلے حصّے میں زمین پڑی ہوئی ہے۔ جس کی ترجمانی دیوتا قیب کر رہا ہے۔ ہوا کا دیوتا شو درمیان میں دیوی نت کو سہارا دیے کھڑا ہے۔ دیوی ایسی پوزیشن میں کھڑی ہے جیسے لڑکھڑا رہی ہو، اور ابھی دم کے دم میں گر جائے گی۔

اس تصویر کے قریب ہی دو تصویریں اور بنی ہوئی ہیں جن میں دو چھوٹی کشتیاں دیوی نت کے جسم کے اوپر سے گزر رہی ہیں۔ ایک کشتی میں سورج ہے، دوسری میں چاند۔ ایسی تصویریں مذہبی اہمیت رکھنے کی وجہ سے مقدس

* حاجی بلڈنگ، حسن علی آفندی روڈ، کراچی، پاکستان

خیال کی جاتی تھیں۔ ان کو مذہبی تقدس اس لیے حاصل ہوا تھا کہ قدیم مصری ہیئت داں پروہت بھی ہوتے تھے۔ لوگوں کی مذہبی رسوم پروہت (ہیئت داں) ہی انجام دے سکتا تھا۔

قدیم مصر کی ان فلکیاتی تصویروں سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ لوگ مادی کائنات کے بارے میں کیا نظریات اور کیا خیالات رکھتے تھے۔ صرف اتنا ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مادی کائنات کو لمبوتری شکل میں دیکھتے تھے اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اُن کا مصر ایک لمبوترا اور تنگ پٹی کی شکل کا جغرافیہ رکھتا ہے۔ وہ کائنات کو بھی لمبوترا اور تنگ پٹی جیسا خیال کرتے تھے۔

تکوینِ کائنات

مادی کائنات کی ہیئت و ماہیت سے عدم دلچسپی کی وجہ ظاہر ہے ہیئت داں کی دلچسپی پروہت ہونے کی وجہ سے کہیں اور تھی۔ وہ صرف حیات بعد الموت پر توجہ دیتا تھا۔ ہم اس بات کو مدّنظر رکھیں تو گرین فیلڈ پیپرس میں نت، شو اور قیب کی تصویروں کے معانی بھی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ یہ گویا تخلیق کائنات کے بارے میں اُن کے مذہبی عقیدے کی تصویریں (دیو مالائی) ہیں کائنات کی تکوین کے بارے میں اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ ابتدا میں ایک سیلاب آیا تھا جس سے خشکی کی ایک پہاڑی پیدا ہوئی۔ ابتدائی زندہ اشیاء اس پہاڑی پر پیدا ہوئیں۔ تکوین کائنات کو سیلاب سے منسوب کرنے کی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ دریائے نیل میں ہر سال سیلاب آتا تھا۔

اس نظریے کی بنیاد پر رفتہ رفتہ ایک دیو مالا (مذہبی عقیدہ) بنتی گئی۔ مصری دیومالا کی رُو سے کہ دیوتاؤں کا دیوتا آتم تھا۔ اس نے تھوکا تو اُس کے تھوک سے دیوتاؤں کا پہلا جوڑا برآمد ہوا، شو (ہوا) اور تفنت (پانی) جب یہ دونوں نیچے کی طرف آرہے تھے۔ تو شو دیوتا نے اپنی ایک ہی پھونک سے آسمان (نت) کو زمین (قیب) سے جُدا کر دیا۔

پروہت کی جیت

بعد میں ان پانچ بنیادی دیوتاؤں میں زرخیزی کا دیوتا اوسیرس بھی شامل ہوگیا اور اس کی بیوی آسس اور اس کا بھائی اور قاتل سیت، جس کی بیوی نفتیس، اس خاندان کی میزبان اول کی حیثیت رکھتی تھی آسس کے بطن سے اوسیرس کا ایک بیٹا ہورس پیدا ہوا۔ اس کی زندہ تجسیم وہ فرعون ہوتا تھا جو اس وقت حکمراں ہوتا تھا۔ آتم دیوتا سورج دیوتا کی ایک شکل سمجھا جاتا تھا اس کے چاروں پیدا کردہ دیوتا اور اوسیرس اور اس کا کنبہ مل کر ایک بڑا خاندان بن گئے اور "بنی نت" کہلائے۔ یوں کائنات کا رشتہ خود بخود دوسری دنیا یعنی حیات بعد الممات سے قایم ہوگیا۔ یہ پروہت ہیئت داں کی دلچسپی کی چیز تو ہے لیکن سائنس داں کی دلچسپی کی چیز نہیں جو کائنات کا خالص مادی نقطہ نظر اپنا کر ہی سوچتا اور تحقیق کرتا ہے۔ پروہت کے دل میں اس قسم کی کوئی خواہش پیدا نہیں ہوتی کہ وہ یہ جانے کہ ستارے کس چیز سے بنے ہیں، کب پیدا ہوئے اور کیوں کر پیدا ہوئے۔ نئے ستارے کیا ہوتے ہیں۔ بڈھے ستارے کیا ہیں۔ وہ صرف روحانی دنیا کا شیدائی ہوتا ہے مادی دنیا کا تمنائی نہیں ہوتا۔ قدیم مصر کا پروہت بہت با اختیار اور طاقت ور ہوتا تھا۔ صرف ایک مثال کا حوالہ دینا کافی ہے۔ امن دیوتا کے معبد کا پروہت اتنا طاقت ور تھا کہ اس نے حکم جاری کر دیا تھا کہ کافر فرعون اخناتون (جس نے پہلے دیوتا کی پوجا ممنوع قرار دے دی تھی) کے تمام سرکاری احکام کالعدم قرار دیے جاتے ہیں، اس کی جاری کردہ دستاویزات منسوخ کی جاتی ہیں اس کا سر یادگاری مجسمہ توڑ دیا جائے۔ اس کی یاد دلوں سے بھلا دی جائے۔ اپنے ہونٹوں پر اس کا ذکر لانے والے کافر اور قابلِ سزا ہیں نتیجہ یہ ہوا کہ اخناتون نے جو اجتہاد کیا تھا وہ پروہت کی طاقت تلے



آسمان کی دیوی نت کو ہوا کا دیوتا شو اور زمین کا دیوتا قیب سہارا دیئے ہوئے ہے۔

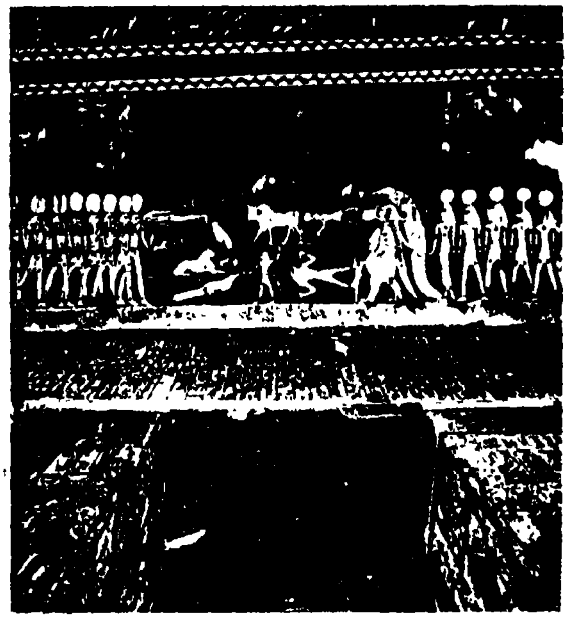
یا۔ سائنس داں ہار گیا اور علم کے پرانے محافظوں کی جیت ہوئی اور کائنات وہی پرانا، روایتی جما جمایا نظریہ جاری و ساری رہا۔ اس میں نیا خون شامل ہو سکا۔ ایک عام مصری کے نزدیک آتم دیوتا سے فرعون وقت فرعون تک تنے بھی حکمران گزرے تھے وہ سب حیات بعد الموت پر یقین رکھتے تھے۔ یہ دنیا انی ہے۔ اصل دنیا وہی ہے جو مرنے کے بعد آئے گی۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا قدیم مصر کا پروہت ہیئت داں یہ نظریہ رکھتا تھا ہیئت افلاک کا صرف ایک فائدہ ہے کہ وقت کے تعین میں اُن سے مدد تی ہے۔ ستاروں اور ان کے جھرمٹوں ے صرف سورج کی حرکت معلوم کرنے کام لیا جا سکتا ہے کہ کس مہینے میں ورج کہاں ہو گا۔ سورج کی حرکت ے موسموں کا تعین کر لیا جاتا تھا۔ چنانچہ وں نے ایک اچھا خاصہ کیلنڈر بھی الیا تھا۔ وہ کیلنڈر فلکیات کے قاصد کو تو پورا نہیں کر سکتا تھا، تاہم دیم زمانے میں کسی بھی قوم یا ملک ں جتنے بھی کیلنڈر بنائے گئے تھے ں میں سب سے اچھا اور صحیح مصری لنڈر تھا۔

اولین کیلنڈر

مصریوں کو شروع ہی میں یہ وم ہو گیا تھا کہ دریائے نیل سال کے سال جو سیلاب آتا ہے اُس کا تعلق ایک اہم اور واضح یانی واقعے سے ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ پو پھٹنے سے پہلے مشرقی افق پر سے روشن ستارہ شعریٰ یمانی، ایک مخصوص عرصے تک اوجھل رہنے کے ودار ہوتا ہے۔ مصر کے صاف شفاف آسمان پر اس کا اچانک نمودار ایک غیر معمولی منظر ہوتا ہو گا۔ شعریٰ یمانی کے اس خوشگوار ظہور کو "سال ند" قرار دیا گیا۔ سال کا پہلا مہینہ اور یوں کیلنڈر کا آغاز ہوا۔ اولین لنڈر کے بارہ مہینے تھے۔ ہر مہینہ ۲۹ یا ۳۰ دن کا ہوتا تھا۔ اس کا تعلق

چاند کی ½ ۲۹ دن والی گردش سے جوڑ دیا گیا۔ یوں پورا سال ۳۵۴ دن کا ہو گیا۔ فرق کی کسر پوری کرنے کے لیے ہر دو یا تین سال کے بعد ایک اضافی مہینہ بڑھا دیا جاتا تھا۔ مصری کیلنڈر پہلے خاندان کے عہد (۳۱۰۰ تا ۲۶۸۶ ق م) ہی میں بن گیا تھا۔ جب وقت کے ساتھ ساتھ انتظامی ڈھانچہ زیادہ مضبوط اور وسیع ہو گیا، قواعد و ضوابط بننے لگے تو زیادہ صحیح موسمی کیلنڈر کی ضرورت پیش آئی، جس میں دو دو یا تین تین سال کے بعد ایک اضافی مہینہ نہ بڑھایا جائے اور نہ مہینے چھوٹے بڑے ہوں، کوئی انتیس دن کا، کوئی تیس دن کا۔



فرعون سیتی اول (۱۳۱۸–۱۳۰۴ ق م) کے مقبرے کی چھت پر موجود ہائے بُرج کی نقشی تصویریں۔

چنانچہ ۳۶۵ دن کا موسمی سال مقرر ہوا۔ اس کی پیمائش یوں کی گئی کہ ایک لاٹھی زمین پر عموداً کھڑی کر دی گئی اور ہر روز دوپہر کے وقت اس کے سائے کی بدلتی ہوئی لمبائی ماپ لی گئی۔ یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ جب ادلتے بدلتے موسموں کے ساتھ سورج کے سائے بھی گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔ گرمیوں میں سورج اوپر ہو جاتا ہے اور دوپہر کے وقت سایہ گھٹنے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ وسطِ گرما میں سایہ کم سے کم رہ جاتا ہے۔ اسی طرح سردیوں میں دوپہر کے وقت سایہ بڑھنے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ وسط سرما میں سایہ زیادہ سے زیادہ ہوتا ہے۔ قدیم مصری بھی اس فلکیاتی مشاہدے سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ انہوں نے بعض فلکی مظاہر کے ساتھ چند یادگاریں اور تعبیرات منسوب کر رکھی تھیں۔ مثلاً شعریٰ یمانی کے ظہور کا مطلب ہے نئے سال کا آغاز، وسطِ گرما میں چھوٹے سائے کا مطلب ہے فصل کی کٹائی سایوں کی یومیہ پیمائش کے تجربوں اور مشاہدوں سے طے پا گیا کہ ایک سال ۳۶۵ دن کے برابر ہونا چاہیے۔

نیا کیلنڈر بناتے وقت انتظامیہ نے سال کے تین موسم برقرار

رکھے، جو ایک مدت سے چلے آ رہے تھے یعنی سیلاب، پھر لوائی، پھر کٹائی۔ ہر موسم چار مہینوں کا تھا۔ ہر مہینے کے تیس دن تھے۔ اس حساب سے ایک سال ۳۶۰ دن کا ہوا۔ پانچ دن کا اضافہ کر لیا جاتا تھا۔ ایک ہفتہ دس دنوں کا شمار ہوتا تھا۔ یہ ایک عملی کیلنڈر تھا اور موسموں کی بنیاد پر تہذیب یافتہ آدمی کا پہلا کیلنڈر، جو روزمرہ کی عملی زندگی میں کام آتا تھا۔

ہمارا موجودہ دن تو رات کے بارہ بجے سے رات کے بارہ بجے تک شمار ہوتا ہے لیکن قدیم مصر میں ایک دن طلوع آفتاب سے طلوع آفتاب تک ہوتا تھا۔ ایک دن کے بارہ بارہ گھنٹے کے دو وقفے ہوتے تھے۔ دن کو برابر برابر کے دو حصوں میں تقسیم کرنے کا سہرا مصریوں کے سر ہے۔ بارہ گھنٹے کی "اکائی" اس لیے مقرر کی گئی کہ اس اکائی کے اندر اندر ستارے ابھرتے بھی تھے اور ڈوب بھی جاتے تھے۔

دن کے گھنٹے دھوپ گھڑیوں، بلکہ زیادہ صحیح لفظوں میں سایہ گھڑیوں سے ناپے جاتے تھے۔ یہ زیادہ مشکل کام نہ تھا۔ فرعون توتمس ثالث (۱۴۹۰ تا ۱۴۳۶ ق م) کے زمانے سے طریقہ چلا آ رہا تھا۔ لکڑی کی ایک سپاٹ تختی کو پانچ مساوی حصوں میں تقسیم کر کے اس پر نشان لگا دیے جاتے تھے۔ لکڑی کے ایک سرے پر افقی ڈنڈا باندھ دیا جاتا تھا، جس کا سایہ نشانوں پر پڑتا رہتا تھا۔ فی الحقیقت اس پیمانے سے صرف دس گھنٹوں کی پیمائش ہو سکتی تھی کیوں کہ پہلا اور آخری گھنٹہ جھٹپٹے میں چھپے رہتے تھے۔ پو پھٹتے وقت اور شام کو غروب آفتاب کے وقت سورج کا سایہ نہیں ہوتا۔

فرعون آمن ہوتپ (۱۳۹۷ تا ۱۳۶۰ ق م) کے عہد کی ایک مصری آبی گھڑی اب تک محفوظ ہے جس میں ۱۵۴۰ ق م تک کیلنڈر کی صورت حال دکھائی گئی۔ گویا فرعونوں کے آٹھویں خاندان کی ایجاد ہے۔ آبی گھڑیوں کے بعد ستارہ گھنٹے ایجاد ہوئے جو دھوپ گھڑیوں اور آبی گھڑیوں سے زیادہ صحیح اور مستند تھے۔ یہ رنگین ہوتے تھے۔ فرعون رعمیس (۱۱۴۲ ق م) اور اس کے جانشینوں کے مقبروں پر رنگین ستارہ گھنٹے بنے ہوئے ہیں۔

دائرۃ البروج

بالائی مصر میں دندرا کے مقام پر اوسیرس کے معبد کی چھت میں ایک دائرۃ البروج بنایا ہوا ہے۔ اس معبد کی تعمیر ۳۰ ق م میں ہوئی گویا دائرۃ البروج قدیم مصریوں کو بہت بعد میں اس وقت معلوم ہوا جب یونانیوں نے تیسری صدی (قبل مسیح) میں مصر پر قبضہ کیا۔ اس سے پہ کبھی مصریوں نے سیاروں کی گردش دائرۃ البروج، طریق شمس وغیر سے دلچسپی نہیں لی۔ شخصی زائچے بنانے کا خیال مصریوں کو اس وقت آیا جب چھٹی صدی قبل مسیح میں ایران نے مصر پر حملہ کیا تھا۔ قد مصری ہیئت داں سیاروں سے تو واقف تھے، لیکن وہ صرف اِن مذہبی اور روحانی اہمیت پر زور دیا کرتے تھے۔ ان کی گردش او زمین پر اُن کے اثرات سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ سیارے اُ کی نظر میں دیوتا ہورس کے مختلف روپ تھے۔ مشتری ہورس تھا دو دنیاؤں کو روشن رکھتا ہے۔ زحل ہورس تھا جو آسمان کا بیل ہ مریخ افق کا ہورس تھا۔ سیاروں کو اُن کی صفات کے اعتبار کوئی خاص نام دینا اور بات ہے، اور ان خصوصیات کی بنیاد کسی شخص کی تاریخ پیدائش کے حساب سے اُس کی زندگی کا زائچہ اور بات ہے۔

> "دورِ وسطیٰ کا خاص کارنامہ اور ایسا کارنامہ کہ جس کی طرف نظر کم جاتی ہے، یہ ہے کہ اس دور نے تحقیقات کا شوق پیدا کر دیا اور اس عمل کا سہرا بارہویں صدی تک مسلمانوں کے سر بندھا رہا۔"
>
> سارٹن۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ - جلد ۷، شمارہ ۴ (اپریل ۸۸ء)

انسدادِ گداگری

عبدالستار انصاری*

بھیک مانگنا معاشرہ کی ایک بڑی لعنت ہے۔ سماج کے چہرے ایک بدنما داغ ہے جس کا مٹا دینا ایک صحت مند سماج کے لیے نہایت روری ہے۔

مغربی ممالک اس لعنت سے پاک ہیں لیکن ہمارے ملک میں یہ نت وبا کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ اتر، دکھن، پورب، پچھم جہاں بھی یے۔ عبادت گاہوں، بزرگوں کے مزاروں، سنتوں کی سمادھیوں لوے اور بس اسٹیشنوں، پارکوں، ندیوں کے گھاٹوں اور میلے ٹھیلوں ں گداگروں کی کثیر تعداد پائی جاتی ہے۔ یہ گداگر عبادت گزاروں، باریوں، عقیدت مندوں، سیاحوں اور مسافروں کے لیے وبالِ ان بنے رہتے ہیں۔ ان سے بچ کر نکلنا محال ہے۔ اپنی گندگی اور ر لاظت سے وہ تمام فضا کو مسموم اور تمام ماحول کو گھناونا بنا دیتے یا۔

محلے، بازاروں اور دیگر رہائش گاہوں میں عموماً ہر روز اور گل اور جمعرات کو خصوصاً ان گداگروں کو ایک مکان سے دوسرے کان اور ایک دوکان سے دوسری دوکان پر بھیک مانگتے دیکھا جا سکتا ہے۔ ان گداگروں میں بیمار، اپاہج، کوڑھی، بچے، بوڑھے، یتیم، بیوائیں ہی نہیں ہوتیں بلکہ تندرست و توانا ہٹے کٹے مسٹنڈے جوان بھی وتے ہیں جن کو دیکھنے سے ہی ہیبت طاری ہوتی ہے۔

گداگری کی بہت سی وجوہ ہیں۔ ان میں سب سے بڑی وجہ ہمارے مذہبی عقائد ہیں جو اس لعنت کو بہت بڑی حد تک فروغ دینے کے ذمہ دار ہیں۔

ہمارے ہم وطن بنیادی طور پر مذہبی ہیں اور روحانیت سے ان کا گہرا لگاؤ ہے۔ مذہبی عقاید کے لحاظ سے خیرات کرنا اور دان کرنا ایک مذہبی فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے ہر سائیں، سادھو، فقیر کو بھیک دینا ثواب میں شامل ہے۔ عام طور سے ہر منگل اور جمعرات کو اور دیگر تقریبات کے مواقع پر سائلوں، فقیروں، سادھوؤں اور دیگر مانگنے والوں کو تلاش کر کے بھیک دی جاتی ہے۔ موت اور خوشی کی کوئی رسم ایسی نہیں ہوتی کہ جس کی ادائیگی کے موقع پر بھیک دینا ضروری نہ سمجھا جاتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جتنے گداگر ہمارے ملک میں پائے جاتے ہیں، اتنے کسی اور ملک میں نہیں ملتے۔

ہر مذہب نے غریبوں، محتاجوں اور حاجت مندوں کی امداد کرنے پر تو زور دیا ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ سماج کے ایسے طبقے کو جس کے افراد تندرست و توانا اور اپنی روزی خود کمانے کے قابل ہوں اور جنہوں نے بھیک مانگنے ہی کو اپنا پیشہ بنا لیا ہو، ان کی ہمت افزائی کی جائے۔ مستحق اور غیر مستحق کا لحاظ کیے بغیر ان کو بھیک دی جائے اور اس طرح معاشرے کے ایک حصہ کو بالکل کاہل الوجود اور ناکارہ بنا دیا جائے۔

گداگری کی لعنت کو دور کرنے کے لیے ہمیں اپنے عقاید کی اصلاح

* سابق او۔ ایس۔ ڈی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

کرنی ہوگی۔ مذہبی تعلیمات کو صحیح طریقے پر سمجھنا ہوگا۔ افسوس یہ ہے کہ نہ اب تک مذہبی رہبروں نے اس طرف کوئی توجہ دی ہے اور نہ دیگر مصلحان قوم ہی نے اس کو دور کرنے کی طرف کوئی موثر قدم اٹھایا ہے۔

اکثر و بیشتر تندرست و توانا اور خوش پوش بھیک منگے صاحب جائیداد بھی ہوتے ہیں اور ان کے خاندان بھی ہوتے ہیں، مگر ان کو بھیک مانگتے شرم نہیں آتی۔ اس لیے کہ وہ اسے ایک جائز پیشہ سمجھتے ہیں۔ ان کے یہاں یہ پیشہ ان کے آبا و اجداد سے چلا آتا ہے۔ ایسے گداگر باعث ننگ قوم و وطن ہیں اور سماج کے لیے ایک لعنت۔ ایسے پیشہ ور گداگروں کو بھیک نہ دینے کے لیے ایک زبردست مہم چلانے کی ضرورت ہے اور لوگوں کو یہ سمجھانا ہے کہ ایسے گداگروں کو بھیک دینا کوئی کار ثواب نہیں ہے حکومت وقت کو چاہیے کہ ایسے گداگروں کے لیے ایسے ادارے قایم کیے جائیں جہاں ان سے جبری کام لیا جائے اور اگر وہ بھیک مانگتے پائے جائیں تو اُن کو قرار واقعی سزا دی جائے۔ اس طرح ایک جانب یہ لعنت دور ہوگی تو دوسری طرف یہ ناکارہ اور مہمل طبقہ سماج کے لیے ایک سود مند عنصر بن جائے گا۔

اپاہج، کوڑھی اور بیمار ضعیف گداگروں کے لیے ایسے ادارے قایم کیے جائیں کہ جہاں ان کا مفت علاج ہو سکے اور جہاں ان کے خورد و نوش کا معقول انتظام ہو۔ اس کے لیے گورنمنٹ اور پبلک دونوں کا تعاون ضروری ہے۔ پبلک کے جو مخیر حضرات ایسے حاجت مندوں کی امداد کرنا چاہیں وہ اپنے عطیات ایسے اداروں میں بھیج دیں جن کے متعلق انتظام کے لیے گورنمنٹ اور پبلک کے نمائندوں کی مشترکہ کمیٹی تشکیل کی جائے۔ اس طرح ایسے گداگر نہ تو گلی کوچوں اور شہروں کی شاہراہوں پر گھوم کر اس کی فضا کو مسموم کر سکیں گے اور نہ عبادت گزاروں، سیاحوں اور تاجروں کے لیے وبال جان ہوں گے۔

گداگری سے ہماری سیاحی کی صنعت کو بہت نقصان پہنچ رہا ہے۔ ان گندے، غلیظ بھیک منگوں کی وجہ سے غیر ممالک سے آئے ہوئے سیاح بہت کتراتے ہیں اور ہندوستان کے بجائے دیگر ممالک میں جانا پسند کرتے ہیں جہاں انہیں گداگروں سے دوچار ہونا نہ پڑے۔

معذور اور تندرست گداگروں کے علاوہ ایک کثیر تعداد ان بچوں کی ہوتی ہے جو بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔ ان بچوں میں اکثر و بیشتر اپاہج اور اندھے ہوتے ہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ یہ لاوارث بچے نہ پیدائشی اپاہج ہوتے ہیں اور نہ اندھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ایسے بچوں کو صغر سنی میں اغوا کر کے معذور اور اندھا بنا دیا جاتا ہے اور انہیں بھیک مانگنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ سماج میں ایک طبقہ ایسے بدکردار لوگوں کا پایا جاتا ہے جن کا پیشہ ہی اغوا شدہ بچوں کو اپاہج اور اندھا بنا کر بھیک منگوانا ہے۔ ایسے سماج دشمن عناصر سے جو معصوم بچوں کی زندگی تباہ کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں نہ صرف خبردار رہنا ہے بلکہ ان کا سختی استحصال کرنا ضروری ہے۔ حکومت وقت اور سماجی کارکنوں کو اس طرف توجہ دے کر ان کو عوام کے سامنے بے نقاب کرنا اور ان کی مجرمانہ کارروائیوں کے لیے سزا دلوانا ہے اور سزا بھی ایسی جو دوسروں کے لیے باعث عبرت ہو۔

ان بدنصیب بچوں میں سے کچھ کو اپاہج اور اندھا نہ بنا کر ان کو گرہ کاٹنے کی تربیت دی جاتی ہے اور اس طرح ان معصوموں کو بچپن ہی سے جرائم کی دنیا میں دھکیل دیا جاتا ہے جہاں وہ بڑے ہو کر ڈاکو اور قاتل بن جاتے ہیں۔ اگر ان نونہالوں کی زندگیوں کو سنوارنا ہے تو ان کو مجرم اور بھکاری بنانے والے سماج دشمن عناصر کی بیخ کنی کرنی ہوگی۔

گداگروں میں ایک طبقہ عورتوں پر بھی مشتمل ہوتا ہے جن میں جوان بھی ہوتی ہیں اور بوڑھی بھی۔ یہ بدقسمت عورتیں عام طور سے وہ ہیں جو بیوہ ہو جاتی ہیں اور بیوہ ہو جانے پر ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جاتا ہے۔ انھیں نہ ان کی سسرال میں پناہ ملتی ہے نہ میکے میں۔ اس کے ناکردہ گناہوں پر انھیں منحوس قرار دے کر در در کی ٹھوکریں کھانے کے لیے گھروں سے نکال دیا جاتا ہے۔ پھر ان بے آسرا عورتوں کے اپنی گزر اوقات کے واسطے بجز بھیک مانگنے کے اور کوئی چارہ نہ رہ جاتا۔ ان میں سے بہت سی جوان لڑکیاں سماج دشمن عناصر کے ہاتھ میں آ کر عصمت فروشی پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ ان کو گداگری اور عصمت فروشی سے بچانے کے لیے سماجی اصلاح کی ضرورت ہے۔ رہنمایان

کا فرض ہے کہ وہ ان بدقسمت عورتوں کو سماج میں ان کا صحیح مقام دلائیں۔ عوام کو یہ بتائیں کہ یہ عورتیں بے قصور ہیں اور انہیں بھی باعزت زندگی گزارنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ شادی شدہ عورتوں کو۔

بیواؤں کی شادیاں کرانے کی لوگوں کو ترغیب دی جائے۔ ان کے سسرال اور گھر والوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ یا تو ان بیواؤں کو گھروں میں رکھ کر ان کی پرورش کریں یا ان کو نان ونفقہ دیں جس سے وہ بھیک مانگنے یا عصمت فروشی پر مجبور نہ ہوں۔ ان کے لیے ایسے ادارے قائم کیے جائیں کہ جہاں اُن کو کوئی چھوٹی موٹی گھریلو صنعت سکھائی جائے جس سے وہ باعزت طریقے پر اپنی گزر بسر کر سکیں۔

ان بدقسمت عورتوں میں ان کا بھی شمار ہے جن کے شوہر تلاش معاش میں گاؤں سے شہروں میں چلے آتے ہیں اور روزگار نہ ملنے پر ان عورتوں کو یوں ہی بے سہارا چھوڑ جاتے ہیں۔

گداگری کی لعنت کو ختم کرنے کے لیے حکومت نے چند سال قبل کچھ قوانین مرتب کیے تھے، مگر ان پر خاطر خواہ عمل نہ ہو سکا۔ کچھ تو قوانین ہی میں خامیاں تھیں اور کچھ افسران کی عدم دلچسپی اور لاپرواہی نے ان کو غیر موثر بنا دیا مگر آج تک حکومت نے اس بات کا جائزہ نہیں لیا کہ یہ قوانین عمل میں کیوں نہیں آسکے اور کون افسران ان کے لیے ذمہ دار ہیں۔

اب بھی چند شہروں میں (Beggar's Home) ہیں مگر ان کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ جو بھکاری ان میں رکھے بھی جاتے ہیں وہ کھلے بندوں ان میں سے نکل کر گداگری کرتے ہیں۔ یہ ادارے محض نام کے لیے ہیں۔ ضرورت ہے کہ انسداد گداگری کے لیے از سر نو مکمل قوانین مرتب کیے جائیں اور ان پر سختی سے عمل درآمد کیا جائے سماج کے مخیر اور صاحب ثروت اصحاب کی مدد سے کہ معذوروں، عورتوں، بچوں کے لیے اچھے یتیم خانے، دودھوا آشرم، اناتھ آشرم، قائم کیے جائیں جہاں اُن کے خورد و نوش اور رہن سہن کا معقول انتظام ہو اور جہاں ان کو گھریلو دھندوں کی تربیت دی جائے جس کو سیکھ کر وہ اپنی روزی خود کمانے کے قابل ہو سکیں۔ بچوں کی تعلیم کا بھی معقول انتظام کیا جائے تاکہ یہ ہونہار پڑھ لکھ کر معاشرے کے مفید جز بن سکیں اس طرح ان کو جرائم کی دنیا سے محفوظ رکھا جا سکے۔

گداگری کو غیر قانونی فعل قرار دیا جائے اور جو تندرست توانا بھیک مانگتے نظر آئیں ان کو Work Houses میں لے جا کر ان سے کام کرایا جائے۔

قوانین بنانے کے ساتھ ساتھ سماجی اصلاح کی بھی ضرورت ہے جس کے ذریعے سے عوام کا شعور بیدار کیا جائے۔ وہ گداگری کو قابل نفرت فعل سمجھیں۔ اپنے مذہبی عقاید میں تبدیلی لائیں۔ غریبوں، محتاجوں کی امداد منصوبہ بندی کے ساتھ کریں۔ بیواؤں اور دیگر زمانے کی ستائی عورتوں کو سماج میں ان کا جائز مقام دلائیں۔

لاوارث بچوں کی تعلیم و تربیت کا کام کریں جو سماج دشمن عناصر چھوٹے اور معصوم بچوں کو اغوا کر کے اور انہیں محتاج اور اندھا بنا کر گداگری کے لیے مجبور کرتے ہیں، ان سے سختی سے نبٹا جائے۔

ملک اور قوم کو خوشحال بنانے کے لیے گداگری کا استحصال نہایت ضروری ہے۔ جس کے لیے حکومت اور پبلک دونوں کے تعاون کی ضرورت ہے۔

> اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے، یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانشمندوں کے لیے۔
>
> (قرآن کریم۔ سورہ روم ۲۲)

مولانا محمد یوسف کوکن

جامعہ دارالعلوم عمرآباد کا ایک نامور فرزند

ابوعلی اثری*

ارکاٹ کے شمالی حصے میں آمبور کے قریب عمرآباد میں جامعہ دارالسلام کے نام سے دہلی کے ایک دریادل، فیاض اور مخیر تاجر کاکا محمد عمر مرحوم کی کوششوں سے ۱۹۲۴ء سے دیوبند اور ندوہ کی حیثیت کی ایک عظیم عربی درسگاہ قایم ہے جس کی عالی شان عمارتیں ایک وسیع رقبۂ زمین پر پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ پہلے ویرانہ تھا، ۱۹۲۲ء میں اس ویرانے کی قسمت جاگی۔ روشن کمپنی کے شریک غالب حاجی کاکا محمد عمر نے جو ان اطراف کے ایک مخلص، کتاب وسنت کے پابند اور موحد تاجر تھے۔ انہوں نے سالہا سال امرت سر میں رہ کر مولانا عبداللہ صاحب غزنوی سے فیض اٹھایا اور دینی تربیت حاصل کی۔ وہاں سے علم و دین کی دولت لے کر اپنے وطن ارکاٹ میں آئے تو اس ویرانے کو خریدا اور اس کو اپنا مسکن بنایا اور اپنے نام کی نسبت سے اس کا نام عمرآباد رکھا اور یہاں دارالعلوم کے نام سے ایک عربی مدرسہ قایم کیا، جس کو اپنی نوعیت افادیت اور فیض رسانی کے لحاظ سے مدراس کا دارالعلوم ندوۃ العلماء سمجھنا چاہیے۔ اس میں بھی نصاب مختصر رکھا گیا ہے، معقولات کو کم کیا گیا ہے، دینیات میں قرآن وحدیث وفقہ کی تعلیم پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ انگریزی بھی عربی کے ہر درجے کے ساتھ لازمی اور ضروری قرار دے دی گئی ہے۔ کتب خانہ بھی ہے، لڑکوں کے رہنے کے لیے دار الاقامہ بھی بنایا گیا ہے، مسجد بھی ہے جس میں پنج وقتہ باضابطہ نمازیں پڑھی جاتی ہیں، جمعہ بھی ہوتا ہے۔ مدراس اور ہندوستان کے مختلف صوبوں اور شہروں سے لایق مدرس اکٹھا کیے گئے ہیں۔ حنفی اور اہلحدیث، مقلد یا غیر مقلد کا کوئی امتیاز روا نہیں رکھا گیا ہے۔ دونوں ہی اپنے مسلک پر قایم رہ کر، درس وتدریس کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ گروہی عصبیت اور فقہی تعصب وہاں نام کو بھی نہیں ہے۔ طالب علموں کی تعلیم وتربیت پر خاص طور سے کوشش صرف کی جارہی ہے۔ باوجود متعدد مقامی زبانوں کے جن میں سے بعض بعض اپنا ادب بھی رکھتی ہیں اور ان کے بولنے والے اپنی زبان اور ادب کو زندہ رکھنے کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دے چکے ہیں، خود سوزی بھی کی ہے، یہاں کا ذریعۂ تعلیم ہندوستان کے تمام عربی مدرسوں کی طرح اردو ہی رکھا گیا ہے اسی زبان میں اساتذہ طلباء کو تعلیم دیتے ہیں اور کتاب کے معانی ومطالب سمجھاتے ہیں۔ مصحف کے نام سے یہاں سے ایک اردو رسالہ بھی نکلتا ہے ایک پریس بھی قایم ہے۔ جس میں مدرسے سے متعلق تمام چیزیں چھپتی ہیں۔ یہ جامعہ ۱۹۲۴ء میں قایم ہوا اور دو ہی برس کے اندر ۱۹۲۶ء میں اس درسگاہ کی عمارت تیار ہوئی۔ اس درسگاہ کے قریب حاجی محمد عمر کاکا کے بڑے صاحب زادے کاکا محمد اسماعیل نے ایک محمدیہ انگلش اسکول بھی قایم کیا ہے۔ اس کی الگ پرشکوہ عمارت ہے۔ اس میں مسلمان بچوں سے زیادہ غیر مسلم بچے اور بچیاں پڑھتی ہیں۔ ہر مسلم اور غیر مسلم طالب علم کے لیے اردو لازمی ہے یعنی اردو پڑھنا ضروری ہے۔ اس سے مدراس میں عربی ودینی تعلیم کے ساتھ اردو کی بھی اشاعت خوب ہو رہی ہے۔ یہاں کے ہندو بچے اور بچیاں حمد ونعت کے اردو اشعار پڑھتے ہیں تو سننے والوں کو بڑا مزہ آتا ہے۔ اس درسگاہ کے تقسیم اسناد کے جلسے کے موقع پر یو۔پی اور مدراس کے دیگر ممتاز اور سربرآوردہ عالموں کے ساتھ مولانا سید سلیمان ندوی کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ منتظمین جلسہ نے

---

* دارالمصنفین، اعظم گڑھ یو۔پی۔

نے سید صاحب سے بر وقت خطبۂ اسناد دینے کی فرمائش کی اور اسی
کے ساتھ یہ بھی خواہش کی کہ یہ خطبہ بجائے زبانی کے تحریری ہو جس کے لیے
وہ بالکل تیار نہیں تھے۔ بہر حال سید صاحب کے انکار پر ان کا اصرار غالب
آیا اور سید صاحب نے کارکنوں کے اصرار سے جلسہ کی رات ہی کو یہ خطبہ
اس طرح قلم بند کرایا کہ املا کرانے والا ہر لحہ سونے کے لیے اور لکھنے والے
ہر لحہ جگانے کے لیے مستعد تھے اور وہی خطبہ جو نیند اور غنودگی کے عالم میں
لکھوایا گیا تھا، سید صاحب نے پڑھا اور فرمایا کہ اس میں کوئی غلطی ہو
تو سامعین اس کو خمارِ نیم شبی پر محمول کریں۔ یہ برجستہ فاضلانہ خطبہ بغیر کسی ترمیم
اور اضافے کے ماہ جنوری ۱۹۳۵ء کے معارف میں چھپ بھی گیا ہے جو
اسی جامعہ عربیہ دار السلام عمر آباد کے پہلے تقسیم اسناد کی ایک اہم یادگار
ہے۔ سید صاحب کو جہاں زندگی کے اور مسایل سے دلچسپی تھی مسئلہ تعلیم سے
بھی دلچسپی تھی۔ نادر شاہ نے تعلیمی مشورے کے لیے ہندوستان کے جن تین
آدمیوں کو بلایا تھا، ان میں ایک سید صاحب بھی تھے۔ سید صاحب ندوہ
کے معتمد تعلیمات بھی تھے۔ ان کے استاد مولانا شبلیؒ نے گزشتہ تعلیم پر
اگر مقالہ لکھا تھا تو لایق شاگرد نے مسلمانوں کی آئندہ تعلیم پر بہت ہی گرانقدر
مقالہ لکھا تھا جو جامعہ ملیہ کی کسی تقریب میں پڑھا گیا تھا۔ سید صاحب مسلم
یونیورسٹی علی گڑھ کے کورٹ کے بھی ایک نمایاں ممبر تھے اور برابر اس کی
میٹنگوں میں شریک ہوتے تھے اور اس سلسلے میں مشہور صاحب طرز
ادیب رشید احمد صدیقی کے یہاں قیام فرماتے تھے جن کے سید صاحب
کے بڑے مخلصانہ تعلقات تھے۔ علی گڑھ کی سلور جوبلی کے موقع پر عربی مدارس
کی بھی ایک کانفرنس ہوئی تھی جس کے صدر مولانا حسین احمد مدنی تھے اس
کی ایک نشست کی صدارت سید صاحب نے بھی کی تھی۔

دار العلوم ندوۃ العلماء کے ۸۵ سالہ جشن کے بعد کا طلائی جشن بہت
شان و شوکت اور جوش و خروش کے ساتھ منایا گیا۔ اس میں بھی ندوہ کے
جشن کی طرح عرب ملکوں کے بہت سے عرب علما اور دانش ور مدعو
تھے۔ ان کی رعایت سے اس کی بھی تمام کارروائی بجائے انگریزی یا اردو
کے عربی میں ہوئی۔ عربوں کی تقریروں کے ترجمے اردو میں ہوے اور اردو
تقریروں کے ترجمے عربی میں ہوئے جن کو سامعین نے بڑے لطف و لذت
کے ساتھ سنا۔ اس کی ایک نشست میں یو۔پی کے سابق وزیر اعلیٰ ہیم وتی
نندن کھوگنا بھی شریک تھے۔ عرب شیوخ جب تقریر کرنے کے لیے مائک
پر آتے تھے تو اپنی تقریر کا آغاز السلام علیکم ورحمۃ اللہ علیہ سے
کرتے تھے۔ اس کو دیکھ کر کھوگنا جی تقریر کرنے کے لیے آئے تو انھوں
نے بھی ان کے تتبع میں اپنی تقریر کا آغاز السلام علیکم ورحمۃ اللہ علیہ سے
کیا جس کو سن کر مجمع جھوم اٹھا۔ دیر تک تالیاں بجتی رہیں اور صدائے تحسین
بلند ہوتی رہی۔ ان کی تقریر بہت پسند کی گئی اور ان کو مجمع کی طرف سے
خوب خوب داد ملی۔ یہ دار العلوم دیوبند کے صد سالہ جشن سے ایک
مہینہ پہلے فروری کے اواخر میں جامعہ سلفیہ بنارس کی عظیم الشان موتمر تعلیم
دعوت میں بھی شریک تھے۔ لیکن ہمارے پہنچنے سے پہلے اف کی اور
ریلوے منسٹر ترپاٹھی کی تقریریں ہوچکی تھیں۔ وہاں بھی ان دونوں حضرات
کی تقریروں سے لوگ بہت محظوظ ہوئے تھے۔ ہمارے مولانا محمد یوسف
صاحب کوکن صدر شعبۂ مشرقیات مدراس یونیورسٹی اور سوانح ابن تیمیہ
کے مصنف اسی درس گاہ کے فاضل ہیں۔

اس جشن کے موقع پر وہاں کی جمعیۃ ابنائے قدیم اس جشن کی یادگار
کے طور پر اپنے دار العلوم کے آرگن صحیفہ کا ایک ضخیم خاص نمبر بھی شایع
کیا تھا جس میں مختلف عنوانات کے تحت زیادہ تر اسی درس گاہ کے فضلا
اور فارغین اور شعرا کے مضامین، اشعار اور نظمیں ہیں۔ شخصیات کے عنوان
کے تحت اسی کی نامور شخصیتوں کے تعارف اور تذکرہ پر ہیں کہ مختلف فضلا
کے قلم سے مضامین ہیں جس میں محسنین جامعہ کے عنوان سے مولانا محمد یوسف
کوکن عمری کا بھی ایک دلچسپ مضمون ہے جو درحقیقت ان کے زرنگار قلم
سے ان کی آپ بیتی ہے جس کو پڑھ کر ہم بہت محظوظ ہوئے۔ افادۂ عام
کے خیال سے ہم ذیل میں اسی کی تلخیص پیش کرتے ہیں۔

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ علم و دولت ایک جگہ جمع نہیں ہوتے لیکن
جنوبی ہند کے تاجروں اور مالداروں نے تجارت اور دولت کے ساتھ
علما و فضلا۔ شعرا و ادبا کی صحبت میں اہل علم و فضل کی تمام خصوصیات
حاصل کرلیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی عقل، سمجھ بوجھ اور قوت تمیز عطا
فرمائی کہ وہ بھلائی اور برائی اور نیک و بد میں اچھی طرح تمیز کرسکتے تھے
انہی نے برطانوی حکومت کے زمانے میں مسلمانوں کو ان کے مذہب، ثقافت،
کلچر، تہذیب اور روایات پر قایم رکھنے کے لیے حکومت کے مقابلے میں

مدرسے اور علمی ادارے قایم کیے۔ ان کو اپنی فیاضیوں اور بے پناہ زرپاشیوں سے زندہ رکھا اور چلایا اور دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی بھی خوب دل کھول کر مدد کی۔ مدراس میں انہوں نے دارالعلوم لطیفیہ قایم کیا۔ مدرسہ باقیات الصالحات کی بنیاد ڈالی۔ وانم باڑی میں معدن العلوم کھولا۔ مدراس میں مدرسہ مہدی اور مدرسہ جمالیہ قایم ہوے۔ پھر کہنول میں مدرسہ اسلامیہ قایم ہوا۔ یہ تمام مدارس اپنے سرپرستوں کی فیاضی اور حسن انتظام سے بڑی کامیابی سے چل رہے ہیں اور علوم اسلامیہ و دینیہ کی درس و تدریس کی مبارک خدمت انجام دے رہے ہیں۔ دسمبر ۱۹۲۴ء میں عمرآباد میں جامعۂ دارالسلام قایم ہوا جس کا اس وقت طلائی جشن منایا جا رہا ہے۔ مولانا محمد یوسف کوکن، کاکا محمد اسماعیل کے دور سرپرستی میں اس جامعہ میں داخل ہوئے۔ انہوں نے یہاں کی عربی تعلیم سے فارغ ہوکر جب ۱۹۳۴ء میں مدراس یونیورسٹی سے میٹرکولیشن کا امتحان پاس کرلیا تو کاکا محمد اسماعیل کو بے حد خوشی ہوئی۔ اس کے بعد ان کا ارادہ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس میں داخلہ اور ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے کا تھا۔ اس وقت ان کے بڑے بھائی محمد اسماعیل گورنمنٹ محمڈن کالج مدراس میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، وہ بھی ان کے ہم نوا تھے اور اپنے طور پر مدراس کے سرسید، افضل العلما ڈاکٹر عبدالحق مرحوم سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے اس اعلی تعلیم کے لیے ان کی بڑی ہمت افزائی کی۔ اس سے ان کا ارادہ اور زیادہ پختہ ہوگیا۔ مولانا یوسف یہ ارادہ لے کر عمرآباد پہنچے تو ان کو معلوم ہوا کہ کاکا محمد اسماعیل ساہوکار ان کو بجائے ڈاکٹر اور طبیب بنانے کے اہل قلم اور مصنف بنانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مولانا سید سلیمان ندوی ناظم دارالمصنفین سے اس کے متعلق خط و کتابت بھی شروع کر دی ہے۔ ان کے بھائی اور ان کے ماموں کے درمیان جو اسی مدرسے میں مدرس اور سید صاحب سے بھی تعلقات رکھتے تھے، اور جن پر کاکا محمد اسماعیل کے بڑے احسانات تھے، بڑی بحث ہوئی۔ ان کے بھائی ان کو ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے اور ان کے ماموں کہتے تھے کہ ساہوکار صاحب کے مجھ پر احسانات ہیں ان کی بات مان لینی چاہیے لیکن ان کے بڑے بھائی کا اصرار قایم رہا کہ کسی عربی پڑھنے والے کے لیے بہت ہی زریں موقع ہاتھ آیا ہے۔ علم الادیان اگر ضروری ہے تو علم الابدان بھی اس سے کم ضروری نہیں ہے۔ ہم کو اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ بالآخر ان کے ماموں کی رائے غالب آئی اور وہ ۱۹۳۵ء میں تصنیف و تالیف کی تربیت حاصل کرنے کے لیے دارالمصنفین اعظم گڑھ آگئے۔ وہ چار سال تک نہایت جانکاہی، محنت اور انہماک کے ساتھ سید صاحب کے زیر نگرانی تربیت حاصل کرتے رہے۔ جس کا سارا خرچ کاکا محمد اسماعیل ساہوکار نے برداشت کیا۔ یہ ان پر کاکا صاحب کا اتنا بڑا احسان ہے جس کو وہ آج تک نہیں بھولے ہیں۔ یہاں ان کو ابن تیمیہ پر تحقیق کا کام دیا گیا۔ سب سے پہلے علامہ ابن تیمیہ کی لائف لکھنے کا خیال مولانا شبلی کو پیدا ہوا تھا۔ وہ اپنی آخر زندگی میں ان سے بہت زیادہ متاثر ہوگئے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ ان کے سامنے رازی و غزالی سب ہیچ نظر آتے ہیں۔ ان کی لائف لکھنی بھی شروع کر دی تھی لیکن اس کا ایک نمبر الندوہ لکھنؤ میں شایع ہوکر رہ گیا۔ اس ایک نمبر کی چند سطور سے مولانا کی نظر میں علامہ کی اہمیت اور ان کی ذات کے ساتھ ان کی والہانہ عقیدت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ تمہید میں فرماتے ہیں؛

> "اسلام میں سیکڑوں، ہزاروں، بلکہ لاکھوں علماء، فضلاء، مجتہدین، ائمہ فن اور مدبرین ملک گزرے ہیں، لیکن مجدد بہت کم پیدا ہوے۔ مجدد یا ریفارمر کے لیے تین شرطیں ضروری ہیں۔
>
> ۱۔ مذہب یا علم یا سیاست (پالیٹکس) میں کوئی مفید انقلاب پیدا کر دے۔
>
> ۲۔ جو خیال اس کے دل میں آیا ہو، کسی کی تقلید سے نہ آیا ہو بلکہ اجتہاد ہو۔
>
> ۳۔ جسمانی مصیبتیں اٹھائی ہوں، جان پر کھیلا ہو، سرفروشی کی ہو۔
>
> مجددیت کے تمام شرائط جس میں پائے جائیں گے، وہی ریفارمر یا مجدد ہو سکتا ہے۔ اس لحاظ سے ہمارے نزدیک ریفارمر کا اصلی مصداق علامہ ابن تیمیہ ہیں۔"

پھر اپنی گوناگوں علمی مشغولیتوں کی وجہ سے اس کی تکمیل کا خیال مولانا کے دل سے نکل گیا اور وہ ناتمام رہ گئی۔ سید صاحب نے مولانا شبلی کے اس ناتمام کام کی تکمیل کے لیے مولانا یوسف کو یہ موضوع دیا تھا جس کو

وہ یہاں کے زمانہ قیام میں انجام نہ دے سکے ورنہ ان کی یہ گراں قدر کتاب دارالمصنفین کے سلسلۂ تصانیف میں فخر و مسرت کے ساتھ شامل کر لی جاتی۔

وہ ابھی لکھنے پڑھنے کی تربیت حاصل ہی کر رہے تھے اور معارف میں امام ذہبی، امام ابن جوزی اور دوسرے مختلف موضوعات پر ان کے مضامین شائع ہو رہے تھے اور ابن تیمیہ پر مواد فراہم کر رہے تھے کہ یکایک ان کی زندگی کا رخ بدل گیا اور وہ یہ سب چھوڑ چھاڑ انگریزی کی تعلیم کی تکمیل میں لگ گئے مدراس سے تو وہ ہائی اسکول پاس کر کے اور عربی کی افضل العلماء کی اعلیٰ ترین ڈگری مدراس یونیورسٹی سے لے کر یہاں آئے تھے، یہاں بغیر کسی کو اطلاع دیے الٰہ آباد بورڈ سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ پھر ١٩٤٢ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔ اے پاس کیا۔ ١٩٤٨ء میں عربی میں ایم۔ اے کیا۔ سید صاحب کو ان کی ان سرگرمیوں کا علم ہوا تو انہوں نے ان کو خفگی آمیز خط لکھا۔ پھر بھی وہ اپنی روش پر قایم رہے اور اپنی انگریزی کی تعلیم جاری رکھی۔ سید صاحب کے انتقال کے بہت عرصے کے بعد ١٩٦٥ء میں ایم۔ لٹ کی ڈگری لی۔ مدراس یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کے لکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا اور اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد وہ اس شعبے کے صدر ہو گئے تو پھر وہ کاکا محمد اسماعیل ساہو کار کی دعاؤں کی برکت سے تصنیف و تالیف اور تحقیق و ریسرچ کی لائن پر آ گئے۔ پہلے انہوں نے علامہ ابن تیمیہ کی نا تمام سوانح عمری کی تکمیل کی اور اس کو دو صاحبوں کی بہت معمولی مدد اور اپنی جیب خاص سے ساڑھے سات ہزار روپیہ خرچ کر کے چھپوایا۔ اس کامیاب تصنیف پر ملک کے تمام اہل علم و تحقیق نے ان کو داد دی اور ان کی اس علمی خدمت کو بہت سراہا۔ یہ اردو میں ابن تیمیہ پر ان کے قلم سے پہلا اوریجنل کام ہے جس میں انہوں نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس سے پہلے اردو میں ان پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ یا تو نا مکمل ہے یا عربی کتابوں اور مضامین کا ترجمہ یا خلاصہ ہے۔ مولانا ابوالحسن علی نے بھی اپنے تاریخ دعوت و عزیمت کے سلسلے میں ان پر بھی ایک کتاب لکھی ہے لیکن اس سے مقصود ان کی سوانح عمری لکھنا نہیں تھا بلکہ ایک عظیم صاحب دعوت و عزیمت کی حیثیت سے ان کا تعارف کرانا اور ان کے مجددانہ و مصلحانہ و مجاہدانہ کارناموں کو بیان کرنا تھا۔ علامہ ابن تیمیہ کی بہت ہی جامع اور مکمل مولانا یوسف ہی کی لکھی ہوئی سوانح عمری ہے۔ جن کی زندگی کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں رہ گیا ہے۔

اس وقت تک وہ درجنوں کتابوں کے مصنف ہو گئے ہیں۔ انہوں نے عربی کی صرف و نحو پر بھی بہت عمدہ اور مفید کتاب لکھی ہے جو عربی مدارس کے ابتدائی نصاب میں رکھنے کے قابل ہے۔ اس سے بہت جلد عربی کی مناسبت طلبا میں پیدا ہو سکتی ہے وہ علمی سمیناروں میں بھی شرکت کرتے اور مقالے پڑھتے ہیں۔ ١٩٦٩ء میں اسلامک اسٹڈیز کانفرنس منعقدہ دارالمصنفین اعظم گڑھ میں بھی شرکت کے لیے آئے تھے اور تامل ناڈو میں مسلمانوں کی علمی خدمات پر بہت ہی پر مغز مقالہ پڑھا تھا۔ اب وہ مدراس یونیورسٹی کے شعبۂ مشرقیات کی صدارت سے ریٹائر ہو گئے ہیں اور اپنا سارا وقت تصنیف و تالیف و ترجمہ و تحقیق پر صرف کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی گراں قدر تصنیفات سے اردو کے مصنفین میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا ہے جس کو اب نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے عربی میں ایک کتاب اعلام النثر والشعر فی العصر العربی الحدیث بھی لکھی ہے۔ یہ درحقیقت موجودہ دور کے عربی شعر و ادب کے مشاہیر رجال کا تذکرہ ہے جس کو وہ بڑی محنت سے مرتب کر رہے ہیں۔ ابھی صرف اس کی ایک ہی جلد چھپی ہے۔ اس کی تکمیل کے بعد ہی کسی دوسرے علمی کام کی طرف وہ متوجہ ہوں گے۔ ان کو عربی، فارسی اردو اور انگریزی تمام زبانوں پر یکساں قدرت ہے اور ان میں وہ برابر مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ ابھی جب وہ پاکستان گئے تھے تو مولانا عطا اللہ حنیف بھوجیانی کو جنہوں نے ابوزہرہ کی کتاب حیات شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ کا رئیس احمد جعفری ندوی سے ترجمہ کرا کے اور مولانا غلام رسول مہر سے مقدمہ لکھوا کے اس پر خود اپنے قلم سے بہت قیمتی حواشی لکھے ہیں اور اس کو نہایت اہتمام سے چھپوا کر شائع کیا ہے، اپنی کتاب کی یہ جلد ان کو ہدیہ کی۔ اس کی دوسری جلد چھپ رہی ہے۔ تیسری جلد بھی تیار ہے۔ وہ بھی جلد چھپے گی۔ ان کے احباب کا اصرار ہے کہ وہ علامہ ابن تیمیہ کی منہاج السنہ اور الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح کا خلاصہ لکھیں اور اس کو چھپوائیں۔ نیز مولانا باقر آگاہ دیلوری کی چار جلدوں پر مشتمل کتاب "الرسائل فیما یتعلق من الامامۃ با المسائل" کا بھی خلاصہ کر دیں لیکن وہ ان دو چیزوں کی طرف اپنی کتاب کی تیسری جلد کے چھپنے کے بعد توجہ کریں گے۔ خدا کرے کہ وہ اپنے ان تمام عزائم میں کامیاب ہوں۔ اللہ تعالےٰ کا دست کرم ان کے آغاز طالب علمی ہی سے ان کے

سر پر سایہ فگن ہے اور وہ برابر علمی ترقی کرتے اور ہر طبقے میں مقبولیت حاصل کرتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ احاطہ مدراس کے باہر کے اہل علم کے حلقے میں ان کو وہ شہرت حاصل نہیں ہے جس کے وہ اوّل روز سے آرزو مند ہیں۔

دو سال ہوئے دار المصنفین نے اپنی مجلس انتظامیہ کی رکنیت کے لیے ان کا انتخاب کیا ہے اور اس کے دو سالانہ جلسوں میں جن میں سے ایک مولانا ابوالحسن علی ندوی کی دعوت پر دار العلوم ندوہ میں ہوا تھا اور دوسرا دو برس پہلے دار المصنفین میں ہوا تھا، وہ بحیثیت رکن کے شریک ہو چکے ہیں۔ آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کے بعد جو ۱۹۶۹ء کی فروری میں حکیم عبد الحمید صاحب متولی ہمدرد کی صدارت میں اعظم گڑھ میں ہوئی تھی جس میں وہ خاص طور سے شرکت کے لیے آئے تھے اور ساتھ تامل ناڈو میں اسلامی علوم و فنون کی خدمت کے عنوان سے اس کی ایک نشست میں اپنا پر از معلومات مقالہ بھی پڑھا تھا۔ پورے بیس برس کے بعد ان سے نیاز حاصل ہوا۔ وہ مجھ سے بہت گرم جوشی اور تپاک سے ملے اور ایسی شفقت و محبت کے ساتھ پیش آئے کہ مجھے یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ میں ۲۰ برس کے وقفہ کے بعد ان سے مل رہا ہوں۔ اس سلسلے میں ان کی ایک تقریر جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ میں بھی ہوئی تھی اور غریب خانے کو بھی اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازا تھا۔

وہ ۱۹۸۵ء کے اپریل میں بلا کسی اطلاع کے اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ تشریف لائے۔ صباح الدین صاحب اتفاق سے موجود نہیں تھے۔ رات یہیں گزار کر صبح ہی کو اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ غریب خانہ پر پہنچ گئے۔ میں حسب معمول گھنٹہ دو گھنٹہ کی صبح کی واک سے گھر واپس آیا تو اُن صد لائق احترام مہمانوں کو اپنے گھر دیکھ کر، جس کا میں نے کبھی خواب بھی نہیں دیکھا تھا، اتنی خوشی ہوئی کہ اس کا اظہار لفظوں میں مشکل ہے۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

ابھی ان کا قیام دار المصنفین میں ہی تھا کہ صباح الدین صاحب سفر سے واپس آگئے اور باصرار تمام ان میاں بیوی کو تین چار روز دار المصنفین میں ٹھہرایا۔ ان کی بیگم صاحبہ بہت ہی روشن خیال، پڑھی لکھی اور ان کی علمی معاون بھی ہیں۔

گورنمنٹ آف انڈیا نے ان کو ان کی عربی تصانیف اور عربی زبان و ادب کی شاندار خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ سے بھی نوازا ہے جس کے وہ، بیک وقت چار چار زبانوں یعنی عربی، انگریزی، فارسی اور اردو میں اپنی گوناگوں علمی خدمات کی بنا پر شروع ہی سے مستحق تھے۔ ہم اس جوہر شناسی پر گورنمنٹ آف انڈیا کو مبارک باد دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ دین و مذہب، علم و فن اور زبان و ادب کی خدمت کے لیے پوری صحت و توانائی کے ساتھ ان کی عمر دراز سے دراز کرے اور انہوں نے جو علمی کام چھوڑ رکھے ہیں ان کی تکمیل کی توفیق ارزانی فرمائے اور ان کو اپنے پیش رو افضل العلماء ڈاکٹر عبد الحق کرنولی کا جانشین بنائے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

"اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی حمایت ایسے موقع پر نہیں کرتا، جہاں اس کی تذلیل کی جا رہی ہو اور اس کی عزت پر حملہ کیا جا رہا ہو تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی حمایت ایسے مواقع پر نہیں کرتا، جہاں وہ اللہ کی مدد کا خواہاں ہو اور اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی حمایت ایسے موقع پر کرتا ہے جہاں اس کی عزت پر حملہ کیا جا رہا ہو اور اس کی تذلیل و توہین کی جا رہی ہو تو اللہ عزوجل بھی اس کی مدد ایسے مواقع پر کرتا ہے، جہاں وہ چاہتا ہے کہ اللہ اس کی مدد کرے۔"

[ابو داؤد]

محنت کش بچے کس دہلیز پر دستک دیں

ایم۔ ایس۔ رحمن*

آج دنیا میں محنت کش بچوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ بین الاقوامی محنت کش تنظیم (آئی۔ ایل۔ او) کے ایک سروے کے مطابق ۱۴ سال سے کم عمر کے ۵ کروڑ ساٹھ لاکھ بچے محنت مزدوری کر رہے ہیں۔ ایک دوسری تنظیم بین الاقوامی کمیٹی برائے فلاح اطفال کے مطابق آج دنیا کے ہر خطے میں محنت کش بچے مزدوری کر رہے ہیں لیکن ایشیائی اور افریقی ممالک میں ان کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔

ہندوستان میں ڈھائی کروڑ بچے کش بچے ہیں جو ہندوستان کی کل آبادی کا ۳٫۶ فی صد اور بالغ مزدوروں کا ۷ فی صد ہیں۔ علی گڑھ میں لگ بھگ بیس ہزار، فیض آباد میں ۵۴ ہزار، بنارس میں دس ہزار، مرزاپور میں ۱۴ ہزار، کانپور میں ۲۲ ہزار، آگرہ میں ۲۰ ہزار اور میرٹھ میں ۱۴ ہزار مزدور بچے ہیں۔ علی گڑھ میں کل آبادی کا ۶٫۷ فی صد بچے مزدور ہیں۔

اتر پردیش ہی نہیں ملک کا صنعتی (اسمال اسکیل انڈسٹریز) اور کاروباری نظام مزدور بچوں کی بیساکھیوں پر رواں دواں ہے۔ علی گڑھ، مراد آباد، بنارس، فیروز آباد، مرزاپور، کانپور، میرٹھ، غازی آباد اور آگرہ جیسے صنعتی اور کاروباری علاقوں میں محنت کش بچے اگر کام کرنا بند کر دیں تو اتر پردیش کا صنعتی اور اقتصادی نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

ہندوستان میں ۳۵ کروڑ محنت کش لوگوں کے لیے قومی سطح پر دس ٹریڈ یونینیں اور ریاستی و علاقائی سطح پر ان گنت ٹریڈ یونین کام کر رہی ہیں۔ جب کہ ڈھائی کروڑ محنت کش بچوں کی فریاد کو سننے والا ایک بھی ٹریڈ یونین نہیں ہے۔ آزادی کی چھاؤں میں غلامی کا ایک ایسا گوشہ بھی ہے جہاں سلیکا اور کاربن ڈسٹ کا کالا ناگ محنت کش بچوں کو ڈسنے کے لیے تیار بیٹھا ہے۔ تہذیب و تمدن کے اس ارتقائی دور کی تاریخ میں اس سے زیادہ گھنونا باب کیا ہوگا کہ پیدا ہونے سے قبل ماں کے شکم میں ہی بچے کو بندھوا مزدور بنا دیا جائے۔ لاڈ اور پیار پانے والی عمر میں بچے جب تفریحی کھیل کی جگہ کاربن ڈسٹ سے کھیلنے لگیں تو ان کی دہلیز پر دمہ، برونکائٹس، تپ دق ہی دستک دیں گی۔

ملک کے جس گوشے میں آپ جائیں، ہر جگہ آپ کو مزدور بچہ مل جائے گا۔ ہوٹل ہو یا ورک شاپ، دوکان ہو یا ڈھکیل، فٹ پاتھ ہو یا بنگلہ پلاٹ ۱۵ سال سے کم عمر کے مزدور آپ کی خدمت کے لیے تیار ملیں گے۔ جن کے چہرے پر معصومیت اور بے بسی کا مشترکہ لیکن انمٹ چھاپ خاموش لبوں سے اپنی داستان سنا رہا ہوگا۔

مہانگروں اور صنعتی شہروں میں ان کی کثیر تعداد دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس وقت ملک میں سب سے زیادہ محنت کش بچے بمبئی میں ہیں۔ ایک سروے کے مطابق صرف ہوٹل میں کام کرنے والے بچوں کی تعداد بمبئی میں ۵۰ ہزار، کلکتہ میں ۴۷ ہزار اور دہلی میں ۳۰ ہزار ہے۔ تعجب ہوتا ہے جب لیبر کمشنر اور لیبر سپرنٹنڈنٹ ہی نہیں بلکہ نارتھ اور ساؤتھ ایونیو میں رہنے والے عوامی نمائندوں کی میز پر چائے پہنچانے والا محنت کش بچہ ہی ہوتا ہے۔ عدالت کی کینٹین میں محنت کش بچوں کی موجودگی کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ قومی ایوان، ریاستی قانون ساز اسمبلی اور ضلع عدالت سے لے کر سپریم کورٹ کے حلقے میں جب عوامی نمائندوں، وکلاء اور حکام کے جوتوں پر محنت کش بچے جب پالش کرتے ہوئے

* سیکشن آفیسر۔ ہاؤس نمبر ۴۰، سیکٹر ۱۰۔ این۔ آئی۔ ٹی۔ فرید آباد۔ (ہریانہ)

نظر آئیں تو پھر انصاف کس دہلیز پر ملے گا؟ محنت کش بچے انصاف کے لیے کہاں جائیں؟ کس کے پاس جائیں؟ اور کس چوکھٹ پر دستک دیں جہاں سے انہیں انصاف ملے۔

۱۹۱۹ء میں محنت کش بچے ہندوستان میں بہت ہی کم تھے شہروں کی ترقی، اور شہری زندگی کی کشش سے محنت کش بچوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد صنعتی شہروں اور مہانگروں کے بننے سے تو اس کی تعداد برقی رفتار سے بڑھنے لگی۔ چھ اور سات کی دہائی میں مہنگائی بڑھنے سے لوگوں کی معاشی بدحالی شروع ہوئی۔ کنبے کو اقتصادی بحران سے بچانے کے لیے غریب و مفلس بچے اسکول کی جگہ دوکان اور ورک شاپ میں پہنچ گئے۔ اس طرح ہندوستان میں محنت کش بچوں کا آج سیلاب نظر آرہا ہے، جو آزاد اور جمہوریت پسند ہندوستان کے لیے اہم مسئلہ بن چکا ہے۔

محنت کش بچوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور اس سے پیدا شدہ بُرے نتائج کی وجہ غریبی اور جہالت ہے۔ غریب مزدور اور کم تنخواہ پانے والے اشخاص مہنگائی کے اس دور میں کنبے کی پرورش اپنے محدود ذرائع سے کر نہیں پاتے اور والدین اقتصادی نقطۂ نگاہ سے بچوں کو مزدور بنانے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ بچوں کی مزدوری سے حاصل رقم سے وہ راحت محسوس کرتے ہیں۔ اس طرح یہ چلن شروع ہوجاتا ہے۔ علم سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے بھی والدین علم کی روشنی کو دیکھ نہیں پاتے اور بچوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تاریکی میں دھکیل دیتے ہیں۔ بڑھتی ہوئی بیکاری کو دیکھ کر ماں باپ اپنے بچوں کو اسکول اور کالجوں میں بھیجنے سے زیادہ بہتر دوکان اور ورک شاپ میں بھیجنا پسند کرتے ہیں۔ کچھ یتیم، بے سہارا اور لاوارث بچے اپنے پیٹ کی آگ کو بجھانے کے لیے مزدوری کرنے لگتے ہیں۔ کچھ بچے ماں باپ کے سخت نظم وضبط یا بے رخی سے تنگ آکر شہر کی طرف بھاگ آتے ہیں جہاں انہیں مزدور بننا پڑتا ہے اس طرح غریبی، جہالت اور بے رخی نے اس سیلاب کو ایسے مقام پر پہنچادیا ہے جہاں پر یہ ایک قومی مسئلہ بن گیا ہے۔

مالکوں نے بھی اس مزدوری کو فروغ دینے میں اہم کردار نبھایا ہے کیوں کہ انہیں مفت میں یا کم مزدوری میں یا صرف کھانے کا نظم کرنے سے ہی انہیں مزدور دستیاب ہوجاتے ہیں۔ وہ بالغ مزدوروں کی نسبت زیادہ دیر تک اپنے مالک کے پاس رہ سکتے ہیں۔ مالکوں کے سخت برتاؤ کو بھی محنت کش بچے برداشت کر لیتے ہیں۔ محنت کش بچوں سے کارخانو میں ہڑتال یا دیگر قسم کے ہنگاموں کا اندیشہ نہیں رہتا۔ کارخانوں میں ٹریڈ یو نہیں بن پاتی جس سے وقتاً فوقتاً مزدور سہولتوں کی مانگ نہیں کرپاتے اس طرح محنت کش بچوں کی بحالی سے مالکوں کو فائدہ ہوتا ہے۔ اس لیے و اس مزدوری کو بڑھاوا دیتے ہیں۔

محنت کش بچوں کے ان پڑھ یا کم پڑھے لکھے ہونے کی وجہ سے مستق میں ان کا انفرادی جوہر نکھر نہیں پاتا۔ ان کے انفرادی جوہر کو کسی قسم کا نہیں مل پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ محنت کش بچے ادنیٰ مزدور بن کر رہ جاتے نکل پالش، کیمیکل فیکٹری، چرم فیکٹری وغیرہ صنعتوں میں کام کر والے محنت کش بچے جلد ہی سیلی کوسس اور ٹیوبرکلوسس جیسی خطرناک بیماریوں کے شکار ہوجاتے ہیں۔ فریدآباد کے مشہور و معروف ڈاکٹر اے۔ برنی کا کہنا ہے کہ بچوں کے پھیپھڑے چوں کہ مکمل طور سے ڈیولپ نہیں ہو اس لیے کم عمر سے ہی ان کا ڈیولپمنٹ رک جاتا ہے۔ بچوں کے اسپائنل لچکیلے ہوتے ہیں جنھیں بار بار جھکانے سے یا محنت کرنے سے سپائنل پیدا ہونے لگتا ہے۔ جو بعد میں بہت ہی خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ ویلڈنگ کا کام کرنے والے بچے جلد ہی اندھے ہوجاتے ہیں۔ علی گڑھ گاندھی آ ہاسپٹل کے مشہور و معروف ڈاکٹر جناب پی اے صاحب اپنے تجربات سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ۲۰ فیصد مزدوروں کے اندھے ہونے کی وجہ بچ میں ویلڈنگ یا تیز بھٹی کے کاموں سے وابستہ ہونا رہا ہے۔ علی گڑھ م یونیورسٹی کے جناب آل مصطفیٰ علیگ کا کہنا ہے کہ علی گڑھ میں چھوٹی عمر ہی بچے مزدوری کرنے لگتے ہیں۔ اس وجہ سے بچوں کا انفرادی جوہر نکھر نہ پاتا اور بچوں کی دماغی صلاحیت بھی بڑھ نہیں پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علی گ کے مزدور بنے ہوئے تالوں کی نقل کرسکتے ہیں، نئی تکنیک کو فروغ نہیں د پاتے ہیں۔ علی گڑھ میں سکنڈری اسکول تعلیم کے بعد اگر مزدوروں کو تالا کا ہنر سکھایا جائے اور اس کے لیے ایک کورس ترتیب دیا جائے تو یہا کے مزدور جیکسن اور جیکسن کمپنی کی تکنیک کو بھی ثانوی بنا سکتے ہیں۔

مزدور بچے کسی ایک پیشے یا کاروبار سے جڑے نہیں ہیں ا نہ ہی کوئی مخصوص کاروبار اس سے جڑا ہے۔ آسان سے آسان اور مشک مشکل کام میں محنت کش بچوں کو دیکھا جاسکتا ہے۔ کچھ مخصوص شہروں میں مخصو

ا کاروبار فروغ پا چکا ہے۔ اس لیے ان شہروں میں محنت کش بچے اس مخصوص ہر کے کاروبار میں زیادہ دیکھے جا سکتے ہیں۔ جیسے علی گڑھ میں تالے کے کام میں، راد آباد میں پیتل کے برتنوں کے کام میں، فیروز آباد میں کانچ کے کام میں، میرٹھ قینچی کے کام میں، شیو کاشی میں آتش بازی کے کام میں، ساگر میں بیڑی بنانے ، کام میں اور مرزاپور میں دری بنانے کے کام میں۔ الغرض بیڑی بنانے میں، ڑا اور رنگائی کے کام میں، ماچس اور آتش بازی، دری بنانے کے کام میں، انچ کے کام میں، تالے اور پیتل کے برتن بنانے کے کام میں محنت کش بچوں اسیلاب دیکھا جا سکتا ہے۔

محنت کش بچے اور قانونی و سرکاری کوششیں

ہندوستان بچوں کی مزدوری کے ہمیشہ خلاف رہا ہے۔ ین الاقوامی مزدور تنظیم کا علاقائی دفتر کا قیام اور اس کو عملی جامہ پہنانے لیے دی گئی امداد اس کے عزم کی ترجمان ہے۔ ہندوستان نے ہمیشہ بوں کے مکمل فلاح و بہبود کو دھیان میں رکھتے ہوئے بچوں کی طرف دنیا کا ھیان نہ صرف کھینچا ہے بلکہ کئی بین الاقوامی پروجیکٹ میں بھرپور تعاون بھی دیتا رہا ہے۔ بچوں کی مزدوری ختم کرنے کے لیے اس نے پہلی عالمی کانفرنس ں بھاؤ بھی رکھا تھا۔ اس کانفرنس کے مسودات کی تیاری میں اور اسے پاس رانے میں اس نے اہم کردار نبھایا تھا۔ پولینڈ کو اگر اس بات کا فخر ہے ، اس نے بین الاقوامی اطفال سال اول پہ پہلی تجویز پیش کی تھی تو ہندوستان بھی یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے بین الاقوامی اطفال سال اول کو ہر طرح ے کامیاب بنانے کے لیے ہر طرح کا تعاون پیش کیا تھا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندوستان ہمیشہ ترقی پسند نظریات کو ترجیح دیتا رہا ہے۔ یہ نہ صرف رقی پسند اصولوں کو مانتا ہے بلکہ اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے کوشش بھی ہرتا رہا ہے۔

اس صدی کی تیسری دہائی میں ہندوستان نے اس مزدوری کو روکنے لیے ایک ٹھوس قدم اُٹھانے کی ضرورت محسوس کی۔ ملک میں محنت کش بچوں کی تعداد بڑھ رہی تھی جس پر قانونی روک لگانا ضروری سمجھا گیا۔ اسی وجہ سے ہندوستان میں ۱۹۳۸ء میں اطفال قانون پاس کیا گیا جس کی رو سے ۱۵ سال سے کم عمر کے بچوں کو مزدور بننے سے روکا گیا۔

آزاد ہندوستان میں اقتصادی ترقیاتی اسکیم، صنعت و حرفت کے فروغ اور مزدوروں کی پسماندگی کو دیکھتے ہوئے ۱۹۴۸ء میں فیکٹری، دکان اور کاروبار قانون پاس کیا گیا۔ اس میں فیکٹری و دیگر کاروبار میں بچوں کی مزدوری پر روک لگائی گئی اور ان کی حالت میں سدھار کے لیے عمل درآمد ہونے کا فیصلہ کیا گیا۔

۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو ملک کا دستور نافذ کیا گیا۔ یہ دستور انڈین یونین کا جمہوری دستور تھا۔ اس میں بھی واضح طور پر بچوں کی مزدوری کو غیر آئینی قرار دیا گیا۔ ملک پر یہ ذمہ داری عاید کی گئی کہ بچوں کے لیے فلاحی اقدامات اُٹھائے جائیں۔ دستور ہند کے ڈائرکٹو پرنسپل آف اسٹیٹ پالیسی میں کہا گیا ہے کہ حکومت کو چاہیے کہ دستور کے نافذ ہونے کے دس سال کے اندر سبھی بچوں کی مفت تعلیم کا معقول انتظام کرے۔ بچوں کی عمر ۱۴ سال ہونے سے قبل انہیں مفت اور لازمی تعلیم ضرور ملنی چاہیے۔ دستور ہند کی دفعہ ۲۴ میں ذکر کیا گیا ہے کہ ۱۴ سال سے کم عمر کے بچے کسی بھی فیکٹری یا کان میں یا دوسرے خطرناک قسم کے کاموں میں نوکری پر بحال نہیں کیے جائیں گے۔ ۱۹۶۱ء میں موٹر گاڑی قانون پاس ہوا۔ جس میں بھی محنت کش بچوں کی مزدوری پر روک لگائی گئی۔

اس طرح ہم پاتے ہیں کہ ۱۹۱۹ء میں مسودہ پر دستخط کر کے ہندوستان نے جس چنوتی کو قبول کیا تھا، اس کے لیے سدا کوشش کرتا رہا۔ قومی ایوانوں کے ذریعے مختلف قوانین کو پاس کر کے اس غیر آئینی مزدوروں کو روکنے کی کوشش کی گئی۔ قومی ایوانوں کے علاوہ بین الاقوامی سطح پر بھی اس نے رائے عامہ ہموار کرنے میں اہم کردار نبھایا ہے۔ ہندوستانی قانون کی رو سے اگر کوئی مالک بچوں سے مزدوری کراتا ہے تو اس جرم کے لیے اسے ایک ماہ کی قید اور ۵۰۰ روپے کا جرمانہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ قانون عملی طور سے زیادہ ٹھوس اور با اثر نہیں مانا جاتا۔ کیوں کہ جرمانہ کی رقم بہت ہی کم اور سزا کی مدت بھی بہت ہی کم ہے۔ آج کے پراگندہ ماحول میں جہاں رشوت اور کرپشن کا بازار گرم ہو وہاں مالک گرفت میں آتے ہی نہیں ہیں اور اگر گرفت میں کبھی آجائیں تو بھی یہ جرمانہ کافی نہیں ہے۔ لیبر انسپکٹر، لیبر کمشنر و دیگر حکام کو خوش کرنے کے لیے مالک ماہانہ رشوت کی رقم مقرر کر دیتے ہیں۔ اس مقرر شدہ ماہانہ رشوت کی وجہ سے مالک ہمیشہ قانون کی پیچیدگی سے آزاد رہتے ہیں۔ یہی وجہ

ہے کہ ملک میں لیبر آفیسروں کا ایکتا فلہ بحال کیا جا چکا ہے مگر پھر بھی محنت کش بچوں کی فریاد سرکاری دفتروں سے ٹکرا کر لوٹ جاتی ہے۔

نومبر ۱۹۸۵ء میں ایک ترمیمی قانون قومی ایوانوں سے پاس کیا گیا جس کے مطابق جرمانہ اور سزا کی مدت بڑھا دی گئی جس کی رو سے سزا کی مدت ۱ ماہ سے ۳ ماہ اور جرمانہ کی رقم ۵۰۰ سے ۱۰۰۰ روپیے کر دی گئی ہے۔ آج دری کے کام میں محنت کش بچوں سے مزدوری کرانے کی سزا تین ماہ کے لیے اور دو ہزار روپیے تک جرمانہ مقرر کیا جا چکا ہے۔

محنت کش بچوں کی تاریخ میں ۱۹۸۶ء ایک نیا سنگ میل کی طرح ہوگا۔ جب سپریم کورٹ نے محنت کش بچوں کے معاملے میں دخل دے کر ۸۰۰ بچوں کو مالکوں کے ظلم سے آزاد کرایا تھا۔ یہ بچے بہار کے پلاموضلع میں دری کا کام ۲۰-۲۰ گھنٹے تک لگاتار کرتے تھے۔ اس غیر انسانی فعل کا علم جب سپریم کورٹ کو ہوا تو اس نے فوراً قانونی کارروائی کی۔ اس طرح ہندوستانی عدلیہ نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ کسی قسم کے بھی غیر انسانی اور غیر آئینی فعل کو قانون خاموش منظوری نہیں دے گا

مگر ہندوستان کے قومی ایوانوں میں ۱۹۸۶ء میں ایک اور قانون کو پاس کرانے کی پیش کش کی گئی۔ وہ پر دیوزڈ بل محنت کش بچوں کی مزدوری سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے مطابق محنت کش بچے خطرناک صنعتوں کے علاوہ دیگر کاروبار میں مزدوری کر سکیں گے۔ یہ پر دیوزڈ بل ہندوستان کی دیرینہ روش کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس سے ملک میں محنت کش بچوں کی مزدوری کو قانونی جامہ مل جائے گا۔ قانونی منظوری کسی بھی قیمت پر بچوں کے حق میں نہیں ہوگی۔ اول اس بل میں خطرناک صنعتوں کو واضح نہیں کیا گیا ہے۔ پھر آسان سے آسان کام بھی خطرناک صورت حال پیدا کر سکتا ہے

مثلاً گھریلو نوکر یا ہوٹل میں برتن صاف کرنا آسان کام ہے مگر جب کام گھنٹوں کو بڑھا دیا جائے تو یہی کام خطرناک ہو جاتا ہے۔ خطرناک صنعتو مکمل فہرست نہ بنانے سے کئی خطرناک کاروبار بھی قانونی گرفت سے جاتے ہیں۔ یہ کہنا کہ ہندوستان میں غریبی ہے اور غریبی کی وجہ سے وا اپنے بچوں سے مزدوری کراتے ہیں۔ بچوں کی مزدوری سے غریبوں کو پرورش میں آسانی و سہولت ہوتی ہے۔ اگر اس مزدوری کو ختم کر دیا ملک میں اقتصادی بحران پیدا ہو جائے گا۔ بلا شبہ یہ نظریہ صحیح و ہے۔ لیکن کیا یہ غیر انسانی فعل نہیں ہے؟ کیا جمہوری اور فلاحی نظام کے لیے منظور شدہ قدروں کی خلاف ورزی نہیں ہے؟ کیا بچوا اس لیے مزدوری کی دلدل میں پھنسایا جائے۔ کیوں کہ یہ ملک اقتصادی بحران کو توازن دے گی؟ کیا اس طرح بچوں کو ہمیشہ کے لیے مالکوں کے رحم و کرم پر چھوڑنا نہیں ہوگا؟

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ منصفانہ اند اس مسئلہ پر سوچیں کہ ہمیں مستقبل میں معیاری شہریوں کی ضرا ہوگی۔ آئیڈیل شہری ہی ملک و قوم کو صحیح رہبری دے گا۔ آج کے بچے کل کے ہندوستان کے ستون ہوں گے۔ اگر بچوں کے ساتھ ہم نے انصاف نہیں کیا تو ہم ارتقاء کے اس دور میں پیچھے رہ جائیں گے۔

انسان آپ اپنے لیے سب سے بڑا استاد ہے۔ دنیا کے تمام واقعات اس پر گزرتے ہیں اور ان کے اثروں سے جیسا وہ واقف ہوتا ہے، دوسرا کوئی واقف نہیں ہوتا اور اُن سے اس کو عبرت پکڑنے کا سب سے زیادہ موقع ہوتا ہے۔

سر سید

اسلامی فکر میں سائنس کا مفہوم و مصداق

شبیر احمد خاں غوری*

یوں تو ہر علم ایک سائنس ہے مگر رائج الوقت اصطلاح میں لفظ سائنس سے ذہن ان علوم کی طرف منتقل ہوتا ہے جو Dewey's Decimal Classification میں 500 Pure Sciences کے تحت شامل ہیں یعنی

510 Mathematics
520 Astronomy
530 Physics
540 Chemistry
550 Earth Sciences
560 Palentology
570 Anthropology and Biological Sciences
580 Botanical Sciences
590 Zoological Sciences

سائنس کا یہ مصداق اسلامی فکر (یا زیادہ صحیح لفظوں میں یونانی-عربی نظام فکر) میں سائنس کے مصداق سے مختلف ہے۔

یونانی-عربی نظام فکر میں جملہ علوم کے مجموعے کا نام فلسفہ یا حکمت ہے جس کے دو حصے ہیں:

حکمت نظری اور حکمت عملی۔

حکمت نظری کی تین قسمیں ہیں:- ریاضیات، طبعیات اور الٰہیات اسی طرح حکمت عملی کی بھی تین قسمیں ہیں: اخلاق، تدبیر منزل اور سیاست مدن۔

اس یونانی عربی نظام تقسیم (System Of classification) کی بنیاد ارسطو کی تصانیف ہیں۔ ان میں سے قدیم درس وتدریس میں متداول کتابوں کی فہرست ابن الندیم نے 'کتاب الفہرست' (زمانۂ تصنیف ۳۷۸ھ مطابق ۹۸۸ء) میں دی ہے جسے اس نے چار عنوانوں منطقیات، طبعیات الہیات اور خلقیات کے تحت بیان کیا ہے۔

اول الذکر (منطقیات) کے تحت آٹھ کتابیں آتی ہیں:-

۱۔ قاطیغوریاس (یا کتاب المقولات) Categories
۲۔ باری ارمینیاس (یا کتاب العبارت) Pari Hermeniticae
۳ انولوطیقا الاول (یا کتاب تحلیل القیاس) Analyticae
۴ ابو دیقطیقا (یا کتاب البرہان) Appodicticae or Posterior Analytics
۵۔ طوبیقا (یا کتاب الجدل) Topicae
۶۔ سوفسطیقا (یا کتاب الحکمۃ المموھہ) Sophisticae
۷۔ ریطوریقا (یا کتاب الخطابہ) Rohetoricae
۸۔ ابو طیقا (یا کتاب الشعر) Poeticae

فضلائے یورپ ان میں سے صرف پہلی چھ کتابوں کو منطق میں محسوب کرتے ہیں۔ آخر الذکر دو کتابوں کو ارسطو کی تصانیف میں مستقل (بغیر کسی عنوان کے)

---

* سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی بورڈ الٰہ آباد یو-پی۔ سرسید نگر۔ علی گڑھ

ذکر کرتے ہیں (ملاحظہ ہو ۹۹ (Thilly: History of Philosophy) بعد میں منطق کی ان درسی کتابوں میں فرفوریس صوری (Porphyry کی ایساغوجی یا "المدخل" INTRODUCTION Of Tyre To LOGIC بھی بڑھادی گئی اور اس طرح منطق کی درسی کتابوں کی تعداد نو ہوگئی۔

ثانی الذکر یعنی طبعیات میں ابن الندیم ارسطو کی مندرجہ ذیل سات کتابوں کو گناتا ہے :۔

۱ کتاب السماع الطبیعی	Physics
۲ کتاب السماء والعالم	De Coeloet Munde
۳ کتاب الکون والفساد	De Generationes el Corruptions
۴ کتاب الآثار العلویہ	Metereiogia
۵۔ کتاب الحیوان	History of Animals or The Parts of Animals, and on The Origin of Animals
۶۔ کتاب النفس	On The Soul
۷۔ کتاب الحس والمحسوس۔	Parva Naturalia

تیسرے اور چوتھے عنوانوں کے ضمن میں وہ ارسطو کی صرف ایک ایک کتاب کا نام لیتا ہے :۔

الٰہیات میں کتاب الحروف

خلقیات میں "کتاب الاخلاق"۔

ابن الندیم نے ریاضیات کے موضوع پر ارسطو کی کسی کتاب کا ذکر نہیں کیا البتہ ابن القفطی نے کسی یونانی فاضل بطلیوس کے ایک خط میں سے جو اس نے اگلس نام کے کسی شخص کو لکھا تھا، ارسطو کی کتابوں کی ایک طویل فہرست نقل کی ہے۔ اس میں مذکوردو کتابوں کے عنوان سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ریاضیات کے موضوع پر تھیں یعنی

۱۔ کتابہ الذی یتکلم فیہ علی الخطوط التی غیر منقسمۃ و یسمیٰ فاری طوف ۳ مقالات

۲۔ کتابہ الموسوم المسائل الحیلیہ ویسمیٰ منجانیقا (فریلیماطا) مقالتان

لیکن یہ کتابیں ابن الندیم کے زمانے میں نہ متداول تھیں اور نہ مشہور۔

بایں ہمہ یہ باور کرنے کے کافی وجوہ ہیں کہ اس زمانے میں ریاضیاتی علوم بالخصوص اقلیدس کی 'اصول الہندسہ' اور بطلیموس کی 'کتاب المجسطی' درس میں داخل تھیں اور ان کے ساتھ غیر معمولی اعتنا برتا جاتا تھا

چوتھی صدی ہجری کے آخر میں شیخ بوعلی سینا کا نبوغ ہوا۔ اگر اس کا استاد اس کی تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر نہ چلا جاتا تو اس کی تعلیم بھی نظام کے مطابق ہوتی۔ یعنی پہلے ریاضی پھر طبعیات پھر الٰہیات وغیرہ۔ پھر استاد کے چلے جانے کے بعد شیخ نے فلسفہ وحکمت کی جملہ درسی کتابوں پر اُن کی شروح وفصوص کی مدد سے عبور حاصل کرلیا اور جلد ہی فلسفی کی حیثیت سے اُس کی مسلمیت اور اُن علوم میں اس کا تبحر فیما بین معلم ہوگئے۔

شیخ کی زندگی کا نصف آخر (۴۰۳ھ مطابق ۱۰۱۲ء) کے بڑے پُرآشوب حالات میں گزرا۔ یہاں تک کہ ایران اور وسطا کے مختلف درباروں میں قسمت آزمائی کے جدوہ بالآخر ہمدان پہنچا منصب وزارت پر فائز ہوا مگر تخریب پسندی اور شورش آخر تک دم کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اس لیے وہ دن بھی دیکھنا پڑا کہ جالالے پڑے ہوئے ہیں، دشمن اسے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں اور عقیدت مند کے گھر میں چھپا بیٹھا ہے۔

اسی پُرآشوب زمانے میں اس کے عزیز از جان شاگرد جوزجانی نے اس سے ارسطو کی کتابوں پر شرح لکھنے کی درخواست شیخ نے کہا کہ اتنی فرصت تو نہیں ہے، البتہ اُن تحقیقات پر جو میرے نزدیک صحیح ہیں، ایک مستقل کتاب لکھ سکتا ہوں۔

"اِنْ رَضِیْتَ مِنّی بتصنیفِ کتابٍ اُوْرِدُ فِیہِ
ما صَحَّ عِنْدی مِن ھٰذِہِ العلوم بِلا مناظرۃِ
الخُصُومِ ... فَعَلْتُ ذٰلِکَ۔"

شاگرد راضی ہوگیا اور پھر اس کی درخواست پر وہ کتاب ظہور میں آئی جو "کتاب الشفا" کے نام سے نام نہاد اسلامی (یا زیادہ صحیح میں ارسطاطالیسی یا ابن سینائی) فلسفہ کی "کتاب مقدس" قرار پائی جس کی عظمت سے متاثر ہو کر مشہور شاعر انوری نے کہا تھا:

مردرا باید کہ حکمت نیز دامن گیر دش "تا شفائے بوعلی" خواند نہ تازہ بجز

عظیم شاعر و ریاضی داں عمر خیام کے مرتے وقت بھی " شفائے بو علی " زیر مطالعہ تھی۔

" شفا " کے چار حصے ہیں۔ منطق ، ریاضیات ، طبعیات اور الٰہیات۔ منطق میں نو فنون ہیں جو اوپر مذکور ہوئے۔ ریاضیات میں چار شعبے ہیں: حساب (جو نیقوماخس الجراسی ۔ Nicomachus of Gerasa کی کتاب کتاب المدخل الی علم العدد" کا جسے ثابت بن قرہ نے یونانی سے عربی میں ترجمہ کیا تھا، چربہ ہے)، ہندسہ (جو اقلیدس کے صور الہندسہ کے تیرہ مقالوں نیز البسقلاوس کے دو ملحقہ مقالوں کا خلاصہ ہے) ہیئت جو بطلیموس کی کتاب المجسطی " کی تلخیص ہے اور موسیقی

طبعیات میں مندرجہ ذیل آٹھ فنون ہیں:

الفن الاول : فی السماع الطبعی

الفن الثانی : فی السماء والعالم

الفن الثالث : فی الکون والفساد

الفن الرابع : فی الافعال والانفعالات

الفن الخامس : فی الآثار العلویہ

الفن السادس : وھو کتاب النفس

الفن السابع : فی تولید النبات

الفن الثامن : فی طبایع الفنون

ان میں سے پہلے ، دوسرے ، تیسرے ، پانچویں ، چھٹے اور آٹھویں فنون کا موضوع وہی ہے جو ارسطو کی طبعیاتی تصانیف کا ہے۔ چوتھا اور ساتواں فن بھی اسی کی خوشہ چینی کا نتیجہ ہیں۔

الشفا اور دوسری فلسفیانہ تصانیف کے علاوہ شیخ نے " علوم حکیہ " کی تقسیم کے موضوع پر ایک مستقل رسالہ بعنوان " رسالہ فی اقسام العلوم العقلیہ " بھی لکھا تھا۔ خوش قسمتی سے یہ ہنوز موجود ہے اور شیخ کے دوسرے آٹھ رسالوں کے ساتھ ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۰ء میں مطبع الجوائب قسطنطنیہ سے " تسع رسائل لابن سینا " کے نام سے شایع ہو گیا ہے۔

اس رسالہ میں شیخ نے فلسفہ یا حکمت کی تعریف اور اس کے اقسام بالکل اسی انداز میں بیان کیے ہیں جس طرح مدارس عربیہ میں پڑھائے جانے والے فلسفہ کے دوسرے متون و شروح جیسے ہدایۃ الحکمۃ ، میبذی " اور صدرا " میں مذکور ہیں۔ اس رسالے میں شیخ نے ریاضیات ہو یا طبعیات دونوں کی پہلے دو دو قسمیں بنائی ہیں۔ اقسام اصلیہ اور اقسام فرعیہ

ریاضیات کی اقسام اصلیہ وہی ہیں جو کتاب الشفا میں مذکور ہیں یعنی حساب ، ہندسہ ، ہیئت اور موسیقی۔

طبعیات کے اقسام اصلیہ بھی وہی آٹھ ہیں یعنی

۱۔ السمع الکیان (یا سماع طبعی)

۲۔ السماء والعالم

۳۔ الکون والفساد۔

۴۔ الآثار العلویہ کے پہلے تین مقالے جنھیں شیخ نے " کتاب الشفا " میں الفعل والانفعال کے نام سے لکھا ہے۔

۵ علم المعادن (یعنی الآثار العلویہ کا آخری مقالہ)

۶۔ علم النبات

۷۔ علم طبایع الحیوان

۸۔ علم النفس الانسانی

اس رسالے میں مذکور حکمت کی بقیہ اقسام الٰہیات وغیرہ سے تعرض غیر ضروری ہے، کیوں کہ رائج الوقت اصطلاح میں وہ sciences کے بجائے Social Sciences اور Philosophy کے تحت آتی ہیں۔

گیارھویں صدی ہجری (سترھویں صدی مسیحی) کے وسط میں ملا محمود جونپوری نے " الشمس البازغہ " تصنیف کی جو اسلامی ہند کی فلسفیانہ عبقریت کا نقطۂ عروج ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے صرف " علوم طبعیات " کے بیان کا ارادہ کیا تھا ، مگر موت نے تکمیل کی فرصت نہیں دی — بہرحال اس کے مقدمہ میں انھوں نے طبعیات کی وہی اقسام ہشت گانہ گنائی ہیں یعنی

۱۔ السماع الطبعی۔

۲۔ کتاب السماء والعالم۔

۳۔ کتاب الکون والفساد۔

۴۔ کتاب الفعل والانفعال۔

۵۔ کتاب الآثار العلویہ والمعادن ۶۔ کتاب النفس
۷۔ کتاب النبات ۸ کتاب الحیوان

مذکورہ بالا تفصیل سے اسلامی فکر میں حکمت یا Sciences کا مفہوم و مصداق متعین ہو جاتا ہے، جو شیخ بوعلی سینا کے زمانہ (پانچویں صدی ہجری یا گیارہویں صدی مسیحی) سے آج کے دن تک قدیم تعلیم یافتہ طبقہ کی علمی تفکیر کا مسلمہ رہا ہے اور جس کی رو سے جملہ علوم حکمیہ کے مجموعے کا نام فلسفہ یا حکمت ہے۔ اس کے دو حصے ہیں: حکمت نظری اور حکمت عملی۔ اول الذکر "حکمت نظری" کی تین قسمیں ہیں: ریاضیات طبعیات اور الہیات یا ما بعد الطبعیات (Meta Physics)۔ اسی طرح حکمت عملی کی بھی تین قسمیں ہیں: اخلاق، تدبیر منزل اور سیاست مدن۔

ریاضی کے اصول (بنیادی قسمیں یا "الاقسام الاولیہ" چار ہیں: حساب، ہندسہ، ہیئت اور موسیقی:

یونانی۔ عربی نظام فکر کا "علم الحساب" آج کل کے علم الحساب سے قطعاً مختلف تھا۔ اگرچہ دونوں کا نام Arithmetics ہے۔ مگر آج کل حساب، عملی زندگی کا علم الحساب ہے یعنی جمع تفریق، ضرب، تقسیم، کسور عام اور کسور اعشاریہ اور اُن کے جوڑ باقی وغیرہ۔ جذر المربع اکائی کا قاعدہ جس نے پہلے زمانے کے "اربعہ متناسبہ" کی جگہ لے لی ہے اور اس اکائی کے قاعدے کی مختلف تفریعات (Applications) جیسے وقت اور کام کے سوال، نفع نقصان وغیرہ۔ مگر یونانی فلسفی کی ہمت عالی کا مطمح نظر اس عارضی سود و زیاں کے بازیچۂ اطفال سے کہیں زیادہ بلند تھا۔ اس کے پیشوائے اولین فیثاغورث (Pythagoras) نے تو عدد ہی کو "مبداء اولین کائنات" قرار دیا تھا ہٰذا اس کی ملہ فلک پیما اعداد کے گوناگوں خواص ہی کی تحقیق میں مصروف پرواز رہی ویسے یونانی عبقریت کا یہ عظیم القدر ورثہ عہد حاضر میں Theory Of Numbers کہلاتا ہے۔ فیثاغورث اور اس کے متبعین کی اس موضوع (علم خواص الاعداد) پر تحقیقات کو نیقوماخس الجراسنی (Nicomachus Of Gerasa) زمانہ ۱۰۰ مسیحی کے قریب) نے (Introductio Arithmatica) کے عنوان سے مدون کیا۔ بعد میں ثابت بن قرہ نے اس کتاب کو "کتاب المدخل الی علم العدد" کے نام سے عربی میں ترجمہ کیا۔ شفائے بوعلی سینا کی ریاضیا[ت] کا فن حساب اسی کتاب کے محتویات پر مبنی ہے اور یہی بعد کے موسوعات نگاروں (Encyclopaedists) مثلاً قطب الدین شیرازی در[ة] التاج الغرۃ لدباج" کا اس موضوع پر ماخذ و مصدر رہا ہے۔

علم الھندسہ عہد حاضر کی (Geometry) ہے۔ صرف اتنا فرق کہ موجودہ "جیومیٹری" کا دائرہ عمل اپنی مصری الاصل "جیومیٹری" کی طرح زمین[ی] زمینی اجسام کی پیمایش تک محدود ہے۔ مگر یونانی جومطریا کا موضوع (Abstract) خطوط و سطوح تھے جو اپنے وجود کے لیے کثیف ماد[ے] کے محتاج نہیں ہوتے۔

ہیئت بھی عہد حاضر کی (Astronomy) ہے مگر قدیم علم الہیئۃ کا دائرۂ عمل اجرام فلکی کی سیر و گردش، ان کے اوضاع کا تعین (یعنی ستاروں کا longitude اور latitude) دریاف[ت] کرنا) اور متعلقہ مسائل کی بحث و تمحیص تھا۔ مگر آج کل Astronomy کا دائرہ بہت زیادہ وسیع ہو گیا ہے۔ اس میں بہت سے مباحث [م]نجمی طبعیات Astrophysics وغیرہ آگئے ہیں جن سے قدیم علم الہ[یئۃ] میں بحث نہیں ہوتی تھی، بلکہ یونانی۔ عربی نظام کی طبعیات کے اس جز میں سے تعرض کیا جاتا تھا جو قدیم کتابوں میں "کتاب السماء والعالم" — e Coelo et Mundee اور بعد کے متون میں فلکیات کے [نام] سے موسوم تھا۔

ریاضی کا چوتھا اصول (بنیادی قسم) موسیقی (Music) مگر عہد حاضر میں یہ حسین و جمیل مشغلہ ریاضی کی خشک اور سنگلاخ واد[ی] "فنون لطیفہ" کی لطیف فضا میں پرواز کر گیا ہے اور Degree میں Fine Arts کے تحت محسوب ہوتا ہے۔

ریاضی کی "اقسام فرعیہ" حسب تصریح شیخ بوعلی سینا (رسالہ تقسیم العلوم العقلیہ) حسب ذیل ہیں۔

فروع علم العدد: عمل الجمع والتفریق بالھندی، علم الجبر والمقا[بلۃ]
فروع علم الھندسہ: علم المساحت، عمل الحیل، عمل جر الاثقال، عل[م] الموازین، علم آلات الحربیہ، علم المناظر والمرایا، علم نقل المیا[ہ]
فروع علم الھیئت: علم الزیجات والتقاویم۔

موسیقی کی فروع کی فہرست غیر ضروری ہے کیوں کہ آج خود موسیقی کو سائنس کے بجائے فنون لطیفہ کے تحت محسوب کیا جاتا ہے)

عمل الجمع والتفریق بالھندی جسے شیخ بوعلی سینا "علم العدد" کی پہلی فرع بتاتا ہے (اور جسے "الحساب الھندی" یا "حساب الھند" بھی کہا جاتا تھا) آج کل کا "عملی زندگی کا علم الحساب" ہے۔

علم الجبر والمقابلہ عہد حاضر کا "الجبرا" (modern Algebra) ہے۔ مگر آج الجبرا کا دائرہ بہت زیادہ وسیع ہے۔ اس میں مختلف درجات کی مساواتوں کے حل کے علاوہ اور بے شمار مباحث داخل ہوگئے ہیں جیسے نظریہ معادلات (Theory of Equations) حسابی ہندسی اور تالیفی سلسلے Arithmetical, Geometrical and Harmonic Progression اور سلسلوں کا جمع کرنا Summation of Series (اجتماع و ترتیب Permutation and Combination) احتمالیات (Probability) اور خود "نظریہ اعداد" (Theory of Numbers) جو یونانی - اسلامی فکر کی اصل اول تھی - "علم الحساب" کا موضوع تھا، مگر آج الجبرا کے مختلف مباحث میں سے ایک مبحث ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلامی فکر کا الجبر والمقابلہ صرف مساواتوں (پہلے دوسرے درجے کی مساوات، پھر خیام کے یہاں تیسرے درجے کی مساوات اور بعض فضلا، کے یہاں چوتھے درجے کی مساوات) کے حل تک محدود تھا۔

فروع علم ہندسہ میں سے "مساحت" وہی علم تھا جو آج Mensuration کہلاتا ہے۔

مگر علم الحیل (Mechanics) آج ہندسہ کی فرع یا Applied Geometry کے بجائے Physics کا جزو محسوب ہوتا ہے۔ اسی طرح "علم جر الاثقال" جیومیٹری کی فرع کے بجائے ایک مختلف فن ہے جسے Theory of Granes یا Traction of Heavy Loads سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اسی طرح علم الاوزان والموازین Theory of Balances جیسا بھی ایک مستقل فن تھا، جس پر معیاری شاہکار عبدالرحمن الخازنی کی کتاب "میزان الحکمۃ" ہے۔

علم المناظر والمرایا میں سے علم المناظر (Optics) ہندسہ کے بجائے Physics کا ایک اہم جزو ہے جس سے اس فن کی Text-Books میں Light کے زیر عنوان بحث کی جاتی ہے علم المرایا (Theory of Burning Mirrors) نظری طور پر (Physics) کے اندر مشمول ہونا چاہیے مگر Solar Energy کے Tap کرنے کی Technique کا نام ہے۔ عہد حاضر میں اس فن نے کوئی زیادہ ترقی نہیں کی۔ مگر قدیم زمانہ میں یہ ایک اہم علم تھا۔ کہتے ہیں کہ اسی علم کی مدد سے Archimedes نے Syracuse کی لڑائی میں رومیوں کے ٹڈی دل لشکر کو جلا کر بھسم کر دیا تھا۔ آج یہ واقعہ شاید افسانہ معلوم ہو، مگر صدر اسلام میں الکندی نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی تھی جس میں اُس نے بتایا تھا کہ مختلف آئینوں کو آپس میں کس طرح ترکیب دیا جائے کہ سورج کی شعاعیں ان پر سے منعکس ہو کر اتنی شدید گرم ہو جائیں کہ جس شے پر پڑیں اسے جلا کر خاک سیاہ کر دیں۔ بعد میں اس موضوع پر ابن الہیثم نے دو رسالے لکھے جن میں Plane Mirrors کے بجائے مدور اور مکافی و بیضوی آئینوں سے کام لیا جاتا ہے۔

علم الآلات الحربیہ بھی تطبیقی ہندسہ Applied Geometry کے بجائے ایک مستقل فن ہے جو Military Science اور Defence Production کی Technology سے تعلق رکھتا ہے۔

"علم نقل المیاہ" پانی کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل کرنے کا علم تھا۔ عہد اسلام میں یہ بھی تطبیقی ہندسہ کی قسم محسوب ہوتا تھا، مگر آج Engineering میں آتا ہے۔

فروع علم الھیئت میں عمل الزیجات والتقاویم مشاہدات فلکی کو فلکیاتی جداول (Astronomical Tables) میں مدون کرنے اور پھر اُن کی مدد سے تقویمیں (Almanak) تیار کرنے کی Techniques کا نام تھا۔

مگر طبیعیات کا معاملہ ریاضیات سے زیادہ سنجیدہ غور و فکر کا مقتضی ہے:

اول تو آج کی طبعیات میں دائرے میں بہت سی ایسی ابحاث آگئی ہیں جن سے قدما قطعاً ناواقف تھے جیسے برقیات Electricity ہوگا مقناطیسیات Magnetism اور سب سے زیادہ اہم نیوکلیائی طبعیات Nuclear Physics

دوسرے قدیم (یونانی-عربی) اور جدید (رائج الوقت) انداز تقسیم ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں۔ مثلاً عہد حاضر میں (انڈر گریجویٹ سطح پر) Physics کے اجزاء حسب ذیل ہیں۔

۱- Mechanics بشمول General Properties of Matter اور Hydrostatics
۲- Heat
۳- Light
۴ Sound
۵ Magnetism
۶ Electricity

ان میں سے Mechanics اور Light یا Optics یونانی-عربی حکمت میں تطبیقی ہندسہ میں مشمول ہوتی تھیں جن کی تفصیل اوپر مذکور ہوئی اور اس طرح ریاضی Mathematics کی اقسام تھیں۔ اسی خلط مبحث کا نتیجہ ہے کہ جو لوگ عربی بالخصوص عہد اسلام کے "علوم حکمیہ" سے ناآشنا ہیں، ابن الہیثم اور البیرونی کو Physicist کہنے لگتے ہیں۔ کیوں کہ اول الذکر نے علم المناظر (Optics) پر ایک شاہکار تصنیف لکھی ہے اور ثانی الذکر نے بہت سے اجسام کی کثافت اضافی Relative Density دریافت کی تھی اور یہ دونوں مبحث آج طبعیات کے اندر مشمول ہوتے ہیں۔

اسی طرح قدیم (یونانی-عربی) طبعیات کے اجزاء حسب ذیل تھے۔

۱. سماع طبعی: جو آج کل کی طبعیات کے اس جزء کی نظیر تھا جو General Properties of Matter کہلاتا ہے۔ اگرچہ دونوں کا مواد بنیادی طور پر مختلف ہے۔ مثال کے طور پر زمان و مکان کی ابحاث جن پر بقول مورتس شلک طبعیات جدیدہ کی پوری عمارت قائم ہے مگر ان کی تفکیر میں آج کا سائنس دان اپنی سرگرمیوں کو اس کے عملی پہلو تک محدود رکھتا ہے جب کہ یونانی-عربی نظام فکر کا دانائے راز اسے مابعد الطبیعیاتی، بلکہ ماورائی Transcendental مجہول بھلیوں میں گھسیٹ لے جاتا ہے، یہاں تک کہ اسے انھیں واجب الوجود (یا خدا) ماننے میں بھی تامل نہیں ہوتا تھا۔ اس شوق فضول و جرأت رندانہ کا تصور آج کا فلسفی تو کر سکتا ہے، سائنس داں نہیں۔ شاید اسی لیے ان لایعنی ابحاث سے بیزار ہو کر خواجہ حافظ نے کہا تھا

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

۲- السماء والعالم: اس کا پہلا جزء قدیم طبعیات کی کتابوں میں فلکیات کے زیر عنوان بیان ہوتا تھا اور آج اس کی نظیر نجمی طبعیات Astrophysics ہے۔ اگرچہ دونوں کی ابحاث نیز انداز استدلال بنیادی طور پر مختلف ہیں۔

۳- الکون والفساد Cosmology کا متبادل تھا اور اس طرح آج کل کی طبعیات اعلیٰ Higher Physics کے اس جزء سے یک گونہ مشابہ تھا جس میں کائنات کی پیدائش اور خاتمہ کے متعلق قیاس آرائیاں کی جاتی ہیں۔

۴- الآثار العلویہ کے پہلے تین مقالوں کا موضوع وہی ہے جو عہد حاضر میں "جغرافیہ طبیعی" کا ہوتا ہے۔ آخری مقالہ جسے ابن سینا نے مستقل طور سے "کتاب المعادن" کے نام سے بیان کیا ہے، آج کی Mineralogy اور Geology کی نظیر تھا

۵- علم النبات آج کی Botany ہے۔

۶ علم الحیوان آج کی Zoology ہے۔

۷- علم النفس الانسانی آج کی Psychology تھا مگر عہد حاضر میں Psychology فلسفہ کا جزء قرار دی جاتی ہے۔

رہیں طبعیات کی فروع تو شیخ (ابن سینا) نے اُن کی تعداد سات بتائی ہے۔ یعنی علم الطب، علم احکام النجوم (جوتش) علم الفراسة، علم تعبیر الرؤیا، علم الطلسمات، علم النیرنجات اور علم کیمیا۔

ان میں سے علم الطب عہد حاضر کی Medical Science ہے جو بجائے خود ایک نہایت باثروت علم ہے، باینہمہ وہ "فنونِ مفیدہ" کے بجائے Pure Sciences کی قسم منسوب ہوتا ہے۔

علم الکیمیا عہد حاضر کی Chemistry کی نظیر بلکہ اُس کا منبع و ماخذ تھا۔ مگر قدیم کیمیا کا مقصد خسیس دھاتوں مثلاً تانبہ اور رانگ کی شریف دھاتوں (سونے اور چاندی) میں قلب ماہیت تھا، جب کہ جدید کیمسٹری تہذیب حاضر بالخصوص اس کی اقتصادی اور اس سے زیادہ صنعتی سرگرمیوں کی سنگ بنیاد ہے۔

اس طرح قدیم طبعیات کے دائرہ میں ریاضی و ہیئت کے علاوہ Pure Sciences کا پورا مجموعہ آجاتا تھا۔ رہیں قدیم انداز تقسیم کے مطابق طبعیات کی باقی پانچ قسمیں (باقی پانچ فروع طبعیات) جو کسی زمانے میں "سری علوم" occult Sciences کہلاتے تھے (یعنی جوتش، علم الطلسمات وغیرہ) تو آج کے سائنس دانوں کے پاس ان کے واسطے شدید قسم کی نفرت و حقارت کے اور کچھ نہیں ہے۔

"ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں تربیت اطفال کا کوئی ذریعہ موجود نہیں ہے، اور بڑا سبب اُن کی حالت کے تباہ ہونے اور اولاد کے نالائق رہنے یا آوارہ ہوجانے کا یہی ہے۔ ہم ان حالتوں کا ذکر نہیں کرتے جن میں اطفال آوارہ اور خراب ہوجاتے ہیں کیوں کہ اس کو تو سب بُرا جانتے ہیں، بلکہ ہم تو اس حالت کا ذکر کرتے ہیں جس میں غلطی سے لوگ سمجھتے ہیں کہ ہماری اولاد نے خوب تربیت پائی ہے۔ غلطی اس لیے ہے کہ حقیقت میں وہ تربیت عمدہ تربیت نہیں ہے اور یہی سبب ہے کہ ان کو کچھ لیاقت نہیں آتی اور اُن کے دل میں اخلاقی فیاضی اور طبیعت کی آزادگی اور دل کی کشادگی پیدا نہیں ہوتی۔ تمام قویٰ جو ان میں خدا تعالےٰ نے رکھے ہیں، سب پژمردہ اور ناکارہ رہ جاتے ہیں، اور رفتہ رفتہ ان میں وہ قویٰ جن سے انسان اپنے کسی زمانۂ عمر میں نام آور اور دل چلا اور عالی حوصلہ، غیرت والا ہوتا ہے، باقی نہیں رہتے۔"

سرسیدؒ

ذرا نم ہو تو یہ مٹی . . . . . .

ثمینہ سلیم*

اِسلام سلامتی کا مذہب ہے اور ہر دور کے تقاضوں کے مطابق اپنے پیروکاروں کو ان کی سلامتی اور بقا کی حفاظت میں مدد کرتا ہے۔ مسلمانوں کو بلاشبہ جدید علوم میں ترقی کی راہ پر چلنے کے لیے مذہبی آزادی حاصل ہے۔ یہاں تک کہ قرآن پاک میں علم کو ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض کیا گیا۔ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کارخانۂ قدرت پر غور کرنے کو عبادت کے برابر درجہ دیا اور ایک حدیث کے مطابق حصولِ علم کے لیے گھر سے باہر گزرنے والا ایک گھنٹہ ایک ہزار مہینوں کی عبادت سے زیادہ اجر و ثواب پہنچاتا ہے۔ بلاشبہ یہ علم جس کی اِسلام میں اس قدر حوصلہ افزائی کی گئی ہے اس ڈگری سے مختلف ہے جس کے لیے طالب علم نقل کا سہارا لے کر اور کتابیں رٹ کر مطمئن ہو جاتا ہے۔ یہ علم جو مذہبی فریضے کا درجہ لے جاتا ہے وہ علم ہے جو ہمیں زندگی کے حقایق سے روشناس کرواتے ہوئے ہماری اجتماعی ترقی میں معاون و مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ اس علم میں مسلمانوں کی سربلندی اور وقار کا پہلو مضمر ہو۔ یہ علم دین کی سمجھ پیدا کر کے ریاکاری اور دیگر اخلاقی کمزوریوں سے پاک اِسلامی معاشرے کی تشکیل میں مدد دیتا ہے۔ یہ وہ علم ہے جس کو حاصل کر کے مسلمانوں نے ماضی میں جدید علوم کی بنیاد رکھتے ہوئے درخشاں روایات قائم کیں۔ الخوارزمی، ابن الہیثم، بوعلی سینا، البیرونی، عمر خیام اور دیگر علم دوست مسلمانوں نے ایسے وقت میں طبعیات، کیمیا، ریاضی اور طب ایسے جدید سائنسی علوم کی بنیاد رکھی جو اس وقت اس قدر مناسب انداز میں منظر عام پر آئے کہ ان ہی کی بنیاد پر جدید سائنس اور ٹکنالوجی کی بنیادیں استوار ہوئیں۔

لیکن افسوس کہ مسلمان اپنے اس قیمتی علمی ورثے کے امین نہ بن سکے ان کے اسلاف کے علمی کارناموں کو دوسری قوموں نے اپنا لیا۔ اس سبب مسلمانوں میں علمی رجحان کی کمی، بے علمی اور لاپرواہی کے علاوہ ا[ن کی] مذہب کی غرض و غایت سے ناآشنائی کو بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہم[ارے] ماضی کی درخشاں روایات ہمارا قیمتی سرمایہ ہیں اور ہمارے لیے مشعل راہ ان کی رہنمائی میں ہم جدید علوم میں ترقی کے لیے دن رات کی محنت کا[م] کر سکتے ہیں۔ ہمارا ماضی ہمیں اپنی زبوں حالی کے اسباب پر غور کرنے علمی میدان میں پیچھے رہ جانے کی وجوہات بتا کر ہمارے لیے نشان عبرت بن جاتا ہے۔ لیکن اگر ہمارا یہی ماضی ہمیں احساس برتری دلا کر جھوٹی اور تسلی کا سامان فراہم کر دے تو ہمیں ایسے ماضی کو بھلا کر صرف اور اپنے حال پر توجہ دینی چاہیے۔ ہمارے پاس آج بھی اچھے محنتی اور ذہن کے حامل افراد کی کمی نہیں، ہمارے پاس آج بھی جذبۂ ملی اور جذبۂ موجود ہے، ہم آج بھی مل جل کر سب مسلمان ایک جگہ اکٹھا ہو کر ایک د[وسرے] کی مدد کرتے ہوئے اگر ترقی کی راہ پر پیش رفت شروع کر دیں تو ک[وئی] وجہ نہیں کہ ہماری رفتار میں اتنی سرعت نہ پیدا ہو جائے کہ ہم دنیا کی تر[قی یافتہ] قوموں کی صف میں شامل ہونے کے قابل ہو جائیں۔ اس کے لیے ہمیں بغض و حسد سے بچ کر اپنے بھائیوں کی ترقی سے جلنے کے بجائے ان کی مدد کرنی چاہیئے۔ جب تک ہم اپنی سوچ میں اجتماعیت کا احساس شامل نہ کریں ہم کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔ ہم کبھی بھی تنہا نہیں ہوتے اور نہ ہی کسی کی ایک فرد کی ترقی ہے۔ چنانچہ ہمیں ہر فرد کے مقام کا تعین من حیث ا[لقوم]

* شعبۂ طبعیات، قائد اعظم یونیورسٹی، اِسلام آباد ۔ پاکستان

کرنا چاہیے ؎

فرد قایم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

ہم اگر آج بھی لوگوں کی عیب جوئی کے بجائے خود اپنے آپ پر نگاہ ڈالیں اور اپنا محاسبہ شروع کر دیں تو ہمارے بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔ مسلمان ہونے کے ناطے تو سب سے پہلے ہمیں اس حدیث کو سامنے رکھنا چاہیے کہ مومن کا آج گزشتہ کل سے بہتر ہوتا ہے۔ بس اگر صرف اسی حدیث کو مشعل راہ بنالیا جائے تو ترقی کی راہوں پر کامیابی ہماری منتظر ہوگی ہماری چھوٹی چھوٹی اخلاقی برائیاں جن میں بغض، حسد، کینہ اور جھوٹ شامل ہیں اجتماعی طور پر جب معاشرے کا جزو بن جاتی ہیں تو معاشرے میں ان کی حیثیت موذی مرض کی سی ہے جو رشوت ستانی اور دیگر بدعنوانیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ ایسے میں ذاتی مفادات کو اخلاقی اقدار اور اجتماعی مفاد پر فوقیت دینے کا عمل سونے پر سہاگہ کا کام کرتے ہوئے معاشرتی ڈھانچے کو دیمک کی طرح چاٹ جاتا ہے اور پھر یہ کھوکھلا معاشرہ قوموں کو تباہی کی طرف لے چلتا ہے۔ ایک فرد کی انفرادی غلطی یا مفاد پرستی بعض اوقات ایسے موذی جراثیم کو قوم کی رگوں میں داخل کر دیتی ہے کہ نسلوں تک ان اخلاقی امراض سے چھٹکارا پانا ممکن نہیں رہتا۔ ان موذی اخلاقی امراض سے بچنے کے لیے علم ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ تعلیم انسان کو بہتر معاشرے کی تشکیل میں مدد دینے کے علاوہ اپنے کردار و عمل کا محاسبہ کرنے اور اس کے معاشرے پر اجتماعی اثرات کا تجزیہ کرنے کے قابل بناتی ہے۔ علم کا شوق اور کتابوں کی رغبت اخلاقی برائیوں سے دور لے جا کر انسانی ذہن کو وسعت اور ہمہ گیری عطا کرتی ہے۔ اس لحاظ سے علم معاشرتی برائیوں سے نجات اور بہتر معاشرے کی تشکیل میں مدد دیتے ہوئے انسان کو بہتر فرد بنا دیتا ہے۔ اس کے علاوہ آج دنیا پر تلوار کے بجائے قلم کی حکمرانی ہے۔ طاقتور انسانی جسموں سے زیادہ صحت مند انسانی ذہن کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ تلواروں کی جگہ میزائل لے رہے ہیں۔ جنگ کے نقشے محاذوں پر بیٹھ کر بنانے کے بجائے ایئر کنڈیشنڈ عالی شان کمروں میں کاغذ پر بنتے ہیں۔ اس لحاظ سے آج دنیا پر ٹکنالوجی کو برتری حاصل ہے اور سائنس کی حکمرانی قایم ہو گئی ہے۔ چنانچہ سائنسی علوم میں برتری ہی اقوام عالم میں سربلندی کی ضامن ہے۔ ایسے میں ہم مسلمانوں کو کم از کم جدید سائنسی علوم کے حصول میں کسی بھی قسم کے پس و پیش سے گریز کرنا پڑے گا۔ ہمارے پاس تو اس وقت یہ بھی گنجایش باقی نہیں رہی کہ ہم اپنے طور پر آرام اور اطمینان سے کام کرتے ہوئے جس راستے پر پہنچ جائیں، اسی پر چل پڑیں۔ آج ہم میں سے ہر ایک کو ابتدا ہی سے پختہ عزم اور محنت کے جذبے سے سرشار ہو کر زندگی کے ایک ایک لمحے سے استفادہ کرتے ہوئے آگے اور آگے بڑھنا ہے۔ ہم آج دنیا کی ترقی یافتہ قوموں سے اس قدر پیچھے رہ گئے ہیں کہ ہماری رفتار ان سے کئی گنا تیز ہو تو پھر کہیں ہم کچھ عرصے میں اُن کے مقابل آسکتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے مذہبی اصولوں، اخلاقی تقاضوں اور تہذیبی قدروں کو ساتھ لیے جہاں تک ہو سکے مغربی علوم میں مہارت حاصل کریں اور جس قدر ممکن ہو سائنس اور ٹکنالوجی کو ترقی دیں۔ یہی وہ واحد طریقہ ہے جس کو اپنا کر ہم کم از کم وقت میں اپنی سلامتی اور بقا کو یقینی بنا سکتے ہیں۔ اس وقت ہمیں "محنت" کو اپنا اصول اور "اپنی مدد آپ" کو اپنا ایمان بنانے کی ضرورت ہے۔ مغربی طاقتیں اپنی اجارہ داری کو قایم رکھنے کے لیے ہمیں سائنس و ٹکنالوجی کی منتقلی پر نہ تو آمادہ ہیں اور نہ ہی ہو سکتی ہیں۔ ترقی یافتہ قومیں ہمیشہ ہمیں اپنا دست نگر بنائے رکھنے کی کوشش کریں گی۔ ایسے میں ہمیں خود پر بھروسہ کرنا ہوگا، جس کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ہم باہر سے مشینی پرزہ جات اور دیگر اشیا خریدنے کی بجائے خود بنانے پر توجہ دیں۔ ابتدا میں ہم غیر معیاری اور مہنگی چیزیں تیار کریں گے لیکن جلد ہی معیاری اور سستی مصنوعات کی تیاری کے قابل ہو جائیں گے۔ ہمارے ہمسایہ ممالک میں چین، جاپان اور بھارت نے اسی اصول کے تحت اتنی ترقی کی ہے۔ کم و بیش ہمارے ساتھ ہی آزادی حاصل کرنے والے یہ تینوں ممالک ترقی کی دوڑ میں ہم سے محض اس لیے آگے نکل گئے کہ انھوں نے دوسروں پر انحصار کرنے کے بجائے خود اپنے آپ پر بھروسہ کیا۔ ہمارے پاس تو خدا کے فضل و کرم سے غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل ذہنوں اور انتھک محنت کے جذبے سے سرشار دلوں کی کمی نہیں۔ قومی احساس بھی بیدار ہے۔ ایسے میں کمی ہے تو صرف ابتدائی قدم اٹھانے کی۔ ہمارے پاس کمی ہے تو منصوبہ بندی کی۔ ہمیں اپنی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ

ما نے کا موقع نہیں ملتا۔ بڑے اچھے اچھے ذہن ضائع ہو رہے ہیں بہت سے
ین افراد وسائل کی کمی کے باعث تعلیم کا سلسلہ منقطع کر کے تلاش معاش
ا چل نکلتے ہیں اور وقت گزارنے کے لیے تعلیم حاصل کرنے والے افراد
ں اوقات تعلیم کے میدان میں آگے چلے جاتے ہیں۔ لیکن یہ ایک خوش آئند
ت ہے کہ وقت کے ساتھ ان چیزوں میں کمی واقع ہو رہی ہے۔

ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ذہنی انتشار ہے۔ ہمارے نوجوان اور
صلاحیت ذہن انتشار کا شکار ہو کر صحیح فیصلوں سے محروم ہو جاتے
یں اور ہمارے بزرگ ایک حد تک بچوں کے بہتر مستقبل کے خیال
ا انہیں حصول علم سے زیادہ کسب معاش میں کامیابی کے طریقے اختیار
نے کی ترغیب دیتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں علم کی صحیح
مد نہیں۔ ہماری معاشرتی اقدار میں دولت، عزت کا معیار بن گئی ہے۔
ازمتوں میں سفارشیں، علمی رجحان کے لیے زہر قاتل ثابت ہوتی ہیں۔
ں کہ قابلیت سے زیادہ اثر و رسوخ کو کامیابی حاصل ہوتی ہے۔
ے میں متوسط طبقے کے محنتی اور ذہین افراد پڑھ لکھ کر بھی اپنی قابلیت
، باوجود اپنے معیار کی ملازمت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ایسے میں
ہر ہے کہ دولت کمانے کے لیے کوئی بھی طریقہ اختیار کرنے سے گریز نہیں
ا جاتا۔ بلکہ بعض اوقات تو پڑھے لکھے ذہین افراد حالات کی ناساعدت
ے مشتعل ہو کر منفی رویہ اختیار کرتے ہوئے برائیوں کی طرف مائل
ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کی اکا دکا مثالیں بھی لوگوں کو تعلیم سے بد دل کرنے
ے لیے کافی ہیں۔ سرکاری ملازمتوں کے لیے بھی ہمارے یہاں ایسے
ھانچے مرتب ہو چکے ہیں کہ علم کی نسبت تجربے کو بہت فوقیت حاصل
ے۔ چنانچہ لوگ تجربے کی بنیاد پر بہتر مقام حاصل کرنے کے لیے جلد
ازمتیں حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لہٰذا اعلیٰ تعلیم کا رجحان
م ہو جاتا ہے اور تعلیم کے معاملے میں ارتکاز میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔
ب ایسے حالات میں ایسے افراد کا میسر آنا تو بہت دشوار ہے جو اپنے
م تر مفادات کو قربان کر کے اپنی تمام تر توجہ حصول علم پر مرکوز کر دیں
ہر ہے کہ انسان کے کچھ ذاتی مسائل بھی ہوتے ہیں۔ ہر شخص کے لیے
ے تمام تر مفادات کو پس پشت ڈال دینا بھی ممکن نہیں۔ ان ہی حالات
ے مایوس ہو کر ہمارے اچھے ذہن باہر کی دنیا میں جا کر اپنی صلاحیتیں غیروں

کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں اور ان کے کارنامے ان کے اپنے ملک کے بجائے
دوسرے ملکوں کی ترقی میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں
کہ ایسے تمام لوگ جو باہر جا کر کام کرتے ہیں وہ اپنے ملک و قوم کے لیے
اچھے جذبات نہیں رکھتے یا کام نہیں کرنا چاہتے لیکن ہر شخص کے لیے اپنے
تمام تر مفادات کو قربان کر دینا بھی ممکن تو نہیں ہوتا اور نہ ہی ہم اپنے
لوگوں میں قومی خدمت کا اس قدر جذبہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے
ہیں کہ وہ ممکنہ حد تک قربانیوں سے دریغ نہ کریں۔ اس لیے یا تو ہم ان
لوگوں کو وہ سب کچھ دیں کہ وہ اپنی قوم سے اپنائیت کا وہ احساس پیدا
کر سکیں جہاں کو اپنے ملک و قوم پر وہ اعتماد دے جو ایک اولاد کو
اپنی ماں پر ہوتا ہے تو پھر ہم نوجوانوں سے قربانیوں کی توقع رکھ سکتے ہیں۔
یا پھر ان کے علم و فن کی اس انداز سے حوصلہ افزائی کر سکیں کہ وہ اپنے
ملک میں رہ کر کام کرنے کو ترجیح دیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی شخص تھوڑے
بہت مادی فائدے کے لیے اپنے وطن اور اپنے عزیز و اقارب سے دور
پردیس میں زندگی گزارنے کو ترجیح نہیں دے سکتا۔

یہ تو درست ہے کہ ہمارے پاس مادی وسائل محدود ہونے
کے باعث ہم اپنے ہی ماہرین کو ان کے حسب قابلیت معاوضہ نہیں دے
سکتے لیکن کم از کم انہیں وہ تحفظ اور عزت و احترام تو دے سکتے ہیں کہ
وہ دولت کی کمی کو پورا ہوتا ہوا محسوس کریں۔ یوں بھی ہمارے ماہرین
کی خدمات کو حاصل کرنے کے لیے ملک میں سائنس و ٹکنالوجی کے
مزید شعبوں کو قایم کیا جا سکتا ہے۔ بظاہر تو ہمارے پاس مزید کارخانے
اور تحقیقی ادارے قایم کرنے کے لیے وسائل نظر نہیں آتے لیکن اگر ہم
چاہیں تو سرمایہ کاری میں ایسی منصوبہ بندی کر سکتے ہیں کہ افرادی قوت
کو زیادہ سے زیادہ استعمال میں لا کر ملکی معیشت کو مختصر ترین عرصے
میں سنبھالا دینے کی کوشش کریں۔ نئے اداروں کا قیام ہی ضروری
نہیں ہے۔ موجودہ اداروں میں کام کرنے رفتار کو بڑھانے کی کوشش
بھی کی جا سکتی ہے۔ افرادی قوت کو کام پر لگا کر اور اپنی مصنوعات
کو بہتر بنا کر ہم اپنی مصنوعات میں کم از کم خود کفیل ہونے کے رجحان کی
حوصلہ افزائی کو ضرور کر سکتے ہیں۔ بعض اور چھوٹے چھوٹے اقدامات
بھی ہماری ترقی کی راہوں میں دوہری اہمیت کے حامل قرار دیے جا سکتے

ہیں۔ اگر ہمارے تعلیمی اداروں سے چھوٹے چھوٹے صنعتی مراکز ملحق کر دیا جائے اور متعلقہ شعبوں کے طلبہ سے ان مراکز میں چھوٹے چھوٹے پراجیکٹس کروائے اور غریب طلبا کو معمولی معاوضے پر ان مراکز میں ملازم رکھ کر ایک طرف تو ہم صنعتی ترقی میں کچھ پیش رفت کر سکتے ہیں اور دوسری طرف غریب طلبا کے لیے معاش کا ایک ذریعہ فراہم کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے تو جزوی طور پر وظائف کی رقم سے بھی مدد لی جا سکتی ہے ۔ اس قسم کے اقدامات کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ طلبا میں قومی خدمت کا رجحان بھی بڑھے گا اور طلبا محنت اور ایمان داری سے کام کرکے ملکی ترقی میں بہت مددگار ثابت ہو سکیں گے ۔

ہم بنیادی طور پر ایک غریب قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے اس وقت ہمیں عالی شان عمارتوں، قیمتی قالینوں، ریشمی پردوں اور بیش قیمت صوفوں کی نہیں بلکہ باصلاحیت ذہنوں، بہترین معیاری کتابوں قابل استادوں اور ملک و قوم سے سچی محبت کے جذبوں سے سرشار نوجوان ذہنوں کی ضرورت ہے۔ ہمیں اپنے ان ہی محدود وسائل سے اپنے ملک و قوم کے لیے وہ سب کچھ کرنا ہے جو ان حالات میں قدرے مشکل ضرور نظر آتا ہے لیکن ناممکن نہیں۔ بلکہ اگر دیکھا جائے تو اس وقت ہر باشعور شہری اس ضرورت کو شدت سے محسوس کر رہا ہے اس وقت صورت حال بالکل ایسی ہے کہ بھٹی میں لوہا گرم ہے، بس ذرا سی ضرب پڑنے کی ضرورت ہے کہ جس سے قوم کے نوجوان حصول علم کو عبادت سمجھ کر اپنا لیں۔ آج کتابیں رٹ کر امتحان پاس کر کے نوکری حاصل کرنے کے بجائے لوگوں میں علم سے محبت پیدا کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ ذرا سی کوشش سے علم کا فہم پیدا کرکے اسے دل و جان سے قبول کرنا اشد ضروری ہے۔

اگرچہ لڑکوں کی تعلیم کا فرض مقدم ان کے ماں باپ پر ہے، مگر جیسی تعلیم کہ مطلوب ہے وہ بغیر اس کے کہ تمام قوم آپس میں متفق ہو کر اس کو قائم نہ کرے، ممکن نہیں ہے؛ اور اس لیے وہ فرض تمام قوم سے متعلق ہوتا ہے اور کچھ شک نہیں ہے کہ ایسے سامان تعلیم کے موجود نہ ہونے سے تمام قوم گنہگار اور شرمسار ہے؛ اور اس لیے میں امید کرتا ہوں کہ اب لوگ ہوشیار ہوں گے اور فرض کفایہ کے پورا کرنے پر، جو بسبب ضرورت و حاجت شدید کے رتبے میں فرض عین سے زیادہ بڑھ گیا ہے، توجہ فرمائیں گے۔

سر سیدؒ

زمان و مکان اور آئن سٹائن

سیّد عاصم محمود*

میں کوئی خاص قابلیت نہیں رکھتا۔ میں صرف جنونی حد تک متلاشی اور پُر تجسس ہوں۔ یہ بات ایک دفعہ آئن سٹائن نے اپنے بارے میں کہی تھی۔ اس کا یہ جنونی تجسس اس کے دو مقالات میں ظاہر ہوا تھا، ایک خصوصی نظریۂ اضافیت (۱۹۰۵ء میں) اور دوسرے عمومی نظریۂ اضافیت (۱۹۱۶ء) میں اس کے ان دونوں نظریوں نے مل کر کائنات اور زمان و مکان کے بارے میں انسان کے نقطۂ نظر کو یکسر بدل ڈالا۔

۱۹۰۵ء میں جرمنی کے رسالے "طبعیات" میں اس کے چار مقالے شایع ہوئے تھے، جن میں سے وہ مقالہ بھی تھا جس میں خصوصی نظریۂ اضافیت پیش کیا گیا تھا۔ یہ مقالہ بہت مختصر تھا۔ اس وقت آئن سٹائن کی عمر ۲۶ سال کی تھی اور وہ سوئٹزرلینڈ کے شہر برن میں ایک معمولی کلرک تھا۔ اس مقالے میں اس نے میکسویل کے ساکن اجسام کے نظریے کی بنیاد پر متحرک اجسام کی حرکیات کا سادہ نظریہ قائم کیا تھا۔ برقی حرکیات طبعیات کا ایک شعبہ ہے جس کے تحت برقی اور مقناطیسی میدانوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یہ شعبہ سچ پوچھیے تو انیسویں صدی کے اواخر میں سکاٹ لینڈ کے ماہر طبعیات جیمز کلارک میکسویل نے کھولا تھا جب آئن سٹائن مذکورہ مقالہ چھپا تو کسی کو بھی یہ احساس نہ ہوا کہ مقالہ نگار نے اپنے جنونی تجسس سے اپنے ہم عصر ماہرین طبعیات — عوام الناس کو ایک عجیب وغریب دنیا کی سرحدوں سے روشناس کرادیا ہے۔



اپنے وسیع تر مفہوم میں اضافیت ہمارا روزمرہ کا تجربہ ہے۔ اگر آپ کسی ٹرین سے پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کر رہے ہوں اور پیچھے سے کوئی دوسری ٹرین ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آپ کے برابر سے گزرنے لگے تو اس دوسری ٹرین کی رفتار کے بارے میں آپ کا تاثر اس شخص کے تاثر سے بالکل مختلف ہوگا جو پلیٹ فارم پر کھڑا دیکھ رہا ہے۔ اس کی اضافیت کچھ اور ہے، آپ کی کچھ اور۔ اس فرق کی وجہ آپ کا ذاتی نقطۂ نظر ہے

اس طرح کی روزمرہ اضافیت کی چند صدیاں پہلے اٹلی کے طبعیات دان گلیلیو (۱۵۶۴ - ۱۶۴۲ء) نے کر دی تھی۔ اس نے لکھا: "فرض کرو ایک شخص بحری جہاز سے سفر کر رہا ہے۔ وہ ایسے بند کیبن میں بیٹھا ہے جس میں کوئی روشن دان بھی نہیں ہے۔ اسے باہر کی کوئی چیز نظر نہیں آرہی ہے۔ جب تک جہاز کی حرکت ہموار ہے اور وہ ہچکولے نہیں کھاتا تو اس شخص کو ذرا بھی احساس نہ ہوگا کہ کیبن کے باہر جہاز کو حرکت کرنے کے لیے کتنی توانائی درکار ہے یا یہ کہ متحرک چیز دل کی حرکت میں اسے کوئی تبدیلی نظر نہیں آئے گی۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے گا کہ جب تک جہاز کی حرکت ہموار ہے، وہ نہ ہچکولے کھا رہا ہے، نہ اس کی رفتار بڑھ رہی ہے، نہ گھٹ رہی ہے تو یہ طے کرنے کے لیے کہ کیبن حرکت کر رہا ہے یا نہیں کوئی میکانکی تجربہ

* حسن علی آفندی روڈ ۔ کراچی ۔ پاکستان

ہیں ہو سکتا۔"

گلیلو نے اس مثال سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہموار حرکت (یعنی ایک مستقل ست میں مستقل رفتار میں حرکت صرف خارجی حوالوں کی نسبت سے ظاہر کی جا سکتی ہے۔

روشنی کی رفتار

گلیلیو سے لے کر آئن سٹائن تک روشنی کی ماہیت کے بارے میں بہت کچھ معلومات حاصل ہو چکی تھی۔ جیمز کلارک میکسویل نے ثابت کر دکھایا تھا کہ روشنی برقناطیسی اشعاع کی ایک شکل ہے اور عام عقیدہ یہ رائج تھا کہ جس طرح آواز ہوا میں سے گزرتی ہے اور امواج پانی میں سے گزرتی ہے، اسی طرح روشنی ایتھر میں سے گزرتی ہے جو کہ ایک غیر مرئی واسطہ ہے۔ آئن سٹائن کے ہم عصروں کو یقین تھا کہ ایتھر تو گلیلیو کے مفروضہ کیبن میں بھی ضرور ہو گا۔ بے شک اس میں روشن دان نہیں ہے لیکن ایتھر تو ہے اگر ایتھر ہے تو اس میں سے روشنی گزر رہی ہوگی۔ پس مسافر اجسام کی حرکت سے نہ سہی روشنی کی رفتار (۱۸۶،۲۶۲ میل فی سکنڈ) سے تو یہ طے کر سکے گا کہ وہ حرکت کر رہا ہے یا نہیں۔

اس تجربے میں مسافر روشنی کی رفتار کا وقت مقرر کرے گا۔ وہ دیکھے گا کہ روشنی کیبن کے ایک سرے سے اندر آئی اور دوسرے سرے تک گئی تو اس سفر میں روشنی کو کتنا عرصہ لگا۔ اگر کیبن حرکت پذیر ہے تو روشنی پہلی صورت میں ایتھر کے بہاؤ کے خلاف چلے گی اور یوں اس کی رفتار کم ہو جائے گی۔ دوسری صورت میں ایتھر کے بہاؤ کے ساتھ چلے گی اور یوں اس کی رفتار تیز تر ہو جائے گی۔ ان دونوں وقتوں میں جو ذرا سا فرق ہے، اسی سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ کیبن حرکت پذیر ہے۔

آئن سٹائن نے کہا: نہیں، ایسا نہیں ہے۔

آئن سٹائن نے کہا: روشنی کی رفتار تغیر پذیر نہیں ہے بلکہ ہمیشہ مستقل ہے۔

اس نے مزید کہا۔ روشنی کی رفتار کا ایتھر کے بہاؤ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ (ایتھر تجربے سے ثابت شدہ حقیقت نہیں ہے ایتھر کوئی چیز نہیں ہے)۔

آئن سٹائن نے یہ موقف اختیار کیا تو گویا وہ یہ منطقی نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہو گیا کہ کیبن میں بیٹھا ہوا مسافر یہ طے کرنے کے لیے کہ جہاز کھڑا ہے یا چل رہا ہے، کوئی میکانکی تجربہ نہیں کر سکتا۔ میکانکی تجربہ ہی نہیں وہ تو روشنی ریڈیو یا بجلی سے متعلق بھی کوئی تجربہ ایسا نہیں کر سکتا جس سے جہاز کی حرکت یا سکون کا علم ہو سکے۔

آئن سٹائن کو مخالفین کی اس بات سے اتفاق تھا کہ میرے اخذ کردہ نتائج میں باہم تضاد ہے۔ کیوں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک طرف تو سیما' کھرا عالمگیر پیمانہ ہو (روشنی کی رفتار) اور دوسری طرف اسے بطور حوالہ استعمال کرنے کا امکان بھی نہ ہو؟ اس سوالیہ نشان کی الجھن کو سلجھانے کے لیے اس نے ایک تجربہ فرض کر لیا تھا جسے وہ بار بار دہرایا کرتا تھا۔ ریل کار کا مفروضہ تجربہ جس میں ایک فلش لائٹ ہے، ایک آئینہ اور ایک اسٹاپ واچ۔ اس تجربے سے آئن سٹائن نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ کسی بھی ایسے نظام میں جو تیز رفتاری سے حرکت کر رہا ہو، وقت خود بخود آہستہ ہو جاتا ہے اس نظام کے مقابلے میں جو ساکن ہو (تیز رفتار ریل کار کے مقابلے میں زمین ساکن محسوس ہوتی ہے)

اس تجربے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وقت (زمان) کے ساتھ ساتھ مکان بھی حرکت سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ ریل کار تیزی سے آپ کے سامنے سے گزر جائے تو وہ کھڑی ہوئی ریل کار سے چھوٹی نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس کھڑی ہوئی ریل کار چلتی ہوئی ریل کار سے بڑی نظر آتی ہے جبکہ حرکت کے یہ اثرات اس شخص کو نظر نہیں آئیں گے جو ریل کار میں بیٹھا ہوا ہے۔

وقت اور فاصلے کے علاوہ تیسرا بنیادی عنصر، جو کسی مادی شے یا نظام کی وجۂ جواز بنے گا، وہ کمیت ہے۔ عام بول چال کی زبان میں کمیت اور وزن میں زیادہ فرق نہیں۔ سائنس کی زبان میں دونوں میں بہت زیادہ فرق ہے۔ کمیت کسی چیز کی مزاحمت ہے حرکت میں تبدیلی (جمود) کے خلاف۔ وزن اس تجاذبی قوت کو ظاہر کرتا ہے جس میں چیزیں ایک دوسرے سے بندھی ہوئی ہیں۔ روایتی طبعیات میں عام طور پہ سمجھا جاتا تھا کہ جب کسی چیز پہ طاقت کا استعمال کیا جاتا ہے تو اس کی رفتار تیز ہو جاتی ہے اور جتنی زیادہ طاقت استعمال ہو گی اتنی ہی رفتار بڑھے گی۔ نظری اعتبار سے اس پہ کوئی حد عاید نہ تھی۔ کیوں کہ کمیت کے بارے میں یہ فرض کر لیا گیا تھا

کہ یہ اسراع وقت قیام پذیر ہو جاتی ہے۔ یہ بھی سمجھا جاتا تھا کہ کائنات کی رفتار کی بھی حد نہیں ہے۔ جب آئن سٹائن نے تسلیم کیا کہ روشنی کی رفتار قایم ہے اور اس کی ایک حد ہے زیادہ اس کی رفتار تیز نہیں ہو سکتی تو اسے یہ بھی محسوس ہوا کہ اس نے کائنات کی حد رفتار بھی معلوم کر لی ہے۔ وہ حد کیا ہے؟ یہ کہ کوئی چیز روشنی کی رفتار سے زیادہ تیزی سے حرکت نہیں کر سکتی۔ یہاں ایک مسئلہ پیدا ہوا کہ اگر کمیت قایم ہے تو پھر روشنی کی سی رفتار سے کسی محو حرکت چیز کو زور دار دھکا دیا جائے گا تو کیا ہوگا۔ اس سوال کا آئن سٹائن نے جو جواب دیا وہ حسبِ معمول سادہ، قابل فہم منطقی اور حیرت انگیز تھا۔ اس نے کہا جناب کمیت قایم نہیں ہے۔ کمیت ولاسٹی کے بڑھنے کے ساتھ بڑھ جاتی ہے۔ کسی محو چیز کو زور دار دھکا دیا جائے گا تو اس کی رفتار روشنی کی رفتار کے برابر نہیں ہو جائے گی، فقط اس چیز کی کمیت بڑھ جائے گی۔

جس زمانے میں آئن سٹائن نے اضافیتی اثرات" کے بارے میں پیشن گوئی کی تھی، اس وقت تک ان میں سے کسی بھی "اثر" کا مشاہدہ نہیں کیا گیا تھا۔ محض اس لیے کہ ہمیں اپنی روزمرہ کی زندگی میں جن "رفتاروں" سے مابقہ پڑتا ہے وہ اتنی سست ہوتی ہیں کہ ان کا کوئی قابل پیمایش اثر یا تغیر ہمارے مشاہدے میں نہیں آتا (حتیٰ کہ "اپالو" پروگرام کے خلا نورد، جو خلائی سفر پر گئے، ان کی رفتار روشنی کی رفتار کا $\frac{1}{۲۷۰۰۰}$ تھا)۔ لیکن اب ضمناً ایٹمی ذرات پر جو تجربات کیے گئے ہیں اور افلاک کے جو نئے مشاہدات نئی دوربینوں سے کیے گئے ہیں، اُن سے آئن سٹائن کی تقریباً تمام پیشن گوئیاں درست ثابت ہوئی ہیں۔ الیکٹرون کو اتنی سرعت سے پھینکا جاتا ہے کہ ایک ایک کی حقیقی کمیت کا لاکھواں کروڑواں حصہ ہو جاتا ہے۔ آسمان سے زمین کی طرف آنے والے کائناتی شعاعی ذرات کو راستے میں ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو جانا چاہیے لیکن وہ ختم نہیں ہوتے کیوں کہ وقت کی توسیع کے باعث ان کا عرصۂ حیات بھی بڑھ جاتا ہے۔

آئن سٹائن کے نظریے کی رُو سے روشنی کی رفتار تک پہنچنے کے لیے کسی چیز کی سرعت میں اضافہ کرنے کے لیے قدم قدم پہ زیادہ، مزید زیادہ توانائی بڑھانے کی ضرورت پیش آئے گی۔ روشنی کی رفتار کائنات کی مطلق حد رفتار ہے جہاں تک کوئی مادی چیز نہیں پہنچ سکتی۔

فوٹون (اشعاعی توانائی کی اکائی) اور نیوٹرون (تاب کاری سے پیدا شدہ ذرّات) بلاشبہ روشنی کی رفتار سے سفر کرتے ہیں لیکن وہ عام مادہ نہیں ہیں۔ وہ عام ساکن کمیت نہیں رکھتے۔ روشنی سے کم رفتار پہ وہ وجود ہی نہیں رکھتے۔

آئن سٹائن نے جو یہ تین اضافیتی اثرات دریافت کیے تھے ان میں سے "کمیت میں اضافہ" ایک ایسا اثر ہے جس کے سبب سے زیادہ نتائج برآمد ہوئے — ۱۹۰۵ء سے پہلے عام طور پہ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ کائنات دو بنیادی عناصر سے مرکب ہے۔ ایک مادہ اور دوسرا توانائی۔ یہ دونوں الگ الگ اور مختلف ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ توانائی کے بغیر مادہ اور مادے کے بغیر توانائی کا تصور کبھی نہیں کیا جا سکتا۔ آئن سٹائن اس عام خیال کو شبے کی نگاہ سے دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ چونکہ بڑھتی ہوئی ولاسٹی سے کمیت بڑھتی ہے، اس لیے آئن سٹائن یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب تھا کہ کمیت میں جتنا بھی اضافہ ہوتا ہے وہ اس چیز کی حرکت کی توانائی سے اخذ ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ توانائی بھی کمیت رکھتی ہے۔ یہ واقعی ایک انقلاب خیز انکشاف تھا۔ مادہ اور توانائی الگ الگ اور جدا گانہ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ ایک ہی بنیادی حقیقت کے دو پہلو۔

توانائی میں جو کمیت ہے وہ اتنی تھوڑی ہے کہ محسوس بھی نہ ہو سکے گی۔ توانائی میں کمیت جانچنے کے لیے آئن سٹائن نے ایک فارمولا بنایا۔

$$m = E/c^2$$

mass = m (کمیت)

Energy = E (توانائی)

"اللہ ہی نے تم کو اس قابل بنایا کہ تم سمندروں پہ قابو حاصل کرو، تاکہ اللہ کے حکم سے تمہارے سفینے اس پر چل سکیں۔ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں زمین اور آسمان کی ہر شے پر حکمرانی عطا کی ہے یہی ہیں وہ نشانیاں جن میں اصحاب فکر کے لیے اللہ کے اشارے موجود ہیں۔"

(قرآن حکیم ۴۵ - ۱۲/۱۳)

c^2 = روشنی کی رفتار کا مربع

یعنی کمیت برابر ہوتی ہے توانائی کی اس مقدار کے جو روشنی کی رفتار
ے مربع سے تقسیم کرنے پر حاصل ہو۔ چوں کہ طبیعات میں عام طور پر اعشاری نظام
ستعمال کیا جاتا ہے، اس لیے کمیت کو گرام، روشنی کی رفتار کو سینٹی میٹر فی
سکنڈ اور توانائی کو ارگ میں تولا یا ناپا جاتا ہے)۔ اس سے بھی زیادہ
ہم بات یہ ہے کہ اگر توانائی میں کمیت ہوتی ہے تو آئن سٹائن کو محسوس ہوا کہ
س کا الٹ بھی درست ہوگا یعنی مادّے میں بھی توانائی ضرور ہوگی۔ چنانچہ
س نے اپنی مساوات کو الٹا دیا اور یوں تاریخ سائنس کی مشہور ترین
ساوات سامنے آگئی یعنی:

$$E = mc^2$$

توانائی برابر ہے، کمیت × روشنی کی رفتار کا مربع۔

اس مساوات نے آسمان و زمین کو ہلا کر رکھ دیا۔ ارضیات، طبیعات، فلکیات،
تمام مروجہ علوم کے اپنے لپنے تہ و بالا ہوگئے۔ آئن سٹائن کے
اس فارمولے سے اس پُر اسرار توانائی کی بھی توجیہ ہوگئی جو تابکاری سے
پیدا ہوتی ہے اور اس امر کا بھی واضح اشارہ مل گیا کہ چھوٹے سے چھوٹا
ایٹم بھی (جس میں کمیت برائے نام ہوتی ہے) جب پھٹتا ہے تو اس میں
سے بے تحاشا توانائی خارج ہوتی ہے۔ یاد رہے کہ روشنی کی رفتار
کے مربع سے مراد یہ ہے
186,282 میل فی سکنڈ × 186,282 میل فی سکنڈ

کمیت کو توانائی میں بدلنے کی زبردست شرح کا اندازہ کیا جا سکتا
ہے۔ ایک اونس مادہ سے اتنی توانائی حاصل ہوگی جتنی ۲ کروڑ گیلن
گیسولین کے جلانے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس نظریے کو عملی صورت
دینے کے لیے جو ٹکنالوجی درکار تھی، وہ ۱۹۰۵ تک دستیاب نہ ہوئی تھی
چالیس سال بعد جب الاموگورڈو (نیومیکسیکو) میں پہلے ایٹم بم کا تجربہ کیا
گیا تو ثابت ہو گیا کہ آئن سٹائن کا فارمولا محض ایک نظریہ، ایک خیال
نہ تھا بلکہ ایک ٹھوس عملی حقیقت تھا۔

۱۹۰۵ میں آئن سٹائن کے شائع ہونے والے مقالے کا موضوع
تھا "خصوصی نظریۂ اضافیت" کیوں کہ اس کا تعلق صرف ان چیزوں
سے تھا جو ایک یکساں رفتار سے خط مستقیم میں حرکت کرتی ہیں اور ایسی
حرکت نادر و نایاب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات میں زیادہ تر
چیزیں، جن میں ہمارا نظام شمسی اور ہماری زمین بھی شامل ہے، یکسانی
سے حرکت نہیں کرتیں۔ ۱۹۱۶ میں اس نے "عمومی نظریۂ اضافیت
پیش کیا تھا، جس کا اطلاق غیر یکساں حرکت پر ہوتا ہے۔

ہم پر لازم ہے کہ بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر جن تبدیلیوں
کا آنا ضروری ہے جو نہ تو ہمارے اسلام سے ٹکراتی ہیں، نہ ہمارے
ایمان کو کمزور کرتی ہیں، نہ ہمارے عقاید کو مجروح کرتی ہیں اور نہ ہی
ہماری کسی اور چیز پر اثر انداز ہوتی ہیں، انھیں قبول کرنے میں ہم
کو کوئی ہچکچاہٹ اور تذبذب نہ ہونا چاہیے۔

سیّد ہاشم علی

زندگی کے سالمات کی کیمیا

عظیم قدوائی*

سن پچاس کے عشرے میں جینیاتی کوڈ" دریافت ہوا تھا۔ اس وقت سے اب تک حیاتی علوم میں گویا ایک بھونچال آیا ہوا ہے جو کسی طرح ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب حیاتیات کو کیمیائی اصطلاحوں میں سمجھا یا کہا جاسکتا ہے۔ اب زندگی کی تشریح یوں کی جاسکتی ہے جیسے یہ کیمیائی عمل ہو۔ ۱۹۷۰ء سے پہلے زندگی کو صرف حیاتیات کے پیکر ہی میں رکھ کر دیکھا اور سمجھا جاسکتا تھا۔ اس وقت تک حیاتی افعال کی اصلیت، ماہیت اور کیمیا پوری طرح سمجھ میں نہ آسکی تھی۔

اس رواں دواں انقلاب کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ایک نئی سائنس "حیاتی کیمیا" وجود میں آگئی ہے جو بڑی تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ حیاتی کیمیا نے دورِ جدید کے اسٹیج پر تین ایکٹ کا ایک نیا ڈراما رچایا ہے پہلا ایکٹ حیاتیات، دوسرا ایکٹ حیاتی ٹکنالوجی اور تیسرا ایکٹ جینیاتی انجینرنگ (جینیاتی انجینرنگ کے تحت ایک نامیے سے جینی مادہ کاٹ کر کسی دوسرے نامیے میں پیوند کاری کے ذریعے جذب کر دیا جاتا ہے)۔

اس پس منظر میں نومبر کے پہلے ہفتے میں کراچی میں دنیا کے چند بلند پایہ ماہرین حیاتیات جمع ہوں اور ان کے پر مغز مقالات سننے کا موقع ملے تو اسے دعوتِ دانش ہی خیال کرنا چاہیے۔ موقع یہ تھا کہ انٹرنیشنل یونین آف بایوکیمسٹری کے تحت ایک بین الاقوامی مذاکرے کا اہتمام تھا۔ یہ ایشیا اور اوشیانا کے حیاتی کیمیا کے ماہرین کی فیڈریشن کے تحت چھٹا بین الاقوامی مذاکرہ تھا، جس کی میزبانی کے فرائض پاکستان نے انجام دیے۔

ارتقاء کے رازہائے سربستہ

اس سہ روزہ مذاکرے میں پاکستان کے ۱۵۰ اور بیرونی ممالک کے ۵۷ ممتاز سائنس دانوں نے شرکت کی۔ مذاکرے کا عنوان تھا "بایوٹکنالوجی برائے ترقی"۔ سائنس دانوں کے اس شاندار پروقار اجتماع میں دو شخصیتیں ایسی بھی تھیں جو ایف آر ایس ہیں، یعنی فیلو رائل سوسائٹی۔ ایک پاکستانی صاحب اور ایک انگریز خاتون۔

پاکستانی صاحب پروفیسر محمد اختر تھے جو شعبۂ حیاتی کیمیا ساؤتھ یونیورسٹی (برطانیہ) کے سربراہ ہیں۔ غیر معمولی شخصیت کے حامل ہیں۔ وہ پہلے پاکستانی ماہر حیاتیات ہیں، جن کو رایل سوسائٹی کا فیلو بننے کا علمی اعزاز حاصل ہوا ہے۔ یہ اعزاز صرف تین پاکستانیوں کو حاصل ہو چکا ہے۔ ایک پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام، دوسرے ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی اور تیسرے پروفیسر محمد اختر۔

مذاکرے کا افتتاحی اجلاس حسب دستور آرائشی اور نمائشی نوعیت کا تھا۔ پروفیسر عطاء الرحمن نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں بعض کام کی باتیں کیں۔ پروفیسر صاحب جناح پوسٹ گریجویٹ میڈیکل سینٹر کے شعبۂ کیمیا کے صدر ہونے کے علاوہ پاکستانی ماہرین حیاتی کیمیا کی یونین کے صدر نشین بھی ہیں۔

مثال کے طور پر ڈاکٹر رحمٰن نے کہا:

" حیاتی کیمیا ایک ایسی سائنس ہے جس کا مقصد اس عجیب وغریب سوال کا جواب معلوم کرنا ہے کہ "تمام بے جان

---

* بی ۱۱ – ۳۴۷ اے۔ شمالی کراچی۔ پاکستان

مسامات خلیے کو کیونکر زندہ رکھتے ہیں۔ یہ ایسی سائنس ہے جو طب، غذائیات، زراعت اور صنعت و حرفت کے میدانوں میں اپنے علمی اطلاق سے ہمارے معاشرے پر غیر معمولی اثر ڈال رہی ہے اور مستقبل میں اس کا اثر اور بھی بڑھ جائے گا۔"

انہوں نے مزید کہا:

"جب سے جینیاتی کوڈ دریافت ہوا ہے اور ارتقا کے راز ہماری سمجھ میں آنے لگے ہیں، جینیاتی ٹکنالوجی دورِ جدید کی اہم ترین ٹکنالوجی بن گئی ہے۔ جینی انجینئرنگ کے شعبے میں خلیوں میں جینی مادے کی باز ترکیب کا جو طریقہ دریافت ہوا ہے وہ اس عہد کا اہم ترین انکشاف ہے۔"

اس انکشاف سے فوری طور پر جو فائدے حاصل ہوئے ہیں، ان کے بارے میں ڈاکٹر عطاء الرحمٰن نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا:

"ڈی۔ این۔ اے کی باز ترکیب سے متعدد نئی ادویہ حاصل ہوئی ہیں۔ بے شمار ہارمون اور ویکسین زیرِ تحقیق آئے ہیں۔ مثلاً ذیابیطس کی دوا انسولین کا اسپرے تیار کیا جا رہا ہے جو سونگھا جا سکے گا۔ ذیابیطس کے ایسے مریض، جن کو ٹیکا نہیں لگایا جا سکتا۔ انسولین سونگھ کر شفایاب ہو سکیں گے۔ ٹیکے کے مقابلے میں سونگھنے والی دوا کا استعمال آسان ہوتا ہے۔"

افتتاحی اجلاس کے بعد متعدد فنی اجلاس منعقد ہوئے جن میں سائنس دانوں نے پچاس سے زیادہ مقالات پڑھے۔ فنی اجلاس ان موضوعات کے مطابق گروپ کی شکل میں منعقد ہوئے۔ بایوٹکنالوجی، جینیاتی انجینئرنگ، غذائیات، طبی حیاتیات کیمیا اور سالماتی ویکسین۔

برطانیہ کی خاتون پروفیسر پیٹریکا کلارک (ایف۔آر۔ایس) کے مقالے کا عنوان تھا: مائکروبی خمیر سے حاصل شدہ نئی اشیاء" مائکروب خردبینی جرثومے ہوتے ہیں یہ کسی بھی تخمیری عمل کے بنیادی کارکن ہوتے ہیں ان کی کارکنی سے فارمیسی اور صنعت کی بے شمار چیزیں پیدا ہوتی ہیں — خردبینی جرثوموں کی تخمیر سے جو صنعتی اشیاء وجود میں آئی ہیں، ان میں ضد حیویات (اینٹی بایوٹکس) سرِفہرست ہیں جو ہماری روزمرہ زندگی میں رچ بس چکی ہیں۔ علاوہ ازیں کئی کیمیات مثلاً ایتھانول، ایسی ٹون، بیوٹانول وغیرہ بھی بنا لیے گئے ہیں لیکن پروفیسر پیٹریکا کا کہنا یہ تھا کہ اب ڈی این اے کی باز ترکیب سے بالکل نئی قسم کے جرثومے پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ ان نئی قسم کے جرثوموں کی تخمیر سے نئے پروڈکٹ بنائے جا سکیں گے۔

پروفیسر صاحب نے نوساختہ جرثومے کی ایک مثال بھی دی۔ جو چند ہفتے قبل کیلی فورنیا میں تجرباتی بنیاد پر حاصل کیا گیا ہے۔ اس سے ماحول کو صاف کرنے کا کام لیا جائے گا۔ کچھ عرصہ پہلے امریکہ میں مقیم ایک بھارتی سائنس داں کے بارے میں بھی معلوم ہوا تھا کہ اس نے تخمیر کے ذریعے ایک ایسا نیا جرثومہ بنایا تھا کہ جب اسے تیل آلودہ سمندر پر چھوڑا جائے گا تو وہ سمندر میں پھیلا ہوا سارا تیل چٹ کر جائے گا۔

خاتون پروفیسر پیٹریکا نے کہا کہ جرثومی تخمیر کے استعمال اور بایوٹکنالوجی کے اطلاق سے طب، زراعت، ایندھن اور غذائیات کے شعبوں میں ایک خوش گوار اور مثبت انقلاب آجائے گا۔ ماحول سے طرح طرح کی آلودگیوں کو صاف کرنے میں مدد ملے گی۔ پھر یہ کہ نئے پروڈکٹ بہت سستے ہوں گے۔

ایک فنی اجلاس کی صدارت کے فرائض پروفیسر محمد اختر نے ادا کیے لیکن انہوں نے اپنا کوئی مقالہ نہیں پڑھا۔ تاہم ہماری خوش قسمتی سے ان سے گفتگو کے اچھے خاصے مواقع مل گئے۔ دو اجلاسوں کے درمیان جو بھی وقفہ ملتا ہم اُن کے پاس پہنچ جاتے اور حیاتی کیمیا کی موجودہ کیفیت اور مستقبل میں اس کی ترقی و اہمیت کے بارے میں ان کے قیمتی خیالات معلوم کرنے کی کوشش کرتے۔ ہمارا بنیادی اور بڑا اصول یہ تھا کہ اب جب کہ زندگی کے سالمات پر کیمیا کے اصولوں کا اطلاق ہونے لگا ہے، تو ان کے خیال میں کیا مسائل پیدا ہوں گے اور ان کے حل کیا ہوں گے؟

پروفیسر محمد اختر کے نزدیک زندگی چار مختلف مرحلوں سے عبارت ہے، اور اب وہ مقام آگیا ہے کہ ان چاروں مرحلوں کو الگ الگ تحقیق کے ڈھانچے میں پرکھا جانا چاہیے۔ ان کی یہ بات سن کر ہم ششدر رہ گئے کہ اپنی پسند اور مرضی کا کوئی نیا ڈی این اے بنانے میں شاید پچاس سال لگ جائیں گے۔ گویا صرف پچاس سال میں زندگی کی اصل حقیقت انسان پر آشکار ہو جائے گی۔

ممتاز پاکستانی سائنس داں نے زندگی کے ان مرحلوں کی جو تشریح کی، اس کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ ڈی این اے زندگی کا بنیادی سالمہ ہے۔ تمام موروثی معلومات اس سالمے میں درج ہوتی ہیں۔ جینیاتی معلومات کی ترسیل بھی اس کی ذمہ داری ہے۔

۲۔ آر۔ این۔ اے کا کام یہ ہے کہ جہاں معلومات چھپی بیٹھی ہیں، وہاں سے حاصل کی جائیں اور جہاں اُن کی ضرورت ہے، وہاں پہنچائی جائیں آر۔ این اے گویا ایک واسطے کا کام کرتا ہے اور انتہائی متحرک ہوتا ہے۔

۳۔ پروٹین۔ ان میں سے بعض بہت عمل انگیز ہوتی ہیں، جیسے انزائم، پروٹین (لحمیات) تمام زندہ خلیوں کے بنیادی اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں۔ اُن کی تالیف و ترکیب ڈی این اے اور آر۔ این اے کے ہاتھ میں ہے۔

۴۔ ننھے ننھے سالماتی مرکبات، جو زندگی کے پھیلے ہوئے جال میں رسول کی حیثیت رکھتے ہیں۔

پروفیسر اختر کا خیال تھا جینیاتی انجینئرنگ نے اب تک صرف "سادہ ترین" معاملات پر ہاتھ ڈالا ہے اور کامیابی حاصل کی ہے یعنی ایسے معاملوں میں جہاں سالماتی کیمیا استعمال کرتے ہوئے کیمیائی اصولوں کا اطلاق نسبتاً آسان تھا، اور یوں مسئلے بھی حل ہوئے لیکن بعض حیاتیاتی معاملے اور نظام بہت مشکل اور پیچیدہ ہیں۔

سادہ سالمے کی مثال کے لیے دیکھیے انسانی انسولین اس کو جینیاتی انجینئرنگ کے ذریعے بنایا جا سکتا تھا، اس لیے بنالی گئی اور آج کل بطور دوا پوری دنیا میں مستعمل ہے۔ انسولین چونکہ پروٹین ہے، اس لیے اس کو بنانے کا کام تیسرے مرحلے ہی میں ختم ہوگیا۔ چوتھے مرحلے میں جانے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔

اب پیچیدہ معاملے کی مثال پر غور کیجیے۔ فرض کرو ایک خاص شخص کے جسم میں ایک خاص قسم کا پروٹین نہیں رہا۔ اس لیے وہ خاص قسم کے مرض میں مبتلا ہے۔ کیا کسی دوسرے شخص کے اسی پروٹین کا خلیہ لے کر مریض کے جسم میں تحلیل کرکے مرض کا علاج کیا جا سکتا ہے۔ یہ چوتھے مرحلے کا معاملہ ہے اور انتہائی مشکل اور پیچیدہ ہے۔

قدرت کے ارتقائی عمل میں جینیاتی تغیرات کے ایک حادثے، محض اتفاق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انسان کی حالت یہ ہے کہ وہ ایسے ارتقائی پر مکمل کنٹرول حاصل کرنا چاہتا ہے، جسے خود قدرت محض اتفاقاً اور حادثتاً انجام دیتی ہے۔

سو ایک نوع کا ڈی این اے لے کر اسے کسی دوسری نوع میں پیوست کرنا مشکل، بہت مشکل کام ہے۔ بڑا چیلنج انسان پر بایوٹکنالوجی کا اطلاق ہے۔ انسان کے جسم کا مرکزہ دوسری انواع کی نسبت کچھ زیادہ پیچیدہ ہے۔ کیا انسان کسی دوسری نوع کا ڈی۔ این۔ اے وصول اور قبول کرکے اسے دوبارہ پیدا بھی کر سکتا ہے، اس کا جواب آسانی سے فراہم نہیں ہو سکتا۔

انقلاب کی طرف پہلا قدم اُس دن اُٹھے گا جس دن زندگی کے عمل کے چاروں مرحلوں پر یکسانی اور یکسوئی سے قابو پالیا جائے گا۔

اس مذاکرے میں ایک شاندار مضمون، جس نے سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلی تھی، ایک اور جونیئر پاکستانی سائنس داں ڈاکٹر ایم معصوم نے پڑھا تھا۔ ان کا تعلق شعبۂ حیاتی کیمیا، بلوچستان یونیورسٹی سے ہے ڈاکٹر صاحب نے انزائم کو غیر متحرک کرنے کا ایک سادہ طریقہ نکالا ہے انزائم زندہ خلیوں سے پیدا شدہ بڑے پیچیدہ عمل انگیز پروٹین ہوتے ہیں انزائم اس لیے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں کہ زیادہ مفید اور ارزاں ہوتے ہیں۔

بایوٹکنالوجی میں انزائم کا استعمال روز بروز بڑھ رہا ہے اور اسی حساب سے کوئٹہ میں تحقیق کا کام بھی۔

> "خدا کی یاد سے خالی قلب کی مثال ایسی ہے جیسے بغیر قاضی کے عدالت گاہ ہوتی ہے۔"
>
> لامارتین

فیثاغورث

یونان کے اردگرد کے سمندر میں جو بحیرۂ ایجیئن کے نام سے مشہور ہے ایک چھوٹا سا جزیرہ ساموس واقع ہے جو ایشیائے کوچک کے ساحل سے صرف ایک میل دور ہے۔ اسی جزیرے میں حضرت مسیح سے چھ صدی پہلے یعنی ۵۸۲ ق م میں فیثاغورث پیدا ہوا۔ اس کا باپ یونان کا ایک بہت دولتمند شخص تھا جس نے اپنے بیٹے کی تربیت پر بے دریغ روپیہ صرف کیا اور اس کو تعلیم دینے کے لیے یونان کے بہترین اتالیق مقرر کیے۔ چوں کہ فیثاغورث فطری طور پر بہت ذہین تھا۔ اس لیے اس نے اس تعلیم سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور تھوڑے ہی عرصے میں وہ ریاضی اور فلسفے میں اپنے ہم سبقوں سے بہت آگے بڑھ گیا۔ ابھی اس کی عمر صرف بیس برس کی تھی کہ اسے سیاحت کا شوق چرایا۔ چنانچہ یہ ہنس مکھ اور بے فکرا نوجوان جس کے گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی، محض حصول علم کے جذبے کو دل میں لیے ایک طویل سفر پر روانہ ہو گیا۔

وہ سب سے پہلے بابل پہنچا جو قدیم دنیا کا سب سے مشہور شہر تھا۔ یہ عراق میں دریائے فرات کے کنارے موجودہ بغداد سے ساٹھ میل کے فاصلے پر واقع تھا اور تہذیب و تمدن کا بہت بڑا مرکز تھا۔ چنانچہ یہاں کے رہنے والے ایسے زمانے میں بھی علوم و فنون سے مالا مال تھے، جب یونانیوں کی حالت بالکل وحشیانہ تھی۔ فیثاغورث نے یہاں کے مشہور اساتذہ سے جتنا ممکن ہو سکا، علم حاصل کیا۔ مگر اسے جس سکون کی تلاش تھی وہ اسے نہ مل سکا۔ اس لیے چند سال یہاں گزارنے کے بعد اس نے مشرق کی راہ لی اور کئی برس کی صعوبتیں اٹھانے کے بعد وہ برعظیم پاک و ہند کے اس علاقے میں پہنچا جو موجودہ زمانے میں بہار کے نام سے موسوم ہے اور بھارت کا ایک صوبہ ہے۔ یہاں اس کی ملاقات بدھ مت کے بانی گوتم بدھ سے ہوئی جو اس عہد میں پاک و ہند کے گوشے گوشے میں عرفان کی تجلیاں بکھیر رہا تھا۔ کیا فیثاغورث نے فی الواقع بدھ مت اختیار کر لیا تھا؟ یونانی مورخ اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں لیکن یہ بات یقینی ہے کہ بدھ کے خیالات اور عقائد کا فیثاغورث پر بہت گہرا اثر پڑا تھا۔ چنانچہ جب یونان میں جا کر اس نے اپنی ایک الگ مذہبی جماعت بنائی تو اس جماعت کے اکثر اصول بدھ مت کے اصولوں کا ہی چربہ تھے۔ بہار میں بدھ سے رخصت ہو کر فیثاغورث مصر پہنچا جہاں کے دانشور جیومیٹری میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ اس نے مصری عالموں سے جیومیٹری کا علم حاصل کیا اور پھر اپنے غور و فکر سے اس میں چند جدید مسائل دریافت کیے جن میں سب سے مشہور وہ مسئلہ ہے جو مسئلہ فیثاغورث کے نام سے مشہور ہے۔

فیثاغورث کے ایک سوانح نگار نے لکھا ہے کہ مصر کے قیام کے دوران میں اسے حضرت موسیٰؑ کے حضور میں باریابی کا شرف حاصل ہوا مگر یہ ایک شدید غلطی ہے۔ کیوں کہ حضرت موسیٰؑ کا زمانہ فیثاغورث سے کم از کم ایک ہزار سال پہلے کا ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام میں سے حضرت دانیالؑ فیثاغورث کے ہم عصر تھے۔ اس لیے اس امر کا امکان ہو سکتا ہے کہ فیثاغورث نے حضرت دانیالؑ کی صحبت سے فیض حاصل کیا ہو۔ لیکن یقین کے ساتھ اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

فیثاغورث جب یونان سے روانہ ہوا تو وہ ایک نوجوان لڑکا تھا، لیکن جب وہ اپنے طویل سفر سے واپس آیا تو اس کی عمر پچاس سال

(ماخوذ)

سے متجاوز ہو چکی تھی اور وہ ایک خاموش سنجیدہ مزاج مفکر بن چکا تھا۔ اس نے زندگی کے پورے ۳۰ سال اس طویل سیاحت کی نذر کر دیے تھے۔

اگر اس سیاحت کے دوران میں مشرق کے کسی مقام پر اس کی موت واقع ہو جاتی تو اس کا کوئی نام بھی نہیں جانتا، لیکن وہ اپنے وطن میں زندہ سلامت لوٹ آیا۔ یہاں آکر اس نے اپنے افکار کی تبلیغ کے لیے ایک الگ جماعت بنائی۔ فلسفۂ حیات کا ایک علیحدہ مکتب فکر جاری کیا۔ جیومیٹری میں اپنا مشہور مسئلہ ہندسی عالموں کے سامنے بیان کیا، اس کے ثبوت میں بہم پہنچائے اور ان تمام باتوں سے اپنے لیے شہرت دوام کے دربار میں ایک مقام پیدا کر لیا۔



فیثا غورث

فیثاغورث نے سب سے پہلے اٹلی کے ایک شہر "کرٹونا" میں بود و باش اختیار کی۔ یہاں اس نے اپنے عقیدت مندوں اور شاگردوں کو تعلیم دینے کے لیے ایک درس گاہ بنائی جس میں وہ مروجہ علوم کے ساتھ ساتھ اپنے مخصوص عقاید کی بھی تعلیم دیتا تھا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مذہبی لحاظ سے اس کے یہ مخصوص عقاید کیا تھے کیونکہ تعلیم کا یہ حصہ پوشیدہ طور پر دیا جاتا تھا اور اسے اپنے عوام پر ظاہر نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اس تعلیم میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کا عنصر غالب تھا۔

فیثاغورث کے شاگرد نہ صرف اپنے فاضل استاد سے گہری عقیدت رکھتے تھے بلکہ ان کے آپس کے تعلقات بھی بھائیوں سے بڑھ کر تھے۔ اس کا ثبوت ہمیں ایک واقعہ سے ملتا ہے جسے ایک یونانی سوانح نگار "ڈاسیر" (DACIER) نے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ایک دن فیثاغورث اپنے وطن سے دور کسی سرائے میں اقامت پذیر تھا، جہاں وہ بیمار پڑا اور جو روپیہ اس کے پاس تھا وہ خوراک اور علاج پر خرچ ہو گیا۔ سرائے کا مالک جو ایک خدا ترس آدمی تھا، اس کے بعد اپنے پاس سے روپیہ خرچ کر کے اس کی تیمار داری کرتا رہا لیکن اس کی حالت روز بروز بگڑتی گئی۔ جب اسے اپنی زندگی کی کوئی امید نہ رہی تو اس نے کاغذ اور قلم منگوایا۔ اپنی داستانِ غم لکھوائی اور اس کے خاتے پر فیثاغورث کا مخصوص نشان ثبت کر دیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے مربی یعنی سرائے کے مالک سے التجا کی کہ اس کاغذ شہر کے دروازے پر لگا دیا جائے۔ اگلے روز بیمار کا انتقال ہو گیا اور سرائے کے مالک نے اس کے لکھوائے ہوئے کاغذ کو اس کی وصیت مطابق شہر کے دروازے پر چسپاں کر دیا۔ کئی روز گزر گئے۔ ایک دن وہاں سے ایک اور فیثاغورثی کا گزر ہوا۔ اس نے اس کا پڑھا اور جب اس کے آخر میں فیثاغورث کا مخصوص علامتی نشان اس کی نظر پڑا تو اسے معلوم ہو گیا کہ کاغذ پر لکھی ہوئی یہ داستان کسی فیثاغورثی بھائی کی ہے۔ وہ فوراً سرائے کے مالک کے پاس آیا۔ اس کے تمام روپے کی ادائیگی کر دی اور مزید براں ایک خطیر انعام کے طور پر دے کر اس کی ان خدمات پر اس کا شکریہ ادا کیا جو ایک فیثاغورثی کی جان بچانے کے لیے اس نے سر انجام دی تھیں۔

فیثاغورث کے یہ مخصوص علامتی نشان جن سے اس کے شاگرد ایک دوسرے کو پہچان لیتے تھے، چند فقرے تھے جن کے اندر ظاہری معنوں کے علاوہ بعض ایسے معنیٰ پوشیدہ ہوتے تھے جن کو فیثاغورثیوں کے سوا کوئی اور نہ سمجھ سکتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک نوع کی فقرے تھیں جو ظاہری معنوں کے علاوہ پوشیدہ معنوں کی حامل ہوتی تھیں۔ ذیل میں تشریح کے طور پر فیثاغورث کے چند علامتی فقرے اور ان کے پوشیدہ معنیٰ درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ ایسی مچھلی نہ کھاؤ جس کی دم سیاہ ہو۔

(پوشیدہ معنیٰ: ایسے شخص کی صحبت میں نہ بیٹھو جس کی شہرت اس کے بُرے اعمال کے باعث داغدار ہو اور جسے لوگ پیٹھ پیچھے بُرا کہتے ہیں)

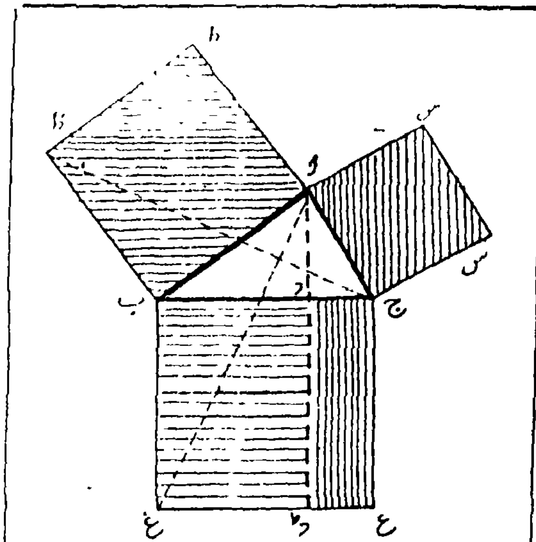
۲۔ آگ کو تلوار کی نوک سے حرکت نہ دو۔

(پوشیدہ معنیٰ: جو شخص پہلے سے تمہارا دشمن ہو، اس کو مزید غصہ دلا کر اس کی عداوت کی آگ کو نہ بھڑکاؤ)۔

ہے اور کتا بھی طرح بلبلا رہا ہے۔ فیثاغورث نے کہا: بھلے مانس کیوں مارتا ہے۔ اس میں تو میرے ایک دوست کی روح آئی ہوئی ہے۔ میں نے اس کی آواز پہچان لی ہے"۔

فیثاغورث اور اس کے حواریوں نے ریاضی اور فلکیات کے شعبوں میں غیر معمولی خدمات انجام دی تھیں۔ وقت دیکھنا چاہیے کہ کون سا زمانہ تھا۔ وہ زمانہ ابتدائی ہے۔ ہر چیز خام اور ناپختہ ہے۔ نہ آلات ہیں نہ اوزار۔ اس کے باوجود یہ پہلے لوگ تھے جنھوں نے دنیا والوں کو بتایا کہ دنیا گول ہے۔ انہوں نے اجرام فلکی کا مشاہدہ کرنے کے بعد بتایا کہ "ہیں ستارے کچھ نظر آتے ہیں کچھ"۔ ان کو یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ سورج جو روزانہ صبح شام زمین کے گرد چکر لگا رہا ہے، محض دکھاوے کی بات ہے۔ حقیقت یقیناً کچھ اور ہے۔ وہ یہ دریافت نہ کر سکے کہ زمین اپنے محور پر گھوم رہی ہے وہ یہ کہتے تھے کہ کائنات کے مرکز میں آگ دہک رہی ہے۔ ہماری زمین اس آگ کے گرد گھوم رہی ہے۔ زمین کے علاوہ چار سیارے اور بھی اسی طرح مرکزی آگ کے گرد گھوم رہے ہیں، جن میں چاند اور سورج بھی شامل ہیں۔ زمین اپنی گردش ایک دن میں، چاند ایک مہینے میں اور سورج ایک سال میں مکمل کر لیتا ہے۔ ہم اس آگ کو اس لیے نہیں دیکھ سکتے کہ ہم گول زمین پر مخالف سمت میں رہتے ہیں۔ بہر صورت فیثاغورث اور اس کے حواریوں نے مستقبل کے کوپرنیکس اور گیلیلیو کے لیے صداقت کی راہیں کھول دیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ فیثاغورث نہ ہوتا تو گیلیلیو نہ ہوتا۔

فیثاغورث علم الاعداد کا تو موجد ہے۔ اعداد سے اسے بے پناہ عشق تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ کائنات کا مرکز عدد ہے، سب کچھ عدد ہے زندگی بھی عدد سے ہے اور موت بھی۔ تمام ضرب، تقسیم، جمع، تفریق عدد سے ہوتی ہے۔ عدد نہ ہو تو یہ کائنات قائم نہیں رہ سکتی۔ سورج، چاند اور ستاروں کی حرکات عدد سے ہیں، موسیقی کے سر عدد سے ہیں۔ فن تعمیر عدد سے ہے۔ فاصلوں کی پیمائش عدد سے ہوتی ہے۔ چیزوں کا ناپ تول عدد سے ہوتا ہے۔ عدل و انصاف کا عدد چار ہے۔ شادی کا عدد پانچ ہے۔ سات کا عدد وقت کی گردش کا عدد ہے: یہ ہفتے کے سات دن، موسیقی کے سات سروں، منشور کے سات رنگوں کا عدد ہے وغیرہ۔



فیثاغورث نے علم الاعداد کی بنیاد پر علم الہندسہ یعنی جیومیٹری کے بعض قواعد بنائے جن میں سے اس کا دریافت کردہ ایک مسئلہ تو آج تک اس کے نام سے منسوب ہے۔ وہ مسئلہ یہ ہے: "ایک قائم الزاویہ مثلث کے زاویۂ قائمہ کے ضلع پر کا مربع دوسرے دو ضلعوں کے مربعوں کے مجموعے کے برابر ہوتا ہے۔"

فیثاغورث نے اعداد کی سائنس میں مبالغے کی حد تک ادراک حاصل کر لیا تھا۔ جس کے باعث اس سے مضحکہ خیز غلطیاں بھی سرزد ہوتی تھیں۔ مثال کے طور پر "دو" کے عدد کا جذر معلوم کرنے کے سلسلے میں اس نے سخت غلطیاں کیں۔ تاہم اس کے قائم کردہ علم الاعداد کو بعد میں ریاضی داں اقلیدس نے منضبط شکل میں پیش کیا۔

۵۴۰ سے اس کی وفات ۵۰۰ ق م تک فیثاغورث کی شہرت اپنے عروج پر تھی اس کے قائم کردہ مذہبی فرقے کو ارباب سیاست میں بھی گہرا اثر و رسوخ حاصل تھا اٹلی کے یونانی مقبوضات پر اس کے اثرات مستحکم تھے لیکن سیاسی اثرات سے فائدہ صرف روسا، کو پہنچتا تھا۔ روسا اس فرقے میں داخل ہو گئے تھے اور اپنے مفادات کی خاطر اس کے نام سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے تھے۔ وہ سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لیے فیثاغورثی مذہب کو بطور آلہ کار استعمال کرتے تھے۔ عین اسی زمانے میں کروٹن اور اس کے پڑوسی شہر سائرس کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ سائرس کا حاکم تیلیسی بڑا ظالم اور مطلق العنان تھا۔ اس نے کروٹن کے چند باشندوں کو پکڑ کر محبوس کر لیا۔ کروٹن والوں نے بڑی منت سماجت کی لیکن تیلیسی نے کسی بھی قیمت پر انہیں رہا کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ خوفناک جنگ ہوئی جس میں کروٹن والوں نے سائرس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ سائرس جو پورے یونان میں اپنی دولت اور ثروت کی وجہ سے خاصی شہرت

۳۔ شارع عام پہ نہ جاؤ۔

(پوشیدہ معنیٰ: عام آدمیوں کے پیچھے مت چلو، صرف دانشوروں کی پیروی کرو۔

۴۔ گل خطمی کی کاشت کرو مگر اس کو کھاؤ نہیں۔

(پوشیدہ معنیٰ: دوسروں کے گناہوں کو معاف کردو، مگر اپنے گناہوں کو معاف نہ کرو۔)

فیثاغورث کے حلقۂ تلمذ میں نظم و ضبط بہت سخت تھا جس میں سے اُس کے تمام شاگردوں کو گزرنا پڑتا تھا۔ ان کے زمانۂ تعلیم میں پہلے پانچ سال کی مدت "عرصۂ خاموشی" کہلاتی تھی۔ اس مدت میں ہر شاگرد کے لیے ضروری تھا کہ وہ استاد کے تمام فرمودات کو خاموشی کے ساتھ سنے اور ان پر پوری عقیدت کے ساتھ یقین رکھے۔ اس عرصے میں اسے کسی قسم کے سوال کرنے یا شک کا اظہار کرنے یا زبان اعتراض کھولنے کی قطعی اجازت نہ تھی۔ بعض طلبا کے لیے جن کی ذہانت اور اکتساب علم کی استعداد عام طالب علموں سے بڑھی ہوئی ہوتی تھی عرصۂ خاموشی کی مدت پانچ سال سے گھٹا کر دو سال کر دی جاتی تھی لیکن دو سال سے وہ کسی صورت میں کم نہ ہوتی تھی۔

طلبا کا روزمرہ کا پروگرام علی الصبح موسیقی سے شروع ہوتا تھا۔ فیثاغورث موسیقی کا بہت شائق تھا اور اس کے اثرات پہ گہرا یقین رکھتا تھا۔ موسیقی کے بعد طلبا فیثاغورث کی قیادت میں ایک گھنٹے کے لیے سیر کو چلے جاتے۔ سیر سے واپس آکر مکتب کی چار دیواری میں ان کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ دوپہر کو وہ ایک میز پہ اکٹھے کھانا کھاتے۔ ان کی خوراک بہت سادہ ہوتی تھی اور شراب کی انہیں سخت ممانعت تھی۔ کھانے کے بعد مختلف موضوعات پہ لیکچر ہوتے اور سہ پہر کو تھوڑی سی ورزش یا کھیل کے بعد ایک دن کے پروگرام کا اختتام ہو جاتا۔

فیثاغورث نے اپنے عقیدت مندوں میں برادرانہ تعلقات اس حد تک استوار کر دیے تھے کہ وہ اپنی ساری دولت برادری کے مشترکہ فنڈ میں شامل کر دیتے تھے اور پھر اس مشترکہ فنڈ سے تمام اراکین اپنی ضرورت کے مطابق بہرہ اندوز ہوتے تھے۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی امیر ہو، اس کے لیے اپنی ساری نقدی اور پونجی مشترکہ کھاتے میں داخل کرنا لازمی تھا۔ اس مشترکہ خزانے کا اہتمام چند منتخب افراد کرتے تھے، جو ماہرین اقتصادیات کہلاتے تھے۔ یہ لوگ اس مشترکہ فنڈ کو تجارت میں بھی لگا دیتے تھے جس کے نفع سے فنڈ بڑھتا رہتا تھا اور کچھ عرصے کے بعد دوگنا تگنا ہو جاتا تھا۔ اگر کوئی شخص برادری کے حلقے سے نکلنا چاہتا تو اس کا روپیہ منافع کے ساتھ اس کو واپس کر دیا جاتا مگر ساتھ ہی درس گاہ کے احاطے کے قریب اس کی ایک فرضی قبر بنا دی جاتی۔ کیوں کہ برادری کے اراکین کے نزدیک حلقے سے اس کا اخراج عملی طور پر اس کی موت کے مترادف تھا۔

فیثاغورث کے فلسفے میں عورت کا بہت احترام تھا اور وہ عورت کو ترقی کی راہ میں مردوں کے دوش بدوش دیکھنا چاہتے تھے۔ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ اس بارے میں اس کے خیالات یونانی دور کے ایک اور دانش ور ارسطو کے خیالات سے متضاد تھے۔ کیونکہ ارسطو عورتوں کو مردوں سے بہت فروتر جانتا تھا اور انہیں حکومت یا سوسائٹی میں کسی قسم کے حقوق دینے کا سخت مخالف تھا لیکن فیثاغورث عورتوں کو مردوں کے سے تمام حقوق دینا چاہتا تھا۔ حکومت میں بھی اور معاشرے میں بھی، اس کے حلقۂ درس میں عورتیں بھی برابر شریک ہوتی تھیں جن میں سے بعض عورتیں علمیت کے اعلیٰ درجے پہ پہنچ گئی تھیں۔ انہیں فاضل عورتوں میں ایک فیثاغورث کی اپنی بیوی تھی۔ فیثاغورث کی جاری کردہ تحریک کو ان خواتین سے جو اس میں شامل ہو گئی تھیں، بہت تقویت ملی تھی اور یہ تحریک سرعت سے پھیل رہی تھی۔

اس کے فلسفے کا کلیدی نکتہ آواگون یا تناسخ ارواح ہے، یہ کہ آدمی کو مرنے کے بعد جزا سزا سے ضرور گزرنا پڑے گا۔ فیثاغورث کا عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد روح بار بار اپنے اعمال کے مطابق جنم لیتی ہے۔ اگر اچھے کام کیے ہیں تو بہتر انسان کی جون میں اور اگر بُرے کام کیے ہیں تو بُرے انسان کم ذات انسان یا حیوانوں کی جون میں جنم لیتا رہتا ہے۔ اگر انسان اپنی نفسانی خواہشات کو مارنے میں کامیاب ہو جائے اور اپنی روح کو پاک صاف کر لے تو وہ آواگون کے چکر سے چھوٹ جاتا ہے اور اسی کا نام "نجات" یا "مکتی" ہے۔ یہ نظریہ آج تک ہندو مت اور بدھ مت کے اکثر پیروکاروں میں موجود ہے۔

اس سلسلے میں تاریخ یونان کے مصنف جے بی بری نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ فیثاغورث نے دیکھا کہ ایک شخص کتے کو مار رہا

رکھتا تھا، اس کا نام و نشان تک ہمیشہ کے لیے مٹ گیا۔

سائرس کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے کا کارنامہ فیثاغورث یا اس کے فلسفے کا کارنامہ نہیں تھا بلکہ اس کے فرقے کے روسا کی رقابت کا شاخسانہ تھا۔ اب وہی روسا برسر اقتدار آگئے۔ ان کی قایم کردہ نئی حکومت کے خلاف عوام نے بغاوت کردی، جس کی لپیٹ میں فیثاغورث اور اس کا فلسفہ بھی آگیا، اس کا فرقہ بھی، اس کے درویش بھی۔ فیثاغورث نے اس بغاوت کی مزاحمت کرنے کے بجائے عافیت اسی میں سمجھی کہ بھاگ کر میٹیاپونٹم (اٹلی کا ایک شہر) چلا گیا۔ مرتے دم تک وہیں قیام کیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے خودکشی کرلی تھی۔ اس کے کروٹن سے چلے جانے کے بعد وہاں امن ہوگیا۔ اس کے درویش پھر تبلیغ و تحقیق میں مصروف ہوگئے لیکن چالیس برس کے بعد اچانک ایسا واقعہ ہوا کہ فیثاغورث کے نام لیوا بھی مٹ گئے۔

ہوا یوں کہ چالیس درویش ایک شخص ملیون کے گھر میں جلسہ کررہے تھے۔ مخالفوں نے ان کا گھیراؤ کرکے مکان کو آگ لگادی۔ فیثاغورث کے درویش سب جل کر راکھ ہوگئے۔ گویا یہ اعلان تھا اس امر کا کہ یونان اور اٹلی میں جہاں جہاں بھی فیثاغورثی فرقے کا کوئی رکن پایا جائے اسے فوراً موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

اس اجتماعی ہلاکت سے صرف دو درویش باقی رہ گئے تھے جن سے افلاطون کے نوجوان شاگرد ارسطو نے فیثاغورث کے قصے سنے اور اپنی تالیفات میں قلم بند کیے۔ ارسطو اور اس کے شاگردوں کی تالیفات فیثاغورث کے واحد مآخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

فیثاغورث کا نام تو مٹ گیا لیکن کام نہ مٹ سکا۔ اس کے قایم کردہ علم الاعداد اور جیومیٹری کو گہرائی میں سمجھنے والا ایک شخص اقلیدس پیدا ہوگیا۔ جسے دنیا
آج تک "بابائے ریاضی"
کے نام سے یاد کرتی
ہے۔

یہ دینی طبقہ، دنیا اور عوام کالانعام کو تو خاطر ہی میں نہیں لاتا، جاہ کا مظاہرہ اپنے ہی طبقے کے لوگوں میں کرتا ہے، انہیں کی غیبت، عیب جوئی تحقیر اور ان میں سے بعض کو گرانے کی کوشش کرتا ہے، تاکہ ان پر اپنی بڑائی، عزت، اپنے تقوے اور تنزکیے کے اظہار کے لیے راستہ صاف ہو۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ کام کرنے والے ہمیں بڑا بنا کر رکھیں ہماری بات مانیں، ہم پر کوئی اعتراض نہ کریں۔ یا تو نظامت، امارت ہمارے ہاتھ میں ہو یا ہمارا عہدہ بے شک کوئی نہ ہو لیکن قوت حاکمہ ہمارے ہاتھ میں ہو اور شیطان اس بات کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتا کہ ان قلبی شیطانی امور سے وہ متقی، زانیوں، شرابیوں اور چوروں سے بھی نیچے گرجاتا ہے۔

شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ

ہندوستانی سیارچوں کی تاریخ

احرار حسین* ترجمہ صغیر افراہیم**

خلائی تکنیک کی کامیابی نے ذہن انسانی کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ آج ان کے وسیلے سے فلاح وبہبود کے لیے بڑے پیمانے پر امیدیں وابستہ ہو چکی ہیں۔ روز بروز ترقی یافتہ ممالک اس جانب بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ امریکہ، روس، فرانس، انگلینڈ اور مغربی جرمنی وغیرہ باہری خلا (OUTER SPACE) میں بڑے کروفر کے ساتھ داخل ہو چکے ہیں۔ ہمارے ملک کے سائنس دانوں نے بھی اب اس اہمیت کو پوری طرح محسوس کر لیا ہے اور وہ اس جانب بھرپور توجہ دے رہے ہیں۔

باہری خلائی سائنس اور طرح طرح کے سیاروں کے کاسمک حادثات کے متعلق بھارت میں موجود دنیا کی قدیم کتابوں یعنی گرنتھوں کے ذریعے بہت سی معلومات ملتی ہیں۔ ان گرنتھوں کی روشنی میں ہمارے سائنس دانوں کا خیال مذکورہ مسئلے کے لیے بہت پہلے سے تھا۔ مگر ۱۹۶۳ء میں انھوں نے باقاعدگی کے ساتھ ترویندرم کے قریب تھومبا میں، تھومبا خط تقسیم راکٹ مرکز کے نام سے کثیر المقاصد راکٹ سہولت کی بنیاد رکھتے ہوئے اصل کام کا آغاز کیا۔ اس منصوبے کا بنیادی مقصد ملک کی مختلف ضرورتوں جیسے عوامی رابطہ اور تعلیم وغیرہ کا تیزی سے ترقی کرنا تھا۔ اس منصوبے کی شروعات سے ہندوستانی ماہرین فلکیات نے اپنے تجربوں کے لیے خود کے راکٹوں، سیارچوں کو لے جانے والی خلائی گاڑی وغیرہ کے لیے تحقیقی کام شروع کیا۔

ہندوستانی خلائی پروگرام کا آغاز بھارت سرکار نے عوام کی فلاح وبہبود کے لیے باقاعدگی کے ساتھ ۱۹۷۲ء سے کیا۔ خلائی ترقی اور خلائی سائنس کے فروغ کے لیے خلائی کمیشن اور ہندوستانی خلائی تحقیقی تنظیم (اِسرو) کے شعبہ کا انعقاد کیا۔ ان دونوں انجمنوں کا صدر آفس بنگلور میں کھولا گیا۔ ہندوستانی تحقیقی تنظیم کے اہم مراکز اس طرح ہیں:

۱۔ وکرم سارا بھائی خلائی مرکز، ترویندرم
۲۔ ہندوستانی خلائی تحقیقی تنظیم، بنگلور
۳۔ خلائی استعمالی مرکز، احمد آباد۔

ہندوستانی خلائی تحقیقی تنظیم، کثیر المقاصد گھریلو سیاریے سیریز کے لیے خلائی تحقیقی کاموں کی ذمہ دار ہے۔ اس تنظیم کا اہم مقصد سیارچوں کا استعمال Mass Communication جیسے Tele Communication اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں کی نشرواشاعت، ہوائی جہازوں سے رابطہ، خلائی پلیٹ فارمس قدرتی موسمی سائنس اندراجات کا استعمال کرنا ہے۔ ان تنظیموں سے تقریباً بارہ ہزار لوگ وابستہ ہیں۔

ہندوستان کا پہلا مصنوعی سیارچہ آریہ بھٹ جس کا وزن تقریباً ۳۶۰ کیلو گرام تھا، سوویت روس سے ۱۸ اپریل ۱۹۷۵ء کو سوویت انٹر کاسماس راکٹ کے ذریعے 50.7 ڈگری کے مدقہ

* یونیورسٹی پالی ٹیکنک۔ اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ
** شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

میں ۵۶۲×۶۱۹ کیلو میٹر میں چھوڑا گیا تھا۔ اس سیارچے کے ذریعے ایسرو کے سائنس دانوں نے خلا میں مختلف تجربے کرتے ہوئے ایکس رے، علم طبیعات اور فضائی علم کے تجربوں میں کامیابی حاصل کی۔

ہندوستان کا دوسرا اہم سیارچہ بھاسکر، ۷ رجون ۱۹۷۹ کو سوویت سنگھ کے انٹر کاسماس کے ذریعے خلا میں چھوڑا گیا۔ اس سیارچہ کا استعمال بحری ماحول، بحری سطح کا ماحول اور فضا میں بھاپ اور



بھاسکر سیارہ۔

رکیک بھاپ کی مقدار کے بارے میں خصوصی اندراجات حاصل کرنے تھے۔ ان اندراجات کا استعمال برفیلے میدانوں، جنگلات اور ارضیات وغیرہ کے شعبوں میں تجربوں کے لیے کیا گیا۔ اس سیارچہ کو مارچ ۱۹۸۱ء میں بند کر دیا گیا تھا۔

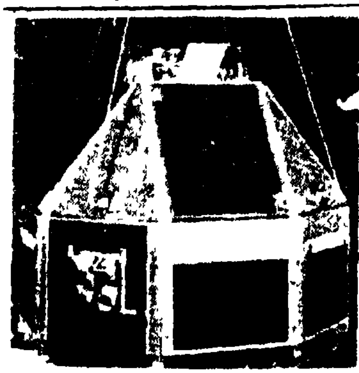
ہندوستان کا تیسرا اہم سیارچہ ایپل تھا۔ اس سیارچہ کو یورپین خلائی ایجنسی کے ایرین راکٹ کے ذریعے ۱۸ رجون ۱۹۸۲ء کو



ایپل سٹلائٹ۔

کورو فرینچ گیانا سے چھوڑا گیا تھا۔ مختلف قسم کے خلائی تجربوں کے بعد ایندھن کی کمی کی وجہ سے ۱۸ رستمبر ۱۹۸۳ء کو اسے بند کر دیا گیا تھا۔

روہنی ہندوستان کا چوتھا سیارچہ ہے جس کو ۱۸ رجولائی ۱۹۸۰ء کو ۷، ۹ ویں منٹ دائرہ کار میں ۳۰۰×۹۰۰ کیلو میٹر کی ایلیپٹیکل مدار میں ایس۔ ایل۔ وی ۳ کی اڑان سے فضائے بسیط میں اتارا گیا۔ اسی سیریز میں آر۔ ایس۔ ڈی ۲ کو ۱۷ راپریل ۱۹۸۳ء کو خلا میں ٹھہرایا



آر ایس ڈی ۲ سٹلائٹ ۱

گیا۔ مذکورہ سیارچہ کو منصوبے کے تحت، تجربوں کے بعد ۲۴ رستمبر ۱۹۸۴ء کو بند کر دیا گیا۔

انسٹ ون سیریز میں ہندوستان کا پہلا قومی سیارچہ انسٹ ون اے ۱۰ راپریل ۱۹۸۲ء کو ڈیلٹا راکٹ کے سہارے امریکہ سے ایسٹ لونگیٹیوڈ مدار میں چھوڑا گیا۔ اس سیارچہ کا اہم مقصد گھریلو دور سنچار، موسمی سائنس اور دیہی لوگوں کو نشریات کے لیے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں کے لیے استعمال میں لانا تھا۔ مگر کچھ تکنیکی دشواریوں کی وجہ سے اسے ۱۳ رستمبر ۱۹۸۲ء کو بے مقصد قرار دے دیا گیا۔ اس سیارچے پر تقریباً ۶۵ کروڑ روپے کا خرچ آیا تھا۔ اس کی تعمیر امریکن کمپنی فورڈ ایرو اسپیس کومنی کیشن سینٹر نے ایسرو کی نگرانی میں کیا تھا۔ اس منصوبے کی ناکامی کی وجہ سے ہمارے ملک کے سائنس دانوں کو بڑی تکلیف ہوئی لیکن سائنس کی دنیا میں تجربات کی ناکامی بھی ماہرین کے علم میں اضافہ کرتی ہے اور ان کے تحقیقی پروگراموں سے ان ناکامیوں سے فائدہ پہنچتا ہے۔ لہٰذا حکومت اور ملک کے سائنس دانوں نے شکست تسلیم کرنے کے بجائے انسٹ ون۔ بی منصوبے کا اعلان کر دیا۔

انسٹ ون۔ بی سیارچہ ۳۰ ر اگست ۱۹۸۳ء کو امریکن خلائی گاڑی کے ذریعے کیپ کیناورل سے چھوڑا گیا تھا۔ اس سیارچے کو بھی فورڈ ایرواسپیس کومنی کیشن سینٹر نے ایسرو کی نگرانی میں تعمیر کیا تھا۔ اس کی تکمیل میں ۶۰ کروڑ روپیہ خرچ ہوا تھا۔ تعمیر کے وقت وہ تمام تکنیکی دشواریاں جو کہ سابقہ سیارچے میں پیدا ہو گئی تھیں، پوری طرح خیال رکھا گیا۔ لیکن داغنے کے بعد جب اس پر تجربہ کیا گیا تو پتہ چلا کہ سی ۲ شمسی سیلس جو خلاء میں



انسیٹ ۱ ۔ ب ۔ سیارہ ۔

سیارچے کو چلانے کے لیے رکھے گئے تھے، کام کرنا بند کر دیا ہے۔ سائنس دانوں نے ان سیلوں کو متحرک کرنے کی بھرپور کوشش کی مگر کامیابی نہ مل سکی جس کی وجہ سے ایسرو کو دوسری بار دھکا پہنچا، لیکن اچانک انسٹ ون۔ بی نے ۱۵ ر اکتوبر ۱۹۸۳ء کو گنیش چتورتھی کے دن کام کرنا شروع کر دیا جس کو گنیش جی کا معجزہ سمجھا گیا۔ انسٹ ون بی کے ذریعے اہم مقاصد میں پوری کامیابی ملی۔ اس کے توسط سے ملک بھر کو ایک دھارے میں منسلک کر دیا گیا۔ یعنی اس سیارچے کے ذریعے ملک کے کسی بھی حصے سے آدھے سکنڈ میں رابطہ قایم کر سکتے ہیں اس طرح ملک کے دور دراز علاقے جیسے انڈمان نکوبار اور لیہہ (LEH) بھی ملک کے ایک دھارے سے جڑ گئے۔ انسٹ ون۔ بی ۱۱ ر فروری ۱۹۸۴ء کو قومی ملکیت قرار دیا گیا۔ اس وقت اس کے 2093 ذرائع چالو ہیں۔ ملک کے مختلف حصوں میں اس سیارے سے پیغامات وصول کرنے کے ۳۹ مراکز قایم کر دیے گئے ہیں جن میں سے ۳۶ نصب شدہ اور تین گشتی مراکز ہیں۔ اس سیارچے کا

سب سے زیادہ فائدہ دوردرشن، آکاشوانی اور شعبہ موسمیات



گشتی اسٹیشن ۔

اٹھاتے ہوئے اپنے اپنے پروگرام ملک کے کونے کونے تک ایک ہی وقت میں پہنچا رہے ہیں۔ صرف ٹیلی ویژن کے ۱۸۷ اسٹیشنوں میں سے ۱۸۲ اسٹیشن اس مصنوعی سیارے سے جڑے ہوئے ہیں۔ انسٹ ون۔ اے کے استعمال سے اب Repeater Station بنانے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ انسٹ ون۔ بی زمین سے تقریباً ۳۶ ہزار کیلومیٹر کی دوری پر ایک خاص مدار میں نصب کر دیا گیا ہے اس لیے زمین پر ہونے والی موسمی خرابیاں اس سیارچے پر کسی طرح کا برا اثر نہیں ڈال پاتی ہیں۔ اس وجہ سے ہم انسٹ ون بی کے ذریعے میڈیم ویو پر بھی آسانی سے سارے پروگرام سن سکتے ہیں۔ شعبۂ موسمیات میں انسٹ ون بی کا استعمال بہت ہی مفید ہے۔ اس کے ذریعے ہم کو آنے والے موسم جیسے طوفان، گھٹا اور باہری درجۂ حرارت وغیرہ کی تفصیلات مل جاتی ہیں اور آنے والے موسم کے بارے میں پہلے ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح انسٹ ون بی انسانی فلاح و بہبود کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوا ہے۔ عام طور سے سیارچوں کی زندگی سات سے آٹھ سال تک ہوتی ہے۔ اس لیے انسٹ ون۔ بی کا استعمال ۹۱-۱۹۹۰ء تک ہی ہو پائے گا۔ اس مسئلے کو ذہن میں رکھتے ہوئے انسٹ سیریز میں انسٹ ون سی اور انسٹ ون۔ ڈی منصوبے زیر تکمیل ہیں۔ انسٹ ون۔ سی کو امریکہ کی خلائی گاڑی کی آٹھویں اڑان

سے خلا میں نصب کیا جانا تھا، لیکن جنوری ۱۹۸۶ء کو ہوئے خلائی حادثے کی وجہ سے اس منصوبے کو ملتوی کرنا پڑا۔ اب انسٹ ون۔ ڈی کو امریکہ کے فورڈ ایرو اسپیس کمیونیکیشن سینٹر (F.A.C.C) کے ذریعے تیار کیا جا رہا ہے جو امریکہ کی خلائی گاڑی کے ذریعے ۱۹۸۹ء میں خلا میں بھیجا جائے گا۔

مستقبل قریب میں دور سنچار اور دوردرشن خدمات کی روز بروز بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے پیش نظر حکومت ہند نے قومی سیارچہ منصوبہ انسٹ دوم سیریز کے سیارچوں کی تعمیر کے لیے اپنی منظوری دے دی ہے انسٹ دوم سیریز کا پہلا سیارچہ ۱۹۸۹ء میں چھوڑے جانے کی امید ہے۔

"ہماری تعلیم اچھی نہیں ہو پاتی، اس کے ذمہ دار کچھ حد تک ماں باپ ہیں، ایک حد تک استاد اور ایک حد تک ناسازگار حالات۔ ماں باپ زیادہ تر بے پڑھے لکھے ہیں اور جو پڑھے لکھے ہیں، ان میں سے بہت سے بچوں کی تعلیم اور تربیت کی طرف سے غافل ہیں۔ استادوں نے بغیر آنکھ جھپکائے سوداگری شروع کر دی ہے کہ اصل رشتے آمدنی ہے جو ہر مرحلے پر حلال مشکلات بن جاتی ہے، پڑھائی میں کون سر کھپائے، کوڑھ مغزوں کو کون پڑھائے۔ انہیں نوکری تو ملنے سے رہی اور سند تو مل کر رہے گی۔ حکومت کو یہ فکر ہے کہ کس طرح ڈگری کو ملازمت سے جدا کرے۔ اسے کیا خبر کہ ڈگری ریاضت اور دیانت دونوں سے کبھی کی الگ ہو چکی۔ ایک ملازمت باقی رہ گئی ہے، اس سے بھی الگ ہو جائے گی۔ ملک میں تعلیم کا معیار کوئی اونچا نہیں ہے، لیکن سب سے زیادہ خراب حالت ان اسکولوں اور کالجوں کی ہے جنہیں مسلمان چلاتے ہیں"۔

سید حامد۔

جذام

افتخار احمد نقوی* و اسلام الدین*

کوڑھ، کشٹ، جذام، داء الاسد، مہا بیدھی، لیپروسی ایک ہی مرض کے مختلف نام ہیں۔ تاریخ کے اوراق کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ ماضی سے لے کر آج تک اس مرض کے مریضوں کے ساتھ دنیا نے بہت ہی نازیبا اور وحشیانہ سلوک کیا ہے۔ ان کو زندہ جلایا ہی نہیں بلکہ دفن کر دیا گیا۔ جنگلوں کی سمت بھگا دیا گیا، ان کے گلے میں گھنٹیاں باندھ دی گئیں تاکہ لوگ ان کی آمد سے باخبر ہو جائیں۔ آج بھی جب کہ دنیا کافی ترقی کر چکی ہے، تب بھی لوگ اس مرض کو ایک لاعلاج مرض تصور کر کے زمانہ جاہلیت جیسا سلوک اس مرض کے لوگوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔

جذام کی تاریخی کڑیاں سلسلہ وار تسلسل کے ساتھ ملتی ہیں۔ اہرام مصر کی کھدائی سے جو دستاویزات اور اوراق بردی (برگ سنیس بپیرس) برآمد ہوئی ہیں ان سے ہمیں ۲۴۰۰ ق م میں اس مرض کے ہونے کے واضح اور بین ثبوت ملتے ہیں۔

ہندی طب کی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ چرک اور سشرت جیسے وید بھی اس مرض سے واقف ہی نہیں تھے بلکہ انہوں نے اس مرض کا علاج بھی تحریر کیا ہے۔

سنہ ۶۱۰ء میں آفتاب رسالت طلوع ہوا، مرسل اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے نہ صرف روح کی بیماریاں دور ہوئیں، بلکہ آپؐ نے طب صحت اور قیام صحت کے بہترین اصول بھی بتائے۔ خلافت راشدہ کی تاریخ کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفۂ اول سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ روزانہ ایک غار میں کھانا لے کر جاتے تھے۔ آپؓ کے وصال کے بعد خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکرؓ کی پوری تقلید کی اور اسی غار میں کھانا لے کر پہنچے۔ آپؓ نے دیکھا کہ غار میں ایک مریض بہت ہی نازک حالت میں موجود ہے۔ امیر المومنینؓ نے جیسے ہی اپنے دست مبارک سے اسے کھانا کھلایا وہ چیخ اٹھا۔

"کیا ابوبکرؓ مر گئے؟"

معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ خلیفہ اولؓ اپنی زبان پر لقمہ رکھ کر اس کے منھ میں دیتے تھے کیوں کہ اس مریض کے منھ میں بہت زخم تھے۔

مشہور مورخ طبری لکھتا ہے کہ اموی خلیفہ ولید نے جذام کے مریضوں کے لیے ایک الگ قیام گاہ کا انتظام کیا تھا۔

LEPROSY یونانی زبان کے لفظ Lepra سے بنا ہے جس کے معنی Scaly کے ہوتے ہیں۔ ایک زمانے تک اطبا حضرات جذام اور دیگر Scaly امراض سوریاسس PSORIASIS آتشک، داء الاضلی بلاگرا میں تفریق نہ کر سکے۔ ہمارے ملک میں اس کو کشٹ اور مہا روگ کے نام سے موسوم کیا گیا اور اس کو دیوی دیوتاؤں کی بد دعا تصور کیا جاتا رہا اور اسی بنا پر اس کے علاج سے بھی گریز کیا جاتا رہا۔ آج دنیا میں ۱۵ ملین (ایک کروڑ ۵۰ لاکھ) لوگ اس مہلک مرض میں مبتلا ہیں۔ اس کے مریضوں کی زیادہ تعداد مرکزی افریقہ اور جنوبی امریکہ، ٹراپیکل ایشیا میں ہے۔ ہمارے ملک میں آندھرا پردیش اور مدراس میں اس کے مریضوں کی تعداد پورے ملک کے مریضوں کی تعداد کا ½ ہے۔ ملک کے مختلف صوبوں میں اس مرض میں مبتلا لوگوں کی تعداد درج ذیل ہے۔

---

* شعبۂ علم الادویہ - مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

صوبہ جات	تعداد لاکھوں میں
تامل ناڈو	۷.۸۳
آندھرا پردیش	۶.۲۸
بہار	۳.۲۹
مغربی بنگال	۳.۰۴
مہاراشٹر	۲.۸۰
اتر پردیش	۱.۶۸

۱۸۷۳ء میں ناروے کے ایک سائنس داں Hansen نے اس مرض کے جراثیم کا پتہ لگایا اور ثابت کیا کہ جذام ایک متعدی مرض ہے۔ ان کی اس دریافت کے بعد اس مرض کا نام Hansen Disease پڑا۔ ۱۹۳۷ء میں جذام کی دوا Dopsone سے لوگ متعارف ہوئے اس کے بعد ۱۹۴۱ء میں Sulphone اور ۱۹۴۱ء میں Amithiozone سے لوگ متعارف ہوئے لیکن اس جذام میں خاطر خواہ فائدہ ۱۹۵۴ء میں سائنس داں Lowe کے ذریعے معلوم ہوا۔

وجہ تسمیہ:۔ جذام عربی لفظ جذم سے مشتق ہے جس کے معنی کاٹنے کے ہیں۔ کیوں کہ یہ مرض اعضاء میں قطع پیدا کرتا ہے اور نسل و عمر کو بھی کاٹتا ہے یعنی ختم کرتا ہے۔ جذام کے چہرے کی ہیئت کذائی ببر شیر سے مشابہ ہوتی ہے۔ اس لیے اسی مناسبت سے داءالاسد بھی کہا گیا ہے۔

اسباب:۔

حاملین اور ماہرین طب جدید کے خیال کے مطابق اس مرض کا سبب ایک خوردبینی جراثیم ہوتا ہے۔ جس کا انکشاف پہلی بار ۱۸۴۵ء میں دنیل سن اور لوبک نے کیا۔ اس پر مزید تحقیق اور ہینسن کے تجربات کی صداقت کی تصدیق نائیسر نے ۱۸۷۹ء میں کی اور اس کو لیپرا بیسلس کا نام دیا۔ جراثیم دریافت سے قبل طب جدید کے حاملین کا خیال تھا کہ جذام خون میں فائبرن البیومن کے زیادہ مقدار میں شامل ہو جانے کی بنا پر ہوتا ہے۔ جذام کے اسباب کے سلسلے میں علامہ داؤد انطاکی کا خیال ہے کہ اس مرض کا سبب مادی خشک غذا ہے۔ خواہ خشک غذا لبار دہی کیوں نہ ہو۔ جیسے گائے، بھینس، غیر خصی شدہ بکروں کا گوشت اور مسور وغیرہ یا حار ہو لیکن ایسی غلیظ کہ ہاضم قوتیں اس میں اس وقت عمل کرسکیں جب کہ وہ احتراق پذیر ہونے لگے جیسے بینگن اس کا سبب فاعلی خشکی کی زیادتی ہے۔ خواہ یہ خشکی حرارت کی بنا پر ہو یا برودت کی بنا پر۔ اس کا سبب صوری بدن کا اپنی طبعی شکل و صورت سے ہٹ جانا ہے۔ نیز سبب غائی فساد بدن ہے۔ اس مرض کی شروعات سودا کی بکثرت تولید سے ہوتی ہے۔ اگر یہ سودا رقیق ہو اور ظاہر بدن کی طرف منتشر ہو جائے تو یرقان پیدا ہو جاتا ہے، باطن بدن کی طرف مائل ہو جائے تو حمی ربع (چوتھیا بخار) ہوگا۔ اگر یہ سودا غلیظ ہو اور کسی خاص حصہ بدن تک محدود ہو تو سرطان (Cancer) ہوگا۔ اگر یہ سارے بدن میں عام ہو جائے تو جذام (کوڑھ) پیدا ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اطباء متقدمین نے اس کا نام سرطان عام بھی رکھا ہے۔

شارح اسباب علامہ علی حسین گیلانی اور دیگر حکماء متقدمین جن میں حکیم اعظم خاں، حکیم شریف خاں اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں شامل ہیں، نے بھی اس کا سبب سوداغیر طبعی، احتراقی، جودی یا نفلی کو ہی قرار دیا ہے۔ کبھی کبھی یہ مرض سوزاک آتشک جیسے قبیح اور سوداوی امراض میں زیادہ دنوں تک مبتلا رہنے سے بھی ہوتا ہے۔ کیوں کہ مذکورہ امراض میں شدت حرارت سے سودا متحرق ہو جاتا ہے یہی سودا خون میں مل کر جذام کا موجب ہوتا ہے۔ عام طور سے یہ مرض چالیس پچاس برس کی عمر کے لوگوں کو ہوتا ہے مگر آج کے اس ترقی یافتہ زمانہ میں اس کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں۔

زمانہ قدیم میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ کوڑھ ایک موروثی مرض ہے۔ جراثیم دریافت کے بعد یہ بات واضح ہو گئی کہ جذام ایک متعدی مرض ہے نہ کہ موروثی کیوں کہ جذام کی حامل مریضہ کے بطن سے صحت مند بچہ پیدا ہوتا ہے مگر بعد میں اس مرض کا تعدیہ بچے کو ہوتا ہے۔

علامات:

جلد پر گاہے بگاہے سرخ یا گلابی رنگ کے دھبے پڑ جاتے ہیں جو سیاہی مائل ہوتے ہیں۔ جس حصہ جسم پر یہ داغ ہوتے ہیں

وہاں کی جلد کو حس کا فقدان ہو جایا کرتا ہے۔ چہرہ شیر کی طرح خوفناک ہو جاتا ہے۔ کان کی لویں موٹی اور لمبی ہو جاتی ہیں۔ کبھی کبھی جسم کے مختلف مقامات پر بیڈول قسم کے ابھار یا گانٹھیں پیدا ہو جاتی ہیں داغ دار حصوں کی جلد خشک ہو کر سخت ہو جاتی ہے اور وہاں کے بال اُڑ جاتے ہیں۔ وریدیں رسی کی مانند سخت ہو جاتی ہیں۔ زخم اور پھوڑے بننے لگتے ہیں، اعصاب میں یبوست کا غلبہ ہو جاتا ہے عضلات میں تشنج ہو جاتا ہے، ہاتھ، پیر اور ناک کی ہڈیاں گھلنے لگتی ہیں — شاذ و نادر بینائی بھی زائل ہو جاتی ہے۔ منھ کے اندر کی غشاء مخاطی گل جاتی ہے۔ جسم پر موٹی موٹی گرہیاں پڑ جاتی ہیں۔ یہ بیضوی ہوتی ہیں مرض کا یہ درجہ تین سال تک رہتا ہے جو درجہ بدرجہ قابل علاج ہے۔ دوسرے درجے میں گول اور بیضوی گومڑیاں نرم پڑنے لگتی ہیں اور اُن کے بیچ میں سوراخ ہو کر رقیق القوام زرد رنگ کی پیپ خارج ہونے لگتی ہے۔

تیسرے اور آخری درجے میں زخم پھیلنے لگتے ہیں۔ ان میں گلاؤ پڑ جاتا ہے۔ اعضاء کٹ کٹ کر گرنے لگتے ہیں۔ ناک کا بانسہ گل جاتا ہے۔ اس درجے کے مریض بمشکل تمام صحت یاب ہو پاتے ہیں۔

اس مرض میں جگر، طحال اور جسم کے دیگر غدود بھی بڑھ جاتے ہیں — یہ مرض ایک انسان سے دوسرے انسان کو لگتا ہے۔ عام طور سے عورتوں کے مقابلے میں مرد اس کا زیادہ شکار ہوتے ہیں۔ گھنی آبادی، غلاظت، رہائش کے لیے تنگ و تاریک مکان اس کے بڑھنے میں معاون ہوتے ہیں۔

علاج جدید

(۱) مریض کے عضو ماؤف کی کھال کھرچ کر اس کا امتحان کرایا جائے تاکہ جراثیم کا پتہ لگ سکے۔

۲۔ تشخیص مرض کے بعد مریض کو دوسروں سے الگ تھلگ رکھیں۔ اس کے کھانے کے برتن کپڑے اور کمرہ وغیرہ الگ کریں۔ اس کا علاج کم از کم پانچ سال تک لگاتار ہونا چاہیے تاکہ مریض پوری طرح صحت یاب ہو سکے۔ آج کل اس کی سب سے سستی اور زود اثر دوا ڈیپ سون ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی دوائیں، اس کے علاج کے لیے بہتر تو یہی ہے کہ کسی ماہر طبیب سے رجوع کریں

یونانی:

نضج و تنقیہ سودا کے اصولی طریقے برتنے کے ساتھ ساتھ ادویہ بالخاصہ جو براہِ راست مواد مرض یا جراثیم مرض پر حملہ آور ہو کر اسے بے اثر یا کم کر دیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں سے مسلسل استفراغ مادہ کرتے رہنا چاہیے۔ درمیانی وقفوں میں رفع یبوست کے لیے تدابیر ترطیب بصورت غذا استحمام سوا تمریخ وغیرہ اختیار کریں۔ مادہ مرض اگر صفرا محترق ہے تو استفراغ کے ساتھ تطفیہ کو بھی ملحوظ خاطر رکھیں۔ اجزاء دمویہ کی ترکیب استواء کرنے کے لیے مصفیات دم ادویات کا استعمال نضج و تنقیہ کے ابتدائی مراحل کے بعد زیادہ موزوں رہتا ہے تنقیہ مواد فاسدہ تیز مسہلات کا استعمال نہ کرائیں۔

روغن چال موگرا کا داخلی اور خارجی استعمال اس مرض میں مفید ہے۔ اس کو ۵ سے لے کر ۲۰ قطرے تک گائے کے دودھ میں ملا کر دیتے ہیں۔

غذا و پرہیز:- بھیڑ کا دودھ مریض جذام کے لیے بہترین غذا ہے۔ شیخ الرئیس کے خیال میں پرندوں کے گوشت کا شوربہ بھی عمدہ غذا ہے۔ صاف چھلے ہوئے جو اور جوار کی روٹی۔ تازہ سبزیاں، چقندر وغیرہ اگر مریض قوی المعدہ ہو تو بغیر نمک کی بیسنی روٹی گھی کے ساتھ دیں۔ نیز روزانہ نیم کے پتوں کے پانی سے غسل کرائیں۔

حفظ ماتقدم: مریض کو صحت مند لوگوں سے الگ رکھیں مریض کے فضلات بدنیہ کو فنائل، مرکری لوشن یا چونے یا گرم راکھ میں ڈالیں۔

چورانوے فیصد پاس۔ ستائیس فیصد فرسٹ ڈویژن

احمد رشید شیروانی

آج ۱ر فروری تک بہار کے ۶۰ ہائی اسکولوں کے ۱۹۸۷ء کے نتائج ہمارے پاس آئے ہیں۔ ان میں سے سب سے اچھے پندرہ نتائج چارٹ میں پیش ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔ ہم دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں ان اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر صاحبان اور ہیڈ مسٹریس صاحباؤں کو، اساتذہ کرام اور معزز اساتذات کو۔ اور ان اسکولوں کے طلبا و طالبات اور ان کے والدین کو اور ان اسکولوں کے صدر و سکریٹری صاحبان اور دیگر عہدیداران و ممبران منتظمہ کو سب کو دلی مبارکباد۔ ان پندرہ میں سے تین اسکولوں کا رزلٹ تو سو فیصد پاس ہے۔ البتہ جس اسکول کا سب سے کم ہے وہ بھی اکیاسی فیصد پاس ہے۔ باقی گیارہ اسکولوں کے نتائج اٹھاسی فیصد پاس سے لے کر اٹھانوے فیصد پاس کے درمیان ہیں فرسٹ ڈویژن کا تناسب سب سے زیادہ اسلامیہ ہائی اسکول پہاڑپور سمری بختیار پور ضلع سہرسہ میں ہے۔ اسی فیصد فرسٹ ڈویژن۔ البتہ جس اسکول میں فرسٹ ڈویژن سب سے کم ہے وہ بھی سولہ فیصد ہے۔ باقی تیرہ اداروں میں فرسٹ ڈویژن کا تناسب انیس فیصد اور پینسٹھ فی صد کے درمیان ہے۔

بہار کے سب سے اچھے پندرہ نتائج ۱۹۸۷ء

شریک امتحان	پاس تعداد	پاس فیصد	فرسٹ ڈویژن تعداد	فرسٹ ڈویژن فیصد	ہائی اسکول کا نام ۔ مقام ضلع
۲۵	۲۵	سو	۲۰	اسی	اسلامیہ۔ پہاڑپور۔ سمری بختیار پور۔ سہرسہ
۲۲	۲۲	سو	۷	بتیس	داؤد میموریل اردو گرلز سیوان
۶۵	۶۵	سو	۱۳	بیس	پرسہ۔ ضلع گوڈا۔ سنتھال پرگنہ
۸۳	۸۱	اٹھانوے	۳۵	بیالیس	انسان۔ کشن گنج۔ ضلع پورنیہ
۹۸	۹۵	ستانوے	۳۴	پینتیس	صغریٰ۔ بہار شریف۔ نالندہ
۱۴۴	۱۳۹	ستانوے	۴۵	اکتیس	ایچ۔ ای۔ اسکول۔ پکری براداں۔ نوادہ
۷۳	۷۱	ستانوے	۲۲	تیس	اسلامیہ اردو اکیڈمی۔ میرگنج۔ گوپال گنج
۳۷	۳۵	پچانوے	۲۴	پینسٹھ	ملت اکیڈمی۔ رانچی
۳۹۹	۳۷۶	چورانوے	۶۳	سولہ	مولانا مظہر الحق میموریل اردو۔ گوپال گنج
۸۳	۷۷	ترانوے	۱۶	انیس	قاسمی۔ گیا۔

شریک امتحان	پاس تعداد	پاس فیصد	فرسٹ ڈویژن تعداد	فرسٹ ڈویژن فیصد	ہائی اسکول کا نام - مقام ضلع
۳۶	۳۳	بانوے	۹	پچیس	ملت اکیڈمی - جھریا - ضلع دھنباد
۱۴۰	۱۲۴	نواسی	۴۱	انتیس	اسلامیہ۔ شیخ پور ۔ مونگیر
۱۹	۱۷	نواسی	۵	چھبیس	گیا مسلم آرفینج ۔ چیرکی گیا
۲۵	۲۲	اٹھاسی	۵	بیس	اسماعیلیہ مومن اردو گرلز ۔ رانچی
۱۱۱	۹۰	اکیاسی	۲۶	تیئیس	ہادی ہاشمی ۔ گیا۔
۱۳۶۰	۱۲۷۲	چورانوے	۳۶۵	ستائیس	سب سے اچھے پندرہ کا ٹوٹل ۔

بہار کے مسلم ہائی اِسکولوں کے نتائج میں سے بہترین پندرہ نتائج تو آپ نے ملاحظہ فرما لیے۔ اب پیش ہیں مزید پندرہ نتائج۔ ان میں سے پہلے چھ کے نتائج اکیاسی فیصد پاس سے لے کر چورانوے فیصد پاس تک ہیں۔ یعنی پاس فیصد کے اعتبار سے تو یہ بھی بہترین نتائج کے برابر ہیں۔ البتہ ان میں فرسٹ ڈویژن کا تناسب بہترین سے کم ہے۔ یعنی اگر ان موقر اسکولوں میں فرسٹ ڈویژن کا تناسب بڑھ جائے تو اُن کے نتائج بھی بہترین کے زمرے میں آسکتے ہیں۔ انشاء اللہ۔

باقی نو اسکولوں کے نتائج یوں سمجھیے کہ بہترین سے ذرا سے ہی کم ہیں (یعنی پچھتر فیصد پاس سے لے کر اسّی فیصد پاس تک) تھوڑی سی مزید توجہ اور محنت سے ان اسکولوں کے نتائج بھی بہترین بنائے جاسکتے ہیں۔ انشاء اللہ۔ بہرحال یہ نتائج بھی اوسط سے بہتر تو ہیں ہی۔ ہم ان کی مزید بہتری کے لیے دعاگو ہیں۔

یہ نتائج ٹوٹل ہیں۔ یعنی مسلم اور غیر مسلم طلباء و طالبات سب ان میں شامل ہیں۔ مسلم بچوں کے نتائج الگ کر کے یہ جائزہ لیا جائے گا کہ بہار کے مسلم ہائی اسکولوں میں مسلم بچے تعلیم میں کتنے آگے بڑھے۔

احمد رشید شیروانی
۱۲- اے کناٹ پلیس
نئی دہلی — ۱۱۰۰۰۱

بہار کے دوسرے پندرہ نتائج ۱۹۸۷ء

شریک امتحان	پاس تعداد	پاس فیصد	فرسٹ ڈویژن تعداد	فرسٹ ڈویژن فیصد	ہائی اِسکول کا نام - مقام ضلع
۳۵	۳۳	چورانوے	۱	تین	عراقی اردو گرلز نوادہ
۱۰۳	۹۵	بانوے	۸	آٹھ	اِسلامیہ ۔ ادلہان پور سارن
۵۰	۴۴	اٹھاسی	۲	چار	کبیریہ ۔ جمشید پور سنگھ بھوم
۱۹۷	۱۶۷	پچاسی	۷	چار	ڈاکٹر منیر احسن گیا۔

شریک امتحان	پاس تعداد	پاس فیصد	فرسٹ ڈویژن تعداد	فرسٹ ڈویژن فیصد	ہائی اسکول کا نام ۔ مقام ۔ ضلع
۱۰۵	۸۷	تراسی	۲	دو	مولانا آزاد رانچی
۱۷۳	۱۴۰	اکیاسی	۹	پانچ	اسلامیہ سیوان
۱۸۰	۱۴۴	اسی	۴	دو	محمد سالح ۔ حسین گنج سیوان
۹۹	۷۸	اناسی	۵	پانچ	عدالت حسین ۔ بگاہی ضلع مغربی چمپارن
۳۲	۲۵	اٹھتہر	—	صفر	ملت اردو ۔ سہسرام ضلع روہتاس
۴۴	۳۴	ستہتر	۵	گیارہ	ایم بی ٹی اے ۔ اسلامیہ ۔ کٹیہار
۷۰	۵۴	"	۱	ایک	اقلیہ ۔ رزاق نگر ۔ مظفرپور
۲۰	۱۵	پچھتر	۳	پندرہ	مشتاق علی خان ۔ بھدیہ ۔ گیا
۱۰۶	۸۰	"	۱۱	دس	سینٹرل کریہ ۔ جمشید پور ۔ سنگھ بھوم
۸۰	۶۰	"	۸	دس	پٹنہ مسلم
۲۴	۱۸	"	—	صفر	سرسید اردو گرلز پٹنہ
۱۳۱۸	۱۰۷۴	اکیاسی	۶۶	پانچ	دوسرے پندرہ کا ٹوٹل ۔

"تعلیم کا پہلا کام یہ ہے کہ صحیح مشاہدے کی صلاحیت پیدا کرے اس کے دھوکوں سے بچنے کے صحیح مشاہدوں سے صحیح نتیجوں پر پہنچنے کی مشق کرائے۔ ٹھیک دیکھ سکنا اور منطقی طور پر سوچ سکنا سکھا دیجیے تو آپ نے تعلیم کا تین چوتھائی کام کر دیا۔"

ذاکر حسین

توانائی — ایک اہم ضرورت

ظفرحسن انجم*

درج ذیل مضمون درجۂ دہم کے ایک طالب علم کا تحریر کردہ ہے۔ ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات نہ صرف اس طالب علم کو لائق مبارکباد سمجھتا ہے بلکہ اس کے اساتذہ کو بھی مبارکباد دیتا ہے جن کے دامن تربیت میں یہ نونہال پرورش پا رہا ہے۔ اسی ادارے کے ایک دوسرے طالب علم کا مضمون سر سید احمد خاںؒ پر بھی موصول ہوا ہے جو ہم انشاء اللہ اکتوبر ۸۸ء کے تہذیب الاخلاق میں شائع کریں گے۔ [ادارہ]

آج سے ہزاروں سال قبل جب اس زمین پر انسان عالم وجود میں آیا، تب وہ جنگلوں میں رہتا تھا۔ پوشاک کے نام پر درختوں کی چھال پہنتا اور کچا گوشت کھاتا تھا۔ وقت کے ساتھ رفتہ رفتہ جنگلوں میں ننگ دھڑنگ گھومنے والا غیر مہذب انسان، مہذب بنتا گیا۔ اس کی تہذیب کروٹیں لیتی رہی اور اس کو روزمرہ کے استعمال کے لیے نئی نئی ضرورتیں پیش آتی گئیں۔ نتیجتاً بہت سی نئی چیزیں ایجاد ہوئیں اور انسان تیز رفتاری سے آگے بڑھتا ہوا بیسویں صدی کے "سائنسی دور" میں آپہنچا۔ لیکن چلتے چلتے وقت نے یکایک دنیا کو اس طرح للکارا کہ اس کے پاؤں سست پڑ گئے۔ ایسا محسوس ہوا کہ اس کی ترقی رک سی گئی ہے۔ اور وہ للکار تھی "توانائی کا مسئلہ!"

آج ساری دنیا توانائی کے مسئلے سے دوچار ہے۔ انسان نے کبھی بھی یہ نہ سوچا کہ دنیا کبھی توانائی کے مسئلے سے بھی دوچار ہو سکتی ہے۔ اگر پہلے سے اس کے متعلق سوچا گیا ہوتا تو اس کے حل کے لیے اب تک ضروری اقدام کیے جا چکے ہوتے۔

توانائی کے مسئلے کی بات تو ہم بعد میں کریں گے، پہلے آیئے ہم یہ سمجھ لیں کہ "توانائی" ہے کیا؟ اگر سچ پوچھیں تو توانائی ہماری زندگی کا اہم جز ہے اور زندگی کے ہر شعبۂ حیات میں ہمیں توانائی کی ضرورت پڑتی ہے بلکہ اگر ہم کہیں کہ توانائی کے بغیر ہماری زندگی ادھوری اور بے لطف ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

جس چیز میں توانائی ہے، وہی کام کرسکتی ہے۔ لہذا توانائی اور کام میں گہرا تعلق ہے۔ سب سے پہلے ۱۸۰۷ء میں مشہور ماہر علم طبیعات ٹامس ینگ (Tomas Young) نے توانائی کی تعریف ان الفاظ میں کی۔

The Capacity of a body for doing work is known as Energy."

[کسی چیز کے کام کرنے کی صلاحیت کو توانائی کہتے ہیں]

سائنس دانوں نے توانائی کو مختلف حصوں میں تقسیم

* طالب علم درجہ دہم۔ انسان اسکول، کشن گنج، پورنیہ، بہار

مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ میکانکی توانائی ۲۔ کیمیائی توانائی ۳۔ روشنی کی توانائی ۔ ۴۔ حرارتی توانائی ۵۔ برقی توانائی ۔ ۶۔ آواز کی توانائی ۷۔ مقناطیسی توانائی ۸۔ جوہری توانائی وغیرہ ۔

توانائی کے مندرجہ بالا اقسام کی آپس میں تبدیلی تو ہو سکتی ہے لیکن یہ کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ اس کے متعلق ۱۶۹۹ء میں ایک ڈچ سائنسداں ہائیگنس" نے اپنا اصول پیش کیا کہ

"توانائی کبھی ختم نہیں ہوتی، لیکن ایک قسم کی توانائی دوسرے میں منتقل ہو سکتی ہے۔"

جیسے کوئلے کے جلنے سے اس میں جمع کیمیائی توانائی، حرارت (Heat) کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

زمانۂ قدیم میں انسان کو سب سے پہلے توانائی پتھروں کی رگڑ سے پیدا شدہ "آگ" سے ملی۔ اس علم کی بنیاد پر جو قدیم انسان کچا گوشت کھایا کرتا تھا، وہ اب اسے بھون کر کھانے لگا۔ پتھروں کو رگڑ کر آگ پیدا کر کے یا لکڑی وغیرہ کو جلا کر وہ ٹھنڈک وغیرہ سے بچتا تھا اور دوسری ضروریات پوری کرتا تھا۔ دھیرے دھیرے سبزیوں سے حاصل شدہ تیل، جانوروں سے چربی اور گھی وغیرہ کو گلا کر روشنی پیدا کرنے کا کام لیا جانے لگا۔ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسان نے توانائی کے اور بھی دوسرے ذرائع (Sources) ڈھونڈ نکالے۔ اس نوع کی توانائی میں (Fossil Fuel) قابل ذکر ہے۔ کانسل پٹرول اور کوئلہ آج سے ہزاروں سال قبل زمین میں دبے پڑے جانداروں اور پیڑ پودوں کے ڈھانچے ہی ہیں۔ بہت زیادہ دباؤ پڑنے کی وجہ سے پیڑ پودے چٹانوں کے بیچ میں دب کر کوئلے میں تبدیل ہو گئے۔ جو جانور سمندر کی بے پناہ گہرائیوں میں ڈوب گئے تھے، ان کے ڈھانچے کیچڑ جیسے مادے میں تبدیل ہو گئے اور اسی کیچڑ سے آج ہم مٹی کا تیل، پٹرولیم، ڈیزل اور تارکول وغیرہ حاصل کرتے ہیں۔

Fossil Fuel کے علاوہ توانائی کے دوسرے رائج شمسی توانائی اور جوہری توانائی بھی ہیں۔ ان دونوں توانائی کے ان عظیم ذرائع سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

آج کے اس سائنسی دور کا انسان کافی تن آسان ہو گیا ہے اور ہر کام دقت کو بچاتے ہوئے کرنے کا عادی ہو گیا ہے۔ اس نے توانائی کے محدود ذخائر کی پرواہ کیے بغیر ہی صنعت و حرفت کو اونچے پیمانے پر بڑھا دیا ہے۔ دنیا کی آبادی کافی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اس لحاظ سے انسانی ضروریات کو پورا کرنا لازمی ہو جاتا ہے اور ایسی ضروریات آج کے دور میں صرف کارخانوں سے ہی پوری نہیں ہو سکتیں۔ کارخانوں کو چلانے کے لیے ایندھن جیسے کوئلہ، پٹرول اور برقی وغیرہ درکار ہیں، لہٰذا توانائی کی کھپت دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے جب کہ ہمارے پاس توانائی کے ذرائع (قدرتی ذخائر) کافی محدود ہیں اور انہیں ہم کسی بھی مصنوعی عمل سے بڑھا نہیں سکتے اس لیے اگر توانائی کے بیجا صرف (Consume) پر روک نہ لگائی گئی تو چند صدیوں کے بعد دنیا کے تمام قدرتی توانائی کے ذخائر ختم ہو جائیں گے۔

اس مسئلے کے حل کے لیے Renewable Energy کے ذرائع کی تلاش کافی ضروری ہے۔ اس لیے آج ساری دنیا میں "Search for alternate Sources of Energy" کی تیزی سے تلاش جاری ہے اور یہ امید کی جا سکتی ہے کہ جلد ہی نیوکلیائی توانائی اور شمسی توانائی کا اونچے پیمانے پر استعمال ہونے لگے گا۔ چوں کہ آج کل سائنس دانوں نے نیوکلیائی توانائی کو علاج و صحت، زراعت اور رسل و رسائل وغیرہ کے کاموں میں استعمال کرنے کے وسیلے اور امکانات تلاش کر رہے ہیں اور انہیں اس میدان میں کافی کامیابی بھی ملی ہے جب کہ شمسی توانائی بھی سائنس دانوں کی خاص توجہ کی حامل ہے، چوں کہ یہ توانائی ہمیں کثرت سے حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ توانائی دس دنوں میں زمین پر جتنی مقدار میں آتی ہے، وہ زمین میں پوشیدہ تقریباً تمام Fossil Fuel کے برابر ہے۔ ہندوستان کے Meteorological Deptt کی ایک رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں اپریل اور مئی کے مہینوں میں بہت زیادہ شمسی توانائی حاصل کی جا سکتی ہے جو تقریباً 800 cal/m²/day

یا KWatt $15 \; 10^{10}$ ہوگی۔ اس جمع شدہ توانائی کو بجلی میں تبدیل کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے استعمال میں کچھ معاشی مسایل پیدا ہو جاتے ہیں۔ سورج کی توانائی کو جمع کرنا اور اس کو استعمال میں لانا ایک بہت مہنگا عمل ہے۔ ویسے شمسی توانائی سے آج بھی اناج کو سکھانے، پانی گرم کرنے، کھانا پکانے، موٹر وغیرہ چلانے میں استعمال کیا جارہا ہے۔

انسانی زندگی میں توانائی کی کافی اہمیت ہے چوں کہ اس کے بغیر زندگی کے کسی شعبے میں حرکت کے اثر کو ممکن نہیں کہا جا سکتا۔ ہماری ملوں، مشینوں، موٹروں، ٹرینوں اور جہاز وغیرہ تمام کے تمام کا انحصار توانائی پر ہے۔ یہ تمام چیزیں کوئلہ، پیٹرول، ڈیزل اور برقی توانائی وغیرہ سے چلتی ہیں۔ اس طرح پورے ملک کے کارخانوں کے لیے یہ توانائیاں ایک بڑی مقدار میں صرف ہوتی ہیں۔ ملک میں تیل کے علاوہ تقریباً سبھی دوسرے توانائی کے ذرائع دستیاب ہیں، اس لیے ہندوستان میں تیل کی کل کھپت کا کافی بڑا حصہ باہر سے منگانا پڑتا ہے۔ تیل اب توانائی کا ارزاں ذریعہ نہیں رہا چوں کہ اب اس کی قیمت میں کافی اضافہ ہوگیا ہے جس کی بڑی قیمت ہمیں غیر ملکی زر میں چکانی پڑتی ہے۔ ہمارے یہاں قدرتی گیس اور Associated Gas بھی کافی مقدار میں دستیاب نہیں ہے۔ کھاد اور پیٹروکیمیکل مادوں کا food stock کی شکل میں استعمال ہوتا ہے۔ پورے ملک میں cocking coal کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور اس کے ذخیرے بھی ہمارے یہاں کافی محدود مقدار میں ہیں۔ بجلی کی پیداوار بھی ہمارے یہاں بقدر ضرورت نہیں ہو رہی ہے۔ ملک میں ہر دو تین سال میں پڑنے والے سوکھے کا بجلی کی پیداوار پر کافی اثر ہے۔ لکڑی اور گوبر کا استعمال ابھی تک صحیح طور پر نہیں ہو رہا ہے۔ گاؤں میں انہیں جلانے کے کام میں ہی استعمال کیا جارہا ہے۔ اور پھر پچھلے کئی سالوں سے ملک کی انتظامیہ Administration میں بھی کافی تبدیلی آئی ہے اور توانائی کے مسائل اور بھی مشکل تر ہوتے جا رہے ہیں۔

ہندوستان کی معاشی ترقی کی شرح کو 5.5% سے 6% تک بنائے رکھنے کے لیے تیل کی مانگ کو کنٹرول کر کے توانائی کے متبادل ذرائع کی تلاش اور ان کی ترقی کے منصوبوں کو تیز کرنا پڑے گا۔ توانائی کی بچت کے باوجود اگلے بیس سالوں میں تیل کی مانگ دوگنی ہو جائے گی جب کہ کوئلے اور بجلی کی مانگ دوگنی سے تین گنی ہو سکتی ہے۔ کیمیائی Fertilizers کے ذریعے غلے کی پیداوار میں اضافہ کرنے، زمین کے اندر کا پانی زیادہ استعمال کرنے، صنعتوں اور رسل و رسائل کی ترقی سے توانائی کی مانگ بڑھے گی۔ بڑھتی ہوئی آبادی سے ایندھن کے لیے کوئلے اور لکڑی وغیرہ میں کمی ہوتی جارہی ہے۔ لہٰذا آئندہ سالوں میں توانائی کا مسئلہ مسلسل بڑھتا ہی جائے گا۔ جب کہ ہمارے پاس قدرتی توانائی کے ذخائر محدود ہیں اور اس کے متبادل ذرائع کی جستجو زیادہ کامیاب نہیں ہو سکی ہے۔ اس لیے ہمیں اس کی طرف توجہ دینا چاہیے اور جلد از جلد اس کے بڑھتے ہوئے مسئلے پر قابو پایا جانا چاہیے کیوں کہ اس وقت توانائی کے دوسرے ذرائع کو اپنانا آج کی بہ نسبت زیادہ مہنگا پڑے گا۔

لہٰذا مندرجہ بالا باتوں کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ توانائی موجودہ دور کے لیے ایک اہم ضرورت ہے اور اس کی حفاظت اور ترقی ضروری ہے۔ چوں کہ آج کے اس مشینی دور میں ہماری ساری حرکت اور سارے منصوبے توانائی کے دم سے ہیں۔ اسی لیے پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی کہا تھا

"کسی ملک کی ترقی کا اندازہ ہم
صرف اس بات سے لگا سکتے ہیں
کہ وہ ملک کتنی توانائی پیدا
کرتا ہے یا کتنی استعمال کرتا
ہے۔"

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد — مئی ۱۹۸۸ء — شمارہ

ترسیل زر کا پتہ

لیڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

Editow: TAHZIBUL AKHLAQ &
NISHANT,
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY.

زر سالانہ

انڈیا	Rs. 30·00
بیرونی ممالک	20·00 US $ ہوائی ڈاک
	8·00 US $ عام ڈاک

مقالہ وغیرہ بھیجنے کا پتہ

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی

ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ۔

انڈیا ______

مندرجات

[تہذیب الاخلاق میں جو مضامین شایع کیے جاتے ہیں، ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہرحال ان سے متفق ہو۔]

اداریہ

امتحان میں فیل ہونے والے کسی طالب علم سے اس کے فیل ہونے کا سبب پوچھ کر دیکھیے۔ جو جواب ملے گا وہ کچھ اس قسم کا ہوگا۔ پرچے خراب آئے، ممتحن سخت تھا یا ٹیچروں نے ٹھیک سے پڑھایا نہیں۔ شاید ہی کوئی اپنے فیل ہونے کا سبب یہ بتائے کہ وہ کلاس میں غیر حاضر رہا کرتا تھا، اس نے پابندی سے پڑھائی نہیں کی یا امتحان کی تیاری اچھی طرح نہیں کی۔ جب کہ عموماً انھیں اسباب کی بنا پر طلبا فیل ہوا کرتے ہیں۔

اسی طرح ایک ناکامیاب کسان اپنے کھیتوں میں اچھی فصل نہ آنے کی وجہ موسم کی خرابی، سینچائی کے لیے وقت پر پانی کا نہ ملنا یا فصل میں بیماری کا لگ جانا بیان کرے گا۔ شاید ہی وہ اس بات کا اعتراف کرے کہ اس نے اپنے کھیتوں کو اچھی طرح تیار نہیں کیا تھا۔ سینچائی کے پانی کے لیے وقت پر دوڑ دھوپ نہیں کی یا فصل کو بیماری سے بچانے کا خاطر خواہ اہتمام نہیں کیا۔

یہ ایک عام رویہ ہے کہ لوگ اپنی ناکامیوں اور محرومیوں کا الزام کبھی حالات کی خرابی اور کبھی دوسروں کی جانب سے ہونے والی زیادتیوں پر رکھتے ہیں۔ باوجودیکہ اس رویے میں وہ کبھی حق بجانب بھی ہوتے ہیں، یہ ایک منفی رویہ ہے۔ جس کا مضر اثر یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو اپنی ان خامیوں اور کمیوں کا اندازہ نہیں ہونے پاتا جنھیں دور کرکے مستقبل میں کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔

اس رویے کا مظاہرہ بڑے انسانی گروہ بھی کرتے ہیں۔ یہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ پسماندہ فرقے اپنی پسماندگی کا ذمہ دار کسی دوسرے فرقے کو سمجھتے ہیں اور ان کی اس سوچ کو یہ دیکھ کر تقویت پہنچتی ہے کہ ترقی کے ثمرات میں وقت کے ساتھ ساتھ ان کا حصہ کم ہوتا جاتا ہے لیکن اپنی بڑھتی پسماندگی کا الزام دوسروں پر رکھنے سے پہلے جو بات دیکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ آگے بڑھ جانے والے فرقے نے پسماندہ فرقے کو دانستہ طور پر پیچھے ڈھکیل دیا ہے یا اس نے اپنی محنت اور عرق ریزیوں سے وہ برق رفتاری حاصل کرلی ہے کہ تن آسان فرقہ خود کو پیچھے ہوتا چلا گیا۔ اگر آخر الذکر بات صحیح ہے جیسا کہ عموماً ہوتا ہے تو پسماندہ فرقے کو ترقی کرنے والے فرقے کے بجائے خود سے شکایت ہونی چاہیے۔

آج مسلمانوں کو یہ احساس تو ہو چلا ہے کہ وہ تعلیمی اور اقتصادی میدان میں ملک کے اکثریتی فرقے کے مقابلے میں کافی پیچھے ہیں اور وہ یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی پسماندگی مقابلتاً بڑھتی جارہی ہے لیکن ان کی ایک بڑی اکثریت کے خیال میں یہ پسماندگی ان پر تھوپی گئی ہے۔ وہ اپنی ناکامیوں اور محرومیوں کا ذمہ دار دانستہ یا نادانستہ طور پر ملک کے اکثریتی فرقے کو سمجھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اپنی خامیوں اور کوتاہیوں پر ان کی نظر نہیں جاتی۔ ہمارا تجزیہ یہ ہے کہ اس بڑھتی ہوئی پسماندگی کے ذمہ دار کافی حد تک ہم مسلمان خود ہیں۔ اپنے اس خیال کی تائید میں ہم تعلیم کے معاملے میں مسلمانوں کی لاپروائی کی مثال پیش کریں گے۔ یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ تعلیم ہی ساری ترقی کی جڑ ہے۔

ترقی پذیر ممالک میں یہ ہمارا ملک ہندوستان ہی ہے جہاں جمہوریت برقرار ہے اور اصولاً اقلیتوں کو برابر کے حقوق حاصل ہیں یہاں اقلیتوں کو اپنے تعلیمی ادارے

قائم کرنے اور کا فی حد تک اپنی مرضی سے چلانے کی آزادی ہے۔ یہ آزادی مسلمانوں کو بھی حاصل ہے جسے وہ استعمال بھی کر رہے ہیں مسلمانوں کے تعلیمی ادارے دو قسم کے ہیں۔ ایک عصری تعلیم کے اسکول و کالج۔ دوسرے دینی مکاتیب و مدارس۔ ان دونوں قسم کے تعلیمی اداروں کا نظم و نسق خود مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے اور ان میں گورنمنٹ یا اکثریتی فرقے کا عمل دخل نہیں ہوتا۔

ہمارے اسکولوں اور کالجوں کی جو خستہ حالت ہے اس سے کون واقف نہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا اسکول یا کالج ہو جس کی انتظامیہ کے ممبران آپس میں دست و گریباں نہ ہوں اور مختلف گروہوں میں نہ بٹے ہوں۔ اکثر مقدمے بازی کی نوبت آجاتی ہے۔ کبھی کبھی تو آپسی جھگڑے اس حد تک بڑھ جاتے ہیں کہ مجبوراً گورنمنٹ کو مداخلت کرکے ادارے کو ایڈمنسٹریٹر کی نگرانی میں دینا پڑتا ہے۔

انتظامیہ کے آپسی جھگڑوں کا ایک مستقل اثر یہ ہوتا ہے کہ اساتذہ بھی گروہ بند ہو جاتے ہیں اور ہر گروہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی ادھیڑ بن میں لگا رہتا ہے۔ جب حالات یہ ہوں تو یہ سوچا جا سکتا ہے کہ ان اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم و تربیت کس عالم میں ہوگی۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ مستثنیات کو چھوڑ کر ہمارے زیادہ تر اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم کا معیار گرا ہوا ہے۔ بالخصوص سائنس اور ریاضی کی تعلیم کچھ زیادہ ہی خراب ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ خود مسلمان اپنے ذہین بچوں کو مسلم زیرِ انتظام اسکولوں میں بھیجنے سے گریز کرنے لگے ہیں۔

عصری تعلیمی اداروں کے بعد دینی تعلیمی اداروں کو لیجیے۔ انہیں مسلمان اپنی کمائی سے چلاتے ہیں اور ان سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ یہ دینی اور دنیاوی معاملات میں رہبری کریں گے لیکن افسوس کہ ان کی حالت بھی کسی طور عصری تعلیمی اداروں سے بہتر نہیں مستثنیات کو چھوڑ کر یہاں بھی ویسی ہی گروہ بندیاں، لڑائیاں اور رقابتیں ہیں جیسی کہ عصری تعلیمی اداروں میں۔ یہاں بھی زیادہ تر توانائیاں تعلیمی امور پر صرف ہونے کے بجائے داؤں پیچ اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششوں میں صرف ہوتی ہیں اور پھر یہاں کے صدیوں پرانے نصاب اور طریقۂ تعلیم کا ذکر نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ یہاں اس دور میں بھی یہ درس دیا جاتا ہے کہ کائنات چار عناصر آب، باد، خاک اور آتش سے بنی ہے۔

پوچھنے والا پوچھ سکتا ہے کہ ہمارے ان تعلیمی اداروں کی خراب حالت کا ذمہ دار کون ہے؟ ہم خود یا کوئی اور؟ ان میں تعلیمی معیار کی گراوٹ کس کی وجہ سے ہے؟ ہماری خود اپنی یا کسی اور کی؟ مدارس کے نصاب کا عصری تقاضوں کے مدِّنظر تبدیل کرنا کس کا کام ہے؟ ہمارا اپنا یا کسی اور کا؟ نظر اُٹھا کر دیکھیے ہمارے اپنے ہی ملک میں ایک چھوٹی سی اقلیت عیسائیوں کی بھی ہے۔ ان کے تعلیمی اداروں کی کارکردگی اور تعلیم کے معیار کا یہ عالم ہے کہ لوگ بلا تفریق مذہب و ملّت ان میں اپنے بچّوں کو تعلیم دلانا فخر کی بات سمجھتے ہیں۔

کسی فرد یا قوم کی ترقی کا پہلا زینہ ہے اپنی خامیوں اور کمیوں سے آگاہی۔ دوسرا زینہ ہے انہیں دور کرنا۔ ان دونوں زینوں سے گزرے بغیر ترقی کی منزل کا پالینا ناممکن ہے۔ پر افسوس کہ ہم ہندوستانی مسلمان نہ جانے کیوں اس حقیقت کو جانتے ہوئے بھی انجان بنے ہیں۔ اس بات کا جائزہ لینے کی زحمت نہیں کرتے کہ ہماری موجودہ پسماندگی میں خود ہماری اپنی کوتاہیوں کا کتنا ہاتھ ہے۔ جہاں تک تعلیمی پسماندگی کا تعلق ہے ہم یہ کہنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں کہ اس کے ذمّہ دار ہم خود ہیں۔ اپنے بچّوں کو تعلیم دلانے، اپنے تعلیمی اداروں کی حالت کو بہتر بنانے اور ان میں معیارِ تعلیم کو بلند کرنے میں ہمارے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں۔ اگر ہم نے صرف اپنے تعلیمی معاملات کو درست کر لیا تو سمجھیے کہ ترقی کا آدھے سے زیادہ سفر طے کر لیا۔

اسرار احمد

عید مبارک

رمضان المبارک کا مہینہ ہے۔ شام کا وقت ہے۔ مغربی افق پر گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں جس کے سبب سورج کو غروب ہوتے ہوئے دیکھنا محال ہے۔

لیکن یہ کوئی پریشانی یا الجھن کی بات نہیں

گھر میں لگے ہوئے انطار و سحر کے جدول سے افطار کا وقت معلوم کیا اور گھڑی دیکھ کر وقت پر بلا کسی ہچکچاہٹ اور پس و پیش کے روزہ افطار کر لیا۔

سوچنے کی بات ہے

- سحر اور افطار کے اوقات کا جدول جسے ہم سب معتبر سمجھتے ہیں، فلکیات کے جس علم کی بنیاد پر تیار کیا جاتا ہے جب اسی علم کی بنیاد پر یہ کہا جاتا ہے کہ عید کا چاند فلاں روز طلوع ہو گا تو ہم اس بات کا یقین کیوں نہیں کرتے؟
- جس ریڈیو یا ٹیلی ویژن پر اعلان کیے گئے صحیح وقت سے ہم ماہ رمضان میں اپنی اپنی گھڑیوں کو ملاتے ہیں تاکہ صحیح وقت پر سحر و افطار کر سکیں۔ پھر جب اسی پر کسی عالم یا مفتی کے اعلان کی بنیاد پر عید کے چاند کے طلوع ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو ہم میں سے کچھ لوگوں کو اسے صحیح مان لینے میں تامل کیوں ہوتا ہے؟

ہمارے طرز عمل میں انہیں تضادات کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ تقریباً ہر سال رویت ہلال کا جھگڑا کھڑا ہوتا ہے اور ایک ہی شہر، قصبے یا گاؤں میں دو عیدیں اور کبھی کبھی تو تین عیدیں تک منائی جاتی ہیں۔

کاش ہم اللہ کی دی ہوئی عقل سے کام لینا سیکھتے اور کم ازکم ایک بستی میں ایک ہی عید مناتے۔

اس دعا کے ساتھ کہ امسال رویت ہلال کا تنازعہ نہ کھڑا ہو اور کم ازکم ایک جگہ کے مسلمان ایک ہی عید منائیں ہم اپنے قارئین کو ادارہ تہذیب الاخلاق کی جانب سے اور خود اپنی جانب سے عید الفطر کی دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

اسرار احمد

محبت

سر سید احمد خاں

فرض کرو کہ کوئی شخص کسی سے محبت رکھتا ہے، ہم اس سے سوال کرتے ہیں کہ:

"تم اس سے کیوں محبت رکھتے ہو؟"

وہ اس کا جواب دیتا ہے کہ:

"وہ میرا بڑا محسن ہے۔ اس نے بڑے مشکل مشکل وقتوں میں مجھ پر احسان کیے ہیں: تنگی کے وقت روپیہ سے مدد کی ہے بیماری کی حالت میں میری تیمارداری کی ہے؛ دوا دارو، علاج معالجہ میں بڑی کوشش کی ہے۔"

یا وہ اس کا یوں جواب دیتا ہے کہ:

"ہم اور وہ مدت تک ساتھ رہے ہیں، دن رات آپس میں اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا ساتھ رہا ہے: روز روز کی ملاقات، بات چیت، ہنسی مذاق، دل لگی، مزاج کی باہمی موافقت کے سبب آپس میں دوستی و محبت ہو گئی ہے۔"

یا وہ کہتا ہے کہ:

"جس فن کا مجھ کو شوق ہے، اس فن کا اس کو بدرجۂ غایت کمال ہے۔ اس فن کے کمال کے سبب جس کا مجھ کو شوق ہے، اس شخص سے دلی محبت اور جانی دوستی ہو گئی ہے۔"

یا اس کا سبب وہ یہ بتلاتا ہے کہ:

"وہ شخص نہایت خوب صورت ہے۔ اس کے حسن و جمال نے میرے دل میں اس کی محبت بلکہ اس کا عشق پیدا کر دیا ہے۔"

پھر ہم اس سے دوسرا سوال کرتے ہیں، اور کسی بزرگ کا بزرگانِ دین میں سے نام لیتے ہیں، اور پوچھتے ہیں کہ:

"تم ان بزرگ سے بھی محبت رکھتے ہو؟"

وہ ضرور جواب دیتا ہے کہ:

"ہاں کیوں نہیں؟"

تب ہم اس سے کہتے ہیں کہ:

"وہ بزرگ تو تم سے کئی سو برس پہلے گزر چکے ہیں۔ انھوں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا، کسی مشکل کے وقت تمھارے کام نہیں آئے۔ کبھی تنگی کے وقت میں تم کو کچھ نہیں دیا۔ کبھی تمھاری تیمارداری نہیں کی، کبھی تمھاری دوا درمن علاج معالجہ میں کوشش نہیں کی۔ کبھی وہ اور تم ساتھ نہیں رہے۔ نہ کبھی ساتھ اٹھے بیٹھے۔ نہ کبھی آپس میں ملاقات بات چیت ہوئی۔ نہ کبھی ہنسی مذاق ہوا۔ نہ کبھی باہم مزاجی موافقت ہوئی۔ جس فن کا تم کو شوق ہے، وہ اس کا نام بھی نہیں جانتے تھے۔ نہ تم نے

ان کو دیکھا کر ان کے حسن و جمال نے تم کو فریفتہ کر لیا ہو۔
پھر کیوں تم ان سے محبت رکھتے ہو۔؟"

اس سوال کا وہ نہایت ناراض ہو کر اور لال منہ کر کر، غصہ بھری آواز سے جواب دیتا ہے کہ:

"میاں! وہ بزرگان دین تھے۔ خدا کے ہاں ان کا بڑا درجہ ہے۔ وہ دین داری میں یگانۂ وقت تھے۔ ایمان کامل ان کو نصیب تھا۔ دین میں سب کے سردار تھے۔ اس لیے ان سے محبت رکھتے ہیں۔"

اب میں بتاتا ہوں کہ یہی پچھلی محبت، محبت من حیث الدین ہے، جس کو میں حب ایمانی کہتا ہوں؛ اور یہی محبت غیر مذہب سے رکھنی شرعاً ممنوع اور حرام بلکہ کفر ہے؛ اور پہلی محبت، جس کو میں حبِ انسانی کہتا ہوں، شرعاً ممنوع نہیں۔ دونوں قسم کی محبت میں بالبداہت تفرقہ و تمیز موجود ہے: کہ ایک قسم کی محبت اُن اسباب ظاہری کے باعث تھی جو بمقتضائے فطرت انسانی ایک کو دوسرے کے ساتھ پیدا ہو جاتے ہیں؛ اور دوسری قسم کی محبت، باوجود معدوم ہونے ان تمام اسباب ظاہری کے، من حیث الدین تھی۔ اب کون شخص ہے جو ان دونوں قسم کی محبت میں تمیز نہیں کر سکتا؟"

پس، جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ غیر مذہب والوں سے سچی دوستی اور دلی محبت کرنا ممنوع ہے، یہ ان کی غلطی ہے۔ جو چیز کہ خدا تعالےٰ نے انسان کی فطرت میں بنائی ہے، وہ برحق اور بالکل سچ ہے۔ ہم کو تمام دوستوں سے، خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں سچی دوستی اور دلی محبت رکھنی اور برتنی چاہیے مگر وہ تمام محبت اور دوستی حب انسانی کے درجے میں ہو نہ حبّ ایمانی کے؛ کیوں کہ حبّ ایمانی بلا اتحاد مذہب بلکہ بلا اتحاد مشرب، ہونی غیر ممکن ہے؛ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی ہدایت ہم کو ہمارے سچے مذہب اِسلام نے کی ہے۔

مافقۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم،
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

"زندگی عبارت ہے حرکت سے آرزو سے جستجو سے۔ جہاں اِن تینوں میں سے کسی کا سراغ نہ ملے تو جان لو کہ وہاں موت کی قلمرو شروع ہو گئی۔ جس انسان کے دل میں آرزو نہیں، جس کو جستجو نہیں، جو آگے بڑھنے کے لیے بے چین نہیں، وہ انسان نہیں مٹی کا ڈھیر ہے۔"

سیّد حامد

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۷ شمارہ ۵ (مئی ۸۸ء)

سائنس کی منتقلی برائے ترقی

عبد السلام*

"بنیادی سائنسی تحقیق کے لیے گورنمنٹ کی امداد ایک وفاقی فریضہ ہے... بنیادی تحقیق ایک قوم کی پائدارسی کے لیے ضروری غذا ہے. کیوں کہ اس کے فوائد انتہائی وسیع اور جامع ہیں۔ مختصراً بنیادی تحقیق ہماری قومی اصلاح کا ایک اہم ستون ہے"
یہ ہیں وہ الفاظ جن سے صدر امریکہ کے سائنسی مشیر جارج اے کیورتھ دوئم George A. Keyworth II نے سائنس اور ٹکنالوجی کی ہاؤس کمیٹی ۱۹۸۴ء کے سامنے بنیادی تحقیق کے فروغ کی وکالت کی۔

ترقی پذیر ممالک میں بنیادی سائنسی علوم کی نظراندازی

مجھے ان الفاظ کے ساتھ اظہار خیال کے آغاز کی اجازت دیجیے کہ اس موضوع پر لکھنے کے لیے میں اپنے آپ کو اس لحاظ سے اہل سمجھتا ہوں کہ اس ناچیز محقق طبعیات کا تعلق ایک ترقی پذیر ملک سے ہے اور دوسرے مجھے اٹلی کے شہر ٹریسٹ (TRIESTE) میں واقع ایک بین الاقوامی مرکز برائے نظریاتی طبعیات I.C.T.P کے ناظم ہونے کا اعزاز بھی ہے ۱۹۶۴ء میں I.C.T.P کے قیام کے وقت سے اب تک کوئی ۲۲,۰۰۰ تجرباتی اور نظریاتی ماہرین طبعیات اس مرکز پہ آئے جن میں سے ۱۱,۰۰۰ کے قریب ترقی پذیر ممالک کی جامعات اور تحقیقی اداروں سے وابستہ تھے پچھلے بیس سالوں کے تجربے کی روشنی میں جو نکتہ میں آپ کے سا[منے] پیش کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ماسوائے ارجنٹائن، برازیل، چین اور بھارت کے تیسری دنیا کے باقی ممالک نے' یہ جانتے ہوئے بھی کہ سائنس اور ٹیکنالوجی رگ جاں ہے اور معاشی خوش حالی کی سب سے بڑ[ی] امید بھی، سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف سے بے اعتنائی کا رویہ اپنا[یا] ہے۔ اس حد تک کہ وہ سائنس کو ٹیکنالوجی کے مقابلے میں ایک اضافی س[...] سمجھتے ہیں۔ یہی سوچ امیر ممالک کے امداد دینے والے اداروں اور اقو[ام] متحدہ کی مختلف ایجنسیوں کی ہے اور بدقسمتی سے یہی انداز فکر ترقی پا[...]

---

* ڈائرکٹر انٹرنیشنل سینٹر فار تھیوریٹیکل فزکس، ٹریسٹے۔ اٹلی

ممالک سے وابستہ ان سائنس دانوں کا بھی ہے جن سے یہ امید تھی کہ تیسری دنیا کے سائنس دانوں کے خاص الخاص ساتھی بنیں گے۔

اس مقالہ کا بنیادی مقصد تیسری دنیا میں سائنس کی ناگفتہ حالت کا جائزہ لینا ہے اور اقوام متحدہ اور دوسرے اداروں کے لیے اس راہ کی نشاندہی کرنا ہے جس سے اس صورت حال کو بہتر بنایا جاسکے۔

میں اس بات پر کیوں مُصر ہوں کہ ترقی پذیر ممالک میں سائنس ایک اضافی سرگرمی سمجھی جاتی ہے۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔

اول: پالیسی ساز، حزنکمیشن (مثال کے طور پر برانڈکمیشن) اور امداد دینے والے ادارے سب کے سب ترقی پذیر ممالک کو ٹیکنالوجی کی منتقلی کے مسئلے پر ایک ہی طرح کی سوچ رکھتے ہیں اور وہ یہ کہ بس ٹیکنالوجی کی منتقلی ہی کافی ہے۔ اس پر یقین کرنا مشکل ہے لیکن یہ سچ ہے کہ برانڈکمیشن رپورٹ میں کہیں بھی لفظ سائنس درج نہیں۔ ترقی پذیر دنیا میں بہت تھوڑے لوگ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ دیرپا اثرات کے لیے ٹیکنالوجی کی منتقلی سائنس کی منتقلی کے ساتھ ساتھ ہونی چاہیے۔ کیوں کہ آج کی سائنس کل کی ٹیکنالوجی ہے۔ یہاں ہم لفظ سائنس کو اس کے وسیع تر معنی میں استعمال کر رہے ہیں جس سے مراد یہ بھی ہے کہ ایسی سائنس جو بہ آسانی بروئے کار لائی جاسکے۔ میں تو یہ کہنے سے بھی گریز نہیں کروں گا کہ اگر کوئی دورُخی چال کھیل رہا ہے تو اس کے ان شرارت آمیز ارادوں کو تاڑ لینا چاہیے جو ہمیں ٹیکنالوجی کی منتقلی بغیر سائنسی علوم کی منتقلی کی تجویز پیش کرتے ہیں۔ تیسری دنیا میں اس سے زیادہ نقصان ہمیں کسی نے نہیں پہنچایا جتنا کہ امیر ممالک کے مناسب سائنس (Rare science [illegible]) کے نعرے نے۔ یہ امر قابل افسوس ہے کہ اس نعرے کو ہمارے ممالک نے بغیر سوچے سمجھے ہر قسم کی سائنس کی ترقی کے لیے موافق اور مناسب گردانا۔

دوم: سائنس کی منتقلی سائنس دانوں کی برادری سے متاثر بھی ہوتی ہے اور اسے متاثر بھی کرتی ہے۔ ایسی کمیونٹی یا برادری کے لیے لازم ہے کہ اس کی افرادی قوت اور ضروری ابتدائی ڈھانچہ (infrastructure) کو ایک خاص حد تک بڑھایا جائے۔ یہ نشوونما کا عمل دانشمندانہ طویل مدتی سائنس پالیسی بنانے کی ترغیب دیتا ہے۔

پھر ہمارے ممالک میں اعلیٰ صلاحیت کے سائنس دانوں کو قوم کی تعمیر میں برابر کا شریک ہونے کی اجازت ہونی چاہیے۔ اسی طرح جب ایک ماہر معاشیات یا ایک ٹیکنالوجسٹ کو شریک کیا جاتا ہے۔ ابھی تک چند ہی ترقی پذیر ممالک نے ایسا طرز عمل نافذ کیا ہے اور چند ہی امداد دینے والے اداروں نے سائنسی علوم کے ضروری ڈھانچہ (infrastructure) کی تعمیر میں حوصلہ افزائی کرنے اور امداد دینے کا منشور بنایا ہے۔

سائنس کی منتقلی کیوں ؟

جن سائنسی علوم کی میں بات کر رہا ہوں، ان کا infrastructure کیا ہے اور کیوں؟ اول اور سب سے مقدم ہیں ہر سطح پر اور خاص کر اعلیٰ سطحوں پر (کم از کم) انجینئرز اور ٹیکنالوجسٹ کے لیے سائنسی خواندگی اور سائنسی تدریس کی ضرورت ہے اس کام کے لیے اعلیٰ صلاحیتوں کے اساتذہ کی خدمات چاہیں اور اس وقت تک کوئی بھی اعلیٰ استاد نہیں بن سکتا۔ جب تک کہ اس نے کسی نہ کسی طرح اپنے کیریر کے کسی حصے میں کچھ نہ کچھ جدید سائنس میں تحقیق و تجربے سے استفادہ نہ کیا ہو۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ہماری تجربہ گاہیں ہر طرح کے ساز و سامان سے آراستہ ہوں (اس سائنسی تیز رفتار دور میں) جدید ترین جرائد اور کتب دستیاب ہوں یہ کسی ملک کے سائنسی infrastructure کی اہم ترین ضرورت ہے۔

اس کے بعد ترقی پذیر ممالک کے ادارے اور ان کی ابھرتی ہوئی صنعتیں اپنے اپنے ممالک کے سائنس دانوں سے یہ مطالبہ کریں کہ وہ بلا امتیاز کے یہ مشورہ دیں کہ ملک کے لیے کون سی ٹیکنالوجی مناسب اور قابل عمل ہوگی۔

مزید برآں ترقی پذیر ممالک کی ایک قلیل تعداد کے لیے اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ بنیادی سائنس کے ماہرین اپنے اطلاقی سائنس کے رفقائے کار کی تحقیقی کام میں مدد کریں۔ کسی بھی معاشرے کے لیے اس کے زراعتی مسایل، نقصان پہنچانے والے کیڑوں اور بیماریوں کے اور

مقامی مال کے ضروری اجزا کے مسائل کا حل مقامی طور پر ہی ہونا چاہیے ان شعبوں میں اطلاقی تحقیق کے لیے بنیادی سائنس میں اعلیٰ درجے کی بنیاد کا سہارا ضروری ہے۔

ایک ترقی پذیر ملک میں اطلاقی سائنس کی پرورش بنیادی سائنس کی پرورش سے زیادہ مشکل ہے۔ کیوں کہ اطلاقی کام کی مناسبت سے جس بنیادی علم کے جاننے کی ضرورت ہے وہ پڑوس سے یا ٹیلی فون کے ذریعے میسر نہیں ہے۔

اور آخر میں ایک ملک کی اعلیٰ سطح کی تعمیر کے لیے بنیادی سائنس میں تحقیق ایک اہم ضرورت ہے جو مستقبل میں ٹیکنالوجی کی صورت میں فائدہ پہنچائے گی۔ اس سلسلے میں بہت سی مثالیں ذہن میں آتی ہیں۔

میرے تحقیق کے میدان میں ہی ہونے والی ترقیوں کی مثال لیجیے یعنی فطرت کی بظاہر مختلف قوتوں میں وحدت کی تلاش۔ اس سلسلے میں فیراڈے (FARADAY) نے پچھلی صدی میں برق و مقناطیسی قوتوں کی پوشیدہ وحدت کے انکشاف کی جو شروعات کی وہ یقیناً ایک بہت ہی روشن مثال ہے۔ فیراڈے (Faraday) اپنے تجربات کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جب ساکن برقی بار اپنے گرد برقی بار پر برقی اثر ڈالتا ہے تو متحرک برقی بار ایک مقناطیسی میدان پیدا کرتا ہے۔ اس وقت کسی کے ذہن میں یہ بات تک نہ تھی کہ یہ معمولی دریافت جو کہ لندن میں Piccadilly میں قائم شدہ تجربہ گاہ میں ہوئی ہے وہ بجلی پیدا کرنے کی ٹیکنالوجی کی بنیاد ثابت ہوگی۔

اس بات کو سمجھنے کے لیے کہ فیراڈے کے کام کو اس کے ہم عصر کتنا بے سود سمجھتے تھے ذرا چارلس برنی کے ان تاثرات کو سنیں جو اس نے برق اور میوزک کے فوائد کا موازنہ کرتے ہوئے رقم کیا ہے۔ "عالمی طور پر برق ایک نہایت دلچسپ اور حیران کن مظہرِ قدرت سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اکثر اس بات پر اظہار تاسف بھی کیا جاتا ہے کہ اسے اب تک 'یقینی طور پر' کسی فلاحی مصرف میں نہیں لایا جا سکا... جب کہ یہ بتلانا آسان ہے کہ کس طرح موسیقی کو انسانیت کی فلاح کے لیے استعمال میں لایا گیا ہے۔ اس سے نہ جانے کتنے یتیموں کی پرورش ہوتی ہے اور دردِ زچگی کی شدت میں کمی آتی ہے جس سے جان جانے کا خطرہ کم ہوتا ہے۔"

برق مقناطیسی قوتوں کی وحدت کو واضح طور پر میکسویل (Maxwell) نے نمایاں کیا جو فیراڈے کے فوراً بعد آیا۔ خالص نظریاتی بنیاد پر Maxwell نے یہ پیشین گوئی کی کہ حالتِ اسراع میں ایک چارج برق مقناطیسی اشعاع پیدا کرے گا۔ ۱۸۷۹ء میں Maxwell کے انتقال کے چند سال بعد جرمنی میں Hertz نے اس پیشین گوئی کی توثیق کی اور یہ پایا کہ میکسویل کا تجویز کردہ شعاعی طیف نوری امواج لمبی طول والی ریڈیائی امواج اور چھوٹی طول موج والی ایکس رے پر مشتمل ہے۔ اس طرح ایک غیر معروف پروفیسر کے پیش کردہ بظاہر معمولی نظریاتی قیاس سے ریڈیو، ٹیلی ویژن جیسے جدید نظام خبر رسانی نیز انسانی جسم کے اندر دیکھنے والی X-Rays جیسے عجوبے پیدا ہوئے۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں فیراڈے کے وقت سے یعنی میکسویل کے سو سال بعد حالات کیسے بدلے۔ ۱۹۶۰ء کے عشرے میں میرے ہم عصر گلیشو (Glashow) اور وائن برگ (Weinberg) اور یورپ میں میں نے اپنے اپنے طور پر اگلا قدم اٹھایا۔ جو قدرت کی دو اور قوتوں کو یکجا کرنے کے متعلق تھا۔ یعنی برقناطیسی اور کمزور نیوکلیائی قوتوں کی وحدت۔ اس پر لندن کے اکنامسٹ نے پرزور الفاظ میں مستقبل کے تاجروں کو مشورہ دیا کہ اس نئی دریافت کے معاشی نتائج کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔

پچھلے سال جنوری میں جنیوا میں قائم عظیم یورپین مرکز برائے نیوکلیر تحقیق (CERN) نے ہمارے نظریے کی براہ راست تصدیق کی۔ یہ کارنامہ اعلیٰ ترین تکنیکی ذہانت کی وجہ سے تقریباً ۵۰ ملین ڈالر کی لاگت سے ممکن ہوا۔ میں یہ مشورہ نہیں دے رہا ہوں کہ ترقی پذیر ممالک CERN کے طرز کی Accelerator تجربہ گاہیں تیار کریں۔ اگرچہ لندن اکنامسٹ نئی قوتوں کے وحدت کے نئے نظریے کے براہ راست معاشی فوائد کی طرف سے اچھی امید رکھے ہوئے ہے۔ لیکن اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ یہ Accelerator تجربہ گاہیں 'Micro-Electronics' Vacuum اور Super Conductor Material Science Technology کے شعبوں میں اعلیٰ ترین ٹیکنالوجی کا منبع ہیں۔ میں اس خبر پر مسرور ہوں کہ شکاگو میں Fermi Lab نے لیبارٹری سے نکلنے

،خاص ادارہ قایم کرنے کا فیصلہ کیا ہے، تاکہ سائنس اور اس سے متعلق
الوجی لاطینی امریکہ کے ماہرین طبعیات کو بھی میسر ہوں اور CERN لیبارٹری
ینی Microprocessor ٹیم کے کچھ ماہرین کی خدمات ٹریسٹ مرکز
ستعار کی ہیں جنھوں نے پہلے ہی چھ چھ ہفتوں کے دو اعلیٰ معیار کے Micro
Process فزکس اور ٹیکنالوجی کالج، ترقی پذیر ممالک کے ۲۵۰
رین طبعیات کے لیے منظم کیے۔ جون ۱۹۸۴ء میں یہ ٹیم سری لنکا میں جنوب
قی ایشیا سے ۶۲ ماہرین طبعیات کے لیے چار ہفتے کا ایک Micro
Processor کالج کا انعقاد کر رہی ہے۔ اسی مضمون میں بعد میں ۱۹۸۵
۱۹ء، ۱۹۸۷ء اور ۱۹۸۸ء میں چار ہفتے کے کالج چین، کولمبیا، کینیا
مراکو میں بھی منعقد ہوں گے۔

مختصراً یہ کہ موجودہ حالات میں ٹیکنالوجی اس وقت تک فروغ نہیں
لتی جب تک اس کے ساتھ سائنس بھی فروغ نہ پائے۔ حال ہی میں اس
کا پرزور تذکرہ Erzurums کی یونیورسٹی کے ایک ترکی ماہر
ں نے مجھ سے کیا کہ سلطان سلیم III نے ۱۷۹۹ء سے ترکی میں الجبرا،
Trigonomet، میکانیات Ballistics دھات گری کی تدریس
غاز کیا تھا اور فرانس اور سوئٹزرلینڈ کے اساتذہ کی مدد سے ان
دں میں خاص اسکول بنائے۔ اس کا مقصد اپنی فوج کو جدید طرز پہ
کرنا تھا۔ تاکہ وہ اپنے یورپی حریفوں کا Gun-founding
پ ڈھالنے کے فن کی ترقی میں مقابلہ کر سکیں۔ ترکی کا میلہ نہ ہوا۔ میرا
نظر اس واسطے پھر یہی ہے کہ آج کل کے حالات میں سائنس کی مدد
بغیر ٹیکنالوجی فروغ نہیں پائے گی۔

تیسری دنیا میں سائنسی علوم کی صورت حال

آیئے ذرا تیسری دنیا میں (ارجنٹائنا، انڈیا، برازیل اور چین کو چھوڑ
) سائنس اور سائنسی تحقیق کی صورت حال کا گہرا جائزہ لیں۔ اس صورت
ل کی وضاحت اپنے ملک کی مثال سے پیش کرتا ہوں۔ جب میں High
Energy Physics میں کیمبرج اور پرنسٹن میں کام کرنے کے بعد
۱۹ء میں پاکستان میں درس و تدریس کے لیے واپس آیا تو اس وقت
روڑ آبادی والے ملک میں صرف ایک ماہر طبعیات تھا جس نے اس

مضمون میں بھی کام کیا تھا۔ فزیکل ریویو کی جدید ترین جلدیں بھی ۱۹۳۹ء
کی دوسری جنگ عظیم سے پہلے کی تھیں۔ سمپوزیم یا کانفرنس میں شمولیت
کے لیے کسی قسم کا کوئی فنڈ میسر نہ تھا۔ جب ایک دفعہ میں نے برطانیہ میں
کانفرنس میں شرکت کی تو اپنی ایک سال کی پوری بچت خرچ کر ڈالی۔

تیس سال کے بعد پاکستان میں صورت حال ذرا کچھ سنبھلی ہے۔ اب
اس ۸ کروڑ کی آبادی والے ملک میں ۱۹ جامعات میں طبعیات نظریاتی اور تجرباتی
دونوں کے ماہرین کی تعداد ۴۶ ہے۔ (امریکہ کے معیار کے مطابق اس آبادی
والے ملک کے لیے یہ تعداد ایک سو گنا زیادہ ہونا چاہیے یعنی ۵ ہزار) یہ
ماہرین طبعیات ابھی بھی انہیں مسائل کا سامنا کر رہے ہیں جن کا تعلق جرائد
کی دستیابی، مقالوں کی اشاعت کے اخراجات، کانفرنس میں شرکت
وغیرہ وغیرہ سے ہے۔ پاکستان آج بھی بین الاقوامی یونین برائے خالص اور
اطلاقی طبعیات کا ممبر نہیں ہے۔ کیوں کہ ہمارے ناظمین سائنس کا خیال ہے
کہ وہ ۱٫۵۰۰ ڈالر کی فیس ادا نہیں کر سکتے۔ ہمارے ماہرین طبعیات کو
ابھی بھی یہی بتلایا جاتا ہے کہ تمام بنیادی سائنس حتیٰ کہ وہ جسے کبھی جو اطلاقی
طبعیات کے لیے ضروری ہیں، پاکستان جیسے غریب ملک کے لیے ایک
نہایت ہی بھیانک عیش پرستی ہے۔ تاہم پاکستان کے اور ایک خصوصی حیثیت
کے حامل ۳۰ ممالک کے گروپ جس کا ذکر بعد میں آئے گا، باقی ساٹھ ترقی
پذیر ممالک میں صورتِ حال بالکل ایسی ہی ہے جیسی پاکستان کی ۱۹۵۱ء
میں تھی۔ اوّل سب سے اہم مسئلہ سائنس دانوں کی مناسب تعداد کا ہے
ان میں سے بہت سے ممالک میں ریسرچ میں تربیت یافتہ ماہرین طبعیات
کی تعداد ایک ہاتھ کی انگلیوں پر شمار کی جا سکتی ہے۔

ان ماہرین نے جن شعبوں میں تربیت حاصل کی ہے وہ بیشتر کسی
منصوبے کے تحت نہیں بلکہ اتفاقی ہے، ان کی اپنی کوئی برادری نہیں۔

۱۹۶۰ء کے عشرہ میں ٹریسٹ (TRIESTE) میں ایک بین الاقوامی
مرکز برائے نظری طبعیات معرض وجود میں آیا۔ جب تیسری دنیا میں سے ہم میں سے
بعض لوگوں نے اقوام متحدہ کے اداروں خاص کر IAEA اور UNESCO
سے اصرار کیا کہ وہ نظریاتی طبعیاتی ریسرچ میں اس صورت حال کو سدھارنے
میں ہماری مدد کریں۔ اس سلسلے میں بعض ترقی یافتہ ممالک کی نافہمی بھی بہانے
سامنے آئی۔ یہ وہ ممالک ہیں جہاں فزکس پھلتی پھولتی ہے۔ IAEA میں ایک

ترقی یافتہ ممالک کا سند وب میاں تک کہہ گیا

" نظریاتی طبعیات سائنس کی رولز رائس (Rolls - Royce) ہے۔ ترقی پذیر ممالک کو صرف بیل گاڑیوں کی ضرورت ہے "

اُن صاحب کے لیے یہ ۵۰ ماہرین جو تمام کے تمام اعلیٰ تربیت یافتہ تھے پاکستان جیسے ملک کے لیے جس کی آبادی اس وقت ۱۲ کروڑ کے قریب تھی محض ۵۰ بے مصرف انسان تھے۔ ریسرچ میں اُن کی شمولیت کی بات تو ایک طرف یہ لوگ پاکستان میں طبعیات اور ریاضی کی تعلیم کے پورے نظام کو ترتیب دینے والے تمام قواعد و ضوابط کے ذمہ دار تھے۔ اُن کی یہ بات کتنی غیر متعلق تھی وہ خود ماہر معاشیات تھے جو کہ IAEA جیسے سائنسی ادارے میں وارد ہوئے۔ وہ یہ تو پوری طرح سمجھ سکتے تھے کہ ہمیں اعلیٰ معیار کے ماہرین معاشیات درکار ہیں۔ لیکن ریسرچ میں تربیت یافتہ ماہرین طبعیات اور ماہرین ریاضی ان کے نزدیک عیاشی تھی۔

کافی دباؤ ڈالنے پر، تجویز پیش کرنے کے چار سال بعد IAEA طبعیات کا ادارہ قائم کرنے پر رضامند ہوا اور ہمیں ایک تحقیقی بین الاقوامی مرکز بنانے کے لیے ۵۵,۰۰۰ ڈالر کی رقم مختص کی گئی۔ خوش قسمتی سے اطالوی گورنمنٹ کی فیاضانہ سالانہ ایک تہائی ملین ڈالر کی گرانٹ میسر آ گئی اور یہ مرکز ٹریسٹ (TRIESTE) میں قائم ہو گیا۔ بین الاقوامی فزکس برادری نے ہماری مستقل حوصلہ افزائی کی۔ مرکز کی پہلی سائنٹفک کونسل میٹنگ میں Victor Weisskopf, Aage Bohr, J. R. Sandoval Vallarta اور Oppenheimer نے شرکت کی۔ Oppenheimer نے مرکز کے آئین کی تشکیل دی۔

مرکز نے ۱۹۶۴ء میں کام کرنا شروع کیا۔ یونیسکو نے IAEA کے ساتھ برابر کے شریک کی حیثیت سے ۱۹۷۰ء میں شمولیت اختیار کی۔ مرکز اس وقت سے برابر بڑھتا جا رہا ہے۔ ان کی حمایت سے بھی جو کبھی اس کے جواز پر شک کرتے تھے اس کے فنڈ کا بیشتر حصہ جو کہ اب ۷.۵ ملین ڈالر ہے، اٹلی IAEA اور UNESCO سے دستیاب ہے۔ چھوٹی عارضی گرانٹ، وقتاً فوقتاً ان جگہوں سے بھی ملی ہیں: اقوام متحدہ کا ترقیاتی پروگرام (U.N.D.P) اقوام متحدہ کا مالی امدادی سسٹم برائے ترقی سائنس اور ٹیکنالوجی۔ یونیورسٹی اقوام متحدہ، تیل پیدا اور برآمد کرنے کی کارپوریشن (OPEC) کا فنڈ۔ امریکی محکمہ توانائی، فورڈ فاؤنڈیشن۔ بین الگورنمنٹ ادارہ برائے اطلاعات (I.B.I)، کینیڈا، کویت، لیبیا، قطر، سویڈن، جرمنی، سری لنکا، نیدرلینڈ، جاپان، ڈنمارک۔ ان بیس سالوں کے عرصے میں جب سے یہ مرکز قائم ہوا ہے، اس نے اپنی توجہ خالص طبعیات کی بجائے خالص اور اطلاقی فزکس دونوں کے سرحدی شعبوں کی طرف تبدیل کر دی ہے۔ مثلاً اس طرح کے شعبے مادی طبعیات اور مائیکرو پروسیسر طبعیات، توانائی کی طبعیات، فیوژن کی طبعیات، تدبیل گر کی طبعیات، طبعیات شمسی اور غیر رسمی توانائی، ارضی طبعیات، حیاتی طبعیات، اعصابی طبعیات، لیزر طبعیات سمندر اور صحرا کی طبعیات اور سسٹم کے تجزیے۔ یہ شدید توانائی والی طبعیات کے شعبوں کے علاوہ ہیں۔ یعنی کوانٹم کشش، علم کائنات، اٹامک اور نیوکلیر طبعیات اور ریاضی وغیرہ۔ خالص اور اطلاقی طبعیات کے سرحدی شعبوں کی طرف ایسی تبدیلی اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کی گئی ہے یہ ترقی پذیر ممالک کے ماہرین طبعیات کی اس میدان میں محرومی کو پورا کرنے کے لیے کوئی اور بین الاقوامی ادارہ نہ موجود تھا اور نہ ہی اب موجود ہے۔

اس کے متعلق آج نہایت ہی اہم مثالوں میں سے ایک مثال طبعیات اور توانائی کے شعبے کی ہے۔ توانائی کی فراہمی موجودہ دور میں بنی نوع کی ایک بہت بڑی تشویش ہے۔ ملک ملک یا تو توانائی کے نئے شعبے کھولے گئے ہیں یا اٹامک انرجی کمیشن کو ایک جامع توانائی شعبے میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ تمام بین الاقوامی کانفرنسوں کے انعقاد کے باوجود میرے علم کے مطابق اب بھی توانائی میں سائنسی لحاظ سے تحقیق اور تربیت کا ادارہ وجود میں نہیں آیا، جہاں ترقی پذیر ممالک کے سائنس داں کوئی نمایاں ریسرچ کر سکیں۔ ایک مناظری بدل گر (Optical Converter) کو کتنا کم سے کم ممکن حد تک مواد استعمال کرنا چاہیے یہ شمسی شعاع کی گہرائی (Penetration) اور اُکسائی حالت (Excited State) کی سرکاؤ لمبائی (Diffusion Length) سے معلوم ہوگا، جن پر اس تبدیلی کا انحصار ہے۔ غیر قلمی مادے (Amorphous Materials) کے لیے یہ تبدیلی نقائص (Defects) کی کثافت پر اور ان کو سمجھنے پر منحصر ہے۔ تاثیر بخش اور قیمت کے بہتر

بدل والے فوٹو وولٹائی خانے اس طرح ٹھوس حالت مواد کی فزکس پر انحصار کرتے ہیں اور نہ کہ ٹیکنالوجسٹ کی کم فہمی پر۔ اس ضرورت کے ایک حصے کو پورا کرنے کے لیے ٹریسٹ کے مرکز نے محسوس کیا کہ اس کو توانائی سے مناسبت والے مواد کی اعلیٰ معیار کی فزکس کے فروغ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے اور خاص کر جاذبی (Absorbing) اور اخراجی (Emitting) سطحوں کی فزکس کی طرف۔ اب تک اس شعبے میں ہمارے کالجوں میں تقریباً ایک ہزار ماہرین طبیعیات شریک ہو چکے ہیں۔

لندن اکنامسٹ جو ایک موقر جریدہ ہے اپنے ۲۷ ستمبر ۱۹۸۰ء کے شمارے میں اس شعبے کے متعلق راقم ہے۔

"اگر شمسی توانائی کو دنیا کی توانائی کے بحران کا حل مہیا کرنا ہے تو وہ حل غیر معیاری بالائے چھت شعاع ریزوں سے نہیں ہوگا۔ یہ انقلاب کوانٹم فزکس، بائیوکیمسٹری یا بیسویں صدی کے سائنسی علوم کے اطلاق سے آئے گا۔ آج کی ٹیکنالوجی پر مبنی تمام صنعتیں نئی سائنس پر انحصار کرتی ہیں۔"

۱۹۸۳ء میں ٹریسٹ مرکز میں ۲۴۰۰ ماہرین طبیعیات آئے ان میں سے ۱۴۰۰ سائنس داں ۹۰ ترقی پذیر ممالک سے تھے۔ ان ترقی پذیر ممالک سے آنے والے اوسطاً دو ماہ یا اس سے زیادہ عرصہ مرکز میں گزارتے ہیں اور اس کی تحقیقی ورکشاپ اور طویل ریسرچ کالجوں میں حصہ لیتے ہیں۔ ۱۹۸۱ء سے ہم نے ان میں سے چار کالجوں کا انعقاد ترقی پذیر ممالک میں کیا ہے۔ گھانا، بنگلہ دیش، کولمبیا اور اب سری لنکا میں یہ چار سے آٹھ ہفتے کے ریسرچ کالج ٹھوس حالت فزکس، مون سون حرکیات، شمسی فزکس اور Microprocessors کے موضوعات پر تھے۔ ہم نے ایک ایسوسی ایٹ شپ اسکیم کا آغاز کیا ہے جو کہ اس بات کی گارنٹی دیتی ہے کہ ترقی پذیر ممالک سے چوٹی کے طبیعیات داں اپنے سہولت کے اوقات جن کا دورانیہ چھ ہفتے سے تین ماہ تک ہے، چھ سال میں تین مرتبہ اس مرکز میں آسکیں۔ تاکہ وہ اپنے ہم عصروں سے ایک محرک ماحول میں کام کرکے اپنی بیٹریاں چارج کریں اور پھر واپس اپنی تدریسی اور تحقیقی پوزیشن میں چلے جائیں۔ ہم کوئی تنخواہ نہیں ادا کرتے۔ صرف سفر اور قیام کے اخراجات برداشت کرتے ہیں۔ اس وقت لیے ۲۰۰ ایسوسی ایٹ اس مرکز سے وابستہ ہیں۔ ہمارے ساتھ ۴۱ ترقی پذیر ممالک میں واقع ۱۰۲ فزکس کی درسگاہیں کی وابستگی اخراجات میں حصہ دار کی بنیاد پر ہے۔ ایک کتب بینک اسکیم کے ذریعے ہم انفرادی عطیات سے کل ۲۵۶۵ کتابیں اور ۵۴۲۰۸ جدید جرائد ۶۲ ممالک میں موجود ۱۳۲ اداروں میں تقسیم کر چکے ہیں۔ ہم ایک اور اسکیم شروع کر رہے ہیں جس میں ترقی یافتہ ممالک کی تجربہ گاہوں کا عطا کردہ غیر استعمال شدہ فاضل ساز و سامان کو جمع کرنا اور تقسیم کرنا ہے۔ ۱۹۸۲ء سے اطالوی گورنمنٹ کی ایک تہائی ملین ڈالر سالانہ کی امداد سے ہم نے ۷۵ تجرباتی ماہرین طبیعیات کو ۶ سے ۹ ماہ کے عرصے کے لیے اطالوی جامعات اور صنعتی تجربہ گاہوں میں بھجوایا ہے۔ اس مرکز نے طبیعیات کے مضمون کو عموماً اور ترقی پذیر ممالک کی فزکس برادری کو خصوصاً فروغ دیا ہے۔

۴ تیسری دنیا میں سائنسی علوم کی نشو و نما اور منازل

فزکس میں حاصل کردہ تجربے کی بنا پر ہم ترقی پذیر ممالک (ارجنٹائن، برازیل، چین، بھارت کے سوا) کو تین زمروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

پہلا زمرہ ۹ ممالک پر مشتمل ہے۔ بنگلہ دیش، کوریا، ملائیشیا، پاکستان، سنگاپور اور ترکی ایشیا میں، مصر افریقہ میں اور میکسیکو اور وینزویلا لاطینی امریکہ میں۔ ان ممالک میں ماہرین طبیعیات کی تعداد معقول حد تک پوری ہو رہی ہے اور ساتھ میں طبیعیات میں اعلیٰ معیار کے کچھ مراکز بھی معرض وجود میں آرہے ہیں۔ جہاں سائنس داں اپنے طور پر تحقیق کر سکیں گے۔ یہ مراکز اپنے ممالک میں پی ایچ ڈی کی ڈگری دینے کے اہل بھی ہوں گے۔

دوسرے زمرے میں کوئی ۱۹ ممالک ہوں گے جو کہ ان ممالک پر مشتمل ہیں۔ ایران، عراق، اردن اور لبنان مشرق وسطیٰ میں، انڈونیشیا، فلپائن، سری لنکا، تھائی لینڈ اور ویت نام جنوب مشرقی ایشیا میں؛ الجزائر، گھانا، کینیا، مراکش، نائجیریا، سوڈان، تنزانیہ افریقہ میں؛ چلی، کولمبیا اور پیرو لاطینی امریکہ میں۔ ان ممالک میں ماہرین طبیعیات کی مناسب تعداد ہے اگرچہ جامعات میں کام کرنے والوں کی تعداد کم ہے وہاں کوئی تحقیقی گروپ تشکیل نہیں پا سکے، لیکن کچھ حالات میں انفرادی طور پر

بعض لوگ کافی سرگرمِ عمل ہیں۔ قاعدے کے مطابق ان متعلقہ ممالک میں پی ایچ ڈی ڈگری ایوارڈ نہیں کی جاتی۔ میں ان دو قسموں کا ذکر کرتا ہوں۔ کیوں کہ امیر دنیا کی سائنس برادری کی منظم امداد سے یہ ممالک قلیل مدت میں ترقی کی جانب گامزن ہو سکتے ہیں۔

باقی ۶۰ ممالک 'غربت لائن' سے نیچے آتے ہیں۔ ان کے بعض غیر معمولی ذہین افراد جنہیں ہم ٹریسٹ مرکز کے ایسوسی ایٹ منتخب کرتے ہیں اُس وقت تک کے لیے جب اُن کے اپنے ممالک میں تحقیقی سرگرمی سے شروع ہو لیکن منظم فزکس ریسرچ نہیں۔ میں ایک بار پھر زور دیتا ہوں کہ یہ تاثرات فزکس برادری کے ساتھ تجربات پر مبنی ہیں۔ ان میں کسی اور قسم کی اہمیت کا دخل نہیں ہے۔

۵ سائنسی علوم کے فروغ کا طریقہ کار

آخر میں ہمارے ممالک میں سائنس کا فروغ ہمارا مسئلہ ہے لیکن اس مضمون میں محض اس امداد کے ذکر تک اپنی بات محدود رکھوں گا جس کی ہمیں ترقی یافتہ ممالک کی سائنس برادری اور متعلقہ افراد سے تیسری دنیا میں اعلیٰ سائنسی علوم کے فروغ کے سلسلہ میں ملنے کی امید ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بیرونی امداد اگر منظم طریقے پر دی جائے تو یہ خاطر خواہ نتائج دے گی۔ انفرادی طور پر ماہرین طبعیات کے کام میں مدد کے لیے مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر ترقی یافتہ ممالک کی فزیکل سوسائٹیاں اپنے جرائد کی ۲۰۰ سے ۳۰۰ جلدیں مستحق اداروں اور افراد کو بطور عطیہ دیں وہ اشاعت اور کانفرنس میں شمولیت کے اخراجات معاف کر سکتے ہیں۔ اسی سلسلے میں بین الاقوامی یونین برائے خالص اور اطلاقی طبعیات (IUPAP) نے پرانی جلدوں کی تقسیم کے اخراجات برداشت کر کے مرکز کی امداد کی ہے۔ امریکہ کی فزیکل سوسائٹی نے ۱۳ ترقی پذیر ممالک سے متعلق ۳۱ ماہرین طبعیات کی شراکتی چندے کی صورت میں ہماری مدد کی۔ ترقی یافتہ ممالک کی تحقیقی تجربہ گاہیں اور جامعات ترقی پذیر ممالک کی اس طرح مدد کر سکتی ہیں کہ وہاں کی اپنی مقابل جگہوں سے فیڈریشن تعلقات استوار کریں اور اُن اداروں کے سٹاف کے دوروں کی مالی اعانت کریں۔ وہ ایسوسی ایٹ مرکز کی اسکیم کا اجرا کر سکتے ہیں، جس کا میں پہلے ہی ٹریسٹ مرکز کے حوالے سے ذکر کر چکا ہوں (جس میں ایک باکمال طبعیات داں جو کہ ترقی پذیر ملک میں کام کر رہا ہوتا ہے، ہمارے اسٹاف سے منسلک ہو جاتا ہے۔ اس طرح کہ اسے چھ سال میں تین مرتبہ ہمارے ہاں آنے کا حق مل جاتا ہے)۔

مجھے اس طرح اظہارِ خیال کرنے پر معاف فرمایئے گا کہ ترقی یافتہ ممالک سے وابستہ فزکس کے ادارے اپنے طور پر (جنس کی شکل میں) اقوام متحدہ کے مشہور فارمولے کے تحت مدد کرنے پر غور کر سکتے ہیں جس میں اکثر ترقی یافتہ ممالک نے اپنے GNP کی ۱ فیصد آمدنی دنیا کی ترقی کے لیے صرف کرنے کی یقین دہانی کرائی ہے۔ آخر میں یہ اخلاقی مسئلہ ہے کہ آیا سائنس برادری کا خوشحال طبقہ اپنے مستحق لیکن محروم ساتھیوں کا خیال رکھنے کے لیے تیار ہے۔ نہ صرف اس طرح کہ ان کی مادی مدد سے وہ اچھے سائنس داں بن کر رہ سکیں بلکہ اس کام میں ان کے ساتھ برابر کے شریک رہ کر بھی مدد کر سکیں۔ تاکہ وہ اپنے ممالک میں مستند پیشہ ور مانے جائیں جو اپنے ممالک کی ترقی اور بالآخر دنیا کی ترقی کے لیے اہم ہیں۔

اب میں اس موضوع کی طرف آرہا ہوں کہ بین الاقوامی ادارے اپنے استعدادی میدان میں لمبی مدت کے لیے سائنسی ڈھانچہ بنانے میں امداد مہیا کر سکتے ہیں۔ میں خاص کر اس طریقہ کار پر زور دیتا ہوں جس سے میں ذاتی طور پر واقف ہوں۔ یعنی بین الاقوامی تحقیقی ادارے۔ اس میں تو کسی سوال کی گنجائش ہی نہیں کہ ترقی پذیر ممالک کو آج بین الاقوامی تحقیقی ادارے درکار ہیں جیسے اطلاقی میدان میں گندم چاول تحقیقی ادارہ اور سائنسی میدان میں نیروبی میں کیڑوں کی فزیالوجی کا بین الاقوامی مرکز (ICIPE) بین الاقوامی بنائے بغیر سائنس فروغ نہیں پا سکتی۔ کوئی بھی معیار کی یقین دہانی نہیں کر سکتا اور نہ نئے خیالات سے آگاہی کی یقین دہانی اور نہ ہی خالقین سائنس اور ان مراکز کے مدعوین کی طرف برابر منتقلی کی جو کہ حسنِ تخلیق کے جذبے سے سرشار ہو کر یہاں آتے ہیں۔

حال ہی میں (NICE) کے مقام پر ریاضی میں ایک بین الاقوامی [illegible] قائم ہوا ہے۔ ایک بین الاقوامی مرکز سری لنکا میں، ایک ترکی میں اور وینزویلا میں۔ ایک بین الاقوامی مرکز طبعیات برائے لاطینی امریکا کچھ ماہ قبل کولمبیا کے صدر نے کیا اور یونیڈو بھی بائیوٹیکنالوجی [illegible]

...د بین الاقوامی مراکز بنائے جا رہے ہیں ایک ٹرسٹ میں، دوسرا بھارت ...ں۔ بائیوٹیکنالوجی میں دیکھنے میں آیا ہے کہ جنیات (Genetics) میں ...ٹسن اور کرک کے جنیاتی ضابطے (Genetic Code) سمجھنے میں جدید ...یش رفت ہوئی۔ تمام معلوم شدہ زندگی کی بنیاد جیسے ظاہر ہے یہ دافخات ...و ایک ملبہ کے تحت لانے والی نہایت ہی اعلیٰ دریافت ہے۔ نہ صرف بیسویں ...دی کی بلکہ تمام وقتوں کی۔ مجھے اس امر واقعہ پر فخر ہے کہ والٹر گلبرٹ جنہوں ...نے ۱۹۵۶ء میں میرے ساتھ نظریاتی طبعیات میں کیمبرج سے پی ایچ۔ڈی کی ...ڈگری لی تھی اور پھر جنیات کے میدان میں داخل ہو گئے۔ ان کا شمار ان ...لوگوں میں ہے جنہوں نے وہ شاندار تیکنیک دریافت کی جس سے جنیاتی ...ضابطے کا مطلب نکالا گیا اس کام پر انہیں کیمیا میں ۱۹۸۰ء کا نوبل انعام ...ملا۔ ۱۹۸۱ء میں انہوں نے ایک کمپنی Biogen کی بنیاد ڈالی جو کہ ...دوسروں کے مقابلے میں جنیاتی کاریگری سے انسولین کی تیاری کو کام میں ...لاتی ہے۔ اس میں پھر ہم اعلیٰ سائنس اور ٹیکنالوجی کے امتزاج کا مشاہدہ ...کرتے ہیں۔

یونیڈو کی ابتدائی کارروائی کا دوبارہ ذکر کر رہا ہوں۔ یونیڈو ...کے انتظامی ڈائرکٹر ڈاکٹر عبدالرحمٰن خانی ہیں جن کا تعلق الجزائر سے ...ہے۔ ٹریسٹ آنے پر ہمارے بنیادی اور اطلاقی طبعیات کے مشترکہ پروگراموں ...سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ تیسری دنیا کے لیے ...ایک یا ایک سے زیادہ بائیوٹیکنالوجی کے مراکز قائم کرنے کا وقت ...آگیا ہے۔ یونیڈو کے کہنے پر ایک مقابلے کا اہتمام ہوا جس کے نتیجے میں اٹلی، ...اسپین، بھارت، پاکستان، مصر، تھائی لینڈ اور کیوبا نے ایسے مراکز ...قائم کرنے کی پیش کش کی۔ جگہ کو منتخب کرنے کے لیے تین بین الوزارتی اجلاس ...منعقد ہوئے۔ اپریل ۱۹۸۴ء میں دہلی اور ٹریسٹ آخر کار ایک مشترکہ مرکز ...کے لیے چن لیے گئے۔

میرے خیال میں حیاتی علوم کے حالات کا سب سے اہم ایک پہلو ...یہ ہے کہ تیسری دنیا کے اتنے سارے ممالک اس بات کے خواہاں تھے کہ مجوزہ ...مرکز ان کے یہاں ہو اور اس کے لیے اپنے وسائل کی پیش کش کر رہے تھے ...اور پھر مجھے ان وزراء کے فیصلے پر افسوس ہوا جو مقابلے میں ہارنے والے ...تھے مصر، تھائی لینڈ، پاکستان اور اسپین کو اکثریتی ووٹ سے

الحاقی مرکز کا درجہ دینے پر بھی رضامند نہ ہوئے۔ ان ممالک کی اولین خواہش تھی کہ ان کو ایک ثانوی درجہ ہی مل جائے۔ تاکہ وہ اپنی مقامی کوشش کو بین الاقوامی بنانے کے فوائد میں حصہ لے سکیں۔ مجھے امید ہے کہ اس کا جلد ہی حل تلاش کر لیا جائے گا اور یہ دوسری پیش کش بھی مان لی جائے گی۔ جو نقطۂ نظر میں پیش کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ ممالک بھی جن میں سائنسی تحقیق کی معمولی سی بھی سرگرمی ہے انھوں نے بین الاقوامی سائنسی مراکز کی میزبانی کرنے میں دلچسپی کا اظہار کرنا شروع کر دیا ہے۔

اسی نسبت سے اس بات کو اجاگر کرنے کے لیے کہ عالمی بنک یا بین الاقوامی فنڈ برائے مال و زر (IMF) جیسے ادارے کیا کردار ادا کر سکتے ہیں، اس اقتباس پر غور کریں جو کہ ای۔ ایس میسن (E. S. Mason) اور آر ای۔ آشر (R. E. Asher) کی حال ہی میں لکھی ہوئی عالمی بنک کی سوانح سے لیا گیا ہے۔

> عالمی بنک کے اس میدان میں آنے سے پہلے یونیسکو کئی
> سال سے تعلیمی منصوبہ بندی پر معقول رائے دیتا آرہا
> ہے ... بعض اوقات اس رائے کے بعض حصے مان لیے
> جاتے لیکن تعلیمی منصوبہ بندی کی طرف توجہ کافی بڑھ گئی۔
> جب یہ عیاں ہو گیا کہ بعض پراجیکٹ کو عالمی بنک کی طرف
> سے مالی اعانت ملنے کے مواقع ہیں۔ "

تعلیمی منصوبہ بندی اور سائنسی زراعت کی ترقی میں امداد کے علاوہ میں یہ بھی چاہوں گا کہ عالمی بنک اپنے طور پر ترقی پذیر ممالک کو باور کرائے کہ آج کل مالی استحکام حاصل کرنے کا تیز ترین ذریعہ سائنسی بنیاد پر مبنی اعلیٰ ٹیکنالوجی کے حصول پر منحصر ہے۔ مثال کے طور پر مائکروالیکٹرانکس، کمپیوٹر سے مستفید ہونے کے علوم اور اسی طرح کے دوسرے مضامین اور ان شعبوں میں جس اہم اور بڑی سرمایہ کاری کی ضرورت ہے وہ ہے سائنسی علوم میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افرادی قوت کی افزائش۔ جس دن سے ہمارے سرمایہ کاری پر قدرت رکھنے والے (خواہ وہ ترقی پذیر ممالک کی گورنمنٹ سے منسلک ہوں یا پرائیویٹ سیکٹر سے) اس بات کو سمجھ گئے کہ ہماری معاشی نجات کا آغاز ہو گا۔

مختصراً یہ کہ ہر ترقی پذیر ملک کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے مسائل

ثیں ہیں جن کے لیے سائنسی ماہرانہ رائے کی ضرورت ہے، میں اسے شدت
محسوس کرتا ہوں کہ اقوام متحدہ کو ترقی پذیر ممالک میں سائنس کی بین الاقوامی
یت کی جائز تحریک کی قیادت کرنی چاہیے۔ یہ ضروری نہیں کہ تحقیقی ادارے
ی پذیر ممالک ہی میں واقع ہوں۔ کچھ سال پہلے سابق امریکی وزیر خارجہ ڈاکٹر
ری کسنجر نے امریکی گورنمنٹ کی جانب سے تیسری دنیا سے کئی اداروں کے
ام کا وعدہ کیا تھا جن میں ایسے ادارے بھی شامل تھے جن کو اعلیٰ ٹیکنالوجی
رسائی ہو گی۔ انہوں نے خاص کر ایک بین الاقوامی ادارہ توانائی، ایک
ن الاقوامی مرکز برائے تبادلہ، تیکنیکی اطلاعات اور ایک بین الاقوامی ادارہ
ائے صنعت و حرفت کا ذکر کیا۔ مجھے یقین ہے کہ امریکی انتظامیہ جلد ان
عدوں کو وفا کرے گی اور ہر ادارے میں مذکورہ سائنس کے حصہ کا اضافہ
رے گی۔

آخر میں قومی امداد مہیا کرنے والے اداروں کی طرف آیئے۔ ہر جگہ کے
یری اداروں سے میری گزارش ہے کہ ان کو سائنس کے فروغ کے لیے لمبی مدت
پر محیط پروگرام وضع کرنا چاہیے۔ ان کا بہت زیادہ اثر دوررس ہے جو انہیں
ضرور استعمال کرنا چاہیے۔ خصوصاً یہ دیکھنے کے لیے ان ممالک کا جن کی یہ امداد
کرتے ہیں، مناسب ڈھانچہ بن چکا ہے اور وہاں کی سائنس برادری اس
قابل ہے کہ وہ تعمیری عمل میں صحیح کردار ادا کر سکیں۔

اس بابت یہ کہا جا سکتا ہے کہ سائنس کی منتقلی کا اچھی طرح آزمودہ
طریقہ کار ایک بین الاقوامی فاونڈیشن برائے سائنس کی بنیاد ڈالنا ہے جو
کہ ترقی پذیر ممالک میں سائنس دانوں کو انفرادی گرانٹ دے۔ ان مقاصد کے
تحت ایک بین الاقوامی سائنس فاؤنڈیشن Pierre Auger, Roger Revelle
Robert Marshak اور میری تجویز پر سٹاک ہام میں ۱۹۷۲ء میں قائم کی
گئی۔ اس فاؤنڈیشن کی آج کل یہ ممالک امداد کر رہے ہیں۔ سویڈن، کینیڈا
امریکہ، مغربی جرمنی، فرانس، آسٹریلیا، ہالینڈ، بلجیم، نائیجیریا، ناروے اور
سوئٹزرلینڈ۔ اس فاونڈیشن سے ترقی پذیر ممالک کے محققین کو تحقیق کے لیے
انفرادی امداد دی جاتی ہے جو کہ ۱۰ ہزار ڈالر فی گرانٹ سے زائد نہیں ہوتی
بدقسمتی سے فاؤنڈیشن کے پاس کل فنڈ کی رقم دو ملین ڈالر سے زیادہ نہیں
اسی قسم کا کام امریکہ میں Bosch نامی تنظیم کرتی ہے جس کو امدادی
ادارے رقم مہیا کرتے ہیں۔ ان سرگرمیوں میں نیچرل سائنس داخل نہیں ہے

اور نہ ہی فنڈ میں اتنی گنجائش ہے کہ وہ سائنسی ڈھانچہ کی تعمیر میں مدد کر سکے
برانڈ کمیشن کی ٹیکنالوجی کی منتقلی کے متعلق سفارشات کو ذہن میں
رکھتے ہوئے میں نے اُن سربراہان مملکت کو جنہوں نے Cancun
summit میں شرکت کی، مندرجہ ذیل خط لکھا۔

"میں جانتا ہوں کہ ٹیکنالوجی کی منتقلی جہاں زیادہ زور
توانائی کے مسائل پر ہوگا میکسیکو میں شمال۔جنوب سربراہان
مملکت کی آئندہ میٹنگ میں زیر بحث موضوعات میں سے
ایک موضوع ہو گا۔ بدقسمتی سے زیادہ تر ترقی پذیر ممالک
ہر سطح پر سائنسی ڈھانچہ تعمیر کرنے کے لیے امداد چاہتے
ہیں اور سائنس کی منتقلی ٹیکنالوجی کی منتقلی کے ساتھ
ساتھ ہونی چاہیے۔ اگر موخر الذکر کو واقعی ہمارے
ممالک میں مضبوط ہونا ہے، شمال کی سائنسی برادری اپنی
جنوبی برادری کے پھلنے پھولنے میں مدد کر سکتی ہے اور
مجھے یقین ہے کہ وہ ایسا کرے گی، بشرطیکہ وہ اس کے
لیے تیار ہو۔"

میں نے سائنس کی منتقلی کی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے کم از کم
اتنے فنڈ کے ساتھ جتنا کہ فورڈ فاؤنڈیشن مہیا کرتی ہے (ایک سو سے دو سو
ملین ڈالر سالانہ) ایک شمال۔جنوب سائنس فاؤنڈیشن کے قیام کی تجویز دی
اس فاؤنڈیشن کا نظم ونسق دنیا کی سائنسی برادری کے ہاتھ میں ہو اور وہ بنیادی
سائنسی علوم میں تحقیق اور تحقیق میں تربیت کا بندوبست کرے۔

میری درخواست کی تائید میں سب ترقی یافتہ ممالک کے سربراہوں سے
مجھے شائستہ جواب موصول ہوئے جب کہ ترقی پذیر ممالک کے سربراہوں میں
سے صرف مسز گاندھی نے جواب دیا (یہ عدم توجہی شاید تیسری دنیا میں سائنس
کی بابت سرد مہری کی طرف ایک بار پھر توجہ دلاتی ہے) تاہم یہ کہنے کی مجھے
اجازت دیں کہ ہمیں کوئی نہ کوئی طریقہ کار تلاش کرنا ہوگا۔ خصوصاً فورڈ فاؤنڈیشن
کے اس خط کے بعد جو اس نے حال ہی میں معرض وجود میں آنے والی سائنسی
علوم میں تیسری دنیا کی اکیڈمی Third world Academy of
Sciences کو لکھا کہ فورڈ فاؤنڈیشن کی نگاہ میں اب تیسری دنیا میں
سائنسی تحقیق کی کوئی اولین اہمیت نہیں ہے۔

دوسرے شعبوں کی طرح سائنسی علوم میں بھی یہ دنیا امیر و غریب میں منقسم ہے۔ آدھا امیر تر حصہ جو کہ صنعتی شمالی اور مرکزی انتظامیہ کے تحت خطوں پر مشتمل ہے اور جس کی آمدنی ۵ کھرب ڈالر ہے۔ اس کا ۲ فیصد حصہ یعنی ۱۰۰ ارب ڈالر سے زیادہ غیر فوجی سائنسی اور ترقیاتی تحقیق پر صرف کرتے ہیں۔ باقی آدھی دنیا غریب جنوب پر مشتمل ہے جن کی اس آمدنی کا ۱/۵ حصہ یعنی کوئی ایک کھرب ڈالر ہوتا ہے جس میں سے دو ملین ڈالر سے زیادہ سائنس اور ٹیکنالوجی پر خرچ نہیں کرتی۔ امیر ممالک کے فیصد لحاظ سے ان کو ۲۰ گنا زیادہ خرچ کرنا چاہیے۔ یعنی تقریباً ۲۰۔ ارب اقوام متحدہ کے زیر انتظام سائنس اور ٹیکنالوجی پر ویانا کانفرنس جو ۱۹۷۹ء میں منعقد ہوئی اس میں غریب ممالک نے بین الاقوامی فنڈ کے لیے درخواست کی۔ تاکہ وہ اپنا سالانہ خرچ ۲۔ ارب سے ۴۔ ارب ڈالر تک بڑھا سکیں ان سے نہ ہی دو ارب کے اور نہ ہی ایک ارب کے وعدے ہوئے۔ بلکہ اس کا بھی ساتویں حصے کے جیسے ہم جانتے ہیں۔ یہ بھی کبھی محسوس نہیں کیا گیا کہ بین الاقوامی سائنس اور ٹیکنالوجی مالیاتی نظام برائے ترقی بھی مناسب وسائل کے بغیر ہے۔ اس صورت حال کا فوجی میدان سے موازنہ کریں۔ ایک نیوکلیائی آبدوز کی قیمت ۲۔ارب ڈالر ہے جب کہ دنیا کے سمندروں میں اس طرح کی ۱۰۰ آبدوز موجود ہیں۔ ایک نیوکلیر آبدوز کی قیمت سے میرے ٹریسٹ مرکز جیسے پانچ سو مراکز کی ایک سال کے لیے مالی امداد فراہم کی جا سکتی ہے۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں بیرون دریا کچھ نہیں

"تعلیم دراصل کسی سماج کی اس کی جانی بوجھی، سوچی سمجھی کوشش کا نام ہے جو وہ اس لیے کرتی ہے کہ اس کا وجود باقی رہ سکے اور اس کے افراد میں یہ قابلیت پیدا ہو کہ بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ سماجی زندگی میں بھی مناسب اور ضروری تبدیلی پیدا کر سکیں۔"

(ڈاکٹر ذاکر حسین خان)

سلطان التتمش کے دور کا

اودھ کا ایک ہندو راجا

نذیر احمد*

سلطان التتمش کے عہد میں اودھ کا ایک ہندو راجا 'ہردودل' نامی تھا۔ اس کی سلطان ناصر الدین محمود سے جنگ ہوئی اور اس جنگ میں وہ مارا گیا۔ اس راجا کے ذکر سے سیاسی تاریخیں خالی ہیں، اس کا تنہا ماخذ دیوان سراجی خراسانی ہے جس کے دو نسخے راقم حروف کی توجہ سے معلوم ہوئے اور ان کی مدد سے راقم نے اس دیوان کا ایک انتقادی متن ۱۹۷۲ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع کیا۔ سراجی دہلی سلطنت کا قدیم ترین صاحب دیوان شاعر ہے۔ دراصل ادبی تصانیف کا استعمال تاریخ کے بنیادی ماخذ کے طور پر ہونا چاہیے، محض دیوان سراجی سے اس دور کی سیاسی و تمدنی تاریخ کے نہ جانے کتنے تاریک گوشے روشن ہوتے ہیں، سلطان قطب الدین ایبک اور سلطان التتمش کے دور کا ایک امیر ملک عز الدین بختیار احمد تھا، سراجی نے اس کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے، حال ہی میں راقم السطور نے اس قصیدے کی روشنی میں ملک بختیار کی شخصیت کا تعین کیا تھا۔ سراجی کا یہ قصیدہ اس نامور امیر کی زندگی کا ایک لحاظ سے تنہا ماخذ قرار پاتا ہے۔ اتفاق سے چند سال پہلے امیر عز الدین بختیار کا ایک کتبہ مہرولی میں برآمد ہوا' دیوان سراجی ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا اور کتبہ ۱۹۷۳ء میں مکشوف ہوا۔ مشہور محقق ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی نے اس کتبے پر ایک نہایت دلچسپ یادداشت (Epigraphica Indica - تمہ عربی فارسی ۱۹۸۳ء) میں شائع کی۔ ان کی یادداشت کی بنیاد طبقات ناصری اور تاج المآثر کے وہ اشارے ہیں جو عز الدین بختیار کے بارے میں ملتے ہیں لیکن موصوف کو دیوان سراجی کے اس قصیدے کا حال معلوم نہ تھا جس میں سراجی نے امیر عز الدین بختیار کی شخصیت کے بعض گوشے اجاگر کیے تھے۔ اس بنا پر راقم الحروف نے ایک مختصر مقالہ اسلام آباد کے ایک مشہور مجلہ' دانش شمارہ ۹ میں شمس الدین التتمش کے عہد کا ایک نامور امیر "عز الدین بختیار" کے عنوان سے شائع کیا۔ اس گزارش کا مقصد اس اہم ضرورت کی طرف اشارہ ہے کہ شعرا کے دواوین سے سیاسی اور ثقافتی تاریخ میں مدد لینی چاہیے۔ اس مقصد کے تحت دیوان سراجی میں مذکور ایک اور تاریخی شخصیت کے بارے میں مختصر سی گزارش پیش کی جاتی ہے اور وہ اودھ کا ایک راجا ہردودل نامی تھا۔

ہردودل کے ذکر سے تاریخیں خالی ہیں' وہ اودھ کا حکمراں تھا اور دیوان سراجی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس راجا نے کسی آویزش کے موقع پر ہزاروں مسلمانوں کو تہ تیغ کر ڈالا تھا، پھر سلطان ناصر الدین نے اس پر حملہ کیا۔ طبقات ناصری کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان التتمش نے اپنے بڑے بیٹے سلطان ناصر الدین محمود کو اودھ کا مقطع بنایا تھا۔ وہاں اس کو بغاوتوں کا سامنا ہوا، باغیوں میں ایک 'برتوہ' نامی تھا جس نے بہت زیادہ مسلمان سپاہیوں کو قتل کر ڈالا تھا۔ منہاج سراج "طبقات ناصری" میں لکھتا ہے:

> سلطان ناصر الدین محمود پسر مہتر سلطان شمس الدین بود
> و او پادشاہ فرزانہ، عاقل و بخرد و در غایت جلادت و
> مبارزت و بذل و احسان بود، و اول اقطاعی کہ سلطان او را
> فرمود خطۂ ہانسی بود، بعد از مدتی در شہور ثلاث و عشرین و ستمائۃ

---

* سابق صدر شعبۂ فارسی، ڈین فیکلٹی آف آرٹس، اے ایم یو
سر سید نگر، علی گڑھ

خطۂ اودھ بدو مفوض گشت و آں پادشاہزادہ دراں دیار آثار پسندیدہ بسیار نمود و غزوات بسنت کرد چنانچہ ذکر او بمرجولیت و شہامت در عرصۂ ہندوستان منتشر گشت و برتوہ لعین را کہ صد و بیست و اند ہزار مسلمان بر دست و تیغ او شہادت یافتہ بودند برانداخت و بدوزخ فرستاد' کفار متمردان را کہ در اطراف زمین اودھ بودند قمع و قہر کرد و جماعتی را منقاد گردانید و از اودھ عزیمت لکھنوتی کرد"

(ج اول طبع کامل ص ۲۵۳)

[سلطان ناصر الدین محمود سلطان شمس الدین کا بڑا بیٹا تھا وہ بڑا ہوشیار' عاقل اور دانا تھا اور تیزی' بہادری' سخاوت اور احسان کے لحاظ سے ممتاز تھا' سب سے پہلے وہ ہانسی کا اقطاع دار مقرر ہوا' کچھ عرصے کے بعد ۶۲۴ھ میں اودھ کا علاقہ اس کے سپرد ہوا اور شاہزادے نے یہاں عمدہ خدمات انجام دیں اور بڑی لڑائیاں لڑیں' اس کی وجہ سے اس کی جوانمردی اور اولوالعزمی کا شہرہ پورے ہندوستان میں ہوگیا اور برتوہ لعین کو جس نے ایک سو بیس ہزار سے زیادہ مسلمانوں کو تہ تیغ کر ڈالا تھا' اکھاڑ پھینکا اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا اور اودھ کے اطراف میں باغیوں کا گروہ تھا اس کا قلع قمع کردیا اور ان میں کی بڑی جماعت مطیع بھی ہوگئی پھر وہ اودھ سے لکھنوتی آیا۔

یہ تفصیل اس قصیدے کے مشمولات پر جو سراجی نے سلطان محمود کی تعریف میں لکھا تھا' پوری اترتی ہے' سوائے باغی کے نام کے' جو قصیدے میں ہر دو دل ہے اور وہی ردیف ہے' یعنی اس کی قرات میں کسی قسم کا شبہ نہیں' تاریخوں میں برتوہ کی مختلف صورتیں آئی ہیں' قیاس یہ ہے کہ یہ ہر دو' کی بگڑی ہوئی صورت ہے' قصیدے میں دریائے سرو ہے جس کی موجودہ شکل سرجو ہے اور وہ اودھ کے خطے میں بہتا ہے۔ بہرحال بلاشبہ ہر دو دل اودھ کے خطے کا فرماں روا تھا اور وہی شخصیت ہے جس کا ذکر طبقات ناصری میں ہوا ہے۔ اب میں سراجی کا قصیدہ مع ترجمے کے پیش کرنا چاہتا ہوں:۔

اے زدہ یک ترک تو برہم سپاہ ہر دو دل[1]
رفت برگردوں ز شمشیر تو آہ ہر دو دل

اے وہ شخص جس کے ایک ترک نے ہر دو دل کے سپاہیوں کو درہم برہم کردیا۔ تیری تلوار (کی مار) سے ہر دو دل کی فریاد کی آواز آسمان تک گئی۔

بر لب آب سرو دریائے قلزم بر کشاد
چشمۂ تیغ تو' از خون سپاہ ہر دو دل[2]

دریائے سرجو کے کنارے خون کا دریا بہا دیا۔ تیری تلوار کے چشمے نے ہر دو دل کے سپاہیوں کے خون سے۔

بعد ازیں خاک افگند در دیدہ جیحون وابر
آب ہر دو چشم' چون خون سپاہ ہر دو دل

اس کے بعد ہر دو دل کی دونوں آنکھوں نے خون کے اتنے آنسو بہائے کہ دیدہ جیحوں اور دیدہ ابر ان کے سامنے گرد ہوگئے۔

بدسگال ہر دو دل آمد بجاں از بیم تو
آنکہ از دل بیش ازیں شد نیکخواہ ہر دو دل

تیرے خوف کی وجہ سے وہ شخص جو ہر دو دل کا خیرخواہ تھا اب دل و جان سے اس کا بدخواہ ہوگیا۔

ہر دو دل گر آب و جاہی داشت بنگر چون برفت
آبروی خنجر تو آب و جاہ ہر دو دل

---

[1] دیوان سراجی ص ۲۱۷ - ۲۱۹

[2] ترجمہ میں پہلے دوسرے مصرعے کا ترجمہ پڑھا جائے۔

تیری تلوار کی آب سے ہر دو دل کی عزت و آبرو اگر واقعی
اس کی وہ تھی بھی، تو دیکھ کر وہ کیسی ختم ہوئی ۔

خسرو رستم تنی در راہ کین نگذاشتی
بیژن دل خستہ را در قعر چاہ ہر دو دل
ہر دو دل کی قید سے بیژن خستہ دل کو آزاد کرا لیا، تجھ جیسے
رستم تن سلطان کا کام ہے ۔

فتح رستم وار کردی و گواہ حال تست
آب زرد بیژن و روی سیاہ ہر دو دل
رستم کی طرح تم نے فتح کیا، اور اس فتح کی شہادت
بیژن کی خستہ حالی اور ہر دو دل کی روسیاہی سے فراہم
ہوتا ہے ۔

زین سپس از عکس روی و خون ہندو تا بحشر
زعفران و گل دمد در رزمگاہ ہر دو دل
اس کے بعد ہر دو دل کے میدان جنگ میں بیژن کے چہرے
کی زردی اور دشمن کے خون کی سرخی سے بالترتیب زعفران
اور گلاب کے پھول کھلیں گے ۔

بعد ازیں در بزم شاہاں مطربان خوش نوا
پردہ ہا سازند بر دستان واہ ہر دو دل
اس کے بعد بادشاہوں کی مجلسوں میں ہر دو دل کے واقعات
سے خوشنوا مطرب نئے نئے نغمے ایجاد کریں گے ۔

آفتاب چتر شہ چو بر دمید از برج فتح
در محاق مدبری افتاد ماہ ہر دو دل
بادشاہ کے چتر کا آفتاب جب فتح کے برج سے نکلا
تو ہر دو دل کا چاند مدبری کے گرہن میں آگیا ۔

بعد ازین از گوشہ ہای جنگل ہندوستان
بر سر گردون رسد واحسرتاہ ہر دو دل
اس کے بعد ہندوستان کے جنگلوں کے گوشے گوشے سے ہر دو دل
کے نالہ و فریاد آسمان تک پہنچیں گے ۔

ہر دو دل زین پس نماند ور بماند نگذرد
جز برنج و درد و حسرت، ساہ و ماہ ہر دو دل
ہر دو دل اس کے بعد زندہ نہیں رہ سکتا اور اگر رہتا ہے
تو اس کی زندگی رنج، غم اور حسرت اور آہ میں گزرے گی۔

شد زبیم تیغ شہ در صلب ناپاک و پلید
از پی قطع نسب چون سنگ، باہ ہر دو دل
بادشاہ کی تلوار کے خوف سے ہر دو دل کا اسی طرح قطع
نسب ہو جائے گا جیسے پتھر کا ۔

ہر دو دل گر رسم و راہی داشت، از شمشیر شاہ
تا قیامت مندرس شد رسم و راہ ہر دو دل
ہر دو دل کی اگر کوئی رسم و راہ تھی تو بادشاہ کی تلوار کی وجہ
سے قیامت تک کے لیے مٹ گئی ۔

بخت نابیدار او در انتباہ آمد، چنانک
اعتبار عالمی شد انتباہ ہر دو دل
ہر دو دل کی بدنصیبی کا یہ عالم ہوا کہ وہ ساری دنیا کے لیے
درس عبرت بن گئی ۔

گر بماند ہر دو دل زین پس، مدد سازد فلک
آب دریا را زچشم پر سیاہ ہر دو دل
اگر اس کے بعد بھی ہر دو دل باقی رہتا ہے تو آسمان اس کی
آنکھوں کے پانی سے دریا کی روانی میں مدد دے گا۔

در بمیر دہردد دل دفانی اندر بزمہا
چنبر دف سازد از پشت دوتاہ ہردودل
اگر ہردودل باقی رہ گیا تو دف بجانے والے مجلسوں میں اس
کی دہری پیٹھ سے چنبر اور دف بنائیں گے۔

تو پناہ عالمی و باسپاہ تو نماند
جنگل ہشتاد فرسنگی پناہ ہرددل
تو اے ممدوح! تو دنیا کو پناہ دینے والا تیری سپاہ
کی وجہ سے اسی کوس کا جنگل اب ہردودل کی پناہ گاہ نہیں رہ گیا۔

شد چنان حالش تبہ کاندر جہاں ہرگز مباد
ہیچکس را حال چون حال تباہ ہرددل
ہردودل کا حال ایسا ابتر ہو گیا کہ خدا ایسے ابتری کے دن
کسی کو نہ دکھائے۔

شہریارا از معالی دہ سراجی را بلطف
کرۂ فربہ شدہ از آب وکاہ ہردودل
اے شہریار، اپنی جوانمردی اور مہربانی سے سراجی کو ایک
ایسا جوان گھوڑا اعطا کر جس نے ہردودل کے یہاں پرورش پائی ہو۔

اسپکی کردہ چرا در جنگل ہندوستان
کردہ پہلو ہا پر از آب وگیاہ ہردودل
ایسا گھوڑا جو ہندوستان کے جنگلوں میں چرا ہو، اور جس
نے ہردودل کے پانی اور چارہ سے اپنا پہلو بھرا ہو۔

وین بچشم ہمت شاہ جہاں اندک بود
چون غنیمت داد بسیارش آنہ ہردودل
اور یہ بادشاہ کی بخشش کے پیش نظر بہت حقیر سی بات ہے،
اس لیے کہ ہردودل کے یہاں سے اس کو بہت سا مال غنیمت ملا ہے۔

تا توان گفتن کہ از جرم ابلیس لعین
بگذری نبود گناہی چون گناہ ہرددل
جب تک یہ کہہ سکتے ہوں کہ جب ابلیس لعین کے گناہ معاف
ہو سکتے ہیں اس لیے کہ اس کے گناہ ہرددل کے گناہ کے برابر
نہیں (یعنی ہمیشہ ہمیشہ)

صد چنین فتح دگر بادت ز لطف کردگار
ہمدرین تمثیل و تشکل و اشتباہ ہرددل
خدا ہردودل کی طرح کی سیکڑوں فتح سے تجھ کو سرفراز
کرے۔

آنگون شمشیر آتش بار گوہر دار شاہ
دین فزای شرع باد و کفر کاہ ہردودل
بادشاہ کی آبدار، آتش بار، گوہر دار تلوار شرع و دین
کی پاسدار اور ہردودل کے کفر کو ختم کرنے والی ہے۔

دیوان سراجی کے اس قصیدے کی اہمیت کئی اعتبار سے ہے۔

۱۔ اس سے تاریخ کے ایک تاریک گوشے پر حقایق کی روشنی پڑتی ہے۔

۲۔ ممکن ہے کہ میرا یہ قیاس کہ طبقات ناصری میں مذکور باغی ہردودل نہ ہو بلکہ کوئی دوسرا ہو، لیکن اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ اس سے تحقیق کی مزید راہ کھلتی ہے۔

۳۔ اس کی وجہ سے کم از کم یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ شعرا کے دیوان اور دوسری ادبی تصانیف تاریخ وتہذیب کے اہم مآخذ کے طور پر مطالعے میں آنے چاہیں۔

۴۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان کی تاریخ وتہذیب کو سمجھنے اور پرکھنے میں فارسی کا کتنا اہم رول رہا ہے اور اس زبان کی طرف جو عام بے توجہی برتی جا رہی ہے وہ اپنی تاریخ وتہذیب سے عدم توجہی کے مترادف ہے۔

مجھے اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ یہ مختصر مقالہ زیادہ تحقیقی اور فنی ہو گیا ہے لیکن کبھی کبھی ان سے سود مند نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ بس:

تازہ خواہی داشتن گر داغہای سینہ را　　گاہ گاہی باز خوان این قصۂ پارینہ را

خطبۂ استقبالیہ

اسرار احمد

[یہ خطبہ سینٹر فار پروموشن آف سائنس کے مدارس کے اساتذہ کے سائنسی تربیتی/تعارفی کورس ۲۶ - ۳۱ مارچ ۱۹۸۸ء کے افتتاحی اجلاس میں پیش کیا گیا۔]

عالی جناب وائس چانسلر صاحب، اساتذۂ کرام اور حضرات

میرے لیے یہ بڑی خوش نصیبی کی بات ہے کہ مرکز فروغ سائنس کی جانب سے اور خود اپنی جانب سے آپ حضرات کو خوش آمدید کہوں۔ مزید خوش نصیبی کی بات یہ ہے کہ آج مجھ جیسے سائنس کے طالب علم کو ایک ایسی مجلس کے سامنے اظہار خیال کا موقع ملا ہے جس کے شرکاء میں سے بیشتر حضرات اُس ابدی علم کے حامل ہیں جو ساری انسانیت کے لیے مشعل راہ ہے۔

مرکز فروغ سائنس، جس نے اس تربیتی کورس کا اہتمام کیا ہے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ترمیمی ایکٹ ۱۹۸۱ء کے سیکشن (c) (2) 5 کے تحت ۱۹۸۵ء میں قایم ہوا۔ بنیادی طور پر اس مرکز کے قیام کی غرض وغایت ہندوستانی مسلمانوں پر سائنسی علوم کی تحصیل و تخلیق کی اہمیت کو واضح کرنا، انہیں اس طرف راغب کرنا اور مسلم زیر انتظام تعلیمی اداروں بشمول دینی مدارس میں سائنسی تعلیم کو فروغ دینے اور اسے بہتر بنانے کی کوشش کرنا ہے۔ اپنے قیام کے وقت سے اب تک یہ مرکز گو ناگوں مشکلات کے باوجود مسلم اسکولوں کے اساتذہ کے لیے آٹھ تربیتی کورسوں کا انعقاد کر چکا ہے جو توقع سے زیادہ کامیاب ہوئے۔ اس کے علاوہ مرکز نے دو بنیادی اہمیت کی حامل کانفرنسوں کا بھی انعقاد کیا۔ ان میں سے ایک کانفرنس جنوری ۱۹۸۲ء میں منعقد ہوئی تھی جس میں ملک کے چیدہ چیدہ مسلم سائنس داں اور ماہرین تعلیم نے شرکت کی اور جنہوں نے مرکز کے منصوبوں پر غور و خوض کے بعد اسے زیادہ مفید اور قابل عمل شکل دی۔ دوسری کانفرنس جس کا موضوع "دینی مدارس اور سائنسی تعلیم" تھا گذشتہ سال مارچ میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں پچاس سے زیادہ علمائے کرام اور ماہرین تعلیم نے شرکت کی۔ اس میں متفقہ طور پر جو تجاویز منظور ہوئیں وہ یہ ہیں:

۱۔ کانفرنس کے جملہ شرکاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ریاضی اور سائنس کو مدارس کے نصاب میں داخل کیا جائے۔

۲۔ کانفرنس اس توقع کا اظہار کرتی ہے کہ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مستقبل میں عربی مدارس کو جو دشواریاں پیش آئیں گی، ان کے ازالے کے لیے مرکز فروغ سائنس ہر ممکن تعاون دے گا۔

ڈپارٹمنٹ آف فزکس، اے۔ایم۔یو، علی گڑھ - یو۔پی

۳۔ کانفرنس کو یہ توقع ہے کہ مرکز فروغ سائنس مدارس کے ارباب حل و عقد کے مشورے سے سائنسی نصاب کی تیاری اور اس کے اساتذہ برائے سائنس کے لیے تربیتی کورس کا انعقاد کرے گا۔

۴۔ کانفرنس کا یہ خیال ہے کہ مرکز فروغ سائنس مسلم معاشرہ بالخصوص اس کے تعلیمی اداروں میں سائنسی طرز فکر کے فروغ کے لیے ہر ممکن اقدام کرے گا۔

مدارس کے اساتذہ کے لیے یہ تربیتی کورس کانفرنس میں منظور شدہ تجاویز کے تحت ہمارا پہلا عملی قدم ہے۔

ہمیں اس بات پر بڑی مسرت ہے کہ مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کی ہماری آواز پر ملک کے مدارس کی اکثریت نے لبیک کہا۔ اس کے ایک واضح ثبوت میں ہم یہ بتانا چاہیں گے کہ اس سلسلے میں ہمارے وائس چانسلر صاحب کو مدارس کی جانب سے بے شمار خطوط موصول ہوئے ہیں جن میں اس پروگرام کے شروع کرنے پر انہیں دلی مبارکباد پیش کی گئی ہے اور گہری خوشی کا اظہار کیا گیا ہے۔ ہمارے اس پروگرام کی عام پسندیدگی کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس تربیتی کورس میں شرکت کے لیے ہمیں ۱۲۳ مدارس کے اساتذہ کی درخواستیں موصول ہوئیں۔ افسوس کہ وسائل کی کمی کے باعث ہم صرف چالیس اساتذہ کو ہی شرکت کے لیے مدعو کر سکے۔

البتہ ہماری مذکورہ بالا کانفرنس کی کامیابی کے بعد ایک دو صدائیں ایسی بھی سننے میں آئیں جن میں ہمارے پروگرام پر شک و شبہ کی بازگشت ہے اور اس اندیشے کا اظہار ہے کہ سائنسی تعلیم سے مدارس میں الحاد پھیلے گا۔ ہمارے خیال میں اس شک و شبہ اور اندیشے کی بنیاد یہ غلط فہمی ہے کہ سائنس مغربی تہذیب کی دین ہے۔ اس لیے اس کی فکری اساس لازماً غیر اسلامی ہے۔ اس موقع پر ہم اس حقیقت کو پر زور الفاظ میں واضح کرنا چاہیں گے کہ سائنس جو ایک تجرباتی علم ہے، دراصل اسلامی تہذیب کی دین ہے۔ اس کی ابتدا آٹھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے ہاتھوں ہوئی جنہوں نے اسے بطور علوم عقلیہ کی ایک شاخ کے کافی آگے بڑھایا۔ مغربی تہذیب کا کارنامہ محض یہ ہے کہ اس نے اپنی عرق ریزیوں سے سائنس کو وہ تناوری بخش دی کہ آج خود اس کے موجد اس کی شناخت سے قاصر ہیں؛ سنیے! اس بابت بریفالٹ کیا کہتا ہے:

> "جسے ہم لوگ سائنس کہتے ہیں، اس کی بنیاد مشاہدات، تجربات اور ناپ تول پر ہے اور ان نئے طریقوں سے یورپ والوں کو مسلمانوں نے متعارف کرایا۔ اسلامی تہذیب کا سب سے گراں قدر عطیہ موجودہ دور کی سائنس ہے۔"

بریفالٹ نے جو کچھ کہا ہے وہ ایک تاریخی حقیقت کا اظہار ہے۔ مسلمان حکماء کے نزدیک علم کے حصول میں تجربات کی کیا اہمیت تھی، اس کا اندازہ نویں صدی عیسوی کے مشہور کیمیا داں جابر بن حیان کے ان اقتباسات سے ہوتا ہے:۔

> "کیمیا میں سب سے ضروری بات تجربہ کرنا ہے۔ جو شخص اپنے علم کی بنیاد تجربے پر نہیں رکھتا، وہ ہمیشہ غلطی کرتا ہے۔ پس اگر تم کیمیا کا صحیح علم حاصل کرنا چاہتے ہو تو تجربوں کو لازم سمجھو! اور صرف اسی علم کو صحیح جانو جو تجربے سے ثابت ہو جائے۔"
>
> "ایک کیمیا داں کی عظمت اس بات میں نہیں ہے کہ اس نے کیا کچھ پڑھا ہے بلکہ اس میں ہے کہ اس نے کیا کیا تجربے کے ذریعے ثابت کر دکھائے ہیں۔"

کتنے افسوس کا مقام ہے کہ تاریخ پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ سائنس اساسی طور پر اسلامی تہذیب کا ورثہ ہے مگر ہم میں سے چند ہیں کہ اپنے اس قیمتی ورثے کی شناخت سے ڈر رہے ہیں اور اس خوف سے کانپے جا رہے ہیں کہ سائنس کی

ترویج سے مسلمانوں کے عقائد میں خلل آجائے گا اور ان کی تہذیب تباہ ہو جائے گی۔

اس وضاحت کے بعد کہ سائنس مسلمانوں کے لیے کوئی اجنبی شے نہیں ہے ہم مختصراً یہ بتانا چاہیں گے کہ مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کیوں ضروری ہے۔ لیکن اس سے پہلے یہ امر واضح کر دینا مناسب معلوم ہوگا جب ہم مدارس میں سائنسی تعلیم کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم وہاں سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے خواہاں ہیں یا ان مدارس کو سائنسی تحقیق کا مرکز بنانا چاہتے ہیں۔ بلکہ محض یہ ہے کہ مدارس کے طلباء ہائی اسکول یا زیادہ سے زیادہ انٹرمیڈیٹ سطح کی سائنسی تعلیم حاصل کریں۔ اس لیے کہ دورِ حاضر کو سمجھنے کے لیے سائنس اور سائنسی طرز فکر سے واقفیت ضروری ہے۔ یہ نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی ضروری کہ ہر فرد سائنس داں ہو۔ لیکن سائنسی انقلاب نے زمانے کو جو رُخ دے دیا ہے اس کے پیش نظر یہ جاننا یقیناً ضروری ہے کہ سائنس کس حد تک انسانی زندگی اور سماج پہ اثر انداز ہو رہی ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب مبادیات سائنس سے واقفیت ہو۔

ہندوستان میں مسلم زیر انتظام عصری تعلیمی اداروں کے مقابلے میں دینی مدارس کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر صرف صوبۂ یو۔پی میں ہی ایسی دینی درس گاہوں کی تعداد تخمیناً پانچ سو کے قریب ہے جہاں درجہ آٹھ یا اس سے اونچی سطح کی تعلیم دی جاتی ہے اور جن میں دو سو سے لے کر چند ہزار تک طلباء زیر تعلیم ہیں۔ اس کے برخلاف مسلم ہائی اسکولوں اور کالجوں کی تعداد تین سو سے بھی کم ہے۔ مزید ان عصری تعلیمی اداروں میں مسلم طلباء کی تعداد اوسطاً پچاس فیصد سے زیادہ نہیں۔ کم و بیش یہی صورت حال صوبہ بہار کی ہے۔ بلکہ وہاں یہ دینی درس گاہوں کی تعداد مسلم عصری اسکولوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی ہے۔ چونکہ سرکاری اور غیر مسلم عصری تعلیمی اداروں میں عموماً مسلم طلبا کی تعداد ملک میں مسلم آبادی کے تناسب سے کافی کم پائی جاتی ہے۔ اس لیے یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ مسلم خواندگی کا کم سے کم پچاس فیصد دینی تعلیمی اداروں کا مرہون منت ہے۔

بات اتنے پر ہی نہیں ختم ہوتی جونیر ہائی اسکول اور ہائی اسکول میں داخل ہونے والے مسلم طلباء کی اکثریت دینی مکاتیب کی راہ سے آتی ہے۔ ان مکاتیب میں ریاضی اور سائنس کی تعلیم پر کوئی زور نہیں دیا جاتا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مکاتیب کے مدرسین کو جو زیادہ تر دینی مدارس کے فارغ ہوتے ہیں ان مضامین سے واقفیت نہیں ہوتی۔ نتیجتاً مکاتیب کی راہ سے آنے والے مسلم طلباء یا تو خود کو کلاس میں کمزور پاکر تعلیم سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں یا گھسٹتے ہوئے چلتے ہیں۔ اور جیسے ہی موقع ملا ان مضامین بالخصوص ریاضی سے چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں۔

ان حقائق کی روشنی میں اور اس حقیقت کے پیش نظر کہ ملک میں ایک سائنسی انقلاب برپا ہو چکا ہے اور جس کمیونٹی نے اس انقلاب سے چشم پوشی کی اس کا مقدر پسماندگی کے علاوہ اور کچھ نہ ہوگا۔ ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ دینی مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج ہو۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس دور کے کسی بھی میدان میں چاہے وہ زراعت ہو، صنعت و حرفت ہو، بزنس ہو، انڈسٹری ہو یا سروس، سائنس سے آراستگی کے بغیر دلخواہ کامیابی محال ہے۔

ہمارا یہ تربیتی کورس صرف ایک ہفتے کا ہے، اس کی ایک وجہ جہاں مالی وسائل کی کمی ہے وہیں یہ بھی ہے کہ ہم اس کورس کے تجربے سے آئندہ ہونے والے طویل مدتی کورسوں کو زیادہ بامعنیٰ اور مفید بنانا چاہتے ہیں۔ خدا کے فضل سے حال ہی میں ہمیں تھرڈ ورلڈ اکیڈمی آف سائنس کی جانب سے اتنی مالی امداد ملی ہے کہ ہم اگلا کورس چار سے چھ ہفتے تک کا کر سکیں۔ اس کا اعلان انشاء اللہ جلد ہی کیا جائے گا۔

یہ کورس اس لحاظ سے تاریخی اہمیت کا حامل ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کی علمی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے جب دینی مدارس کے اساتذہ کے لیے سائنس کے ایک تربیتی کورس کا انعقاد ہوا۔ ہم اپنے وائس چانسلر جناب سیّد ہاشم علی صاحب کے انتہائی ممنون ہیں کہ انہوں نے اس پروگرام میں گہری دلچسپی لی جس کے بغیر اس کورس کا انعقاد ممکن نہ ہوتا۔

اپنی گفتگو ختم کرنے سے پہلے میں اپنے رفقاء کار ڈاکٹر سید ابوالہاشم رضوی، ڈاکٹر فرمان مجیب اور اپنی جانب سے آپ تمام حضرات کا اس پروگرام میں شرکت کے لیے شکریہ ادا کرنا چاہوں گا۔ بالخصوص ہم وائس چانسلر صاحب کے تہ دل سے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے عدیم الفرصتی کے باوجود اس کورس کا افتتاح کرنا قبول فرمایا۔

اسلام اور سائنس

شبیر احمد خاں غوری

میں یہ تو نہیں کہوں گا — اور کہا بھی نہیں جا سکتا — کہ اسلام اور سائنس عین یک دیگر ہیں لیکن اس حقیقت باہرہ کا بھی کمال اعتماد کے ساتھ اظہار کرنا ہوگا کہ سائنسی علوم کا حاصل کرنا اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اس کے اساسی تصورات کا منطقی مقتضا ہیں۔

الف) اسلام کی بنیادی تعلیم

اسلام کی بنیادی تعلیم یہی ہے کہ

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔

لیکن کیا یہ "ایمان باللہ" اور "ایمان بالرسول" بس دو تکوینی حقیقتیں ہی ہیں جن کی انسان کو اپنے اس فطری جذبہ عبودیت کی آسودگی کے لیے حاجت ہے جو مخلوق کو اپنے خالق کے تئیں ہوتا ہے اور اسی طرح جو اس فطری جذبۂ عقیدت کی تشفی کے لیے درکار ہے جو ایک رہرو صراط مستقیم کو اپنے ہادی و پیشوا سے ہوتی ہے؟ نہیں! یہ تکوینی حقیقتوں کی طرح تشریعی حقایق بھی ہیں اور ان کے تشریعی پہلو پر ذمہ دارانہ غور و فکر انسان کی فلاح معاد کے ساتھ صلاح معاش کے لیے ناگزیر ہے، بالخصوص جب کہ پچھلی مذہبی برادریوں کے علی الرغم اسلام نے "لا رھبانیۃ فی الاسلام" کا اعلان کر کے ترک دنیا و فرار عن الحیاۃ کی بیخ کنی کر دی اور اس کے بجائے ایک ایسے متمدن سماج کی بنیاد ڈالی جس کے ترقی پسند تقاضے لمحہ بہ لمحہ احتساب کائنات کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ اس بات کی مزید توضیحی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ سردست اسلام کے اساسی تصورات:

(ب) اسلام کے اساسی تصورات

۱۔ اسلام کی آئیڈیالوجی

ہر نظام فکر و عمل کا بنیادی نظریہ ہوتا ہے، جس کی ساحت قدس مناظرانہ قیل و قال اور متکلمانہ موشگافیوں سے کہیں بلند و برتر ہوتی ہے۔ اس کی جلالت قدر صرف اسی بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ اس کی کیفیت واقعی کی روشنی میں اس کے پیروؤں کے لیے ایک منظم و متمدن معاشرے کے رہنما اصول منضبط کیے جائیں۔

اسلام کی بھی ایک آئیڈیالوجی ہے جس کی رو سے خلاق کائنات نے انسان کو نعمت وجود (تخلیق) سے نوازنے کے بعد سب سے پہلے "علم اسماء" کی دولت سے مالا مال کیا اور یہ وہ دولت تھی جس سے ملائکہ بھی تہی دامن تھے۔ جیسا کہ قرآن حکیم کہتا ہے۔

وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ
فَقَالَ اَنْبِئُوْنِيْ بِاَسْمَاءِ هٰٓؤُلَاءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ
قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ

سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی بورڈ الہ آباد - دودھپور - علی گڑھ - یو۔پی۔

اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ

"اور اس نے (اللہ تعالیٰ نے) آدم کو سب (چیزوں) کے نام سکھائے، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان کے نام بتاؤ۔ انھوں نے کہا تو پاک ہے، جتنا علم تو نے ہمیں بخشا ہے، اس کے سوا ہمیں کچھ معلوم نہیں، بے شک تو دانا (اور) حکمت والا ہے۔"

اسی آئیڈیالوجی کا نتیجہ تھا کہ اسلام نے پہلے ہی دن سے "عقلیت" کی اہمیت پر زور دیا۔ قرآن اپنے مخاطبین سے عقل و خرد اور فہم و تدبر کے استعمال کا بار بار مطالبہ کرتا ہے: **افلا تعقلون افلا یتدبرون اور اولم یتفکروا** اس کی دعوت کا عام جز ہے۔ اسی معقولیت پسند تعلیم کا نتیجہ ہے کہ وہ کورانہ تقلید کو جو امم ماضیہ میں عام تھی، شرک سے تعبیر کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن پچھلی امتوں کے بارے میں کہتا ہے:

"اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ"

"انھوں نے اپنے احبار (علمائے یہود) اور راہبوں کو اللہ کے سوا خدا بنا لیا۔"

ان مدعیان علم و حکمت نے خدا کے بندوں کو اوہام باطلہ کا شکار بنا رکھا تھا، جن کے بار گراں سے ان کی مضطرب انسانیت کچلی جا رہی تھی مگر راہِ مفر نہ پاتی تھی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا انسانیت پر بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اس کو اپنے ہی بنی نوع کی غلامی سے آزاد کیا۔ قرآن کہتا ہے:

"وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ"

"اور نبی اُن کے اوپر سے ان کا بوجھ اور ان پر جو قیدیں تھیں، اُتارتے ہیں۔"

۲۔ معاشرہ کی طبقہ بندی

عدیم الطبقات معاشرہ (Classless Society) صحیح معنوں میں

ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنیٰ نہ ہوا

کا مصداق ہے۔ اگر کوئی سماج اپنے افراد کی اور اگر کوئی ملک اپنے باشندوں کی مساوات کا دعویٰ کرے تو اُن کے یہ کھوکھلے دعوے ایک فلک شگاف قہقہہ سے زیادہ کسی اعتناء کے مستحق نہیں ہیں۔ پچھلے زمانہ میں طبقاتی امتیاز اونچے نیچے خاندان کی بنیاد پر روا رکھا جاتا تھا، آج دولت و افلاس کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ اسلام اپنی جمہوریت نوازی و شورائیت کے باوجود اس قسم کے ناممکن العمل دعوے نہیں کرتا۔ اس کے یہاں بھی طبقاتی امتیاز ہے مگر اس کی اساس خاندانی نجابت یا دولت و ثروت پر نہیں ہے بلکہ صرف "دانائی و نادانی" کے اصول پر ہے۔ "جاننے والوں" کی ایک جماعت ہے اور "نہ جاننے والوں" کی دوسری۔ اور دونوں جماعتیں نابرابر ہیں۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ

"کہہ دیجیے کہ کیا جو لوگ جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے دونوں برابر ہیں؟"

اور "جاننے والوں" میں بھی فرق مراتب ہے اور اس طبقاتی جماعت بندی میں سب سے بلند مرتبہ "علماء" کو حاصل ہے۔ کیوں کہ "خوف و خشیت الٰہی" جو "تقویٰ" کا دوسرا نام ہے، انھیں کا وصف ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے

"اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا"

"بے شک اللہ کے بندوں میں سے علماء ہی اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔"

اور اسی خوف و خشیتِ الٰہی (یا تقویٰ) سے اتصاف کے مراتب افراد کے شرف و کرامت اور عزت و عظمت کے پیمانے ہیں اور اس طرح معاشرے میں سب سے زیادہ اشرف و اکرم وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی اور اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ

"تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہے۔"

اور یہی وجہ ہے کہ قرآن جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعارف

ایک باسطوت و شوکت شہنشاہ کی حیثیت سے نہیں کراتا بلکہ صرف اسی حیثیت سے کراتا ہے کہ وہ "کتاب و حکمت" کی تعلیم دیتے ہیں اور اس علم کتاب و سنت کی بعثت کو مومنوں پر اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت بتاتا ہے:۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ"

اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا ہے کہ ان میں انھیں میں سے ایک پیغمبر بھیجا ہے جو انھیں خدا کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے اور ان کو پاک کرتے اور (خدا کی) کتاب اور حکمت سکھاتے ہیں اور پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے"

۳۔ اسلام کا نظام اقدار۔

ہر معاشرے کا ایک نظام اقدار (scale of values) ہوتا ہے۔ مثلاً قارونی سماج میں افراد کی بلندی و پستی روپیہ پیسہ سے ناپی جاتی ہے، جبابرہ و طواغیت کی ٹولی میں اس کا پیمانہ ان کے نشاء اقتدار اور زیر دست آزاری میں مبالغہ پر ہے۔ اخیار کی جماعت میں ان کی نیکی و نیکوکاری ہے۔ اسلامی سماج کا بھی ایک نظام اقدار ہے۔ اس کے یہاں بھی "اقدار" کے متصاعد سلسلے میں سب سے بلند قدر (Summum bonum) "حکمت" ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

اور جس کو حکمت ملی اس کو بڑی نعمت (خیر کثیر) مل گئی۔

۴۔ خارجی کائنات کے بارے میں اسلام کا تصور

مسیحی مذہب کے پیرووں کی بابت ولیم نمل لکھتا ہے:

"عیسائی خارجی فطرت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے"

اور اس کا نتیجہ تھا کہ جب تک وہ اپنے مذہب کی اس مزعومہ تعلیم پر کاربند رہے، علم و حکمت میں کوئی ترقی نہ کر سکے۔ اس سے بدتر حال مشرک اقوام کا تھا، وہ مظاہر کائنات کے سامنے گڑگڑاتے ہوئے جاتے تھے اور جو کچھ اتفاق سے مل جاتا، اسے مزعومہ دیوتاؤں کی دین سمجھتے اور جو کچھ نہ ملتا اسے ان کے قہر و غضب کا نتیجہ گردانتے تھے۔ چنانچہ جب سکندر سارے جہان کو اپنے قوت بازو کے سہارے فتح کرنے کے ارادے سے نکلا تو جہاز پر سوار ہونے سے پہلے سمندر کے دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایک سانڈ کی قربانی دی اور آج بھی جب اس "عہد تنویر" میں سمندر کے اندر کوئی جہاز اتارا جاتا ہے تو ان دیوتاؤں کو منانے کے لیے ناریل توڑے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس لادینی حکومت میں بھی جس طرح سرکاری تقاریب کا افتتاح ہوتا ہے، وہ سب کو معلوم ہے۔

مذاہب عالم کے مابین صرف اسلام ہی کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ وہ خارجی کائنات کی تسخیر کے لیے اپنے متبعین کی ہمت افزائی کرتا ہے، کیونکہ اس کی کتاب مقدس بار بار آ کے یہ بتاتی ہے کہ ان کے پروردگار نے عالم طبیعی کو ان کے قابو میں کر دیا ہے، اب ان کا کام ہے کہ کس طرح اسے اپنے کام میں لائیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد باری ہے:

أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً"

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے مسخر کر دیے تمہارے لیے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اور پوری کر دیں تمہارے اوپر اپنی نعمتیں کھلی ہوئی اور چھپی ہوئی

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

"اللّٰهُ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيهِ بِأَمْرِهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ"

اللہ وہ ہے جس نے بس میں کر دیا تمہارے دریا کو کہ چلیں اس میں جہاز اس کے حکم سے اور تاکہ تلاش کرو تم اس کے فضل سے اور تاکہ تم شکر ادا کرو

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِنْهُ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ٥

"اور مسخر کر دیا تمہارے لیے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں سب کو اپنی طرف سے۔ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے واسطے جو غور و فکر کرتے ہیں۔"

اسلام کی بنیادی تعلیم

اسلام کی بنیادی تعلیم یا کلمۂ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی موعودہ توضیحی تفصیل حسب ذیل ہے۔

کلمۂ طیبہ کے دو حصے ہیں توحید ربوبیت اور تصدیق رسالت

"توحید ربوبیت" کا ماحصل یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی انسان کا معبود ہے لیکن جیسا کہ سابق میں مذکور ہوا، یہ محض ایک تکوینی حقیقت نہیں ہے ایک تشریعی حقیقت بھی ہے۔ یعنی انسان اللہ تعالیٰ کے سوا کسی غیر اللہ کی عبادت نہ کرے۔ چنانچہ قرآن غیر مبہم الفاظ میں اس تشریعی حقیقت کا اعلان کرتا ہے:

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ

اور حکم کر چکا تیرا رب کہ نہ پوجو اس کے سوا

اور یہ غیر اللہ کی عبادت (شرک) اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کے آگے سر جھکانا اسلامی نظام اقدار میں اتنا بڑا گناہ ہے جو ناقابل عفو و درگزر ہے

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ
ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى
اِثْمًا عَظِيْمًا

بے شک اللہ نہیں بخشتا اس کو جو اس کا شریک ٹھہرائے اس کے سوا جس کو چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جس نے شریک ٹھہرایا اللہ کا، وہ سخت گمراہ ہوا (اس نے گناہ عظیم کا افترا کیا)

یہی توحید ربوبیت" اسلامی تعلیمات کا سنگ بنیاد اور اسلامک کلچر کا اصل الاصول ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بالفاظ دیگر اللہ رب العزت کے سوا انسان کا کوئی آقا نہیں، سب اس کے محکوم و مرؤس ہیں کیوں کہ دنیا کی ہر چیز اُسی کے لیے پیدا کی گئی ہے، جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

"هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا"

(اللہ) وہی ہے جس نے زمین میں جو کچھ ہے، سب تمہارے واسطے پیدا کیا۔

اس تعلیم کا منطقی نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ پیروان اسلام کائنات کے سامنے بھکاری کی حیثیت سے نہیں بلکہ شکاری کی حیثیت سے پہنچے۔ تاکہ فطرت کی ظاہر اور پوشیدہ قوتوں کو تسخیر کر کے اپنے مقاصد کے مطابق استعمال کریں۔ اسی کا نام "تسخیر کائنات" ہے جس کے لیے قرآن بار بار رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن کائنات کی جاندار اور بے جان قوتوں کی تسخیر ان سے براہ راست کشتی لڑ کر نہیں کی جا سکتی ہاتھی کو اٹھا کر پٹکا نہیں جا سکتا، صرف آنکس کے ذریعے اسے قابو میں لایا جاتا ہے۔ دریا کے پرزور بہاؤ کا رخ ہاتھوں کے جھکولوں سے نہیں موڑا جا سکتا، صرف ٹربائن کے ذریعے اس کی توانائی کو بجلی کی شکل میں ذخیرہ کیا جاتا ہے۔ پہاڑ کو گھونسوں سے نہیں توڑا جا سکتا، صرف ڈائنامٹ کے ذریعے اُڑا کر اس میں سرنگیں کھو دی جاتی ہیں۔ کھلے سمندر کو پیر کر پار نہیں کیا جا سکتا، صرف دخانی کشتیوں کے ذریعے طوفانی سمندر میں بے خوف و خطر سفر کیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ کیا ہے؟ صرف تسخیر ارض و سموات اور کائنات کی پوشیدہ قوتوں کی واقفیت۔ اسی کا نام "علم طبیعی" اور نیچرل سائنس" ہے جس کا محرک حقیقی "توحید ربوبیت" پر ایمان ہے۔

کلمۂ طیبہ کا دوسرا جزء "تصدیق رسالت" ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں"

اس لیے جو کچھ آپ نے فرمایا حق ہے اور جس بات کے کرنے کا حکم دیا، وہ احکام الٰہی کی بجا آوری کی طرح واجب التعمیل ہے۔

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ

کے فرمان واجب الاذعان سے قرآن حکیم کے صفحات معمور ہیں اور فرمان خدا و رسول کی بجا آوری اسلام کا حکم ناطق ہے جس میں کسی کوتاہی کی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ
رَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَ
مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا

اور نہ تو کسی مسلمان مرد اور نہ ہی کسی مسلمان عورت کو یہ حق پہنچتا ہے کہ جب اللہ و رسول کچھ فرمائیں تو انھیں اپنے معاملے میں کچھ اختیار رہے اور جو حکم نہ مانے اللہ اور اس کے رسول کا وہ بے شک صریح گمراہی میں جا پڑا۔

اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروؤں کو جس طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت اور نیکوکاری اختیار کرنے اور برائیوں سے بچنے کا حکم دیا ہے، اسی طرح ان کو یہ بھی حکم دیا ہے کہ خود کو اوصاف حمیدہ سے متصف کریں اور ان اوصاف حمیدہ کے چندن ہار میں واسطۃ العقد علم و حکمت ہے۔ لہذا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروؤں کو حکم دیا کہ وہ علم حاصل کریں ہر چند کہ اس کے حاصل کرنے کے لیے انہیں انتہائی مشقت حتی کہ اقصائے عالم کا سفر ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

اطلبوا العلمَ وَلو كانَ بالصِّينِ

"علم کو تلاش کرو خواہ وہ چین (اقصائے عالم) ہی میں کیوں نہ دستیاب ہو۔"

پھر اس "حکم ناطق" کو مزید مؤکد بنانے کے لیے اسے "فریضہ" کے لفظ سے تعبیر کیا، جس میں کسی کوتاہی یا تہاون کی گنجائش ہی نہیں ہے:

طلب العلم فريضة على كل مسلمٍ و مسلمةٍ

"علم کو طلب کرنا ہر مسلمان مرد اور ہر مسلمان عورت پر فرض ہے۔"

یہی نہیں بلکہ آپ نے فرمایا کہ حکمت مومن کی متاع گم گشتہ ہے جہاں ملے وہ دوسروں کے مقابلے میں اسے لینے کا زیادہ حق دار ہے۔

"كلمة الحكمة ضالّة المومن اينما وجدها فهو احقّ بها۔"

شمع رسالت کے پروانوں کو اس حکم کی تعمیل میں کیا پس و پیش ہو سکتا تھا، لہذا زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ امت مسلمہ علم و حکمت کے خزانوں کی امین ہو گئی۔

ج۔ سائنسی علوم کے حصول کے باب میں اسلام کا موقف

قرآن حکیم اصولاً ایک منزل من اللہ ضابطۂ حیات ہے جو بنی نوع انسان کو فلاح دارین کا راستہ دکھانے کے لیے نازل کیا گیا تھا، لہذا جہاں وہ اُخروی زندگی میں فلاح و نجاح کے احکام کی تعلیم دیتا ہے، وہیں دنیوی زندگی کو بنانے سنوارنے کی بھی تعلیم دیتا ہے، اور دنیاوی زندگی کی اصلاح و ترقی "تمتع بالکائنات" کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُم مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا

(اللہ) وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے واسطے سب کچھ جو زمین میں ہے۔

یہی "تمتع بالکائنات" کا جذبہ اسلامی فکر میں مختلف علوم و فنون کے آغاز و ارتقا کا سب سے قوی عامل ہے۔

تمام علوم طبیعیہ کا سنگ بنیاد "مطالعہ فطرت" ہے اور قرآن تفصیل کے ساتھ فطرت کے مختلف مظاہر کے مطالعے پر زور دیتا ہے۔ وہ ایجابی طور پر اپنے متبعین کو مامور کرتا ہے کہ وہ مظاہر کائنات کا بامعنیٰ مشاہدہ کریں کیوں کہ ان میں سوچنے سمجھنے والے اذہان کی رہنمائی کے لیے نشانیاں ظاہر و باہر ہیں:۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ مَا تُغْنِى الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ

اور آپ کہہ دیجیے کہ تم غور کرو (اور دیکھو) کہ کیا کیا چیزیں ہیں آسمانوں میں اور زمین میں اور جو لوگ (عناداً) ایمان نہیں لاتے، ان کو دلائل اور دھمکیاں فائدہ نہیں پہنچاتیں۔

یہی نہیں، بلکہ وہ اس فریضے سے پہلوتہی کرنے والوں کو زجر و توبیخ کرتا ہے:۔

"اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِىْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَىْءٍ وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ فَبِاَىِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ

اور کیا ان لوگوں نے غور نہیں کیا آسمانوں اور زمین کے عالم میں اور (نیز) دوسری چیزوں میں جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں اور اس بات میں (بھی غور نہیں کیا) کہ ممکن ہے کہ ان کی اجل قریب ہی آ پہنچی ہو، پھر قرآن کے بعد کون سی بات پر یہ لوگ ایمان لاویں گے۔

اسلامی آئیڈیالوجی میں تکمیل ایمان "ایمان بالآخرۃ" پر موقوف

ہے اور اس کے حاصل کرنے کے لیے تخلیق کائنات کا مطالعہ اور اس مطالعے کے لیے سیر و سیاحت ضروری ہے۔ قرآن کہتا ہے:

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ
ثُمَّ اللَّهُ يُنْشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيرٌ ۝

آپ ان لوگوں سے فرما دیجیے کہ تم لوگ زمین پر چلو پھرو اور دیکھو کہ خدائے تعالیٰ نے مخلوق کو کس طور پر اول بار پیدا کیا ہے، پھر اللہ پچھلی بار بھی پیدا کرے گا۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اور اس فریضے کی بجا آوری میں کوتاہی کرنے والوں سے وہ باز پرس کرتا ہے:

أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللَّهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ إِنَّ
ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ

کیا ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کس طرح مخلوق کو اول بار پیدا کرتا ہے (کہ عدم محض سے وجود میں لاتا ہے) پھر وہی دوبارہ اس کو پیدا کرے گا۔ یہ اللہ کے نزدیک بہت ہی آسان بات ہے۔

غرض قرآن کریم نے جو اصولاً ایک مذہبی کتاب ہے، ان تمام علوم کی ہمت افزائی کی ہے جو آج اور اسی طرح آئندہ "علوم طبیعیہ" میں محسوب ہوں گے مثلاً قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ فلکیات (ASTRONOMY) کا مطالعہ ملت اسلامیہ کا مقدس ترین ورثہ ہے۔ اسی نے سیدنا حضرت ابراہیم علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی چشم جہاں بین کو "توحید" کے لعل الجواہر سے روشن کیا۔ بقول اقبال

وہ سکوت شام صحرا میں غروب آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشم جہاں بین خلیل

قرآن کہتا ہے:

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأَىٰ كَوْكَبًا قَالَ هَٰذَا رَبِّي
فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَا أُحِبُّ الْآفِلِينَ ۝ فَلَمَّا رَأَى الْقَمَرَ
بَازِغًا قَالَ هَٰذَا رَبِّي فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَمْ يَهْدِنِي
رَبِّي لَأَكُونَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّينَ ۝ فَلَمَّا رَأَى
الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هَٰذَا رَبِّي هَٰذَا أَكْبَرُ فَلَمَّا أَفَلَتْ
قَالَ يَا قَوْمِ إِنِّي بَرِيءٌ مِمَّا تُشْرِكُونَ ۝ إِنِّي وَجَّهْتُ
وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا
وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝

پھر جب رات کی تاریکی اس پر چھا گئی تو اس نے ایک ستارا دیکھا۔ اس نے کہا (تمہارے زعم کے مطابق) یہ میرا رب ہے۔ سو جب وہ غروب ہو گیا تو اس نے کہا میں غروب ہو جانے والوں سے محبت نہیں رکھتا۔ پھر جب چاند کو دیکھا چمکتا ہوا تو کہا (تمہارے زعم کے مطابق) یہ میرا رب ہے۔ سو جب وہ غروب ہو گیا تو کہا اگر مجھ کو میرا رب (حقیقی) ہدایت نہ کرتا رہے تو میں گمراہ ہو جانے والے لوگوں میں سے ہو جاؤں۔ پھر جب آفتاب کو دیکھا چمکتا ہوا تو کہا کہ (تمہارے زعم کے مطابق) یہ میرا رب ہے۔ یہ تو سب سے بڑا ہے۔ سو جب وہ غروب ہو گیا تو کہا اے قوم! میں بے شک تمہارے شرک سے بیزار ہوں۔ میں اپنا رُخ اُس (ذات) کی طرف کرنا تم سے ظاہر کرتا ہوں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

اس لیے قرآن خصوصیت سے اجرام فلکی کے مشاہدے کی ترغیب دیتا ہے کیوں کہ یہ مطالعہ انسان ہی کے فائدے کے لیے ہے۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا وَقَدَّرَهُ
مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ مَا
خَلَقَ اللَّهُ ذَٰلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ

وہی ہے جس نے سورج کو جگمگاتا بنایا اور چاند کو چمکتا اور اس کے لیے منزلیں ٹھہرائیں تاکہ تم برسوں کی گنتی اور (مہینوں دنوں اور ساعتوں) کا حساب جانو۔ اللہ نے اسے بنایا مگر حق (کہ اس سے اس کی قدرت اور وحدانیت ظاہر ہو)

چنانچہ جب آیت کریمہ "إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ

نہار لآیات لاولی الالباب نازل ہوئی تو جناب نبی کریم صلی اللہ
یہ وسلم نے فرمایا
"ویل لمن لاکھا بین لحیتیہ ولم یتفکر فیہا"
تباہی ہے اس کے لیے جو اس آیت کی منہ سے تلاوت کرتا
ہے مگر اس کے معانی و مفہوم پر غور نہیں کرتا۔
اسی طرح قرآن دیگر طبیعیاتی علوم کی طرف رہنمائی کرتا ہے
، کہتا ہے:

اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ
وَ فِیْ خَلْقِکُمْ وَمَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّۃٍ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ
وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ
مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْیَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ
مَوْتِهَا وَتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ

آسمانوں میں اور زمین میں اہل ایمان کے (استدلال کے)
لیے بہت سے دلائل ہیں اور (اسی طرح) خود تمہارے اور
ان حیوانات کے پیدا کرنے میں جنھیں زمین پر پھیلا رکھا ہے
ان لوگوں کے لیے دلائل ہیں جو یقین رکھتے ہیں (اسی طرح)
یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں اور اس
(مادہ) رزق میں جس کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اتارا
پھر اس (بارش) سے زمین کو تر و تازہ کیا اس کے خشک
ہوئے پیچھے اور (اسی طرح) ہواؤں کے بدلنے میں دلائل
ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل (سلیم) رکھتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ مظاہر کائنات میں معرفت باری تعالیٰ کی نشانیوں کے علاوہ
غور و فکر کرنے والوں کے لیے اور بھی بہت کچھ ہے، کیوں کہ کائنات و مافیہا
ان کی میراث ہے۔ اس لیے انھیں اس کی تسخیر کا طریقہ جاننا چاہیے۔

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِکَ دَحٰهَا اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا
وَ مَرْعٰهَا وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا مَتَاعًا لَّکُمْ وَلِاَنْعَامِکُمْ

"اور اس کے بعد زمین کو بچھایا اور (بچھا کر) اس کا پانی اور
چارہ نکالا اور پہاڑوں کو اس پر قایم کر دیا تمہارے اور
تمہارے مویشیوں کے فائدہ پہنچانے کے لیے۔"

لہٰذا انسان کو "تمتع بالکائنات" کے ساتھ اس عمل الٰہی پر بھی نظر رکھنا ہے
جو کائنات میں جاری و ساری ہے۔ قرآن کہتا ہے:

" فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰی طَعَامِہٖ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا
ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا فَاَنْبَتْنَا فِیْهَا حَبًّا وَ
عِنَبًا وَ قَضْبًا وَ زَیْتُوْنًا وَ نَخْلًا وَ حَدَآئِقَ غُلْبًا وَ
فَاکِهَۃً وَ اَبًّا مَتَاعًا لَّکُمْ وَلِاَنْعَامِکُمْ ہ

انسان کو چاہیے کہ اپنے کھانے کی طرف نظر کرے کہ ہم نے
عجیب طور پر پانی برسایا پھر عجیب طور پر زمین کو پھاڑا
پھر ہم نے اس میں غلہ اور انگور اور ترکاری اور زیتون
اور کھجور اور گنجان باغ اور میوے اور چارہ پیدا کیا۔
(بعض چیزیں) تمہارے اور (بعض چیزیں) تمہارے مویشیوں
کے فائدے کے لیے۔

وہ مظاہر کائنات کے ساتھ حیات حیوانی کے مطالعے پر بھی زور دیتا
ہے۔ کیوں کہ یہی اسلام کے مقصد بعثت کی تکمیل کا صحیح راستہ ہے اور اسی
کی مدد سے ایمان تک رسائی ہوتی ہے:-

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ وَ اِلَی
السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ وَ اِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ وَ
اِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ۔ فَذَکِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ
مُذَکِّرٌ ہ

کیا وہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح (عجیب طور
پر) پیدا کیا گیا ہے اور آسمان کو (نہیں دیکھتے کہ) کس
طرح بلند کیا گیا ہے اور پہاڑوں کو (نہیں دیکھتے کہ) کس
طرح کھڑے کیے گئے ہیں اور (زمین کو (نہیں دیکھتے) کہ
کس طرح بچھائی گئی ہے تو آپ (ابھی ان کی فکر میں نہ
پڑیے بلکہ صرف) نصیحت کر دیا کیجیے (کیوں کہ) آپ تو
صرف نصیحت کرنے والے ہیں۔

اسی طرح وہ تاریخ طبیعی (Natural History) اور حیوانیات
(Zoology) کے مطالعے پر آمادہ کرتا ہے۔

وَاللّٰہُ خَلَقَ کُلَّ دَآبَّۃٍ مِّنْ مَّآءٍ فَمِنْهُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ

عَلیٰ بطنہٖ وَمنھم مَن یمشی علی رِجلین ومنھم من یمشی عَلیٰ اَرْبَعٍ یَخْلُقُ اللّٰہُ مَایَشَاءُ اِنَّ اللّٰہَ عَلیٰ کل شیٍٔ قَدیرٌ ہ۔

اور اللہ ہی نے ہر چلنے والے جاندار کو (بری ہو یا بحری) پانی سے پیدا کیا ہے۔ پھر ان میں بعض تو وہ (جانور) ہیں جو اپنے پیٹ کے بل چلتے ہیں اور بعض ان میں وہ ہیں جو دو پیروں پر چلتے ہیں اور بعض ان میں وہ ہیں جو چار (پیروں) پر چلتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے خلق فرماتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔

ایک اور مقام پر وہ حیوانات کے عضویاتی مطالعے کی ہمت افزائی کرتا ہے:

وَاِنَّ لکم فی الانعامِ لَعِبْرَۃً نُسْقِیکم مِّمَّا فی بُطُونِہٖ من بَینِ فرثٍ وَّ دَمٍ لبنًا سائغًا للشّٰربین

اور (نیز) تمہارے لیے مویشیوں میں بھی غور درکار ہے (دیکھو) ان کے پیٹ میں جو گوبر اور خون (کا مادہ) ہے اس کے درمیان میں سے صاف اور گلے میں آسانی سے اُتر جانے والا (دودھ بنا کر) ہم تم کو پینے کو دیتے ہیں۔

دوسری جگہ وہ اُڑنے والی مخلوقات کے تحقیقی مطالعے پر اُبھارتا ہے:

اولم یروا الی الطیر فوقھم صافات ویقبضن، مایمسکھن الا الرحمٰن انہ بکل شیٔ بصیرٌ ہ

کیا ان لوگوں نے اپنے اوپر پرندوں کی طرف نظر نہیں کی کہ پر پھیلائے ہوتے (اُڑتے پھرتے) ہیں اور کبھی (اسی حالت میں) پر سمیٹ لیتے ہیں بجز (خدائے) رحمٰن کے ان کو کوئی تھامے ہوئے نہیں ہے۔ بے شک وہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔

غرض سائنسی علوم کے حصول میں اسلام کے اس مذکور الصدر موقف کو اسلام کی بنیادی تعلیم نے متعین کیا، جس کی رو سے ایک جانب "ایمان باللہ" یا توحید ربوبیت کا عقیدہ (جو اپنی نوبت میں تسخیر کائنات اور اس کوشش کے نتیجے میں علم طبیعی اور نیچرل سائنس میں دستگاہ عالی کا مقتضی تھا) اور دوسری جانب "ایمان بالرسالۃ" یا اطاعت رسول کا جذبہ (جو اس بات کی تعلیم دیتا تھا کہ "حکمت" جہاں بھی ملے، مردِ مومن اسے حاصل کرنے میں دیر نہ کرے) ان دونوں عوامل کا مجموعی نتیجہ یہ ہوا کہ ملت اسلامیہ کا اجتماعی ذہن شروع ہی سے علم و حکمت کے حصول پر مرکوز ہو گیا۔

قرآن کریم آج بھی موجود ہے اور حدیث رسول بھی۔ لہٰذا اگر ماضی میں یہ سب کچھ ہوا تو مستقبل میں بھی کیوں نہ ہوگا۔

وما ذٰلک علی اللہ بعزیز

"اللہ پاکیزہ ہے، پاکیزگی کو پسند کرتا ہے۔ صاف ستھرا ہے، صفائی اسے محبوب ہے۔ سخی ہے، سخاوت اس کی پسندیدہ صفت ہے۔ کریم ہے، کرم اسے اچھا لگتا ہے۔ اس لیے اپنے گھروں اور میدانوں کو صاف ستھرے رکھو اور یہودیوں کی مشابہت اختیار نہ کرو"

(ترمذی)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۷ شمارہ ۵ - (مئی ۸۸ء)

تاریخِ ادب کی تدوین سے متعلق

محمد انصار اللہ*

[انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند (شاخ دہلی) کے زیر اہتمام "ادبی تاریخ نویسی، طریقۂ کار اور تدریس" کے عنوان سے ۳۰، ۳۱ مارچ ۱۹۸۸ء کو دو روزہ کل ہند مذاکرہ منعقد ہوا۔ پہلے اجلاس میں ڈاکٹر محمد انصار اللہ نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی اور چوتھے اجلاس میں "کلیدی خطبہ" دیا۔ اُس خطبہ کا متن پیش کیا جارہا ہے]

اردو زبان و ادب کی اب تک جو تاریخیں چھپ چکی ہیں، میرے ایک شاگرد نے ان کی فہرست تیار کی ہے۔ اس کے مطابق ان کی تعداد اس طرح ہے۔

اردو ادب کی عمومی تاریخیں (مکمل اور ناتمام)	۲۵
اردو ادب کی تاریخیں۔ متعلق بہ ادوار	۱۱
بہ لحاظ علاقہ	۲۹
" اصناف نظم	۵۵
" اصناف نثر	۷۳
ادارہ و اقوام و ملل	۱۹
تحریکات و رجحانات	۲۴
کل	۲۳۶

ظاہر ہے کہ یہ تعداد قطعی نہیں ہے اور کچھ شک نہیں کہ جن کتابوں کا علم اسے حاصل نہیں ہو سکا ان کی تعداد بھی خاصی بڑی ہوگی۔ اس تعداد کے باوجود ہم میں سے ہر شخص کو اس بات کا شکوہ ہے کہ کسی بھی پہلو سے کوئی کامیاب تاریخ موجود نہیں ہے۔ ہمارا یہ شکوہ اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ ہمارے ذہنوں میں تاریخ کا ایک تصور موجود ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ہم اُس تصور کو عمل میں لانے سے اب تک قاصر ہیں۔

تاریخ میں مربوط اور مسلسل واقعات کا بیان اس طرح ہونا چاہیے کہ اُس سے ارتقا کا اندازہ ہو سکے۔ کہنے میں یہ بات جتنی آسان ہے، اس کے مطابق عمل کرنا اتنا ہی مشکل ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر لمحہ اور ہر مقام پر ایک نیا واقعہ ظہور میں آتا رہتا ہے۔ تمام واقعات کو ارادہ اور کوشش کے باوجود ضبطِ تحریر میں لانا ممکن نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ واقعات کو قلمبند کر کے کھتونی، روزنامچہ، ڈایری، بیاض یا طومار ضرور تیار کیا جاسکتا ہے لیکن تاریخ چیزے دیگر است۔

یہ بات واضح طور پر ذہن میں رکھنے کی ہے کہ کوئی واقعہ یا حادثہ مجرد طور پر رونما نہیں ہوتا ہے۔ وہ لازماً ارتقائی عمل کا مظہر بھی ہوتا ہے لیکن اُس ارتقائی کیفیت کی شناخت آسان نہیں ہے۔ کسی واقعے کو اس کے متعلقات سے الگ کر کے دیکھنا اور یہ سمجھنا کہ اس کی تشخیص کرلی گئی یا کرلی جائے گی محض خود فریبی ہے۔ کسی چہرے کو محض آنکھ، محض کان، ناک یا محض منہ یا رنگت یا محض اس کے چھوٹے بڑے ہونے سے شناخت نہیں

---

* ریڈر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

کیا جا سکتا۔ شناخت پورے چہرے کی ہوتی ہے۔ مورخ کے لیے بھی محض یہ جان لینا کہ فلاں واقعہ رونما ہوا، ہرگز کافی نہیں ہے۔ کوئی واقعہ کب اور کہاں رونما ہوا، یہ جاننا تو ضروری ہے ہی۔ مورخ کے لیے اِس بات کا جاننا بھی لازم ہے کہ وہ کیوں اور کن حالات میں رونما ہوا تھا اور اُس نے دوسرے واقعات کو کس طور پر متاثر کیا تھا۔ تنہائی اور تجرد کی بات کہنے میں خواہ کتنی ہی بھلی لگتی ہو، مورخ کو وہ زیب نہیں دیتی۔ مورخ کے لیے کوئی واقعہ محض ایک واقعہ نہیں ہوتا بلکہ وہ واقعات کا ایک تسلسل ہوتا ہے۔ اِس نظر سے دیکھیے تو اندازہ ہوگا کہ مورخ کا کام کتنا پھیلا ہوا ہے اور اس کے لیے کتنی وسیع النظری دوربینی اور غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔

ادب کی تاریخ کا دایرہ سیاسی تاریخ کے مقابلے میں بہت زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ حروفِ تہجی، رسمِ خط، تحریر، الفاظ و لُغات، زبان، عروض، بیان و بدیع، اصنافِ نظم و نثر کے علاوہ فکر و خیال، معاشرت، تہذیب غرض زندگی کے کم و بیش سبھی پہلوؤں سے متعلق ارتقائی کیفیت کا اظہار ادب کی تاریخ کے دایرہ میں آجاتا ہے۔ ایک ادیب اپنی تحریروں میں مروجہ لباس، اسبابِ خورد و نوش، علمی فتوحات اور مختلف النوع انسانی کمالات کا بیان بھی کرتا ہے۔ چنانچہ مورخ کے لیے لازم ہے کہ اس کا علم ہمہ جہت اور ہمہ گیر ہو۔ عملاً اور معمولاً یہ بات ممکن نہیں اِس لیے تسلیم کرنا چاہیے کہ واقعی مثالی اور معیاری ادبی تاریخ لکھنا فردِ واحد کے لیے ناممکن ہے۔ غالباً یہ بھی ایک وجہ ہے کہ آج تک ہم اپنے ادب کی تاریخ مرتب نہیں کر سکے ہیں۔

ہندوستان اور پاکستان میں اجتماعی سطح پر بھی تاریخ نویسی کی کوششیں ہوئی ہیں لیکن وہ کوششیں بھی محض بظاہر اجتماعی تھیں۔ فی الواقع وہ بھی انفرادی کاوشوں ہی کے ذیل میں آتی ہیں۔ ہوتا یہ رہا ہے کہ مختلف عالموں سے مختلف اشخاص، ادوار یا موضوعات سے متعلق مضامین لکھوا کر یکجا کر دیے گئے ہیں۔ اِن کو مجموعۂ مقالات تو کہا جا سکتا ہے، لیکن انھیں مرتب اور باضابطہ تاریخ کہنا ظلم ہے۔

تاریخ اور تحقیق کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور جو شخص اپنی زندگی میں دیانت دار اور آزاد نہیں ہے، وہ نہ تو تحقیق کا کام کر سکتا ہے اور نہ تاریخ ہی لکھ سکتا ہے۔ میرے نزدیک ہمارے مورخوں کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا اور ہے کہ انھیں آزادی نصیب نہ ہو سکی۔ اِس سلسلے میں "تنقید شعر العجم" کے مصنف حافظ محمود خاں شیرانی کا نام لیا جانا چاہیے، جن کی صلاحیت، لیاقت اور [illegible] سی میں مجھے ذرا بھی شبہ نہیں لیکن اُن کا سب سے کمزور کام دیتی ہے جو ہم اردو والوں میں سب سے زیادہ مقبول ہے یعنی "پنجاب میں اردو"۔ یہ کتاب شروع اِس جملے سے ہوتی ہے کہ:

> "جب پرنسپل عبداللہ یوسف علی نے مجھ سے اردو کے آغاز و قدامت کے موضوع پر لکھنے کے لیے ارشاد کیا۔" الخ

میرے کرم گستر خورشید احمد خاں صاحب کو میری یہ بات ناگوار ہوئی ہے لیکن مجھے اِس بارے میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ شیرانی مجبور تھے ایک ایسی کتاب لکھنے کے لیے جو بقول اُن کے:

> "از اول تا آخر پنجاب اور اردو کے باہمی تعلقات کے تذکروں سے لبریز ہے۔"

اس کتاب میں ترتیب کے ساتھ خسرو، شرف الدین یحییٰ منیری، کبیر باجن، قطبن، عبدالقدوس، علی جیو گامدھنی گجراتی، خوب محمد چشتی احمد دکنی کا نام اور کلام ملتا ہے۔ "پنجابی اور اردو" کے تحت بحثوں میں معراج العاشقین، خالق باری، یوسف زلیخا (امین دکنی)، خوب ترنگ (خوب محمد)، سب رس (وجہی)، جواہر اسرار اللہ (علی جیو گامدھنی)، بکٹ کہانی (افضل)، لیلا مجنوں (احمد دکنی) کے علاوہ میرانجی شمس العشاق، برہان الدین جانم، ملک محمد جائسی، محمد قلی قطب شاہ، جعفر زٹلی کے کلام سے سندیں پیش کی گئی ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ اِن میں سے کسی ایک کا تعلق بھی پنجاب سے نہیں ہے۔ میرا ذہن اِس بات کو تسلیم کرنے کے لیے کبھی تیار نہ ہو سکا کہ یہ بات شیرانی کے علم میں نہیں تھی لیکن شیرانی ملازمت کرتے تھے۔ پرنسپل کا حکم تھا اور انھیں جو کچھ لکھنے پر مامور کیا گیا تھا انھوں نے وہی لکھا۔ ملازمت کی مجبوریوں کو، ہم میں سے کون ہے، جو نہیں سمجھتا ہے؟

شیرانی دیانت دار شخص تھے، انھوں نے اس کام کے لیے جس پر مامور تھے پوری محنت کی۔ انھوں نے متعدد غلطیوں کی تصحیح کی۔ کئی نئی

تصانیف کا پتا لگایا اور آئندہ کام کرنے والوں کے لیے نہایت وقیع سرمایہ چھوڑ گئے۔ لیکن ہر شخص شیرانی نہیں ہو سکتا۔ ہمارے مورخوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے کتاب کی صورت نہیں دیکھی اور اس پر تبصرے کر ڈالے ہیں۔ اس قسم کی کارکردگی کی روایت خاصی قدیم ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں ملک محمد جائسی کی مشہور کتاب پدماوت کے بارے میں لکھا ہے ؛

" ورق کے ورق اُلٹتے جاؤ، فارسی عربی کا لفظ نہیں ملتا"

جس کسی نے اس کتاب کو دیکھا ہوگا، وہ یقینی طور پر یہ بات نہیں کہہ سکتا۔ یہ افسوس ناک ہے کہ ہمارے یہاں سو برس تک غلطیوں کا جاری رہنا غیر معمولی بات نہیں ہے۔ مثال کے طور پر صاحبِ آب حیات نے محمد تقی میر کو تیسرے اور شیخ قلندر بخش جرأت کو چوتھے دور میں رکھا ہے آج تک ہم اسی کی اتباع کر رہے ہیں۔ علی گڑھ تاریخ ادبِ اردو کے مجوزہ خاکے میں بھی ایسا ہی تھا۔ جب کہ یہ سامنے کی بات تھی کہ میر کا انتقال ۱۲۲۵ھ میں ہوا تھا اور جرأت ان سے ایک برس پہلے یعنی ۱۲۲۴ھ میں اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔

تلاشِ واقعات کی طرف بھی ہماری توجہ کم سے کم رہی ہے۔ تمام مورخ اس پر متفق ہیں کہ ابتدائی نہج پر اردو کی تعمیر و تشکیل کا کام صوفیا نے انجام دیا تھا۔ لیکن صوفیا کی تصانیف سے جس طرح بے اعتنائی برتی گئی ہے، وہ عبرتناک ہے۔ ذرا خیال فرمایے کہ صوفیا کی وہ تصانیف جو بار بار اردو خط میں چھپتی رہی ہیں، ہماری بے التفاتی کا شکار ہو کر ہندی ادب کا سرمایہ بن چکی ہیں۔ میں نے لسانیات کے ایک استاد سے پوچھا کہ اگر اردو کا قدیم نام ہندی یا ہندوی تھا تو کیا وہ سب تصانیف جن کو ان کے مصنفین اور معاصرین نے ہندی یا ہندوی کہا تھا اردو کا سرمایہ ہیں؟ انھوں نے پوری شانِ بے نیازی سے انکار کر دیا ؎

ناطقہ سر بگریباں کہ اِسے کیا کہیے

میں نے پھر پوچھا کہ اردو کی پہلی معلوم تصنیف کون سی ہے؟ جواب ملا۔ بکٹ کہانی۔ میں نے کہا کہ کبیر کی وہ نظم جس کا نام " الف نامہ" ہے اور جس کا ہر شعر عربی کے ایک حرف سے شروع ہوتا ہے اور شعروں کی ترتیب " ابتث " کے مطابق ہے، کیا وہ بھی اردو نہیں ہے؟ جواب میں ارشاد ہوا کہ نظم کے نام اور حروف تہجی سے زبان کا تعین نہیں ہوتا۔ ہم ہندی کے بڑدانوں کی وسیع النظری سے بھی سبق لینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جنھوں نے شمال اور جنوب کی مختلف بولیوں کو اپنی زبان کے جز کی حیثیت سے شریک کر لیا ہے اور جو خود اردو کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لینے کے لیے بیقرار ہیں۔

دعوا کچھ بھی ہو، واقعہ یہی ہے کہ اپنے مفروضات کے ساتھ جس شدت کے ساتھ ہم چپٹے ہوئے ہیں، وہ بھی ہمارا ہی حصہ ہے۔ حالانکہ بعض کی عدم صحت بدیہی ہے۔ ہمارا دعوا ہے کہ اردو کا قدیم نام ہندی یا ہندوی ہے۔ ہم نے کبھی اس بات کی جستجو نہیں کی کہ "ہند" سے کون سا علاقہ مراد تھا؟ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی سلطنت کے استحکام کے ساتھ یہ زبان ان کی پوری عملداری میں جو شمال میں سندھ سے بنگال تک وسیع تھی، رائج تھی۔ لیکن ہم نے کسی ایسی تصنیف کو قدیم اردو تسلیم نہیں کیا ہے جس کا تعلق اُس سلطنت سے رہا ہو۔ ہم بار بار یہ کہتے ہیں کہ یہ زبان اسی خطۂ ارض پر وجود میں آئی تھی، لیکن ہم نے کبھی نہیں مانا کہ اس زبان میں ابتداءً جو شاعری تھی وہ معمولاً یہیں کے اوزان و بحور میں اور یہیں کے مزاج و رسوم کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ ہاں ہمیں اس بات پر اصرار ہے کہ خسرو نے پہیلیاں کہی تھیں، جب کہ ان سے منسوب پہیلیاں مختلف بولیوں میں اور مختلف انداز کی ہیں اور اُن میں سے بیشتر مختلف شعرا کے مجموعوں میں چھپی ہوئی موجود ہیں۔ ہمیں اصرار ہے کہ ہماری زبان محمد تغلق کے ساتھ دہلی سے دکن پہنچی تھی، جب کہ خود حضرتِ دہلی کی زبان کے بارے میں ہمیں کچھ بھی نہیں معلوم۔

تاریخ ادبِ اردو کے دورِ قدیم کے بارے میں تلاش و تحقیق کی ذمہ داری عام طور سے ان سرپھروں کے سر ڈال دی جاتی ہے، دنیاوی مراتب و ترقیات سے محرومی جن کا مقدر ہے لیکن جدید دور کے بارے میں بھی ہمارا علم و مطالعہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ میں اس مقام پر پریم چند کے ایک ایسے معاصر کا ذکر کرتا ہوں جس کا دعوا ہے کہ ہندوستان میں کسی شخص نے میری برابر کتابیں نہیں لکھیں۔ میرے علم میں اُس کی سوا سات سو کتابوں کے نام ہیں اور سوا سو سے زاید کتابیں خود میرے پاس موجود ہیں اس کے عقیدت مندوں کے بیان کے مطابق اس نے تین ہزار پانچ سو نو تحریریں چھوڑی ہیں۔ جو کتابیں میرے علم میں ہیں اُن میں کوئی پونے دو سو ناول اور قصے ہیں۔ اس شخص نے بعض مسلمان بزرگوں اور ہندو سنتوں کی

سوانحات بھی لکھی ہیں۔ اُن کے کلام کو مرتب کیا ہے، کلام کی شرحیں لکھی ہیں اور اس کی فرہنگیں بھی تیار کی ہیں۔ اگرچہ ان کا بنیادی موضوع تصوف اور یوگ ہے، اُس نے کچھ کتابیں خالص علمی موضوعات پر بھی لکھی ہیں۔ اُس شخص کا نام دانا دیال مہرشی شیو برت لال ورمن ہے۔ وہ ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوا تھا اور ۱۹۳۹ء میں فوت ہوا۔ میں نے اس شخص کا ذکر اردو کے بعض استادوں سے کیا تو انھوں نے میرا مذاق بھی بنایا لیکن انصاف سے کہیے کہ جس شخص نے ہماری زبان میں سیکڑوں کتابیں مذہبی، اخلاقی، اصلاحی اور علمی و ادبی موضوعات سے متعلق لکھ کر چھپوا دیں۔ ہم نے اگر اس کا نام بھی نہیں سنا ہے تو یہ قصور کس کا ہے؟ ہماری ادبی تاریخ میں کسی نہ کسی حیثیت سے اس کا نام ضرور ہونا چاہیے تھا۔

حضرات! ابھی تک میں نے صرف واقعات سے متعلق گفتگو کی ہے۔ اب بعض مسائل کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ ہماری زبان اردو کے جو اولین فقرے دستیاب ہیں، غور کیجیے تو وہ عموماً ضرب المثل کی صورت میں ہیں۔ مثلاً

جو منڈاسا باندھی، سو پاین پسری

اور :

نیچی بیری، سب کوئی جھوری

ان ضرب الامثال میں ہماری زبان کے بہت سے الفاظ اور فقرے اپنی اصل صورت میں محفوظ ہو گئے ہیں۔ عالمگیر اورنگ زیب کے وقت سے ان ضرب الامثال کو جمع کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ تاریخ ادب میں ان کا مذکور بھی چاہیے۔ اسی طرح ایسی تمام اصناف شعری کے زوال کے اسباب کا جائزہ بھی لیا جانا چاہیے جن کا تعلق شمالی اور جنوبی ہند کے مختلف خطوں سے ہے مثلاً جھولنے، دوہرے، سی حرفی وغیرہ۔

ہندوستان کی تاریخ میں مختلف وقتوں میں مختلف سلطنتیں وجود میں آتی رہی ہیں۔ مثلاً گجرات، مالوہ، اور گولکنڈہ، بیجاپور، بیدر وغیرہ۔ ہر سلطنت کا اپنا مزاج اور ماحول تھا اور وہاں کی ادبی تخلیقات اسی کی آئینہ دار تھیں۔ مثال کے طور پر بیجاپور کی زبان میں فارسی کا اثر اور وہاں کی شاعری میں صناعی کا دخل گولکنڈہ کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ بیدر کی تصانیف میں مذہب و اخلاق کی طرف میلان پایا جاتا ہے وغیرہ۔ یہ ایسی باتیں ہیں جن کی طرف مورخ کو توجہ ہونی چاہیے۔ دور متوسطین میں ہم نظیر اکبر آبادی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جیسے ریگستان میں اچانک کوئی باغ نمودار ہو گیا ہو۔ بالفرض اگر ایسا ہوا ہے تو بھی اس باغ کے نمودار ہونے کے اثرات دور و نزدیک اس ریگستان میں ضرور مرتب ہوئے ہوں گے۔ ان اثرات کی جستجو ضرور تھی۔

تحقیق ہو یا تاریخ، جب تک ذہن مفروضات اور تعصبات سے پوری طرح آزاد نہ ہوگا، کامیابی کی توقع عبث ہے۔ دنیا میں آزادی کا نام تو ہے لیکن آزادی کا واقعی وجود معلوم نہیں ہوتا۔ اس لیے جو بھی اس میدان میں قدم رکھے لازم ہے کہ ہر قسم کی ابتلاؤں کے لیے آمادہ ہو جائے۔ یہ کام عاشقی کا ہے جس میں سراسر زیاں ہے ع

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق۔

> جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا
> گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ
> فراموش نہ کر۔ احسان کر جس طرح اللہ نے تیرے
> ساتھ احسان کیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرنے
> کی کوشش نہ کر۔ اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔
>
> (القرآن سورہ قصص ۷۷)

قرآن، مسلمان اور سائنس

وارث میر

میں ان مسلمان علماء سے اتفاق نہیں کرتا جو قرآن پاک کی آیات میں سے سائنسی فارمولے تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ قرآن پاک اور دوسری الہامی کتابیں سیاسی اور فوجی نظاموں کی ہیئت ترکیبی بتانے یا ایٹم بم کا نسخہ سمجھانے کے بجائے انسانوں کو اخلاقی لحاظ سے ایک بہتر زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتی ہیں۔ اعلیٰ قدروں کا شعور پھیلاتی ہیں اور حقوق اللہ سے زیادہ حقوق العباد پر زور دیتی ہیں۔ قرآن کی ایک متمیز خصوصیت یہ ہے کہ زندگی کے مسائل کی طرف اس کا رویہ فطرت انسانی اور حقایق سے قریب تر ہے۔ اور جدید زبان میں کہا جا سکتا ہے کہ قرآن اپنے قارئین کو کائنات کے اسرار و رموز پر سوچنے اور وہ بھی سائنٹفک انداز میں غور و تدبر کی دعوت دیتا ہے۔ مطالعہ قرآن کے دوران، ایسے کئی اشاروں کی طرف خاص طور پر توجہ مبذول ہو جاتی ہے جو کسی نہ کسی سائنسی انکشاف کی تائید کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً گزشتہ چند سال سے مغرب کے سائنس داں اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ اس کائنات میں ہر چیز ایک عکس رکھتی ہے۔ لیکن ہماری آنکھوں کی ساخت ایسی ہے کہ اس کی ظاہر بینی کی قوت، اس عکس کو دیکھ نہیں سکتی۔ تاہم یہ عکس اس کائنات میں موجود ہوتا ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ انسانی آنکھ کو نظر آنے والی پوری دنیا کا ایک عکس موجود ہے۔ پرانے فلسفیوں کا بھی خیال تھا کہ اس مادی دنیا کے علاوہ، تصورات کی ایک غیر مرئی دنیا World of Ideas بھی پائی جاتی ہے جس کا پر تو انسان کی سیرت و کردار اور فکر و شعور پر پڑتا رہتا ہے۔ دنیا کے تمام بڑے بڑے اور مسلمہ مذاہب حیات بعد الممات کے قایل ہیں اور اب سائنس دانوں نے ایسے کیمرے بھی ایجاد کر لیے ہیں جو کسی چیز یا جسم سے خارج ہونے والی لہروں کی مدد سے اس چیز یا جسم کی خاص کیفیت کو تصویر میں ڈھال سکتے ہیں۔ گویا مختلف مذاہب اور قرآن کا خصوصاً یہ کہنا کہ انسان کے اقوال و اعمال کا ریکارڈ اللہ کے پاس محفوظ رہے گا اور اس دنیا کے علاوہ ایک اور دنیا بھی موجود ہے جو ظاہری آنکھ کو نظر نہیں آتی لیکن قرآن کی بعض آیات اور خاص وقت میں کسی سائنسی انکشاف کے مفہوم میں معناً یا مجازاً مماثلت کی وجہ سے قرآن کو سائنس کی کتاب ثابت کرنے پر کمر نہیں باندھ لینی چاہیے۔ نئے نئے سائنسی انکشافات کا سلسلہ جاری رہے گا۔ آج کے سائنسی اصول نامکمل اور ناقص بھی ثابت ہوتے رہیں گے اور ان انکشافات کا قرآن یا کسی دوسری الہامی کتاب کی آیات پر منطبق کرنے کا شغل ان کتابوں میں پوشیدہ پیغام کی وسعتوں کو محدود کر دینے کے مترادف ہوگا۔ سمجھنے اور غور کرنے والی بات ایک ہی ہے کہ قرآن شعور و آگہی کے سفر مسلسل میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا۔ زندگی کے مختلف مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے قرآن مظاہر کائنات کو دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے۔ چند روز پیشتر پاکستان کے اخبارات میں اوٹاوہ یونیورسٹی کے پروفیسر موریس بوکئی کے اس لیکچر کا بہت چرچا رہا جو انھوں نے اوٹاوہ مسلم ایسوسی ایشن کی طرف سے منعقدہ ایک سیمینار میں دیا اور دعویٰ کیا کہ تخلیق کائنات کے بارے میں آج جتنے بھی نظریات پیش کیے گیے وہ سب قرآن پاک کے بیان کردہ نظریے کے مطابق ہیں اور یہ کہ

۱۴۵، شاہراہ قائداعظم۔ فیصل آباد، پاکستان

قرآن پاک میں تسخیر کائنات قدرتی تغیرات اور آسمانی مخلوق کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے، جدید سائنسی انکشافات نے ان باتوں کو درست تسلیم کیا ہے۔ بوکئی کی رائے میں قرآن پاک کو سمجھنے میں ایک بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ اس کتاب کے عربی سے دوسری زبانوں میں تراجم ان لوگوں نے کیے جو سائنسی اصطلاحات سے قطعی طور پر لاعلم تھے۔

مورلیس بوکئی کی مشہور کتاب "بائیبل، قرآن اور سائنس" کا میں نے پہلی بار لندن (اوائل ۱۹۸۰ء) میں مطالعہ کیا تھا۔ میرے لیے اس کتاب کا طرز استدلال اور مواد نیا نہیں تھا۔ اس قسم کی کتابیں، دینی لٹریچر سے شغف رکھنے والوں کی نظر سے گزرتی رہتی ہیں۔ اس انداز میں مصر میں بہت کم کام ہوا ہے۔ عربی میں بعض مسلمان مفسرین نے کئی کئی جلدوں میں قرآن پاک کی تفسیریں لکھیں۔ ان تفسیروں سے متاثر ہو کر برصغیر کے بعض اہل قلم نے بھی، اس بھاری پتھر کو اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ مورلیس بوکئی کی تحقیق کو عالم اسلام میں زیادہ شہرت اس لیے ملی کہ اس نے ایک غیر مسلم اور فرانسیسی ہونے کے باوجود، قرآنی آیات کا تجزیہ کرتے وقت، جن معلومات اور سائنسی مشاہدات و حقائق سے مدد ملی۔ وہ تازہ ترین اور آج کے تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے قابل فہم ہیں۔ دوسرے ان معلومات کو نہایت سلیس اور دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود میں اپنی رائے پر قائم ہوں کہ مغربی علما اور مسلمان مفسرین کو قرآن پاک سے سائنسی فارمولوں کی بجائے سائنسی انداز فکر اور زندگی کی سچائیاں تلاش کرنی چاہئیں۔ اسی چیز کی آج کے مسلمانوں کو ضرورت ہے۔ مسلمان اپنی سیاسی غلامی، مادی پسماندگی اور سائنسی درماندگی کے احساس سے نجات پانے کے لیے گزشتہ ایک صدی سے تحریر و تقریر میں اس قسم کے دعووں پر اظہار مسرت کرتے آ رہے ہیں کہ مغرب کے سائنس داں، آج جن نتائج پر پہنچے ہیں، مسلمانوں تک یہ راز ہائے سربستہ چودہ سو سال پہلے ہی پہنچ چکے تھے اور اس کے باوجود مسلمان صدیوں تک غلام رہے ہیں اور آج بھی بڑے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے مسئلہ میں سائنٹفک انداز سے کوسوں دور ہیں۔

مذہب کے نام پر جہالت اور توہمات و تعصبات کی ایک الگ دنیا بسائے بیٹھے ہیں۔ گاہے گاہے قرآن کے مکمل ضابطۂ حیات یا اس کے "انسائیکلو پیڈیا آف سائنس" ہونے کا "ایمان پرور" نعرہ لگا کر خوش ہو لیتے ہیں۔ مسلمانوں کی اس فراری ذہنیت اور فکری و عملی کوتاہیوں کا اعتراف کرنے کے بعد، میں مورلیس بوکئی کے قرآنی مطالعہ اور تحقیق میں، قارئین کو شریک کر لینا ضروری سمجھتا ہوں۔

"بائبل، قرآن اور سائنس" پہلی دفعہ ۱۹۷۶ء میں فرانسیسی زبان میں شائع ہوئی۔

۱۹۷۸ء میں مصنف نے ایک رفیق کار کی اعانت سے اس کتاب کو انگریزی زبان میں منتقل کر کے شائع کرایا۔ بوکئی نے یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کی آسمانی کتب کے ضروری اور نازک پہلوؤں کا مقابلہ و موازنہ کرنے کے بعد غیر مسلم دنیا کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرائی ہے کہ اپنی مقدس کتب کو تو آسمانی درجہ دیتے ہو اور قرآن کو صرف ایک ذہین انسان کی تصنیف قرار دے کر خدائی کتابوں کی فہرست سے خارج کر دیتے ہو ایسا کرتے ہو تو ناانصافی اور جہالت کا ثبوت دیتے ہو۔

مصنف کے مطابق یہودی اور عیسائی علماء اپنے قدیم مذہبی لٹریچر اور موجودہ سائنسی حقائق میں تصادم کو، عقل سلیم سے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں یا اس کی طرح طرح کی تاویلات میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جب کہ یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے "آسمانی لٹریچر" میں بیان کردہ واقعات اور مظاہر کائنات کی مختلف خصوصیات اور وظائف کا تقابل کیا جائے تو قرآن کا طرز بیان سائنسی اصول کے قریب تر معلوم ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں مورلیس بوکئی نے انسان کی پیدائش کے عمل سے لے کر پھلوں سبزیوں، کیڑوں، مکوڑوں، حیوانوں، پرندوں کی عادات و خصائل اور موسموں میں تبدیلی اور عناصر فطرت کی گوناگوں حکمتوں کا قرآن کی روشنی میں جائزہ لیا ہے۔ حتیٰ کہ آسمان و زمین کی تخلیق کے مذہبی تصورات طوفان نوح اور فرعون کی غرقابی کے قرآنی واقعات کو بھی بائبل کے مقابلے میں سائنس کے تقاضوں سے زیادہ قریب تر ثابت کیا ہے۔ اس ضمن میں قرآن کی ترتیب میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی دلچسپی اور کوشش اور صحابہ کرامؓ کی احتیاطی تدابیر کا ذکر کرتے ہوئے، احادیث کی پرکھ میں اصول درایت کو بھی بیان کیا ہے یعنی تعلیمات قرآن اور اصول درایت کی نقیض احادیث کی صداقت کو محل نظر ٹھہرایا ہے۔ احادیث کی پرکھ اور چھان پھٹک کے اصولوں کی وضاحت کرتے ہوئے مصنف کی نیک نیتی قائم

رہتی ہے۔ وہ "بائبل لٹریچر" کو "حدیث لٹریچر" کے مماثل قرار دیتا ہے لیکن قرآن کے حقائق کو ان دونوں سے برتر سمجھتا ہے۔ مصنف نے غیر مسلم ہونے کے باوجود بائبل اور قرآن کے تقابلی مطالعے اور عربی زبان سیکھنے میں زندگی کا بیشتر حصہ صرف کر دیا۔ علم کی خاطر یہ بہت بڑی قربانی ہے لیکن میرے نزدیک مصنف کی شخصیت اور فکر کا نمایاں ترین اور مستحسن ترین پہلو اس کی علمی اور تحقیقی جرأت اور بے خوفی ہے۔ اس نے عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید میں ان اضافوں تحریفوں اور اصول فطرت کے خلاف باتوں کی نشان دہی کی ہے جو مصنف کے نزدیک انسانی ذہن کی تخلیق ہے اور غیر مسلم دنیا کو اس غلط رویہ پر سختی سے ٹوکا ہے کہ قرآن کو انسان تخلیق کہتے ہو؟ بوکائی نے ایسے نکات اور مقامات کو بھی روشن کیا ہے جو متعدد معاملات میں یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کو متحد کر سکتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات اور فلسفۂ حیات کے بعض ایسے پہلوؤں کی وضاحت بھی کی گئی ہے جن سے بیشتر ازیں، مغرب کا عام پڑھا لکھا شخص آگاہ نہیں تھا۔ قرآنی اشاروں اور علامتوں کی تشریح و تفسیر جاننے کے لیے اور اصلی مآخذ تک رسائی کے لیے بوکائی نے عربی زبان کے اسرار و رموز اور بلاغتوں کا علم حاصل کیا اور اس علم کی روشنی میں اس نے قرآن کا خود براہ راست مطالعہ کیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ فطرت کی نیرنگیوں اور کارخانہ قدرت کے عجائبات کو سمجھنے کے لیے جدید سائنسی علم کے بنیادی اصولوں کو جاننا بھی ضروری ہے قرآن کی اپروچ، عقلی و سائنسی رویوں کی تائید کرتی ہے۔ جب کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے مذہبی لٹریچر اور اصول سائنس میں تضاد دنیا میں پایا جاتا ہے۔ مصنف تاریخ اسلام کے عروج و زوال کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے زمانۂ عروج میں سائنسی علوم اور سائنس دانوں کی بے پناہ عزت افزائی کی جاتی ہے۔ جب کہ یورپ ان دنوں میں جہالت اور توہم پرستیوں کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ بوکائی لکھتا ہے کہ (یہودیوں کی) عبرانی بائبل اور عیسائیوں کے عہد نامہ عتیق میں کئی اختلافات ہیں۔ عہد نامہ عتیق میں متعدد ایسے اضافے ہیں جو عبرانی بائبل میں نہیں ہیں ان اضافوں پر نو سو سال تک کام ہوتا رہا اور یہ بتانا محال ہے کہ کون سا اضافہ کب اور کیوں ہوا اور کس نے کیا؟ ان اضافوں سے یہودی تعلیمات اور فلسفۂ حیات میں کوئی بڑی اور بنیادی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔

لیکن یہودیت اپنی "آسمانی کتاب" کے علاوہ کسی دوسری کتاب کو "وحی الٰہی" کا درجہ دینے کے لیے تیار نہیں۔ عیسائیوں نے یہودیوں کی عبرانی بائبل کو اپنا تو لیا لیکن اضافوں کی وجہ سے عہد نامہ عتیق کے مندرجات یہودیوں کے لیے ناقابل قبول ہیں۔

عہد نامہ جدید کی اناجیل میں عبرانی زبان کے اثرات مزید کم ہو گئے پھر بائبل کی زبان کو جدید تر اور قابل فہم بنانے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ عیسائیت بھی حضرت عیسیٰؑ کے بعد کسی وحی کو تسلیم نہیں کرتی۔ لہٰذا قرآن پاک یہودیوں عیسائیوں میں سے کسی کے نزدیک آسمانی کتاب نہیں ہے۔ ان دونوں مذاہب کے برعکس قرآن نے مسلمانوں کو باقاعدہ حکم دیا ہے کہ وہ آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے تمام پیغمبروں کی حقانیت کو تسلیم کریں۔ ان کی عظمت اور احترام میں بھی فرق اور امتیاز نہ کریں۔ قرآن نے حضرت عیسیٰ کی پیدائش زندگی کے دوسرے واقعات اور حضرت مریم کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے۔ مصنف افسوس کا اظہار کرتا ہے کہ مغرب والوں کو قرآن کے اس وسیع اور عالمگیر انسانیت نواز مزاج کا علم نہیں ہے اور مذہبی علماء انھیں گمراہ کن معلومات مہیا کر کے، اسلام کے خلاف نفرت اور تعصب کی آگ کو ہوا دیتے ہیں۔ مغرب میں صدیوں سے کئی نسلیں اسی نفرت اور جہالت کی فضا میں پروان چڑھی ہیں۔ "محمڈنزم" کی اصطلاح سے معصوم ذہنوں پر یہ تاثر مرتب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جیسے ایک انسان نے، اپنے طور پر بعض عقائد کو گھڑ کر خدا کے سلسلہ وحی سے لاتعلق رہتے ہوئے، انھیں دنیا میں پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ مغرب میں کئی اسلام کے سماجی، سیاسی اور فلسفیانہ پہلوؤں پر پڑھنے لکھنے اور سوچنے کے لیے تیار رہتے ہیں لیکن اسلام کے الہیاتی پہلوؤں اور اہمیت پر توجہ نہیں دیتے۔ بوکائی کے مطابق جب اس نے قرآن اور بائبل میں بیان کردہ بعض واقعات کے تقابلی جائزے کا بعض عیسائی دوستوں سے اشارتاً ذکر کیا تو ان میں سے بعض نے اس سلسلے میں کسی قسم کی بات کرنے سے یا سننے سے صاف صاف انکار کر دیا۔

واضح رہے کہ میں نے موریس بوکائی کی کتاب کے مندرجات کو اردو کے قالب میں اس نیت سے قطعی طور پر نہیں ڈھالا کہ عہد نامہ عتیق

اور عہد نامہ جدید کے بارے میں کسی بحث کا آغاز کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کتاب دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کر، لاکھوں کی تعداد میں پڑھی جا رہی ہے ورمیں نے اس کتاب کے بعض حصوں کو اردو خواں طبقے تک پہنچا کر صرف اس نکتے کو روشن کرنے کی کوشش کی ہے کہ دیکھو! ایک غیر مسلم قرآن میں عقلی اور سائنسی رویوں کو تلاش کر رہا ہے اور تم اہتمام کر کے غیر عقلی، غیر سائنسی اور غیر قرآنی طرز فکر کو اسلامی فکر ثابت کرنے پر تلے بیٹھے ہو اور یوں اسلام کو اضحوکہ روزگار بنا رہے ہو۔

دوسرے... میری رائے میں... موریس بوکائی نے یہ کتاب دوسری الہامی کتابوں پر قرآن کی برتری ثابت کرنے کے لیے نہیں لکھی۔ اس کا بنیادی مقصد اسلام، یہودیت اور عیسائیت کے تقابلی موازنے کے ذریعے مشترکہ نکات کو تلاش کر کے ان تین بڑے مذاہب کے ماننے والوں میں رشتہ اشتراک و اتحاد تلاش کرنا ہے۔ موریس بوکائی بہت پر امید ہیں کہ رومن کیتھولک عیسائی دنیا کی اعلیٰ ترین اور موثر ترین سطح پر اسلام کے متعلق رویے میں بڑی خوش گوار اور مثبت تبدیلی پیدا ہو رہی ہے۔

ویٹی کن کے "نان کرسچین افیرز" کے شعبے نے چند سو صفحات پر مشتمل ایک دستاویز تلاش کی ہے جس کا عنوان ہے "عیسائیوں اور مسلمانوں میں افہام و تفہیم"۔

۱۹۷۰ء میں اس دستاویز کا فرانسیسی زبان میں تیسرا ایڈیشن شائع ہوا تھا۔ اس دستاویز میں اہل علم اور حق طلب عیسائیوں کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ اسلام کے متعلق اپنے تعصبات اور بدگمانیوں سے چھٹکارا پانے کی کوشش کریں۔ اسلام اور اسلامی تعلیمات کے بارے میں گمراہ کن معلومات کو درست کرنے کی سعی کرتے ہوئے عیسائی دنیا کو سمجھایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں اللہ کا وہی مفہوم ہے جو عیسائیوں کے ہاں "گاڈ" کا ہے۔

ویٹی کن کی طرف سے شائع ہونے والی کتاب میں مسلمانوں کے خدا اور عیسائیوں کے "گاڈ" کو ایک ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یوں بھی دونوں کے نزدیک خدا "واحد" ہے۔ "جہاد" کا صحیح تصور بھی عیسائی دنیا پر واضح نہیں ہے اور اب تک عیسائی علما بھی یہی خیال کرتے آ رہے ہیں کہ اسلام اپنے سے مختلف عقیدہ رکھنے والے کو قتل کرنے کا حکم دیتا ہے اور دشمن یا غیر مسلم کو قتل کرنے کا نام ہی جہاد ہے جب کہ اسلامی تعلیمات کی رو سے اللہ کے پیغام کو پھیلانے کی جد و جہد وقت اور عہد کے تقاضوں کے مطابق جو بھی صورت اختیار کرے، جہاد کہلاتی ہے۔

ویٹی کن، الازہر یونیورسٹی اور سعودی حکومت کی سطح پر ذمہ دار نمائندوں اور وفود کے باہمی تبادلے بھی ہوتے رہتے ہیں اور عیسائی اور مسلمان علما نے اس کتاب کے بنیادی استدلال اور اس کی اشاعت کے نیک اغراض و مقاصد سے اتفاق بھی کیا ہے لیکن مغرب کے ذرائع ابلاغ نے دو دنیاؤں میں محبت اور مروت پیدا کرنے والی اور مختلف مذاہب کے پیروکاروں میں افہام و تفہیم کی فضا پروان چڑھانے والی اس علمی کاوش کے ساتھ فراخ دلانہ سلوک نہیں کیا۔

مغرب کے ذرائع ابلاغ اور سرمایہ دارانہ نظام کے محافظ مذہبی ذہن کے موجودہ غلبے اور تسلط سے زیادہ گھبرانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ مے خانہ سلامت ہے تو سرخیٔ مے سے تزئین در و بام حرم کرنے والے بھی پیدا ہوتے رہیں گے۔

دنیائے عیسائیت کے بطن سے لبریشن تھیالوجی کے جنگجو سیاسی فلسفے نے جنم لیا ہے جو دوسرے مذاہب سے فروعی مسائل پر تصادم لینے کی بجائے استعماریت کے ہاتھوں کچلے ہوئے عوام کی سیاسی اور اقتصادی جنگ لڑ رہا ہے اور اس میدان میں جد و جہد آزادی کی ایک شاندار تاریخ رقم کر رہا ہے اور ہمیں اس دن کا انتظار ہے جب کیتھولک پادریوں میں جنم لینے والے اس نئے شعور کا ان مسلمان رہنماؤں کے شعور کے ساتھ اتحاد ہو جائے گا جو دنیا کے مختلف خطوں میں اپنی بقا کی لڑائی میں مصروف ہیں اور جنہیں مغرب طنزاً Militant مسلم کا نام دیتا ہے کہ لبریشن تھیالوجی کے فلسفے کا عملی اور بھرپور مظاہرہ لاطینی امریکہ میں ہو رہا ہے جس کی ابتدا ۱۹۶۰ء میں ہوئی تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس مظاہرے کا دائرہ کار پھیلتا چلا گیا۔

اس جنگ میں مصروف یوراگوئے کے کارڈینل ہیلڈ کیمرو نے عیسائی پادریوں میں پیدا ہونے والی اس تبدیلی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اندر نئی آنکھیں روشن ہو گئی ہیں۔ لبریشن تھیالوجی کے علمبرداروں کی طرف سے یہ بات لگی لپٹی کے بغیر کہی جارہی ہے کہ سوال صرف یہ نہیں ہے کہ غریب اور پسماندہ عوام کو سوسائٹی میں کس طرح بہتر مقام دیا جائے۔ مسئلہ یہ ہے کہ بے انصافی اور ظلم و استحصال کی بنیادوں پر استوار ہونے والے معاشرے کو کیونکر تبدیل کیا جائے۔ صرف انقلابی تبدیلیاں ہی وہ حالات پیدا کر سکتی ہیں جن میں لوگ خدا کے قریب ہو سکتے ہیں۔"

برازیل کے بشپ لیونارڈ بوف کی پوپ نے جواب طلبی کی تو اس نے مختلف سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہا:

"میرا خیال ہے کہ پہلی دنیا کو بھی آزاد کرانا چاہیے کیونکہ ظلم و استحصال کے اسباب تیسری دنیا کے ممالک اور لاطینی امریکہ میں نہیں ہیں۔ بلکہ یہ اسباب پہلی دنیا میں وجود رکھتے ہیں جو کہ بے پناہ دولت، زندگی کی آسودگی کے سامان اور استحصال کے بین الاقوامی تعلقات کی مالک ہے۔ لہذا پہلی دنیا کو بھی ظلم و استحصال کی قوتوں سے آزاد کرانا ضروری ہے۔"

جناب الطاف جاوید نے "سوشلسٹ انقلاب کا مستقبل اور لبریشن تھیالوجی" میں بڑی جرأت اور حوصلے سے مستقبل میں مختلف مذاہب کی تعلیمات میں اشتراک کی بات کو آگے بڑھایا ہے۔ یہ بات آپ بھی سن لیں۔ لکھتے ہیں:

"اب ارتقا کا عمل مارکسی فکر اور اشتراکی عمل سے ہی آگے بڑھے گا جو مارکسزم کی ان خصوصیات کو ساتھ لے کر نئے ارتقائی مرحلے میں داخل ہو گا جو اس نئے مرحلے کے مزاج کے مطابق ہوں گی۔ یہ نیا ذہنی انقلاب نظریاتی لحاظ سے فرانس اور روس کے کلاسیکل انقلابوں سے بہت زیادہ وسیع، زیادہ ہمہ گیر، زیادہ عمیق اور پُرمایہ ہے اس کے لیے دانش وروں کو بہت زیادہ تحقیق، مطالعہ اور علمی جدوجہد کرنا پڑے گی۔ اس میں ایسے تحقیقی اداروں کی ضرورت ہو گی جن میں تمام مذاہب عالم کی کتب مقدسہ کا ترتیب زمانی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے۔ تاکہ ارتقائے معاشرہ کے ساتھ ساتھ ان کی بدلتی اور ترقی کرتی ہوئی تعلیمات کا باہمی تقابل کیا جا سکے۔ کیونکہ اس ارتقائی پراسس کا آخری مرحلہ اپنے ماقبل مذاہب سے مکمل ترین ہو گا۔ مزید یہ کہ مسخ شدہ مذہب اور حقیقی مذہب کو ایک دوسرے سے الگ کرنا ہو گا۔ تاکہ حقیقی مذہب اپنے ظاہری اختلافات کے باوجود وحدت ادیان کے ادارے کی اساس بن سکے۔ اس میں ایسی درس گاہوں کی ضرورت ہو گی جن میں ہر مذہب کا طالب علم اپنی کتاب مقدس کے علاوہ دوسرے مذاہب کی زبانوں کی تحصیل بھی کر سکے۔ تاکہ ان تمام کتب مقدسہ کا ایک ساتھ مطالعہ کیا جا سکے اور زبان اور اصطلاحات کے اختلافات سے مذاہب کے درمیان جو مغائرت پائی جاتی ہے اور جس مذہبی پیشوائیت کا عوام کی کم علمی کی وجہ سے فائدہ اٹھا کر مذاہب کے درمیان نزاعی کیفیت پیدا کرتی رہی ہے اور جس کی وجہ سے اتحاد انسانیت کا نصب العین آج تک عملاً حاصل نہیں کیا جا سکا، اس تک رسائی ہو سکے اس میں ایسے معبدوں اور عبادت گاہوں کی ضرورت ہو گی جن میں مختلف مذاہب کے پیروکار مل کر عبادت کر سکیں۔ تاکہ انسانی برادری میں محبت اور اعلیٰ قدریں فروغ پا سکیں۔"

اب مغرب اور مشرق کے "حوصلوں" میں فرق دیکھیے کہ یہ انقلابی تجویز، ترقی یافتہ مغرب کی بجائے ترقی پذیر مشرق کے مولانا عبید اللہ سندھی کے ایک پاکستانی پیروکار نے پیش کیا ہے یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا۔

"شہرت بہادری کے کارناموں کی خوشبو ہے"
سقراط

افیم کا سفر

محمد اسلم پرویز

جب سے انسان نے اس دنیا میں قدم رکھا ہے اس نے اپنے چاروں طرف پیڑ پودے دیکھے ہیں۔ ان پودوں میں سے کچھ نے اس کی زندگی، اس کے رہن سہن اور طرز عمل پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ افیم (افیون) کے پودے کا نام اس فہرست میں کافی اوپر آتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اناج کے بعد اگر کسی پودے نے حضرت انسان کی زندگی میں انقلاب برپا کیا ہے تو وہ افیم کا پودا ہے۔ اس پودے کی وجہ سے اگر ایک طرف قومیں اور نسلیں تباہ ہوئیں ملکوں میں جنگیں چھڑیں تو دوسری طرف اس سے حاصل شدہ دواؤں نے لاکھوں افراد کو بہت سے امراض سے نجات دی اور کئی ملکوں اور اداروں کو کروڑ ہا روپیوں کا فائدہ پہنچایا۔ دیکھنے میں یہ ننھا سا، خوبصورت سا پودا بڑا بے ضرر اور معصوم لگتا ہے۔ عموماً اس کی اونچائی تین فٹ کے اندر ہی رہتی ہے اور اس میں سفید، گلابی یا قرمزی رنگ کے پھول آتے ہیں۔ اس کی خوبصورتی اور سرور کو دیکھتے ہوئے قدیم مصوروں نے اس کی تشبیہ ایک حسین دوشیزہ سے کی تھی جس کی گھنیری زلفوں کے سائے میں لوگ مست و بے ہوش پڑے رہتے ہیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اس پودے کی کاشت اور اس سے افیم نکالنے کا فن بہت پرانا ہے۔ کئی صدیوں سے افیم کو بطور دوا استعمال کیا جا رہا ہے۔ آج سے تقریباً ساڑھے چار ہزار سال قبل بابل کے باشندے اس دوا سے فیض یاب ہوتے تھے۔ ان کے طبیب افیم کو شراب میں ملا کر پلاتے تھے جس سے مریض کو نیند آتی تھی اور درد کی تکلیف سے نجات ملتی تھی

یونان کے قدیم روایتی شاعر ہومر (۸۵۰ قبل مسیح) کے مشہور شاہکار اوڈیسی (Odyssey) میں ہیلن نے جو دوا استعمال کی ہے وہ افیم تھی۔ اس کی کیفیت کا بیان شاعر یوں کرتا ہے:

> جس برتن میں ان کو شراب پلائی گئی تھی اس نے (ہیلن کی طرف اشارہ ہے) ایک دوا ملا دی جس نے ان کو تمام غم اور غصے سے نجات دے دی اور تمام تکلیف دہ یادیں غائب ہوگئیں۔ جس نے بھی شراب میں یہ دوا لی تھی وہ اس دن رو نہ سکا چاہے اس کے ماں یا باپ ہی کیوں نہ ہلاک ہوئے ہوں، یا اس کے بیٹے یا بھائی کا سر اس کی آنکھوں کے سامنے ہی کیوں نہ قلم کر دیا گیا ہو۔"

پرانے مصری نسخوں میں اس پودے کے عرق کی مدد سے بچوں کو سلانے کا ذکر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ روتے ہوئے بچوں کو سلانے اور چپ کرنے کے لیے افیم کا استعمال اگرچہ نقصان دہ ہے لیکن آج بھی کہیں کہیں جاری ہے۔ اگرچہ چین میں بھی افیم بطور دوا صدیوں سے استعمال ہو رہی تھی لیکن بطور نشہ دکے افیم نے چین کو جتنا نقصان پہنچایا ہے کم از کم ماضی میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اٹھارھویں صدی کے اخیر تک چین میں افیم کا نشہ بہت کم تھا۔ وہاں افیم کو چانڈو کہا جاتا تھا اور اردو میں چانڈو خانے کا لفظ جس معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اس سے جو محاورے یا لطائف منسوب ہیں ان کی بنیاد یہی ہے۔ چانڈو خانے میں مٹی کے لیمپ

ذاکر حسین کالج، اجمیری گیٹ، دہلی۔

پائپوں میں افیم سلگا کر اس کا دھواں جسم کے اندر لے کر نشہ کیا جاتا تھا۔ کچھ ہی لمحوں بعد نشہ کرنے والا نیند کی وادی میں چلا جاتا تھا اور خوش گوار سپنے دیکھا کرتا تھا۔ اس افیم کی راکھ کو ایک قسم کے ایندھن میں ملا کر دوبارہ قابلِ استعمال بنایا جاتا تھا۔ یہ سستا نشہ ہوتا تھا جو کہ عموماً غرباء کے شوق کی تسکین کرتا تھا لیکن زہریلا ہونے کی وجہ سے اس سے اکثر اموات ہو جایا کرتی تھیں۔ انیسویں صدی تک چین میں بہت محدود پیمانے پر نشہ کیا جاتا تھا اور افیم کی کاشت سے وہاں کوئی واقف نہ تھا۔ لیکن انیسویں صدی کی شروعات سے ہی وہاں جو کچھ ہوا وہ آج کی دنیا کے لیے ایک زبردست سبق ہے۔ کس طرح مغربی ممالک، خاص طور سے انگریز، اپنے مفادات کی حفاظت کرتے ہیں کس طرح اپنے منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں اور کیوں کر کسی ملک کو اپنے استحصال اور اپنے مفاد کی خاطر تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ اس کی عمدہ ترین مثال ہم کو انیسویں صدی کے چین سے ملتی ہے۔

اگرچہ چین کے کافی نزدیک کے علاقوں تک یورپین اپنا تسلط جما چکے تھے لیکن چین کے اندر داخل ہونے میں وہ ناکام رہے تھے۔ چین میں اس وقت چیانگ حاکموں کا دور تھا جو کہ مغربی ممالک کے باشندوں کو ذہنی اور اخلاقی طور سے پست سمجھتے تھے۔ علاوہ ازیں چین کا سماج مستحکم تھا اور وہ اپنی تمام ضروریات خود ہی پوری کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کو مغربی ممالک سے کسی قسم کی تجارت کی بھی ضرورت نہ تھی۔ برخلاف اس کے یورپ چین سے تجارت کرنے کا خواہش مند تھا کیوں کہ ان کی نظریں چین کی چائے، ریشم، مصالحوں اور شیشے کے برتنوں پر تھی۔ باہری دنیا کے ممالک میں سے پرتگال پہلا ملک تھا جس نے چین کو اپنے ساتھ تجارت کے لیے راضی کیا۔ بعد ازاں جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے زبردست تجارتی بیڑہ تیار کر لیا تو ۱۷۷۳ء میں بنگال کی فتح کے بعد اس کمپنی نے چین میں قدم جمانے شروع کیے۔ کافی لمبی گفت و شنید کے بعد جس میں کہ انگریزوں کو کافی دبنا بھی پڑا، چین نے ایک کافی باہری جزیرہ تجارت کے لیے مخصوص کر دیا۔ لیکن اس تجارت میں چینی دلال پوری طرح حاوی تھے اور انگریز تاجروں کی حرکات و سکنات پر زبردست پابندی تھی علاوہ ازیں چین کی شرط یہ تھی کہ ان کے سامان کے بدلے میں ان کو چاندی دی جائے۔ کیوں کہ ان کو مغرب کے کسی سامان کی ضرورت نہیں ہے۔ چین کی اس کامیاب پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۱۵ - ۱۸۱۰ء کے مختصر وقفے میں ہی یورپ کی چاندی کی بڑی مقدار چین میں منتقل ہو چکی تھی۔ یورپ میں چاندی کی کمی نے وہاں مہنگائی پیدا کر دی جس سے کہ یورپین تاجروں کا منافع کم ہونے لگا۔ یہی وقت تھا جب یورپ کے تاجروں اور سیاست دانوں نے سر جوڑ کر چین کے اس معاشی وار کا توڑ تلاش کیا۔ انھوں نے طے کیا کہ چین کے باشندوں کو افیم کا چسکا لگا کر پھر وہاں افیم فروخت کی جائے یہ ایک ایسا غیر انسانی اور وحشیانہ فیصلہ تھا کہ ایسی مثال تاریخ میں کم ہی ملتی ہے۔ شروع میں برطانوی تاجروں نے وہاں مفت افیم تقسیم کی اور جب وہ لوگ عادی اور محتاج ہو گئے تو ان کو منھ مانگے داموں افیم فروخت کرنا شروع کر دی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی اس تجارت کو مزید مستحکم بنانے کے لیے ایک دوسرا قدم یہ اُٹھایا کہ وہ ہندوستان میں، جہاں کہ ان کا تسلط ہو چکا تھا، بنارس اور بہار کے علاقوں میں خاص طور سے افیم کی کاشت کرانی شروع کر دی۔ یہاں سے تیار شدہ افیم کو چین میں فروخت کیا جاتا تھا۔ ایک طرف چین کے عوام اس زہر کے شکار ہو رہے تھے تو دوسری طرف بنارس بہار اور جن دوسرے علاقوں میں افیم اگائی جا رہی تھی، وہاں چونکہ اناج کی پیداوار بند ہو چکی تھی اس لیے ان علاقوں میں قحط اور بھکمری کا راج ہو گیا۔ افیم کی کاشت چوں کہ لازمی تھی اس لیے لوگ اپنی ضرورت کے لائق بھی اناج نہیں اگا سکتے تھے۔ چین میں چوں کہ چاندی کی مقدار بہت تھی اس لیے وہاں خوش حالی تھی جس کی وجہ سے لوگوں نے فراخ دلی سے اس نشے کو قبول کیا۔ لیکن اس لعنت نے سال بھر کے اندر ہی اس وقتی خوشحالی کو کافور کر دیا۔ چین سے چاندی واپس یورپ میں جانے لگی جہاں دام گرنے لگے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے منافع اور دولت میں پھر اضافہ ہونے لگا۔ چین میں چونکہ سکہ رائج الوقت چاندی تھی اس لیے اس کی قلت نے وہاں مفلسی پیدا کر دی حکومت کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ کنفیوشس کے اقوال پر عمل کرنے والی قوم ایک دوسرے سے لاپرواہ اور تتر بتر ہو گئی۔ انگریزوں نے جب افیم کے یہ تباہ کن اثرات دیکھے تو انہوں نے فوراً اپنے ملک کے لیے یہ پیش بندی کر لی کہ افیم کی درآمد بالکل بند کر دی گئی۔ تاکہ یہ زہر بھولے سے بھی ان کے عوام تک نہ پہنچے کہ کہیں وہ

چینیوں کی طرح افیونی ہو جائیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اگرچہ عوام و خواص کی اکثریت اس ظلم سے بے پرواہ تھی لیکن کچھ انسان دوست سیاست دانوں نے پارلیمنٹ میں یہ سوال اٹھایا تھا اور برطانوی حکومت سے درخواست کی تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس عمل سے روکا جائے لیکن اس تجارت سے ہونے والے فائدوں کو دیکھتے ہوئے حکومت نے اس آواز کو دبا دیا۔ کیوں کہ برطانوی حکومت کو نئے علاقوں میں اپنی حکومت مستحکم کرنے کے لیے پیسے کی ضرورت تھی۔

۱۸۳۳ء میں شاہ تاؤ کا دانگ کا بیٹا اس لت کا شکار ہو گیا۔ بادشاہ نے کمشنر لین کو حکم دیا کہ افیم کی تجارت فوراً بند کر دی جائے۔ ۱۰ مارچ ۱۸۳۹ء کو لن نے ایک فرمان جاری کر کے افیم کی تجارت بند کر دی اور افیم کے تمام ذخائر کو نذر آتش کرا دیا۔ برطانوی سامراج اس جسارت پر تلملا گیا۔ برطانوی پارلیمنٹ میں بہت ہنگامہ ہوا اور وہاں یہ مطالبہ کیا گیا کہ حکومت اس بے عزتی کا بدلہ لے۔ برطانوی حکومت تو عرصے سے چین پر قبضہ کرنے کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھی اس واقعے نے ان کو یہ نادر موقع فراہم کر دیا اور انھوں نے چین پر دھاوا بول دیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بیڑے جن کے ہمراہ فرانس اور امریکہ کے جہاز بھی تھے، چین کے علاقوں میں داخل ہو گئے۔ چین کے عوام جو نشے کے عادی تھے اور جہاں بارود کا استعمال صرف آتش بازی تک محدود تھا اور جہاں یہ سمجھا جاتا تھا کہ فوج امن برقرار رکھنے کے لیے ہوتی ہے۔ وہ مغربی ممالک کی افواج کا کیا مقابلہ کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۵۰۰ برطانوی فوجیوں کے بدلے میں ۲۰،۰۰۰ چینی مارے گئے۔ اگست ۱۸۴۲ء میں نانکنگ معاہدہ ہوا جس کی رو سے اس لڑائی کے اخراجات چین کو ادا کرنے پڑے۔ چین نے یہ ہرجانہ ۲ کروڑ ۱۰ لاکھ ڈالر کی شکل میں ادا کیا۔ علاوہ ازیں چین میں مغربی ممالک کو تجارتی آزادی دی گئی اور ہانگ کانگ برطانوی تسلط میں چلا گیا۔ (ہانگ کانگ کا مسئلہ ابھی حال ہی میں طے ہوا ہے۔ ویسے ابھی تک وہ برطانوی اثر میں ہی ہے)۔ اس طرح کئی مراعات فرانس اور امریکہ نے بھی حاصل کر لیں اور چین ایک طرح سے پورے طور پر مغربی اثر میں آ گیا۔ افیم کی تجارت پھر شروع ہو گئی۔ ۱۹۰۰ء میں یہ حالت تھی کہ تقریباً دس فیصد چینی باشندے باقاعدہ افیم کا استعمال کرتے تھے۔ چین کے جن علاقوں پر برطانیہ کا قبضہ تھا وہاں افیم کی کاشت شروع ہو گئی اور رفتہ رفتہ چین میں بھی یہ کاشت ہونے لگی۔

اس طوفان کو روکنے کی کوشش ۱۹۰۶ء سے شروع ہوئی۔ ۱۹۱۱ء میں جب چیانگ حکومت کا خاتمہ ہوا تو اس کام نے اور زور پکڑا لیکن اسی وقت بھی صورت حال یہ تھی کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران صرف شنگھائی شہر میں ہی ۶۶۰ (چھ سو ساٹھ) چانڈو خانے تھے۔ رفتہ رفتہ چین نے اس بلا سے نجات پائی۔ مثل مشہور ہے کہ جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے خود ہی اس میں گر جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی مغربی ممالک کے ساتھ ہوا۔ جو لت انھوں نے چین کی چاندی حاصل کرنے کے لیے وہاں پہنچایا تھا، اس نے ان ممالک میں بھی قدم جما لیا۔ اس قسم کی وبائیں اور رجحانات سرحدوں سے نہیں رکتے۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ تک جنوبی امریکہ میں افیم کے نشے نے وبائی صورت اختیار کر لی تھی۔ امریکہ اور کنیڈا کے شہر اس کی لپیٹ میں تھے۔ ۱۹۵۰-۷۰ء کے دوران زیادہ تر افیم ترکی کے اناتولین علاقے میں اگائی جاتی تھی۔ جہاں سے اسے مارفین میں تبدیل کر کے فرانس بھیجا جاتا تھا، جہاں اسے ہیروئن میں تبدیل کیا جاتا تھا۔ اس تجارت میں زبردست فائدہ تھا۔ دس کلو افیم جو کہ ۲۰۰ سے ۳۰۰ ڈالر کے درمیان مل جاتی تھی ایک کلو ہیروئن میں تبدیل کرنے کے بعد ۵۰،۰۰۰ ڈالر کی فروخت ہوتی تھی۔

۱۹۷۰ء میں امریکہ کے صدر نکسن نے افیم کے خلاف اعلان جنگ کر دیا انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ افیم کے پھیلاؤ کو روکنے کی سب سے کارگر ترکیب یہ ہو سکتی ہے کہ ترکی میں اس کی کاشت کو روکا جائے۔ چوں کہ ترکی حکومت امریکہ کے اثر میں اور اس پر کافی حد تک منحصر تھی۔ اس لیے امریکہ نے ترکی کی حکومت پر دباؤ ڈالا کہ وہ افیم کی کاشت کو روکے۔ امریکہ نے ساڑھے تین کروڑ ڈالر سالانہ ترکی کو دیے کہ وہ کسانوں کو یہ پیسہ تقسیم کر کے افیم کی کاشت سے روکے اور اس دوران ان کے لیے متبادل فصلوں کی تلاش ہو۔ لیکن جیسا کہ آگے پتہ لگا یہ اقدامات ترکی کے لیے تباہ کن ثابت ہوئے۔ افیم کی کاشت کرنے والوں کا پورا انحصار اس فصل اور اس سے تیار شدہ چیزوں پر تھا۔ چوں کہ اناتولیہ کے کسان صدیوں سے یہ کاشت کر رہے تھے اس لیے ان کے پاس اور کوئی فصل نہیں تھی۔ علاوہ ازیں اس علاقے کا موسم حالات اور زمین اس قابل نہ تھی کہ اس پر کوئی اور فصل لگائی جائے۔ بارش بہت کم تھی اور سڑکیں بھی اس قابل نہ تھیں کہ یہ لوگ شہر سے کوئی

تجارتی تعلق قایم کرلیتے۔ لیکن حکومت نے معاہدے کی وجہ سے ۱۹۷۲ء اور ۱۹۷۳ء میں افیم کی کاشت روکنے کی پوری کوشش کی۔ فوجوں نے کھڑی فصلوں کو آگ لگادی۔ ہیلی کاپٹروں نے کھیتوں کے اوپر ایسی دوائیں چھڑکیں جن سے فصلیں تباہ ہوگئیں۔ یہ دوائیں وہی تھیں جو امریکے نے ویتنام کے جنگلوں پر چھڑکی تھیں، تاکہ سب درخت ننگے ہو جائیں۔ پتے ٹہنیاں گر جائیں تاکہ جنگل میں چھپے گوریلے نظروں میں آسکیں۔ ظاہر ہے ترکی کو یہ دوائیں امریکے نے ہی مہیا کی تھیں۔ انقرہ سے ۱۵۰ میل شمال مغرب میں واقع شہر افیون (ترکی میں افیم کو افیون کہتے ہیں) جو کہ اس سرگرمی کا مرکز تھا، سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ ہزاروں افراد جرمنی اور فرانس میں جاکر نوکریاں کرنے لگے۔ یہ لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر ایک نئے ماحول میں گئے تھے، جہاں کی نہ وہ زبان سمجھتے تھے اور نہ اس تہذیب سے واقف تھے۔ اس لیے قدرتی طور پر وہ وہاں اپنے آپ کو ڈھال نہ سکے جس کی وجہ سے وہ جرائم کی دنیا میں داخل ہو گئے۔ اپنے عوام کی اس بربادی کو دیکھتے ہوئے ترکی نے امریکہ سے اس معاہدہ پر نظر ثانی کرنے کو کہا۔ امریکہ میں اس کا زبردست ردّعمل ہوا۔ ۸ کے مقابلے میں ۱۸ ووٹوں سے سینٹ نے یہ منظوری دے دی کہ ترکی کی تمام امداد بند کردی جائے اور ساتھ ہی امریکہ نے اپنا سفیر بھی واپس بلالیا۔ بعد ازاں ناٹو (NATO) معاہدے کے دیگر ممبران کی مداخلت سے یہ مسئلہ اس طرح حل ہوا کہ ترکی نے یہ یقین دہانی کرائی کہ وہاں افیم کی کاشت حکومت کی نگرانی میں اور لائسنس سے کی جائے گی حکومت خود ہی اس سے مارفین نکال کر دوا بنانے والی کمپنیوں کو سپلائی کرے گی۔ ۱۹۷۵ء میں اس معاہدے کی پہلی فصل لگائی گئی۔ اس تجربے سے امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کو یہ احساس ہو گیا کہ کاشت کو روکنے سے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔ اس قدم سے امریکہ نے اپنے ایک ساتھی ملک کو بھی ناراض کیا، لیکن نشے کی حالت برقرار رہی بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ترکی سے سپلائی بند ہونے کے بعد افیم کے مہنگے ہونے سے حالات اور خراب ہو گئے اور نئے نئے راستے نکالے گئے۔ نئے نئے علاقوں سے افیم آنے لگی۔ میکسیکو سے ٹیکساس اور کیلی فورنیا کے راستے اس کی سپلائی قائم ہو گئی۔ ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے امریکی حکومت نے فیصلہ کیا کہ اس نشے کا علاج نشے باز سطح پر نہ کرنا ہوگا۔ ان وجوہات کو سمجھنا اور ان کا حل نکالنا ہوگا جن کی وجہ سے عوام نشے کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔

افیم کیسے بنتی ہے:

افیم کے پودوں میں پھول آتے ہی کاشت کار تیار ہو جاتے ہیں۔ پھول کی پنکھڑیاں گرنے کے بعد ٹہنی پر ایک ننھا سا گول کیپسول لگا رہ جاتا ہے۔ جو شروع میں ہرا اور بعد میں بھورا یا پیلا ہو جاتا ہے۔ یہی اس پودے کا پھل ہوتا ہے جس کے اندر اس کے بیج ہوتے ہیں۔ اس ہرے پھل میں شام کے وقت ایک خاص اوزار سے کچھ نشتر یا چیرا لگا دیا جاتا ہے۔ جس میں سے سفید سفید دودھ جیسا رقیق مادہ نکلنے لگتا ہے۔ تمام رات یہ سفید دودھ نکلتا ہے۔ کل ملا کر دنیا میں لگ بھگ ۱۰۰۰ میٹرک ٹن افیم بنتی ہے جس میں سے صرف ۲۰۰۰ ٹن دواؤں میں استعمال ہوتی ہے۔ ہندوستان میں اس کی کاشت مدھیہ پردیش، اترپردیش اور راجستھان کے علاقوں تک محدود ہے۔

موجودہ صورت حال

افیم کا پودا ہر اس جگہ اگایا جاسکتا ہے جہاں موسم گرم ہو اور دھوپ کافی مقدار میں موجود رہتی ہو۔ چونکہ اس کی پیداوار میں انسانی ہاتھوں کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے، اس لیے تجارتی اعتبار سے ان علاقوں میں اس کا اگانا مفید ہے جہاں مزدوری سستی ہو۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی میں ہر سال اوسطاً ۱۰۰ میٹرک ٹن افیم تیار ہوتی ہے جس کی خاصی مقدار مقامی استعمال میں آجاتی ہے۔ افغانستان میں بھی تقریباً اتنی ہی پیداوار ہے لیکن اس کا بڑا حصہ مشرق وسطیٰ کے ممالک کو اسمگل ہو جاتا ہے۔ ترکی میں ۶۰ سے ۱۰۰ میٹرک ٹن کے درمیان پیدا ہونے والی افیم مغربی ممالک میں دوا بنانے کے کام آتی ہے۔ حال ہی میں میکسیکو نے بھی افیم کی کاشت شروع کی ہے لیکن ابھی اس کی پیداوار ۱۰ میٹرک ٹن سے بھی کم ہے۔ افیم کی پیداوار کے لیے سب سے مشہور علاقہ اس وقت وہ ہے جس کو سنہری مثلث یعنی گولڈن ٹرائی اینگل (Golden Triangle) کہتے ہیں۔ اس میں برما، لاؤس اور کمبوڈیا کے علاقے شامل ہیں۔ ان علاقوں کے بارے میں اگرچہ صحیح اور واضح اعداد و شمار مفقود ہیں، لیکن پھر بھی یہ اندازہ ہے کہ یہاں ۲۵۰ سے ۵۰۰ ٹن سالانہ افیم تیار ہوتی ہے۔ اس کا دودھ

رس رس کر سوکھتا رہتا ہے۔ علی الصباح اس کو پھل سے کھرچ کر اس میں سے پانی نکال کر اس کو دھوپ میں سکھا لیا جاتا ہے۔ سوکھ کر یہ بھورے رنگ کے ایک بدبودار مادے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہی وہ افیم ہوتی ہے جس نے کئی قوموں اور ملکوں کی تقدیریں بدل دیں۔ اگرچہ اس خاندان میں بہت سارے پودے ہیں جو لگ بھگ ایک سی شکل رکھتے ہیں لیکن صرف ایک پودا ایسا ہے جو کہ افیم بنانے کے کام آتا ہے۔

افیم کے پودے کا استعمال محض افیم بنانے تک محدود نہیں ہے افیم جس پھل میں سے نکالی جاتی ہے، اس کے ننھے ننھے سفید بیج سکھا کر استعمال کیے جاتے ہیں۔ ہم سبھی ان کے ذائقے سے بخوبی واقف ہیں۔ یہ بات آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن سچ ہے کہ ہم سب نے افیم کے بیج کھائے ہیں۔ اگر یقین نہ آئے تو بتائیے کیا آپ نے خشخش استعمال نہیں کی ہے؟ جی ہاں خشخش درحقیقت افیم کے بیج ہی ہوتے ہیں لیکن اس میں نشہ بالکل نہیں ہوتا ہے اور ان کا استعمال ہر اعتبار سے جائز ہے۔ ان بیجوں سے تیل بھی نکالا جاتا ہے جس کا کافی استعمال ہوتا ہے۔ اس کی کھلی (تیل نکالنے کے بعد بقیہ ماندہ بیج) جانوروں کو کھلانے میں اور بسکٹ بنانے میں استعمال ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں افیم سے بھی بہت سی دیگر ادویات تیار کی جاتی ہیں۔ پٹرولیم کی مانند افیم بھی بہت سے مرکبات کا مجموعہ ہے۔ جس طرح پٹرولیم سے پٹرول، مٹی کا تیل، تارکول اور دیگر چیزیں بنائی جاتی ہیں، اسی طرح افیم بھی اپنے اندر ۲۴ مرکبات رکھتی ہے لیکن ان میں سے تین بہت اہم ہیں اور تینوں نے ہی انسان کی زندگی پر اچھا اثر ڈالا ہے افیم سے مارفیا یا مارفین نکلتی ہے جو کہ نیند لانے اور درد بھگانے کی بے مثال دوا ہے لیکن اس کو بطور نشہ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سے آنتوں کی حرکت میں کمی آتی ہے۔ اس وجہ سے اس کو شدید دستوں اور ہیضے میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس دوا کو انجکشن کے ذریعے داخل کیا جاتا ہے

کیوں کہ یہ معدے سے پوری طرح جذب نہیں ہو پاتی۔ اس کا نشہ کرنے
بھی انجکشن کے ذریعے ہی اس کو جسم میں داخل کرتے ہیں۔ ۱۰ سے ۱۵
(ایک ملی گرام ایک گرام کا ایک ہزارواں حصہ ہوتا ہے) مارفین سے ایک
تقریباً چھ گھنٹے تک نیند میں رہتا ہے۔ ۳۰ ملی گرام سے زیادہ مقدار ا
آدمی کو ہلاک کر سکتی ہے لیکن نشے باز جو کہ اس کے عادی ہو جاتے ہیں
اس سے کہیں زیادہ مقدار لینے پر بھی زندہ رہتے ہیں۔ مارفین سے ہی
بنائی جاتی ہے جو کہ اس وقت استعمال ہونے والا کافی عام اور خطر
نشہ ہے۔ ان دونوں دواؤں میں خاص بات یہ ہے کہ یہ انسان کے جس
ہونے والی کیمیائی عملات میں شامل ہو جاتی ہیں۔ جس کی وجہ سے ا
نظام ان کا عادی ہو جاتا ہے۔ اس حالت کے بعد ان دواؤں سے
پیچھا چھڑانا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ کیوں کہ جس طرح جسم کو خوراک اور پانی کی
ضرورت ہوتی ہے اور وہ اس کو مانگتا ہے۔ کبھی ہم کو پیاس لگتی ہے تو کبھی بھو
اسی طرح جسم پھر ان دواؤں کو بھی مانگنے لگتا ہے اور ان کے نہ ملنے
کی حالت خراب ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے کہ ان کا شکار مرتے د
ان کے پنجے سے نہیں نکل پاتا ہے بشرطیکہ وہ کسی ڈاکٹر کی مدد نہ ل
یہی دونوں مرکبات صحیح مقدار میں بے حد مفید ثابت ہوتے ہیں
سے نکلنے والی ایک اور دوا کوڈین ہے جو کہ کھانسی کے علاج
بے حد استعمال ہوتی ہے۔ ۱۸۳۲ء سے جب کہ کوڈین کو افیم سے نکالا گیا تھا، یہ دوا کروڑوں افراد کو کھانسی سے راحت پہنچا چکی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایٹمی توانائی کی طرح افیم کا غلط استعمال بھی انسان کی ہی اختراع ہے۔ ورنہ تو اس پودے میں بھی فائدے ہی فائدے پوشیدہ ہیں۔

"اسلام کا صحیح مسئلہ یہی ہے کہ اسی کام کے کرنے میں ثواب ہے جس کی ضرورت ہے۔ دیکھو کوئی اجر ہجرت سے زیادہ نہ تھا جس کی اس وقت بڑی ضرورت تھی۔ فتح مکہ کے بعد کچھ بھی نہ تھا۔ جیش اسامہ کی تیاری کے لیے جو چار ٹکے کا اسباب ابوبکر صدیقؓ نے حاضر کیا جس کی ضرورت تھی مگر اب اس کی برابری کو وہ احد کے برابر سونا بھی نہیں کر سکتا۔"

سر سید احمد خانؒ

عمر خیام

سید عبدالودود شاہ

بادشاہ زادہ سخت بیمار تھا۔

بڑے بڑے ماہرین طب اس کا علاج کر کے ہار مان چکے تھے۔ اتنے میں ایک شخص آیا۔ اس نے بادشاہ سے کہا، میں شہزادے کا علاج کروں گا۔ اللہ شفا دینے والا ہے۔

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق بادشاہ راضی ہو گیا۔ اس نووارد نے شہزادے کا علاج کیا۔ خدا کی قدرت سے شہزادہ اچھا ہو گیا بادشاہ بہت خوش ہوا اور شاہانہ فیاضی سے کہا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ دنیاوی آسائشوں سے بے نیاز اس شخص نے کچھ نہیں لیا۔ اس پر اسے شاہی طبیب کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔

یہ شخص تھا عمر خیام۔ جس کو آج ہم صرف ایک شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے عہد کا یکتائے روزگار شخص تھا جو شاعری تو محض تفریح طبع کے لیے کرتا تھا، ورنہ وہ اپنے عہد کا ایک اعلیٰ پائے کا حکیم اور فلسفی اور زبردست ریاضی دان اور ماہر فلکیات اور سائنس داں تھا۔!

عمر خیام کا اصل نام ابو الفتح عمر بن ابراہیم الخیامی تھا جس عہد میں سلطان محمود غزنوی کی عظیم الشان سلطنت زوال پذیر تھی اور وہ صرف افغانستان اور پنجاب تک محدود رہ گئی تھی اس عہد میں ۱۰۳۹ء میں عمر خیام پیدا ہوئے۔ (سلطان محمود غزنوی کا انتقال ۱۰۳۰ء میں ہوا تھا)۔ ایران کے صوبے خراسان کے مشہور شہر نیشاپور میں عمر کی پیدائش ہوئی۔ ان کے والد خیمہ دوز تھے۔ یعنی خیمہ سیتے تھے۔ اس نسبت سے عمر کو بھی عمر خیام کہا جاتا ہے۔ اگرچہ عمر خیام نے کبھی باپ کا پیشہ نہیں اختیار کیا

پروفیسر علی ناصر زیدی اپنی کتاب "مسلمان موجد اور سائنس داں" میں لکھتے ہیں۔

عمر خیام کی شہرت و قابلیت میں ان کے وطن عزیز نیشاپور کا بڑا حصہ ہے، جو علم و ادب کا ایک بڑا مرکز تھا۔ اس نے سامانیوں، آل بویہ اور غزنویوں کا عہد اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ خیام کی پیدائش سے ایک سال قبل سلجوقیوں کے قدم یہاں آئے تھے۔ اس وقت یہاں کئی اچھے مدرسے موجود تھے اور علمائے روزگار علمی مجالس و مباحث میں مصروف رہتے تھے عمر خیام نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی اور اس سے بہت کچھ استفادہ کیا

(ص ۱۳۸)

خواجہ جمیل احمد اپنی کتاب "مشہور مسلمان سائنس داں" میں لکھتے ہیں

" اگرچہ عام طور سے عمر خیام کو ایرانی تسلیم کیا جاتا ہے لیکن کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ عربی قبیلہ "الخیامی" کے فرد تھے جو خیمہ بناتے تھے اور ایران کی فتح کے بعد عرب سے ہجرت کر کے ایران میں آباد ہو گئے۔"

(مشہور مسلمان سائنس داں ص ۱۳۹)

سید قاسم محمود نے اسلامی انسائیکلوپیڈیا میں تاریخ پیدائش ۱۰۳۹ء ہی درج کی ہے (ص ۱۱۰۱) لیکن عمر خیام کی تاریخ پیدائش خواجہ صاحب نے کتاب مذکور میں ۱۰۴۸ء لکھی ہے جو قابل غور ہے۔

یہی تاریخ انھوں نے اپنی انگریزی تصنیف "ہنڈرڈ گریٹ مسلم" میں بھی درج کی ہے۔ (ص ۲۲۳)

عمر خیام کے ابتدائی حالات کے بارے میں خواجہ صاحب کی تحقیق کے مطابق عمر خیام کی ابتدائی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں لیکن ایک متمول خاندان کے فرد ہونے کی وجہ سے انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور دنیائے اسلام کے مشہور استاذ، امام موفق کے شاگرد رہے۔ یہاں ان کی ملاقات حسن علی بن اسحاق سے ہوئی جو بعد میں نظام الملک طوسی کے نام سے سلجوقی حکمرانوں کے وزیر اعظم ہوئے اور حسن بن صباح سے بھی ہوئی جس نے آگے چل کر اسمٰعیلی فرقے کی بنیاد ڈالی۔

(ص ۱۳۹)

پروفیسر علی ناصر زیدی نے لکھا ہے:

بو علی سینا اپنے وقت کا ممتاز عالم اور سائنس داں تھا۔ خیام کو اس کا فیض تو میسر نہیں آسکا کیوں کہ بو علی سینا دو سال قبل ہی وفات پا چکا تھا۔ البتہ اس کے کئی فاضل شاگرد اس کی یادگار، اس شہر میں موجود تھے جن میں ابو الحسن زنہاری کا نام قابل ذکر ہے۔ خیام نے ان کی شاگردی اختیار کی اور فلسفہ، ریاضی اور ہیئت کا درس لیا۔ عمر خیام نے طب کا مطالعہ بھی کیا تھا۔

(مسلمان موجد اور سائنس داں۔ ص ۱۳۸)

عمر خیام نے ایک ایسے دور میں ہوش سنبھالا اور تعلیم حاصل کی۔ جب مسلمانوں کا ہر شہر علم و حکمت کا گہوارہ تھا اور مسلمانوں نے علوم و فنون کو جامد نظریات سے نکال کر متحرک اور جاندار شکل دی اور تجرباتی سائنس کی بنیاد ڈالی۔ یہی سائنس بیسویں صدی کی حیرت انگیز ترقیات کی بنیاد بنی۔

اس عہد زریں میں سمر قند، بخارا، بلخ، نیشا پور اصفہان جیسے شہر اپنی ترقی اور اپنی چمک دمک سے مغرب کی آنکھوں کو خیرہ کرتے تھے۔ ترک حکمرانوں نے علماء و فضلاء کی بے حد قدر و منزلت کی۔ ترکوں کی حکومت ترکستان میں کئی صدیوں تک قایم رہی۔ عمر خیام کی جوانی میں اس سلطنت کا فرماں روا شمس العلا تھا۔ اس کا پایہ تخت سمر قند تھا۔ یہ حکمراں خود عالم تھا اور اہل علم کی قدر کرتا تھا۔ اس کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ نیشا پور میں تعلیم کے زمانے سے ہی علم و ہنر کے دیگر شعبوں کے ساتھ عمر خیام کو ریاضی سے بھی گہری دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلے اس مضمون میں ایک کتاب "مکعبات" تصنیف کی۔ جس میں جذر نکالنے کے مختلف طریقوں سے بحث کی گئی ہے (حوالہ کتاب مذکورہ بالا از پروفیسر علی ناصر زیدی۔ ص ۱۳۸ - ۱۳۹)

بحیثیت ایک سائنس داں کے ان کی تحقیق اور دریافتیں بہت وسیع ہیں۔ پہلا اہم علمی کام اسی کتاب "مکعبات" کی تصنیف ہے۔ جس کا ذکر اوپر آیا ہے مگر چوں کہ ان کے کام کی توقیر نہیں ہوئی، اس لیے وہ دل برداشتہ ہو کر ترکستان کے دار الحکومت سمر قند چلے گئے۔ "مکعبات" نامی کتاب کا پورا نام خواجہ جمیل احمد نے اپنی کتاب "مشہور مسلمان سائنس داں" میں البرہان استخراج اضلاع المربعات والمکعبات" لکھا ہے

(ص ۱۴۴)

سمر قند میں عمر خیام نے کافی عرصے قیام کیا اور یہاں وہ ایک رئیس ابو طاہر کے دربار سے وابستہ ہو گئے اور کام شروع کیا۔ ابو طاہر خود صاحب علم آدمی تھا اور اہل علم کی قدر کرتا تھا خود بھی ماہر ریاضی تھا اس کے ہاں عمر خیام نے اپنی مشہور تصنیف الجبر والمقابلہ ترتیب دی ہے۔ ۱۰۶۷ء کا زمانہ ہے جب عمر خیام کی عمر صرف ۲۸ سال تھی۔

(علی ناصر زیدی حوالہ ایضاً۔ (ص ۱۳۹)

سمر قند اور بخارا دو الگ شہر تھے لیکن خواجہ جمیل احمد نے اپنی مذکورہ کتاب میں اس شہر کا نام بخارا درج کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہاں پر انھوں نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "جبر و مقابلہ" مکمل کی، علوم ریاضی الجبرا، مساحت اور اقلیدس سے خیام کو بڑی دلچسپی تھی۔ الجبرا میں انھوں نے ابو موسیٰ خوارزمی کی پیروی کی لیکن خیام نے خوارزمی کے الجبرا میں اضافہ کیا اور اس پر جدید الجبرا کی بنیاد پڑی (خواجہ جمیل احمد۔ مشہور مسلمان سائنس داں ص ۱۴۳)

اس کتاب کے بارے میں سید قاسم محمود نے اسلامی انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے۔

ابو طاہر کے کہنے پر عمر خیام نے اپنی مشہور تصنیف الجبر والمقابلہ لکھی۔ اس کتاب کو اس نے ۱۰۶ء میں سمر قند میں لکھنا شروع کیا اور ۱۰۷۴

میں مکمل کیا۔ اسلامی عہد میں یہ الجبرے پر چوتھی یا پانچویں کتاب تھی جو اس مضمون کی پہلی کتاب یعنی محمد بن موسیٰ خوارزمی کے ڈھائی سو سال بعد تالیف کی گئی تھی۔ (شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا ص ۱۱۰۲)

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ علی ناصر زیدی اور قاسم محمود کا اس کتاب کی تصنیف کے سال کے بارے میں اتفاق رائے ہے۔ پروفیسر زیدی نے مزید لکھا ہے کہ اس تصنیف میں جو نظریات پیش کیے گئے وہ آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔ ۱۸۵۱ء میں اس تصنیف کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کیا گیا۔ (یہی سن خواجہ جمیل احمد نے بھی درج کیا ہے)۔ خواجہ صاحب مزید لکھتے ہیں۔

اس کی مزید اہم تصانیف پیرس اور انڈیا آفس لندن میں محفوظ ہیں اقلیدس سے متعلق اس کی تصنیف "مصادرات" اور حساب سے متعلق اس کی کتاب "مشکلات حساب" میونخ (جرمنی) میں موجود ہیں۔

(خواجہ جمیل احمد۔ حوالہ ایضاً)

خواجہ صاحب مزید لکھتے ہیں۔

دی منورسکی کے قول کے مطابق وہ زمانۂ وسطیٰ کا عظیم ترین ریاضی داں تھا اور اس نے اہم ترین کارنامہ الجبرا کے میدان میں سرانجام دیا اس نے یونانیوں اور خوارزمی کے مقابلے میں الجبرا کے علم میں بڑا اضافہ کیا عمر خیام نے مساواتِ مکعب کا حل بتایا ہے۔ جب کہ خوارزمی کی تگ و دو محض مساوات مربع تک محدود تھی۔ تراش مخروطی کے ذریعے مربع اور مساوات مکعب کا حل عربی ریاضی کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور بلند ترین نمونہ ہے جو دستیاب ہو سکا ہے۔ بقول میکس میرہاف اقلیدس داں کی حیثیت سے اس کی مہارت اس کی ادبی فضیلت کے برابر ہے جو اس کی منطقی قوت اور بصیرت کو ظاہر کرتی ہے (مشہور مسلمان سائنس داں ص ۱۴۴)

علم طبعیات میں عمر خیام کی تحقیق سونے اور چاندی کے اوزان سے متعلق ہے۔ اس کی کتاب میزان الحکما، میں ایسی اشیاء کے اوزان معلوم کرنے کے طریقے درج ہیں جن میں قیمتی پتھر جڑے ہوں اور وہ پتھر نکالے بغیر ان اشیاء کا وزن معلوم کیا جا سکے۔

(ایضاً ص ۱۴۴ - ۱۴۵)

سید قاسم محمود اس ضمن پر اسلامی انسائیکلوپیڈیا میں لکھتے ہیں!

اگرچہ اسے ریاضی سے خاص شغف تھا لیکن وہ طب میں بھی دستگاہ رکھتا تھا۔ چنانچہ ملک شاہ کے دربار میں اس کا تعارف ایک طبیب کی حیثیت سے ہوا۔ ملک شاہ کے ایک بیٹے کو چیچک نکل آئی اور طبیبوں کے علاج کے باوجود اس کی حالت غیر ہوتی گئی۔ اس وقت عمر خیام کو طلب کیا گیا۔ جس کے علاج سے خدا نے ملک شاہ کے بیٹے کو شفا بخشی، اس کامیابی کے بعد اسے شاہی طبیب کے عہدے پر سرفراز کیا گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ریاضی اور ہیئت کے مقابلے میں طب سے اس کی وابستگی اور دلچسپی کم تھی اسے شکایت تھی کہ عوام و خواص ایک طبیب کی حیثیت سے تو اس کی بہت قدر و منزلت کرتے ہیں لیکن اس سے ان کا ذاتی مفاد وابستہ ہے لیکن ریاضی اور ہیئت میں اس کی شاندار تحقیقات کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔

آخر وہ وقت آیا کہ عمر خیام کو ریاضی داں اور ہیئت داں کی حیثیت سے اپنی لیاقت کا اعتراف کرانے کا موقع مل گیا۔ ملک شاہ سلجوقی نے اصفہان میں ایک رصدگاہ تعمیر کی اور اس میں عمر خیام کو ایک اعلیٰ افسر کی حیثیت سے مقرر کیا۔ اس نے ایک کثیر رقم آلاتِ رصد کے لیے دی اور رصدگاہ کے عملے میں عمر خیام کے ساتھ سات دیگر ہیئت داں بھی مامور کیے یہاں عمر خیام نے اپنی تحقیقاتی سرگرمیاں تیز کر دیں اور کئی معاملات میں اجتہادی تبدیلیاں کیں (شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا ص ۱۱۰۲)

سید قاسم محمود نے عمر خیام کے بارے میں آخری سطور میں جو لکھا ہے اس کی وضاحت یہاں موجود نہیں ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ سید صاحب کے پیش نظر عمر خیام کی ایک مختصر اور جامع سوانح پیش کرنا تھا۔ اس کے علمی اور تحقیقی کاموں پر علیحدہ بحث ہو سکتی ہے۔ اس کی وضاحت میں پروفیسر علی ناصر زیدی نے اپنی محولہ بالا کتاب میں لکھا ہے۔

اس رصدگاہ میں عمر خیام نے جو اہم ترین کارنامہ انجام دیا ہے اس کا تھوڑا سا ذکر ہم شروع میں کر چکے ہیں۔ یعنی وہ کیلنڈر جو تاریخ الجلالی کے نام سے مشہور رہے اور گریگوری کے کیلنڈر سے بھی زیادہ صحیح ہے۔ گریگوری کے قدیم کیلنڈر میں تین ہزار تین سو برس کے بعد ایک دن کا مغالطہ پیدا ہوتا ہے لیکن عمر خیام کے کیلنڈر میں پانچ ہزار برس کے بعد ایک دن کا فرق پیدا ہوتا ہے۔" چنانچہ خواجہ جمیل احمد نے بھی اس ضمن میں اپنی مذکورہ کتاب

مشہور مسلمان سائنس دان" میں لکھا ہے۔

ملک شاہ سلجوقی کو نئی تقویم تیار کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ کیوں کہ قمری و شمسی ماہ اور سال میں کافی فرق ہو جاتا تھا اور سرکاری مالیہ کا آغاز اسلامی سال یعنی یکم محرم سے ہوتا تھا۔ اس کی وجہ سے حساب و کتاب میں کافی دشواری پیش آتی تھی۔ خلیفہ مامون الرشید نے اس الجھن کو دور کرنے کے لیے دونوں سال ملا دیے تھے لیکن ۲۴۲ھ میں پورے ایک سال کا فرق ہو گیا۔ عباسی خلیفہ المتوکل کے عہد خلافت میں زائد سال پھر ختم کر دیا گیا لیکن ہر ۲۲ سال بعد یہ فرق پڑتا رہا۔

(ص ۱۴۵)

خواجہ صاحب نے آگے چل کر رصد گاہ کی تعمیر اور وہاں عمر خیام کے تحقیقی کام کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے۔

گریگورین کیلنڈر جو آج کل رائج ہے، عمر خیام نے اس سے ۶ سو سال قبل تاریخ جلالی مرتب کی جو گریگورین کیلنڈر سے اب بھی زیادہ صحیح ہے بقول سیڈیلیٹ" یہ اس (گریگورین کیلنڈر) سے بھی زیادہ درست ہے"۔

(ص ۱۴۶)

اس کیلنڈر (تقویم) کا نام تاریخ الجلالی کیوں رکھا گیا اور اسے عمر خیام کا سب سے بڑا کارنامہ کیوں سمجھا جاتا ہے۔ درحقیقت عمر خیام کا یہی ایک کام اسے یاد رکھنے کے لیے کافی ہے لیکن نہایت افسوس ناک امر یہ ہے کہ ہماری اکثریت عمر کے اس عظیم علمی کارنامے سے بے خبر ہے لہٰذا ہم اس کا تفصیل سے تذکرہ کریں گے۔ اس کا نام ملک شاہ جلال الدین کے حوالے سے رکھا گیا ہے۔ پروفیسر علی ناصر زیدی اپنی محولہ بالا کتاب پر آگے صفحہ ۱۴۰ پر لکھتے ہیں۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ زمین جتنے عرصے میں سورج کے چاروں طرف ایک بار گردش کرتی ہے وہ مدت ایک سال کہلاتی ہے۔ قدیم یونانی حکماء اسے پورے ۳۶۵ دن سمجھتے تھے۔ بطلیموس نے اس میں پانچ گھنٹے ۵۵ منٹ کا اضافہ کر دیا، لیکن عمر خیام نے اپنی تحقیقات کے بعد یہ مدت ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے ۴۹ منٹ قرار دی۔ ہم موجودہ دور میں بہت سے سائنسی آلات کی ایجاد کے بعد یہ مدت ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے ۴۸ منٹ اور ۴۶،۷ سکنڈ مانتے ہیں۔ یعنی خیام کی معلوم کردہ مدت اور آج کی مدت کے درمیان صرف چند ثانیوں کا فرق ہے۔

(حوالہ کتاب ایضاً ص ۱۴۰)

واضح رہے کہ عمر خیام کے دور میں ان جدید سائنسی آلات کا تصور بھی نہیں تھا جو آج اس قسم کی پیمائشوں میں عام مستعمل ہیں۔ اس سے عمر خیام کی بحیثیت ریاضی داں اور ہیئت داں۔ خداداد فراست ظاہر ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ عمر خیام اپنے وقت کئی صدیوں سے آگے تھا۔ صرف عمر خیام پر منحصر نہیں دیگر مسلم سائنس دانوں نے جو تحقیقات کی ہیں اپنے اپنے شعبوں میں انھوں نے یا تو اپنے وقت سے آگے آکر تحقیقات کی ہیں یا کم سے کم موجودہ ترقی یافتہ سائنس کی بنیاد رکھنے میں ایک لینٹ کا اضافہ ضرور کیا ہے۔

پروفیسر علی ناصر زیدی اسی کتاب میں مزید لکھتے ہیں۔

اسی موضوع سے متذکرہ بالا کیلنڈر کا تعلق بھی ہے جو خیام کا اہم ترین کارنامہ ہے جسے ملک شاہ نے اپنی پوری سلطنت میں رائج کیا تھا۔ آپ ابھی پڑھ چکے ہیں کہ زمین سورج کے گرد ۳۶۵ دن بعد تقریباً چھ گھنٹوں میں ایک گردش پوری کرتی ہے۔ ہم نے اس مدت کو اپنی آسانی کے لیے بارہ انگریزی مہینوں میں تقسیم کر لیا ہے۔ جن میں کچھ مہینے ۳۰ دن کے ہوتے ہیں کچھ ۳۱ کے اور فروری ۲۸ دن کا۔ ہر چوتھے سال فروری ۲۹ دن کا ہوتا ہے۔ اس طرح ایک سال کی یہ مدت پوری کی پوری کھپ جاتی ہے۔"

(ص ۱۴۱)

پروفیسر صاحب نے آگے چل کر عربی اور انگریزی مہینوں میں دونوں کا جو فرق پڑتا ہے، اس کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس طرح تقریباً گیارہ دن کا فرق پڑ جاتا ہے۔ انھوں نے مزید لکھا ہے کہ گیارہ دن کا فرق پڑنے کی وجہ سے ۳۳ قمری سال ۳۲ شمسی سالوں کے برابر ہوتے ہیں۔ اس طرح ہر ۳۲ شمسی سالوں کے بعد ایک سال نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ عرصۂ دراز تک یونہی چلتا رہا۔

(ص ۱۴۱)

دراصل اس وقت تک کسی کے پاس ایسا حل نہیں تھا جو یہ فرق اور الجھاؤ دور ہو سکے۔ چنانچہ خواجہ جمیل احمد نے بھی اس ضمن میں جو لکھا ہے وہ

ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ لہٰذا پروفیسر علی ناصر زیدی اپنی اسی کتاب میں آگے لکھتے ہیں۔

ایرانی کیلنڈر کے حساب سے سال کا آغاز نوروز سے ہوتا تھا۔ جب موسم بہار پر دن رات برابر ہوتے ہیں انگریزی حساب سے یہ اتفاق ۲۱ مارچ کو پیش آتا ہے۔ ایران کی بہار مشہور ہے۔ سال کا آغاز اسی موسم سے کیا جاتا تھا۔ اور بارہ مہینوں میں ہر ایک ۳۰ دن کا ہوتا تھا۔ یہ لوگ آخری مہینے کے بعد ۵ دن کا اضافہ کر لیتے تھے۔ اس طرح ان کے ۳۶۵ دن پورے ہو جاتے تھے۔ تقریباً ۶ گھنٹے کا فرق پھر بھی باقی رہ جاتا تھا جو وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتا جاتا تھا۔

اس فرق کو عمر خیام نے دور کیا اور وہ بھی بہت آسان طریقے سے، اس نے ۵ اضافی ایام کو آخری مہینے میں لگانے کے بجائے انہیں پورے سال پر تقسیم کر دیا۔ اس طرح بعض مہینے ۳۰ دن کے اور بعض ۳۱ دن کے ہو گئے۔ اس طرح ۳۶۵ دن تو پورے ہو گئے لیکن چھ گھنٹوں کی علت پھر بھی باقی رہی۔ خیام نے اس کا علاج یہ نکالا کہ ہر چوتھے سال ایک مہینے میں ایک دن کا اضافہ کر دیا اور وہ سال ۳۶۵ کے بجائے ۳۶۶ دن کا ہو گیا۔ یہ اصلاح آج بھی اسلامی کیلنڈر میں جاری ہے۔

آج ہم اس ۳۶۶ دن والے سال کو لیپ کا سال کہتے ہیں (مرتب)

ابھی تھوڑا سا فرق باقی تھا، خیام نے اسے بھی دور کیا جو اس کی مہارت کی روشن دلیل ہے۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ ایک سال پورے ۳۶۵ دن اور ۶ گھنٹوں کا نہیں ہوتا بلکہ ۵ گھنٹے اور تقریباً ۵۵ منٹ کا ہوتا ہے اس لیے ہر چوتھے سال میں ایک دن بڑھانے سے ۴۴ منٹ زاید ہو جاتے ہیں۔ عمر خیام نے اس اضافے کو دور کرنے کے لیے یہ قاعدہ وضع کیا کہ جو سن ۱۳۲ پر پورا تقسیم ہو جائے اس میں سال کی مدت ۳۶۶ کے بجائے ۳۶۵ دن ہی رہنے دی جائے۔ اس اصلاح کے بعد ۳۷۷۰ سال (تقریباً پونے چار ہزار سال) کے بعد صرف ایک دن کا فرق پڑتا ہے۔

اس وقت دنیا میں جو شمسی تقویم جاری ہے اس کے مطابق ۴۰۰ برس میں لیپ کے سال ۱۰۰ کے بجائے ۹۷ لیے جاتے ہیں اور یوں ۳۳۰۰ سال بعد ایک دن کا فرق پڑتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عمر خیام کے وضع کردہ کیلنڈر میں غلطی کا عنصر بہت کم ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ خیام کے زمانے میں بہت کم ہیئتی آلات میسر تھے۔ اس نے شاہی رصد گاہ میں مشاہدات کر کے ایک زائچہ بھی مرتب کیا تھا (پروفیسر علی ناصر زیدی۔ مسلمان موجد اور سائنسدان ص ۱۴۰۔ ۱۴۱۔ ۱۴۲)

عمر خیام کی تصانیف کے بارے میں خواجہ جمیل احمد لکھتے ہیں۔

"عمر خیام نے کل دس کتابیں اور ۳۰ رسالے تصنیف کیے۔ ان میں ریاضی کے چار، سائنس کے تین اور مابعد الطبیعیات کے تین اور الجبرا کا ایک اور اقلیدس کا ایک رسالہ شامل ہے۔"

(مشہور مسلمان سائنس داں ص ۱۴۶)

خواجہ صاحب نے اپنی کتاب میں نزہتہ الارداح کے حوالے سے اس کی وفات کا واقعہ یوں لکھا ہے۔

"موت کے دن وہ بوعلی سینا کی کتاب "الشفا" کا مطالعہ کر رہا تھا۔ جب وہ باب "ایک اور ایک سے زیادہ" پر پہنچا تو اس نے کتاب ایک طرف رکھ دی، کھڑا ہوا اور نماز ادا کی اور اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو وصیت کی۔ اس وقت سے شام تک کچھ نہیں کھایا پیا۔ مغرب کی نماز کے بعد وہ سجدے میں گر پڑا اور گڑگڑایا۔

"خدایا! میں نے اپنے مقدور بھر تجھ کو پہچاننے کی کوشش کی اور اب میں تجھ سے مغفرت کا طلب گار ہوں۔"

یہ کہتے کہتے اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔"

(ص ۱۴۰)

تعجب ہے کہ اس کتاب میں خواجہ صاحب نے عمر خیام کا سن وفات درج نہیں کیا۔ حالاں کہ موت کے دن کی اتنی تفصیل درج ہے۔ معلوم نہیں اس کی وجہ کیا ہے۔ ان کی انگریزی کتاب میں وہی واقعہ انگریزی میں ترجمے کی صورت درج ہے لیکن اس میں بھی تاریخ وفات کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔

سید قاسم محمود نے شاہکار اسلامی انسائیکلو پیڈیا میں صفحہ ۱۱۰۲ پر تاریخ ۱۱۳۱ء درج کی ہے جب کہ علی ناصر زیدی نے بھی

ءِ سن ۱۱۳۱ درج کیا ہے۔ عمر خیام جس شہر میں پیدا ہوا تھا، اس شہر کی خاک نے اس آفتاب جہاں تاب کو اپنی خاک میں چھپا لیا۔

اگر عمر خیام اپنی شاعری کے سبب زیادہ پہچانا جاتا ہے، اس میں کوئی متغیر فلسفہ نہیں ملتا۔ اگرچہ غالب بھی اردو زبان کا پہلا فلسفی شاعر تھا لیکن اس کی شاعری میں بھی کوئی متغیر فلسفہ نہیں ملتا۔ اسی طرح عمر خیام نے بھی چوں کہ شاعری کو وقت گزاری کے مشغلے کے طور پر اختیار کیا تھا، اس لیے اس کے ہاں بھی موضوعات کا تنوع گو ملتا ہے لیکن کوئی خاص فکری راستہ نظر نہیں آتا۔ آسانی کے لیے ہم اس کو ایران کا غالب کہہ سکتے ہیں۔ بہرحال رباعیات کا یورپ کی مغرب کی بہت سی زبانوں پر ترجمہ ہوا ہے۔ اسے فارسی زبان کے چار بڑے ستونوں جن میں حافظ، سعدی، فردوسی شامل ہیں، میں شمار کیا جاتا ہے اس کے کلام کو اعلیٰ ادب پارے قرار دیا جاتا ہے۔ آج عمر خیام ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن ان کا کلام ان کی یاد دلاتا رہے گا۔

حوالہ جات

۱۔ مشہور مسلمان سائنس دان۔ خواجہ جمیل احمد۔
اردو اکیڈمی سندھ۔ کراچی۔

۲۔ مسلمان موجد اور سائنس دان۔ پروفیسر علی ناصر زیدی۔
قومی کتب خانہ، ریلوے روڈ۔ لاہور

۳۔ شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا۔ سید قاسم محمود
شاہکار بک فاونڈیشن۔ کراچی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے اپنے کسی بھائی کی حق تلفی کی ہو یا اس کی عزت پر ظلم کیا ہو تو آج ہی اسے راضی کرلے۔ قبل اس کے کہ وہ دن آئے جب اس کے پاس درہم ہوگا نہ دینار ہوگا۔ اگر اس کے پاس نیک عمل ہوں گے تو اس کے ظلم کے بقدر انھیں لیا جائے گا اور اگر اس کے پاس اچھائیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی برائیاں لے کر اس کے اوپر لاد دی جائیں گی۔"

(بخاری)

سائنس کے یادگار کارنامے

فضل ربی راہی

- دس ہزار سال پہلے انسان نے کپڑا بننا اور مٹی کے برتن بنانا سیکھا۔
- پانچ ہزار سال پہلے بیل گاڑی، گھوڑا گاڑی، اور بادبانی جہاز ایجاد ہوئے۔
- چار ہزار سال پہلے مصر اور یونان میں آب پاشی کے لیے نہریں بنائی گئیں۔ پہلی دفعہ انسان نے خیالات کو الفاظ کا روپ دیا۔ مصر اور بابل میں علم حساب رائج ہوا۔ دکانوں کی تعمیر کے سلسلے میں جیومٹری سے مدد لی گئی۔ زاویہ دریافت ہوا، جس کی رو سے دائرے کو 360 ڈگری میں تقسیم کیا گیا۔
- ساڑھے چار ہزار سال پہلے اہل بابل نے سکہ رائج کیا اور دنیا کا پہلا قانون مرتب کیا گیا۔ بحیرۂ روم، افریقہ اور یورپ کے سمندروں میں جہاز رانی شروع کی گئی
- ۳۵۰۰ (ق م) میں پہیہ ایجاد ہوا۔
- ۱۵۰۰ (ق م) میں ریشم کی صنعت ایجاد ہوئی۔
- ۱۹۰۰ (ق م) میں تصویری رسم الخط وجود میں آیا۔
- ۱۲۰۰ (ق م) میں شیشہ دریافت ہوا۔
- ۱۰۰۰ (ق م) میں یونان میں پہلی مرتبہ حروف ابجد دریافت ہوئے۔ بابل میں پہلی مرتبہ باقاعدہ فوج قایم کی گئی جو دھات کے بنے ہوئے ہتھیاروں سے لیس تھی۔
- ۶۰۰ (ق م) میں یونان میں فلسفہ پہلے باقاعدہ علم کے طور پر راﺋ ہوا۔ اسی فلسفے نے تمام جدید علوم کو جنم دیا۔ یہ فلسفی دنیا کے قدیم ترین سائنس داں قرار پائے۔
- ۶۵۰ (ق م) میں یونانی فلسفی تالیس ملطی نے زمین کو گو ثابت کیا تھا۔
- ۵۰۰ (ق م) میں فیثاغورث نے ریاضی کے چند ابتدائی اصو وضع کیے جن میں مثلثات سے متعلق بعض اصول آج بھی ہمارے نصا میں پڑھائے جاتے ہیں اور اسی دور میں جمہوری طرز حکومت کا بھی آ ہوا۔
- ۳۰۰ (ق م) ارسطو، سقراط اور افلاطون جیسے عظیم فلسفیوں سائنس کی داغ بیل ڈالی۔ یونان ہی میں اقلیدس نے جدید علم جیومٹر کی بنیاد رکھی۔
- ۲۸۰ (ق م) میں یونان کے استارخوس نے زمین سے سو اور چاند کا فاصلہ معلوم کیا۔
- ۲۵۰ (ق م) میں ارشمیدس نے طبعیات کا آغاز کیا۔ اس چند اصول آج بھی ہماری نصابی کتب کا حصہ ہیں۔ ارشمیدس دنیا کا انجینئر تھا۔
- ۲۴۰ (ق م) میں اسکندریہ کی لائبریری کے صدر ایراتو تھ نے کرۂ ارض کی موٹائی اور اس کا وزن معلوم کیا۔ علم ریاضی کو پہلی

کامیابی سے استعمال کیا گیا۔ انسان کو چاند پر اتارنے میں علم ریاضی نے مرکزی کردار ادا کیا ہے۔

- ۱۵۰ (ق م) میں چین میں کاغذ ایجاد ہوا۔
- ۱۰۰ء میں یونانی فلسفی جالینوس نے علم طب کی بنیاد رکھی۔ سولھویں صدی تک اس کی کتابیں مستند سمجھی جاتی رہیں۔
- ۸۰۰ء اور ۱۲۰۰ء کے دوران بہت سے مسلمان سائنس دانوں نے سائنس میں بیش بہا اضافے کیے۔ فلکیات، جغرافیہ، طب، ریاضی، کیمیا اور طبعیات نے مسلمانوں کے زیر سایہ بہت ترقی کی۔ گھڑی، قطب نما، چھاپہ خانہ، سرجری اوزار اور دوربین اسی دور کی ایجاد ہیں۔ اسی دوران مسلمانوں نے بارود ایجاد کی۔ بارود نے ہوائی جہاز اور آتش بازی کے دوسرے سامان کو جنم دیا۔ آتش بازی کا یہی سامان راکٹ کی ابتدائی شکل تھا۔ مسلمانوں نے سیاروں اور چاند کا زمین سے صحیح فاصلہ معلوم کیا اور فلکیات کے اصول وضع کیے۔ ان میں کشش ثقل کا اصول بھی شامل تھا۔ چاند کے متعلق وسیع معلومات حاصل کی گئیں۔
- ۱۲۷۰ء میں ایک عرب سائنس داں حسن الرمۃ کی آتش بازی کے متعلق ایک کتاب چھپی، جس میں راکٹ سازی کے طریقے تفصیل سے بیان کیے گئے۔
- ۱۲۷۴ء میں چینیوں نے منگولوں کے خلاف ایک جنگ میں پہلی بار راکٹ استعمال کیے۔ چند سال بعد جاپانیوں نے بھی منگولوں کے خلاف راکٹ استعمال کیے۔ حتی کہ ۱۳۰۰ء تک دنیا کے کئی ملکوں میں آتشیں اسلحہ استعمال ہوا۔
- ۱۴۹۲ء میں کولمبس نے نئی دنیا دریافت کی۔ اُسے گمان بھی نہ ہوسکتا تھا کہ اس دنیا کے لوگ پانچ سو سال سے بھی کم عرصے میں چاند پر جا اتریں گے۔
- ۱۵۳۲ء میں پولینڈ کے ماہر فلکیات کوپرنیکس کی کتاب "نظام شمسی" شائع ہوئی۔ جس میں سورج، سیاروں اور چاند کے متعلق تفصیلی معلومات فراہم کی گئی تھیں۔
- ۱۵۷۹ء میں نے دنیا کے گرد چکر لگانا شروع کیا۔
- ۱۵۷۹ء میں ہالینڈ ہی کے ایک سائنس داں نے خوردبین بنائی جس نے علم طب کی ترقی میں مرکزی کردار ادا کیا۔
- ۱۵۹۶ء میں جرمنی کے ایک ماہر فلکیات کیپلر کی کتاب "نیا علم فلکیات" چھپی۔ جس میں فلکیات پر سیر حاصل بحث کی گئی تھی۔ کیپلر نے کشش ثقل کی نشاندہی کی۔ لیکن کوئی اصول وضع نہیں کر سکا۔
- ۱۶۰۹ء میں اطالوی سائنس داں گلیلیو نے دوربین کے ذریعے چاند کے بدصورت چہرے سے تقدس کا نقاب اٹھایا۔ چاند کی توہین کرنے پر اُسے نظر بند کر دیا گیا۔ چاند کی طرف انسان کا یہ پہلا قدم تھا۔
- ۱۶۶۵ء میں نیوٹن نے کشش ثقل کے اصول وضع کیے۔ نیوٹن نے دعویٰ کیا کہ دنیا کی کوئی چیز کشش ثقل سے باہر نہیں نکل سکتی۔ تین سو سال سے بھی کم عرصے یعنی ۱۹۵۹ء میں روس کے ایک خودکار جہاز اور ۱۹۶۸ء میں اپالو ۸ کے خلا بازوں نے نیوٹن کے اس خیال کو غلط ثابت کر کے اس کی روح کو صدمہ پہنچایا۔
- ۱۷۷۰ء میں سلطان حیدر علی نے انگریزوں کے خلاف جنگ میں راکٹ استعمال کیے۔ میسور کے سقوط کے بعد انگریزوں نے یہ راکٹ اپنے قبضے میں لے لیے اور انھیں اپنی نگرانی میں وسیع پیمانے پر تیار کرایا۔ ۱۸۱۲ء میں انھوں نے بالٹی مور پر راکٹ برسائے۔ امریکی فوج نے راکٹ کا استعمال ۱۸۰۶ء میں شروع کیا۔ اس وقت امریکہ کے لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ ایک سو سال بعد راکٹ امریکہ کو چاند پر پہنچا دے گا۔
- ۱۷۶۹ء میں واٹسن نے بھاپ پر چلنے والا انجن ایجاد کیا۔ میکانیات میں یہ پہلی اہم ایجاد تھی۔
- ۱۷۸۳ء میں غبارے کے ذریعے پہلی پرواز کی گئی۔ اس خبر کو دنیا بھر میں بہت اہمیت دی گئی۔
- ۱۷۹۱ء میں وولٹ نے برقی سیل ایجاد کیا۔ آج بھی اسی کے نام سے بجلی کو وولٹ کی اکائی سے ناپا جاتا ہے۔
- ۱۸۳۷ء میں مورس نے ٹیلی گراف ایجاد کیا اور اسی دور میں کیمرہ کی فلم بھی ایجاد ہوئی۔
- ۱۸۶۷ء میں نوبل نے ڈائنامیٹ ایجاد کیا۔ انسان کی ہلاکت کا سامان کرنے والے اس عظیم سائنسداں کے نام سے اب بھی ہر سال دنیا کے عظیم سائنسدانوں کو نوبل پرائز دیا جاتا ہے۔
- ۱۸۶۸ء میں گرام نے ڈائنمو ایجاد کیا۔ ڈائنمو ہی منگلا جیسے عظیم بجلی گھروں کا جدِ امجد ہے۔
- ۱۸۷۶ء میں گراہم بیل نے ٹیلی فون ایجاد کیا۔
- ۱۹۱۴ء میں سونٹن نے ٹینک ایجاد کیا
- ۱۹۲۶ء میں جان بیرڈ نے ٹیلی ویژن ایجاد کیا۔

یو۔پی کے پندرہ مسلم گرلز انٹر کالجوں میں انٹر پاس ہونے والی طالبات کی تعداد

گیارہ سال میں اکیاسی فیصد زیادہ

بیگم نصرت شیروانی+

جہاں تک ہمیں معلوم ہے اتر پردیش میں سترہ مسلم گرلز انٹر کالج ہیں۔ جس صوبے میں اندازاً قریب دو کروڑ مسلمان ہیں وہاں ہونے تو چاہیں تھے مسلم گرلز انٹر کالج مگر ہیں صرف سترہ۔ ان میں سے ایک (صغیر فاطمہ محمدیہ گرلز انٹر کالج آگرہ) سے ابھی تک ۱۹۸۷ء کا رزلٹ نہیں آیا ہے۔ ایک اور (اسماعیل گرلز نیشنل انٹر کالج میرٹھ) سے پہلا بیچ ۱۹۷۹ء میں فترکیک ہوا تھا۔ باقی پندرہ کالجوں میں مسلم طالبات کے ۱۹۷۶ء کے نتائج چارٹ میں دائیں جانب درج ہیں اور ان ہی اداروں میں مسلم طالبات کے ۱۹۸۷ء کے نتائج بائیں جانب درج ہیں۔ تاکہ یہ دیکھا جاسکے کہ ان اداروں میں گزشتہ گیارہ سال کے دوران مسلم طالبات کی تعلیم کو انٹر کی سطح پر کتنا فروغ ہوا۔ ۱۹۷۶ء میں ان سب کالجوں سے ملاکر صرف پانچ سو بارہ (۵۱۲) مسلم

یو۔پی کے پندرہ گرلز کالجوں میں مسلم طالبات کے نتائج
گیارہ سال میں کتنے بہتر

شریک (۱۹۷۶ء)	پاس (۱۹۷۶ء)	فیصد (۱۹۷۶ء)	مسلم گرلز کالج کا نام	مقام	شریک (۱۹۸۷ء)	پاس (۱۹۸۷ء)	فیصد (۱۹۸۷ء)
۲۴	۲۲	بانوے	قدوائی میموریل	الہ آباد	۲۳	۲۳	سو
۳۲	۱۶	پچاس	آل احمد	امروہہ	۴۱	۴۱	سو
۷	۳	تینتالیس	بیگم خیر	بستی	۱۸	۱۸	سو
۲۹	۲۶	نواسی	نسواں	اعظم گڑھ	۳۶	۳۶	سو
۱۷۸	۸۷	انچاس	حمیدیہ	الہ آباد	۱۲۸	۱۲۲	پچانوے
۷۹	۴۲	ترپن	عبدالسلام مسلم	مرادآباد	۱۰۶	۱۰۱	پچانوے

۳۰	۲۳	ستہتر	کرامت حسین	لکھنؤ	۴۲	۴۰	پچانوے
۱۲۸	۹۰	ستر	امام باڑہ مسلم	گورکھپور	۱۶۷	۱۵۳	بانوے
۱۵	۹	ساٹھ	ابوالکلام آزاد	کھیری لکھیم پور	۲۵	۲۳	بانوے
۳۲	۱۱	چونتیس	تعلیم گاہ نسواں	لکھنؤ	۷۱	۶۵	بانوے
۵۵۴	۳۲۹	انسٹھ	دس کا ٹوٹل		۶۵۷	۶۲۲	پچانوے
۱۰۰	۶۱	اکسٹھ	مسلم جوبلی	کانپور	۹۱	۸۱	نواسی
۱۹	۷	سینتیس	ساجدہ	جونپور	۴۵	۳۸	چوراسی
۲۸	۲۲	اناسی	انڈسٹریل مسلم	سہارن پور	۷۳	۶۰	نواسی
۴۲	۲۱	پچاس	نیشنل	شاہ جہاں پور	۵۹	۴۶	اٹھہتر
۱۱۸	۷۲	اکسٹھ	اِسلامیہ	بریلی	۱۰۸	۸۱	پچہتر
۳۰۷	۱۸۳	ساٹھ	پانچ کا ٹوٹل		۳۷۵	۳۰۶	بیاسی
۸۶۱	۵۱۲	انسٹھ	پندرہ کا ٹوٹل		۱۰۳۲	۹۲۸	نوے

طالبات انٹر میں پاس ہوئی تھیں۔ ۱۹۷۸ء میں یہ تعداد بڑھ کر نوسو اٹھائیس ہوگئی۔ چار سو سولہ عدد کا یہ اضافہ اکیاسی فیصد ہے۔ پاس ہونے والی مسلم طالبات کی تعداد میں سب سے زیادہ اضافہ بیگم خیر کالج بستی میں ہوا۔ جہاں سے ۱۹۷۶ء میں صرف تین مسلم طالبات پاس ہوئی تھیں ۱۹۸۷ء میں اٹھارہ پاس ہوئیں۔ یعنی تعداد چھ گنی ہوگئی۔ تعلیم گاہ نسواں کالج لکھنؤ میں تعداد گیارہ سے بڑھ کر پینسٹھ ہوگئی۔ یعنی قریب چھ گنی۔ ساجدہ اسکول جون پور میں تعداد سات سے بڑھ کر اڑتیس ہوگئی۔ یعنی قریب ساڑھے پانچ گنی۔ یہ اضافہ گنے کے اعتبار سے تو بہت اچھا کہا جائے گا، لیکن بستی، لکھنؤ اور جون پور میں مسلم آبادی کو دیکھتے ہوئے اب بھی اضافے کی گنجائش کافی ہے۔ یعنی تعداد اب بھی کم ہے۔ بہرحال گزشتہ گیارہ سال میں اضافہ ہوا اور یہ خوشی کی بات ہے۔

انڈسٹریل مسلم کالج سہارنپور میں تعداد بائیس[۲۲] سے بڑھ کر ساٹھ ہوئی۔ یعنی ڈھائی گنی سے کچھ زیادہ۔ آل احمد کالج امروہہ ضلع مراد آباد میں تعداد سولہ سے بڑھ کر اکتالیس[۴۱] ہوئی۔ ابوالکلام آزاد کالج لکھیم پور میں نوے سے بڑھ کر تیئس۔ یہ بھی ڈھائی گنی سے کچھ زیادہ ہے۔

عبدالسلام مسلم گرلز کالج مراد آباد میں بیالیس[۴۲] سے بڑھ کر ایک سو ایک[۱۰۱]۔ نیشنل کالج شاہ جہاں پور میں اکیس سے بڑھ کر چھیالیس یعنی دوگنی سے زیادہ مگر ڈھائی گنی سے کم۔ کرامت حسین کالج لکھنؤ میں تیئس سے بڑھ کر چالیس۔ امام باڑہ مسلم کالج گورکھپور میں نوّے سے بڑھ کر ایک سو ترپن۔ یعنی ڈیڑھ گنی سے زیادہ مگر دوگنی سے کم۔

گویا متذکرہ بالا دس کالجوں میں پاس ہونے والی مسلم طالبات کی تعداد میں اضافہ کافی ہوا ہے۔ مگر بستی، جون پور، سہارنپور، امروہہ کھیری، شاہ جہاں پور اور لکھنؤ کے کالجوں میں مسلم طالبات کی تعداد اب بھی کم ہے۔ مراد آباد کے کالج میں تعداد کافی ہوگئی ہے مگر مراد آباد میں مسلم آبادی کو دیکھتے ہوئے وہاں ایک اور مسلم گرلز کالج کی ضرورت نظر آنے لگی ہے۔

یہاں کیوں نہیں بڑھی

غرض مندرجہ بالا دس کالجوں میں پاس ہونے والی مسلم طالبات کی تعداد بڑھی۔ البتہ باقی پانچ کالجوں میں اضافہ بہت کم ہے۔ مثلاً نسواں کالج اعظم گڑھ میں گزشتہ گیارہ سال میں تعداد چھبیس سے بڑھ کر چھتیس ہوئی ہے۔ دس عدد کا یہ اضافہ صرف اڑتیس فیصد ہے جو کچھ بھی نہیں۔ مسلم جوبلی کالج کانپور میں تعداد اکسٹھ سے بڑھ کر اکیاسی ہوئی ہے۔ یہ اضافہ صرف تینتیس فیصد ہے۔ یو۔پی کے شہروں میں مسلمانوں کی آبادی سب سے زیادہ غالباً کانپور ہی میں ہے اور وہاں کے واحد مسلم گرلز انٹر کالج سے سو مسلم طالبات بھی انٹر پاس نہ کریں تو یہ تشویش کی بات ہے۔ گیارہ سال میں مسلمانوں کی آبادی ہی قریب پینتیس ۳۵ فیصد بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے یہی کہا جائے گا کہ کانپور میں انٹر کی سطح پر پاس ہونے کے معاملے میں مسلم طالبات نے کوئی ترقی نہیں کی۔ بریلی میں بہتر سے بڑھ کر اکیاسی ہوئی۔ نو عدد کا یہ اضافہ صرف تیرہ فیصد ہے۔ آبادی میں اضافے کے مد نظر یہی کہا جائے گا کہ بریلی کے مسلم کالج میں مسلم طالبات تعلیم میں پیچھے گئیں۔ الٰہ آباد میں دو کالجوں میں سے حمیدیہ کالج میں تعداد ستاسی سے بڑھ کر ایک سو بائیس ہوئی۔ یہ اضافہ چالیس فیصد ہے اور یوں سمجھیے کہ آبادی میں اضافے کے تناسب سے بس ذرا سا ہی زیادہ ہے۔ یعنی کہا جا سکتا ہے کہ اس کالج میں مسلم طالبات کوئی پانچ فیصد آگے بڑھیں۔ الٰہ آباد کے دوسرے کالج قدوائی میموریل میں تعداد بائیس سے بڑھ کر تیئیس ہوئی۔ ایک عدد کا یہ اضافہ صرف پانچ فیصد ہے۔ یعنی آبادی میں اضافے کے اعتبار سے تیس ۳۰ فیصد کی کمی ہوئی۔

بہرحال خوشی کی بات ہے کہ پندرہ کالجوں میں سے کسی ایک میں بھی ۱۹۷۶ء کی بہ نسبت ۱۹۸۷ء میں پاس ہونے والی طالبات کی تعداد کم نہیں ہوئی اور جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، مجموعی طور پر تعداد اکیاسی فیصد بڑھی ہے اور یہ اس لیے ممکن ہو سکا کہ ان کالجوں میں مسلم طالبات کا مجموعی رزلٹ جو ۱۹۷۶ء میں صرف اکسٹھ فیصد پاس تھا، ۱۹۸۷ء میں نوے فیصد پاس ہو گیا۔ بلکہ پہلے دس کالجوں سے ملا کر بچانوے فیصد مسلم طالبات پاس ہوئیں۔ چارٹ ملاحظہ فرمائیے۔

شریک کم کیوں؟

آیئے اب دیکھیں کہ ان کالجوں سے انٹر بورڈ امتحان میں شریک ہونے والی مسلم طالبات کی تعداد کتنی بڑھی۔ کہاں بڑھی، کہاں گھٹی۔

سب سے زیادہ اضافہ انڈسٹریل مسلم گرلز کالج میں ہوا ہے، جہاں سے ۱۹۷۶ء میں اٹھائیس شریک ہوئی تھیں۔ ۱۹۸۷ء میں بہتر شریک ہوئیں۔ مگر خیر کالج میں تعداد سات سے بڑھ کر اٹھارہ ہوئی۔ یعنی ان دونوں میں تعداد ڈھائی گنی سے کچھ زیادہ ہو گئی۔ ساجدہ کالج میں تعداد انیس سے بڑھ کر پینتالیس ۴۵ ہو گئی۔ تعلیم گاہ نسواں میں بتیس سے بڑھ کر اکہتر۔ یعنی ان دونوں میں دوگنی سے زیادہ ہوئی مگر ڈھائی گنی سے کم رہی۔ ابو الکلام آزاد کالج میں پندرہ سے بڑھ کر پچیس یعنی ڈیڑھ گنی سے زیادہ مگر دوگنی سے کم۔ بس ان ہی پانچ کالجوں میں اضافہ **خاطر خواہ کہا جا سکتا ہے۔**

دو اور کالج ہیں جن میں تعداد چالیس فیصد بڑھی۔ یعنی مسلمانوں کی آبادی میں اضافے کے لگ بھگ برابر۔ کرامت حسین کالج میں تیس ۳۰ سے بڑھ کر بیالیس اور نیشنل کالج میں بیالیس سے بڑھ کر انسٹھ۔

چار اور کالج ہیں جن میں مسلم طالبات کی تعداد بڑھی مگر مسلمانوں کی آبادی میں اضافے کے تناسب سے کم۔ عبدالسلام مسلم کالج میں اناسی سے بڑھ کر ایک سو چھ ۱۰۶۔ یہ اضافہ چونتیس فیصد ہے اور جیسا کہ عرض کیا گیارہ سال میں مسلمانوں کی آبادی قریب پینتیس فیصد بڑھ جاتی ہے۔ یعنی یوں سمجھیے کہ یہاں انٹر بورڈ امتحان میں شریک ہونے والی مسلم طالبات کی تعداد ایک فیصد کم ہو گئی۔ امام باڑہ مسلم کالج میں ایک سو اٹھائیس سے بڑھ کر ایک سو سرسٹھ ہوئی۔ یہ اضافہ تیس فیصد ہے۔ یعنی آبادی کو دیکھتے ہوئے پانچ فیصد کم۔ آل احمد کالج میں بتیس سے بڑھ کر اکتالیس۔ یہ اضافہ اٹھائیس فیصد ہے۔ یعنی آبادی کے اعتبار سے سات فیصد کم۔ نسواں کالج اعظم گڑھ میں انتیس سے بڑھ کر چھتیس ۳۶۔ اضافہ چوبیس فیصد۔ آبادی کو ملحوظ نظر رکھیں تو گیارہ فیصد کم۔

اور چار کالج تو ایسے ہیں جہاں تعداد ہی کم ہو گئی۔ قدوائی میموریل کالج میں چوبیس سے گھٹ کر تین ہیں۔ یہ کمی چار فیصد ہے۔ اسلامیہ کالج بریلی میں ایک سو اٹھارہ سے گھٹ کر ایک سو آٹھ۔ یہ کمی دس فیصد ہے۔ مسلم جوبلی کالج میں سو سے گھٹ کر اکیانوے یعنی نو فیصد کم۔ حمیدیہ کالج میں صورت حال سب سے خراب نظر آتی ہے۔ کیوں یہاں بورڈ امتحان میں شریک ہونے والی مسلم طالبات کی تعداد ایک سو اٹھہتر سے گھٹ کر ایک سو اٹھائیس رہ گئی۔ یعنی اٹھائیس فیصد کم۔ ان اداروں میں مسلم طالبات کی تعداد انٹر کی سطح پر کم کیوں ہو رہی ہے؟ یہ بہت اہم سوال ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ نتائج تو بہتر ہوئے ہیں بڑی خوشی کی بات ہے۔ لیکن یہ سوال بھی اہم ہے کہ انٹر بورڈ امتحان میں شریک ہونے والی مسلم طالبات کی تعداد میں اضافہ مسلم آبادی میں اضافہ کی رفتار سے بھی کم کیوں ہے؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کو ابھی ستر سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ مسلمان قرآن کریم کے مذکورہ احکام کی تعمیل کے ماتحت اس دور کے سائنسی علوم کی تحصیل میں نہایت تیز رفتاری اور سرگرمی سے لگ گئے۔ انھوں نے بہت باقاعدگی سے اپنے زمانے کے علوم کے سارے دفتروں کو دوسری زبانوں سے اپنی مذہبی زبان عربی میں منتقل کر ڈالا۔ اعلیٰ تعلیم کے اداروں مثلاً بیت الحکمۃ اور نظامیہ ایسی باوقار یونیورسٹیوں کی بنیاد ڈال کر دنیا کے اس خطے میں انھوں نے سائنس کے میدان میں وہ بلندی حاصل کر لی جو صدیوں تک قایم رہی۔

پروفیسر عبدالسلام

سائنس نامہ

احوار حسین

صنعتی اضافے اور سائنسی ایجادات کا ہر موسم اور ہوا پر بُرا اثر پڑا ہے۔ خراب ہوا بڑے بڑے شہروں میں ایک مسئلہ بن گئی ہے۔ اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لیے سائنس داں مصروف ہیں۔ جاپان کے سائنس دانوں نے اس کا حل کینڈ آکسیجن سے کیا ہے۔ کینڈ آکسیجن اب جاپان میں ہوٹلوں اور دوکانوں پر دستیاب ہے۔ تقریباً دس منٹ آکسیجن حاصل کرنے کا خرچ ۱۰۰ این بتایا جاتا ہے۔ اگر ہوا کی آلودگی پر جلد کنٹرول نہیں کیا گیا تو روٹی، کپڑا اور مکان کے بعد چوتھا نمبر آکسیجن کا ہوگا۔

کینسر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ایپی ڈیمیولوجی یونٹ کے ڈاکٹر پیرن اور کستوری جنت نے ایک رپورٹ میں بتایا کہ ریڈ چلیز کے زیادہ استعمال سے اور ل کینی کیسنر کے ہونے کا بہت زیادہ امکان ہے اس طرح تمباکو اور سگرٹ نوشی کے ساتھ ساتھ لال مرچ سے بھی پرہیز کرنا چاہیے۔

آج دنیا بھر میں سپر کنڈکٹرس پر تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ سائنس داں مختلف درجۂ حرارت پر کام کرنے والے سپر کنڈکٹرس بنانے میں معروف ہیں۔ بقول سائنس دانوں کے' ان کا استعمال اکسیلیریٹر پارٹیکلس' ڈی ٹیکٹر، موٹرس، جنیریٹرس، میگنیٹک سپریشن' پاور کیبلس' میگنیٹو کارڈی اوگرافی ۔ اور سگنل پروسیسرس میں بہت اہم رول ادا کریں گے۔

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف نیوٹریشن حیدر آباد کے سائنس داں ڈائی بیٹیکس کے علاج پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ اِن کی رپورٹ کے مطابق میتھی سیڈس کے استعمال سے بلڈ شوگر لیبل کو کنٹرول کیا جاتا ہے۔ میتھی کے استعمال سے زیادہ بھوک لگنا، پیاس کی شدت ... پیشاب کے بار بار آنے کو کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔

انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایسٹرو فزکس بنگلور کے ڈاکٹر رات موہن کے بتانے کے مطابق اُن کے گروپ نے چار نئے ایسٹی رائڈس تلاش کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ان چاروں ایسٹی رائڈس کا نام انٹرنیشنل ایسٹرونامیکل ایسوسی ایشن نے FY-1، FZ-1، HQ-2 اور HR-2 رکھا ہے۔ یہ ایسٹی رائڈس مارس اور جوپیٹر کے درمیان ایک نئی دوربین جو کہ کیوالور میں لگائی گئی ہے۔ اس سے دیکھنے میں مدد ملی ہے۔

یونیورسٹی پولی ٹیکنک ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

وہ شیر خوار بچے جو ڈبے کے دودھ پر پرورش پاتے ہیں' ان کے مقابلے میں دوسرے بچے جو ماں کے دودھ پر ہی منحصر ہوتے ہیں ان کی صحت کہیں بہتر ہوتی ہے۔ گائے بھینس کا دودھ اتنا مفید نہیں ہے جتنا ماں کا دودھ۔

عنقریب ہی یہ انکشاف ہوا ہے کہ وہ بچے جو وقت سے پہلے پیدا ہو جاتے ہیں' وہ اپنی جلد سے سانس لیتے ہیں' کیوں کہ ان کے پھیپھڑے اتنے مضبوط نہیں ہوتے۔ ان بچوں کو انکیوبیٹر میں رکھا جاتا ہے۔ پھر بھی ان کو زندہ رکھنے میں کم ہی کامیابی ہوتی ہے۔ رپورٹ کے مطابق اگر ان بچوں کے جسم پر چکنا رقیق مادہ لگا کر انکیوبیٹر میں رکھیں تو ان بچوں کو بچایا جا سکتا ہے۔

پنجاب اگریکلچر یونیورسٹی کے ڈاکٹر ایس۔ ایس گل کے کہنے کے مطابق ہندوستان میں پہلی بار Embryo Transfer بھینس Buffaloes کا تجربہ بلغاریہ کے تعاون سے کیا گیا ہے اور بہت حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ اس نئی تکنیک سے بفیلوز اپنی زندگی میں پہلے سے زیادہ بچے دے سکیں گی۔

برٹن رائل سگنل ڈیٹا لیبوریٹری کے مطابق ۱۹۹۱ء کے بعد لوگوں کی موت کا ذمہ دار کمپیوٹر ہوا کرے گا۔ آج مائکرو پروسیسر کا استعمال زندگی کے ہر شعبے میں کیا جا رہا ہے۔ ان میں ذرا سی بھی خرابی آ جانے پر کوئی بڑا حادثہ پیش آ سکتا ہے۔

طالب علم اس دنیا میں کچھ ترقی نہیں کر سکتا' وہ اپنا اثر دوسروں پر نہیں ڈال سکتا' جب تک کہ وہ استقلال کے ساتھ اپنی اخلاقی سطح دنیا کی مشکلوں میں بلند نہ رکھے۔ وہ شخص ہرگز طالب علم کہلانے کا مستحق نہیں جو اپنے فرائض کو استقلال اور سنجیدگی سے پورا نہ کرے۔ اس کو ہرگز اپنے دل میں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ اگر وہ ایسا خیال کرے گا تو وہ کچھ بھی نہ کر سکے گا۔ بلکہ اس کو ہمت کے ساتھ کیے جانا چاہیے۔ کیوں کہ اگر وہ ایسا کرے گا تو وہ ضرور اپنے کام میں کامیاب ہوگا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین

مالک: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ پرنٹر پبلشر: اسرار احمد۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔
پریس: ایس کے آفسیٹ پریس۔ دہلی۔

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۷ — جون ۸۸ء — شمارہ ۶

مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی

ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ۔

انڈیا

زر سالانہ

انڈیا — RS. 30·00

بیرونی ممالک US $ 20·00 ہوائی ڈاک

US $ 8·00 عام ڈاک

ترسیل زر کا پتہ

ایڈیٹر، تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

Editor: TAHZIBUL AKHLAQ & NISHANT,
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY.

مندرجات

[تہذیب الاخلاق میں جو مضامین شایع کیے جاتے ہیں، ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہرحال ان سے متفق ہو]

اداریہ

- ابواسحٰق ابراہیم بن جندب (متوفی ۷۷۰ء) نے فلک کے مشاہدے کے لیے ایک آلہ ایجاد کیا تھا، جس کی بنیاد پر دوربین بنی ـــــــ مگر دنیا کی نگاہ میں دوربین کا موجد گلیلیو ہے۔
- جابر بن حیان (متوفی ۸۱۰ء) نے علم کی تخلیق میں تجربات کی اہمیت پر زور دیا۔ اور اس طرح جدید سائنس کی بنیاد ڈالی ـــــــ مگر مشہور یہ ہے کہ جدید سائنس مغرب کی دین ہے۔
- ابوعباس احمد بن محمد کثیر فرغانی (متوفی ۸۶۳ء) نے زمین کے محیط (circumference) کی صحیح صحیح پیمائش کی اور دریا کی طغیانی ناپنے کا ایک آلہ ایجاد کیا ـــــــ مگر یہ کون جانتا ہے کہ یہ اسلامی تہذیب کے ایک فرزند کے کارنامے ہیں۔
- ابوعبداللہ محمد بن جابر البنانی (متوفی ۹۲۹ء) نے یہ ثابت کیا کہ زمین سورج کے گرد دائرے میں نہیں بلکہ بیضوی شکل کے مدار میں گھومتی ہے ـــــــ سائنسی دنیا میں یہ سیاروں کی حرکت کے کیپلر (kebler) کے پہلے قانون کے نام سے مشہور ہے۔
- ابوعلی حسن ابن الہیثم (متوفی ۱۰۲۱ء) نے مادی اجسام میں جمود کا تصور دیا ـــــــ لوگ اسے مادی اجسام کی حرکت کے نیوٹن کے پہلے قانون کے نام سے جانتے ہیں۔

  اسی عظیم سائنس داں نے یہ انکشاف کیا کہ روشنی ایک مقام سے دوسرے مقام تک جانے کے لیے ایسا راستہ منتخب کرتی ہے کہ کم سے کم وقت لگے ـــــــ آج یہی فرما کے اصول (Fermat's Principle) کے نام سے مشہور ہے۔
- احمد بن محمد علی مسکویہ (متوفی ۱۰۳۲ء) نے نظریہ ارتقا کی بنیاد ڈالی ہے ـــــــ مشہور یہ ہے کہ نظریۂ ارتقاء کا بانی ڈارون ہے۔
- ابوالفتح عمر بن ابراہیم خیام (متوفی ۱۱۳۱ء) نے ۳۶۵ دن اور ۶ گھنٹے کے شمسی سال کو مہینوں کے دنوں کی تعداد کم و بیش کرکے اور لیپ ایر (leap year) ایجاد کرکے شمسی کیلنڈر کی تصحیح کی ـــــــ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مروجہ شمسی کیلنڈر مغرب کی ایجاد ہے۔

یہ صرف ایک ہلکی سی جھلک ہے اسلامی تہذیب کے ان علمی کارناموں کی جن کا سہرا دانستہ یا نادانستہ طور پر مغربی تہذیب کے سر پہ بندھا ہوا ہے۔ خدا جانے فرزندانِ اسلام کی عرق ریزیوں کے کتنے موتی مغرب کے علمی تاج کو چکاچوندھ بخش رہے ہیں۔

حیرت کا مقام ہے کہ اگر کوئی شرپسند یہ کہتا ہے کہ تاج محل حقیقتاً ایک راجپوت محل تھا یا یہ کہ قطب مینار اصلاً ایک ہندو راجہ کی بنوائی ہوئی لاٹ ہے تو ہماری غیرت اور حمیت جاگ اٹھتی ہے۔ ہم شور مچانے لگتے ہیں کہ دیکھو یہ ہمارے تہذیبی اثاثہ پر ڈاکہ ہے۔ مگر اسلامی تہذیب کے علوم کے یہ سیکڑوں تاج محل اور ہزاروں قطب مینار جو دانستگی یا نادانستگی میں دوسروں سے منسوب ہو گئے ہیں ان پر ہم خاموش ہیں اور ہماری غیرت و حمیت نہیں جاگتی کہ دنیا کو یہ باور کرائیں کہ جدید سائنس ہمارا گم شدہ ورثہ ہے۔ ایسا کیوں ہے؟

وجہ صاف ظاہر ہے۔ ہم نے علوم سے اس حد تک منہ موڑ لیا ہے کہ خود یہ شناخت کرنے سے قاصر ہیں کہ مغربی تہذیب نے اسلامی تہذیب کی کتنی قندیلوں سے اپنے دیے روشن کیے ہیں۔ ہم اپنی علمی تاریخ سے اس حد تک نابلد ہیں کہ خود یہ نہیں جانتے کہ ہمارے اسلاف نے علوم کی کتنی کہکشائیں تخلیق کی ہیں۔ ہم محنت، ریاضت اور لگن کی روش سے اس حد تک دور ہو گئے ہیں کہ زمانے نے اسلامی تہذیب کے کارناموں پر جو گرد کی دبیز تہہ جما دی ہے اسے کھرچ کر پھینک سکیں۔ ہم علوم کے معاملے میں اتنے بے حس ہو گئے ہیں کہ اسلاف کے علمی کارناموں کو اجاگر کرنے، ان کی روایات کو زندہ کرنے اور آگے بڑھانے کی کوئی ہمک باقی نہیں رہی۔

ہماری موجودہ روش کے مدنظر گمان غالب ہے کہ تاج محل اور قطب مینار کے معاملے میں بھی اگر ہمیں زبان ہلانے کے علاوہ، ہاتھ پیر ہلانے پڑتے، لائبریریوں میں تاریخ کے اوراق پلٹنے پڑتے اور دلائل پیش کرنے کے لیے ذہن پر زور ڈالنا پڑتا تو شاید ہم خاموش رہنا ہی پسند کرتے۔

سعید اراحمد

اُمید

سرسید احمد خاں

موجودہ حالت گو وہ کیسی ہی اچھی یا بُری ہو، انسان کے دل کے مشغلہ کو کافی نہیں ہوتی۔ موجودہ رنج و خوشی، محبت و دوستی، کی چیزیں اتنی نہیں ہوتیں کہ انسان کے دل کی قوتوں کو ہمیشہ مشغول رکھیں؛ اس لیے اُس بڑے کاریگر نے، جس نے انسان کے پتلے کو، اپنے ہاتھ سے اور اپنی ہی مانند بنایا، اس میں چند اور قوتیں دی ہیں جن کے سبب سے دل کے لیے کاموں کی کمی نہیں ہوتی، اور ہمیشہ و ہر وقت دل کے مشغول رہنے کا سامان مہیا اور موجود رہتا ہے۔ انہیں قوتوں کے ذریعے سے گزری ہوئی باتیں پھر دل میں آتیں اور آئندہ کی باتوں کا ان کے ہونے سے پیشتر خیال ہوتا ہے۔

وہ عجیب قوت جس کو ہم یاد کہتے ہیں، ہمیشہ پیچھے دیکھتی رہتی ہے جب کوئی موجودہ چیز ہم کو شغل کے لیے نہیں ملتی، تو وہ قوت پچھلی باتوں کو بلا لاتی ہے، اور اسی کے فکر یا خیال سے ہمارے دل کو بہلائے رکھتی ہے۔ اس کی مثال جگالی کرنے والے جانوروں کی ہے کہ پہلے تو گھاس دانہ سب کھا لیتے ہیں، اور جب ہو چکتا ہے، تو ایک کونے میں بیٹھ کر پھر اسی پیٹ میں سے نکال کر چباتے جاتے ہیں۔

جس طرح کہ یاد پچھلی باتوں کو خالی وقت میں ہمارے دل میں شغل کو بُلا لاتی ہے، اُسی طرح ایک اور قوت ہے جو آئندہ ہونے والی باتوں کے خیال میں دل کو مشغول کر دیتی ہے جس کا نام امید و بیم یا خوف و رجا ہے۔ انہی دونوں قسم کے خیالوں سے ہم آئندہ زمانے تک پہنچ جاتے ہیں اور جو باتیں کہ دور دراز زمانہ میں شاید ہونے والی ہیں اور ظلمات کے پردوں میں چھپی ہوئی ہیں اور بڑے گہرے اندھیرے گڑھوں میں پڑی ہوئی ہیں، ان کو ایسا سمجھتے ہیں کہ ابھی ہو رہی ہیں؛ ان کے ہونے سے پہلے ان کی خوشی یا رنج اُٹھانے لگتے ہیں؛ یہاں تک کہ اس زمانہ کا بھی، جب نہ یہ زمین ہوگی اور نہ یہ آسمان اور ہر چہار طرف سے لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ کی آواز آتی ہوگی، ابھی خیال کر لیتے ہیں۔ پھر کون کہہ سکتا ہے کہ انسان کی زندگی، صرف موجودہ وقت پر محدود ہے۔

میرا ارادہ ہے کہ میں اس تحریر میں صرف اسی کا کچھ بیان کروں جس کو امید کہتے ہیں۔ ہماری خوشیاں اس قدر کم اور چند روزہ ہیں کہ اگر وہ قوت ہم میں نہ ہوتی، جس سے انسان ان عمدہ اور دل خوش کن چیزوں کا ان کے ہونے سے پہلے مزہ اُٹھاتا ہے جن کا کبھی ہو جانا ممکن ہے تو ہماری زندگی نہایت ہی خراب اور بدمزہ ہوتی۔ ایک شاعر کا قول ہے کہ

"ہم کو تمام عمدہ چیزوں کے حاصل ہونے کی امید رکھنی چاہیے؛ کیوں کہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی امید نہ ہو سکے، اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ہم کو دے نہ سکے۔"

فارسی زبان کا مشہور قول ہے کہ "تمنا را عیبے نیست"۔ ایک ظریف نے کہا کہ:

"دنیا میں مجھے کسی چیز کا رنج نہیں ہے، کیوں کہ امید مجھے ہمیشہ خوش رکھتی ہے۔"

دوستوں نے پوچھا کہ

"کیا تم کو مرنے کا بھی رنج نہیں ہے؟"

اس نے کہا کہ،

"کیا عجب ہے کہ میں کبھی نہ مروں؛ کیوں کہ خدا اس پر

بھی قادر ہے کہ ایک ایسا شخص پیدا کرے جس کو موت
نہ ہو۔ اور مجھ کو امید ہے کہ شاید وہ شخص میں ہی ہوں۔"
ل ایک ظرافت کا تھا، مگر سچ یہ ہے کہ زندگی کی امید ہی موت کا
خ ہم سے ہٹاتی ہے۔ اگر ہم کو زندگی کی امید نہ ہوتی تو ہم سے زیادہ
ر حالت کسی کی نہ ہوتی۔

زندگی ایک بے جان چیز کی مانند ہے جس میں کچھ حرکت نہیں ہوتی
ید اس میں حرکت پیدا کرتی ہے۔ امید ہی کے سبب سے انسان میں
سنجیدگی اور بردباری اور خوش مزاجی کی عادت ہو جاتی ہے، گویا
ید انسان کی روح کی جان ہے، ہمیشہ روح کو خوش رکھتی ہے اور تمام
لیفوں کو آسان کر دیتی ہے، محنت پر رغبت دلاتی ہے، اور انسان
نہایت سخت اور مشکل کاموں کے کرنے پر آمادہ رکھتی ہے۔

امید سے ایک اور بھی فائدہ ہے، جو کچھ کم نہیں ہے، کہ ہم موجودہ
ستیوں کی کچھ بہت قدر نہیں کرتے اور اسی میں محو نہیں ہو جاتے۔ سیزر
قیصر روم) نے جب اپنا تمام مال و اسباب اپنے دوستوں کو بانٹ دیا
و اس سے لوگوں نے پوچھا کہ:

"آپ نے اپنے لیے کیا رکھا؟"

اس نے کہا کہ:

"امید"

س کی عالی طبیعت ان چیزوں کی کچھ قدر نہیں کرتی تھی، جو اس کے پاس تھیں
لکہ ہمیشہ اس کا خیال کسی بہتر چیز کی طرف رہتا تھا۔

اگلے زمانے کے لوگ بغیر امید کی زندگی کو نہایت ہی برا سمجھتے
تھے۔ نقل ہے کہ خدا نے انسان کے پاس ایک صندوقچہ بھجوایا۔ جب اس
کو کھولا تو اس میں سے ہر ایک قسم کی بلائیں اور مصیبتیں اور بیماریاں
جو انسان کو ہوتی ہیں، سب نکل پڑیں۔ امید بھی اسی صندوقچہ میں تھی
وہ نہ نکلی بلکہ ڈھکنے سے چمٹ رہی اور صندوقچہ ہی میں بند ہو گئی، تاکہ مصیبت
کے وقت انسان کو تسلی دے۔

پس، جس زندگی میں امید ہے اس سے بڑھ کر کوئی خوش زندگی
نہیں ہے، خصوصاً، جب کہ امید ایک عمدہ چیز کی، اور اچھی بنا پر ہو!
اور ایسی چیز کی ہو جو امید کرنے والے کو حقیقت میں خوش کر سکتی ہو۔ اس
بات کی حقیقت وہی لوگ خوب جانتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ
خوش حال آدمی کے لیے بھی زمانہ موجودہ میں کافی خوشی نہیں ہے۔

میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ مذہبی زندگی میں عمدہ عمدہ چیزوں کی بہت
سی امیدیں ہوتی ہیں، اور ایسی چیزوں کی ہوتی ہیں جو ہم کو پورا پورا خوش
کر سکتی ہیں۔ بلاشبہ امید کے اثر سے انسان کی زندگی نہایت
شیریں ہو جاتی ہے اگر وہ موجودہ حالت سے خوش نہیں رہتا تو اس پر
صبر تو ضرور آ جاتا ہے۔ مگر مذہبی امیدیں اس سے بھی زیادہ فائدہ مند
ہیں۔ کیوں کہ ان میں عقل کے علاوہ مذہبی اعتقاد کی بھی نہایت قوت
ہوتی ہے۔ مذہبی امید گویا مردہ کو زندہ کر دیتی ہے۔

میں ہمیشہ خدا کو اپنے سامنے رکھتا ہوں۔ وہ میری دائیں
طرف ہے، اسی لیے میں گھبراتا نہیں۔ میرا دل خوش ہے۔ میرا
گوشت بھی اس امید میں رہے گا کہ تو میری روح کو
جہنم میں نہ ڈالے! تو اپنی چیز کو خراب ہوتے
ہوئے نہ دیکھے گا! تو ہی مجھ کو زندگی
کے طریق دکھلائے گا! تیری
ہی حضور میں خوشی کا کمال
ہے! تیری ہی دائیں طرف
ہمیشہ کی خوشی ہے۔
آمین!!

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:
"کمزوروں کا بوجھ ڈھونا نماز کے برابر ہے اور راستے سے مضر چیزوں کا ہٹانا ایک نماز کا ثواب
رکھتا ہے۔" (ابن خزیمہ)

ماضی کے اسیر

سیّد حامد

انسان بہت سی مجبوریاں لے کر پیدا ہوتا ہے، ان کی فہرس طویل
ہے: جسمانی ذہنی مجبوریاں؛ رجحان اور افتادِ طبع کی بندشیں، طبایع
، باہمی اختلافات کی دیواریں، بدگمانیوں کے بندھن، مفادات کا ٹکراؤ
ائت اور ماحول کی بیڑیاں۔ ان مجبوریوں سے نبٹنا اور اپنی تقدیر تراشنا
ر ایسے کام کرنا جو نوعِ انسان کی فلاح کے ہوں، دراصل ہفتخواں طے کرنا
ہے۔ بے شمار مجبوریوں کے ہوتے ہوئے انسان اگر اپنی مجبوریوں میں خود
نا فہ کرے تو اسے سمجھ داری تو نہ کہیں گے لیکن انسان باوجود زعمِ عقل
، فرد اور جماعت دونوں کی حیثیت سے، ایسا کرتا ہے اور لگاتار کرتا
ہے۔ وہ اپنی مجبوریوں، مصیبتوں اور تکلیفوں کو خود بڑھاتا ہے۔ آفات
مادی کا جواب وہ آفاتِ ارضی سے دیتا ہے۔ اقبال نے اپنی ایک
ٹی سی فارسی نظم میں جس کی حیثیت جواہر پارے کی ہے یہ دکھایا ہے
مل تخلیق میں انسان یزداں کا شریک ہے، بلکہ اس سے چند قدم
گے

بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم

ق کائنات خام مواد پیدا کرتا ہے، انسان اسے فراد اتارتا ہے
سے پر صیقل کرتا ہے۔ تزئین و تجمیل کی جہاں تک بات ہے بندہ خالق سے
ی لے گیا۔ اسی طرح جہاں تک آفات، مصایب، محرومیوں اور مجبوریوں
تعلق ہے، انسان اپنی سر نوشت پر اضافہ کرتے ہوئے نہیں تھکتا۔

ٹکراؤ اور تناؤ کے رجحانات کا عنانگیر ہونے کے بجائے انھیں شہ دیتا ہے
بہت سی بری عادتوں کا خود کو اسیر بنالیتا ہے۔ یہ عادتیں راسخ ہو کر طبیعت
کا منصب حاصل کر لیتی ہیں۔ جبلی رجحانات کی طرح یہ بھی اس کو تختہ بند کر دیتی
ہیں۔ ان عادتوں میں کاہلی، آرام طلبی، دروغ گوئی، کج بحثی، جھگڑالوپن
عیاشی وغیرہ کے علاوہ نشہ کی نت نئی اقسام بھی شامل ہیں۔

اجتماعی نقطۂ نظر سے اگر دیکھیے تو حال کی لائی ہوئی مجبوریوں اور بندشوں
سے کہیں زیادہ کارگر ماضی کی بندش ہے۔ دوسری بندشیں اور پابجولانیاں کیا
کم تھیں کہ انسان نے خود کو ماضی کا زندانی بنادیا۔ ہمارے بزرگ جو کچھ
کر گئے تھے، اس کے نتائج کا ہدف ہم نے اپنی موجودہ نسل کو بنالیا۔ باہمی
اختلافات کی گنجایش حال کی صورت حال اور مستقبل کے اندیشوں میں کیا
کم تھیں کہ بیتی ہوئی صدیوں کی ساری کدورتوں، عداوتوں، زیادتیوں اور
رنجشوں کو ہم نے اپنے گلے کا ہار بنالیا۔ حال اور مستقبل پر تو انسان
کو یک گونہ اختیار ہوتا ہے لیکن ماضی کے روبرو وہ بے بس ہے گزری ہوئی
کو آن گزری بنا دینا اس کے اختیار میں نہیں ہے۔ وقت کے گورستان میں
جتنی برائیاں، خباثتیں، کدورتیں اور دشمنیاں اور ناانصافیاں اور مظالم
دفن ہو چکے ہیں، ان کو گڑے مردوں کی طرح اکھاڑنا، زندگی اور عافیت کی
راہ کو اور سنگلاخ بنانا ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ واقعات کو اختراعات سے
پر پرواز دیا گیا ہے۔ مورخوں نے برائیوں اور نااتفاقیوں اور چیرہ دستیوں
اور ناانصافیوں اور جور وستم کو ضرب دے دے کر، پھونک پھونک کر فُبالے

سابق وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ہمدرد نگر۔ نئی دہلی۔

کی طرح پھیلا دیا ہے۔ گزرے ہوئے زمانوں کی (واقعی اور خیالی) مکروہات کے سایے نے ہمیں روشنی سے محروم کر دیا ہے۔ ہم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں، اس سرنگ کے سرے پر جو ماضی سے نکلتی ہے اور جو حال کو دو نیم کرتی ہوئی مستقبل میں دُور تک چلی گئی ہے، ہمیں روشنی کی کرن دکھائی نہیں دیتی۔

یہاں ہم اپنے ملک کا ہی ذکر کر رہے ہیں۔ ایک عرصے سے ہم وظیفہ کی طرح یہ بات دہراتے چلے آرہے ہیں کہ انگریزوں نے "پھوٹ ڈالو اور راج کرو" کی پالیسی کے تحت ہماری تاریخ کو مسخ کر ڈالا۔ سوال یہ اُٹھتا ہے کہ ہمیں صحیح تاریخ لکھنے اور افترا پردازی کی تردید کرنے سے کس نے روکا تھا اور کس نے ہمیں مجبور کیا تھا کہ جو زہر تاریخ کی رگوں میں انگریزوں نے پیوست کیا تھا اُسے اپنی اختراعات فائقہ سے دوگنا کر کے نصاب کی کتابوں کے ذریعے ننھے ننھے ذہنوں کو مسموم کرنے کے لیے بکھیر دیں؟ زہر افشانی اور زہر خورانی کا عمل آج تک جاری ہے اور روز افزوں پر ہے۔

بدگمانی کا بیج فاصلہ کی سرزمین میں پنپتا ہے۔ ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہم گویا اس کی ہوڑ لگی ہوئی ہے کہ کون دوسرے کے متعلق کتنا کم جانتا ہے، کون دوسرے سے کتنا زیادہ بدگمان ہو سکتا ہے، کون ماضی کے ترکش سے زیادہ سے زیادہ تیر لے کر دوسرے کے جسم و جگر کو چھلنی کر سکتا ہے۔ ہماری کتابیں، ہماری صحافت، ہماری گھریلو بات چیت نفاق اور بدگمانی کو ہوا دیتی رہتی ہے۔

ہندو اور مسلمان ہندوستان کی خاک سے اُٹھے ہیں اور اسی کی مٹی میں جا کر دم لیں گے۔ اُن کی صورت حالات کی منطق یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر بھائی چارہ اور خیر سگالی کے انداز پر رہیں۔ دونوں کو ایک دوسرے سے اور دونوں سے ہندوستان کو اور ہندوستان سے نوع انسانی کو تقویت ہو۔ شانہ سے شانہ ملا کر حال کی مشکلات سے (جن کی فہرس کوئی مختصر نہیں) نبرد آزما ہوں، چہ جائیکہ ماضی کے جھگڑوں اور جھمیلوں کے موجودہ اختلافات کو اور پُر پیچ بنانے کے لیے طلب کریں

مذکورہ بالا سطور لکھنے کی تحریک راج موہن گاندھی کی ایک کتاب کو دیکھنے کے بعد ہوئی جو ۱۹۸۶ء میں چھپی تھی۔ یہ آٹھ بڑے مسلمان رہنماؤں کے سوانح پر مشتمل ہے۔

سرسید (۹۸- ۱۸۱۷ء)، محمد اقبال (۱۹۳۸ء - ۱۸۷۷ء)
محمد علی (۱۹۳۱ - ۱۸۷۸ء)، محمد علی جناح (۱۹۴۸ - ۱۸۷۶ء)
فضل الحق (۱۹۶۲ - ۱۸۷۳ء)، ابوالکلام آزاد (۱۹۵۸ - ۱۸۸۸ء)
لیاقت علی خاں (۱۹۵۱ - ۱۸۹۵ء)، ذاکر حسین (۱۹۶۹ - ۱۸۹۷ء)

مصنف نے جو گاندھی جی کا پوتا ہے، دیباچے کی شروعات اس جملہ سے کی ہے

"ان اوراق کے پس پردہ یہ آرزو ہے کہ اس فاصلے کو مٹایا جائے جس نے ہندوستانیوں کو پاکستانیوں اور بنگلہ دیشیوں سے دور کر دیا ہے اور ان دوریوں کو بھی مٹایا جائے جو بھارت کے ہندوؤں اور یہاں کے مسلمانوں کے درمیان حائل ہیں"

ایک صفحہ اُلٹنے کے بعد ہم (۱۹۴۸ء میں) گاندھی جی کو بعض ہندو اور سکھ شرنارتھیوں کا ہدف ملامت بنتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

"یا تو خود پاکستان چلے جاؤ یا سنیاس لے کر ہمالیہ میں جا بسو۔ پاکستان کو بننے سے تم نے روکا نہیں اور نہ تم ہمارے عزیزوں کی جان اور عزت بچا پائے۔ تم پر خدا کی لعنت ہو"

گاندھی جی دراصل اس وقت پاکستان جانا چاہ رہے تھے اور انھوں نے اس مضمون کا پیغام قائد اعظم کو بھیجا بھی تھا، لیکن دلی کے مسلمانوں کی فکر ان کے پاؤں کی زنجیر بن گئی اور جنوری ۱۹۴۸ء میں انھوں نے مسلمانوں کو سلامتی کا احساس دلانے کے لیے برت رکھا۔

اس کے بعد مصنف نے ہماری تاریخ سے کچھ معنی خیز اقتباسات دیے ہیں:۔

البیرونی نے جو محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان آیا تھا، لکھا ہے کہ

"اس کی غارت گری کی وجہ سے ہندو تمام مسلمانوں سے شدید نفرت کرنے لگے تھے"

سو سال بعد ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ:

"ملابار کے ہندوؤں کو یہ گوارا نہ تھا کہ کوئی مسلمان اُن کے گھر میں داخل ہو، یا ان کے برتنوں میں کھانا کھائے اور

اگر انھوں نے اپنے برتنوں میں کبھی مسلمان کو کھانا کھلادیا تو وہ برتن یا تو توڑ دیے جاتے یا مسلمانوں کو دان کر دیے جاتے ۔"

پاکستانی مورخ اشتیاق حسین قریشی لکھتا ہے کہ

" اسلامی فاتحین اور اسلامی تسلط کے خلاف بغاوت کرنے والوں کے متعلق ہندوؤں اور مسلمانوں کے جذبات متضاد ہیں ۔"

پاکستانی مورخ حفیظ ملک نے لکھا ہے کہ

"جزیہ ہندوؤں کے کمتر درجہ کی علامت تھا ۔"

شیواجی نے اورنگزیب کے نام اپنے ایک خط میں اس کو یاد دلایا ہے :

"اس کے پر دادا اکبر نے جزیہ اُٹھالیا تھا ۔ جزیہ پھر سے عاید کرتے ہوئے ہندوستان کا شہنشاہ بھکاریوں پر رشک کرتا دکھائی دے رہا ہے اور برہمنوں، سادھوں، کنگالوں سے روپیہ وصول کر رہا ہے ۔"

آر ۔ سی ۔ مجمدار اور دوسروں نے (دہلی سلطنت ۔ بھارتیہ ودیا بھون) ہے کہ

دوسرے حملہ آوروں کے برخلاف مسلمان ہندوؤں کے ساتھ شیر و شکر نہیں ہوئے ۔ اس طرح پہلی بار ہندوستان کی آبادی دو اکائیوں میں بٹ گئی ۔ یہ ہندو مسلم مسئلہ کا تاریخی آغاز تھا جو چھ سو سال (سے کچھ زیادہ) کے بعد پاکستان کے برگ و بار لایا ۔"

مصنف ان اقتباسات کے بعد یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ شاید پاکستان مقدر تھا، لازمی تھا، اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا اور اگر چارہ بھی ہوتا تو اب تو پاکستان کو بنے ہوئے چالیس سال ہو گئے ، ی آرزو ہے کہ پاکستان پھلے پھولے ... ہماری کوشش چاہیے کہ ایک طرف ان تینوں ممالک میں اور دوسری طرف بھارت ہندوں اور مسلمانوں میں باہم خوش گوار تعلقات قایم ہوں ۔ بھارت میں مسلمان ۹ کروڑ ہیں (کل آبادی کا ۱۱.۴٪) بنگلہ دیش میں ہندو ایک کروڑ دس لاکھ ہیں (کل آبادی کا ۱۲.۱٪)

ایس ۔ ایم ۔ اکرام[۱] کے حوالے سے مصنف الطاف حسین حالی کی نظم 'حب وطن' کا اقتباس دیتا ہے اور پھر مسدس سے نقل کرتا ہے ۔

سبق تھا یہ پہلا کتاب ہدیٰ کا
کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا

" مسلمان بادشاہ ہندو تہوار ۔ ہولی ، راکھی، دشہرہ دیوالی مناتے تھے لیکن سب سے بڑا ارتباط اردو زبان میں نظر آتا ہے جس کے (بقول حالی) افعال، حروف، حروف اتصال اور اسما، کا بڑا حصہ ہندی الاصل ہے ۔"

" ہر چند کہ ہندوستانی مسلمان ہندو مسلم اتحاد کا خواہاں تھا لیکن وہ مستقبل سے خائف تھا جس میں اکثریت حکمراں ہوگی ۔ علاوہ بریں مسلمان حکومت کو مذہب سے الگ نہیں سمجھتا ۔"...."

" مسلم حکومت کے دوران ریاست نے ہندوؤں کی دولت سے کبھی مداخلت نہیں کی ۔ خوش حال ہندو دولت جمع کر سکتے تھے اور اس پر اپنی مرضی کے مطابق وصیت کر سکتے تھے ۔ درآنحالیکہ مسلم عمائدین بادشاہ کی نظر بدلتے ہی اپنی دولت کھو بیٹھتے تھے ۔

محمد مجیب صاحب کے الفاظ میں مغل سلطنت اسلامی سلطنت صرف اس مفہوم میں تھی کہ بادشاہ مسلمان تھا اور حکومت کرنے والی پارٹی بیشتر مسلمانوں پر مشتمل تھی ۔

آٹھوں مشاہیر کے سوانح حیات کو فاضل مصنف نے اجمال، بصیرت، حسنِ انتخاب اور چابک دستی کے ساتھ رقم کیا ہے ۔ اُن کا ہم

---

1 Collodern. Muslim India and The Best of Pakistan

کاذکر بھی جو ہندوستان کی تقسیم کے زیادہ ذمہ دار سمجھے جاتے ہیں، ہمدردی اور فراخ دلی کے ساتھ کیا گیا ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ سیاسی موقف سے قطع نظر، ان میں سے کوئی بھی ہندوؤں کے خلاف نہیں تھا۔ اتحاد کی کوششوں کی راہ میں کانگریس کا گھمنڈ اور لیگ کی انتہا طلبی حائل ہوئی۔

مصنف نے بہت پتے کی بات کہی ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک فریق صرف خود کو ہی درست سمجھتا تھا۔ دونوں میں سے کسی نے خود کو دوسرے کی جگہ رکھ کر دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ کانگریس کو سولہ آنے یقین تھا کہ مسلمان ہندوستان میں محفوظ رہیں گے اور جناح اور لیاقت علی خاں کے لیے یہ بات تصور میں آنے والی ہی نہ تھی کہ پاکستان میں ہندوؤں اور سکھوں کو کسی قسم کا کھٹکا ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کے خلاف تشدد کے امکان سے ہندو جو انکار کر رہے تھے وہ اس بنا پر نہیں تھا کہ ان کے اندر مسلمانوں کے خلاف مخالفت کے جذبات نہیں تھے۔ یہ جذبات دراصل زندہ تھے اور لو دے رہے تھے۔ اس انکار کا سبب یہ اعتقاد تھا کہ ہندو مذہب رواداری پر مبنی ہے۔ وہ اپنی قدیم کتابوں سے اس قسم کے اقوال نقل کر کے خود کو مطمئن کر لیتے تھے کہ دنیا ایک خاندان ہے اور یہ کہ 'سب راستے ایک خدا کی طرف لے جاتے ہیں'۔ اسی طرح ۱۹۴۷ء کی خونریزی کے باوجود، لیاقت علی خاں نے ۱۹۴۹ء میں کہا کہ مسلمان اقوام کی رواداری کا ریکارڈ عظیم الشان ہے، اور اسلام کی اس رواداری کا ذکر کیا جس کے تحت اقلیت کو احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ گویا ہر دو فریق کا اپنے یہاں اقلیتوں کی سلامتی پر اعتماد، ہندوؤں کے نفیس ترین افکار اور اسلام کے پاکیزہ ترین ادوار پر مبنی تھا، موجودہ حقیقتوں سے بہت دور۔ ہندو اور مسلمان اپنے اپنے فرقہ کو اپنے بہترین افکار و آمال و اہداف کے مطابق جانتے تھے اور دوسرے فرقے کو اس کے بدترین اعمال و افعال کی بنیاد پر۔

راج موہن نے آخری باب یعنی پایان کتاب میں ایک اور چشم کشا بات کہی ہے

"علیحدگی کو اس بات سے بھی فروغ ملا کہ کانگریس ایسی زبان اور ایسے محاورے میں گفتگو نہ کر سکی جو ہندوانہ ہونے کے بجائے ہندوستانی ہوتا۔ ۱۹۴۷ء میں کانگریس قانون سازوں اور وزیروں نے ہندوانہ چہرہ دکھایا گاندھی جی نے مثالی سماج کے لیے رام راج کی اصطلاح استعمال کی، بعض وزراء نے اسکولوں کو "ودیا مندر" کہا۔ سرکاری تقریبات میں ایسے گیت گائے گئے جو ہندوؤں کی نگاہ میں قوم پرستانہ تھے لیکن مسلمانوں کو ہندوانہ سنائی دیتے تھے اور وزراء نے سنسکرت سے مملو ہندی استعمال کرنا شروع کی۔ یہ سب ایک ہندوانہ محاورہ کے اجزا تھے جنھوں نے ایک عنوان لیگ کی اس فریاد کی تصدیق کر دی کہ ہندو راج مسلط کیا جا رہا ہے۔ کانگریس کا مقصد ہندوستانیوں کی بڑی تعداد کو متاثر کرنا تھا۔ ۴ میں سے ۳ ہندوستانیوں کے لیے ہندی محاورہ میں جذباتی اپیل تھی، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چوتھے ہندوستانی کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ 'ایک آدمی، ایک ووٹ' کا انجام ہو گا ہندو ریاست۔ پہلے تناسب ۳ اور ۱ کا تھا اب یہ چار اور ایک کا ہو گیا ہے۔ کیا ہم اب بھی ایسے محاورے کی تشکیل نہیں کر سکتے جن کی اپیل پانچوں کے لیے یکساں ہو؟"

ہمارا آشتی خو اور مصالحت جو مصنف بڑی حسرت کے ساتھ یہ سوا کرتا ہے۔ اُس نے یہ جرات آمیز اعتراف بھی کیا ہے کہ یہ مطالعہ اس نظریے کو ثابت نہیں کرتا کہ ہندو مسلم اختلاف کا بیج برطانوی را نے بویا تھا۔ ہندوستانی اختلافات کو برطانیہ کی تصنیف قرار د قرین حقیقت نہ ہو گا۔ حقیقت کا اعلان محمد علی نے ۱۹۳۰ء کے دو لندن میں یہ کہہ کر کیا تھا کہ

"ہم آپس میں پھوٹ ڈالتے ہیں اور وہ (انگریز) حکومت کرتے ہیں۔"

۱۹۴۶ء میں سرت چندر بوس نے وائسرائے ویول کے سامنے یہ الز دہرایا کہ:

"انگریزوں کی پالیسی ہے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو۔"

توویل نے جواب دیا کہ

"ہماری کوشش ہے کہ جوڑیں اور خود چلے جائیں۔"

اگرچہ یہ دعویٰ بھی درست نہ تھا۔

"نام نہاد اسلامی اساسیت کا بھی ہندو مسلم تعلقات پر کوئی اثر براہ راست نہیں پڑا۔ آٹھ اکابرین سے اقبال اور آزاد اساسیت کی طرف زیادہ جھکے ہوئے تھے۔ اقبال نے کبھی فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی مخالفت نہیں کی اور آزاد نے عملاً خود کو ہندو مسلم اتحاد و شرکت کار کا سب سے بڑا موید ثابت کیا۔ ایک اسلامی ریاست کے قیام کا سب سے پرجوش وکیل وہ شخص ٹھہرا جس کا تعلق ان آٹھوں میں اسلام سے سب سے کم تھا لیکن قیام پاکستان کے بعد اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی بقائے باہم کے نظریے کو پھر سے گلے لگایا۔"

راج موہن گاندھی کے تجزیے اور تخمین سے کہیں کہیں اختلاف کرسکتے ہیں لیکن اس کی نیت پر شبہ نہیں کرسکتے۔ شعور اس کی اس غیر ملفوظ تجویز کی پذیرائی کرنے پر مجبور ہے کہ ہمیں فرقہ وارانہ کشیدگی کے لیے ماضی میں محرکات ہرگز نہیں ڈھونڈنے چاہییں اور فیصلہ کرنے یا رائے قائم کرنے سے پہلے خود کو دوسرے فریق کی جگہ رکھ کر دیکھنا چاہیے۔ یہ بات بھی دونوں فریقوں کی توجہ کے لائق ہے کہ ہندوستان میں مسلمان بادشاہوں کی حکومت اسلامی حکومت نہیں تھی اور ان کے فیصلے سیاسی مصالح پر مبنی ہوتے تھے۔ ہندوستان کے بادشاہی دور پر تبصرہ کرنے سے پہلے معاصر مطلق العنان حکومتوں کے طرز عمل پر نگاہ ڈالی جائے تو اصابت رائے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ بہر کیف اسلاف کو اخلاف کے اعمال کا وارث قرار دینا ایک غیر منصفانہ اور مضحکہ خیز حرکت ہے۔ اسی طرح غیر عادلانہ رویہ ان لوگوں کا ہے جو پدرم سلطان بود کہہ کر اکڑنے اور الگ تھلگ رہنے کا جواز فراہم کرتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ماضی کو بھول کر حال کو سنوارنے اور مستقبل کو بنانے کی کوشش کریں۔

لیکن یہ مرحلہ صرف خوش کلامی اور صلح جوئی سے سر نہیں ہونے کا۔ ضرورت ان دونوں باتوں کی ہے۔ لیکن ہمیں اس تلخ حقیقت کو ایک لمحہ بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ یہ دور سخت مقابلے کا، زندہ رہنے کے لیے مجاہدہ اور مجادلہ کا دور ہے۔ ہندوستان بڑھتی ہوئی آبادی، غربی اور بے روزگاری اور جہالت کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔ اگر مسلمان یہ چاہیں کہ صرف خیرسگالی اور اکثریت کی ہم نوائی سے کام چل جائے گا تو یہ ان کی بہت بڑی بھول ہوگی۔ خیر اندیشی اور آشتی بہت ضروری ہے لیکن کافی نہیں ہے۔ اگر ہم خود کو لائق اور کارگزار اور ماہر شہری نہیں بنائیں گے تو ہماری خیرسگالی پر لوگ مسکرائیں گے۔ یہ ترقی کا قافلہ اور نہ برادران وطن ہمیں ساتھ لے چلنے کے لیے ایک لمحہ بھی رکیں گے۔ انھیں ہم سے یہ شکایت ہوگی اور بجا ہوگی کہ ہم وطن عزیز کی ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ نوبت آجائے کہ وہ ہمارے ساتھ ہمدردی کا اظہار کریں لیکن وہ ان محدود وسائل اور امکانات کو جو ملک کو دستیاب ہیں ہمارے ساتھ بانٹنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں گے۔ انھیں تو ہمیں خود بڑھ کر اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لینا ہوگا۔ ان محدود وسائل کے لیے سخت زہرہ گداز مقابلہ حالیہ ہندوستان کے مقدر میں لکھا ہوا ہے۔ جو اس دوڑ میں کارواں کا ساتھ نہ دے پایا، وہ روندا جائے گا، کچلا جائے گا اور کوئی اس پر اشک بار ہونے کے لیے نہیں رکے گا۔ یہاں نہ میٹھی میٹھی باتیں کام آئیں گی، نہ نالہ و فریاد نہ ترحم کی درخواست۔ ہمارے وہ مفکرین جو رہنما جو صرف خوش نوائی اور کنارہ کشی اور قومی یک جہتی کی باتیں اس طرح کرتے ہیں گویا اُن میں ہمارے مسائل کا حل ہے۔ وہ زندگی کے حقائق اور اس کی اساس اور تنازع للبقا کے قانون سے ناواقف ہیں۔ ہمیں خوش دلی اور خیر اندیشی کے ساتھ کمر کس کے مقابلہ اور جدل کے میدان میں آنا چاہیے کہ زندگی ہرگز پھولوں کی سیج نہیں ہے۔ ہمیں اسے خوش گوار بنانا چاہیے لیکن نہ اس طرح کہ خوش گواری سپر اندازی کی شکل اختیار کرلے۔ ہمیں اپنا حق اپنے قوت بازو سے حاصل کرنا چاہیے ریاضت، انصاف اور استقامت کے ساتھ چھینا جھپٹی اور دست درازی کے انداز میں نہیں۔ ہمارا مدعا یہ ہونا چاہیے کہ ہماری کوششوں سے وطن کی ترقی کی رفتار تیز ہو۔ جو لوگ کھیل کے میدان میں اتر چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ جیتنے کے لیے جان لڑانی پڑتی ہے۔ لیکن کھیل کے آداب

اور مقابلے کے آئین سے تجاوز نہیں کیا جاتا۔ وہ ٹیم جو خیر اندیشی کے نشہ میں میدان میں اترنے سے ہی انکار کر دے اور اگر اترے بھی تو اعتذار یا نیم دلی کے انداز میں اس کا نام اسکور بورڈ پر نہ کبھی آیا ہے، نہ آئے گا۔ وہ بالآخر صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا۔ مبادا کہ ہمارے ساتھ ایسا ہو۔ ابنائے وطن کے ساتھ ہم تعلقات کو شگفتہ رکھیں گے اور ان سے مقابلے کے لیے تیاری کریں گے۔ اگر ہم ان سے بہت پیچھے رہ گئے تو ان کی طرف دست تعاون کیسے بڑھائیں گے؟ اپنا ہاتھ ہمارے بڑھے ہوئے ہاتھ میں دینے کے لیے کیا وہ پیچھے کی طرف آئیں گے؟ نتیجہ یہی نکلا کہ مقابلے سے، سخت مقابلے سے، جانکاہ مقابلے سے کوئی مفر نہیں۔ اگر ہم بقا اور عزت چاہتے ہیں تو نہ ٹکراؤ اور تصادم سے کام چلے گا نہ نری خیر سگالی اور خوشنوائی اور للّو چپّو سے، نہ ماضی کے دندانی بنے رہنے سے، نہ قومی یک جہتی کا وظیفہ پڑھنے سے۔ کام چلے گا سنجیدگی، محنت، ریاضت، مقابلہ، جانفشانی، اعتدال، توازن، ہمدردی، حبّ وطن، علم اور انسان دوستی سے۔ کام چلے گا حال سے نبرد آزمائی اور مستقبل کی پذیرائی سے۔

”فرض کفایہ وہ علوم ہیں جن کی حاجت امور دنیا کے قیام میں پڑے۔ جیسے کہ طب کہ بدن انسان کی صحت کے قیام کے لیے ضروری ہے۔ اسی طرح حساب جو معاملات، وصیتوں اور ترکوں کی تقسیم وغیرہ میں ضروری ہیں.... اس میں تعجب نہ کرنا کہ ہم نے طب اور حساب کو فرض کفایہ کہہ دیا۔ اس لیے کہ اس اعتبار سے تو اصل صنعتیں بھی فرض کفایہ ہیں۔ مثلاً نوربافی، کاشتکاری اور سیاست بلکہ حجامت، پچھنا لگانا اور سینے پرونے کا کام بھی فرائض میں داخل ہیں۔“

امام غزالی

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۷ ، ش ۶ (جون ۸۸ء)

اسلام کا فلسفۂ عید

(یہ خطبہ عید الفطر کے موقع پر جامع مسجد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں دیا گیا)

محمد مسعود عالم قاسمی*

ساری تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو رحمان و رحیم ہے، درود و سلام ہو اللہ کے رسولوں پر۔ خاص طور پر آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور ان کی آل و اصحاب پر۔

آج عید کا دن ہے اور ہم لوگ عید الفطر کی نماز ادا کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ عید خوشی و انبساط کو کہتے ہیں۔ یعنی یہ ہماری خوشی کا دن ہے اور یہ نماز خوشی کی نماز ہے۔ اسلام میں خوشی اور غم کا ایک واضح تصور ہے۔ اس لیے ہر مسلمان جس طرح اپنے سارے کام میں اس بات کو پیش نظر رکھتا ہے کہ اس کا خدا کس بات سے خوش ہوتا ہے اور کس چیز سے ناراض ہوتا ہے اسی طرح اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اپنی خوشی اور غم کے حدود کو نگاہ میں رکھے اور معتدل و ہنگامی حالات میں اپنے آپ کو سنبھالے رہے۔

خوشی ایک مطلق حقیقت ہے جسے ہر انسان جانتا ہے، پسند کرتا ہے اور اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر کسی شخص کے سامنے خوشی اور غم دو اختیاری چیزیں ہوں تو کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر وہ خوشی کو اختیار کرلے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ سقراط اور افلاطون کی طرح وہ دو اور دو چار کے انداز میں یہ نہ بتا سکے کہ خوشی کیا ہے، کب پیدا ہوتی ہے اور کس طرح پیدا ہوتی ہے وغیرہ۔ وہ تو بس اتنا جانتا ہے کہ خوشی ایک کیفیت ہے جو اس پر طاری ہے، ایک انبساط ہے جو اسے حاصل ہے اور ایک سرور ہے جو اسے مست کیے دیتا ہے۔

اس کے باوجود کہ خوشی ایک فطری اور جبلی چیز ہے جو ہر انسان میں پائی جاتی ہے اور ہر انسان اس کا متلاشی ہے۔ خوشی کے اسباب و عوامل اور اس کے حصول کے طریقوں میں بڑا اختلاف ہے۔ کوئی عہدہ و اقتدار کے ذریعے خوشی حاصل کرتا ہے اور کوئی مال و دولت کی فراوانی میں خوشی دیکھتا ہے، کوئی آل و اولاد سے خوشی پاتا ہے اور کوئی رقص و سرود میں خوشی ڈھونڈتا ہے، کوئی حسن و عشق میں خوشی کا جویا ہے اور کوئی سیر و تفریح میں خوشی پاتا ہے۔ ایک فارسی شاعر کہتا ہے:

بعضے کہ تمنائے زر و مال خوش اند
بعضے کہ تماشائے خط و خال خوش اند
اینہا ہمہ اسباب پریشانی ہست
خوش حال کسانیکہ بہر حال خوش اند

اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انسان کے مقاصد الگ ہوتے ہیں، پسند ناپسند مختلف ہوتی ہے، فکر و خیال جدا ہوتے ہیں، عقیدہ و نظریہ علیحدہ ہوتا ہے اور یہ سب انسان کی خوشی اور غم کا پیمانہ بناتے ہیں۔ بظاہر خوشی کے حسب ذیل تین عوامل ہوتے ہیں۔

۱۔ خارجی عوامل: اس میں دولت، عہدہ، قبیلہ، خاندان زیادہ موثر ہیں۔

---

* ناظم دینیات سنی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

۲۔ طبیعاتی عوامل: اس میں صحت، طاقت، حسن اور اس قبیل کی چیزیں زیادہ موثر ہیں۔

۳۔ روحانی عوامل: اس میں علم، انصاف، حکمت اور نیکی زیادہ موثر ہوتی ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ خوشی اگرچہ ایک فطری اور عمومی چیز ہے، مگر خوشی کے اسباب و عوامل اور اس کی حدود کی تعین میں عقل اور نقطۂ نظر کو بھی دخل ہے۔ پھر خوشی کی ایک قسم وہ ہے جو "لذت" سے جڑی ہوئی ہے۔ جن چیزوں سے انسان کو لذت ملتی ہے وہ ایک طرح کی خوشی بھی عطا کرتی ہیں۔ مثلاً تیز دھوپ میں ٹھنڈے پانی کا گلاس اگر آدمی کو لذت عطا کرتا ہے تو عین اسی لمحے میں اسے خوشی بھی حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے لذت کو خوشی سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ مگر ایک لذت تو وہ ہے جو محسوسات کے دائرے میں محصور ہے۔ مثلاً آنکھ اور کان کی لذت زبان اور ناک کی لذت یا جنسی افعال کی لذت وغیرہ۔ لذت کی ایک اور قسم ہے جو ماورائے محسوسات ہے اور وہ محسوسات سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ مثلاً ایک عالم کے لیے کسی علمی نکتے کے حاصل ہونے کی لذت، ایک ریاضی داں کے لیے کسی پیچیدہ فارمولا کے حل ہو جانے کے بعد کی لذت، ایک سائنس داں کے لیے کسی تھیوری کے دریافت کر لینے کی لذت، ایک شاعر کے لیے کسی اچھے شعر کے آمد کی لذت اور ایک مومن کے لیے تہجد کی نماز کی لذت یا کسی ضرورت مند کی حاجت پوری کر دینے کے بعد کی لذت وغیرہ۔ یہ ساری لذتیں حسی لذتوں سے کہیں زیادہ طاقت ور، دیرپا اور خوشی عطا کرنے والی ہوتی ہیں۔

بہت سے قدیم اور جدید فلسفیوں کا خیال ہے کہ خوشی محض خواب و خیال ہے۔ دنیا میں خوشی نام کی کسی چیز کا کوئی وجود نہیں۔ ہم جسے خوشی سمجھتے ہیں وہ درحقیقت رنج و غم کا ہی ایک حصہ ہے۔ کیونکہ یہ دنیا مصائب و آلام کی آماجگاہ ہے۔ اس میں سوائے دکھ درد اور رنج و محن کے کچھ نہیں۔ انسان کو خوشی تو اس وقت حاصل ہوگی جب وہ اس دنیا کے مصائب سے چھٹکارا پالے اور اپنے اندر کی دنیا کو باہر کی دنیا سے قطعی لاتعلق کرلے۔ ورنہ اس کا ہر وقت رنج و الم سے گھرا ہوگا۔ ایرانی تصوف، ہندومت، بدھ مت کا فلسفہ تقریباً اسی خیال کے اردگرد گھومتا ہے۔

دوسری طرف بہت سے مغربی مفکرین ہیں جن کی نظر میں خوشی کا اصلی سرچشمہ یہی مادی دنیا ہے۔ دنیا ہی خوشی عطا کرتی ہے۔ جب کہ انسان کے اندر سوائے رنج و غم اور محرومی کے کچھ نہیں۔ خوشی، رنج و غم سے چھٹکارا حاصل کرنے کا نام ہے۔ اگر انسان اپنے اندر کی محرومی کو دور کرنا چاہتا ہے تو وہ مادی دنیا کا سہارا لیے بغیر ایسا نہیں کر سکتا۔ انسان رنجیدہ اس لیے ہے کہ وہ بھوکا ہے۔ اگر اسے روٹی مل جائے گی تو وہ خوش ہو جائے گا۔ انسان غم زدہ اس لیے ہے کہ اسے اسباب راحت میسر نہیں۔ اگر اسے سامان راحت میسر آجائیں تو یقیناً اسے خوشی حاصل ہوگی اور اندر کی محرومی باہر کی فراوانی سے مل کر خوشی میں تبدیل ہو جائے گی۔

خوشی کے بارے میں اہل فکر کی یہ دو انتہائیں ہیں ان میں بعض جزوی صداقتیں موجود ہیں لیکن خوشی کی یہ کامل تصویر نہیں۔ ان دونوں نقطہائے نظر میں کمیاں اور کمزوریاں ہیں۔ ایک طرف اگر انسان خارج کی دنیا سے اپنا ناطہ توڑ لے اور پھر اپنے اندر خوشی تلاش کرے تو یہ ایک لاحاصل عمل ہوگا۔ ایک سپاٹ، بے کیف، یک رخی اور تلخ و شیریں سے عاری زندگی کبھی انسان کو خوشی عطا نہیں کر سکتی اور یہ فرض کرنے کا بھی کوئی جواز نہیں کہ دنیا میں خوشی کا وجود نہیں۔ جس طرح یہ مان لینے کا کوئی جواز نہیں کہ دنیا میں رنج و غم کا کوئی وجود نہیں۔ دوسری طرف اگر انسان صرف مادی دنیا کو حاصل کرکے اور اس کی رعنائیوں اور دلکشیوں کو سمیٹ کر چاہے کہ اسے خوشی حاصل ہو جائے تو یہ ضروری نہیں۔ پھر یہ فرض کر لینا بھی غلط ہے کہ انسان کے اندرون میں محرومی اور غم پوشیدہ ہے بلکہ خوشی اور غم کی جڑیں اندر و باہر ہر جگہ موجود ہیں۔ مغربی تہذیب نے ایسی ہزاروں مثالیں پیش کر دی ہیں کہ ایک انسان بظاہر زندگی کی راحتوں کے سارے اسباب کا مالک ہے، اس کے سامان تعیش کی فہرست میں کوئی ایسی چیز نہیں جو نشان زدہ نہ ہو، پھر بھی اسے خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ بے چینی اور اضطراب میں اس کے شب و روز کٹتے ہیں۔ اب وہ کبھی افیون کھا کر اپنے آپ کو فراموش کرتا ہے، کبھی ہپّی ازم کی بنا ڈالتا ہے، کبھی کرشنا ازم کا تجربہ کرتا ہے

اور کبھی قید حیات کی بندشیں کاٹ ڈالتا ہے۔

اسلام کا نقطۂ نظر ان دو انتہاؤں کے درمیان معتدل اور ہموار ہے۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق انسان جانور کی طرح صرف ایک مادی وجود کا نام نہیں جس کی خوشی صرف ظاہر سے وابستہ ہو اور صرف جسم و تن اور اعضائے بدن تک محدود ہو۔ انسان کے بارے میں یہ سوچنا سراسر ظلم ہے۔ بلکہ وہ جسم اور روح دونوں کا مالک ہے۔ اس لیے اس کی خوشی جسم اور روح دونوں سے جڑی ہوئی ہے۔ اسلام نہ ظاہر کو نظر انداز کرتا ہے اور نہ باطن سے غفلت برتتا ہے۔ اسلام میں خوشی وہی معتبر اور پائیدار ہے جو انسان کی فطرت سے پھوٹے۔ انسان کی فطری ترقی کا نتیجہ ہو اور انسان کی آخری خوشی (فطری انجام) سے ہم آہنگ ہو۔ اسلام کی نظر میں انسان کی فطرت نیک ہے۔ اس لیے حقیقی خوشی وہی ہے جس کی بنیاد نیکی ہو۔ انسان کا فطری ارتقاء یہ ہے کہ وہ سمت راست میں ترقی کرے۔ اس لیے یہی خوشی وہی ہے جو راہ راست پر چلنے سے حاصل ہوتی ہو اور آخری خوشی یہ ہے کہ وہ آخرت میں رنج و غم اور نارِ جہنم سے نجات پائے اور جنت کی خوشی اسے حاصل ہو۔ اس لیے یہاں اصلی خوشی وہ ہے جو اس انجام خیر سے ہم آہنگ ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مختصر جملہ میں اسی مفہوم کو انتہائی حکیمانہ انداز میں یوں بیان فرمایا ہے:

"اذا سرتک حسنتک وساءتک سیئتک فانت مومن"

[جب تمہاری نیکی تمہیں خوش کر دے اور تمہاری برائی تمہیں بری لگے تو تم مومن ہو۔]

قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر اس فلسفۂ رنج و خوشی کو مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ سورۃ الحدید میں ہے۔

"اعلموا انما الحیوٰۃ الدنیا لعب ولھو وزینۃ وتفاخر بینکم وتکاثر فی الاموال والاولاد کمثل غیث اعجب الکفار نباتہ ثم یھیج فترٰہ مصفرا ثم یکون حطاما وفی الآخرۃ عذاب شدید ومغفرۃ من اللہ ورضوان"

[جان لو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل اور تماشا اور زینت و آرائش ہے اور تمہارے آپس میں فخر و ستائش اور مال و اولاد کی ایک دوسرے سے زیادہ طلب ہے (اس کی مثال ایسی ہے) جیسے بارش کے نتیجہ میں کسانوں کو کھیتی بھلی لگتی ہے، پھر وہ خوب زور پر آتی ہے۔ پھر تو دیکھتا ہے کہ وہ زرد پڑ جاتی ہے پھر چورا چورا ہو جاتی ہے اور آخرت میں کافروں کے لیے عذاب شدید اور مومنوں کے لیے خدا کی طرف سے بخشش اور خوشنودی ہے۔]

سورۃ العبس میں قدرے دو ٹوک انداز میں کہا گیا:

وجوہ یومئذ مسفرۃ ضاحکۃ مستبشرۃ۔
ووجوہ یومئذ علیہا غبرۃ ترھقھا قترۃ۔
اولئک ھم الکفرۃ الفجرۃ۔

[بہت سے چہرے اس دن چمک رہے ہوں گے، خنداں اور شاداں ہوں گے اور بہت سے چہرے اس دن وہ ہوں گے جن پر گرد پڑ رہی ہوگی اور سیاہی چھائی ہوئی ہوگی۔ یہ کفار بدکار ہوں گے۔]

عید کی خوشی اسلام کی اس ہمہ گیر تصور انبساط کا ایک حصہ ہے۔ رمضان المبارک کے پورے مہینے میں مسلمان روزہ رکھتا ہے، عبادت اور تلاوت کرتا ہے، صدقہ و خیرات کرتا ہے اور نیکی کا ایک ہمہ جہت ماحول بناتا ہے، اس سے اس کے اندر خوشی کی ایک طاقت ور کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ نماز عید اس خوشی کا موزوں و مناسب اور اجتماعی اظہار ہے۔ اسلام میں وقتی اور عارضی خوشی بہرحال خوشی ہے مگر شرط یہ ہے کہ یہ عارضی خوشی مذکورہ دائمی خوشی سے ہم رشتہ ہو اور اسی کی آگجو ہو۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک مسلمان کے لیے پانچ دن عید کے ہوتے ہیں۔

۱۔ جس دن وہ گناہ سے محفوظ رہے اور کوئی گناہ اس کے دامن دل کو تر نہ کرے۔

۔ جس دن وہ دنیا سے اپنا ایمان بسلامت لے جائے اور شیطان کی چالوں سے محفوظ رہے ۔

۲۔ جس دن وہ دوزخ کے پل سے بخیر و عافیت گزر جائے ۔

۳ ۔ جس دن وہ دوزخ سے بچ کر جنت میں چلا جائے ۔

۴ ۔ جس دن وہ اپنے پروردگار کا دیدار حاصل کرلے اور اس کی رضا سے بہرہ یاب ہو ۔

جہنم سے نجات، جنت میں داخلہ، اپنے رب کا دیدار اور اس کی رضا کا حصول ہی انتہائی سعادت اور آخری خوشی ہے ۔ چنانچہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ فرماتے ہیں :

عیدگاہ ما غریباں کوئے تو
انبساط عید دیدن روئے تو
صد ہلال عید قربانت کنم
اے ہلال عید ما ابروئے تو

عیدالفطر میں بندہ کو اللہ سے یہی کچھ ملتا ہے ۔ اسی لیے عید کی خوشی دوسری قوموں کے تہواروں سے بہت حد تک مختلف ہوتی ہے ۔ اس میں نہ کہیں رنگ و آہنگ ہے نہ رقص و سرود ہے نہ بے حیائی اور فضول خرچی ہے ۔ بلکہ وقار اور سنجیدگی ہے، باہمی احترام و محبت اور اخوت و ہمدردی ہے، نفاست و پاکیزگی اور تعاون باہمی کا مظاہرہ ہے اور یہی عید کی سچی خوشی ہے ۔

اللہ کی نظر میں وہ خوشی زیادہ پسندیدہ ہے جو دوسروں کے لیے بھی وجہ شادمانی ہو ۔ وہ خوشی اللہ کو قطعی پسند نہیں جو ایک فرد یا چند افراد کے آنگن میں مسرت کے پھول کھلائے، انبساط کی خوشبو پھیلائے اور دوسرے انسانوں کے دلوں میں رنج و غم کی آگ لگائے، آہ و فغاں کا دھواں اٹھائے ۔ انسانی زندگی میں خوشی کا بڑا موقع نکاح کا ہوتا ہے اور اس خوشی کا اظہار ولیمہ کے ذریعے کیا جاتا ہے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ولیمہ پر لعنت بھیجی ہے جس میں مال دار تو بلائے جائیں اور نادار چھوڑ دیے جائیں ۔ امیر تو مدعو ہوں مگر محتاج سے نظر چرائی جائے ۔ عید بھی خوشی کا موقع ہے ۔ اس میں امیر و غریب سب کو برابر کا شریک ہونا چاہیے ۔ دھیان رکھیے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کچھ لوگ نئے اور خوشبودار لباس زیب تن کیے ہنستے اور مسکراتے عید گاہ کو نکلیں مگر ان کے پڑوس سے حسرتوں اور تمناؤں کا جنازہ نکلے ۔ صدقۃ الفطر ہر صاحب حیثیت مسلمان پر اسی لیے واجب ہے کہ جو لوگ معیار زندگی کے نچلے زینے پر کھڑے ہیں ان کی ضروریات کا پاس و لحاظ رکھا جائے اور ان کی خوشی کا سامان مہیا ہو ۔ خدا نہ کرے وہ دن آئے کہ انسانوں کی بھری پری بستی میں افلاس و تنگ دستی کچھ لوگوں کو رونے تماشا بنا دے اور مال و دولت کی فراوانی دوسرے لوگوں کو چشم تماشا بنائے رکھے ۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"علم اس لیے حاصل نہ کرو کہ اس کے ذریعے علماء پر فخر جتاؤ ۔ نہ اس کے ذریعے بیوقوفوں سے جھگڑا کرو، نہ اس سے مجلسوں پر غالب آنے کی کوشش کرو

لیکن

جس نے ایسا کیا تو

اس کا ٹھکانا آگ ہے ۔"

ایک صاحب طرز ادیب

ابوعلی اثری

کبیر احمد جائسی

مولانا ابوعلی اثری کا شمار اردو کے ان "قلم کے مزدوروں" میں ہوتا ہے جو گزشتہ ساٹھ برسوں سے اپنی شخصیت کے اظہار کے لیے مختلف علمی و ادبی موضوعات پر برابر کچھ نہ کچھ لکھتے رہے ہیں اور لکھ رہے ہیں لیکن ان ساٹھ برسوں کی کمائی اس گردِ سفر کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے، جو گردشِ روزگار نے ازراہِ ترحم ان کے دامن میں ڈال دی ہے۔ اب جب کہ ان کی عمر کا عشرۂ نہم بھی نصف ہونے کو آیا ہے، جناب ضیاء اللہ کھوکھر گجرانوالہ کی علم شناسی اور علم دوستی نے ان کے اس مجموعۂ مقالات کو شائع کر دیا ہے جو مولانا سید سلیمان ندویؒ کی زندگی، رجحانات اور بعض علمی کارناموں کا احاطہ کرتا ہے۔ اب مولانا اثری کا دوسرا مجموعۂ مقالات کھوکھر صاحب ہی کی توجہ اور نظرِ کرم سے منظرِ عام پر آ رہا ہے جو ان کے اُن مقالات پر مشتمل ہے جو مولانا ابوالکلام آزادؒ کے بارے میں وقتاً فوقتاً لکھے گئے تھے۔ گویا اب گردشِ روزگار نے گردِ سفر کے علاوہ ان کے دامن میں کچھ پھول بھی ڈالنے شروع کر دیے ہیں۔ خدا کرے ان پھولوں کی خوشبو تادیر قایم رہے اور حالات کی تمازت اُن کی جلد کمھلانے نہ دے۔

مولانا اثری نے مشرقی یو۔پی کے مردم خیز خطہ اعظم گڑھ میں ۱۹۰۳ء میں اس جہانِ رنگ و بو میں آنکھیں کھولیں۔ ان کے والد ایک پڑھے لکھے آدمی تھے۔ اس لیے ان کی تمنا تھی کہ مولانا اثری بھی عالم بنیں۔ مولانا کی ابتدائی تعلیم مدرسۂ اسلامیہ واقع باغ میر پیٹو اعظم گڑھ میں ہوئی۔ جہاں ان کو ایک اہلِ حدیث عالم مولوی خدا بخش صاحب کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا

مولوی خدا بخش صاحب کے انتقال کے بعد ان کو مدرسۃ الاصلاح، میر میں داخل کیا گیا، اُس وقت مولانا شبلی متکلم ندوی اس کے صدر مد اور صاحبِ تفسیر نظام القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ ناظم تھے۔ مد الاصلاح میں ابھی انھوں نے متوسطات تک ہی کی تعلیم حاصل کی تھی کہ ہندوستان اس وبائی انفلوئنزا بخار کی لپیٹ میں آ گیا، جس نے نہ گھروں کو بے چراغ کر کے رکھ دیا تھا۔ مولانا کے والد بھی اسی انفلو میں مبتلا ہو کر اللہ کو پیارے ہوئے۔ جس کے نتیجے میں مولانا کو اپنی تع نامکمل چھوڑنی پڑی اور تلاشِ معاش میں کلکتہ کی خاک چھاننے پر مج ہوئے جہاں ان کے کچھ نزدیکی اعزہ مقیم تھے۔ وہ مصیبت کے دن ا نے کس طرح کاٹے، صبر کے کن کن مراحل سے گزرے، شدائد و مصا کیسے کیسے طمانچے سہے، اس کا ذکر مولانا ابوعلی اثری نے نہ تو کبھی زبا سے کیا، نہ تحریری طور پر۔ پھر نہ جانے کن اسباب کے تحت ۱۹۲۳ء کو دار المصنفین کے کتب خانہ کی مہتممی اور پھر تصحیح کی اسامی پر رکھ لیا گ وہ دن اور آج کا دن ہے کہ یہ قلم کا مزدور کاپیوں اور پروفوں کی کر کے اپنے جسم و جان کے رشتے کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔

معلوم نہیں آپ دار المصنفین گئے ہیں یا نہیں؟ اگر آج بھی آ جانے کا موقع ملے تو جو صاحب وہاں پر سب سے زیادہ مسن اور قدیم سے مختصر نظر آئیں آپ آنکھیں بند کر کے یقین کر لیں کہ مولانا اثری ہی وہ یا تو تازہ کتابوں کی کاپیاں اور پروف دیکھ رہے ہوں گے یا "حکیم

ریڈر ان ایرانین اسٹڈیز، ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز۔ اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

نے والے " کاغذ پر اپنا کوئی مضمون تحریر کر رہے ہوں گے۔ پہلی نظر میں آپ نا کو دیکھ کر اندازہ بھی نہ کر پائیں گے کہ اس نحیف الجثہ اور مختصر سے انسان ا قدرت نے کتنی بجلیاں چھپا کر رکھ دی ہیں۔

موجودہ عہد کے دار المصنفین میں ان سے زیادہ پرانا کارکن کوئی نہیں ہے۔ اس ادارے کی خدمت کرتے ہوئے ان کو پچاس برسوں ے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس لحاظ سے اگر ان کو دار المصنفین کا برادر رد کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ انہوں نے اس ادارے کی گفتنی و ناگفتنی سب ا بچشم خود مشاہدہ کیا۔ گفتنی کو تو وہ اپنے قلم کے ذریعے برابر تشہیر کرتے ہے، مگر ناگفتنی کو بار امانت کی طرح اپنے سینے میں چھپائے رہے۔ وہاں فتنی و ناگفتنی سب کچھ ہوتا رہا اور مولانا اثری پروف بھی پڑھتے رہے اور پنے مقالے بھی لکھتے رہے۔ گویا وہ اس ادارے میں ایک ایسے درخت کی لرح رہے جس پر کسی بھی موسم کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ انہوں نے سید سلیمان دوی کا دور نظامت دیکھا، شاہ معین الدین ندوی کے ماتحت بن کر ن کاٹے، سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب کی دار وگیر سے دو چار ہے مگر وہ جناب خلیل الرحمن اعظمی مرحوم کے اس شعر

کتنوں کی کمر جھک گئی اس دورِ خرد میں
دیوانہ مگر اب بھی اسی طرح جواں ہے

کی تصویر بنے اپنے کام میں مشغول ہیں۔ آج بھی جب کہ وہ ۸۰ سال سے اوپر کے ہو چکے ہیں، خاصہ دور کا فاصلہ طے کر کے پیدل دار المصنفین آتے ہیں اور جوانوں بلکہ نوجوانوں کے شانہ بہ شانہ پورے دن کام میں مصروف رہ کر اپنے کلبۂ احزاں کو واپس چلے جاتے ہیں۔

مولانا اثری اپنے اساتذہ میں سب سے زیادہ مولانا عبد الرحمن نگرامی ندوی مرحوم سے متاثر ہیں اور ان کا ذکر بڑے ہی ادب و احترام سے اب بھی کرتے رہتے ہیں۔ افسوس ہے کہ مولانا عبد الرحمن نگرامی کو زیادہ عمر نہ ملی ورنہ ممکن ہے کہ مولانا اثری ان کا منشی بن کر مدرستہ الاصلاح سے فارغ التحصیل ہوتے۔ بہرحال مولانا نگرامی کی تربیت کا یہ نتیجہ ہے کہ کابیاں اور پروف پڑھتے وقت علامہ شبلی نعمانی مرحوم کے علاوہ کسی بھی مصنف اور مضمون نگار کی عبارت ان کی اصلاح سے نہیں بچتی۔ حتی کہ سید صاحب کی عبارتوں پر بھی "مشق ستم" فرما دیتے، جس کو سید صاحب کمالِ حلم سے جھیل جاتے۔ اس سلسلے میں مولانا اثری اور سید صباح الدین عبد الرحمن سے اکثر چھیڑ چھاڑ ہوتی جس سے مولانا اثری آزردہ خاطر ہو جاتے مگر اپنی مشق ستم سے کبھی باز نہیں آئے۔

مولانا نے باقاعدہ تصنیف و تالیف کی تربیت حاصل نہیں کی یہی وجہ ہے کہ وہ بلا مبالغہ صدہا مقالات لکھنے کے باوجود کوئی مستقل اور مربوط تصنیف پیش کرنے سے قاصر رہے۔ ان کے تمام مقالات وقتی تاثر کا نتیجہ ہیں۔ جو زیادہ تر ایک ہی نشست میں معرض وجود میں آئے ہیں۔ وہ جوش انشا پردازی میں اکثر اپنے موضوع سے اس طرح گریز فرماتے ہیں کہ اس کا اصل سرا ہاتھ آنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر وہ کسی ایسے پیشے سے منسلک ہوتے جہاں مطبوعہ مقالات کی تعداد پر ترقی کا انحصار ہوتا تو وہ اس بات پر ضرور قادر ہوتے کہ وہ اپنے ایک مقالے سے چار مقالے بنا لیں لیکن چوں کہ اس طرح کی کوئی ضرورت ان کو زندگی بھر نہیں پڑی اس لیے وہ اپنے ایک مقالے میں چار مقالوں کا مواد دکھاتے رہے۔ جس کا نتیجہ اکثر حالت میں یہ نکلتا ہے کہ پیشانی کے عنوان اور مقالے کے مندرجات میں ایک ربط خفی کے علاوہ ہاتھ کچھ نہیں آتا، مگر اس کے باوجود ان کی تحریروں کی دلکشی اور علامہ شبلی کے طرز کی کامیاب پیروی ان کے مقالات کے اس نقص کی پردہ پوشی بن جاتی ہے۔

اب سے ربع صدی پہلے تک مولانا اثری صاحب اخبارات میں اپنے مضامین شایع کرواتے تھے۔ جب میں ان کا "منھ لگا" ہو گیا تو میں نے ضد کرنی شروع کی کہ آپ اپنے مقالات رسائل میں بھیجیے۔ اگر مجھ کو صحیح یاد ہے تو ان کا سب سے پہلا مقالہ جو کسی رسالے کی زینت بنا ہو، فاران کراچی میں شایع ہوا تھا۔ پھر جب جنوری ۱۹۶۱ء سے فروری ۱۹۶۴ء تک میں ماہنامہ ادیب علی گڑھ کے ادارتی عملے میں تھا تو میں نے بھی ان کے کئی مقالات شایع کرنے کا شرف حاصل کیا۔ یہ شرف مجھے دوبارہ اس وقت حاصل ہوا جب میں نے ۱۹۷۳ء۔ ۱۹۷۴ء میں کانفرنس گزٹ علی گڑھ کو ترتیب دینے کا کام انجام دیا۔ جون ۱۹۷۶ء سے ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ کے ادارتی عملے سے متعلق ہوں اسی مناسبت سے سہ بارہ یہ شرف پھر مجھ کو حاصل ہو گیا ہے کہ ان کے مقالات شایع کروں۔ شان خط مولانا اثری کے مقالات کی یہ ہوتی ہے (واضح رہے

کردہ اصلاً خوش خط ہیں اور دوسروں کے مسودوں کو صاف کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں، شبلی کالج اعظم گڑھ کی طالب علمی کے زمانے میں مجھے بھی اپنا ایک مسودہ ان سے صاف کرانے کی عزت حاصل ہے) کاتب تقدیر کے علاوہ دوسرا شخص ان کو پڑھنے میں بڑی دقت محسوس کرتا ہے۔ ستم بالائے ستم کاغذ کا کوئی کنارہ ایسا نہیں ہوتا جس پر تیر کا نشان بنا کر کچھ نہ کچھ لکھ نہ دیا جائے۔ ۱۸۵۷ء کا آہنی قلم، بین السطور نام کو نہیں بکھری ہوئی داستان کی طرح کاغذ کے چاروں طرف بکھری ہوئی تحریر، جس کو کتابت کرتے وقت کاتب اپنے مقدر کو ضرور کوستا ہوگا۔ یہ ہوتا ہے مولانا اثری کا وہ مسودہ جو آب و تاب کے ساتھ شایع کیا جاتا ہے۔

یہاں پر ایک خاص واقعہ کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا، مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد ارباب دار المصنفین نے یہ طے کیا کہ دار المصنفین کی طرف سے سید صاحب کی سوانح عمری شایع کی جائے اور اس کام کے لیے اس زمانے کے ناظم علمی مولانا شاہ معین الدین ندوی مرحوم کا انتخاب ہوا۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب شاہ صاحب کے قلم کی روانی بڑی حد تک ختم ہو چکی تھی اور وہ صرف معارف کے شذرات ہی لکھنے پر اکتفا فرماتے، جس کو وہ بڑے غور و فکر کے بعد لکھتے۔ جب "حیات سلیمان" کی اشاعت میں دیر ہونے لگی اور وقت خاصا گزر گیا تو مولانا ابو علی اثری نے "ایک عقیدت مند" کی نقاب چہرے پر ڈالی اور "میدان کارزار" میں تن تنہا کود پڑے۔ پھر کیا تھا۔ صدق جدید، فاران کراچی، قومی آواز لکھنؤ وغیرہ میں "ایک عقیدت مند" کے مراسلے شایع ہونے شروع ہو گئے۔ جن میں یہ مطالبہ ہوتا کہ سید صاحب کی سوانح عمری جلد شایع کی جائے۔ مراسلوں کی بھرمار سے مولانا شاہ معین الدین احمد مرحوم خاصے پریشان ہوئے۔ ان میں سے ایک مراسلہ تو ایسا تھا جس کا جواب شاہ صاحب کو معارف کے شذرات میں دینا پڑا، جس میں انھوں نے اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کیا تھا کہ یہ عقیدت مند صاحب خود ماشاء اللہ صاحب ذوق اور صاحب قلم ہیں اس لیے سیرت سلیمانی لکھنے کے کسی سے کم اہل نہیں ہیں۔ بہرحال اس راز سے صرف دو شخص واقف تھے۔ ایک یحییٰ اعظمی مرحوم دوسرے راقم السطور۔ ایک دن "عقیدت مند" صاحب کے چہرے سے نقاب اس طرح اٹھی کہ ان کا کوئی مراسلہ کسی اخبار میں شایع ہوا۔ یحییٰ اعظمی مرحوم دفتر میں کام کرتے تھے اور مولانا اثری کتابخانے میں۔ یحییٰ اعظمی صاحب نے ایک رقعہ لکھ کر ان کو ان کے حسن تحریر پر مبارکباد دی۔ رقعہ انہوں نے دفتر کے کسی ملازم سے بھجوایا تھا جو بجائے مولانا اثری کو رقعہ دینے کے، غلطی سے شاہ صاحب کو دے آیا۔ اس طرح برسوں کے بعد اس بات کا علم ہو سکا کہ یہ عقیدت مند تو دار المصنفین کے کتاب خانے ہی میں روپوش ہیں۔ بہرحال ان مراسلات کی بھرمار سے گھبرا کر اس وقت تک شاہ صاحب اس موضوع پر کافی مواد جمع کر چکے تھے۔ اس راز کے فاش ہونے کے برس دو برس بعد ہی حیات سلیمان منظر عام پر آئی۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ اس کی اشاعت میں مولانا اثری کا بھی حصہ ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

سطور بالا میں تحریر کیا جا چکا ہے کہ مولانا اثری کو تصنیف و تالیف کی باقاعدہ تربیت حاصل نہیں۔ اس بیان سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ وہ دلکش، جاذب نظر، متوازن اور بامعنی تحریر پر دسترس نہیں رکھتے۔ واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اردو دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا مقالہ نگار ہو جس نے باقاعدہ تصنیف و تالیف کی تربیت حاصل نہ کی ہو اور صرف اپنی مشق سخن اور ذوق و جذبہ کی بنا پر "صاحب طرز" بن گیا ہو۔ خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مولانا اثری ایک صاحب طرز ادیب ہیں، ان کے انداز تحریر کی نقل نہیں کی جا سکتی اور اگر ان کا تحریر کردہ ایک جملہ بھی کسی دوسری تحریر میں ملا دیا جائے تو وہ پکار پکار کر اس بات کا اعلان کرے گا کہ وہ کس کی تراوش قلم کا نتیجہ ہے۔ صاحب طرز ہونے کے لیے نہ تو باقاعدہ تصنیف و تالیف کی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی موٹی موٹی کتابیں لکھنے کی۔ اگر ایسا ہوتا تو دار المصنفین کا ہر رفیق صاحب طرز ہوتا۔ ان مقالات کی اشاعت کے بعد آج نہیں تو کل جب اردو کے صاحب طرز ادیبوں پر کوئی مربوط اور مفصل کام ہوگا تو کوئی بھی ایماندار ناقد مولانا اثری کے طرز تحریر کو نظرانداز نہ کر سکے گا۔ وہ اپنے طرز کے موجد ہوں یا نہ ہوں خاتم ضرور رہیں اور اب ایسی تحریریں پیش کرنے والا کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ جس کے یہاں شبلی اور ابوالکلام کا طرز تحریر اس انداز سے مخلوط ہو گیا ہو کہ ان کو جدا کرنا ناممکن ہو جائے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ہمارے ان مظلوم رہنماؤں، ادیبوں اور دانشوروں میں ہیں جن کے ساتھ کبھی انصاف نہیں ہوا اور ان کی زندگی میں ان کے عقیدت مندوں نے ان کو تمام غلطیوں سے مبرا اور کسی دوسری دنیا کی مخلوق کی حیثیت سے پیش کیا اور مخالفوں نے ان کی ایسی تخفیف کی کہ ان کو منہیات کا مرتکب ثابت کر کے چھوڑا۔ حالاں کہ وہ نہ تو غلطیوں سے مبرا انسان تھے، نہ ہی منہیات کے مرتکب۔ ہاں وہ ایک ایسے انسان ضرور تھے جن کا ہاتھ ہمیشہ وقت کی نبض پر رہا۔ اور انہوں نے اپنی خدا داد فہم و فراست سے ان حوادث کا بھی صحیح صحیح اندازہ کر لیا تھا جو آگے چل کر پیش آنے والے تھے۔ ان کے بہت سے خدشے درست اور ان کی بہت سی پیش گوئیاں صحیح ثابت ہوئیں۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ان کو کوئی مافوق الفطرت قوت حاصل تھی بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ اسباب وعلل کا معروضی تجزیہ کرنا جانتے تھے اور اس بات سے واقف تھے کہ کس عمل کا ردّ عمل کیا ہوگا۔ مولانا آزاد کی شخصیت کے بارے میں سب سے زیادہ خبث باطنی کا مظاہرہ پنڈت جواہر لال نہرو کے سکریٹری متھائی نے اپنی انگریزی کتاب ـ Reminiscences of the Nehru Age ـ Days with Nehru میں کیا ہے۔ افسوس ہے کہ اردو یا انگریزی زبان میں کوئی ایسی تحریر اب تک معرض وجود میں نہیں آئی جو متھائی کے زہر کا ازالہ کرتی۔ مولانا آزاد کے انتقال کو تقریباً تیس برسوں کا عرصہ گزرنے کو آیا۔ اب وقت آگیا ہے کہ ان کے بارے میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے، اس کا ناقدانہ جائزہ لے کر اصل و حقیقی ابوالکلام آزاد کو نئی نسل سے روشناس کرایا جائے۔

ختم کلام کے طور پر مولانا ابوعلی اثری سے ایک نیازمندانہ گزارش ہے۔ انھوں نے سید صاحب کی بارگاہ میں عقیدت و محبت کے پھول پیش کیے، مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت، ادبی بصارت اور علمی جاہ و جلال کو الفاظ کا خراج تحسین ادا کیا۔ آخر کیا سبب ہے کہ علامہ شبلی نعمانی مرحوم کے ایک دوسرے ممتاز شاگرد، سید صاحب کے خواجہ تاش، مولانا آزاد کے الہلالی دور کے رفیق و ہم کار مولانا عبدالسلام ندوی ان کی نگاہ توجہ سے پرے رہ گئے ہیں چوں کہ ان کا آبائی اور پشتینی مسلک، مسلک اہل حدیث تھا اس لیے ان کے بہت سے فکری اجزاء دار المصنفین کے معروف فکر سے میل نہ کھاتے۔ غالباً اسی وجہ سے ان کی سات کتابیں اب تک غیر مطبوعہ پڑی ہوئی ہیں۔ مولانا اثری ان کے اصلی و حقیقی کارناموں کو ضبط تحریر میں لا کر بہت سے ان جالوں کو چھڑانے کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں جو ان کے نام نہاد عقیدت مندوں نے ان کی شخصیت اور کارناموں کے گرد تان رکھے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ جناب ضیاء اللہ کھوکھر صاحب مولانا اثری سے مولانا عبدالسلام ندوی پر کتاب لکھوانے اور شایع کرنے میں کامیاب ہوں گے۔

"علم حاصل کرنے کے صرف دو طریقے ہیں: دلائل اور تجربات۔ دلائل سے ہم بعض نتیجے اخذ کر سکتے ہیں لیکن یہ نتیجے صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی۔ اس لیے علم کے حصول میں محض منطقی دلائل پر انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ جو علم تجربے سے حاصل ہوتا ہے وہ یقینی ہوتا ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں باقی رہتی۔ اس لیے علم حاصل کرنے کا یہ دوسرا طریقہ ہی صحیح اور قابل وثوق ذریعہ ہے۔"

راجر بیکن

وادیٔ دجلہ و فرات کی تہذیبیں

سید قاسم محمود

جن دنوں مصری تہذیب ترقی کی منزلیں طے کر رہی تھی، اُس زمانے میں دجلہ اور فرات کی وادی میں بھی ایک نئی تہذیب کا ظہور ہوا۔ اس تہذیب کی متعدد شاخیں تھیں جو اپنے اپنے علاقوں کے نام سے مشہور رہیں۔ ایلم، سمیریا، اکاد، بابل اور اشوریہ۔

اس تہذیب میں سائنس کی حالت و کیفیت کیا تھی اس پر روشنی ڈالنے سے پہلے اس کے تاریخی پس منظر پر نظر ڈالنا ضروری ہے جو کسی قدر طویل اس لیے ہو جائے گا کہ اردو خواں طبقہ ان کی تاریخ سے بہت کم واقف ہے زراعت، تجارت، گھوڑا گاڑی، کھاتہ، جمع بندی، صنعت و حرفت، قانون و حکمت، حساب و کتاب، دوائیں، نلے اور نالیوں کا انتظام، اقلیدس اور علم ہیئت، جنتری، تقسیم اوقات، گرہن وغیرہ، حروف تہجی، تحریر، کاغذ، روشنائی، کتابیں، کتاب خانے، مدرسے، درس گاہیں، علم، ادب، شاعر، راگ، موسیقی، سنگ تراشی، فن تعمیر، ظروف سازی، فرنیچر، توحید الٰہی، ایک بیوی کا نظریہ، سنگھار کی چیزیں، جڑاؤ زیور، شطرنج، انکم ٹیکس، اناگیری، جو کی شراب، الغرض یہ تمام چیزیں، جو بنیادی طور پر سائنسی ایجادات کی حیثیت رکھتی ہیں، وادی دجلہ و فرات کی تہذیب، یونان و روم ہوتی ہوئی یورپ اور یورپ سے امریکا پہنچیں۔

آریوں نے تہذیب نہیں نکالی، انھوں نے سمیریا، بابل اور مصر سے لی۔ نہ یونان و روم نے تہذیب شروع کی۔ بلکہ تجارت اور جنگیں تمام سائنس اور ٹکنالوجی کو ان کے شہروں میں مشرق قریب سے لائیں۔ یہ وہ قرضہ ہے جو یورپ اور امریکا کو اب تک زیر بار کیے ہوئے ہے۔ اگرچہ وہ بہتر صورت میں واپس دے رہے ہیں۔

آپ ذرا نقشے میں ایران کے صوبے فارس کو تلاش کر کے خلیج کے اوپر والے علاقے کو دیکھیے۔ عمارہ تک پہنچ کر نگاہ کو عراق کی سرحد پر لایئے۔ اور پھر موجودہ شوشتان قصبے پر ٹھہرایئے۔ یہاں آپ کو قدیم شہر سوس مل جائے گا۔ اس علاقے کو قدیم زمانے میں سشنار کا میدان کہتے تھے اور یہودیوں نے اسے "ایلم" لکھا ہے۔ یعنی بلند زمین۔ اس تنگ علاقے میں جو مغرب کی طرف دلدلوں میں گھرا ہوا ہے اور مشرق کی طرف پہاڑوں کی دیوار ہے، جو ایرانی سطح مرتفع سے جا ملتی ہے اس میں ایک نامعلوم نسل کی قوم رہتی تھی، جس نے تاریخی تہذیب کی بنیاد رکھی تھی۔

یہاں فرانسیسی آثار قدیمہ نے ایسے آثار نکالے ہیں جن کی عمر ۲۰ ہزار سال بتائی جاتی ہے اور کہتے ہیں کہ ان کی ترقی یافتہ تہذیب کے باقیات اب سے چھ سات ہزار سال پہلے کے ہیں۔ یہ مدت مصر کی ترقی یافتہ تہذیب سے زیادہ ہے۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ یہ ایلمی قوم کسی وقت گلہ بانی و خانہ بدوشی کی ٹھوکروں سے ہٹ کر شکار کی دوڑ دھوپ اور مچھلیاں پکڑنے کے سست کام سے جان چھڑا کر تمدنی برکت پر پہنچی تھی۔ ان کے پاس تانبے کے ہتھیار اوزار، زراعتی غلے اور بہت سی قسم کے جانوروں کا سدھاؤ، تصویری تحریر، تجارت، آئینے اور جڑاؤ زیور تھے۔ ان کی تجارت مصر سے لے کر

ایڈیٹر ماہنامہ طالب علم - کراچی پاکستان۔

ہندوستان تک پھیلی ہوئی تھی۔ حقیقاتی پتھر کی پچی کاری کے ساتھ نہایت عمدہ گول منقش برتن نکلے ہیں، جن پر ہندسی خاکے، حیوانوں اور پودوں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ ان میں سے بعض برتن ایسے خوب صورت ہیں کہ شاید ہی کبھی انسانی ہاتھوں نے بنائے ہوں گے۔

یہاں کمہار کا چاک اور گاڑی کے پہیے بھی ملے جو بابل اور مصر والوں سے پرانے ہیں۔ اس قوم نے بعد میں سمیریا اور بابل کو فتح کر لیا لیکن زیادہ دنوں تک سنبھال نہ سکے اور ان قوموں نے آزادی حاصل کر کے کچھ مدت بعد خود اس پر چوٹیں لگانا شروع کر دیں۔ شہر سوس ہزاروں سال قائم رہا۔ سمیر، بابل، مصر، اشوریہ، ایران، یونان اور روم کے زمانوں میں تھا۔ اس نے بہت سی قوموں کی حکومتیں دیکھیں۔ بعض ادوار میں یہ دولت کا مرکز بن گیا۔ جب سال چھ سو چالیس قبل مسیح میں اشور بنی پال نے اسے فتح کیا تو اس میں بے شمار سونا، چاندی، جواہرات، شاہی زیورات، بہترین لباس، فرنیچر، سنگھار دان اور گاڑیاں ملیں جنھیں وہ نینوا لے آیا۔ چاہے یہ شہر کتنی ہی صدیوں قائم رہا تاہم اس کا آغاز ترقی اثرات پھیلاؤ اتنے قدیم تھے کہ بعد کی قوموں انہیں یاد بھی نہ رکھ سکیں اور ایلمی اپنی ذکاوت کے ساتھ اس طرح مٹے کہ قصہ کہانی کی صورت میں بھی دماغوں میں نہ رہے۔

ہاں! تو پہلے یہ سن لیجیے کہ ایلمی اور سمیری تہذیبوں سے آگاہی اپنی قدامت اور تاریکی زمانے سے دور ہونے کی بنا پر دنیا کی نگاہوں سے اتنی اوجھل رہی ہے کہ غیر تو غیر خود ان کے علاقے کے موجودہ لوگ اس سے کلیتہً بالکل بے خبر ہیں۔ یونانیوں، رومیوں اور یہودیوں کو ان کے بارے میں ایک حرف بھی معلوم نہ تھا۔ تاریخ کے آدم یعنی یونانی مورخ ہیروڈوٹس نے کہیں بھولے سے بھی ایک حرف ان کے بارے میں نہیں لکھا۔ اُسے خبر ہی نہ تھی کہ بابل کے علاقے میں کوئی قوم تھی جس نے تہذیب کی بنیادیں مضبوط کی تھیں۔

اس بارے میں صرف ایک مورخ بابل کا ایسا ہے جس نے دو سو پچاس سال قبل مسیح میں صرف اتنا لکھا کہ سمیری وغیرہ کوئی دیو یا جنوں کی قوم تھی، جس کا بادشاہ اُنیس تھا وہ روزانہ خلیج فارس سے نکل کر خلقت میں آتا تھا اور دن بھر اُنھیں ہنر، صنعت و حرفت اور زراعت، دھاتوں کی ساخت و ساز اور تحریر وغیرہ سکھا کر شام کے وقت پانی میں چلا جاتا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ: انسان کی تمام اختراعات و ایجادات جو اب تک ہو چکی ہیں اُنیس نے انسان کو سکھائیں، اس کے بعد اب تک ان میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اس کی یہ تحریر بھی محض افسانے اور کہانی کی صورت میں ہے، اس سے قوم کے کارناموں پر ذرا سی بھی روشنی نہیں پڑتی۔

یہ سمیری قوم کہاں آباد تھی۔ دجلے اور فرات کے دہانے سے اوپر کو چل کر وہاں پہنچیے، جہاں یہ دونوں بچھڑ کر دور دور ہو جاتے ہیں۔ یعنی موجودہ مقام "کرنا" پر کھڑے ہو جائیے۔ پھر فرات کے دونوں کناروں پر نظر ڈال کر ڈھونڈیے۔ یہیں آپ کو سمیریوں کے مدفون شہر "اریدو" یعنی موجودہ شہرین، عور (مکاییر) عورک (ورقہ) لارسا یعنی موجودہ سنقرہ، لگاش (شیرلہ) نیپر (نفر) وغیرہ ملیں گے۔

بابل کے ساتھ ہی شمال کی طرف شہر کش ہے جو اس علاقے کی تہذیب میں قدیم ترین مقام ہے۔ پھر یہاں سے ساٹھ میل بابل سے اوپر اکاد کا شہر ہے جو اکادیوں کا دارالحکومت تھا۔ اکادی سامی تھے اور سمیری غیر سامی ان دونوں قوموں میں مدتوں لڑائی رہی اور آخر کار سامی غالب رہے۔ پھر دونوں قومیں مل کر اس قدیم تہذیب کو تیزی سے ترقی دینے میں تعاون کرتی رہیں۔ آخر کار سامیوں نے سمیری تہذیب کو اختیار کر لیا۔

ابھی تک معلوم نہیں کہ سمیری کہاں سے آ کر اس وادی میں آباد ہوئے شاید ایشیائے متوسط سے آئے ہوں۔ اس لیے کہ دونوں زبانوں کے الفاظ کچھ مشابہ ہیں۔ ممکن ہے کہ آرمینیا یا کاکیشیا سے آئے ہوں۔ اس لیے کہ دونوں زبانوں کے الفاظ کچھ مشابہ ہیں جن کہانیاں پتہ دیتی ہیں کہ وہ خلیج فارس کے راستے مصر سے یا کسی اور جگہ سے پہنچے۔ ممکن ہے کہ سوس سے آئے ہوں۔ ایلم میں ایک پرانا سر نکلا ہے جو سمیری شکل سے مشابہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ منگول ہوں۔ اس لیے کہ دونوں کی زبان میں مشابہت پائی جاتی ہے بہرحال جہاں سے بھی آئے ہوں تھے عجیب!

ان کے بتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پستہ قد، گٹھے ہوئے اور سیدھے تھے۔ سامیوں کی سی عقابی ناک نہ تھی۔ ذرا دبی ہوئی پیشانی، نیچے کو جھکی ہوئی آنکھیں۔ داڑھیاں بھی رکھتے تھے اور منڈاتے بھی۔ بعض اوپر کے ہونٹ صاف کرتے تھے۔ بھیڑ کی کھال پہنتے تھے۔ نوکر اور نوکرانیاں گھروں میں سر سے چھاتی تک ننگے رہتے تھے۔ عورتیں سر پر ٹوپی پہنتی تھیں اور پاؤں میں سلیپر ہوتے تھے۔ بڑے گھروں کی بوٹ پہنتی تھیں اور اس میں ایسے ہی

تسمے باندھتی تھیں جیسے آج کل باندھتے ہیں۔ زیورات میں ہنسلی، کڑے، ہار، انگلیوں کے چھلّے، کانوں کی بالیاں پہنتی تھیں۔ بالکل آج کل کی طرح۔

جب اُن کی تہذیب بہت پرانی ہوگئی تو دو ہزار تین سو قبل مسیح میں ان کے شاعروں نے قبل تاریخ کے حالات میں ملک کی سرسبزی و ترقی کا حال لکھا اور بتایا کہ ایک دن خلیج فارس کا پانی چڑھ گیا۔ سیلاب آیا اور ایک گنہگار شاہ کے اعمال کی وجہ سے ملک تباہ ہوگیا۔ شاعروں نے اپنی عادتوں کے مطابق عجیب عجیب کہانیاں لکھیں اور وقت تاریخ داستان امیر حمزہ بن کر دوسروں کے لیے جھوٹ کی تحریک بن گئی۔

سمیریوں کے یہاں صنعت نے ترقی کی۔ کپڑے کے سرکاری کارخانوں میں سپروائزر اپنی نگرانی میں کپڑا بنواتے تھے۔ حکومت نے اور بھی کارخانے قایم کیے ہوئے تھے۔ عام مکان کچی گھاس پھوس، پرالی اور سرکنڈوں کے تھے اور آج کی طرح گارے میں بھوسا ملا کر انہیں لیپ لیا جاتا تھا۔ دروازے کے پٹ پتھر کے چولوں پر گھومتے تھے۔ یہ طریقہ یہاں بھی اب تک جاری تھا اور جہاں پتھر نہ تھا وہاں لکڑی کا چول لگاتے تھے۔ وہ لوگ فرش میں صرف مٹی کوٹ لیتے تھے۔ چھت بھی سرکنڈے باندھ کر پاٹ لیتے تھے۔ پانی کے لیے کنوئیں تھے۔

وہ سامان دریاؤں اور نہروں کے ذریعے کشتیوں میں لاتے تھے۔ خشکی پر گاڑیاں استعمال کرتے تھے۔ اس لیے کہ قدیم شہر کیش میں پرانے پہیے نکلے ہیں اور تجارتی مہریں ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ مصر اور ہندوستان سے تجارت کرتے تھے۔ تاہم ابھی تک سکہ وجود میں نہ آیا تھا۔ سونا چاندی اور چیزوں کے ساتھ تبادلے میں استعمال ہوتے تھے۔ ان کی بہت سی تختیاں نکلی ہیں جن میں تجارتی اقرار نامے ہیں۔ لین دین اور معاملات کی تفصیلیں پائی جاتی ہیں۔ نفع کی تقسیم میں سونے چاندی کا استعمال ہے۔ بہت سی باتیں موجودہ وقت کے معاملات سے ملتی جلتی ہیں۔

ان کے مندروں میں بے شمار سونا ملتا ہے۔ نہ صرف جڑاؤ زیوروں کی صورت میں بلکہ اس کے ہتھیار، برتن، عام زیورات اور آلات وغیرہ بھی ہیں۔ درجوں طبقوں کی تفصیل ملتی ہے۔ غلامی بہت سنبھلی ہوئی اور شائستہ تھی۔ ملکیت کے حقوق میں تقدس پایا جاتا تھا۔ امیر اور غریب طبقوں کے درمیان ایک درمیانہ طبقہ بھی ہے، جن کا کام معمولی تجارت اور کاروبار کرنا تھا۔ علماء، اطباء اور پروہتوں کی جماعت بھی ہے۔ طبابت ترقی کر چکی تھی اور ہر مرض کی دوائیں تھیں۔ پھر بھی مذہبی اوہام کو بہت دخل تھا۔ وہ خیال کرتے تھے کہ بیماریاں روحوں اور بھوتوں کی وجہ سے آتی ہیں۔ بغیر جھاڑ پھونک کے ٹھیک نہیں ہوسکتیں۔ ان کے یہاں جنتری قمری حساب سے بارہ مہینے پر منقسم تھی۔ تیسری چوتھے سال ایک مہینہ بڑھا دیتے تھے اور اس طرح مہینے فصل کے موسم کے مطابق چلتے تھے۔ ہر شہر نے مہینوں کے نام الگ لکھے ہوئے تھے۔

حکومت کا طریقہ خود اختیاری کا سا تھا۔ ہر شہر اپنا بادشاہ رکھتا تھا جس کو وہ لوگ بتیسی کہتے تھے۔ یعنی پروہت بادشاہ"۔ اس لیے کہ حکومت مذہب سے وابستہ ہوتی تھی۔ دو ہزار آٹھ سو سال قبل مسیح میں جب کہ اُن کی تہذیب اور نظام ترقی کر چکا تھا۔ تجارت عروج پر تھی اس طرح کہ جدا جدا حکومتوں کا قیام مشکل ہوگیا تھا شاہی مرکز کی ضرورت پڑی۔ مالی اور سیاسی حالات نے مجبور کر کے ایک نظام کے ماتحت کر دیا۔ متحد ہوگئے پھر بھی بادشاہ کے ساتھ پروہت حکومت کرتے تھے۔

مطلق العنان بادشاہ ایک الگ تھلگ محل میں رہتا تھا۔ جس کے صرف دو راستے ہوتے تھے۔ اتنے تنگ کہ ان میں صرف ایک آدمی گزر سکتا تھا ان میں دونوں طرف ایک خفیہ کنج ہوتا تھا۔ جن میں چھپے ہوئے سپاہی ہر ملاقاتی کا جائزہ لیتے تھے۔ خطرہ دیکھتے تھے تو خنجروں سے اس کا کام تمام کر دیتے تھے۔ بادشاہ کا مندر بھی خفیہ ہوتا تھا اور وہ بغیر ظاہر ہوئے مذہبی رسم ادا کر لیتا تھا۔ لڑائیوں میں فوجی گاڑی میں بیٹھ کر جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک بھیڑ تیر کمان اور نیزوں سے آراستہ چلتی تھی۔ جنگ کی وجہ تجارتی غرض یا مال کا حصول ہوتا تھا۔ اکادّ کے بادشاہ منیش نے کھلے طور پر اعلان کیا تھا کہ میں ایلم کی چاندی کی کانوں پر قبضہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہاں کے قیمتی پتھر بھی اٹھاؤں گا۔

مفتوح، غلام بنا کر بیچ دیے جاتے تھے۔ اگر اس میں کچھ فائدہ نہ دیکھے تو میدان جنگ ہی میں قتل کر دیے جاتے تھے۔ ورنہ خداؤں کے سامنے لا کر قربانی کے طور پر ذبح کر دیے جاتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اس قوم کی آزادی طبع اور شہروں کی آزادی نے زندگی اور آرٹ کو ابھارا لیکن سرکشی، نا اتفاقی و نافرمانی بھی پیدا کر دی جس سے ہر ایک ریاست کمزور ہوگئی اور ملک تباہی پر پہنچ گیا۔

بڑی حکومتوں میں وہاں زمین دارانہ اصول رہا۔ لیکن بتدریج کرنے

والے بادشاہوں نے لڑائی کے بعد زمینیں اپنے سرداروں میں بھی تقسیم کیں۔ ان جاگیرداروں کو محاصل معاف کر دیے گئے۔ ان سرداروں نے تنظیم اور امن بھی پیدا کیا اور لڑائیوں میں بادشاہ کو رسد اور سپاہی بھی دیے۔ حکومت کی آمدنی مختلف قسم کے ٹیکسوں سے وصول ہو کر شاہی محل کے خزانے میں جمع ہوتی تھی اور اس سے افسروں اور نوکروں کی تنخواہیں دی جاتی تھیں۔

اس فیوڈل سسٹم کے ساتھ اُرنمّو اور ڈنگی نے شہر عور کے قوانین میں اضافہ کر کے قوانین قایم کیے جو ہر پہلو پر حاوی تھے اور حقیقت میں یہی سامی بادشاہ حمورابی کے بہترین قوانین کا منبع و مصدر بنے۔ یہ احکام زیادہ سخت نہ تھے۔ مثلاً سامیوں کے یہاں اگر عورت زنا کی مرتکب ہوتی تھی تو اسے مار ڈالتے تھے۔ سمیری قانون اسے ہلاک نہ کرتا تھا۔ بلکہ شوہر کو دوسری شادی کرنے کی اجازت دیتا تھا اور کہتا تھا کہ پہلی کو خدمت گار کے طور پر رکھ لیا جائے۔ یہ قانون تجارت، خانگی زندگی، قرضے اجارے، خرید و فروخت میراث اور ترکے کے احکام پر شامل تھا۔ عدالت مندروں میں لگتی تھی۔ زیادہ تر پروہت جج ہوتے تھے۔ حکومت کے جج بڑی عدالتوں میں تھے۔

اس قانون میں ایک دفعہ مقدمات کو روکنے، گھٹانے کی تھی — ہر مقدمہ پہلے ایک عام جج کے حوالے کیا جاتا تھا۔ جس کا فرض تھا کہ قانون کی طرف جھکنے سے پہلے کسی طرح معاملے کو نبٹا دے۔ یہ صورت بہت اچھی تھی۔ جس کی طرف بڑے بڑے قانونی انکار جھک گئے اور اب اسی کے نتیجے میں پنچایتی سسٹم چلایا جا رہا ہے۔ یہ بہت اچھا طریقہ ہے کہ پنچایت سے معاملہ نہ طے ہو سکے تو آدمی عدالتوں کی مشکلات میں پھنسے۔

سمیریوں کی سب سے حیرت انگیز صنعت و ایجاد ان کی تحریر ہے۔ آرٹ کی بھی ترقی نمایاں نظر آتی ہے۔ تجارت، ظروف سازی اور مذہب میں بھی بہت شعور و ادراک ہے۔ قدیم ترین کتبے تو پتھر پر ہیں جو تین ہزار چھ سو سال قبل مسیح کے ہیں۔ لیکن تین ہزار دو سو کے بعد تختیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ پھر معلوم ہوتا ہے کہ کھلے طور پر نئی معلومات کی طرف قدم اٹھاتے ہیں۔ محققین کی خوش قسمتی یہ ہے کہ انہوں نے کمزور پتوں اور بے جان کاغذ پر پھیکی سیاہی سے نہیں لکھا۔ بلکہ مٹی کی کچی تختیوں پر لکھ کر انہیں پکا دیا ہے۔ ان میں شاہی تاریخوں اور حالتوں سے لے کر نیچے تک کے ہر قسم کے حالات و کوائف درج ہے۔ ایجاد اور تاریخ نویسی کا یہ خیال تاریخ انسانی پر احسان عظیم ہے کہ جس سے ہم اس وقت کی ہر قسم کی سرگزشتیں پڑھ لیتے ہیں۔

ان کی تحریر دائیں سے بائیں کو چلتی ہے ہماری تحریر کی طرح۔ بابلیوں نے پہلی مرتبہ بائیں سے دائیں طرف لکھائی شروع کی۔ سمیریوں کے یہاں پہلے علامتوں اور تصویروں کی تصویر نکلی تھی جو ان کے برتنوں پر موجود ہے۔ پھر سیکڑوں سال کے بعد میں وہ تحریر آئی جس میں چیزوں کی جگہ آوازوں کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ تاہم وہ اس درجے سے آگے نہ بڑھے اور ٹھیک آوازوں کے لیے حروف پر آنے کی عزت مصریوں کے لیے چھوڑ گئے۔

تحریر سینکڑوں سال تک تجارتی ضرورتوں میں کام دیتی رہی، پھر کہیں جا کر ادب اور تاریخ کو دامن میں سمیٹا۔ دو ہزار سات سو سال قبل مسیح سمیریا میں بڑی بڑی لائبریریاں تیار ہو چکی تھیں۔ ڈی زرزک نے شاہ گوڈیا کے زمانے کے تیس ہزار تختیاں کھنڈرات میں سے نکالیں جو نہایت ترتیب، احتیاط اور صفائی کے ساتھ ایک دوسرے پر رکھی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دانا قوم سوچ سمجھ کر ہمارے لیے رکھ کر گئی تھی۔ ان کے کچھ حالات و واقعات بابلیوں کی تختیوں سے بھی ملے ہیں۔ اصلی تختیوں میں بہت سی نظمیں اور دعائیں پروہتوں کی ہیں۔

یہی سمیریوں کا کلچر خود اپنے ملک میں اور دیگر ممالک میں چلتا رہا۔ اس پر مدتوں کچھ اضافہ نہ کیا گیا۔ البتہ انہوں نے ہی تحریر کو شکلی صورت میں ڈھالا۔ فن تعمیر کو بھی بنیادی طور پر گھروں اور مندروں کی عام صورتوں سے آگے نکال دیا۔ محراب بھی ایجاد کر لی، ستون بھی کھڑے ہو گئے۔ یہاں تک کہ دیہاتیوں نے بھی سرکنڈوں اور پھٹیل کے گھروں کو محرابوں اور گنبدوں سے رونق دے لی۔ شہر نیپر میں پانچ ہزار سال پہلے کی ایک محراب دار بدرو ملی ہے۔ عور کے شاہی مقبرے میں تین ہزار پانچ سو سال قبل مسیح کی محرابیں ہیں۔ عور کی محرابوں میں پتھر نہایت قرینے اور قاعدے سے لگائے ہیں۔ دولت مندوں کے محل چالیس فٹ کی کرسی پر (ٹیلوں پر) ہیں۔ ان کی صورت حال قلعوں کی سی ہے۔ اکثر ان میں اینٹوں کے ہیں، اندر پلستر ہے۔ دیواروں پر تصویریں اور نقوش ہیں۔ مکان بڑے صحن کے بیچ میں بنے ہوئے ہیں۔ نالی سسٹم موجود ہے۔ فرنیچر پایا جاتا ہے۔ بعض پلنگ دھات اور ہاتھی دانت کے ملے ہیں اور کرسیاں شیروں پر ٹکی ہوئی ہیں۔ مندروں کے لیے باہر سے بیش قیمت عمدہ پتھر منگواتے تھے اور

مختلف دھاتوں سے اور عمدہ سامانوں سے سجاتے تھے۔ عور کے نانار مندر میں خوب صورت زرد ٹائل لگے ہوئے ہیں۔ ساگوان شاہ بلوط کا کام ہے۔ سنگ مرمر کا استعمال کیا ہے، چاندی اور سونے تک کا کام کیا ہے۔ ایک مندر میں چھ سات منزل کا مینار ملا ہے، جس کے اندر سیڑھیاں ہیں۔ یہ ایک بڑا برج ہے جس میں خطرے کے وقت بادشاہ پناہ لے سکتا تھا۔ ال عبید سے پرانے قدیم سمیری زمانے کا ایک بُت بیل کا ملا ہے جو تانبے کا ہے۔ ہزاروں سال زمین میں دبا رہا اور اب بھی ویسا ہی ہے۔ ملکۂ شباد کی قبر سے ایک گلے کا سر چاندی کا نکالا گیا ہے۔ یہ آرٹ کا بہترین نمونہ ہے۔

سمیری قوم نے چاہے خود قدم بڑھایا ہو یا ایلیمیوں سے استفادہ کیا ہو، اس میں شک نہیں کہ وہ ذہین قوم تھی جو وحشت کی تاریکیوں کو چھانٹ کر آگے بڑھی۔ انقلاب پیدا کیا اور انسان کو تہذیب کی نعمت دے کر خود اس طرح مٹ گئی کہ ان کی یاد بلکہ ذکر بھی دماغوں سے نکل گیا۔ قومیں بھول بسر گئیں۔ بہرحال سامی مذاہب کا ان سے گہرا تعلق ہے۔ بنی اسرائیل اس نسل کی یادگار ہیں۔ اس لیے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنے نظریۂ توحید کو لے کر اس اپنی ترقی یافتہ قوم کو چھوڑ کر شہر اُر سے اُردن کے علاقے میں حران بستی میں پہنچے تھے۔

یہ واقعہ کس زمانے میں ہوا؟ تاریخ اس کا کوئی واضح نشان دینے سے قاصر ہے۔ موجودہ مورخین قیاس کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے حمورابی کے خاندان کے بادشاہوں میں سے کسی کے عہد میں بت پرستی کے خلاف جہاد شروع کیا اور وہ غالباً نرعداد تھا۔ یہ جو نمرود نام آتا ہے، اسی کی بگڑی ہوئی صورت ہے اس نرعداد نے ایک عمارت بنوائی اور کتبہ لگوایا ہے کہ یہ عمارت اس وقت بنی جب میں نے ناعید شمس باغی کو تباہ کیا۔" نرعداد نمرود سے ملتا جلتا لفظ ہے۔ اور کسی نام سے مشابہت نہیں کھاتا۔ اس خاندان نے دو ہزار ایک سو پچیس سال قبل مسیح تک حکومت کی۔ یہ بھی خیال ہے کہ شاید حضرت ابراہیمؑ اس خاندان کے دور میں ہوئے ہیں جو دو ہزار دو سو پچہتر سال قبل مسیح میں ختم ہو گیا تھا۔

"سائنس کی تمام ایجادات درحقیقت اسلامی معنویتوں کا مادّی رخ ہیں اور اس دور میں اسلام تفہیم اور اس کے اقرب الی الفہم کرنے کے لیے ہی تکوینی طور پر سائنسی طرقیات کا وجود عمل میں آیا ہے۔ پس جو شخص سائنس کو اسلام کا وسیلہ بنا کر استعمال کرے گا وہ اسلام کو قوت پہنچائے گا اور جو اسے مستقلاً مقصود بنا کر عمل میں لائے گا وہ اپنے نفس کو ضعف اور ضرر پہنچائے گا۔ مگر اسلام کا اس سے کچھ نہیں بگڑ سکتا۔"

قاری محمد طیب صاحب

کاغذی نظام زرِ مبادلہ

سید شفیق احمد[*]

آج کی دنیا میں کرنسی نوٹ کاغذ کا ایک ایسا جادوئی ٹکڑا ہے جسے دکھاتے ہی بہت سی مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ کاغذی زرمبادلہ کو نہ صرف عام قبولیت حاصل ہوئی ہے بلکہ نقل وحمل کی سہولت کی وجہ سے دھات کے سکوں کے بالمقابل اسے ترجیح بھی دی جاتی ہے۔ کاغذی زرمبادلہ سے مراد سکۂ رائج الوقت کے اس نظام سے ہے جس کے تحت سرکار یا مرکزی بینک یا دونوں ہی ادارے اسے حسب ضرورت جاری کر سکتے ہیں اور اس کی شکل غیر محدود زر قانونی (Legal tender) کی ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کم قیمت کی دھات کے سکے بحیثیت علامتی سکے (token coin) کے بھی رائج رہتے ہیں۔ لیکن انھیں سونے یا چاندی میں تبدیل نہیں کرایا جا سکتا ہے۔ مبادلہ (barter) نظام یعنی اشیاء کے بدلے اشیاء کا لین دین کی دشواریوں نے سکوں کو جنم دیا تھا۔ نقل وحمل کی دشواریوں کے پیش نظر اور قیمتی دھاتوں کی گھساوٹ اور کمی نے انسانی ذہن کو کاغذی نظام زر مبادلہ (Paper currency) کی طرف منتقل کرایا۔

ٹوئینی کا خیال ہے کہ چین کے سنگ حکمراں خاندان نے سب سے پہلے ۹۷۰ء میں کاغذی سکہ (پیپر کرنسی) کا استعمال شروع کیا تھا۔ لیکن یہ سلسلہ افراط زر اور قیمتوں میں اضافہ کی وجہ سے ۱۴۳۵ء کے بعد جاری نہ رہ سکا۔ چین کے ہی مانچو حکمراں خاندان نے اُسے پھر دوبارہ ۱۸۵۱ء میں جاری کیا[1]

دوسرا خیال یہ بھی ہے کہ ۱۸۶۱ء سے قبل شوح (shuh) چین کے صوبہ ذی شین (Szechhuen) میں سب سے پہلے پیپر کرنسی ایجاد ہوئی تھی۔ چنگ ینگ نام کے ایک شخص کو اسے سرکولیشن میں لانے کا فخر حاصل ہوا۔ اس پیپر کرنسی کو جیٹزے (chitse) بھی کہا جاتا تھا۔ کچھ لوگ انھیں کینزی (Keentze) بھی کہتے تھے اور ایک کینزی کو ایک اونس چاندی کے سکے کے برابر مانا جاتا تھا۔[2]

ہندوستان میں کاغذی زرمبادلہ کے ارتقاء کی تاریخ ماضی کے تقریباً ۳۰۰ سال کے دھندلکوں میں چھپی ہوئی ہے۔ ۱۸۶۱ء سے قبل نوٹوں کے اجراء کا کام بینکوں اور بینکروں کے ہاتھ میں تھا۔ ۱۸۰۹ء میں بینک آف بنگال اور بینک آف ہندوستان کو چند شرائط کے ساتھ نوٹ اجراء کرنے کی اجازت ملی تھی لیکن ان کے جاری کردہ نوٹوں کو سرکاری خزانوں میں قبول نہیں کیا جاتا تھا۔ "گریٹ ڈپریشن" کے بعد ۱۹۳۲ء میں تقریباً سبھی ممالک میں کاغذی زرمبادلہ کا آغاز ہوا۔[3]

کاغذی زرمبادلہ کو فیاٹ اسٹنڈرڈ بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اسے سرکاری ساکھ پر چلایا جاتا ہے۔ بحیثیت سکۂ رائج الوقت کے اس کی اپنی کوئی قیمت نہیں ہوتی ہے۔ اور اس وجہ سے اسے اشیاء یا قیمتی دھات مثلاً سونا یا چاندی کے برابر ہرگز تبدیل نہیں کرایا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کاغذی نوٹ کا سونے یا چاندی کے سکے سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس کی قبولیت کا انحصار سرکاری ساکھ اور ملک کی اقتصادی

[1] اے. جے. ٹوئینی۔ اے اسٹڈی آف ہسٹری۔ (ص ۳۱۳) [2] کلبراتھ (Kalbrath) اور کین آف مرمنی۔ [3] بی بی داس گپتا۔ پیپر کرنسی اِن انڈیا۔

[*] ڈپٹی فائنس آفیسر۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

حالت پر مبنی ہوتا ہے۔ اسی لیے اسے منیجڈ سسٹم (Managed System) بھی کہا جاتا ہے۔

کاغذی زرمبادلہ کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ملک کی اقتصادی ترقی میں مددگار ثابت ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے ملک کے قدرتی وسائل مثلاً قیمتی دھاتوں کا استعمال زیادہ اہم کاموں اور مناسب طریقوں سے کیا جا سکتا ہے۔ صنعتوں کے بڑھنے سے روزگار میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے ملک کی قیمتوں میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔ کیوں کہ سکۂ رائج الوقت ہمیشہ چلن (circulation) میں رہتا ہے اور سونے کے سکوں کی طرح معاشرے کے افراد اس کو چھپا کر جمع نہیں کرتے ہیں۔ لارڈ کینس نے اسی وجہ سے پیپر کرنسی کی سفارش کی تھی۔ کیوں کہ اس میں چلن میں رہنے کی صلاحیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔

پیپر کرنسی کی ایک دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ ملک کی اقتصادی حالت کو بین الاقوامی زرمبادلہ کی تبدیلیوں سے متاثر نہیں ہونے دیتی ہے۔

خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس نظام میں کچھ خامیاں بھی ہیں۔ اگر نوٹ چھاپنے کی مقدار میں غلطی ہو جائے تو ملک افراط زر کا شکار ہو جائے گا اور روپے کی قیمت گھٹ جائے گی۔ اس کی ایک نمایاں مثال جرمنی کی ہے جہاں دوسری جنگ عظیم کے بعد ضرورت سے زیادہ کرنسی چھاپ دی گئی اور کسی قسم کا ریزرو (reserve) نہیں رکھا گیا، جس کی وجہ سے قیمتوں میں اضافہ ہوا اور کرنسی کی قیمت تشویش ناک حد تک نیچے گر گئی تھی۔

سرکولیشن میں آنے والے نوٹوں کی تعداد کی بڑی اہمیت ہے۔ اسی لیے اس کے جاری کرنے کے اصول بڑے احتیاط سے مرتب کیے گئے ہیں۔ نوٹ جاری کرنے کے دو بنیادی اصول ہیں پہلا اصول کرنسی پرنسپل (زرمبادلہ کا اصول) اور دوسرا بینکنگ پرنسپل (بینکاری کا اصول) کہلاتا ہے۔

کرنسی اصول نہایت محفوظ اقتصادی نظام کو مدنظر رکھ کر تشکیل کیا گیا ہے۔ اس طریق کار کا بنیادی مقصد لوگوں میں اعتماد پیدا کرنا ہے۔ یہ امید کی جاتی ہے کہ نوٹوں کی سونے یا چاندی میں حسب ضرورت تبدیلی کی گارنٹی معاشرے کے افراد میں کرنسی نظام کے لیے اعتماد پیدا کرنے کی محرک ہوتی ہے۔ اس اصول کے تحت مرکزی بینک یا سرکاری خزانے میں نوٹوں کی قیمت کے برابر سو فیصدی سونا یا چاندی ہر اجراء کے موقع پر محفوظ کر لیا جاتا ہے تاکہ نوٹ کی مالیت کے برابر سرمانگنے والے کو نوٹ پر چھپی رقم کے برابر سونا یا چاندی دیا جا سکے۔ اس طریق کار سے قیمتی دھاتوں کی گھساوٹ کی وجہ سے آنے والی کمی کو روکا جا سکتا ہے ظاہر ہے اس نظام میں افراط زر کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے لیکن اس سے کرنسی میں لچک (elasticity) کی خوبی ختم ہو جاتی ہے، جو فی زمانہ اقتصادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ یہ اصول یا طریق کار نہ صرف ترقی پذیر ممالک میں بلکہ ترقی یافتہ ممالک میں بھی قابل عمل نہیں سمجھا جاتا ہے۔ ماہرین اقتصادیات کا خیال ہے کہ سبھی لوگ ایک وقت میں نوٹوں کے بدلے سونا پانے کی خواہش نہیں کریں گے اور اس وجہ سے اس بات کی ضرورت بھی نہیں ہے کہ سو فیصد سونا یا چاندی محفوظ کیا جائے۔ جنتا کا اعتماد اس بات پر منحصر ہے کہ سرکار کتنی ہوشیاری اور کامیابی سے کرنسی کی قیمت (value) میں استحکام پیدا کرتی ہے۔

نوٹ جاری کرنے کا ایک دوسرا طریقہ بینکنگ پرنسپل کہلاتا ہے اس کے تحت زرمبادلہ میں لوچ کی اہمیت پر زور دیا جاتا ہے۔ یہ یقین کیا جاتا ہے کہ ایک ہی وقت پر سب لوگوں کو تمام نوٹ بدلنے کی ضرورت نہیں ہوگی، اس لیے سو فیصدی سونا یا چاندی محفوظ رکھنا ضروری نہیں ہے۔ اسی لیے بینکنگ طریق کار کو کرنسی طریق کار پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اسی طریقہ کار میں بڑھتی ہوئی اقتصادی ضرورتوں اور رجحانوں کی وجہ سے بہت سی تبدیلیاں کی ہیں۔ موٹے طور پر نوٹوں کے اجراء کے دو طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ سادہ امانتی نظام (Simple Deposit System) جو کرنسی اصول پر مبنی ہے، بتایا جاتا ہے۔ دوسرا طریقہ جزوی امانتی نظام یا رتسل ڈپازٹ سسٹم (R. D. S) ہے جو کہ بینکنگ اصول پر نافذ کیا جاتا ہے اوّل الذکر نظام میں سونا یا چاندی یا دونوں ہی کو چھاپے جانے والے نوٹوں کی مالیت کے برابر خزانہ میں محفوظ کیا جاتا ہے۔ دوسرے نظام کے تحت نوٹوں کی مالیت کے کچھ حصے کے برابر ہی سونا یا چاندی محفوظ

کیا جاتا ہے اور باقی سب سے تمسکات (سیکورٹیز) کی بنیاد پر اجرا کیا جاتا ہے۔ اس نظام کے بہت سے روپ دیکھنے کو ملتے ہیں جن میں سے کچھ حسب ذیل ہیں۔

زیادہ اعتمادی نظام

Maximum Fiduciary System

اس نظام کے تحت سرکار نوٹ جاری کرنے کی ایک حد مقرر کر دیتی ہے اور سینٹرل بینک اُس سے زیادہ نوٹ جاری نہیں کر سکتا ہے۔ اس حد تک سرکار یا بینک کو کسی قسم کا ذخیرہ (رزرو) رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ آخری حد کا تعین فی زمانہ ضرورتوں کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔ اس طرح اس طریقہ کار میں کافی لچک آجاتی ہے جو افراط زر کے خطرے سے ملک کی اقتصادیات کو محفوظ رکھتی ہے۔ بہت سے ممالک میں یہ طریقہ رائج ہے۔ انگلینڈ میں ۱۹۳۹ء سے اسی نظام کے تحت نوٹوں کا اجراء کیا جاتا ہے۔ پھر بھی یہ کہنا کہ یہ طریقہ کار مثالی ہے، شاید غلط ہوگا۔ کیوں کہ اندازے کی غلطی سے زیادہ نوٹوں کے اجراء ہونے کا امکان بہر حال رہتا ہے۔

مقررہ اعتمادی نظام

Fixed Fiduciary System

اس طریقہ کار کے تحت مرکزی بینک کو یہ ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ تمسکات (سیکورٹیز) کی بنیاد پر ایک مقررہ تعداد کے نوٹ جاری کرے اور اس تعداد سے زیادہ اجراء کی صورت میں سونا یا چاندی کو رزرو میں رکھنا لازمی قرار دیا جاتا ہے۔ انگلینڈ کی طرح ہندوستان میں بھی اس طریقہ کو اپنایا گیا تھا۔ ۱۸۶۱ء میں فکسڈ فڈوشری اشو چار کروڑ روپیہ کا تھا جو ۱۹۲۰ء میں بڑھ کر ۱۲۰ کروڑ روپیہ ہو گیا تھا۔ اس نظام میں لچک کی کمی بتائی جاتی ہے۔

تناسبی ذخیرہ کا نظام

Proportional Reserve System

اس نظام کے تحت سونا یا چاندی ۳۳ سے ۴۰ فیصد تک رزرو میں رکھا جاتا ہے اور باقی تمسکات (سیکورٹیز) کی صورت میں رکھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں یہ طریقہ ۱۹۲۷ء سے ۱۹۵۶ء تک اپنایا گیا جس کے تحت نوٹوں کی مالیت کا ۴۰ فیصد سونے کی صورت میں رزرو میں رکھا گیا اور باقی ۶۰ فیصد سیکورٹیز کی شکل میں رکھا گیا تھا۔ ترقی پذیر ملکوں کے لیے یہ طریقہ مناسب خیال کیا جاتا ہے۔

کم سے کم ذخیرہ کا نظام

(Minimum Reserve System)

اس نظام کے تحت مرکزی بینک کو قانونی طور پر یہ ہدایت ہوتی ہے کہ وہ کم از کم ایک مقررہ تعداد میں ہر اجرا کے وقت سونا یا چاندی محفوظ رکھے۔ اس وقت ہندوستان میں کم از کم ۲۰۰ کروڑ روپیہ کا ذخیرہ (رزرو) رکھا جاتا ہے۔ جس میں سے ۱۱۵ کروڑ سونے کی شکل میں رکھا جاتا ہے[1] اس طریقہ کے تحت یہ یقین کیا جاتا ہے کہ لوگوں کے نوٹوں کو سونے اور چاندی میں تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس نظام میں کافی لچک پائی جاتی ہے۔ فی زمانہ یہ کافی مقبول طریقہ ہے۔

کاغذی زر مبادلہ کا نظام ایسا ہونا چاہیے جس میں لوگوں کا اعتماد ہو۔ طریق کار میں لچک ہو اور قیمتی دھاتوں مثلاً سونے یا چاندی کو کم از کم محفوظ کیا جائے۔ تاکہ وہ دیگر ضروریات میں کام آسکے خاص طور سے بیرون ملک کی تجارت میں۔ اس سے برآمدات کو فروغ ملے گا۔

۱؎ سیکشن ۷ حصہ ۵۔ سسٹم آف نوٹ ایشو ان انڈیا۔

> "اہل یورپ کو یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ وہ قرآن کا مرہون منت ہے۔ قرآن ہی تھا جس نے یورپ میں آفتاب علم و دانش طلوع کیا۔"
>
> اوڈویل

ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ   جلد نمبر ۷ - شمارہ نمبر ۶ (جون ۱۹۸۸ء)

رزیڈنشیل اسکولوں کی اہمیت و افادیت

محمد اسحاق

آندھرا پردیش ملک میں واحد ریاست ہے، جہاں پہلے پہل ۱۹۷۱ء میں تلگو میڈیم رہائشی اسکول ضلع نلگنڈہ کے ایک موضع "سردیل" میں قایم کیا گیا اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ دیہات کے وہ ذہین طلباء، جو معاشی نکبت کی وجہ سے بہتر تعلیم حاصل نہیں کر سکتے، انھیں اچھی تعلیم کے مواقع فراہم کیے جائیں تاکہ ملک کا یہ زرخیز سرمایہ یوں ہی ضایع ہونے نہ پائے۔ دوسرا اہم مقصد یہ تھا کہ ذہین طلباء کی تلاش میٹرک کے بعد نہیں بلکہ ابتدائی عمر ہی میں انھیں شریک کر لیا جائے تاکہ ان کی تعلیم ابتدائی جماعتوں ہی سے مضبوط بنیادوں پر قایم ہو جائے۔ پبلک نظام تعلیم میں یہ تبدیلی ایک انقلاب سے کم نہ تھی، حکومت کا کام اب تک صرف یہ تھا کہ دیہاتوں اور شہروں میں اسکول کھول دیے جائیں، جو طلباء چاہیں شریک ہوں۔ آزادی کے بعد اسکولوں اور طلباء کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ کمیت میں اضافے کے ساتھ کیفیت کا قایم رہنا نہایت مشکل ہے۔ طلباء کی تعداد کے ساتھ ساتھ معیار تعلیم کا بہتر ہونا ضروری ہے۔ کیوں کہ حکومت کے وسائل محدود ہوتے ہیں

شہری علاقوں میں صاحب ثروت لوگ اپنے بچوں کو اعلیٰ معیار کے انگریزی میڈیم اسکولوں میں پڑھاتے ہیں، دوسرے الفاظ میں وہ تعلیم کو خریدتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ تعلیم جتنی مہنگی ہوگی، اتنی ہی بہتر ہوگی، سستی تعلیم اتنی ہی غیر معیاری ہوگی۔ آج کل تعلیم خود ایک انڈسٹری میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے "سردیل" کا تجربہ کامیاب رہا، اس کی اہمیت و افادیت کو رفتہ رفتہ تسلیم کر لیا گیا۔ ملک کا وہ غریب اور بدقسمت طبقہ جن کے بچے نہایت ذہین اور ملک کے لیے اثاثہ ثابت ہو سکتے ہیں، وہ بن کھلے مرجھانہ جائیں۔ وہ محض اچھی اور صحیح تعلیم نہ ملنے کی وجہ سے بس یوں ہی کچھ آگے بڑھ کر ٹھہر جاتے ہیں۔ ورنہ تجربے سے یہ ثابت ہے کہ شہری علاقے کے طلباء کی طرح انھیں مساوی مواقع دیے جائیں تو وہ بہترین معیار اور مقابلے پر آ سکتے ہیں۔ آج رہائشی اسکولوں کی جڑیں اس ریاست کی سرزمین میں بہت گہری اور دور دور تک پھیل چکی ہیں۔ اس وقت مختلف اضلاع میں ۹۰ میٹرک کی سطح کے ۴ انٹرمیڈیٹ کی سطح کے اور ایک ڈگری کالج کے معیار کے "تلگو میڈیم اقامتی اسکول قایم ہو چکے ہیں۔ اس اسکیم کی غیر معمولی افادیت کے پیش نظر، جدید تعلیمی پالیسی ۱۹۸۶ء میں مرکزی حکومت سارے ملک کے ۴۰۰ اضلاع میں اپنے اخراجات سے اس نوعیت کا اقامتی اسکول کھولے گی جنھیں نوودیا و دیالہ کا نام دیا گیا ہے۔ اب تک سارے ملک میں مرکزی حکومت وزارت فروغِ انسانی وسایل کی جانب سے اس قسم کے ۱۸۰ اسکول کھول چکی ہے خود آندھرا پردیش میں ۱۱۶ اسکول قایم ہو چکے ہیں۔

۱ داخلہ کا طریقۂ کار

ان اقامتی اسکولوں میں داخلہ میرٹ کی بنیاد پر دیا جاتا ہے میٹرک کی سطح کی رہائشی اسکولوں میں سمتی کی سطح پر ابتدائی ٹسٹ لے کر ہر سمتی سے ۱۰ طلباء کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ پھر ان سب کا دوسرا ٹسٹ ڈسٹرکٹ ایجوکیشنل آفیسر ضلع کی سطح پر ٹسٹ لیتے ہیں۔ داخلہ امتحان کے تین پرچے ہوتے ہیں۔ عام معلومات، تلگو اور حساب ہر پرچے کے ۵۰ نشانات

ریٹائرڈ پرنسپل۔ سلطان العلوم کالج آف ایجوکیشن، حیدرآباد

ہوتے ہیں، کامیابی کے لیے کم از کم ۵۰ فی صد یا ½ ، نمبر لینا ضروری ہیں۔ اس طرح ۱۵۰ میں جملہ نشانات ½ ۲۲ ضروری ہیں۔ یہ ٹسٹ پانچویں جماعت میں شرکت کے لیے چوتھی جماعت کا کورس اور آٹھویں جماعت میں شرکت کے لیے چھٹی اور ساتویں جماعت کا کورس پیش نظر ہوتا ہے۔ یہ پرچے ان ہی جماعتوں کے نصابی معیار کے ہوتے ہیں۔ جو طلبا ضلع کی سطح پر امتحان میں کامیاب ہوتے ہیں میرٹ کے لحاظ سے پہلے ۲۶ امیدوار جماعت پنجم اور ۳۶ طلبا جماعت ہشتم میں شریک کر لیے جاتے ہیں۔ ان طلبا کے والدین کی سالانہ آمدنی ۱۲ ہزار تک ہونی چاہیے اگر اس احاطہ آمدنی میں طلباء نہ مل سکیں تو پھر ۱۵ ہزار اور ۱۸ ہزار تک آمدنی کی سطح تک طلباء کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

۲ طلباء کی صبح و شام

تمام طلباء و اسٹاف مدرسہ، پرنسپل کی کالج کے احاطہ ہی میں رہائش ضروری ہے۔ ٹیچرس ہی 'ہاوز ماسٹرس' ہوتے ہیں۔ ان کا پروگرام صبح کے ۵ بجے سے شروع ہوتا ہے اور رات کے ½ ۹ بجے ختم ہوتا ہے صبح ½ ، بجے سے جماعتوں میں تعلیم شروع ہوجاتی ہے اور ½ ا بجے ختم۔ پھر ½ ۲ دن سے شام پانچ بجے تک اساتذہ کی زیر نگرانی اسٹڈی کروائی جاتی ہے۔ کوچنگ ٹیوٹوریل لائبریری کلب مصروفیات شام میں کھیل کود اسکوٹنگ اور کلچرل پروگرام وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح صبح سے شام تک منٹ منٹ کا پروگرام نہایت مصروف رہتا ہے۔

۳۔ اخراجات

گورنمنٹ فی طالب علم سالانہ کوئی ۱۲ سو روپیے صرف کھانے کے اخراجات پر صرف کرتی ہے اور جو نیر اور ڈگری رہائش کالجوں میں سالانہ فی طالب علم ۱۸ سو روپے منظور ہیں۔ مرکزی حکومت کے نوّدیا ودیالہ میں فی طالب علم ۲۴۰۰ روپے صرف کیے جاتے ہیں۔

۴۔ نتائج کا شاندار ریکارڈ

سال ۱۹۸۷ میں میٹرک کے پبلک امتحان میں ریاست آندھرا پردیش کے ۴۸ رہائشی اسکولوں سے جملہ ۱۴۸۰ طلباء نے شرکت کی، ان میں سے ۱۴۲۳ طلباء نے درجہ اول میں کامیابی حاصل کی صرف ۱۴ اسکولوں کے نتائج ۱۰۰ فیصد سے کسی قدر کم رہے۔ ناگرجنا ساگر کے رہائشی انٹرمیڈیٹ کالج کے سرسری اعداد معلوم کرنے سے اندازہ ہوا کہ یہاں کامیاب ہونے والے سب طلباء کو ایم۔بی۔بی۔ایس، انجینرنگ کالجس، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی، زرعی کالج، ایم۔بی۔اے اور ایم۔ایس سی میں ہر سال داخلہ مل جاتا ہے۔ یونیورسٹی کے بعض اساتذہ سے معلوم ہوا کہ ریزیڈنشیل اسکول سے آئے ہوئے طلباء کا معیار کافی اونچا ہے اور وہ اپنے اس امتیاز کو ان اعلیٰ کورسس میں بھی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ یہ وہ اعلیٰ پیشہ وارانہ کورسس ہیں جن میں اسکولوں سے آنے والے طلباء کو بہ مشکل ایک دو کو داخلہ مل سکتا ہے۔

اردو میڈیم رہائشی اسکول، حیدرآباد۔

حکومت آندھرا پردیش نے گزشتہ سال شہر حیدرآباد سکندرآباد کے طلباء کے لیے اردو میڈیم رہائشی اسکول' کے قیام کی منظوری دی جو اس وقت شہر کے مصروف ترین بازار "لاڈ بازار" میں واقع ہے۔ شہر کی مسلم آبادی کوئی دس لاکھ کے قریب ہوگی اور اردو میڈیم سے پڑھنے والے طلباء کی تعداد بھی کافی ہوسکتی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ پہلے سال داخلہ امتحان میں شرکت کے وقت آخری تاریخ تک صرف ۲ درخواستیں وصول ہوئیں اور اس سال بھی ٹیسٹ میں شرکت کرنے والوں کی تعداد حوصلہ شکن رہی۔ وہ تو محض علم و فن کی کوششوں سے ان دو برسوں میں پانچویں اور آٹھویں جماعت میں ۳۶، ۳۶ طلباء کو شریک کروا دیا گیا۔ اس سال تو ۱۵ نشستیں خالی ہیں ان میں، طلباء ایسے ہیں جو ۱۵ فیصد یا ۵۰ میں سے ½ ، نمبرات بھی نہ لے سکے اور ۸ طلباء اسکول چھوڑ کر غائب ہوگئے۔

اہمیت و افادیت

اردو میڈیم رہائشی اسکول جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے ہندوستان بھر میں یہ پہلا اسکول ہے۔ اس کا سہرا موجودہ حکومت کے سر ہے۔ ۱۴ ردسمبر، ۱۹۸۰ کو چیف منسٹر نے نظام آباد، گنٹور اور کرنول میں ایک ایک اردو میڈیم رزیڈنشیل اسکول کے قیام کا اعلان کیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ سارے حضرات جنھوں نے اسکولوں کے قیام اور منظوری کے لیے کوشش کی ہے، وہ سب اردو داں طبقے کے شکریے کے مستحق ہیں۔

قلی قطب شاہ اربن ڈیولپمنٹ اتھارٹی نے فی طالب علم

یونیفارم کتب اور صندوق کے لیے چھ سو روپے منظور کرکے ایک مستحسن اقدام کیا ہے۔ اس اسکول کا قایم ہونا کچھ مبالغہ نہ سمجھو تو ایسا ہی کہ کسی نے میڈیکل کالج یا انجینیرنگ کالج کھول دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کالجوں میں انٹرمیڈیٹ کے بعد، ٹسٹ پاس کرنے کے بعد ہی ممکن ہے لیکن جو بچہ رہائشی اسکول کی پانچویں جماعت میں داخلہ کا مستحق ہوگیا وہ ان کالجوں میں آٹھ سال قبل ہی داخلہ پانے کا مستحق بن جاتا ہے، وہ خود آپ اپنی جگہ حاصل کرلے گا۔ کیوں کہ اس کی تعلیم کی بنیادیں ٹھوس چٹان پر ہوتی ہیں، ریگستان کی ریت پر نہیں۔ ہر مسابقتی امتحان میں وہ بھرپور اعتماد کے ساتھ شریک ہو سکے گا۔

عدم دلچسپی کی وجوہات

زیادہ تفصیل میں گئے بغیر اس اسکیم سے عدم دلچسپی کی دو وجوہات سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک تو عام اردو داں طبقہ اقامتی اسکولوں کی افادیت سے قطعاً ناواقف ہے۔ بلکہ اچھے پڑھے لکھے لوگ بھی ناواقف ہیں۔ اس سے زیادہ حیرت کا مقام ہے کہ اردو میڈیم کے ہیڈ ماسٹرس کو بھی اس اسکیم سے معلومات برائے نام بھی نہیں ہیں۔

دوسری بنیادی وجہ عام مسلمانوں کا رجحان رہا ہے کہ حکومت کی ہر نئی اسکیم کو سمجھنے اور پانے میں کئی برس ضایع کر دیتے ہیں۔ ان کی بے حسی اور لاپرواہی فطری بن چکی ہے۔ اس صورت حال کی بڑی حد تک ذمہ داری قیادت کے فقدان پر بھی عائد ہوتی ہے۔

اردو میڈیم رہائشی اسکول سے متعلق عام تاثرات

گزشتہ ۲۵، ۳۰ برسوں میں ساری ریاست بھر میں کبھی کسی اردو میڈیم اسکول کے نتائج اچھے نہیں رہے۔ شہر کے بعض اردو میڈیم کا نتیجہ کئی برسوں سے میٹرک میں صفر چلا آرہا ہے۔ یہ اسکول آج بھی اپنی روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے اردو میڈیم رہائشی اسکول سے کیا توقع رکھی جاسکتی ہے۔ حال ہی میں جناب سید حامد صاحب، سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے میرے نام ایک خط میں یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اردو میڈیم رہائشی اسکول حیدرآباد کے دوسرے سال بھی طلباء کی تعداد کم ہونے کی وجہ پہلے سال کا خراب معیار تعلیم ہو سکتا ہے۔ یہاں

عرض کرنا ضروری ہے کہ ذریعہ تعلیم ہمیشہ مادری زبان ہی ہونا چاہیے۔ چاہے وہ اردو ہو یا تلگو۔ معیار تعلیم سے قطعاً اس کا تعلق نہیں، بلکہ مادری زبان ہی اعلیٰ معیار تعلیم کی سو فیصد ضامن ہو سکتی ہے۔ دنیا کے سارے ماہرین تعلیم کا یہی خیال ہے۔ تعلیم مادری زبان کے ذریعے جتنی اچھی اور خالص ہوتی ہے وہ کسی اور زبان کے ذریعے ممکن ہی نہیں۔ کیوں کہ مادری زبان بچہ ماں کے دودھ کے ساتھ پیتا ہے (ذاکر حسین) زبان بچے کے جسم و جان، رگ و پے، خون و پوست میں جذب ہو کر اس کی شخصیت کا حصہ بن جاتی ہے۔ دوسری کسی زبان میں مہارت تو حاصل کی جاسکتی ہے لیکن وہ جسم و روح کا حصہ نہیں بن سکتی۔ آخر وقت تک تصنع، بناوٹ اور غیر فطری پن سے فرار ناممکن ہے۔

اردو میڈیم اسکولوں کے خراب نتائج اور زبوں حالی کی ذمہ داری بے چاری اردو پر ہرگز نہیں۔ اس کے بالکل ہی دوسرے وجوہات ہیں اسکول کا انتظامیہ، ٹیچرس کی کمی، ٹیچرس کی عدم دلچسپی، والدین کی لاپرواہی ان کی غربت و فلاکت، اسکولوں میں فرنیچر، پلے گراونڈ، پانی وغیرہ کا عدم انتظام، ایک ایک جماعت میں ۷۰، ۹۰ طلباء کا ہجوم، تاریک کمرے وغیرہ۔ یہ سب اسکول نہیں چھوٹے بچوں کے لیے قیدخانہ سے کم نہیں، جہاں پر روحانی جسمانی اذیت میں کمسن طلبا، مبتلا رہتے ہیں وہاں تعلیمی ماحول تو کیا خاک مل سکتا ہے، بلکہ یہ اسکول تعلیم سے نفرت پیدا کرنے کی فیکٹریاں بن چکی ہیں۔ مسلم طلباء ابتدائی جماعتوں میں اگر ۱۰۰ شریک ہوتے ہیں تو میٹرک تک صرف ۱۰ پہنچ پاتے ہیں (ہمدرد سوسائٹی کا سروے) ۹۰ فیصد "ڈراپ آوٹ" انسانی وسائل کا کتنا عظیم نقصان ہے۔ اگر حیدرآباد کے بعض انگلش میڈیم اسکولوں کا اچھا معیار ہے تو "انگریزی زبان" میں کوئی جادو نہیں ہے بلکہ وہاں کا بہترین انتظامیہ، ٹیچرس کی لگن، بچوں کے ماں باپ کی غیر معمولی دلچسپی، خانگی ٹیوشن، بچے کے نام خارج کر دینے کا خوف خود بچوں کی دلچسپی۔ یہ سب باتیں وہاں کے اچھے نتائج کے ذمہ دار ہیں۔

مسلم طلباء کے داخلے کے لیے "نام" کی اسکیم

نیشنل ایسوسی ایشن آف مسلم فاونڈیشن (NAM) حیدرآباد نے مسلم طلباء کی شرکت سے متعلق سنجیدگی سے جائزہ لیا۔ جب کہ

۷ ابرس پہلے سے آندھرا پردیش کے ۱۰۰ رزیڈنشیل اسکولس میں کوئی ۳۰ ہزار طلبا تعلیم پا رہے ہیں اور مسلم طلبا، ان میں بس برائے نام صفر کے برابر ہیں۔ چنانچہ صرف طلباء کے داخلے کو ایک مہم کے طور پر شروع کرنے کے لیے اس سال ۲۵ ہزار روپے اس غرض کے لیے منظور کیے گئے۔ اس اسکیم کے اہم خدوخال یہ ہیں۔

۱۔ جہاں تک ممکن ہو اضلاع کے دیہات اور شہری علاقوں میں قایم اسکولوں کا سروے کرکے ایسے غریب اور ذہین طلباء کے نام اور پتے اکٹھے کیے جائیں جو اس وقت چوتھی، پانچویں جماعتوں میں تعلیم پا رہے ہیں۔

۲ ان طلباء کو رہائشی اسکولوں میں داخلے کے لیے جو انٹرنس ٹیسٹ ہوتا ہے، اس میں شریک کروایا جائے اور انھیں ٹیسٹ کے نمونے پر کم از کم دو ماہ کوچنگ دی جائے۔

۳۔ کوچنگ کے لیے ضروری لٹریچر تیار کیا جائے جو کوچنگ سینٹرس کے اساتذہ اور طلباء کے لیے کارآمد ہو۔ اس قسم کے لٹریچر کی تیاری کے لیے ماہرین تعلیم سے مدد لی جائے۔

۴ رہائشی اسکولوں کی اہمیت و افادیت سے مسلم طبقہ قطعی ناواقف ہے۔ اس کے لیے تشہیری لٹریچر تیار کیا جائے اور یہ لٹریچر تعلقہ، ضلع اور قصبات کی سطح تک مختلف دینی، ملی، سماجی اور سیاسی جماعتوں کے ذریعے پہنچایا جائے۔

۵۔ ہر ضلع پر ایک ایسی تعلیمی کمیٹی قایم کی جائے جو ان اسکولوں میں داخلے کے لیے ایک واضح پلان کے تحت کام کرتی رہے۔

۶۔ جو طلباء انٹرنس ٹیسٹ میں کامیاب ہو جائیں ان کے فارموں کی خانہ پُری، ضروری سرٹیفکیٹس کی فراہمی اور جہاں ضرورت ہو تھوڑی بہت ان طلباء کی داخلہ فیس سے مدد کرکے انھیں رہائشی اسکولوں میں شریک کروا دیا جائے۔ یہ کام اس لیے ضروری ہے کہ اکثر والدین پڑھے لکھے نہ ہونے کی وجہ سے لاپروائی سے یہ قیمتی موقع کھو دیتے ہیں۔

یہ کام بظاہر چھوٹا معلوم ہوتا ہے لیکن آج کرنے کا کام یہی ہے۔ اس کے بڑے دور رس نتائج نکلیں گے۔ آپ سے استدعا ہے کہ آپ اس کام میں مدد دیں اور اس کو ایک عملی تحریک میں تبدیل کرنے کے لیے دیں۔ اس تحریک کے چلانے کے لیے بہت بڑے سرمایے کی ضرورت نہیں بلکہ ملی ہمدردی رکھنے والے سرگرم کارکن حضرات کی ضرورت ہے۔ کے غریب اور ذہین طلباء کے لیے گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی میں اقامتی اسکولوں کا قیام ایک انقلاب سے کم نہیں۔

"سب سے پہلی چیز جو اس نئے نظام میں ہونی چاہیے وہ یہ ہے کہ دینی اور دنیوی علوم کی انفرادیت مٹا کر دونوں کو ایک جان کر دیا جائے۔ علوم کو دینی اور دنیوی دو الگ الگ قسموں میں تقسیم کرنا، دراصل دین اور دنیا کی علیحدگی کے تصور پر مبنی ہے اور یہ تصور بنیادی طور پر ایک غیر اسلامی تصور ہے۔"

(سید ابوالاعلیٰ مودودی)

لوگ نشہ کیوں کرتے ہیں

محمد اسلم پرویز

نشیلی دواؤں کا استعمال بہت پرانا ہے۔ آج سے دس ہزار سال قبل انسان باقاعدہ زراعت شروع کر چکا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ بطور خوراک استعمال ہونے والے پودوں کے بعد انسان نے جن پودوں کو پہچانا ان میں بڑی تعداد ان پودوں کی تھی جو کہ نشیلی اور دیگر ادویات مہیا کرتے ہیں۔ لیکن باوجود ان دریافتوں کے ان پودوں کا بھرپور استعمال اور ان سے مکمل واقفیت انسان کو کافی عرصے بعد ہوئی۔ جس طرح زراعت کی ابتدا کے وقت انسان نے کچھ پسندیدہ پودے چن لیے تھے۔ مثلاً گیہوں، چاول، مکا، آلو وغیرہ جو کہ آج تک انسان کی ضروریات پر پورے اترتے رہے ہیں، اسی طرح نشے کے طور پر استعمال کرنے کے لیے انسان نے جو پودے چنے تھے وہ آج بھی کم و بیش اسی طرح استعمال ہو رہے ہیں۔ انسانی تاریخ کے مطالعے سے ایک اور بات واضح ہوتی ہے کہ ہر اس دور میں جب کہ عوام کی اکثریت کسی بھی وجہ سے بے اطمینانی یا بے انصافی کا شکار رہی یا جب ظلم بڑھا، مظلوم کمزور ہوا اور ظالم کی طاقت بڑھتی گئی یا جب نوجوانوں نے اپنے آپ کو بے بس و بے کس بے یار و مددگار یا بے آسرا پایا۔ جب بے راہ روی و عیش و عشرت عام ہوئے۔ جب بھی نشے کی لت نے سماج کو دیمک کی طرح کھوکھلا کیا اور اخیر میں یہ کسی کھوکھلے بے جان ستون کی طرح حالات و ذمہ داری کے بوجھ تلے بیٹھ گیا۔ مغربی ممالک کا تو خیر ذکر ہی کیا لیکن آج ہمارا ملک، ہمارا سماج، ہماری قوم اور ممکن ہے ہمارا خاندان اور ہمارا پڑوس اس خطرناک کینسر کی زد میں ہے۔ اس وقت ضرورت ہے کہ ہم ان نشوں کے بارے میں، ان کے اثرات کے بارے میں اور ان کی وجوہات کے بارے میں جانیں۔ تاکہ ہم میں سے ہر ایک اس وبا کے ہر پہلو سے بخوبی واقف ہو کر اس کا مقابلہ کر سکے۔

کوکین

جنوبی امریکا میں پائے جانے والے ایک ہرے بھرے چھوٹے سے درخت کو کوکا کہتے ہیں۔ زمانۂ قدیم سے اس کی پتیاں منھ میں چبا کر ان کا رس بطور نشہ استعمال ہوتا ہے۔ ۱۸۶۰ء میں جرمنی کے ایک سائنس داں البرٹ نیمن نے ان پتوں سے ایک کیمیائی مادہ نکالا جس کو کوکین کا نام دیا گیا۔ سگمونڈ فرائڈ ایک مشہور فلسفی تھا۔ اس کے زمانے میں لوگوں میں فلسفی اور اپنے اوپر "سوچ" طاری کرنے کا بڑا رواج اور فیشن تھا۔ اس وقت کوکین کے استعمال نے بہت زور پکڑا۔ لوگ کوکین کے پاؤڈر کو ناک سے سونگتے تھے جس کی وجہ سے یہ پاؤڈر ناک کی اندرونی جھلی پر چپک جاتا تھا۔ وہاں سے وہ ہلکے ہلکے جذب ہو کر دوران خون میں شامل ہو جاتا تھا اور نشے کی کیفیت طاری کر دیتا تھا۔ یہ دوا انسان کے جسم میں موجود خون کی نالیوں کو سکیڑ کر پتلا کر دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے خون کا دباؤ اور دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے۔ اس کے مستقل استعمال سے ناک کی جھلی زخمی ہو جاتی ہے۔ سر میں درد اور نزلہ زیادہ رہتا ہے۔ اس دوا کے استعمال کے بعد آدمی اپنے آپ کو چاق و چوبند اور ہلکا محسوس کرتا ہے تھکان کم ہوتی ہے اور بھوک بھی کم لگتی ہے۔ بے چینی، تجسس اور اشتعال بڑھ جاتا ہے۔ آدمی چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھنجھلاہٹ کا اظہار کرتا ہے۔ زیادہ استعمال کی وجہ سے کھال پر چکتے اور کھجلی رہنے لگتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کھال کے نیچے کوئی کیڑا رینگ رہا ہے۔ یہ بے چینی اتنی بڑھ

ذاکر حسین کالج، اجمیری گیٹ۔ دہلی۔

جاتی ہے کہ مریض اپنی کھال نوچ کر پھینک دیتا ہے اور حد یہ کہ اپنا گوشت بھی کاٹ کر پھینک سکتا ہے۔

بطور دوا کوکین کو کئی طرح سے استعمال کیا جاتا ہے۔ کسی جگہ کو سن کرنے کے لیے کوکین کا استعمال ۱۸۸۴ء سے ہو رہا ہے۔ اس دوا سے ایک اور دوا تیار کی گئی ہے جس کو نوودکین کہتے ہیں۔ دنداں ساز، دانت نکالنے سے پہلے مسوڑھے میں اسی دوا کا انجکشن لگاتے ہیں جس کی وجہ سے یہ کام آسانی سے ہو جاتا ہے۔ چوں کہ یہ دوا تھکان کے احساس کو مٹاتی ہے اور بھوک بھی کم لگتی ہے اس لیے مزدوروں میں اور غربا میں اس کا استعمال کافی عام رہا ہے۔ لیکن اس کا اثر زائل ہوتے ہی ایک دم شدید تھکان اور بھوک کا حملہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا شکار فوراً اس کی دوسری خوراک لیتا ہے تاکہ اس اذیت سے اپنے کو بچا سکے۔ اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے حتیٰ کہ خوراک نہ ملنے کی وجہ سے جسم لاغر ہو کر موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔

افیم

پوپی نام کے پودے سے افیم حاصل کی جاتی ہے۔ اس پودے کے کچے پھول کو چیرا لگا کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ عموماً شام کے وقت یہ چیرا لگایا جاتا ہے۔ تمام رات اس پھول میں سے سفید سفید عرق نکل کر پھول کے چاروں طرف چپک جاتا ہے۔ جس کو صبح کو کھرچ کر صاف کر لیا جاتا ہے اس مادے میں زیادہ مقدار مارفین کی ہوتی ہے۔ مارفین درد بھگانے کی ایک بڑی کارآمد دوا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کھانسی اور دائمی ہیضے کے لیے بھی بہت مفید ہے۔ ۱۸۹۸ء میں مارفین سے ایک اور دوا تیار کی گئی جس کو ''ہیروئن'' کہا گیا۔ یہ کھانسی کے لیے اکسیر تھی لیکن چوں کہ یہ مارفین سے دس گنا زیادہ تیز ہوتی ہے اس لیے اس کا استعمال ترک کر دیا گیا۔ اگرچہ بطور دوا یہ اب بھی استعمال ہوتی ہیں، لیکن نشے کے لیے ان کا استعمال کہیں زیادہ ہے۔ خاص طور سے مارفین اور ہیروئن نے لاکھوں لوگوں کو اپنا غلام بنائے ہوئے ہیں۔ یہ ایسے کیمیائی مادے ہیں کہ جو انسان کے جسمانی نظام میں شامل ہو کر خون میں رچ بس جاتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ان کی طلب میں اتنی شدت ہوتی ہے کہ مریض کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں ہوتا کہ وہ اس دوا کو استعمال کرے، چاہے اسے حاصل کرنے کے لیے اسے کوئی جرم یا کوئی قتل ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ یہ کیفیت اتنی شدید ہوتی ہے کہ یقیناً کسی تنہا انسان کو اس پر قابو پانا مشکل ہے

علاج

• جس طرح کوکین ناک کے ذریعے جذب کر دی جاتی ہے، اسی طرح افیم کو بھی سگریٹ میں استعمال کر کے اس کا دھواں ناک اور منھ کے ذریعے جذب کرایا جاتا ہے اسی لیے ان دونوں دواؤں کا علاج کافی حد تک یکساں ہے۔ ایک دفعہ نشہ کرنے کے بعد اس کا اثر چھ سے آٹھ گھنٹے تک رہتا ہے لیکن یہ نشہ کی مقدار اور نشہ باز کی ذہنی اور جسمانی صحت پر بھی منحصر ہوتا ہے۔ نشہ ختم ہونے پر مریض کی ناک سے پانی بہنے لگتا ہے، آنکھوں سے پانی آتا ہے، پسینہ بہت آتا ہے، بے چینی ہوتی ہے، پیٹ میں شدید درد ہوتا ہے اور دست آنے لگتے ہیں۔ آنکھوں کی پتلیاں پھیل جاتی ہیں اور تمام جسم میں اینٹھن اور درد ہوتا ہے۔ ایسے میں عموماً اگر مریض کی دیکھ بھال نہ ہو تو وہ دل کی حرکت بند ہونے کی وجہ سے ہلاک ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر ایسے مریض کو پیٹ اور جسم کے درد کو دور کرنے والی دوائیں دیتے ہیں اس کے علاوہ ان کو نیند لانے والی دوائیں بھی دی جاتی ہیں اور بھرپور خوراک دی جاتی ہے تاکہ جسم کی کمزوری دور ہو۔ یہ علاج سات سے تیس دن تک چلتا ہے۔ جب مریض طلب سے نجات پا جاتا ہے تو اس کو مشغول رکھنے کے لیے کسی کام میں مصروف کر دیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ اپنے دیگر پرانے ساتھیوں سے دور رہے۔ ایسے میں مریض کے گھر والوں کی بہت ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ مریض کو اپنے ساتھ رکھیں اور جسمانی، ذہنی یا نفسیاتی جھٹکوں سے اس کو بچائیں۔ عموماً دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ ایک دفعہ طلب چھٹنے کے بعد مریض اپنے خاندان میں واپس آتا ہے تو وہاں اس کو وہ جگہ نہیں ملتی جس کی اس کا حساس ذہن خواہش رکھتا ہے۔ ایسے میں بد دل ہو کر وہ پھر اپنی اس دنیا میں لوٹ جاتا ہے جو کہ اس کو دن بدن موت سے نزدیک کرتی رہتی ہے۔

سَن کا نشہ:

یہاں لفظ سن کو میں نے اس معنیٰ میں استعمال نہیں کیا ہے جو کہ یکلخت ذہن میں آتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ سن کا اپنا ایک نشہ ہوتا ہے۔ لیکن یہاں میری مراد اس پودے سے ہے جس کو سن کہا جاتا ہے۔

اب تو ڈبل بیڈ اور فولڈنگ بیڈ کا زمانہ ہے لیکن ابھی بھی آپ کے گھر کے کسی کونے میں بان کا بنا ہوا پلنگ پڑا ہو تو اس کی پائنتی کی رسی کو اگر آپ دیکھیں تو وہ سن کی ہی بنی ہوگی۔ سن کے پودے سے ریشے نکالنے کا کام بہت پرانا ہے۔ ان ریشوں سے رسیاں، ٹاٹ اور دیگر موٹے قسم کی مصنوعات بنائی جاتی ہیں۔ یہ ریشے پودے کے تنے سے نکالے جاتے ہیں لیکن ہزاروں سال پہلے سے ہندوستان اور نیپال میں اس پودے کی پتیوں سے مختلف قسم کے نشے تیار کیے جاتے ہیں۔ بنیادی طور پر تین قسموں کے نشے اس پودے سے تیار کیے جاتے ہیں۔ نر اور مادہ پودوں کی پتیوں اور شاخوں کو پیس کر معجون بنائی جاتی ہے جو کہ سب سے کمتر قسم سمجھی جاتی ہے۔ مادہ پودوں میں پھول کے کھلنے سے پہلے ان کو بمع اوپری پتیوں کے توڑ لیا جاتا ہے، اس کو دھوپ میں سکھا کر پیس لیا جاتا ہے، یہ بھنگ یا بھانگ کہلاتی ہے۔ اس کو یا تو دودھ کے ساتھ ملا کر پیا جاتا ہے یا پھر چلم بنا کر دھویں کی شکل میں پی جاتی ہے مادہ پودوں کی صرف اوپری پتیوں سے گانجا بنایا جاتا ہے جس کو چلم میں بھی پیا جاتا ہے اور شراب اور دودھ میں ملا کر بھی پیتے ہیں۔ مادہ پودوں میں جب پھول آتے ہیں تو ان سے ایک چپچپا مادہ نکلتا ہے جس کو چرس یا حشیش کہتے ہیں۔ اس کو عموماً تمباکو کے ساتھ ملا کر سگریٹ میں یا چلم میں پیا جاتا ہے۔ ان تمام اقسام کے نشوں سے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں الفاظ کی ادائیگی مبہم ہو جاتی ہے۔ یعنی انسان الفاظ صاف طور سے ادا نہیں کر پاتا۔ آنکھوں میں سرخی اور دھندلاہٹ رہتی ہے۔ سستی اور غنودگی طاری رہتی ہے، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے اور دیگر احساسات بھی مردہ ہو جاتے ہیں۔ مختلف لوگوں میں مختلف حالات کے تحت ان نشوں کے الگ الگ اثرات ملتے ہیں۔ کچھ لوگ خوش گوار احساسات کا شکار ہوتے ہیں تو کچھ کو ناخوش گوار تجربات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان نشوں سے متاثر مریضوں کا علاج بھی کوکین یا افیم کے شکار لوگوں جیسا ہی ہوتا ہے۔

مصنوعی ادویات

بیسویں صدی کے شروع سے علم کیمیا میں کی گئی دریافتوں کے سبب بہت سی نئی نئی دوائیں ایجاد ہوئیں۔ جسم کے درد اور تھکان کو دور کرنے والی دواؤں کے غلط استعمال کو ڈھونڈنے میں لوگوں کو دیر نہ لگی اور اس طرح نشہ آور چیزوں کی فہرست کچھ اور طویل ہو گئی۔ مصنوعی دو
میں سب سے زیادہ عام اور خطرناک دوا ایل۔ ایس۔ ڈی (L.S.D.
ہے جو کہ ایک لمبے کیمیائی نام کا مخفف ہے۔ سوئزرلینڈ کے دو سائنس
اسٹول اور ہوف مین نے ۱۹۳۸ء میں یہ کیمیائی مرکب تیار کیا تھا۔ اس
ایک قسم کی پھپھوندی سے تیار کیا گیا تھا۔ اس کی دریافت کے بعد پا
سال تک اس کی تباہ کاریوں سے لوگ ناواقف رہے۔ ۱۹۴۲ء میں
اس کے موجد ہوف مین کو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ اپنی تجربہ گاہ میں کام
کرتے وقت اس کے ہاتھوں پر ایل۔ ایس۔ ڈی کی کچھ مقدار لگ گئی جو
اتفاقاً اس کے منھ میں پہنچ گئی۔ اس کے بعد ہوف مین پر بے حد مدہوش
اور بے چینی طاری ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے طرح طرح کے رنگ
لہرانے لگے۔ اسے ایسا لگا کہ گویا کہ وہ ہوا میں اڑ رہا ہو، کبھی غوطہ لگا
ہو تو کبھی تیر رہا ہو۔ کچھ دیر بعد یہ کیفیت ختم ہو گئی لیکن اسے یہ شک ہو گ
کہ یہ سب کچھ ایل۔ ایس۔ ڈی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اپنے اس خیال
پر کھنے کی غرض سے اس نے ایل۔ ایس۔ ڈی کی بہت خفیف مقدا
یعنی صرف ۲۵ ملی گرام اپنے منھ میں رکھ لی۔ اس پر پھر وہی کیفیت طار
ہو گئی جو کافی دیر تک قائم رہی۔ اس کی دیر تک رکنے کی وجہ بعد
یہ معلوم ہوئی کہ ہوف مین نے جس مقدار کو بہت کم سمجھا تھا وہ بھی بہ
تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ نشہ کرنے کے لیے اس دوا کے صرف ۱۰۰ مائیکرو
(ایک گرام کا ایک لاکھواں حصہ) ہی کافی ہوتے ہیں۔ یہ مقدار کسی قدر
ہے، اس کا اندازہ آپ اس طرح لگا سکتے ہیں کہ ایک کلو ایل۔ ایس۔ ڈ
سے لندن اور نیویارک کی پوری آبادی نشہ کر سکتی ہے۔ ۱۹۵۹ء میں
درد بھگانے اور اعصاب کو بے حس کرنے والی ایک اور دوا ای
ہوئی جس کا نام پی۔ سی۔ پی (P.C.P.) تھا۔ اس کے استعمال سے م
کے تمام احساسات ختم ہو جاتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ اگر اس کا آپریشن بھ
کر دیا جائے تو اسے پتہ ہی نہیں چلتا۔ ۱۹۶۰ء کے درمیان اس کا ا
بہت تیزی سے شروع ہوا۔ اس کو عرف عام میں "سکون کی گولی" کہا ج
تھا۔ لیکن اس کی ذرا سی بھی زیادہ مقدار جان لیوا تھی۔ اس لیے اس
چلن بھی اتنی ہی تیزی سے ختم ہو گیا جتنی تیزی سے شروع ہوا تھا۔ ایک
عرصے سے سائنس داں کسی ایسی دوا کی تلاش میں تھے جس سے کہ بے خو

کے مریضوں کو نیند کی وادیوں میں لے جانا ممکن ہو اور ذہنی طور سے پراگندہ لوگوں کو سکون ملے۔ آخر کار اس صدی کے شروع میں باربی ٹیورک ایسڈ کے مرکبات دریافت ہوئے جن سے کہ نیند لانے والی گولیاں بنیں جن کو آج کل مریضوں کو دیا جاتا ہے۔ ان سے اعصاب کو سکون ملتا ہے، ذہنی پریشانیاں کم ہوتی ہیں اور زیادہ مقدار میں لینے سے نیند بھی آتی ہے۔ چند ہی سال کے اندر اندر غلط استعمال شروع ہو گیا۔ ان دواؤں کے شکار ہلکے ہلکے موت کی آغوش میں پہنچتے ہیں۔ پہلے وہ ایک گولی سے شروع کرتے ہیں، کچھ عرصے بعد ان کا جسمانی نظام ایک گولی میں موجود دوا سے اثر لینا بند کر دیتا ہے ان کی لت اسی لذت کو تلاش کرتی ہے لہٰذا وہ ایک سے دو گولیوں پر آجاتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ سلسلہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ایک دن وہ آتا ہے کہ وہ ان گولیوں کی اتنی تعداد لے لیتے ہیں جو ہلاکت خیز ہوتی ہے۔ نتیجتاً ان کی موت ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگ عموماً دوا کھا کر سوتے ہیں۔ درمیان میں ایک تے کرتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں یا پھر سوتے ہی میں خاموشی سے کوچ کر جاتے ہیں۔

نشہ۔ آخر کیوں؟

نشے کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو دیکھتے ہوئے پہلا سوال یہ ذہن میں آتا ہے کہ آخر لوگ نشہ کیوں کرتے ہیں؟ نشہ درحقیقت ایک قسم کا فرار ہے جس کا شکار عموماً کمزور افراد ہوتے ہیں۔ اعصابی طور پر کچھ لوگ مضبوط ہوتے ہیں جو کہ مخالف اور سخت حالات کا مقابلہ کرنے کی سکت رکھتے ہیں۔ جب کہ اعصابی طور پر کمزور لوگ ناموافق حالات یا سخت مقابلے میں گھبرا جاتے ہیں۔ ان حالات سے پناہ لینے کے لیے یا جان چھڑانے کے لیے یہ لوگ اپنے آپ کو فراموش کرنے اور اپنے حالات سے غافل اور مدہوش ہونے کی کوشش کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں وہ کسی نہ کسی قسم کے نشے تک پہنچتے ہیں۔ اسی پس منظر میں ایک اور بات واضح ہوتی ہے وہ یہ کہ جو افراد نشے کی طرف راغب ہوتے ہیں وہ اعصابی طور پر کمزور تو ہوتے ہی ہیں، ساتھ ہی وہ اپنے سماج یا خاندان سے بھی کٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ ان میں ہونے والی اس زبردست تبدیلی کو ان کے گھر کے افراد یا آس پاس کے لوگ محسوس نہ کریں۔

آج کل لوگوں میں نشے کی وبا ایک مرتبہ پھر جڑ پکڑ رہی ہے۔ خاص طور سے اس کا شکار نوجوان زیادہ ہو رہے ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ تمام لوگ احساس محرومی یا مایوسی کا شکار ہیں۔ ان کی زندگی میں کسی نہ کسی طرح کی اتنی زبردست کمی ہوتی ہے کہ وہ اس نقصان یا کمی کو ناقابل تلافی سمجھتے ہیں اور اپنے ذہن سے اس کمی کے احساس کو مٹانے کے لیے نشہ شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح دھیرے دھیرے اپنی موت کی طرف بڑھتے ہیں۔ بخلاف ان دوسرے مسائل کے جو کہ ہمارے سماج کے سامنے ہیں۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا تعلق سماج کے ہر طبقے سے ہے۔ امیر ہوں کہ غریب، جاہل ہوں کہ تعلیم یافتہ شہری ہوں کہ دیہاتی، اس مذہب کے ہوں یا اس مذہب کے۔ ہر رنگ کے لوگوں میں یہ لت پائی جاتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے سماج کا ہر طبقہ کسی نہ کسی کمی کا شکار ہے۔ یہاں ایک اور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہر دور میں سماج کے ہر طبقے نے کسی نہ کسی کمی میں زندگی گزاری ہے پھر آج ہی یہ لت کیوں پائی جاتی ہے؟ اس کا جواب جو کہ ایک حقیقت ہے بہت تلخ ہے اور ہم سب سے، اور ہمارے سماج کے ہر ایک فرد سے رابطہ ہے۔ ۹۰ فیصد لوگوں میں نشے کی لت کم عمری یا نوجوانی میں پڑتی ہے یہ وہ وقت ہوتا ہے جس میں لڑکا ہو یا لڑکی اپنی عمر کے سب سے نازک اور ناپائیدار دور میں ہوتا ہے۔ آج کل کا زمانہ جس زبردست مقابلے کا ہے اس میں ہر نوجوان پر کئی طرح کے دباؤ ہوتے ہیں۔ اس کے آگے مستقبل ایک بڑے سوالیہ نشان کی طرح گم سم کھڑا ہوتا ہے۔ سماج کو اس سے کچھ توقعات ہوتی ہیں۔ اس کے ماں باپ گھر والے بھی اس کی طرف پُر امید نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اس کے اساتذہ اور ساتھی بھی اس سے کچھ توقعات رکھتے ہیں۔ دوسری طرف اسے چاروں طرف پھیلی ہوئی بیروزگاری غربت، کنبہ پروری، فرقہ واریت، عصبیت اور بے ایمانی نظر آتی ہے آج کل کے ماحول میں مادیت کی فضا کو دیکھ کر اس کی نظروں میں تعلیم کی وقعت کم سے کم تر ہوتی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کالج میں آنے والے طلباء کی بڑی تعداد محض وقت گزاری کرنے یا اپنے ماں باپ کے دباؤ میں یا تفریحاً آتی ہے۔ یا پھر اس لیے آتی ہے کہ اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہے ایک مبہم سی امید ہوتی ہے کہ شاید اس تعلیم کے بعد روزگار کی کچھ راہیں کھلیں۔ جب ایک ناتجربہ کار اور ناپائیدار ذہن پر اتنے انواع واقسام کے دباؤ پڑتے ہیں تو اس کو بہت شدت سے کسی ہمدردی اور ہمرازی

ضرورت ہوتی ہے۔ کسی راہبر کی، مشورے دینے والے کی سمجھانے والی کی ضرورت ہوتی ہے۔ عرصۂ دراز سے یہ کام ماں باپ اور گھر کے بڑے بہن بھائی انجام دیتے آئے ہیں لیکن اب صورت حال مختلف ہے۔ زیادہ تر گھروں میں ماں باپ دونوں ہی نوکر پیشہ ہیں۔ دونوں تھکے ہارے شام کو گھر لوٹتے ہیں تو گھر کے کام اور مسائل ان کا استقبال کرتے ہیں۔ گھریلو ضروریات کو انجام دے کر ان کی کوشش ہوتی ہے کہ جو وقت بچاہے اس میں کچھ ذہنی سکون اور آسودگی حاصل کریں جس کے لیے وہ ٹیلی ویژن کا سہارا لیتے ہیں۔ آج کے معاشی افراتفری اور حرص و رشک کے دور میں ہر شخص کی، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ بہتر سے بہتر زندگی گزار سکیں اور سماج میں بہتر مقام بنا سکیں۔ ان کی یہ مشغولیات اُن کو اپنے بچوں سے دور کر دیتی ہیں۔ یہی دوری فاصلوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ پھر بیچ میں دیواریں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ بچّے اپنے انداز سے جینے لگتے ہیں اور یہیں سے شروعات ہوتی ہے زوال کی۔ بچّہ کبھی جنسی بے راہ روی کا شکار ہوتا ہے تو کبھی نشیلی دواؤں کا۔ کبھی وہ کلب جاتا ہے تو کبھی بلیو فلمیں دیکھتا ہے کبھی جوئے کی لت میں پڑتا ہے تو کبھی چور اچکوں کی شاگردی کرتا ہے۔ ہمارے سماج میں آج جو بنیادی خرابی آرہی ہے وہ یہ ہے کہ بڑے چھوٹوں سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کی وجوہات ہر طبقے میں الگ الگ ہیں۔ امیر و کبیر ماں باپ کو بزنس، پارٹیوں اور اپنے دوروں سے فرصت نہیں ملتی۔ کہ وہ بچوں پر دھیان دے سکیں لیکن ان کے نزدیک بچوں کو گاڑی، عمدہ کپڑے اور بھری ہوئی جیب مہیا کرنا بھی فرائض میں داخل ہے۔ وہ اسی سے مطمئن ہیں کہ بچوں کو سب کچھ دے دیا۔ درمیانی طبقے کے ماں باپ نوکری کی چکّی میں پس کر اپنے ڈرائنگ روم کی سجاوٹ بڑھانے میں لگے ہیں۔ تاکہ پڑوسیوں پر اور آنے جانے والوں پر رعب ڈال سکیں کہ "ہم بھی کچھ ہیں"۔ اسی کوشش وہ نہ صرف اپنا آپا، اپنی ہستی بلکہ اپنی اگلی نسل بھی فراموش کر دیتے ہیں۔ رہا نچلا طبقہ تو اسے عموماً یہ شعور ہی نہیں ہوتا کہ آج کل کے دور میں بچّوں کو کیا تربیت دی جائے اور کیوں کر دی جائے ان کے نزدیک تو لڑکا یا لڑکی کالج یا اسکول گیا ہے۔ جب آگیا تو ٹھیک ہے، جو کر لیا سو اچھا ہے۔ درمیانی اور نچلے طبقے کے بچّوں کا جب اونچے طبقے کے بچوں سے واسطہ پڑتا ہے تو وہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں یہ خود کو دقیانوسی اور روایتی محسوس کرتے ہیں، اکثر اپنے اوپر "دقیانوسیت" کا ٹھپہ ہٹانے کے لیے ان دونوں طبقوں کے بچے کچھ زیادہ ہی "ماڈرن" ہو جاتے ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ آج کل "ماڈرن" ہونے کا مطلب بے راہ روی ہے، ہر قسم کی آزادی اور ہر چیز کا بے جھجک استعمال۔ اوپری طبقے تک پہنچنے کی کوشش میں ان کے پاؤں اپنے طبقات کی زمین سے اکھڑ جاتے ہیں۔ ایک خاص وقت کے بعد اوپری طبقہ بھی ان کو قبول نہیں کرتا اور فضا میں معلق یہ بچے سمجھ نہیں پاتے کہ اب کیا کریں۔ اس پس منظر میں اگر میں یہ کہوں کہ آج کل کے نوجوانوں کی گمراہیت کے لیے بڑی حد تک ان کے ماں باپ ذمہ دار ہیں تو شاید غلط نہ ہوگا ہم اور ہمارا سماج کل کے ان ماں باپ سے بھی واقف ہیں جو لڑکے کے بہکتے قدم اور لڑکی کی بدلی ہوئی چال کو ایک نظر میں بھانپ لیتے تھے۔ کیوں کہ شاید انہیں گہرائی سے بچوں کو دیکھنے کا وقت ملتا تھا۔ آج تین قسم کے والدین پائے جاتے ہیں۔ ایک قسم تو وہ ہے کہ جس کے نزدیک ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے وہ ان فرسودہ باتوں پر یقین ہی نہیں رکھتے۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ بچوں کو اچھے بُرے کی خود پہچان کر لینے دو۔ تجربہ کرنے دو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ماں باپ خود بھی واقف ہیں کہ اس کے نتائج کیا ہوتے ہیں، لیکن وہ اپنی کمی کو ان الفاظ کے جامے میں لپیٹ کر عقلی گرُ پیش کرکے اپنے آپ کو جھوٹی تسلی دیتے ہیں۔ دوسری قسم ان والدین کی ہے جن کو کسی نہ کسی وجہ سے فرصت ہی نہیں ہے کہ بچوں کو وقت دے سکیں۔ تیسری قسم اور کمیاب قسم وہ ہے جو اب بھی بچوں کو وقت دینا چاہتی ہے۔ بچے کے مسائل پر توجہ دیتی ہے۔ اس کی بدلتی عمر کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے ان کے مطابق بچّے سے برتاؤ کرتی ہے اور بچّے کو گھٹن یا ذہنی پریشانی سے بچاتی ہے۔ خود میرے تعلق میں ایسے بہت سے شاگرد آئے ہیں جن کو یہ شکایت رہتی ہے کہ ان کے والدین کے پاس ان کے لیے وقت ہی نہیں ہے۔ وہ گھر جلدی جاتے ہیں تو کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ جلدی کیسے آئے۔ دیر سے جاتے ہیں تو بھی باز پرس نہیں ہوتی۔ یہی وہ خطرناک طبقہ ہے جو دواؤں کا شکار ہوتا ہے۔ نشیلی دواؤں کے شکار لوگوں کا علاج ڈاکٹر سے زیادہ سماج کے پاس ہے۔ خاندان کے پاس ہے، گھر میں موجود ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر افراد اور رشتوں کے بیچ صحت مند تعلق ہو تو یہ لت ہی نہ لگے۔ ہم آپ سب کو محاسبہ کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم کتنا وقت اپنے بچوں کے مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے میں لگاتے ہیں۔ اگر وہ ہماری بے رخی اور بے توجہی کا شکار ہو کر ادھر ادھر بھٹکتے ہیں تو مجرم وہ نہیں ہم ہیں، سزا کے مستحق بھی ہم ہی ہیں۔

نئے علمی سفر کے تاثرات

میرزا سعید الظفر چغتائی*

آسمانوں کی گردش کی طرح، اپنی زندگی کی گردش میں بھی سات کا عدد بار بار ابھرتا ہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں سات سال رہا۔ پیرس اور لندن کا قیام سات سال کے قریب کھنچ گیا اور اب کی ترا ست سات سال بعد ہی جانا ہوا۔ بڑا فرق نظر آیا۔ نظریاتی طبعیات کا بین الاقوامی مرکز سائنس فیکلٹی میں تبدیل ہو رہا ہے میرا مارے کی اصل عمارت زیادہ تر ان لوگوں کے لیے مخصوص ہو گئی ہے جو ریاضی اور نظریاتی طبعیات میں تحقیق کے لیے کچھ مہینوں کی مدت یہاں آ گزارتے ہیں۔ بڑے ہال اور دوسر بکمروں میں مذاکرے، مباحثے اور کالج منعقد ہوتے ہیں، مگر ان کے لیے اور بکس بھی نکال لی گئی ہیں اور توسیع کا سلسلہ جاری ہے۔ سمندر کنارے نشیب میں ادریاٹکو ہوٹل لے لیا گیا ہے جس میں کانفرنس ہال بھی ہے۔ ایک چھوٹی سی لائبریری بھی۔ کلرکوں کے کمرے بھی جن کا رویہ وہ ہے جو ہمارے یہاں ڈپٹی کلکٹروں کا ہوتا ہے۔ مطعم اور چائے خانہ بھی۔ اوپر کی تیسری سے چھٹی منزل تک رہائشی کمرے ہیں اس لیے یہاں اب یہ ممکن ہے کہ بعض خوش قسمت یا بدقسمت شرکاء عمارت سے دن دن بھر باہر نکلیں ہی نہیں، سوائے سنیچر کی سہ پہر سے اتوار تک کے۔ جب مطعم بند رہتا ہے اور بقول کسے

بھوک بھیڑیے کو کچھار سے باہر نکالتی ہے۔

گلی لیو عمارت بن گئی ہے۔ اس میں رہنے کا بھی انتظام ہے اور دفتروں کا بھی۔ پس ماندہ ملکوں کی اکادمی کے عہدے دار یہیں بیٹھتے ہیں

اکادمی چند برس ہوئے قایم ہوئی ہے اور اس کا کام لشتم پشتم آگے بڑھ رہا ہے۔ جس میں ترتیب، تنظیم اور پوری باقاعدگی شاید مدتوں بعد آسکے۔ اکادمی کے فیلو اور ارکان دنیا بھر سے منتخب ہو رہے ہیں اور ایسی سرگرمیاں اختیار کی جا رہی ہیں جو مفید بھی ہوں اور منفرد بھی لیکن حیرت انگیز بات یہ نظر آئی کہ پسماندہ دنیا کے سائنس دانوں کی ڈائرکٹری مرتب کرنا شروع کر دی اور صرف ان لوگوں کی بنیاد پر جو مرکز کی سرگرمیوں میں شریک ہونے پچھلے چند برسوں سے یہاں آئے اور اپنا نام دے گئے۔ سوچنا چاہیے تھا کہ سائنس میں اتنے مضامین ہیں۔ دنیا میں جو ملک پسماندہ تیسرے درجے کے ہیں، ان کی تعداد سو سے اوپر ہے۔ اگر مضحکہ خیزی نہیں مراد ہے تو یہ کام بہت باقاعدگی اور غور و فکر سے کیا جانا چاہیے۔ دنیا کو لاطینی امریکہ، افریقہ، مشرق وسطیٰ، مشرق بعید، ہندوستان، چین جیسے منطقوں میں بانٹ دینا چاہیے اور ہر مضمون پر ہونے والے بین الاقوامی مطبوعات کا جائزہ لے کر دس دس سال کی مدت پر مبنی ڈائرکٹری بنانی چاہیے۔ یہ معروضات اس لیے پیش کرتا ہوں کہ راقم الحروف کو ایک کام چھوٹے پیمانے پر کرنے کا تجربہ ہوا ہے۔

اکادمی کئی دوسرے اچھے کام کر رہی ہے۔ جیسے کہ مختلف ترقی پذیر ملکوں کے سائنس دانوں کا تبادلہ اور تعاونی سائنسی تحقیق اور مذاکروں کے انعقاد میں مدد۔ ترقی پذیر ملکوں کے شعبوں

---

* ڈپارٹمنٹ آف فزکس - اے۔ایم۔یو۔ علی گڑھ۔

اور اداروں کو ضرورت کی کتابوں اور آلات کا مفت مہیّا کرنا وغیرہ ان معاملات میں ہمیں ان سے رابطہ قایم کرنا چاہیے۔

مرکز کے مذاکرے کئی برس سے ریاضی یا نظری یا طبیعات تک محدود اب دائرۂ عمل میں تمام طبیعاتی سائنس آ گئے ہیں۔ ارضیات، جغرافیہ موسمیات، توانائی ‏ ‏ ‏ ‏ حیوانیات، معالجات (Medicine) وغیرہ مائکرو پراسسر - MICRO PROCESS URS کا مستقل ادارہ کھل رہا ہے اور بحریات-OCEANO GRAPHY کا ادارہ عنقریب قایم ہوگا- امکانات کیمیا اور بایوفزکس کے بھی ہیں۔ اس وقت مرکز کے اربوں ڈالر سالانہ کے بجٹ کا اسی فیصد بوجھ اطالوی حکومت اُٹھا رہی ہے اور اسی باعث یہ ترقیاں اور امنگیں نظر آ رہی ہیں۔

مرکز کے اخراجات کا بیس فیصد ملازمین اور منتظمین کی تنخواہوں پر خرچ ہو رہا ہے جو بہت ہے۔ یہ تنخواہیں بین الاقوامی ادارہ یونیسکو UNESCO وغیرہ کے معیار پر دی جاتی ہیں اور ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں۔ انھیں اطالوی معیار پہ دیا جانا چاہیے اور اطالیہ کے ملکی قوانین کے مطابق۔

میں جن موضوعات پر منعقد مذاکروں میں پانچ ہفتے شریک رہا وہ نیم موصل لیزر Semi-conductor Lasers یکجا نظریات (Integrated Optics) اور منظری دھاگے (Optical Fibers) تھے۔ یہ تینوں ایک دوسرے سے متعلق ہیں اور مستقبل قریب کے مواصلات (Communications) ان کے ہاتھ میں ہیں۔ نوری دھاگوں پر پہلا مذاکرہ تریاست میں دو سال پہلے منعقد ہوا اور مجھے اس میں مدعو کیا گیا مگر عملی دقتیں عین وقت پر حائل ہو گئیں تھیں۔ اس بار میں گیا جب دوسرا مذاکرہ ۵ فروری - مارچ ۱۹۸۰ء میں منعقد ہوا۔

منظری دھاگے، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، شیشے کے کھینچے ہوئے کئی کئی کلو میٹر لمبے مہین تار ہیں، جو روشنی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ اس طرح لے جاتے ہیں جیسے تانبے، المونیم کے تار بجلی کی رَو کو — معیار کے مطابق منظری دھاگے بنانا، انھیں ترقی دیتے رہنا اور روشنی کی لہروں کو ضرورت کے مطابق ان سے گزارنا ایک مستقل فن بن کر سامنے آیا ہے جس میں دنیا کی جدید ترین صنعت و حرفت اور سائنس آج کی جدید ترین علمی اور عملی سطح پر منہمک ہیں۔ جاپان، امریکا، انگلینڈ، جرمنی، سوئزرلینڈ اور برازیل آگے آگے ہیں۔ لیکن اٹلی نے ان کا پیچھا پکڑ لیا ہے اور ہندوستان و الجریا وغیرہ میں کام خاصا آگے بڑھ چکا ہے۔ اس فنی موضوع پر تو بعد میں لکھوں گا، ابھی ضمنی تاثرات بیان کر رہا ہوں۔

مرکز کے سبھی مذاکروں میں دنیا بھر سے لوگ شریک ہوتے ہیں لیکن ۱۹۷۳ء سے آج تک میں نے وہاں اتنی اچھی نمائندگی نہیں دیکھی تھی جتنی اس بار۔ لاطینی امریکا اور افریقہ کے بہت سے نئے ملکوں سے لوگ آئے۔ کیوں کہ اب وہاں علمی چرچے اور عملی کام چل نکلے ہیں سعودی عرب اور دوسرے مغربی ایشیا کے ملکوں سے کوئی نہ کوئی آیا تھا اور یہ سب لوگ پورے وقت کام میں لگے رہے۔ اگر کسی کو کسی لکچر میں دلچسپی نہ تھی، جو عام بات ہے، تو وہ لائبریری میں اپنے کام کے حوالے جمع کرتا اور اپنے مطلب کے صفحات نقل کرتا رہا۔ مرکز نے کئی کئی عکس گیر مشینوں کا انتظام کیا ہے وہ سب گھری رہتی تھیں اور محسوس ہوتا تھا کہ فی کس ایک مشین کی ضرورت ہے۔

ایک غیر معمولی بات عوامی جمہوریہ چین کی شرکت ہے جو ادھر چند برسوں سے شروع ہوئی ہے۔ ہمارے پروگرام میں آٹھ دس چینی اراکین شریک تھے۔ ساتھ ہی ساتھ نیوکلیائی فزکس اور ریاضی وغیرہ کے ایک ایک پروگرام بھی دوسری عمارتوں میں چل رہے تھے۔ ان سب میں چینی بھاری تعداد میں شریک تھے۔ ان سب سے ملاقات رہی اور کھل کر بات چیت ہوتی رہی۔ انگریزی بولنے اور سمجھنے میں اُنھیں ابھی دقّت ہوتی ہے، مگر اپنی بنیادی لیاقت، لگن اور کارکردگی سے وہ اس کی تلافی کر لیتے ہیں معلوم ہوا کہ کلچرل انقلاب کے زمانے میں وہ لوگ بنیادی تعمیری کاموں میں لگے رہے۔ یونیورسٹیوں سے ڈگریاں اُڑا دی گئی تھیں اور انھیں منصوبے دے دیے گئے تھے، جن میں کامیابی اور ناکامیابی کا درجہ اُن کی سند ہوتا۔ اس طرح چینی تعلیم نے پڑھے لکھوں کی بے روزگاری میں نہیں ہنرمندی اور تعمیری صلاحیت میں اضافہ کیا۔

ہمارے نئے دوستوں میں کوریا کے ایک پروفیسر تھے جنھوں نے امریکا میں اعلیٰ تعلیم پائی ہے اور ادھر چند برس ہی سے کوریا واپس آئے ہیں۔ ملکی ترقی پہ خود بھی تعجب کرتے تھے۔ کہنے لگے، جاپانی تسلط کے زمانے میں کوریا والے دنیا کے شاید سب سے کاہل باشندے سمجھے جاتے تھے، آج ہر شخص مستعد اور محنت پر کمربستہ ہے۔ ترقی کے لیے محنت ضروری ہے مگر کافی بالکل نہیں۔ کوریا میں امداد باہمی کی تنظیمیں ہر ہر جگہ اور ہر ہر معاملے میں کام کر رہی ہیں جو عوام کی محنت کو بنیوں اور منافع خوروں کی جھولی میں ہضم ہو جانے سے روکتی اور کام کرنے والوں کو اس کا صلہ پہنچاتی ہیں۔ اسی لیے عوام میں خود اعتمادی پیدا ہوئی ہے اور ضرورت کے وقت لوگ دن رات کام کرکے اپنی کمپنیوں کا مال وقت پر تیار کرا دیتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ برآمد سے متعلق کسی خرید پہ سرکاری ٹیکس نہیں ہے، جس کی وجہ سے بین الاقوامی مقابلے میں وہ سب سے بازی لے جاتے ہیں۔ ایک مثال یہ ہے کہ ابھی حال میں بنگلہ دیش نے ٹرانسفارمروں کے لیے ٹینڈر مانگے۔ کوریا نے فی عدد ۱۷سو روپے کے بقدر مانگے، جب کہ ہندوستان سے سب سے سستا ٹینڈر ۴۵سو روپے کا تھا۔

ان مذاکروں میں (آنے جانے والے ملاکر) ڈیڑھ سو کے قریب افراد شریک ہوئے ہوں گے۔ کچھ سارے وقت کے لیے، کچھ اول آخر یا بیچ میں چند ہفتوں کے لیے۔ کویت کے شرکاء صرف چند دنوں کے لیے آئے بعض کا چہرہ بھی ہم نہیں دیکھ پائے، کرائے کے دام وصول کیے اور چلے گئے۔ دوسرے دن خریداری کی، تیسرے دن کہیں اور روانہ ہو گئے۔ پوچھا تو کہا، روپیہ تو ہمارا ہی ہے جی۔

اس مذاکرے کی ایک اور قابل تعریف خصوصیت خواتین کی شرکت ہے، جو مختلف منطقوں اور ملکوں سے آئیں اور تناسب میں شرکاء کے پندرہ فیصد کے بقدر۔ اس تناسب کو ابھی اور بہتر ہونا ہے۔ ملک اور گھر دونوں کی فلاح کا انحصار عورت کی تعلیم اور صلاحیت پر ہوتا ہے۔

جن صنعتوں نے ہاتھ پر زیادہ تکیہ کیا اور دماغ کو نظر انداز کر دیا وہ بچھڑ گئیں۔ جن صنعتوں نے ہاتھ سے بھی زیادہ زور دماغ پہ دیا وہ آگے بڑھ گئیں ہمارے کاریگروں کے دستِ حسن آفریں کو اگر دماغ سے جو تازہ ترین علم و ہنر سے جلا پا چکا ہے، کمک ملتی رہے تو وہ آسمان سے تارے توڑ کر لائیں۔ انھیں اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دینی چاہیے۔ پیٹ کاٹ کر انھیں پڑھانا چاہیے تاکہ وہ علم حاصل کر کے اپنے خاندانی ہنر میں چار چاند لگا سکیں اور کچھ پشتینی کاروبار چھوڑ کر زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی نام پیدا کر سکیں۔

سیّد حامد

تحفظ حسن شباب

ابو وارث جمیل

ہمارے ملک میں جوانی کا مفہوم بہت غلط لیا جاتا ہے یعنی شباب کے معنی صرف صنفی خواہش کی برانگیختگی کے لیے جاتے ہیں۔ دوسرے قویٰ پر بالکل نظر نہیں کی جاتی۔ لہٰذا زیر نظر مضمون اس روایتی طرز سے ہٹ کر قوائے جسم کے صحت کلیہ سے بحث کرتا ہے جن کا حالت صحت پر رہنا صنفی خواہش کو طبعی طور پر برانگیختہ کرنے کا بھی ذریعہ ہے۔ صنفی خواہش اور اس کی تکمیل کے ذرائع کا حالت صحت پر رہنا اور اس کی برانگیختگی تحفظ حسن شباب کا الگ ایک جزء ہے۔ جس پر انشاء اللہ آئندہ کے کسی شمارے میں بحث کی جائے گی۔

صحت قدرت کی ایک گراں قدر نعمت ہے جس کی قدر کرنا اور شکر ادا کرنا ہر انسان پر لازم ہے اس لیے اسلام میں پاکیزگی اور طہارت کو نصف ایمان قرار دیا گیا۔ کیوں کہ جب انسان پاک و صاف رہے گا تو جسم کی پاکی و صفائی اپنے قریب جراثیم کو آنے نہیں دے گی اور جب جراثیم کا مسکن جسم انسان نہیں ہوگا تو تعدیہ کے مواقع نہیں ہوں گے اور جسم انسان امراض سے محفوظ رہے گا۔ اس طرح انسانی حالت صحت میں رہ کر ہی خدا اور بندہ کا حق اچھی طرح ادا کر سکے گا۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عَلَيْكَ لِجَسَدِكَ حَقٌّ

[تم پر تمہارے جسم کا بھی حق ہے]

آج کل امراض سے بچنے کے لیے قدرتی حفظان صحت کے بجائے بیشتر دافع عفونت (ANTISEPTIC) طریقہ کار اپنایا جا رہا ہے۔ جو کہ خود بھی دوسرے امراض کے پیدا کرنے کا سبب ہے۔ کیوں کہ کسی بھی ضد حیات (ANTIBIOTIC) یا دافع تعفن ادویہ کے استعمال سے جہاں ایک خلیہ یا ایک سے زائد خلیے والے اجسام ہلاک ہوتے ہیں وہاں جسم انسانی کے دیگر خلیات بھی مجروح ہوتے ہیں۔ کیوں کہ ان ادویہ کے اندر جسم انسانی کو پہنچنے والے نقصان کی تلافی یا اصلاح کے لیے دیسی ادویہ کی طرح تریاقی مادے جیسے گوند (GUMS)، آشیز (ASHES) ٹینن (TANIN) یا روغنی مادہ - (Oily Materials) وغیرہ نہیں ہوتے۔ اس لیے انسان کی قوت مدافعت کو قوانین قدرت کے مطابق قوی رکھنے اور امراض سے بچاؤ کے لیے کھانے پینے کے آداب سے واقف، سونے جاگنے کے اصول سے باخبر، پانی کی اصلاح غذاؤں کی ترکیب و ترتیب سے باخبر ہونا اور سان حفظان صحت کے اصولوں پر عمل کرنا انتہائی ضروری ہے۔

ایم۔ ڈی اسکالر، ڈپارٹمنٹ آف کلیات، اجمل خاں طبیہ کالج اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

اصول حفظانِ صحت دورِ قدیم کا آزمودہ چلا آرہا سرمایہ ہے، جسے اس دور میں دوبارہ زندہ کرنے کی انتہائی ضرورت ہے۔ کیوں کہ آج اسی حفظانِ صحت پر عمل نہ کرنے کے نتیجے میں جسمانی قوتِ مدافعت کم ہوتی جارہی ہے۔ اس دور میں جب کہ انسان کی اکثریت اپنی طبعی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی امراض کا شکار ہو کر فنا ہو جاتی ہے۔ تجربے سے ثابت ہے کہ قدرتی اصول حفظانِ صحت پر عمل کر کے انسان بآسانی امراض سے بچتا ہوا اپنی طبعی عمر کو پا سکتا ہے اور ان قوانین کی پابندی امراض سے انسان کو کوسوں دور رکھتی ہے۔ اگر اطباء کے اصول حفظانِ صحت کو دیکھا جائے تو وہ اس قدر سادہ اور فطری ہیں کہ اس پر عمل کرنا بہت آسان ہے۔

حفظِ صحت کی دو صورتیں ہیں۔

۱۔ انسانی قوتِ مدافعت کو قوی کر دیا جائے۔

۲۔ تمام جراثیم کو ہلاک کر دیا جائے۔

اطبائے قدیم نے تحفظِ صحت کی بنیاد اسی طبیعت مدبرہ بدن کو بڑھا کر قوت مدافعت کو قوی کرنے پر رکھا ہے نہ کہ ضد حیات یا دافع عفونت ادویہ کے استعمال پر۔ کیوں کہ ان ادویہ کا استعمال بغرض تحفظ جراثیم انسانی قوت مدافعت کو برباد کر دیتی ہے۔

تحفظِ صحت کے بارے میں ابو الطب بقراط (Hippocrates) نے جو کلیات بیان کیے ہیں وہ حکمت سے بھرے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ اس نے کہا:

"معدہ کو کھانے پینے سے نہ بھرنے اور کاہلی کو ترک کرنے سے صحت محفوظ رہتی ہے۔"

سن شباب میں تحفظِ صحت کے لیے مندرجہ ذیل امور پر کاربند ہونا انتہائی ضروری ہے تاکہ جوانی کی آب و تاب کو دیر تک قائم رکھا جا سکے۔ کیونکہ اس دور میں بے اصولی کے نتیجے میں پتہ ہی نہیں چلتا کہ جوانی کب آئی اور گزر گئی۔ ایسے نوجوانوں میں صحت گری گری سی، جسم میں لاغری، سر کے بالوں میں وقت سے پہلے سفیدی، مزاج میں بے اعتدالی وغیرہ عموماً دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہر شخص کی صحت پر اس کے عادات و اطوار ماحول، مزاج، جثہ، پوشاک، ماکولات و مشروبات، ریاضت و نیند وغیرہ کا نمایاں اثر پڑتا ہے اور ان کا خیال رکھنا نہ صرف امراض سے بچنے میں بلکہ اچھی صحت کا ضامن ہے۔

نوجوانوں میں شباب کو برقرار رکھنے کے لیے چند قوانین کلیات جن پر صحت اور بیماری کا انحصار ہے، بیان کیے جاتے ہیں۔ جن کی پابندی تحفظِ صحت کے لیے باعث نعمت ہوگی جو درج ذیل ہیں:

۱۔ باعتبارِ موسم مناسب و کثیر التغذیہ غذاؤں (صالح اخلاط پیدا کرنے والی) کا استعمال۔

۲۔ تنقیہ فضلات (ورزش، مالش اور حمام اور کبھی کبھی ادویہ کے ذریعے)۔

۳۔ ہوا کی پاکیزگی۔

۴۔ سوءِ مزاج پیدا کرنے والے موروثی اور نفسیاتی (رنج و غم، عادات بد وغیرہ) سے پرہیز۔

باعتبارِ موسم مناسب و کثیر التغذیہ غذاؤں (اخلاط صالحہ پیدا کرنے والی) کا استعمال

یہاں پر کثیر التغذیہ غذاؤں سے مراد وہ غذائیں ہیں جن میں غذائیت زیادہ ہو اور جسم میں صالح اخلاط پیدا کرنے کا ذریعہ ہوں۔ غذا جو ہم کھاتے ہیں معدے میں کیلوس اور جگر میں کیموس (اخلاط) کہلاتی ہے اور اخلاط کی پیدائش جگر سے ہوتی ہے۔ لفظ اخلاط کے معنی ملی جلی چیز کے ہوتے ہیں اور اخلاط صالحہ یا اخلاط محمودہ وہ ہیں جس میں اخلاط اربعہ یعنی صفرا، سودا، بلغم اور خون اپنی کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے اعتدال پر ہوں۔ اس قسم کی غذاؤں سے پیدا ہونے والا خون نہ زیادہ گاڑھا اور نہ زیادہ رقیق ہوگا۔

ہماری غذائیں مختلف چیزوں کا مجموعہ ہوتی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ لحمیات

۲ شحمیات

۳ نشاستہ جات

۴۔ نمکیات

۵ حیاتین

۶ پانی

اگر یہ تمام چیزیں غذا میں توازن اور صحیح تناسب کے ساتھ موجود ہوں گی تو صحت برقرار رہے گی اور جسم انسان بڑی حد تک امراض سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ اغذیہ کا تعین باعتبار موسم کرنا چاہیے۔ کیوں کہ قدرت نے ہر موسم میں ایسی غذائیں مثلاً اناج، پھل پھول اور سبزیاں وغیرہ پیدا کی ہیں جن کا استعمال اس مخصوص موسم یا فصل میں پیدا ہونے والے امراض اور موسم کے مزاج میں ہونے والی شدت کی کاٹ کرتی ہیں اور طبیعت مدبرہ بدن کی قوت کو بڑھا کر قوت مدافعت کو بھی بڑھاتی ہیں، ورنہ ہم چاہے کتنی بھی اچھی غذا استعمال کریں اگر غذا کا مزاج موسم کے مزاج سے مطابقت رکھے گا اور مزاج انسانی کے مضاد ہوگا تو ایسی غذا عوارض سوء مزاج پیدا کرے گی۔ مثلاً ٹھنڈک کے موسم میں لسی، دہی، آئس کریم یا اور دیگر بارد ماکولات و مشروبات کا استعمال یا اسی طرح گرمی کے ایام میں گرم اغذیہ مثلاً انڈے، پائے، گرم مصالحوں کا استعمال یا بارش کے زمانہ میں مرطوب غذاؤں کا استعمال وغیرہ اس لیے اغذیہ کے تعین کے لیے موسم کو سامنے رکھتے ہوئے موسم کے مزاج کے مضاد اغذیہ کا تعین کرنا ہوگا تاکہ اخلاط صالحہ کی پیدائش ہو سکے اور صحت کا موسم کے مضر اثرات سے تحفظ ہو سکے۔ جیسے موسم سرما میں حار اغذیہ مثلاً گوشت، انڈے، پائے، شہد وغیرہ کا تعین اور اسی طرح موسم گرما میں ٹھنڈی اور مرطوب غذائیں مثلاً دہی لسی، کھیرا، ککڑی، تربوز، خربوزہ وغیرہ کا استعمال اور موسم باراں میں مرطوب اغذیہ چاہے وہ پھل، سبزی یا گوشت ہوں، ان سب سے پرہیز ضروری ہے۔ کیوں کہ موسم کی مرطوبیت جلد تعفن و فساد کا باعث بنتی ہے۔

غذا کا مقصد جسم کی بقا، اس کی نشو و نما، مرمت اور کام کرنے کے لیے ان کو توانائی پہنچانا ہے۔ جس سے جسم میں حرکت کرنے کی قوت پیدا ہوتی ہے اور جسم انسانی خارجی اثرات کو کم قبول کرتا ہے۔ اور وہ بہت سے امراض سے محفوظ رہتا ہے۔ غذا کی ضرورت انسان کو زندگی کے آغاز سے انتہا تک ہوتی ہے۔ کچھ غذائیں جن کی ہمیں روزمرہ ضرورت ہوتی ہے اور ان سے ہمیں غذا کے مخصوص ۶ اجزاء مطلوب ہیں جو گندم، جوار، باجرا، چنا، دالیں، چاول اور گوشت و روغنیات وغیرہ ہیں۔ جسم میں غذا کے تین مخصوص کام ہیں:

۱۔ توانائی پہنچانا تاکہ جسم حرکت کر سکے۔
۲۔ اعضائے جسم کا نشو و ارتقاء اور مرمت کرنا۔
۳۔ جسم کے تحلیل شدہ عناصر کا بدل مہیا کرنا۔

حضرت انسان ایک ایسا جانور ہے جو کہ ہمہ خور۔ (Omnivorous) کہلاتا ہے جس کی غذا حیوانی اور نباتی دونوں اغذیہ پر مشتمل ہے۔ غذا کی مقدار و قسم پر موسم و فصل جنس و عمر ورزش و آرام اور جگہ کے اعتبار سے تفریق کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً جسمانی محنت کرنے والوں کی غذا اور ہوگی اور علمی محنت کرنے والوں کی اور۔ اسی طرح بچوں کہ سن شباب میں ارادی اور غیر ارادی طور پر ورزش، محنت اور بھاگ دوڑ زیادہ کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے غذا کی مقدار زیادہ ہوگی اور ایسے لوگوں کی غذا میں غذائیت زیادہ ہونی چاہیے۔ اب ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ انسان کو کام کرنے کے لیے کتنی غذا کی ضرورت پڑتی ہے۔ غذا کے استحالہ (Metabolism) سے پیدا ہونے والی طاقت یا حرارت کو ہم کیلوریز میں ناپتے ہیں۔ کیلوری کی تعریف یہ ہے کہ

" ایک گرام پانی کی حرارت ایک ڈگری سینٹی گریڈ بڑھانے کے لیے جتنی حرارت کی ضرورت ہوتی ہے، کیلوری کہلاتی ہے۔"

کاربوہائیڈریٹ پروٹین اور چربی سے پیدا ہونے والی حرارت کی مقدار حسب ذیل ہے۔

غذا	وزن	کلو کیلوریز
پروٹین	۱ گرام	۴۰۰
چربی	۱ گرام	۹۰۰
کاربوہائیڈریٹ	۱ گرام	۴۰۰

مختلف انسانوں کی خوراک مختلف ہوتی ہے۔ خوراک پر عمر، جنس، قد، وزن اور سب سے زیادہ پیشہ کا اثر پڑتا ہے۔ مثلاً مزدور یا جسمانی محنت کرنے والوں اور علمی یا دماغی محنت کرنے والوں کی غذا میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ مزدور کی غذا دماغی کام کرنے والوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ کیلوری توانائی حاصل کرنے کے لیے صرف مقدار ہی نہیں بلکہ جنس غذا کی بھی اہمیت ہے۔ مثلاً ایک جنس کو اگر زیادہ

مقدار میں کھا کر جو توانائی حاصل کر سکتے ہیں تو دوسری جنس غذا کو قلیل مقدار میں کھا کر بھی ہم اتنی توانائی اور قوت حاصل کر سکتے ہیں جیسے ½ اونس مکھن کھا کر ہمیں جو توانائی حاصل ہوتی ہے، اتنی ہی توانائی ہم ۵ تولہ آلو یا ایک بڑا سنترہ کھا کر حاصل کر سکتے ہیں۔

جسمانی محنت کرنے والے یا مزدوروں کی غذا

جو شخص زیادہ محنت کرتا ہے اس کی غذا میں نشاستہ اور شکر والے اجزا زیادہ ہونے چاہیں۔ کیوں کہ جسم میں طاقت نشاستہ سے حاصل شدہ گلوکوز Glucose کے استحالہ Metabolism سے پیدا ہوتی ہے جیسا کہ ہم جانتے ہیں ایک سالمہ گلوکوز One Molecule Glucose کے استحالہ سے ۳۸ سالمہ اے۔ ٹی پی (38 ATP) بنتے ہیں جس کے ٹوٹ کر اے۔ ڈی۔ پی (A.D.P) میں بدلنے پر 4.56 K. cal توانائی جسم میں پیدا ہوتی ہے۔ ایک تندرست آدمی جو درمیانی درجے کی محنت کرتا ہے اسے ۳۵۰۰ حرارے والی غذا ملنی چاہیے۔ جو لوگ کثیر محنت یا ریاضت وغیرہ کرنے کے عادی ہیں، انھیں عام لوگوں کی بہ نسبت زیادہ حرارے توانائی کی ضرورت پڑتی ہے اور ان کی غذائیں کثیر التغذیہ ہونی چاہیں۔ مثلاً انڈا، دودھ، گوشت فواکہات و نشاستہ جات وغیرہ۔

علمی انسان یا دماغی محنت کرنے والوں کی غذا

دماغی محنت کرنے والوں کو چوں کہ جسمانی محنت کم کرنی پڑتی ہے جس سے ہضم عموماً ناقص ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کی غذا میں حیوانی اغذیہ بہتر ہوتی ہیں۔ کیوں کہ نباتی اغذیہ کی بہ نسبت یہ جلدی ہضم ہوتی ہیں اور فضلہ بھی بنتا ہے اور ان میں اجزاءِ غذائیہ بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ اگر دماغی کام کرنے والے اشخاص آرام کے ساتھ ساتھ ورزش بھی کرتے رہیں تو پھر ہر چیز کھا سکتے ہیں۔ دماغی کام کرنے والوں کو خالص سبزی پر گزر کرنا مناسب نہیں۔ کیوں کہ نباتی اغذیہ کا ہضم حیوانی اغذیہ کی بہ نسبت دشوار ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ علمی کام کرنے والے انسان کے لیے زیادہ خون کا دماغ میں رہنا ضروری ہے نہ کہ معدے کے قرب و جوار میں سبزی

کے ہضم کے لیے۔ خواہش سے زیادہ کھانا صحت کے لیے مضر ہے۔ کیونکہ یہ اعضائے ہضم پر بوجھ بنتا ہے۔ دوسرے یہ کہ دماغی قوت کو کم کر دیتا ہے۔

بقراط کا قول ہے کہ:

"اتنا نہ کھاؤ کہ وہ تم کو کھا جائے۔"

اب یہاں پر اندازہ سے زیادہ کھانے اور زیادتی غذا سے بچنے کے لیے مذکورہ ذیل کے جدول کو تحریر کیا جاتا ہے۔ تاکہ زیادتی غذا کے مضرت رساں نتائج سے اپنی صحت کو بچایا جا سکے اور دورِ شباب کو دیر تک درخشاں رکھا جا سکے۔

جدول ۱

بالغ مرد کے لیے متوازن خوراک

	بیٹھ کر کام کرنے والا		جسمانی محنت کا کام کرنے والا		سخت محنت کا کام کرنے والا	
	سبزی خور (گرام)	گوشت خور (گرام)	سبزی خور (گرام)	گوشت خور (گرام)	سبزی خور (گرام)	گوشت خور (گرام)
اناج	400	400	475	475	650	650
دالیں	70	55	80	65	80	65
ہرے پتے والی سبزیاں	100	100	125	125	125	125
دوسری سبزیاں	75	75	75	75	100	100
جڑیں اور گٹھلیاں	75	75	100	100	100	100
پھل	30	30	30	30	30	30
دودھ	200	100	200	100	200	100
چکنائی	35	40	40	40	60	60
گوشت اور مچھلی	—	30	—	30	—	30
انڈے	—	30	—	30	—	30
شکر اور گڑ	30	30	40	40	55	55

جدول ۲
بالغ عورت کے لیے متوازن خوراک

	ہلکا کام: سبزی خور (گرام)	ہلکا کام: گوشت خور (گرام)	اوسط کام: سبزی خور (گرام)	اوسط کام: گوشت خور (گرام)	بھاری کام: سبزی خور (گرام)	بھاری کام: گوشت خور (گرام)	مزید مقدار (دوران): حمل (گرام)	مزید مقدار (دوران): رضاعت (گرام)
اناج	300	300	350	350	475	475	50	100
دالیں	60	45	70	55	70	55	-	10
ہرے پتے والی سبزیاں	125	125	125	125	125	125	25	25
دوسری سبزیاں	75	75	75	75	100	100	-	-
جڑیں اور گٹھلیاں	50	50	75	75	100	100	-	-
پھل	30	30	30	30	30	30	-	-
دودھ	200	100	200	100	200	100	125	125
چکنائی	30	35	35	40	65	70	-	15
شکر اور گڑ	30	30	30	30	40	40	10	20
گوشت اور مچھلی	-	30	-	30	-	30	-	-
انڈے	-	30	-	30	-	30	-	-

تنقیہ فضلات

جسم کے اندر مستقل طور سے فعل وانفعال کے نتیجے میں فضلات بنتے رہتے ہیں جن کا طبعی طور سے اخراج انتہائی ضروری ہے۔ جب ان فضلات کا جسم سے اخراج نہیں ہوتا تو یہ فضلات مواد ردیہ کی شکل میں اعضاء کے ساختوں اور انسجہ۔ (Tissues) میں ٹھہر جاتے ہیں۔ جس سے جسم ان کے سمی اثر سے متاثر ہو کر مختلف قسم کے امراض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جسم کے اندر پیدا ہونے والے مواد ردیہ (فضلات) کا استفراغ نہایت ضروری ہے۔ فضلات کا اندفاع مختلف طریقے سے انجام پاتا ہے۔

۱۔ ورزش کے ذریعے۔
۲۔ مالش کے ذریعے
۳۔ حمام کے ذریعے
۴۔ کبھی کبھی ادویہ کے ذریعے۔

(۱) ورزش کے ذریعے۔

ابی الولید محمد ابن رشد کا قول ہے:
"ورزش صحت کی ضامن ہے"۔
اعضاء کی حرکت ارادیہ کو ورزش کہتے ہیں۔ حرکت ارادیہ کے دوران ورزش دو طرح کی ہوتی ہے:

۱۔ ورزش کلیہ۔
۲۔ ورزش جزئیہ۔

بقول شیخ الرئیس، اگر صحیح اوقات میں اعتدال کے ساتھ ورزش کی جائے تو

تمام امراض مادیہ اور سوء مزاج سادہ اور مادی سے انسان محفوظ رہے گا"۔ جو لوگ ورزش نہیں کرتے اس کا اثر ان کے چہرے سے ظاہر ہو جاتا ہے مثلاً قید خانوں میں رہنے والے لوگوں کے چہرے زرد پڑ جاتے ہیں اور بدن میں امراض پیدا ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ لوگ ایک ہی مقام پر پڑے رہتے ہیں اور حرکت ارادیہ سے قاصر ہوتے ہیں۔ اس طرح یہی حال ان تمام جانوروں اور پرندوں کا ہے جو پنجروں میں بند رہتے ہیں۔

ورزش ایک ایسا عمل ہے جو ابتدا سے ہی جسم میں فضلات اور مواد ردیہ کو ٹھہرنے نہیں دیتا۔ اس کے علاوہ یہ حرارت غریزیہ کو بھی ابھارتا ہے جس سے جسم توانا، چست اور پھرتیلا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ورزش سے جسم کے اندر ایک لطیف قسم کی حرارت پیدا ہوتی ہے جو ان فضلات اور مواد ردیہ کو تحلیل کر دیتی ہے۔ اس کے علاوہ عمل ورزش بذات خود ان مواد کو حرکت میں لا کر جسم میں پھیلانے اور آگے بڑھنے میں اور فضلات کے اخراج میں مدد کرتا ہے۔ جس کے نتیجے میں کچھ روز تک اس عمل کی استقامت پر یہ فاسد مواد جسم میں اکٹھا نہیں ہو پاتے اور جسم ان کے سمی اثرات سے محفوظ رہتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ حرارت غریزی کو بڑھا کر جوڑوں اور عضلات کو مضبوط بنا دیتا ہے جس سے ان اعضاء کے افعال قوی ہو جاتے ہیں اور ان اعضاء میں غذا کو قبول کرنے کی استعداد بڑھ جاتی ہے کیونکہ ورزش اعضاء کے اندر تحلیل کرتی اور فضلات کو برابر کم کرتی رہتی ہے جس سے انجذاب غذا اور اخراج فضلات کا عمل ایک دوری طریقے (Cyclic way) میں جاری رہتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ اعضاء

کی قوتِ جاذبہ کو بڑھا کر اعضا میں چستی اور وسعت پیدا کرتا ہے۔

ورزش کچھ دنوں تک کر کے چھوڑ دینا باعثِ مضرِ صحت ہے۔ کیوں کہ اس سے اعضا، نحیف ہو جاتے ہیں۔ اس عمل کو کرتے رہنے سے روح غریزی (نسیم) کا انجذاب اعضاء کی طرف اچھا ہوتا ہے جس سے اعضاء میں قوت پیدا ہوتی ہے لیکن جب اس عمل کو ترک کر دیا جاتا ہے تو پھر یہ روح اعضاء کی طرف جذب نہیں ہوتی، جس کے نتیجے میں قوت بھی پیدا نہیں ہوتی۔ قوی ورزش کے ذریعے جسم میں غیر معمولی استفراغ ہوتا ہے جو جسم کو کمزور کر دیتا ہے جیسا کہ سخت جسمانی محنت یا ورزش کرنے والوں میں ملتا ہے۔

ورزش کے بھی کچھ اصول اور کلیے ہیں۔ اگر ان کی پابندی نہ کی جائے گی تو یہی ورزش نقصان کا باعث ہوگی۔ مثلاً اوقات، مقدار، ورزش کے پہلے اور بعد کی غذائیں، ورزش کے پہلے اور بعد کی مالش اور ورزش کے بعد حمام اور آرام وغیرہ۔

۲ مالش (دلک) ہضم اخیر (رابعہ) کے فضلات کا استفراغ مالش کے ذریعے انجام پاتا ہے۔ مالش کا عمل ورزش کے ذریعے حاصل ہونے والے فوائد کو بڑھا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ورزش سے پہلے اور بعد میں مالش کرانا ضروری ہے۔

ورزش سے پہلے ورزش کرنے کی استعداد پیدا کرنے کے لیے دلک استعداد کراتے ہیں۔ دلک استعداد کے ذریعے ورزش کے لیے بدن کو تیار کرتے ہیں تاکہ حرارت غریزیہ برانگیختہ ہو اور بند مسامات کھل جائیں اس لیے اس قسم کی مالش ورزش شروع کرنے کے پہلے کرائی جاتی ہے۔

دلک استرداد ہمیشہ ورزش کے بعد کرائی جاتی ہے۔ اس مالش کی غرض تھکن کو دور کرنا (تسکین) اور فضلات جو کہ ابھی ریاضت سے خارج نہیں ہوئے ان کا اخراج ہے جو کہ دلک استرداد نہ کرانے سے عضلات میں رہ کر تھکان اور کسل کا سبب بنتے ہیں۔ دلک استرداد کے بعد ہاتھ پیر کو خوب ادھر ادھر چلایا جائے تاکہ تکان دور ہو اور فضلات تحلیل ہوں۔

مالش کی غرض اور منفعت یہ ہے کہ اگر کسی کا جسم ڈھیلا اور پولا ہے تو مالش کے ذریعے ٹھوس بنایا جا سکتا ہے اور اگر سخت ہے تو نرم اور پولا بنایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ عمل مالش کسی خاص عضو کو فربہ بنانے کے لیے بھی کرتے ہیں۔ مالش کے ذریعے ریاح کی تحلیل ہوا کرتی ہے اور کبھی کبھی کسی عضو کی برودت اور جمود کو دور کرنے کے لیے اور کبھی کبھی در کے لیے بھی مالش کراتے ہیں۔

۳۔ حمام تدابیر حفظ صحت میں حمام کو بھی خاص دخل کے ذریعے فضلات کا استفراغ کر کے قوائے طبیعیہ کو اپنے افعال رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تندرست افراد کو ایسے حمام کی ضرور ہے جس سے ہلکے درجے کی حرارت اور معتدل درجہ کی رطوبت پیدا ہو ریاضت اور مالش کی طرح قلب اور دوران خون کو ہیجان میں لاتا اس طرح قلب سے دور کے اعضا، کی تغذیہ میں معاون ہوتا ہے تکان دور کر کے نیند لاتا ہے، مسامات کو کھول کر جلا بخشتا ہے اور زیر جلد کے فضلات کا استفراغ کرتا ہے۔ حمام کے ذریعے کبھی فربہی پیدا کرتے یا لاغری پیدا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف امراض کے سدّباب کے لیے بھی حمام استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ذق، وجع المفاصل، موٹاپا، تیز بخار وغیرہ۔ حمام اکثر بھوک دیتا ہے۔ مادوں کو ایک عضو سے دوسرے عضو پر گراتا اور گھلاتا ہے، درد میں سکون اور ہیجان بھی پیدا کرتا ہے۔ حمام کے ذ فعل بھی انجام پاتے ہیں جیسے کہ حمام جسم میں حرارت، برودت، پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح زیر جلد فضلات کا استفراغ کرتا، مسا کھولتا یا زیر فضلات کو بند کرتا اور مسامات کو بند کرتا ہے۔

ورزش، مالش اور حمام سے فراغت کے بعد ایسی غذا ا کی جائے جو کیفیت اور مقدار میں مناسب ہو جیسے مرغ کا گوشت کے بچے کا گوشت یا جوان بچھڑے کا گوشت، خمیری روٹی وغیرہ ا کے بعد غذا استعمال کی جائے۔

۴۔ ہواؤں کی پاکیزگی :۔ ہوا جب تک پاک و معتدل ہوتی ہے اور اس میں کوئی فاسد مادہ شریک نہ ہو جو کہ ہو کے مزاج کو فاسد نہ کر دے تو ایسی ہوا صحت مفید ہوتی ہے اور صحت کی محافظ ہوتی ہے اور یہ جب اپنی اصل تبدیل ہو جاتی ہے تو اس کے افعال و خواص بھی مخالف اور مضر ہیں اور صحت کے لیے مضر ہوتی ہے۔ ہواؤں میں تین طرح کے ت ہستے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ تغیرات طبعیہ ۔ فصلی تغیرات

۲۔ تغیرات غیر طبعیہ ۔ یہ ہوا میں فصلی تغیرات کے مطابق نہیں ہوتے۔

۳۔ تغیرات وبائی ۔ جو ہوا کے جوہر کو تعفن و فساد کے باعث تحلیل کر دیتے ہیں۔

کبھی کبھی کیفیات کے اعتبار سے ہوائیں غیر طبعی حالت پر ہوتی ہیں اور کبھی کبھی تعفن و فساد کے باعث ہوا کا جوہر بالکل بدل جاتا ہے۔ ہوا کی یہ دونوں حالتیں جسم میں امراض کو قبول کرنے کی استعداد پیدا کر دیتی ہیں۔ امراض وبائیہ میں خصوصاً وہی لوگ مبتلا ہوتے ہیں جن میں ان امراض کو قبول کرنے کی استعداد زیادہ ہوتی ہے۔ ہوا میں غیر طبعی تغیر کی صورت میں تحفظ کے لیے عمومی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ مثلاً سدوں کا کھولنا، اسباب عفونت کو روکنے کی کوشش کرنا اگر ہوا کسی ایک کیفیت میں معتدل ہو جائے تو اس کے بالمقابل مضاد تدابیر اختیار کی جائیں۔ مثلاً جب ہوا میں حرارت و یبوست زیادہ ہو جائے تو بار د رطب غذائیں استعمال کی جائیں اور ممکن ہو تو ان فضلات و اخلاط کا استفراغ کیا جائے جو اس موسم میں پیدا ہوتے ہیں اور اگر ہوا کا پورا جوہر فاسد ہو جائے یعنی وبائی ہو جائے تو استفراغ عام کیا جائے اور مانع وبا، اشیاء کا استعمال کرنا چاہیے۔ مثلاً لیمو، پیاز، لہسن، سرکہ، عرق گلاب، مصفیات و مفرحات کا کثرت استعمال اور مرطوب و رس دار پھلوں سے پرہیز وغیرہ۔ غرض کہ جب ہوا کے فاسد ہونے کے سبب امراض پیدا ہونے لگیں تو ان امراض سے تحفظ کے لیے ایسی تدابیر اختیار کی جائیں جو مزاج ہوا کے مخالف ہوں۔

موسم گرما میں ایسے مقام پر رہائش اختیار کی جائے کہ جہاں کی ہوا صاف ستھری ہو یعنی بلند مقامات پر۔ وبائی زمانے میں ایسے مکان میں رہائش ہونی چاہیے جس میں ہوا کی اصلاح ہوتی رہے اور تمام پھلوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اس سے جو خون بنتا ہے اس میں جلد عفونت کو قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ گوشت سے بھی پرہیز کرنا چاہیے کیوں کہ اس کا استحالہ تعفن کی طرف جلد ہوتا ہے۔ اس زمانے میں مچھلیوں کا استعمال بہت مضر ہے۔ اطبا، کا اس پر اتفاق ہے کہ ہر موسم میں ایسی دوائیں استعمال کی جائیں جو محافظ صحت ہوں۔ تاکہ یہ اخلاط صدیدی کو نکال دیں جس سے جسم عفونت سے محفوظ رہ سکے۔

۵ سوءِ مزاج حرکاتِ نفسانیہ سے پرہیز

عوارضات نفسانیہ کا اثر صحت پر براہ راست پڑتا ہے مثلاً رنج و ملال، غم و غصہ، فرحت و انبساط، خوف، پشیمانی وغیرہ۔ جب حرکاتِ نفسانیہ کیفیت اعتدال سے ہٹ کر بڑھ جائے یا گھٹ جائے تو اسے سوءِ مزاج کہتے ہیں۔ سوءِ مزاج حرکات نفسانیہ میں حرکاتِ بدنیہ میں شدت اور تیزی آجانے کے سبب ہضم ناقص ہو کر سوءِ ہضم کا سبب بنتا ہے جس سے بعض اوقات تخمہ و بدہضمی اور کبھی کبھی قرحہ معدی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اس لیے کھانے کے بعد خصوصاً ان عوارضات سے بچنا چاہیے۔

تمام حرکات نفسانیہ میں روح اور خون جس طرف حرکت کرتے ہیں اس طرف حرارت بڑھ جاتی ہے اور جس طرف سے حرکت کرتے ہیں، اس طرف برودت بڑھ جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں حرارت و برودت کا یہ دور اعتدال سے ہٹ کر سوءِ مزاج کا سبب بنتا ہے۔ اگر حرکات نفسانیہ انتہا پر پہنچ جائے تو باعث ہلاکت بن سکتی ہے۔ مثلاً خوشی کی افراط سے بھی موت ہو سکتی ہے جیسا کہ اکثر سننے میں آتا ہے جس کو "شادیِ مرگ" کہا جاتا ہے اور خوف و غم کی زیادتی بھی موت کا سبب بن جاتی ہے جس کو صدمہ (shock) کہا جاتا ہے۔ لہٰذا ان عوارضات کی زیادتی سے بچنا چاہیے۔

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جو پاک چیزیں اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں، انھیں حرام نہ کر لو اور حد سے تجاوز نہ کرو۔ اللہ کو زیادتی کرنے والے سخت ناپسند ہیں۔" (سورہ مائدہ ۸۷)

مذہب

ہمارا علم ایک چھوٹا سا روشن دائرہ ہے جو چاروں طرف پھیلی ہوئی تاریکی کے بہت بڑے رقبے کے درمیان چمک رہا ہے۔ یہ چھوٹا سا دائرہ علم کا ہے اور یہ بہت بڑا تاریک اور اندھیرا رقبہ جہالت کا ہے۔ جوں جوں ہم اس روشن دائرے کے رقبے کو بڑا کرتے ہیں، اس کا محیط بھی بڑھتا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں علم کا دائرہ جتنا زیادہ بڑھتا ہے، اتنا ہی جہالت سے اس کا تعلق بھی بڑھتا جاتا ہے۔ جوں جوں ہمارا علم بڑھتا ہے، ہم پر اس حقیقت کا انکشاف ہوتا جاتا ہے کہ ابھی تو ہمیں بہت کچھ معلوم نہیں۔

راز حقیقت کو میں کوئی حیران کن چیز نہیں سمجھتا اور نہ ہی میں اسے کوئی ایسی خوفناک چیز سمجھتا ہوں کہ آدمی اس سے دور بھاگے۔ مجھے تو اس خیال سے خوف آتا ہے کہ صرف طبعی کائنات موجود ہے اور اس کے علاوہ کوئی اور کائنات موجود نہیں۔ اس کے برعکس مجھے اس خیال سے خوف نہیں آتا، بلکہ سکون ملتا ہے کہ مادی دنیا کے علاوہ بھی کوئی اور دنیا ہونی چاہیے، خواہ وہ چیز ہماری سمجھ میں نہ آئے۔ دور جدید کے عظیم سائنس داں آئن سٹائن نے اس بات کو نہایت اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

> "دنیا کی حسین ترین چیز جس کا ہم تجربہ کر سکتے ہیں، پراسراریت ہے، یہی تمام علوم وفنون کا منبع ہے۔ وہ شخص جو اس جذبے کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہے، جو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور حیران و متحیر ہونا نہیں جانتا، وہ بالکل مردہ ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہیں۔
>
> زندگی کی پراسراریت کو سمجھنے کی یہی بصیرت، جس میں اکثر خوف بھی شامل ہوتا ہے، اصل میں مذہب کی بنیاد ہے۔
>
> یہ جاننا اور سمجھنا کہ وہ چیز یا ہستی، جو ہماری سمجھ سے باہر سچ مچ اپنا وجود رکھتی ہے اور اپنا اظہار اعلیٰ ترین دانش اور تابندہ حسن کی صورت میں کرتی ہے اگرچہ ہم اس دانش و حسن کی بہت ہی معمولی صورتوں کی پہچان رکھتے ہیں۔ یہی علم، یہی احساس اصل میں سچی مذہبیت کی جان ہے۔"

سی۔ای۔ایم۔جوڈ

کیا ہم اپنے دانتوں کی حفاظت کرتے ہیں

سلیم شہزاد عظیمی

دانت ہمارے جسم کا اہم جزو ہیں۔ ان کی حفاظت کی ذمہ داری ہمیں بچپن ہی سے محسوس کر لینی چاہیے۔ مگر ہوتا کیا ہے کہ ہم بچپن سے بڑھاپے تک زندگی کے اس اہم عنصر سے پہلو تہی برتتے ہیں۔ نتیجتاً جب بڑھاپے میں منہ سے یہ نعمت ایک ایک کر کے جھڑنے لگتی ہے تو اس کی قدر کا احساس ہوتا ہے۔ تب مصنوعی دانتوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ لیکن یاد رکھیے! اعلیٰ سے اعلیٰ مصنوعی دانت برے سے برے اصلی دانتوں کا نعم البدل نہیں بن سکتے۔ مصنوعی دانت رکھنے والا شخص لقمے کو چبانے کی لذت اور مختلف پھلوں اور سبزیوں کو چکھنے کی مسرت ولطف سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتا ہے۔

منہ کے اندر اگر ایک دانت بھی خراب ہو جائے تو وہ تمام جسم کے لیے بیماری کا مرکز بن جاتا ہے ایک حالیہ طبی رپورٹ کے مطابق برطانیہ میں چالیس لاکھ بچے ایسے پائے گئے، جن کے دانت بوسیدہ ہو گئے تھے اور اس بوسیدگی یا خرابی کا براہ راست اثر ان کے معدے پر پڑ رہا تھا، جس سے گیس پیدا ہو کر نظام انہضام کو متاثر کر رہی تھی۔ دانت کی خرابی بدہضمی اور گیس کے علاوہ کئی اور بیماریوں کو جنم دے سکتی ہے۔ برطانیہ میں بیس ہزار دانتوں کے ڈاکٹر محض اسکول کے بچوں کے دانتوں کے علاج کے لیے متعین کیے گئے ہیں۔ وہاں بیس سال کی عمر سے اوپر ہر دس میں سے ایک نوجوان مکمل طور پر اپنے دانتوں سے محروم ہو چکا ہے اور وہ مصنوعی دانت استعمال کرنے پر مجبور ہے۔ برطانیہ کے ڈاکٹروں کی ایسوسی ایشن کے مطابق اس ملک میں سالانہ تیس کروڑ پاؤنڈ بوسیدہ دانتوں کی فلنگ پر خرچ کر دیتے ہیں۔

بچوں میں دودھ کے مکمل دانتوں کی تعداد بیس ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ دانتوں کی جگہ مستقل دانت لے لیتے ہیں۔ جب یہ مستقل دانت مکمل ہو جاتے ہیں تو ان کی تعداد ۳۲ ہو جاتی ہے۔ عام طور پر والدین اپنے چھوٹے بچوں کے دودھ کے دانتوں کا خیال اس لیے نہیں رکھتے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ عارضی دانت ہیں اور بالآخر ان کی جگہ مستقل دانت نکلیں گے۔ لیکن ماں باپ کی یہ غفلت ایک ایسی غلطی ہے جس کی بھاری قیمت بچوں کو ادا کرنی پڑتی ہے۔ محض اتنا ہی کافی نہیں کہ آپ اپنے بچوں کو بے بی برش سے دانت صاف کرنا سکھا دیں، اسے صحیح قسم کی خوراک کھلانا بھی ضروری ہے۔ کیوں کہ میٹھی اور نشاستہ دار غذا دانتوں کے لیے مضر ثابت ہوتی ہے کسی اتفاقی حادثے کے سوا دودھ کے دانتوں کا اس وقت تک برقرار رہنا ضروری ہے، جب تک مستقل دانت ان کی جگہ نہ لے لیں۔ اگر کسی وجہ سے دودھ کا کوئی دانت وقت سے پہلے ضایع ہو جائے تو اس کے قریب واقع دوسرے دانت اس کے خلا کو پُر کرنے کی کوشش میں آگے کی طرف ہونے لگتے ہیں اور اس طرف منہ کی خوب صورتی تو متاثر ہوتی ہی ہے، دانت غلط ترتیب سے لگنے لگتے ہیں۔ اگر دانت ترتیب میں نہ ہوں تو خوراک چبانے کی استعداد بھی متاثر ہوتی ہے۔

دانتوں کی حیثیت ایک دیوار کی اینٹوں یا کسی چھت کے ستون کی سی ہے۔ اگر دیوار سے ایک بھی اینٹ نکال لی جائے تو اس کا توازن متاثر ہوگا اور اس اینٹ کا بوجھ دوسری اینٹوں کو برداشت کرنا پڑے

ماخوذ ۔

گا۔ اسی طرح اگر دانتوں میں سے ایک دانت کم ہو جائے تو توازن برقرار نہیں رہتا اور ایک دانت کا کام بھی دوسرے دانت کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ دانتوں کی تشکیل اور ظاہری شکل کا تعین اگرچہ ایک شخص کی نسلی اور آبائی خصوصیات سے بھی ہوتا ہے لیکن جس انداز میں ہم اپنے دانتوں کو استعمال کرتے ہیں، اس سے دانتوں کی شکل پر اثر پڑتا ہے۔

آج کل مختلف قسم اور ناموں کے ٹوتھ پیسٹوں، منجنوں اور ٹوتھ برشوں کی نئی سے نئی اقسام کے بڑے بڑے دلچسپ اشتہار دیکھنے میں آتے ہیں۔ اس قسم کے اشتہارات سے نام نہاد ڈاکٹروں کے حوالے سے عام طور پر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ

"صاف دانت کبھی خراب نہیں ہوتے۔"

دانتوں کی صفائی کا جو تصور ان اشتہارات میں پیش کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ کسی خاص کمپنی کے بنے ہوئے ٹوتھ برشوں کے ساتھ ہر روز خوب رگڑ رگڑ کر دانتوں کو صاف کیا جائے۔ بدقسمتی سے یہ دعویٰ مکمل طور پر درست نہیں ہے۔ ہزاروں سال پہلے لوگ کوئی ٹوتھ پیسٹ یا ٹوتھ برش استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ سادہ مسواک کا استعمال بھی رائج نہ تھا، لیکن اس کے باوجود ان کے دانت تا عمر محفوظ رہتے تھے کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ لوگ کچی سبزیاں اور پھلوں پر گزارا کرتے تھے۔ دانتوں کے موجودہ امراض دراصل تہذیب نو کی پیداوار ہیں۔ آج بھی ایشیا اور افریقہ کے بعض غیر متمدن قبائل میں جہاں تہذیب کی کرنیں ابھی تک نہیں پہنچیں، لوگوں کے دانت ٹھیک ٹھاک اور مضبوط ہوتے ہیں۔

دانتوں کو کیڑا لگنے کی بیماری کا آغاز دراصل آگ کی دریافت سے ہوا۔ جب انسان نے کچی اور تازہ خوراک کی جگہ آگ سے پکی اور چکی سے پسی ہوئی غذا کھانی شروع کی۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ دانتوں کی بوسیدگی دو وجہ سے ہو سکتی ہے۔ ایک خوراک کے کھانے کے بعد دانتوں کی صفائی نہ کرنا۔ اور دوسرے دانتوں کی بناوٹ۔ دانتوں کی بوسیدگی کا آغاز مسوڑھوں کی سطح سے ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ ان کے نیچے تک سرایت کر جاتی ہے اس بوسیدگی کو پیدا کرنے والا ایجنٹ ایک قسم کا کیڑا ہوتا ہے جو نشاستہ دار اشیاء یا چینی کے تخمیر کے عمل سے جنم لیتا ہے اور ایک طاقت ور تیزابی مادہ "لیکٹک ایسڈ" پیدا کرتا ہے۔ یہی مادہ دانتوں کو بوسیدہ اور کھوکھلا کر دیتا ہے۔ ہمارے دانتوں کی بیرونی سطح پر ایسے چھوٹے چھوٹے گڑھے پائے جاتے ہیں جو کھلی آنکھ سے کسی کو نظر نہیں آتے۔ جب ہم خوراک کھاتے ہیں تو اس کے باریک ذرات ان گڑھوں میں اٹک کر رہ جاتے ہیں۔ لعاب دہن کے ساتھ ملنے سے عمل تخمیر شروع ہو جاتا ہے اور ایسے تیزابی مادے پیدا ہوتے ہیں جو دانتوں کے انیمل کھرچ ڈالتے ہیں اور یوں بوسیدگی کا عمل تیز ہو جاتا ہے۔

یہ سمجھنا ٹھیک نہیں کہ روزانہ دو وقت یعنی صبح و شام دانتوں کو برش کرنے سے کیڑا لگنے کی بیماری سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ دانتوں کو نقصان پہنچانے والے جراثیم کھانا کھانے کے صرف بیس منٹ بعد منہ کی نرم بافتوں میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ جراثیم بڑی تیزی سے بڑھتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ کوئی سارا دن ہر بیس منٹ بعد اپنا منہ برش سے صاف نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر ہم صحیح قسم کی خوراک استعمال کریں تو عمل تخمیر کو دانتوں کے اندر وقوع پذیر ہونے سے روک سکتے ہیں۔ ہماری خوراک میں مکمل معدنیات اور وٹامن کا ہونا ضروری ہے اور یہ اس لیے کہ ہمارے جسم کی نشوونما اور خلیوں کی ٹوٹ پھوٹ کی مرمت ہوتی رہے۔ نشاستہ دار غذا سے جسم کو حرارت اور توانائی ملتی ہے۔ چکنائی سے اعصاب کی نشوونما ہوتی ہے۔ معدنی نمکیات اور حیاتین سے نہ صرف ہڈیاں اور دانت بنتے ہیں بلکہ ان کی عدم موجودگی میں دیگر تمام غذاؤں کے فوائد بھی بے نتیجہ ثابت ہوتے ہیں۔ مختلف قسم کے حیاتین کے علاوہ ہمارے جسم میں تقریباً بیس قسم کے معدنی نمکیات کی موجودگی کا پتہ چلا ہے۔ ان میں اہم نمکیات سوڈیم، کیلشیم فاسفورس، فولاد اور سلیکون وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن کوئی شخص بھی کیمیائی تحقیق کے بغیر خوراک نہیں کھا سکتا۔ لہٰذا یہ کہنا یا سمجھنا کہ خوراک میں اس قدر معدنی نمکیات یا اتنے حیاتین ہوں، اس قسم کا پیمانہ مقرر کرنا ایک طرح کی حماقت ہوگی۔ اصل بات یہ ہے کہ خوراک کو متوازن بنایا جائے۔ بس اس سے زیادہ سر کھپانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

ہمیں خاص طور پر بچوں کی خوراک کو متنوع اور متوازن بنانا چاہیے اس خوراک میں روٹی اور سالن کے ساتھ ساتھ کافی زیادہ تازہ کچی سبزیاں، ساگ پات اور تازہ پھل ہونے چاہئیں۔ سفید چینی کی جگہ گڑ اور

گنے کا تازہ رس استعمال کیا جائے تو بہتر ہے۔ لیکن شہد سب سے بہتر ہے پھل ایسے ہوں جنہیں دانتوں سے کاٹ کر کھانا پڑے یعنی تازہ اور سخت پھل۔ گو میدے سے تیار کی ہوئی ڈبل روٹی، کیک اور پڈنگ وغیرہ کھلانا سخت مضر بلکہ خطرناک ہے۔ سفید آٹا (میدہ) ایک مردہ خوراک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تیار کی ہوئی ڈبل روٹی زیادہ عرصے تک برقرار رہتی ہے۔ جس طرح برقرار رہتا ہے جب کہ موٹے آٹے کی روٹی جلدی خراب ہو جاتی ہے۔ سفید آٹے کی طرح سفید چینی کا استعمال ضروری ہے۔ کیونکہ سفید چینی میں سفیدی اور مٹھاس کے سوا سب کچھ غائب رہتا ہے جہاں تک ممکن ہو جائے یا کافی کو چینی یا کسی دوسری مٹھاس کے بغیر ہی استعمال کیا جائے۔ میٹھا کھانا بہت ہی ضروری ہو تو پھر گڑ یا شکر کا سہارا لیا جائے۔

بچوں کو ایسی خوراک دینی چاہیے جس سے ان کے دانتوں پر بُرا اثر نہ پڑتا ہو۔ سالم اور ان چھنی گندم کا آٹا اور جو کے آٹے کی روٹی بچوں کے لیے بہترین غذا ہے۔ اگر بچے کو بہترین نشوونما پاتا دیکھنا ہو تو اسے ہر روز ایک لٹر دودھ، ایک انڈا، کم از کم ایک اونس مکھن، ایک گلاس کسی رس دار پھل کا جوس (لیکن اسکواش نہ ہو) کچھ تازہ پھل یا کچی سبزیاں ضرور دیں۔ ان چیزوں سے پروٹین، نشاستہ، کیلشیم، فاسفورس اور مختلف حیاتین کی ضروریات پوری ہو سکتی ہیں۔ دودھ کے بعد انڈا بہترین غذا ہے۔ انڈے میں پروٹین کی وافر مقدار ہوتی ہے۔ اگر انڈے کو گرم دودھ میں پھینٹ کر پیا جائے تو اس سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ گوشت بھی بڑھنے پلنے والے بچے کے لیے ضروری ہے لیکن پنیر گوشت سے بہتر ہے پنیر کے ایک اونس میں پروٹین کے سات گرام ہوتے ہیں، جب کہ مچھلی کے ایک اونس میں ساڑھے چار۔ بڑے گوشت میں چار اور چھوٹے گوشت میں ساڑھے تین۔ بہت سے لوگوں کے لیے یہ انکشاف شاید تعجب خیز ہو کہ سویابین کے ایک اونس میں ساڑھے گیارہ گرام پروٹین ملتے ہیں۔

آئیے اب دیکھیں کہ وٹامن ہمارے لیے کیا خدمات انجام دے سکتے ہیں۔

وٹامن الف:

اس وٹامن کو بعض لوگ "سحر کار حیاتین" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ عام طور پر بہت سی غذاؤں میں جزواً پایا جاتا ہے۔ اس وٹامن کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ خوراک میں تنوع پیدا کیا جائے۔ یہ حیا ہمارے دانتوں کے مسوڑھوں کے مقام اتصال کو کنٹرول کرتا ہے اور یہی وہ ہے جو سب سے زیادہ جراثیم کے حملے کا شکار ہوتی ہے جس کا نتیجہ بعد میں پائو وغیرہ کی شکل میں نکلتا ہے۔ اگر وٹامن الف کا استعمال بچوں کو شروع میں نہ کرایا جائے تو دانت کے مسوڑھے کبھی بھی استحکام نہیں پکڑیں نتیجتاً وقت سے پہلے دانت گر جاتے ہیں۔ اس وٹامن کی کمی کا ایک نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ دانتوں پر سفید سفید رونما ہونے لگتے ہیں اور ایسا لگ ہے کہ جیسے وہ ابھی تڑخ جائیں گے۔ چنانچہ وٹامن الف نہ صرف دانتوں چمک اور انیمل کے لیے ضروری ہے بلکہ یہ دانتوں کو مضبوط اور پائیدا بھی رکھتا ہے۔ یہ وٹامن مکھن، انڈے کی زردی، مچھلی کے تیل، گاجر آلو، خوبانی، خشک آڑو، مٹر، ٹماٹر، آلو بخارا، شلجم، پالک اور کلیج وغیرہ میں وافر مقدار میں حاصل ہو سکتا ہے۔

وٹامن بی

یہ وٹامن دل کو طاقت بخشنے اور اعصاب کو مضبوط بنا کے ساتھ ساتھ دانتوں کی مضبوطی کا ضامن بھی ہے۔ قابل ذکر بات یہ کہ دانتوں کی پائیداری کا راز ان کی ورزش میں ہے اور یہ ورزش دان کو اس طرح ملتی ہے کہ ہم ان چھنے آٹے اور مکمل غذائیت سے بھرپو آٹے کی روٹی منہ میں کچھ دیر چبا کر کھائیں، اس سے ایک تو وٹامن ب حاصل ہوگا، دوسرے دانتوں کی ورزش ہوگی۔ جسم میں اس وٹامن ک کمی ہو تو قبض، تھکان، بدہضمی، اعصابی کمزوری، لقوہ، امراض چشم جیسی بیماریاں آ پکڑتی ہیں۔ اس لیے اس کی ہمارے جسم کو سخت ضرورت ہے یہ وٹامن دودھ، انڈے، گوشت، تازہ پھلوں، مونگ، سویابین، سر مرچ، بند گوبھی، اناناس، چقندر، لوبیا اور سیب وغیرہ میں پایا جا ہے۔

وٹامن سی:

یہ زیادہ تر ترش چیزوں میں پایا جاتا ہے۔ اس سے محرومی کا نتیجہ سکروی جیسی اذیت ناک بیماریوں کی صورت میں نکلتا ہے جو خاص طور پر مسوڑھوں، دانت کی ہڈی اور خون کی رگوں کی دیواروں کو متاثر کرتی ہے۔ وٹامن سی میسر نہ آنے کی صورت میں

دانت اپنی جگہ سے ہل جاتے ہیں اور ٹوٹنے لگتے ہیں۔ وٹامن سی کی اہمیت مسوڑھوں کے ضمن میں بہت ضروری ہے۔ یہ مسوڑھوں کی سوجن اور پائیوریا کو روکتا ہے۔ اگر دانت بوسیدگی کا شکار ہونے لگیں تو اس کے استعمال سے دانت مزید خراب ہونے سے بچ جائیں گے۔ تاہم بوسیدگی کو روک نہیں سکتا۔ یہ وٹامن سب سے زیادہ لیموں اور سنگترہ میں پایا جاتا ہے۔ باقی غذاؤں میں نارنگی، اسٹابری، آلوچہ امرود، ترش آم، آلو بخارا، انگور وغیرہ میں مل جاتا ہے۔

وٹامن ڈی:

یہ وٹامن عموماً وٹامن 'اے' ہی کی خصوصیات رکھتا ہے اور یہ بھی نہ صرف دانتوں بلکہ جسم کی مضبوطی میں معاون ہوتا ہے۔ اس میں ہمارے جسم میں کیلشیم یعنی چونے کو جذب کرنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے یہ جنین کی پرورش میں مدد دیتا ہے۔ ماہرین نے طویل تجربات کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وٹامن ڈی دانتوں کی کرم زدگی اور بوسیدگی کو روکنے کے لیے مددگار ثابت ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ دانتوں کی پیدائش میں باقاعدگی اور ان کے درمیان متناسبت کا بھی ذمہ دار ہے۔ اگر بچوں میں اس وٹامن کی بہت زیادہ کمی ہو تو ان کے دانت خوب صورت نہیں ہوں گے۔ یعنی کوئی دانت آگے کوئی پیچھے ہوگا اور کوئی ٹیڑھا ہوگا اور پھر ان کے درمیان خلا بھی ناہموار رہے گا۔ وٹامن ڈی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ہڈیوں اور دانتوں میں کیلشیم کو ضائع ہونے نہیں دیتا۔ اس لیے اس وٹامن کو حاملہ عورتوں کے لیے ناگزیر تصور کیا جاتا ہے۔ ماہرین تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر دوران حمل عورت اس وٹامن کی کمی کا شکار رہے۔ تو نہ صرف اس کے اپنے لیے نقصان دہ ہے بلکہ بچّے کے دانت بھی متاثر ہوں گے۔ یہ وٹامن انڈے، دودھ، بادام، ناریل، مکھن، چربی مچھلی کے تیل اور سورج کی روشنی میں پایا جاتا ہے۔

دانتوں کی تندرستی اور مناسب حفاظت کے سلسلے میں سب سے اہم عنصر ہماری روزمرہ خوراک ہے اگر خوراک میں تمام حیاتین، نمکیات اور تھوڑا سا الکلی کا تناسب موجود رہے تو دانت کبھی خراب نہ ہوں عام طور پر لوگ ترش پھلوں سے اس لیے گریز کرتے ہیں کہ ان کے خیال میں ان سے تیزابیت پیدا ہوتی ہے۔ حالاں کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

تیزابیت تو گوشت وغیرہ کھانے سے بھی ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ پروٹین میں گندھک پائی جاتی ہے جو آکسیجن کے کیمیائی عمل سے پیٹ میں سلفیورک ایسڈ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ترش پھل کھانے سے تیزابیت پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ انہضام کے عمل سے گزرنے کے بعد ان کا جوہر اساسیت (Alkalinity) کا حامل ہوتا ہے۔ جسمانی تندرستی اور دانتوں کی تندرستی کے لیے ہر دو نتائج (تیزابیت اور الکائن) کی خوراک کھانا ضروری ہے اس کے برعکس سفید آٹا یا گلوکوز جو اس زمانے کی نعمتیں ہیں جتنی دیر تک ہمارے منہ میں رہیں گی، ہمارے لعاب میں ملتی رہیں گی، اتنا ہی ہمارے دانتوں کو نقصان پہنچائیں گی۔ جب کبھی کوئی میٹھی چیز کھائی جائے تو ایک تو اسے زیادہ دیر تک منہ میں نہ رکھا جائے جیسے ٹافی یا چیونگم کو لے لیں بچے ان کو دیر تک منہ میں رکھ کر چوستے ہیں۔ اس طرح ان کے دانتوں کو دہرا نقصان پہنچتا ہے۔ دوسرا یہ کہ میٹھی چیز کے فوراً بعد منہ کو اچھی طرح صاف کر لیا جائے۔ اگر برش سے دانت صاف کیے جائیں تو زیادہ بہتر ہیں لیکن یہ احتیاط رہے کہ برش اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر کیا جائے، ورنہ مسوڑھوں کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ جن لوگوں کو کھانے یا چائے وغیرہ پینے کے فوراً بعد کلی سے منہ صاف کرنے کی عادت ہوتی ہے، ان کے دانت عام طور پر زیادہ دیر تک محفوظ رہتے ہیں۔

بچّے کی زندگی کے ابتدائی سالوں میں خوراک کے توازن کی طرف پوری توجہ دینی چاہیے۔ بچوں کو فیڈر یا بوتل سے دودھ پلانے کا رواج بھی بچوں کے دانتوں کی بہت سی پیچیدگیوں کا باعث بن سکتا ہے۔ ایک تو دودھ بوتل سے پلانے میں بچّوں کے مسوڑھوں کی ورزش نہیں ہوتی۔ دوسرے چوں کہ اس طرح بچے کے ہونٹوں کو کام نہیں کرنا پڑتا اور نپل کو چوستے وقت اس کے منہ کی حرکت اوپر کی طرف ہوتی ہے۔ اس لیے اس کا دہن تنگ اور تالو اونچا ہو جاتا ہے۔ بچوں کے ابتدائی سالوں میں ان کی عادت کی نگرانی بھی بہت ضروری ہے۔ کیوں کہ بعض عادات کی وجہ سے دانتوں کی پیدائش بے قاعدہ ہو جاتی ہے۔ مثلاً بعض بچوں کو اپنا انگوٹھا یا انگلی کو چوسنے کی عادت ہوتی ہے۔ چوں کہ چوستے وقت بچے منہ کا پورا زور لگا دیتے ہیں۔ اس سے نہ صرف یہ کہ تالو کی ہڈی اور نرم ہڈی پیچھے کو ہو جاتی ہے بلکہ سامنے کے دانت بھی آگے کی طرف نمایاں

یا "اچلویں" ہو جاتے ہیں۔ اس طرح چہرے کی خوبصورتی متاثر ہوتی ہے چوں کہ ہونٹ آپس میں مل نہیں پاتے، اس لیے ناک کی بجائے منہ کے راستے سانس کی تکلیف دہ عادت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس عادت کا ایک غیر معمولی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بعض اوقات ہونٹ اور دہن بدصورت ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً ان بچوں کے دانت بہت متاثر ہوتے ہیں جنھیں ان کی مہربان مائیں سلانے کے لیے یا چپ کرانے کے لیے منہ میں چوسنی دے دیتی ہیں۔ بچوں کے معاملے میں اس سے بڑھ کر دشمنی اور خود غرضی اور کوئی نہیں ہو سکتی چوسنی منہ میں رکھ کر چوسنے والا بچہ بڑا ہو کر کسی بھی چوسنے والی چیز کا شائق رہتا ہے۔ چنانچہ چوسنی چھوٹ جانے کے بعد وہ میٹھی ٹافیاں اور چیونگم کی طرف رجوع کرتا ہے اور انھیں گھنٹوں بڑی رغبت سے منہ میں رکھ کر چوستا ہے۔ اس طرح اس کے دانت بوسیدگی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور وقت سے پہلے گر جاتے ہیں۔

کوئی ماں باپ یہ نہیں چاہتا کہ ان کے بچے یا بچی کے دانت بگڑی ہوئی شکل میں ہوں۔ دانتوں کی بدنمائی کی کچھ وجوہات تو قدرتی ہوتی ہیں، جیسے دہن میں پیدائشی نقص یا تالوی کی غیر فطری پوزیشن یا کسی بیماری کا حملہ وغیرہ اور کچھ وجوہات ماں باپ کی غفلت اور بچوں کی غلط عادات کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ مثلاً زمانۂ حمل کے دوران صحیح قسم کی غذا نہ کھانا، بچے کو دودھ غلط طریقے سے پلانا، بوتل اور فیڈر کا بے تحاشا استعمال، کسی حادثے کے نتیجے میں اگر بچے کا دانت ضائع ہو جائے تو بھی دانتوں کی شکل و صورت پر اثر پڑتا ہے۔ دانتوں کی بدنمائی محض دانتوں تک محدود نہیں۔ یہ بدنمائی انسان کے شخصی حسن کی مجموعی تاثر کو تہس نہس کر ڈالتی ہے اور انسان بعض اوقات احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ جدید ٹکنالوجی نے اس احساس کو بھی کم کر دیا ہے۔ ٹیڑھے میڑھے دانت بالکل سیدھے کیے جا سکتے ہیں۔ مگر ایک تو اس عمل کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ دوسرے یہ طریقہ آرام دہ بھی کم ہے۔ اس طریق کے مطابق دانت کو رگڑ کر میخ کی شکل دی جاتی ہے اور اس کے اوپر سونے یا چاندی کا خول یا ٹوپی چڑھائی جاتی ہے جو ہوا اور روشنی سے سخت ہو جاتی ہے۔ دانت کو اپنی مرضی کے مطابق کوئی بھی شکل دی جا سکتی ہے۔ دانت کی تکمیل کے بعد اسے پالش لگا کر چمکا دیا جاتا ہے۔

ماہرین سب کا اتفاق ہے کہ دانت کی بیماری سب سے خطرناک بیماری نہیں تو کم خطرناک بھی نہیں ہے اس لیے کہ جب اس کے نقصان کا انسان کو علم ہوتا ہے تو یہ اپنا کام کر چکی ہوتی ہیں۔ اس بیماری سے اور کئی بیماریاں جنم لے سکتی ہیں مثلاً انیمیا (کمیٔ خون) اپنڈی سائٹس، خون کی زہرآلودگی، کان، ناک اور گلے کی تکالیف، گردن، اعصاب اور وریدوں کے غدودوں کی سوجن اور ورم، اعصابی درد، ذات الجنب، نمونیا، برونکائٹس، جوڑوں کا درد، پیٹ کا درد، پیٹ اور معدے کا السر، لیکن اس کا مطلب یہ نہ لیا جائے کہ صرف دانتوں کی بیماری کی وجہ سے ان میں سے کوئی بیماری لاحق ہو سکتی ہے اور کئی وجوہ ہو سکتی ہیں لیکن دانت کی بوسیدگی اور بیماری بھی ان میں نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے کیونکہ دانت کی بوسیدگی کے نتیجے میں جو زہریلا مادہ ہر وقت پیدا ہو کر خون میں شامل ہوتا رہتا ہے اس لیے کئی خوفناک عوارض اور پیچیدگیاں رونما ہو سکتی ہیں۔ آج ماہرین اس قسم کی کسی بیماری کی تشخیص کرتے ہیں تو وہ منہ کا معائنہ کرنا بھی نہیں بھولتے۔ کیوں کہ جب تک بنیادی وجہ کا پتہ نہ چلے بیماری کا علاج نہیں ہو سکتا) لیکن اس مقصد کے لیے ضروری نہیں کہ زہریلا مادہ پیدا کرنے والا دانت ہی اکھاڑ پھینکا جائے۔ جدید سائنس کا تقاضہ یہ ہے کہ حتی الوسع بیمار دانت کو بچا لیا جائے۔ اس کی ڈرلنگ اور فلنگ صحیح طریقے سے ہو تو اچھا خاصہ خراب اور بوسیدہ دانت بھی منہ میں برقرار رکھا جا سکتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ نوبت بیماری کے بعد ہی علاج تک کیوں پہنچا جائے۔ کیوں نہ شروع سے ایسی تدابیر اختیار کی جائیں کہ بیماری اور علاج کا مرحلہ ہی نہ آئے۔ بچوں کو اسکول میں داخلے سے بھی پہلے گھر پر بتانا چاہیے کہ ٹوتھ برش کرنا ضروری ہے۔ تاکہ بچہ دانتوں کی صفائی کا عادی ہو جائے اور پھر محض دانتوں پر ہی نہیں بلکہ مسوڑھوں اور زبان کی تھوڑی سی ورزش اور صفائی کے لیے بھی برش کرنا ضروری ہے۔ کوئی بھی ٹوتھ پیسٹ ہو ٹھیک ہے، بشرطیکہ اس کا ذائقہ ترش نہ ہو۔ فلورائیڈ ٹوتھ پیسٹوں کو بہت مشتہر کیا جاتا ہے لیکن ماہرین کے نزدیک فلورائیڈ الٹا نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ دانتوں پر زرد یا سیاہ رنگ کا میل کبھی نہ جمنے دیا جائے، ورنہ وہ پائیوریا کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ زیادہ تر جراثیم کش ماؤتھ واش بھی استعمال نہ کریں۔ کیوں کہ یہ مسوڑھوں کو متاثر کرتی ہے۔ سب سے آخری اور اہم بات یہ کہ غذا نرم نہ ہو بلکہ سخت ہو تاکہ چبانے سے دانتوں کی ورزش ہوتی رہے۔

اتر پردیش میں جونیر ہائی اسکول بورڈ امتحان ۱۹۸۷ء کے نتائج پر اب تک

۵۷ اسکولوں میں ۲۵۸ شیروانی انعامات ۱۹۸۷ء

احمد رشید شیروانی

اگست کے اخیر میں ہمارے پاس اتر پردیش کے جن جونیر ہائی اسکولوں سے بورڈ امتحان ۱۹۸۷ء کے نتائج آئے، ان کے منتخب ہونہار ترین طلباء و طالبات کو الحاج بیگم تارا رشید شیروانی (چیرمین بھارت سیوا ٹرسٹ، چیرمین جیپ انڈسٹریل سنڈیکیٹ لمیٹڈ اور منیجنگ ڈائرکٹر شیروانی شوگر سنڈیکیٹ لمیٹڈ) کی طرف سے دلی دعاؤں کے ساتھ انعامات بھیجے گئے۔ پچاس اسکولوں میں ایک سو بیاسی انعامات کی بابت رپورٹیں پہلے ہی جاری ہو چکی ہیں۔ اب مزید پچیس اسکولوں میں انعامات جیتنے والے چھہتر ہونہار طلباء و طالبات کے نام پیش ہیں۔ ان کو ملا کر یو۔پی کے پچہتر جونیر ہائی اسکولوں میں شیروانی انعامات ۱۹۸۷ء جیتنے والے بچوں کی تعداد دو سو اٹھاون ہو گئی۔

صلاح پور بوائز جونیر ہائی اسکول ضلع الٰہ آباد

۱۔ محمد طاہر سلمہٗ ۲۔ خوش الحان سلمہٗ ۳۔ اشفاق محمد سلمہٗ ۴۔ ارشاد حسین سلمہٗ ۵۔ محمد ذاکر سلمہٗ ۶۔ محمد حامد سلمہٗ ۷۔ قیوم احمد سلمہٗ ۸۔ رشید احمد سلمہٗ

مسلم رحمانیہ جونیر ہائی اسکول راجہ کا تاجپور ضلع بجنور

۱۔ محمد عارف سلمہٗ ۲۔ محمد اکرم سلمہٗ ۳۔ کماری خدیجہ خاتون سلمہا۔ ۴۔ وقار احمد سلمہٗ ۵۔ کماری گلستاں پروین سلمہا۔

مسلم گرلز جونیر ہائی اسکول۔ مراد آباد۔

۱۔ کماری صفیہ پروین سلمہا۔ ۲۔ کماری شمع ظفر سلمہا ۳۔ کماری نازش فرحت سلمہا۔ ۴۔ کماری ثریا سلمہا ۵۔ کماری رخسانہ بیگ سلمہا۔

سید بدیع الدین جونیر ہائی اسکول۔ بشن پور مٹھوا ضلع

۱۔ گریش کمار سلمہٗ ۲۔ رام کرشن سلمہٗ ۳۔ محمد عفان خاں ۴۔ شکیل شاہ سلمہٗ۔

نشاط جونیر ہائی اسکول۔ سوائے تروین سنبھل، ضلع مراد آباد

۱۔ کماری فرزانہ بی سلمہا ۲۔ کماری عظیمہ شہناز سلمہا ۳۔ کماری فرزانہ تبسم سلمہا۔

انجمن اسلامیہ گرلز جونیر ہائی اسکول۔ ہلدوانی ضلع نینی تال

۱۔ کماری عذرا جمال سلمہا ۲۔ کماری ناظرین سلمانی سلمہا ۳۔ کماری عشرت جہاں سلمہا۔

اسلامیہ جونیر ہائی اسکول۔ درگا گنج ضلع پرتاپ گڑھ

۱۔ معین الدین سلمہٗ ۲۔ شو بہادر سلمہٗ ۳۔ بسنت لال سلمہٗ۔

قاسمیہ عربیہ اسلامیہ جونیر ہائی اسکول ضلع بلند شہر

۱۔ کنور ساجد علی سلمہٗ ۲۔ محمد عرفان سلمہٗ ۳۔ مشتاق احمد سلمہٗ۔

۱۲۔ اے۔ کناٹ پلیس — نئی دہلی

نورحق جونیر ہائی اسکول - مبارکپور
ضلع فیض آباد

(۱) کماری ساجدہ خاتون سلمہا - (۲) کماری نسرین جہاں سلمہا (۳) کماری شبنم جہاں سلمہا -

زیب النساء نسواں جونیر ہائی اسکول
بلتھرا روڈ - ضلع بلیا -

(۱) کماری غزالہ پروین سلمہا - (۲) کماری توحید فاطمہ سلمہا (۳) کماری شانتی سلمہا -

مسلم گرلز جونیر ہائی اسکول بجنور

(۱) کماری نسرین فاطمہ سلمہا (۲) کماری اسما خاتون سلمہا (۳) کماری تبسم فاطمہ سلمہا -

محمدیہ بنکر نسواں جونیر ہائی اسکول - کانپور

(۱) کماری مہ لقا رد شی سلمہا (۲) کماری جمیلہ خاتون سلمہا (۳) کماری غزالہ پروین -

جنت نشاں جونیر ہائی اسکول - بریلی

(۱) کامران خاں سلمہ (۲) محمد شاکر سلمہ (۳) شاہد حسین سلمہ -

جامع العلوم جونیر ہائی اسکول - کماتولی
ضلع مظفر نگر

(۱) ذاکر حسین راٹھور سلمہ (۲) محمد اسلم سلمہ (۳) محمد دلشاد سلمہ -

سوتنتر سلمانیہ آدرش جونیر ہائی اسکول
اتراسی کلاں - ضلع مراد آباد -

(۱) شوردیر سنگھ سلمہ (۲) مبین احمد سلمہ (۳) واحد علی سلمہ -

مرکزی درسگاہ اسلامی جونیر ہائی اسکول - رامپور

(۱) عبدالحفیظ سلمہ (۲) محمد اعجاز اسلم سلمہ (۳) حفیظ احمد سلمہ -

مسلم جونیر ہائی اسکول تمبور - ضلع سیتاپور

(۱) صفی الدین سلمہ (۲) جلال الدین سلمہ (۳) محمد سلیم سلمہ -

بنات القریش گرلز جونیر ہائی اسکول - مراد آباد

(۱) کماری عظمت آرا سلمہا - (۲) کماری عظمی سلمہا - (۳) کماری کوثر جہاں سلمہا -

عاصم بہاری گرلز جونیر ہائی اسکول - مراد آباد

(۱) کماری ذی شان اختر سلمہا (۲) کماری شائستہ پروین سلمہا (۳) کماری مین آرا سلمہا -

جنت نشاں گرلز جونیر ہائی اسکول - مراد آباد

(۱) کماری عائشہ بانو سلمہا - (۲) کماری رضیہ خانم سلمہا - (۳) کماری لیئق النساء سلمہا -

راحت مولائی گرلز جونیر ہائی اسکول - مراد آباد

(۱) کماری شہلا تبسم سلمہا - (۲) کماری رعنا جمال سلمہا -

سینیر بیسک اسکول - سرائے ترین - سنبھل
مراد آباد -

(۱) افروز خاں سلمہ

مونس مسلم گرلز جونیر ہائی اسکول مراد آباد

(۱) کماری روما قمر سلمہا -

فلاح دارین ہائر سکنڈری اسکول - مراد آباد
(جونیر سیکشن) (۱) ابرار حسین سلمہ

مسلم راجپوت جونیر ہائی اسکول - ملابت نگر گنگاولی
ضلع بلند شہر

(۱) عامل خاں سلمہ -

پہلے بیس جونیر ہائی اسکولوں میں سے ہر ایک میں تین یا اس سے زیادہ فرسٹ ڈویژن ہیں - عموماً تین تین ہونہار بچوں کو انعامات بھیجے گئے - راحت مولائی اسکول میں دو فرسٹ ڈویژن ہیں - سینیر بیسک اسکول میں ایک اور آخری تین میں کوئی فرسٹ ڈویژن نہیں تو سکنڈ ڈویژن میں ٹاپ کرنے والے کے لیے انعام بھیجا گیا -

یوپی کے جن مسلم جونیر ہائی اسکولوں سے ابھی تک ۱۹۸۶ء کے رزلٹ نہیں بھیجے گئے، براہ کرم اب جلد از جلد بھیج دیے جائیں -

آدابِ اختلاف

قیصر روم نے حضرت امیر معاویہؓ کو خط لکھا تھا کہ تم کو حضرت علیؓ نے ستا رکھا ہے۔ تمہاری مدد کے لیے میں فوج بھیج دوں۔ اس پر حضرت امیر معاویہؓ نے اس کو لکھا کہ

"اے نصرانی کتے! میرے اور علیؓ کے درمیان جو اختلاف ہے تو اس سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے۔ یاد رکھ اگر تو نے علیؓ کی طرف ترچھی نگاہ سے دیکھا تو سب سے پہلے علیؓ کے لشکر کا سپاہی بن کر تیری آنکھیں پھوڑ دینے والا معاویہ ہوگا۔"

ایک بار مولانا الیاسؒ ایک میواتی پر تبلیغ کر رہے تھے۔ وہ بگڑ گیا اور آپ کے ایک گھونسہ مار دیا۔ مولانا دبلے اور کمزور آدمی تھے۔ گھونسے کی تاب نہ لاکر زمین پر گر پڑے کچھ دیر بعد جب ان کے حواس بجا ہوئے تو وہ گرد جھاڑ کر اُٹھے اور میواتی کا دامن پکڑ لیا اور کہا:

"اچھا تم تو اپنا کام کر چکے، اب میری سنو"

یہ دیکھ کر میواتی آپ کے قدموں پر گر پڑا اور بولا:

"مولوی مجھے معاف کر، ورنہ بخشش نہ ہوگی۔"

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ پرنٹر پبلشر: اسرار احمد۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق ایڈمنسٹریشن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ پریس: ایس کے۔ آفسیٹ پریس۔ دہلی۔

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY,

ALIGARH

ADMISSION NOTICE No. III

SESSION—1988-89

Applications for admission to Senior Secondary School Certificate Course (Class XI, under 10+2 system) for the session 1988-89, are invited from the eligiblee candidates.

The details of the courses, minimum eligibility requirement, rules for admission etc. are notified in Guide to Admission No. I. Application form and Guide to Admission can be obtained from the Deputy Controller (Admissions), Post Box No. 52, Aligarh Muslim University, Aligarh-202001 on payment of Rs. 12/- in cash or through a crossed Indian Postal Order drawn in favour of the Finance Officer. A.M.U. Aligarh. Candidates desirous of getting application form by post should send a self-addressed envelope of (9"x6" sizee) affixing stamps worth Rs. 3/80 for one single application form. In case the application form is required to be sent by Registered Post,

stamps warth Rs. 8/50 should be affixed on self-addressed envelope. If more than one application forms are required, separate stamped envelope should be sent with the requisition. Request for application forms (desired to be sent through post) shall not be entertained if received in this office after 8.7.1988.

Application form and the relevant information may be obtained, in the manner prescribed above.

Application forms complete in all respects and accompanied by the registration fee, at the rate of Rs. 5/- for each additional choice over and above the two combinations of subjects (non-refundable) through the crossed Indian Postal Order, payable to the Finance Officer, A.M U. Aligarh, should reach the Deputy Controller (Admissions), Post Box No. 52, Aligarh Muslim University, Aligarh-202001, before 5.00 P.M. on or before 15.7 1988. No late applications will be entertained.

(N. Moideen)
Controller of Exams. & Admissions

62/159

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY,
ALIGARH.

ADMISSION NOTICE No. V

SESSION—1988-89

Applications on prescribed forms are invited from eligible candidates for admission to the following courses for the session 1988-89. The last date for receipt of completed application forms in the Admission Office of the University is mentioned against each courses. Wherever the eligibility requirement for a course is prescribed as B.A./B Sc./B.Com /B.Sc (Ag.) etc., it means that the respective degree should have been obtained under 10 + 2 + 3 system of education. Those who hold a bachelor's degree under 10 + 1 + 3 or 10 + 2 + 2 system of eduation will therefore, not be considered eligible for the concerned course.

S. No.	Name of the Course	Last date for receipt of applications
1—	**B. A. (Hons.)/B.Sc. (Hons.)/B.Com. (Hons.)** Part-I of the three year degree course in the Faculties of Arts, Social Sciences, Science, Life Sciences, and Commerce.	7.7.1988

(a) M. A. (Faculty of Arts) :
Arabic/English/Fine Art/Hindi/Linguistics Malayalam/ Persian/ Philosophy/ Sanskrit/ Urdu

(b) M. A. (Faculty of Social Sciences) :
Economics/ Education/ History/ Islamic Studies/Political Science/Public Administration/Psychology/Sociology

(c) M. Sc. (Faculty of Science) :
Chemistry/Geography/Geology/Geophysics/Mathematics/Operations Research/ Physics/Statistics

(d) M. Sc. (Faculty of Life Sciences) :
Biochemistry/Botany/Wild Life/Zoology

(e) M. Sc. (Agriculture) (Centre of Agriculture) :
Entomology/Land Use and Water Management/ Microbiology/ Nematology/ Plant Pathology

(f) Faculty of Commerce :

(i) M. Com.

(ii) Diploma in Bank Administration (DBA)

(iii) Diploma in Secretarial Work (DSW)

(g) Faculty of Theology:

(i) Bachelor of Theology (B. Th.)

(ii) Master of Theology (M. Th.)

(h) Faculty of Law :

(i) LL.B. (Hons.)

(ii) LL.M.

22-7-1988

(i) **Centre of Professional Courses :**

Diploma in Professional courses :

(a) Electronics Data Processing and Machine Operation
(b) Pest Management
(c) Museology
(d) Company Law, Banking & Insurance
(e) Labour Law & Labour Relations
(f) Criminology & Criminal Administration
(g) Lab. Technology (Physical & Chemical)
(h) Gem Testing & Art of Lapidary.
(i) Medical Lab Technology (Radiology)
(j) Journalism
(k) Applied Art
(l) Instrument Technology
(m) Medical Lab Technology (Clinical Pathology)
(n) Cartography
(o) Orthcptics
(p) Piscioulture
(q) Certificate in Dental Hygiene

The details of the courses, minimum eligibility requirement, rules for admission etc. Are notified in Guide to Admission No 2. Application form and Guide to Admission can be obtained from the Deputy Controller (Admissions), Post Box No. 52, Aligarh Muslim University, Aligarh-202001 by post on payment of Rs. 12/- (covering the cost of application form and registration fee upto two choices), through crossed Indian Postal Order drawn in favour of the Finance Officer, A.M.U. Aligarh, along with a self-addressed envelope of 9"X6" size affixing stamps worth Rs. 5/80 for one single application form. In case the application form is desired to be sent by Registered Post,

stamps worth Rs. 10/80 should be affixed on the self-addressed envelope. If more than one application forms are required, separate envlope should be sent with the requisition. Request for application forms (desired to be sent through post) shall be entertained only if received in this Office at least a week before the last date prescribed for receipt of application forms.

Application form and the relevant information may be obtained, in the manner prescribed above, or on payment of Rs. 12/- in cash, from the following Regional Information and Guidance Centres also.

1. Mr Abid Ali Khan
   Editor,
   Siyasat Daily,
   Hyderabad-500001

2. Professor (Dr.) U. Mohammad
   "Baithul Hamd", 10-Zakariah Avenue,
   Egmore,
   Madras-600008

3. Dr. Mumtaz Ahmad Khan
   Ghosia Industrial & Engg. Trust,
   Hosur Road,
   Bangalore-560029

4. Mr. K. Abdul Rasheed
   General Secretary
   A.M.U. Old Boy's Association,
   Alfa Travels, Alakapuri Building,
   Callcut-672002

5. Dr. A.U. Sheikh I.A. S. (Retd.)
   Chairman, The Shad Adam Shaikh Trust,
   11, 'Lalit', Wodehouse Road,
   Bombay-400839

6. Dr. Maqbool Ahmad
Hony Sr. Visiting Surgeon & Professor,
9, Rippen Street,
Calcutta-700016

7. Mr. Shoeb Usman
Rahat Manzil,
Lakhtokia,
Guwahati-781001

8. Mr. Nasseer Ahmad
Secretary, Students Affairs,
Islamic Study Circle,
Auqaf Building, Badshah Chowk,
Srinagar-190001

SUBMISSION OF APPLICATION FORM :

(a) Women Candidates :

External women candidates for admission to B. A. (Hons.) (Arts and Social Sciences) and B. Sc (Hons.) (Science and Life Sciences) Courses should send their applications, complete in all respects, supported by the required documents including the attested copy of mark list of the qualifying examination, as well as the registration fee for additional choice' if any, to the Principal, Women's College, Aligarh Muslim University, Aligarh-202001 by the specified date.

External women candidates for admission to B. Com. (Hons.) post-graduate and other courses are required to submit their applications complete in an all respects, alongwith the documents including attested copy of the mark list of the qualifying examination and the requisite fee for additional choice, if any, to the Deputy Controller (Admissions), Post Box No. 52, Aligarh Muslim University, Aligarh-202001, by the specified date.

(b) Internal Candidates :

All Internal candidates should submit their applications complete in all respects, supported by the required documents

including the attested copy of the mark list of the qualifying examination, as well as the registration fee for additional choice, if any, to the Office of the Provost concerned, at least two days before the last date for receipt of application.

(c) **Others :**

Rest of the candidates are required to submit their applications, complete in all respects, supported by the required documents including attested copy of the mark list of the qualifying examination as well as the registration fee for additional choice, if any, to the Deputy Controller (Admissions), Post Box No. 52, Aligarh Muslim University, Aligarh-202001 by the specified date.

Incomplete applications or those received late will not be accepted, and no further correspondence will be entertained regarding such applications.

(N. Moideen)
Controller of Exams. & Admissions

124/240

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

شمارہ

جلد

جولائی ۸۸

سرپرست : جناب سید ہاشم علی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

ایڈیٹر : اسرار احمد ——— جوائنٹ ایڈیٹر : کبیر احمد جائسی

اسسٹنٹ ایڈیٹر : شباب الدین

تزئین : سوفراز ——— انچارج سرکولیشن : مستقیم احمد

ترسیل زر کا پتہ :

ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

Editor : TAHZIBUL AKHLAQ & NISHANT.

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

زر سالانہ

انڈیا RS. 30.00

بیرونی ممالک US $ 20.00 ہوائی ڈاک

US $ 8.00 عام ڈاک

مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی

ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

- انڈیا -

مندرجات

[تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہرحال اُن سے متفق ہو]

اداریہ

آٹھ سو سترہ (۸۱۷) میں صرف تیرہ (۱۳) ——— دو فیصد سے بھی کم۔ یہ ہے سنٹرل سروسز میں اس سال منتخب ہونے والے مسلمانوں کی تعداد۔ اس تعداد کو دیکھیے، ملک کی آبادی میں مسلمانوں کے تناسب کو سامنے رکھیے اور ماتم کیجیے۔ اس پر ستم یہ کہ یہ کوئی اتفاقی امر نہیں۔ کم و بیش یہی صورت حال پچھلے سال تھی اور اس سے پچھلے سال بھی۔ اس محاذ پر ناکامی و نامرادی کا ایک سلسلہ ہے جو برسوں سے چلا آرہا ہے۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ گورنمنٹ کو اس مسئلے کی سنگینی کا اتنا احساس نہیں جتنا کہ اس کا تقاضا ہے۔ سرکاری حلقوں سے اس خواہش کا اظہار تو بار بار ہوتا ہے کہ سنٹرل سروسز میں مسلمانوں کا تناسب بڑھنا چاہیے مگر اس بابت ابھی تک کوئی نتیجہ خیز عملی منصوبہ سامنے نہیں آیا۔ اگر گورنمنٹ یہ سمجھتی ہے کہ ایک معاشی طور پر بدحال اور تعلیم میں پسماندہ اقلیت کے نوجوانوں کے لیے چند کوچنگ سنٹر قایم کرکے وہ اس سنگین مسئلے کو حل کر لے گی تو اس خام خیالی پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

اس سے زیادہ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ مسلم لیڈر شپ چاہے وہ کسی بھی طبقۂ فکر سے تعلق رکھتی ہو اس مسئلہ پر تقریباً خاموش ہے ایک دو ایسے بیانات دے کر جن میں الزام تراشی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ فرض ادا ہوگیا۔ اس مسئلے کا حل ڈھونڈھ نکالنے کی بات تو دور کی ہے شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ مسلمان لیڈروں نے سر جوڑ کر اس مسئلے کے بنیادی اسباب پر غور و فکر کیا ہو۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ ہے کہ زیادہ تر لیڈروں کو "نعرۂ تکبیر۔ اللہ اکبر" قسم کے مسائل کی کشش اس طرف متوجہ ہی نہیں ہونے دیتی۔

ہمارے نزدیک سنٹرل سروسز میں آبادی کے لحاظ سے مسلمانوں کا کم ہونا ایک اہم مسئلہ ہے۔ اس لیے نہیں کہ کسی اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہونے کو ہم انسان کے کمال کی معراج سمجھتے ہیں اور اس معراج تک ہر سال چند دہائی مسلمانوں کے نہ پہنچنے سے ہمیں رنج ہوتا ہے۔ اس لیے بھی نہیں کہ اس سروس سے جو گلیمر وابستہ ہے اسے دوسروں کی قسمت کے خانے میں دیکھ کر ہم حسد میں مبتلا ہیں، بلکہ اس لیے کہ جب تک سرکاری مشینری میں مناسب تعداد میں ایسے افراد نہ ہوں گے جنھیں مسلمانوں کے معاشی، سماجی اور تعلیمی مسائل اور مختلف معاملات میں مسلمانوں کے احساسات سے براہ راست واقفیت ہو اس وقت تک ملک کی مسلم اقلیت کی فلاح و بہبود اور اس کی ترقی کا کوئی بھی منصوبہ خاطر خواہ طور پر انجام نہیں پاسکتا اور اس لیے بھی کہ سرکاری مشینری میں مسلمانوں کی متناسب نمائندگی سے مسلم اقلیت اور گورنمنٹ کے درمیان شک و شبہ کی جو دھند چھا رہی ہے وہ دور ہوگی جس سے ملک کی سب سے بڑی اقلیت کا گورنمنٹ میں اعتماد بحال ہوگا۔

بعض حلقوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ سنٹرل سروسز میں مسلمانوں کے کم منتخب ہونے کی ایک بڑی وجہ مسلمانوں کے خلاف تعصب ہے۔ ہم اس خیال سے اتفاق نہیں کرتے۔ باوجودیکہ اس قسم کے تعصب کی کارفرمائیاں بسا اوقات ہمارے سامنے بھی

آتی ہیں۔ اتفاق نہ کرنے کے دو اسباب ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ عصری تعلیم کے میدان میں ہندوستانی مسلمان کافی پیچھے ہیں۔ وجہ چاہے جو بھی ہو یہ ایک حقیقت ہے کہ آزادی کے بعد سے مسلمان عصری تعلیم کے میدان میں اکثریتی فرقے کے مقابلے میں رفتہ رفتہ کافی پیچھے ہو گئے ہیں ظاہر ہے کہ اگر عصری تعلیم میں مسلمانوں کا تناسب ملک میں ان کی آبادی کے تناسب سے کم ہوگا، جیسا کہ ہے، تو مقابلہ جاتی امتحانات میں شریک اور کامیاب ہونے والے مسلمانوں کا تناسب بھی کم ہی ہوگا۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ بالعموم مسلم نوجوان علم کے میدان میں سخت محنت سے کتراتے ہیں جب کہ اعلیٰ سطح کے مقابلہ جاتی امتحانات میں محنت، ریاضت اور لگن کامیابی کی پہلی شرط ہے۔ یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ مسلمان مشکل مضامین کو پڑھنے اور اعلیٰ سطح کے مقابلہ جاتی امتحانات میں شریک ہونے سے گریز کرتے ہیں اور اگر کسی وجہ سے وہ اس سمت قدم اٹھاتے بھی ہیں تو خاطر خواہ محنت نہیں کرتے۔ یہاں ایک مثال پیش کرنا مناسب ہوگا۔ سائنس کے ایک اہم مگر مشکل مضمون فزکس میں شمالی ہند کے مسلم تعلیمی اداروں میں سوائے مسلم یونیورسٹی کے ایم۔ ایس سی میں مسلم طلبا کا تناسب بالعموم ۲۵ فیصد سے کم ہی پایا جاتا ہے اور مسلم یونیورسٹی میں بھی یہ تناسب پچاس فیصد سے زیادہ شاید ہی کبھی ہوا ہو۔

ان حقایق کے پیش نظر اگر ہم سنٹرل سروسز میں مسلمانوں کے تناسب کو بڑھتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں تو کرنے کا کام یہ ہے کہ منصوبہ بند طور پر مسلمانوں میں عصری تعلیم کو فروغ دیا جائے۔ مسلم تعلیمی اداروں میں تعلیم کا معیار بلند کیا جائے، ایسے وسائل فراہم کیے جائیں جن سے غریب مگر باصلاحیت طلباء کی مدد ہو سکے اور نوجوانوں کو یہ ترغیب دی جائے کہ وہ محنت، ریاضت اور لگن کی راہ کو اپنائیں۔ یہ کام کسی اور کا نہیں خود ہمارا ہے اور اسے ہمیں ہی کرنا ہے۔

اسرار احمد

مکتوب شیخ الجامعہ

مسلم یونیورسٹی کے طلبا کے نام

Aligarh Muslim University

OFFICE OF THE VICE CHANCELLOR
UNIVERSITY ROAD ALIGARH-202001
TELEPHONE OFF: 3994 RES 3173 TLX 564-230 CEA-IN

SYED HASHIM ALI
VICE CHANCELLOR

میرے عزیز طلبا

دعائیں

یہ شمارہ جس وقت آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گا یونیورسٹی میں داخلے کی ہماہمی شروع ہو چکی ہوگی۔ آپ میں سے جن طلبا نے گزشتہ سال اپنے وقت کا صحیح استعمال کیا ہوگا، خود کو فتنہ و فساد سے دور رکھا ہوگا، محنت اور لگن سے امتحان کی تیاری کی ہوگی انھوں نے گزشتہ امتحان میں یقیناً اچھے نمبر حاصل کیے ہوں گے اور اس لیے امید ہے کہ وہ اپنے مطلوبہ مضامین میں بہ آسانی داخلہ لے سکیں گے۔ اس کے برخلاف جنھوں نے پڑھائی کی طرف سے لاپرواہی برتی ہوگی، محنت اور لگن سے امتحان کی تیاری نہ کی ہوگی وہ مطلوبہ معیار پر پورا نہ اترنے کے باعث داخلے کے لیے پریشان دوڑ دھوپ کر رہے ہوں گے۔ وہ اس اندیشے میں مبتلا ہوں گے کہ معلوم نہیں کہ انہیں داخلہ ملتا بھی ہے یا نہیں ـــــ کاش اس صورت حال کا احساس انھیں پہلے ہی ہوا ہوتا۔

داخلے کے زمانے کی ہماہمی اور دوڑ دھوپ صرف ہماری ہی یونیورسٹی کا خاصہ نہیں۔ تعلیم کے روز افزوں پھیلاؤ کی وجہ سے یہ ملک کے ہر معیاری تعلیمی ادارے میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ البتہ ایک بات ایسی ہے جس کی نظیر اس یونیورسٹی کے علاوہ شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ یہ ہے داخلے کے زمانے میں بے بنیاد افواہوں کا سلسلہ ـــــ ایسی افواہیں جن کا سر نہ پیر۔ کبھی یہ خبر پھیلے گی کہ امسال سائنس فیکلٹی کے داخلوں میں مسلم طلبا کا تناسب بہت کم ہے تو کبھی یہ کہ انجینئرنگ کالج میں گزشتہ سالوں کے مقابلے میں مسلمان طلبا کو کم داخلہ ملا۔ کبھی یہ افواہ اڑے گی کہ ایک بڑے اچھے نمبر حاصل کرنے والے مسلمان لڑکے کو داخلے سے محروم کر دیا گیا تو کبھی یہ کہ ڈپلوما انجینئرنگ کے داخلے کی لسٹ میں مسلمانوں کے نام خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ اس قسم کی بے بنیاد افواہوں کا سلسلہ اسی دور میں شروع ہوا ہو بلکہ یہ مدتوں سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ یونیورسٹی میں اصلاحی اقدامات کرنے اور یہاں کے طلبا کے مستقبل کو درخشاں بنانے کی کوشش کرنے والے ہر

وائس چانسلر کو کم و بیش اس قسم کی بے بنیاد افواہوں کے تیر کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔ اس پر ستم یہ کہ ان افواہوں کو مزید چاشنی دینے کے لیے اکثر یہ بھی کہا جاتا رہا ہے کہ وائس چانسلر یہ سب کچھ گورنمنٹ کو خوش کرنے کے لیے کر رہا ہے۔ تاکہ یہاں سے سبکدوشی کے بعد گورنمنٹ اسے کسی صوبے کا گورنر یا کسی ملک کا سفیر بنا دے ______ حیرت اس پر ہے کہ پڑھے لکھے لوگ دلوں کا حال جان لینے والی خدائی صفت کا مظاہرہ کرنے والے ان افواہ گروں کی باتوں کو قابلِ اعتنا کیسے سمجھتے ہیں۔

یہ افواہیں کون لوگ پھیلاتے ہیں اور اس کے پس پردہ مقامی یا ملکی سطح کی کونسی اغراض ہیں ان کی نشاندہی گو ناممکن نہیں مشکل ضرور ہے۔ اس پر وقت صرف کرنا تضیع اوقات ہوگا۔ یاد رکھنے والی بات صرف یہ ہے کہ جو کوئی بھی ایسی بے بنیاد خبر پھیلانے جیسی قبیح حرکت کرتا ہے وہ آپ کا اور آپ کی مادر علمی کا دشمن ہے وہ اپنے کسی ذاتی مفاد کے ہاتھوں آپ کی مادرِ علمی کے روشن چہرے کو داغدار بنانا چاہتا ہے۔ آپ ایسے تمام لوگوں سے ہوشیار رہیں، چاہے وہ آپ کے سامنے سراپا درد ملت ہی بن کر کیوں نہ آئیں۔

میں گزارش کروں گا کہ جب کبھی ایسی کوئی خبر آپ تک پہنچے تو آپ کلام پاک کی درج ذیل ہدایت کو سامنے رکھیں،

"اے ایمان والو! اگر کوئی شریر آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو خوب تحقیق کر لیا کرو۔ کبھی کسی قوم کو نادانی سے کوئی ضرر نہ پہنچا دو، پھر اپنے کیے پر پچھتانا پڑے۔"

(الحجرات ۱ : ٦)

متعلقہ افراد یا مجھ سے اس کی بابت تحقیق کر لیں۔ آپ یہ پائیں گے کہ وہ خبر بے بنیاد ہوگی۔

اس موقع پر میں آپ کو یہ یاد دلانا چاہوں گا کہ یہ دور محنت، جفاکشی اور سخت مقابلے کا ہے۔ جسے دیکھیے اپنی منزل مقصود کی طرف دوڑ رہا ہے۔ ایسے میں ذرا سی تساہلی، ذرا سی آرام طلبی، ذرا سی لاپرواہی اور ذرا سی کوتاہی بھی آپ کو منزل مقصود سے ہمیشہ کے لیے دور کر سکتی ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ آپکے والدین نے آپ کو یہاں تعلیم حاصل کرنے اور ایک مہذب انسان بننے کے لیے بھیجا ہے۔ وہ اس کمر توڑ گرانی میں نہ جانے اپنی کتنی جائز خواہشات کو قربان کر کے آپ کے تعلیمی اخراجات کے بوجھ کو اس امید پر برداشت کر رہے ہیں کہ آپ یہاں سے ایک کامیاب انسان بن کر نکلیں گے۔ کیا آپ پر یہ فرض نہیں کہ آپ ان کی توقعات پر پورے اتریں؟

آپ کو علم ہوگا کہ کچھ دنوں پہلے انجینئرنگ کالج کے طلبا نے اسٹرائک کی تھی جو ایک عرصے تک جاری رہی بات صرف اتنی سی تھی کہ جب ہم پر یہ واضح ہوا کہ کالج میں رائج گریڈنگ سسٹم میں چند ایسی خامیاں ہیں جن کی وجہ سے وہاں کے فارغین کی امپلائمنٹ مارکیٹ میں وہ قدر و قیمت نہ ہوگی جو کہ ہونی چاہیے تو ہم نے وہاں کے اساتذہ کے مشورے سے اس گریڈنگ سسٹم کی خامیوں کو دور کیا اور اس کے نفاذ کا اعلان کر دیا۔ ہمارا یہ اصلاحی قدم اسٹرائک کا بہانہ بن گیا۔ ہم نے بڑی کوشش کی کہ اسٹرائک جلد ختم ہو جائے۔ تاکہ تعلیم کا نقصان نہ ہو۔ طلبا کے نقطۂ نگاہ کو سمجھنے کے لیے ہم نے ان سے بار بار گفتگو کی اور جہاں تک ممکن تھا ان کی باتوں کو مان بھی

لیا مگر چند ناعاقبت اندیشوں کی وجہ سے معاملہ طول پکڑ تا گیا۔ مجبوراً ہمیں چند سخت اقدامات کرنے کا اعلان کرنا پڑا۔ خدا کا شکر ہے شر پسندوں کی نہ چلی اور معاملہ سلجھ گیا۔ طلباء نے اسٹرائک ختم کر دی۔ ان کے اس مثبت رویے سے ہمیں بڑی تقویت ملی۔ یہ دیکھ کر ہمیں بڑی خوشی ہوئی کہ وہاں کے طلبا کی ایک بڑی اکثریت تعلیم اور اپنے مستقبل کی بابت سنجیدہ ہے۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس اصلاح شدہ گریڈنگ سسٹم کے نفاذ سے ہمارا کونسا ذاتی مفاد وابستہ ہو سکتا ہے۔ اس کا واحد مقصد کالج کی اسناد کو ملک میں زیادہ باوقار بنانا ہے اور یہاں کے فارغین کی قدر و قیمت کو بڑھانا ہے۔ ہمارے لیے یہ بڑا آسان تھا کہ ہم طلبا کے مطالبے کو مان لیتے اور اپنے نام کا زندہ باد کا نعرہ لگوا لیتے۔ ایک بڑی درد سری اور پریشانی سے بچ جاتے۔ لیکن ہمارے ضمیر نے یہ گوارا نہ کیا کہ چند ناعاقبت اندیشوں کے شر سے بچنے کے لیے ہزاروں نوجوانوں کو ایک بہتر مستقبل سے محروم ہونے دیں۔ اول دن سے ہی ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ یہاں کی ہر فیکلٹی میں تعلیم کا معیار بلند تر ہو تاکہ یہاں سے فارغ طلبا ترقی کی دوڑ میں دوسروں سے پیچھے نہ رہیں۔ ایسی کوشش کرنا ہمارا فرض ہے اور کسی قسم کا اندیشہ ہمیں اس فرض کی ادائیگی سے روک نہیں سکتا۔

ہماری دعا ہے کہ خدا آپ کو اعلیٰ درجے کی کامیابیوں سے نوازے، آپ یہاں سے ایک کامیاب و کامران انسان بن کر نکلیں اور جہاں بھی جائیں اپنی مادر علمی کا نام روشن کرتے رہیں۔

دعا گو

اشرف

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۷ - ش ۷ - (جولائی ۸۸ء)

فیض میموریل لکچر

کائنات، سائنس اور ٹیکنالوجی

عبد السلام*

فیض میموریل لکچر دینے کے لیے مدعو کرکے بیگم ہاشمی صاحبہ نے میری بڑی ہمت افزائی فرمائی۔ اس نوازش کے لیے میں ان کا انتہائی شکر گزار ہوں۔

یورپ کے میرے حلقۂ احباب میں یہ خبر پھیلی تو زیادہ تر دوستوں نے تعجب کیا۔ کیوں کہ فیض ایک عظیم شاعر تھے اور یہ عاجز ایک کم مایہ سائنس داں ہے، لیکن سائنس داں حسن و جمال سے بے پروا نہیں ہوتا۔ لاہور میں پیدا ہونے والے نوبل انعام یافتہ پروفیسر چندر شیکھر نے اپنی گرانمایہ کتاب سچائی اور حسن (Truth and Beauty) میں جان کیٹس (John Keats) کی بات دہرائی ہے۔

Truth is beauty, beauty is truth.

یعنی صداقت اور حسن میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ سائنس کی تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ جمالیاتی ذوق رکھنے والے سائنس دانوں کے پیش کردہ نظریے آخر میں صحیح ثابت ہوئے، گو شروع میں وہ کمزور معلوم ہوتے تھے۔

نظریاتی اختلاف کے باوجود، فیض اور اس عاجز کے درمیان کئی قدریں مشترک ہیں۔ ایک تو یہی کہ فیض اس جادۂ تفکر و تسخیر کے راہی تھے جو تحیر کی منزل پہ لے جاتا ہے۔

کئی بار اس کی خاطر ذرّے ذرّے کا جگر چیرا
مگر یہ چشم حیراں، جس کی حیرانی نہیں جاتی

فیض تفکر اور تحیر سے پیدا ہونے والی تسخیر یعنی ٹکنالوجی کو انسانی فلاح و بہبود کے لیے استعمال ہوتے دیکھنا چاہتے تھے۔ لینن پرائز کی تقریب میں انھوں نے کہا:

"یہ بم، راکٹ، توپیں، بندوقیں سمندر میں غرق کردو
اور ایک دوسرے پر قبضہ جمانے کے بجائے تسخیر
کائنات کو چلو، جہاں جگہ کی کوئی تنگی نہیں۔"

اور پھر:

"آپ سے پہلے انسانوں کو فطرت کے ذخیروں پہ اتنی
دسترس اور پیداوار کے ذریعوں پر اتنی قدرت نہ تھی
کہ ہر گروہ کی ضرورتیں پوری ہو سکیں لیکن اب یہ صورت
نہیں۔ اب انسانی عقل، سائنس اور صنعت کی بدولت
ایسی منزل پہ پہنچ چکی ہے کہ سب تن بخوبی پل سکتے ہیں
اور سبھی جھولیاں بھر سکتی ہیں۔"

اور اب تو ایک اور قدر فیض اور اس عاجز میں مشترک ہو گئی ہے۔ ہم دونوں ملک کے ایک مخصوص طبقے کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہیں ؎

نثار میں تری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے

ذہن پہ زور دینے کے باوجود، یاد نہیں پڑتا کہ فیض سے میری ملاقات پہلی بار کب اور کہاں ہوئی تھی۔ شاید ملک کے باہر لندن

* ڈائرکٹر انٹرنیشنل سینٹر فار تھیوریٹیکل فزکس - ٹریسٹے، اٹلی

ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں ان کا مجموعۂ کلام نقشِ فریادی پڑھنے کا موقع ملا تو ایسا لگنے لگا کہ میں ہمیشہ سے ان سے واقف تھا۔ ان سے میری آخری ملاقات ملتان کے ہوائی اڈے پر ہوئی۔ وہ لاہور جارہے تھے اور میں کراچی۔ کہر اور غبار اس روز اتنا تھا کہ جہاز اسلام آباد سے آکر وہاں رُک گیا اور ہم ایرپورٹ پر بار بار ملے۔ انھوں نے اپنی کئی غزلیں سنائیں اور از راہِ کرم میری نوٹ بک میں اشعار لکھ دیے۔

اس قدرے طویل تمہید کے بعد، اب اصل موضوع پر آتا ہوں۔

وسعتِ کائنات :

چاند، سورج، تارے اور خود آسمان ابتدا ہی سے انسان کے غور و فکر کے محور رہے ہیں۔ اس غور و فکر کی تاریخ کم از کم اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ قدیم مصریوں کی۔ ابتدائی کوششیں دیومالائی (mythological) نوعیت کی تھیں جن میں اجرامِ فلکی کو دیوی دیوتاؤں سے تعبیر کیا گیا

ان کہانی قصّوں کے بعد بطلیموس (Ptolemy) کے تصورِ کائنات کا دور آیا، جس کے مطابق زمین سارے کائنات کا مرکز تھی اور چاند، سورج، تارے اور دوسرے سیارے سب کے سب زمین کے گرد گھوم رہے تھے۔ اسے پہلی بار سنجیدگی سے جار دانو برونو (Giardano Bruno) نے چیلنج کیا۔ اس نے زمین کی مرکزی حیثیت سے انکار کیا تو ان خیالات کی پاداش میں غریب برونو کو کیتھولک مذہب پرستوں نے مرتد قرار دے کر آگ میں جلا ڈالا۔

قرونِ وسطیٰ کے کیتھولک مذہبی طبقے کے ہاتھوں کسی سائنس داں کو اس کے سائنسی نظریوں کی بنا پر ایذا پہنچانے کا یہ پہلا موقع نہ تھا۔ گلیلیو نے اپنے طبعیاتی تجربوں کی روشنی میں برونو کے خیالات کی تائید کی تو وہ بھی زیرِ عتاب آئے اور اٹلی میں سائنس کی ترقی اٹھارھویں صدی کے آخر تک رک گئی۔

ان واقعات کے تقریباً ساڑھے تین سو سال بعد اب کیتھولک طبقے کی طرف سے نظریاتی اختلاف کے معاملے میں رواداری کا اظہار ہو رہا ہے اور پوپ جان پال ثانی نے ۹ رمئی ۱۹۸۳ء کو وٹیکن میں اعلان کیا:

”گلیلیو اور اس کے بعد کے واقعات سے چرچ نے سبق سیکھا ہے چرچ خود تجربے اور غور و فکر سے سیکھتا ہے۔ وہ اب تحقیق کی آزادی کے مفہوم کو بہتر طور پر سمجھنے لگا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ سائنس اور ایمان میں کوئی حقیقی تضاد نہیں۔“

مخالفت کے باوجود رفتہ رفتہ زمین کی مرکزی حیثیت کا تصور ختم ہو گیا۔ حالانکہ اب بھی کچھ نافہم نکل آتے ہیں جو زمین کو ساکن بتاتے ہیں۔

ہمارا نظامِ شمسی جس کے مرکز پر سورج ہے، رات میں آسمان پر نظر آنے والی کہکشاں کا ایک حقیر جزو ہے۔ اس کہکشاں میں ہمارے سورج جیسے (جو خود ایک ستارہ ہے) تقریباً ایک سو ارب (10^{11}) ستارے ہیں۔ کائنات میں ہماری کہکشاں جیسی تقریباً ایک سو ارب (10^{11}) کہکشائیں ہیں۔ ہماری کہکشاں کی پڑوسی کہکشاں تقریباً ڈیڑھ ارب نوری سال کی دوری پر ہے (ایک نوری سال = 10^{13} کلومیٹر)

زیادہ تر سائنس دانوں کا خیال ہے کہ کائنات کی ابتدا ایک عظیم دھماکے (Big Bang) سے ہوئی جو آج سے تقریباً پندرہ بیس ارب (~ 10^{10}) سال پہلے ہوا تھا۔ اس کے اثر سے کائنات نے پھیلنا شروع کیا اور پھیلنے کے اثر سے ٹھنڈی ہونے لگی۔ ٹھنڈی ہونے سے پہلے کوانٹم نظریے کے بموجب توانائی اور مادّہ کی ایک دوسرے میں تبدیلی (Energy matter inter-conversion) شروع ہوئی اور مادہ وجود میں آنے لگا۔ پہلے کوارکس (quarks) جیسے بنیادی ذرّے بنے، پھر ان سے نیوکلیانس (nucleons) اور نیوکلیانس سے ہلکے مرکزے کے نیوکلیس (nucleus)۔ اس طرح ہیلیم (^4He) کے نیوکلیس بنانے میں تقریباً تیس فیصد نیوکلیان خرچ ہو گئے ہوں گے اور یہ سارا عمل عظیم دھماکے سے چند سکنڈ کے وقفے میں پورا ہو گیا ہوگا۔

اس عظیم دھماکے کو سمجھنے کے لیے اب میں کائنات میں کام کرنے والی ان بنیادی قوتوں کا ذکر کروں گا جن کے تحت قدرتی عمل پیش آتے ہیں۔

کائنات میں کار فرما بنیادی قوتیں اور ان میں وحدت

ابتدا ہی سے انسان کی کوشش رہی ہے کہ طبعیاتی عوامل کی توجیہ چند سادہ تصوروں اور اصولوں سے کر دے۔ ان کوششوں میں افغانستان کے البیرونی کا نام آتا ہے۔ اس کے بعد گلیلیو نے یہ اصول پیش کیا کہ طبعیات کے جو قانون کرۂ ارض پر کام کر رہے ہیں وہی کائنات کے ہر گوشے میں کام کرتے ہیں۔ آج یہی اصول سائنس کی بنیاد ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو سائنس کا وجود ہی نہ ہوتا

البیرونی اور گلیلیو کے کام کو نیوٹن نے آگے بڑھایا اور ریاضی کی مدد سے دکھایا کہ جس قوت کے تحت مادی اجسام زمین کی طرف گرتے ہیں ہ بعینہ وہی ہے جس کے زیر اثر سیارے سورج کے گرد گردش کرتے ہیں ہ قوت کشش ثقل (Force of gravity) ہے۔

دوسری، برقی مقناطیسی قوت دو الگ الگ شکلوں میں سامنے ئی۔ ایک مقناطیسی اور دوسری برقی قوت کے طور پر۔ فیراڈے (Faraday) اور ایمپیر (Ampere) کے تجربات ۱۸۳۰ء) کے بعد میکسویل (Maxwell) کی نظریاتی تحقیق ۱۸۷۰ء) سے ثابت ہوا کہ مقناطیسی اور برقی قوتیں دراصل ایک ہی ت کے دو مختلف پہلو ہیں۔ نیوٹن کے بعد، دو بظاہر مختلف نظر آنے الی قوتوں کی وحدت نمایاں کرنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ یہ الیکٹرومیگنٹک رس (برقی مقناطیسی قوت) ہی ہے جس کی بدولت ایٹم میں منفی چارج الیکٹران مثبت چارج کے نیوکلیس سے بندھا ہے۔ ہماری روزمرہ کی ندگی میں سہولت پہنچانے والی بیشتر اشیاء جیسے بجلی، ریڈیو، ٹیلی وژن، یر وغیرہ، برقی مقناطیسی قوت کا ہی کرشمہ ہیں۔ اس صدی کے شروع ں کوانٹم میکانکس کی مدد سے یہ بھی انکشاف ہوا کہ کیمیائی قوت (Chemical force) جس کا تعلق کرۂ ارض پر زندگی سے ہے ہ الیکٹرو میگنٹک فورس کی مخصوص شکل ہے۔

ثقل اور برقی مقناطیسی قوتوں کے علاوہ دو قوتیں اور ہیں، جن کا ق ایٹم کے مرکزہ (نیوکلیس) سے ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، یٹم کی تقریباً ساری کی ساری کمیت (mass) اس کے نیوکلیس کزہ میں مرکوز ہوتی ہے۔ ہر مرکزہ میں دو قسم کے ذرّے پائے تے ہیں ایک پروٹان اور دوسرا نیوٹران۔ جس قوت کے اثر سے رّے بندھے رہتے ہیں، اسے قوی نیوکلیائی قوت (strong nuclear force) کہتے ہیں۔ کائنات میں کام کرنے والی دی قوتوں کی یہ تیسری قسم ہے اور ہمارے روزمرہ کے مشاہدے ں نہیں آتی۔

نیوکلیائی قوت کی ایک اور قسم بھی ہوتی ہے جس کی وجہ سے مرکزہ ت بے وقت چھوٹے ٹکڑوں میں ٹوٹتا رہتا ہے۔ چونکہ یہ قوت کافی کمزور ہوتی ہے، اسے کمزور نیوکلیائی قوت (weak nuclear force) کہتے ہیں۔

اس صدی کے شروع میں آئن سٹائن نے چار بعدی زمان و مکان (4-dimensional space - time) کا انقلابی تصور کیا اور دکھایا کہ زمان و مکان اپنی الگ الگ حیثیت نہیں رکھتے بلکہ وہ ایک سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ اس تصور کو مزید وسعت دے کر انھوں نے بتایا کہ مادی اجسام کے گرد جو زمان و مکان خمیدگی (space time curvature) پیدا ہو جاتی ہے، ثقل اس کا مظہر ہے۔ کچھ ایسی ہی geometrical (اقلیدسی) توجیہ وہ برقی مقناطیسی قوت کی بھی کرنا چاہتے تھے اور اس طرح یہ دکھانا چاہتے تھے کہ کائنات میں پائی جانے والی قوتوں میں ایک قسم کی وحدت ہے۔ مگر اپنی عمر کا بیشتر حصہ (یعنی ۳۵ سال) اس فکر میں ڈوبے رہنے کے باوجود وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔

اس پس منظر میں میری تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ برقی مقناطیسی اور کمزور نیوکلیائی قوتیں دراصل ایک ہی قوت کے دو پہلو ہیں۔ اس قوت کو میں نے الیکٹرو ویک فورس (برقی کمزور قوت) کا نام دیا ہے۔ اس انکشاف کی نوعیت وہی ہے جو فیراڈے اور میکسویل کے ذریعے الیکٹرک اور میگنٹک قوتوں کی وحدت کے انکشاف کی تھی۔ اس کام میں شریک دو اور سائنس دانوں وائن برگ (Weinberg) اور گلیشو (Glashow) نے بھی انکشاف اپنے طور پر کیا ہے

ہماری تحقیق کی چند پیش گوئیاں تھیں، ان کے لیے تجربات کیے گئے تو وہ اُن پر پوری اتریں۔ ہم نے پیش گوئی کی تھی کہ ایسے تین نئے ذرے دریافت ہونے چاہییں جن کی وجہ سے الیکٹرو ویک فورس وجود میں آتا ہے۔ سرن (CERN) کے تجربوں سے اس کی تصدیق ہوئی اور ان ذروں کی دریافت پر تجرباتی ٹیم کے سربراہوں وان ڈیومیر (Van der Meer) اور کارلو روبیا (Carlo Rubia) کو ۱۹۸۴ء کے نوبل انعام سے نوازا گیا۔ ہم تینوں یعنی وائن برگ، گلیشو اور مجھ کو تقریب میں شرکت کی خصوصی دعوت دی گئی۔

الیکٹرو ویک نظریے کی کامیابی کے بعد ہمارے سامنے دوسرا

...اعلیٰ وحدت (Grand Unification) یعنی "برق کمزور" اور نیوکلیائی" قوتوں کی وحدت کا تھا۔ اس بابت میں نے ڈاکٹر پیتی (PAT...) کے ساتھ مل کر ایک نظریہ پیش کیا ہے، جس سے یہ اہم پیش گوئی ...ہے کہ پروٹان جیسے غیر زوال پذیر سمجھا جاتا تھا اور جس کی زندگی ...لا متناہی تصور کی جاتی تھی، حقیقت میں زوال پذیر ہے اور اس کا عرصۂ ...حیات خاصا لمبا (10^{32} سال) ہونے کے باوجود محدود ہے۔[1] ...اس سلسلے میں اب تک کئی تجربے ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک یہ پیش گوئی تجربے ...کی کسوٹی پر پوری نہیں اتری ہے۔

اینتھروپک اصول (Anthropic Principle)

سادہ الفاظ میں ڈکے (Dicke) کا اینتھروپک ...اصول یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

"ایک کائنات کی عمر چند ارب سال سے زیادہ ہونی چاہیے تاکہ اس میں ذہین مخلوق آباد ہو سکے۔"

ہماری کائنات کا ایک عظیم دھماکے سے شروع ہونا، پھیلتے جانا، ...قوتوں کا مختلف شکلیں اختیار کرنا، مادہ کا بننا، کہکشاؤں کا وجود ...میں آنا، ستاروں کا پھٹنا، پھر ایک ستارے کے گرد باقیات سے ...ایک ایسے سیارے کا وجود میں آنا جس پر مناسب فضا اور سمندر ہو، ...ان سب کے لیے چند ارب سال کا عرصہ ضروری ہے۔

نیوکلیائی اور برق مقناطیسی قوتوں کی طاقت (strength) ...کے تناسب (ratio) کی جو قیمت اس کائنات میں ہے، اگر اس میں ذرا ...سا فرق بڑھ جاتا تو کائنات کی تاریخ پر بڑا ڈرامائی اثر پڑتا۔ مثال ...کے طور پر، اگر یہ تناسب ذرا سا بڑھ جاتا تو دو پروٹان آپس میں مل ...کر دہرا پروٹان (diproton) بناتے اور دو الفا مرکزے (α - nuclei) مل کے ^{8}Be کا پائیدار مرکزہ بناتے جو اس تناسب کی موجودہ قیمت کے تحت نہیں بنتے۔ اس کا اثر یہ ہوتا کہ عظیم دھماکے کے بعد والی مرکزوی ترکیب (Big bang nucleo synthesis) کا عمل اتنا تیز ہو جاتا کہ سارے نیوکلیان اور دوسرے بھاری مرکزے بنانے میں صرف ہو جاتے۔ نہ ہائڈروجن باقی اور نہ پانی ہوتا اور نہ ازلی سمندر (Primeaval Ocean) جس کے بغیر خلیاتی زندگی (Cellular life) کا وجود ممکن نہیں۔ اس طرح ساری بائیو کیمسٹری اور بائیولوجی جو زندگی کی ذمہ دار ہیں نہ ہوتیں۔

دوسرا اتفاق یہ ہے کہ ستارے اسی صورت میں بن سکتے ہیں کہ خلا ہو تاکہ ان کے بنتے وقت نکلنے والی گرمی اور روشنی اس میں سما سکے۔ اگر کائنات نہ پھیلتی رہتی تو اسٹار بننے کے لیے یہ خلا میسر نہ آتا۔

یہ کائناتی (Cosmic) اتفاقات ہیں۔ مقامی (local) اتفاقات یہ ہیں کہ ثقلی توانائی (gravitational energy) کے اخراج سے برق مقناطیسی (electromagnetic) اور مرکزوی (nuclear) قوتیں پھر کارفرما ہونے لگتی ہیں جن سے نئے مرکزے (nuclei) بننے لگتے ہیں اور ستارہ ان کے بوجھ کو سپرنووا دھماکہ کے ذریعے خلا میں پھینک دیتا ہے۔ اس طرح ایٹم، سالمے (مالیکول) اور سیارے بنتے ہیں اور بعض سیاروں میں زندگی وجود میں آتی ہے۔

تیسری دنیا اور ٹکنالوجی

بہ حیثیت مجموعی تیسری دنیا رفتہ رفتہ اس حقیقت کو سمجھنے لگی ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی پر ہی معیارِ زندگی کا انحصار ہے۔ اسی کے سبب سے شمال مالدار ہے اور جنوب غریب۔ کرۂ ارض پر دو طرح کے انسان بستے ہیں۔ ایک وہ جن میں یہ صلاحیت ہے کہ جو کچھ سائنس اور ٹکنالوجی دے سکتے ہیں، حاصل کریں۔ اس لیے وہ اقتصادی طور پر بالادست ہیں۔ دوسرے وہ جنہوں نے سائنس اور ٹکنالوجی کو اپنے روزمرہ کا جزو نہیں بنایا اور اسی وجہ سے بے وقعت اور

---

[1] سپر سمٹری (Supersymmetry) کے تصور کے مطابق یہ عرصۂ حیات 10^{45} سال ہو جاتا ہے اور قریب قریب تجرباتی تصدیق کی حدود سے باہر نکل جاتا ہے۔

اخراجات کی تفصیل دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دفاع، تعلیم اور صحت عامہ پر، ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک قریب قریب یکساں خرچ کرتے ہیں لیکن سائنس اور ٹکنالوجی پر ان کے خرچ میں دس گنے سے زیادہ کا فرق ہے۔ ہم جنوب کے لوگ اس معاملے میں افسوس ناک حد تک غیر سنجیدہ ہیں۔

یہ کہتے ہوئے بڑا دکھ ہوتا ہے کہ میرے ملک پاکستان میں سائنس اور ٹکنالوجی کی حالت کچھ زیادہ ہی خراب ہے۔ اگر ہم نئے علم و فن کو چار حصوں میں بانٹیں:

۱۔ بنیادی سائنس (Basic Science)

۲۔ اطلاقی سائنس (Applied Science)

۳۔ رائج صنعت و حرفت (classical technology)

۴ اعلیٰ صنعت و حرفت (high technology)

تو پتہ چلتا ہے کہ پاکستان کے اندر بنیادی سائنس میں ریسرچ نام کی چیز کا وجود ہی نہیں اور اعلیٰ ٹکنالوجی کے لفظ سے ہمارے کان ابھی آشنا تک نہیں ہوئے ہیں۔ دکھ کی بات اس وجہ سے اور بھی ہے کہ پاکستانیوں کی تعداد کم نہیں۔ اس ملک کی آبادی ساڑھے نو کروڑ سے بھی زیادہ ہے، جو جاپان کے برابر اور فرانس اور برطانیہ سے دو گنی ہے۔

ماضی میں امتِ مسلمہ نے سائنس کی ترویج و ترقی میں شاندار کارنامے انجام دیے۔ بدقسمتی سے اس برصغیر کے مسلمان حکمرانوں کو علمی اوقاف بنانے یا سائنس اکادمیاں اور یونیورسٹیاں قایم کرنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ انھیں اگر دلچسپی تھی تو مقبرے تعمیر کرانے سے۔

پاکستان میں سائنس اور ٹکنالوجی کی خستگی کی بابت جو کچھ میں نے کہا ہے، اس کی وضاحت میں چند حقائق پیش کروں گا۔

انڈیا جس کی آبادی پاکستان سے صرف آٹھ گنی ہے، ہر سال فزکس میں دو سو پی ایچ۔ ڈی نکال رہا ہے لیکن پنجاب یونیورسٹی جو پاکستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے، اپنی سو سال کی عمر میں فزکس کے صرف تین پی ایچ۔ ڈی پیدا کر سکی اور ریاضی میں ایک بھی نہیں۔

رسالہ compact میں شایع ہونے والے ایک مقالہ میں ڈاکٹر مجاہد کامران نے سائنس میں قحط الرجال کا اظہار اس طرح کیا ہے:

"پاکستان کی یونیورسٹیوں میں فزکس پڑھانے والے اساتذہ کی کل تعداد چھیاسی ہے اور ان میں سے بھی صرف ۴۹ پی ایچ۔ ڈی ہیں۔"

پاکستان میں سائنسی علوم کے حصول و ترقی کے لیے نہ کوئی قومی عزم ہے اور نہ کوئی اجتماعی احساس کہ اقتصادی اور دیگر مسائل حل کرنے کے لیے سائنس کے عملی اطلاق سے فائدہ اٹھایا جائے۔ جیسا کہ جاپان میں شہنشاہ میجی کے دور میں ہوا تھا۔ شہنشاہ نے جاپان کے نئے آئین کے تحت پانچ حلف اٹھائے تھے جن میں سے ایک یہ تھی

"جاپان کی عظمت و جلالت کی خاطر، پوری صلاحیت اور استطاعت صرف کر کے نیا سائنسی علم حاصل کیا جائے گا خواہ وہ کہیں سے بھی حاصل ہو۔"

اس عزم اور احساس کے نہ ہونے سے حکام بالا کے دل میں سائنس والوں کے لیے ایک قسم کی حقارت کا جذبہ ہے۔ مجھے پلاننگ کمیشن کے ایک سابق چیرمین یاد آتے ہیں۔ جب میں نے ان سے گزارش کی کہ سائنس پر مبنی صنعتوں کی منصوبہ بندی کرتے وقت سائنسدانوں سے مشورہ کر لیجیے گا تو انھوں نے تنک مزاجی سے کہا

"مجھے سائنس والوں سے مشورہ لینے کی کیا ضرورت۔ میں اپنا گھر چلانے کے لیے باورچی سے مشورہ نہیں لیا کرتا۔"

لیکن انھوں نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ وہ اپنے کون سے قدرتی حق کی بنا پر پلاننگ کمیشن کے سربراہ بنے بیٹھے تھے!

مشورے:

۱۔ اعلیٰ سطح پر سائنس (بنیادی اور اطلاقی دونوں) اور سائنس پر مبنی اعلیٰ ٹکنالوجی میں محققین اور تجربہ گاہوں کی تعداد میں اضافہ ضروری ہے۔ اس معاملے میں ہم کو چین کے نقش قدم پر چلنا چاہیے۔ ۱۹۴۹ میں ان کے سارے ریسرچ اداروں (Institutes) میں مجموعی طور پر کل پانچ سو سائنس داں

تھے، آج کل یہ تعداد بڑھ کر تین لاکھ ہو گئی ہے۔ یعنی چالیس سال میں چھ سو گنے کا اضافہ۔

۲۔ تعلیمی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے، اس کے بجائے کہ ٹکنکل، زراعتی (اگریکلچرل) تجارتی اور حرفہ جاتی (vocational) تعلیمات الگ الگ منفرد اداروں میں دی جائیں، جیسا کہ اس وقت ہو رہا ہے، ضرورت ہے کہ سب طرح کی تعلیم ایک ہی تنظیم (authority) کے تحت ہو۔ یہ اتھارٹی آرٹس اور سائنس کے موجودہ لبرل سسٹم کے نہج پر پیشہ ورانہ (پروفیشنل) تعلیم کا نظام اس طرح قائم کرے کہ تعلیم کی تینوں دھاریں، یعنی آرٹس، سائنس اور پیشہ ورانہ تعلیم (پیروفیشنل) متوازی طور پر آگے بڑھیں اور ہر ایک میں میٹریکولیشن، انٹرمیڈیٹ بی۔اے، بی۔ایس سی کی اسناد دیے جائیں۔

طلبا، اور والدین کے ذہن سے یہ خیال نکال دینا ضروری ہے کہ موجودہ لبرل سسٹم کی آرٹس اور سائنس میں ملنے والی ڈگریاں زیادہ قیمتی اور باعث عزت ہیں اور ان کے مقابلے میں پولی ٹکنیک کے ڈپلومے بیکار ہیں۔ اس تجویز پر عمل کیا گیا تو یہ خیال خود بخود نکل جائے گا۔

۳۔ وقت آگیا ہے کہ ہمارے ملک میں کپڑا سازی (ٹکسٹائل) کاغذ، شکر، سیمنٹ، کھاد، گیس، ٹیلی کمیونیکیشن، جہاز سازی (chases building) کٹلری، کھیل کود کا سامان اور فولاد وغیرہ کی صنعتیں اپنے تحقیقی اور ترقیاتی ادارے قائم کریں اور چلائیں، جیسا کہ برطانیہ اور دوسرے مغربی یورپ کے ملکوں میں دستور ہے۔ حکومت کی سرپرستی اور صنعتوں کے مالی وسائل سے امداد باہمی صنعتی تحقیق (Cooperative industrial research) اور تعمیر و تربیت (Development and Training) کے مرکز قائم کیے جا سکتے ہیں۔ برطانیہ میں اس وقت بیکری، آٹے، برش، کٹلری، رنگ سازی، ربڑ، جوتا سازی، ویلڈنگ وغیرہ کے لیے تقریباً دو درجن مرکز قائم ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں ان اداروں میں سات ہزار سائنس داں ملازم تھے، جن پر تیرہ ملین پاؤنڈ خرچ آیا۔ انھوں نے اس کے جواب میں صنعت کاری (industry) کو تقریباً چالیس ملین پاؤنڈ کا فائدہ پہنچایا۔ یہ مراکز صنعت کاروں اور استعمالی سامان بنانے والوں کو جدید ترین فنی (technical) معلومات فراہم کرتے ہیں۔

۴۔ اب تک ہماری گفتگو تحقیق، ترقی اور تربیت کے نچلے درجے تک محدود رہی ہے۔ فی زمانہ دولت کا ذریعہ اعلیٰ ٹکنالوجی ہے۔ جاپان، جنوبی کوریا، تائیوان اور سنگاپور کی مثالیں سامنے ہیں۔ اس وقت تنہا سنگاپور ملٹی نیشنل (multi-nationals) سے سالانہ سو ارب ڈالر سے زیادہ کی دولت حاصل کر رہا ہے۔ سنگاپور میں ملٹی نیشنلز کی دلچسپی کی وجہ وہاں اعلیٰ سطح کے فنی اور سائنسی تربیت یافتہ افراد کی دستیابی ہے۔

جہاں تک ہمارے تعلیمی ڈھانچے کی اوپری سطح کا سوال ہے ملک بھر میں بنیادی سائنس اور اعلیٰ ٹکنالوجی کے تعلیمی ادارے قائم کیے جانے کی ضرورت ہے۔ ان میں سے جو ادارہ اس ڈھانچے کی چوٹی پر ہو، دارالسلطنت میں رہے اور اسے انسٹی ٹیوٹ آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی کہا جائے۔ یہ عالمی حیثیت کا پوسٹ گریجویٹ تعلیمی ادارہ ہوگا۔

۵۔ ایک سے زیادہ سائنس اور اعلیٰ ٹکنالوجی کے اداروں کے قیام کے لیے بہتر ہوگا کہ تعاون کرنے والے ترقی یافتہ ملکوں کے درمیان مقابلے کا جذبہ ابھارا جائے، جیسا کہ انڈیا نے امریکہ، روس، برطانیہ اور جرمنی کے مابین کانپور، کھڑگپور، بمبئی، دہلی، اور مدراس میں آئی آئی ٹی (I.I.Ts) (انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی) قائم کرتے وقت پیدا کیا تھا۔

۶۔ تھرڈ ورلڈ اکیڈمی آف سائنس (تیسری دنیا کی سائنس اکاڈمی) نے سفارش کی ہے کہ تعلیمی بجٹ کے چار فیصد کے مساوی رقم بنیادی سائنس میں تحقیق پر، ۴ فیصد اطلاقی (applied) سائنس پر اور ۸۰ فیصد سائنس پر مبنی اعلیٰ ٹکنالوجی کے فروغ پر صرف کی جائے۔

پاکستان کے لیے اس کے معنی ہوئے تقریباً ۱۲۰۔ارب ڈالر کا اہتمام جو ہماری عام قومی پیداوار (GNP) کا ۴۴، فیصد حصہ ہے۔ یہ ملک کے ساتویں پلان میں شامل ہونا چاہیے۔

ہمیں اپنے ملکوں میں سائنس اور ٹکنالوجی کی پسماندگی سے دل شکستہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں تک سائنس کا سوال ہے اس کی اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی کے لیے بھی ایک دو نسلوں کی ہی ضرورت پڑتی ہے۔ جیسا کہ امریکہ، روس، جاپان اور اب برازیل، ہندوستان، چین اور کچھ عرصے سے کوریا کی مثالوں سے ظاہر ہے۔ ہمیں خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔

میری کم عمری کے زمانے میں عام طور پر سننے میں آتا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان حساب میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ آج صورت حال ایسی بدل چکی ہے کہ مشرق وسطیٰ کا بینک کاری کا پورا انتظام پاکستانی چلا رہے ہیں۔ جاپانیوں نے خوش خطی میں اپنے ورثے کا اطلاق اعلیٰ ٹکنالوجی پر کیا ہے۔ کیا چاول پر سورۂ اخلاص لکھ لینے والے مائکرو الکٹرونکس کے میدان میں کمال حاصل نہیں کر سکتے؟

۷۔ ایک یوروپی نوبل انعام یافتہ طبعیات داں نے چند سال پہلے مجھ سے اچانک ایک سوال کیا تھا:

"سلام! کیا آپ کے خیال میں یہ واقعی ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ان اقوام کی دستگیری کرتے رہیں، ان کو مالی امداد دیتے رہیں، انھیں خوراک فراہم کرتے رہیں جنھوں نے انسانی علمی ذخیرے میں ایک ذرہ کا بھی اضافہ نہیں کیا۔"

اس نے مجھ سے یہ سوال نہ کیا ہوتا، تب بھی میرا ضمیر ملامت کرتا رہتا ہے۔ جب میں کسی اسپتال میں جاتا ہوں تو سوچتا رہتا ہوں کہ آج کی زندگی بچانے والی ساری دوائیں دوسروں نے بنائی ہیں۔ ہمارے ملکوں خصوصاً پاکستان کے سائنس دانوں کا ان کی ایجاد اور تیاری میں کوئی حصہ نہیں۔

اس تناظر میں بھارت، بنگلہ دیش اور ملیشیا کے علماء سے میں نے حال ہی میں سوال کیا تھا کہ جب قرآن مجید کا تقریباً آٹھواں حصہ قدرت کا مطالعہ کرنے، غور و فکر کرنے، عقل سے کام لینے، حکمت اور فکر والی زندگی اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے تو کیا آپ اپنے آٹھ خطبات میں سے ایک خطبہ بھی سائنس کے بارے میں دیتے ہیں؟ سب نے مجھے ایک ہی جواب دیا:

"ہم چاہتے تو ہیں لیکن ہم خود سائنس نہیں جانتے، خطبہ کیا دیں گے۔"

کیا وقت نہیں آ گیا ہے کہ دینی مدارس کے نصاب میں جدید سائنس کے غیر متنازعہ فیہ حصوں کو شامل کر لیا جائے۔ جیسے نیوٹن کے قوانین اور کہکشاؤں کی فلکی طبعیات، قدرت کی بنیادی قوتوں کا علم، زمین کی ساخت اور جنیٹک کوڈ وغیرہ؟

قوم کے کردار میں سائنس اور ٹکنالوجی بڑے اوصاف حمیدہ پیدا کر دیتی ہے۔ تدبر، تحمل، باریک بینی، روشن خیالی اور سب سے بڑھ کر رواداری اور دوسروں کی رائے کا احترام۔ سائنس تقلید سے اجتہاد کی طرف لے جاتی ہے۔ قوم اور نسل کی برتری کے غرور سے نکال کر رواداری کا سبق دیتی ہے، جسے او تھانٹ نے ان لفظوں میں کہا ہے:

"I as a Budhist have learnt one thing from my religion -- to be tolerant of everything but of intolerance."

یہی بات قرآن کریم کی آیت "لکم دینکم ولی دین" سے نکلتی ہے۔

۸۔ پاکستان میں سائنسی تعلیم و تحقیق کو فروغ دینے کے سلسلے میں سید قاسم محمود صاحب نے حلقہ ارباب سائنس کی تحریک چلائی۔ میں چاہتا ہوں یہ حلقے جگہ جگہ قائم ہوں اور ترقی کریں۔ اس کے لیے تیسری دنیا کی اکاڈمی کی طرف سے ایک ہزار ڈالر کا اعلان کرتا ہوں۔

فیض اور یہ عاجز دونوں عرصۂ دراز تک ملک بدر رہے ہیں۔ آخر میں وطن عزیز سے مخاطب ہو کر فیض مرحوم کے یہ اشعار پیش کرتا ہوں:

سبھی کچھ ہے تیرا دیا ہوا، سبھی راحتیں، سبھی کلفتیں
کبھی صحبتیں، کبھی فرقتیں، کبھی دوریاں، کبھی قربتیں
یہ سخن جو ہم نے رقم کیے، یہ ہیں سب ورق تری یاد کے
کوئی لمحہ صبح وصال کا، کئی شام ہجر کی مدتیں

~~~~ . ~~~~ . ~~~
~~~~

بچوں کی تربیت کا بہترین ذریعہ

مولوی وحید الدین سلیم

تربیت سے وہ طریقہ مراد ہے جس سے بچوں کی طبعی اور عقلی اور اخلاقی قوتیں نشوونما پاتی ہیں۔ اس میں ہر قسم کی تعلیم اور تہذیب داخل ہے جس سے عقل منور ہوتی ہے، طبیعت راستی کی طرف مائل ہوتی ہے۔ عادات و خصائل اصلاح پر آتے ہیں اور بچے اپنی اور اپنے عزیزوں کی آئندہ نفع رسانی کی قابلیت پیدا کرتے ہیں۔ بچوں کے سرپرستوں اور مربیوں کو تربیت کی طرف بچپن میں توجہ کرنی لازم ہے۔ کیوں کہ اس زمانے میں بچے اپنی آئندہ حالت سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں اور نہیں جانتے کہ وہ کیا ہوں گے اور ان کو کیسا ہونا چاہیے۔ بچوں کی مثال تر و تازہ ٹہنی کی ہے جس کو ہر طرف موڑنے کا اختیار ہے اور خشک ہونے کے بعد اس میں یہ قابلیت نہیں رہتی۔ اسی سبب سے بچپن کی حالت میں ان کی تہذیب و اصلاح کی تدبیر کرنی چاہیے بے زبان جانور نیچرل طور پر صرف خوراک کے محتاج ہیں مگر انسان مادی غذا کے علاوہ جس سے جسمانی تقویت حاصل ہوتی ہے، روحانی اور اخلاقی غذا کا بھی محتاج ہے اور اسی لحاظ سے اس کو جانوروں پر فضیلت حاصل ہے۔ وہ ایک اخلاقی حیوان ہے جس کی اخلاقی امداد کے لیے ان مادی وسائل سے علیحدہ دیگر وسائل کی ضرورت ہے جن سے ان کی جسمانی ترکیب تیار ہوتی ہے۔ انسان کی عقلی اور دماغی قوتیں آہستہ آہستہ ترقی پاتی ہیں اور اس کے لیے اُس کی اندرونی اور ذاتی کوشش کافی نہیں بلکہ خارجی امداد کی ضرورت ہے۔ بچے جس طرح عمر کی منزلیں بتدریج طے کرتے ہیں اور ان کے جسم عرض و طول اور قوت میں بڑھتے جاتے ہیں۔ اسی طرح آہستہ آہستہ ان کی عقلی اور دماغی قابلیتیں نشوونما پا سکتی ہیں۔ ناتربیت یافتہ انسان اپنی جسمانی ترکیب کے لحاظ سے کمزور ہے لیکن اگر تربیت یافتہ ہو تو گو وہ جسم کے لحاظ سے کمزور ہوگا مگر عقل اور دماغ کے لحاظ سے طاقت ور ہوگا اور دیگر مخلوقاتِ عالم کو مسخر کرنے کی قابلیت اس میں موجود ہوگی۔ تربیت ہی وہ چیز ہے جس سے انسان کامل انسان ہوتا ہے ورنہ اس میں اور جانوروں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

تربیت کے جو اصول اور قواعد ہیں، اُن سے بذاتِ خود کوئی آدمی مستفید نہیں ہو سکتا۔ ایک آدمی تربیت کے لیے دوسرے آدمی کا محتاج ہے اس لیے جب تک سوسائٹی نہ ہو تربیت ہونی ناممکن ہے۔ سوسائٹی جس قدر عمدہ ہوگی، اسی قدر تربیت بھی عمدہ ہوگی۔ سوسائٹی سے علیحدہ ہو کر تربیت کا خیال کرنا محض وہم و خیال ہے۔ اگرچہ ایسی تربیت انسانی تمدن کے بالکل برخلاف ہے مگر اٹھارھویں صدی عیسوی میں یورپ کے بہت سے باشندے اپنی اولاد کو سوسائٹی سے علیحدہ رکھ کر تربیت دیتے تھے۔ ڈاکٹر روسو جو فرانس کا نامور عالم ہے اپنے شاگردوں کو سوسائٹی سے بالکل الگ تھلگ رکھتا تھا اور ان کو تاکید کرتا تھا کہ وہ لوگوں سے میل جول بالکل ترک کر دیں۔ ہمارے زمانے میں یورپ کے بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ انسان کی عقل اور دماغ کو بالکل آزادی دی جائے۔ تاکہ وہ دنیا کی تمام باتوں میں مستقل رائے قائم کر سکے۔ اس بنا پر بعض علما نے یہ قرار دیا ہے کہ بچوں کی تربیت بالکل آزادانہ ہونی چاہیے کسی خاص مذہب یا عقیدہ یا رسم و رواج کو اس میں داخل کرنا اصل تربیت کے بالکل برخلاف ہے۔ بچوں کو آزادانہ تربیت دے کر ان کے حال پر چھوڑ

دینا چاہیے۔ تاکہ وہ اپنی رائے سے جس مذہب یا عقیدہ یا رسم و رواج کو چاہیں منظور کریں اور جس کو اپنی اخلاقی تربیت کے برخلاف سمجھیں، رد کر دیں۔ مگر علمائے یورپ کا بہت بڑا گروہ اس طرح کی تربیت کا بالکل مخالف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس تربیت کا نتیجہ یہ ہے کہ بچوں کے دماغ میں فاسد خیالات پیدا ہوتے ہیں اور وہ گمراہی اور بد اخلاقی کے بھنور میں ڈوب جاتے ہیں اور کسی مذہب کے قائل نہیں رہتے۔ اصل تربیت وہی ہے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ مذہب کے بغیر کوئی اصلی اور سچی تربیت نہیں ہو سکتی۔ وہ لامذہبی کی تربیت کو بڑے پُرزور دلائل سے رد کرتے ہیں۔ پہلی قسم کی تربیت کو ماننے والا گروہ کہتا ہے کہ مذہب کو بچوں کی تربیت میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ان کی تربیت میں صرف تمدن کو دخل دینا چاہیے۔ تاکہ وہ سوسائٹی میں داخل ہونے کے قابل ہوں۔ دوسری قسم کی تربیت کو ماننے والا گروہ مذہبی تربیت پر زور دیتا ہے اور کہتا ہے کہ مذہب ہی سے انسان کامل انسان ہوتا ہے۔ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ دونوں رائیوں میں کسی قدر کمی اور خلل ہے۔ کیونکہ جب بچوں کو ہم اس لیے تیار کرتے ہیں کہ وہ جوان ہو کر سوسائٹی کے روشن خیال اور چست و چالاک ممبر ہوں تو ان کی تربیت میں مذہب اور تمدن دونوں کا داخل کرنا نہایت ضروری ہے مگر تربیت کے دونوں اجزاء ایسے معتدل ہوں اور حالاتِ زندگی کے ایسے موافق ہوں کہ بچے جوان ہو کر اخلاقی اور تمدنی قابلیتوں کے لحاظ سے کامل ہو جائیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جن مہذب قوموں نے مدرسوں میں بچوں کو تربیت دینا حکومت کا حق ٹھہرایا ہے اور مذہبی علماء کے ہاتھ سے یہ اختیار نکال لیا ہے۔ انھوں نے بھی مدرسوں کے انتظام کو ایسی ہیئت مجموعی پر رکھنا لازم قرار دیا ہے کہ بچے اپنے والدین کی مرضی کے موافق تمدنی تربیت کے ساتھ مذہبی تربیت حاصل کر سکتے ہیں۔ اس طریقے سے وہ اس تعصب سے بچے رہتے ہیں جو اُن بچوں کے دماغوں میں سما جاتا ہے، جن کو خالص مذہبی مدارس میں تعلیم دی گئی ہے اور جن کو تعصب اس قابل نہیں رکھتا کہ وہ موجودہ دنیا میں کوئی کام کر سکیں۔ یا اپنے تئیں سوسائٹی کے حالات کے موافق بنا سکیں اور اس گمراہی اور الحاد اور بد اخلاقی کے بھنور میں غرق ہونے سے بھی بچ نکلتے ہیں جن میں وہ طلباء اکثر پھنس جاتے ہیں جن کو خالص تمدنی مدرسوں میں تعلیم دی جاتی ہے اور کو لامذہ سوسائٹی کے قوانین کی پابندی سے الگ رکھتی ہے اور ان کو قوم اور ملک کے لیے خطرناک عنصر بنا دیتی ہے۔

بچوں کی تربیت ماں باپ کے گھر سے شروع ہوتی ہے جہاں کسی حکومت کو تصرف کرنے کا اختیار ہے نہ حکماء کی فلسفیانہ رائیں کچھ کر سکتی ہیں۔ گھر میں ماں باپ ہی کو تربیت کا اختیار ہوتا ہے۔ یہ اختیار کسی جبری قوت پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد محبت کے اصولوں پر ہے جو والدین کو بچوں کے ساتھ قدرتی طور پر ہوتی ہے۔ بچہ سب سے پہلے والدین ہی کے سایۂ عاطفت میں تربیت پاتا ہے۔ یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ اگر والدین بچے کی طبیعت کو آزادانہ حالت پر چھوڑ دیں تو وہ خود بخود شائستہ ہو جائے گا۔ نہ یہ وہم دل میں لانا چاہیے کہ بچوں کی طبیعت قدرتی طور سے نیک ہوتی ہے کیونکہ تجربہ اس کے برخلاف شہادت پیش کرتا ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ بچے بچپن کی کمزور حالت میں تربیت کے لحاظ سے دوسروں کی مدد کے محتاج ہوتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ماں باپ اپنی اولاد کی پرورش میں کس قدر تکلیفیں جھیلتے ہیں اور ان کی تربیت میں کس طرح نرمی اور گرمی سے کام لیتے ہیں تاکہ وہ جوان ہو کر جسم اور روح دونوں کے لحاظ سے بے عیب ہوں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جب تک بچوں کو تربیت نہ دی جائے خود بخود ان میں عمدہ اوصاف پیدا نہیں ہو سکتے۔ بچوں کو مذہبی تعلیم کی سخت ضرورت ہے کیوں کہ ماں باپ کے اخلاق کیسے ہی عمدہ ہوں اور ان کی تربیت کے طریقے کیسے ہی پاکیزہ ہوں یہ ممکن نہیں ہے کہ بچوں کے اخلاق پر اس سے زیادہ اثر ڈال سکیں جس قدر کہ ماں باپ کا ہو سکتا ہے اگر مذہبی عقائد کی بچے کو تعلیم دی جائے تو وہ ذرا ہوش سنبھالنے کے بعد یہ سمجھنے لگتا ہے کہ والدین سے بھی زیادہ زبردست قوت اس پر حکومت کرتی ہے۔ اس سے تربیت کا زور بڑھ جاتا ہے اور وہ ناپاک خیالات اور ناپاک جذبات کے ساتھ مقابلہ کرنے کو تیار ہو جاتا ہے اس کی طبیعت کی کجی نکل جاتی ہے اور وہ اپنے فرائض کو بخوبی انجام دینے لگتا ہے اور نیکیوں کو ہر وقت اپنے دل کے اندر موجزن پاتا ہے اکثر علماء اور حکماء اس بات پر متفق ہیں کہ مذہب ہی سب سے قوی

ذریعہ تربیت کا ہے۔ جب بچہ گہوارے میں سوتا ہے تو مذہب ہی اس کو لوری دیتا ہے اور جب وہ جوان ہو کر زندگی کے میدان میں قدم رکھتا ہے تو مذہب ہی اس کو مبارک باد دیتا ہے پھر ہر قدم پر اُس کے ساتھ رہتا ہے اگر وہ بزدل ہو تو اس کے دل میں دلیری اور شجاعت کی روح پھونکتا ہے اگر وہ بخیل ہو تو فیاضی کا جوش اس کی طبیعت میں پیدا کرتا ہے۔ اگر وہ ظالم ہو تو اس کو انصاف پر مجبور کرتا ہے۔ اگر وہ سنگدل ہو تو اس کو رحم کرنا سکھاتا ہے، وہی اس کی عقل کو روشن کرتا ہے، وہی اس کے دماغ میں بلند خیالات بھرتا ہے۔ بچوں کی تربیت میں جن باتوں کا ہونا ضروری ہے اُن میں سے مذہب کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا بلکہ ہر حالت میں اُن کی امداد اور اصلاح پر کمر بستہ رہتا ہے۔ مذہب کا بڑا مقصد یہی ہے کہ جو شخص اس کے احکام پر گردن جھکاتا ہے، اس کو دین اور دنیا میں ترقی کرنے کی قابلیت عطا کرے۔

تعلیم اور تربیت میں یہ فرق ہے کہ جو تعلیم یافتہ ہو وہ ہمیشہ تربیت یافتہ نہیں ہوسکتا اور جو تربیت یافتہ ہو وہ ہمیشہ تعلیم یافتہ نہیں ہوسکتا۔ تربیت کا کمال یہ ہے کہ اخلاق کے ساتھ علم بھی حاصل کیا جائے اور تعلیم کا کمال یہ ہے کہ علم کے ساتھ اخلاق کی اصلاح کا خیال کیا جائے۔ اس بنا پر یہ ضروری ہے کہ جو لوگ بچوں کی تعلیم پر مقرر کیے جائیں وہ عمدہ اخلاق کے زیور سے آراستہ ہوں۔ کیونکہ جس طرح بچوں کو علوم و فنون کا سکھانا ضروری ہے، اسی طرح ان کی طبیعت میں عمدہ اخلاق کا بیج بونا بھی ضروری ہے۔ مذہبی تربیت ایسی ضروری چیز ہے کہ اگر اس سے بچوں کے والدین غفلت کریں اور ان کے سرپرست اس کو سرسری نظر سے دیکھیں تو اُن سے قومی مواخذہ ہوسکتا ہے۔ اس مسئلے پر بہت دنوں تک مباحثہ ہوتا رہا ہے کہ بچوں کو گھر میں تربیت دینا اچھا ہے یا مدرسوں میں۔ مگر اصلی حقیقت یہ ہے کہ اگر گھر پر کامل طور سے بچوں کی تربیت ہوسکتی ہو تو مدرسے کی تربیت سے کہیں افضل ہے۔ لیکن ہر گھر میں عمدہ تربیت کا سامان مہیا نہیں ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ بچوں کو مدرسوں میں بھیجا جائے تاکہ وہ ایسی تربیت حاصل کریں جو اُن کے لیے مفید ہو اور جو اُن کے والدین کے مذہب اور مشرب کے موافق ہو۔ مدرسوں کے طریقۂ تعلیم و تربیت میں اس قدر اختلاف ہے کہ والدین اپنی اولاد کو جب تعلیم و تربیت دینے پر آمادہ ہوتے ہیں تو وہ حیران ہوتے ہیں کہ اس غرض کے لیے کس مدرسے کا انتخاب کریں جس میں تعلیم پاکر وہ دنیا کمانے میں بھی کامیاب ہوں اور سوسائٹی میں بھی عزت کی نظر سے دیکھے جائیں اور جو فرائض خاندان اور قوم و ملک کے ان کے ذمے ہیں اُن کو پورا کریں۔ عمدہ اور اعلیٰ مدارس وہ ہیں جو بچوں کو عمدہ تربیت دے سکیں۔ اُن کے دماغوں کو معلومات کی روشنی سے منور کرسکیں، ان کی عادات و خصائل کو پاکیزہ اور شائستہ بنا سکیں اور ان میں ایسی قابلیت پیدا کرسکیں کہ جب جوان ہو کر وہ سوسائٹی میں داخل ہوں تو اُن خرابیوں، تباہیوں، بد اخلاقیوں اور گمراہیوں کے دور کرنے کی طاقت رکھتے ہوں جو سوسائٹی میں پھیلی ہوئی ہیں۔ بد اخلاقیوں اور گمراہیوں کا سرچشمہ ہمیشہ انسان کی بری خلقت نہیں ہوتی، بلکہ اکثر وہ بری تربیت کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ پس جہاں کہیں تربیت عمدہ ہوگی اور علم و اخلاق پر برابر توجہ مبذول ہوگی، وہاں امن و امان پھیل جائے گا اور ہر قسم کی ترقی کے دروازے کھل جائیں گے اور جہاں کہیں تربیت ناقص اور خراب ہوگی اور بدیوں اور گناہوں کے دفعیہ کی کوشش نہیں کی جائے گی، وہاں فتنہ و فساد برپا ہوگا اور جہالت اور تباہی کا طوفان چھا جائے گا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ قوموں کی پستی اور بلندی، تربیت کے ناقص یا کامل ہونے پر موقوف ہے اور ملکوں کی خوش قسمتی یا بدبختی اس بات پر منحصر ہے کہ ان کے باشندوں کے اخلاق شائستہ ہیں یا نامہذب اور خراب ہیں؟ خاندانوں کا بھی یہی حال ہے جس خاندان کا تنزل ہوتا ہے اور جس پر مصیبت اور افلاس کا ابر گھر کر آتا ہے اس کی اخلاقی اور مالی تباہی کا باعث غالباً یہی ہوتا ہے کہ اس میں بچوں کی تربیت سے بے پروائی کی گئی ہے۔ جب بچے سستی اور کاہلی کی حالت میں پرورش پاتے ہیں تو وہ گویا بدقسمتی کے لیے تیار کیے جاتے ہیں۔ کیوں کہ عیش پرستی اور ناتربیت یافتگی کا اثر ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ جوانمردی اور غیرت کی خاصیت اڑ جاتی ہے۔ جب ایسے بچے جوان ہوتے ہیں اور اُن کی روزی کمانے اور دنیوی کاروبار میں قدم رکھنے کا وقت آتا ہے تو سستی اور کاہلی اور عیش پسندی کے سبب سے ان میں جرأت اور دلیری نام کو نہیں ہوتی اور وہ دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ نہ اُن میں چستی اور پھرتی اور جفاکشی ہوتی ہے جو دنیا میں کام کرنے کے لیے

ضروریات سے ہے وہ اکثر باپ دادا کی کمائی ہوئی دولت کو برباد کر دیتے ہیں اور افلاس اور ذلّت کے گڑھے میں دھکیل دیے جاتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر لوگ اپنے بچّوں کی تندرستی کا رات دن خیال رکھتے ہیں اور ان کی خوشیوں اور امنگوں کے پورا کرنے میں فیاضی سے کام لیتے ہیں مگر ان کی طبیعت کو عمدہ اخلاق سے آراستہ نہیں کرتے اور ایسے وسایل اختیار نہیں کرتے جن سے آئندہ زمانے میں اُن کی حالت درست ہو اور وہ سچی خوشی حاصل کر سکیں۔ تربیت پانے کا کام انھیں پر چھوڑ دیتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ اس کا نتیجہ نہایت خطرناک ہے اور وہ بغیر عمدہ تربیت کے کبھی خوشحال اور فارغ البال نہیں رہ سکتے۔

عمدہ تربیت وہ چیز ہے جو ہمیشہ دنیا کی قوموں اور ملکوں میں انسانی ترقی اور کامیابی کا اعلیٰ ذریعہ رہی ہے۔ تربیت یافتہ انسان نیکیوں کو پسند کرتا ہے، کام کرنے سے جی نہیں چراتا، اعتدال کا خوگر ہوتا ہے اس کے دماغ پر اوہام کی حکومت نہیں ہوتی، اس کے دل میں ناپاک جذبات پیدا نہیں ہوتے۔ وہ حسد اور بغض سے دور بھاگتا ہے، جوانمردی اور عزت کا عادی ہوتا ہے، اس کا شیوہ راست بازی اور راست گوئی کے سوا کچھ نہیں ہوتا اس کا جسم پرہیزگاری کی روح سے بھر جاتا ہے۔ وہ اپنے خاندان کے لیے سرمایۂ ناز اور اپنی قوم کے لیے باعثِ افتخار ہوتا ہے۔ وہ تربیت جس کا ہم نے ذکر کیا لڑکوں کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ اس میں لڑکیاں بھی شامل ہیں اور بالآخر کل قوم کے لیے ضروری ہے۔ اسی تربیت پر ملکوں کی تہذیب اور قوموں کی ترقی کی بنیاد ہے اور اگر یہ نہ ہو تو نہایت بدبختی اور تنزل کی علامت ہے۔ ہندوستان کے سرکاری مدارس میں جو ہندو اور مسلمان بچوں کو تعلیم و تربیت دی جاتی ہے، اگر اس کے اجزا تحلیل کیے جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ایک حصہ جسمانی ورزش کا ہوتا ہے ایک حصہ عقلی تعلیم کا ہے۔ مذہب اور اخلاق کی تعلیم ہندو یا مسلمانوں کے طریقے پر کسی مدرسے میں نہیں دی جاتی۔ اس لیے سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر قوم اپنے طریقے پر مذہب و اخلاق کی تعلیم دینے کے لیے قومی مدارس قایم کرے۔ ہندو مدارس کا حال ہم کو معلوم نہیں ہے مگر اسلامی مدارس جو اس وقت قایم ہیں ان کی حالت دیکھنے کے بعد ہم کو افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اُن میں تہذیب، اخلاق اور تربیت کا مطلق خیال نہیں کیا جاتا اور مذہبی تعلیم کی طرف سے بے پروائی کی جاتی ہے۔ بچوں کے والدین کو یہ توقع ہونی چاہیے اور ہے کہ ان کے بچے قومی مدارس میں تعلیم پا کر انسان بھی بن جائیں گے اور مسلمان بھی۔ مگر افسوس ہے کہ نہ اُن میں انسان بنانے کا سامان ہے نہ مسلمان بنانے کا۔ کاش ہماری قوم کے وہ لوگ جو رفارمر کے لقب سے پکارے جاتے ہیں، اس خطرناک کمی کی طرف اپنی توجہ کو مبذول کریں اور محض سہانی تقریروں اور رنگ آمیز تحریروں سے کام نہ لیں۔ اخلاقی اور مذہبی تربیت کی نگرانی کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ جب تک پوری توجہ اس پر نہ کی جائے گی ممکن نہیں ہے کہ کوئی عمدہ نتیجہ برآمد ہو۔ ہم چند امور کو اس موقع پر لکھنا اپنا فرض سمجھتے ہیں، جن کی طرف اگر توجہ کی جائے گی تو ہمارے قومی مدارس کی تعلیم و تربیت سے فی الحقیقت مسلمان بچوں کی حالت نہایت عمدہ اور شایستہ ہو جائے گی اور وہ جوان ہو کر قومی ترقی کے علمبردار ہوں گے، وہ امور حسب ذیل ہیں:

۱۔ مسلمان بچوں کی تعلیم ایسے معلموں کے ہاتھ میں دی جائے جن کا چال چلن خراب نہ ہو۔

۲۔ مسلمان بچوں کے اخلاق کی نگرانی ایسے استادوں کو سپرد کی جائے جن کا چال چلن نہایت پاکیزہ اور عمدہ ہو۔

۳۔ مسلمان بچوں کی مذہبی تربیت پر ایسے علما مقرر

> اللہ کی خاطر راستی پر قایم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ (سورۂ مائدہ: آیت ۸)

کیے جائیں جو دل سے مذہب کو مانتے ہوں اور جو مذہبی زندگی کا نمونہ ہوں اور جن کی نصیحت دل نشین ہو۔

۴۔ مسلمان بچوں کو بعض اوقات جمع کر کے ایسے مسلمانوں سے مذہب اور اخلاق پر لکچر دلوائے جائیں جو مذہب و اخلاق کے صرف عالم ہی نہ ہوں بلکہ عامل بھی ہوں اور جن کی تقریر موثر ہو۔

۵ مسلمان بچوں کی مذہبی اور اخلاقی درستی اور اس کی ترقی پر انعام مقرر کیے جائیں تاکہ عمدہ نظیر کے دیکھنے سے اور بچوں کے مذہب اور اخلاق میں ترقی کرنے کی ترغیب ہو۔

۶۔ مسلمان بچوں کو بداخلاقی اور ناشائستگی سے محفوظ رکھنے کے لیے ایسے بچوں کو جن کے فاسد اخلاق اصلاح پذیر نہ ہوں اور ایسے معلموں کو جن کا چال چلن خراب ہو توی مدارس سے فی الفور خارج کیا جائے۔

۷۔ مسلمان بچوں کی مذہبی اور اخلاقی تعلیم کے لیے ایسی کتابیں تصنیف کرائی جائیں جن میں خالص مذہبی عقائد اور مذہبی اخلاق پر بہت سے مضامین درج ہوں۔ ان کتابوں کی زبان سلیس اور دلکش ہو اور طرز بیان ایسا دلچسپ ہو کہ ان کے پڑھنے سے بچوں کی طبیعت نہ گھبرائے اور ان کی نصیحتیں دلوں پر خود بخود منقش ہو جائیں۔

"یعقوب کندی کی بدولت عرب پر سے یہ اعتراض اٹھ گیا کہ اب نسل عرب سے کوئی شخص غیر زبانوں کا ماہر یا حکیم و فلاسفر نہیں پیدا ہوا۔ مامون رشید کے زمانے سے چوتھی صدی (ہجری) کے آغاز تک تمام مسلمانوں میں اس کی تصنیفات رائج تھیں اور ارسطو کی تصنیفات کے ہم پلہ خیال کی جاتی تھیں۔ وہ یونانی زبان کا بہت ماہر تھا اور یونانی، فارسی، سنسکرت کے علوم و فنون میں کمال رکھتا تھا۔ اس نے فلسفہ کی بہت سی کتابیں ترجمہ کیں اور بڑا کام یہ کیا کہ اصل کتاب میں جو مشکلات اور پیچیدگیاں تھیں ان کے عقدے حل کر دیے۔ مامون نے اس کو خاص ارسطو کی کتابوں کے ترجمے پر مامور کیا کیونکہ ارسطو کے فلسفے کا سمجھنے والا اس سے بڑھ کر کون ہو سکتا تھا۔"

(شبلی نعمانی)

اردو کے لیے جدوجہد کے تین محاذ

سید حامد

اردو نے آزادی کے بعد کیا کھویا کیا پایا، اس کا جائزہ لینے کا وقت آگیا ہے۔ چالیس سال گزر چکے۔ وہ زبان جس نے سب سے بڑھ چڑھ کر ہندوستان کی آزادی کے گیت گائے تھے، نعرے لگائے تھے، جنگ آزادی کی رجز خوانی کی تھی، لوگوں کو قربانی اور جاں نثاری پر اکسایا تھا؛ آزادی ملنے کے بعد وہی زبان کدورت اور تغافل کا نشانہ بن گئی۔ تاریخ طنز کی مثالیں پیش کرتی چلی آئی ہے، لیکن اتنی بھیانک مثال شاید اس سے پہلے اس کی دسترس سے باہر تھی۔ ہمارا نظام حکومت جمہوری ہے، ہمارے وطن عزیز کا ضمیر سالم و ثابت ہے۔ پھر یہ ناانصافی کیوں کر عمل میں آئی، تاریخ نے یہ طنز کیسے ڈھایا؟

یہ سارا کھیل غلط فہمیوں اور بدگمانیوں اور چھپی ہوئی کدورتوں کا ہے۔ سیاست نے، جسے بالعموم راستی سے بہت زیادہ تعلق نہیں ہوتا، غلط فہمیوں پر پردہ ڈالا، بدگمانیوں پر ملمع کیا، اردو کے ساتھ سر بزم پیمانِ وفا باندھا اور در پردہ وہ اسباب فراہم کر دیے کہ اس کے لیے جینا دشوار ہو گیا۔ اردو کے میمنہ و میسرہ کو کوئی خاص اہمیت نہ دی اور اس کے قلب پر بیدردی کے ساتھ تاخت و تازکی۔ اردو کا قلب کیا ہے؛ دلی، اتر پردیش اور بہار۔ اور دائرہ کو اور تنگ کیجیے تو اتر پردیش اور اس سے متصل دلی کا علاقہ اردو کا دل ہے۔

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی۔

رفتہ رفتہ ایک عام بے مہری اور بے التفاتی کی فضا تیار ہو گئی جس میں سانس لینا اردو والوں کے لیے مشکل ہو گیا۔

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

لیکن دلوں میں اگر دھوکا کھانے کی حسرت تھی تو وہ بار بار پوری ہوئی۔ غریب اردو کے ساتھ تحفظِ حقوق اور حسنِ سلوک کے وعدے ہوتے رہے، ایفا کی نیت یا اس کے اہتمام سے کوسوں دور۔ مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت بھی بدگمانی کی نذر ہو گئی۔ یو۔پی اور دلی میں عام طور پر ابتدائی تعلیم کا یہ نقشہ رہا کہ اگر بازار میں اردو کی کتابیں مل گئیں تو اردو میں پڑھانے والے استاد نایاب۔ نہ قران سعدین ہو سکا، نہ اردو میں تعلیم دی جا سکی۔ جن کو اردو پڑھانے کے لیے رکھا وہ خود اردو سے بھاگنے لگے۔ ثانوی تعلیم میں سہ لسانی فارمولے کو اس طرح توڑا مروڑا گیا کہ اردو پڑھانے کا امکان باقی نہ رہا۔ سب سے کاری ضرب تو جب ہی لگی جب اردو کا ناتہ روزگار سے توڑ دیا گیا۔

اردو کے ساتھ ناانصافی حکومت نے کی، اس کے نفاذ میں سرکاری ملازمین نے کی اور خود اردو والوں نے کی۔ سرکار نے اردو کی اشک شوئی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اردو اکیڈمیاں قائم کیں، ان کو عطیات سے نوازا۔ اردو کی ترقی کے لیے بیورو قائم کیا۔ ترقی اردو کی مرکزی اور ریاستی انجمنوں کو مالی امداد سے زیر بار کیا۔ لیکن دراصل جس

سابق وائس چانسلر - اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ
ہمدرد نگر - نئی دلی۔

بات کی ضرورت تھی، وہی نہ کی۔ اردو کو بیساکھیوں کا عادی بنا دیا، اسے طوقِ زریں سے سجایا مگر اس کی صحت اور توانائی کی کوئی فکر نہ کی۔ چنانچہ اب یہ عالم ہے کہ اکیڈمیوں اور انجمنوں کی امداد سے اردو کی کتابیں چھپتی رہتی ہیں لیکن ان کو خریدنے والے اور پڑھنے والے عنقا ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کا اثر اردو کی تخلیقات کے معیار پر پڑا۔ اہلِ قلم کی فکر جب ہی آزاد رہ سکتی ہے جب انھیں فکرِ معاش کے لیے کسی حکومت یا ادارے یا فرد کا منھ نہ تکنا پڑے۔ اس کی صورت صرف ایک ہے، ان کی کتابیں بکیں۔ یہی چیز اب تقریباً ناممکن ہو گئی ہے۔

انجمن ترقی اردو ہند نے اردو کی تحریک چلائی، بائیس لاکھ دستخط اردو کے حقوق کی حمایت میں جمع کیے۔ بائیس لاکھ اینٹوں سے جو عمارت اُٹھائی گئی تھی وہ ڈھا دی گئی۔ اردو کی تاریخ کا دوسرا بڑا طنزیہ ہے انجمن ترقی اردو ہند مایوس اور دل شکستہ ہو کر بیٹھ گئی۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ زبان کی دال تو گل نہیں رہی؛ ادب سے دل بہلا لیا جائے چنانچہ اس نے نئی اور پرانی کتابوں کی طباعت کا کام زیادہ زور سے شروع کر دیا۔ اس طرح یہ اپنے محور سے ہٹ گئی۔ نہ اس نے یہ سوچا کہ نہ اردو کی دوسری انجمنوں اور اداروں نے کہ زبان کے پڑھنے لکھنے والے باقی نہ رہیں گے تو کتابیں پڑھے گا کون؟ انجمن عوام سے کٹ گئی اور دانشوروں کے حصار میں آ گئی۔ عوام سے کٹنے کا نتیجہ کیا ہوا؟ خواص کے ہاتھوں استحصال۔

چالیس سال کے تجربات اور پیچ و خم کا جائزہ لینے کے بعد انجمن نے فیصلہ کیا کہ وہ ادارہ کو تحریک کی شکل دے گی۔ 'اردو گھر' سے نکل کر اردو والوں کے گھروں تک پہنچے گی۔ خواص کے حلقہ سے نکل کر عوام سے ربط ضبط پیدا کرے گی۔ کوشش کرے گی کہ ہندوستان بھر کے اردو اداروں اور انجمنوں کو وحدتِ مقصد اور اشتراکِ عمل کی لڑی میں پرو دیا جائے۔ اس کی نیت ہرگز یہ نہیں ہے کہ کسی کی قلمرو پر شبخون مارے۔ اس کا ارادہ صرف یہ ہے کہ سب کو ساتھ لے کر اردو کے دفاع اور فروغ کی مہم پر نکلے۔ تاکہ اردو اجتماعی طاقت کا فائدہ اُٹھا سکے اور اس کی آواز حکومت کے ایوانوں اور سیاست کے بازاروں میں احترام کے ساتھ سنی جائے۔

ابھی تک اردو کے سربراہوں نے وقفوں کے ساتھ صرف ایک محاذ پر کام کیا ہے، یعنی حکومت اور اہلِ سیاست کا محاذ۔ نیند سے بیدار ہوئے تو ایک نعرہ دھیمے سروں میں لگا دیا، یا احتجاج کی نحیف صدا بلند کر دی عام چناؤ سے پہلے ان کی کچھ آؤ بھگت بھی ہوتی رہی، وعدوں کا موسم آیا تو اُن کی جھولی بھی بھر گئی۔ فصل کاٹنے چلے تو کچھ ہاتھ نہ آیا۔ خدا خدا کر کے ایک وعدہ پورا کیا گیا، وہ بھی جزوی طور پر، یعنی بہار میں اردو کو دوسری زبان کا درجہ دیا گیا۔ اس کا نفاذ بھی پورے بہار میں ہنوز نہیں ہوا۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ سیاست سے کوئی مفر نہیں ہے، حکومت کو موافق کیے بغیر بات آگے نہیں بڑھتی۔ اس محاذ کو جو ہماری واحد جولانگاہ رہا ہے، نظرانداز کرنا مہلک ہوگا۔ لیکن سیاست اور حکومت کے محاذ کا احترام ہم پر فرض ہے اور احترام کی شکل یہ ہونی چاہیے کہ ہم اتحاد، تنظیم، ترتیب اعتدال اور تواتر کے ساتھ اپنی بات ان تک پہنچاتے رہیں۔ یہ نہیں کہ اچانک کچھ آوازیں بلند کیں، کچھ نعرے لگائے اور پھر خاموش ہو کر بیٹھ گئے اور یہ بھی نہیں کہ گفتگو اور پیمان پر ابہام کا سایہ پڑنے دیا۔ پیمان کو جب تک پالیسی کی وضاحت اور پالیسی کو جب تک پروگرام کی صراحت نہ ملے، دم نہ لینا چاہیے۔

آپ نے کبھی یہ سوچا کہ ہمارے جمہوری اور سیکولر ملک میں، جس کا دستور لسانی اور مذہبی اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے، اردو کے ساتھ ناانصافی کیوں ہو رہی ہے؟ اول تو حکومتوں نے دستور کا صحیح انعکاس اردو پالیسی میں نہیں کیا اور تھوڑا بہت جو کچھ کیا وہ بیشتر اہلِ نفاذ کے تغافل یا تعصب کی نذر ہو گیا۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ جمہوری حکومت عام طور پر کوئی ایسا فیصلہ نہیں کرے گی جو اکثریت جمہور کے خلاف ہو۔ اور اگر ایسا کوئی فیصلہ آئین اور انصاف کی لاج رکھتے ہوئے کر بھی لیا گیا تو اہلِ نفاذ انتہائی خاموشی اور چابک دستی کے ساتھ تاخیر اور تغافل کی مقراض سے اسے پارہ پارہ کر دیں گے۔ اردو کے ساتھ یہی ہوتا رہا ہے۔ یہیں سے ہمیں اردو کے دوسرے محاذ کا سراغ ملتا ہے۔ اس محاذ پر ہم نے ابھی تک کوئی کام نہیں کیا ہے۔ ہندوستان کے عوام کے ایک بڑے طبقے اور خصوصاً ہندی بولنے والوں کے دلوں میں اردو کی طرف سے جو بدگمانیاں ہیں، انھیں دور کرنا ہمارے حق میں ہوگا۔ وہ بدگمانیاں دور

نہ ہوئیں تو ہمارے ہمدرد بھی ہماری مدد نہ کرسکیں گے۔ ہمیں چاہیے کہ ہر جگہ ہر سطح اور ہر موقع پر اس حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے نہ تھکیں کہ اردو کو دوسری ہندوستانی زبانوں سے انسیت اور محبت ہے۔ اردو سراسر خود ہندی الاصل ہے۔ اس کا خمیر اسی خاک سے اُٹھا ہے۔ اس کی ساخت اور نحو وہی ہے جو ہندی کی ہے۔ اس کے ذخیرۂ الفاظ کی غالب اکثریت ہندی ہے۔ ہندی تو اردو کی جڑواں بہن ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ روئے ارض پر کوئی دو زبانیں ایک دوسرے سے اس قدر قریب اور مماثل نہ ہوں گی جتنی ہندی اور اردو ہیں۔ یہ بات بھی بار بار دہرانے کی ہے کہ اردو نے آزادی کی لڑائی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اس نے ہندوستان کے سارے مذاہب کی کتابوں کو اپنے دامن میں عزت و احترام اور ذوق و شوق کے ساتھ جگہ دی ہے۔ اس زبان کا پیغام محبت ہے۔ اس میں نہ جانے کتنی زبانیں اور بولیاں شیر و شکر ہو گئی ہیں۔ اس کی شاعری تصوف اور بھکتی اور صلح کل میں ڈوبی ہوئی ہے۔ وہ فراخ دلی رواداری اور انسان دوستی کا سبق سکھاتی ہے۔ اردو کی ہندی سے کوئی رقابت نہیں ہے۔ وہ ہندی کی بالادستی کو خوش دلی کے ساتھ تسلیم کرتی ہے دونوں زبانوں میں ایک دوسرے کے لیے تغذیہ اور تقویت کا سامان ہے۔ ان کے درمیان باہمی لین دین کا کاروبار برابر چلتا رہا ہے اور چلتا رہے گا۔ اردو اخباروں کے علاوہ ہندی اور انگریزی اور دوسری ہندوستانی زبانوں کے اخباروں اور رسالوں میں بھی یہ باتیں چھپنی چاہئیں اردو والوں کی بساط اور حوصلے اور لگن کے مطابق۔

آپ نے دیکھا کہ پہلا محاذ اہم ہے، دوسرا اس سے زیادہ اہم۔ وہ سَر ہو جائے تو پہلا سرنگوں ہو جائے۔ تیسرا محاذ ان دونوں سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ اس محاذ پر جو کچھ ہم نے اب تک کیا ہے، وہ نہ کرنے کے برابر ہے۔ پہلے دونوں محاذوں پر کامیابی کا انحصار ایک حد تک دوسرے کے تعاون، ان کے مثبت ردّعمل پر ہے لیکن تیسرا محاذ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ ملک گیر پیمانے پر ایثار، اخلاص، لگن اور محنت کو بروئے کار لائے تو یہ مورچہ آپ کے ہاتھ ہے خواہ سارا زمانہ مخالف کیوں نہ ہو۔ یہ محاذ ہے بچوں کو گھر پر اردو پڑھانے کا۔ گھر گھر یا کم از کم محلّہ محلّہ اردو پڑھانے کا انتظام کیجیے۔ اردو والوں کی سب سے کڑی آزمائش یہی ہے۔ اگر اپنے بچوں کو اردو پڑھانے میں وہ اسی طرح غفلت برتتے رہے تو چاہے حکومتوں اور اہلِ سیاست اور جمہور کی اکثریت کا رُخ اردو کے حق میں ہو جائے تو بھی اردو پنپ نہ سکے گی۔ خود اردو والے جب اردو کی مدد نہیں کریں گے، اس کو اپنے گھروں میں جگہ نہ دیں گے تو حکومت یا ہمسائے اردو کو کیا سہارا دے سکیں گے۔

انجمن ترقی اردو ہند نے طے کیا ہے کہ مذکورہ بالا تینوں محاذوں پر تنظیم اور مداومت اور قرینہ کے ساتھ کام کیا جائے گا کیونکہ انجمن اردو کے مسائل پر غور و فکر کرسکتی ہے، اس کی ترجمانی کرسکتی ہے رہبری کرسکتی ہے، تعاون کے لیے التماس کرسکتی ہے۔ اردو بولنے والے اگر اس کی صدا پر لبیک کہیں گے تو کامیابی یقینی ہے اور اگر خدانخواستہ انھوں نے اس نازک موڑ پر بھی تغافل سے کام لیا تو انجمن کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوگی اور اردو کی جان کے لالے پڑ جائیں گے۔ خدا کرے کہ اردو والے اب چیت جائیں کہ دن بہت کم رہ گیا ہے۔

" دوسری جگہوں کے مقابلے میں عالمِ اسلام میں سائنس کے پھولنے پھلنے کا انحصار زیادہ تر اس سرپرستی پر تھا، جو اسے اربابِ حل و عقد سے حاصل ہوتی تھی۔ جہاں مسلمانوں کی معیشت زوال پذیر تھی وہاں سائنس کی حالت بھی ابتر تھی۔ لیکن جہاں کہیں بھی بادشاہوں اور وزیروں کو سائنس سے دلچسپی رہی یا جہاں بھی سائنس سے ان کے نفع، عیش اور عزت میں اضافے کا امکان تھا وہاں یہ شمع جلتی رہی۔"

(پروفیسر عبدالسلام)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ج ۷، ش ۷ (جولائی ۸۸ء)

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

(ڈاکٹر حمیدہ سعید الظفر کی رحلت پر)

آل احمد سرور

۲۹ مئی ۱۹۸۸ء کو صبح سات بجے کے قریب ڈاکٹر حمیدہ سعید الظفر مشہور ماہر امراض چشم اور پروفیسر ایمری ٹس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا دماغ کی رگ پھٹ جانے کی وجہ سے جواہر لال نہرو میڈیکل کالج ہسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی بے ہوشی کی حالت میں اپنے مکان "گل رعنا" سے وہاں لائی گئی تھیں۔ اُن کے منہ سے خون جاری تھا۔ غالباً رات میں کسی وقت وہ اپنے ڈرائنگ روم میں گئیں اور وہاں گر پڑیں۔ تین دن پہلے ان پر لَو کا ہلکا سا اثر ہوا تھا اور بخار بھی تھا جو زیادہ تیز نہ تھا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر سَتّر برس کی تھی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ڈاکٹر حمیدہ سعید الظفر رام پور کے ایک نہایت ممتاز خاندان کی چشم و چراغ تھیں۔ ان کے والد ڈاکٹر سعید الظفر ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے انگلستان کے ساتھی اور گہرے دوست تھے۔ ڈاکٹر سعید الظفر لکھنؤ میڈیکل کالج کے پہلے ہندوستانی پرنسپل تھے اور اپنے معاصرین میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انھوں نے دہرہ دون میں قیام کی غرض سے وہاں ایک بڑا خوبصورت مکان بنا لیا تھا۔ انھیں اَن پڑھ بالغوں کی تعلیم سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ چنانچہ ان کی ایک انگریزی کتاب Urdu for Adults کتابستان الٰہ آباد سے آزادی سے پہلے شائع ہوئی تھی۔ اردو میں ادارہ تعلیم و ترقی دہلی نے ان کی دو کتابیں شائع کی تھیں۔ ان کے بھائی محمود الظفر آکسفورڈ کے گریجویٹ اور مشہور کمیونسٹ رہنما تھے۔ سجاد ظہیر نے اپنی کتاب روشنائی میں ان کی علمی، تنظیمی صلاحیت اور باقاعدگی کا بڑے لطف سے ذکر کیا ہے۔ ان کی بھاوج ڈاکٹر رشید جہاں اردو کی ممتاز افسانہ نگار اور سیاسی و سماجی کارکن تھیں۔

ڈاکٹر حمیدہ سعید الظفر نے پہلے لکھنؤ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس اور پھر OPTHALMOLOGY M S کیا۔ میری ملاقات ان سے سب سے پہلے لکھنؤ میں قیصر باغ کے قریب اس مکان میں ہوئی تھی جہاں ان کے بھائی اور بھاوج رہتے تھے۔ یاد پڑتا ہے کہ ڈاکٹر سی بی مصرا صدر شعبہ جو گرو جی کہلاتے تھے خود انھیں M S میں کامیابی کی اطلاع دینے آئے تھے۔ وہ شعبے کی بہت ممتاز اسکالر تھیں۔ اس کے بعد وہ امراض چشم میں ڈی لینے انگلستان گئیں اور وہاں سے واپسی کے بعد ہی موہن لال آئی ہسپتال علی گڑھ لے لی گئیں۔ جب یونیورسٹی نے امراض چشم کا انسٹی ٹیوٹ موہن لال ٹرسٹ کے تعاون سے قائم کیا تو وہ اس میں پہلے ریڈر اور پھر پروفیسر مقرر ہوئیں۔ انھیں دو سال کی توسیع دی گئی اور اس کے بعد پروفیسر ایمری ٹس مقرر کیا گیا۔ حال میں W.H.O. کی طرف سے انھوں نے اس کے مرکزوں کے کام کی جانچ کے لیے ہندوستان، سری لنکا، بنگلہ دیش اور برما کا دورہ کیا تھا۔ انھوں نے انگلستان سے اپنے مخصوص فن میں پی ایچ ڈی بھی کرلیا تھا۔ وہ امراض چشم کی بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کرتی تھیں اور ان کے ایک شعبے کی صدارت بھی کی تھی۔ درس و تدریس کے علاوہ انھیں ریسرچ سے بھی گہری دلچسپی تھی اور ان کے متعدد مقالے شائع ہو کر بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ وہ نہایت پابندی سے ہفتے میں دو بار مریضوں کو دیکھتی تھیں۔ ہر شخص کا معائنہ ان کے نمبر کے مطابق

سابق صدر شعبہ اردو، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ ۔ سر سید نگر۔ علی گڑھ۔

ہوتا تھا - امیر غریب کی تخصیص نہ تھی - وہ معائنے میں مرض کے ہر پہلو پر پوری توجہ کرتی تھیں اور طلبا جو موجود ہوتے ان کے لیے بعض نکتوں کی تشریح بھی کرتی جاتی تھیں - وہ بہت اچھی سرجن تھیں اور بہت اچھی معالج۔ اپنے مریضوں سے بڑی ہمدردی اور دل سوزی سے پیش آتی تھیں - فضول باتیں کرنے کے بجائے کام کی بات پر ان کا اصرار تھا - انھوں نے آنکھ کے پردے (retina) کا لا پانی (glaucoma) اور fundus کے امراض میں امتیاز حاصل کیا تھا - سارے ہندوستان سے ان کے پاس مریض آتے تھے - ان کے شاگرد بھی ہندوستان کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے تھے - اُن کی وجہ سے ڈاکٹر موہن لال کے بعد یونیورسٹی کا یہ انسٹی ٹیوٹ امراض چشم کے لیے ایک ہندوستان گیر شہرت کا ادارہ بن گیا تھا۔

اپنے باپ کی طرح وہ اپنے پیشے میں ممتاز ہی نہ تھیں، امام فن بھی تھیں اور انھیں کی طرح بعض دوسرے معاملات سے بھی دلچسپی تھی - وہ بہت اچھی فوٹو گرافر تھیں اور اس کے علاوہ انھیں پرندوں کی عادات کا مطالعہ کرنے کا بھی شوق تھا - اس کی وجہ سے وہ ڈاکٹر سالم علی سے بہت قریب آ گئی تھیں - انھیں کے اثر سے ڈاکٹر سالم علی نے یونیورسٹی میں Wild Life کے مطالعے کا ایک الگ شعبہ کھلوایا تھا - میرے نواسے عرفی نے جب علی گڑھ کے پرندوں پر ایک وضاحتی فہرست تیار کی تو اس میں ڈاکٹر حمیدہ کی رہنمائی اور ہمدردی شامل تھی - اپنے شاگردوں پر وہ بڑی شفقت کرتی تھیں اور پیشے کے علاوہ ان کی ذاتی ضروریات پر بھی توجہ کرتی تھیں - انتقال سے تین دن پہلے ایک مریض کو دیکھا اور اس سے کہا کہ تم جون کے وسط میں ایک دفعہ اور آؤ - مریض نے کہا مجھے تو اب کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی - ڈاکٹر حمیدہ نے بے ساختہ کہا - تمھیں ضرورت نہیں مگر تمھاری آنکھوں کو ضرورت ہے -

ڈاکٹر حمیدہ صاف گو تھیں، لگی لپٹی نہیں رکھتی تھیں - ان کے دل میں دکھی انسانوں کے لیے ہمدردی کا ایک سمندر موجزن تھا - اُن کی زندگی بڑی مرتب اور منظم تھی - انھوں نے شادی نہیں کی تھی - ان کا پیشہ ہی ان کا سب کچھ تھا - وہ بڑی وضعدار خاتون تھیں، جن سے مراسم تھے ان سے آخر تک اسی گرم جوشی سے پیش آتی رہیں -

اپنے پیشے کی جدید ترین تحقیقات پر تو ان کی نظر رہتی ہی تھی، سائنسی، علمی، تہذیبی اور ادبی مسائل سے بھی گہری دلچسپی رکھتی تھیں خیالات کے اعتبار سے وہ بائیں بازو سے قریب تھیں مگر انھوں عملی سیاست میں کبھی حصہ نہیں لیا - ادھر وہ اپنی خود نوشت لکھ رہی تھیں اپنے والد کی کتاب URDU FOR ADULTS کو دوبارہ چھپوا تھیں - افسوس کہ موت نے انھیں اتنی مہلت نہ دی کہ وہ یہ سب کا

میرے چالیس سال سے اوپر سے اُن سے مراسم تھے - ان خلوص کی گرمی تھی اور لہجے میں ایک وقار - ڈاکٹر اسلام الحق انصا سے بھی پرانے مراسم تھے - ڈاکٹر اسلام الحق ان کے چچا کے ساتھی تھے عید کے دن اُن سے اور مجھ سے ملنے آئی طبیعت میں ایک براقی تھی اور کبھا ر بہت پتے کی بات کہہ جاتی تھیں - ایک دفعہ فرمانے لگیں - جو شخص دن میں پانچ دفعہ نماز پڑھتا ہے اسے کبھی [illegible] نہیں ہو سکتی -

آہ رام پور کی یہ دختر نیک اختر، لکھنؤ کی یہ گوہر شب چراغ علی گڑھ کی یہ آبرو، اپنے فن کی یہ امام اور مجتہد، انسان دوستی کی تہذیب اور شائستگی، اخلاق اور دل سوزی کی یہ جیتی جاگتی تصویر ہم سے رخصت ہو گئی - اس نے ہزاروں کی زندگی کے دھندلکے میں روشنی کی کرن دوڑائی، ہزاروں کو مایوسی کی دلدل سے نکالا اور زندگی کا مقابلہ کرنا سکھایا - اُن کا جسم خاکی تو خاک ہو گیا، مگر ان کی روح کے ایک مینار کی طرح، علم و عمل میں امتیاز، بہترین معیار ان کی جستجو انسانیت کی اعلیٰ قدروں کی لگن کے لیے اپنے ساتھیوں، شاگردوں دوستوں اور ملنے والوں کو اکساتی رہے گی -

وہ جس کی چارہ گری میں ادائے محبوبی
وہ جس نے کتنے دھندلکوں کو روشنی دی تھی
نہ جانے کتنے اندھیروں کی چاک کی تھی قبا
نہ جانے کتنے مریضوں کو زندگی دی تھی
(سرور)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد نمبر ۷، شمارہ نمبر ۷ (جولائی ۸۸ء)

ادنیٰ سے اعلیٰ جانوروں کے ذہن اور ذہانت کا ارتقاء اور وجوہ

محمد بابر مرزا

علم الحیوانیات کے نامور پروفیسر ڈاکٹر محمد بابر مرزا سابق صدر شعبۂ حیوانیات اور سابق ڈین فیکلٹی آف سائنس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ انہوں نے ملک بالخصوص علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں علم الحیوانیات میں جدید خطوط پر تحقیق و تدریس کی بنیاد ڈالی اور اسے انتہائے کمال تک پہنچایا۔ یہ مقالہ انھوں نے تقریباً پینتالیس ۴۵ سال پہلے لکھا تھا۔ ہمیں اس کا مسودہ ان کے شاگرد رشید پروفیسر ڈاکٹر اطہر صدیقی کے توسط سے ملا ہے۔ ہم پروفیسر صدیقی کے انتہائی ممنون ہیں جن کی علم دوستی کی بدولت یہ نادر تحریر قارئین تہذیب الاخلاق کے سامنے آئی۔ [ادارہ]

ایک مرتبہ جب کہ میں انسانی ذہن اور ذہانت پر تقریر کر رہا تھا ایک فلسفہ داں نے مجھ سے سوال کیا کہ آیا ذہن پہلے پیدا ہوا کہ ذہانت؟ اس سوال کا جواب میں سوال کی شکل میں یوں دے سکتا تھا کہ جناب والا بتایے کہ پہلے مرغی پیدا ہوئی کہ انڈا؟ یہ بات حاضرین جلسہ کو محظوظ کرتی لیکن ہم سائنس داں آنکھیں بھینچ کر کبھی جواب نہیں دیتے۔ ہمارے پاس تو اس بات کا بھی جواب ہے کہ پہلے مرغی پیدا ہوئی کہ انڈا۔ میرا کہنا یہ ہے کہ پہلے ذہن پیدا ہوا اور بعد میں ذہانت۔

دنیا میں کوئی جانور ایسا نہیں ہے جس میں اعصاب نہ پائے جاتے ہوں۔ سب سے ادنیٰ جانور جو صرف ایک خانوی ہوتے ہیں اور جن کو ہم نخز لیوان کے نام سے موسوم کرتے ہیں، ان میں بھی اعصاب پائے جاتے ہیں۔ یہ ننھی منی جانیں خردبینی ہوتی ہیں اور پانی میں رہتی ہیں۔ اگر آپ ان کے قریب ایک خردبینی ریتے کے ذرّے کو ڈال دیں تو یہ اس کی طرف غذا سمجھ کر بڑھتا ہے اور اس کو اپنے جسم میں داخل کر لیتا ہے لیکن فوراً ہی خارج کر دیتا ہے۔ اگر غذا کا ذرّہ ہو تو اس کو یہ جسم میں رکھ کر ہضم کرتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس جانور میں اعصاب ہیں لیکن ذہانت نہیں۔ اگر ذہانت ہوتی تو یہ ریتے کے ذرّے کے قریب دوسری مرتبہ نہ جائے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے اعصاب یا ذہن پیدا ہوا اور اس کے بعد ذہانت وجود میں آئی۔ اِن سادہ ترین جانوروں کے مقابلے میں اعلیٰ طبقے کے جانوروں میں اعصاب بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں۔ جسم کے ایک خاص حصّہ پر اعصاب کے مجموعہ کو ہم مغز یا دماغ قرار دیتے ہیں۔ آپ زمینی کینچوے کو دیکھیے۔ اس کے نہ تو کان ہیں اور نہ آنکھیں لیکن یہ روشنی کی موجودگی کو محسوس

سابق صدر ڈپارٹمنٹ آف زوولوجی۔ اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ۔

کرتا ہے۔ اس کی جلد یا کھال پر نہایت ہی باریک اعصاب پھیلے رہتے ہیں سارے جسم کے اعصاب اس کے جسم کے اگلے حصے پر مل کر اس کا دماغ بناتے ہیں۔ بارش کے موسم میں اگر آپ اندھیری رات کو روشنی لے کر نکلیں تو آپ کو سیکڑوں کینچوے زمین کے اوپر دکھائی دیں گے۔ یہ اندھیرے میں نکلتے ہیں اور جوں ہی اِن کے جسم پر روشنی پڑتی ہے، یہ زمین دوز ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان میں اعصاب ہوتے ہیں۔ کیوں کہ قوت حس بغیر اعصاب کے ہرگز نہیں پائی جاتی۔ بے ریڑھ کے ہڈی دار جانوروں میں سب سے اعلیٰ پیمانے پر دماغ چیونٹیوں میں پایا جاتا ہے۔ گو ایک چیونٹی کا دماغ ایک نقطہ کے برابر ہوتا ہے، لیکن اس میں ذہانت اس بلا کی ہوتی ہے کہ بہت سے انسانوں کے کرتب کو مات کرتی ہے۔ یہ ننھی منی سی چیونٹی اپنے رہنے کے لیے ایک عالی شان قصر تہ زمین تیار کرتی ہے۔ غذا کی تلاش میں دور دراز کا سفر کرتی ہے اور بخیر و عافیت گھر واپس ہوتی ہے۔ اپنے مکان میں خاص قسم کے کیڑے لا کر رکھتی ہے۔ ان کا دودھ دوہتی ہے۔ پھپھوند کی روٹی تیار کرتی ہے۔ اپنے انڈوں کو دھوپ دینے کے لیے مکان کے باہر لے جاتی ہے اور سورج غروب ہونے سے کچھ قبل گھر واپس آتی ہے۔ اپنے گھر کی حفاظت کرتی ہے۔ اپنے دشمنوں سے اپنے آپ کو بچاتی ہے۔ اپنے ساتھیوں کی امداد کرتی ہے اور امن و امان کے ساتھ اپنے کنبہ میں نہایت آرام دہ زندگی بسر کرتی ہے۔ اس کی ذہانت پر ہمارے دماغ چکراتے ہیں اور ہم اس کی عقل مندانہ حرکتوں کو جبلت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ

لے کاہل! چیونٹی کے پاس جا اور اس کی رہائش کے طریقے
سیکھ کر عقل حاصل کر۔"

اب ہم آپ کو ریڑھ کی ہڈی دار جانوروں کی مثال دیں گے۔ اگر ہم ادنیٰ جانور سے بڑھتے ہوئے اعلیٰ جانوروں کا ان سے مقابلہ کریں یعنی ارتقائی اصول کے لحاظ سے نیچے سے اوپر کی طرف چڑھیں تو ہم کو یہ بات معلوم ہوگی کہ جیسے ہم اوپر چڑھتے جائیں گے ویسے ہی دماغ بڑھتا ہوا پایا جائے گا۔ مگر مچھ کی کھوپڑی کی گنجائش صرف ۲۵ مکعب سینٹی میٹر ہوتی ہے (ایک انچ تقریباً ۲½ سینٹی میٹر کے برابر ہوتا ہے) جنگلی سور کی ۲۰۰، شیر کی ۳۲۱۔ گوریلا بندر کی ۵۲۵ اور انسان کی ۱۵۰۰ ہوتی ہے

اب آپ دیکھیے کہ ایک چھوٹے سر کے بیوقوف جنگلی سور اور جانوروں کے بادشاہ یعنی شیر میں کس قدر بڑا فرق ہے! اور پھر شیر اور انسان یعنی اشرف المخلوقات کے دماغ میں کس قدر فرق ہے!

اگر ہم حیوانی دنیا پر ایک نظر ڈالیں تو یہ بھی معلوم ہوگا کہ دماغ کوئی ریاضیاتی مساوات کا مسئلہ نہیں ہے۔ وہیل مچھلی اور انسان جسامت میں ایسا ہی فرق ہے جیسا کہ ایک چوہے اور شیر کے جسم میں۔ مچھلی کا دماغ شہد کی مکھی کے دماغ سے چالیس ہزار گنا بڑا ہوتا ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ وہیل مچھلی شہد کی مکھی سے چالیس ہزار گنا زیادہ عقل مند ہے۔

دماغ صرف عضو ذہانت ہی نہیں بلکہ ایک عصبی آلہ ہے (ایک بر آرندہ حسی عضو جس کے ذریعے احساسات ظاہر کیے جاتے ہیں) دماغ کی جسامت خالص جسمی افعال کے اقسام و مدیر انحصار رکھتی ہے۔ بڑے جانوروں کو بہ مقابلہ چھوٹے جانوروں کے اور چست و چالاک جانوروں کو بہ مقابلہ سست اور بھدے جانوروں کے۔ بڑے دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے جانور جو زمین کے اندر رہتے ہیں مثلاً چھچھوندر وغیرہ ان کا شمی فص اس قدر بڑا ہوتا ہے کہ اس کے سامنے ایک چھوٹے بندر کا مکمل دماغ بھی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ گھوڑے کے دماغ میں برآرندہ کرّے نہایت بڑے ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ یہ ایک چست جانور ہے۔ اس کا مقابلہ گینڈے کے بر آرندہ کرّوں سے نہیں کرسکتے۔ کیونکہ آخر الذکر ایک سست جانور ہے اور اس کو بر آرندہ کرّوں کی چنداں حاجت نہیں۔

گھوڑے کا کام بھاگ دوڑ ہے۔ چنانچہ اس کے پیروں کے اعصاب نہایت ہی جسیم اور اعلیٰ پیمانے پر پائے جاتے ہیں۔ گینڈا بھاگتا دوڑتا بہت کم ہے۔ چنانچہ اس کے پیروں کے اعصاب کمزور ہوتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دماغ۔ دماغ کے حصے و اعصاب ضرورت کے لحاظ سے بڑے اور چھوٹے پائے جاتے ہیں۔

یہ بات تعجب خیز ہے کہ عالم حیوانات میں انسان کا دماغ نہ تو وزن اعظم رکھتا ہے اور نہ دوسرے جانوروں کے مقابلے میں زیادہ وزنی ہوتا ہے۔ ہالر کے قانون کے مطابق جانور جتنا چھوٹا ہوگا اتنا

اس کا دماغ وزنی ہو گا۔ اگر ہم جانوروں کو دماغی وزن کی بنا پر ترتیب دیں تو انسان کا نمبر دنیا کے سب سے بڑے جانور وہیل مچھلی اور ہاتھی کے بعد آتا ہے اور اگر ہم جانوروں کے دماغ کو اضافی وزن کے مطابق ترتیب دیں تو انسان چمپانزی اور بجھو بندر کے درمیان رکھا جاتا ہے۔ دونوں حالتوں میں انسان کا دماغ ذہانت کے لحاظ سے سب جانوروں سے افضل ہے بندر بھی دماغی اعتبار سے کچھ بہت پیچھے نہیں۔

جیسے جیسے جانور ترقی کرتے گئے ہیں، ویسے ویسے ان کا دماغ اور ذہانت بڑھتی گئی ہے۔ بن مانس کا دماغ چھ سو مکعب سینٹی میٹر ہوتا ہے۔ بن مانس سے اعلیٰ طبقہ پر پائتھی کنتھروپس تھا۔ اس کا دماغ آٹھ سو پچاس مکعب سینٹی میٹر تھا۔ موجودہ انسان کا دماغ پندرہ سو مکعب سینٹی میٹر ہوتا ہے۔

جیسے جیسے کہ تہذیب و تمدن ترقی کرتے جاتے ہیں، دماغ بھی بڑھتا جاتا ہے ایک سو حبش کے ہاٹنٹوز اور اسی تعداد میں آسٹریلیا کے باشندے چینی اور یوروپین کو اگر جمع کیا جائے اور ایک بڑے کمرے کے چار دروازے دماغ کے وزن کے لحاظ سے رکھے جائیں یعنی پہلا دروازہ ان لوگوں کے داخلے کے لیے جن کا دماغ بارہ سو مکعب سینٹی میٹر سے کم ہو تو یہ دیکھا جائے گا کہ سب سے زیادہ تعداد ہاٹنٹوز کی اس دروازے میں سے گزرے گی۔ تقریباً پچاس آسٹریلین، آٹھ یوروپین اور صرف دو چینی داخل ہو سکیں گے۔

دوسرے دروازے سے صرف ان لوگوں کو داخل ہونے کی اجازت دی جائے جن کا دماغ بارہ اور چودہ سو مکعب سینٹی میٹر کے درمیان ہو تو چاروں قوموں کی کثیر تعداد گزرے گی۔ تقریباً پچاس ہاٹنٹوز و آسٹریلیا کے اصل باشندے۔ چالیس یوروپین اور اڑتیس چینی گزریں گے۔

تیسرے دروازے سے صرف ان کو داخل ہونے کی اجازت دی جائے جن کا دماغ چودہ و پندرہ مکعب سینٹی میٹر کے درمیان ہو تو تصویر بالکل بدل جائے گی۔ ایک ہاٹنٹوٹ بھی نہیں گزر سکے گا۔ صرف پانچ آسٹریلین اور بیس سے کچھ زیادہ یوروپین و چینی داخل ہو سکیں گے۔

اگر چوتھے دروازے سے صرف ان کو داخل ہونے کی اجازت دی جائے جن کا دماغ پندرہ سو سے زیادہ ہو تو آسٹریلین کے لیے بھی دروازہ بند رہے گا۔ صرف ستائیس یوروپین لیکن ۳۳ چینی گزر سکیں گے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ تمدن کی رفتار کا اثر دماغ پر پڑتا ہے۔ چونکہ چینی تہذیب و تمدن نہایت ہی قدیم ہے اس وجہ سے ان کا دماغ بھی اس قدر بڑا اور اعلیٰ ہے کہ اب تک دماغی وزن میں ان کو دنیا کی کسی قوم نے بھی فتح نہ کیا۔

دماغ اور ذہانت پر صحبت کا بھی بہت اثر پڑتا ہے۔ روس کی مختلف عورتوں میں حسب ذیل سر کا ناپ پایا گیا:

۱۔	طوائفوں میں	۵۳٫۲	سینٹی میٹر
۲	چوروں میں	۵۳٫۶	" "
۳	کسانوں میں	۵۳٫۷	" "
۴	تعلیم یافتہ عورتوں میں	۵۳٫۸	" "

فرض کرو کہ دو بھائی ایک ہی سی ذہانت اور قابلیت رکھتے ہیں لیکن ہر ایک مختلف پیشہ اختیار کرتا ہے۔ ایک تو ترقی کر کے سفیر بن جاتا ہے اور دوسرا پادری بن کر مختلف گاؤں میں وعظ دیتا پھرتا ہے یہ دیکھا جائے گا کہ اول الذکر کا دماغ بڑھے گا۔ اس وجہ سے کہ اس کی صحبت اعلیٰ ہے اور ذہانت بڑھنے کے مواقع ہیں۔ اس کی زندگی چست ہے۔ وہ ہر وقت نئے مسئلہ کو حل کرنے کی فکر میں رہتا ہے چنانچہ دماغی کام کرتا ہے جس کی وجہ سے دماغ کو متواتر خون پہنچتا رہتا ہے۔ چنانچہ دماغ و ذہانت بڑھتی جاتی ہے۔ دوسرے بھائی نے انجیل کو حفظ کر لیا ہے اور بغیر دماغ پر زور ڈالے ہوئے وعظ دے جاتا ہے۔ اس کا دماغ ترقی نہیں کرتا کیونکہ اس کی صحبت اس سے کم تعلیم یافتہ دیہاتیوں کی رہتی ہے۔

جتنا دماغی کام کیا جائے گا اتنا ہی دماغ بڑھتا جائے گا۔ تعلیم یافتہ انسان کا دماغ جاہل کے دماغ سے کہیں زیادہ بڑا ہوتا ہے۔ لیکن ہمیشہ ہر شخص میں نہیں بلکہ اوسط لینے پر۔ ہم ہمیشہ سو آدمیوں کا اوسط لیتے ہیں۔ تعلیم یافتہ لوگوں کا دماغ ہر ایک فرد میں ایک سا نہیں ہوتا۔ شوپن ہاور جو ایک مشہور فلسفہ داں تھا۔ اس کی کھوپڑی کی غیر معمولی گنجائش ۱،۵۹ مکعب سینٹی میٹر تھی اور لائیب نتز جو اسی پلے کا آدمی تھا صرف ۱۴۰۹ تھی۔ رافائیل ایک نہایت ہی

ہین شخص تھا لیکن اس کی کھوپڑی کا ناپ صرف ۵۰،۲ سینٹی میٹر تھا۔ ایک شخص جس کی کھوپڑی کا ناپ صرف ۵۴ سینٹی میٹر ہو۔ نہایت ذہین ہو سکتا ہے اور دوسرا جس کا ناپ ۶۰ سینٹی میٹر ہی کیوں نہ ہو نالایق ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر ہم تنو ذہین اشخاص کی کھوپڑیوں کا اوسط لیں تو یہ تنو جاہلوں کے اوسط سے ۱۲ سینٹی میٹر ناپ میں اور ۷۵ مکعب سینٹی میٹر جسامت میں بڑا رہتا ہے۔

جب ایک مصور کام کرنے بیٹھتا ہے تو اس کا سر گرم ہو جاتا ہے۔ ایک قابل آدمی کا سر جلنے لگتا ہے جس وقت وہ کسی مسئلے کو حل کرتا ہے۔ اشعار لکھتے وقت شاعر کی کنپٹیاں جلتی ہے اور وہ مثل شمع کے بھڑکتا ہے۔ جرمنی کا مشہور شاعر شلر۔ شاعری کرتے وقت اپنے پیروں کو ایک ٹھنڈے پانی سے بھری ہوئی بالٹی میں ڈبوئے رکھتا تھا۔ ایک حبشی چاہے دن رات فلسفہ چھانٹے لیکن اس کا دماغ شوپن ہاؤر اور کانٹ کے دماغ کی جسامت کا مقابلہ نہیں کر سکتا لیکن اس کے ساتھ اس بات کا بھی خیال رہے کہ شوپن ہاؤر اور کانٹ کا دماغ ہرگز اس قدر نہ بڑھتا اگر وہ بچپن سے فلسفیانہ خیالات پر مائل نہ ہوتے۔ گوئٹے جرمنی کا ایک نہایت قابل شاعر تھا۔ اس کی قابلیت کا چرچا تمام عالم میں ہے۔ اس کا دماغ اس بات کا ثبوت دینے کے لیے کہ دماغی کام کرنے سے دماغ بڑھتا ہے نہایت ہی بہترین مثال ہے۔ عموماً ۴۰ اور ۵۰ برس کی عمر کے درمیان دماغ اپنی افضل جسامت کو پہنچ جاتا ہے لیکن گوئٹے کا دماغ متواتر اس کی وفات تک بڑھتا رہا۔ ۶۵ برس کی عمر تک وہ زندہ دلی سے پُر تھا جس کا ثبوت اس کی اس عمر میں لکھی ہوئی کتاب "دیوان" کا ہے۔ ۸۰ برس کی عمر میں اس نے کئی دلچسپ کتابیں لکھیں اور اپنی موت سے کچھ ہی دن قبل ۸۲ برس کی عمر میں "فاؤسٹ" کو ختم کیا۔

ایک ماہر نے اس بات کو معلوم کیا کہ گوئٹے کا دماغ موت تک برابر بڑھتا رہا۔ چوبیس اور تیس برس کی عمر میں گوئٹے کے سر کا ناپ ۹۴ سینٹی میٹر تھا۔ ۳۰ اور ۵۰ کے درمیان ۱۱۰۔ ستر کی عمر میں ۱۱۲ اور ۸۰ برس میں ۱۱۶ سینٹی میٹر تھا۔

بچپن ہی سے مرد کا دماغ بہ نسبت عورت کے زیادہ وزنی ہوتا ہے۔ مردوں کا اوسط وزن ۱۴۰۰ گرام ہے اور عورت کا ۱۲۵۰ گرام۔ ایک تازہ وارد لڑکے کا دماغ ۴۲۰ مکعب سینٹی میٹر ہوتا ہے اور لڑکی کا ۴۱۰۔ یہ فرق عمر کے ساتھ بڑھتا رہتا ہے۔ ایک سال کی عمر کے بعد لڑکے کا دماغ ۸۵۰ اور لڑکی کا ۷۲۵ ہوتا ہے۔ تیس سال کی عمر کے بعد لڑکے کا ۱۵۰۰ اور لڑکی کا ۱۳۵۰ ہو جاتا ہے۔ پیدائش کے وقت لڑکے اور لڑکی کے دماغ میں صرف ۱۰ مکعب سینٹی میٹر کا فرق تھا لیکن بالغ ہونے کے بعد ۱۸۰ کا فرق ہو جاتا ہے۔ اگر ہم مختلف قوموں کے مردوں اور عورتوں کے دماغ کا مطالعہ کریں تو دونوں کے دماغ میں بہت زیادہ فرق پایا جائے گا۔ بالغ حبشی مرد اور عورت کے دماغ میں صرف ۷۰ مکعب سینٹی میٹر کا فرق ہوتا ہے۔ امریکن میں ۸۰۔ مالایاکن میں ۱۰۰۔ یوریشین میں ۱۲۵ لیکن ہندوستانی مرد اور عورت کے دماغ میں ۲۷۰ مکعب سینٹی میٹر کا فرق پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ افریقہ کے مرد اور عورت باشندوں کے کام میں بہت کم فرق ہے۔ مرد اور عورتیں آپس میں ملتے جلتے رہتے ہیں اور تقریباً ایک ہی سی صحبت ہوتی ہے۔ ہندوستان میں اس وجہ سے اتنا فرق پایا جاتا ہے کہ یہاں پر پردہ کے وجہ سے عورت کی صحبت کو بالکل ترک کر دیا جاتا ہے۔ ہماری عورت کنج قفس میں رہتی ہے۔ مرد اس سے صرف کھانے، کپڑے وغیرہ کی باتیں کرتا ہے۔ عورت کی صحبت نوکرانیوں سے ہوتی ہے۔ اگر پردہ قایم رہا تو کچھ صدیوں بعد ہندوستانیوں کا دماغ بمقابلہ اور اقوام کے بہت گھٹیا ہو جائے گا۔ مرد اپنے دماغ کو روپیہ کمانے کی غرض سے استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ اس کا دماغ بڑھتا رہتا ہے لیکن ہندوستانی بیویاں گھر بیٹھے کھاتی ہیں۔ بچوں کی دیکھ ریکھ اُلٹی سیدھی کرتی ہیں۔ سیتی پروتی ہیں۔ بہرحال مرد سوچتا ہے اور عورت صرف محسوس کرتی ہے لاکھوں برس پہلے بھی یہی حالت تھی اور موجودہ دنیا میں بھی یہاں زیادہ تر ایسی ہی حالت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ مردوں اور عورتوں کے دماغ میں یہ فرق خواہ کم ہو یا زیادہ، پایا ضرور جاتا ہے۔ میں آپ کو پھر اس بات پر رجوع ہونے کی درخواست کروں گا کہ ہم ہمیشہ اوسط نکالتے ہیں۔ آپ کسی ایک خاص قابل عورت کی مثال دے کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ ہزاروں

ردوں سے زیادہ قابل ہے۔ چنانچہ عورتوں کا دماغ مردوں کے دماغ سے زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اگر آپ اس قابلہ کو اور ۹۹ عورتوں کے ساتھ رکھ کر اوسط نکالیں تو یہ بیچاری قابلہ ۱۰۰ عورتوں کے دماغ کے اوسط کو سن کر نہایت ہی شرمندہ ہوگی اور ۹۹ عورتیں اس کو نیچا دکھا دیں گی۔

متّو پروفیسروں اور متّو مزدوروں کی کھوپڑی کی پیمائش لے کر یہ معلوم کیا گیا ہے کہ پروفیسروں کا دماغ مزدوروں کے دماغ سے کہیں زیادہ بڑا ہوتا ہے۔ ایک فرد میں یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ ایک شخص جس کا دماغ بڑا ہو ایک چھوٹے دماغ والے انسان سے زیادہ عقلمند ہوگا اب تک سب سے بھاری دماغ ایک نالائق شخص کا دیکھا گیا ہے۔ یہ ایک اوسط دماغ سے دوگنہ بھاری تھا۔ اس کے دماغ کی جھلی جس میں ذہانت کی بافت پائی جاتی ہے، بہت زیادہ موٹی تھی جس کی وجہ سے دماغ تو نہایت بھاری تھا لیکن ذہانت بالکل نہ تھی۔

انسان کا دماغ تغیّر پذیر ہے۔ اس کے بہت سے حصّے بدل رہے ہیں۔ انسان کی قوتِ ذہانت اس کے دماغ کی سطح پر پائی جاتی ہے۔ دماغ کے اندر موجودہ زمانے میں بھی اس قدر بیکار گنجائش ہے کہ ایک شخص اس کو نکال دینے پر بھی کوئی فرق محسوس نہیں کرے گا۔ جتنا دماغ سے کام لیا جائے گا اتنا ہی خون دماغ کو پہنچے گا اور اسی قدر ذہانت کے خلیے دماغی جھلّی پر پیدا ہوں گے اور انسان کو ذہین کریں گے۔

> بادشاہوں کو کبھی آرام یا عیش و عشرت کی زندگی نہیں بتانی چاہیے۔ یہ غیر مردانگی کی عادت ہے۔ ملکوں اور بادشاہوں کی بربادی کی وجہ یہی چیز ہوتی ہے۔ بادشاہوں کو اپنی حکومت میں نشیلی چیزیں یا شراب بیچنے یا پینے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ اس سے رعایا کا کردار خراب ہو جاتا ہے۔ اس مد کی آمدنی کو انھیں حرام سمجھنا چاہیے۔"
>
> (اورنگ زیب عالمگیرؒ)

اردو کا سب سے کثیر التصانیف مصنف

محمد انصار اللہ ؔ

اس دنیا کے معاملات بہت عجیب ہیں۔ بعض لوگ محض چند صفحے لکھ کر شہرت و ناموری کی معراج پالیتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو ساری عمر تصنیف و تالیف میں بسر کرتے ہیں، پھر بھی کوئی ان کا نام تک نہیں جانتا۔ میر علی اوسط رشک نے خوب کہا ہے ؎

نہیں موقوف اولاد و کمال و خلق و دولت پر
بڑی تقدیر ہے دنیا میں جس کو نام ملتا ہے۔

ہماری زبان اردو میں (بلکہ ممکن ہے دوسری ملکی زبانوں میں بھی) سب سے کثیر التصانیف مصنف شیو برت لال ورمن ہوئے جو اپنی مذہبی اور روحانی فتوحات کے سبب مہرشی اور داتا دیال کہلائے

مہرشی جی ضلع بنارس کے قصبہ بھدوی میں فروری ۱۸۶۰ءؔ میں پیدا ہوئے تھے اور اناسی برس کی عمر پاکر ۲۳ فروری ۱۹۳۹ء میں انھوں نے چولا چھوڑا (وفات پائی) ابتدائی تعلیم گیان پور میں پائی تھی۔ کہتے ہیں کہ گلستان بوستان بلکہ مثنوی مولانا روم بھی ان کو حفظ تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں انھوں نے اردو، فارسی، عربی پڑھی تھی۔ بعد میں ہندی اور سنسکرت کے علمی سرمائے کی بھی تحصیل کی۔ الٰہ آباد یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا اور بتایا گیا ہے کہ امریکہ کی کسی (غالباً شکاگو) یونیورسٹی میں ۱۸۹۹ء میں کوئی مقالہ پیش کر کے انھوں نے ال۔ ال۔ ڈی کی اعلیٰ سند بھی حاصل کرلی تھی۔

اگرچہ مہرشی جی کا گھرانا فارغ البال تھا، انھوں نے اپنی بسر کے لیے ابتدا میں مختلف مقاموں پر ملازمتیں کیں۔ بالآخر ۹-۱۸۹۶ء میں وہ آریہ سماج ہائی اسکول بریلی میں ہیڈ ماسٹر ہوگئے۔ یہ ملازمت ان کے علمی مزاج سے مطابقت رکھتی تھی۔ اس زمانے میں انھوں نے متعدد نام برآوردہ ہندو مردوں اور عورتوں کی سوانحات کو افسانوں اور ناولوں کی صورت ن لکھ ڈالا۔ اس سلسلے کی ان کی بعض تصانیف کے نام اس طرح ہیں:

۱۔ راجستھان کی بیرانیاں ۲۔ چتوڑ کی چڑھائیاں
۳۔ پرتھوی راج۔ ۴۔ آلھا اودل
۵۔ ستی بر تانت۔ ۶ دیوبرتانت
۷۔ ہماری ماتائیں۔ ۸۔ سچی استریاں۔ وغیرہ

ؔ افسانوںؔ اور ناولوں کے علاوہ اس زمانے میں مہرشی جی نے علمی موضوعات سے متعلق بھی کچھ کتابیں لکھی تھیں۔ مثلاً

کلیان دھرم بھگوان بدھ کی بڑی سوانح عمری
لوگ فلاسفی۔ تمباکو۔ معدن التہذیب وغیرہ

۱۹۰۱ء میں مہرشی جی کی اہلیہ کا انتقال ہوا، جس سے انھیں سخت صدمہ پہنچا اور انھوں نے تمام معاملات سے علیحدگی اختیار کرلی۔ کچھ دن ہردوار رہے۔ پھر لاہور چلے گئے۔ وہاں آریہ گزٹ کی ایڈیٹری کا کام ان کے سپرد ہوگیا۔ اس زمانے میں آریہ سماج میں کھنڈن کا بڑا زور تھا اور "بندگانِ دین کی تعظیم کا بالکل ہی خیال نہیں رکھا جاتا تھا"۔ اس صورت حال سے دل برداشتہ ہوکر مہرشی جی آریہ گزٹ سے الگ ہوگئے

ؔ ریڈر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۔

ر اگست ۱۹۰۷ء میں انھوں نے لاہور سے خود ایک ماہوار رسالہ "سادھو" نام سے نکالنا شروع کیا۔ اپنے مخصوص خیالوں کی ترویج و اشاعت کے لیے وں نے "سنت سندیش"، سرسوتی بھنڈار، لکشمی بھنڈار، مارتنڈ، ؛ رشی اور پنجابی سورما جیسے متعدد ضخیم رسالہ جات ماہواری وقتاً فوقتاً اری کیے اور متعدد ضخیم کتابیں بھی شائع کیں۔ مثلاً :

عجیب و غریب قصے	کتھا کلپدرم
دستنوپُران	الحیات بعد الممات وغیرہ

گرچہ مہرشی جی نے مختلف اور متعدد موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے لیکن ن کی تحریر کا اصل انداز افسانوی ہے۔ وہ خالص مذہبی اور فلسفیانہ مباحث کو بھی اس طرح قلم بند کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو اس میں قصے کہانی کا لطف آتا ہے اور ان کی کتابوں کو بیچ میں چھوڑ کر اُٹھ جانے و دل پسند نہیں کرتا۔ اسی وصف نے ان کی تحریروں کو مقبول عام بنا دیا ہے۔

۱۹۱۱ء میں مہرشی جی نے جاپان، امریکہ اور ممالک یورپ کا سفر کیا۔ وہاں سے واپسی کے بعد انھوں نے لاہور سے جو ماہوار رسالے جاری کیے، ان کے نام اس طرح ہیں :

وگیانی	سنت سماگم	سنت امرت بانی
ویدانت میگزین	اپنشد میگزین	رمتا رام شو
من مگن	دھولاگر پربت	سمیرو پربت
اَدھوت	ست سنگت	

۱۹۲۱ء میں مہرشی جی لاہور کو چھوڑ کر بنارس چلے آئے اور یہاں بھی اپنے مذہبی، اصلاحی اور علمی کاموں میں مصروف رہے۔ یہاں سے بھی "متوالا اودھوت" وغیرہ رسالے نکالتے رہے۔ مہرشی جی نے جنوبی ہند کا سفر بھی کیا تھا۔ ہنمکنڈہ (ضلع ورنگل) میں داتا دیال لائبریری اور ملحقہ مندر کے احاطے میں ایک درخت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے نیچے بیٹھ کر مہرشی جی اپنے عقیدت مندوں کو تعلیم دیتے تھے یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس مندر میں صرف ایک مورت ہے اور وہ مہرشی جی کی ہے۔ اس کے پیچھے دیوار پر کبیر، گرو نانک وغیرہ کی تصاویر کے فریم آویزاں ہیں۔ دیوار پر الوہیت کے مدارج وغیرہ انگریزی، تیلگو، ہندی کے علاوہ اردو میں بھی تحریر ہیں۔ اسی طرح سکندآباد (حیدرآباد) کے مندر میں جو "بی مین سوسائٹی" Be Man Society کے نام سے موسوم ہے۔ کلمہ طیبہ کا نہایت دلآویز فریم دیوار پر آویزاں ہے جس سے اس سلسلے کے معاملات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

کہا جا چکا کہ مہرشی جی نے تصنیف و تالیف کے لیے اردو زبان کو اختیار کیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے عقیدت مند اس کو اپنی "مقدس" زبان خیال کرتے ہیں اور ان کے یہاں اس زبان کے لیے جو درد پایا جاتا ہے، وہ قابل رشک ہے۔ کئی بزرگ فارسی داں بھی ہیں اور راقم کی ان حضرات سے مراسلت کا سلسلہ اردو ہی میں جاری ہے۔

مہرشی جی نے اپنی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے خود لکھا تھا کہ :

> "جب بریلی میں ہیڈ ماسٹر تھا ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے اردو لکھنے کی طرف توجہ دی۔ جب میرے 'زمانہ' نامی رسالے کا پہلا پرچہ نکلا، ہندو اور مسلمان دونوں اسے کراہیت کی نظر سے دیکھنے لگے لیکن میں نے ۔ ۔ ۔ اپنے کام کو برابر جاری رکھا۔ زمانہ تو اسی شش ماہی میں کامیاب ہو گیا اور ستاون سال کی عمر تک میں نے صرف بیس برس کے علمی شغل کے سلسلے میں ایک ہزار سے کم کتابیں نہیں لکھیں جو از حد قبول عام ہیں۔ مجھ سے زیادہ ہندوستان میں بہ مشکل کسی کی تالیف و تصنیف کی تعداد ہو گی ۔ ۔ ۔ لطف یہ ہے کہ دوست دشمن، خیرخواہ اور بدخواہ سب ہی کو اُن کے پڑھنے کا شوق رہتا ہے۔"

نندو سہائی مہاراج کا کہنا ہے کہ

> "۵۷ ویں سال کی عمر کے بعد دو ہزار سے زیادہ تصانیف چھپیں۔ مہرشی جی نے اپنے آخری وقت تک بھی لکھنے کا کام نہیں چھوڑا تھا۔ تین ہزار سے زیادہ کتابوں کی تصنیف کی تصدیق دیال جوگ کی دوسری جلدوں میں مہرشی جی کے اپنے قلم سے کرا دی جائے گی۔"

جناب "موہن لال نیّر نے بھی لکھا ہے کہ

"تصانیف تین ہزار سے زاید ہیں۔"

مہرشی جی کی کتاب " اسرار کامیابی" کے آخر میں ایک اشتہار میں یہ تعداد " تین ہزار پانسو نو" بتائی گئی ہے۔

مہرشی جی کی تصانیف میں سے کوئی ڈھائی سو راقم کے پاس موجود ہیں اور تقریباً ساڑھے آٹھ سو کتابوں کے نام اس کے علم میں ہیں۔ ان میں سے تقریباً ڈھائی سو ناول اور افسانوں کے مجموعے ہیں[2]۔ مہرشی جی نے "موتیوں" کے سلسلے میں بقول نندو بھائی "پچاسوں اخلاقی ناول" لکھے تھے۔ خود مہرشی جی کا کہنا ہے کہ:

"میں نے موتی کے سلسلے کے کتنے ناول لکھے، مجھے یاد نہیں۔"

جو کچھ معلوم ہے یہ ہے کہ اس سلسلے کا اُن کا آخری ناول "جاں نثار موتی" تھا۔ اسی طرح "شاہی" کے سلسلے میں متعدد ناول لکھے تھے، ان میں سے ایک ناول "شاہی بٹ مار" میں "بالشوازم سے متعلق محققانہ بحث" کی گئی ہے۔ شادیوں سے متعلق بھی کئی ناول ہیں مثلاً "راجپوتنی کا دواہ، شیو پاروتی وواہ" وغیرہ۔ تعلیم نسواں سے متعلق کوئی تین درجن ناول اور افسانوں کے مجموعے موجود ہیں۔ ان افسانوں اور ناولوں کے اُس پس منظر میں، جس کی طرف شروع میں اشارہ کیا گیا ہے تفصیلی اور تجزیاتی مطالعے کی ضرورت ہے۔

مہرشی جی نے سوانحات بھی بڑی تعداد میں لکھی تھیں، ان میں سے بعض یہ ہیں:

حضرت محمدؐ صاحب	حضرت امیر المؤمنینؓ (ابوبکر صدیق)
حضرت علیؓ کے حالات	ابراہیم ادھم معروف بہ عشق صادق
شمس تبریز	تانا شاہ
کرشن دیو	مہاتما غریب داس
دھنی دھرم داس	پنڈت مدن موہن مالویہ وغیرہ

کبیر سے متعلق ان کی تصانیف دو درجن کے قریب ہیں۔ اسی طرح انھوں نے "ایک[5] درجن سے زاید رامائنیں لکھیں"۔ رادھا سوامی مت سے متعلق کوئی ڈیڑھ درجن کتابیں ہیں۔ بدھ مذہب کے بارے میں ایک درجن سے زاید ہیں۔ اسی طرح جین مذہب، پارسی مذہب، عیسائی مذہب اور سکھ مذہب سے متعلق بھی کئی کئی کتابیں شائع کی تھیں۔ تصوف اور معرفت کے موضوعات سے متعلق کوئی پانچ درجن اور یوگ، گیان اور گیان کے بارے میں بھی تقریباً اتنی ہی کتابوں کے نام ملتے ہیں۔ تاریخ اور جغرافیہ اور دوسرے موضوعات سے متعلق بھی ان کی متعدد کتابیں موجود ہیں۔ مثلاً

تاریخ امریکہ	جاپان،	سنسکرت زبان
کی عظمت۔		آریوں میں علم تحریر کا رواج وغیرہ

مہرشی جی کا کلام منظوم بھی بہت ہے چنانچہ کلام[6] ضابط اور کلام پیر مغاں کے نام سے دو مجموعے موجود ہیں۔ گلستان ہزار رنگ میں بھی ان کا بہت کلام محفوظ ہے۔

افسوس ہے کہ مہرشی جی کی تمام تصانیف کے نام بھی ہمارے علم میں نہیں ہیں۔ جناب موہن لال نیّر، جناب سمتر اکمار، جناب آنند راؤ اور ٹھاکر کمل سنگھ صاحب وغیرہ کی توجہ اور عنایات سے یقین ہے کہ ان کی مکمل فہرست تیار کی جا سکے گی۔ یہ ابتدائی کام ہو جائے تو مہرشی جی کے علمی اور تصنیفی کاموں کی قدر و قیمت کا تعین کیا جا سکے گا۔ فی الوقت اتنی بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ مہرشی داتا دیال شیو برت لال ورمن زبان اردو ہی کے نہیں، ہندوستان کے بھی سب سے کثیر التصانیف شخص تھے اور اُن کا حق ہے کہ اردو کی تاریخ میں ان کا ذکر احترام کے ساتھ کیا جائے۔

حوالہ جات

لہ نیّر اعظم۔ طبع اول میں ۱۸۶۱ء لکھا ہے (ص ۴۲) جو صحیح نہیں ہے۔

٢ه دیال جوگ مولفہ نندو بھائی ص ۳۳

٣ه اس سلسلے کی تفصیلات ابھی راقم کو حاصل نہیں ہو سکی ہیں۔

٤ه یہ بات ذہن میں رہے کہ پریم چند مہرشی جی سے عمر میں بیس برس چھوٹے تھے اور ان کے افسانے اور ناول لکھنے کا زمانہ بھی

کسی قدر بعد کا ہے۔

۵ دیال جوگ ص ۳۵

۶ ایضاً ص ۳۶

۷ ایضاً ص ۳۷

۸ رسالہ رمتا رام میں مہرشی جی نے بالاقساط اردو کی بیشتر ضرب الامثال سے متعلق قصے اور واقعات شائع کیے تھے۔ بعض کہاوتوں کی تشریح بھی کی تھی۔ مہرشی جی کے داماد جناب گوری شنکر لال اختر نے ان کو "مخزن امثال" کے نام سے اپنے پیش لفظ کے ساتھ مرتب کر دیا تھا۔ یہ مجموعہ تاحال غیر مطبوعہ ہے۔ اختر صاحب کے صاحبزادے جناب سمترا کمار نے از راہ علم نوازی یہ راقم کو عنایت کر دیا ہے جسے اب راقم اشاعت کے لیے مدوّن کر رہا ہے۔

۹ دیال جوگ ص ۲۴۹ تا ۲۵۰

۱۰ ایضاً ص ۲۵۲

۱۱ شبد گنجار ص ۷۹

۱۲ اسرار کامیابی ص ۴۱

۱۳ دیال جوگ ص ۳۸

۱۴ ہوشیار موتی، دیباچہ

۱۵ جاں نثار موتی ص ۴

۱۶ دنیا کی بہتری ص ۱۳۳

۱۷ جناب موہن لال نیرّ کا کہنا ہے کہ مہرشی جی خود کو شاعر کہلانا نہیں چاہتے تھے لیکن موزوں طبیعت پائی تھی اور فی البدیہہ شعر کہتے تھے۔ جس عقیدت مند کے لیے شعر کہتے تھے اس کا نام بطور تخلص نظم کر دیتے تھے۔ چنانچہ بہت اشعار ہیں جن میں تخلص نیرّ نظم کیا ہے۔ یہی معاملہ ضابطہ اور پیر مغاں کا بھی ہے۔

۱۸ پیر مغاں صاحب مہرشی جی کے نہایت با اخلاص عقیدت مند بزرگ ہیں۔ ان کی ذات سے اب بھی اکثر لوگ فیض پاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ موسیقی کے دلدادہ اور ماہر تھے۔ چنانچہ ان کے کمرے میں اکثر ساز دیکھنے میں آتے ہیں۔ راقم کو مہرشی جی کے بارے میں بعض مفید معلومات ان بزرگ سے بھی حاصل ہوئی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام ان کو مہرشی جی نے عنایت کیا تھا اور اس کو ایسا چلن ہوا کہ اب لوگوں نے اصلی نام کو بالکل فراموش کر دیا ہے۔

مسلمان کی ذمہ داری

"مسلمان ہونے کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ آدمی ایک خاص جماعت سے تعلق رکھتا ہے اور اسی کے دنیاوی اور سیاسی مفاد کی ادھیڑبن میں لگا رہتا ہے۔ مسلمان پر ساری دنیا کی ذمہ داریاں بھی ہیں، اپنے ملک کی ذمہ داریاں بھی ہیں۔ مسلمان ہونے کے معنیٰ ہیں زندگی کا ایک مطمح نظر رکھنا"۔ (ڈاکٹر ذاکر حسین)

ایران کا ایک سنگین مسئلہ

کبیر احمد جائسی

ایران - عراق جنگ سے قطع نظر، ایران ایک اور اندرونی مسئلہ سے دوچار ہے جو کسی وقت بھی آتش فشاں بن سکتا ہے۔ یہ مسئلہ مذہبی یا سیاسی نہیں خالص لسانی ہے جس سے غیر ایرانی اہل علم کم ہی واقف ہیں اور جو حضرات اس سے کسی حد تک واقف بھی ہیں ان کو اس کی سنگینی کا ابھی احساس نہیں ہو سکا ہے۔ اس لیے درج ذیل سطور میں اس مسئلہ کے سلسلے میں چند بنیادی باتیں تحریر کی جا رہی ہیں۔

ایران کا شمال مغربی صوبہ آذربائجان زمانۂ ماقبل اسلام سے ہی بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے اور اس کی یہ مخصوص حیثیت عصر حاضر میں بھی برقرار ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ایران کی $\frac{1}{5}$ آبادی اس صوبہ میں آباد ہے۔ عصر حاضر میں اس صوبے میں جو لوگ بودوباش رکھتے ہیں، وہ نسلاً ترک ہیں جو تقریباً ایک ہزار سال سے وہاں رہتے ہیں اور ایک ایسی زبان بولتے ہیں جو فارسی نہیں ہے بلکہ آذری یا ترکی آذربائجانی کہلاتی ہے۔ ایران کے صوبہ آذربائجان میں ترکوں کی آمد کا سلسلہ گیارہویں صدی عیسوی میں شروع ہوا۔ جب کہ ایران پر سلجوقیوں کی حکمرانی تھی۔ ہوا یوں کہ غز نام کے ایک ترک قبیلے نے آذربائجان پر حملے کرنے شروع کیے۔ اردو دائرۂ المعارف کے مقالہ نگار کے قول کے مطابق "پہلے یہ حملے چھوٹے چھوٹے جتھوں کے ذریعے کیے گئے۔ بعد ازاں بڑی جمعیتوں نے آذربائجان پر حملہ کر کے بالآخر اس پر قبضہ کر لیا"

چونکہ فاتح غزوں کی مادری زبان ترکی تھی، اس لیے آذربائجان کی ایرانی آبادی نے بھی رفتہ رفتہ یہی زبان اختیار کر لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس صوبے کے تمام باشندوں کی زبان ایک ہو گئی جو آج کل آذری یا ترکی آذربائجانی کے نام سے معروف ہے۔

آذری بولی ہے یا زبان؟ یہ فارسی زبان کی ذیلی شاخ ہے یا ترکی زبان کی؟ ان سوالوں پر اب سے چالیس پچاس سال قبل کافی گرما گرم مباحثہ ہو چکا ہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب پورے وسط ایشیا پر روس کا اقتدار مستحکم ہو چکا تھا۔ وسط ایشیا کے بہت سے افراد نے روسی اقتدار کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور دس برسوں تک اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے برسر پیکار رہے لیکن تنظیم کے فقدان اور آلات جنگ کی کمی نے ان کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ اس وقت جن وسط ایشیائی باشندوں نے افغانستان، ترکی وغیرہ میں پناہ لی تھی، انہوں نے "دنیا کے ترکو! متحد ہو جاؤ" کا نعرہ بلند کیا۔ اس نعرے کا دیرپا اثر تو نہیں ہوا لیکن کچھ دنوں تک فضا میں ہلچل ضرور مچی رہی جس کے اثر سے آذربائجان بھی محفوظ نہ رہا۔ ترکی کے اخبارات اور رسالے آذربائجان میں بولی جانے والی زبان آذری یا ترکی آذربائجانی کو ترکی الاصل زبان ثابت کرنے میں مشغول ہو گئے۔ جس کا نتیجہ بہرحال یہ ہوا کہ آذربائجان کی ایک بہت بڑی آبادی نے

---

۱ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، جلد ۱ (آئین - اجوف) طبع اول، لاہور، ۱۹۶۴ء ص ۳۸۔

ریڈر ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

پنی بول چال کی زبان کو ترکی الاصل سمجھنا شروع کر دیا۔ ترکی کے ترکوں کے ں خیال سے آذربائیجان کے ایک ترک اور اپنے زمانے کے ایک متنازع فیہ ز احمد کسروی تبریزی متفق نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ آذربائیجان کی قدیم ہان آذری ایک ایرانی الاصل بولی تھی جس کی باقیات آج بھی موجود ہیں بہرحال علمی مباحثہ چند برسوں کے بعد سرد ہو گیا اور بظاہر دونوں طرف خاموشی چھا گئی۔

محمد رضا شاہ کے والد رضا شاہ نے قاچاریوں کی حکومت ختم کرنے کے بعد جو ملکی اصلاحات کیں، ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ انھوں نے فارسی زبان کو پورے ایران کی سرکاری زبان قرار دے کر علاقائی زبانوں میں درس و تدریس کا سلسلہ یکسر موقوف کروا دیا اور کردستان، آذربائیجان، بلوچستان خوزستان وغیرہ صوبوں کے مدرسوں اور اسکولوں میں بھی فارسی زبان درس و تدریس کی زبان بن گئی۔ رضا شاہ کی اس روش کے خلاف آذربائیجان میں غم و غصہ کا اظہار تو ضرور ہوا مگر حکومت کے سامنے سب ہی بے بس ہو کر رہ گئے بہرحال آذربائیجان کے عوام و خواص کی بول چال کی زبان وہی آذری رہی جس نے ترکی آذربائیجانی کا نام اختیار کر لیا تھا لیکن وہاں کا پڑھا لکھا طبقہ اپنی مادری زبان کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کا بھی اتنا ہی ماہر ہونے لگا جتنا کوئی غیر آذربائیجانی، ایرانی ہو سکتا ہے۔ زبان کی یہ کشاکش و کشمکش اندر ہی اندر لاوے کی طرح اُبلتی رہی لیکن حکومت کی سخت گرفت کی وجہ سے سطح پر نمودار نہ ہونے پائی۔ ۱۹۷۹ء میں ایرانی انقلاب سے کچھ ہی پہلے ایک آذربائیجانی جلاوطن ادیب و عالم ر ضا براہینی نے The Crowned Cannibals کے نام سے امریکہ سے ایک کتاب شایع کی جس میں پہلوی حکومت پر جو فرد جرم عاید کی گئی تھی اس میں آذربائیجان کے لوگوں پر زبردستی فارسی زبان کا مسلط کرنا بھی شامل ہے اس کتاب کی اشاعت کے کچھ ہی عرصے بعد ایران کا حالیہ انقلاب رونما اور کچھ دنوں کے لیے پھر یہ مسئلہ دب گیا۔

انقلاب کے چند ہی برسوں کے بعد "ولایت فقیہ" کی تعبیر و تشریح کے مسئلے میں آیت اللہ شریعت مداری مرحوم اور آیت اللہ خمینی میں شدید اختلافات رونما ہوئے۔ آیت اللہ شریعت مداری، آذربائیجانی تھے اور نسلاً ترک۔ اس اختلاف میں ایران کے بیشتر عوام نے آیت اللہ خمینی کا ساتھ دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے تو آیت اللہ شریعت مداری خانہ نشین ہو گئے اور پھر خانہ نشینی کی زندگی بسر کرتے ہوئے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان دونوں بزرگوں کے اختلاف کے سلسلے میں آذربائیجان میں خاموشی رہی مگر آیت اللہ شریعت مداری کے انتقال کے بعد ایک بار پھر زبان کا مسئلہ اپنی تمام پیچیدگیوں کے ساتھ اُبھر کر سامنے آگیا ہے جس کی واضح مثال ڈاکٹر جواد ہیئت کی کتاب "سیری در تاریخ زبان و لہجہ ہای ترکی" ہے یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۳۶۴ھ ش (۱۹۸۶ء) میں "نشر نو" تہران نے شایع کی تھی لیکن ایک سال کے اندر ہی اندر اس کے سارے نسخے فروخت ہو گئے۔ اس لیے ناشر نے ۱۳۶۵ھ ش میں اس کو دوبارہ شایع کیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر جواد ہیئت نہ تو کبھی ادبیات و لسانیات کے طالب علم رہے ہیں اور نہ ہی تعلیم و تعلم ان کا ذریعۂ معاش ہے وہ ایک طبیب ہیں اور علاج معالجہ ان کا پیشہ۔ اس کے باوجود انہوں نے متعدد روسی عالموں اور ترکی کے زبان شناسوں کی تصانیف کا غائر نظر سے مطالعہ کر کے اپنی مذکورہ کتاب تحریر کی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے ایرانی عالموں کا وہ طبقہ ازحد برافروختہ ہے جو "ایک ملک ایک زبان" کے نظریے کا حامل ہے۔

ڈاکٹر جواد ہیئت نے اپنی مذکورہ کتاب میں ترکی زبان کے عہد بہ عہد ارتقا اور اس سے نکلنے والی بولیوں کا خود زبان کا درجہ حاصل کر کے اپنی آزادانہ شان قایم کرنے کا جو مفصل بیان کیا ہے، ہم اس سے سردست صرف نظر کر کے صرف اس حصے پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں جس میں انہوں نے طرح طرح سے گھما پھرا کر صرف ایک بات کہنے کی کوشش کی ہے کہ فارسی زبان کو جبراً سارے ایران کی زبان قرار دینا نہ تو اسلامی فعل ہے اور نہ ہی ملکی مصالح کے مطابق ہے۔ اگر فارسی زبان حضرات، ترکوں، کردوں، بلوچیوں اور کرددں وغیرہ پر اپنی زبان جبراً مسلط کریں گے تو اس کا نتیجہ ایسے ردّ عمل کی شکل میں سامنے آئے گا جو ممکن ہے ملک کی سالمیت کو بھی نقصان پہنچائے۔

---

[1] تفصیل کے لیے راقم الحروف کی کتاب 'آذری' مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی ' ۱۹۷۸ء ملاحظہ ہو۔

ڈاکٹر جواد ہیئت کی تحریر سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح ہمارے ملک میں ہندی زبان کے نادان دوست دوسری ہندوستانی زبانوں کی نفی کر کے پورے ہندوستان کی زبان ہندی بنا دینا چاہتے ہیں اُسی طرح کا ایک گروہ ایران میں بھی پیدا ہو گیا ہے جو ایران سے فارسی زبان کے علاوہ دوسری تمام زبانوں کو ناپید کر دینے کا خواہاں ہے۔ ڈاکٹر جواد ہیئت کی کتاب ایسے ہی افراد کے عمل کے خلاف صدائے احتجاج ہے۔ اُن کا خیال یہ بھی ہے کہ آج آذری یا ترکی آذربائجانی کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ وہی عمل ہے جس کی ابتدا پہلویوں نے ایران کے تخت و تاج پر قابض ہوتے ہی کر دی تھی۔ ڈاکٹر جواد ہیئت کے اصل الفاظ یہ ہیں:

"آنچہ با آمدن حکومت پہلوی عاید مردم آذربائجان
شد گذشتہ از استبداد و خفقان سیاسی ستم ملی بود
کہ احساسات ملی گرائی افراطی و شوونیستی فارسیان
چشمہ می گرفت" (ص ۲۶۱)

[پہلوی حکومت کے قایم ہونے کے بعد آذربائجان کے
لوگوں پر جو چیز مسلط ہوئی وہ سیاسی ظلم اور پاگل پن کے
علاوہ وہ قومی ظلم تھا جس کی آبیاری فارسیوں کے بڑھے
ہوئے ملی تفوق کے احساس اور جارحانہ وطن پرستی کے
جذبات سے ہوتی۔]

پہلوی حکومت اپنے ظلم و استبداد میں کامیاب ہوئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آذربائجان کے سارے مکتبوں، مدرسوں، اسکولوں اور اعلیٰ تعلیم گاہوں سے آذری یا ترکی آذربائجانی کو خارج کر دیا گیا اور اس کی جگہ پر فارسی زبان کو جبراً رائج کیا گیا۔ اس طرح وہاں کے عوام اپنے اس بنیادی حق سے محروم کر دیے گئے کہ وہ اپنی مادری زبان میں علم حاصل کریں اور اپنے بچوں کو اسی زبان میں تعلیم دیں۔ اس تلخ حقیقت کا اندازہ ڈاکٹر جواد ہیئت کے درج ذیل جملے سے لگایا جا سکتا ہے۔

"مردم از نخستین حقوق انسانی یعنی تعلیم و تعلم و تکلم و تحریر
بہ زبان مادری محروم ماندند" (ص ۲۶۱)

[لوگ اپنے اولین انسانی حق یعنی مادری زبان میں پڑھنے
پڑھانے، بات چیت کرنے اور اس میں لکھنے سے محروم
ہو گئے۔]

اپنے بنیادی حق سے محروم ہونے کے بعد آذربائجان کے عوام و خواص نے اس کی بازیابی کے لیے تحریک چلائی جس کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کو جیل خانوں میں زندگی بسر کرنی پڑی اور بہتوں کو اپنی جان تک سے ہاتھ دھونا لیکن پہلوی حکومت کی دار و گیر کی پالیسی کے سامنے ان کی کوئی تحریک برگ و بار نہ لا سکی اور پورے آذربائجان میں فارسی زبان، ذریعۂ تعلیم بن گئی۔ اس محاذ پر شکست کھانے کے بعد بھی آذربائجانی عوام نچلے نہ بیٹھے اور وہ ہر اس تحریک کا گرم جوشی سے خیر مقدم کرتے جو پہلوی حکومت کے خلاف چلائی جاتی خواہ اس کا تعلق اصلاح اراضی سے ہو یا خواہ پردہ پر پابندی سے۔ آذربائجان کے علما اس قسم کی تحریکوں میں ہراول دستہ کا کام انجام دیتے بہرحال تقریباً پچاس برسوں کی جد و جہد اور گیر و دار کے بعد جب ایران میں انقلاب کی زمین ہموار ہونے لگی تو آذربائجان کا صوبہ آتش فشاں بن گیا۔ ۱۹۷۹ء میں ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ ایران کے بادشاہ محمد رضا شاہ پہلوی کو اپنے وطن سے فرار ہونا پڑا اور ایران میں ایک اسلامی حکومت قایم ہوئی۔ انقلاب کے فوراً بعد آذربائجان کے عوام دوسرے صوبوں کے عوام ہی کی طرح جشن فتح مناتے رہے۔ جب جذبات کے امڈتے سیلاب میں اتار آیا تو آذربائجان کے لوگوں نے پھر اپنا پرانا مطالبہ دہرانا شروع کیا جس کو ڈاکٹر جواد ہیئت نے ایک جملے میں یوں تحریر کیا ہے۔

"خصوصیات مذہبی و زبانی و فرہنگی ہر یک محترم
شناختہ شود۔" (ص ۳۹۳)

[ہر ایک شخص کی مذہبی، لسانی اور تمدنی خصوصیات
کو عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھا جائے۔]

اس مطالبہ کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دنیا کے بہت سے ترقی یافتہ ممالک ایسے ہیں جنہوں نے اپنے اپنے ملکوں میں ایک سے زیادہ زبانوں کو سرکاری زبان کا درجہ دے رکھا ہے جس کی وجہ سے لسانی اقلیتیں اکثریت سے نہ صرف یہ کہ شاکی نہیں ہیں بلکہ اس بات کے لیے بھی کوشاں ہیں کہ وہ اکثریت کی زبان کو اس طرح سیکھ لیں کہ ان کے شانہ بہ شانہ اور گام بہ گام چل کر ملک کی پیشرفت میں ان کے برابر حصہ لیں۔ اگر ان

ترقی یافتہ ممالک نے کسی بھی ایک زبان کو پورے ملک کے عوام پر جبراً مسلط کیا ہوتا تو اس کا نتیجہ یہ ضرور برآمد ہوا ہوتا کہ اس ملک کے عوام کئی دھڑوں میں تقسیم ہو چکے ہوتے اور لسانی جارحیت ملک کی پیش رفت کو نقصان پہنچا چکی ہوتی۔ ڈاکٹر جواد ہیئت نے بھی مثال کے طور پر بہت سے ملکوں کا نام لیا ہے جہاں کئی کئی سرکاری زبانیں ہیں اور ہر زبان کو اپنے منطقے میں پھلنے پھولنے کے مواقع حاصل ہیں۔ ان کے اصل الفاظ یہ ہیں:

> "در سوئیس چہار زبان رسمی است، در کانادا در قسمت فرانسہ زبان، زبان اول فرانسہ است۔ در بلزیک دو زبان فرانسہ و فلامان رسمی است۔ در شوروی بیش از پانزدہ زبان و در چین پنج زبان رسمی است۔ در یوگوسلاوی ہم پنج زبان رسمی است۔ در کشور فرانسہ زبانہای ترماندی و لمبوژیم ہم پذیرفتہ شدہ است۔ در انگلستان در منطقۂ اسکاتلند و ویلز زبانہای محلی ہم بعد از جنگ دوم جہانی شکوفا گردیدہ است۔"
>
> (ص ۳۹۳)

> [سوئٹزرلینڈ میں چار سرکاری زبانیں ہیں۔ کناڈا میں جہاں فرانسیسی بولنے والے ہیں وہاں کی پہلی (سرکاری) زبان فرانسیسی ہے۔ بلجیم میں دو سرکاری زبانیں ہیں۔ ایک فرانسیسی اور دوسری فلامان۔ ممالک متحدہ روس میں پندرہ سے زیادہ زبانیں اور چین میں پانچ سرکاری زبانیں ہیں۔ ملک فرانس میں ترماندی اور لمبوژیم زبانوں کو بھی (سرکاری زبانیں) تسلیم کیا گیا ہے۔ انگلستان میں اسکاٹ لینڈ اور ویلز کے منطقوں میں دوسری جنگ عظیم کے بعد سے مقامی زبانیں برگ و بار لا رہی ہیں]۔

غالباً ان ملکوں کی مثالوں ہی کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جب متمدن اور ترقی یافتہ ملکوں میں ایک سے زیادہ سرکاری زبانیں ہو سکتی ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ایران میں ایسا نہ ہو سکے۔ یعنی اگر فارسی بولنے والے اپنی لسانی عصبیت سے باز آجائیں تو کردی، بلوچی، آذری، تالشی، گیلکی وغیرہ وغیرہ بولیوں میں بھی درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہو جائے اور ہر شخص کو اس بات کا حق حاصل ہو جائے کہ وہ اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرے۔ اس سلسلے میں انہوں نے بہت صاف صاف الفاظ میں تحریر کیا ہے کہ

> "مردم ہر منطقہ . . . . باید بتوانند بزبان مادری و محلی خود تحصیل و تدریس کنند۔ زبان محلی باید در محل رسماً پذیرفتہ شدہ باشد . . . . انتخاب یک زبان و تحمیل اجباری آن بہ ہمہ اقوام بہ قیمت نفی زبان قومی و مادری آنہا عاقلانہ و بہ مصلحت ہیچ کشوری نیست و جز نفاق و ایجاد عکس العمل دفاعی و تنفر کینہ نتیجہ ندارد۔"
>
> (ص ۳۹۳)

> [چاہیے کہ ہر منطقے . . . کے لوگ اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کریں اور تعلیم دیں۔ یہ بھی چاہیے کہ مقامی زبانوں کو اپنے اپنے مقام پر سرکاری طور پر تسلیم کیا جائے . . . . کسی ایک زبان کو منتخب کرنا اور اس کو دوسری قوموں پر جبراً اُن کی مادری زبان کی نفی کر کے مسلط کرنا نہ تو عاقلانہ (فعل) ہے اور نہ ہی کسی ملک کے مصالح کے مطابق ہے۔ اس (عمل) کا نتیجہ سوائے افتراق، دفاعی ردّ عمل، نفرت اور کینہ کے کچھ اور نہیں ہے]۔

درج بالا اقتباس سے اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بات اب دھمکی کی حد تک پہنچنے لگی ہے اور اس کے بین السطور سے یہ مطلب برآمد ہوتا ہے کہ ایران کے حالیہ انقلاب کے بعد آذربائیجان کے لوگ اس صورت حال کو بہت دنوں تک برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر آذربائیجان کے لوگوں پر مرکز کی سرکاری زبان نہ لادی جائے تو وہ از خود پہلے ہی کی طرح فارسی زبان پڑھتے پڑھاتے رہیں گے۔ کیوں کہ ایسا نہ کرنے میں خود ان کا ہی نقصان ہے۔ آذربائیجان کے لوگ اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ آذری یا ترکی آذربائیجانی ان کے صوبے کے علاوہ ایران کے کسی قریہ یا کسی گوشے کی زبان نہیں ہے

اس لیے وہ خود اس بات کو پسند نہ کریں گے کہ وہ اپنے ہی ملک کی پوری آبادی سے کٹ کر رہ جائیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ان کی مادری زبان کی اہمیت کو تسلیم کیا جائے اور اس کو آذربائجان میں ذریعۂ تعلیم کی حیثیت دی جائے۔ اگر غیر جذباتی انداز سے حکمت و دانائی کے ساتھ آذربائجان کے لوگوں سے معاملہ کیا جائے تو اس لسانی کشاکش و کشمکش کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ فارسی زبان حضرات آذربائجان کے عوام کے احساسات کو کس حد تک سمجھ پاتے ہیں اور کس طرح اس مسئلہ کا حل نکالتے ہیں۔

اس بات سے شاید ہی کوئی منصف مزاج ایرانی انکار کر سکے کہ ایران کے ترک (آذربائجانی) ہر تحریک میں فارسوں کے شانہ بشانہ رہے ہیں اور انہوں نے بھی اپنے ملک کی آزادی کے لیے اپنی جان گنوائی ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ ایران کے ترکوں کے اس احساس کو یکسر ختم کر دیا جائے کہ ان کے ساتھ کوئی لسانی تعصب برتا جا رہا ہے اور اس کے ذریعے ان کی زبان اور تمدن کو دھیرے دھیرے ختم کیا جا رہا ہے۔ غالباً اسی احساس کے تحت ڈاکٹر جواد ہیئت نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ

"تجربۂ پنجاہ سالۂ دوران پہلوی نشان داد کہ روش غیر انسانی و ضد اسلامی نتیجۂ معکوس دارد و ممکن است در روزهای ضعف و تاریک بہانہ و دستاویزی بہ دست دشمنان بدہد و مورد سوء استفادۂ دیگران قرار گیرد۔"

(ص: ۳۹۳)

[پہلوی دور کا پچاس سالہ تجربہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ غیر انسانی اور غیر اسلامی روش کا نتیجہ بالکل الٹا نکلتا ہے اور ممکن ہے کہ (یہ روش) کمزوری کے تاریک دنوں میں (ملک کے) دشمنوں کے ہاتھ میں ایک ایسی دستاویز اور بہانہ دے دے جو نقصان پہنچانے کا ایک ذریعہ بنے۔]

ڈاکٹر جواد ہیئت کے درج بالا اقتباس میں جس روش کو غیر اسلامی قرار دیا گیا ہے، اگر اس کو ایرانی پاسداران انقلاب بھی غیر اسلامی سمجھ لیں اور اپنے رویے میں تھوڑی سی لچک پیدا کر لیں تو یہ آواز اپنے ابتدائی مرحلے میں دب سکتی ہے۔ اگر خدانخواستہ اس آواز کو زور و جبر کے ذریعے دبانے کی کوشش کی گئی تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا انجام کس صورت میں ظاہر ہوگا۔

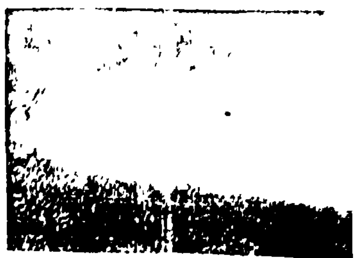
"کیا ان لوگوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا کہ فضائے آسمانی میں گھرے ہوئے کس طرح اڑتے رہتے ہیں، ان کو اللہ ہی تھامے رکھتا ہے۔ اس میں اہل ایمان کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔"

سورہ نحل۔

یورپی فلکیات

سید قاسم محمود

اسلامی دور کے زوال کے بعد سائنس کو اہل یورپ نے دل و جان سے اختیار کر لیا، مسلمانوں نے یونانیوں کے فلسفے، سائنس اور علوم کی جو کتابیں وسیع پیمانے پر عربی میں ترجمہ کی تھیں، ان کو عربی سے انگریزی، جرمن، فرانسیسی اور مغربی یورپ کی دوسری زبانوں میں منتقل کیا جانے لگا۔ "المجسطی" کو اس وقت فلکیات کی پہلی کتاب سمجھا جاتا تھا۔ اس کا عربی سے ترجمہ ۱۲۳۰ء میں شہنشاہ فریڈرک ثانی کے حکم سے ہوا۔ فلکیات کے مشاہدے اور مطالعے کی ترویج کے لیے ۱۲۳۲ء میں ایک اور وجہ تحریک یوں پیدا ہوئی کہ قشتالیہ کے حکمران الفانسو دہم کی سرپرستی میں فلکیاتی نقشے اور زیچ تیار کرائے گئے۔ اسی زمانے میں یارک شائر کے ایک عالم، جان ہالی ووڈ نے ایک کتاب "فلک گردش" لکھی۔ جو اگرچہ بطلیموس کے نظریے پر مبنی تھی، لیکن یہ کئی صدیوں تک مقبول رہی اور اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ ویانا کے مقام پر ہیئت داں پر باخ نے اور اس کے قابل اور مشہور شاگرد جوہانز ملر کونز برگ (۱۴۳۶ء۔ ۱۴۷۶ء) نے فلکیات کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ بالخصوص ملر نے بحری سفر کے دوران میں عرض بلد اور طول بلد کے معلوم کرنے کے طریقوں پر غور کیا اور کچھ دریافت بھی کیے اور ان کو ایک کتاب کی صورت میں قلمبند بھی کیا۔



ہیلی کے دُمدار ستارے کا سر

کوپرنیکس : فلکیات کا ایک پورا کا پورا عہد کوپرنیکس (۱۴۷۳ء۔ ۱۵۴۳ء) کے ساتھ شروع ہوا۔ اس نے یہ نعرۂ مستانہ بلند کر کے کہ زمین نہیں سورج کائنات کا مرکز ہے، ارسطو اور بطلیموس کی قدیم روایات کے پرخچے اڑا دیے۔ اس نے صرف نعرہ ہی نہیں لگایا، بلکہ ثابت بھی کر دکھایا کہ زمین اپنے محور پر بھی گردش کرتی ہے اور سورج کے گرد بھی گھومتی ہے۔ اپنے اس انقلابی نظریے کی بنیاد پر اس نے ستاروں کی ظاہری حرکت، ستاروں کی نسبت سے سورج کی سالانہ حرکت اور مریخ، مشتری اور زحل کی عارضی رجعی حرکت کی وضاحت کی۔ اجرام فلکی کی حرکت کی نئی مگر سادہ وضاحت کے لیے ایک نئے نظریے کی ضرورت تھی جو اس وقت مشاہدے سے زیادہ تخیل کا تقاضا کر رہا تھا کہ زمین اگرچہ مشاہدے میں ساکن ہے لیکن دراصل گھومتی ہوئی بڑی تیزی سے گردش کر رہی ہے۔ کوپرنیکس کو شدت سے یہ خوف لاحق تھا کہ پادری صاحبان کی طرف سے اس کے نظریے کی سخت مخالفت کی جائے گی۔ اس لیے حتی الوسع اسے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی۔ جس سال اس نے وفات پائی اسی سال اس کی کتاب شائع ہوئی تھی۔ اس کے نظریے کو سمجھنے کے لیے بہت زیادہ ریاضی فہمی کی ضرورت تھی اور ریاضی سے پادری لوگ عموماً نابلد ہوتے ہیں۔ اس لیے اس کے "کافرانہ اور ملحدانہ" نظریے پر زیادہ غوغا آرائی نہیں ہوئی اور یوں اس کا نظریہ خاموش ہو گیا۔

ٹائکو براہے : کوپرنیکس کے تخیل کو مشاہدے اور تجربے کی
ٹی پر ٹائکو براہے (۱۵۴۶ – ۱۶۰۱ء) نے پرکھا۔ وہ ایسا ماہر فلکیات
جسے فلک کو دیکھنے کا عشق تھا۔ اس کی آنکھ دوربین سے بھی زیادہ تیز اور
ں تھی۔ اس نے مشاہدے کے لیے ایسے ایسے آلات بنائے تھے کہ اس کے
رووں نے کبھی اس کا خواب بھی نہ دیکھا ہوگا۔ وہ ایک ضابطے اور منصوبے
مطابق برس ہا برس سورج، چاند، اور سیاروں
مشاہدہ کرتا رہا۔ اس نے کوپرنیکس کے نظام
س لیے قبول نہیں کیا کیوں کہ وہ ستاروں کے
، وقوع میں فرق کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ حالاں کہ
ین کے سورج کے گرد گھومنے کی صورت میں یہ
الانہ فرق ناگزیر تھا۔ اس نے بطلیموسی نظام کو
ارد کر دیا۔ اور ایک نیا نظام پیش کیا جس کے
ابق سیارے سورج کے گرد گھومتے ہیں اور سورج چاند کی مانند ساکن زمین
گرد گھومتا ہے۔ جہاں تک نظام شمسی کا تعلق ہے اس کا پیش کردہ نظام
اضیاتی اعتبار سے کوپرنیکس کے نظام سے ملتا جلتا ہے۔ اس نے ۱۵۷۲ء
نظر آنے والے نئے ستارے اور ۱۵۷۷ء میں نمودار ہونے والے بڑے
دارے کے محتاط مشاہدے سے ارسطو کے خیالات کو پارہ پارہ کر دیا۔

ٹائکو براہے کے اس نظریے کو اس کی وفات کے بعد چند سال تک
ں ماہرین فلکیات نے زندہ رکھا جو بطلیموس کے نظام کو اس لیے تسلیم نہیں
سکتے تھے کہ اس نظام کی غلطیاں اُن کے مشاہدے
ں آچکی تھیں لیکن کوپرنیکی نظام کو بھی اپنانے کی
ہیں جرات نہیں ہوتی تھی۔ اس سے پادریوں کے
نر کے فتوے کا ڈر تھا جس کی سزا قید و بند اور
ض حالات میں زندہ جلائے جانا تھی۔ خود براہے
اس بات پر فخر تھا کہ اس کا نظریہ کائنات
ں میں زمین کو ساکن مانا گیا ہے، عیسائیت
، مذہبی عقائد کے عین مطابق ہے۔ لیکن اس نظریے کی کوئی سائنسی بنیاد نہ
ی۔ اس لیے چند سال کے بعد یہ نظریہ اپنی موت آپ مر گیا۔

ٹائکو براہے نظریاتی فلکیات اور ریاضی میں ماہر نہ تھا۔ اس لیے
وہ دنیا کو فلکیات کا کوئی قابل قدر نظریہ نہ دے سکا۔ لیکن مشاہدۂ افلاک
میں اُس کا کوئی ہم سر نہ تھا۔ یہ اس کے مشاہدات اور اس کے مرتب کردہ
جدولیں ہی تھیں، جن کی مدد سے کیپلر اور نیوٹن نے اپنے شہرہ آفاق قوانین
دریافت کیے اور جدید فلکیات کی بنیاد رکھی

جوہانز کیپلر : وہ ٹائکو براہے کا شاگرد اور ماتحت تھا۔
ٹائکو براہے نے مرتے وقت وصیت نامے کی
رو سے کیپلر کو اپنے مشاہدات کے مسودوں کا
وارث بنا دیا تھا۔ یہ مسودات، جو کاغذ کے کئی من
وزنی پلندوں پر مشتمل تھے۔ ٹائکو براہے کی
عمر بھر کی محنت کا نتیجہ تھے۔ یہ کیپلر ہی تھا کہ جس نے
ٹائکو براہے کے تمام فلکی مشاہدات اور اس کی مرتب
کردہ ہیئت کی جدولوں کو شائع کیا اور شاہ روڈولف
سے منسوب کرنے کے باعث اُن کے نام "روڈلفی جدولین" رکھا



مریخ، موسم بہار میں

ٹائکو براہے اور کیپلر (۱۵۷۱ء – ۱۶۳۰ء) دونوں کی حیثیت میں
ایک بنیادی فرق تھا۔ براہے فلکی مشاہدات کا بادشاہ تھا، لیکن ریاضی میں وہ
کمزور تھا اس لیے وہ ان مشاہدات کو ریاضی کے کلیات میں مربوط کرنے پر قادر
نہ تھا۔ اس کے برعکس کیپلر کو فلکی مشاہدات میں چنداں مہارت نہ تھی۔ وہ
بہت کم مشاہدے کرتا تھا اور اگرچہ اس کے عہد میں دوربین کا رواج عام
ہو چلا تھا۔ مگر اس نے عملی طور پر اس مفید کام سے بہت کم کام لیا۔ لیکن ریاضی
میں وہ ماہر کامل تھا اور نظریات کے وضع کرنے
میں اس کا دماغ بہت تیز تھا۔ جب براہے کے
مشاہدات کا سارا سرمایہ اس کی تحویل میں آگیا تو
مشاہدات میں اس کی کمزوری کی تلافی ہو گئی۔ اس نے
اپنے دماغ کی تمام قوتیں ان مشاہدات کو ایک لڑی میں
مربوط کرنے پر مرکوز کر دیں۔ اس کا نتیجہ ان تین کلیات
کی صورت میں نکلا جو کیپلر کے سہ قوانین حرکت" کہلاتے
ہیں جو کہ یہ ہیں۔



مریخ موسم گرما میں

پہلا قانون: ہر سیارہ سورج کے گرد ایک بیضوی مدار میں حرکت کرتا
ہے جس کے دو مرکزی نقطوں میں سے ایک نقطہ پر سورج ہوتا ہے۔

دوسرا قانون: سیارے کو سورج سے ملانے والا فرضی خط مساوی وقفوں میں مساوی رقبہ طے کرتا ہے۔

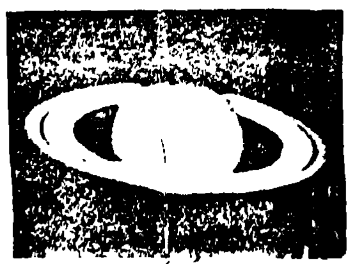
تیسرا قانون: سورج کے گرد کسی سیارے کے عرصۂ گردش کا مربع سورج سے اس کے اوسط فاصلے سے مکعب کے متناسب ہوتا ہے۔

کیپلر کے ان تین قوانین کی دریافت فلکیات کی تاریخ کا سب سے اہم واقعہ ہے۔ کیوں کہ ان قوانین کی وجہ سے نظامِ شمسی کی تصویر مکمل ہو گئی۔ اور پچھلے ماہرینِ فلکیات مثلاً بطلیموس، کوپرنیکس اور ٹائکو براہے کے پیش کردہ نظاموں کی ساری خامیاں یک بار ختم ہو گئیں۔ اس لحاظ سے کیپلر کی کتاب "دنیا کی ہم آہنگی" جس میں اس نے اپنے تینوں قوانین پوری شرح و بسط کے ساتھ بیان کیے ہیں، اس قابل ہے کہ اس کا شمار فلکیات کی عظیم کتابوں میں کیا جائے۔

کیپلر نے سیاروں کے متعلق اپنی تحریروں میں بیان کیا تھا کہ وہ نور افشاں ہوتے ہیں، ورنہ اگر چاند کی طرح اُن کی روشنی بھی سورج سے مستعار لی ہوتی تو پھر ان کا بھی عروج و زوال ہوتا۔ مگر یہ اس کی غلطی تھی کیوں کہ تمام سیارے اصل میں بے نور ہوتے ہیں اور وہ صرف سورج کی روشنی کو منعکس کرنے کے باعث روشن نظر آتے ہیں۔ کیپلر کی اس غلطی کی تصحیح گلیلیو نے کی تھی۔ گلیلیو عمر میں کیپلر سے سات سال بڑا تھا اور ان دونوں میں ہم عصر ہیئت دانوں کے درمیان کبھی کبھی خط و کتابت کے ذریعے تبادلۂ خیال ہوتا رہتا تھا۔ گلیلیو کیپلر کے کمال کا مداح تھا اور اسے ہیئت کے تین بنیادی قوانین دریافت کرنے کے باعث افلاک کا قانون داں کہا کرتا تھا۔

گلیلیو: (۱۵۶۴ء - ۱۶۴۲ء) اس نے ۱۶۰۹ء میں اور پھر آنے والے برسوں میں دوربین کی نئی ایجاد کو مشاہدہ افلاک سے وابستہ کر کے گویا فلکی دریافتوں اور انکشافات کا دروازہ کھول دیا۔ دوربین سے اتنے زیادہ اور اتنے نئے ستارے نظر آنے لگے کہ خالی آنکھ سے نظر نہیں آ سکتے تھے۔ پتا چلا کہ چاند کی سطح ہموار نہیں ہے بلکہ ناہموار ہے اور گھاٹیاں، پہاڑ اور سمندر سے دکھائی دیتے ہیں۔ سیارہ زہرہ کی اشکال بھی ہمارے چاند کی طرح گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔ سیارہ مشتری چار روشن ساتھیوں کے درمیان گھرا ہوا نظر آیا۔ یہ چاروں مشتری کے گرد گھومتے ہوئے دکھائی دیے۔ سورج کی سطح پر داغوں اور دھبوں کا انکشاف ہوا۔ پتا چلا کہ خود سورج بھی اپنے محور کے گرد گھوم رہا ہے۔

گلیلیو نے اپنے مشاہدات کا اطلاق کوپرنیکس کے مفروضے پر کیا اور کچھ سوالات اٹھائے۔ اگر سورج گھومتا ہے تو زمین کیوں نہیں؟ اگر مشتری اپنے چاروں سیارچوں کے ہمراہ سورج کے گرد گھوم سکتا ہے تو زمین اپنے ایک سیارے یعنی چاند کی ہمراہی میں سورج کے گرد کیوں نہیں گھوم سکتی؟ گلیلیو نے کوپرنیکس کے ریاضیاتی دلائل میں ازسرِ نو جان ڈال دی اور ان کو زیادہ مقبولیت بخشی۔ اس نے بطلیموسی نظام اور کوپرنیکسی نظام کے موازنے پر اپنی مشہور کتاب ۱۶۳۲ء میں شائع کی۔ اس کتاب نے یورپ کے علمی اداروں اور جامعات سے تو پذیرائی حاصل کی لیکن مذہبی مجلسِ احتساب کی نظر میں یہ قابلِ عتاب ٹھہری۔


زحل اور اس کے حلقے

کوپرنیکسی تصور اور نظام کو کسی اور ملک سے زیادہ انگلستان میں پذیرائی حاصل ہوئی۔ تھامس ڈگس پہلا ہیئت داں تھا جس نے پرانے ہیئت دانوں سے بغاوت کرتے ہوئے ان کے اس نظریے کی تردید کی کہ تمام ستارے قائم ہیں اور ایک دوسرے سے یکساں فاصلے پر رہتے ہیں۔ اس نے دعویٰ کیا کہ ستارے ایک دوسرے سے دور ہٹتے جاتے ہیں اور جوں جوں ان کا فاصلہ بڑھتا جاتا ہے، ان کی روشنی بھی دھیمی پڑتی جاتی ہے۔ برونو ایک صوفی بزرگ تھا۔ فلکیات سے اسے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ تصوف اور گیان دھیان اس کی منزل تھی۔ وہ ۱۵۸۳ء میں انگلستان آیا۔ اس نے کوپرنیکس کے نظام کو پسند کیا اور دوسرے ملکوں میں اسے متعارف کرانے میں ماہرینِ فلکیات سے زیادہ کام کیا۔

نیوٹن کا نظریۂ تجاذب: فلکیات کی تاریخ میں اگلا بڑا دور نیوٹن کے پیش کردہ نظریۂ کشش ثقل کے سبب پیدا ہوا۔ روایت ہے کہ نیوٹن اپنے گاؤں میں ایک سیب کے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا کہ اوپر سے ایک سیب گر پڑا۔ اس پر اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ سیب کا نیچے گرنا اس وجہ سے تھا کہ زمین ہر شے کو جو اس کی سطح کے قریب ہو، اپنی

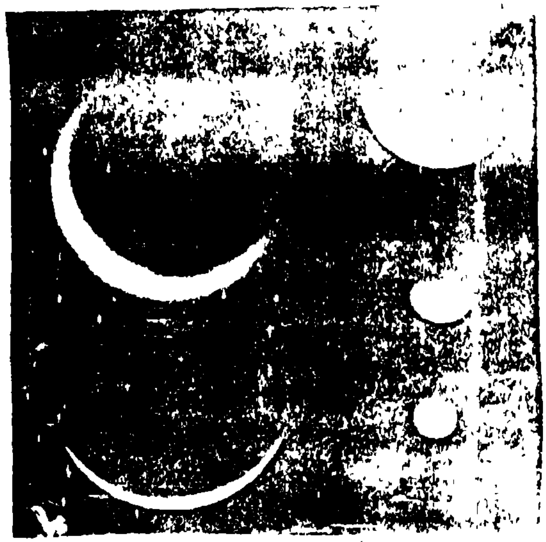
ت کھینچتی ہے۔ اس طرح اسی نے کششِ زمین کے راز کو معلوم کرلیا۔ درخت کے
پ بیٹھا ہوا وہ غالباً اپنی عادت کے مطابق غور و فکر میں مستغرق تھا۔ غالباً وہ
یہاں' چاند اور سیاروں کی گردش کے متعلق سوچ رہا تھا۔ وہ کوپرنیکس کے
ے گردش زمین کو درست جانتا تھا لیکن اس سوال کا صحیح جواب اس کے
س نہ تھا کہ زمین کو اور دیگر سیاروں کو سورج کے گرد گردش کے دوران
ا کون سی قوت ان کے اپنے مدار میں قایم رکھتی ہے۔ اس اثنا میں درخت پر
ے ایک سیب نیچے گرا۔ جس نے نیوٹن کو چونکا دیا اور معاً اس کو خیال آیا
ہ جس کشش نے سیب کو زمین کی جانب کھینچا ہے، وہی کشش بڑے پیمانے پر زمین اور سورج کے درمیان عمل پیرا ہوتی ہے اور زمین کو سورج کے گرد ایک خاص مدار میں رکھتی ہے اور یہی قوت دیگر سیاروں اور سورج کے درمیان پائی جاتی ہے اور یہی قوت چاند کو زمین کے گرد گھماتی ہے۔ اس طرح اس نے کششِ زمین Gravity کی مقامی قوت کو ایک عالمی قوت کا روپ دیا اور اس کا نام تجاذب رکھا۔

جوہان کیپلر نے فلکیات کے جو تین قوانین معلوم کیے تھے، ان پر نیوٹن کی گہری نگاہ تھی۔ ان قوانین کے عملی اطلاق سے اس نے قانون تجاذب کے متعلق دو اہم امور دریافت کیے:

۱۔ اول تو یہ کہ دو جسم جتنے زیادہ بڑے ہوں گے، ان کے درمیان اتنی ہی تجاذبی قوت زیادہ ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں تجاذب کی قوت ان جسموں کی کمیتوں کے حاصل ضرب کے متناسب ہوگی۔

(۲) دوم یہ کہ دو جسموں کے درمیان کے فاصلے اور تجاذب کی قوت میں باہمی تعلق ضرور موجود ہے۔ یہ بات تو بدیہی تھی کہ دو جسموں کے درمیان فاصلہ اگر زیادہ ہوگا تو ان کی باہمی کشش کم ہوگی اور اگر فاصلہ کم ہوگا تو ان کی باہمی کشش زیادہ ہوگی۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اگر مثال کے طور پر دو قوتوں کے درمیان فاصلہ تین گنا کر دیا جائے تو کیا اُن کے درمیان تجاذب کی قوت کم ہو کر ۱/۳ رہ جائے گی۔

نیوٹن نے کیپلر کے قوانین کی مدد سے ثابت کیا کہ یہ قوت ۱/۳ نہیں، بلکہ ۱/۹ رہ جائے گی۔ اسی طرح اگر فاصلہ چار گنا کر دیا جائے تو قوت ۱/۱۶ رہ جائے گی اور اگر فاصلہ پانچ گنا کر دیا جائے تو قوت ۱/۲۵ رہ جائے گی۔ یعنی ہر صورت میں یہ قوت فاصلے کے مربع کے برعکس متناسب ہوگی۔



یہ چاند نہیں بلکہ زہرہ سیارے کے مختلف نظارے ہیں

جب نیوٹن نے تجاذب کی قوت کی یہ خصوصیات معلوم کرلیں اور یہ نظریہ بھی قایم کرلیا کہ یہ قوت عالمگیر ہے اور اس کا عمل دخل تمام اجرام فلکی پر ہے، تو اس نے زمین کے گرد چاند کی گردش پر اس کا اطلاق کرکے اس کی تصدیق کرنا چاہی۔ اس مقصد کے لیے اس کو ایک طرف زمین کے سائز اور دوسری طرف چاند کے سائز کی پیمائشیں درکار تھیں۔ زمین کا سائز جو اس کے زمانے میں معلوم تھا۔ نیوٹن نے اس پر انحصار کیا اور اس کی بنا پر چاند کی رفتار کا حساب لگایا تو یہ حساب چاند کی اصل رفتار کے مطابق ثابت نہ ہوا۔ نیوٹن اس شبے میں پڑگیا کہ اس نے تجاذب کے عالمگیر ہونے کا جو نظریہ قایم کیا ہے، یہ غالباً درست نہیں۔ اس وجہ سے اس نے تجاذب پر جو تحقیقات کی تھی، اس کا مسودہ شایع نہیں کیا بلکہ اسے اپنے بکس میں بند کر دیا۔ نیوٹن نے اپنی دیگر دونوں دریافتوں مثلاً کیلکولس کی ایجاد اور روشنی کی ماہیت کو بھی شایع نہیں کیا۔ یہ مسودات سالہا سال تک اس کے پاس پڑے رہے۔ اس وقت وہ ایک نوجوان طالب علم تھا اور اس کی عمر چوبیس سال سے زیادہ نہ تھی۔

نیوٹن سے اس حساب میں جو غلطی ہوئی تھی، وہ زمین کے سائز کی وجہ سے تھی جو اس وقت صحیح طور پر معلوم نہ تھا۔ مغربی سائنس دانوں

نے زمین کے گھیر کی جو پیمائش اس وقت تک کی تھی، ان کے مطابق یہ گھیر ۲۲ ہزار میل تھا۔ اسی پیمائش کو جان کر نیوٹن نے اپنا حساب لگایا تھا لیکن حقیقت میں یہ گھیر ۲۵ ہزار میل ہے۔ سترہ برس بعد ۱۶۸۲ء میں نیوٹن کو پتا لگا کہ فرانس کے ایک سائنس داں پیکارڈ نے زمین کے گھیر کی نئی پیمائش کی ہے جو ۲۲ ہزار کے بجائے ۲۵ ہزار میل نکلی ہے۔ نیوٹن کو فوراً خیال آیا کہ اس نئی پیمائش کی بنا پر مجوزہ قانون تجاذب کی مدد سے چاند کی گردش کی رفتار معلوم کی جائے۔ جب اس نے اس رفتار کا حساب لگایا تو وہ چاند کی اصل رفتار کے عین مطابق نکلی۔ جس سے قانونِ تجاذب کی تصدیق ہو گئی۔

رائل آبزرویٹری :

مشاہداتی فلکیات کو برطانیہ کی شاہی رصدگاہ کے قیام سے بہت تقویت ملی۔ شاہی رصدگاہ ۱۶۷۵ء میں گرین وچ کے مقام پر قائم ہوئی۔ سمندر میں جہاز رانی کے وقت مقامات کے طول بلد مقرر کرنے کے لیے کوئی قابل اعتبار ذریعہ پیدا کرنے کی ضرورت اتنی شدید ہو گئی تھی کہ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" کے اصول پر شاہی رصدگاہ نے جنم لیا۔ ستاروں کے صحیح مقامات اور چاند کی حرکت معلوم کرنے کے لیے یہ شاہی رصدگاہ بادشاہ چارلس دوم نے قائم کی تھی۔ اس وقت کے مشہور ماہر فلکیات جان فلامسٹیڈ کو اس رصدگاہ کا پہلا ناظم اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ اس نے ستاروں کا استوائی مطلع ان کی نصف النہار قوت گزرگاہ کے وقت سے مقرر کیا اور اس مقصد کے لیے جو کلاک استعمال کیا تھا وہ آج تک زیر استعمال ہے۔ اس نے چاند کے جو مشاہدات کیے تھے، ان سے نیوٹن کو ایسی قیمتی معلومات حاصل ہوئیں جو نظریۂ تجاذب وضع کرنے میں آئیں۔ اس نے ستاروں کی ایک فہرست بھی مرتب کی تھی جو ۱۷۲۵ء میں شائع ہوئی اس میں ۲۸۰۴ ستاروں کے مقامات بھی درج ہیں اور اس کے مشاہدات بھی۔

جان فلامسٹیڈ کے بعد یہ عہدۂ جلیلہ ایڈمنڈ ہیلی کے سپرد ہوا جو نیوٹن کا ذاتی دوست تھا۔ نیوٹن کو کتاب "پرنسپیا" لکھنے کی ترغیب ہیلی نے دی تھی اور اشاعت و طباعت کے تمام اخراجات اسی نے برداشت کیے تھے

ہیلی نے ثابت کیا کہ ۱۶۸۲ء میں نمودار ہونے والا عظیم دمدارہ ۱۶۰۷ء میں، اس سے پہلے ۱۵۳۱ء میں بھی نمودار ہوا تھا اور پیشین گوئی کی کہ اب ۱۷۵۸ء میں نمودار ہوگا۔ نیوٹن کے نظریۂ تجاذب کی بنیاد پر یہ پہلی کامیاب پیشین گوئی تھی جس کے باعث نظریۂ تجاذب کو زبردست قبولیت عامہ حاصل ہوئی۔ ہیلی نے ستاروں کے مقامات کا موازنہ بطلیموسی فہرست سے کرنے کے بعد نتیجہ اخذ کیا کہ بعض زیادہ روشن ستاروں کی حرکت انتہائی متناسب ہے۔ اس لیے جن کو ہم ثوابت کہتے ہیں، ان میں سے بعض قائم نہیں ہیں۔ بلکہ حرکت میں رہتے ہیں۔ اس نے چاند گرہن کے قدیم ریکارڈ کے مطالعے کے بعد یہ نتیجہ بھی نکالا کہ چاند کی اوسط حرکت رفتہ رفتہ بڑھ رہی ہے۔



مریخ کا ایک اور نظارہ

ہیلی کے بعد شاہی رصدگاہ کا ناظم اعلیٰ جیمز بریڈلے مقرر ہوا اس نے روشنی میں اہتزاز دریافت کیا جس سے زمین کی حرکت کا پہلا براہ راست ثبوت فراہم ہوا۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ زمین کا محور قدرے ترچھا ہے۔ اس نے ۶۰ ہزار مشاہدات کی بنیاد پر ۳۲۰۰ ستاروں کی فہرست بنائی۔ اس کے مشاہدات کو جدید فلکیات کا نقطۂ آغاز کہا جاتا ہے۔

فرانس میں جیمز بریڈلے کا ہم عصر لاسیلی (۱۷۱۳ء - ۶۲ء) تھا۔ اس نے دس ہزار جنوبی ستاروں کا مشاہدہ کیا۔ یہ مشاہدات اس نے کیپ کی مہم کے دوران کیے تھے۔ موازنہ کے بعد اس نے سورج اور چاند کے اختلاف منظر ازسرنو متعین کیے۔

جرمنی میں اس وقت ماہر فلکیات توبیاس مئیر (۱۷۲۳ء - ۶۲ء) کام کر رہا تھا۔ اس نے بھی بریڈلے کی سی صحت اور نظریات کے ساتھ ستاروں کے مشاہدے کیے۔ اس نے ایک نظریۂ قمر بھی وضع کیا تھا جس کے مطابق اس کے نقشوں اور جدولوں کے بارے میں حکومتِ برطانیہ نے بریڈلے سے رپورٹ طلب کی۔ بریڈلے نے اپنی رپورٹ میں اس کی توثیق کی، تو حکومت برطانیہ نے مئیر کی بیوہ کو تین ہزار پونڈ کا عطیہ دیا۔ کیوں کہ ان نقشوں سے جہاز رانی کے دوران طول بلد مقرر کرنے میں بڑی مدد ملتی تھی۔

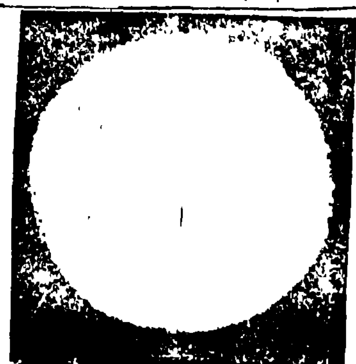
جہاز رانی کے مقاصد کے لیے فلکیات کا بہتر استعمال برطانیہ کے ہیئت دان مسا کلین (۱۷۳۲ء - ۱۸۱۱ء) نے کیا جسے ۱۷۶۶ء میں "شاہی ماہر فلکیات" مقرر کیا گیا۔ اس نے سال کے سال ایک بحری المانک شائع کرنے کا اہتمام کیا جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ المانک میں سورج، چاند اور سیاروں کی ہیئتوں کا اندراج ہوتا تھا۔

اٹھارویں صدی :

نیوٹن کی وفات کے بعد ضروری تھا کہ یہ دیکھا جائے کہ اس کے قانون تجاذب کے مطابق اجرام فلکی کی حرکات کیوں کر مقرر ہوتی ہیں۔ ان حالات کی معمولی معمولی جزئیات کا خیال رکھنا بھی ضروری تھا۔ اس اہم کام کو فرانس کے اس زمانے کے بڑے ریاضی دانوں الیلر، کلیرپوٹ، ایلبرٹ، لیگرینج اور لاپلاس وغیرہم نے پورا کیا۔ نیوٹن نے زیادہ تر جیومیٹری کے طریقے اختیار کیے تھے لیکن چاند اور سیاروں کی حرکت کی تجاذبی نزاکتوں کو سمجھنے کے لیے حسابی تجزیوں اور نظری حرکیات کی ضرورت تھی۔ یہ ضرورت ان ریاضی دانوں نے پوری کر دی۔ کلیرپوٹ نے زمین کی شکل کا نظریہ پیش کیا اور وضاحت کی کہ زمین کی سطح پر کشش ثقل کے کیا کیا اثرات وار د ہوتے ہیں۔ ایولر نے چاند کی حرکات کے سابقہ نظریے میں چند ترمیمیں اور اصلاحیں پیش کیں۔ لیگرینج نے سیاروں کی باہمی تجاذبی قوت کا مطالعہ کیا۔ لاپلاس نے تجاذبی فلکیات کے تمام شعبوں میں اہم اصلاحات کا اضافہ کیا اور نظام شمسی کے اجرام کی حرکات کو نیوٹن کے قانون تجاذب سے ہم آہنگ اور مطابق قرار دیا۔ فرانس کے ان ریاضی دانوں کے مجموعی کام سے فلکیات کا ایک نیا شعبہ کھل گیا، جسے "فلکی حرکیات" کہا جاتا ہے۔

نظریۂ اضافیت

مشاہداتی فلکیات کی بڑھتی ہوئی صحت سے تجاذبی فلکیات کی صحت پر کبھی خوش گوار اثر پڑا۔ چند مستثنیات سے قطع نظر تجاذب کا اصول نظریہ روز مرہ کے مشاہدات کے عین مطابق ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مشاہدے ہی میں کوئی غلطی یا فرق ہو۔ سالہا سال سے سیارہ عطارد کے نقطۂ حضیض کی مشاہدہ شدہ حرکت اور ریاضیاتی حرکت میں فرق چلا آ رہا ہے، یعنی ایک صدی میں ۴۳ درجے۔ اس فرق کو سمجھنے کے لیے بہت کوششیں ہوئیں، لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اس فرق کو نظریۂ تجاذب سے کبھی نہ سمجھا جا سکا تھا لیکن نظریۂ اضافیت کے وجود سے یہ فرق سمجھ میں آ گیا۔ تجاذبی فلکیات کا ایک بڑا مسئلہ چاند کی حرکت کا مسئلہ تھا۔ ماہرین فلکیات ہینسن، ڈلانے اور جی ڈبلیو ہل نے اپنے اپنے انداز میں اس پیچیدہ مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی۔ سب سے اچھا اور مکمل نظریہ وہ تھا جو براؤن نے ہل کے پیش کردہ نظریے کی اساس پر پیش کیا تھا۔ براؤن نے چاند کی حرکت کے جو نقشے اور جدول بنائے تھے، وہ ۱۹۲۳ء سے "بحری المانک" میں شائع کیے جا رہے ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ماہرین فلکیات نے پہلی مرتبہ چاند کی حرکت کے بارے میں ایک مکمل اور صحیح تجاذبی نظریہ پیش کیا۔



مریخ اور اس کی قطبی ٹوپی

ترقی یافتہ آلات : اٹھارویں صدی میں فلکیاتی آلات میں بھی اہم اور قابل ذکر اصلاحیں اور ترقیاں ہوئیں۔ بریڈلے نے جو آلات سدس بنائے وہ اتنے اعلیٰ اور درجہ بند تھے کہ ستاروں کی بلندی تقریباً پوری پوری صحت کے ساتھ معلوم ہو جاتی تھی۔ بے رنگ شیشے کی دریافت سے بہتر سے بہتر دوربین بنانے کا راستہ کھل گیا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ گھنٹے بنائے جانے لگے، جن سے ستاروں کی گزرگاہوں کا بہتر انداز میں مشاہدہ کیا جانے لگا۔ بحری وقت پیما (کرونومیٹر) کی ایجاد سے جہاز رانی کے دوران میں طول بلد معین کرنے کا مسئلہ حل ہو گیا۔ فلکی آلات کو سب سے زیادہ ترقی ولیم ہرشل نے دی۔ جس نے شیشے کو ڈھالنے، پیسنے اور چمکانے کے کام کے متعدد طریقے ایجاد کیے اور بہترین دوربینیں خود بنائیں۔

سر ولیم ہرشل کو جدید فلکیات کا بانی کہا جاتا ہے۔ اسے افلاک کے مشاہدے کا جنون تھا۔ سیارہ یورانس کی دریافت سے اسے عالمگیر شہرت

بھی حاصل ہوئی۔ پھر کچھ عرصے بعد اس نے یورانس کے دو اور زحل کے دو سیارچے دریافت کیے۔ اس نے متعدد ڈبل ستاروں کا کھوج لگایا ستاروں کے فاصلے کے بارے میں نئی معلومات حاصل کیں۔ ہرشل نے سحابیوں کو بھی دریافت کیے اور سحابیوں اور مجموعہ ہائے نجوم کی فہرست بھی بنائی۔ اس نے ثابت کیا کہ ہرقلس کے مجموعۂ نجوم میں ایک خاص نقطے کی سمت محو حرکت ہے۔ اس نے اپنی بنائی ہوئی ذاتی دوربینوں سے آسمان کے مختلف حصوں کے مشاہدات کیے۔ پھر ان مشاہدات سے ایسے نتائج اخذ کیے، جن کی وجہ سے فلکیات کی سائنس نے ترقی کے مدارج تیزی سے طے کیے۔

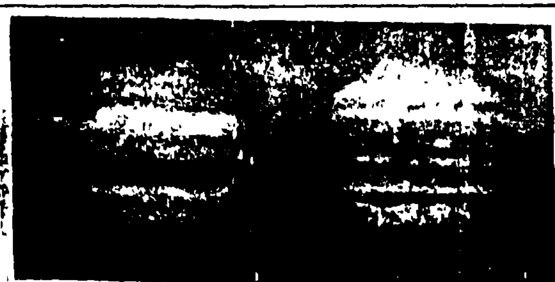
ستاروں کے فاصلے:

ستاروں کے باہمی فاصلے مقرر کرنے کا مسئلہ زمانۂ قدیم ہی سے ماہرین فلکیات کی دلچسپی و توجہ کا محتاج رہا ہے۔ بالخصوص کوپرنیکی نظام کی مقبولیت کے بعد اس مسئلے نے شدت اختیار کرلی تھی۔ اب ستاروں کے فاصلے بھی پیمانے کی زد میں آنے لگے۔ ۱۸۳۸ء کے بعد ہینڈرسن نے قنطورس، بیسل نے دجاجہ ۶۱ اور سٹرویو نے ستارہ لائرے کے فاصلوں کی پیمائش کی۔ ستاروں کے انتہائی صحیح اور مستند پیمائش بیسل نے شمسی پیمائی مدد سے کی تھی۔ اس معاملے میں ہر قسم کے مشاہدات سے فوٹوگرافی کہیں زیادہ مفید ثابت ہوئی۔ فوٹوگراف کی بدولت ہزاروں ستاروں کے فاصلے مقرر کیے جا چکے ہیں۔

ریڈیائی فلکیات

۱۹۴۵ء کے بعد اجرام فلکی کا مشاہدہ ریڈیائی امواج پر کیا جانے لگا ہے۔ شروع شروع میں یہ خیال تھا کہ جن اجرام سے ریڈیائی امواج خارج ہوتی ہیں وہ ہماری دودھیا کہکشاں کی حدود میں واقع ہیں۔ لیکن اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ریڈیائی سرچشمے دودھیا کہکشاں سے باہر، بہت دور واقع ہیں۔ آسمان میں سب سے بڑا ریڈیائی سرچشمہ کاسیوپیا میں واقع ہے۔ [illegible] زیادہ تر ریڈیائی سرچشمے ماورائے کہکشانی ہیں۔ تازہ تحقیقات سے انکشاف ہوا ہے کہ اس قسم کی کہکشائیں ۴½ ہزار ملین نوری سال پر واقع ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں نیم نجمی ریڈیائی سرچشموں یعنی کوزاروں کے دریافت سے کچھ فلکی معاملات سلجھ گئے، کچھ مزید الجھ گئے۔ ۱۹۷۰ء تک ۲۰۰ کوزاروں کے فوٹوگراف لیے گئے۔ ماہرین فلکیات میں اس امر پر اتفاق پایا جاتا ہے کہ کوزاروں کی سرخ منتقلی درحقیقت کائناتی اثر کا نتیجہ ہے۔ نیز یہ کہ اب تک انسان کو جس بعید ترین جرم فلکی کا جو سراغ لگ سکا ہے، وہ کوزار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کوزار ۱۰۰ ملین سورجوں پر مشتمل ہیں اور ایک ایسے خطے میں محصور ہیں جو ہمارے نظام شمسی سے بڑا نہیں ہے۔

ریڈیائی فلکیات کی وجہ سے ۱۹۶۰ء میں پلسر پہلی مرتبہ دریافت ہوئے۔ اب تک چالیس سے زیادہ پلسر دریافت ہو چکے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمارے نظام شمسی میں واقع ستارے ہیں جو قریب المرگ ہیں۔ ان کے ریڈیائی اشاروں کی رفتار ۳۰ فی سکنڈ ہے۔ اور اس کی وجہ ستارے کی محوری گردش ہے۔



مشتری کے دو مختلف پہلو

مسلم طلباء کا معیارِ تعلیم

پست معیار کی وجوہات، تجاویز اور حل

محمد اسحاق

کچھ عرصے سے اخبارات میں مسلم طلباء کے معیارِ تعلیم پر مراسلے اور مضامین کا سلسلہ چل رہا ہے۔ اس سے ایک عام تاثر یہ قائم ہو چلا ہے کہ مسلم طلبا کا معیارِ تعلیم پست ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلم طلبا عام طور پر غبی، کند ذہن اور لاپرواہ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر امتحان میں ناکام ہونے والے امیدواروں کی فہرست میں ان کی تعداد سرِ فہرست ہوتی ہے لیکن یہ نظریہ تباہ کن اور غلط ہے۔ جہاں تک طلبا کے تعلیمی معیار کا تعلق ہے اس میں مسلم اور غیر مسلم سب برابر ہیں۔ البتہ ہندوستان میں برسہا برس کی پچھلی تاریخ دیکھی جائے تو چند ذاتیں ایسی رہی ہیں جنھوں نے علم کو پھیلنے نہ دیا۔ وہی خاص طبقہ عام طور پر ہوشیار، ذہین اور حکومت کے لائق سمجھ لیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ جسمانی وجاہت کی طرح ذہانت بھی توارثاً یا ماں باپ کا عطیہ ہے اچھے پڑھے لکھے، ذہین اور تعلیم یافتہ والدین کے بچے عام طور پر ذہین اور پڑھنے لکھنے میں تیز ہوتے ہیں لیکن وہ غریب ماں باپ جو معمولی شد بد سے بھی ناواقف رہ جاتے ہیں وہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کو ضروری نہیں سمجھتے۔ ان کے بچے جنگلی پودوں کی طرح اُگ آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہریجن، اچھوت اور قبائلی لوگ جنھیں گزشتہ چار ہزار برس تک تعلیم سے دور رکھا گیا وہ ذہنی اعتبار سے پست اور تعلیم کے معیار کو چھونے میں سست ہیں۔ تعلیم کی وجہ سے چند برسوں میں اُن کے آگے آنے اور دوسروں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔ یہ خود ذاتی قابلیت و صلاحیت سے محروم نہیں ہیں لیکن انھیں صیقل کرنے کا کبھی موقع ہی نہیں دیا گیا۔ اسی مفروضے پر اگر یہ کہہ دیا جائے کہ پست اقوام کے طلبا کا معیارِ تعلیم بھی پست ہوتا ہے تو بات صحیح ہے لیکن ایسا کیوں ہے؟ یہی اصل سوال ہے۔

بھیڑیا بچہ رامو کی مثال

۱۹۵۳ء کی بات ہے کہ انگریزی اخباروں میں "ایک بھیڑیا بچہ" کا ذکر بہت دنوں تک آتا رہا۔ ہوا یہ کہ اتر پردیش کے کسی جنگل میں شکاریوں نے دیکھا کہ بھیڑیوں کے جھنڈ میں انسان کا بچہ بھی شامل ہے وہ اس گلہ میں دوڑ رہا ہے۔ بڑی ہوشیاری سے اسے زندہ پکڑ لیا گیا۔ اس کو لکھنؤ میڈیکل کالج میں رکھا گیا۔ اس کا فرضی نام رامو رکھا گیا۔ یہ بچہ تقسیم ہند کے زمانے میں کسی طرح جنگل میں چھوٹ گیا۔ نہیں معلوم یہ بچہ ہندو تھا یا مسلمان، کسی مادہ بھیڑیے نے اس شیرخوار کو سایہ دیا اور یہ بڑا ہو کر "بھیڑیا بچہ" بن گیا۔ اس کے جسم کے بال اور ناخن بڑھ چکے تھے۔ یہ دودھ پلیٹ میں چاٹ کر پیتا تھا۔ چھ ماہ تک اس کو دودھ چمچے سے پلانے کی مشق کرائی گئی تو اتنا ہوا کہ چمچے میں دودھ لے کر منھ تک پہنچانے تک آدھا اوپر گرا لیتا۔ اس کی عمر آٹھ، نو برس کی ہو چکی تھی۔ بات کرنے کی کوشش کی گئی تو "غوں غوں" کی آواز نکالتا۔ چھ ماہ کے اندر ہی یہ انسان کا بچہ میڈیکل کے غیر فطری ماحول کو برداشت نہ کر سکا اور مر گیا۔ اگر رامو کچھ نہ سیکھ سکا تو اس میں قصور کس کا ہے۔ رامو تو انسان کا بچہ تھا لیکن شیرخوارگی کے زمانے ہی سے وہ کسی گھر کے ماحول، تہذیب و تمدن، زبان و بیان، اوصاف انسانی سے واقف نہ ہو سکا۔ اگر رامو ہمارے درمیان میں ہوتا

ریٹائرڈ پرنسپل سلطان العلوم کالج آف ایجوکیشن - حیدر آباد

اس کی تعلیم و تربیت کی نگرانی کی جاتی تو شاید وہ ہمارے ملک کا بڑا آدمی
ہوتا۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ جہاں تک توارث کا تعلق ہے وہ فیصلہ کن
ہے۔ بچہ کا ناک نقشہ، رنگ و قد وغیرہ وغیرہ سب کچھ استقرار حمل ہی
کے وقت طے ہو جاتا ہے۔ اب جو کچھ ہمارے قابو میں ہے وہ اس کی تعلیم و
تربیت یا ماحول۔

چند تجربے

سال ۱۹۶۱ء میں مردم شماری کے سلسلے میں مجھے محلہ جینل گوڑہ میں گھر گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ یہاں پر دو حضرات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ایک جناب امیر علی خاں صاحب مرحوم صوبیدار تھے۔ موصوف نے ادھر ادھر کی باتیں کیں اور میرے سر ہو گئے کہ آپ نے ایم۔ اے کیوں ادھورا چھوڑ دیا۔ ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی کر دو وغیرہ۔ اس گفتگو سے مجھ میں ایک ولولہ پیدا ہوا اور میں اپنے خول سے نکل آیا۔ اب احساس ہوتا ہے کہ بڑے آدمی طلبا کی حوصلہ افزائی کریں تو ان کی زندگی کا رُخ تبدیل کر سکتے ہیں۔

دوسرے بزرگ جن کا نام یاد نہیں "اتالیق منزل" کے قریب ہی ایک چھوٹے سے کرایہ کے مکان میں رہتے تھے اور حضور نظام کے صرف خاص سے ۱۵ روپے وظیفہ پاتے تھے۔ ان کے گیارہ لڑکے اور لڑکیاں تھیں۔ ان میں دو لیڈی ڈاکٹر، ایک لڑکی بنک آفیسر، سب لڑکے انجینیر، ڈاکٹر، سائنٹسٹ اور ایک اعلیٰ عہدے پر دہلی، لکھنؤ، بمبئی، حیدرآباد میں ملازم احد عشر کوکباً کی مثال گیارہ بچے سب کے سب آسمان کے ستارے ہیں میں حیرت میں رہ گیا۔ پوچھا کیا آپ کے سب بچے اتنے ذہین تھے۔ آخر راز کیا ہے۔ جواب دیا کہ بچے کوئی غیر معمولی ذہین تو نہ تھے۔ البتہ میں گزشتہ بیس برس سے ہر روز ان بچوں کے ساتھ دو گھنٹے بیٹھ کر پڑھاتا، ان کا ہوم ورک دیکھتا۔ میں خود میٹرک کامیاب تھا۔ چند دن میں میں ان کے سب مضامین کو اچھی طرح پڑھانے کے قابل ہو گیا۔ وہ سب ایک کے بعد ایک میٹرک میں کامیاب ہوتے گئے، پھر اس کے بعد خود ہی اڑنے لگے۔

ایک اور مثال محبوب نگر کے مولوی شمس الدین صاحب مرحوم کے بچوں کی ہے۔ یہ مولوی صاحب ۵ سہ برس تک محبوب نگر ہائی اسکول پر ابتدائی شاہرہ ۳۰ روپے ماہانہ پر کام کرتے رہے۔ ان کے ۴ لڑکے اور ۵ لڑکیاں ہیں۔ لڑکے۔ ایک مائننگ انجینیر پی ایچ۔ ڈی (سائنٹسٹ) اور ایک ایم۔ بی بی ایس (MBBS) عثمانیہ یونیورسٹی میں فرسٹ۔ لڑکیاں ایک بایوکیمسٹری میں پی ایچ۔ ڈی، ایک ایم۔ ایس سی (جیالوجی)، ایم۔ ایس سی (کیمسٹری)، ایم۔ کام، ایم۔ اے۔ یہ سب کے سب اس وقت حیدرآباد، دہلی اور مدراس میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔

مولوی صاحب کے مکان ہی میں سڑک پر آٹے کی گرنی تھی۔ موصوف کے ایک صاحب زادے اس گرنی پر صبح سے شام تک متعین تھے۔ ایک روز ایک کرسچین جوڑا آٹا پسوانے آیا۔ مولوی صاحب اپنی مذہبیت اصول و کردار کے لیے ساری بستی میں مشہور تھے۔ انھوں نے کہا مولوی صاحب اس لڑکے کو آپ کم از کم میٹرک تک پڑھا دیا ہوتا۔ آپ نے اس کی مٹی پلید کر دی۔ اس وقت اس لڑکے کا چہرہ اور بال آٹے کے پوڈر سے سفید ہو چکے تھے۔ مولوی صاحب نے جواب دیا یہ میٹرک سے بھی آگے ہے۔ کیا انٹرمیڈیٹ پاس ہے؟ اس سے بھی آگے۔ کیا بی ایس سی ہے؟ اس سے بھی آگے۔ کیا ایم ایس سی ہے؟ اس سے بھی ذرا آگے۔ کیا پی ایچ ڈی ہے؟ ہاں یہ علی گڑھ سے بایوکیمسٹری میں پی ایچ ڈی کر چکا ہے۔ ابھی اس کو ملازمت نہیں ملی آج کل یہ صاحب زادے مدراس میں سائنٹسٹ کے عہدے پر ہیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے انھیں دو سال وظیفہ پر جاپان بھیجا۔ ان کے مقالے پر بعض ہندوستان کی یونیورسٹیوں نے اعزاز بخشا اور بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ مولوی صاحب نے ابتدا ہی سے ان کی تعلیم و تربیت پر توجہ دی اور ایک پلان کے تحت ان سب کو اعلیٰ ترین ڈگریوں تک پڑھایا۔

ان چند مثالوں سے دو باتیں واضح ہو چکی ہوں گی۔ ایک تو یہ کہ یہ لڑکے اور لڑکیاں کوئی بڑے گھرانوں کی نہیں تھیں۔ والدین معمولی درجے کے تھے۔ دوسری اہم بات ان والدین کی دور اندیشی تھی۔ بچے ہی ان کی زندگی کا اصل سرمایہ تھے۔ اس کے لیے وہ بہت پہلے ہی سے اپنا عزیز وقت نکالتے اور ان کے ساتھ گھنٹہ دو گھنٹہ محنت کرتے۔ وہ اس راز کو پا گئے تھے کہ ابتدائی دس برس کی تعلیم ہی اہم ہوتی ہے۔ یہ

محنت اور وقت کا مشغول کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی بنک میں تھوڑا تھوڑا سرمایہ دس برس تک جمع کرتا رہا اور ساری عمر نفع حاصل کرتا رہا۔ بس انہوں نے یہی کیا تاکہ ان کے بچے زندگی میں معتبر اور عزت کا مقام حاصل کر سکیں۔

زیادہ تفصیل میں گئے بغیر پست معیار تعلیم کی اصل وجوہات چند ایک ہیں۔ اسکول کا انتظامیہ، سرمایے کی فراہمی، صدر مدرسہ کی عدم کارکردگی، اساتذہ کی عدم دلچسپی، اسکولوں کا غیر تعلیمی ماحول، اسکولوں میں بنیادی ضرورتوں کی عدم فراہمی، جماعتوں میں طلباء کا ہجوم، بچوں کی لاپرواہی اور والدین کی عدم توجہ اور دلچسپی ان سب عوامل میں ہم صرف یہاں ایک سبب پر روشنی ڈالیں گے کہ والدین کی توجہ سے کیا انقلاب آسکتا ہے۔

تعلیم کے معیار کی بات دور کی ہے۔ اس سے قبل جو سب سے زیادہ اہم بنیادی بات ہے وہ یہ کہ بچوں میں تعلیم کا شوق اور دلچسپی پیدا کی جائے۔ یہ دلچسپی صرف اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کہ طالب علم سیکھنے لگتا ہے۔ بچوں میں لکھنے پڑھنے کا جذبہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ وہ کاغذ سلیٹ، کتابوں، دیوار اور فرش پر چاک اور کوئلہ وغیرہ سے لکھتے ہی جاتے ہیں یا لکیریں ہی کھینچتے رہتے ہیں جیسے جیسے وہ سیکھنے لگتا ہے اس میں خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے۔ تعلیم کا اصل مسئلہ تعلیم کے سارے زمانے میں اس ذوق و شوق کو مسلسل برقرار رکھنے کا ہے۔ یہ کام چند دن یا ہفتوں کا نہیں بلکہ دس بدرہ بارہ برس کا ہے۔

ایک دو برس پہلے کی بات ہے کہ جناب سید حامد صاحب سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ دہلی کی مرکزی سرکار میں کوئی ۴۴ سکریٹریز ہیں جن پر سارے ہندوستان کی حکومت کا دارومدار ہے اور جن سے ۵ منٹ کی ملاقات کے لیے اچھے اچھے لوگوں کو پندرہ پندرہ دن انتظار کرنا پڑتا ہے۔ ان کا حال یہ ہے کہ شام ہوئی میاں بیوی دونوں اپنے بچوں کی تعلیم اور ہوم ورک میں مدد دینے کے لیے، گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ جاتے ہیں۔ یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ہم میں ایسے کتنے ماں باپ ہیں جو اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے مہینوں اور برسوں میں ایک دو گھنٹے ہی سہی بیٹھ گئے ہوں۔

اس سارے مضمون کا ماحصل یہی ہے کہ آپ آج ہی سے طے کر لیں کہ اپنے عزیز وقت کا حصہ جیسا دوسرے کاموں پر صرف ہوتا ہے، لازماً اپنے بچوں کے ساتھ گھنٹہ دو گھنٹہ روزانہ بیٹھ جایئے۔ چاہے آپ پڑھے لکھے ہوں یا نہ ہوں، آپ کی نگرانی بہت کافی ہے۔ جو پڑھا سکتے ہیں وہ تو بہت اچھا ہے۔ اس میں نہ تو بڑے منصوبے کی ضرورت ہے اور نہ سرمائے کی۔

"اور سب مل کر اللہ کی (ہدایت کی) رسی کو مضبوط پکڑے رہنا اور متفرق نہ ہونا۔ اور اللہ کی اس مہربانی کو یاد کرو، جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہو گئے۔"

سورہ آل عمران

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ   جلد نمبر ۷   شمارہ نمبر ۷ (جولائی ۸۸ء)

تاریخ کی درسی کتابیں اور فیروز شاہ تغلق

ظفر الاسلام

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری (پٹنہ) کے زیر اہتمام ۲۲ تا ۲۶ مارچ ۱۹۸۸ء کو عہد وسطی کی ہندوستانی تاریخ سے متعلق مخطوطات پر جنوب ایشیائی سیمینار منعقد ہوا۔ اس سیمینار کے دو اجلاس مختلف اسکولوں کی تاریخی درسیات کے تنقیدی جائزے کے لیے مخصوص تھے، جن کے بارے میں عام تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے تئیں ہندوؤں میں نفرت و عداوت کے جذبات پیدا کرنے میں اہم رول ادا کرتی ہیں۔ اس مخصوص اجلاس میں ملک کے مختلف اداروں کے مندوبین کے علاوہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ڈاکٹر جمال محمد صدیقی، ڈاکٹر افضال حسین اور جناب ارشد اسلام شریک ہوئے۔ سیمینار کے عام موضوع کی مناسبت سے میرا مقالہ عربی کے ایک تاریخی مخطوطہ پر تھا لیکن تاریخی درسیات سے دلچسپی کی وجہ سے میں اس کے مخصوص اجلاس میں بھی شریک رہا اور اس موضوع پر متعدد مقالہ نگاروں کی تحقیقات اور ان پر بحث و مباحثہ سے مستفید ہوا۔ اس سیشن میں پیش کیے جانے والے مقالات سے دو باتیں خاص طور سے اُبھر کر سامنے آئیں۔ اول یہ کہ درسی کتابوں کے تاریخی اسباق کے مطابق عہد وسطی کے وہ مسلم حکمراں زیادہ متعصب، تنگ نظر اور فرقہ پرست واقع ہوئے تھے جو دینی میلانات اور مذہبی رجحانات کے لیے معروف تھے۔ اس کا بخوبی اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ان درسی کتابوں سے منافرت پھیلانے والے جو اقتباسات بطور مثال پیش کیے گئے تھے ان میں سے بیشتر کا تعلق فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱ - ۱۳۸۸ء) اور اورنگ زیب عالمگیر (۱۶۵۶ - ۱۷۰۷ء) سے تھا۔ دوسرے یہ کہ مذہب کی پابندی یا اسلامی شریعت کی پیروی اور تعصب و تنگ نظری میں گہرا رشتہ ہے۔ اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ ان درسی کتابوں میں پہلے ان مسلم بادشاہوں کو شریعت کا متبع اور اسلام کا نمائندہ بتایا گیا ہے اور پھر ہندو عوام کے ساتھ ان کی ظلم و زیادتی کی مفروضہ کہانی اس انداز میں پیش کی گئی ہے کہ ایک دوسرے کے لازم و ملزوم معلوم ہوتے ہیں۔

تاریخی حقائق کی روشنی میں غور کیا جائے تو مذکورہ دونوں باتیں بے بنیاد اور غلط ثابت ہوں گی۔ اس میں شبہ نہیں کہ سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ فکری و نظری طور پر اسلامی شریعت کی بالادستی کے قایل تھے اور ان کے یہاں ظاہری طور پر شریعت کا احترام اور شرعی قوانین کا پاس و لحاظ پایا جاتا تھا، لیکن یہ کہنا خلاف واقعہ ہوگا کہ ان کی شخصی و عوامی زندگی صحیح معنوں میں اسلامی تعلیمات کی عکاس تھی یا یہ کہ ان کا نظم حکومت شریعت کے عین مطابق تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی حکومت کا نظام شاہانہ تھا اور سیاست و حکومت کی دنیا میں ان کے پیش نظر مختلف عوامل (مذہبی تقاضے، خاندانی روایتیں سیاسی مصلحتیں، انتظامی ضروریات اور مقامی حالات) ہوتے تھے جو ان کی کارکردگی کی راہ متعین کرتے تھے۔ ان میں سے کس عامل کو کس معاملے میں ترجیحی مقام حاصل ہوتا تھا، اس کا فیصلہ موقع و محل کی مناسبت اور سلطان کی صواب دید پر منحصر تھا۔ اس لیے اگر کوئی ان کے ہر ایک عمل کو اسلام سے

لیکچرر شعبہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

سوب کرے یا ان کے جملہ اقدام کو اسلامی تعلیمات کا متقاضی قرار دے تو ے کیسے حق بجانب کہا جاسکتا ہے۔ تاریخ کی درسی کتابوں میں ایک جانب لم حکمرانوں سے بہت سی ایسی باتیں منسوب کی گئی ہیں جو ان کے عہد میں ہام پذیر نہیں ہوئیں۔ دوسری جانب برادران وطن کے ساتھ ان کے وا و ناروا ہر نوع کے سلوک کو اس طور پر پیش کیا گیا ہے کہ یہ تمام تر . بنائے تقاضائے اسلام تھا۔ اسی بات کی وضاحت کے لیے یہاں تاریخی اخذ کی روشنی میں فیروز شاہ کی بابت درسی کتابوں کے بیانات کا تنقیدی تجزیہ پیش کیا جائے گا۔ اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آئے گی کہ کس ح تاریخی واقعات کو توڑ مروڑ یا بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے تاکہ معصوم بچوں کے ذہنوں میں مسلم حکمرانوں بالخصوص مذہبی رجحان رکھنے والوں کی یک بھیانک تصویر جم جائے اور مسلمانوں کے تئیں نفرت و عداوت کا احسا بیدار ہو جائے۔

درسی کتابوں میں فیروز شاہ کے جس اقدام کو سب سے زیادہ اہمیت و شہرت دی جاتی ہے، وہ ہندوؤں پر جزیہ کا نفاذ ہے۔ اسے ایک زائد مالی بوجھ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس انداز میں اس کا ذکر کیا جاتا ہے کہ فیروز شاہ نے ہندوستان میں پہلی بار یہ قانون لاگو کیا۔ یہاں اس کی گنجائش نہیں کہ اسلام کے تصور جزیہ اور اس کی تاریخ پر روشنی ڈالی جائے لیکن یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان میں یہ قانون کسی نہ کسی صورت میں فاتح سندھ محمد بن قاسم کے زمانے سے رائج تھا۔ فیروز شاہ نے اس میں صرف یہ ترمیم کی کہ اس نے برہمنوں کو بھی (جو پہلے اس سے مستثنیٰ تھے) اس کی ادائیگی کا پابند قرار دیا۔ سلطان کا یہ اقدام معاصر علماء سے مشورہ اور ان کی متفقہ رائے پر مبنی تھا کہ چلو برہمن اپنی سماجی و معاشی مصروفیات کی وجہ سے پروہت اور معابد کے خدام کے زمرے میں شامل نہیں کیے جاسکتے جو شریعت کی رو سے جزیے سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ فیروز شاہ کے عہد میں قانون جزیہ کے اجراء کا بہت تذکرہ ملتا ہے۔ لیکن اس جانب شاید ہی کہیں اشارہ کیا جاتا ہے کہ اس نے برہمنوں کے ساتھ رعایت کرتے ہوئے شرح جزیہ میں تخفیف کی اور تمام برہمنوں پر یکساں طور پر فی نفر دس تنکہ مقرر کی۔ فیروز شاہ کے اس اقدام کو سمجھنے کے لیے یہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ اس نے شرعی قوانین کی روشنی میں نظام محاصل میں اصلاح پیدا کرنے کی کوشش کی، صرف انھیں محاصل کی وصولی پر زور دیا جو شریعت سے ثابت ہیں اور اس نے حکومت کے ذرائع آمدنی کی تشخیص و تحصیل میں جو بے ضابطگیاں کی جاتی تھیں انہیں رفع کیا۔ شریعت کی روشنی میں قانون جزیہ کا اجراء سلطان کی اس مہم کا ایک حصہ تھا نہ کہ ہندوؤں کے خلاف کوئی تعزیری اقدام یا ان کی مالی ذمہ داریوں میں اضافہ کرنا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ شاید ہی کوئی درسی کتاب جزیہ کے ذکر سے خالی ہو لیکن اس کا حوالہ شاذ و نادر ہی کہیں ملتا ہے کہ سلطان نے تقریباً ۲۸ ایسے محاصل معاف کیے جو شریعت سے ثابت نہیں تھے۔ یہ محاصل زیادہ تر مقامی نوعیت کے تھے جو کسانوں، دستکاروں اور مختلف پیشہ والوں سے وصول کیے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ سلطان کے اس اقدام سے ہندو و مسلم سبھی کو راحت ملی اور اس کی یہ معافی کسی خاص طبقے تک محدود نہ تھی۔

درسی کتابیں مسلم حکمرانوں سے عمومی طور پر مندروں کا انہدام منسوب کرتی ہیں۔ فیروز شاہ اس ضمن میں کوئی استثنا نہیں ہے لیکن فیروز شاہ اور مذہب پسند سلاطین کے ساتھ خصوصیت یہ ہے کہ اس عمل کو ان کے دینی رجحان کا مظہر قرار دیا جاتا ہے اور اسے اس طرح ذکر کیا جاتا ہے کہ گویا یہ عمل مسلم حکمرانوں کے فرائض میں داخل ہے۔ اول تو یہ کہ بت شکنی یا منادر کی تخریب کو مذہبیت یا اسلام پسندی کا لازمہ سمجھنا اسلام کی غلط ترجمانی اور اس کے مزاج سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ اسلام دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کے احترام کی تعلیم دیتا ہے وہ کسی مسلم شہر میں حکومت کی اجازت کے بغیر ذمیوں کو منادر کی تعمیر کی اجازت نہیں دیتا لیکن قدیم منادر کے خلاف کسی اقدام کو روا نہیں سمجھتا۔ شریعت میں صرف اسی صورت میں مندر کے انہدام کی اجازت ہے جب اس کے ضابطے کے خلاف ان کی تعمیر عمل میں آئی ہو یا پھر وہ کسی سماجی و اخلاقی خرابی کے پھیلنے کا ذریعہ بن جائیں لیکن اگر کسی سلطان یا بادشاہ کے یہاں اس اصول کی خلاف ورزی ملتی ہے تو نہ تو اسے اسلام سے منسوب کرنا انصاف کا تقاضا ہوگا اور نہ اس کا دفاع صحیح ہوگا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں مندروں کے انہدام کے واقعات پیش آئے لیکن انھیں بیان کرتے وقت یہ دیکھنا

ضروری ہے کہ کن حالات و اسباب کے تحت یہ واقعات رونما ہوئے۔ یہ مندر نیا تو نہیں تھا جو کسی مسلم شہر میں تعمیر کیا گیا۔ جنگی حالت یا فوجی مہم کے دوران اس کے لوٹنے کا واقعہ تو پیش نہیں آیا، یا یہ حکومت کے خلاف سرگرمیوں و سازشوں کا اڈہ یا غیر اخلاقی اعمال کے پھیلنے کا ذریعہ تو نہیں بن گئے تھے۔ فیروزشاہ کی بابت معاصر مآخذ کی تفصیلات سے صاف طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے عہد میں زیادہ تر نئے منادر کو مسمار کیا گیا جو اسلامی ضابطے کی خلاف ورزی میں بنائے گئے تھے۔ تغلق پور، صالح پور اور گوہانہ کے منادر کے ضمن میں خاص طور پر یہی وجہ بیان کی گئی ہے۔ جاج نگر اور نگر کوٹ کے مندر فوجی مہم کے دوران منہدم کیے گئے۔ اور بعض مندر کی بابت یہ صراحت ملتی ہے کہ وہ اس لیے توڑے گئے کہ وہ گمرہی و بد اخلاقی پھیلانے کا وسیلہ بن گئے تھے۔ انھیں عوامل کے تحت فیروزشاہ کے عہد میں کچھ مندر توڑے گئے۔ ایسا نہیں ہے کہ منادر کا انہدام اس کی بنی بنائی سیاسی پالیسی کا حصہ تھا۔ اس ضمن میں ایشور ٹوپا کی یہ رائے بہت متوازن معلوم ہوتی ہے :

> "فیروزشاہ نے ایک طرف اسلامی قانون کے تحت اور دوسری طرف پبلک بھلائی کے پیش نظر ان مندروں کو توڑا۔ فیروزشاہ نے عام طور سے بحیثیت سرکاری پالیسی کے مندر نہیں توڑے۔"

فیروزشاہ دراصل لوگوں کی مذہبی و اخلاقی زندگی کے سدھار کا خواہاں تھا اور وہ ان تمام ذرائع کو بند کرنا چاہتا تھا جو اس کے لیے ضرر رساں تھے۔ یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ سلطان نے اسی مقصد کے پیش نظر مندروں میں عورتوں کا جانا ممنوع قرار دیا۔ اور دوسری جانب مزاروں پر عورتوں کی حاضری پر پابندی عاید کی۔ اس لیے کہ اس کی وجہ سے اوباش و بد طینت لوگوں کو غیر اخلاقی اعمال میں ملوث ہونے اور مذموم حرکتیں کرنے کا موقع ملتا تھا۔ اگر اس ممانعتی حکم کے پیچھے جو جذبہ کار فرما تھا اسے نہ ذکر کیا جائے یا صرف مندروں کے سلسلے میں بات کہی جائے تو یقیناً اس سے ظاہر ہوگا کہ سلطان متعصب و تنگ نظر واقع ہوا تھا اور اس طرح سے ۔ افکار فرقہ وارانہ جذبات کو بھی ہوا لگے گی۔ واقعہ یہ کہ فیروزشاہ نے ہندوؤں سے متعلق جو اصول و ضوابط جاری کیے یا انتظامی قدم اٹھائے وہ اس کی عام سیاسی پالیسی اور اصلاحی کوششوں کا جزء تھے۔ ان سے مقصود سماجی و

شہری حقوق کو سلب کرنا نہ تھا۔ سلطان کے زمانۂ حکومت میں ہندوؤں کو وہ تمام حقوق و مراعات حاصل تھے جو ذمی کی حیثیت سے شریعت کی روشنی میں انھیں ملنے چاہیے۔ تاریخی و فقہی مآخذ اس کی واضح شہادت پیش کرتے ہیں جس کی تفصیل میں جانے کا یہاں موقع نہیں ہے۔

اسی طرح فیروزشاہ کے بارے میں یہ بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ ایک کٹر سنی مسلمان تھا اور اس نے مختلف ایسے فرقوں و تحریکوں کے خلاف سخت معاندانہ رویہ اختیار کیا جو عام سنی عقاید و نظریات سے میل نہیں کھاتے تھے۔ اس ضمن میں خاص طور سے شیعہ فرقہ کا نام لیا جاتا ہے۔ فیروزشاہ نے بعض متشدد شیعوں کے خلاف جو سخت قدم اٹھایا اگر اس کے پس منظر کی وضاحت کے بغیر یا سلطان کی دینی و سماجی اصلاحات سے الگ کرکے اس واقعہ کو بیان کیا جائے تو یہ بلا شبہ سلطان کے تعصب و تنگ نظری کی کھلی ہوئی دلیل فراہم کرے گا لیکن اگر اسے اس تناظر میں دیکھا جائے کہ سلطان نے ایک صالح و صحت مند معاشرے کی تعمیر کے لیے دینی افکار و نظریات کی پرورش اور مذہبی و اخلاقی زندگی میں بگاڑ پیدا کرنے والے عقاید و خیالات کے سد باب کے لیے کوشش کی اور ان فرقوں و تحریکوں کے رہنماؤں کو قرار واقعی سزا دینے میں کسی نرمی کا ثبوت نہیں دیا جو اپنے گمراہ کن افکار و اعمال کے ذریعے ذہنی بے راہ روی اور فکری کجی پیدا کرتے تھے۔ اور اگر یہ بھی ملحوظ خاطر رکھا جائے کہ اس ضمن میں اس نے اباحتی و ملاحدہ فرقے کے سرغنہ، وحدت الوجودی فلسفہ کی آڑ میں گمراہی پھیلانے والے بعض نام نہاد صوفیا، فساد عقیدہ کی دعوت دینے والے کچھ شیعہ اور فتنۂ ارتداد کو ہوا دینے والے بعض برہمن میں کوئی تفریق و امتیاز نہیں برتا تو اسے تنگ نظری یا کسی فرقے کی سرگرمیوں پر بیجا پابندی سے تعبیر کرنا حقائق کو مسخ کرنا ہوگا۔ فتوحات فیروزشاہی میں صاف صاف مذکور ہے کہ سلطان نے ان شیعوں کے تئیں سخت رویہ اختیار کیا جو دین کے مسلمہ عقاید کے خلاف افکار کی تبلیغ میں مصروف تھے اور لوگوں میں فکری کجروی پیدا کر رہے تھے۔ ورنہ جہاں تک اہل بیت سے عمومی طور پر سلطان کی عقیدت و محبت کا سوال ہے معاصر مورخ بہنی کے یہ الفاظ اس پر گواہ ہیں :

در اخلاص اہل بیت رسول رب العالمین و در محبت

خاندان خاتم النبین گوی سبقت از بادشاہان ربع مسکوں ربودہ است۔"[14]

سلطان فیروز شاہ تغلق کی سیاسی ومذہبی پالیسی کے بارے میں جو غلط بیانی پائی جاتی ہے اس سے قطع نظر علوم وفنون کی دنیا میں اس کی دلچسپیوں اور اس کے عہد کی سرگرمیوں کی بھی صحیح عکاسی نہیں کی جاتی۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس نے صرف مذہبی علوم اور اسلامی لٹریچر میں دلچسپی لی اور اس کے عہد میں انہی علوم کی کتابوں کی تالیف وتصنیف عمل میں آئی اور یہ کہ دوسرے علوم سے اس کا کوئی واسطہ نہیں تھا اور نہ ہی ان کی ترویج واشاعت کی جانب اس نے کوئی توجہ دی۔ واقعہ یہ ہے کہ سلطان کی علمی سرگرمیوں کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ بلاشبہ فقہ وفقہی علوم سے اسے خصوصی شغف تھا۔ لیکن اس کے ساتھ تاریخ، علم ہیئت وطب میں بھی اس کی دلچسپی کا ثبوت ملتا ہے۔[15] عہد فیروز شاہی کی تصنیفی و تالیفی یادگاروں میں تفسیر تاتارخانی، فتاوای فیروز شاہی، فتاوای تاتارخانی، فوائد فیروز شاہی اور طرفۃ الفقہا کا عام طور پر تذکرہ کیا جاتا ہے لیکن اس کا حوالہ بہت کم ملتا ہے کہ اس کے دور میں تاریخ وطب اور ہیئت وموسیقی سے متعلق کتابیں بھی لکھی گئیں۔ جن میں بعض اسی کے نام معنون ہوئیں۔ مثلاً تاریخ فیروز شاہی، طب فیروز شاہی اور دلائل فیروز شاہی۔ یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ موخر الذکر کتاب علم ہیئت کی ایک سنسکرت کتاب کا فارسی ترجمہ ہے جسے سلطان کی ایما پر عزالدین خالد خانی نے انجام دیا تھا۔[16] علم ہیئت سے اس کی ذاتی دلچسپی اس سے بھی بجا طور پر واضح ہوتی ہے کہ اس نے خود ایک اسطرلاب تیار کیا تھا جو "اسطرلاب فیروز شاہی" کہلایا اور منارۂ فیروز شاہی پر نصب کیا گیا۔[17] سلطان نے سنسکرت کی دوسری کتابوں کا بھی فارسی میں ترجمہ کرایا اور اس طرح ہندوؤں کی علمی خدمات سے مسلمانوں کو متعارف کرایا۔ مزید براں اس کے عہد میں فن موسیقی سے متعلق جو کتاب (غنیۃ المنیہ) لکھی گئی تھی اس میں ہندوستانی موسیقی کا خصوصی تذکرہ ملتا ہے۔ علم طب کے فروغ پر اس نے کافی توجہ دی۔ اس کے زمانۂ حکومت میں اسی موضوع پر نہ صرف مفید کتابیں مرتب کی گئیں بلکہ اس فن کے سیکھنے وسکھانے کا بھی اہتمام کیا گیا اور شفاخانے قائم کیے گئے جہاں مختلف امراض کے ماہرین علاج ومعالجہ کی خدمات انجام دیتے تھے۔[18] ان حقائق سے یہ بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ سلطان کا تصور علم بہت وسیع تھا اور اسی لیے عہد فیروز شاہی کی علمی سرگرمیاں کسی خاص دائرے میں محدود نہ تھیں بلکہ مختلف جہات میں جاری ہوئیں۔ اس کے عہد میں مکاتب ومدارس کی کثرت اور مختلف علوم وفنون کی کتابوں کی تالیف وتصنیف اسی حقیقت کی غماز ہیں۔ علم کی اشاعت کے لیے سلطان نے جو نمایاں خدمات انجام دیں ان کا اعتراف پروموشن آف لرننگ ان انڈیا کے مصنف این۔ این۔ لا کے یہاں ان الفاظ میں ملتا ہے:

" فیروز شاہ سے قبل مسلم حکمرانوں میں کوئی ایسا حکمراں نہیں گزرا ہے جس نے عوام میں علم کی ترویج کے لیے اس کے بقدر کوشش کی ہو۔"[19]

مختلف اسکولوں اور تعلیم گاہوں کی درسی کتابوں کا المیہ یہ ہے کہ ان میں واقعات کو توڑ مروڑ کر اور حقائق کو مسخ کر کے ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کی تاریخ میں ایسی چیزوں کو نمایاں کیا جاتا ہے جس سے غیر مسلموں کے ساتھ ان کی دشمنی اور غیر منصفانہ روش ثابت ہو اور ستم بالائے ستم یہ کہ ان باتوں کو اس انداز میں پیش کیا جاتا ہے کہ اسلام کی تعلیم یہی ہے اور مسلم حکومت کی خصوصیات میں یہ چیزیں داخل ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس نوع کی تاریخ نگاری سے باہمی نفرت وعداوت کے علاوہ اور کیسے جذبات پروان چڑھ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر درسی کتابوں میں عہد فیروز شاہی کے تاریخی واقعات میں جزیہ کا نفاذ، مندروں کے انہدام اور بعض فرقوں کے خلاف سخت اقدام کو نمایاں مقام دیا جاتا ہے لیکن فیروز شاہ کے جو کارنامے بلا تفریق دین ومذہب جملہ عوام کی فلاح وبہبود سے تعلق رکھتے ہیں ان کی جانب اشارہ بھی نہیں ملتا۔ کتنی درسی کتابیں ہیں جو فیروز شاہ کے بیان میں ان حقائق کو بے نقاب کرتی ہیں کہ سلطان نے اس وقت کے محدود وسائل کی روشنی میں بے روزگاری کے انسداد کی تدبیر کی۔ کوتوال کے ذریعے شہر کے حالات کے حالات کی تفتیش کی اور بیکار لوگوں کو ان کی صلاحیت واستعداد کے مطابق کام پر لگایا۔[20] یا یہ کہ اس نے غریب خاندان کی لڑکیوں کی شادی کے لیے دیوان خیرات[21] کے نام سے ایک مستقل محکمہ قائم کیا اور اعلان کرایا کہ نادار لوگ جن کے یہاں

شادی کے قابل لڑکیاں ہیں وہ اپنا نام اس محکمے کے دفتر میں درج کرائیں۔ اس محکمے کے افسران پہلے نام درج کرانے والوں کے حالات کی تحقیق کرتے اور پھر ان میں سے ہر ایک کو اس کی حالت وضرورت کی مناسبت سے مالی امداد مہیا کرتے تھے[21] اسی طرح درسی کتابوں میں شاذ ونادر ہی یہ بیان ملتا ہے کہ فیروزشاہ نے کسانوں کی بھلائی کے پیش نظر متعدد نہریں کھدوائیں[22] محاصل کی تشخیص وتحصیل میں کسانوں کے مفاد کو ملحوظ رکھنے پر خاص زور دیا[23] اور ان سب سے اہم یہ کہ کسانوں پر سے کروڑوں تنکہ کی معافی کا اعلان کیا جو اس کے پیش رو سلطان کے زمانے سے تقاوی کی صورت میں ان کے ذمہ واجب الادا تھے۔ اس عام معافی کا اصل سبب کسانوں کے حالات کی روشنی میں یہ احساس تھا کہ قرض کی وصولی کی صورت میں وہ زبوں حالی کا شکار ہو جائیں گے[24]۔ مزید براں فیروزشاہ نے تعزیری نظام میں جو اصلاحات پیدا کیں، ان میں بھی انسانی فلاح وبہبود کے علاوہ اور کوئی جذبہ کارفرما نہ تھا۔ اس زمانے میں مجرمین بالخصوص باغیوں اور ان کے حامیوں کو جو اذیت ناک سزائیں دی جاتی تھیں سلطان نے ان پر پابندی عاید کی[25] اور اقبال جرم کے لیے ایذادہی وتعذیب کا جو طریقہ رائج تھا، اس نے اسے بھی ممنوع قرار دیا۔ لیکن اس نوع کے واقعات درسی کتابوں کے مرتبین کے لیے لائق توجہ نہیں بنتے۔

مختصر یہ کہ عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں مسلم حکمرانوں نے جو اہم اقدامات کیے ان کو درسی کتابوں میں اگر صحیح سیاق وسباق میں پیش کیا جائے تو اس سے نہ صرف ان حکمرانوں کے تئیں برادران وطن کے انداز فکر میں تبدیلی پیدا ہوگی بلکہ باہمی میل جول اور بھائی چارگی کی فضا کو پروان چڑھانے میں بھی اس سے مدد ملے گی لیکن افسوس کہ اس کے برخلاف موجودہ دور میں تاریخ کی بیشتر درسی کتابیں مسلم حکمرانوں کے کردار اور ان کی سیاسی ومذہبی پالیسی کی ایسی تصویرکشی کرتی ہیں کہ اس سے لامحالہ ہونہار طلبہ کے دل ودماغ میں حکمرانوں اور ان کے ہم مذہبوں کے تئیں نفرت وعداوت کا احساس جنم پاتا ہے۔ ان درسیات کے جو مسموم اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ اس سے ہر دانا وبینا واقف ہے۔ اس لیے یہ ازحد ضروری ہے کہ مذکورہ حقائق کی روشنی میں تاریخ کی درسی کتابوں (بالخصوص ابتدائی سطح کی) میں مناسب تبدیلی وترمیم لائی جائی اور ان کے مسموم اثرات کو زائل کرنے کے لیے مختلف نہج سے کوشش کی جائے خدابخش لائبریری کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار کی سربراہی میں منعقد ہونے والا یہ سیمینار اس سمت میں ایک اہم قدم تھا۔ اس میں ملک کے مختلف حصوں میں رائج تاریخ کی درسی کتابوں کا نہ صرف تجزیاتی تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا بلکہ وقت کے اس اہم موضوع پر بحث ومباحثے کے لیے آزادانہ وخوشگوار ماحول بھی فراہم کیا گیا۔

حواشی ومراجع

1. شمس سراج عفیف، تاریخ فیروزشاہی، کلکتہ، ۱۸۹۱ء ص ۲۸۴۔ حنفی مسلک کے مطابق مالی اعتبار سے ذمیوں کو تین طبقوں میں تقسیم کرکے ایک متعین تناسب کے ساتھ ان پر جزیہ عاید کیا جاتا ہے۔ فیروزشاہ نے یہاں شافعی ومالکی فقہاء کی رائے کو اختیار کیا جس کے مطابق ذمیوں کی طبقاتی تقسیم ضروری نہیں۔ امام اپنی صوابدید سے تمام ذمی باشندوں پر جزیہ کی یکساں مقدار عاید کرسکتا ہے۔
2. تفصیل کے لیے دیکھیے راقم کا مضمون "عہد فیروزشاہی کا نظم محاصل شرعی قوانین کی روشنی میں" تحقیقات اسلامی (علی گڑھ) ۳/۱۔ جنوری۔ مارچ ۱۹۸۴ء۔ ص ۲۸ – ۴۲
3. فتوحات فیروزشاہی۔ علی گڑھ ۱۹۵۴ء، ص ۵۔ عفیف۔ محولہ بالا۔ ص ۲۷۸ - ۲۷۹
4. فتوحات فیروزشاہی۔ ص ۹ – ۱۰۔

۵ خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، دہلی، ۱۹۵۸ء ص ۴۳۷

۶ فتوحات فیروز شاہی ص ۹-۱۰۔

۷ ایشور ٹوپا۔ ہندی مسلمان حکمرانوں کے سیاسی اصول۔ انجمن ترقی اردو علی گڑھ، ۱۹۴۳ء۔ ص ۸۹

۸ سجان رائے بھنڈاری۔ خلاصۃ التواریخ۔ دہلی، ۱۹۱۸ء ص ۲۵۰

۹ فتوحات فیروز شاہی۔ ص ۸-۹

۱۰ اس موضوع پر بحث راقم کے مضمون "غیر مسلموں سے تعلقات کی نوعیت فتاوای فیروز شاہی کی روشنی میں" زندگی نو ۳/۷ ستمبر ۱۹۸۷ء۔ ص ۱۶-۲۵) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

۱۱ اس موضوع پر تفصیل کے لیے دیکھیے راقم کا مضمون "فیروز شاہ تغلق کی دینی وسماجی خدمات"۔ تحقیقات اسلامی۔ ۵/۲- اپریل۔ جون ۱۹۸۶ء۔ ص ۴۶-۵۷۔

۱۲ فتوحات فیروز شاہی ص ۶-۸ عفیف، ۳۷۹-۳۸۲

۱۳ فتوحات فیروز شاہی۔ ص ۶۔ نیز دیکھیے سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات۔ ص ۴۲۳-۴۲۴

۱۴ ضیاء الدین برنی۔ تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ، ۱۸۶۰ء ص ۵۸۰۔

۱۵ سیرت فیروز شاہی، نقل (مخطوطہ اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور) مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، یونیورسٹی کلکشن، فارسیہ اخبار ۱۱۱، ص ۱۴۷، ۲۹۲-۲۹۷، ۳۰۵، ۳۴۰

۱۶ عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، کلکتہ، ۱۸۶۸ء ۱/۲۴۹ سیرت فیروز شاہی ص ۲۹۳

۱۷ سیرت فیروز شاہی ص ۹۵

۱۸ فتوحات فیروز شاہی ص ۱۵-۱۶ عفیف، ص ۳۵۶ سیرت فیروز شاہی ص ۲۳۵-۲۳۸-۳۴۰۔

۱۹ این این ہالا۔ پروموشن آف لرننگ ان انڈیا۔ دہلی، ۱۹۷۳ء ص ۵۶

۲۰ عفیف۔ ص ۳۳۴-۳۳۵

۲۱ عفیف ص ۳۴۹-۳۵۱۔ سیرت فیروز شاہی۔ ص ۲۳۸-۲۳۹

۲۲ برنی ص ۵۶۷ عفیف ص ۱۲۷-۱۲۹

۲۳ برنی ص ۵۶۴، عفیف ص ۹۴۔ سیرت فیروز شاہی۔ ۲۱۱-۲۱۲

۲۴ عفیف ص ۹۲

۲۵ فتوحات فیروز شاہی ص ۲۔

> مبارک ہیں وہ لوگ جن کے پاس نصیحت کرنے کے لیے الفاظ نہیں اعمال ہوتے ہیں۔
>
> حضرت ثوبان ثوری

آبدوز

سید عاصم محمود

آبدوز ایسا بحری جہاز ہے جو پانی کی سطح کے علاوہ پانی کے اندر بھی سفر کرسکتا ہو۔ آبدوز کا شمار پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے خوفناک ترین ہتھیاروں میں ہوتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ان جنگوں میں ڈبوئے جانے والے ۷۵ فیصد جہاز آبدوزوں کا نشانہ بنے۔

آبدوز تاریخ کے آئینے میں

۱۵۷۸ء میں ایک انگریز ریاضی دان ولیم بورن نے خیال ظاہر کیا کہ اگر ایک کشتی کو چمڑے کے خول میں لپیٹ دیا جائے تو اسے پانی کے نیچے بھی چلایا جاسکتا ہے۔ ۱۶۲۰ء میں ہالینڈ کے ڈربیل نے ایسی کشتی تیار کرلی جسے بارہ ملاح چلاتے اور یہ پانی کی سطح سے پندرہ فٹ نیچے چل سکتی تھی۔ سترھویں صدی کے دوران اور بھی کئی آبدوزیں تیار کی گئیں لیکن ہر آبدوز میں کوئی نہ کوئی خامی ہوتی تھی۔ پہلی کامیاب آبدوز ییل یونیورسٹی (امریکا) کے ایک طالب علم بشنل نے تیار کی جو طویل عرصے تک پانی کے اندر رہ سکتی تھی۔ اس نے اس کا نام ٹرٹل یعنی کچھوا رکھا۔ اس کی شکل انڈے کی طرح تھی اور اس میں صرف ایک آدمی کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ اس کے اندر ایک گراری نصب تھی جس کے ساتھ ایک دستہ لگا ہوا تھا۔ اسے ملاح ہاتھ سے گھماتا تو کشتی چلنے لگتی۔ اس میں ایک سمت نما، سادہ عمق پیما اور غوطہ دینے اور رخ موڑنے والے آلات بھی نصب تھے۔ اس میں ایک تارپیڈو بھی لگا ہوا تھا۔ نیوی کے لیفٹننٹ ازرالی نے پہلی بار ٹرٹل کا تارپیڈو برطانوی بحری جہاز "ایگل" پر داغا۔ "ایگل" تباہ تو نہ ہو سکا لیکن آبدوز جنگ کا آغاز ہوگیا۔

۱۸۰۰ء میں رابرٹ فلٹن نے اکیس فٹ لمبی آبدوز "ناٹیلس" (Nautilus) یعنی سرمایہ کے نام سے تیار کی جو بھاپ کے ذریعے چلتی تھی۔ اس نے برطانیہ، فرانس اور امریکا کے بحری افسروں کے سامنے "ناٹیلس" کے جنگی تجربات کا مظاہرہ کیا لیکن وہ اپنے بڑے بڑے بحری جہازوں پر اتنے نازاں تھے کہ انھوں نے فلٹن کی ننھی سی کشتی کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔

امریکا کی خانہ جنگی میں ایک آب دوز نے پہلی بار دو بحری جہازوں کو ڈبونے کا کارنامہ سرانجام دیا۔ جو چارلسٹن کی بندرگاہ کو گھیرے ہوئے تھے۔ یہ ۱۸۶۴ء کا واقعہ ہے۔ ہنلے نامی یہ آبدوز دو امریکی انجینروں لیک اور ہالینڈ نے تیار کی تھی۔ ہالینڈ نے ۱۸۹۸ء میں ۵۳ فٹ لمبی آبدوز "ہالینڈ" تیار کی جو پٹرول کے ذریعے چلتی تھی۔ اس کی رفتار سات میل فی گھنٹہ تھی۔ لیکن اس میں باہر کا منظر دیکھنے کا کوئی نظام موجود نہ تھا۔

پہلی جنگ عظیم میں جرمنی آبدوزوں نے تباہی مچادی۔ پہلے ہی مشن میں ایک آبدوز نے تین برطانوی جنگی جہاز ڈبو دیئے۔ جلد ہی جرمنوں نے مال بردار اور مسافر بردار بحری جہازوں پر بھی تارپیڈو برسانے شروع کر دیے۔ جرمنی کی اس جارحیت کے باعث امریکا جنگ میں شامل ہوا اور جرمنی کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔

دوسری جنگ عظیم میں تمام بڑی طاقتوں کے پاس آبدوزوں کے بیڑے

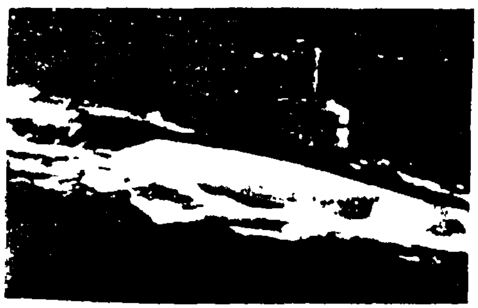
دفتر ماہنامہ طالب علم - کراچی پاکستان

موجود تھے جرمن کا بیڑہ سب سے زیادہ طاقتور اور خطرناک تھا۔ ان آبدوزوں کو یو بوٹ (U. Boat) کہا جاتا تھا۔ امریکا کے پاس ۳۰۰ فٹ لمبی آبدوزیں موجود تھیں جن میں ۸۰ افراد سوار ہو سکتے تھے۔ ان کی رفتار پانی کی سطح پر بیس میل فی گھنٹہ ہوتی تھی۔ ان سے ایسا تارپیڈو چھوڑا جاتا تھا جس میں ۵۰۰ پونڈ بارود ہوتا تھا۔ یہ تارپیڈو پٹرول سے چھوڑا جاتا تھا اور اس کی رفتار ۴۵ میل فی گھنٹہ ہوتی تھی لیکن اس میں قباحت یہ تھی کہ یہ اپنے پیچھے ایک لہر چھوڑتا جاتا تھا جو دشمن کو نظر آجاتی تھی۔ بعد میں ۲۹ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے والا بجلی کا تارپیڈو استعمال کیا جانے لگا جو دشمن کی نظر سے اوجھل رہتا تھا۔ جاپان کی آبدوزیں حجم میں سب سے بڑی تھیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ایسی آبدوزیں بنائی گئی ہیں جو بہت تیز رفتار ہیں اور طویل عرصے تک زیر آب رہ سکتی ہیں۔ برطانیہ نے ۱۹۵۴ میں ہائیڈروجن پر آکسائڈ سے چلنے والی "ایکسپلورر" سمندر میں اتاری۔ ۱۹۵۵ میں امریکا میں دنیا کی پہلی ایٹمی آبدوز "ناٹیلس" کا افتتاح ہوا۔ یہ نام فلٹن کی آبدوز کی یاد میں رکھا گیا ہے۔ ناٹیلس نے بحر منجمد شمالی کی برف کے نیچے سفر کرنے کا ریکارڈ قائم کیا ہے اور وہ قطب شمالی پر سے بھی گزری۔ ۱۹۶۰ میں امریکہ کی ۴۴۷ فٹ لمبی ایٹمی آبدوز "ٹرائیٹن" پانی کی سطح پر ابھرے بغیر دنیا کے گرد پورا ایک چکر لگایا۔ ٹرائٹن نے ۴۱۵۰۰ میل کا سفر ۸۴ دنوں میں طے کیا۔ امریکا کی ایٹمی آبدوز کشتی "جارج واشنگٹن" کئی مہینے زیر آب رہ سکتی ہے اور یہ "پولیرس" نامی میزائل سے بحری جہازوں کو نشانہ بنا سکتی ہے۔ آج کل امریکا اور روس کے بحری بیڑوں میں سینکڑوں آبدوزیں موجود ہیں۔ جدید ترین آبدوزیں ایک ہزار فٹ کی گہرائی تک اتر سکتی ہیں۔

آبدوز کی ساخت اور طریقۂ کار

آبدوز کی شکل سگار کی طرح ہوتی ہے اور اس کا سامنے کا جیٹ طیارے کے منہ کی طرح ہوتا ہے۔ اس حصے میں آبدوز کا انجن اور رُخ بدلنے والی مشنری نصب ہوتی ہے۔ دم میں غوطہ دینے والی مشین نصب ہوتی ہے۔ آبدوز کا رُخ بدلنے کا طریقہ بالکل ہوائی جہاز کے رخ بدلنے کے طریقے جیسا ہے۔ دھات کے بڑے بڑے تختوں کو دائیں بائیں موڑنے سے پانی کا ردعمل انھیں مختلف سمت میں دھکیل دیتا ہے اور اس طرح آبدوز کی سمت میں ردوبدل کیا جا سکتا ہے۔



امریکہ کی تیز رفتار آب دوز "البا کور"

آبدوز کی دیواریں دوہری بنائی گئی ہیں اور دو دیواروں کے درمیان پانی یا ہوا ہوتی ہے۔ اس ساخت کی بدولت آبدوز گہرائی میں پانی کے زبردست دباؤ سے محفوظ رہتی ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو آبدوز پانی کے دباؤ میں پس کر رہ جائے پانچ سو فٹ کی گہرائی میں پانی آبدوز کے ایک مربع انچ کے رقبے پر تین ٹن کا دباؤ ڈال رہا ہوتا ہے۔ جب غوطہ لگانا مقصود ہو تو آبدوز کے اندر موجود ایک خالی ٹینک میں پانی بھر لیا جاتا ہے۔ اس میں جتنا زیادہ پانی بھرا جائے آبدوز اتنی ہی زیادہ گہرائی تک پہنچ سکتی ہے۔ جب پانی کی سطح پر آنا مقصود ہوتا ہے تو پمپوں کے ذریعے یہ پانی باہر نکال دیا جاتا ہے اور آبدوز پھر ابھرنے لگتی ہے۔ دم پر لگے ہوئے بڑے بڑے تختے بھی غوطہ لگانے میں مدد دیتے ہیں۔ پانی بھرنے سے آبدوز رفتہ رفتہ غوطہ لگاتی ہے لیکن ان تختوں کی مدد سے چند سکنڈ میں سوڈیڑھ سو گز لمبی آبدوز پانی کے نیچے چلی جاتی ہے۔ یہ تختے افقی یعنی پانی کی سطح کے متوازی ہوتے ہیں۔ جب انھیں نیچے جھکایا جاتا ہے تو پانی ردعمل کے طور پر دم کو اوپر اٹھاتا ہے اور آبدوز غوطہ لگاتی ہے۔

توانائی کا مسئلہ

ڈیزل سے چلنے والی آبدوز میں چار انجن ہوتے ہیں۔ جب آبدوز سطح پر چل رہی ہوتی ہے یا دشمن کا خطرہ نہیں ہوتا تو صرف دو انجن چلائے جاتے ہیں۔ ہنگامی حالات میں زیر آب سفر کے وقت چاروں انجن چلا دیے

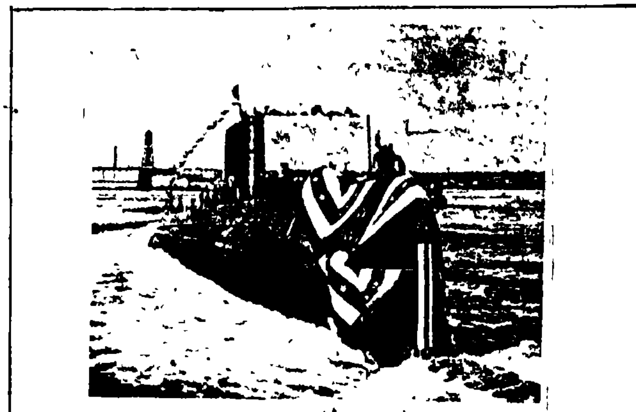
جاتے ہیں۔ بعض آبدوزیں بجلی سے بھی چلتی ہیں۔ لیکن یہ ہمہ وقت بجلی سے نہیں چل سکتیں۔ جب یہ سطح پر ہوتی ہے تو ایک بیٹری چارج ہوتی رہتی ہے اور جب یہ زیرِ زمین آجاتی ہیں تو اس بیٹری کو استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے آخر تک آبدوز زیادہ سے زیادہ تیس گھنٹے زیرِ آب رہ سکتی تھی۔ ڈیزل جلانے اور سانس لینے کے لیے آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے تیس گھنٹے کے بعد آبدوز کو ہوا کا ذخیرہ اکٹھا کرنے کے لیے بہرحال سطحِ آب پر آنا پڑتا ہے۔ ۱۹۴۵ء میں جرمنوں نے "سنارکل" نامی ایک آبدوز تیار کی جو زیرِ آب سفر کے دوران ہی ہوا اکٹھی کر سکتی تھی۔ ایک بہت بڑا نل پانی سے باہر نکال دیا جاتا جو ہوا اندر کھینچ لیتا تھا لیکن اس میں سے پانی اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ آبدوز طویل عرصے تک زیرِ آب رہ سکتی تھی اور اس لحاظ سے بہت خطرناک تھی لیکن یہ اس وقت ایجاد ہوئی جب جرمنی عملی طور پر یہ جنگ ہار چکا تھا۔ ایٹمی آبدوزوں کو چونکہ ایندھن جلانے کے لیے آکسیجن کی ضرورت نہیں ہوتی صرف عملے کے سانس لینے کے لیے آکسیجن کا نسبتاً بہت تھوڑا ذخیرہ ساتھ لے جانا پڑتا ہے۔ اس لیے یہ کئی مہینے بلکہ کئی سال متواتر زیرِ آب رہ سکتی ہے۔

آبدوز کی رہنمائی۔

آبدوز کی پشت پر چند اونچے کھمبے نصب ہوتے ہیں جن کی اونچائی ٹرانسسٹر کے ایریل کی طرح کم یا زیادہ کی جا سکتی ہے۔ ان میں سے ایک میں بالا بین (Periscope) نصب ہوتی ہے۔ جب آبدوز زیرِ آب ہوتی ہے تو عملہ بالا بین کی مدد سے آبدوز مرکز سے اپنا رابطہ برقرار رکھتی ہے اور ملنے والی ہدایات کے مطابق اپنا رُخ بدلتی رہتی ہے۔ اس طرح یہ آلات آبدوز کی رہنمائی کا کام کرتے ہیں۔ یہ کھمبے باہر سے نظر نہیں آتے، لیکن یہ اپنے پیچھے ایک لکیر سی چھوڑتے چلے جاتے ہیں۔ اس لیے اگر دشمن کا جہاز بہت قریب ہو تو آبدوز ان کھمبوں کو اندر کھینچ لیتی ہے اور بیرونی دنیا سے کلی طور پر منقطع ہو کر اندھا دھند سفر کرتی ہے خطرہ ٹل جانے کے بعد یہ پھر صحیح راستے پر آجاتی ہے۔

جب آبدوز تباہ ہوتی ہے۔

تباہ شدہ بحری جہاز کے عملے کو بچانا مشکل نہیں لیکن جب آبدوز کافی گہرائی میں تباہ ہو کر ڈوبنے لگتی ہے تو عملے کی جان بچانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی معاون بحری جہاز قریب ہی موجود ہو تو ایک ہزار فٹ تک کی گہرائی تک ڈوبنے والی آبدوز کو بچایا جا سکتا ہے۔ جہاز سے رسّے نیچے پھینکے جاتے ہیں جن کے ساتھ خاص قسم کی گھنٹیاں نصب ہوتی ہیں جن کی آواز پانی میں دور دور تک سنی جا سکتی تھی۔ رسوں کو تھام کر عملے کے لوگ اوپر آسکتے ہیں۔ آبدوز کے ہر کارندے کو ایک مصنوعی پھیپھڑا فراہم کیا جاتا ہے جو کئی گھنٹے تک اسے آکسیجن مہیا کر سکتا ہے۔ جب آبدوز ڈوب رہی ہوتی ہے تو اس کا ایک دارلاہ کھول کر، جس سے کمروں میں پانی نہیں آسکتا، بہت سی غبارہ نما کشتیاں چھوڑی جاتی ہیں جو تیزی سے پانی کی سطح پر پہنچ جاتی ہیں۔ ان کے نیچے رسے لگے ہوئے ہوتے ہیں جن کو تھام کر عملے کے لوگ اوپر آسکتے ہیں۔ یہ غبارہ نما کشتیاں ایک سو فٹ کی گہرائی تک ڈوبنے والوں کو بچا سکتی ہیں۔ عملے کے پاس غوطہ خوری کا مخصوص لباس بھی فراہم ہوتا ہے جو انھیں پانی کے زبردست بہاؤ سے محفوظ رکھتا ہے۔


امریکا کی ایٹمی آبدوز ناٹیلس اپنے افتتاح والے روز

آبدوزوں کے عملے کے لوگ عموماً رضاکار ہوتے ہیں اور گوریلا سپاہیوں کی طرح انھیں بھی ہر وقت تیار رہنا پڑتا ہے خصوصاً جنگ کے دنوں میں آبدوز میں رہنا خاصا صبر آزما ہوتا ہے۔ عملہ ہر وقت سمندر پر نگاہ رکھتا ہے اور خاص آلات کی مدد سے تارپیڈو، میزائل اور دوسرے آلات کی آوازیں سنتا ہے جن کی مدد سے آبدوز کا نشانہ لیا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات آبدوز کے عملے کو حرکت کرنے سے بھی منع کر دیا جاتا ہے۔ وہ ایک جگہ ساکت و صامت بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ صورت اس وقت پیش آتی ہے جب آبدوز ہر طرف سے

دشمنوں سے گھری ہوئی ہو اور آکسیجن کا ذخیرہ کم ہو۔ یاد رہے کہ بیٹھے یا سونے کی صورت میں انسان کو آکسیجن کی نسبتاً کم مقدار درکار ہوتی ہے۔

مقاصد

آبدوز کے اہم ترین مقاصد جنگی نوعیت کے ہیں۔ جدید ایٹمی آبدوزیں ڈیڑھ ہزار میل دور تک میزائل برسا سکتی ہیں۔ یہ پانی کے اندر سے تارپیڈو مار کر بحری جہازوں میں سوراخ کر سکتی ہیں اور انھیں ڈبو دیتی ہیں۔ آبدوزوں کو آبدوزوں کے خلاف بھی جنگ لڑنی پڑتی ہے اور یہ اس جنگ کا نازک ترین اور مشکل ترین مرحلہ ہوتا ہے۔ آبدوزیں بحری راستوں پر پہرہ دینے میں بھی اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔



امریکی آبدوز جو دوسری جنگ عظیم میں جاپان کے خلاف استعمال ہوئی

آبدوز پرامن مقاصد کے لیے بھی استعمال کی جا سکتی ہے۔ یہ تباہ شدہ جہاز کے مسافروں کو بچا سکتی ہے آج کل آبدوزوں کو زیر آب تحقیق کے لیے بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس طرح انسان سمندر کے اندر موجود معدنیات اور وسائل غذا سے فائدہ اٹھا سکے گا۔

کاہلی

یہ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی سمجھنے میں لوگ غلطی کرتے ہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں سے محنت نہ کرنا، کام کاج محنت مزدوری میں چستی نہ کرنا، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے میں سستی کرنا کاہلی ہے مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ دلی قوئی کو بیکار چھوڑ دینا سب سے بڑی کاہلی ہے۔

(سر سید احمد خاںؒ)

جاپان ـــ مشرقی بھی اور مغربی ملک بھی

ایشور راج ماتھر*

جاپان کو مشرق و مغرب کی تہذیبوں کا سنگم قرار دیا جاتا ہے۔ اس ملک نے مشرقی روایات اور مغربی صنعتی انقلاب اور کلچر کو اس طرح سے پنایا کہ ان کا غیر ملکی رنگ بالکل ہی بدل دیا گیا اور باہر سے آئے ہوئے ثقافتی اقدار کو جاپانی روایات کا پائیدار ملمع چڑھایا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باہر سے آنے والے کلچر کے لوازمات بنیادی طور پر خالص جاپانی ہی ہیں۔ اسی لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جاپان میں اب تک کوئی ثقافتی انقلاب نہیں آیا اور نہ ہی کوئی ایسا انقلاب آئندہ آنے کی توقع ہے۔

اہل جاپان نے کبھی ایسا محسوس نہیں کیا کہ ان کے سماج میں انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے حالانکہ انھوں نے دوسرے ملکوں سے کلچرل آداب مستعار لینے میں کبھی تامل نہیں کیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ عام جاپانی اپنے گھر میں خالص جاپانی رہائش اختیار کرتا ہے، چٹائیوں پر سوتا ہے۔ لباس جاپانی روایات کے مطابق ہوگا اور کھانا بھی جاپانی طرز کا۔ لیکن باہر یا آفس میں وہ سوٹ بوٹ پہن کر یورپین لوگوں کی طرح نظر آئے گا۔ گویا جاپانی اپنی رہائش اور بود و باش میں خالص جاپانی ہے اور صرف آفس میں، کاروبار میں اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں وہ دیگر یورپین نژاد سربراہ کی طرح اپنے آپ کو پیش کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے جاپانی پن کو برقرار رکھتے ہوئے بین الاقوامی کاروبار اور صنعتی ترقی میں شریک ہونے سے گریز نہیں کرتا۔

یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی جاپانی قوم کے کارنامے بالخصوص تیری کارنامے چھٹی صدی عیسوی سے اب تک کسی بھی حالت میں بہ اعتبار نشوو نما، ارتقاء و بالیدگی اور بہ اعتبار پیمانہ انقلابی نوعیت کے ہیں۔ ہر دور میں جاپانی لوگوں نے اپنے ماضی کو بامعنی پایا اور انھوں نے اپنے عظیم الشان ماضی اور قومی روایات سے کبھی رشتہ نہیں توڑا۔ انھوں نے ترقی کے لیے اپنے گذرے ہوئے زمانے اور کلچر کو پوری طرح رد نہیں کیا۔

ان کی ترقی مسلسل اور پیہم رہی ہے۔ یہ ترقی ماضی سے جڑی ہوئی رہی۔ ترقی کے منازل میں کبھی کبھی جھٹکے بھی آئے لیکن عام طور پر تند و تیز رو رہی۔ ان کی مطابقت پذیری کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے ترقی پذیر تبدیلی کو اپنے کلچر میں اثر انداز ہونے دیا۔ دوسرے ملکوں سے تہذیبی میدان میں مستعار لینے سے پیچھے نہیں رہے اور ساتھ ساتھ خود اپنے کلچر میں جو اچھائیاں تھیں ان مثبت پہلو کو سنبھال کر رکھنے میں کوئی بھی قوم جاپانی قوم کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ جاپانیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے کلچر کے عمدہ پہلوؤں کو برآمد کرکے وہ اچھائیوں کا ایک ہم آہنگ مجموعہ بنالیتے ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ ایسے ادارے جو فرسودہ ہو گئے ہیں ان کو رد کرنے میں بھی پیچھے نہیں ہٹتے۔ انھوں نے دقیانوسی اور فرسودہ جاگیردارانہ اور زمینداری نظام کو خاتمہ کرنے سے کبھی پس و پیش نہیں کیا۔ اسی لیے یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ جاپان ایک ایسا انوکھا ملک ہے اور جاپانی قوم ایک ایسی متحرک اور پر اثر کلچر کی آئینہ داری کرتی ہے جو زمانے کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بدلنے میں

---

* سابق صدر ناظم اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت مہاراشٹرا۔

پس و پیش نہیں کرتی، لیکن اپنی قدیم روایات اور جاپانی طرز زندگی اور قومی روایات کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔

اس کے برخلاف چینی جو کہ جاپان تین سو سال تک یعنی نویں صدی تک کلچرل معاملات میں تقلید کرتا رہا، موجودہ دور کے مغربی ٹکنالوجی کی چنوتی کا مقابلہ نہ کر سکے۔ سب سے پہلے تو انھوں نے اپنی بادشاہت ختم کردی، وہ بھی ایسے وقت جب کہ جاپان میں شہنشاہیت عروج پر تھی۔ اس کے بعد چینیوں نے اپنے ماضی کو خیرباد کہہ دیا اور مارکسسٹ انقلاب کو اپنایا اور اس کے ساتھ ہی کلچرل اور ثقافتی انقلاب آیا جس سے ماضی سے بالکل ہی ناطہ توڑ لیا گیا۔

جاپان چینی تہذیب و ثقافت کا بڑی حد تک مرہون منت ہے۔ ایک طرف تو اسے لکھنے کا ہنر حاصل ہے۔ آرٹ اور آرکیٹکچر اور فنِ تعمیر پر چین کی چھاپ نمایاں ہے اور سب سے بڑھ کر جاپانی طرز حکومت پر بھی چین کا قابل لحاظ اثر رہا ہے۔ جاپان کے سماجی اور سیاسی اداروں کے ہر پہلو پر چین کے گہرے تعلقات اور اثرات رہے ہیں۔ ان سب سے بڑھ کر چین نے بدھ مت کو جاپان برآمد کیا جو قبل ازیں ہندوستان سے چین نے درآمد کیا تھا اور بدھ مت کے ساتھ ہی چین کے دوسرے تہذیبی اور ثقافتی عناصر جاپانی زندگی اور طرز رہائش میں داخل ہو گئے اور جاپانی ادب پر بھی چین کا بے انتہا اثر نمایاں ہے۔ چائے پینے کی روایت بھی جاپان نے چین سے سیکھی لیکن جب جاپان نے محسوس کیا کہ چینی کانجی (KANJI) حروف اور رسم الخط جاپان کے لیے ناموزوں ہے اور ان کی قومی ضروریات کو پورا کرنے میں ناکافی ثابت ہو رہا ہے تو انہوں نے کٹاکانا اور ہیراگونا" طرز تحریر اختیار کیا۔ ان تمام درآمدات اور مستعار لینے کی کاوشوں میں جاپان نے ہمیشہ اپنی قومی ضرورتوں کو پیش نظر رکھا اور اپنے تہذیبی نقشے میں اس طرح منسلک کر لیا کہ وہ بھی جاپانی تہذیب کا جز لاینفک بن گئے اور جاپانی کلچر میں اس طرح گھل مل گئے کہ کوئی یہ کہہ نہیں سکتا کہ یہ باہر سے درآمد کیے ہوئے تہذیبی عناصر ہیں۔ اس تہذیبی میل جول میں جاپان نے اپنے قومی جوہر اور زبردست جاپانی تہذیبی اقدار کو اس طرح فروغ دیا کہ باہر سے لی ہوئی چیزیں بھی خالص جاپانی ہی نظر آتی ہیں اور جاپانی چھاپ اس قدر واضح ہے کہ کبھی شک و شبہ بھی نہیں ہوتا کہ وہ تہذیبی عنا دوسرے ملک سے درآمد کیے گئے ہیں۔ اگر جاپان کو چین کی تہذ بیٹی تصور کیا جائے تو یہ ظاہر ہوگا کہ یہ تہذیبی بیٹی اپنی ماں پر نہیں گئی بل وہ اتنی خود مختار خودرو اور خود پسند ثابت ہوئی کہ وہ اپنی ماں سے بھی ہر شعبۂ زندگی میں آگے نکل گئی۔

جاپان نے چین سے جو تہذیبی ورثہ حاصل کیا اس میں تنگ خاندان کے زوال عظیم الشان تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ جوں ہی چین میں ثقافتی اور تہذیبی انحاط شروع ہ جاپان نے چین سے کسی قسم کا تبادلہ یا تہذیبی اور ثقافتی عناصر کو مستعار لینا بند کر دیا سے حاصل کی ہوئی چیزوں کو جاپان نے اپنی قومی ضرورتوں اور تقاضوں کا لحاظ کر ہوئے خالص جاپانی انداز میں رد و بدل کیا اور ایک نئی گنگا جمن اور ملی جلی تہذیب کے ارتقائی دور کا آغاز ہوا جس میں خالص جا طرز، جاپانی انداز، جاپانی نقطۂ نظر اور خالص جاپانی قومی چھاپ نئی تہذیب کی ابتدا ہوئی۔

جاپان نے چین سے تہذیبی رشتے توڑ دیے اور اپنی اَ تھلگ قومی تہذیبی احساس کو بڑھاوا دیا۔ چونکہ نسلی، مذہبی اختلافات مو نہیں تھے اس لیے ایک خاص قومی شناخت کے قایم کرنے میں دیر لگی۔ آج کوئی اور قوم اس قدر ہم آہنگ اور قریبی طور پر متحد نہیں جیسے کہ جاپان۔ یہ خیال عام ہے کہ جاپانی قوم کو بہشت میں خدا ا ہاتھوں سے بنایا گیا ہے اور اس بہشتی قوم کو جاپان کے جغرافیا حدود میں ایک خاص تہذیب و ثقافت کو فروغ دینے کے بسایا گیا ہے جس کی خصوصیت تخلیق رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قومی ایک بنائے رکھنے میں جاپان کو کسی قسم کی توانائی صرف نہیں کرنی پڑی۔ واسیوں اور اوکیناوا کی قومیت کے لوگوں کا اصل کلچرل دھا میں مل جانے کے بعد جاپان نسلی متحد ملک بن گیا۔ اس طرح جاپان تہذیبی تشکیل اور سماجی ڈھانچہ کی بنیادیں اس قدر پائیدار اور مضب تھیں کہ اندرونی تبدیلیوں اور بیرونی دباؤ کا مقابلہ جاپانی قوم ڈ کرنے کے قابل بن گئی۔ بیرونی طاقتیں جو اس ملک پر قابض ہو ہمیشہ اس کوشش میں لگی رہیں کہ جاپان کو اپنے ثقافتی ڈھانچے میں ڈ لیں لیکن یہ کوشش کبھی کامیاب نہ ہو سکی۔ کیوں کہ جاپان کی کلچرل بنیا

صرف انتہائی مضبوط ہی نہیں بلکہ اس میں اس قدر نفاست ہے کہ وہ صرف
ہر کی عمدہ اور قابل قدر اعلیٰ اقدار کو ہی اپنے خاص جاپانی انداز میں قبول
رنے کے قابل ہے۔ ۱۹۴۵ء میں جاپان کی شکست کے بعد سات سال
ک امریکہ کا قبضہ رہا۔ جنرل میک آرتھر نے ہزاروں اصلاحی اقدامات
یے اور اس پر سختی سے عمل پیرائی کے باوجود جاپانیوں نے اپنی شناخت
ور اپنے قومی انوکھے پن کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ
مریکن حکمرانوں کی وجہ سے جاپانی خودداری اور حریت پسندی کو کافی دھکہ
لگا۔ لیکن جاپانی، جاپانی ہی رہے وہ امریکی تہذیبی سانچے میں ڈھالے نہ
جاسکے۔ بڑی کوششیں کی گئیں کہ جمہوریت کو جاپان پر زبردستی ٹھونس دیا
جائے تاکہ ان جاپانی روایات کا قلع قمع ہو جائے جن کی وجہ سے فوجی
ذہنیت نے جنم لیا اور جن کی وجہ سے بحر الکاہل کی جنگ شروع ہوئی
تھی۔ جنرل میک آرتھر نے سماجی، سیاسی اور معاشی اصلاحات رائج کیں
اور اس طرح ایک ہمہ گیر تہذیبی حملہ شروع کیا گیا تاکہ آنے والی جاپانی
نسل اپنی قدیم روایات اور کلچر کو بالکل بھول جائے اور امریکن طرز زندگی
اور امریکن سوچ بچار اور فلسفہ کو بحیثیت برتر کلچر کے قبول کریں اور
اسے اپنا لیں اور ایک نئے امریکن جاپان کی بنا پڑے لیکن جاپانی کچھ
اس طرح اپنے سماجی بندھنوں اور تہذیبی رشتوں میں جکڑے ہوئے تھے
کہ انھوں نے امریکن کلچر ان کے سر پر تھوپنے کی ہر کوشش ناکام کردی

جاپان کا سب سے بڑا ثقافتی خزانہ نظم و ضبط اور ڈسپلن
عمدہ کارگزاری اور کام کی اخلاقیات، حصول علم کی لگن اور ہم عصر سائنس
اور ٹکنالوجی کو اپنانے کی خاص کوشش اور آپس میں بات چیت اور
ہم آہنگی سے قومی سطح پر فیصلے کرنے کی نیک روایات جاپان میں جوں
کی توں برقرار ہیں۔ نصاب تعلیم بنیادی طور پر بدل دیا گیا۔ جوں ہی امریکن
قبضہ ختم ہوا ایسے اقدامات کیے گئے جن سے اس کا یکا یقین ہو گیا کہ
اس نظام تعلیم میں ایسی تبدیلیاں کی جائیں کہ جس کے ذریعے بہتر اور
روشن خیال جاپانی پیدا ہوں جو جنگ سے تباہ و تاراج جاپان کی تعمیر نو
کے قابل ہوں۔ اس طرح حکومت جاپان نے نظام تعلیم میں جو کچھ خامیاں
اور کمیاں رہ گئی ہیں ان کو دور کر کے روایتی اقدار کو پھر سے نظام تعلیم
میں داخل کیا جو امریکی قبضے کے دوران نظر انداز کر دی گئیں تھیں۔
اس عصر جدید کے جاپان نے جنگ سے تباہ کیے گئے جاپان کی تعمیر نو
اور ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کا راستہ تیار کر لیا۔

جاپانی قوم کام میں لگے رہنے کو اپنا قومی شعار بنا چکی ہے علم
جاپانی کو کام سے شغف اور دلی لگاؤ ہوتا ہے۔ مغربی نظروں میں جاپانیوں
کا اس طرح کام میں گتھ جانا مجرمانہ حرکت سمجھی جاتی ہے

اب تک جاپانیوں نے قدیم روایات اور زمانۂ حال کے مطابق
ہونے کی تحریک میں تضاد اور تصادم کو روک رکھا ہے۔ ان کی طرز
رہائش اور تہذیب کی خوبی یہی ہے کہ ان دونوں متضاد محرکات
کا خوش آئند امتزاج پیدا کر لیتے ہیں اور آگے بڑھتے ہیں۔ وہ
مسلسل دوسرے ملکوں سے تہذیبی عناصر کو مستعار لیتے رہے ہیں۔
لیکن ان کو اپنانے میں اپنی پسند اور روایات اور اپنی انفرادیت کو
ہمیشہ برقرار رکھے رہے ہیں۔ انھیں اپنے ماضی سے کوئی گلہ یا شکایت نہیں ہے بلکہ وہ
اپنے تہذیبی ورثے کو نئی طاقت اور نئی انرجی کا حامل بنا لیتے ہیں اور اپنے قومی
ورثے کو فخر اور اعتماد کے ساتھ اپنے سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔ ان کو اپنے تہذیبی
ورثے کا اتنا خیال ہے کہ وہ اس پر کسی قسم کے حملہ کو برداشت نہیں کر سکتے۔ شاید
یہی وجہ ہے کہ جنگ کے بعد سے اب تک قدامت پسندوں کی حکومتوں کو منتخب
کر کے لائے ہیں۔ اس کے پیچھے ہمیشہ یہی خیال گامزن رہا کہ وہ اپنے ملک کے
مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے کسی حد تک عصر جدید کا ساتھ دے سکتے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"(اللہ کو ماننے کے بعد) بہترین دانائی انسانوں
سے محبت کرنا ہے۔"

۹۸ فیصد پاس — ۶۵ فیصد فرسٹ ڈویژن

احمد رشید شیروانی

یو۔پی کے پچیس مسلم جونیر ہائی اسکولوں کے ۱۹۸۷ء اور ۱۹۸۸ء کے نتائج چارٹ میں درج ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔ یہ وہ اسکول ہیں جن سے ان دونوں سال کے بورڈ امتحانوں میں صرف مسلم بچے شریک ہوئے۔ یعنی ہم یہاں مسلم اور غیر مسلم بچوں کے نتائج کا موازنہ نہیں کر سکتے۔ البتہ ہم یہ ضرور دیکھ سکتے ہیں کہ ان اداروں میں گزشتہ ایک سال کے دوران مسلم بچے جونیر ہائی اسکول بورڈ امتحان کی سطح پر کتنے آگے آئے۔

۱۹۸۷ء میں چھ سو چھپن شریک۔ چھ سو بنتیس یعنی ستانوے فیصد پاس۔ ۱۹۸۸ء میں سات سو تینتیس شریک۔ سات سو سترہ یعنی اٹھانوے فیصد پاس۔ گویا شریک ہونے والے بچوں کی تعداد چھ سو چھپن سے بڑھ کر سات سو تینتیس ہوگئی۔ یہ اضافہ بارہ فیصد ہے۔ اب کہنے کو تو کہا جا سکتا ہے کہ ایک سال میں بارہ فیصد اضافہ کافی تو ہے لیکن دراصل یہ کافی نہیں ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ دوسرے اسکولوں میں اس سطح پر غیر مسلم بچوں کی تعداد میں اضافہ کی رفتار اس سے کچھ زیادہ نظر آتی ہے۔ اگر مسلمانوں کو تعلیم میں دوسروں کے برابر آنا ہے تو انہیں دوسروں سے زیادہ تیز رفتار سے آگے بڑھنا ہوگا تب ہی وہ کبھی دوسروں کے برابر پہنچ پائیں گے۔

اب کچھ لوگ بس بیٹھے بیٹھے یہ کہتے رہتے ہیں کہ "ہائے مسلمانوں کو آگے بڑھنے ہی نہیں دیا جاتا"۔ تو عرض ہے کہ ان ہی پچیس مسلم اداروں میں سے ۱۴ ادارے ایسے ہیں جہاں گزشتہ ایک سال میں بورڈ امتحان میں شریک ہونے والے مسلم بچوں کی تعداد بڑھی اور کافی بڑھی جی ہاں ان چودہ اسکولوں میں ملا کر تعداد دو سو بانوے سے بڑھ کر چار سو تیرہ ہوگئی۔ ایک سو اکیس (۱۲۱) عدد کا یہ اضافہ اکتالیس فیصد ہے۔ باقی گیارہ اسکولوں میں ملا کر تعداد تین سو تریسٹھ سے گھٹ کر تین سو بیس رہ گئی یعنی تینتالیس عدد یا بارہ فیصد کم ہوگئی۔ اگر چودہ اسکولوں میں مسلم بچوں کی تعداد میں اتنا اضافہ ایک سال میں ہو سکتا ہے اور ہوا ہے تو پھر باقی گیارہ اسکولوں میں تعداد کیوں کم ہو گئی؟ ان اداروں کے ذمہ داران اور ان مقامات کے باشعور علم دوست مسلمان اس بات پر بہت سنجیدگی سے توجہ دیں اصل چارٹ میں دیکھا جا سکتا ہے کہ کہاں کہاں تعداد کتنی کتنی بڑھی اور کہاں کہاں کتنی کتنی کم ہوگئی۔

فرسٹ ڈویژن

۱۹۸۷ء میں ان پچیس اسکولوں سے تین سو اڑتالیس (۳۴۸) عدد یعنی ترپن (۵۳) فیصد مسلم بچے فرسٹ ڈویژن لائے تھے۔ ۱۹۸۸ء میں چار سو اناسی یعنی سینسٹھ فیصد مسلم بچے فرسٹ ڈویژن لائے یہ اضافہ تو خاطر خواہ ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اب ہم پاس ہونے کو "رزلٹ" نہیں کہہ سکتے کیوں کہ پاس تو لگ بھگ سب ہی ہوتے

ہیں۔ اب اگر ہم مختلف اسکولوں کے "ریزلٹ" کا موازنہ کریں تو یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ کہاں سے کتنے فیصد فرسٹ ڈویژن لائے۔ چنانچہ چارٹ میں نتائج فرسٹ ڈویژن کے اعتبار سے درج ہیں۔ پہلے تین اسکولوں سے سو فیصد مسلم بچے فرسٹ ڈویژن لائے اور آخری تین سے صفر۔ پچیس میں سے پہلے پندرہ اسکول ایسے ہیں جن میں فرسٹ ڈویژن کا تناسب انسٹھ۵۹ فیصد یا اس سے زیادہ ہے۔ مگر آخری دس میں فرسٹ ڈویژن کا تناسب آدھے سے بھی کم ہے۔

پچیس خالص مسلم جونیئر ہائی اسکولوں کے نتائج

۱۹۸۷ء						۱۹۸۸ء			
شریک	پاس	فرسٹ	جونیئر ہائی اسکول	مقام	ضلع	شریک	پاس	فرسٹ	فرسٹ فیصد
۳۹	۳۹	۲۵	عاصم بہاری گرلز		مرادآباد	۶۵	۶۵	۶۵	سو
۲۴	۲۴	۱۹	محمدیہ بنکر گرلز		کانپور	۲۳	۲۳	۲۳	سو
۱۴	۱۴	۱۴	الاصلاح	کمال پور	بلند شہر	۱۵	۱۵	۱۵	سو
۳۰	۳۰	۱۰	جنت نشاں گرلز		مرادآباد	۳۹	۳۹	۳۸	ستانوے
۱۹	۱۹	۱۹	منظہر العلوم ۔ اکبرپور		بلند شہر	۲۰	۲۰	۱۹	پچانوے
۲۲	۲۲	۲۰	حافظ محمد صدیق اسلامیہ گرلز		اٹاوہ	۳۶	۳۶	۳۴	چورانوے
۵۱	۵۱	۱۲	ضیاء الاسلام		بلند شہر	۴۹	۴۹	۴۳	اٹھاسی
۱۲	۱۲	۱۱	نور حق		فیض آباد	۸	۸	۷	اٹھاسی
۱۱	۱۱	۷	مسلم	تمبور	سیتاپور	۲۰	۲۰	۱۷	پچاسی
۸۷	۸۷	۵۰	مسلم نسواں ۔ ٹانڈہ		فیض آباد	۶۷	۶۷	۵۷	پچاسی
۹	۹	۷	رحمانیہ گرلز		بدایوں	۱۹	۱۹	۱۴	چوہتر
۳۹	۳۹	۳۲	علی خاں	ہاپوڑ	غازی آباد	۴۷	۴۷	۳۵	چوہتر
۲۶	۲۶	۲۱	مسلم فرقانیہ گرلز	بسواں	سیتاپور	۳۰	۳۰	۲۱	ستر
۳۶	۴۴	۲۴	اسلامیہ عربیہ	دھام پور	بجنور	۴۴	۴۴	۳۰	اڑسٹھ
۲۸	۲۸	۹	ایچ۔ آر۔ گرلز	خورجہ	بلند شہر	۲۷	۲۷	۱۹	انسٹھ
۲۹	۲۹	۲۶	اسلامیہ فرقانیہ	بسواں	سیتاپور	۳۰	۲۹	۱۲	چالیس

شریک	پاس	فرسٹ	جونیئر ہائی اسکول	مقام	ضلع	شریک	پاس	فرسٹ	فرسٹ فیصد
۵۷	۵۴	۱۰	بنات القریش		مراد آباد	۵۶	۵۶	۱۷	تیس
۱۵	۱۵	۱۲	فیض القرآن	ملکہ مقیم پور	بجنور	۱۱	۱۱	۳	ستائیس
۱۳	۱۳	۶	ہادی		رام پور	۲۱	۱۸	۵	چوبیس
۲۷	۱۹	۵	شمسی گرلز		رام پور	۲۱	۱۴	۳	چودہ
۲۴	۲۴	۲	ایم۔اے۔او		آگرہ	۳۲	۳۲	۴	تیرہ
۹	۶	—	اصلاح قوم		رام پور	۱۸	۱۵	۱	چھ
۸	۸	۷	قاسمیہ عربیہ اسلامیہ		بلند شہر	۲۱	۲۱	—	صفر
۳	۳	—	سلیم مبشر ماڈل		بدایوں	۲	۲	—	صفر
۱۳	۹	—	مسلم نیشنل		دہرہ دون	۱۲	۱۰	—	صفر
۶۵۵	۶۳۵	۳۴۸	پچیس خالص مسلم اسکولوں میں			۷۳۳	۷۱۷	۴۷۹	سرسٹھ
—	ستانوے	ترپن	فیصد			—	اٹھانوے	سرسٹھ	—

ایک سلطان کے وزیر نے بغداد میں مدرسہ قائم کرنے کے لیے دو لاکھ دینار وقف کیے اور پندرہ ہزار دینار سالانہ اس کے صرفہ کے لیے مقرر کیے اس ادارے سے چھ ہزار ہر درجے کے طلبا مختلف وقتوں میں بہرہ اندوز ہوئے۔

(گبن)

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ پرنٹر و پبلشر: اسرار احمد۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
پرنٹیڈ: الیس۔ کے آفسیٹ پریس۔ دہلی۔

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۷ — شمارہ ۸ — اگست ۸۸ء

ترسیل زر کا پتہ :

ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

Editor : TAHZIBUL AKHLAQ & NISHANT.

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

زرِ سالانہ

انڈیا 30.00 Rs.

بیرونی ممالک US $ 20.00 ہوائی ڈاک

US $ 8.00 عام ڈاک

مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی

ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

انڈیا۔

مندرجات

[تہذیب الاخلاق علی گڑھ کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ مسلم یونیورسٹی بہر حال ان سے متفق ہو۔]

اِداریہ

ہم چاہتے ہیں :

- اردو زبان پھولے پھلے اور آگے بڑھے
  مگر
  خود اپنے بچوں کو انگریزی میڈیم اسکولوں میں تعلیم دلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں

- مسلم زیر انتظام اداروں میں تعلیم کا معیار اونچا ہو
  مگر
  تقرری کے وقت علمی لیاقت کو پس پشت ڈال دیتے ہیں

- اوقاف کی جائدادیں دوسروں کی دست برد سے محفوظ رہیں
  مگر
  ان پر خود ناجائز قبضہ جما لینے میں ہمیں کوئی شرم نہیں آتی

- مسلم پرسنل لاء میں گورنمنٹ مداخلت نہ کرے
  مگر
  خود عورتوں کے جائز حقوق ادا نہ کرنے کے بہانے تلاش کرتے ہیں

- مسلم معاشرے کا تشخص برقرار رہے
  مگر
  جہیز جیسی سماجی لعنت کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں

- اعلیٰ سرکاری عہدوں پر مسلمانوں کی نمائندگی بڑھے
  مگر
  مقابلہ جاتی امتحانات میں مسلم نوجوانوں کی تعداد بڑھانے کی کوشش نہیں کرتے

- ملک میں مسلمان ترقی کریں اور آسودہ و خوش حال ہوں
  مگر
  محنت، ریاضت اور لگن کی راہ اختیار کرنے کی بات نہیں کرتے

- باہمی اخوت، رواداری اور بھائی چارگی کا چرچا ہو
  مگر
  اختلاف فکر و رائے کو برداشت نہیں کرتے

ہم شاید یہ بھول گئے ہیں کہ جب تک خواہش اور عمل میں ہم آہنگی نہ ہو، صرف خواہش کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

اسرار احمد

باہمی اتحاد اور تعلیم

سر سید احمد خان

جناب پریسیڈنٹ صاحب و دیگر بزرگان وطالب علمان

اس وقت میں آپ صاحبوں کی خدمت میں اس لائق نہیں ہوں کہ اس حال میں جو ایک تعلیم گاہ ہے جس میں لائق ہیڈ ماسٹر اور ٹیچر موجود ہیں۔ اور بھی بہت سے لائق لوگ تشریف رکھتے ہیں۔ تعلیم و تربیت کے باب میں کچھ کہنے کی جرأت کروں۔ مگر میں اپنے خیال نسبت تعلیم و اتحاد کے جو کچھ کہ ہیں، اس لئے بیان کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ جو کچھ اس میں غلطیاں ہوں گی، اُن کی اصلاح ہوگی۔

اے صاحبو! ہمارے ملک ہندوستان میں جو کہ غالبًا صدیوں سے ان دو قوموں سے جو ہندو اور مسلمان کے لفظ میں تقسیم کی گئی ہیں آباد ہیں۔ اُن کے بزرگوں کی عظمت اور فضیلت اور ناموری ایسی نہ تھی جو بھلا دی جائے۔ ہندوؤں کے بزرگ جس قدر کہ انھوں نے تمام علوم ریاضیات ہندسہ، حساب، لاجک، فلاسفی، مارل سائنس میں ترقی کی، آج تک ان کی یادگار نشانیاں ہیں جس سے ان کی اولاد کو فخر ہے۔ مسلمان بعد کو اس ملک میں آکر آباد ہوئے وہ بھی اپنے بزرگوں کی عمدہ تحریرات، عمدہ تالیفات اور تصنیفات پر فخر کرتے ہیں، انھوں نے علم کی ہر شاخ میں ترقی دی۔ گو یہ علم یونانیوں سے حاصل ہوئے مگر انھوں نے اس کو ایسے درجے تک ترقی پر پہنچایا کہ یونان اور انگلستان دونوں کو اُن کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا۔ یہ باتیں یقینًا بہت سے لڑکے اور جوان یاد کرکے فخر کرتے ہوں گے۔ مگر اے دوستو! بزرگوں کی یاد کرکے فخر کرنا اور خود کچھ نہ ہونا حمیت کے خلاف ہے بلکہ اپنی جہالت اور کم علمی سے ان بزرگوں کے نام کو بھی بٹہ لگانا ہے۔ نہایت افسوس ہے ان دونوں قوموں پر جن کے بزرگ ایسے گزرے اور جہالت میں پڑ کر بزرگوں کو بھی بدنام کریں

اس زمانے میں علم کا بہت چرچا ہو رہا ہے لیکن ہم کو تعلیم کے معاملے میں اوّل غور کرنا چاہیے کہ کیا چیز ہے جس کو ہم سیکھیں اور کیا چیز ہے جس کا سیکھنا ہم کو مفید نہ ہوگا۔ میں اس بزرگ زبان کو جو سنسکرت ہے جس کو ہمارے ملک کے باشندوں کا ایک حصّہ عزیز رکھتا ہے اور واقعی وہ اپنا ثانی بھی نہیں رکھتی ہے یا اس مقدس زبان کو جو عربی کہلاتی ہے جس کو میں دل سے مقدس سمجھتا ہوں اور جو اس قابل بھی ہے کہ تمام علوم اور سائنس اُس میں لائے جاسکتے ہیں، دل سے پسند کرتا ہوں مگر باوجود ان سب خوبیوں کے جو اُن زبانوں میں ہیں سوال یہ ہے کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے۔ اگر ہم بغیر خیال ضرورت کے تعصب یا نیچرل خواہش سے اپنی ان دونوں زبانوں کو تعلیم کا ذریعہ قرار دیں تو یقین کرنا چاہیے کہ جس چیز کے حاصل کرنے کی ہم کو ضرورت ہے اس کو چھوڑ بیٹھیں گے۔

میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان مقدس اور پُرانی زبانوں کو بالکل چھوڑ بیٹھیں۔ سمجھنے کی یہ بات ہے کہ بالفعل ہم کو ضرورت کس چیز کی ہے اور کون زبان ہم کو علوم کے اعلیٰ مطالب کی طرف پہنچا سکتی ہے۔ اس کے جواب میں یہ کہوں گا کہ انگلش لینگوج۔ ایک زمانہ تھا کہ ہمارے ہاں کی کتابیں علوم وفنون سے بھری ہوئی تھیں مگر اب دیکھنا چاہیے کہ علوم وفنون نے کہاں تک ترقی کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جن علوم کے بیج ہمارے بزرگوں نے بوئے تھے وہ اب برومند اور تناور درخت ہو گئے ہیں اور ان میں ایسے پھل پھول لگے ہیں اور ایسی خوشنما شاخیں نکلی ہیں اور ایسے لذیذ میوے لگے ہیں کہ وہ ایک نئے درخت معلوم ہوتے ہیں۔ علوم جدیدہ جو

بالکل نئے ہوں اور جن کا وجود مطلقاً ہمارے بزرگوں کے زمانے میں نہ پایا جاتا ہو۔ واقعی تھوڑے ہیں اور زیادہ وہی ہیں جو اگلے بزرگوں کے پاس تھے مگر حقیقت میں اُس وقت وہ بیج تھے اور اب وہ پھل دار درخت ہوگئے ہیں پس اب ہمارا اُن بیجوں پر فخر کرنا اور اُن بارآور درختوں کے سائے سے فائدہ نہ اُٹھانا اور ان لذید میووں کے ذائقہ سے محروم رہنا ہم کو نہ کچھ فائدہ دینے والا ہے نہ کچھ عزت بخشنے والا۔ اگر ہم ہی علوم میں ترقی کرتے جائیں تو اُن بیجوں کا جو ہمارے باپ دادا نے بوئے تھے ہم کو فائدہ حاصل ہوگا نہیں تو ہم پرانے کہنہ لگے ہوئے بیجوں کو جن میں بسبب کہنگی کے نمو کی طاقت بھی نہیں رہی ہے، ہاتھ میں لئے بیٹھے رہیں گے۔ ہم کو اب ہری ہری شاخیں اور میوہ دار ٹہنیاں لینی چاہییں جو میووں کے گچھے اس میں لٹک رہے ہیں ان سے تمتع حاصل کرنا چاہیے۔

پس اب یہ بات قابل دیکھنے کے ہے کہ وہ علوم کن کن زبانوں میں ہیں؟ اور اُن میں سے ہم کو کس زبان کو اختیار کرنا چاہیے؟ تمام یورپ میں فرنچ زبان سب سے اعلیٰ اور سب سے زیادہ شیریں اور سب سے زیادہ پولیٹ ہے۔ علوم جدیدہ بھی فرنچ زبان میں بہت ہیں اور قریب زمانہ آنے والا ہے کہ جرمن زبان بھی اس سے زیادہ علوم کے لیے مخزن ہو جائے گی۔ مگر وہ دونوں زبانیں ہمارے اختیار سے باہر ہیں۔ یہ علوم انگلش لینگونج میں بھی ہیں اور ہم جو کچھ ترقی کر سکتے ہیں اسی زبان میں کر سکتے ہیں۔ ہم انگلش گورنمنٹ کے زیر سایہ بستے ہیں جس میں ہم کو ہر طرح کا امن و امان حاصل ہے۔ ہم کو اپنی گورنمنٹ کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے ہم کو امن و امان کے سوا تعلیم میں بھی ایسی مدد دی ہے کہ کوئی سلطنت کوئی بادشاہت ایسی ہم کو نظر نہیں آتی جس نے اپنی رعایا کی تعلیم میں ایسی مدد کی ہو اور عمدہ سامان تعلیم کا مہیا کر دیا ہو۔ گرداسپور کوئی بڑا مقام نہیں ہے مگر دیکھیے کہ گورنمنٹ کی طرف سے تعلیم گاہ موجود ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم شکر گزاری کے ساتھ تعلیم کا فائدہ نہ اُٹھائیں۔

مگر اے دوستو! میری رائے اور میرا خیال یہ ہے کہ کوئی گورنمنٹ ہر ایک قوم کی تعلیم کا ذمہ اپنے اوپر نہیں لے سکتی ہے۔ بلکہ میں مضبوطی سے اس رائے پر قائم ہوں کہ ممکن نہیں کہ گورنمنٹ اپنی تمام رعایا کی تعلیم کر سکے اس سے بھی سخت میری رائے یہ ہے کہ کوئی قوم جس کو اپنے بچوں اور قوم کی تعلیم کی خواہش ہو۔ جب تک وہ تعلیم کو اپنے ہاتھ میں نہ لے اس کی خواہش کا پورا ہونا غیر ممکن ہے۔ جو کچھ مجھے افسوس ہے یہی ہے کہ ہماری قوم کو ہر جگہ یہی خواہش ہے کہ گورنمنٹ اسکول قائم ہو۔ مگر یہ خواہش کسی طرح پوری نہیں ہو سکے گی۔ کیونکہ گورنمنٹ کی آمدنی بہ لحاظ اس کے اور مصارف کے کسی قوم کی تعلیم کے واسطے کافی نہیں ہو سکتی۔ ہندوستانیوں کو ترقی اس وقت ہوگی جب وہ اپنے باہمی چندہ۔ اپنے انتظام اپنی قوت سے بلا مداخلت گورنمنٹ اور اس کے افسروں کے اپنی خود سری اور اپنی مرضی کے موافق اپنے بچوں کی تعلیم کریں۔

اے دوستو! تم اس بات کا خیال کرو کہ گورنمنٹ جو ایسی وسیع مملکت ہندوستان میں حکومت کرتی ہے جس میں مختلف قومیں مختلف اغراض کے لوگ بستے ہیں۔ وہ کسی ایک قوم کی طرف داری یا بہتری کی کوشش نہیں کر سکتی۔ اس کو لازم ہے کہ اس کے قواعد تعلیم ایسے ہوں جو یکساں سب سے متعلق ہو سکتے ہوں۔ اور جیسا کہ میں نے بیان کیا کہ قوم کی ضرورتیں مختلف ہیں پس گورنمنٹ اپنی دور اندیشی کے قاعدے سے کسی خاص فرقے کی خاص ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتی اور ہرگز نہیں کر سکتی۔ ایک بات خیال کرنے کی ہے کہ انگریزی گورنمنٹ کی کچھ ہی تعریف کی جاتی ہو، کچھ ہی عمدگی اُس میں ہو مگر سب سے زیادہ عمدگی جو اس میں ہے وہ یہ ہے کہ وہ تعلیم مذہبی سے بالکل علیحدہ ہے۔ اگر گورنمنٹ کسی مذہبی تعلیم میں دخل دے گو وہ نیک نیتی اور نیک دلی ہی سے کیوں نہ ہو ہم کو شبہ میں ڈالے گا اور بہت برا خیال ہمارے دل میں پیدا ہوگا۔ اس سبب سے بچوں کی تعلیم مذہبی گورنمنٹ کی مصلحت اُس کی پالیسی اور اس کے نظام حکومت کے بالکل خلاف ہے۔ اگر گورنمنٹ کے اسکول ہماری دنیوی تعلیم کے واسطے کافی ہوں تب بھی ایک ضروری جزو مذہبی تعلیم کا رہ جاتا ہے پس ہمارے ہم وطن اور ہم قوم لوگوں کو گورنمنٹ پر بوجھ تعلیم کا نہ ڈالنا چاہیے اور تعلیم کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہیے۔ گورنمنٹ کا یہ فرض ہے کہ وہ ہم کو مدد دے۔ اس سے زیادہ گورنمنٹ سے مانگنا بے فرقی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے گورنمنٹ ہر اسکول میں مدد دینے کو تیار ہے۔ ہم کیوں کہیں کہ فلاں قسم کی تعلیم ہم کو چاہیے اور فلاں قسم کے مدرسے یا کالج ہماری تعلیم کے لئے ضروری ہیں۔ کیوں نہیں تعلیم کو

ہم لوگ اپنے ہاتھ میں لیں اور جس طرح کی تعلیم کی ضرورت سمجھیں اُس طرح کی تعلیم دیں۔ کیمبرج یونیورسٹی میں ابھی ایک لیڈی نے ایک نیا کالج قائم کیا ہے اُس فیاض لیڈی نے اس کالج کے لیے اپنے پاس سے اٹھارہ لاکھ روپے دئے ہیں جو یہاں کے حساب سے بیس لاکھ ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں ہمارے ملک کے ہر ضلع و ہر قصبے کے لوگ مدرسہ قائم کر سکتے ہیں۔ یہاں کی مردم شماری کچھ بھی ہو مگر دو روپیہ اوسط فی کس دینے سے یہاں کے لوگ لاہور کالج سے زیادہ عمدہ ایک کالج گورداسپور میں قائم کر سکتے ہیں لیکن ہمت اور ارادے کی کمی ہے۔

تعلیم کے متعلق میں اس وقت یہ بحث کرنا نہیں چاہتا کہ کون کون علوم اور فنون عمدہ ہیں اور کون کون تعلیم میں شامل ہونے چاہییے۔ یہ بہت بڑا وسیع میدان ہے اور بہت لوگوں نے اس پر رائے دی ہے۔ اس وقت میں اس تعلیم کا ذکر کروں گا جس کو میں ادنیٰ درجے کی تعلیم کہتا ہوں اور جس کی عموماً ملک کے لوگوں کو ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے کہ انگریزی زبان عمدہ طور پر جاننا، عمدہ گفتگو کرنا، انگریزی اخباروں کا بخوبی پڑھنا، قانون انگریزی کو خوب سمجھنا، اپنے خیالات کو انگریزی تحریر میں اچھی طرح ظاہر کر سکنا۔ اسی تعلیم کی اشد ضرورت ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تعلیم سے تربیت جدا نہیں ہو سکتی ہے۔ اگر ہمارے ملک کے لڑکے اس قدر تعلیم پا جاویں اور ایسی تحریر کر سکیں جس سے وہ لارڈ میکالے کا خطاب پا سکیں اور تربیت اُن میں نہ ہو تو وہ کسی کام کی نہیں۔ لارڈ میکالے میرے خیال میں وہ شخص ہے جس نے ہندوستان میں بھلائی کے درخت کا یا یوں کہو کہ علم کے درخت کا بیج لو یا کوئی گورنر جنرل اور کوئی وائسرائے ہندوستان میں ایسا نہیں گزرا جس نے لارڈ میکالے سے زیادہ ہندوستان کو بھلائی پہنچائی ہو۔ گو یقیناً اس نے جو کچھ کیا اپنی گورنمنٹ کی خیر خواہی اور بھلائی کے لئے کیا۔ مگر اسی کے ساتھ اصلی خیر خواہی اور بھلائی کی اصلی جان اس نے ہمارے ملک میں بھی ڈال دی۔

اے دوستو! تربیت اور تعلیم دو چیزیں ہیں۔ صرف تعلیم سے آدمی انسان نہیں بنتا بلکہ تربیت سے بنتا ہے۔ بولنے میں یوں آتا ہے کہ تعلیم اور تربیت۔ مگر تربیت میری سمجھ میں تعلیم پر مقدم ہے۔ ہماری قوم کے لوگوں کو اس پر خیال کرنا چاہیے کہ اگر لڑکوں کی تعلیم کا گورنمنٹ کے اسکولوں پر بھروسہ کرتے ہیں تو کیا وہ سمجھتے ہیں کہ وہ تربیت بھی پا سکتے ہ[یں] ہرگز نہیں۔ تعلیم کا اصلی مقصد مارل کی درستی ہے۔ بہت سے تعلیم یافتہ ہی[ں] جن کا طرز اخلاق ایسا خراب ہے جس کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے اور کہا جاتا [ہے] کہ کاش وہ بے تعلیم ہی رہتے تو اچھا ہوتا۔ میں تمام ہندوستان میں جہاں ت[ک] خیال کر سکتا ہوں اور جن بڑے بڑے شہروں میں پھرا ہوں اور وہاں کے حا[لات] سے واقف ہوا ہوں نہایت زور سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی کو اولاد کی ترب[یت] کا خیال نہیں ہے۔

اے عزیزو! سمجھو کہ اگر لڑکے کسی گورنمنٹ اسکول میں پانچ گھنٹے [تعلیم] پا کر آتے ہیں تو اُن کا باقی حصہ زندگی کا جو بالکل سادہ اور مثل ایک پودے کی نرم شاخ کے ہوتا ہے کہ جس طرح پر چاہو ٹیڑھی یا سیدھی کر سکو کس طرح بسر ہوتا ہے۔ گھر کے نوکروں کی صحبت گلیوں میں بازاری لونڈو[ں] کے ساتھ کھیلنا، ان کی صحبت میں بد اخلاقی کی باتیں سیکھنا اور فحش او[ر] بد اخلاقی کے الفاظ جو وہ لونڈے بولتے ہیں اور بکتے ہیں ان کو سننا [اس] قسم کے غارت کن رزائل میں ان کی زندگی کا باک حصہ بسر ہوتا ہے اور [بجائے] اس کے کہ وہ فرشتہ سیرت ہوتے، شیطان سے بدتر ان کے اخلاق ہو[تے] ہیں۔ جب کہ لڑکوں کا چہارم حصہ ماسٹر کے پاس اور اس سے زیادہ [حصہ] خراب حالت میں گزرتا ہے تو کیا اُس سے ان کی تربیت اخلاق کی تو[قع] ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ہماری قوم اور ہمارے بچے تربیت یافتہ اور مہذب ہوں دوسری قوموں میں عزت پاویں تو اُن [کا] پہلا فرض یہ ہے کہ تربیت کی فکر کریں۔ میں یہ نہیں کہتا وہ سب کچھ میر[ے] ہی خیال کے موافق کریں۔ تم مجھ کو جانے دو۔ میرے خیال کی پیروی نہ کر[و] تم خود سوچ کر کوئی تدبیر نکالو۔ دیکھو یہ یورپین بچہ (ایک کم عمر لڑکا جو اُ[س] وقت موجود تھا، اُس کی طرف اشارہ کیا) جو اس وقت موجود ہے کیا ت[م] ایسا بچہ اپنی قوم میں نکال سکتے ہو؟ گو یہ بچہ اب تک سوسائٹی میں نہ[یں] ملا، مگر یہ اپنی ماں کی تربیت سے کیسا نیک عادتوں کا نمونہ ہوا ہے۔ ا[گلے] زمانے میں ہماری اولاد بھی اپنے باپ اور اس کے دوستوں کی صحبت [سے] فائدہ اُٹھاتی تھی۔ اُن کے اخلاق حسنہ سیکھتی تھی۔ واقعی وہ بہت ا[چھا] طریقہ تھا مگر وہ تیلیاں جس ڈورے سے بندھی تھیں ٹوٹ گیا۔ اب ن[یا] ڈورا اُن کے باندھنے کو ہونا چاہیے۔ اب جو نسلیں موجود ہیں آپ مجھ

معاف کیجیے گا۔ وہ اس لائق نہیں کہ بچے ان سے تربیت پا سکیں۔ پس مناسب ہے کہ اولاد کی تربیت کی فکر اور تدبیر کی جائے۔ گورنمنٹ پر بوجھ نہ ڈالیے۔ اُس سے صرف مدد دیجیے، جو اس کا فرض ہے اور جس کے ادا کرنے پر وہ آمادہ ہے۔

اس وقت ہندوستان میں خدا کے فضل سے دو قومیں آباد ہیں اور اس طرح سے ہیں کہ ایک کا گھر دوسرے سے ملا ہے۔ ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے۔ ایک آب وہوا کے شریک ہیں۔ ایک دریا یا کنوئیں کا پانی پیتے ہیں۔ مرنے جینے میں ایک دوسرے کے رنج وراحت کا شریک ہوتا ہے۔ ایک دوسرے سے بغیر ملے کوئی نہیں۔ پس کسی چیز کو جو معاشرت سے ملاقہ رکھتی ہے اُن دونوں کو علیحدہ علیحدہ رکھنا دونوں کو برباد کر دیتی ہے۔ ہم کو ایک دل ہو کر مجموعی حالت میں کوشش کرنی چاہیے۔ اگر ایسا ہوگا تو سنبھل جائیں گے نہیں تو ایک دوسرے کے اثر سے دونوں قومیں تباہ اور بگڑ جائیں گی

پرانی تاریخوں میں پرانی کتابوں میں دیکھا اور سنا ہوگا اور اب بھی دیکھتے ہیں کہ قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے افغانستان کے مختلف لوگ ایک قوم کہے جاتے ہیں۔ ایران کے مختلف لوگ ایرانی کہلاتے ہیں۔ یورپین مختلف خیالات اور مختلف مذاہب کے ہیں مگر سب ایک قوم میں شمار ہوتے ہیں۔ گو اُن میں دوسرے ملک کے بھی لوگ آکر بس جاتے ہیں مگر وہ آپس میں مل جل کر ایک ہی قوم کہلائے جاتے ہیں۔ غرض کہ قدیم سے قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے گو ان میں بعض بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں۔

اے ہندو اور مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اسی زمین پر تم دونوں نہیں بستے۔ کیا اسی زمین پر تم دفن نہیں ہوتے ہو یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے؟ اسی پر مرتے ہو اور اسی پر جیتے ہو۔ تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے۔ ورنہ ہندو مسلمان اور عیسائی بھی جو اسی ملک میں رہتے ہیں، اس اعتبار سے سب ایک قوم ہیں۔ جب یہ سب گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں تو ان سب کو ملکی فائدے میں جو ان سب کا ملک کہلاتا ہے ایک ہونا چاہیے۔ اتفاق کی خوبیاں مجھ کو زیادہ بیان کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ جو شخص اتفاق نہیں رکھتا وہ بھی سمجھتا ہے کہ وہ برا کرتا ہے۔ جو لوگ باہم برخلاف ایک دوسرے کے دشمن ہیں وہ بھی جب دل میں سوچتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک بُری بات ہے جو چیز نہایت عمدہ اور خوب ہے وہ اتفاق ہی ہے۔ اتفاق کرکے جو کچھ کیا جائے گا وہی عمدہ ہوگا۔ پس اس امر پر خیال کرکے باہم اتفاق کرنا چاہیے اور اس اتفاق کے ذریعے سے قومی تعلیم اور تربیت حاصل کرنا چاہیے۔ میں کچھ اور زیادہ بیان کرتا مگر آپ مجھے معاف رکھیں کہ میں آج ہی ابھی آیا ہوں اور سفر کی تکان سے خستہ ہو رہا ہوں۔

"بدگمانی کے عوض اگر نیک گمان کریں اور نیک کام میں مدد دیں اور غلطیوں کی اصلاح پر کوشش فرمائیں تو صرف مخالفت کرنے سے ہزار درجہ ہمارے اور ہماری قوم کے لیے بہتر ہوگا۔"

سر سید احمد خانؒ

خطبۂ صدارت

سیّد ہاشم علی

[یہ خطبہ مرکز فروغ سائنس کے زیر اہتمام منعقد کیے گئے مسلم زیر انتظام اسکولوں کے اساتذہ کے ریفریشر کورسوں کی اختتامی نشست میں دیا گیا]

جناب ڈین صاحب، جناب پروفیسر اسرار احمد صاحب، میرے دیگر محترم رفقائے کار، مہمان اساتذہ، خواتین و حضرات۔

مجھے آپ لوگوں سے دوسری دفعہ مل کر بڑی خوشی ہو رہی ہے۔

ان ریفریشر کورسوں کے بارے میں جو رپورٹیں ابھی پیش کی گئیں اور جو تفصیلات میرے سامنے آئیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس ٹریننگ پروگرام کا کافی اچھا اثر ہوا ہے۔ میں اس کے لیے مرکز فروغ سائنس کے کارکنان کو مبارکباد پیش کرتا ہوں جنھوں نے اپنے فرائض منصبی سے آگے بڑھ کر یہ ذمّہ داری قبول کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس تربیتی پروگرام سے آپ حضرات کی معلومات میں اضافہ ہوا ہوگا اور آپ کی کارکردگی اور تندہی پر ایک مثبت اثر پڑے گا۔ یہاں سے واپسی کے بعد آپ اپنے اسکولوں کی خدمت بہتر طور پر انجام دے سکیں گے اور اپنے طلبا کو زیادہ بہتر طور پر پڑھا سکیں گے۔

آپ مسلم زیر انتظام اسکولوں کے اساتذہ ہیں۔ کانسٹی ٹیوشن کے لحاظ سے ہندوستان کے سب شہری برابر کے حقوق رکھتے ہیں لیکن چند تاریخی و سیاسی اسباب کی بنا پر کچھ لوگوں کو ناموافق حالات کا سامنا کرنا پڑا جس سے وہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے۔ چنانچہ اگر آپ نے ساتویں پلان کے ڈاکومنٹس (DOCUMENTS) کو پڑھا ہوگا اور نئی ایجوکیشن پالیسی کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش کی ہوگی تو یہ معلوم ہوا ہوگا کہ اب خود ہماری حکومت کو اس بات کا اعتراف ہے کہ مسلمان اور نیو بدھسٹ تعلیمی اعتبار سے ہندوستان کے سب سے پسماندہ لوگ ہیں اور جب حکومت کے کسی اعلان یا پالیسی پیپر میں اس بات کا ذکر ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ حکومت کے پاس ایسے اعداد و شمار ہیں جن کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے۔ اس لیے ہمیں یہ مان کر چلنا ہوگا کہ آج مسلمان اور نیو بدھسٹ تعلیم کے میدان میں سب سے پچھڑے گروہ ہیں۔

میں اس جھگڑے میں نہیں پڑوں گا کہ اس تعلیمی پسماندگی کی وجہ کیا ہے؟ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اس میں حکومت اور اقلیتوں

دونوں کا برابر کا ہاتھ ہے۔ میں حکومت کی کئی ایسی پالیسیوں کی نشاندہی کر سکتا ہوں جن کی وجہ سے لسانی اقلیتوں کو پریشانی اٹھانی پڑتی ہے اور جو ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ کا سبب بنی ہیں۔ مثلاً تعلیم کا یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ بچے کی ابتدائی تعلیم اس کی مادری زبان میں دی جائے مگر ہماری حکومت کو زبان کی بابت کوئی فیصلہ کرنے میں کئی برس لگ گئے اور جب اس نے اس بابت سہ لسانی فارمولے کی شکل میں ایک فیصلہ کیا بھی تو وہ ریاستی، قومی اور بین الاقوامی زبانوں پر مبنی تھا۔ اس کے باوجود یہی سہ لسانی فارمولا ہندی ریاستوں میں لسانی اقلیتوں کے لیے بڑا کارآمد ہو سکتا تھا۔ مثال کے طور پر یو۔پی اور بہار میں ایک کافی بڑی اقلیت کی مادری زبان اردو ہے۔ ان ریاستوں میں چوں کہ قومی زبان یعنی ہندی ہی ریاستی زبان بھی ہے اس لیے سہ لسانی فارمولے کے ایک ایماندارانہ عمل درآمد کے طور پر یہاں کی اردو اقلیت کے بچوں کو بہ آسانی یہ سہولت فراہم کی جا سکتی تھی کہ وہ اردو بہ حیثیت مادری زبان، ہندی بہ حیثیت ریاستی اور قومی زبان اور انگریزی بہ حیثیت بین الاقوامی زبان کے پڑھیں۔ اس طرح ان ریاستوں کی اردو اقلیت میں وہ بے اطمینانی اور ناراضگی نہ پائی جاتی جو آج ہے۔ ہر دور اندیش حکمراں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ملکی آبادی کا کوئی قابل لحاظ حصہ ان سے بلا وجہ ناراض نہ رہے۔ لیکن یہاں دور اندیشی اور فراست کو بالائے طاق رکھ کر بلا وجہ ہی ایک بڑی تعداد کو ناراض کر دیا گیا ہے۔ حکومت کی یہ لسانی پالیسی کی ایک بڑی وجہ ہے جو مسلمان بچے ابتدائی تعلیم میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ کیوں کہ اردو میں جو کہ بالعموم ان کی مادری زبان ہے، ابتدائی تعلیم کا حکومت کی طرف سے کوئی خاطر خواہ نظم نہیں ہے۔ مسلمان بچے یا تو مکتب کی طرف رُخ کرتے ہیں یا تعلیم سے محروم رہتے ہیں۔ اس طرح ہماری تعلیمی پسماندگی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ حکومت کی پالیسیوں میں وہ فراخ دلی نہیں ہے جو کہ ایک دور اندیش حکومت میں ہونی چاہیے۔

اسی نوع کی ایک بات اور ہے۔ کچھ دنوں پہلے این۔سی۔ سکسینہ نے مسلمانوں کی پسماندگی کے اسباب پر تحقیق کی تھی۔ اس سلسلے میں انہوں نے یہ بتایا کہ جن جن جگہوں پر مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے وہاں پر بالعموم پولیس اسٹیشن قائم کیے گئے ہیں اور ان جگہوں پر جہاں پر مسلمانوں کی آبادی کم ہے یا دوسرے فرقے کے لوگ زیادہ ہیں وہاں پر اسکول۔ اس قسم کی اقلیتوں کی ترقی میں مانع غلط پالیسیوں کی ایک بڑی وجہ تعصب ہے۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ جس تعصب سے ملک کا اتنا بڑا نقصان ہو سکتا ہے کہ آبادی کا ایک قابل قدر حصہ پسماندہ رہ جائے، اس سے آپ دور رہیں۔ آپ اسکولوں کے اساتذہ ہیں۔ آپ نہ صرف خود کو تعصب سے پاک رکھیں بلکہ یہ کوشش کریں کہ تعصب کے جراثیم آپ کے طلباء میں نہ پھیلنے پائیں۔ آپ کا شاگرد چاہے وہ ہندو ہو، مسلمان ہو، سکھ ہو یا کوئی اور اسے آپ کی طرف سے انصاف ملے۔ اگر وہ کلاس کا سب سے ہونہار بچہ ہے تو خواہ آپ کا کوئی مذہب ہو، اس بچے کو پورے نمبر ملیں۔ تاکہ اس میں یہ احساس نہ پیدا ہو کہ فلاں مذہب کے استاد نے میرے ساتھ یہ ناانصافی کی۔ اور جب اس قسم کی ناانصافیوں کا احساس بچپن سے دلوں میں نہ رہے گا تو مستقبل کا ہندستان کچھ اور ہی ہو گا۔ ایک استاد کا مذہب یہ ہے کہ سارے شاگرد بلا تفریق مذہب و ملت اس کی نگاہ میں برابر ہیں اور اس کی یکساں توجہ کے مستحق ہیں۔

دوسری بات جو میں عرض کرنا چاہوں گا، یہ ہے کہ اکثر اقلیتی اداروں میں باوجودیکہ ان کا انتظام اقلیتوں کے ہاتھ میں ہے اقلیتی فرقے سے زیادہ دوسرے مذاہب کے طلباء پڑھتے ہیں۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ اول اقلیتی فرقے کی معاشی بدحالی ہے۔ دوم غریب والدین (جو بالعموم اہلِ حرفہ ہوتے ہیں) کی یہ خواہش کہ ان کے بچے جلد از جلد چند پیسے کمانے لگیں، تاکہ گھر کی آمدنی بڑھے۔ سوم

والدین کا یہ احساس کہ جب نوکری نہیں ملتی تو پڑھانے سے کیا فائدہ ؟ لہٰذا یہ دیکھا گیا ہے کہ اقلیتی فرقے کے بچے داخلے کے بعد جلد ہی اسکول چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ اس لیے آپ لوگوں کو نہ صرف طلبا کو تعلیم کی طرف راغب کرنا ہے بلکہ والدین کو بھی تعلیم کے دوررس فوائد سے آگاہ کرنا ہے۔ تاکہ تعلیم کو ادھورا چھوڑنے کے رجحان میں کمی آئے۔

یہاں یہ بتلا دینا مناسب ہوگا کہ تعلیمی اداروں میں مختلف مذہبی فرقوں کے طلبا کا ہونا فائدہ مند ہے۔ اگر کسی ادارے میں صرف ہندو ہی طلبا ہوں یا صرف مسلمان ہی طلبا ہوں تو اس سے خود پسندی کی خرابی پیدا ہوگی۔ بچوں میں یہ ذہنیت پیدا ہوگی کہ صرف ہم ہی ہیں کوئی اور نہیں۔ اس لیے ہندوستان جیسے ملک کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر قسم کے عصری تعلیمی اداروں میں کچھ نہ کچھ تعداد میں ہر مذہب کے بچے ہوں۔ اس سے ایک دوسرے کو سمجھنے کا اور پرکھنے کا موقع ملے گا۔ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر آگے بڑھنے کا رجحان بڑھے گا۔ کلاس روم میں وہی حالات پیدا ہوں گے جو کہ ملک میں ہیں اور جن حالات میں آگے چل کر بچّے کو رہنا ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے اقلیتی اداروں میں دوسرے مذاہب کے بچّوں کا ایک خاص تعداد میں ہونا فائدہ مند ہے۔

میری تیسری گزارش یہ ہے کہ آپ ایک تعلیمی طور پر پسماندہ اقلیت کے تعلیمی اداروں میں پڑھا رہے ہیں۔ اس لیے آپ کے پاس آنے والوں میں اکثریت اُن طلبا کی ہوگی جن کی پہلی نسل اسکول میں آئی ہے یا جن کی پہلی نسل انگریزی اور جدید سائنس کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ ایسے طلبا بالعموم اردو یا ہندی میڈیم کے ہوتے ہیں اور آگے چل کر میڈیم بدلنے کے باعث کلاس میں کمزور پڑ جاتے ہیں۔ ایسے طلبا آپ کی خصوصی توجہ کے مستحق ہیں تاکہ وہ اُن طلبا کے ساتھ آگے بڑھ سکیں جو شروع ہی سے انگریزی میڈیم لے کر چلے ہیں۔ جب تک انہیں آپ کی خصوصی توجہ حاصل نہ ہوگی وہ کلاس میں اُبھر نہ سکیں گے۔ وہ تعلیم سے بددل ہو کر غلط راہوں پر پڑ جائیں گے۔

چوتھی بات کے طور پر میں آپ کو یہ یاد دلانا چاہوں گا کہ آپ اساتذہ کی بڑی ذمہ داریاں ہیں۔ آپ کو پوری قوم کو اُبھارنا ہے۔ یہ صرف اپنے فرائضِ منصبی کی تکمیل کی حد تک ہی کام کرنے سے ممکن نہ ہوگا۔ آپ اپنے فرائضِ منصبی سے آگے بڑھیں اور کمزور شاگردوں پر زیادہ توجہ کریں۔ آپ یہ کوشش کریں کہ کلاس کا ہر طالب علم آپ کے درس کو سمجھے۔ ہندوستان میں بہت سے اساتذہ ایسے ہیں جو اپنے فرائضِ منصبی سے آگے بڑھ کر کام کرتے ہیں۔ آپ اُن کے نقشِ قدم پر چلیں۔ یہاں آپ کو ٹیچنگ اور لرننگ پروسس (Teaching and learning process) کی بابت بتایا گیا ہوگا۔ اکثر اساتذہ اس کے صحیح مفہوم کو نہیں سمجھ پاتے۔ وہ محض حفظ کر لینے کو ہی تعلیم سمجھتے ہیں۔ انھیں شاید یہ علم نہیں ہے کہ حفظ کی عادت سے عقل و فہم کی ترقی پر مضر اثرات پڑتے ہیں۔ اس سے طلبا میں استدلالی صلاحیتوں اور خود اعتمادی کا فروغ رک جاتا ہے۔ جس سے انہیں آگے چل کر آزادانہ فیصلے کرنے میں دقت ہوتی ہے۔ اس لیے آپ کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ طلبا چیزوں کو سمجھ کر پڑھیں۔ وہ نصابی کتابوں اور کلاس روم تک ہی سمٹ کر نہ رہ جائیں۔ وہ لائبریری جائیں، اخبار و سنجیدہ رسائل پڑھیں، اساتذہ کی مدد سے اپنی مشکلات دور کریں اور اپنی سطح کی عام معلوماتی کتابوں کو بھی اپنے مطالعے میں رکھیں۔ یہی طریقہ ہے جس سے آپ کے شاگرد دوسروں کے مقابلے میں کھڑے ہو سکتے ہیں۔ ایک بار پھر مجھے یہ عرض کرنے دیجیے کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے آپ کو beyond the call of duty کام کرنا ہوگا۔ میں خود زندگی بھر beyond the call of duty کام کرتا رہا ہوں۔ اپنے تجربے کی بنیاد پر آپ کو یہ یقین دلانا چاہوں گا کہ کام

کرنے کی ایک خاص لذت ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی دوسری لذت نہیں کر سکتی۔ جب آپ جی جان سے اپنا کام کریں گے اور یہ کوشش کریں گے کہ آپ کے شاگرد پڑھ لکھ کر قابل بن جائیں تو شام کی تھکن میں بھی ایک خاص قسم کی فرحت محسوس کریں گے۔ جب آپ کا کوئی شاگرد آپ کی محنت اور کوششوں کی بدولت کوئی اعلیٰ مقام حاصل کرے گا، کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہوگا یا ناموری کا کوئی کام کرے گا، اس وقت آپ جو لذت اور خوشی محسوس کریں گے، اس کا بیان کرنا بھی محال ہے۔ باوجودیکہ اس سے آپ کی ذات کو کوئی مادّی فائدہ نہ حاصل ہوگا۔ میں نے خود یہ دیکھا ہے کہ ایک استاد اپنے شاگرد کے کسی اعلیٰ مقام پر پہنچنے پر کتنی خوشی اور فخر محسوس کرتا ہے۔ ایک ایسا فخر جس کا مقابلہ کوئی دوسرا فخر نہیں کر سکتا۔

اپنی آخری بات کے طور پر میں یہ کہوں گا کہ یہ یونیورسٹی جس میں آپ نے کچھ دن گزارے ہیں، صرف ہندوستان ہی کے لیے نہیں بلکہ سارے عالم اسلام کے لیے اس کے بانی سر سیّد احمد خاں کا ایک نادر تحفہ ہے۔ یہ ادارہ سر سیّد کی اولو العزمی، روشن خیالی اور دور اندیشی کا مظہر ہے۔ آج سے تقریباً سو سال پہلے جب سر سیّد اس ادارے کی بنیاد رکھ رہے تھے اور علی گڑھ تحریک کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں میں جدید تعلیم کی ترویج کی کوشش کر رہے تھے تو ان کی مخالفت کس کس طرح نہ کی گئی۔ مگر آج یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سر سیّد کی فکر اور ان کی برپا کی ہوئی تعلیمی تحریک درست تھی اور ان کی مخالفت کرنے والے غلط۔ اس بابت اب کسی قسم کے شبہے کی گنجائش نہیں۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ علی گڑھ تعلیمی تحریک کو دوبارہ بڑے زور و شور سے برپا کیا جائے۔ اسے ہر ہر گاؤں اور ہر ہر شہر تک پہنچایا جائے۔ لوگوں کو جدید تعلیم کی طرف راغب کیا جائے اور اس کے فائدوں کو اجاگر کیا جائے۔ انہیں یہ بتایا جائے کہ جب تک ہم جدید تعلیم نہ حاصل کریں گے، ہمارا سر فخر سے بلند نہ ہوگا۔ ہم ہر چیز کے لیے دوسروں کے محتاج رہیں گے۔ انھیں یہ باور کرایا جائے کہ بڑے بڑے مگر تعلیمی طور پر پسماندہ ممالک آزاد ہونے کے باوجود یورپ اور امریکہ کے غلام ہیں۔ صحیح معنوں میں سیاسی اور معاشی آزادی کے لیے یہ ضروری ہے کہ ملک میں جدید تعلیم عام ہو۔ اس کے بغیر ہمیں آزادی کو برقرار رکھنا بھی ممکن نہ ہو سکے گا۔

میری دلی تمنا ہے کہ آپ سب لوگ اس ادارے کے قیام کے پس منظر کا ایک گہرا تاثر لے کر جائیں۔ یہاں سے قومی خدمت کا وہ جذبہ لے کر جائیں، جس کے ہاتھوں یہ عظیم ادارہ وجود میں آیا۔ میری دعا ہے کہ یہ تاثر اور قومی خدمت کا جذبہ یہاں سے جاتے ہی ختم نہ ہو جائے، بلکہ قایم و دایم رہے۔ آپ خود اس جذبے سے سرشار رہیں اور اپنے طلبا کو بھی سرشار کریں۔ قومی خدمت کی وہ روح جو سر سیّد نے یہاں کے لوگوں میں پھونکی تھی وہ آپ لوگ اپنے طلبا میں بھی پھونکیں۔ آپ اپنے تعلیمی مشن میں کامیاب ہوں۔ آپ کے شاگرد صحیح معنوں میں انسان ہوں اور مثالی شہری بنیں۔ آپ کی شخصیت اور اخلاص کا ان پر اتنا گہرا اثر ہو کہ اسکول چھوڑنے کے بعد بھی وہ آپ کو اور آپ کے درس کو تا حیات یاد رکھیں۔

شکریہ۔

ہا تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۷۔ شمارہ ۸ (اگست ۸۰ء)

متن

سید حامد

متن کو جیسے گہن لگ گیا ہو۔ لکھنے والے نے لکھا کیا ہے، طالب علم کو
ے کوئی سروکار نہیں۔ متن پر بعد میں آنے والوں نے کیا حواشی لکھے، اس
ح کس انداز سے کی، طالب علم کو بس اسی سے غرض ہے۔ ناقد نے تصنیف
تنقید کی مصنف کی زندگی، اس کے عصر، اس کے کردار، افتادِ طبع اور
ت پر کیا روشنی ڈالی، طالب علم اسے پڑھ کر مطمئن ہو جاتا ہے۔ سورج کو
لتا ہے تو براہِ راست اس کو نہیں دیکھتے کہ آنکھ کی روشنی کو گزند پہنچنے کا ڈر
طسد میں پانی بھر کر سورج کی پرچھائیں کو دیکھتے ہیں۔ سورج ظاہر ہے
اف نظر نہیں آئے گا لیکن بینائی تو محفوظ رہے گی۔ بیسویں صدی کے
دم کا یہ امتیاز ہے کہ اس نے تنقید کو محفلِ ادب کا صدر نشیں بنا دیا
بق کو (جو متن کا دوسرا نام ہے یا متن جس کا نتیجہ ہے) صدر سے ہٹا کر
میں بٹھا دیا۔ دوسرے دیسوں میں کیا ہو رہا ہے ہمیں نہیں معلوم۔ ہم
نتے ہیں کہ ہندوستان میں یہی ہو رہا ہے۔ یہاں متن کس مپرسی
میں ہے اور بات بھی ٹھیک ہے۔ ہم سے بہتر دماغ جب متن کو
ۂ ہیں اور متن اور صاحبِ متن سے سیر حاصل بحث کر چکے ہیں تو ہم
یا پڑی ہے کہ متن میں خواہ مخواہ سر کھپائیں۔ پکی پکائی کو آن پکی بنانے
لا حاصل کیوں کریں۔ یہ تو کفرانِ نعمت ہوگا کہ تنقید اور تشریح کے
درسرمایے کو نظر انداز کرتے ہوئے تخلیق تک براہِ راست پہنچنے کا
طریقہ اختیار کریں۔ ان لوگوں کے انجام سے ڈریے جو حاجب و
کی اجازت اور مدد کے بغیر صاحبِ خانہ سے ملنے کی کوشش کرتے
ہیں۔ ان زائرین کا حشر کیا ہوگا جو خدام کی وساطت کے بغیر مزار پر حاضری
کی کوشش کریں۔

اس کاروبارِ شوق میں یہ بات البتہ انوکھی ہے کہ جس عمر میں کسی تخلیق
کو سمجھنے کے لیے رہنمائی کی ضرورت ہو سکتی ہے اس میں تو متن سے براہِ راست
رابطہ رہتا ہے۔ جیسے جیسے عمر اور سمجھنے اور رخنا اندوز ہونے کی صلاحیت
بڑھتی جاتی ہے، ویسے ویسے طالب علم کو انگلی پکڑ کر چلانے اور شرح و
تنقید پر تکیہ کرانے کی کوششیں سوا ہوتی جاتی ہیں۔ ایم اے تک پہنچتے پہنچتے
عروسِ سخن سات پردوں کے پیچھے پہنچ جاتی ہے۔ ادب کے مجاور اسے زندہ
درگور کر دیتے ہیں۔ اس کے اطراف تنقید کا ایسا تانا بانا بن دیتے ہیں
کہ اس کی جھلک دیکھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

نقد و شرح کے ریگ زار سے ایک بار گزر جایے پھر کبھی تخلیق سے
وہ حظ نہیں اٹھا سکتے جو نظر کی معصوم تازگی سے حاصل ہوتا ہے۔ سارا چمن
غبار آلود نظر آتا ہے۔ تجزیہ حُسن کو پارہ پارہ کر دیتا ہے۔ پرائی آنکھوں
سے دیکھنا بھی کوئی دیکھنا ہے۔ دوسروں کی نگاہوں سے دیکھیے، ان کے
دل سے محسوس کیجیے، ان کے ذائقہ سے چکھیے، ان کے کانوں سے سنیے،
اور یہ فراموش کر دیجیے کہ آپ کو خالق نے دل بھی دیا ہے۔ آنکھیں بھی
کان بھی، ذائقہ بھی اور ذوق بھی۔ ہمارے نصاب کی جو نہج ہے، اس کے
تحت یہ ساری انہونی ہو رہی ہے۔ تصنیفات اپنا لطف کھو بیٹھی ہیں تخلیقات
ہمارے طالب علم کے لیے دور کا جلوہ بن گئی ہیں۔ اسے تخلیق کے بیکر جمیل کے رُو برو

سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
ہمدرد نگر۔ نئی دہلی۔

اتنا لطف بھی نہیں ملتا جتنا راقم کی نسل کے بچوں کو ڈبہ کے گول شیشے سے جھانسی کی رانی کو، ڈبہ والے کی ہدایت میں، دیکھنے سے حاصل ہوتا تھا۔ تنقید سارا لطف کرکرا کر دیتی ہے لیکن تنقید ہی کے بل پر تو امتحان پاس کیا جاتا ہے۔ یہ ممکن ہے بلکہ سال بہ سال ہوتا چلا آرہا ہے کہ آپ متن پر نظر بھی نہ ڈالیں اور تنقیدی آرا، اور تبصروں کو رٹ کر ادب کے منتہی ہو جائیں۔ دوسروں کے چبائے ہوئے نوالے چباتے ہوئے ہماری نئی پیڑھی کو کراہت اور تکدر کیوں نہیں ہوتا ؟

تخلیق اور قاری کے درمیان جو بھی حائل ہوتا ہے، خواہ وہ ناقد ہو خواہ شارح، خواہ کلید بنانے والا خواہ خلاصہ ساز، خواہ نوٹ طراز، ادب کا خون کرتا ہے اور ادب کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز اور انبساط طلب ہونے کی صلاحیت کو پامال کرتا ہے۔

ہماری جامعات نے متن کے وزن کو بہت کم کر دیا ہے۔ متن کو (یہاں سخن وسیع معنیٰ میں استعمال ہوا ہے)۔ سمجھنے والے، اس سے حظ اندوز ہونے والے، اس پر وجد کرنے والے نہ رہے تو معیار ذوق تخلیق بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے گا۔ ہمارے حالیہ ادب یا تخلیق ادب کو دو خطرات لاحق ہیں: تخلیق کار کی آزادی سلب ہو چکی ہے (یہاں ذکر صرف اردو کا ہے)۔ اردو کی تصنیفات کے خریدنے والے نہ رہے اردو لکھنے والے سرکار یا سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کے دست نگر ہو گئے۔ ان کی آزادی چھین لی گئی۔ ان کی فکر مرجھا گئی اور وہ حق گوئی کی جرأت سے محروم ہو گئے۔ اب وہ لاکھ جتن کریں دوسرے درجے کی تخلیق سے آگے کسی حال میں نہیں بڑھ سکتے ؛ تیسرے درجے کے حصار سے ان کے لیے بسا اوقات دشوار ہوتا ہے۔

دوسرا خطرہ شرح و تنقید کا وہ شکنجہ ہے جس نے ذوق کو کم ہے۔ راقم کو اسکولوں، یونیورسٹیوں اور سول سروسز کے شخصی ا سے واسطہ پڑا ہے۔ شاذ ہی کوئی امیدوار ایسا نظر آیا ہو، جو مثا طور پر، اشعار کا صحیح مطلب بتا سکتا ہو یا اُن کے محاسن کی طرف ا کر سکتا ہو۔ جامعات کی فہرست اساتذہ پر نظر ڈالیے، بہت کم ا ایسے ملیں گے جو متن کو خصوصاً قصیدہ کے متن کو، ذوق اور اعتما ساتھ پڑھا سکتے ہوں۔ ہمارے طرز تدریس میں استعارہ ایک نئے سے کار فرما ہے۔ یعنی ہمارے اساتذہ جو کچھ پڑھاتے ہیں وہ تنقیدنگاروں سے مستعار لے کر پڑھاتے ہیں۔ اگر یہی لیل و نہار ر تو ادب اور ذوق ادب کے سوتے خشک ہو جائیں گے۔ تنقید کو پروان چڑھانے اور اس کا صحیح مذاق پیدا کرنے اور اسے دینے کے بجائے ادب کا گلا گھونٹ دے گی۔ حیرت ہے کہ
اس خطرے سے نہ کوئی آگاہ
نظر آتا ہے، نہ اس پر
فکر مند۔

"ہمارے سامنے اس وقت واحد راستہ یہ ہے کہ ہم ایک مودب
لیکن آزادانہ رویے سے علوم حاضرہ تک رسائی حاصل کریں
اور اسلام کی تعلیم کا اس نئے علم کی روشنی میں مطالعہ کریں
خواہ ہمیں اپنے متقدمین سے اختلاف ہی کیوں نہ کرنا
پڑے۔"

علامہ اقبال ؒ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ج ۲۷، ش ۸ (اگست ۲۰۰۸ء)

تعلیم قسمت کی بات نہیں

منصوبہ بند کوشش کا نتیجہ ہے

محمد اسحاق

۱۹۳۷ء کا زمانہ تھا ہم بالکل ابتدائی جماعتوں میں ایک چھوٹے سے گاؤں کے اسکول میں پڑھتے تھے۔ اسی سال اس قصبے سے محبوب نگر ہائی اسکول سے تین طلباء میٹرک کے امتحان میں شریک ہوئے اور صرف ایک صاحب درجہ سوم سے کامیاب ہوئے۔ اخبار میں نام آیا سارے گاؤں میں دھوم مچ گئی۔ سارے گاؤں کے بڑے لوگوں کی ضیافت بریانی سے کی گئی۔ ہر ایک کی زبان پر صرف ایک ہی جملہ تھا "تعلیم قسمت کی بات ہے"

۱۹۵۴ء کی بات ہے کہ ایک ریونیو انسپکٹر میرے پاس آئے اور اپنے لڑکے کو انجینئر بنانے کے سلسلے میں مشورے کے طلب گار ہوئے یہ لڑکا میٹرک میں دو سال فیل ہو کر تیسرے درجے میں کامیاب ہو چکا تھا اس صاحبزادے کی قابلیت پر مجھے شک تو تھا ہی میں نے ان صاحب کو مشورہ دیا کہ یہ لڑکا انجینئر نہیں بن سکتا۔ بہتر ہے کہ انھیں کوئی دکان لگا دیجیے یا پھر اپنے اثرات سے کسی تحصیل میں انھیں صیغہ دار بنا دیجیے۔ باپ بیٹا دونوں سخت مایوس ہو گئے۔ لڑکے کی یہ ضد کہ وہ انجینئر بن کر رہے گا اور باپ کی یہ تمنا کہ وہ اپنے لڑکے کو انجینئر بنا کر ہی رہیں گے۔ کچھ بحث کرنے پر میں نے انھیں مشورہ دیا کہ لڑکے کو حیدرآباد کے کسی کالج میں شریک کروا دیجیے۔ ماہانہ سو روپے بھیجیے اور دوسرا کام دعا کرتے رہیے۔ یہ صاحب زادے انٹرمیڈیٹ کے دو سال کے بعد آخری امتحان میں مسلسل پانچ سال ناکام ہوتے رہے اور آخر کار ہار گئے اور وظیفے پر ہٹتے وقت اس لڑکے کو تحصیل میں کسی خدمت پر تقرر کروا کے مجھ سے ملاقات ہوئی، شرمندہ ہوئے اور کہنے لگے "تعلیم قسمت کی بات ہے"

ان دو مثالوں سے ہٹ کر تیسری مثال ان ذہین، غریب اور متوسط گھرانوں کے طلباء کی ہے جن کے والدین نے کبھی اپنے بچوں کی تعلیم پر توجہ نہیں دی لیکن انھوں نے خود ہی محنت و مشقت کر کے مندر و مسجد کے چراغوں کے نیچے پڑھ کر تعلیم کے اعلیٰ معیار تک پہنچ پائے۔ آج بھی شہر حیدرآباد اور اضلاع میں ڈاکٹر، انجینئر، وکیل اور پروفیسر مل جائیں گے جن کا تعلیمی ریکارڈ نہایت شاندار رہا ہے اور جن کی جد وجہد بھی حیرتناک ہوگی اور یہ بات بھی قریب قریب ہر ایک کے تجربے میں ہوگی کہ ان ہی کے خاندان کے قریبی رشتے دار ان کی تعلیم کے سخت مخالف رہے ہوں گے۔ جہاں تک وہ پست ہمت کر سکتے تھے کر چکے ہوں گے اور یہ بھی مشورہ دے چکے ہوں گے کہ زیادہ پڑھنے سے دماغ پگھل جاتا ہے اور آدمی پاگل ہو جاتا ہے اور جب ان کی ایک نہ چلی تو وہ دل میں شرمندہ ہوں گے اور بالآخر کہیں گے کہ "تعلیم قسمت کی بات ہے"

گزشتہ پچاس برس سے ہم یہی سنتے آئے ہیں کہ تعلیم قسمت کی بات ہے اور آج بھی یہی خیال خام عام ہے۔ اتنے برسوں میں پہلے سچ مچ تعلیم اتنی پھیلی ہوئی نہیں تھی۔ غربت و جہالت کی وجہ سے ایک ہونہار بچہ

ریٹائرڈ پرنسپل کالج آف ایجوکیشن، حیدرآباد۔

اسکول میں شریک ہوتے تو بس دس پانچ میٹرک تک پہنچ پاتے۔ اس کے علاوہ اسکولوں کا تنگ و تاریک ماحول اور سخت سزاؤں کا رواج عام تھا۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ بچہ کو جتنی سزا ملے گی اتنا ہی وہ تعلیم میں اوپر آئے گا۔ جو استاد سزا دینے میں استاد ہوتا اس کی گاؤں میں اتنی ہی زیادہ قدر ہوتی مگر ان اساتذہ نے کتنے معصوم طلبا کی زندگی اجاڑی، اس کی شاید انھیں خبر نہ ہوگی جو مار کے خوف سے اسکول چھوڑ بیٹھے۔ ان حالات میں کوئی سخت جان طالب علم آگے نکل جاتا تو لگتا ہے کہ یہ قسمت ہی کی بات ہو سکتی تھی۔

تعلیم منصوبہ بند کوشش کا نتیجہ ہے

تعلیم قسمت کی بات ہرگز نہیں۔ بچوں کی تعلیم ایک سوچے سمجھے دور رس واضح منصوبے کا نام ہے جو بچے کی ۴، ۵ سال کی عمر سے شروع ہو کر پندرہ سولہ سال کی عمر تک جاری رہتا ہے جب کہ یہ لڑکا میٹرک کا امتحان کامیاب کر لیتا ہے۔ اس منصوبے کی تکمیل کے لیے تھوڑے بہت سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن سب سے زیادہ اہم بات سرمایہ نہیں بلکہ یہ بات ہے۔

آپ نے اپنے بچے کی تعلیم پر کتنی توجہ دی کتنی دلچسپی لی اور اپنا کتنا وقت اس کی تعلیم پر دیا۔ یہی تو اصل سرمایہ ہے جو بچے کی تعلیم کے لیے مشغول کرنا ضروری ہے۔

کم از کم یہ منصوبہ بند جدوجہد دس برس یا دو پنج سالہ منصوبوں پر محیط ہے۔

یہاں پر تعلیمی منصوبہ بندی اور عام منصوبہ بندی کے بنیادی فرق کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ کوئی مکان، ڈیم یا برج بنانا ہو تو یہ منصوبہ پہلے کاغذ پر تیار کیا جاتا ہے۔ کاغذی نقشے کی تکمیل کے لیے ضروری سرمائے کی فراہمی اور پھر اصل کام نقشے کے مطابق شروع ہو جاتا ہے۔ آخر میں یہ جانچ کی جاتی ہے کہ جو منصوبہ ہم نے بنایا تھا وہ کہاں تک کامیاب رہا اور ہم نے جو نشانات مقرر کیے تھے کس مدت میں کس حد تک تشفی بخش طریقے پر حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

آپ کے بچے کی تعلیمی منصوبہ بندی بالکل الگ چیز ہے۔ وہاں کاغذی پلان یا نقشہ کی طرح بچے بے حس و بے جان نہیں ہے۔ کاغذی پلان پوری طرح پلانر اور انجینئر کے قابو میں ہوتا ہے وہ جب چاہے اس میں رد و بدل کر سکتا ہے لیکن یہاں جس کے لیے پلان بنایا گیا ہے وہ خود ذی روح اچھلتا کودتا اور زندگی کی ساری توانائیوں کا مرکز ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم کے اکثر چھوٹے بڑے منصوبے ناکام ہو جاتے ہیں۔

ذاکر حسین تعلیمی فارمولا

ڈاکٹر ذاکر حسین ہمارے ملک کے بڑے ماہر تعلیم ہوئے ہیں۔ کوئی چالیس برس پہلے ایک کالج کے طلبا سے خطاب کرتے ہوئے انھیں ایک تعلیمی فارمولا دیا جو کامیابی کا ضامن ہے۔ ڈر ہے کہ یہ فارمولا یوں ہی ضائع نہ ہو جائے۔ کیوں کہ ذاکر صاحب پر جو کتابیں انگریزی یا اردو میں ہیں کہیں پر اس تقریر کا ذکر نہیں ہے۔ فارمولا یہ ہے:

"شدت × مدت = مقصد

شدت سے مراد مقصد کو حاصل کرنے کا جوش، جذبہ، ولولہ، لگن اور دھن کا پیمانہ ہے۔ اس کو ہم یہاں ۱۰۰ درجوں یا ڈگریوں میں ظاہر کریں گے۔

مدت اس مقصد کے حاصل کرنے کا جوش یا جذبہ کتنے دن تک باقی رہا کیوں کہ مقصد کے حصول کے لیے جتنی مدت درکار ہے وہ دلچسپی باقی رہی یا اس میں اتار چڑھاؤ آتے رہے کیا یہ دلچسپی درکار مدت تک ایک ہی سطح اور ڈگری پر قائم رہی یا نہیں

مقصد اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ہماری زندگی کے کئی ایک مقاصد قلیل مدتی اور طویل مدتی اسی فارمولے کے تابع ہیں۔ اس کا اطلاق آسانی سے تعلیمی منصوبہ بندی پر ہوتا ہے۔ ایک بات یہاں یاد رکھنے کی یہ ہے کہ جو مقصد جتنا اونچا ہوگا اس کے حصول کا جذبہ (شدت) بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا اور پھر درکار مدت بھی اتنی ہی ضروری ہوگی۔

> "ہر سانس ایک خزانہ ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا کوئی سانس بے کار جائے اور قیامت کے دن اپنے خزانے کو خالی دیکھ کر تمہیں شرمندگی اٹھانی پڑے۔"
>
> ابن جوزیؒ

مثال کے طور پر ہم یہاں ۳ طلبا کا ایک فرضی جدول پیش کرتے ہیں جو اس سال میٹرک کے امتحان میں شریک ہیں۔ ان کے نتائج اسی فارمولے کے تحت دیکھیے۔

شدت × مدت = مقصد (نتیجۂ امتحان)

پہلا طالب علم ۹۰٪ × ۳ ماہ = ۲۷۰ نشانات ۔ ناکام

دوسرا طالب علم ۶۰٪ × ۸ ماہ = ۴۸۰ " کامیاب

تیسرا طالب علم ۸۰٪ × ۱۲ ماہ ۹۶۰ " درجہ اول

پہلا طالب علم امتحان کے سر پر آجانے سے شدت کا پارہ بہت زیادہ ہے لیکن درکار مدت بہت کم ہے۔

دوسرے طالب علم میں کامیابی کا جذبہ ٹھیک ہے اور مدت بھی وسط ہے۔ درجہ سوم یا دوم بہرحال کامیاب ہے۔

لیکن تیسرا طالب علم وہ ہے جس نے شدت کے پارہ کو ایک برس تک اعلیٰ سطح کی ڈگری پر قایم رکھا، اسی لیے درجہ اوّل میں کامیاب ہوا۔ اس کا مقصد بھی اونچا تھا اور جذبہ بھی بہت تھا اور طویل مدت تک وہ آئندہ زندگی میں کوئی معتبر مقام حاصل کر کے رہے گا۔ اس مثال میں ذہانت کے اعتبار سے ہم تینوں کو مساوی سمجھتے ہیں۔

آپ کے سامنے بہت سی ایسی مثالیں ہوں گی۔ ہمیں یہاں ایک بات پورے وثوق سے کہنا ہے کہ "تعلیم قسمت کی بات نہیں"۔ آپ اس وہم سے نکل آیئے کہ تعلیم قسمت کی بات ہے۔ تعلیم ایک منصوبہ بند جدوجہد کا نتیجہ ہے جو اس دلچسپی اور ولولے کو ایک طویل مدت تک برقرار رکھنے سے حاصل ہوتی ہے

ہماری آرزو ہے کہ ذاکر حسین تعلیمی فارمولا ہر گھر میں آویزاں ہو اور ہر طالب علم کی میز کی زینت بنے۔

"قوم کی حالت اور اسلام کی حرمت کیسی ہی خراب ہوتی جاوے اس کے اسباب پر غور کرنے اور اس کے رفع کرنے کا خیال کسی کو نہیں ہے۔ اپنے خیال کے مطابق جو اپنے ثواب اور دوسرے جہان میں اپنے چین کرنے کا کام سمجھتے ہیں، وہ کرتے ہیں۔ پھر کس طرح خیال ہو سکتا ہے کہ وہ قومی ہمدردی کے کام ہیں"۔

سرسید احمد خاں

علم خواص الاعداد کی ترقی میں مسلمانوں کی خدمات

شبیر احمد خان غوری

ارثمیطیقا (Aritmetica) معرب (ارثماطیقی)
یزی اصطلاح "ارتھمیٹک" کی یونانی اصل ہے۔ مگر مڈل اور
اسکولوں میں پڑھائے جانے والے "ارتھمیٹک" سے یونانی فلسفہ
ارثمیطیقا "(ارثماطیقی) قطعاً مختلف تھا۔ اسکولوں میں پڑھائے
نے والے "ارتھمیٹک" سے مراد روزانہ زندگی کا "علم الحساب" ہوتا
، یعنی جمع تفریق، ضرب، تقسیم کے چار قاعدے، کسور عاملہ و کسور اعشاریہ
ان کے جو شماتی وغیرہ، جذر المربع، مساحت (رقبہ اور حجم کے سوالات)
کی کا قاعدہ (جس نے پہلے زمانے کے "اربعہ متناسبہ" کی جگہ لے لی ہے)
اس اکائی کے قاعدے کی مختلف تفریعات (Applications)
یہ وقت اور کام کے سوالات نفع نقصان وغیرہ، جب کہ یونانی فلسفی کی
ت عالی مطمح نظر اس عارضی سود و زیاں کے بازیچۂ اطفال سے کہیں زیادہ
ند اور ارفع تھا۔ اس کے پیشوائے اولین (فیثاغورث Pythagoras)
، تو عدد ہی کو مبدأ اولین کائنات قرار دیا تھا۔ لہٰذا اس کے اور اس
شاگردوں کی فکر فلک پیما اعداد کی حقیقت و ماہیت اور ان کے گوناگوں
اص ہی کی تحقیق میں مصروف پرواز رہی۔ یہی ذہنی ورزش "ارثماطیقی"
نام سے موسوم ہوئی۔

فلسفیانہ پس منظر

علم خواص الاعداد (Theory of Numbers) کی ابتدا
فیثاغورث اور اس کے متبعین کے مکتب فکر میں ہوئی۔[1]

فیثاغورث کا نبوغ یونانی فلسفہ کے ابتدائی دور میں ہوا، جب کہ مذہبی و معاشرتی عوامل کے خلاف ردعمل کے نتیجے میں یونانی فکر "قوام کائنات کے مبداء اولین" کی تلاش و تحقیق میں مصروف تھی۔ پہلے یونانی فلسفی تالیس الملطی (Thales of Miletus) کے نزدیک یہ "مبداء اولین" پانی تھا۔ تالیس کے شاگرد انکسمینڈر (Anaximander) کے نزدیک یہ غیر متمیز و غیر متشخص مادہ (undifferentiated matter) تھا اور انکسمنڈر کے شاگرد انکسیمینس (Anaximenes) کے نزدیک ہوا۔

انکسیمنڈر ہی کا شاگرد فیثاغورث تھا۔ اس لیے اس کا حکمائے ملطیہ کے انداز تفکیر و منہاج تحقیق سے متاثر ہونا فطری تھا۔ مگر اس نے اس انداز تفکیر میں ایک دوررس تبدیلی کی۔ دوسرے یونانی مفکرین کے علی الرغم جو اس "مبداء اولین کائنات" کو مادیات میں تلاش کر رہے تھے، اس نے اسے مجردات میں ڈھونڈا، اس نظم و ترتیب میں جو کائنات میں مضمر ہے اس توازن و تناسب اور اعتدال میں جس کے اندر لاانتہا تضادات پنہاں ہیں، المختصر اُن ریاضیاتی تعلقات و اضافات میں جو جملہ اشیائے کائنات میں کارفرما ہیں۔ ہندسہ ہو یا ہیئت یا موسیقی انجام کار ہر چیز عدد ہی میں تحویل ہو جاتی ہے۔ بقول ویبر

سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی۔ بورڈ الہ آباد۔ سر سید نگر۔ علی گڑھ

what interests the Philosophers of Miletus is matter .... what impresses Pythagoras and the Pythagorians is the immaterial in matter, the order which prevails in the world, the unity proportion and harmony in its contrast, the mathematical relations underlying all things. In geometry, in astronomy, and in music everything is ultimately reduced to numbers.[7]

لہذا عدد ہی قوام کائنات کا مبداء اولین اور اس کی باطنی حقیقت ہے اشیاء اعداد مشہودہ (Sensible Numbers) ہیں۔ ہر شے کسی نہ کسی عدد کو ظاہر کرتی ہے اور علم و حکمت کا مقصد اقصیٰ صرف کسی شے کے لیے اس عدد کی تلاش و دریافت ہے، جس کے لیے وہ قائم ہے۔

"The final goal of Science is to find for each being the NUMBER for which it stands.[8]"

اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ فیثاغورث اور اس کے مکتب فکر نے اپنی تمام تر توجہ علم الاعداد کو ترقی دینے پر مرکوز کر دی۔ مگر فیثاغورثی جماعت کی سرگرمیوں کی تفصیل تاریخ محفوظ نہیں رکھ سکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے یہاں تعلیم و تعلم کا فریضہ زبانی ابلاغ کے ذریعے انجام پاتا تھا۔ خود بلکہ کی تعلیمات و عقائد حد درجے عویص و غامض تھے اور ارباب حال کے دائرہ سے باہر ارباب قال کے لیے حد درجہ عسیر الفہم تھے۔[9] اس لیے فیثاغورثی جماعت کی تحقیقات کی نوعیت اور ان تحقیقات کے محققین کی شخصیت معرض تحریر میں نہ آسکی۔ لہذا نوشتہ دستاویزی شہادتوں کے فقدان کی توجیہ رازداری و اخفاء میں ان کی شدت اہتمام سے کی گئی اور پھر اس سلسلے میں بڑی دلچسپ داستانیں تراشی گئیں: مثلاً ہپاسس (Hippasus) فیثاغورث کی تعلیمات کو افشا کرنے کے جرم میں جماعت سے خارج کیا گیا، بلکہ ایک افسانہ میں تو یہاں تک مبالغہ آرائی کی گئی کہ اس نے کرہ میں مجسم ذی اثنا عشر قواعد کو بنانے کے طریقے کو اپنی دریافت ہونے کا دعویٰ کیا تھا، اس لیے اسے سمندر میں غرق کر دیا گیا۔

"He was drowned at sea for revealing the construction of the dodecahedron in the sphere and claiming it as his own.[10]"

ریاضیاتی پس منظر

بہرحال "علم الاعداد" کا بہت بڑا حصہ متبعین فیثاغورث کی سعی و اعتناء سے وجود میں آچکا تھا (جس کی تفصیل موجب تطویل ہو گی) کہ چوتھی صدی قبل مسیح کے آخر میں اقلیدس کا نبوغ ہوا۔ اس کی کتاب "اصول الہندسہ والحساب" کا ساتواں، آٹھواں اور نواں مقالہ "علم الاعداد" کی ابحاث پر ہیں۔ اس کے بعد پہلی صدی مسیحی میں نیقوماخس پیدا ہوا لیکن یہ نہیں معلوم کہ اقلیدس اور نیقوماخس کے درمیانی عرصے میں کسی یونانی فاضل نے علم الاعداد کے موضوع پر کوئی کتاب لکھی یا نہیں اور اگر اس اثنا میں کوئی باقاعدہ تصنیف وجود میں آئی بھی ہو تو وہ صفحۂ دہر پر باقی نہیں رہ سکی۔[11] "علم الاعداد" کا پہلا متن متین نیقوماخس الجراسنی (Nicomachus of Gerasa) کا (Introduction Arithmetica) تھا۔ مسلمان فضلاء اس موضوع پر متقدمین و متاخرین حکمائے یونان کی تصانیف میں سے صرف اسی کتاب سے واقف تھے۔ چنانچہ ابن الندیم "کتاب الفہرست" میں اس بارے میں لکھتا ہے:

"ینقوماخس الجہراسنی و لہ من الکتب کتاب الارثماطیقی"۔[12]

"ینقوماخس الجہراسنی: اس کی تصانیف میں سے کتاب الارثماطیقی ہے۔"

ینقوماخس کی اس کتاب کے بارے میں ماہر نقادان فن کی رائے کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے۔[13] مگر پھر بھی قدرت کی طرف سے اسے قبول عام

سے نوازا گیا جس کا ثبوت اُن جوامع و تفاسیر سے ملتا ہے جو اس کتاب کے سلسلے میں لکھی گئیں، دوسری صدی عیسی میں Apuleius of Madaura نے اس کا لاطینی میں ترجمہ کیا اور پھر چھٹی صدی میں Boetius نے اس کی "جوامع" تیار کی۔ اس کے علاوہ اس کتاب کی متعدد شروح و تفاسیر لکھی گئیں جن میں سرفہرست ایامبلخس کی تفسیر ہے۔ دوسری تفاسیر میں Asclepius of Tralles، Proclus اور Hermas Joannes Philopnos تفسیریں قابل ذکر ہیں[14]۔ ان میں سے بعض تفاسیر "رفقؔ" یورپ کے اعتناء و اہتمام سے شایع ہو چکی ہیں مگر مسلمان ان میں سے کسی تفسیر سے واقف نہیں تھے۔ وہ صرف نیقوماخس ہی کے المدخل الی الارثماطیقی سے واقف تھے یا شاید ان غیر اہم اور نسبتاً غیر معروف متفرق تعلیقات سے جو حکمائے یونان نے علم الاعداد کی تفریعات Applications پر لکھی تھیں جیسے افلاطون نے کتاب السیاسۃ (Republica) میں علم الاعداد سے کام لیا تھا۔ اس موضوع پر ابن الندیم نے کتاب الفہرست میں الکندی کی ایک تصنیف کا ذکر کیا ہے، جس کا نام اس نے "رسالۃ فی الاعداد التی ذکرہا افلاطون فی کتاب السیاسۃ" بتایا ہے[15]۔

۴ ارثماطیقی مسلمانوں میں

المدخل الی الارثماطیقی کا سب سے پہلے دوسرے عباسی خلیفہ ابو جعفر المنصور (١٣٦ - ١٥٨ھ مطابق ٧٥٣ - ٧٧٤ء) کے عہد میں عربی میں ترجمہ ہوا۔ چنانچہ مشہور مورخ ابو الحسن المسعودی "مروج الذہب" میں لکھتا ہے:

> (المنصور) ... ترجم لہ کتاب المجسطی لبطلیموس و کتاب اُقلیدس و کتاب الارثماطیقی و سائر الکتب القدیمۃ من الیونانیۃ۔"
>
> [اور منصور کے لیے بطلیموس کی کتاب المجسطی، اقلیدس (کی اصول الہندسہ نیز) کتاب الارثماطیقی اور دیگر قدیم کتابیں یونانی زبان سے ترجمہ کی گئیں]

تیسری صدی ہجری کے نصف اول میں ابو یوسف یعقوب بن اسحاق الکندیؒ کا نبوغ ہوا جو مختلف علوم الاوائل میں اپنے تبحر و تمہر کی بنا پر فیلسوف العرب کہلاتا ہے[16]۔ ابن الندیم اس کی تصانیف میں "حسابیات" کے زیر عنوان ایک کتاب "المدخل الی الارثماطیقی" کا ذکر کرتا ہے جو پانچ مقالوں میں تھی۔ اس لیے نیقوماخس کی کتاب کا یہ حرف بحرف ترجمہ تو نہیں تھا، کیوں کہ اس میں صرف دو مقالے تھے۔ اس لیے یا تو یہ اس کی "المدخل الی الارثماطیقی" کی جوامع ہوگی یا اس کی بنیاد پر الکندی کی ایک مستقل تصنیف جس میں اس نے نیقوماخس کی کتاب کے دو مقالوں کے محتویات کو پانچ مقالوں میں بانٹ دیا تھا۔

باضابطہ طور پر اس کتاب کو مشہور مترجم و ریاضی داں ثابت بن قرہ نے کتاب المدخل الی العدد کے عنوان سے عربی میں ترجمہ کیا۔ ابن القفطی لکھتا ہے:

> تبت ما صنفہ ابو الحسن ثابت بن قرہ الصابی الحرانی و نقلہ واصلحہ .... جوامع عملہا لکتاب نیقوماخس فی الارثماطیقی مقالتان[18]۔"

اس ترجمہ کا ایک مخطوط بادحوادث کے تھپیڑے کھا کھا زندہ رہ گیا تھا جسے Father Wilhelm Kutsch نے بیروت کے ملیح کاتھولیکیہ سے ١٩٥٩ء میں شایع کر دیا ہے۔ اس کا ایک نسخہ میرے پیش نظر ہے۔ مشہور مورخ ریاضیات Heath نے اپنی "یونانی ریاضیات کی تاریخ" میں اس کے اصل یونانی متن کا جو خلاصہ دیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں مقالے ابواب میں منقسم تھے۔ مگر ثابت بن قرہ کے ترجمہ میں اس قسم کی "تبویب و تفصیل" نہیں ہے جس کی وجہ غالباً یہ رہی ہوگی کہ ثابت کا محض ملخص ترجمہ ہے جس میں صرف بحرف منتقلی کا التزام نہیں کیا گیا۔ ثابت بن قرہ نے علم الاعداد کے ایک اہم بحث الاعداد المتحابہ Amicable Numbers پر بھی ایک مستقل رسالہ لکھا تھا۔[19]

تیسری صدی ہجری کے آخر میں مشہور مورخ الیعقوبی نے اپنی "تاریخ" کی جلد اول (صفحہ ١٢٣ - ١٢٥) میں نیقوماخس کا تذکرہ قلم بند کیا ہے۔ نیز اس کی پیش نظر تصنیف "کتاب الارثماطیقی" کا ایک انتہائی مفید خلاصہ بھی دیا ہے[20] جسے نقل کرنے سے خوفِ تطویل مانع ہے۔

غالباً چوتھی صدی ہجری کے نصف اول میں یہ کتاب اور اس کا موضوع

عام ہو چکے تھے اور اکثر افاضل عہد نے اس موضوع پر کتابیں لکھی تھیں۔ ان میں سرفہرست ابوالوفا البوزجانی (۳۲۸ - ۳۸۶ھ) کا نام ہے۔ ابن الندیم نے اس موضوع پر اس کی دو کتابوں کے نام گنائے ہیں:

۱۔ کتاب المدخل الی الارثماطیقی (ایک مقالہ)

۲۔ کتاب فیما ینبغی ان یحفظ قبل الکتاب الارثماطیقی و نیقوماخس کی المدخل الی الارثماطیقی، پڑھنے سے پہلے جن مباحث کو حفظ کرنا چاہیے اُن کا بیان؟

ابوالوفا کا معاصر ریاضی داں الانطاکی تھا جو المجتبیٰ کے نام سے ملقب ہے۔ اس کا زمانہ ۳۷۶ھ کے قریب ہے۔ اس نے "تفسیر الارثماطیقی" کے عنوان سے نیقوماخس کی "المدخل الی الارثماطیقی" کی شرح و تفسیر کی تھی[۲۳] اور بھی لوگ تھے جنھوں نے علم الاعداد کے موضوع پر خامہ فرسائی کی تھی، جیسے ابوجعفر الخازن مصنف "کتاب المسائل العددیہ"[۲۴] قاضی محمد بن یحییٰ بن اکثم مصنف "کتاب مسائل الاعداد"[۲۵]

اسی زمانہ میں اخوان الصفا نے اس موضوع پر ایک رسالہ لکھ کر اپنے "رسائل" کا اس سے افتتاح کیا۔[۱۰] اخوان الصفا "بصرہ کے چند آزاد خیال "دانشوروں" کی ایک جماعت تھی جنھیں مختلف علوم متداولہ بالخصوص علوم حکمیہ میں دستگاہ عالی حاصل تھی۔ ان کا خیال تھا کہ شریعت اسلامیہ کو جہالت کی گندگی نے ناپاک کر دیا ہے اور اس کی تطہیر یونانی حکمت سے ہی ہو سکتی ہے۔ اس غرض سے مختلف علوم پر انھوں نے کوئی باون رسالے لکھے اور پھر انھیں خاموشی سے کتب فروشوں میں پھیلا دیا[۲۵]۔ ان "رسائل" میں سب سے پہلا رسالہ "علم الاعداد" یا "ارثماطیقی" پر ہے جس کے اندر وہ فیثاغورث کے اتباع کا اعتراف کرتے ہیں:

اعلم ایها الاخ البار الرحیم، بانه لما کان من مذهب اخواننا الکرام ..... النظر فی جمیع الموجودات ... والبحث عن مبادیها .... وعن کیفیة حدوثها و نشوءها عن علة واحدة واحد .... ولیستشهدون بیانها بمثالات عددیة و براهین هندسیة التی تسمیٰ الارثماطیقی۔[۲۶]

[جان تو اے نیکوکار اور رحم دل بھائی کہ چوں کہ ہمارے شریف بھائیوں کا طریقہ ہے کہ جملہ موجودات پر غور و فکر کریں ... ان کے مبادی origins سے بحث کریں ..... اور (اس بات پر کہ) وہ علت واحدہ اور مبداء واحد سے کس طرح پیدا ہوئے اور ترقی کی .... اور وہ اپنے بیانات پر عددی مثالوں اور ہندسی دلیلوں سے شہادت لاتے ہیں جس طرح فیثاغورثی پنتھ کے حکماء کیا کرتے تھے تو ہمیں ضرورت محسوس ہوئی کہ ہم اپنے باقی رسالوں سے پہلے اس رسالہ (علم الاعداد) کو لکھ کر ان کی ابتدا کریں اور اس میں علم العدد اور اس کے خواص Properties کا تھوڑا سا ذکر کریں جسے ارثماطیقی کہا جاتا ہے]

مصنفین اس رسالے میں فیثاغورث کے علاوہ نیقوماخس کی خوشہ چینی کا بھی اعتراف کرتے ہیں:

والارثماطیقی هو معرفة خواص العدد.....
التی ذکرها فیثاغورث و نیقوماخس۔[۲۷]

[ارثماطیقی عدد کے خواص (Properties) کی معرفت کا نام ہے جسے فیثاغورث اور نیقوماخس نے ذکر کیا تھا۔]

رسالے میں اس فن کے عام مباحث ہیں جیسے اعداد کی زوج و فرد میں تقسیم در تقسیم، خواص العدد، عدد تام و ناقص و زائد، اعداد متحابہ (Amicable Numbers) خواص الانواع، عدد مربع وغیرہ جن کی تفصیل موجب تطویل ہوگی۔ البتہ ایک بحث ضرور دلچسپ ہے وہ ہے "مراتب اعداد" کی بحث۔ عرب اور ان کی تقلید میں عام مسلمان اہل علم عدد کے چار مرتبوں یعنی اکائی، دہائی، سینکڑہ اور ہزار کے قایل تھے، ہندوستانی ہزار سے کہیں زیادہ بڑے مراتب لاکھ، کروڑ، ارب وغیرہ کا استعمال کرتے ہیں۔ اخوان الصفا بھی "مراتب چہارگانہ" کے قایل تھے، اگرچہ وہ اسے فطری نہیں سمجھتے تھے۔

واعلم بان کون العدد علی اربع مراتب التی هی
الآحاد والعشرات والمئات والالوف لیس امراً

فی ورایا . . . . لکنہٗ امروضعی۔"

[جاننا چاہیے کہ اعداد کے چار مرتبے اکائی، دہائی، سینکڑہ اور ہزار ضروری اور فطری (elementary) امر نہیں ہیں . . . بلکہ اصطلاحی امر ہیں]۔

وہ کہتے ہیں کہ اکثر تو ہیں ان مراتب چہارگانہ کی قایل ہیں لیکن فیثاغورثی انداز فکر میں ان مراتب کی تعداد سولہ ہے۔ اور پھر انہوں نے ان مراتب شانزدہ گانہ کی تفصیل دی ہے۔[۲۸]

چوتھی صدی کے نصف آخر میں ابوعبداللہ الخوارزمی نے طبقہ کتاب کے لیے مختلف علوم متداولہ کا ایک مخزن العلوم (Encyclopaedia) "مفاتیح العلوم" کے نام سے مرتب کیا۔ یہ دو مقالوں پر مشتمل ہے؛ پہلا مقالہ علوم شرعیہ وادبیہ پر ہے، جس میں چھ باب ہیں — دوسرا مقالہ یونانی وغیرہ اہل عجم کے علوم (علوم حکمیہ) پر ہے جو نو ابواب پر مشتمل ہے۔ ان میں سے چوتھا باب "علم العدد" پر ہے۔ اس میں پانچ فصلیں ہیں؛[۲۹]

الفصل الاول؛ فی الکمیہ المفردۃ

الفصل الثانی؛ فی الکمیہ المضافہ

الفصل الثالث؛ فی الاعداد المسطحہ والمجسمہ

الفصل الرابع؛ فی العبارات

الفصل الخامس: حساب الہند وحساب الجمل
ومبادی الجبر والمقابلہ

رسائل اخوان الصفا نے بہت جلد فرقہ باطنیہ (اسماعیلیہ) میں کتب مقدس کا درجہ حاصل کرلیا۔ جو خاندان ان "رسائل" سے متاثر ہوئے ان میں شیخ بوعلی سینا کا خاندان خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ چنانچہ بیہقی اس کے اور اس کے باپ کے بارے میں لکھتا ہے؛۔

"وابوہ کان یطالع ویتامل رسالہ اخوان الصفاء وھو ایضاً احیاناً یتامّلہٗ"[۳۰]

[اس کا باپ رسایل اخوان الصفا کا مطالعہ کیا کرتا تھا اور اس (کے مندرجات) پر (بڑی سنجیدگی سے) غور وفکر کیا کرتا تھا۔ وہ خود بھی کبھی کبھی اس (کے مندرجات) پر غور وفکر کیا کرتا تھا۔]

بچپن کا یہ تاثر دیرپا ثابت ہوا۔ بعد میں اس کے باپ نے اپنے ایک ہم مذہب کو علوم حکمیہ میں اس کی تعلیم پر مقرر کیا۔ ہندسہ اور ہیئت میں اس سے تعلیم پانے کی کیفیت تو شیخ نے لکھی ہے مگر "علم الاعداد" یا "ارثماطیقی" میں تعلیم کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ پھر جب اس کا استاد اس کی تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر چلا گیا تو پھر اس نے فلسفہ کی مختلف اقسام کا علم بشمول ریاضیات کے اپنے طور پر ان علوم کی کتابوں سے حاصل کیا۔ آخر میں جب وہ ہمدان پہنچا تو اس نے کتاب "الشفا" کو لکھنا شروع کیا۔ ہوا یہ کہ اس کے عزیز شاگرد ابوعبید جوزجانی نے اس سے ارسطو کی کتابوں کی شرح لکھنے کی درخواست کی۔ شیخ نے کہا اتنی فرصت تو نہیں ہے، البتہ

"ان رضیت منی بتصنیف کتاب اورد فیہ ما صح عندی من ھذہ العلوم بلا مناظرۃ الخصوم . . . . فعلت ذالک۔"[۳۱]

[اگر تم راضی ہو کہ میں ایسی کتاب تصنیف کروں جس میں ان علوم کے سلسلے میں جو بات میرے نزدیک صحیح ہے، اسے بلا مخالفوں سے مناظرہ کیے ہوئے، بیان کردوں . . . . . تو میں یہ کرسکتا ہوں۔]

شاگرد راضی ہوگیا اور پھر شیخ نے علوم فلسفیہ کا وہ شاہکار مرتب کیا جس کا نام "کتاب الشفا" ہے اور جس کی اہمیت سے متاثر ہوکر انوری نے کہا تھا؛

مرد الحکمت ہمی باید کہ دامن گیر دش
تا شفائے بوعلی خواند نہ ژاژ بحتری

شفا کے چار حصے ہیں؛ منطقیات، ریاضیات، طبیعیات اور الہیات۔ ریاضیات میں چار فن ہیں؛ ہندسہ، حساب یا ارثماطیقی، ہیئت اور موسیقی۔ ریاضیات شفا کا جزء، ارثماطیقی نیقوماخس کے "المدخل الی الارثماطیقی" کا چربہ ہے۔[۳۲] اگرچہ شیخ اس کا اعتراف نہیں کرتا۔ غالبا ثابت بن قرہ کا ملخص ترجمہ بھی اس کے سامنے نہیں تھا۔ البتہ اس موضوع پر اور فضلاء کی تصانیف شیخ کے پیش نظر تھیں مگر شیخ ان کا نام نہیں بتلاتا۔

شیخ نے ریاضیات شفا میں اپنا مستقل انداز اختیار کیا۔ نیقوماخس کی اصل کتاب اور اسی طرح ثابت بن قرہ کا ملخص ترجمہ دو مقالوں پر مشتمل ہیں۔ مگر شیخ نے ان کے مواد کو چار مقالوں میں بانٹ دیا اور پھر بعد کے مصنفین نے (مثلاً قطب الدین شیرازی نے "درۃ التاج" میں محمد بن محمود آلآملی نے "نفائس الفنون" میں اور لطف اللہ مہندس نے "رسالہ خواص الاعداد" میں اسی جدت کا اتباع کیا۔

جہاں تک عہد اسلام کا تعلق ہے "علم الاعداد (ارثماطیقی) کی ترقی میں شیخ کا "ارثماطیقی شفا" سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے دوسرا سنگ میل قطب الدین شیرازی کا "درۃ التاج لغرۃ الدباج"[۳۴] ہے جو متداول علوم حکمیہ کا ایک مخزن العلوم (Encyclopaedia) ہے۔ (اگرچہ خاتمہ میں دوسرے علوم سے بھی تعرض کیا گیا ہے۔ اس کا چوتھا حصہ (جملہ چہارم) ریاضیات پر ہے۔ اس میں چار فن ہیں۔ فن سوم ارثماطیقی پر ہے جیسے شیخ کی طرح قطب الدین شیرازی نے بھی چار مقالوں میں تقسیم کیا ہے۔ شیخ نے ان مقالوں کے عنوان تجویز نہیں کیے تھے۔ علامہ نے ان کے عنوانات بھی مقرر کیے ہیں۔

مقالہ اول: درخواص اعداد از روئے کہ در نفس خویش کم اند۔

مقالہ دوم: درخواص اعداد از جہت نسب

مقالہ سوم: درخواص اعداد از جہت تشکیل باشکال اور

مقالہ چہارم: دراقسام مناسبات وخواص سربکے۔

'درۃ التاج' کے بعد اور بھی مخزن العلوم مرتب کیے گئے اور ان میں 'ارثماطیقی" کے لیے کتاب کا ایک حصہ بھی وقف کیا گیا۔ بعد کے زمانے میں اس موضوع پر سب سے اہم تصنیف محمد بن محمود آلآملی کی "نفائس الفنون" ہے۔

اس سلسلہ تصنیف کا خاتمہ لطف اللہ مہندس نے کیا' جو استاد احمد معمار کے منجھلے صاحبزادے اور مولانا امام الدین ریاضی مصنف "التصریح فی الهیئۃ" کے برادر بزرگوار تھے۔ انھوں نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ بعنوان "خواص الاعداد" لکھا' جس کا واحد مخطوطہ برٹش میوزیم لائبریری میں ہے (نمبر 16,744)۔[۳۶]

علم الاعداد ہی کے مباحث میں سے "جمع سلاسل" Summation of Series) کا مبحث ہے، چنانچہ شیخ نے شفا کے جزء "ارثماطیقی" میں اعداد طبیعی (Natural Numbers) کے مجموعہ کے بارے میں یہ ضابطہ (Formula) لکھا ہے:

انا اذا زدنا علی مبلغ العدد الاخیر المبتدی من الواحد واحداً وضربناہ فی نصف عدد المراتب، کان الحاصل مساویا لجملۃ الجمع

[جب ہم ۱ سے شروع کر کے آخری عدد پر ۱ بڑھائیں اور اسے (حاصل جمع کو) اعداد کی تعداد کے نصف میں ضرب دیں تو حاصل ضرب (اس سلسلہ اعداد طبعی کے) جملہ اعداد کے مجموعہ کے برابر ہوگا۔]

[$\sum_{n=1}^{n=n} = (n+1)\times\frac{n}{2}$ or $1+2+3+4 \ldots n = (n+1)\times\frac{n}{2}$]

ومثالہ لیکن آخر المراتب اربعۃ۔ فانک اذا زدت علی الاربعۃ واحداً فکان خمسۃ۔ فضربتہ فی نصف عدد المراتب الذی ہو اربعۃ ونصفہ اثنان، بلغ عشرۃ ہو مجموع ما بین الواحد الی الاربعۃ"[۳۵]

[اور اس کی مثال کے لیے فرض کیا کہ آخری عدد ۴ ہے جب تم (اس) ۴ پر ۱ کا اضافہ کرو تو ۵ ہوگا۔ پھر اسے اعداد کی تعداد کے آدھے یعنی ۴ کے آدھے ۲ میں ضرب کرو تو نتیجہ ۱۰ ہوگا اور یہ ۱ سے ۴ تک کے اعداد کا مجموعہ ہے۔

[$\sum_{n=1}^{n=4} = (4+1)\times\frac{4}{2} = 5\times\frac{4}{2} = 10$, or $1+2+3+4 = (4+1)\times\frac{4}{2} = 10$]

اسی طرح قطب الدین شیرازی نے "درۃ التاج" میں لکھا ہے "وازخواص افراد متتالیہ آن ست کہ مجموع آن از واحد ابداً مربع بود' چنانکہ مجموع یک وسہ چہار است ومجموع ۱، ۳، ۵ نہ' ومجموع ۱، ۳، ۵، ۷ شانزدہ۔"[۳۶]

[افراد متتالیہ (Consecutive Odds) کی ایک خاصیت یہ ہے کہ ان کا مجموعہ ہمیشہ مربع ہوتا ہے

جیسا کہ ایک اور تین کا مجموعہ ۴ ہے اور ۱، ۳، ۵ کا مجموعہ نو اور ۱، ۳، ۵، ۷ کا مجموعہ ۱۶]

علم الاعداد پر مستقل متون مرتب کرنے والوں کے علاوہ جن افاضل نے علم الحساب کی عمومی تصانیف لکھی ہیں، انھوں نے بھی اکثر اس مبحث (جمع سلاسل) سے تعرض کیا ہے۔ ان میں سب سے اہم غیاث الدین جمشید کاشی ہیں۔ انھوں نے "مفتاح الحساب" کے باب سوم میں "استخراج مجہولات" کی تسہیل کے لیے کوئی پچاس "قاعدے" Formulas دیے ہیں۔ جمع سلاسل کے بارے میں حسب ذیل چار قاعدے اہم ہیں:

القاعدۃ الثالثۃ: اذا اردنا ان نجمع الاعداد المتوالیہ من الواحد الی ای عدد شئنا بالنظم الطبیعی، نزید الواحد علی العدد الاخیر ولنضرب المجموع فی نصف العدد الاخیر او نضرب العدد الاخیر فی نصف ذلک المجموع ۳۷

[تیسرا قاعدہ: جب ہم چاہیں کہ ا سے لے کر کسی بھی عدد تک اعداد طبعی (Natural Numbers) کو جمع کریں تو آخری عدد پر ا بڑھائیں اور مجموعہ کو آخری عدد کے نصف میں یا آخری عدد کو اس مجموعہ کے نصف میں ضرب دیں

القاعدہ الثانیہ عشر: اذا اردنا جمع مربعات الاعداد المتوالیہ من الواحد الی کم شئنا، نزید واحدا علی ضعف العدد الاخیر ولنضرب ثلث المجموع فی مجموع تلک الاعداد "

[بارھواں قاعدہ: اگر ا سے لے کر جس عدد تک چاہیں اعداد متوالیہ (Consecutive Numbers) کے مربعوں کو جمع کرنا چاہیں تو آخری عدد کے دگنے پر ا بڑھائیں۔ اور مجموع کے تہائی کو ان اعداد کے مجموعہ کے آدھے میں ضرب دیں۔ $\sum_{n=1}^{n} n^2 = \frac{(2n+1)}{3} \cdot \frac{n(n+1)}{2}$

القاعدۃ الثالث عشر: اذا اردنا ان نجمع مکعبات الاعداد المتوالیۃ من الواحد الی کم شئنا نضرب مجموع تلک الاعداد فی نفسہ، تحصل المطلوب"

[تیرھواں قاعدہ: جب ہم اعداد متوالیہ کے مکعبوں کو ایک سے لے کر کسی بھی عدد تک جمع کرنا چاہیں تو ان اعداد کے مجموعہ کو خود اسی میں ضرب دیں مطلوب حاصل ہوگا۔ $\sum_{n=1}^{n} n^3 = \left[\frac{n(n+1)}{2}\right]^2$

القاعدۃ الرابعۃ عشر: اذا اردنا جمع اموال الاموال للاعداد المتوالیہ من الواحد، ننقص من مجموع تلک الاعداد واحداً ونأخذ خمس الباقی دائما ونزیدہ علی مجموع تلک الاعداد بلغ لنضربہ فی مجموع مربعات تلک الاعداد، یحصل المطلوب"

[چودھواں قاعدہ: جب ہم ا سے لے کر جس عدد تک چاہیں اعداد متوالیہ کی چوتھی قوتوں کو جمع کرنا چاہیں تو ان اعداد کے مجموعہ میں سے ا گھٹائیں اور باقی کا پانچواں حصہ لیں اور پھر اسے ان اعداد کے مجموعہ پر بڑھا دیں۔ حاصل جمع کو ان اعداد کے مربعوں کے مجموعہ میں ضرب دیں۔ مطلوب حاصل ہوگا۔

$$\sum_{n=1}^{n} n^4 = \left\{\frac{n(n+1)}{2} + \frac{\frac{n(n+1)}{2} - 1}{5}\right\} \times \frac{2n+1}{3} \times \frac{n(n+1)}{2}$$

مولانا جمشید کاشی نے اعداد متحابہ (Amicable Numbers) نیز اعداد تام و ناقص و زائد (کے استخراج کے بھی قواعد بیان کیے ہیں۔ (قاعدہ چہل و نہم و قاعدہ پنجاہم) مگر اس کی تفصیل ان کے پیش روں کے ساتھ ان کی دریافت کے تقابلی مطالعہ کا تقاضہ کرتی ہے، جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ لہذا یہ تفصیل کسی اور موقع پر۔

عہد حاضر میں علم خواص الاعداد ـ (Theory of Numbers) کا ایک اہم مبحث وہ ہے، جس کا عنوان ہے Firmat's Last Theorem

اور جس کا کہنا ہے کہ $X^n + Y^n \neq Z^n$ ـ جہاں X، Y، Z مثبت اعداد صحیح ہیں اور n کوئی بھی عدد مگر ۲ سے بڑا)

اس کا جزو یا نقطۂ آغاز $X^3 + Y^3 \neq Z^3$ ہے یعنی ایسے دو مثبت صحیح عدد نہیں مل سکتے جن کے مکعبوں کا مجموعہ خود مکعب ہو ـ یہ جزو تو شیخ بہاء الدین عاملی (وفات ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء) کی "خلاصۃ الحساب" کے خاتمہ میں ملتا ہے۔

عدد مکعب مُنقسم بقسمین مکعبین

[ایک مکعب عدد دو ایسے حصوں میں بانٹا جائے کہ ہر حصہ بجائے خود مکعب ہو]

"A cubic number is to be divided into two Parts, each part being a Cube" is unsolvable

غالباً یہ خود شیخ بہاء الدین عاملی کی اپنی دریافت نہیں ہے اور یقیناً انہوں نے اس باب میں کسی یورپین ریاضی داں کی تصنیف سے بھی استفادہ نہیں کیا۔ لہٰذا ظن غالب یہ ہے کہ انھوں نے یہ مسئلہ کسی سابق مسلمان ریاضی داں کی تصنیف سے اخذ کیا ہے۔

مگر کس سے ؟

اس سوال کا جواب کم ازکم اس ہیچمیرز و ہیچمدان کے لیے تکلیف مالا یطاق سے کم نہیں ہے، وہ جو کہتے ہیں ملاّ کی دوڑ مسجد تک اس کی رسائی صرف مولانا آزاد لائبریری تک ہے جو ہر چند کہ دنیا کے اہم علمی ذخائر میں سے ہے مگر پھر میری بدنصیبی و بدقسمتی کہ یہاں جمشید کاشی کی "مفتاح الحساب" قوشجی کے "رسالہ محمدیہ" اور بہاء الدین عاملی کے "خلاصۃ الحساب" کے علاوہ قدماء تو درکنار متاخرین کی بھی اس موضوع پر تصانیف کا فقدان ہے۔ کاش مادر درسگاہ کے ارباب حل و عقد اس کمی و کوتاہی اور اس کے مضر اثرات کا صحیح اندازہ لگا سکیں اور اس کی تلافی کی جانب توجہ دیں، تاکہ یہاں کے طالب علم بھی اپنے اسلاف کے علمی کارناموں کو منظر عام پر لاکر سائنس کی تاریخ میں ان کا صحیح مقام جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں، انھیں دلا سکیں۔ مجھے امید واثق ہے کہ بقولے "صاحب البیت ادری بما فی البیت" (گھر والا بہتر جانتا ہے کہ گھر میں کیا ہے) اس طرح جو علمی و ملکی تحقیقات معرض وجود میں آئیں گی، وہ اغیار کی تحقیقات انیقہ سے فائق تر ہی ہوں گی

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید
دگیراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

کیا ارباب حل و عقد سے توقع رکھیں کہ

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

ویسے

بہ کریماں کارہا دشوار نیست

تعلیقات و مراجع

1- Heath, Sir Thomas: History of Greek Mathematics. (Oxford, 1921) vol. I. 266

2. Weber, Alfred: History of Philosophy (Charles Scribner's Sons. N. York) P. 8

3 Ibid, P. 9.

4 Thilly, Frank: (History of Philosophy Central Book Depot, Allahabad, P.P. 15-16.

(5) Weber: History of Philosophy. P. 10

(6) Ibid. P. 22.

(7) Ibid, P. 23

(8) Ibid. P. 23

(9) Heath, History of Greek Mathematics, vol I. P. 98.

(10) Ibid. P. 65

(11) Ibid. P. 97.

۱۲- ابن الندیم محمد ابن اسحاق، کتاب الفہرست (فلوگل ایڈیشن لیپزنگ ۱۸۷۲ء ۲۶۹-

13 Heath: History of Greek Mathematics, vol. I. P. 95

14. Ibid. P. 99.

۱۵- ابن الندیم - الفہرست، صفحہ ۲۵۶

(۱۶) المسعودی، ابوالحسن علی بن حسین بن علی: مروج الذہب و معادن الجوہر (پیرس ۱۸۶۱ء) جلد ہفتم ص ۲۸-

۱۷ ابن الندیم: الفہرست ص ۲۵۵ - ۲۵۶

۱۸ ابن القفطی، جمال الدین ابوالحسن علی بن یوسف: تاریخ الحکماء

(مختصر کتاب اخبار العلما باخبار الحکما ولیپزگ ۱۹۰۳ء ص ۱۱٦
(۱۹) ایضاً۔ ص ۱۱۷
(۲۰) الیعقوبی : احمد بن ابی یعقوب بن جعفر بن وھب، ابن واضح: تاریخ الیعقوبی (بیروت ۱۳۷۹ھ/ ۱۹٦۰ء) جلد اول. صفحات ۱۲۳ وما بعد
(۲۱) ابن الندیم: الفہرست ص ۲۸۳
(۲۲) ایضاً ص ۲۸۴
(۲۳) ایضاً ص ۲۸۲
(۲۴) ایضاً ص ۲۸۲
(۲۵) التوحیدی، ابو حیان، کتاب الامتاع والمؤانسہ (لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر۔ الطبعۃ الثانیہ) الجزء الاول ص ۱۲۷- ۱۲۸
۲٦۔ اخوان الصفا : رسائل اخوان الصفا وخلان الوفا المجلد الاوّل (بیروت ۱۳۷٦ھ) ص ۴۷
۲۷ ایضاً ص ۵۵
۲۸ الخوارزمی : ابو عبداللہ محمد بن احمد بن یوسف، الکاتب : کتاب مفاتیح العلوم (برل ۱۹٦۸ء مرتبہ فان فلوٹین) ص ۱۹۵
۲۹ ایضاً ص ۱۴۴
۳۰ بیہقی، ظہیر الدین ابو الحسن علی بن القاسم زید: تتمہ صوان الحکمۃ (لاہور۔ ۱۹۵۱ء) ص ۴۰۔
۳۱۔ ایضاً ص ۴٦
۳۲۔ ابن سینا، شیخ ابو علی حسین بن عبداللہ : ریاضیات شفا (مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، سبحان اللہ کلکشن ضمیمہ فلکیات عربی ۲۰/۱۴ ورق ۵۹،
۳۳۔ شیرازی، علامہ قطب الدین مسعود بن محمود بن مصلح : درۃ التاج لغرۃ الدباج (تہران ۱۳۲۴ ش بخش دوم۔ ص ۹۔
۳۴ Rieu, Charles, Catalogue of Persian Manuscripts in British Museum Library, vol. II. P 451
۳۵ ابن سینا : ریاضیات شفا
۳٦ قطب الدین شیرازی : درۃ التاج
۳۷۔ الکاشی، غیاث الدین جمشید : مفتاح الحساب (مطبوعہ دمشق ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء) ص ۴۳۵
۳۸ ایضاً ص ۴۵۲
۳۹ ایضاً ص ۴۵۵
۴۰۔ ایضاً ص ۴۵۷
۴۱۔ العاملی، شیخ بہاء الدین: خلاصۃ الحساب (مطبع العلوی لکھنؤ ۱۲۹٦ھ ص ۴۱۔

"بے شک زمین و آسمان کی تخلیق اور رات دنوں کے اختلاف میں عقل مندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ وہ جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں کھڑے، بیٹھے اور لیٹے اور غور و فکر کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں (تو پکار اٹھتے ہیں کہ) اے ہمارے پروردگار! تم نے یہ سب بیکار نہیں پیدا کیا۔"

[آل عمران ۱۹۰- ۱۹۱]

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ۔ ج ۷، ش ۸ (اگست ۸۸ء)

اخلاط اور اخلاق

ابو وارث جہینی

ابوالطب بقراط کا قول ہے،

" اخلاط کا اثر اخلاق پر پڑتا ہے "

نظریہ اخلاط کا بانی بقراط ہے، جس نے اعمال نفسانیہ اور عوارض بدنی کا سبب اخلاط کو قرار دیا۔ چنانچہ اس کا مشاہدہ روزمرہ کی زندگی میں خوب ہوتا رہتا ہے کہ دموی المزاج اور صفراوی المزاج شخص کے اندر غصہ بہت جلد آتا ہے، بہ نسبت بلغمی المزاج شخص کے۔ اور سوداوی المزاج شخص میں غم اور وہم کثرت سے دیکھنے میں آتا ہے مثلاً مالیخولیا کے مریضوں میں۔ اب ہم اخلاط کے بارے میں بقراط کے نظریے کو سامنے رکھتے ہوئے پہلے اخلاط پر بحث کریں گے تاکہ اخلاط کا مفہوم واضح ہو جائے جس سے کہ اخلاط اور اخلاق کا تعلق سمجھنے میں مدد مل سکے۔

کائنات عالم میں مادے کی تین شکلیں پائی جاتی ہیں ؛

۱۔ جامد (SOLID)

۲۔ سیال (LIQUID)

۳۔ ہوائی یا ارواح (GAS)

ان ہی تینوں طرح کے مادوں سے مل کر بدن انسان نے بھی ترکیب پائی ہے۔ چنانچہ بقراط مادہ کی ان تینوں شکلوں کے اعتبار سے بدن انسان کو بھی ان ہی تین جنسوں (جامد، سیال اور ارواح) پر مشتمل قرار دیتا ہے اور اسی جزء سیال کو اخلاط کہا ہے، جس کو جان ٹیلر اسکاٹ لینڈی نے اپنی کتاب انیس المشرحین میں اس طرح بیان کیا ہے،

قال ھذا البقراط ان البدن الانسانی

ھو المرکب من الاشیاء الجامدۃ والسائلۃ والارواح والاجزاء المحیطۃ والمحاطۃ "

(انیس المشرحین عنوان الکتاب ۔ ص ب)

[بقراط کا قول ہے۔ کہ بدن انسان ایسی چیزوں سے مرکب ہے جو جامد ہیں، جو سیال ہیں اور جو ارواح کی طرح ہوائی ہیں اور ایسے اجزاء سے مرکب ہیں جو گھیرے ہوئے اور گھرے ہوئے ہیں]

دوسری جگہ مولف انیس المشرحین بقراط کا دوسرا قول اس طرح نقل کرتے ہیں کہ جس کی کڑی پہلے قول سے جڑی ہوئی ہے۔

والیضا قسم الرطوبات الاصلیۃ الی اربعۃ اقسام الدم، الصفراء والبلغم والسوداء "

[نیز بقراط نے رطوبات اصلیہ کو چار قسموں، خون، صفرا بلغم اور سودا میں تقسیم کیا ہے]

رطوبات اصلیہ اور خلط دونوں مترادف اصطلاحات ہیں اور دونوں کے مصداق خون، صفرا، بلغم اور سودا ہیں۔ اس میں لفظی اختلاف کی اصلی وجہ یہ ہے کہ رطوبات اصلیہ اور اخلاط دونوں عربی الفاظ ہیں اور نظریہ اخلاط کے بانی بقراط کی تالیفات یونانی زبان میں تھیں۔ اس نے اس مدعا کے لیے جو یونانی لفظ استعمال کیا تھا اس کا ترجمہ بعض مترجمین نے رطوبات اور بعض نے اخلاط کیا ہے۔ اس لیے یہ دونوں اصطلاحات ہم معنیٰ سمجھے جاتے ہیں۔

ایم۔ ڈی اسکالر (کلیات)، ڈپارٹمنٹ آف کلیات۔ اجمل خاں طبیہ کالج۔ اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ۔

نظریۂ اخلاط کا بانی ابو الطب بقراط ہے۔ کیوں کہ اُس نے ہی دنیا کو سب سے پہلے اس خیال سے روشناس کرایا اور صحت و مرض کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کیا کہ

"بدن کے اندر چار طرح کی رطوبتیں پائی جاتی ہیں۔ جب تک یہ چاروں بلحاظ کمیت و کیفیت یعنی بلحاظ مقدار و نوعیت ٹھیک ہوتی ہیں تو صحت حاصل رہتی ہے، اور جب کسی اندرونی یا بیرونی سبب سے ان کی کمیت یا کیفیت میں کسی قسم کی خرابی لاحق ہوتی ہے تو مرض پیدا ہوتا ہے۔"

شیخ الرئیس بو علی سینا نے اخلاط کی دو قسمیں بیان کی ہیں؛

۱۔ خلط محمود

۲۔ خلط ردی

خلط محمود وہ ہے جو تنہا یا دوسری چیزوں کے ساتھ مل کر غذا پانے والے عضو کا جزء بن جائے اور اس عضو کے بالکل مشابہ اور ایک ذات ہو جائے۔ اور

خلط ردی وہ ہے جس میں جزوِ بدن بننے کی استعداد نہ ہو اور جس کو طبیعت بدن سے خود ہی خارج کر دے۔

اطباء نے اخلاط کو لطیف اور کثیف دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔

اخلاط لطیف وہ ہیں جو روح (OXYGEN) کے ساتھ احتراق (OXIDISE) پذیر ہو کر بدن میں توانائی پیدا کریں، جن سے قوائے بدنیہ کو طاقت حاصل ہوتی رہے اور جن سے متعدد افعال نفسانی اور بدنی انجام پاتے رہیں۔ اخلاط کثیف وہ مادی اجزا ہیں جو جسم کے تحلیل شدہ حصہ کا بدل ما یتحلل مہیا کرتے ہیں اور جزو بدن بنتے ہیں۔

اطباء نے اخلاط کی تقسیم ان کے طبعی اور غیر طبعی ہونے کے اعتبار سے بھی کی ہے۔

بحالت صحت بدن میں استحالات (Metabolism) کے نتیجے میں اخلاط اور ان کے اجزاء کیمیاویہ ایک مخصوص مقدار میں پیدا ہوتے رہتے ہیں اور اخلاط کی یہی مقدار اس مخصوص جسم انسانی طبعی ہوتی ہے۔ طبعی اخلاط کی مقدار ہر فرد واحد کے لیے الگ الگ ہے اور اگر اسی خلط کی طبعی مقدار میں کمی یا زیادتی ہو جائے تو خو[...] ہو جائے گا اور اس سے جو نفسانی اور بدنی عوارضات ظاہر ہو[ں گے] وہ مزاج انسانی پر بھی اثر انداز ہوں گے جس کے نتیجے میں سوءِ م[زاج] پیدا ہوگا۔

ابو سہل مسیحی نے جملہ رطوبات بدن یعنی اخلاط کو ان کے مقامات کے اعتبار سے تین قسموں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ رطوبت عروق

۲۔ رطوبت تجاویف

۳۔ رطوبت اسطقسیہ

رطوبت عروق یہ وہ اخلاط ہیں جو عروق دمویہ یا لمفاویہ [کے] اندر بہتے ہیں جنھیں خون یا رطوبت لمفاویہ بھی کہتے ہیں۔ رطوبت تجاو[یف] وہ اخلاط ہیں جو کہ تجاویف بین الاعضاء (Intercellular Spaces) میں بہتے ہیں۔ انھیں رطوبت انسجہ (Tissue Fluid) بھی کہتے ہیں۔ اور رطوبت اسطقسیہ وہ اخلاط کی قسم ہے جو کہ خلیات کے اندر پائے جاتے ہیں۔ اس کو رطوبت جوہریہ یا عنصریہ (Cytoplasm) کہتے ہیں اور اسی رطوبت کے صحیح توازن و[...] پر اعضاء مفردہ کے مزاج کا انحصار ہوتا ہے۔

ابو سہل مسیحی کے رطوبات بدن کی یہ تقسیم آج کی جدید سائ[نس] کی روشنی میں بھی تحقیق شدہ ہے جو کہ تمام قسم کی بدنی رطوبات کا ا[حاطہ] کر لیتی ہے۔

رطوبت عروق اور رطوبت تجاویف سے بدن کا داخلی ماح[ول] بنتا ہے اور ان رطوبات کی کمیت یا کیفیت میں تبدیلی اور ان کے اجز[اء] میں اختلال سوءِ مزاج بدنی کا سبب ہوتا ہے۔

غلبہ اخلاط کا اثر مکمل طور پر مزاج پر پڑتا ہے اور اس لحا[ظ] سے انسان کی پوری شخصیت بدل جاتی ہے۔ چنانچہ غلبۂ اخلاط کے لحا[ظ] سے مزاج انسانی کو مندرجہ ذیل چار قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ دموی المزاج

٢. صفراوی المزاج۔

٣. بلغمی المزاج۔

٤. سوداوی المزاج۔

بقراط نے امراض کا سبب اخلاط کو قرار دیا اور بتایا کہ جب اخلاط اپنی طبعی حالت پر ہوگا تو صحت قائم رہے گی اور مزاج بھی اعتدال پر رہے گا جس سے انسان حسنِ اخلاق کا مظاہرہ کرے گا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ اخلاق (اعمال نفسانیہ) کے ساتھ مزاج اور اخلاط کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کیوں کہ اخلاط کے اندر تبدیلی مزاج کے اندر تبدیلی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جس کا اظہار نفسانی اور بدنی عوارضات کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

اخلاط کے غیر طبعی ہونے کی صورت میں مذکورہ ذیل ٢ قسم کے عوارض خاص پیدا ہوتے ہیں۔ ایک قسم کے عوارض کا تعلق نفس سے ہے اور دوسرے عوارض کا تعلق بدن سے ہے۔

١. نفسانی عوارض تو یہ ہے کہ ایسے شخص کے اخلاق میں بگاڑ بتدریج بڑھتا جاتا ہے۔ کیونکہ ایسے شخص کے اخلاط میں سوءِ مزاج پیدا ہوجانے کے سبب اخلاق وعادات و اطوار میں خرابی پیدا ہوجاتی ہے۔ جس طرح سوءِ مزاج سے اخلاق میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے اسی طرح برے اخلاق سے بھی سوءِ مزاج پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ غصہ بدن میں غیر معمولی حرارت پیدا کرتا ہے اور غم حدِ اعتدال سے زیادہ خشکی پیدا کرتا ہے اور کند ذہنی محرکہ و مدرکہ قوئ نفسانیہ میں سستی پیدا کر کے مزاج کو بلغمی بنا دیتی ہے۔ غرض کہ اخلاق کی تعدیل و درستگی میں نفس بدن کی صحت مضمر ہے۔

٢. اخلاط غیر طبعی کی صورت میں عوارضات بدنی یہ ہیں کہ اس کے اندر سوءِ مزاج مادی پیدا ہو جاتا ہے۔ جس میں مادہ مرض اعضا کی ساخت اور ریشوں میں اس طرح پیوست ہو جاتے ہیں کہ جب تک ان مواد میں نضج کے ذریعے استفراغ نہ کیا جائے یا مزید دوسری تدابیر اختیار نہ کی جائیں صحت حاصل نہیں ہوتی۔

چونکہ زیر نظر مضمون کا موضوع "اخلاط اور اخلاق" ہے، لہٰذا اب ہم اخلاط کے غلبہ یا غیر طبعی ہونے کی صورت میں عوارض بدنی کو نظر انداز کرتے ہوئے عوارض نفسانیہ پر بحث کریں گے۔

شیخ الرئیس بو علی سینا نے تمام نفسانی حالات، خوشی اور غم، فکر و فرحت اور دوسرے مختلف احساسات کا تعلق قلب کی ساخت خون کے اقسام اور روح کے مزاج کو قرار دیا ہے۔ شیخ کا یہ خیال ہے کہ انسان کے نفسانی صفات مثلاً کینہ، حسد، بہادری، بزدلی، بخل وغیرہ کا خوشی و غم، فکر و غضب پر طبی تدابیر کے ذریعے قابو پایا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ یہ اعمال نفسانیہ روح قلبی کے مخصوص تاثرات اور انفعالات ہیں لیکن مختلف افراد اور اشخاص میں یہ تاثرات و انفعالات شدت اور ضعف کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں جس کا سبب روح قلبی کی استعداد ہے۔ ہر شخص میں ان تاثرات کی قوت موجود ہے لیکن بعض اشخاص میں کسی تاثر کو قبول کرنے کی زیادہ استعداد ہوتی ہے اور بعض میں کم ہوتی ہے۔ پھر آگے شیخ قوت اور استعداد میں ایک لطیف فرق بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک انسان میں دو ضدوں مثلاً رونے اور ہنسنے کی قوت یکساں ہوتی ہے لیکن ان دونوں ضدوں کی استعداد ایک سی نہیں ہو سکتی کیونکہ ہر انسان میں خوشی اور رنج دونوں کی قوت برابر موجود ہے لیکن دونوں کی استعداد برابر نہیں۔ کسی انسان میں غم کی اور کسی انسان میں خوشی کی استعداد زیادہ ہوتی ہے۔ روح میں خوش رہنے اور غمگین ہونے کی صلاحیت کا موجود رہنا اور بات ہے۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کی استعداد رکھنا دوسری بات ہے۔ غرض کہ شیخ نے تمام کیفیات نفسانیہ کا دار و مدار روح کی صفات کو قرار دیا ہے اور روح کی صفات کا دار و مدار ان مواد پر ہے جن سے روح پیدا ہوتی ہے اور وہ چار اخلاط خون، صفرا، بلغم، سودا، اور کیفیات مزاجی یعنی اعتدال سے زیادہ حرارت برودت، رطوبت و یبوست ہیں۔

شیخ الرئیس نے قوئ نفسانیہ کا تعلق اولاً روح کے ساتھ خاص فرمایا اور روح کو لطیف اخلاط اور ان کی بخاریت سے پیدا فرمایا۔ اس طرح روح قوئ نفسانیہ کی سواری قرار دی جس کے ذریعے وہ قوتیں بدن کے تمام اعضاء میں سرایت کرتی ہیں۔

روح کی نسبت اخلاط کے لطیف اجزاء کے ساتھ ایسی ہے جیسے بدن کی نسبت اخلاط کے کثیف اجزاء کے ساتھ۔ روح کی تولید

اخلاط کے لطیف حصے سے اس وجہ سے ہوتی ہے کہ اخلاط کے ان چاروں حصوں (خون، صفرا، بلغم، سودا) کا باہمی امتزاج ایک ایسی صورت مزاجیہ تک پہنچانے کا باعث ہوجاتا ہے جس کے ذریعے سے روح ان قوائے نفسانیہ کو قبول کرنے کے قابل ہوجاتی ہے جو بسائط سے حاصل نہیں ہوتے۔

روح کے متعلق شیخ فرماتے ہیں کہ روح ایک ایسی چیز ہے جو عناصر سے پیدا ہوتی ہے اور اجسام سماویہ (آسمانی چیزیں) کے مشابہت کی جانب مائل ہوتی ہے۔ اس وجہ سے یہ حکم لگایا جاتا ہے کہ روح ایک نورانی جوہر ہے۔ کیوں کہ نفس جب روشنی کو دیکھتا ہے تو خوش ہوتا ہے اور اندھیرے میں اس کو وحشت ہوتی ہے۔ کیونکہ روشنی روح کے مناسب ہے اور اندھیرا اس کی ضد ہے۔ آگے شیخ مختلف اعمال نفسانیہ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ روح قلبی کی مقدار اگر زیادہ ہو اور جس مادے سے وہ پیدا ہوئی ہے وہ بھی زیادہ ہو اور مزاج اور قوام میں معتدل ہو اور اس کی نورانیت غالب آچکی ہو تو ایسی صورت میں فرحت کی زیادہ استعداد پائی جائے گی لیکن اگر اس کی مقدار قلیل ہو اور اس کا مادہ بھی قلیل ہو جیساکہ کمزور اور بوڑھوں میں ہوتا ہے اور اس کا مزاج بھی غیر معتدل ہو جیساکہ بیماروں میں ہوتا ہے اور قوام بہت کثیف اور غلیظ ہو جیسا کہ سوداوی المزاج اور بوڑھے لوگوں میں ہوتا ہے تو ایسی روح اپنی کثافت کی وجہ سے منبسط (پھیلی ہوئی) نہیں ہوگی۔ یا بہت زیادہ رقیق القوام ہو جیساکہ لاغروں، کمزوروں اور عورتوں میں ہوتا ہے۔ یہ روح بھی انبساط کے لیے کافی نہیں ہوگی یا روح میں نورانیت کے بجائے ظلمت ہو جیساکہ سوداوی المزاج لوگوں میں ہوتا ہے تو اس قسم کی روح میں غم شدید کی استعداد پائی جائے گی۔

خلط دم کے اثرات اخلاق (اعمال نفسانیہ) پر۔

جب خون جسم انسانی کے اندر وافر مقدار میں صاف وشفاف اور باعتبار قوام معتدل ہوتا ہے تو ایسا خون روح میں نورانیت پیدا کرتا ہے جس سے روح میں فرحت اور خوشی کی استعداد پیدا ہوتی ہے اور جب صاف ستھرے خون میں حدت اور گرمی زیادہ ہوتی ہے تو وہ بکثرت مشتعل ہونے اور جلد حرکت میں آنے کی وجہ سے غصہ اور غضب زیادہ پیدا کرتا ہے اور جو خون رقیق القوام، بارد اور صاف ستھرا ہوتا ہے وہ ضعف قلب اور بزدلی کی استعداد پیدا کرتا ہے۔ کیوں کہ اس خون میں پیدا ہونے والی برودت باہر کی طرف روح کو حرکت کرنے سے باز رکھتی ہے جس سے روح کم تحلیل ہوتی ہے اور اس میں اشتعال کم ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے فرحت وغضب بھی کم ہوجاتا ہے اور جو کثیف اور مکدّر خون میں حرارت زیادہ ہوتی ہے وہ روح دیرپا اور مستحکم غم وغصہ کی استعداد پیدا کرتا ہے۔ غم پیدا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے خون سے غیر مصفیٰ اور مکدر روح پیدا ہوتی ہے اور غصہ اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کی روح اپنی حرارت کی وجہ سے جلد مشتعل ہو اٹھتی ہے اور غصہ دیر تک رہنے کی وجہ یہ ہوتی کہ کثیف اور مکدّر روح میں جو گرمی پیدا ہوتی ہے وہ جلدی ٹھنڈی نہیں ہوتی جس سے غصہ دیر تک قایم رہتا ہے۔

خلط صفراء کے اثرات اخلاق پر

خلط صفرا کا خون میں جب غلبہ ہوتا ہے تو غصہ بہت جلد آتا ہے اور جلد ہی ختم ہوجاتا ہے۔ کیوں کہ اس طرح کے خون سے جو روح پیدا ہوتی ہے اس میں حرارت شدید ہوتی ہے اور جب یہ روح صاف اور نورانی بھی ہو تو بہت زیادہ فرحت وانبساط پیدا کرے گی اور جس شخص کا خون غلیظ اور غیر مکدر ہو اور اس کی حرارت بھی زیادہ ہو تو وہ شخص زیادہ غمگین نہیں ہوتا بلکہ قوی القلب، جری اور بہادر ہوتا ہے اور اس میں غصہ کم ہوتا ہے۔ کیونکہ فرحت غصہ کو توڑ دیتی ہے اور جب روح میں ظلمت زیادہ ہوتی ہے، ایسے آدمی میں خوف و ہراس بہت کم پیدا ہوتا ہے اور جس شخص کا خون غلیظ اور غیر مکدّر مائل بشدّت برودت ہو تو ایسا شخص نہ غمگین ہوتا ہے نہ مسرور اور نہ شدید الغضب اس کی بزدلی ایک حد تک رہتی ہے اور وہ کم سخن ہوتا ہے اور جس شخص کا خون گاڑھا مکدّر اور برودت کے لحاظ سے زائد ہو تو وہ شخص زیادہ متوحش اور غمگین رہتا ہے اور اسے بغیر کسی اہم سبب کے غصہ نہیں آتا اور جب غصہ آتا ہے تو اس کا غصہ دیرپا رہتا ہے۔ اس کے غصے کی مدت محرور المزاج (گرم مزاج) والے کے غصے سے نسبتاً کم زمانہ اور رقیق القوام والے کے غصے سے زیادہ زمانہ تک قایم رہتا ہے اور شخص [illegible]

خلط بلغم کے اثرات اخلاق پر

بلغمی المزاج لوگوں میں مزاجی کیفیتیں مختلف ملا کرتی ہیں کیونکہ مختلف قسم کے بلغم کا مزاج مختلف ہوتا ہے اسی وجہ سے اطباء میں اس کے مزاج کے متعلق اختلاف ہے۔ کسی نے اس کے مزاج کو حار رطب بتایا کسی نے بارد رطب بتایا ہے۔ جن لوگوں کے بدن میں بلغم زیادہ ہوتا ہے وہ خواب میں پانی، نہریں، بارش اور گرج کے ساتھ اولے پڑتے دیکھتے ہیں۔ اگر بدن میں شور قسم کے بلغم کا غلبہ ہوگا تو ایسے لوگوں کے اخلاق میں ترشی اور روکھا پن کا غلبہ ہوگا۔ وہ بات بات میں چڑچڑے پن کا مظاہرہ کریں گے۔ جیسا کہ خصوصاً بڑھاپے میں دیکھنے میں آتا ہے اور اگر بلغم تفہ (پھیکا بلغم) کا غلبہ ہوگا تو ایسا شخص اپنے اندر سستی و کاہلی محسوس کرے گا اور اس کے اخلاق اور جذبات میں عام لوگوں جیسی شدت کا مظاہرہ نہیں ہوگا۔ اس کے برخلاف اگر بلغم حلو کا غلبہ ہوگا جس کا مزاج گرم و تر ہے تو ایسے شخص کے جذبات میں اشتعال اور شدت ملے گی۔ کیونکہ ایسے شخص کے خون میں حدت و گرمی زیادہ ہوتی ہے جس میں مہربانی اور غصہ دونوں صفات زیادہ پائی جاتی ہیں۔

خلط سودا کے اثرات اخلاق پر

سوداوی مزاج والوں میں روح کی مزاجی یبوست کی وجہ سے تخیل قوی ہوتا ہے۔ سوداء غیر طبعی یا غلبۂ سوداء کسی بھی خلط کے احتراق سے پیدا ہو سکتا ہے۔ حتیٰ کہ سوداء کے بھی احتراق سے پیدا ہوتا ہے جو کہ باعثِ تغذیہ نہ ہو کر باعث فساد ہوتا ہے اور مختلف قسم کے سوءِ مزاج سادہ اور مادی پیدا کرتا ہے۔ یہ جسم میں دو طرح کے عوارضات پیدا کرے گا۔ ایک کا تعلق نفس سے اور دوسرے کا بدن سے ہوتا ہے

خلط سوداء کے غیر طبعی ہونے کی صورت میں مریض کے خیالات فاسد ہو جاتے ہیں اس میں خوف اور بدگمانی کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے فضول اور بیہودہ حرکات کرتا ہے، عقل سے بے بہرہ ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے انسانیت کے شرف کو بھی کھو دیتا ہے۔ کبھی کبھی اس کی طبیعت میں جوش اور شورش ہوتی ہے۔ دوسرے لوگوں سے بھاگتا ہے یا غصہ میں آکر مارنے لگتا ہے۔ اس طرح کے عوارضات کا تعلق قوت نفسانیہ سے ہے جس کو مالیخولیا (Melancolia) بھی کہتے ہیں۔ مالیخولیا کا نام سبب کے نام پر رکھا گیا ہے جس کے معنی سیاہ خلط کے ہیں۔ کبھی کبھی سوداء غیر طبعی کی صورت میں مانیا (جنون و درندگی) کے عوارضات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایسا مریض درندہ صفت ہو جاتا ہے۔ جو چیز ہاتھ لگتی ہے، توڑ پھوڑ دیتا ہے۔ اخلاق میں درندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی نظر آدمیوں کی نظر جیسی نہیں ہوتی۔ اس کا مریض آدمیوں پر حملہ آور ہوتا ہے اور کبھی کبھی داء الکلب کے عوارضات ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کے مریض کے مزاج میں غصہ اور خوشامد دونوں ہوتی ہے۔ غصہ کے ساتھ مریض کی طبیعت میں کھیل کود بھی ہوتا ہے اور لوگوں کو ایذا پہنچانے کے ساتھ ساتھ مہربانی بھی۔ مالیخولیا مراقی میں ہر وقت مریض غور و خوض میں لگا رہتا ہے ہر بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے۔ بعض اوقات ایک ہی بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے۔ لوگوں کے پاس بیٹھنے اور میل جول سے نفرت ہوتی ہے اور تنہا رہنے کو دل چاہتا ہے اور کبھی کبھی مرض صبارا کے عوارضات کا ظہور ہوتا ہے جس کے معنی سوداوی جنون کے ہیں۔ یہ سخت قسم کا جنون ہوتا ہے اور کبھی کبھی مرض عشق کے جنون کے عوارضات ملتے ہیں۔

ارسطو کا قول ہے:

عشق کیا ہے محبوب کے عیوب معلوم کرنے سے
آنکھوں کا اندھا ہو جانا۔"

یہ وسوسہ اور فکر سے پیدا ہوتا ہے۔ ہمیشہ سوچتے رہنے سے بدن کا خون جل جاتا اور سوداء بن جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ایسے لوگ خواب میں ڈراؤنی چیزیں دیکھتے ہیں۔ مثلاً تاریک گڑھے، خندق اور سیاہ رنگ کی شکلیں وغیرہ وغیرہ۔

> اے گروہ جن و انس! اگر تمہیں قدرت ہو تو آسمان اور زمین کے کناروں سے نکل جاؤ، تو نکل جاؤ (اور علم کے) زور کے سوا تم نکل سکتے نہیں۔
>
> سورہ رحمٰن

لاطینی امریکا سے تعارف

سعید الظفر چغتائی

فروری ۱۹۶۳ء کے شروع میں فرانس پہنچتے ہی مجھے زبان سیکھنے کے لیے بوردو بھیج دیا گیا، جہاں غیر ملکیوں کے لیے دو ماہ کا ایک مختصر سمسٹری (سمسٹر [illegible]) درس شروع ہو رہا تھا۔ یہاں تین پاکستانیوں سے ملاقات ہوئی جن کا تعلق پاکستان ٹیلی ویژن سے، بحریہ سے اور وزارتِ اطلاعات سے تھا۔ ایک یوگوسلاوی انجینئر سے، ایک نوجوان امریکی، ایک حبشی طالب علم، پیرو کے ایک سرکاری ملازم اور تین میاں بیویوں سے جن میں سے ایک ترک، دوسرے یونانی اور تیسرے وسطی امریکا کے گوئٹے مالا والے تھے۔ چند برس پہلے اس آخر الذکر ملک کی خانہ جنگی (۱۹۵۴ء) کی آدمی تہائی خبریں برطانوی اور امریکی حوالوں سے ہندوستان میں چھپتی رہی تھیں اور ہمیں باور کرایا گیا تھا کہ خلیج میکسیکو کے ان ملکوں میں مستقل بدامنی رہتی ہے نہ یہ کہ امریکی تنظیمیں اپنے مسلح زرخرید بھیج بھیج کے صدر آربنز جیسوں کا تختہ الٹا کرتی ہیں کیونکہ وہ محب وطن ہوتے ہیں اور اپنے عوام کے پیٹ میں چھرا گھونپ کر ان کا سرمایہ ملک سے باہر نہیں منتقل کرتے۔

ان نوجوانوں کے چمکتے زردی مائل چہروں پہ نگاہ پڑتے ہی کچھ ان کے ہسپانوی اور قدیم امریکی خون کی آمیزش اور شاید اس سے بڑھ کر صدیوں پہلے کے عربی رشتوں کی طرف دل کھنچنے لگا، جنھیں بال جبریل میں علامہ اقبالؒ تازہ کر گئے ہیں ؎

پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہے حنا کی
باقی ہے ابھی رنگ مرے خونِ جگر میں

یہ غیر ملکی برادری دو مہینے تک آباد رہی، جیسے ہم ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں۔ جیسے ہم چار براعظموں سے نہ آئے ہوں، ایک ہی محلّے رہتے ہوں۔ جیسے ہم اجنبی زبانیں نہ بولتے ہوں اور ہمیں اتفاق نے دو دن کے لیے ساتھ نہ لا کھڑا کیا ہو۔ اسی برادری کی محبت نے مجھ سے ع

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن

سے شروع ہونے والی اقبال کی مسلسل غزل کا ترجمہ کرایا جو چھ برس بعد فرانس چھوڑنے تک پڑھ کر پوری بال جبریل پر حاوی ہو گیا۔ پھر جیسے آندھی گھونسلے کے سارے تنکے تتر بتر کر دے، ہم بھی اڑ اڑ کے دور اور بھول گئے کہ کبھی کوئی ہمارے ساتھ بھی تھا۔

چند برس گزرے تو مجھے فرانس کی زبان و ادب، فلسفہ، تمدن ملکی و غیر ملکی سیاست اور جن عالمی مسائل سے کسی تعلیم یافتہ فرانسیسی کو دلچسپی ہو سکتی تھی، پیدا ہو گئی۔ مثلاً دبرے کا ذکر آیا، بولیویا میں گرفتاری کا، مقدمہ کا، شادی کا، ان کی دانش ورانہ تحریروں کا اور جنوبی امریکا کی تحریک انقلاب یا تحریکِ خود کفالت سے وابستگی کا اور اسی دوران ایک دن اس خبر سے سنسنی پھیل گئی کہ چے گوارا بولیویا کے جنگلوں میں لڑتے ہوئے مارے گئے۔ ایک افریقی نوجوان نے نہایت سنجیدگی سے کہا:

ایسا ہو ہی نہیں سکتا جو دنیا بھر کے مظلوم عوام کی آزادی اور خوشحالی کے لیے لڑ رہا ہو اور ان کی امیدوں کا مرجع ہو، مر نہیں سکتا۔ یہ کوئی اور ہی ہوگا اور اگر خبر کی تصدیق ہو بھی گئی، تو ہم نہ مانیں گے اور چے کو زندہ رکھیں گے۔

ڈپارٹمنٹ آف فزکس - اے - ایم - یو - علی گڑھ

۱۵ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو فیڈرل کاسترو نے ٹیلی وژن پہ آکے تصدیق کر دی کہ تصویریں دیکھنے کے بعد شبہ نہیں رہتا کہ تہبند پہنے شیر سا جوان گولیوں سے چھلنی پڑا تھا وہ چے گوارا نہیں ہے۔

لیزر فزکس کے ماہر ہمارے ایک دوست کوئی پندرہ برس ہوئے نوجی استبداد سے مجبور ہو کر، دوسرے سیکڑوں ہنرمندوں، تعلیم یافتہ حضرات کی طرح، اپنے وطن ارجنٹائنا کو خیرباد کہہ کر برازیل میں کام کرنے آگئے ہیں۔ انھوں نے ستمبر ۱۹۸۳ء میں مجھے چند ماہ کے لیے وہاں مہمان بلایا۔ برازیل کی فزکس پر ایک تحریر چھاپ چکا ہوں لیکن دوسرے مشاہدات کا حق ابھی تک ادا نہیں ہو سکا ہے۔

جنوبی امریکا میں اس مختصر قیام سے، اور باتوں کے علاوہ، معلوم ہوا کہ جس بولیویا کو چے گوارا نے اپنے حوصلے آزمانے کے لیے بڑی آرزو دل سے چنا تھا اور جہاں امید کے خلاف، اہلِ وطن کو پیامِ زندگی دینے کے جواب میں انھیں مرگِ بے اماں نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ وہاں ابھی چند برس پہلے تک افلاس اور بے چارگی کی یہ کیفیت تھی کہ آبادی کی آبادی سوکھی روٹی تک سے محروم رہ کر حشیش کھا کھا کر بھوک مٹاتی اور بیس بائیس سال کی عمر میں قبرستان بسا دیتی تھی۔

میں برازیل ہی میں تھا کہ ارجنٹائنا میں صدارتی الیکشن ہوا۔ وہ ارجنٹائنا جو اس صدی کے دوسرے نصف کے شروع میں یورپ، شمالی امریکا اور جاپان کے بعد صنعتی ترقی میں منفرد تھا اور جہاں جنرل پیرون کی شخصیت اور ان کی قومی تحریک ایک عرصے تک ویسی ہی اہم رہی جیسے فرانس میں جنرل ڈیگال اور گولزم۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ پیرون کے معزول ہونے کے برسوں بعد فرانس میں مئی ۱۹۶۸ء کی انقلابی صورتِ حال سے چند ماہ پہلے جب ڈیگال ارجنٹائنا کے دورے پر گئے اور ملک کے فوجی آمر انھیں ایک کارخانہ دکھانے لے گئے تو مزدور اٹھ کھڑے ہوئے اور در و دیوار سے آواز آنے لگی

پیرون سے الترولوق (پیرون ہاں، دوسرا نہیں)

پھر اسی ارجنٹائنا کو غیر ملکی سرمائے سے خریدے فوجیوں نے پندرہ بیس برس اس طرح کچلا کہ یونیورسٹیوں میں گھس کر تجربہ گاہوں کے آلات تک توڑ ڈالے۔ الکشن میں وہ ملک الفانسین کے ساتھ عوامی امیدوں کی بھیڑ لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ جس چلی میں الندے کی منتخب حکومت کا تختہ الٹتے وقت مقتولوں کے خون سے نہریں بہ گئی تھیں، وہاں زندگی کی حرارت پھر سے محسوس ہو رہی ہے اور شاید خونِ شہیداں رنگ لانے والا ہے۔

برازیل، میکسیکو اور ارجنٹائنا دنیا کے سب سے زیادہ مقروض ملک تھے اور شمالی غیب داں کہتے تھے کہ ان کا کوئی مستقبل نہیں۔ کیا تماشا ہے کہ آج ممالکِ متحدہ امریکا اگست ۱۹۴۵ء میں اپنے دو ایٹم بموں کے شکار جاپان کے ہاتھوں بھی مقروض ہے اور بین الاقوامی صنعت کاروں، بینکوں کے بھی مگر یہ قرض داری اس کے لیے شانِ ریاست ہے، باعثِ رسوائی نہیں اور نہ اس کی وجہ سے اس نے دنیا کا حاکمِ اعلیٰ بننے کے خواب دیکھنا بند کیے ہیں، بین الاقوامی معاشیات کی کتنی بڑی فریب کاری ہے!

جب سے اب تک ارجنٹائنا اور پیرو کے صدرِ مملکت بین الاقوامی بینک کو من مانا سود در سود دینا بند کر چکے ہیں اور پورے لاطینی امریکا میں یہ رجحان بڑھ رہا ہے کہ مالی شاہکاروں سے صاف صاف کہہ دیا جائے کہ بین الاقوامی بینک (International Monetary Fund) دنیا کے غریب عوام کی امداد کے لیے بنا تھا، ان کا خون چوسنے کے لیے نہیں۔ اس لیے سارے مقروض ملکوں کو چاہیے کہ اس کی روز افزوں شرح پہ سود ادا کرنا بند کر دیں۔

برازیل ایک گرم معتدل اور پرسکون ملک ہے، رقبے میں ہندستان سے ڈھائی گنا بڑا اور آبادی میں پہلا چوتھا حصہ، یعنی مجموعی طور پر ۱۵ گنا زیادہ فائدہ میں۔ ملک کا بڑا حصہ شمال مغرب میں، دریائے اعظم آمیزن اور اس کے معاون دریاؤں کے سیراب کردہ جنگلوں سے ڈھکا ہے۔ شمال مشرقی حصہ ریگستانی ہے۔ صرف ساحل کے دس پانچ میل پہ بارش ہوتی ہے اور سرسبزی نظر آتی ہے۔ جنوبی حصہ زرخیز بھی ہے اور صنعت کی آماجگاہ بھی، جس میں ساؤ پاؤلو نام کا سیکڑوں میل لمبائی میں پھیلا دلدل کا جنگل ہے۔ ملک کی آبادی کو یہی روزگار مہیا کرتا ہے۔ قریب کے سارے صوبے معدنیات سے بھرے ہیں۔ کان کھود کے نیچے اترنے کی ضرورت ہی نہیں۔ پہاڑ کے پہاڑ زمین کے اوپر قدرتی خزانوں سے بھرے کھڑے ہیں۔ نواح میں لوہے اور نکل وغیرہ کی کثرت کا اندازہ اس بات سے ہوتا

ہے کہ اس پورے علاقے میں زمین کی افقی مقناطیسی قوت ۲۰ سے کم رہتی ہے جب
کہ دنیا میں اس کا اوسط ۳۶ رہے۔

ان جنوبی صوبوں نے کچھ ہی دن ہوئے علاحدگی کے لیے بغاوت کی تھی
وکامیاب نہ ہونے دی گئی۔

پرتگالی قبضہ کے دوران برازیل میں سونے کے پہاڑ ملے تھے، جن کا
استعمال لزبن کے عجائب خانے میں کھڑی سونا جڑی گاڑیوں سے ہوتا ہے
لیکن ابھی حال میں شمالی ریگستان میں نئے سونے کے پہاڑ دریافت ہوئے
ہیں، جو کہا جاتا ہے سب سے پہلے امریکیوں نے معلوم کیے تھے اور ۹۹ برس
کے لیے اُن کے ہاتھ رہن ہوتے ہوتے بچے۔ شمالی علاقے کے لوگ اپنی ثقافت
پر نازاں ہیں۔ یہاں جنوب کے مقابلے میں وحشت انگیزی بالکل نہیں ہوتی اور
بڑی تعداد میں شمالی امریکا اور یورپ سے زائرین آتے رہتے ہیں رسیفے
کے بڑے تاریخی شہر کے عقب میں اولندا کا گاؤں اپنی دلاویزی کے لیے آج
بھی یادگار رہے۔ مگر برازیل کا اصل ثقافتی مرکز رسیفے کے جنوب اور رئو د
مینرو کے خاصے شمال میں بائیا کا صوبہ ہے، جہاں کئی سو سال پرانی خوبصورت
عمارتیں یادگار ہیں مگر جہاں چند برس پہلے بدامنی اتنی بڑھ گئی تھی کہ زائرین
کی بسیں پہرے میں بھیجی جاتی تھیں۔

برازیل میں ہر قسم کے باشندے ہیں۔ ولندیزی یا پرتگالی نسل
کے یورپی خال خال فرانسیسی، مقامی قدیم امریکی۔ افریقہ سے غلام بنا کر
لائے ہوئے افراد وغیرہ لوگ اب زیادہ تر خلط ملط ہو گئے ہیں۔ تاہم سفید فام
سیاہ فام اور گیہواں ہندوستانی جیسے رنگ اور نقشے برابر دکھائی دیتے ہیں
کوئی دل میں چاہے کچھ سوچتا ہو، کسی کی زبانی نسلی امتیاز کی بات کان نہ سنی
بلکہ بعض لوگوں نے کہا کہ ہم افریقیوں کے شکر گزار ہیں کہ وہ ہمارے نئے ملک
میں اپنی پرانی ثقافت لے کر آئے۔ اس کا سب سے واضح مظاہرہ نئے سال
کے موقع پر ہوتا ہے، جب ۳۱ دسمبر کی گرم رات میں ساری رات لوگ سمندر
دریاؤں یا جھیلوں کے کنارے اپنے انداز کی انوکھی تقریبات مناتے ہیں، ایک
طرح کی ریت رسمیں ادا کرتے ہیں جو جادو ٹونا جیسی لگتی ہیں، دیئے جلتی ناویں
پانی میں بہاتے ہیں اور بیئر پی پی کر دُھت ہو جاتے ہیں۔ سنا ہے کہ اس
نشہ میں کبھی کبھی پستول چل جاتے ہیں اور ایک دو آدمی مر جاتے ہیں۔

برازیل نے اچھی خاصی صنعتی ترقی کر لی ہے۔ بلکہ بعض نئی معاملات
میں ہم سے آگے ہے۔ سڑکیں بہت اچھی ہیں آمد و رفت ہوائی
فیصدی بسوں میں ہوتی ہے۔ ریلیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ برازیل
بڑے پیمانے پر اسلحہ خریدتا ہے لیکن اس نے جدید اسلحہ سازی کی خو
فیکٹریاں اتنی قائم کر لی ہیں کہ جنگی اسلحہ کی برآمدات کے معاملے میں دنیا
ملک ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ سنا ہے کہ لیبیا اس کا بڑا گاہک

لاطینی امریکا میں اب میکسیکو اور چلی بھی برازیل کی طرح خا
زرِ مبادلہ اپنے اسلحہ سازی کے کارخانوں کی بدولت کماتے ہیں
پڑوسیوں میں لڑائی اور خوں ریزی کا بازار ساری دنیا میں، خاص
پر ہمارے پسماندہ ملکوں میں، کچھ مالداروں کی گاڑھی پر مگر زیادہ
حماقت میں جنون کی حد تک عام ہے اور اس طرح ہماری محنت کی گاڑھی
کمائی خود ہمیں جانوروں کی صف سے اُٹھا کر آج کے انسانوں جیسا بنانے
کے بجائے، لوہے تانبے کے دھماکے خریدنے پر خرچ ہوتی رہتی ہے
باخبر حلقوں کا کہنا ہے کہ اسلحہ کی خرید و فروخت پر اوپر سے نیچے تک
سب ملا کر ۳۰ فیصد تک کمیشن ملتا ہے۔ اسی کی خاطر ملکی قائدین ا
قومی ضرورت قرار دیتے اور پڑوس سے تناتنی بڑھائے رکھ
ہیں۔

برازیل کی صنعتی ترقی میں یونیورسٹی کمپنی کا جو غیر معمولی دخ
ہے، اس کا ذکر ہمیشہ کرنا چاہیے۔ یہاں کے پروفیسر ملکی ضرورت
کے بڑے بڑے کام تحقیق کی سطح پر ہاتھ میں لیتے ہیں۔ حکومت
فراخ دلی سے ان کی مالی مدد کرتی ہے۔ پھر جیسے جیسے پیش رفت
ہوتی جاتی ہے، کام صنعت کاروں کے سپرد کیا جاتا رہتا ہے او
سرکار، یونیورسٹی، صنعت کار کے تعاون کا مثلث روز بروز
مضبوط ہوتا جاتا ہے۔ ہمیں اس سے سبق لینا چاہیے۔

اس ترقی کے باوجود افراطِ زر طاعون کی طرح برازیل کی
معیشت کو کھوکھلا کر رہا ہے جو اِدھر شاید دس برس سے ڈھائی
سو فیصد سالانہ ہے۔ حکومت تنخواہوں میں ایک تہائی کے قریب
معاوضہ دے دیتی ہے اور تنخواہ پیشہ لوگ روز بروز افلاس
کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔ مقامی سکے کی کوئی حیثیت نہیں
رہ گئی ہے۔ اس سے اچھائی تو یہ ہے کہ کوئی سکے دبا کر نہیں

رکھتا۔ جن کے پاس جو ہے برابر کاروبار میں لگائے رکھتا ہے۔ مگر شدید نقصان یہ ہے کہ ملکی سکے پر کسی کو اعتماد نہیں رہا۔ ہر شخص مقدور بھر سونا خرید لیتا ہے یا ڈالر اور انھیں امریکی بینکوں میں بھیجتا رہتا ہے۔ جس سے ملک کی دولت برابر بیرون ملک بہتی جاتی ہے — صنعت کار اور حکومت کے سربراہ بڑی بڑی خریداریوں کا کمیشن کس طرح غیر ملکی بینکوں میں ہی جمع کرتے ہیں، اب اس کا تھوڑا اندازہ ہمارے ملک والوں کو بھی ہو گیا ہے۔

لاطینی امریکا کے زیادہ تر ملکوں کی طرح برازیل پر بھی اس صدی کی ساتویں دہائی میں فوجی حکومت چھا گئی تھی اب دھیرے دھیرے اس کے بادل چھٹ رہے ہیں اور چند برس ہوئے صدارت کا براہ راست الکشن ہوا ہے، لیکن "عوام کی حکومت، عوام کے لیے اور عوام کے ذریعے صحیح طور پر قایم ہونے میں ابھی خاصا وقت لگے گا۔

ایک روز سر سید مونڈھے پر اسٹریچی ہال کے سامنے، جو زیر تعمیر تھا، بیٹھے تھے کہ ایک چھوٹا لڑکا زار و قطار روتا ہوا ان کے پاس پہنچا اور شکایت کی کہ مجھ کو فلاں بڑے لڑکے نے مارا ہے۔ اس کے رونے پر وہ کچھ اس طرح مضطرب ہوئے کہ فوراً اس کے ساتھ چل کھڑے ہوئے اور کہا کہ وہ لڑکا کہاں ہے۔ اس کے کمرے پر پہنچے اور بلا کچھ دریافت کیے اپنے ڈنڈے سے اس کی خبر لے ڈالی۔ وہ ایک دو ڈنڈے کھا کر بھاگ گیا اور سید صاحب اپنی جگہ تشریف لے آئے۔ اس کے بعد چند بڑے لڑکے سید صاحب کے پاس گئے اور حقیقت حال اس طرح بیان کی کہ یہ چھوٹا لڑکا بہت شیطان ہے اور لڑکوں کو فحش گالی دیتا ہے۔ اس وجہ سے اس نے برافروختہ ہو کر اسے مارا تھا۔

یہ سن کر سید صاحب کو بہت افسوس ہوا اور اس لڑکے کو اپنی کوٹھی پر بلا کر معذرت چاہی۔ یہ وہ باتیں تھیں جن کی وجہ سے لڑکے سر سید پر فدا تھے۔

سر سید ہال ریویو۔ اولڈ بوائز نمبر

ماں باپ ــــ ہمارے محسن

اسرار احمد خاں

دنیائے انسانیت کا ہر فرد اپنے ماں باپ کے احسانات کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ ماں باپ کی محبتوں اور شفقتوں کا ہر شخص مقروض ہے۔ ان کی محبتیں اور ان کی توجہات نہ ملی ہوتیں تو ہمارا زندہ رہنا اور انسانی معاشرے میں اپنا اپنا کردار ادا کرنا ممکن نہ ہوتا۔ جب ہم پیدا ہوئے تو ماں نے اپنی چھاتی کا سارا پیار ہمارے وجود میں انڈیلا۔ باپ نے ساری محبتیں ہم پر نچھاور کیں۔ دونوں نے مل کر ہمیں پاؤں پاؤں چلنا سکھایا، قدم قدم پر سہارا دیا۔ ہم بیمار ہوئے تو ہماری تیمار داری میں دن رات کا سکھ چین تج دیا۔ ہمیں کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو انھوں نے حتی الامکان پورا کیا۔ ہماری ہنسی اُن کی خوشی اور ہمارا رونا اُن کے غم کا باعث ہوتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ہمیں پیدا ہوتے ہی وہ گلا گھونٹ کر ہمیشہ کے لیے آزادی حاصل کر لیتے، پھر ان کے آرام وسکون میں کوئی خلل واقع نہ ہوتا۔ لیکن نہیں۔ انھوں نے ہمارے ننھے وجود کو اس طرح سینے سے لگا لیا کہ گویا ہم واقعی ان کے جگر کے ٹکڑے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ماں باپ کا بدل اس بھری دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ کوئی دوسری ہستی ہماری خدمت ضرور کر سکتی تھی۔ ہمیں اچھے سے اچھا کھلا سکتی تھی لیکن ماں باپ کی محبت نہیں دے سکتی تھی۔

مغرب میں بوڑھے ماں باپ عضو معطل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی جوان اولاد اس وقت ان سے رُخ پھیر لیتی ہے جب وہ ان کی خدمت توجہ اور محبت کے سخت محتاج ہوتے ہیں۔ یہ بوڑھے ماں باپ مجبور ہو کر اور اپنی تنہائیوں سے گھبرا کر حکومت کی جانب سے قائم بوڑھوں کے مراکز کا رُخ کرتے ہیں جہاں انھیں اپنے ہی جیسے بے شمار بوڑھے غم غلط کرنے کے لیے مل جاتے ہیں۔ وہاں انھیں تنہائی کا وہ عذاب سہنا نہیں پڑتا جو وہ اپنی لاڈوں پالی اولاد کے گھروں میں برداشت کرتے ہیں لیکن وہاں انہیں اپنی اولاد کہاں ملے گی جنھیں دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر سکیں گے۔ وہاں اپنی اولاد کی اولاد یعنی پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں کہاں ملیں گی جنھیں گود میں کھلا کر ان پر اپنی شفقتیں نثار کر سکیں گے۔ اب تو ہندوستان کے ایوان حکومت میں بھی مغربی طرز کے بوڑھوں کے مراکز قائم کرنے کی بات ہو رہی ہے۔ یہ چرچا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ہندوستانی سماج میں بھی بوڑھے ماں باپ کی وہی ناقدری اب بڑے پیمانے پر ہونے لگی ہے جو مغربی تہذیب کا ایک خاصہ ہے۔ ہندوستان کے جوان افراد اپنے بوڑھے ماں باپ کو اب خاطر ہی میں نہیں لاتے بلکہ ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ جلد از جلد دنیا سے چلے جائیں تاکہ ان کی خدمت کا مزید بار نہ برداشت کرنا پڑے اور اُن کی جائداد پر آزادانہ تصرف کیا جاسکے۔

اور تو اور برصغیر ہند و پاک کے مسلم معاشرے میں بھی یہ مرض پھیلتا جا رہا ہے۔ بوڑھے ماں باپ کی تحقیر، تذلیل، بدزبانی، تلخ کلامی حتیٰ کہ جسمانی و روحانی اذیت مسلم سوسائٹی میں بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ بات صرف بے دین اور بے عمل مسلمانوں ہی کے یہاں نہیں بلکہ دین دار گھرانوں میں بھی یہی صورت حال ہے۔ یہ صورتحال فوری توجہ اور اصلاح کی متقاضی ہے۔

ہمارے والدین کے ہم پر بے شمار احسانات ہیں۔ کیا ان کے احسانات کا بدلہ یہی ہے کہ انھیں تنہا چھوڑ دیا جائے۔ ان پر توجہ نہ دی جائے، ان کو بات بات پر جھڑکا جائے، جب وہ کسی بات پر اڑ جائیں تو تلخ کلامی اور

ریسرچ اسکالر شعبۂ دینیات سنّی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

بد کلامی کی جائے، ان کی تحقیر و تذلیل کی جائے، انھیں بڑھاپے، دیوانگی اور سٹھیاپے کا طعنہ دیا جائے، ان کے ساتھ غلاموں سے بھی بدتر سلوک کیا جائے یہاں تک کہ انھیں مارا پیٹا بھی جائے؟

نہیں ہرگز نہیں، ان کا ہم پر یہ حق ہے کہ ہم ان کی دل جوئی کریں، ان پر بھرپور توجہ صرف کریں ان کی باتوں پر اُف نہ کریں، ان سے میٹھے بول بولیں انھیں تنہائی کا احساس نہ ہونے دیں۔ ان کا احترام کریں بالکل اسی طرح جس طرح ہم کسی پیر بزرگ کا احترام کرتے ہیں اور انھیں ہر ممکن طریقے سے آرام پہنچائیں۔ ان کے یہ حقوق فطرت انسانی کے بھی مطابق ہیں اور اسلام جو انسانی فطرت سے ہم آہنگ دین ہے، اس کی بھی یہی ہدایت ہے۔

اللہ اور رسولؐ کے بعد ماں باپ کا درجہ:

اللہ سب سے بڑا ہے۔ اسی لیے اس کا حق اور اس کا درجہ سارے حقوق اور سب کے درجوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ اللہ کے حقوق کی ادائیگی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے بغیر ممکن نہیں۔ لہٰذا اللہ کے بعد رسول کا مرتبہ ہے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ ہی نے اپنے بعد انسانی معاشرے میں ماں باپ کے ساتھ صلہ رحمی کا درجہ رکھا ہے۔ قرآن کریم کی سورۃ النساء میں آیت ۳۶ کے آغاز میں اللہ کا فرمان ہے:

> وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا"
>
> اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو۔

اس آیت میں اللہ نے اپنی عبادت کا حکم دینے اور شرک سے منع کرنے کے بعد ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت کی ہے۔ ہدایات اور احکامات کی یہ ترتیب صاف ظاہر کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں توحید کے بعد جس چیز کی اہمیت ہے وہ ہے ماں باپ کے ساتھ تعلقات کی خوشگواری۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے بعد ماں باپ کا مرتبہ ہے۔

ماں باپ کے اس بلند مرتبے کی بات قابل فہم بھی ہے۔ ماں باپ سماج کی بالکل بنیادی اکائی ہیں۔ سماج کے تمام افراد اپنے ماں باپ کی محبت اور توجہات کے مرہون منت ہیں۔ لہٰذا ان افراد کے اوپر ماں باپ کا یہ حق ہے کہ وہ انھیں بلند مرتبہ دیں اور ان کا احترام کریں۔ اس احترام و محبت کے ماحول میں انسانی معاشرہ نہ صرف انتشار اور ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ رہے گا بلکہ اسے ارتقا کے مواقع حاصل ہوں گے۔

اسلام انسانی معاشرے کے افراد کو باہم مربوط دیکھنا چاہتا ہے یہ ربط اس وقت تک قائم نہیں ہوگا جب تک کہ اولاد بھی اپنے ماں باپ کے ساتھ ویسا ہی سلوک نہ کرے جیسا کہ ماں باپ نے ان کے ساتھ روا رکھا تھا۔ مغربی معاشرے میں انفرادیت پسندی (Individualism) اس حد تک آگے بڑھ گئی ہے کہ پورا معاشرہ اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہے۔ افراد کے درمیان آپس میں کوئی پائیدار ربط و تعلق نہیں ہے۔ بوڑھے ماں باپ تو گویا معاشرے کا حصہ ہی نہیں ہیں۔ یہ اسلام کی رحمت ہے کہ وہ اپنے نام لیواؤں کو باقاعدہ یہ تاکید کرتا ہے کہ ماں باپ کو اللہ اور اس کے رسولؐ کے بعد ہی درجہ دیں۔

قرآن نے بہت سے مقامات پر اللہ کے اس بیان کو دہرایا ہے کہ خدا پرستی کے بعد ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کا درجہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے ارشادات میں یہی بات دوسرے انداز میں فرمائی ہے:

> عن ابن مسعودؓ قال: سألت النبیؐ: ای العمل احب الی اللّٰہ تعالیٰ۔ قال الصلوٰۃ علی وقتھا۔ قلت ثم ای؟ قال بر الوالدین۔ قلت ثم ای؟ قال: الجہاد فی سبیل اللّٰہ (بخاری۔ مسلم)
>
> عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبیؐ سے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول! اللہ کی نظر میں سب سے زیادہ پسندیدہ عمل کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: وقت پر نماز کی ادائیگی۔ پھر میں نے پوچھا: اس کے بعد۔ آپؐ نے جواب دیا: ماں باپ کے ساتھ نیکی۔ میں نے سوال کیا: پھر اس کے بعد؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: اللہ کی راہ میں جہاد"

اس حدیث نے بات واضح کر دی کہ وقت پر نماز کی ادائیگی کے بعد ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ انسانی عمل ہے۔ نماز اس بات کی علامت ہے کہ آدمی دوسری عبادات اور احکام خداوندی کی تعمیل میں بھی مخلص ہوگا۔ اگر کوئی مسلمان نماز سے

غافل ہے تو اس سے یہ توقع ہی فضول ہے کہ وہ دین کے دوسرے معاملات میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی پیروی کرے گا۔ اسی طرح ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک ایک ایسا پیمانہ ہے جس کے ذریعہ یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ آدمی دوسرے افراد معاشرہ کے ساتھ کتنا حسن سلوک کر سکتا ہے یا کرتا ہے جو لوگ اپنے ماں باپ کے تئیں مخلص نہیں ہیں وہ معاشرے کے کسی فرد کے ہمدرد نہیں ہو سکتے ۔

نماز اللہ کا حق ہے۔ نماز قائم کر کے مسلمان اللہ کا ایک بنیادی حق ادا کرتا ہے اور اس کے ذریعے یا اس کے دوسرے حقوق ادا کرنے کے لائق اپنے آپ کو بناتا ہے۔ اسی طرح حسن سلوک معاشرے کا حق ہے اور چوں کہ معاشرے کی بنا ماں باپ نے ڈالی ہے، لہٰذا اُن کے ساتھ حسن سلوک کرنا معاشرے کا حق ادا کرنا ہے اور اس حق کی ادائگی کے ذریعے ہی دوسرے افراد کے حقوق کی ادائیگی کی تربیت ممکن ہو سکتی ہے

ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک فرض ہے:

قرآن کریم اور احادیث دونوں میں ماں باپ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ یہ تاکید استحباب کے انداز میں نہیں ہے بلکہ اس میں حکم کے ساتھ فرضیت کا انداز ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وقضیٰ ربک الا تعبدوا الا ایاہ وبالوالدین احسانا
(الاسراء ۱۷: ۲۳)

"اور تمہارے رب نے تمہارے لیے فیصلہ کیا ہے کہ تم اس کے علاوہ کسی اور کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو احکام صادر کیے ہیں: اپنی عبادت کا اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کا۔ اللہ کی عبادت کے معاملے کو کوئی بھی دانا شخص اختیاری (Optional) نہیں کہہ سکتا کہ دل چاہے تو انجام دے اور نہ چاہے تو ترک کر دے۔ سب کا اس پر اتفاق ہے کہ اللہ کی عبادت بہرحال ہر مسلمان پر لازم ہے۔ جس لفظ کے ذریعے اللہ نے اپنی عبادت کو فرض کیا ہے، اسی لفظ کے ذریعے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کا بھی حکم دیا ہے۔ لہٰذا دوسرا حکم بھی فرض ہے۔ اس لیے بجا آوری پسندیدہ اور مستحسن ہے اور اس کی مخالفت قابل گرفت اور قابل سزا ہے۔

حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو جو نصیحت کی تھی وہ اللہ کو اتنی پسند آئی کہ اسے قرآن میں جگہ دے دی۔ جہاں حضرت لقمان کی نصیحت کا تذکرہ ہے وہیں درمیان میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو خود اپنی طرف سے بھی وصیت کر ڈالی کہ دیکھو ماں باپ کے اوپر تمہارا یہ حق تھا کہ وہ تمہیں صحیح رہنمائی دیں، وہ تمہیں راہ راست سے آگاہ کریں اور تمہیں شرک کی آلودگیوں سے بچائیں۔ سو لقمان جیسے باپ نے اس حق کو ادا کیا۔ لہٰذا ایسے ماں باپ کا حق تم پر یہ ہے کہ تم ان کے شکر گزار رہو۔

ووصینا الانسان بوالدیہ۔ حملتہ امہ وھنا
علی وھن وفصالہ فی عامین ان اشکرلی ولوالدیک
الی المصیر۔ (لقمان ۳۱: ۱۴)

"اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے سلسلے میں تاکید کی۔ اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کے دودھ چھوٹنے میں لگے (اسی لیے ہم نے اس کو نصیحت کی کہ) میرا شکر ادا کر اور اپنے ماں باپ کا شکر بجالا۔ تمہیں میری ہی طرف پلٹنا ہے"۔

ماں باپ کا شکر یہ ادا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دل کو اس جذبے سے معمور رکھا جائے کہ ماں باپ نے ہمارے ساتھ احسان کیا ہے لہٰذا ہم بھی ان کے ساتھ مثبت رویہ اختیار کریں گے۔ اللہ کا شکر گزار بننے کا مفہوم یہ ہے کہ اسی کے آگے جھکا جائے اور اسی کی اطاعت کی جائے اور دوسری وفاداریوں کو ترک کر دیا جائے۔ بالکل ٹھیک اسی طرح ماں باپ کے تئیں اظہار تشکر یہ ہے کہ ان کا کہنا مانا جائے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے، ان کی خدمت کی جائے اور ہر طرح آرام پہنچانے کی حتی الوسع کوشش کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کا اس آیت میں منشا یہ ہے کہ جس طرح ماں باپ کے اوپر اولاد کی تربیت فرض ہے، اسی طرح اولاد پر ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک بھی فرض ہے۔

ماں باپ کی نافرمانی گناہ کبیرہ ہے:

ماں باپ کی حکم عدولی اور ان کو ستانا نہ صرف گناہ ہے بلکہ

گناہ ہے جس کی معافی اللہ کے دربار سے توبہ کے بغیر ممکن نہیں۔ صحیح بخاری صحیح مسلم میں ابوبکرہ نفیع بن حارث رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے کہ :

قال رسول اللہ ﷺ: الا انبئکم باکبر الکبائر ؟
ثلثا۔ قلنا: بلیٰ یا رسول اللہ۔ قال: الاشراک
باللہ وعقوق الوالدین۔ وکان متکئاً فجلس
فقال الا وقول الزور وشہادۃ الزور۔

(بخاری، مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تمہیں بہت بڑے بڑے کبیرہ گناہوں کے بارے میں نہ بتاؤں آپ ﷺ نے یہ سوال تین بار کیا۔ ہم نے عرض کیا: ضرور اے اللہ کے رسول ﷺ۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا اور والدین کی نافرمانی کرنا۔ آپ ﷺ ٹیک لگائے بیٹھے تھے، آپ سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا: خبردار! جھوٹی بات اور جھوٹی گواہی بھی بہت بڑا کبیرہ گناہ ہے۔"

اسی سے ملتی جلتی ایک حدیث رسول ﷺ عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الکبائر الاشراک باللہ، وعقوق الوالدین
وقتل النفس والیمین الغموس۔

(بخاری)

"اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا، کسی کو ناحق قتل کرنا اور جھوٹی قسم کھانا کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔"

مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ان اللہ تعالیٰ حرم علیکم عقوق الامہات ومنعا
وھات ووأد البنات وکرہ لکم قیل و
قال وکثرۃ السوال واضاعۃ المال

(بخاری و مسلم)

اللہ تعالیٰ نے تم پر ماں باپ کی نافرمانی کرنا، مال کو روک کر رکھنا، دوسروں کے مال پر ناجائز قبضہ کرنا، لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا، بے مقصد گفتگو کرنا، زیادہ سوال کرنا اور مال کو ضایع کرنا حرام قرار دیا ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ماں باپ کی اطاعت اور اُن کے حکموں کی بجا آوری ہر معاملے میں اور ہر موقع کے لیے ہے؟ نہیں ماں باپ کی فرماں برداری صرف انہیں معاملات میں ہے جن کی اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اجازت دی ہے۔ گناہ اور غلط کاموں میں ماں باپ کے ساتھ تعاون یا اُن کی فرماں برداری بجائے خود گناہ ہے۔ اللہ نے اس معاملے کو بھی قرآن میں صاف کر دیا ہے۔

وان جاھداک علیٰ ان تشرک بی ما لیس لک بہ علم
فلا تطعھما وصاحبھما فی الدنیا معروفاً (لقمان، ۱۵)

اور اگر تمہارے ماں باپ تم کو میرے ساتھ شرک پر مجبور کریں جس کی کوئی دلیل تمہارے پاس نہیں ہے تو ان کی پیروی نہ کرو۔ البتہ ان کے ساتھ معروف کے مطابق تعلقات رکھو۔"

یہ آیت بتاتی ہے کہ اللہ کی نافرمانی، گناہ اور شرک کے معاملات میں ماں باپ کی حکم عدولی ہی احسن و افضل ہے۔ البتہ حسن سلوک پھر بھی اُن کے ساتھ باقی رہے گا۔

یہاں یہ بات بھی واضح کر دینا مناسب ہے کہ قرآن کی اسی آیت سے علماء وفقہاء نے یہ اخذ کیا ہے کہ ماں باپ مشرک و کافر ہوں جب بھی ان کے ساتھ معروف کے مطابق حسن سلوک کیا جائے گا۔ اس کی تصدیق ایک واقعے سے بھی ہوتی ہے۔ ایک بار اسماء رضی اللہ عنہا کی ماں جو اَب تک ایمان نہیں لائی تھیں، بیٹی سے ملنے مدینے آئیں۔ بیٹی کے گھر گئیں اور کچھ تحفے بھی پیش کیے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے نہ تو تحفے قبول کیے، نہ ان سے ملنا گوارا کیا۔ رسول اللہ ﷺ تک بات پہنچی تو آپ ﷺ نے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کو تاکید کی کہ ماں سے ملاقات بھی کرو اور تحفے بھی قبول کرو۔ یہ واقعہ بخاری، مسلم اور سیرت نبوی کی اہم کتابوں مثلاً سیرت ابن ہشام، سیرت ابن کثیر اور علامہ شبلی کی سیرت النبی میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ماں باپ کے ساتھ تلخ کلامی حرام ہے:

ماں باپ کے ساتھ حسن معاملگی اور تعلقات کی خوشگواری کو اللہ نے

اتنی اہمیت دی ہے کہ قرآن میں اس نے کئی مقامات پر اسلوب بدل بدل کر بڑے موثر انداز میں اس پر روشنی ڈالی ہے اور اہلِ ایمان کو خصوصی ہدایات دی ہیں۔ یہاں تک کہ ایک مقام پر اس تعلقات کے جزئیات تک کا تذکرہ کر کے معاملہ صاف کر دیا ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنی عبادت اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دے کر مزید تاکید یہ کی ہے کہ ماں باپ کے کسی رویے پر اُف بھی نہ کرو اور اگر وہ بے جا گفتگو بھی کرجائیں تو انھیں نہ جھڑکو بلکہ ان سے شیریں کلامی کا رویہ اختیار کرو اور اُن سے لطف و عنایات کا معاملہ روا رکھو۔

اما یبلغن عندك الكبر احدهما او كلاهما فلا
تقل لهما اف ولا تنهرهما وقل لهما قولا كريما۔
واخفض لهما جناح الذل من الرحمة وقل رب
ارحمهما كما ربياني صغيرا۔

(بنی اسرائیل: ۲۳-۲۴)

اگر تمہاری زندگی میں ماں باپ میں سے دونوں کے دونوں یا اُن میں سے ایک بڑھاپے کو پہنچ جائے تو اُن سے اُف بھی نہ کرو اور انہیں جھڑکو مت اور ان سے نرم و شیریں گفتگو کرو اور ان سے ملاطفت کا معاملہ رکھو اور کہو کہ اے ہمارے رب جس طرح ماں باپ نے شفقت کے ساتھ میری پرورش کی تو بھی اُن کے ساتھ رحمت کا معاملہ فرما۔

بڑھاپے کی عمر بچپن کے مترادف ہوتی ہے۔ بوڑھوں کے سوچنے اور عمل کرنے کا انداز بالکل بچوں جیسا ہو جاتا ہے۔ وہ بھی بچوں کی طرح بے وجہ مچل جاتے ہیں۔ بلاوجہ اپنی اولاد کے معاملے میں دخل اندازی کر بیٹھتے ہیں اور اسے اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان سے ایسی اور بھی حرکات سرزد ہوتی رہتی ہیں جو اُن کی اولاد کے لیے اذیت ناک اور ناگواری کا باعث بنتی ہیں ایسے میں اسلام کی ہدایت ہے کہ ماں باپ کی ان بے اعتدالیوں کو نہ صرف خوش اسلوبی سے برداشت کیا جائے بلکہ ان کے ساتھ محبت اور نرمی کا سلوک کیا جائے۔ اسلام کا جوان اولاد سے یہ مطالبہ بالکل فطری اور حق بجانب ہے۔ وہ اولاد جو آج جوان ہے کل وہ بچپن کے دور میں تھی۔ وہ بھی بات بے بات پر مچل جایا کرتی تھی اور ناگوار حرکتیں بھی کیا کرتی تھی۔ اس پر ماں باپ مسکرا تے اور محبت اور نرمی ہی کا رویہ روا رکھتے تھے۔ اب جب اولاد بچ کو پیچھے چھوڑ کر جوان ہو چکی ہے اور ماں باپ بڑھاپے کو پہنچ چکے ہیں تو ا کے ساتھ اولاد کو بھی وہی نرمی اور محبت کا معاملہ رکھنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے ماں باپ کے ساتھ اُف کرنے سے بھی منع ہے۔ لہٰذا اُن کو گالی دینا، انہیں بُرا بھلا کہنا اور انہیں روحانی اذیت د تو بدرجہ اتم ممنوع اور حرام ہے۔ جاہل لوگ اپنے ماں باپ کو بڑ بے دھڑک بات بات پر گالی دیتے اور بُرا بھلا کہتے ہیں۔ یہ حد درجہ شن فعل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار ارشاد فرمایا:

من الكبائر شتم الرجل والديه۔ قالوا
يا رسول الله وهل يشتم الرجل والديه
قال نعم يسب ابا الرجل فيسب اباه و
يسب امه فيسب امه۔

(بخاری - مسلم)

آدمی کا اپنے ماں باپ کو گالی دینا کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ لوگوں نے پوچھا: یارسول اللہؐ کیا آدمی اپنے ماں باپ کو بھی گالی دیتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں، وہ کسی کے باپ کو گالی دیتا ہے تو اس کے جواب میں اس کے ماں باپ کو گالی ملتی ہے، وہ کسی کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کی بھی ماں کو گالی دیتا ہے۔"

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ رسول اللہؐ نے ماں باپ کو گا دینا کبیرہ گناہ قرار دیا تو صحابہؓ نے حیرت کا اظہار کیا کہ کیا کوئی ایسا بدبخت ہو سکتا ہے جو اپنے ماں باپ کو گالی دیتا ہو۔ اس کا مطلب ی ہے کہ بہت ساری خرابیوں کے باوجود عرب کے جاہلی معاشرے میں بھی ماں باپ کو گالی دینا تو دور کی بات ہے اس کا تصور بھی محال رہا ہوگا جب ہی تو حضرات صحابہؓ نے اظہار حیرت کیا۔ اس پر رسول اللہؐ نے بھی یہ نہیں فرمایا کہ آدمی براہ راست اپنے ماں باپ کو گالی دیتا ہے بلکہ ی فرمایا کہ آدمی بالواسطہ طور سے گالی دیتا ہے۔ ذرا تصور کیجیے جب اسلا نے بلاواسطہ گالی کو ماں باپ کو گالی دینے کے مترادف قرار دیا ہے ا

اس سے منع کیا ہے تو ماں باپ کو براہِ راست گالی دینے اور بُرا بھلا کہنے کو بدرجہ اتم حرام قرار دینا چاہیے۔

جاہل اور اَن پڑھ عوام دوسروں کے ماں باپ کو گالی دیتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ اس کی زد خود ان کے اپنے ماں باپ پر پڑ رہی ہے۔

ماں باپ کے ساتھ صلہ رحمی معاشی آسودگی کا ضامن ہے:

ہم مسلمانوں کا اس پر یقین و ایمان ہے کہ اس کائنات میں محض طبعی اور محسوس قوانین فطرت ہی نہیں ہیں بلکہ اس کے پس پشت غیر محسوس اور ان دیکھے اصولوں اور ضابطوں کی بھی کارفرمائی ہے۔ ہماری نگاہوں میں سامنے ظہور پذیر کوئی واقعہ محض چند طبعی اسباب ہی نہیں رکھتا بلکہ ان کے پیچھے کئی ایسی وجوہات بھی ہوتی ہیں جن کو سمجھنے اور محسوس کرنے سے ہمارا قوتِ ادراک قاصر رہتی ہے۔ مثال کے طور پر آج زمین کے بہت سے علاقوں میں بارش بالکل نہیں ہو رہی ہے اور وہاں کی انسانی آبادی خشک سالی کا شکار ہے۔ بظاہر تو اس کا سبب یہ نظر آتا ہے کہ سمندر میں ہوا کا دباؤ کم ہونے کی وجہ سے مانسون نہیں اٹھ پاتا اور مانسون نہ ہونے پر بارش نہیں ہوتی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہوا کا دباؤ کیوں کم ہو گیا جب کہ وہی کائنات ہے اور اس میں موجود تمام ذرائع اپنی جگہ جوں کے توں موجود ہیں۔ اب تو ماہرین موسمیات اور سائنس دانوں کی تحقیق سے یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ سمندر میں ہوا کا دباؤ اتنا کم نہیں ہوا ہے کہ مانسون نہ اٹھ سکے۔ اس کا سبب بظاہر دکھائی نہیں پڑتا۔ اسلام اس کا سبب اس طرح بتاتا ہے کہ جب انسانوں میں بدکاری، بے حیائی، زر پرستی، جمع خوری اور غریبوں پر ظلم و جبر عام ہو جائے گا اور غریبوں، مسکینوں، مسافروں، یتیموں، بیواؤں اور ضرورت مند لوگوں کی خبرگیری بند ہو جائے گی، مال دار اپنی دولت سے زکوٰۃ و صدقات دینا بند کر دیں گے اور وہ اپنے خزانوں پر سانپ بن کر بیٹھ جائیں گے تو اللہ تعالیٰ بارش روک دے گا۔ تھوڑی بہت بارش ہوگی تو وہ انسانوں پر رحم کھا کر نہیں بلکہ جانوروں کی وجہ سے ہوگی۔

یہ اصول ہر جگہ ہر معاملے میں کارفرما ہے۔ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک اور ان کے ساتھ صلہ رحمی آدمی کے رزق میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔ ماں باپ کی ناراضگی میں اللہ کی ناراضگی ہے اور اللہ کی ناراضگی کا کیا نتیجہ ہوگا، اس کا تصور بآسانی کیا جا سکتا ہے اور ماں باپ کی خوشی میں اللہ کی خوشی ہے۔ ماں باپ اسی وقت خوش ہوں گے جب ان کے ساتھ صلہ رحمی کا معاملہ کیا جائے۔ صلہ رحمی کے جواب میں ماں باپ اپنی اولاد کو صدق دل سے آسودگی اور اطمینان بخش زندگی کی دعائیں دیں گے۔ اللہ ان کی دعاؤں کو لازماً سنے گا اور نیک اور فرماں بردار اولاد کے رزق میں اضافہ فرمائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

من احب ان يبسط له في رزقه و
ينسأ له في اثره فليصل رحمه

(بخاری و مسلم)

جو شخص چاہتا ہے کہ اس کو رزق میں فراخی حاصل ہو اور
عمر بڑی ہو تو اسے چاہیے کہ وہ صلہ رحمی کرے۔

اس حدیث میں مطلق صلہ رحمی کا نتیجہ رزق میں کشادگی بتایا گیا ہے ماں باپ کے ساتھ اس کو مقید نہیں کیا گیا ہے۔ یہ بات قابلِ فہم ہے کہ معاشرے کے تمام افراد چاہے وہ بھائی بہن ہوں، پڑوسی ہوں، رشتہ دار ہوں، احباب ہوں یا اساتذہ ہوں، سب کے ساتھ صلہ رحمی کا حکم اور تاکید ہے لیکن افراد معاشرہ میں ماں باپ کا درجہ سب پر مقدم ہے۔ لہٰذا اس حدیث کی عمومیت میں ماں باپ شامل ہیں۔ یعنی ماں باپ سمیت تمام افراد معاشرہ کے ساتھ حسن سلوک رزق میں فراخی کا سبب بنے گا۔ یہ بات بالکل فطری ہے کہ دوسرے افراد معاشرہ کے ساتھ صلہ رحمی اسی وقت ممکن ہے جب کہ ماں باپ کے ساتھ صلہ رحمی کی جا رہی ہو۔ ماں باپ کے ساتھ صلہ رحمی نہ ہونے کی صورت میں سماج کے دوسرے افراد کے ساتھ صلہ رحمی ناممکن ہے۔ ممکن ہے ظاہری طور پر کچھ کر لیا جائے لیکن اس میں اخلاص بالکل نہ ہوگا۔

ماں باپ کے ساتھ صلہ رحمی کا نتیجہ جب رزق میں فراخی ہے تو لازمی طور سے ان کے ساتھ قطع رحمی اور بدسلوکی کا نتیجہ معاشی تنگی اور اقتصادی بدحالی ہوگا۔ ہمارے بے روزگار اور معاشی ناآسودگیوں کا شکار نوجوانوں کو دوسرے پہلوؤں پر غور و فکر کرنے اور اپنے مسائل

عمل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنے کے ساتھ ساتھ اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہیے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ بدسلوکی اور قطع رحمی کا جرم کر رہے ہیں، جس کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے رزق کی فراوانی ان کے حق میں روک لی ہے۔

ماں باپ کی خدمت جنت کا حقدار بناتی ہے:

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

رغم انف ثم رغم انف ثم رغم انف من ادرک ابویہ عند الکبر احدھما او کلاھما فلم یدخل الجنۃ۔ (مسلم)

اس شخص کی ناک غبار آلود ہو، اس شخص کی ناک غبار آلود، اس شخص کی ناک غبار آلود ہو جو اپنے ماں باپ سے کسی ایک یا دونوں کو بڑھاپے کی حالت میں پائے اور اُن کی خدمت کر کے جنت کا مستحق نہ بنے۔"

اس حدیث کے مطابق وہ شخص کتنا بدقسمت ہے جس نے ماں باپ کو مجبوری اور محتاجی کی عمر میں پایا۔ پھر بھی ان کی خدمت نہ کی۔ اگر وہ خدمت کرے گا تو اس صلے میں اسے جنت ملے گی۔

عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا:

میں آپ سے ہجرت اور جہاد پر بیعت کرتا ہوں۔ میں اس کے صلے میں اللہ سے اجر چاہتا ہوں۔

آپ نے پوچھا:

کیا تیرے والدین میں سے کوئی زندہ ہے؟

اس نے کہا:

ہاں! بلکہ دونوں بقید حیات ہیں۔

آپ نے پوچھا:

کیا تو اس کے بدلے میں اللہ سے بدلہ چاہتا ہے؟

اس نے کہا:

ہاں!

آپ نے فرمایا:

"اپنے والدین کے پاس جاؤ اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرو۔" (بخاری، مسلم)

عبداللہ بن عمروؓ ہی سے ایک اور حدیث اس سے ملتی جلتی مروی ہے کہ ایک شخص آیا۔ اس نے رسول اللہؐ سے جہاد کرنے کی اجازت چاہی۔

آپ نے فرمایا:

کیا تیرے والدین زندہ ہیں؟

اس نے کہا:

جی ہاں!

آپ نے فرمایا:

اُن کی خدمت ہی تمہارا جہاد ہے۔" (بخاری ومسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جس طرح ہجرت اور جہاد اللہ کی نظر میں پسندیدہ عمل ہیں اور ان پر بے پناہ اجر ہے، اسی طرح ماں باپ کی خدمت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت زیادہ اجر ہے۔ اگر ماں باپ کی خدمت کرنے والا صرف اس کا ایک بیٹا ہے تو جہاد پر جانے اور ہجرت کرنے سے بڑھ کر ماں باپ کی خدمت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں کئی صحابہؓ ایسے تھے جن کے ماں باپ بوڑھے تھے اور وہ قدم قدم پر دوسروں کے سہارے کے محتاج تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بدر، احد، احزاب وحنین کی جنگوں میں شرکت کی اجازت نہیں دی بلکہ انہیں تاکید کی کہ وہ اپنے محتاج ماں باپ کی خدمت کریں، وہی ان کے حق میں جہاد لکھا جائے گا۔

ماں باپ کو ستانے کی سزا دنیا میں بھی ملے گی

یہ دنیا دار الجزا نہیں بلکہ دار العمل ہے۔ دار الجزا آخرت ہے۔ آخرت ہی میں انسانوں کو ان کے اعمال کے صلے میں اچھا یا بُرا بدلہ ملے گا۔ پھر بھی چند چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے خود ہی اس اصول سے مستثنیٰ رکھا ہے۔ چند گناہ ایسے ہیں جن پر توبہ نہ کی گئی اور اللہ سے معافی نہ مانگی گئی تو اُن کی پاداش میں دنیا میں بھی سزا ملے گی اور آخرت میں بھی ملے گی۔ سنن ابن ماجہ میں ایک حدیث قدسی ہے کہ

الیٰ فرماتا ہے:

بندوں کے جن گناہوں کو چاہوں گا، قیامت کے دن معاف کردوں گا لیکن تین گناہ ایسے ہیں جن کی سزا لازماً دنیا میں بھی دوں گا اور آخرت میں بھی۔ وہ تین گناہ ہیں:

۱۔ کفر و ایمان کی جنگ میں پیٹھ پھیر کر بھاگنا۔
۲۔ جن رشتوں کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے انھیں توڑنا اور
۳۔ ماں باپ کو ستانا۔

اس حدیث کی روشنی میں اگر ہم اپنے معاشرے کا جائزہ لیں تو ایسے سے لوگ ملیں گے جنھوں نے اپنے ماں باپ پر ظلم و ستم کی انتہا کی ہوگی یا ہر طرح کی تعذیب کا نشانہ بنایا ہوگا اور اس کی پاداش میں انہیں ناک حادثات سے دوچار ہونا پڑا ہوگا۔ یہ عبرت ناک حادثات وہی ہے جس کی طرف حدیث بالا میں اشارہ کیا گیا ہے۔

ماں باپ کے احسانات کا بدلہ چکانا مشکل ہے

ماں باپ نے جو احسانات ہم پر کیے ہیں وہ بے پایاں ہیں کا بدلہ کسی طور ممکن نہیں۔ ایک بار ایک صحابیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ م کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

یا رسول اللہؐ! میری ماں معذور ہیں۔ میں انھیں اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتا ہوں۔ اپنے ہاتھ سے ان کی صفائی کرتا ہوں۔ قدم قدم پر انھیں میری ضرورت ہے میں ان کی اچھی طرح خدمت کرتا ہوں۔ ماں نے حج کی خواہش ظاہر کی، میں نے اُن کی یہ خواہش اس طرح پوری کی کہ انھیں پیٹھ پر لیے لیے وطن سے مکہ آیا، پیٹھ پر ہی انھیں طواف کرایا اسی حالت میں صفا اور مروہ کی سعی کرائی، اسی طرح عرفات میں لے گیا اور سارے مناسک حج اپنی پیٹھ پر ادا کرائے۔ کیا میں نے اپنی ماں کا حق ادا کر دیا؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تم ماں کے احسانات کا بدلہ چکانے کی بات کرتے ہو۔ واللہ تم نے تو ماں کے ان بے شمار جھٹکوں میں سے ایک جھٹکے کا بھی حق ادا نہیں کیا جو اس نے تمہاری پیدائش کے وقت برداشت کیے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے ماں باپ کے احسانات کا بدلہ چکانے کی ایک صورت بتائی ہے:

لا یجزی ولدٌ والداً الا ان یجدہ مملوکا فیشتریہ فیعتقہ۔

(مسلم)

"کوئی بیٹا اپنے والد کے احسانات کا بدلہ نہیں دے سکتا۔ البتہ اس کی ایک صورت ہے وہ یہ کہ وہ اسے غلامی کی حالت میں پائے تو اسے خرید کر آزاد کر دے۔"

غلامی کی زندگی سے نجات دلا کر آزادی کی فضا میں سانس لینے کا موقع فراہم کرنا واقعی ایسا کارِ خیر اور افضل عمل ہے کہ وہ ماں باپ کے احسانات کے برابر ہو سکتا ہے۔

مسلم اسپین میں سڑک کے دونوں طرف روشنی کا استعمال اس وقت کیا جاتا تھا جب فرانس کی راجدھانی پیرس میں لوگوں کے پاؤں کیچڑ سے آلودہ رہتے تھے۔

فلپ کے۔ ھٹی

انوراڈھا ـــــ ہندوستان کی ایک نئی پیش رفت

سید مفتاح الحسن رضوی

انسانی تہذیب کی ترقی کی تاریخ سائنسی ترقی کے ساتھ منسلک ہے انسان جیسے جیسے تہذیب و تمدن سے آشنا ہوتا گیا، اسے نت نئی آرام دہ زندگی بسر کرنے کی فکر بھی بڑھتی گئی۔ جس کے لیے اُس نے مختلف موضوعات خصوصاً روزمرہ کام آنے والی چیزوں پر اپنے ذہن کو تحقیق و تجسس میں لگایا۔ کیوں کہ سائنس صرف بڑے بڑے دارالعمل میں ہی نہیں سیکھی جاسکتی ہے بلکہ زندگی میں کام آنے والی بہت ہی معمولی چیزوں کے توسط سے بھی حاصل کی جاتی ہے سائنس میں دراصل دو باتیں نہایت اہم ہیں۔ اول ذوق اور دوئم جستجو نتیجہ زمانہ قدیم میں کچھ بھی برآمد ہوا ہو مگر تاریخ سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ چند ناکامیابیوں کے باوجود تھوڑی بہت کامیابی بھی ضرور ملتی رہی ہے۔ اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب دنیا میں سائنسی انقلابات اور تغیرات نے تمام انسانوں کے ذہن کو نئے طرز پر سوچنے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے پر آمادہ کیا۔ توہمات کی دیواریں منہدم ہوئیں اور ایک نئے دور کا آغاز ہوا جسے ہم آج سائنسی تہذیب کا دور کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔

تقریباً سو سال قبل ہماری واقفیت دنیا کے بارے میں محض پرکاش کرن تک ہی محدود تھی ہمیں اشعاع (Radiation) کی مختلف قسموں کے متعلق جانکاری نہیں تھی لیکن بعد میں سائنس دانوں نے ثابت کر دکھایا کہ اشعاع مختلف قسم کی ہوتی ہیں جس نے نہ صرف ہماری معلومات میں ہی اضافہ کیا بلکہ انسانی زندگی کے تاریک پہلوؤں میں ضیا بخش دی۔

فرانس کے سائنس داں بیکویرل نے اس بات کا پتہ لگایا کہ غیر مرئی شعاعیں (Radiation) یورینیم اور اس کے کچھ سالٹ سے خود ہی نکلتی رہتی ہیں جو transparent چیزوں میں داخل ہونے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور فوٹوگرافک پلیٹ کو کالا کر دیتی ہیں۔ بعد میں سائنس داں ردرفورڈ نے تحقیقی عمل سے معلوم کیا کہ وہ کرنیں جو منفی پلیٹ کی طرف مڑ جاتی ہیں انھیں ـــ کرن یا X-rays، مثبت پلیٹ کی جانب مڑ جانے والی β-rays اور وہ کرن جو الیکٹریکل فیلڈ پر بغیر اثر کیے ہو سیدھے نکل جاتی ہیں۔ انھیں γ-rays کہتے ہیں۔

ہماری روزمرہ کی زندگی میں ان کرنوں کی بڑی اہمیت ہے۔ مثال کے طور پر ہم X-rays کو ہی لیں X-rays سے انجینیروں کو پل یا بڑی بڑی عمارتوں میں لوہے کے گارڈروں میں موجود دراڑ کا پتہ لگانے میں بہت آسانی ہوئی۔ میڈیکل سائنس کے میدان میں اس rays کا استعمال کینسر جیسے مہلک مرض میں کیا جاتا ہے۔ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور جسم کے اندرونی حصہ میں موجود چیزوں کا پتہ بھی اس سے لگا لیا جاتا ہے۔ ہیرے کے نقلی اور اصلی ہونے کی جانچ بھی X-rays سے کی جاسکتی ہے۔

انھیں تمام فوائد کو مدنظر رکھتے ہوئے سائنس دانوں کے دل میں آگے تحقیق کرنے کی دلچسپی بڑھی۔ ان لوگوں نے دیکھا کہ ان کے علاوہ بھی خلا سے زمین تک ایک شے لگاتار آتی رہتی ہے۔ دور جدید کی تحقیق کے مطابق ہم انھیں کائناتی اشعاع (کاسمک ریز) کہتے ہیں۔ ڈاکٹر ہومی جہانگیر بھابھا نے اس کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس صدی کی دوسری دہائی میں ہوا کے جوہروں کے خود بخود آیونائزیشن (Ionization) کا علم سائنس دانوں کو ہو چکا تھا۔ مطلب نہ دکھائی پڑنے والی شئے ہوا کے جوہروں پر ضرب لگا کر ان کے

رضوی ہاؤس، ہسپورہ، اورنگ آباد۔

باہری الیکٹرون کو توڑ کر الگ کر دیتی ہیں۔ جس کے بعد ہی جوہر آئن (Ions) بن جاتے ہیں۔

اب سائنس دانوں کے ذہن میں مختلف سوالات ابھر کر سامنے آنے لگے۔ مثلاً اس طرح ضرب کرنے والی شے کون سی ہے اور کہاں سے آتی ہے؟ جرمن کے سائنس داں ہس (Hess) نے ۱۹۱۲ء میں اپنے تجرباتی عمل میں ایک آلے کو غبارے کے ساتھ زمین کی سطح سے ۵ کلو میٹر اوپر بھیجا۔ جس سے معلوم ہوا کہ بالائی سطح پر آیو نائزیشن (Ionisation) تیزی کے ساتھ ہوا ہے اور برابر خلا سے وہ ضرب کرنے والی شے آتی رہتی ہے۔ ۱۹۲۲ء میں پھر ایک دوسرے امریکی سائنس داں رابرٹ ملیکن نے غبارے کو ۱۶ کلو میٹر کی اونچائی پر بھیج کر اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ طاقتور ریڈئیشن (Radiation) کا آبشار جو کرۂ ہوا میں نظر آتا ہے دراصل وہ کائناتی شعاعیں (Cosmic Rays) ہیں۔

اب ہندوستان نے انورادھا جیسے غیر معمولی خلائی تجرباتی آلے کو امریکی خلائی جہاز چیلنجر کے ذریعے ۳۰۵ کلو میٹر اوپر خلا میں بھیجا ہے۔ جس سے کائناتی اشعاع کے نئے سرچشمے کا پتہ لگانا ممکن ہو سکے گا۔

انورادھا بیلن نما ہے۔ جس کا وزن ۴۵ کلو گرام، اونچائی ۵۵ سینٹی میٹر اور قطر ۵۰ سینٹی میٹر ہے۔ اس میں کل ۴۰ لاکھ روپیے خرچ ہوئے ہیں اسپیس لیب میں ایک کمپیوٹر نصب کیا گیا ہے جس میں انورادھا سے حصول ہونے والے اعداد و شمار زمین تک پہنچتے رہتے ہیں۔ یہ ممبئی کے ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف فنڈامینٹل ریسرچ اور احمد آباد کے فزیکل لیباریٹری کے سائنس دانوں کا تیار کردہ ہے اس میں کم توانائی (Low energy) والے کائناتی اشعاع کو ریکارڈ کرنے کے لیے ایک مخصوص آلہ بھی موجود ہے۔ دراصل انورادھا کے بھیجنے کا مقصد ایک یہ بھی ہے کہ سائنس دانوں نے اب تک کائناتی اشعاع پر تحقیق کر کے جو نتائج اخذ کیے، اس کی صداقت کا پتہ لگانا مقصود تھا۔

سورج کائناتی اشعاع کا ایک بڑا سرچشمہ ہے۔ یہ اشعاع اصل جوہروں کے ذرّے ہوتے ہیں جن میں ہائیڈروجن اور ہیلیم کے مرکزہ (نیوکلیس) کے علاوہ یورینیم تک کے وزنی آئنس (Ions) آتے ہیں۔ ان تمام باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ کہکشاں کے دوسرے تارے بھی ان اشعاع کے سرچشمہ ہیں۔

سائنس دانوں کے سامنے کائناتی اشعاع کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ کیونکہ اس میں بے انتہا توانائی موجود ہے۔ اس وقت جب کہ ہمیں توانائی کے متبادل کی تلاش ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ مستقبل قریب کی نئی تحقیق سے یہ اشعاع اور بھی زیادہ مفید اور کارآمد ثابت ہوں۔ زیادہ توانائی ہونے کی وجہ سے اس میں ہوا کے جوہروں کو توڑنے کی صلاحیت ہے۔ تقریباً روشنی کی رفتار یعنی ایک سکنڈ میں تین لاکھ کلو میٹر سے کرۂ ہوا میں جانے والے کائناتی جوہری ذروں کی توانائی ۱۰ کرور سے ۱۰۰،۰۰۰،۰۰۰ ارب (۱۰ ملین ارب) الیکٹرون وولٹ تک ہوتی ہے۔

کرۂ ہوا کے بالائی سطح پر موجود جوہروں پر ان کائناتی اشعاع کے نیوکلیس پروٹون، الفا وغیرہ اور آئن ضرب کرتے ہیں جن کے نتیجے میں بہت سارے چھوٹے ذرے وجود میں آتے ہیں۔ یہی ذرے آبشار کی طرح زمین پر آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ کرۂ ہوا کے اوپری حصے میں خلا سے پہنچنے والی کائناتی اشعاع پرائمری کائناتی اشعاع کہلاتی ہیں۔ اب تک جوہر کے اندر ۲۰۰ سے بھی زائد ذرّوں کی شناخت ہو چکی ہے۔

دائی پروٹون الفا ذرات (Alpha particles)

"تم جھوٹ سے بچو کیوں کہ جھوٹ دوزخ کی طرف لے جاتا ہے"
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

"زبان کو شکایت کے لیے بند رکھو، خوشی کی زندگی عطا ہوگی۔"
ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

"دوسروں کا حق غصب نہ کرو اور اپنا حق واجب لینے میں کوتاہی نہ کرو"
حضرت علی کرم اللہ وجہ

"دشمن کو دل کی مہربانی اور احسان سے جیتو اور دوست کو نیک سلوک سے۔"
خواجہ معین الدین چشتیؒ

ہلیم کے نیوکلیس کا استعمال جوہروں کو توڑنے میں کیا جاتا ہے یہاں پر طاقتور (Accelerator) کام میں لائے جاتے ہیں۔ جوہر کے اندر مختلف ذروں کا پتہ لگایا جا چکا ہے۔ امید ہے کہ تحقیق و تجسس کا یہ سلسلہ اسی طرح قایم رہا تو ہمارے سائنس داں دنیا کی بناوٹ اور دیگر اہم باتوں کی جانب بھی حیرت انگیز باتوں کا انکشاف کر پائیں گے۔

آج سارے ہندوستانی انورادھا کے کامیاب سفر کو ایک زبردست کامیابی تصور کر رہے ہیں۔ بیشک ایسی کامیابی ہم سب ہی کے لیے فخر کی بات ہے اور ہماری آئندہ نسل بھی کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔

پروفیسر بسواس نے جو اس پروجیکٹ کے پرنسپل انویسٹی گیٹر ہیں، کیلی فورنیا میں واقع ڈرائیڈن سے روانہ کیے اپنے ایک بجری تار میں انورادھا کے کامیاب سفر اور امریکی شٹل کے زمین پر اترنے کی اطلاع دی۔ اپنے دیگر چار معاونوں کے ہمراہ مئی ۱۹۸۵ء کو ۴۰ کلوگرام وزن کے ٹیپ اعداد و شمار کے ساتھ وطن واپس ہوئے انورادھا سے ۹۰ گھنٹے کے دوران حاصل شدہ اعداد و شمار سے حیرت انگیز اور کارآمد نتائج برآمد ہونے کی توقع ہے۔ ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ فار فنڈامینٹل ریسرچ کے ڈائرکٹر پروفیسر بی۔ وی سری کنٹھ نے کہا ہے کہ ان اعداد و شمار کی تفصیل تیار کرنے میں تقریباً ایک سال لگ جائے گا۔

ہندوستانی سائنس داں مبارک باد کے مستحق ہیں

جن کی کاوش نے ڈاکٹر ہومی جہانگیر بھابھا کے ادھورے خو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ایک اہم رول ادا کیا۔ حکومت اسکالروں کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے جس سے ہمارے سائنہ تحقیق و تجسس کے میر کارواں بن کر تیز قدموں سے اپنی منز طرف بڑھ رہے ہیں۔ جہاں تک پہنچنے کا خواب کبھی نہرو جی، جی اور ماضی کے عظیم ہندوستانی سائنس دانوں نے دیکھا نہرو جی کو آزادی حاصل کرنے کے بعد اس بات کا سخت احسا کہ دنیا کے سائنسی نقشے میں ہمارا کوئی مقام نہیں ہے۔ لہذا! میں ملک کے شہریوں کی حالت سدھارنے کے لیے ہمیں سا ٹکنالوجی کو بڑھاوا دینا ہی ہوگا۔ ورنہ ہم چند ترقی یافتہ ممالک ہاتھوں کھلونا ہی بنے رہیں گے۔ آنجہانی وزیراعظم اندرا گاندھی نہرو جی کی سائنسی پالیسی کو اپنا کر یہاں کے سائنس دانوں کی ہمت کی۔ جس سے دنیا میں ہمارا سر فخر سے اونچا ہوا۔ نوجوان وزیر جناب راجیو گاندھی بھی اس میدان میں بہت زیادہ دلچسپ ہیں جس کی بنا پر یقین کامل ہے کہ مستقبل قریب میں ا نئی نئی تحقیق سے عام انسان کی فلاح و بہبود کے لیے ر ہموار ہوں گے۔

> " اے لوگو!
>
> ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور
>
> تم کو مختلف قومیں بنایا۔ تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔
>
> اللہ کے نزدیک تم میں سب سے بڑا شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو"
>
> (الحجرات ۔ ۱۳ - ۴۹)

حیاتِ شبلی

شباب الدین*

اردو میں سوانح نگاری کی تاریخ بہت پرانی نہیں ہے۔ اس زبان میں باقاعدہ سوانح "سیرت فریدیہ" سرسید کے قلم کی مرہونِ منت ہے۔ سرسید کے بعد حالی اور شبلی نے اس فن کو آگے بڑھایا۔ حالی نے "حیاتِ سعدی" "یادگارِ غالب" اور "حیاتِ جاوید" لکھ کر سوانح نگاری کو باقاعدہ ایک فن بنایا۔ شبلی نے بھی ان کے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے مولانا روم، المامون، الغزالی، الفاروق لکھیں جو اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے حیاتِ شبلی لکھ کر اپنے استاد کی روایت کو زندہ رکھا۔

بعض حضرات شبلی کی زندگی ہی میں ان کی سوانح حیات لکھنا چاہتے تھے، جن میں سید افتخار عالم صاحب، صاحب حیات النذیر کا نام سرِ فہرست ہے مگر علامہ شبلی کو بعض وجوہ سے یہ گوارا نہ تھا کہ افتخار عالم صاحب ان کی سوانح لکھیں۔ علامہ ان کو ٹالتے رہے پھر انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی سے درخواست کی کہ وہ اس سلسلے میں ان کی سفارش کریں، سید صاحب نے جب علامہ شبلی کو اس کی اطلاع دی تو انھوں نے فروری ۱۹۱۴ء کے اپنے ایک خط میں سید صاحب کو لکھا کہ

"افتخار عالم صاحب میری لائف کیا لکھیں گے کبھی تم دنیا کے اور کاموں سے فارغ ہو نا تو تم ہی لکھنا۔"

اس تحریر کے چند ہی ماہ بعد یعنی نومبر ۱۹۱۴ء میں شبلی کا انتقال ہو گیا، دارالمصنفین کے قیام کے بعد جہاں اور کاموں کی تکمیل کا خاکہ بنایا گیا وہیں حیاتِ شبلی کی ترتیب و تکمیل بھی پیش نظر رہی اور اس پر کام شروع کیا گیا۔ یہ کام ۱۹۴۳ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ یہ کتاب تیاری کے جن جن مراحل سے گزری اس کے بارے میں سید صاحب لکھتے ہیں:

"خاکسار نے سیرت کی مصروفیات اور خاندانی اور ابتدائی حالات کی عدم واقفیت کے سبب اس کام کو پہلے اپنے رفیق و شریکِ کار مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کے سپرد کیا کہ وہ مولانا سے برادری اور ہم وطنی کا تعلق رکھتے ہیں اس لیے وہ اس کام کو مجھ سے بہتر انجام دے سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس کام کو اس طرح انجام دیا کہ خاندانی حالات کے ساتھ مکاتیب شبلی کی متفرق معلومات کو بہ ترتیب یکجا کر دیا، ان اوراق کو مولانا شروانی اور مولانا مرحوم کے دوسرے احباب اور تلامذہ نے دیکھا تو اس مجموعے میں زندگی کی روح نظر نہ آئی۔ پھر یہ کام مولانا کے پرانے شاگرد مولوی اقبال احمد صاحب سہیل ایم۔ اے ایل۔ ایل بی، ایم ایل اے وکیل اعظم گڑھ کے سپرد کیا گیا کہ وہ مولانا سے خاندانی تعلقات اور قدیم واقفیت کی بنا پر بہت کچھ لکھنے کے اہل تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا اور مولوی عبدالسلام صاحب کے مسودے کو گھٹا بڑھا کر اور علی گڑھ کے بہت سے

---

* اسسٹنٹ ایڈیٹر، ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

واقعات کا اضافہ کر کے اپنے زورِ قلم سے بزم میں رزم کی
شان پیدا کر دی، ان کا یہ مضمون "سیرتِ شبلیؒ" کے عنوان
سے "الاصلاح سرائے میر" میں ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء
کے چھ نمبروں میں مسلسل نکلتا رہا۔"

اقبال سہیل صاحب اس سلسلے کو برقرار نہ رکھ سکے۔ ۱۹۴۰ء میں سید صاحب نے مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کا مسودہ اور اقبال سہیل صاحب مرحوم کے مضامین کو سامنے رکھ کر اس کام کا آغاز کیا۔ تین برسوں کی محنت کے بعد آٹھ سو پچاس صفحات کی یہ ضخیم کتاب فروری ۱۹۴۳ء میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب کے بارے میں سید صاحب کا اپنا خیال یہ ہے کہ:

"خاکسار کو یہ دعویٰ نہیں کہ یہ تالیف سوانح عمریوں کے صحیح اصول پر پوری طرح منطبق ہے۔ تاہم یہ کوشش کی گئی ہے کہ جو کچھ معلوم ہوا اس کو بے کم و کاست سپردِ قلم کر دیا جائے۔ مولانا کے سوانح میں بعض رفقا، کار اور معاصرین سے الجھاؤ بھی رہا ہے، کوشش کی گئی ہے کہ اس کشمکش کے تاریخی اظہار میں تعلقات کے شیشوں کو قلم کی بے اعتدالی سے ٹھیس نہ لگنے پائے اور کسی ناگوار واقعے کے ذکر کے موقع پر بھی دامن کو راہ کے کانٹوں سے بچا کر نکلا جائے، تاہم نقائص اور عیوب بشریت کا خاصہ ہیں۔ اس لیے کوئی سوانح نگار اپنی نسبت معصومیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور نہ کسی ایک فیصلے کے متعلق سب کی رائیں ایک ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ محبت اور عقیدت کی نظر جہاں مخدوموں کی بہت سی خامیوں کے دیکھنے سے قاصر رہتی ہے وہاں بدگمانوں کی نگاہیں سب سے پہلے انہی پر پڑتی ہیں، اور اُن کے تکرار و اعادہ میں ان کو ایسی لذت ملتی ہے کہ وہ ممکن کمالات سے کھلا اغماض برت جاتی ہیں، لیکن یہ دونوں باتیں درحقیقت نفسیات فطرت کے مطابق ہیں اور اس میں معتقد و منتقد دونوں معذور ہیں۔ رضامندی کی آنکھ ہر عیب کے مشاہدے سے قاصر رہتی ہے، لیکن ناراضی کی آنکھ برائیوں ہی کو ظاہر کرتی ہے۔ بہر حال شبلی، شبلی تھے، جنیدؒ و شبلیؒ نہ تھے۔"

ان معروضات کے بعد اب ہم اس کتاب پر ایک نظر ڈالتے ہیں، سب سے پہلے حیات شبلی کے عنوان سے سید صاحب نے بارہ صفحات کی ایک تحریر رقم فرمائی ہے جس کا ایک اقتباس ہم ابتدا کی سطروں میں نقل کر چکے ہیں۔ پھر دیباچے کے عنوان سے ۴۰ صفحات کی ایک تحریر ہے جس میں مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خاں، مولانا رحم علی خان منگلوری، مولانا عنایت رسول صاحب چریا کوٹی، مولانا سید محمد علی صاحب مونگیری، مولانا محمد قاسمؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا کرامت علی جونپوریؒ، مولوی چراغ علیؒ اور سرسیدؒ کی ان خدمات پر ایک سرسری سی نظر ڈالی گئی ہے، جو ان حضرات نے دفاع اسلام کے سلسلے میں انجام دی ہیں۔ اس تحریر میں سرسیدؒ کے بعد علامہ شبلیؒ کا ذکر کیا گیا ہے اور شبلی کی ان تمام خدمات کی طرف ایک اشارہ کر دیا گیا ہے جن کی تفصیل کتاب میں آگے آنے والی ہے۔ اس دیباچے کے بعد ستاون صفحات کا ایک مقدمہ سامنے آتا ہے جس میں خلجی اور تغلق عہد کے علمائے خراسان کے ذکر سے بات شروع کی گئی ہے۔ بعد ازاں دیار پورب کے علمی مرکزوں اور وہاں کے علما کا ذکر کرتے ہوئے علمائے جون پور اور علمائے ظفرآباد کی خدمات کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ یہ مقدمہ مدرسہ چشمۂ رحمت کے ذکر پر آ کر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ اس طویل مقدمے کے بعد آٹھ صفحات میں اعظم گڑھ اور اس کے اطراف کے عنوان سے سرکار جون پور کا رقبہ اعظم گڑھ کی تاریخ، وہاں کے نومسلم خاندان، اعظم گڑھ کی وجہ تسمیہ اور اس کے مردم خیز قصبات کے بارے میں تاریخی اور جغرافیائی حقائق پیش کیے گئے ہیں، اس کے بعد جو ابواب لکھے گئے ہیں ان کی فہرست یوں ہے۔ ولادت اور تعلیم و تربیت (اس باب میں ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۸۸۰ء تک کے تمام واقعات اور مولانا شبلی کے مشاغل کا احاطہ کیا گیا ہے) تصنیف کا آغاز، سفرنامہ، کلیات اور رسائل، ندوۃ العلماء کی مذہبی اور تعلیمی اصلاح کی تحریک میں شرکت (اس باب میں ۱۹۰۴ء تک کے تمام اہم واقعات اور شبلی کے تمام مشاغل کا تفصیل سے ذکر ہے) دارالعلوم ندوۃ العلماء کی معتمدی (یہ باب ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۳ء تک کے حالات کا احاطہ کرتا ہے) الندوہ، دارالعلوم ندوہ کی مالی ترقی سے متعلق مولانا کی خدمات پاؤں کا حادثہ، بعض دوسری تعلیمی خدمات، مذہبی اور قومی کام، سیاسیات

ندوۃ العلما میں مولانا کی مخالفت اور معتمدی سے استعفیٰ، بھائی کی وفات، اور وطن کی بازگشت اور مرحوم بھائی کے ادھورے کاموں کی تکمیل کا عزم۔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، دارالمصنفین، سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم وفات، آل اولاد، اخلاق وعادات، مراثی و قطعات، اس عنوانات کی فہرست سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کتاب میں علامہ شبلی کی زندگی پر کس قدر تفصیل سے نظر ڈالی گئی ہے۔

سید صاحب کے جس مقدمے کا ذکر اوپر کی سطروں میں کیا گیا ہے بلا شبہ وہ انتہائی دل چسپ اور مفید معلومات فراہم کرتا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ وہ حیات شبلی کے پس منظر کا کام بھی انجام دیتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ سید صاحب نے اتنا طول طویل مقدمہ لکھ کر اس دانش وری کی روایت کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جس پر آگے چل کر شبلی کو اپنی تصانیف کی بلند و بالا اور سنگین عمارت قایم کرنی تھی۔

ولادت و تعلیم کے عنوان سے اس کتاب میں جو باب ملتا ہے اس میں حیات شبلی کے چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے اور ان واقعات کی روشنی میں یہ دیکھنے کی سعی کی گئی ہے کہ شبلی کی شخصیت کی تشکیل میں ان کے معاشرے اور مذکورہ واقعات کا کیسا اور کتنا حصہ رہا ہے، اس کے بعد سید صاحب نے شبلی کا جو مرقع کھینچا ہے اس میں تمام جزئیات آگئی ہیں۔ اگر انھوں نے ایم اے او کالج میں کسی کی آمد پر کوئی خیر مقدمی نظم بھی لکھی ہے تو اس کو بھی ایک ذیلی عنوان قایم کر کے حیات شبلی کا ایک نمایاں واقعہ بنا دیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ سر سید اور شبلی کا اختلاف پہلی بار ایک تقریر کے سلسلے میں ہوا تھا جو جمہوریت کی تائید میں تھی۔ اس تقریر کے بارے میں مولانا سید سلیمان ندوی رقمطراز ہیں:

> "مولانا فرماتے تھے کہ ایک دفعہ یونین میں یہ بحث تھی کہ جمہوری طرز حکومت بہتر ہے یا شخصی؟ جلسے میں سید صاحب بھی موجود تھے۔ مولانا نے جمہوری طرز حکومت کی تائید کی۔ اور اس موضوع پر ایسی مدلل اور موثر تقریر کی کہ تمام طالب علموں نے ان کی موافقت میں رائے دی۔ یہ امر سید صاحب کے مذاق سیاست کے سراسر خلاف تھا۔ چنانچہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اس کے خلاف تقریر کی، بلکہ ایک مضمون بھی لکھا تب جاکر کہیں ان کی طبیعت کی بھڑاس نکلی۔ سر سید نے اپنا یہ مضمون ایشیائی اسلامی طرز حکومت کے عنوان سے ۲۸ جون ۱۸۹۲ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھپایا تھا۔"[1]

ہمارے نزدیک مولانا سید سلیمان ندوی کا یہ خیال "تب جاکر کہیں ان کی طبیعت کی بھڑاس نکلی" درست نہیں معلوم ہوتا۔ کیوں کہ اس کے بعد کے پیراگراف میں مولانا سید سلیمان ندوی نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ اسی سال جب علامہ شبلی کا مقالہ کتب خانہ اسکندریہ شایع ہوا اور اس سے قبل جو مقالہ انھوں نے جزیہ کے عنوان سے لکھا تھا، دونوں مقالوں نے تحقیق کی دنیا میں دھوم مچادی۔ ان مقالات کو پڑھنے کے بعد سر سید کو یہ خیال آیا کہ مغربی مصنفین نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو تاریخی غلطیوں کا انبار لگا رکھا ہے، اس کے سدباب کے لیے ایک مجلس قایم کی جائے۔ سر سید نے اپنی اس تجویز کا خاکہ ۱۸۹۲ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شایع کیا جس میں یہ بھی اعلان کیا کہ علامہ شبلی کے مذکورہ بالا دونوں مقالے اس سلسلے میں داخل کیے جاتے ہیں۔ اگر سر سید کے دل میں شبلی کے خلاف کوئی بغض ہوتا تو وہ ایسا نہ کرتے اور اگر انھوں نے "اپنے دل کی بھڑاس" نکالنے کے لیے شبلی کے مقالے کا جواب لکھا ہوتا تو اسی سال یعنی ۱۸۹۲ء میں ان کو "صیغۂ تصحیح تاریخ" کا سکریٹری نہ مقرر کرتے۔ شبلی اور سر سید دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کا مقلد نہ تھا۔ دونوں ہی اپنی الگ الگ اور مجتہدانہ رائے رکھتے تھے اور اس اختلاف فکر و نظر کو دونوں چھپاتے نہ تھے، بلکہ بر سر عام ظاہر کر دیا کرتے تھے جو ہمارے نزدیک دونوں ہی کی عظمت کی دلیل ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس موضوع کو بہت پھیلا کر لکھا ہے اور کتاب کے سترہ صفحات میں یہ داستان بیان کی ہے جس میں علامہ شبلی کا برسر حق اور سر سید کا برسر باطل ہونا بڑے فنکارانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حیات شبلی کی اشاعت کے چند برسوں ہی کے بعد اس کے جواب میں کئی کتابیں شایع ہو کر منظر عام پر آگئیں جن میں امین زبیری کی "ذکر شبلی" (۱۹۴۶ء) تبصرۂ حیات شبلی، وحید قریشی کی "شبلی کی حیات معاشقہ" (۱۹۵۰ء) اور شیخ اکرام کی "شبلی نامہ" کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سر سید اور شبلی دونوں کے فکر و نظر میں اختلاف

تھا۔ یہ اختلاف کہیں معمولی انحراف ہوتا اور کہیں سنگین اختلاف۔ اگر صرف اختلاف فکرونظر کی صحیح اور مکمل تصویر کشی حیاتِ شبلی میں کردی جاتی تو شاید اس کے ردعمل میں اتنی کتابیں اور مقالے منصۂ شہود پر نہ آتے مگر چوں کہ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کتاب میں یک رخی تصویر پیش کی ہے، اس لیے اس کا شدید ردعمل ظاہر ہوا۔ ہمارے ان خیال کی تصدیق درج ذیل مثال سے ہوجائے گی۔ مولانا سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں:

"ایک دفعہ سرسیّد نے مولانا سے پوچھا کہ ہمارے کالج میں ان تاکیدوں کے باوجود لڑکے نماز کے پابند کیوں نہیں ہوتے فرمایا۔ اس لیے کہ وہ آپ کو پڑھتے نہیں دیکھتے۔ آپ شام کو کالج کی تعمیرات دیکھنے مسجد کے سامنے آتے ہیں مغرب کی اذان اور نماز ہوجاتی ہے اور آپ شریک نہیں ہوتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ آپ نماز نہیں پڑھتے۔ انھیں کیا معلوم کہ آپ کو سلسل البول کی وجہ سے کپڑے اتارنے پڑتے ہیں اور آپ دونوں نمازیں ملا کر (جمع بین الصلوتین) پڑھتے ہیں"۔ ۵؎

سید سلیمان ندوی کا درج بالا اقتباس بلا کسی حوالے کے تحریر ہوا ہے۔ انھوں نے یہ بھی تحریر نہیں فرمایا کہ ان کو یہ معلومات علامہ شبلی کی زبانی حاصل ہوئی ہیں۔ ہم کو اس بات کے ماننے میں تامل ہے کہ کالج کے لڑکے سرسیّد کو نماز پڑھتے نہ دیکھتے رہے ہوں گے۔ خود علامہ شبلی نے سرسیّد کا کالج کی مسجد میں نماز پڑھنے اور آمین بالجہر کی آواز سے مسجد کے گونج اُٹھنے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"مغرب کی نماز سبحان اللہ! کیا شان وشوکت ہوتی ہے کہ بس دل بچھا پڑتا ہے۔ خود سید صاحب بھی شریک نماز ہوتے ہیں اور چوں کہ وہ عامل بالحدیث ہیں، آمین زور سے کہتے ہیں، ان کی آمین کی گونج مذہبی جوش کے رگ میں خون بڑھا دیتی ہے۔" ۶؎

اسی ایک مثال سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کتاب میں سرسید کی شخصیت کی تخفیف کی گئی ہے اور اکثر جگہ مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے بلاحوالہ اطلاعات قلم بند ہوگئی ہیں۔

جہاں تک سرسید کی مذہبی فکر کا سوال ہے۔ اس سلسلے میں یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سرسید کی مذہبی فکر سے اختلاف کرنے والے صرف علامہ شبلی ہی نہ تھے، بلکہ سرسیّد کی جماعت کے اور افراد مثلاً محسن الملک، نذیر احمد حتیٰ کہ مولانا حالی بھی بعض مسائل کے سلسلے میں ان سے اختلاف رائے رکھتے تھے۔ امت مسلمہ میں یہ اختلاف رائے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ جو کہ سنیوں کی چار فقہوں کے بانی مبانی ہیں کیا ان کے زمانے کے علما نے ان سے اختلاف نہیں کیا؟ کیا امام غزالیؒ، امام ابن تیمیہؒ، امام رازیؒ، امام ابن قیمؒ، ابن جوزیؒ کی نکیر ان کے زمانے کے بعض علمانے نہیں کی؟ خود ہمارے زمانے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے افکار وخیالات سے مولانا حسین احمد مدنی کھلا اختلاف نہیں رکھتے رہے۔ اس لیے اگر سرسیّد کی مذہبی فکر کے بعض اجزا سے اُس زمانے کے بعض علما نے اختلاف کیا تو اس کو کوئی اور معنیٰ پہنانا ہمارے نزدیک دیانت داری کے خلاف ہے۔

ندوۃ العلما یعنی علما کی مذہبی وتعلیمی تحریک میں علامہ شبلی کی شرکت سے جو وزن ووقار کا اضافہ ہوا اور اس تحریک کی پیش رفت میں ان کا جو حصہ تھا، سیّد سلیمان ندوی نے اس کی تفصیل بڑی جاں سوزی سے مرتب کی ہے اور علامہ شبلی کی زندگی کے اس دور کے بارے میں تمام جزئیات کو جمع کردیا ہے۔ اس تحریک کی کامیابی کے بعد جب دارالعلوم ندوۃ العلما قایم ہوگیا تو علامہ شبلی اس کے ہر کام میں پیش پیش رہے۔ پھر ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۳ء تک انھوں نے معتمد تعلیمات کا عہدہ سنبھالا اور ندوہ کو ترقی دینے میں منہمک ہوگئے۔ پھر ۱۹۱۳ء میں علامہ شبلی اور دیگر اراکین ندوہ سے کچھ ایسے اختلافات ہوگئے جو روز بروز بڑھتے گئے اور اس کا خاتمہ شبلی کے استعفے پر ہوا۔ ان تمام واقعات کو مولانا سید سلیمان ندوی نے بڑی تفصیل سے تحریر کیا ہے۔

شبلی کی تعلیمی خدمات، مذہبی اور قومی کام، سیاسیات اور سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عنوان سے جو باب لکھے گئے ہیں، وہ مولانا سید سلیمان ندوی کی محنت اور دقت نظر کے مظہر ہیں۔ یہ وہ

ابواب ہیں جو شبلی پر کام کرنے والوں کے لیے ہمیشہ ماخذ کا کام دیتے رہیں گے۔ اسی طرح اخلاق و عادات کے عنوان سے جو باب اس کتاب میں شریکِ اشاعت ہے وہ بھی خاصے کی چیز ہے۔ اس کے مطالعے سے علامہ شبلی کے شب و روز کا پروگرام اور ان کی پسند و ناپسند پر روشنی پڑنے کے ساتھ ساتھ ان کے تصنیفی انداز پر بھی بڑی اچھی روشنی پڑتی ہے۔

غرض یہ سوانح عمری، مشرقی ادبیات کی روایت کی پاسدار ہے یعنی شبلی کے الفاظ میں اس کو کتاب المناقب اور مدلل مداحی کہا جا سکتا ہے۔ اس سوانح عمری کے خلاف بہت سے تبصرے شائع ہوئے جو افراط و تفریط کے شکار تھے۔ ہمارے نزدیک اس کتاب پر سب سے اچھا اور متوازن تبصرہ پروفیسر آل احمد سرور صاحب نے کیا ہے جس کے ایک اقتباس پر ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ سرور صاحب لکھتے ہیں:

> "کتاب میں بعض اور بھی خامیاں ہیں۔ شبلی کے پاؤں کے واقعے پر جتنے قصائد اور نظمیں لکھی گئی ہیں، سب خواہ نخواہ درج کی گئی ہیں۔ بہت سے واقعات دہرائے گئے ہیں۔ ندوہ کے واقعات کی اتنی تفصیل کی ضرورت نہ تھی۔ نہ یہ ثابت کرنے کی ضرورت تھی کہ اس زمانے کے جتنے نیک کام تھے ان میں مولانا شبلی کا ہاتھ ضرور تھا۔ سرسید کی انگریزی پرستی پر اعتراض ہے مگر شبلی جب انگریز گورنر کو بلا کر ندوہ کا سنگِ بنیاد رکھتے ہیں تو اس کی دبی زبان سے تعریف کی گئی ہے۔ غرض حیاتِ شبلی باوجود اپنے واقعات کی تفصیل، اپنے موضوعات و مباحث کی وسعت و جامعیت کے باوجود اپنے حوالوں کی صحت اور اپنی استدلال کی وضاحت کے شبلی کی ترجمانی ہے۔ ان پر تنقید نہیں۔ حیاتِ جاوید اور حیاتِ شبلی ایک دوسرے سے اتنی دور ہونے پر بھی بہت قریب ہیں۔ دراصل ہمارے دور کو صرف سرسید اور شبلی کے بجائے دونوں کی ضرورت ہے اور جس طرح محمد علی اور اقبال نے دونوں سے فیض حاصل کیا، اسی طرح ہم بھی کر سکتے ہیں۔"[7]

حواشی

[1] مولانا سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، دار المصنفین اعظم گڑھ، طبع چہارم ۱۹۸۳ء، ص ۵

[2] " " " " ص ۶ – ۷

[3] " " " " ۸ – ۹

[4] " " " " ۱۶۰ – ۱۶۱

[5] " " " " ۲۸۸

[6] مکاتیبِ شبلی، حصہ اول، دار المصنفین اعظم گڑھ، طبع چہارم ۱۹۶۶ء ص ۴۶

[7] آل احمد سرور، تنقیدی اشارے، ادارۂ فروغِ اردو لکھنؤ، ۱۹۵۵ء ص ۲۰۱

علم اخلاق کی تعریف، موضوع، فائدہ

تسنیم بلخی

عموماً سارے لوگ یہ کہتے رہتے ہیں کہ وہ کام اچھا ہے، یہ کام بُرا ہے یا یہ کہ یہ درست ہے اور وہ نادرست ہے، یہ حق ہے یہ باطل ہے، یا یہ کہ وہ ادنیٰ ہے یہ اعلیٰ ہے۔ الغرض کہ چھوٹے بڑے، اچھے بُرے ہر کام میں لوگ یہی کہتے رہتے ہیں۔ حکومت کے افسران بھی قانونی مسائل میں یہی حکم لگاتے ہیں اور کاروباری لوگ بھی کاروبار میں یا کاروبار کے معاملات میں یہی الفاظ بولتے ہیں۔ حتیٰ کہ بچے بھی کھیل کود میں ان ہی دو لفظوں کو استعمال کرتے ہیں۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اچھا اور بُرا کس کو کہتے ہیں اور پھر وہ کون سا پیمانہ یا کون سی ترازو ہے جس سے ناپ تول کر کسی کام کے متعلق یہ کہہ سکیں کہ یہ اچھا ہے یا بُرا ہے؟

پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے ان اغراض و مقاصد میں بھی جن کی طلب میں وہ سرگرداں رہتے ہیں، بہت بڑا اختلاف ہے!

ایک مال کا طالب ہے تو دوسرا حریت و آزادی کا۔ یا کہ یہ جاہ و حشم کا شیدائی ہے تو وہ شہرت کا فدائی، ایک علم کا عاشق ہے تو دوسرا ان سب سے بے خبر ہو کر اپنی تمام آرزوؤں کا مرکز آخرت کی اس زندگی کو بنائے ہوئے ہے جس میں کہ اس کے نفس کو عروج ہوگا اور جہاں اس کو طرح طرح کی نعمتیں ملیں گی۔ مگر یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ ان میں سے بہت سے اغراض و مقاصد وہ ہیں کہ جن کو انسان کے لیے آخری غرض اور انتہائی مقصد نہیں کہا جا سکتا۔ یا یوں کہیے کہ ان میں غایت الغایات یا منتہائے غرض بننے کی صلاحیت ہی نہیں۔

الغرض کہ جو علم بھلائی اور بُرائی کی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ انسانوں کو آپس میں کس طرح معاملہ کرنا چاہیے، لوگوں کو اپنے اعمال میں کس منتہائے غرض اور مقصد عظمیٰ کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اگر وہ علم اس کو واضح کرے اور مفید و کار آمد باتوں کے لیے دلیل کی راہ بنے وہ علم اخلاق کہلاتا ہے۔

ارسطو، محقق دوانی اور مسٹر جون کہتے ہیں کہ جس علم میں انسانی کردار پر اس حیثیت سے بحث کی جائے کہ وہ صواب و خیر ہو یا خطا و شر اور اس طرح بحث کی جائے کہ یہ تمام احکام صواب و خطا اور خیر و شر کسی مرتب نظام کی شکل میں آجائیں تو اس علم کو علم الاخلاق کہتے ہیں۔

روجرس کہتا ہے کہ جو علم ایسے اصول بتاتا ہو جن سے انسانی کردار کی صحیح مقاصد کی حقیقی اور نسبی قدر و قیمت کا تعین ہو سکے[۲] اس کا نام علم الاخلاق ہے۔ اس کو اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ انسان کے بہت سے اعمال انسان سے غیر ارادی طور پر صادر ہوتے ہیں۔ مثلاً سانس لینا، دل کی حرکت کرنا، تاریکی سے روشنی میں اچانک آجانے سے پلکوں کا جھپکنا وغیرہ کا علم الاخلاق کے موضوع سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم ان پر نہ تو اچھے یا بُرے ہونے کا حکم لگاتے ہیں، نہ ہی ان لوگوں کو جن سے یہ امور صادر ہوتے ہیں نیکو کار یا کہ بدکردار کہتے ہیں اور نہ ہی ان امور کی وجہ سے کوئی محاسبہ کرتے ہیں۔ اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ علم الاخلاق لوگوں کے اعمال سے اس طور پر بحث کرتا ہے کہ اُن پر اچھے یا بُرے ہونے کا حکم لگائے مگر یہ بھی یاد رہے کہ ہر عمل میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ اس پر یہ حکم لگایا جا سکے!

صدر شعبۂ اردو علامہ اقبال کالج۔ بہار شریف ۔ نالندہ۔

اس کے علاوہ وہ اعمال بھی ہیں جو انسان اپنے ارادہ سے کرتا ہے اور وہ بھی اُن کے نتائج پر غور و فکر کرنے کے بعد۔ مثلاً ایک شخص یہ سوچتا ہے کہ اس کے شہر میں شفاخانے کی تعمیر قوم کے لیے نافع اور اُن کے مصائب میں تخفیف کا باعث ہوگی۔ یہ سوچنے کے بعد وہ اسے قائم کر دیتا ہے۔ یا یہ کہ ایک شخص اپنے دشمن کے قتل کا ارادہ کرتا ہے اور پھر اپنی تیز فہمی اور ذکاوتِ فکر سے اس کے اسباب پر غور کرتا ہے اور ارادہ کو کامیاب بنا لیتا ہے۔ سو یہ اعمال 'اعمال ارادی' کہلاتے ہیں اور اُن ہی پر یہ حکم لگایا جا سکتا ہے کہ یہ اچھے اعمال ہیں یا برے اور اُن ہی کے متعلق انسان سے بازپرس کی جاتی ہے اور وہ بھی ان ہی امور میں جواب دہ ہوتا ہے۔

ان قسموں کے علاوہ اعمال کی ایک قسم یہ بھی ہے جو بیان کی گئی قسموں سے مشابہت رکھتی ہے اور اسی بنا پر کبھی کبھی ان پر حکم لگانے میں چشم پوشی کی جاتی ہے۔ جیسے بعض آدمی نیند کی حالت میں بعض کام کر گزرتے ہیں، ایک شخص اُٹھتا ہے اور نیند کی حالت میں گھر کو آگ لگا دیتا ہے۔ اس کے برعکس ایک دوسرا آدمی نیند ہی کی حالت میں اُٹھ کر آگ کو بجھا دیتا ہے۔ تو کیا ان عادات کی بنا پر پہلے کو قابل مذمت اور مجرم قرار دیا جائے اور دوسرے کو قابل ستائش اور ممدوح سمجھا جائے۔

کبھی انسان کو نسیان (بھول) کی بیماری لگ جاتی ہے اور وہ اس بیماری کی وجہ سے اس کام کو نہیں کرتا جس کا وقت معین پر کرنا اس کے لیے ضروری ہے۔ کبھی انسان کسی کام میں مستغرق اور منہمک ہوتا ہے۔ مثلاً علم ہندسہ کے کسی مسئلہ کے حل میں یا کسی دلچسپ کہانی کے پڑھنے میں اور اس کا یہ استغراق اس کو کسی سے کیے ہوئے وعدہ یا وقتِ مقررہ کے درس سے غافل کر دیتا ہے۔ لہٰذا فکر و تامل کے بعد ان اعمال کے متعلق ہم کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ سب غیر ارادی اعمال ہیں۔ اس لیے کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ سونے والے شخص نے جان بوجھ کر گھر کو جلایا اور یہ کہ اس کے نتیجے کا وہ پہلے سے اندازہ لگا چکا تھا۔ لہٰذا اس کے اس عمل پر محاسبہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ اس حالت میں اس سے یہ عمل بے ارادہ صادر ہوا ہے۔

اور اگر اس کو یہ معلوم ہے کہ وہ اس مرض میں مبتلا ہے اور اس سے نیند میں ایسے اہم حادثات کے لیے سبب بنتے ہیں یہ کہ آگ اور اس کے لوازمات کو اپنی خواب گاہ اور اپنے ماحول سے جدا نہیں رکھتا (مثلاً) تو ضرور ان اعمال میں بھی اس سے محاسبہ ہوگا۔ اس لیے کہ ایسی صورت میں وہ اخلاقی طور پر اس بات کا جواب دہ ہے۔ جس کی بدولت اس سے غیر جواب دہ اوقات میں ایسے اعمال صادر ہوتے ہیں۔

اسی طرح باقی مثالوں کا حال ہے۔ فرض کیجیے کہ آپ سو رہے ہیں اور چولہے میں آپ نے آگ روشن چھوڑ دی۔ ایک چنگاری اُڑی اور اس نے مکان کو جلا ڈالا۔ ایسی حالت میں آپ کا یہ عذر نہیں سنا جائے گا کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں نیند کی حالت میں کس طرح چنگاریوں کو اُڑنے سے روک سکتا تھا۔ اس لیے کہ آپ سے کہا جائے گا کہ آپ کو معلوم تھا کہ عنقریب میں نیند کی آغوش میں چلا جاؤں گا اور آپ یہ بھی جانتے تھے کہ اس حالت میں حواس کا شعور معطل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا آپ کے لیے یہ لازم تھا کہ بیداری کی حالت میں ان ذرائع کا سدِّ باب کرتے جن کی وجہ سے سونے کی حالت میں یہ حادثہ پیش آیا۔ یعنی پہلے آگ بجھاتے اور پھر سوتے۔

یہی حال اس شخص کا ہے جو پہلے ایک کام کر گزرتا ہے اور پھر جو اس سے نتائج پیدا ہوتے ہیں ان کے متعلق اپنی ناواقفیت کا عذر تراشتا ہے۔ اس لیے کہ انسان ان تمام اعمال میں جواب دہ ہے جو اس کی عادت ثانیہ بن گئے ہیں خواہ ان اعمال کو کرتے وقت اس سے وہ اعمال بغیر ارادہ کے ہی صادر ہوتے رہتے ہوں۔ کیوں کہ عادی ہونا اس کے ارادی عمل کے بار بار صادر ہونے کا ہی قدرتی نتیجہ ہے۔

اگر ایک شخص بھوک سے پریشان ہے اور وہ ناقابل برداشت بھوک کی وجہ سے چوری یا قتل پر مجبور ہو جاتا ہے تو یہ شخص بھی اپنے اس عمل میں قابل محاسبہ ہے۔ اس لیے کہ وہ گم کردہ عقل و شعور نہیں ہے اور جس چیز کا اقدام کر رہا ہے، اس کی حقیقت سے کچھ ناواقف ہے۔ کیوں کہ وہ سوچتا ہے کہ وہ بھوک برداشت کر لے یا گرسنگی رفع کرنے کے لیے چوری یا قتل پر آمادہ ہو جائے اور پھر اپنے ارادے سے دوسرے عمل کو پہلے پر ترجیح دیتا ہے اور اس کو کر گزرتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ علم الاخلاق کا موضوع دو قسم کے اعمال ہیں

۱- وہ اعمال جو عامل کے اختیار و ارادہ سے صادر ہوتے ہیں اور عمل کے وقت وہ خوب جانتا ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔

۲- وہ اعمال جو عمل کے وقت اگرچہ بغیر ارادہ صادر ہوتے ہیں لیکن اختیار شعور اور ارادہ کے وقت ان کے متعلق احتیاط برت سکتا ہے۔

اور یہی وہ اعمال ہیں جن پر اچھے یا برے ہونے کا حکم لگایا جاتا ہے۔ لیکن جو اعمال نہ تو ارادہ اور شعور سے صادر ہوتے ہیں اور نہ اُن کے بارے میں احتیاط برتی جاسکتی ہے وہ علم اخلاق کا موضوع نہیں بن سکتے۔

علم الاخلاق کا فائدہ یہ سوال ذہن میں اُٹھ سکتا ہے کہ کیا علم الاخلاق میں یہ قدرت ہے کہ وہ ہم کو نیکوکار اور صالح بنادے۔

جواب یہ ہے کہ اس علم میں یہ استطاعت اور قدرت نہیں ہے کہ تمام انسانوں کو صالح اور نیکوکار بنادے بلکہ اس کی مثال ایک طبیب کی سی ہے طبیب کا اتنا ہی فرض ہے کہ وہ مریض کو مسکرات کی خرابیوں سے واقف کردے اور جسم و عقل پر اس کے پینے دکھانے سے جو بُرا اثر پڑتا ہے اس کو بیان کردے۔ اس کے بعد مریض کو اختیار ہے کہ اپنی صحت کی بہتری کے لیے اس سے باز رہے یا کہ طبیب کی بتائی ہوئی احتیاط سے بے پرواہ ہو کر اس میں مبتلا ہو جائے۔ ایسی حالت میں طبیب اس کو کیا روک سکتا ہے؟

علم الاخلاق کا بھی یہی حال ہے۔ اس کی طاقت سے یہ تو باہر ہے کہ وہ ہر انسان کو صالح بنادے لیکن انسان کو اچھے اور برے میں امتیاز کراتا ہے اور اس کی چشم عبرت کو وا کرتا ہے تاکہ خیر و شر اور ان کے آثار و لوازم کو دیکھے اور پہچانے۔ ایک اور بات قابل توجہ ہے کہ علم الاخلاق کی غرض صرف نظریوں اور قاعدوں کی معرفت کے ہی اندر محدود و مقصود نہیں ہے بلکہ اس کی اغراض میں یہ بھی شامل ہے کہ ہمارے ارادے میں تاثیر اور ہدایت کارفرما ہو اور ہم میں یہ جذبہ پیدا ہو کہ ہم اپنی ز کی تشکیل کریں اور اپنے اعمال کو رنگین و عمدہ بنائیں تاکہ ہم حیات کے لیے ایک اعلیٰ مثال قائم کردیں اور خوبی کمال اور عامۃ الناس کی بھلائی جیسی چیزوں کو حاصل کریں۔

اس سلسلے میں ارسطو کا قول ہے کہ

فضیلت کے لیے صرف اس قدر جان لینا ہی کافی نہیں ہے کہ کیا شے ہے بلکہ اس سے زائد اور چیزوں کی بھی ضرورت ہے۔ مثلاً ا کے قیام و حفاظت کے لیے ریاضت اور اس کا روز مرہ کے کاموں استعمال اور اسی قسم کے دوسرے وسائل و اسباب کی ایجاد۔ یہ سب باتیں مل کر ہم کو صاحب فضیلت اور نیکوکار بنا سکیں۔

اس سلسلے میں تیوغینس کا قول ہے کہ

چاہیئے تو یہ تھا کہ ہر آدمی اخلاقی کتابوں کا طالب ہوتا اور قد منزلت کے اعتبار سے وہ بیش بہا قیمتوں پر فروخت ہوتیں مگر افسو کہ ایسا نہ ہوا تاہم بدذوقی کے اس دور میں انمول موتی علم اخلاق کے ضروری مبادیات میں سے زیادہ سے زیادہ یہ کیا جاسکتا ہے کہ بعض شریف طینت نوجوان حسن عمل اور نیکوکاری پر استقامت کے لیے کمر ہمت چست کریں اور اپنے سلیم النظرة قلب کو فضائل اخلا کریمانہ کا گرویدہ و شیدائی اور وفادار بنائیں۔

"اگر تم نے ہر حال میں خوش رہنے کا فن سیکھ لیا ہے تو یقین کرو زندگی کا سب سے بڑا فن سیکھ لیا ہے۔"

خلیل جبران

حقیقت خرافات میں کھو گئی !

سیدہ فرحت

مذہب اسلام جس کی اساس قرآن پاک ہے جو پیغمبر آخر الزماں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا جس نے کلمہ لا الہ الا اللہ کے ذریعے وحدانیت کی تعلیم دی اور صوری اور معنوی طور پر ہر قسم کے شرک توہم پرستی کے راستوں پر چلنے کو گمراہی ٹھہرایا ۔ قرآن پاک کے بارے میں مستشرقین نے بھی تسلیم کیا ہے کہ جس نے مشاہدات فطرت اور کائنات پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی جس میں جگہ جگہ عقل سے کام لینے اور علم و تحقیق کے ذریعے عرفان حیات حاصل کرنے کی دعوت دی گئی ہے جس میں سائنسی نقطۂ نظر دیکھنے والوں نے دیگر مذہبی صحائف کے مقابلے میں آیات قرآنی میں زیادہ سائنٹفک نظریات کا مشاہدہ کیا اور تاریخ شاہد ہے کہ علم طب وعلم کیمیا اور دیگر سائنسی علوم کی ابتدا مسلمانوں کے ہاتھوں ہوئی جس کو موجودہ زمانے کے سائنسی محققین بھی تسلیم کرتے ہیں ۔ مگر افسوس ہے کہ آج بھی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مسلمان اس ترقی یافتہ سائنسی دور میں بھی اپنے مذہب کی تعلیم کے برخلاف قرآنی آیات کی غلط تعبیر و تفسیر کی روشنی میں روایت پرستی اور توہم پرستی میں مبتلا ہیں ۔ علی الخصوص ہندوستانی مسلمانوں نے صدیوں کی صحبت ناجنس کے زیر اثر کلمہ لا الہ الا اللہ صرف زبان سے ادا کرتے ہوئے سیکڑوں خیالی بت تراش لیے ۔ کہیں اپنے مذہبی رہنماؤں کو خدائی کا شریک ان کی تعلیمات کے خلاف قرار دیا گیا ہے کسی نے مزار پرستی اختیار کی اور انتہا تو یہ ہے کہ جن بھوت، آسیب جادو، ٹونے پر جاہل تو جاہل، بہ ظاہر تعلیم یافتہ مرد اور عورتیں یقین رکھتی ہیں ۔ قرآن کریم میں انسان کو خلیفۃ الارض کا خطاب دیا گیا ہے اور تمام زمین آسمان کی طاقتوں کو اس کے لیے مسخر کرنے کی بشارت دی گئی ہے ۔ مگر یہ اشرف المخلوقات، خلیفۃ الارض حضرت انسان آج بھی مافوق الفطرت خیالی قوتوں کے آگے سرنگوں ہے ۔ مختلف نفسیاتی اور اعصابی امراض کا علاج موجودہ دور میں عام ہے اور جس کے معالج موجود ہیں، آج بھی جادو کا اثر اور آسیب کا سایہ سمجھے جاتے ہیں اور بزعم خود برخود غلط عاملین سے دعا تعویذ جھاڑ پھونک کرائی جاتی ہے ۔

مثالاً عرض کروں کہ آج کل ہمارے ہی علی گڑھ میں جس میں شعبۂ علم کے پروفیسرز اور محقق موجود ہیں، جس میں اسلامیات اور دینیات کے ماہرین بھی موجود ہیں ۔ ایک لڑکی جو ہسٹریا کی مریض ہے اور نفسیاتی الجھنوں کے باعث نیم پاگل ہے ۔ آج اس کی چوکھٹ پر ان پڑھ تعلیم یافتہ خواتین و حضرات سجدہ کرتے نظر آتے ہیں ۔ اپنے جسمانی امراض اور مختلف قسم کی پریشانیوں اور مسائل کا حل اس جن کی زبانی سنتے ہیں جو اس لڑکی پر آتا ہے ۔ اور اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں ۔ افسوس کہ اسلام کے پیرو خود اسلام کی تعلیمات سے انحراف کر رہے ہیں ۔

فرحت کدہ، دودھ پور، علی گڑھ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۷، ش ۸ (اگست ۸۸ء)

حکیم اجمل خاں
ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار

ارشد مسعود گنگوہی

اجمل خاں صاحب نہ صرف ایک ماہر یونانی طبیب بلکہ ایک پختہ کار سیاست داں اور ہندو مسلم اتحاد کے ایک علمبردار کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ گاندھی جی ان کو "ایک عظیم مسلمان اور ایک عظیم ہندوستانی" کہا کرتے تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو کے الفاظ میں "ہندوستان کے سب سے قابل اعتماد رہنما و سپوت تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی نظر میں وہ "کانگریس کے مضبوط ترین حامی تھے۔ راج گوپال آچاریہ کے نزدیک وہ "ہندوستان کے اتحاد کے لیے کوشش کرنے والے عظیم وطن پرستوں اور کارکنوں میں سے ایک" تھے اور مسز اندرا گاندھی کے خیال میں "وہ ایک ایسی ہستی تھے جو نہ صرف افراد کے امراض کا علاج کرنے کے لیے کوشاں رہے بلکہ پوری قوم کے درد کا درماں تلاش کرنے میں مشغول رہے"۔

اجمل خاں کی ولادت ۱۸۶۳ء میں دہلی میں ہوئی۔ یونانی طب کی تعلیم انھوں نے اپنے والد حاذق الملک حکیم غلام محمود خاں سے حاصل کی کچھ ہی عرصے میں انھوں نے بحیثیت طبیب زبردست فنی مہارت حاصل کر لی اسی دوران انھوں نے اپنے والد صاحب کے جاری کردہ جریدے "اکمل الاخبار" میں مضامین لکھنا شروع کیے۔ جس سے انھیں ملک کی سیاسی صورت حال سے دلچسپی پیدا ہوئی۔

۱۸۹۲ء میں حکیم اجمل خاں کو نواب صاحب رام پور کے ذاتی طبیب کی حیثیت سے ریاست میں قیام کرنا پڑا اور وہاں ان کا تعارف نہ صرف "علی گڑھ تحریک" سے ہوا بلکہ قومی سیاست سے بھی ہوا۔

۱۹۰۲ء میں حکیم صاحب کو بوجہ اپنے والد بزرگوار کے انتقال کے رام پور سے دہلی منتقل ہونا پڑا۔ انھوں نے خاندانی مطب کو بڑی خوش اسلوبی سے قایم رکھا اور بحیثیت طبیب بڑا نام کمایا۔ دہلی میں رہ کر ان کی دلچسپی قومی اور ملکی مسائل میں اور زیادہ ہوگئی۔ مگر اس زمانے میں وہ دل کے درد (انجائنا) کے عارضے میں مبتلا ہو گئے اور ماحول کی تبدیلی کے خیال سے عراق تشریف لے گئے۔

انگریزوں نے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پرانی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے ۱۹۰۵ء میں بنگال کی تقسیم کا اعلان کیا تاکہ ہندوستان میں بڑھتی ہوئی سیاسی بیداری کو روکا جا سکے۔ انگریزوں نے یو۔پی میں اردو۔ہندی تنازعہ کھڑا کر دیا تاکہ فرقہ واریت پروان چڑھ سکے نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کے خیالات کی تائید میں مسلمان دانشوروں نے قومی سیاست سے دور رہنے کی اس حکمت عملی کو خیرباد کہہ دیا جس کی تلقین سر سید علیہ الرحمۃ نے کی تھی۔ مسلمانوں کا ایک وفد (جس میں حکیم صاحب بھی شامل تھے) وائسرائے کی خدمت میں شملہ حاضر ہوا اور ایک عرض داشت گزاری۔ مسلمانوں نے اپنی سیاسی جماعت تشکیل دینے کا فیصلہ کیا۔

۱۹۰۶ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ڈھاکہ میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں نواب صاحب ڈھاکہ سر سلیم اللہ نے ایک قرارداد پیش کی جس میں مسلمانوں کو اپنی علیحدہ جماعت آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے قایم کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ اس قرارداد کی تائید حکیم صاحب

ریڈر شعبۂ قانون، جامعہ احمد بیلو، زاریا، نائجیریا۔

ـ اس وقت مسلم لیگ کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کو حکومت کی وفاداری رکیاجائے، مسلمانوں کے سیاسی مقاصد کا تحفظ کیا جائے، مسلمانوں ئز مطالبات مناسب انداز میں حکومت کے گوش گزار کیے جائیں، مسلمانوں ہندوؤں اور دیگر اقوام کے درمیان خوشگوار تعلقات قایم کیے جائیں۔

اپنے اس نئے انداز فکر کے تحت حکیم صاحب نے دہلی کے "مدرسہ طبیہ" ں کو حکیم صاحب کے والد بزرگوار نے ۱۸۹۳ء میں قایم کیا تھا) میں آیورویدک ہ علاج کی تعلیم کو لازمی قرار دیا۔

۱۹۱۱ء میں حکیم صاحب نے یورپ کا سفر کیا اور وہاں اُن کی ملاقات ڈاکٹر ر احمد انصاری اور عبدالمجید خواجہ سے ہوئی۔ جو گہری دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ حکیم ب کی وطن واپسی کے کچھ ہی دن بعد اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر دیا۔ برطانیہ نے اس جنگ میں انبداری کا اعلان کیا مگر ہندوستانی مسلمانوں کو یہ خیال لاحق ہو گیا کہ مغربی سامراجی طاقتیں اور دوسرے مسلم ممالک کو آپس میں بانٹ لینا چاہتی ہیں۔ اس خیال کو مزید تقویت اس جنگ سے ۱۹۱۲ء میں بلقان میں شروع ہوئی۔ اس نئی صورت حال نے ہندوستانی مسلمانوں کو مکمل یاسی میدان میں کود پڑنے پر ابھارا۔ حکیم صاحب اور مولانا محمد علی جوہر وغیرہ نے عوام سے ے کی اپیل جاری کی۔ تاکہ ترکی کی امداد کی جا سکے۔ اس سلسلے میں ایک طبی مشن ڈاکٹر ر احمد انصاری کی سرکردگی میں ترکی روانہ کر دیا گیا۔

اس وقت تمام مسلمان لیڈروں کو یہ خیال آیا کہ ترکی کے مفادات ، تحفظ میں یہ بات بڑی معاون ثابت ہوگی اگر کانگریس پارٹی بھی ان مفادات کے تحفظ میں دلچسپی لینے لگے۔ اُدھر کانگریسی لیڈروں کو یہ خیال ر کہ اگر ترکی کے حصے بخرے ہو گئے تو انگریز اور زیادہ طاقت ور ہو جائیں ، اور ان کی گرفت ہندوستان پر اور زیادہ سخت ہو جائے گی۔ اس لیے لمن کے مفادات کے حق میں یہ ہوگا کہ مسلمان ہند کے ان مطالبات کی حمایت کی ئے جو وہ ترکی کے حق میں کر رہے ہیں۔ ان وجوہات سے مسلمان لیڈر اور انگریسی لیڈر ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔ ۱۹۱۳ء میں لکھنؤ میں سلم لیگ کے اجلاس میں کانگریس کے صدر بشن نرائن دار صاحب اور سز سروجنی نائیڈو نے تقاریر کیں۔ اور اسی کے بعد آگرہ میں مسلم لیگ کے صدر سر ابراہیم رحمت اللہ نے "تیس کروڑ ہندوستانیوں کے مشترکہ در نگی بات کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ صرف مسلمانوں کی ہی بات نہیں کر رہے ہیں۔

۱۹۱۶ء میں گاندھی جی نے ہندوؤں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے مسلما بھائیوں کے ان مطالبات کی حمایت کریں جو وہ ترکی کے حق میں کر رہے ہیں۔ اسی وجہ سے کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے اپنے سالانہ اجلاس لکھنؤ میں منعقد کرنا طے کیا۔ ان اجلاسوں نے بڑی ہی خوش گوار فضا پیدا کر دی۔ اور مشہور "معاہدۂ لکھنؤ" وجود میں آیا۔ اس نئی صورتِ حال کے پیش نظر حکومت ہند نے نئی آئینی اصلاحات نافذ کرنے کا اعلان کیا۔

۱۹۱۹ء میں کانگریس اور مسلم لیگ نے اپنے سالانہ اجلاس امرتسر میں منعقد کیے۔ حکیم صاحب نے کانگریسی لیڈروں کے سا۔ نے مسلمانوں کا سیاسی اور مذہبی نقطۂ نظر سے اتنے دل آویز انداز میں پیش کیا کہ وہ سب ترکی کے حق میں مسلمانوں کے مطالبات کی بھرپور حمایت کرنے پر تیار ہو گئے حکیم صاحب نے ہی مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے ہندو برادرانِ وطن کے جذبات کے احترام میں گاؤکشی سے احتراز کریں گے۔

۱۹۲۰ء میں گاندھی جی نے تحریک ترک موالات شروع کی۔ حکیم صاحب نے خطاب "حاذق الملک" اور تمغہ "قیصر ہند" حکومت کو لوٹا دیے۔ اس پر جمعیۃ العلماء ہند نے حکیم صاحب کو "مسیح الملک" کے خطاب سے نوازا اسی تحریک کی تائید میں حکیم صاحب نے علی گڑھ کے مدرستہ العلوم مسلمانان ہند (جو بعد میں اُسی سال مسلم یونیورسٹی بنا) کے قریب تین سو طلباء کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اپنی تعلیم کو خیرباد کہہ دیں۔ ان ہی طلباء میں ڈاکٹر ذاکر حسین (جو بعد میں ہندوستان کے صدر جمہوریہ بنے) بھی شامل تھے۔ ان طلباء کو "قومی تعلیم" دینے کے لیے علی گڑھ میں ہی جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا۔ حکیم صاحب کو جامعہ ملیہ کا پہلا چانسلر مقرر کیا گیا۔

اپنے اخلاص اور لگن کی بدولت حکیم صاحب "ہندو مسلم اتحاد کا نمونہ" بن گئے تھے۔ چنانچہ جب ۱۹۲۱ء میں ہندو مہاسبھا نے اپنا اجلاس دہلی میں منعقد کیا تو حکیم صاحب کو مجلسِ استقبالیہ کا صدر مقرر کیا اور حکیم صاحب نے اس کے بدلے میں سوامی شردھانند جی کو جامع مسجد دہلی کے اندر لے جا کر مسلمانوں سے خطاب کرنے کا موقع فراہم کیا۔

۱۹۲۱ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس احمد آباد میں منعقد ہونا قرار پایا۔ اس کی صدارت سی۔ آر۔ داس کو کرنی تھی۔ مگر اجلاس کی تاریخ سے کچھ پہلے ہی ان کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس پر گاندھی جی اور دیگر لیڈروں نے

حکیم صاحب سے درخواست کی کہ وہ سی۔آر۔ داس کی جگہ کرسیٔ صدارت سنبھالیں
حکیم صاحب نے حکومت کے خلاف سخت تقریر کی اور اپنی پرانی وفاداری کی
روایت کو خیرباد کہا۔

بڑھتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد سے گھبرا کر حکومت نے اپنا پرانا
ہتھیار "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" استعمال کرنے کی سوچی۔ اس کے
ایجنٹوں نے "ہندو سماج" کے فرضی نام سے ایسے مضامین لکھنا شروع کیے
جو ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے دور کر دیں۔ خاص طور پر
انھوں نے حکیم صاحب کو نشانہ بنایا تاکہ ان کی ایسی تصویر عوام کے سامنے پیش
کر دی جائے کہ وہ غیر موثر ہو کر رہ جائیں۔ یہ سازش بار آور ہوئی اور ملتان
میں ہندو مسلم فساد رونما ہوا۔ پنڈت مدن موہن مالویہ نے "سنگٹھن"
نامی تحریک کی ابتدا کر دی۔ ان باتوں نے مل کر فضا کو اتنا زہر آلود کر دیا
کہ جب حکیم صاحب ملتان میں فرقہ وارانہ امن بحال کرانے کی کوشش کرنے
وہاں پہنچے تو پوری طرح ناکام ہو گئے۔

اس زمانے میں مصطفےٰ کمال پاشا نے یونانیوں کو شکست دے کر
ترکی کو مزید بحران سے بچا لیا۔ یہ موقع ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے بڑی
ہی خوشی کا تھا مگر اس کا استعمال برطانوی ایجنٹوں نے یہ کیا کہ مسلمانوں
کو یہ سمجھا دیا کہ اب چونکہ ترکی اپنی حفاظت خود کرنے کی پوزیشن میں آگیا ہے
اس لیے ہندوستانی مسلمانوں کو ترکی کے مفادات کے لیے کانگریس کی
طرف دیکھنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ اس بات نے مسلمانوں
کو خاصا متاثر کیا اور وہ کانگریس سے دور ہوتے چلے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ
ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافات کی خلیج وسیع تر ہوتی چلی گئی۔

ہندوستان کے بہت سے لیڈر اس زمانے میں گرفتار کر کے
پنجاب کی جیلوں میں مقید کر دیے گئے تھے۔ ان ہی لوگوں میں سوامی شردھا
نند جی بھی شامل تھے۔ ایک دن پنجاب کے گورنر نے اس جیل کا معائنہ کیا جس
میں سوامی جی بند تھے۔ دونوں میں ملاقات ہوئی۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد
سوامی جی کو جیل سے رہا کر دیا گیا۔

مگر سوامی جی اپنا پرانا "فرقہ وارانہ اتحاد" کا سبق جیل ہی میں بھول کر باہر
نکلے اور جنوری ۱۹۲۳ء میں "بھارت شدھی" نامی تحریک کی بنیاد ڈالی
جس کا مقصد مسلمانوں کو ہندو بنانا تھا۔ اسی تحریک کے زیر اثر بہت سے

غلط کار گروہ (مثلاً "مہاویر دل" اور "سیوک گارڈ") وجود میں
فضا زہر آلود ہو گئی۔ فرقہ وارانہ فسادات کی زبردست لہر چل
جی اور حکیم صاحب نے معاشرے کو فرقہ داریت کے زہر سے بچا
کوشش کی مگر فرقہ پرست اخبارات نے ان دونوں پر زبردس
اور لعن طعن کی بوچھار کر دی اور دونوں کو غیر موثر بنانے کی مہم
گاندھی جی نے مجبور ہو کر فرقہ واریت کے عفریت کے خلاف اپ
ہتھیار استعمال کیا اور امن کی بحالی کے لیے ۲۱۔ دن کا برت ر
جب برت سے گاندھی جی کی حالت بگڑنے لگی تو سارے فرقہ
دہلی میں جمع ہوئے اور حالات کو معمول پر لانے کی کوششیں
اس سے امن قایم ہو گیا اور گاندھی جی نے اپنا برت ختم کر د
مگر یہ امن عارضی ثابت ہوا۔ کچھ ہی دن بعد کوہاٹ م
فساد پھوٹ پڑا۔ گاندھی جی اور مولانا شوکت علی کوہاٹ پہنچ
اپنے ہم مذہبوں سے فساد کے بارے میں معلومات حاصل کی
معلومات کی بنا پر دونوں صاحبان نے جو نتائج اخذ کیے وہ ا
سے مختلف تھے۔ اس پر حکیم صاحب نے دونوں حضرات سے
کی کہ وہ اپنی رپورٹوں کو شائع نہ کریں چوں کہ وہ یک طرفہ اور نا
پر مبنی ہیں مگر دونوں لیڈروں نے حکیم صاحب کی درخواست
کرتے ہوئے اپنی رپورٹیں شائع کر دیں اور گاندھی جی نے د
کہا،

"مسلمان ظالم ہیں اور ہندو بزدل!"

اس بات سے گاندھی جی اور علی برادران میں زبردست خلیج حا
اور پورا ماحول مسموم ہو کر رہ گیا۔

اپریل ۱۹۲۵ء میں حکیم صاحب بغرض علاج یورپ
لے گئے۔ وہاں سے ماہ ستمبر میں واپسی ہوئی۔ اس وقت ہن
فرقہ وارانہ فسادات کے بھنور میں پھنسا ہوا تھا۔ حکیم صاحب
قایل نہیں ہار رہے تھے کہ وطن کی کشتی کو اس بھنور سے نکا
گاندھی جی بھی خود کو غیر موثر محسوس کر رہے تھے۔

مئی ۱۹۲۶ء میں حکیم صاحب نے ایک بیان جاری کیا جس میں
سے مخلصانہ درخواست کی گئی تھی کہ وہ مسلمانوں کی باتوں پر غو

عل کا اظہار کرنے سے احتراز کریں۔ چوں کہ اس سے "سوراج" کے
ول کے لیے کی جانے والی کوششیں خطرے میں پڑ جائیں گے۔

اس بیان سے چراغ پا ہو کر اور حکیم صاحب سے اپنی پرانی دوستی
بھلا کر سوامی جی نے ان پر لعن و طعن کی بارش شروع کر دی جس نے جلتی پر
ل کا کام کیا۔

اس بگڑتی ہوئی صورت حال کو قابو میں لانے کے لیے پنڈت موتی لال
رو اور مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک اپیل جاری کی جس میں قوم پرستوں
ے درخواست کی کہ وہ "فرقہ واریت" سے پرہیز کریں۔ بہت سے لیڈروں
ز اس اپیل کی تائید کی۔ صورتِ حال سنبھل سکتی تھی مگر سوامی جی ہنوز
ی جگہ آگ بگولہ بنے قایم تھے۔ انھوں نے اس اپیل کے خلاف بیانات دے
اس کا اثر زائل کر دیا۔

دسمبر ۱۹۲۷ء میں حکیم صاحب کی صحت خاصی گر گئی تھی۔ مگر اسی زمانے
ی شاہ افغانستان امان اللہ خاں بمبئی تشریف لائے اور حکیم صاحب
ے ملاقات کے لیے بمبئی کے پُر صعوبت سفر پر نکل پڑے۔ ۲۶ر دسمبر کو
ے دہلی واپس آئے۔ فوراً ہی نواب صاحب رام پور کو دیکھنے کے لیے
ر اختیار کیا۔

رام پور میں ۲۸-۲۹ر دسمبر ۱۹۲۷ء کی درمیانی شب میں ان کو دل کے درد نے پریشان کیا۔ انھوں نے خادم سے گرم پانی لانے کو کہا مگر اس سے پہلے کہ گرم پانی آئے فرشتۂ اجل نے ان کی روح کو مالکِ حقیقی کے پاس پہنچا دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اور اس طرح ہندوستان اس عظیم سپوت اور ہندو مسلم اتحاد کے علم بردار کے دلِ بے قرار نے خموشی اختیار کر لی۔

ہمارا معروضہ یہ ہے کہ چاہے ماضی میں کچھ بھی ہوا ہو، ہندوستان کی موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ سلامتی اور ترقی کا راستہ یہی نظر آتا ہے کہ ہم اسی راستے کو یعنی ہندو مسلم اتحاد کے راستے کو اپنائیں۔ مشکلات تو ہر راستے کی اپنی اپنی ہوا ہی کرتی ہیں اور ہمت و عزم والے لوگ ان پر قابو پا ہی لیا کرتے ہیں اس لیے ہم سب کو قومی یک جہتی کے راستے کو اپنا کر اس کی مشکلات کو دور کرنا چاہیے۔ کیونکہ اسی میں ملک کی بقا اور فلاح کا راز پوشیدہ ہے۔ دوسرے تمام راستے اور زیادہ پُر خطر ہیں۔

"ہنر، فن اور علم ایسی عمدہ چیزیں ہیں کہ ان میں سے ہر ایک چیز کو نہایت اعلیٰ درجے تک حاصل کرنا چاہیے۔ ایک شعب انسان ان تمام دلچسپ اور مفید باتوں سے جو نئی نئی تحقیقات اور نئے نئے علوم سے حاصل ہوتی ہیں، محض جاہل اور ناواقف رہتا ہے۔ اس کی عقل اور اس کے دماغ کی قوت محض بے کار ہو جاتی ہے اور تربیت و شائستگی تہذیب و انسانیت کا مطلق نشان نہیں پایا جاتا۔"

سر سید احمد خاںؒ

ایک علم دوست

غلام السبطین شروانی

حاجی منیر الدین صاحب کو میں ۱۹۵۰ء سے جانتا ہوں۔ علیگ برادری بھی ان سے بخوبی واقف ہوگی۔ وہ علی گڑھ کے ایک جانے پہچانے دست کار ہیں اور جوتا سازی میں اپنی مہارت کے لیے مشہور ہیں۔ عمر بہتر سال سے کچھ زیادہ ہی ہوگی۔ پہلے رسل گنج روڈ پر رہتے تھے، بہت دنوں سے دان پور کیاونڈ میں سکونت اختیار کر رکھی ہے۔

میں دان پور کیاونڈ اکثر جاتا رہتا تھا۔ جب بھی وہاں گیا میں نے حاجی صاحب کو اپنے بالا خانے پر کسی سے درس لیتے ہوئے سنا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ ان کی فیملی کہیں گئی ہوئی تھی۔ حاجی صاحب نے اصرار کر کے مجھے اپنے بالاخانے پر بلا لیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک میز پر ڈھیر ساری کتابیں اور کاپیاں پھیلی ہوئی ہیں اور ایک نوعمر معلم چائے پی کر رخصت ہو رہا ہے مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے حاجی صاحب سے چند سوالات کر ڈالے۔

میں : حاجی صاحب! آپ کا دیرینہ پیشہ تو کچھ اور ہے۔ پھر یہ نوعمر معلم، یہ کاپیاں اور یہ کتابیں آخر کس لیے؟

حاجی صاحب: بات دراصل یہ ہے کہ میں اپنے پیشے سے کچھ اوب سا گیا ہوں۔ اسے چھوڑ کر اب میں علم کی دنیا میں آنا چاہتا ہوں۔

میں : لیکن حاجی صاحب! یہ تو غور کیجیے کہ آپ کی عمر کیا ہے؟ اب اس عمر میں پڑھ لکھ کر آپ کو حاصل کیا ہوگا؟

حاجی صاحب: کیا حاصل ہوگا یہ تو میں نہیں جانتا۔ البتہ میری خواہش یہ ہے کہ پڑھ لکھ کر ایک معلم بنوں۔ اس کے لیے سند کی ضرورت ہوگی۔ اس لیے آج کل میں امتحان کی تیاری کر رہا ہوں۔

میں : آپ کی زیادہ عمر اور آپ کے پیشے کی وجہ سے مجھے ڈ… کہ شاید ہی کہیں معلمی کی جگہ ملے۔ اگر آپ کو معلمی نہ ملی تو پھ… کیجیے گا۔

حاجی صاحب: اس کا احساس مجھے بھی ہے۔ اس لیے میرا منـ… یہ ہے کہ پہلے تعلیمی سند حاصل کر دوں۔ پھر ایک نجی دینیـ… قایم کروں۔ تاکہ لوگوں کو اس مدرسے میں اپنے بچوں کو بـ… میں تامل نہ ہو۔ میرا مقصد پیسہ کمانا نہ ہوگا۔ محض غریب و نا… بچوں کو تعلیم دینا ہوگا۔ خدا کے شکر سے گزارے کے لیے محدود ہی سہی میرے پاس کچھ وسائل اور بھی ہیں۔

اس گفتگو کے دوران میں میز پر رکھی ہوئی کتابوں کی ورق گر… بھی کرتا جا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے کافی حیرت ہو رہی تھی کہ حاجی صاحـ… بیک وقت اردو، عربی، فارسی اور انگریزی چار زبانیں پڑھ رہے… تحریر صاف اور خوشخط تھی۔ بالخصوص منہاج العربیہ جلد اول کا… سے اردو، فارسی اور انگریزی میں کیے گئے ان کے ترجموں کو د… کر جی خوش خوش کر اٹھا۔ میں نے حاجی صاحب کو یہ مشورہ بھی دیا… کسی معروف عالم کو دکھا کر ان ترجموں کو کتابی شکل میں منظر عام… لائیں۔

حاجی صاحب کی محنت اور لگن بار آور ہوئی۔ انھوں۔

حیات منزل، قلعہ روڈ، علی گڑھ

فاضل دینیات (دیوبند)، منشی (الہ آباد) فاضل عربی اور فاضل فارسی (اردو بورڈ۔ علی گڑھ) کی اسناد حاصل کیں۔ انھوں نے یہ دکھا دیا کہ اگر انسان طے کرلے تو منزل مقصود مل کر رہتی ہے۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد حاجی صاحب نے دان پور کمپاؤنڈ ہی میں ایک دینی مدرسہ منیر المدارس کے نام سے قائم کیا۔ اس مدرسے کا مقصد پیسہ کمانا نہ تھا بلکہ شہر کے غریب مسلمان بچوں کو تعلیم سے آراستہ کرنا تھا۔ اسے چلانے کے لیے حاجی صاحب نے دن رات ایک کر دیا۔ مگر والدین کی عام غریبی کے سبب وہ مدرسہ چلانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

غریب والدین اپنے بچوں کی تعلیم کے مقابلے میں یہ زیادہ پسند کرتے تھے کہ وہ چھوٹی موٹی دستکاری کا کام کر کے دو پیسہ کما کر لے آئیں۔ حاجی صاحب کے لاکھ جتن کے باوجود والدین کی ذہنیت نہ بدل سکی اور غریب بچے ایک ایک کر کے ان کے مدرسے سے رخصت ہو گئے۔

مدرسہ تو بند ہو گیا مگر حاجی صاحب کی علم دوستی نہ گئی۔ برسہا برس کے بعد حاجی صاحب سے میری ملاقات پچھلے دنوں دان پور کمپاؤنڈ میں ہوئی۔ یہ دیکھ کر رنج ہوا کہ وہ دوبارہ جوتا سازی کرنے لگے ہیں۔ لیکن اس بات پر خوشی ہوئی کہ ان کے کمرے میں اگر ایک طرف جوتا بنانے کے ساز و سامان بکھرے پڑے ہیں تو دوسری طرف پاس کی میز پر کتابیں اور ایک ڈکشنری رکھی ہوئی ہے۔ سچا علم دوست اسے کہتے ہیں۔

"تعلیمی، تربیتی کام میں ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمتی۔ یہ کام آگ نہیں کہ پل بھر میں پھیل جائے اور سارے ماحول کو خاکستر بنا دے۔ چمن بندی ہے۔ مادی وسائل کی نہروں سے دیر تک اسے سینچنا ہوتا ہے۔ دہقان کو اپنی پیشانی کا پسینہ ایک بار نہیں روز اس میں ملانا ہوتا ہے اور یہاں خون جگر کی کچھ چھینٹیں بھی دینی ہوتی ہیں۔"

ذاکر حسین

مسلم طلبا کو وظائف

ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نے اعلیٰ نمبروں سے پاس ہونے والے مسلم طلبا کو ۹۰-۱۹۸۹ء تعلیمی سال کے دوران وظیفہ دینے کے لیے مقررہ فارموں کی ترسیل شروع کر دی ہے - یہ فارم اسناد وغیرہ کی ضروری نقول کے ساتھ ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۹ء تک سوسائٹی کے دفتر میں جمع کرائے جاسکتے ہیں ___ امیدوار کے لیے کم از کم دسواں درجہ پاس ہونا ضروری ہے۔ سائنس مضامین کے حامل امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی۔ فارموں کی جانچ کے بعد منتخب امیدواروں کو تحریری امتحان اور انٹرویو کے لیے سوسائٹی کے خرچ پر کم از کم دو دن کے لیے دسمبر ۱۹۸۹ء میں کسی وقت ہمدرد نگر، نئی دہلی بلایا جائے گا۔ یہ انتخاب میرٹ کی بنیاد پر ہوگا۔ لیکن اس خیال سے کہ ملک کی زیادہ سے زیادہ ریاستوں کے مسلم طلبا کو وظیفہ اسکیم سے استفادے کا موقع ملے، جہاں ضروری ہوگا، بعض ریاستوں کے امیدواروں کے لیے نمبروں میں کچھ رعایت بھی روا رکھی جائے گی۔

جن مسلم طلبا نے ہائی اسکول یا ہائر سکنڈری میں کم از کم ۶۰ فیصد، 2+10 یا انٹر میں 75 فی صد اور بی۔ اے یا ایم اے میں کم از کم 70 فی صد نمبر حاصل کیے ہیں، وہ وظیفہ کے لیے درخواست دے سکتے ہیں۔ وظیفہ میٹرک پاس کے لیے -/250 روپے ماہانہ، انٹر پاس کے لیے -/350 روپے ماہانہ اور بی اے پاس کے لیے -/500 روپے ماہانہ مقرر کیا گیا ہے۔ صرف وہی امیدوار وظیفہ کے لیے فارم بھریں جن کی تعلیم کا سلسلہ کم از کم ۹۰-۱۹۸۹ء تعلیمی سال کے دوران بھی جاری رہے گا دیگر تفاصیل

'سکریٹری' ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، ہمدرد نگر، نئی دہلی نمبر ۶۲

کے نام خط بھیج کر حاصل کی جا سکتی ہیں۔

یاد رہے کہ ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نے وظیفوں کا سلسلہ اپنے صدر جناب حکیم عبدالحمید صاحب کے ایما پر تین سال قبل شروع کیا تھا اور تب سے اب تک ۶۷ طالب علموں کو یا تو ماہانہ وظیفے جاری ہو چکے ہیں یا پھر کتابوں کے لیے معقول رقوم کی یک مشت امداد دی جا چکی ہے، اور جہاں تک مصارف کا تعلق ہے، سوسائٹی وظیفوں کی مد میں اب تک دو لاکھ ۵۰ ہزار روپوں سے زائد کی رقم خرچ کر چکی ہے۔

ریحان عباسی، برائے سکریٹری، ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، نئی دہلی۔

مالک: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، پرنٹر پبلشر: اسرار احمد - ناظم اشاعت، ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ لٹل آرٹ ہال گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ - پرنٹر: الیکٹرانیہ پریس دہلی۔

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

شمارہ ۹

جلد ۷

ستمبر ۸۸ء

ترسیل زر کا پتہ :
پڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۔

Edit· ·: TAHZIBUL AKHLAQ &
NISHANT.
ALIG··H MUS· ·· UNIVERSI·Y

زر سالانہ

انڈیا Rs. 30·00

بیرونی ممالک US \# 20·00 ہوائی ڈاک

عام ڈاک US \# 8·00

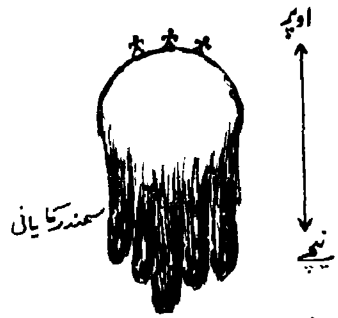
مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ
ڈاکٹر کبیر احمد جائسی
ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
- انڈیا -

مندرجات

تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہرحال ان سے متفق ہو۔

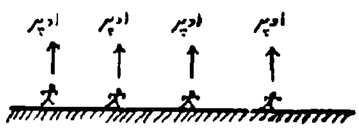
اِدَارِیَہ

۱- زمین گول ہے۔ یہ نظریہ جب پہلی بار پیش ہوا تو اس کی مخالفت بڑے زور شور سے ہوئی۔ مخالفت میں جو دلیلیں پیش کی گئیں ان میں سے ایک دلیل یہ تھی کہ اگر زمین گول ہوتی تو زیادہ تر سمندر جو نیچے ہوتے کیوں کہ ان کا سارا پانی نیچے گر جاتا۔ بظاہر یہ ایک مضبوط دلیل تھی۔ کیونکہ یہ ایک عام مشاہدے کی بات ہے کہ پانی ہمیشہ اوپر سے نیچے کی طرف بہتا ہے۔ (شکل نمبر۱)



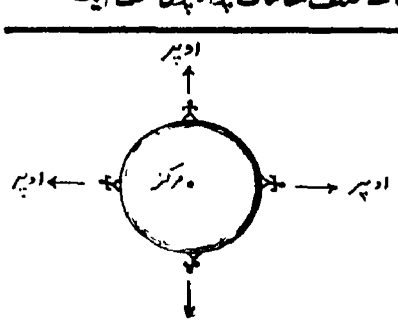
شکل نمبر۱

۲- اس مخالف دلیل کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ اس میں اوپر کی سمت کو مطلق مان لیا گیا ہے۔ یعنی یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ دنیا کے ہر مقام پر اوپر کی سمت ایک ہی ہے۔ اس مفروضے کی جڑیں زمین کے چپٹے ہونے کے تصور میں پیوست ہیں اور زمین کے چپٹے ہونے کے تصور کی بنیاد انسان کے روزمرہ کا محدود مشاہدہ تھا۔ (شکل نمبر۲)



شکل نمبر۲ - چپٹی زمین
زمین کے مختلف مقامات پر اوپر کی سمت ایک

۳- اب اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اوپر کی سمت کا تصور ایک اضافی تصور ہے (جیسا کہ حقیقتاً ہے) اور یہ کہ ہر مقام پر اوپر کی سمت کا تعین خود اس مقام سے ہوتا ہے تو یہ مخالف دلیل کہ زمین کے گول ہونے کی صورت میں سمندر کے پانی کو نیچے گر جانا چاہیے' بے وزن ہو جاتی ہے' کیونکہ کرۂ ارضی کے ہر مقام پر نیچے کی سمت زمین کے مرکز کی جانب ہوگی۔ (شکل نمبر۳)



شکل نمبر۳ : گول زمین
زمین کے مختلف مقامات پر اوپر کی سمت مختلف

۴- زمین چپٹی ہے یا گول اس جھگڑے کو طے ہوئے زمانہ گزر گیا۔ آج سبھی یہ مانتے ہیں کہ زمین گول ہے۔ ماضی کی اس مثال کو پیش کر کے ہم اس حقیقت کو اجاگر کرنا چاہتے ہیں کہ وسیع تر مشاہدات اور تجربات کی بنیاد پر جب کوئی نیا نظریہ یا تصور پیش کیا جاتا ہے تو

لوگوں کو اسے قبول کرنے میں دقت محسوس ہوتی ہے جس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ اسے پرانے فکری ڈھانچے میں رہ کر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یعنی وہ اسے اس فکری نظام کے تحت سمجھنا چاہتے ہیں جو ماضی کے محدود مشاہدات اور تجربات پر قائم ہوا تھا اور جس میں اس بات کی گنجائش ہی نہیں ہوتی کہ نئے تجربات سے منکشف ہونے والے حقائق کو خود میں سمو سکے۔

۵۔ نئے نظریات اور تصورات کی مخالفت محض اس لیے کہ وہ مروجہ فکری ڈھانچہ سے مطابقت نہیں رکھتے علمی حقائق سے چشم پوشی ہے۔ یہ ایک غلط، منفی اور انتہائی مضر رجحان ہے۔ ایسی مخالفت اس فکر کی آئینہ دار ہے کہ انسانی فکری نظام مشاہدات اور تجربات پر مبنی ایک ارتقائی عمل کا نتیجہ نہ ہو کر ایک غیر متغیر یعنی مطلق شے ہے۔ جس سوسائٹی میں یہ فکر حاوی ہو جائے وہ لازماً جمود کا شکار ہو جاتی ہے اور اس میں علوم کی تخلیق کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ ایسی سوسائٹی کا علمی حلقہ مروجہ فکری نظام کے محدود دائرے میں ہی اچھل کود کرتا رہتا ہے جس کے علمی کارنامے اسلوب و تمثیلات کے فرق کے ساتھ ماضی کی تکرار ہوتے ہیں۔

۶۔ اگر مسلمانوں کے پچھلی چند صدیوں کے علمی کارناموں کا سنجیدگی سے جائزہ لیا جائے تو ماضی کی تکرار محض کے علاوہ شاید ہی کوئی نئی بات مل سکے۔ اس صورتِ حال کی بنیادی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ مسلمان علماء اور دانشوروں کا ایک بڑا طبقہ شعوری یا لاشعوری طور پر انسانی فکری نظام کو غیر متغیر سمجھتا رہا ہے اور ہر نئے تصور یا نظریے کو اسی فکری نظام کی کسوٹی پر پرکھنے کی غلطی کرتا رہا ہے جسے صدیوں پہلے اس کے اسلاف نے اپنے دور کے مشاہدات کی روشنی میں علوم نقلیہ اور عقلیہ کے امتزاج سے بنایا تھا۔ چوں کہ وسیع تر مشاہدات اور تجربات کی کوکھ سے پیدا ہونے والے تصورات بالعموم ماضی کے محدود مشاہدات پر قائم ہونے والے فکری نظام (جسے غلطی سے مطلق مان لیا گیا ہے) سے مطابقت نہیں رکھتے۔ اس لیے نہ صرف ان سے کترانے کی روش اختیار کی گئی بلکہ ان کی پر زور مخالفت بھی کی گئی۔ نتیجہ سامنے ہے۔ وہ مسلمان قوم جو کبھی دنیا کے علم و دانش کی امام تھی، آج علوم و فنون کے میدان میں سب سے پسماندہ ہے۔ اس لیے مسلمانوں کے علمی وقار کی بحالی کا صحیح راستہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا علمی طبقہ پرانے فکری ڈھانچے کے دائرے سے باہر نکلے۔ انسانی فکری نظام کی حرکی حیثیت کو تسلیم کرے اور نئے نئے تجربات اور مشاہدات کی بنیاد پر فکری نظام میں ناگزیر تبدیلیوں کے عمل کو پھر سے شروع کر دے۔

اسرار احمد

طالب علموں کے نام ایک خط

سر سید احمد خاں

میرے عزیزو! تم نے اس منزلِ ہستی میں قدم رکھا ہے اور میں بہت سے مرحلے طے کر چکا ہوں۔ زندگی کی پرفضا اور پُر بہار پہاڑی پر چڑھ کر اس کے عجائبات اور غرائبات کو ایک نظر سے دیکھ کر مایوس قدموں اور حسرت بھرے دل سے نشیب کی طرف اُتر رہا ہوں۔ اور زیادہ افسوس میرا اس سبب سے ہے کہ عمر کی پہاڑی کی سیر کرتے وقت جو اوزار مجھے قدرت نے عنایت کیے تھے، اُن کو میں اپنی نادانی اور گمراہی سے مناسب طور پر استعمال میں نہ لا سکا، پہاڑی کی ابتدائی منزل سے اس کی بلند چوٹی تک جا بجا چمن لہرا رہے تھے۔ مرادوں اور آرزوؤں کے گل ہر طرف کھل رہے تھے اور بلا استثنا ہر ایک منزل میں خوشی اور امید کے خوشنما درخت خوشگوار پھولوں سے جھکے ہوئے نظر آتے تھے اور ایک عجیب راحت بخش نسیم ہر ایک چیز اور ہر ایک مقام میں تازگی اور شگفتگی بخشتی دکھائی دیتی تھی۔ قصہ کوتاہ ہر ایک جگہ خوشی و انبساط کے سامان تھے۔ اذنِ عام تھا کہ مسافر جس طرح استعمال کرے، کسی طرح کی روک ٹوک نہ تھی، ان سے فائدہ اُٹھانا محض مسافر کی عقل اور خواہش پر منحصر تھا مگر حیف کہ میں اس فرحت ناک منزل سے آنکھیں بند کیے چلا آیا۔ میں یہی سمجھتا رہا کہ یہ فضا اور یہ بہار اسی طرح چلی جائے گی اور یہ پُر لطف اور مسرت ناک سامان منزل کے آخری حصے تک ختم نہ ہوگا مگر یہ میری کیسی غلطی تھی۔ اب کہ عمر کے آخری مقام پر کھڑا ہو کر پچھلی طے کی ہوئی منزل پر نظر ڈالتا ہوں تو سوائے حسرت اور افسوس کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ عمر کا جو نہایت پُر فضا اور پر جوش حصہ تھا وہ گزر گیا۔ آگے کی طرف جو نظر ڈالتا ہوں تو سارے منظر وادی پر خار معلوم ہوتے ہیں اور ایسی اونچی چڑھائی نظر آتی ہے کہ جس کا کامیابی کے ساتھ طے کرنا ایک موہوم سی امید ہے۔ سامنے کے منظر کی ڈراؤنی صورت اور طے کردہ منزل کی خوبصورتی اور بے نیل و مرام چھوڑ آنے کے خیالات میرے دماغ کو ایسا پراگندہ کرتے ہیں کہ رہی سہی طاقت بھی سلب ہوتی معلوم ہوتی ہے۔

اے عزیزو! یہ مایوسی مجھے کیوں حاصل ہوئی اور کیوں میں حسبِ مراد دنیا سے بہرہ ور نہ ہوا؟ صرف اس سبب سے کہ میں نے وقت کی قدر نہ جانی۔ ابتدائے عمر میں جب کہ میں کچھ کر سکتا تھا اور اپنی بہبودی کی بنیاد قائم کر سکتا تھا، میں نے کچھ نہیں کیا۔ بدقسمتی سے کوئی رہبر یا ہادی ایسا نہ ملا جو مجھے سیدھے راستے پر ڈالتا۔ کوئی مربی یا محسن ایسا نصیب نہ ہوا جو میرے افعال و اعمال کو مناسب سمت کی طرف رجوع کرنے کی کوشش کرتا اپنی ہی مرضی اور اپنی عقل سے کسی کامل رہبر یا کمپاس بغیر اپنی کشتی کو کھیتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک خطرناک چٹان پر آ کر بحرِ ہستی کی بے انتہا سطح پر جو نظر ڈالتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ جن لوگوں نے دانش مندی اور قاعدے کی پابندی سے کام لیا اور وقت کو بے بہا سرمایہ سمجھا وہ کیسے خوش و خرم و بامراد بحرِ ہستی سے عبور کر رہے ہیں۔ یوں تو کون سی چیز تھی جو وقت کی پرواز اور اس سے مستفید ہونے کی ضرورت نہیں جتاتی۔ مگر میں ہی نادانی سے اس کا ایمانہ سمجھا۔ سالہا سال سورج صبح سے نکل کر اس نیلگوں چھت پر اپنا معمولی دورہ کرتا ہوا مغرب میں جا ڈوبا۔ مگر میں یوں ہی کاہلی سے بیٹھا ہوا اس کے منہ کو تکتا رہا۔ اس کے قاعدے کی پابندی سے ذرا بھی سبق نہ لیا۔ چاند، ہلال اور بدر ہو کر اپنے مقرر وقتوں پر ظاہر ہوتا رہا۔ مگر مجھے اس کے نمونے سے نصیحت حاصل نہ ہوئی۔ بہار اپنے معمولی وقتوں پر آئی اور عالمیوں کے واسطے خوان الوان نعمت بچھا کر چلی

رحیف میں یہ نہ سمجھا کہ یہ میری ہی عمر کے ایک سال چلے جانے کا اشارہ کرز
الے کالے مست بادل اپنے وقت پر آئے اور برس کر چلے گئے۔ بجلی نے
تادب کے ساتھ میری مندی ہوئی آنکھوں کو کھولنا چاہا مگر صد افسوس
خفتہ دل نے بیداری حاصل نہ کی۔ رعد نے نہایت زور شور سے کڑک
رے کانوں کو کھولنا چاہا مگر میرے کان پر جوں تک نہ چلی۔ ہوا تیز اور
ٹھنڈی اور گرم سب قسم کی چلتی رہی مگر مجھے ذرا بھی ہوشیاری نہ ہوئی
ہر وقت میری جیب میں رہی اور مجھے اپنی غمناک آواز سے ہر منٹ
ہر سکنڈ وقت کی پرواز سے خبر دیتی رہی مگر میں نہ سمجھا کہ یہ دراصل
عمر رواں کے پاؤں کی آہٹ ہے۔ ہزاروں دفعہ جیب سے نکال کر
۔ کبھی چھ بجے کبھی دس بجے کبھی بارہ بجے۔ مگر حیف میں نہ سمجھا کہ یہ اپنی
رفتہ کے نقش پا ہیں۔ ذوق کا سچا اور پُر فلسفہ شعر پڑھا مگر غور
سے

عزیزو اس کو نہ گھڑیال کی صدا سمجھو
یہ عمر رفتہ کی اپنے صدائے پا سمجھو

بہت دفعہ ریلوے اسٹیشن پر گیا، ریل کو جانے کے لئے تیار دیکھا
گٹھری باندھے سوار ہونے کے لئے تیاری کر رہے ہیں اور بہت سے
منزل مقصود پر پہونچنے کے لئے خوشیاں منا رہے ہیں۔ اتنے میں
انجن نے سیٹی دی اور گنٹھی ٹن ٹن کر ریل یہ جا وہ جا۔ اب دیکھا تو نہ وہ ٹرین
ہے اور نہ وہ رونق۔ اسٹیشن پر ایک پژمردگی اور اداسی کا عالم۔ اس انقلاب
سے میرے دل میں ایک خفیہ چوٹ لگی مگر حیف یہ نہ سمجھا کہ یہ ٹرین زندگی کی
رفتار سے خبر دیتی ہے۔ جو لوگ کہ سوار ہوئے ہیں وہ مسافر ملک عدم ہیں اور
جو آتے ہیں وہ واردان ملکِ ہستی ہیں۔ اب جب کہ سمجھ آئی اور تجربہ ہوا تو
وہ زمانہ رہا نہ وہ طاقت رہی۔ اب جب کہ کسی اسکول یا کالج کی عمارت کے
پاس سے گزرتا ہوں اور طالب علموں کے پڑھنے کی آواز میرے کان میں پڑتی
ہے تو کھڑا ہو جاتا ہوں اور آہ سرد بھر کر کہتا ہوں کہ

"افسوس! اب میں دوبارہ لڑکا نہیں ہو سکتا"

کیا اچھا ہو کہ میں اس تحریر کے ساتھ پھر زندگی کا از سرنو سفر شروع
کر دوں۔

اب کیا ہو سکتا ہے بس اے طالب علمو! اور اے میرے ملک
کے ہوشیار امیدوارو! میں حسرت کے ساتھ تم سے مخاطب ہوتا ہوں
کہ میری تلف شدہ عمر تمہارے رستہ میں نوٹس بورڈ ہو، جس پر یہ
درج ہو کہ

"خبردار اس طرف خطرہ ہے سنبھل کر چلو"

"انا ایک فطری جذبہ ہے ہمیں کوشش سے اس کو قابو میں
کرنا ہے، اس کو زیر کرنا ہے، اس کا ارتفاع کر کے اسے
تخلیقی کاموں میں لگانا ہے۔ اسے عزتِ نفس کے منصب
پر بٹھانا ہے۔ دوسری جانب خدمتِ خلق کے لیے اسے
زیر کرنا ہے، تاکہ انا اشتراک عمل کا راستہ نہ
روک پائے۔"

سید حامد

چار فریق تین محاذ

سید حامد*

فریق گن لیے جائیں پہلے؛ پہلا فریق وہ طبقہ ہے جو اردو کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ناانصافی پر صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ اس کے انسانی اور آئینی حقوق طلب کرتا ہے؛ جو اس کے زوال پر شکوہ سنج ہے؛ باقی تین فریق گویا تین محاذ ہیں جن پر پہلے فریق کو کام کرنا ہے، اثر انداز ہونا ہے۔

دوسرا فریق اردو بولنے والوں کا جن سموہ ہے۔ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر جو دیس بھر میں پھیلا ہوا ہے۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ سو میں سے شاید اسّی ان پڑھ ہوں اور بیس پڑھے لکھے، ان میں سے پڑھے لکھے بہ مشکل پانچ ہوں گے۔ باقی پندرہ کو پڑھائی لکھائی میں شُد بُد ہے حرف شناسی کی قبا ان کی قامت پر زیادہ راست آتی ہے۔ لیکن چاہے یہ لوگ تعلیم یافتہ ہوں، چاہے حرف شناسی، چاہے نرے ان پڑھ انہیں اردو زبان کے ساتھ عاشقانہ وابستگی ہے۔ اردو ان کے کانوں میں پڑتی ہے تو فردوس گوش بن جاتی ہے۔ اردو تحریر ان کے لیے جنت نگاہ ہے۔ محرومی کے احساس نے وابستگی کو مہمیز کیا ہے۔ ان لوگوں نے اپنی آنکھوں سے اردو کو بے آبرو ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ اردو پر مظالم ڈھائے گئے اور یہ بے بسی کے ساتھ دیکھتے رہے۔ اردو کے ساتھ تغافل برتا گیا، یہ فریاد کرکے چپ ہو گئے۔ اردو کو متواتر فریب دیے گئے اور یہ فریب کھاتے رہے۔ اس امید میں کہ شاید ارباب اختیار کی نیت اس بار کھوٹی نہ ہو، ان کے وعدے جھوٹے نہ ہوں۔ کبھی کبھی ان کو اپنے ترجمانوں پر شبہ ہوا کیوں کہ وہ کچھ دیر فریاد کرکے اس طرح خاموش ہو گئے۔ گویا ذہن میں ٹانکے لگ گئے ہوں؛ مایوس ہو گئے بے چارے۔

اردو جیسی خوب صورت اور اظہار پر قادر زبان کا گلا ناعاقبت اندیش اور تنگ نظر افراد گھونٹتے چلے گئے اور اردو بولنے والوں کا طبقہ اہل وطن سے بدظن ہوتا گیا کہ ان کی چہیتی زبان کو ناکردہ گناہ کی سزا دی جا رہی ہے۔ اس بے اطمینانی کا فائدہ اردو کے چند انتہا پسندوں اور شعلہ بیانوں نے اُٹھایا۔ اربابِ اقتدار کو اتنی سمجھ نہ آئی کہ آبادی کے اتنے بڑے حصے کو مفت میں بددل اور دل برداشتہ کر دینے کے نتائج ملک کے لیے بنہایت مضر ہو سکتے ہیں۔ ایسا بھی نہیں کہ اردو کے ساتھ ترشی برتی گئی ہو۔ اس کے لیے ادارے قایم کیے گئے انھیں امداد دی گئی۔ اردو کی ستایش اور سرپرستی حکومت کی طرف سے برابر ہوتی رہی اور اردو کی جڑیں سوکھتی چلی گئیں۔ کیوں کہ انھیں روزگار اور کاروبار کی زرخیز زمین سے اکھاڑ پھینکا گیا تھا۔ اردو مرجھاتی رہی پر اس کے دانشوروں اور راہبروں کو مرجھاتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا۔

تیسرا فریق ہے ارباب اختیار اور اصحابِ سیاست کا۔ ان میں سے بعض نے جو تقسیم ہند کے ردّعمل سے سراو پر نہیں اُٹھا سکتے تھے، سوچا کہ ان اردو والوں کو سبق سکھانا چاہیے۔ انھیں شاید اردو سے کدورت اس بنا پر ہو گئی کہ تقسیم وطن کے جلو میں جو نیا ملک تراشا گیا تھا، اس نے اردو کو قومی زبان قرار دے دیا تھا۔ "جو زبان دشمن کی دوست بن گئی ہو وہ ہماری دوست کیوں کر ہو سکتی ہے۔" اس

* سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہمدرد نگر، دہلی۔

نوکھی منطق کی بنیادی خامی انھیں نظر ہی نہیں آئی - مان لیجیے پاکستان والے
دو کو دیس نکالا دے دیتے تو کیا ہم اردو کو تخت پر بٹھا دیتے ۔
کستان نے اسلام کو حکومت کا مذہب بنا دیا تو کیا ہندوستان نے
ہندو مذہب کو یہاں کا سرکاری مذہب بنا دیا ؟ ۔ کیا ہندوستان فیصلے
پنی صواب دید اور روایتی رواداری کے مطابق نہ کر کے ایک چھوٹے سے
ڑوسی ملک کے افعال کے ردِّ عمل کے طور پر کرنا چاہیے گا - ابھی تک
اس نے ایسا نہیں کیا ؛ یہ غریب اردو کی بدقسمتی ہے کہ پاکستان کے
ساتھ اس کے تعلق نے یہاں کی فضا میں اس کے لیے بدگمانیاں بھر دیں
ہل وطن میں سے کچھ لوگ اردو کا سرا اسلام کے ساتھ جوڑتے ہیں - وہ
سے مسلمانوں کی زبان سمجھ بیٹھے ہیں - کوئی اسے بدیسی زبان کہتا ہے - ستم
ہے کہ اُس زبان کو جو واقعی بدیسی ہے، ہم گلے لگائیں، اس کی راہ میں
نکھیں بچھائیں اور اس زبان کو جو ہندی الاصل ہے، جس کا خمیر یہیں سے
ٹھا ہے، جس کی ساخت سولہ آنے ہندی ہے، جس کا آنول نال یہیں
ڑا ہے، جو یہاں کی بول چال کی میل ملاپ کی زبان ہے، جو ایک طرف
اہمی اختلاط اور دوسری طرف ہمسایوں سے ارتباط کی نشانی ہے، اسے
ہم خارجی، بدیسی اور اسلامی زبان کہہ کر ٹھکرا دیں، دھتکار دیں - یہ لوگ
ہیں جانتے کہ اردو کو جو ہندوستان کی سرزمین میں پیدا ہوئی اور یہیں
روان چڑھی، ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی سب نے مل کر پالا
وسا ہے - اوّل تو اس غریب الدیار کو پاکستان میں کوئی فروغ نہیں ہوا
ور اگر ہو بھی جائے تو بھی سند جب لی جائے گی، دلی اور لکھنؤ کی
بان کی لی جائے گی - لاہور اور کراچی کی اردو نہ کبھی سند رہی نہ رہے
گی -

جو تھا فریق ملک کے عوام نہیں، بالخصوص ہندی بولنے والے
نھوں نے شاید ابھی تک یہ بات نہیں بھلائی کہ آزادی سے پہلے اردو
نے ہندی کی برابری کا دعویٰ کیا تھا اور گاندھی جی کی منصف مزاجی اور
دور اندیشی نے اس دعوے کو تسلیم بھی کیا تھا - پھر یکایک زلزلہ آیا
ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے، کشتوں کے پشتے لگ گئے

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

[وہ پیالہ ٹوٹ گیا اور وہ ساقی نہ رہا]

منقسم شدہ ہندوستان میں اردو اپنی اوقات پر آگئی بھلا
مجال جو اب اس نے برابری کا دم بھرا ہو ! - اس نے مان لیا کہ اب اس
کی حیثیت ثانوی ہے - ہندی تخت نشین ہو گئی - اردو کی مانگ صرف
اتنی تھی کہ اس کو اپنے وطن میں عزت اور وقار کے ساتھ زندگی بسر
کرنے کا موقع دیا جائے - آئین نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا - کاش کہ
وہ حکومتیں بھی ایسا کرتیں جو آئین کے تحت بنی تھیں اور وہ عوام بھی
جنھوں نے آئینِ ہند کے ساتھ پیمانِ وفا باندھا تھا - اردو کی شامتِ
اعمال کہ عوام بالخصوص ہندی والوں نے اس کی طرف سے اپنے دلوں
میں کدورت بھر رکھی - اس کو وہ مسلمانوں کی بلکہ کٹر پنتھیوں اور بنیاد
پرستوں کی زبان سمجھنے لگے - حالانکہ اردو کی وسعت، اس کی کشادہ نگاہی
اس کی فراخ دلی اور رواداری، اس کی زہد بیزاری پکار پکار کر یہ
کہہ رہی ہے کہ اس کی سرشت، اس کا مزاج غیر دینی یا سیکولر ہے،
وطن پرستی اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے - تصوف اور بھکتی اس
کی رگوں میں لہو کی طرح رواں دواں ہے - کبھی کبھی ایسا محسوس
ہوتا ہے کہ حکومتیں اردو کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے گھبراتی
ہیں، ہچکچاتی ہیں - وہ ایسا قدم کیوں اُٹھائیں جس کے نتیجے میں
رائے دہندوں کی تائید سے ہاتھ دھونا پڑے -

اب ہم پہلے فریق کی طرف لوٹتے ہیں یعنی ان لوگوں کی طرف
جو اردو کی نمائندگی کرتے ہیں، اس کا حق مانگتے ہیں، اس کے ساتھ
ناانصافیوں پر حکومت کی بارگاہ میں فریاد کرتے ہیں - ابھی تک ان
لوگوں نے سارا دھیان ایک ہی محاذ کو دیا تھا - یعنی اہلِ سیاست
اور اربابِ حکومت سے ہی وہ طویل وقفوں، دھیمی آوازوں اور
بے ترتیبی اور بے تنظیمی کے ساتھ داد رسی کرتے رہے تھے -
انتخابات سے سال ڈیڑھ سال پہلے کچھ ان کی لَے تیز ہوتی، کچھ
سیاست کاروں اور اقتدار والوں کی سماعت بحال ہوتی - وہ
لوگ اردو کے نمائندوں کو چکنی چپڑی باتوں اور محبوب نما
پیمانوں سے رام کر لیتے ؛ انھیں سبز باغ دکھاتے اور وہ آمنّا
اور صدقنا کہہ کر ان کے پیچھے پیچھے ہو لیتے - اُن وعدوں میں محبوب
کے وعدوں کا سا ابہام ہوتا - اس بار ہمیں عہد کر لینا چاہیے

رہم مبہم وعدوں کو باور نہ کریں گے۔ ہمیں حکومتوں اور سیاسی پارٹیوں سے تنظیمی سلیقہ کے ساتھ بات کرنا چاہیے اور اس وقت تک مطمئن نہ ہونا چاہیے جب تک کہ وعدہ کو پالیسی اور پالیسی کو پروگرام کی صراحت بر ملا نہیں ملتی اور وعدہ کرنے والے صحت نفاذ اور احتساب تعمیل کی ضمانت نہیں لیتے۔ یہ کام اردو والوں کو متحد ہو کر ہوش و گوش، دور اندیشی اور بصیرت کے ساتھ کرنا ہوگا۔

دوسرا محاذ پہلے محاذ سے زیادہ اہم، دیرطلب، صبر آزما اور دوررس ہے۔ یہ محاذ جیسا کہ قارئین کو یاد ہوگا عوام کا بالعموم اور ہندی بولنے والوں کا خصوصاً محاذ ہے۔ ہمیں ہندی والوں کے دلوں کو جیتنا ہے، ان کے دلوں میں اردو کے تعلق سے جو بدگمانیاں ہیں، انھیں دور کرنا ہے۔ انھیں بتانا ہے کہ ہمیں ہندوستان کی ساری زبانوں سے محبت ہے اور ان زبانوں کی سیادت کو بھی ہم تسلیم کرتے ہیں، جن کو ہمارا دستور میں شرف اندراج ملا ہے؛ اور ان سب سے بڑھ کر ہمیں ہندی سے محبت اور وابستگی ہے کیونکہ اردو اور ہندی جڑواں بہنیں ہیں۔ ایک سے دوسرے کو طاقت اور ثروت ملتی ہے۔ جہاں ایک جاتی ہے، دوسری سائے کی طرح اس کے ساتھ لگ جاتی ہے۔ اردو جو بازار میں پیدا ہوئی۔ جس بازار میں اور ملک کے جس خطے میں گئی، ہندی کو اپنے ساتھ لے گئی۔ ہندی جو سرکاری زبان ہے جیسے جیسے فروغ پاتی ہے، اردو کو اپنا ساجھی دار بناتی چلتی ہے۔ ان دونوں زبانوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ سیامی توام بچوں کی طرح یہ زبانیں دراصل کئی عضووں میں اب تک جڑی ہوئی ہیں۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ روئے ارض پر کوئی دو زبانیں ایک دوسرے سے اتنی قریب اور اتنی مشابہ نہ ہوں گی جتنی اردو اور ہندی۔ اتنے قرب کے باوجود اس قدر دوری! قرب حقیقی ہے اور دوری بناوٹی۔ حقیقت کے آگے بناوٹ زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرتی اتنے دن بھی جو ٹھہر گئی وہ غلط فہمیوں کی وجہ سے۔ ہمیں ہندی بولنے والوں کے سامنے اپنے کلیجے کو نکال کر رکھ دینا چاہیے۔ انھیں معلوم تو ہو کہ ہمارے دل میں ہندی کے لیے کتنی جگہ، کتنی محبت ہے۔ ہم ہندی کا احترام کرتے ہیں، اس کی سیادت کو تسلیم کرتے ہیں اور ہندی والوں اور ہندوستان کے عام باشندوں سے اس کی امید کرتے ہیں کہ اس ہندی الاصل زبان کو جس کا نام اردو ہے اور جس میں ساری زبانیں شیر و شکر ہو گئی ہیں، ہندوستان کی دوسری زبانوں کی طرح پنپنے اور ترقی کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ اس کی جڑیں روزگار کی زمین میں پھر سے پیوست کر دی جائیں گی اور اس کے رسم خط کو جس میں ایک ثقافت کا نمول اور ایک ادب کی لطافتیں پنہاں ہیں، محفوظ رکھا جائے گا۔ یہ کام سلیقے اور اتحاد کے ساتھ جابجا کرنے کا ہے۔ ہمیں ہندی والوں کے دلوں کو موہ لینا چاہیے اور ان کے دلنشیں یہ بات کر دینی چاہیے کہ اردو کی ترقی کا فائدہ ہندی کو خود بخود ملے گا۔ اس کی شگفتگی، روانی اسالیب بیان اور ذخائر الفاظ میں اردو کی رفاقت کی بدولت ایسا اضافہ ہوگا جس کی دوسری مثال زبانوں کی دنیا پیش کرنے سے قاصر رہے گی۔ اگر اردو والوں نے دوسرا محاذ سر کر لیا تو پہلا محاذ لامحالہ ان کے زیر نگیں ہو جائے گا۔

آپ نے دیکھا کہ پہلا محاذ بہت اہم تھا لیکن دوسرا محاذ اس سے کہیں زیادہ اہم نکلا۔ تیسرا محاذ اہم ترین محاذ ہے۔ اسے اگر کلیدی یا قلبی محاذ کہیں تو نا روا نہ ہوگا۔ پہلے دونوں محاذوں پر اردو والوں کی کامیابی ان کی ان تھک، باقرینہ اور پر اخلاص مساعی

> "جن باتوں سے کسی قوم پر ادبار آتا ہے اور تمام ہمتیں پست اور قوتیں سست ہو جاتی ہیں، ان میں جہاں عام رسم و رواج کی پابندی اور جاہلانہ تقلید اور اپنے آپ کو ہمہ داں اور سب سے برتر سمجھنا اور تعصب بے جا اور اسی قسم کی خرابیاں شامل ہیں، ان میں ایک حضرت توکل بھی ہیں، جن سے خدا پناہ میں رکھے۔"
>
> وقار الملک

کے علاوہ ایک طرف حکومت، دوسری طرف عوام، بالخصوص ہندی والوں کے تعاون پر منحصر ہے۔ تیسرے محاذ کی قسمت بلا شرکتِ غیرے اردو والوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اس پر اگر وہ ایثار اور جانفشانی، مُداومت اور استمرار اور بے غرضی کے ساتھ کام کرتے ہیں تو میدان ان کے ہاتھ ہے۔ دوسروں کی شکایت کرنے کے بجائے اگر وہ خود اردو کا حق اسے دیں اور عہد کرلیں کہ اپنے بچوّں کو اردو ہر قیمت پر پڑھائیں گے تو چند سال کے اندر ایک انقلاب آجائے گا۔ گھر گھر محلّہ محلہ مکتب کھل سکتے ہیں۔ یہ مسئلہ بڑی حد تک اس قدیم نظام کی بازیابی سے حل ہو جائے گا جس کے تحت بڑی بوڑھیاں ہمسایہ کے بچوّں کو پڑھایا کرتی تھیں۔ سب سے زیادہ جم کر ڈٹ کر کام اسی مورچہ پر کرنا ہے۔

علاوہ بریں، ملک میں تعلیم کی جو توسیع زیرِ غور اور تحتِ عمل ہے، اردو والوں کو ہر شہر اور قریہ میں ارباب تعلیم سے رابطہ قائم کرکے اس توسیع اور اس کے مختلف پروگراموں اور مدراس کے مجوزہ قیام کا فایدہ اٹھانا چاہیے۔

قارئین کرام ! اب تن آسانی اور شکوہ سنجی کا وقت نہیں رہا۔ پانی سر سے اوپر جا رہا ہے۔ اب ہمیں ایک محاذ سے عارضی چھیڑ چھاڑ کے بجائے باتنظیم اور متحد انداز سے تین محاذوں پر لگاتار کام کرنا ہے۔

(۱) حکومت اور اہلِ سیاست کا محاذ

(۲) عوام خصوصاً ہندی والوں کا محاذ

(۳) خود اردو والوں کا محاذ۔

انجمن ترقی اردو نے گزشتہ ۴۰ سال کی روداد کا حال ہی میں جائزہ لیا ہے اور فیصلہ کیا ہے کہ وہ اس ادارہ کو نئے سرے سے تحریک کی شکل دے گی۔ تاکہ مذکورہ بالا تینوں محاذوں پر لگ کر کام کیا جاسکے۔ ادب کو بالکل نظر انداز تو نہیں کیا جائے گا لیکن زبان کو وہ اولیت اور اہمیت، فضیلت اور برتری دی جائے گی جو اس کا حق ہے۔ زبان نہ رہی تو ادب کو کون پوچھے گا۔ انجمن کا صدر آپ سے مودبانہ درخواست کرتا ہے کہ انجمن کی دعوت پر لبیک کہیں، اس کے ہاتھوں کو مضبوط کریں اور اردو کے خیر خواہ ادارے، افراد، انجمنیں، اکادمیاں، مدارس، اسکول، کالج مشترک پروگرام میں انجمن ترقی اردو ہند کا ہاتھ بٹائیں اور ساتھ دیں۔ نصرتِ خداوندی انشاء اللہ آپ کے ہم رکاب ہو گی۔

" اگر تمام اہلِ دنیا کی مصیبتیں لاکر ڈھیر کر دی جائیں اور پھر سب کو برابر بانٹ دیں تو جو لوگ اپنے آپ کو بدنصیب سمجھ رہے ہیں وہ اس تقسیم کو مصیبت اور پہلی مصیبت کو غنیمت سمجھیں گے۔"

سقراط۔

میر ولایت حسین کا ایک اہم مضمون

چند روز ہوئے میں اپنے کچھ کاغذات اور کتابوں کا جائزہ لے رہا تھا، ان میں آپ بیتی یا ایم۔ اے او۔ کالج علی گڑھ کی کہانی، میر ولایت حسین صاحب کی زبانی، پر نظر پڑی۔ یہ کتاب ۱۹۷۰ء میں شایع ہوئی تھی اور میں نے اس پر انجمن ترقی اردو ہند کے ترجمان ہماری زبان میں خاصی تفصیل سے تبصرہ کیا تھا۔ میر ولایت حسین جنھیں سب میر صاحب کہتے تھے ۱۸۶۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۹ء میں ان کا انتقال ہوا۔ یعنی ستاسی اٹھاسی سال کی اُن کی عمر ہوئی۔ انھوں نے خاصی تنگ دستی میں آنکھیں کھولی تھیں، مگر اپنی محنت، استقلال عزم اور حوصلے کی وجہ سے خاصی ترقی کی۔ میر صاحب ۱۸۸۲ء میں علی گڑھ آئے۔ انھوں نے یہاں سے بی۔ اے کیا اور پھر اسکول میں استاد ہو گئے۔ ۱۹۲۰ء میں ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے وابستہ ہو گئے اور یہیں سے ۱۹۳۵ء میں رٹائر ہوئے۔ مگر یہ اعداد و شمار اس انتھک، جفاکش، مخلص اور بے غرض شخصیت کی تصویر پیش نہیں کرتے جس کا نام میر ولایت حسین تھا۔

میں جب ۱۹۳۲ء میں علی گڑھ آیا تو یہ سر راس مسعود کی وائس چانسلری کا زمانہ تھا اور علی گڑھ میں ایک عجیب جوش و ولولہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا ہم سب بہت جلد ستاروں کو چھو لیں گے اور یونیورسٹی مشرق و مغرب کا ایک معیاری ادارہ بن جائے گی۔ اُسی زمانے میں ڈپٹی حبیب اللہ خاں نے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی یادگار کے طور پر آفتاب ہوسٹل کی تعمیر شروع کرائی۔ ہوسٹل کی تعمیر کی نگرانی میر ولایت حسین صاحب کرتے تھے۔ میر صاحب سر سید کے زمانے میں ڈائننگ ہال کے نگراں تھے تو پرنسپل نے یہ طے کیا کہ نگراں سے کھانے کی فیس نہ لی جائے۔ میر صاحب نے کہا کہ میں تو بدستور کھانے کی فیس دیتا رہوں گا ورنہ کسی اور کو نگراں مقرر کیا جائے۔ علی گڑھ منتھلی پہلے انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ضمیمے کے طور پر شایع ہوتا تھا۔ بعد میں میر صاحب کی نگرانی میں یہ علیحدہ شایع ہونے لگا اور رفتہ رفتہ خود مکتفی ہو گیا۔ میر صاحب ایران بھی ایک وفد لے کر گئے تھے تاکہ ایرانی طلباء کو علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے مائل کریں۔ سر سید، سید محمود

شبلی، بیک، مارین، محسن الملک، وقار الملک، کے متعلق اس کتاب میں ایسے چشم دید واقعات ملتے ہیں جو کہیں اور نہیں ملتے۔ سرسید کے آخر دور کے متعلق یہ کتاب معلومات کا ایک خزانہ ہے۔

میر صاحب کا یہ مضمون جو "خیالی پلاؤ" کے نام سے شائع ہوا تھا، ان مضامین میں سے ایک ہے جو ۱۸۹۶ء اور ۱۹۰۰ء کے درمیان لکھے گئے۔ تہذیب الاخلاق میں اس کی دوبارہ اشاعت اس لیے ضروری معلوم ہوئی کہ مذہبی عالم کے سلسلے میں ان خیالات کی آج بھی اہمیت ہے۔ میر صاحب نے کام کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی آج بھی عمل کر سکتی ہے۔ موجودہ حالات میں سارے ملک میں مسلمانوں کی ذہنی اصلاح کا کام یونیورسٹی انجام نہیں دے سکتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر ریاست میں جو وقف بورڈ ہیں وہ اس ریاست کے ہر ضلع میں مساجد میں روزانہ اہم مسائل کے متعلق مختصر تقریریات کا انتظام کریں اور اس کے ساتھ ایسے اسکول قایم کریں جن میں دینی اور دنیوی تعلیم دونوں کا انتظام ہو۔ حالات زمانہ سے باخبر اور روشن خیال علما کے ذریعے سے ہی نئی نسل کو جو مغربی تعلیم حاصل کر رہی ہے، مذہب اور اخلاق کی روح سے آشنا کیا جا سکتا ہے۔ اس اہم کام کو ترجیحی بنیادوں پر کرنا چاہیے۔ اس مضمون کا شروع کا اور آخری حصہ طوالت کے خیال سے حذف کر دیا گیا ہے، مگر میر صاحب کا پورا استدلال لے لیا گیا ہے۔ ——— ڈاکٹر آل احمد سرور

مذہبی عالم کس قسم کے لوگ ہوں؟

مذہب چونکہ لوگوں کی دنیاوی اور دینی دونوں قسم کی رہنمائی کا ذمہ لیتا ہے اور فی الحقیقت یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو بھی نہیں سکتے۔ ان کا باہمی تعلق جسم و جان کا سا ہے کہ ایک بغیر دوسرے کے قایم نہیں رہ سکتا اور خود شارع اسلام کے ارشاد کے موافق الدنیا مزرعۃ الآخرۃ ہے۔ اس لیے ضرور ہے کہ رہنمایان مذہب بھی اس قسم کے لوگ ہوں جو دنیاوی اور دینی دونوں قسم کے علوم کے ماہر ہوں۔ دنیا اور دین دونوں کے کاموں میں ان کی عقل سلیم ہو۔ ان کے افعال و اقوال میں تطابق ہو۔ ان کے اخلاق حمیدہ اور اوصاف پسندیدہ ہوں۔ غرض کہ ہر طرح پر اپنے ابنائے جنس سے جن کی وہ رہبری کریں حتی المقدور اعلیٰ و اوفق ہوں تا کہ لوگوں کے دلوں میں ان کی سچی عظمت قایم ہو۔ ان کے اقوال کو لوگ گوش دل سے سنیں اور ان کے نمونے کی پیروی کرنے کی کوشش کریں۔ یہی وجہ تھی کہ زمانہ ماسبق میں دستار فضیلت اس وقت بندھتی تھی جب کوئی شخص اس زمانے کے مروجہ علوم میں مہارت تامہ پیدا کر لیتا تھا اور مذہبی پیشوا بننے کے علاوہ علوم مروجہ کی واقفیت کے ظاہری و باطنی تقوے و پرہیزگاری کی بھی لازمی تھی۔ پس اس زمانے کے موافق مذہبی عالم ہونے کے لیے جو معیار کہ مقرر تھا وہ بہت صحیح اور درست تھا اور ایسا شخص فی الحقیقت معلومات میں اپنے ہم جنسوں سے اعلیٰ و ارفع ہوتا تھا اور دیگر اخلاقی خوبیاں بھی اس میں موجود ہوں تو وہ اس زمانے کے لوگوں کی ہدایت کے لیے نہایت موزوں شخص ہوتا تھا لوگ اس کو ہر طرح پر اپنے سے بہتر دیکھتے تھے، اس لیے

اس کی دل سے عزت کرتے تھے اور جو وہ کہتا تھا، اس کو رغبت سے سنتے تھے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر اب زمانہ بدل گیا۔ ہر علم بجز علم اخلاق کے جس میں ترقی کی بہت گنجائش نہیں، کوسوں آگے بڑھ گیا ہے۔ مگر ہمارے علما، کے سلسلۂ تعلیم میں وہی مبادی علوم جو پانچ سو برس قبل شامل تھے اسی حالت میں اس وقت بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ حالانکہ اب اُن مبادی کا جاننے والا اس زمانے کی ترقی یافتہ قوموں کے مقابلے میں علمی حیثیت سے کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

دوسری صفت تقویٰ کی جو ایک مذہبی عالم کے لیے ضروری قرار دی گئی تھی، اس کی اصلیت یہ تھی کہ مذہب کی پوری پابندی باطنی خوبیاں پیدا کرتی تھی اور اس اندرونی پاکیزگی کی جھلک پابند مذہب شخص کی بیرونی حرکات و سکنات سے بھی بلا ارادہ ظاہر ہوتی تھی اور اسی کا نام ثقاہت تھا اور اس کے دیکھنے والوں پر اثر پڑتا تھا۔ مگر اب ہم عرض کو جوہر قرار دے لیتے ہیں اور مثل تبرسی فرقہ عیسائیوں کے اصل سے زیادہ تر مقصود نہ رکھ کر ہماری ساری کوشش ظاہری پابندیوں پر صرف ہوتی ہے۔ بلکہ ہم نے ظاہری پابندیوں ہی کا نام مذہب رکھ دیا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ظاہری پابندیاں ضروری نہیں ہیں اور ہر شخص کو فنا فی اللہ کا درجہ آسانی سے حاصل ہو سکتا ہے اور وہ مست ہو کر ساری قیود ظاہری سے آزاد ہو جائے اور مثل رسول شاہیوں کے چار ابرو کا صفایا کر لے۔ اور دنیا بھر کے منہیات اس کے لیے مباح ہوں۔ میرا اعتراض صرف یہ ہے کہ اس زمانے کے عالم اپنے لیے اور نیز دوسروں کے واسطے، باطنی خوبیوں پر اس قدر زور نہیں دیتے جس قدر کہ وہ ظاہر کی لے بڑھاتے ہیں یعنی کسی شخص کو جھوٹ بولتے ہوئے، رشوت لیتے ہوئے، مقدمہ بازی سے دوسروں کا حق چھینتے ہوئے، بے ایمانی سے غیروں کا مال مارتے ہوئے دیکھ کر اس قدر طیش نہیں آتا جتنا کہ ایک شخص کی داڑھی منڈی ہوئی، لبیں بڑھی ہوئی، ازار ٹخنے سے نیچی دیکھنے سے غصہ آتا ہے۔ ان کے نزدیک ایک سب انسپکٹر پولیس جو پنجگانہ نماز پڑھتا ہے، ماہِ صیام میں روزہ رکھتا ہے، بعد نماز کچھ دیر وظیفہ بھی پڑھ لیتا ہے، پکا مسلمان ہے۔ خواہ وہ کتنا ہی ظالم و سفاک، رشوت خوار اور بے ایمان کیوں نہ ہو غرضکہ اب صرف ان ظاہری تشفہ اور پابندیوں کا نام مذہب رکھا گیا ہے۔ اس لیے لوگوں کے دلوں پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے علما کا معیار قابلیت اب بیشتر سے کچھ بڑھ کر ہونا چاہیے تاکہ موجودہ زمانے میں وہ باوقعت ہوں اور ان کی تلقین ہم پر عمدہ اثر پیدا کرے اور ان کے ذریعے سے مذہب اسلام پھر دنیا میں سرسبز اور کامیاب ہو۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ہر زمانے میں اپنے ہم جنسوں کی نظروں میں وقعت حاصل کرنے کے لیے ان سے ان چیزوں میں گوئے سبقت لے جانا ضروری ہے۔ جن کا ان میں چرچہ ہے۔ اس بنا پر مصریوں کی ہدایت کے لیے جب حضرت موسیٰ کو ید بیضا اور لکڑی کا سانپ بنا دینے کا معجزہ عنایت فرمایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چونکہ عرب میں فصاحت و بلاغت کی بڑی قدر تھی، اس لیے بطور معجزہ کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کلام پاک ایسا فصیح و بلیغ عطا ہوا کہ آج تک زبان عرب میں اس کا مثل نہ ہو سکا۔ پس ہمارے علمائے مذہب کے لیے بھی ضروری ہے کہ ایسے قابل اشخاص ہوں کہ جو علاوہ علوم مذہبی کے آج کل کے علوم دنیاوی سے بھی اچھی واقفیت رکھتے ہوں نہایت روشن خیال ہوں امور معاش و معاد دونوں کی ان میں عقل ہو۔ پاکیزہ دل و پاکیزہ خیالات ہوں اور ان کے اعمال و افعال ہی اس پاکیزگی کی جھلک ہو۔ صرف اسی قسم کے علما اس زمانے کے تعلیم یافتہ

گروہ میں باوقعت ہوں گے اور وہ عوام وخواص دونوں قسم کے لوگوں کی امور معاد و معاش میں رہنمائی کرسکیں گے۔ ان کے دل سے وقعت اوراس لیے تقلید کریں گے اور وہ لوگوں کو عمدہ راستے پر چلائیں گے اور مذہب جیسا کہ اب تک لوگوں کے لیے باعثِ خیروبرکت رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔

زمانہ کی ضرورت کے موافق مذہبی عالم کیوں کر پیدا ہوں

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے عالم کیونکر پیدا کیے جائیں۔ ندوۃ العلماء نے بھی اس ضرورت کو محسوس کرکے دارالعلوم کی بنیاد ڈالی تھی مگر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دارالعلوم ہمارے مرض کی پوری دوا نہیں اوراس کو اصل پیمانے پر لانے کے لیے بہت روپیہ اور قابلیت کی ضرورت ہے جس کا ہماری قوم میں سردست مہیا ہونا مشکل ہے۔ اس لیے بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ طالب علم کی طرح ہمارے پاس جو پونجی ہے، اسی کو اس مصرف میں لائیں اور جابجا ناقص ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں بنانے میں روپیہ ضائع کرنے کے بجائے مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی تکمیل کریں اوراس میں مختلف شعبے قائم کرکے اپنی مختلف ضرورتوں کو پورا کریں۔ یعنی کالج کے جو طلباء کہ عربی سکنڈ لینگویج کے ساتھ امتحان بی۔ اے میں کامیاب ہوں اور مذہبی رجحان طبیعت رکھتے ہوں اور پابند صوم وصلوٰۃ ہوں اُن کی وظائف سے مدد کی جائے اور دو یا تین سال تک زبان عربی اور علوم مذہبی کی اُن کو اس شرط پر تعلیم دی جائے کہ بعد فراغِ امتحان کم از کم ایک خاص مدت تک وہ اِسلامی مشن میں ملازمت کریں۔ امتحان میں کامیاب ہونے پر اُن کو کوئی سند مثلِ ڈاکٹر آف ڈونٹی کے دی جائے اور اُن سے اِسلامی مشن میں کام لیا جائے۔

اِسلامی مشن کا طریقہ کاروائی کیا ہو؟

اِس قسم کے سند یافتہ اشخاص ابتدا میں پچاس یا ساٹھ روپیے ماہوار تنخواہ پر اسلامی مشن کی طرف سے ہر ضلع کے صدر مقام میں مقرر ہوں اور ان کا صرف یہ کام ہو کہ اپنی پاکیزہ، مفید اور پُرشغل زندگی سے لوگوں کے سامنے عمدہ نمونہ پیش کریں۔ مساجد میں لوگوں کو پابندی صوم و صلوٰۃ، راست بازی، خوش اطواری اور جفاکشی پر وعظ کہیں۔ مسلمانوں کے متعلق ہر قسم کے مقامی رفاہِ عام کے کام میں حصہ لیں۔ لوگوں کو صلاح نیک دیں۔ اپنے مقام کے پُرجوش اشخاص کی ایک کمیٹی بنائیں اور اس کے ذریعے سے مسلمانوں کی عام بہبودی کے کام کریں۔ اپنے ضلع کے قصبات میں بھی جہاں مسلمانوں کی آبادی ہو، وقتاً فوقتاً دورہ کرتے رہیں اور وعظ و پند سے لوگوں کو نیک ہدایت کریں اور ممکن ہو تو ان قصبات میں ماتحت کمیٹیاں لوگوں کی اصلاح و فلاح کے لیے قائم کریں اور ان کو کام کرنے کی رغبت دلائیں۔"

شیطان انسان کے لیے بھیڑیا ہے اور یہ بھیڑیا انھیں بکریوں کو پکڑتا ہے جو الگ جا بھاگتی ہیں، یا دور نکل جاتی ہیں۔ (حدیثِ رسول)

اردو شاعری میں اسلام کا تصور

رالف رسل*

۱۹۸۰ء میں پندرھویں صدی ہجری کا آغاز منایا جا رہا تھا۔ اس سلسلے میں یونیورسٹی آف لندن کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز نے لکچروں کے سلسلے کا اہتمام کیا۔ مجھ سے درخواست کی گئی کہ اس سلسلے کا ایک لکچر میں بھی دوں۔ میں نے دعوت قبول کی اور اپنے لکچر کا عنوان رکھا

اردو شاعری میں اسلام کا تصور

اس لکچر کی رپورٹ میری تصویر کے ساتھ روزنامہ جنگ مورخہ ۲۵ نومبر ۱۹۸۰ء میں ان سرخیوں کے ساتھ چھپی:

'لندن یونیورسٹی میں رالف رسل کا لکچر
اردو شاعری میں اسلام کا تصور
مذہب کے لفظی معنیٰ پہنانے والوں کے عقائد سے مختلف ہے'۔

رپورٹ میں یہ جملے تھے:

مسٹر رالف رسل..... برطانیہ کے 'بابائے اردو' مانے جاتے ہیں۔ اردو شاعری پر اس عقیدے کی بڑی گہری چھاپ ہے کہ 'چاہے شراب پیو اور چاہے قرآن پاک کو جلاؤ لیکن اپنے ساتھی انسان کے ساتھ بھلائی کرو'۔

میرے لکچر پر ایک صاحب نے سخت اعتراض کیا۔ ان کا خط اور اس کا میرا جواب جو تین قسطوں میں چھپا، یہ ہے:

" آپ کے اخبار کی ۲۵ نومبر کی اشاعت میں برطانیہ کے "بابائے اردو" پروفیسر رالف رسل کے ایک لکچر کی رپورٹ نظر سے گزری۔ یہ رپورٹ اس لحاظ سے تشنہ ہے کہ راقم الحروف جیسے عام قارئین کو میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے ان اشعار سے محروم رکھا گیا ہے جن کا سہارا لے کر پروفیسر رالف رسل نے آپ کے رپورٹر پر یہ بات واضح کر دی کہ تینوں عظیم شعرا کے کلام پر اس "عقیدے" (نظریے؟) کی بڑی گہری چھاپ ہے کہ "چاہے شراب پیو اور چاہے قرآن پاک کو جلاؤ لیکن اپنے ساتھی انسان کے ساتھ بھلائی کرو۔" اس کے علاوہ یہ بات بھی واضح نہیں کی گئی کہ یہ عقیدہ (نظریہ؟) کس شخص کا ہے، اور اسے کہاں بیان کیا گیا ہے۔ اگر قرآن پاک کو جلانے کا تذکرہ اقبالؔ یا غالبؔ نے کہیں کیا ہے تو بہتر ہوتا اس کا حوالہ دے دیا جاتا۔ ساری رپورٹ پڑھنے کے بعد یہ بات بھی عیاں نہیں ہوتی کہ اردو شاعری نے اسلام کا کون سا نیا تصور پیش کیا ہے جو اسلام کے "عام رائج" عقائد اور نظریات سے مختلف ہے۔ بالفرض اردو شاعری میں اس طرح کا کوئی نیا تصور ہے تو کیا اسے "اسلام" کا تصور کہنا چاہیے۔ راقم الحروف کے خیال میں اسلامی عقائد سے مختلف کوئی تصور اسلام کا نہیں ہو سکتا۔ اگر رسل صاحب نے یا ان کے توسط سے آپ کے رپورٹر نے اردو شاعری میں کوئی نیا تصور دریافت کر لیا ہے

---

* استاد شعبۂ اردو ——— لندن۔ برطانیہ۔

تو اسے ازراہ کرم اسلام کا تصور ہرگز نہ کہیے۔ مجھے اپنی کم علمی کا اعتراف ہے لیکن اتنے بڑے اخبار میں یہ دیکھ کر ازحد دکھ ہوا کہ اس ساری رپورٹ کا عنوان نہ صرف معنوی بلکہ لفظی اعتبار سے بھی غلط شایع کیا گیا ہے۔ عنوان کے مطابق اردو شاعری میں اسلام کا تصور جن لوگوں کے عقائد سے مختلف ہے وہ لوگ ـــ مذہب کے لفظی معنیٰ پہنانے والے ـــ کہیں۔ اول تو یہاں مذہب کے لفظی معنیٰ سے مراد کیا ہے؟ دوسرے یہ معنیٰ کیسے پہنائے جارہے ہیں؟ "عقائید" کی بجائے "عقائد" بہتر ہوتا۔ "عقائید" بھی غلط نہیں ہے۔ اگر آپ یہ سطور اپنے اخبار میں شایع فرمادیں شاید پروفیسر رسل صاحب کی "بابائے اردو" والی رگ پھڑک اٹھے اور مجھ حقیر کے علم میں وہ کچھ اضافہ کرنے کی طرف توجہ دیں۔ ورنہ آپ کے رپورٹر صاحب نے تو ان کی شخصیت کو چار چاند لگا ہی دیے ہیں۔

والسلام　　　　ابوالعرشان، لندن"

" پچھلے دنوں، اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز میں "اردو شاعری میں اسلام کا تصور" کے موضوع پر میرے لکچر کے بارے میں ایک رپورٹ شایع ہوئی تھی جس پر ابوالعرشان صاحب نے اپنے ایک خط میں اعتراضات کیے ہیں۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے میں خوشی سے اُن کے اِن اعتراضات کا جواب دوں گا جن سے مجھے اتفاق نہیں (اس جملے سے آپ کو پتہ چلے گا کہ ان کے بعض اعتراضات کو میں خود صحیح سمجھتا ہوں) مشکل یہ ہے کہ مکمل جواب دینے کے لیے فرصت بھی چاہیے اور "جنگ" اخبار کا کم سے کم آدھا صفحہ بھی۔ اور اس وقت نہ مجھے اتنی فرصت ہے اور نہ "جنگ" میں اتنی گنجائش۔ اس لیے مجھے قسط وار جواب دینا پڑے گا، پہلی قسط ملاحظہ ہو:

" مجھے ابوالعرشان صاحب کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ قارئین کو ان سب اشعار سے محروم رکھنا جو میں نے نقل کیے ان کے ساتھ (اور میرے ساتھ بھی) ناانصافی تھی۔ وہ شعر جس کا آزاد اردو ترجمہ رپورٹ میں دیا گیا تھا اصل میں ایک فارسی شاعر کا ہے۔ شعر یہ ہے ؎

مے خور و مصحف بسوز و آتش اندر کعبہ زن
ساکن بت خانہ باش و مردم آزاری مکن

شعر تشریح طلب ہے اور میں نے لکچر میں اس کی تشریح بھی کی تھی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس میں شاعرانہ مبالغہ بہت ہے اور اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ شاعر واقعی چاہتا ہے کہ آپ یہ حرکتیں کریں۔ یہ شعر میں نے سب سے پہلے مرزا رسوا کے مشہور ناول "امراؤ جان ادا" میں پڑھا جہاں انھوں نے اس کو حافظ کا شعر بتایا ہے۔ مجھے شبہ ہوا کہ غالباً یہ حافظ کا شعر نہیں ہے۔ دیوان حافظ میں ڈھونڈھا مگر تلاش نہیں کرسکا۔ البتہ اس میں اور اس بہت مشہور شعر میں جو واقعی حافظ کا ہے، ذرا بھی تضاد نہیں ؎

مباش در پے آزار و ہرچہ خواہی کُن
کہ در شریعتِ ما غیر ازیں گناہے نیست

میں پہلے شعر کے شاعر کو ابھی تلاش نہیں کرسکا۔ (میرے ایک پاکستانی دوست کہتے ہیں کہ خاقانی کا ہے)، لیکن ایران میں لوگ اس سے بخوبی واقف ہیں۔ میں نے اپنے ایرانی رفیق کار سے دریافت کیا کہ یہ کس کا شعر ہے اور "مے خور و ...." تک ہی پہنچا تھا کہ انھوں نے فوراً باقی شعر سنا دیا۔ لیکن ان کو بھی معلوم نہیں تھا کہ شعر کس کا ہے۔ پہلی قسط کے لیے یہ کافی ہے۔ اگلی قسطوں میں ـــ اگر "جنگ" مجھے اس کا موقع دے سکے تو ـــ میں یہ بتاؤں گا کہ اس شعر کے پیچھے اصل تصور میرے نزدیک کیا ہے (۲) اردو کے ان بے شمار اشعار کے کچھ نمونے پیش کروں گا

جو تقریباً اسی تصور کے حامل ہیں۔ (۳) یہ بتاؤں گا کہ مجھے یہ تصور کیوں پسند ہے اور رہی یہ بھی بتاؤں گا کہ میں کیوں صرف اسی مسلمان کو صحیح معنوں میں مسلمان ماننے کے لیے تیار ہوں جو یہ تصور قبول کرے۔ اگر "جنگ" میں اتنی ساری باتوں کی گنجائش نہیں اور ابو العرشان صاحب مجھ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں اور سننا چاہیں کہ مجھے کیا کہنا ہے تو شوق سے ملاقات کریں۔ میں ان کے ہر اعتراض کا جواب دینے کے لیے تیار ہوں۔ چاہے "خلوت" میں ہو چاہے "جلوت" میں۔

دو باتیں اور ـــ

(۱) "مذہب کے لفظی معنی پہنانے والے" میرے الفاظ نہیں تھے بلکہ شاید رپورٹر نے **Fundamentalist** کا ترجمہ کیا ہو۔

۲۔ "بابائے اردو" کا خطاب ظاہر ہے میرا خود ساختہ نہیں ہے۔ غالباً "جنگ" کے ایڈیٹر صاحب کو میرے بارے میں حسنِ ظن ہے جس کی بنا پر انھوں نے یہ خطاب مجھے عطا کیا ویسے کسی شخص کو خطاب عطا کرنے سے پہلے عام طور پر اس سے پوچھا جاتا ہے کہ وہ اسے قبول کرنا پسند کرے گا یا نہیں۔ میرے ساتھ یہ رعایت نہیں کی گئی۔ ورنہ میں یقیناً انکار کرتا۔ میں اردو کا خادم سہی "بابائے اردو" کہلانے کا ہرگز مستحق نہیں۔ خیر بقول انگریزوں کے "آزاد ملک ہے" آصف جیلانی صاحب مجھے یہ خطاب دینا چاہیں تو انھیں کون روک سکتا ہے؟ اور یہ کیا کم ہے کہ اس کی بدولت لوگوں کو ہنسنے اور مذاق اڑانے کا موقع ملا ہے۔

مخلص: رالف رسل

پچھلے خط میں میں نے فارسی کے دو اشعار نقل کیے تھے، ان کے لفظی ترجمے یہ ہیں:

(۱) نا قافی (؟) کا شعر: شراب پیو، قرآن جلاؤ اور کعبے کے اندر آگ پھینک دو۔ بت خانے میں جا کر رہو اور انسانوں کو تکلیف مت پہنچاؤ۔

(۲) حافظ کا شعر: انسان کو تکلیف پہنچانے کی کوشش مت کرو، اور جو جی چاہے کرو۔ کیوں کہ ہماری شریعت میں اس کے سوا (یعنی انسانوں کو تکلیف پہنچانے کے سوا) اور کوئی گناہ ہے ہی نہیں۔

ان دونوں اشعار میں (اور خاص طور پر پہلے شعر میں) کافی مبالغہ ہے۔ وہ کہنا چاہتے ہیں کہ بدترین گناہ دوسرے انسانوں کو تکلیف پہنچانا ہے۔ شاعر کو اس بات کا احساس ہے کہ بہت ہی کم لوگ محسوس کرتے ہیں کہ "مردم آزاری" کتنا بڑا گناہ ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر آپ کسی مسلمان سے کہہ دیں کہ "قرآن جلاؤ" تو اس کو بڑا صدمہ ہوگا لیکن وہی مسلمان بہت اطمینان کے ساتھ اپنے ساتھی انسان کو دکھ دے گا اور سمجھے گا کہ اگر گناہ کیا بھی تو بہت معمولی گناہ کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ معمولی گناہ نہیں، بہت ہی سخت گناہ ہے اور اس بات کو خوب اچھی طرح ذہن نشین کرانے کے لیے مبالغے سے کام لیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کے مقابلے میں شراب پینا، قرآن جلانا وغیرہ جیسے گناہوں کی کچھ اہمیت ہی نہیں۔ ظاہر ہے کہ شاعر نہیں چاہتا کہ آپ واقعی یہ حرکتیں کریں۔ بس ایک بہت ہی اہم بات کو ذہن نشین کرانے کے لیے مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ وہ کہنا چاہتا ہے کہ ہر مسلمان کے لیے لازمی ہے کہ شراب نہ پیے۔ قرآن کا احترام کرے اور اگر اس کے لیے ممکن ہو تو حج کرے۔ کیوں کہ ان ساری باتوں کے ساتھ اگر وہ مردم آزاری کرے تو یہ ساری خوبیاں اس ایک گناہ کی تلافی نہیں کر سکتیں اس کی برائیوں کا پلّہ اس کی نیکیوں کے پلّے سے بھاری ہوگا اور دوسری طرف اگر وہ شراب پیے اور اسلام کے دوسرے

احکام نہ مانے مگر اس کے ساتھ اپنے ساتھی انسانوں کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک کرے تو اس کے سارے گناہوں کے باوجود اس کی نیکیوں کا پلّہ اس کی برائیوں کے پلّے سے بھاری ہوگا

یہ تصور اور ایسے تصورات جن کا اس تصور سے بہت ہی قریبی تعلق ہے اردو غزل میں بھی نہایت عام ہے اگلی قسط میں نمونے کے طور پر کچھ اشعار پیش کروں گا۔

مخلص: رالف رسل

پچھلے خط میں میں نے حافظ کا ایک مشہور شعر نقل کیا اور اس کی تشریح کی۔ میر تقی میر کے دو منقطع اشعار ہیں جو کہ واضح طور پر حافظ کے اس شعر پر مبنی ہیں۔ شعر یہ ہیں:

درِ مسجد پہ حلقہ زن ہو تم
کہ رہو بیٹھ خانۂ خمّار

جی میں آوے سو کیجو پیارے
ایک ہونا نہ درپئے آزار

میر کے یہ شعر بھی ملاحظہ ہوں:

ہیں مسلمان ان بتوں سے ہمیں
عشق ہے لا الٰہ الا اللہ

شیخ جی آؤ مصلّیٰ گروِ جام کرو
جنسِ تقویٰ کے تئیں صرفِ مے جام کرو

پھر میر آج مسجد جامع کے تھے امام
داغِ شراب دھوتے تھے کل جانماز کا

طاعت کوئی کرے ہے جب ابر زور جھوے
گر ہو سکے تو زاہد اس وقت میں گنہ کر

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

اس تصور سے وابستہ ایک اور بہت اہم تصور ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر آپ، مثال کے طور پر، نماز پڑھیں یا حج کو جائیں تو ان عملوں کی 'بجائے خود' کچھ بھی اہمیت نہیں بات جب ہی ہے جب آپ کو خدا سے عشق ہو اور وہ عشق آپ کو اس بات پر مجبور کرتا ہو کہ آپ ان ذریعوں سے خدا کی عبادت کریں۔ اگر آپ کے نماز پڑھنے کا مطلب صرف یہ ہو کہ آپ نے بعض عربی الفاظ رٹ لیے اور دہرائے اور بدن کی کچھ مخصوص حرکتیں کیں یا اگر آپ نے یہ جتانے کے لیے نماز پڑھی کہ آپ اوروں کے مقابلے میں بہت بہتر مسلمان ہیں تو آپ کی نماز بے کار ہے بلکہ مضر ہے اور اس کا سچے اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

میر کے ان اشعار کے پیچھے یہی تصور ہے ؎

مکے گیا، مدینے گیا، کربلا گیا
جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آ گیا

شیخ کی تو نماز پر مت جا
بوجھ سر کا سا ڈال آتا ہے

یہاں میں پھر اس بات پر زور دوں گا کہ شاعر کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ واقعی نماز نہیں پڑھنی چاہیئے اور واقعی حج نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ وہی نماز صحیح معنوں میں نماز ہوتی ہے جس میں نمازی دل و جان سے خدا کی عبادت میں مصروف ہوتا ہے۔

اس خط میں میں نے صرف میر کے اشعار نقل کیے ہیں لیکن ادب کے شائقین جانتے ہیں کہ ہر اچھے شاعر کی کلیات میں آپ کو ایسے اشعار کثرت سے ملیں گے۔

اگر آپ مسلمان ہیں تو ظاہر ہے کہ آپ کو وہ سارے کام کرنے لازمی ہیں جو اسلام کی اصطلاح میں ہر مسلمان پر فرض ہیں۔ آپ کو پانچوں وقت نماز پڑھنی چاہیئے۔ رمضان کے پورے روزے رکھنے چاہئیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن آپ کی نماز اور آپ کے روزے کی قدر و قیمت اس پر منحصر ہے کہ آپ کس جذبے کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں اور کس جذبے کے ساتھ روزہ رکھتے ہیں۔ ایک نماز وہ ہے جس میں آپ سچے دل سے خدا کی عبادت میں مصروف ہیں اور ایک وہ جو آپ صرف دوسروں کو دکھانے کے لیے پڑھتے ہیں۔ میں مسلمان نہیں ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ ہر وہ مسلمان جو صرف کہنے کو مسلمان نہیں ہے بلکہ صحیح معنوں میں مسلمان ہے، میری اس بات سے اتفاق کرے گا کہ اس دوسری قسم کی نماز کی ذرا بھی وقعت نہیں بلکہ جو "مسلمان" اس جذبے کے ساتھ نماز پڑھتا ہے وہ ایک طرح سے خدا کی توہین کرتا ہے کیونکہ اس کی مذہب کی اس ظاہری پابندی میں ایک ایسا جذبہ چھپا ہوا ہے جو اسلام میں ہرگز جائز نہیں قرار پاتا۔ اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سچے نمازی اور جھوٹے نمازی کی پہچان کیا ہے؟ آپ کسی کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر کیسے جان سکتے ہیں کہ اس کے دل میں کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ نہیں جان سکتے نمازی کے دل کی بات یا تو خود نمازی جانے یا خدا جانے۔ آپ نہیں جان سکتے۔

میرے نزدیک سچے مسلمان کو پہچاننے کا ایک ہی معتبر طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ برابر دیکھتے رہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ کس قسم کا سلوک کرتا ہے۔ اسلام کی اصطلاح میں کئی قسم کے حقوق ہیں۔ ایک میں سے دو حقوق اللہ (خدا کے حقوق) اور حقوق العباد (بندوں کے حقوق) ہیں۔

خدا کے حقوق میں نماز، روزہ، حج وغیرہ شامل ہیں لیکن آپ صرف اس صورت میں وہ حقوق ادا کرتے ہیں، اگر آپ کے دل میں سوائے خدا کے عشق اور خدا کی عبادت کے اور کوئی جذبہ موجود نہیں۔ اور آپ کے دل کا حال یا آپ جانیں یا خدا جانے کوئی اور نہیں جان سکتا۔

دوسری طرف حقوق العباد کی صورت یہ ہے کہ معمولی سے تجربے کے بعد آپ فوراً دیکھ سکتے ہیں کہ کون آدمی یہ حقوق ادا کر رہا ہے اور کون نہیں کر رہا اور چونکہ حقوق العباد کا ادا کرنا ہر مسلمان پر اسی طرح فرض ہے جس طرح حقوق اللہ کا ادا کرنا۔ اس لیے سچے مسلمان کی پہچان اس میں ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کے حقوق، جن میں مسلمان، عیسائی، یہودی، ہندو، سکھ، ملحد سب ہی شامل ہیں ادا کرتا ہے یعنی دوسرے انسانوں کے ساتھ وہی سلوک کرتا ہے جس کی وہ ان سے توقع کرتا ہے۔ آپ صرف اسی قسم کے مسلمان کے بارے میں معتبر اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ خدا کے بھی حقوق ادا کرتا ہوگا۔ بلکہ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ خدا اپنے حقوق کی کوتاہی معاف فرما دے گا لیکن اپنے بندوں کے حقوق کی کوتاہی معاف نہیں فرمائے گا [جب تک وہ بندہ خود معاف نہ کرے جس کے حقوق مارے گئے ہوں]

اور یہی وجہ ہے کہ میرے نزدیک اردو شاعری میں جس اسلام کے تصور کا پر زور اظہار پایا جاتا ہے وہ بالکل صحیح ہے اور یہ تصور مجھے اس لیے حد پسند ہے کہ ہر اچھا انسان، چاہے اس کا مذہب اسلام ہو یا کوئی اور بلکہ چاہے ملحد ہی ہو، یہ تصور قبول کر سکتا ہے اور ہر اچھے انسان کو اسے قبول کرنا ہی چاہیے۔

آخر میں میں ابوالحرشان صاحب اور رہنگ اخبار دونوں کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے یہ بہت اہم مسائل اٹھائے اور مجھے ان کے بارے میں اپنے کچھ خیالات کا اظہار کرنے کا موقع دیا۔

مخلص : رالف رسل

[ابوالحرشان کا خط ۱۵ر دسمبر ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں چھپا - میرے تین خط ۲۴ر دسمبر ۱۹۸۰ء، ۱۰ر جنوری ۱۹۸۱ء اور ۱۲ر جنوری ۸۱ء کو چھپے]

تحریکِ آزادی ہند میں علمائے حق کا کردار

قاضی سید اعظم علی صوفی

غدر ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہندوستان کی تحریک آزادی کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔ آزادی کی یہ جنگ وفا شعاروں اور بے وفاؤں کے مابین تمیز اور امتیاز کے لیے ایک کسوٹی تھی جب کہ عبا وقبا کے مقدس لبادہ میں ملبوس بہت سی ایسی شخصیتیں بھی بے نقاب ہوگئیں، جنھوں نے وطن کا سودا کر لینے کو مصلحت وقت قرار دے کر سامراجی انعامات وخطابات کو ہی اپنے لیے موجب اعزاز وافتخار سمجھا۔ ظاہر و باطن ہر لحاظ سے جو علمائے ربانی تھے وہ اپنے بے داغ کردار، بے مثال عزم واستقلال اور عدیم النظیر جرأت و ہمت کے ذریعے اپنے انقلاب انگیز کارناموں کے ایسے لافانی نقوش تاریخ میں چھوڑ گئے ہیں کہ رہتی دنیا تک یادگار و ناقابلِ فراموش ہیں۔ اور آنے والی نسلوں کے لیے سنگ میل اور مشعل راہ بلکہ مینارۂ نور ثابت ہوں گے۔ آج ہر رزم و بزم میں انھیں کی داستان عظمت کی گونج سنائی دیتی ہے۔

حملہ آور انگریزوں کو بھی اس کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ علماء، فقہاء و محدثین ہی قوم کے وہ ستون ہیں جو ملت کے کشور دل کے سلطان ہیں اور جن کے اشارۂ ابرو پر ہر فرد دل وجان قربان کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے، اس لیے اپنا سامراجی اقتدار قایم کرتے وقت سب سے زیادہ ظلم وستم انگریزوں نے علمائے حق پر کیا اور انھیں ستانے اور مٹانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ سیاسی محاذ پر جنگِ آزادی کی روح پھونکنے والے علماء میں علامہ فضل امام صدر الصدور دہلی، مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، علامہ فضل رسول بدایونی، مفتی عنایت اللہ گوپاموی قاضی دہلی، مفتی لطف اللہ سہسوانی، مفتی لطف اللہ علی گڑھی اور قاضی فیض اللہ کشمیری وغیرہم نے کلیدی کردار ادا کیا جن کی تحریص و ترغیب اور قیادت میں ہی منشی رسول بخش کاکوروی، مولانا لیاقت علی الہ آبادی، مولانا امام بخش صہبائی، مولانا غلام امام شہید، منشی عبدالوہاب گوپاموی، مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا وہاج الدین مراد آباد اور سید تراب علی شاہ کاکوروی وغیرہم کی جانب سے انجام دی گئی زریں خدمات ہمارے لیے آج بھی سرمایۂ افتخار ہیں۔ ان کی ہی سرپرستی میں سید احمد اللہ شاہ، جنرل بخت خاں، جنرل عظیم اللہ خاں اور سید باقر ناظر وغیرہم نے ایسی جرأت کا بے باک مظاہرہ کیا کہ ان کے تصور ہی سے انگریزوں کے ماتھے پر پسینہ، جس کا خود فرنگیوں نے اعتراف کیا ہے۔

مجاہد اعظم مولانا سید کفایت علی مراد آبادی آزادیٔ وطن کی لڑائی میں ۳۰ر اپریل ۱۸۵۸ء کو گرفتار ہوئے اور مراد آباد جیل سے متصل انھیں برسرعام پھانسی دی گئی تو آپ کی زبان اس وقت یوں نغمہ سرا تھی ؎

ہم صفیرو! باغ میں ہے کوئی دم کا چہچہا
بلبلیں اُڑ جائیں گی سونا چمن رہ جائے گا
اطلس وکمخواب کی پوشاک پر نازاں نہ ہو
اس تنِ بے جان پر خاکی کفن رہ جائے گا

مفتی صدر الدین آزردہ انگریز گورنمنٹ کے تحت عہدۂ صدر الصدور پر فائز تھے۔ انھوں نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح کے صاحبزادے شاہ عبدالغنی کی خدمت میں کچھ روپیے بطور ہدیہ پیش کیے، جب کہ مفتی صاحب کو علم ہوا کہ شاہ صاحب نہایت عسرت اور تنگ دستی میں زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن شاہ صاحب نے وہ روپیے لینے سے انکار کر دیا۔ مفتی صاحب نے شاہ

سے اصرار کرتے ہوئے عرض کیا۔

"کیا حضور سمجھتے ہیں کہ یہ صدر الصدور ہے، شاید رشوت لیتا ہوگا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسا ہرگز نہیں۔"

اب ملا:

"مجھے کبھی یہ خیال نہیں ہوا کہ تم رشوت لیتے ہو۔ البتہ انکار کی وجہ یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو میں اچھا نہیں سمجھتا، جس کے تم ملازم ہو۔ اس لیے میں یہ نذرانہ لینے سے معذور ہوں۔"

یہی سبب تھا کہ ان نفوس قدسیہ پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کے لیے انگریز مکاروں نے علماء کے پُرفریب پیرہن و لبادہ میں موجود چند بکی ہوئی شخصیتوں کو اپنا آلۂ کار بنایا جنہوں نے علماء حق کے خون اور ہڈیوں کو جوڑ کر اپنی رفعت کے زینے بنائے علماء ربانی نے جہاد کیا تو وہ یا تو شہید ہو گئے یا قید مشقت میں اپنی زندگی گزار گئے لیکن خریدے گئے چند بے وفایان وطن انگریزوں کی آغوش میں بیٹھ کر اپنی نمائشی تاریخ مرتب کر رہے تھے۔ واقعی وہ آزمائشی گھڑی اور کتنی پُرآشوب سالمیت تھی جب کہ ہندوستانیوں کو سبوتاج کرنے کے لیے خود ہندوستانیوں کے ہاتھوں کا خنجر خریدا جا رہا تھا۔ اپنے گھر میں آگ لگانے کے لیے گھر کے افراد ہی سے چنگاری سلگانے کا کام لیا جا رہا تھا۔ شہر دہلی سازشوں کا مرکز بنا ہوا تھا، مگر انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہونے والے سب سے پہلے عظیم مجاہد اور علمائے حق کے میر کارواں یعنی "تحقیق الفتوی" کے مصنف حضرت علامہ فضل حق خیرآبادیؒ کو رب العزت کروٹ کروٹ فردوس نصیب کرے کہ جامع مسجد دہلی سے جن کی ولولہ انگیز تقاریر اور جہاد آزادی ہند کے لیے ۱۸۵۷ء میں ان کا تاریخی فتوی طبقۂ علماء و اہل وطن کے لیے جنگ آزادی کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔ علامہؒ کی شعلہ بیانی زبان اور آتش نوائے قلم نے ہم وطنوں میں وہ حرارت و تپش پیدا کی کہ برصغیر ہندوستان کا چپہ چپہ اور وطن کا ذرہ ذرہ

"عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ لوگوں نے اپنے ایمان کی عمارت کو فلسفیانہ ستونوں پر بلند کیا ہے۔ حالانکہ اس کی بنیاد دماغ پر نہیں، دل کے اوپر قایم ہوتی ہے۔ وجود خدا کی گواہی دل دیتا ہے نہ کہ عقل، ایمان اسی راستے سے دستیاب ہوتا ہے۔ دل کے پاس ایسی ایسی اطمینان بخش دلیلیں ہیں جہاں تک عقل نہیں پہنچ سکتی۔"

ولیم جیمس

گورے فرنگیوں کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبے سے صف آرا ہو گیا اور پھر

ہندوستان چھوڑ دو QUIT INDIA

کا ایسا فلک شگاف نعرہ بلند ہوا کہ جس سے زمین کا سینہ دہل گیا اور فضائے بسیط میں ہر طرف جس کی چنگاریاں اور انگارے دہک اُٹھے۔ علامہ فضل حق خیرآبادی نے عزم و ایمان کی ہر مصلحت سے بے نیاز ہو کر حق کا جو فریضہ انجام دیا ہے، عبد الشاہد خاں شیروانی اپنی کتاب "باغی ہندوستان" میں اس کا اس طرح تذکرہ کرتے ہیں:

"علامہ فضل حق سے جنرل بخت خاں ملنے پہنچے۔ مشورے کے بعد علامہ نے آخری تیر ترکش سے نکالا۔ بعد نماز جمعہ جامع مسجد دہلی میں علما کے سامنے تقریر کی۔ استفتا پیش کیا۔ مفتی صدر الدین صاحب آزردہ صدر الصدور دہلی، مولوی عبد القادر قاضی فیض اللہ دہلوی، مولوی فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی اور سید مبارک شاہ رامپوری نے دستخط کر دیے۔ اس فتوی کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی۔ دہلی میں ۹۰ ہزار سپاہ جمع ہو گئی تھی۔"

ترجمہ الثورۃ کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

"علامہ خیرآبادی کا رجب ۱۲۷۵ھ میں باطل قوتوں کے سامنے یہ اعلان حق ہمیشہ آبِ زر سے لکھا جاتا رہے گا۔"

علامہ کی حق گوئی اور بے باکی کا اعلیٰ ترین مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ چند انگریز نواز ضمیر فروشوں کی سازش اور مہربانیوں سے علامہ اپنی شان علم و فضل کے ساتھ عدالت میں گرفتار کر کے لائے گئے تو جس مخبر نے عدالت

ں مولانا پر الزامات پیش کیے تھے آپ کی علمی ہیبت سے لرز اُٹھا اور بات نجانے
یے کہنے لگا۔ یہ وہ شخص نہیں ہے جس نے اس فتویٰ جہاد پر دستخط کیے تھے۔ میری
اخت غلط ثابت ہوئی" پھر کیا ایمان و غیرت ملی کی جلتی بھڑکتی یہ تصویر دیکھیے اور
یہ جہاد میں سرشار اس مجاہد کی گھن گرج سنیے۔ آواز حق کی سربلندی کا انداز
حظہ کیجیے اور رضائے حق کے لیے اپنی گردن پیش کر دینے کا یہ بے باکانہ تیور
یب نظر کیجیے۔ اپنی تعریف میں علامہ نے جب یہ سب سنا تو انگریز کچہری کو
کارا کہ؛

"مخبر میری صورت دیکھ کر مرعوب ہوگیا اور میری تعریف اور
خوشامد کے الفاظ سے غلط بیانی کر رہا ہے۔ اس نے جو پہلے بیان دیا تھا
وہی صحیح ہے۔ سنو! جہاد کا فتویٰ میں نے دیا ہے اور میں
اب بھی اپنے فتویٰ پر قایم ہوں۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس
امر سے باز نہیں رکھ سکتی۔ یہ فتویٰ میرا ہے۔ یہ بیان میرا ہے
یہ دستخط میرے ہیں۔ اور میں وہی فضل حق ہوں کوئی غیر
نہیں۔ اس احقاق کی پاداش میں مجھے کسی دنیاوی مصیبت
کی پرواہ نہیں۔"

یہ ایک مجاہد حق کا معاملہ تھا کسی دنیا فروش کی سوداگری نہیں۔ زندگی
ر زندگی کی لذتوں پر عزت و حق نیوشی کی موت کو ترجیح دینا انھیں جیسے دلاوروں
کا شیوہ ہے جنھوں نے اپنے کردار عمل سے انگریز کو لرزہ براندام کر دیا —

شاعر مشرق علامہ اقبالؒ نے حق کہا ہے ؎

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

ہمالہ کی سربکف چوٹیاں اور لال قلعہ کا لہراتا ہوا پرچم آج بھی اس کی شہادت
دے رہا ہے کہ افق آزادی کی پہلی کرن ان ہی مجاہدین کی فداکاریوں کا
ثمرہ ہے۔ ابنائے وطن میں سرفروشی کی تمنا پیدا کرنے کا سہرا ان ہی علمائے
کرام کے سر ہے جس کے سبب قصر فرنگیت میں ایسا شگاف پڑا کہ پارلیمنٹ
ہاؤس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور پھر چند سالوں بعد عالم نے
دیکھا کہ برٹش گورنمنٹ کا آفتاب اقبال ہندوستان سے ہمیشہ کے
لیے غروب ہوگیا۔ آزادیٔ ہند کی تحریک اور مسلسل جد و جہد میں
ان علمائے حق کے کردار اور ان کی جانثارانہ خدمات کے تاریخی
حقائق کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ ورنہ مظلوموں کا لہو خود پکار اُٹھے
گا اور خون شہیداں کی سرخی رنگ لا کر رہے گی۔

مرزا مظہر جانجاناں نے خوب کہا ہے ؎

بہ لوح تربت من یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

<u>بقیہ پرندوں میں گانے کے مقاصد</u>

کا فاصلہ رہتا ہے۔ اتنے چھوٹے سے رقبے کے لیے شور مچانا بالکل بیکار
ہوگا۔ کیونکہ مخالف چاروں طرف کافی تعداد میں ہوتے ہیں۔ اگر کوئی
اس مقصد کے لیے شور مچائے گا بھی تو لازمی طور پر لڑائی کی نوبت آئے
گی اور ایسے حالات میں لڑائی مول لینا بالکل بیکار ہوگا۔ کیوں کہ اس
سے ایسی جگہوں پر کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے خاموشی ہی
بہتر ہوگی اور غالباً یہی وجہ ہے کہ بحری چڑیاں گانے کے معاملے میں
بالکل کوری ہوتی ہیں۔

ترکی ــــ یوروپ و ایشیا کی مشترکہ تہذیب کی سرزمین

عابد علی خان*

ایک زمانے سے ترکی دیکھنے کی خواہش تھی۔ جب مجھے یہ اطلاع ملی کہ وزیراعظم جن چار ملکوں کا دورہ کر رہے ہیں' اس میں ترکی بھی شامل ہے اور مجھے بھی ان کی پارٹی کا رکن بنایا گیا ہے۔ اتاترک کے ترکی کو دیکھنے کی دیرینہ تمنا پوری ہوئی۔

جامعہ عثمانیہ میں طالب علمی کے زمانہ ہی سے میں نے سیاسی مضامین کا ترجمہ کرنا شروع کیا تھا۔ ترکی میں کمال اتاترک کی قیادت نے اس ملک کو جسے یورپ کا مرد بیمار کہا جاتا تھا، نئی جہت دی تھی۔ یہاں خلافت کے بعد اب ایک نیا مستحکم سیاسی نظام جنم لے چکا تھا۔ خلافت تحریک اور کمال اتاترک کے انقلاب سے ہندوستان کو گہری دلچسپی تھی۔ دوسری جنگ کے زمانے میں خالدہ ادیب خانم کا دورۂ ہند و حیدرآباد ہمارے لیے ویسے بھی ایک پیام تھا جیسے جواہر لال نہرو کی نظر میں سوویٹ یونین کا انقلاب دعوت فکر تھا۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں "خلافت تحریک" کو بھی نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس تحریک نے ہندو مسلم اتحاد کے تاریخی مناظر دیکھے ہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ ہم حیدرآبادیوں کا ترکی سے خاص لگاؤ، اس وجہ سے بھی تھا کہ سلطان عبد المجید کی صاحبزادی اور بھتیجی شہزادی درشہوار اور شہزادی نیلوفر حیدرآباد کی بہویں بن کر آئی تھیں۔ ترکی کی تاریخ اور ہندوستان سے رشتوں نے ترکی کے حال کے مطالعہ کے ذوق کو تیز کردیا

ترکی دو براعظموں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک حصہ براعظم یورپ میں ہے اور دوسرا حصہ براعظم ایشیا میں واقع ہے۔ ان دونوں حصوں کے درمیان آبنائے باسفورس ہے جو آگے چل کر بحر اسود سے جا ملتی ہے۔ انقرہ اور استنبول یوربی براعظم میں ہیں۔ انقرہ حکومتی صدر مقام ہے اور استنبول تجارتی مرکز جیسے کہ واشنگٹن ڈی سی اور نیویارک ہیں۔

وزیراعظم راجیو گاندھی کے ترکی کے دورہ کی بڑی اہمیت ہے اور اس کے دوررس نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ دراصل یہ ملاقات باز دید کہی جا سکتی ہے۔ ۱۹۸۶ء میں وزیراعظم ترکی جناب ترگت اوزال نے ہندوستان کا دورہ کیا تھا۔ دو عظیم ملکوں کا یہ پہلا راست ربط کہا جا سکتا ہے۔ ۱۹۶۵ء میں پنڈت نہرو نے ترکی کا دورہ کیا تھا۔ اس زمانے میں ترکی پاکستان کا حامی تھا۔ پنڈت نہرو کے دور میں ترکی میں سیاسی اقتدار کے لیے مختلف سمتوں سے کشمکش جاری تھی۔ زمانہ حال میں ترکی میں بڑی حد تک سیاسی سکون ہے۔ اگرچہ کہ وزیراعظم اوزال پر قاتلانہ حملہ کی کوشش کی گئی تھی وہ اس حملہ سے محفوظ رہے لیکن ہاتھ پر گولی کا زخم ابھی تک مکمل طور پر مندمل نہیں ہوا تھا۔ اس حالت میں وزیراعظم کے استقبال کے لیے ترگت اوزال اور ان کی بیگم ہوائی اڈے پر موجود تھے۔ یہ رفاقت کچھ اس قدر گہری نظر آئی کہ جناب اوزال ہمارے وزیراعظم کے ہر پروگرام میں بہ نفس نفیس شریک رہے۔ راجیو جب انقرہ سے استنبول کو روانہ ہو رہے تھے تو وزیراعظم ترکی اپنے شخصی ہوائی جہاز میں ان کے ہمراہ رہے۔ ترکی کے حالیہ دورہ کے باعث ہندوستان اور ترکی میں جو دوری تھی وہ ختم ہوگئی۔ ترکی ہمیشہ سے پاکستان کی تائید میں رہا ہے اور

---

* ایڈیٹر روزنامہ سیاست حیدرآباد دکن۔

تقریباً ہر پالیسی مسئلے میں پاکستان کی تائید کی ہے لیکن وزیر اعظم ترکی کے دورۂ ہندوستان کے بعد ہی سے کئی غلط فہمیوں کے ازالہ کے اثرات نظر آنے لگے تھے۔ ہند ترکی نئے دوستانہ روابط کا سب سے ٹھوس ثبوت ترکی کے اس فیصلے میں ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت ترکی نے پاکستان کو نیوکلیر انورٹرز کی ترسیل پر پابندی عائد کر دی یہ فیصلہ وزیر اعظم راجیو گاندھی کے دورہ ترکی سے دو ہفتے قبل کیا گیا اس فیصلے سے اس سازگار ماحول کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس فیصلہ پر پاکستان میں اب بڑی تشویش کا اظہار ہو رہا ہے۔ پاکستان کی خواہش پر گاندھی فلم کی نمائش بھی ترکی میں روک دی گئی تھی' اب یہ پابندی بھی اٹھالی گئی ہے۔ یہ فیصلہ بھی پاکستان کی ناراضگی کا باعث بنا ہے

ترکی کے دورے میں دونوں ملکوں کے مابین کئی معاہدات اور دستاویزات پر دستخط ہوئے ہیں جن سے دونوں ملکوں کے مابین تجارت دفاعی وصنعتی اشتراک اور ٹریڈ فیر انتھارٹی کے تعاون سے صنعتی میلوں کے انعقاد سے متعلق معاہدے کے علاوہ انڈین ریلوے کنسٹرکشن کمپنی نے ترکی ریلوے نظام کو بہتر بنانے کا بہت بڑا کنٹرکٹ حاصل کیا ہے۔

وزیر اعظم کے دورۂ ترکی میں ان امور کی کامیاب تکمیل دونوں ممالک کی سوجھ بوجھ اور نکتۂ نظر میں ہم آہنگی اور یگانگت یقیناً جمہوریت اور سیکولرزم کی کامیابی متصور ہوگی۔

ترکی میں سرکاری پروگرام کے علاوہ بعض دلچسپ غیر رسمی پروگرام بھی مرتب کیے گئے تھے۔ اس پروگرام سے ترکی کی شاندار تاریخی جھلک کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ مصطفیٰ کمال کی سرکردگی میں ترکی میں جو نیا انقلاب آیا' وہ آج کے ترکی کی بنیاد ہے۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں اتاترک نے انقرہ کو ترکی کا صدر مقام بنایا ہے۔ اس سے قبل انقرہ ۳۵ ہزار آبادی کا ایک چھوٹا پسماندہ شہر تھا۔ یہاں کے بکرے بہت ہی مشہور رہیں۔ ترکی میں انھیں "انگورا" کہا جاتا ہے ان ہی کی وجہ سے اس شہر کا نام انقرہ مشہور ہوا۔ زمانہ قدیم میں بھی اس شہر کی اس کے محل وقوع کی وجہ سے بڑی اہمیت رہی ہے۔ انقرہ کے شمال جنوب اور مشرق ومغرب کے تجارتی راستوں پر واقع ہے جس کی وجہ سے یہاں پر سلجوقی' تیموری اور عثمانی حکومتیں برسر اقتدار آئیں اور ختم ہوئیں۔ آج انقرہ ایک وسیع پھیلا ہوا شہر ہے۔ شہر کی تعمیر بہت ہی منظم طریقہ پر کی گئی ہے۔ آبادی ۳۳ لاکھ ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ترکی چونکہ یورپ میں واقع ہوا ہے اس لیے ان کا رہن سہن لباس اور طرز زندگی پر مغرب کے اثرات ہیں۔ ترکی بڑی قدیم زبان ہے۔ اس میں الفاظ کا بڑا ذخیرہ ہے' اس کی جڑیں ازبکی اور کرغزی زبانوں سے ملتی ہیں۔ زمانہ قدیم میں ترکی زبان کی بڑی قدر ومنزلت تھی۔ اس کو مشرق کی الالوی زبان" کہا جاتا تھا۔ ۱۹۲۸ء تک عربی رسم الخط رائج تھا لیکن ترکی زبان کی صوتی خوش الحانی عربی میں ٹھیک طور پر ادا نہ ہونے کے باعث مصطفیٰ کمال نے عربی رسم الخط کو بدل دیا۔ اب ترکی زبان عام طور پر رومن رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ جدید ترکی زبان میں ابھی تک عربی اور فارسی کے مشترکہ الفاظ تھوڑی سی صوتی تبدیلی کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ یہاں کا سکہ "لیرا" کہلاتا ہے جو ہمارے ایک پیسے کے برابر ہے۔ ایک ہندوستانی روپیے کے تقریباً ۹۰ لیرا ہوتے ہیں۔ یہاں کے لوگ محنتی ہیں' دن بھر خوب کام کرتے ہیں اور شام میں سیر وتفریح کے لیے نکل جاتے ہیں۔ ان میں قومیت اور وطن پرستی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔

استنبول کئی صدیوں سے متمدن ممالک کا مرکز رہا ہے' ترکی کا یہ سب سے اہم شہر ہے۔ آبادی تقریباً ۶۵ لاکھ ہے۔ استنبول دنیا کا واحد شہر ہے جو دو براعظموں میں بٹا ہوا ہے۔ ان دونوں حصوں کو ملانے کے لیے ایک طویل معلق پل بنایا گیا ہے جو دنیا کا ایک عجوبہ کہا جاتا ہے۔ بڑے بڑے جہازوں کے گزرنے کے لیے پل کے ایک حصہ کو اوپر اٹھا دیا جاتا ہے تاکہ جہاز آسانی سے گزر سکیں۔ یونانی حکمرانوں کے زمانے میں اس کو بازنطینی کہا جاتا تھا۔ رومن دور میں قسطنطنیہ کہا گیا۔ قسطنطنیہ سلطنت روما کے مشرقی علاقے کا صدر مقام تھا۔ عثمانی دور میں بھی استنبول کی اہمیت برقرار رہی۔ مصطفیٰ کمال کے انقلاب کے بعد ترکی کا صدر مقام انقرہ منتقل ہوا' لیکن اس کے باوجود اس شہر کی سیاسی اور مدنی اہمیت کسی بھی طرح کم نہیں ہوئی۔

ان دونوں شہروں میں ہمیں انتہائی اہم تاریخی آثار اور باقیات دیکھنے کا موقع ملا۔ مصطفیٰ کمال کے مقبرے پر حاضری دینے کی خواہش پوری ہوئی۔ اتاترک کا مقبرہ گرین پارک نامی پہاڑ کے اوپر ہے' جو بہت خوبصورت سرسبز اور پرسکون جگہ ہے۔ پہاڑی کی چوٹی پر ایک وسیع ایوان تعمیر کیا گیا ہے اور ایوان کے آخری حصے پر ایک چبوترہ ہے جس کے وسط میں ایک ہی پتھر کا تراشا ہوا تابوت ہے۔ نیچے اتاترک مدفون ہیں۔ ایوان سے

نیچے اتر نے پر مشرقی سمت وسیع دالانوں میں اتاترک کے ذاتی استعمال کا سامان ان کی موٹریں اور دیگر روزمرہ استعمال کی چیزیں نمائش کے طور پر رکھی ہوئی ہیں۔ باہر کے سیلح اتاترک کے مقبرے پر حاضری دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس سارے علاقے کو ترکی میں "انت کبیر" کہا جاتا ہے۔ انقرہ میں آکر انت کبیر کو نہ دیکھنا ایسا ہی ہے جیسے حیدرآباد آکر کوئی چارمینار نہ دیکھے

استنبول میں عثمانی دور کے پہلے بادشاہ سلطان محمد کا تعمیر کردہ محل بہت خوبصورت ہے۔ محل ۱۴۵۳ء میں تعمیر ہوا تھا۔ سلطان محمود دوم کے بعد دوسرے حکمرانوں نے ابنائے باسفورس کے دوسرے کنارے پر یوروپی فن تعمیر کے قصر تعمیر کروائے۔ استنبول کے شاہی قصر کو ترکی میں "ٹاپ کاپی سرائے" کہا جاتا ہے۔ اس شاہی محل میں اس زمانے کے برتن لباس، ہتھیار، زیورات اور دیگر تاریخی اشیا نمائش کے لیے بڑے سلیقے سے رکھے گئے ہیں۔ محل کے وسط میں سلطان عبدالمجید کا شاہی تخت مسند گاؤ تکیے سب جیسے کے ویسے رکھے ہوئے ہیں۔ ان پر انمول جواہرات لگے ہوئے ہیں۔ روسائے مملکت سے لے کر شاگرد پیشوں اور چوبداروں کے بیٹھنے اور کھڑے رہنے کی جگہ بھی کچھ اس انداز سے بنائی گئی ہے کہ اگر ان پر افراد کو کھڑا کر دیا جائے تو حقیقی دربار کا منظر نظر آئے۔ محل کے اندرونی اور بیرونی حصوں پر قدیم فارسی زبان میں مختلف انداز میں انتہائی نفیس خط میں شہنشاہ کی مدح میں اشعار کندہ ہیں۔

استنبول کے ایک اور شاہی قصر کا ذکر ضروری ہے۔ یہ ڈولما باغ ہے۔ اسی قصر کے ایک کمرے میں اتاترک کا انتقال ہوا تھا۔ یہ کمرہ جوں کا توں اسی حالت میں محفوظ رکھا گیا ہے جس حالت میں اتاترک کی زندگی میں تھا۔ یہ قصر یورپی انداز میں مرمر سے بنایا گیا ہے اور جو سلطان عبدالمجید کی خواہش پر تعمیر کیا گیا تھا۔

استنبول میں زمانہ قدیم کے اعلیٰ فن تعمیر کے دو تاریخی نمونے قابل دید ہیں۔ ایک حاجیہ صوفیہ کا گرجا ہے اور دوسرا آسمانی یا اودے رنگ کی مسجد حاجیہ صوفیہ کا گرجا چھٹی صدی عیسوی میں رومن شہنشاہ جسٹی نین نے سلطنت روما کی شان اور دبدبے کے اظہار کے لیے تعمیر کروایا تھا۔ یہ دنیا کا سب سے عظیم ترین گرجا کہا جاتا ہے۔ سینٹ پیٹر کا گرجا جہاں سے اسقف اعظم دنیا بھر کے عیسائیوں سے خطاب کرتے ہیں بعد میں تعمیر ہوا تھا۔ لیکن جب یہ شہر عثمانی افواج کے ہاتھ آیا تو سلطان محمود گھوڑے پر سوار ہو کر گرجا میں داخل ہوئے اور اس کی شکل بدل کر مسجد میں تبدیل کر دی۔ تقریباً ۵۰۰ برس تک یہ دنیا کی سب سے بڑی مسجد بھی گئی تھی لیکن اتاترک کے برسر اقتدار آنے کے بعد ۱۹۳۵ء میں اس کو ایک میوزیم قرار دیا گیا اور اس کے دروازے مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کے لئے کھول دیے گئے۔ مسجد کے حصے میں سونے سے انتہائی نفیس اور جلی خط میں قرآنی آیتیں کندہ ہیں۔ امام کی نماز اور خطبے کے مقام کو سونے سے بھر دیا گیا ہے جس جگہ سے اذان دی جاتی تھی، وہ بھی سونے سے بنائی گئی ہے۔ عیسائی حصے میں بھی حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق مجسمے، صلیب اور ان کی مذہبی اشیاء جو سونے اور جواہرات سے مزین ہیں اسی حالت میں محفوظ ہیں جس کو دیکھنے کے لیے ہزاروں لوگ روزانہ آتے ہیں۔

حاجیہ صوفیہ کے گرد و نواح میں ایک اور عظیم الشان مسجد ہے جسے عرف عام میں بلو ماسک یا اودی مسجد کہا جاتا ہے۔ یہ مسجد حاجیہ صوفیہ کے پرشکوہ گرجا کے مقابلے کے طور پر تعمیر کرائی گئی تھی۔ اس مسجد کے فن تعمیر کی نزاکتوں اور خطاطی کے انمول نمونوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ اس زمانے کے خطاط اور تعمیرات کے ماہرین کی قابلیت کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ یہاں بھی سونے کا وافر مقدار میں استعمال ہوا ہے۔ مسجد میں قیمتی قالینوں کا فرش ہے۔ یہاں پر تسبیح، عطر اور مذہبی لٹریچر کی چھوٹی چھوٹی دکانیں لگی ہوئی ہیں۔ سیاحوں کا ہمیشہ ہجوم رہتا ہے۔

"ایک عرب کسی غیر عرب (عجمی) سے بہتر نہیں ہے اور نہ ہی کسی دوسرے عرب سے۔ نہ ہی کوئی سفید فام کسی سیاہ فام سے اور نہ ہی کوئی سیاہ فام کسی سفید فام سے بہتر ہے۔ اگر کوئی کسی سے بہتر کہا جا سکتا ہے تو وہ ذاتی خوبیوں کی بنا پر جن کا اظہار وہ اپنے معاشرے کے افراد سے روزمرہ کے معاملات طے کرنے میں کرتا ہے۔"

خطبہ حجۃ الوداع۔

ابتدائی پروگرام کے لحاظ سے وزیراعظم کا دورہ ۱۹ جولائی کو م ہم جانا چاہیے تھا لیکن وزیراعظم ترکی کی خواہش پر کہ تاریخی شہر ازمیر بھی ہم یکھ لیں، ہمارے پروگرام میں ایک دن کی توسیع کی گئی۔

۱۹ جولائی کی صبح ہوائی جہاز سے ہم استنبول سے ازمیر گئے اور ہوائی ہ سے بس میں ۵۰ کیلومیٹر جنوب میں واقع شہر ایفی سس کے لیے روانہ ے۔ اس شہر کو مذہبی شہر کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ یہاں پر ل مسیح مذہبی آثار موجود ہیں۔ روم کے بادشاہوں نے اسے اپنا صوبائی در مقام بنا کر یہاں ڈیئنا دیوی کا ایک بہت بڑا مندر تعمیر کیا۔ اس ندر کو دنیا کے سات عجائبات میں شمار کیا جاتا ہے۔ عیسائی آثار میں یہاں حضرت مریمؑ سے موسومہ گرجا ہے اور ایک پہاڑی پر ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جس کو "ہاؤس آف میری" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ تاریخی شواہد کے جب یہ بات مسلمہ سمجھی جاتی ہے کہ حضرت مریمؑ نے اس کمرہ میں قیام فرمایا تھا

یہاں سے ہم شہر ایفی سس کے کھنڈرات دیکھنے گئے۔ ابھی ان کھنڈرات کی کھدائی جاری ہے، جہاں سے رومن دور کے نایاب آثار برآمد ہو رہے ہیں اب تک جو آثار برآمد ہوئے ہیں ان میں خوب صورت شاہراہیں، عظیم تھیٹر بھی ہیں۔ دور حاضر کے اسٹیڈیم کی طرح ہے اور جس میں اس زمانے میں ڈھائی ہزار افراد بیٹھ کر تماشا دیکھ سکتے تھے۔ ایفی سس کی کھدائی میں جو کھنڈرات برآمد ہوئے ہیں اس کی وجہ سے شہر کا مکمل نقشہ بنا لیا گیا ہے۔ شام میں ہم ازمیر سے استنبول واپس ہوئے۔ رات میں چھوٹے جہازوں میں ابنائے باسفورس کی سیر کی۔ رات کا کھانا بھی جہاز پر ہوا۔ وزیراعظم کا علیحدہ جہاز تھا جس میں وزیراعظم ترکی بھی شریک تفریح رہے۔ یہ محض تفریح نہیں تھی بلکہ تفریحی ماحول میں اہم مسائل پر آپسی تبادلہ خیال کا بہترین موقع تھا۔

"میرا عقیدہ یہ ہے کہ سب انسان نیک ہیں، سوائے کاہل کے، کاہلی جرم ہے۔ گناہ ہے۔ عطیہ الٰہی سے انحراف اور کفران نعمت ہے۔ یاد رکھیے کہ جو اقوام یا افراد کام کرنے سے ہچکچاتے ہیں اور محنت سے جی چراتے ہیں انھیں کبھی آزادی نصیب نہ ہوگی۔ کام سے انسانیت آتی ہے سیرت اور اخلاق بنتے ہیں۔ ظاہر اور باطن کی اصلاح ہوتی ہے۔ ہم جان دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں مگر کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اس میں پتا مارنا پڑتا ہے۔ عزیز اشغال اور محبوب عادتوں کو ترک کرنا پڑتا ہے۔"

بابائے اردو مولوی عبدالحق

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ج ۷، ش ۹ (ستمبر ۸۸ء)

پرندوں میں گانے کے مقاصد

عبدالبصیر خاں*

پرندوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے رنگ اور ان کی آواز میں ایک فطری تعلق ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ خوبصورت چڑیاں ہی اچھی گانے والی یا اچھی بولنے والی ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ یہ دونوں خوبیاں نر سے تعلق رکھتی ہیں۔ پرندوں کے بچوں میں بھی یہ صفات نہیں پائی جاتیں۔ ان کی موجودگی کا اظہار سن بلوغ کی آمد کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان دونوں صفات کی پوری نمائش صرف سال کے کسی ایک مقررہ وقت پر ہوتی ہے اور وہ وقت اختلاط جنسی کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس زمانے کے ختم ہونے کے ساتھ ساتھ چڑیوں کی خوبصورتی میں کمی ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کا گانا۔ ان کا خوش الحانی سے بولنا یا بعض حالتوں میں بیٹھنا بھی گھٹ جاتا ہے۔

ڈارون کے نظریے کے مطابق نر چڑیوں کے گانے بھی اُن کی آرائش میں اضافہ کرتے ہیں اور ان کو مادہ کی نظروں کے سامنے بہتر صورت میں اپنے حسن کے اظہار کا موقع دیتے ہیں لیکن اگر غور سے چڑیوں کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ چڑیوں کے گانے اور ان کی بولیاں بجائے اس کے کہ اُن کے لیے زیبائش کا باعث ہوں ایک دھمکی دینے کا آلہ ہیں جس کے ذریعے سے دوسرے نروں کو مرعوب کیا جاتا ہے۔

چڑیاں عموماً زمین یا کسی نیچی سطح پر اپنے گانے نہیں الاپتیں۔ بلکہ گانے کے لیے کسی اونچی جگہ کو پسند کرتی ہیں۔ یہ چڑیوں کی ایک خاص عادت ہوتی ہے۔ اب اگر مانا جائے کہ نر چڑیوں کے گانے مادہ کی پسندیدگی کے لیے ہیں تو پھر نر ایسی جگہوں پر کیوں گاتے ہیں جہاں مادہ کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا۔ مادہ اس وقت یا تو زمین پر ہوتی ہے یا کسی دوسری جگہ نر سے علیحدہ ہوتی ہے۔ اگر نر مادہ کے مسحور کرنے کے لیے اپنی بولیاں بولتا ہے تو پھر وہ مادہ کے قریب آکر اسے اپنے سُر کیوں نہیں سناتا تاکہ وہ اس کا گانا سننے کے ساتھ ساتھ اس کی حرکات اور اس کی خوبصورتی کو بھی دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو۔ برخلاف اس کے وہ مادہ سے جتنا دور ہو سکتا ہے چلا جاتا ہے اور اگر وہ ہوا میں گانے والوں میں سے ہے تو وہ اتنا اونچا اُڑتا ہے کہ اکثر مادہ کی نگاہوں سے بھی اوجھل ہو جاتا ہے۔ یہاں پر ہمیں نظریۂ زیبائش سے کوئی مدد نہیں ملتی۔ لیکن اگر ہم تصور کریں کہ نر کا گانا دھمکی دینے یا دوسروں کو ڈرانے کا آلہ ہے تو ہمیں اس کا بھی جواب مل جاتا ہے کہ نر بلندی پر جا کر کیوں گاتے ہیں۔ نر اپنے گھونسلے کے لیے ایک رقبہ کا تعین کر لیتے ہیں۔ وہ یہ نہیں چاہتے کہ ان کے قریب ہی کوئی دوسرا ان کا ہم جنس گھونسلا بنائے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس حلقے میں انھیں کی حکومت اور انھیں کا اثر رہے۔ ان کی آواز ایک قسم کی آگاہی ہے دوسرے نروں کے لیے جو آس پاس رہتے ہیں تاکہ ان کو اطلاع ہو جائے کہ اس جگہ کوئی دوسرا موجود ہے اور وہاں جانا ان کے لیے لڑائی پیدا کرے گا کیوں کہ وہ دوسروں کا اپنے حلقے میں آنا خوشی سے کبھی گوارا نہیں کر سکتے۔ ان کے بس میں جہاں تک ہوگا وہ دوسرے نروں سے لڑیں گے۔ یہاں تک کہ یا تو وہ خود ہار جائیں یا دوسرے کو مکمل شکست ہو جائے۔ یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ اس حادثے کو ٹالنے کے لیے پہلے ہی سے دوسروں کو مطلع کر دیتے ہیں کہ ان کے قریب آنا خطرے سے خالی نہیں۔ اونچی جگہ سے گانے کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ بلندی سے آواز

* سابق صدر شعبہ علم الحیوانیات۔ اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

دور تک پہنچتی ہے اور نیچی جگہوں سے جھاڑیوں اور درختوں میں رُک جاتی ہے۔

چڑیوں کے لیے ان کا گانا، ان کا بولیاں بولنا یا اُن کا چہچہانا سب ایک مقصد رکھتے ہیں۔ دراصل مختلف چڑیوں کی آوازیں مختلف ہوتی ہیں۔ جن کی بولیاں باریک اور سریلی ہوتی ہیں اور ہم لوگوں کو پسند ہوتی ہیں ان کو ہم گانے سے تعبیر کرتے ہیں اور جن کی آواز کرخت اور تیز ہوتی ہے، اسے ہم چیخ کے نام سے پکارتے ہیں۔ حالانکہ چڑیا کے لیے دونوں کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے۔

چڑیوں کے گانے کے متعلق ایک خاص بات ہے کہ چڑیا ہمیشہ یہ کوشش کرتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ تیز آواز نکالے۔ اگر گانا یا چڑیوں کی بولیاں ان کی ماداؤں کی دلچسپی کے لیے ہوتیں تو آوازوں کو پوری تیزی سے نکالنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس سے اور بھی ثبوت ملتا ہے کہ نر کی آواز کی تیزی اس وجہ سے ہوتی ہے تاکہ اس کی آواز دور تک سنائی دے۔ پھر یہ کہ دوسروں کو مرعوب کرنے کے لیے انسان کا بھی قاعدہ ہے کہ جتنی زور سے ممکن ہوتا ہے چیختا ہے۔ اسی طرح چڑیوں میں بھی پوری قوت سے بولیاں بولنا یا گانا اسی مقصد کی تکمیل کے لیے ہو سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ چڑیوں کا گانا ایک رقیبانہ حرکت ہے۔ ایک چڑیا دوسرے کی آواز سن کر اس کو خاموش کرنے کی کوشش کرتی ہے چڑیوں کے شائقین اکثر اپنی چڑیوں کا مقابلہ اس طرح کرتے ہیں کہ کس کی چڑیا زیادہ دیر تک بولتی ہے۔ چنانچہ بٹیر پالنے والے اچھی طرح واقف ہوں گے کہ جو بٹیر جتنا زیادہ بولتا ہے، اتنا ہی اس کی قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور بولنے والے صرف نر ہی ہوتے ہیں۔ بعض چڑیوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ جب ایک نر بولتا ہے تو دوسرا خاموش ہو جاتا ہے اور جیسے ہی وہ اپنی بولی بند کرتا ہے دوسرا فوراً بولنا شروع کر دیتا ہے۔ بعض چڑیوں میں تو یہاں تک ہوتا ہے کہ دو نر ساتھ ساتھ بولتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ جتنا زور سے ہو سکے بولیں تاکہ دوسرا اپنی ہار مان کر خاموش ہو جائے۔ بعض موقعوں پر یہاں تک ہوتا ہے کہ دو نر خوب تیزی سے بولتے ہیں۔ حتیٰ کہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بولتے بولتے وہ ایک دوسرے سے لڑنا شروع کر دیتے ہیں لیکن چڑیوں میں عام قاعدہ یہی ہے کہ نر اپنی بولیاں ایک ساتھ نہیں بولتے بلکہ جب ایک بولتا ہے تو دوسرا خاموش رہتا ہے اور جب وہ اپنی بولی بند کرتا ہے تو دوسرا بولنا شروع کرتا ہے۔ ان سب مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ نر کا بولنا یا گانا مادہ کے لیے نہیں ہوتا بلکہ دوسرے نروں کے لیے ہوتا ہے اور وہی اس کا جواب دیتے ہیں۔ اگر نروں کی یہ بولیاں مادہ کے لیے ہوتیں تو اُن کا جواب بجائے دوسرے نروں کے مادہ کو دینا چاہیے تھا۔ اب اگر یہ بولیاں پیغام ہیں ایک نر کا دوسرے نر کے لیے تو یہ پیغام سوائے اس کے کہ دھمکیاں ہوں اور کچھ نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ چڑیوں کی اس عادت سے اکثر چڑیاں پکڑنے والے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مثلاً تیتر کو لیجیے۔ ایک پالتو تیتر کو ایسی جگہ بٹھا دیا جاتا ہے جہاں جنگلی تیتر رہتے ہیں۔ پالتو تیتر جب بولتا ہے تو جنگلی تیتر نکل کر اس سے لڑنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ لڑائی میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ آسانی سے شکاری کا شکار ہو جاتا ہے۔ جنگلی مرغوں کے پکڑنے کے لیے بھی یہی ترکیب کی جاتی ہے۔ ایک پالتو مرغا لے جا کر جھاڑیوں کے قریب بٹھا دیا جاتا ہے اور اس کے قریب جال بچھا دیا جاتا ہے۔ جب مُرغا آواز لگاتا ہے اس وقت جنگلی مرغا اس سے لڑنے کے لیے نکل آتا ہے اور بیچارہ لڑائی شروع کرتے ہی جال میں پھنس جاتا ہے۔ اس جگہ کئی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ پالتو نر کی بولی پر نر ہی کیوں نکل کر آتے ہیں۔ اگر یہ بولیاں مادہ کے لیے ہوتیں تو مادہ کو باہر نکل کر آنا چاہیے تھا اور پھر جب دوسرے نر باہر نکل کر آتے ہیں تو اُن کا مقصد صرف لڑائی ہی کیوں ہوتا ہے، ان باتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ چڑیوں کی بولیاں اور ان کے گانوں کا مقصد بجائے زیبائش اور دلکشی کے کچھ اور ہی ہے۔ ایک دوسری مثال سے یہ نظریہ اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔ کوئل میں بجائے نر کے مادہ کو لڑنے بھڑنے کا کام کرنا پڑتا ہے اور کوئل میں بجائے اس کے کہ نر اپنے لیے کئی مادائیں رکھے، مادہ اپنے لیے کئی نر رکھتی ہے چنانچہ جب کوئل کو پکڑنا ہوتا ہے تو ایک پالتو مادہ ایک جگہ رکھ دی جاتی ہے اور جب وہ بولتی ہے تو صرف مادائیں آتی ہیں اور اس سے لڑنا شروع کر دیتی ہیں۔ اس مثال سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جب نر لڑنے والا ہوتا ہے تو نر کا بولنا دوسرے نروں کو اس کے سامنے لڑنے کے لیے لے آتا ہے اور جب مادہ لڑنے والی ہوتی ہے تو اس کے سامنے صرف لڑاکا مادائیں ہی آتی ہیں۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ چڑیوں کا گانا ایک جنس کو دوسری

نس کو گرویدہ کرنے کے لیے نہیں بلکہ اپنی ہی جنس کے دوسرے افراد کو آگاہ
رنے کے لیے ہوتا ہے۔

اگر چڑیوں کا گانا زیبائش کا ایک جز ہوتا اور دوسرے کو فریفتہ
رنے کا ایک ذریعہ ہوتا تو گانے کو سننے کے بعد دوسری چڑیوں پر اس کا
چھا اثر پڑنا چاہیے تھا لیکن واقعات اس کے بالکل برعکس نظر آتے ہیں۔
عموماً چڑیوں کا گانا لڑائی کی علامت ہوتا ہے جب دو نر لڑنے کے لیے
مادہ ہوتے ہیں تو وہ لڑنے سے پہلے یا لڑائی کے دوران میں یا فتح کے
بعد اپنا گانا شروع کرتے ہیں۔

چڑیوں کے گانے کے سلسلے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ گانا
نڈے دینے کے زمانے میں سب سے زیادہ گایا جاتا ہے۔ اس سے یہ
ھی ظاہر ہو سکتا ہے کہ چونکہ اس زمانہ میں نر کو مادہ کی ضرورت ہوتی ہے
س لیے وہ ماداؤں کو مسحور کرنے کے لیے اپنا گانا جس قدر بہتر طریقے
سے ہوتا ہے گاتا ہے لیکن اس امر سے اس کا جواب نہیں ملتا کہ بہت سے نر
س زمانے کے علاوہ کیوں اپنا گانا جاری رکھتے ہیں۔ کیونکہ اس وقت تو
نروں کو مادہ کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔

چڑیوں میں عموماً ایک اصول یہ بھی پایا جاتا ہے کہ جب تک مادہ
انڈوں پر بیٹھتی ہے اور جب تک بچوں کی پرورش ختم نہیں ہو جاتی اس وقت
تک نر مادہ کو نہیں چھوڑتا اور اس کے ساتھ رہتا ہے۔ اب اگر ہم یہ مان
لیں کہ نر کا گانا اس لیے تھا کہ مادہ اس پر فریفتہ ہو کر اُس کی ہو جائے تو انڈے
دینے کے بعد گانے کی مطلق ضرورت نہیں رہتی۔ کیونکہ فطرتاً مادہ کے لیے
یہ لازم ہے کہ وہ انڈوں پر بیٹھے اور اُن میں سے نکلے ہوئے بچوں کی پرورش
کرے۔ انڈے دینے کے بعد مادہ کے لیے کسی نر کے انتخاب کی کوئی ضرورت
نہیں رہتی۔ اس اصول کی بنا پر اس زمانے میں جب کہ مادہ انڈوں پر
بیٹھے نر کو اپنے گانے بند کر دینا چاہئیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا اور نر کے
گانے اس دوران میں بھی جاری رہتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا
ہے کہ گانے ایک قسم کی دھمکی ہیں جن کے ذریعے سے نر اپنے دوسرے
ہم جنسوں کو آگاہ کر دیتا ہے تاکہ وہ اس کے حدود کے اندر آ کر کسی قسم
کی مداخلت نہ کریں۔

بہت سی چڑیاں سن بلوغ حاصل کرنے سے پہلے گانا شروع کر دیتی
ہیں۔ اگر گانا مادہ کے لیے ہوتا تو بلوغ سے پہلے چڑیوں میں اس کی موجودگی
تقریباً ناممکن تھی جیسا کہ ڈاروِن نے لکھا ہے کہ جانوروں میں مادہ کا انتخاب
سن بلوغ سے پہلے کبھی نہیں ہوتا۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ گانا جو کہ
جنسی کشش کا ایک ذریعہ ہو اس کا چڑیا میں سن بلوغ سے پہلے اظہار ہو سکے
لیکن اگر یہ تصور کیا جائے کہ چڑیوں کا گانا ایک دھمکی ہے تو اس مسئلے کا
حل بھی آسان ہو جاتا ہے۔ ہر شخص نے غور کیا ہوگا کہ جانور اپنے بچپن ہی
میں لڑنے کے طریقوں کی مشق کیا کرتے ہیں۔ تاکہ وہ بڑے ہونے کے
بعد جب کہ ان کی حفاظت کے لیے ان کے ماں باپ ان کے ساتھ نہیں
ہوتے، اس وقت وہ اپنے ماحول کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہیں۔ اسی
طرح چونکہ گانا بھی جنگ کا ایک جز ہے، اس لیے اس کی مشق بھی سن بلوغ
سے بیشتر شروع ہو جاتی ہے۔

مشاہدات یہ بھی بتلاتے ہیں کہ گانے والی چڑیاں عموماً چھوٹی
چڑیاں ہوتی ہیں۔ اگر گانا جنسی کشش کے لیے ہوتا تو اس کی چھوٹی اور بڑی
دونوں طرح کی چڑیوں میں برابر کی ضرورت تھی لیکن اس کا خصوصاً چھوٹی
چڑیوں میں پایا جانا اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ گانا لڑائی کا ایک
جز ہے۔ بڑی چڑیاں اپنے رقیبوں سے اپنی جسمانی قوت سے لڑ سکتی
ہیں لیکن چھوٹی چڑیاں چونکہ اس قابل نہیں ہوتیں کہ دوسروں کا کامیابی
سے مقابلہ کر سکیں، اس لیے وہ صرف دھمکی سے کام لیتی ہیں۔ چھوٹی چڑیاں
کمزور ہوتی ہیں اور وہ کمزور آدمیوں کی طرح زیادہ شور مچاتی ہیں اور
دوسروں کو اپنی تیز آواز سے رعب میں لانے کی کوشش کرتی ہیں

سمندری چڑیوں میں اچھے گانے والوں کی کوئی مثال نظر
نہیں آتی۔ ایسا کیوں ہے؟ اگر گانا مادہ کی فریفتگی کے لیے ہوتا تو
سمندری چڑیوں کو بھی اس کی اتنی ہی ضرورت تھی جتنی کہ بری چڑیوں کو۔
لیکن اگر گانے کو ایک دھمکی سمجھا جائے تو یہ مشکل بھی آسان ہو جاتی ہے
سمندری چڑیوں کے لیے زمین کی اتنی کمی ہوتی ہے کہ وہ اپنے لیے علیحدہ
علیحدہ مقبوضات کے حدود مقرر نہیں کر سکتیں۔ کیوں کہ ان کو رہنے
کے لیے صرف کوئی چھوٹا سا جزیرہ ہی بمشکل مل سکتا ہے۔ زمین کی کمی
کی وجہ سے وہ عموماً اپنے گھونسلوں کو اتنا قریب بناتی ہیں
کہ ایک دوسرے کے گھونسلے کے درمیان مشکل سے دو یا تین فٹ

باقی صفحہ نمبر ۲۲ پر

علی گڑھ تحریک کے چند پہلو

اقبال حسین*

جب کوئی علی گڑھ تحریک کا نام لیتا ہے تو ذہن کے پردوں پر ہندستان کی انیسویں صدی کے بے شمار تاریخی واقعات اُبھر آتے ہیں جو اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں کہ 'علی گڑھ تحریک' کوئی حادثاتی یا اتفاقی تحریک نہ تھی بلکہ اس کے پس پشت ایک پوری تاریخ اور تہذیب و تمدن کا قیمتی سرمایہ تھا جس کے تحفظ کے لیے سرسیّد نے ایک منصوبہ تیار کیا اور اس پر عمل کیا۔

سرسیّد، جن کی شخصیت اب محتاج تعارف نہیں، وہ ایک ایسے دور کی پیداوار تھے جب ہندوستان میں مسلمانوں کی بچی کھچی سیاسی قوت، انگریزوں کی حکمت عملی کا شکار ہو کر آخری سانس لے رہی تھی، ہندوستانی مسلمانوں نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں فعال کردار ادا کرتے ہوئے اپنی کھوئی ہوئی سیاسی برتری از سرِ نو قایم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ناکام رہے، جس کی انھیں بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔ نتیجتاً ان کی خود اعتمادی مجروح اور سیاسی شعور کو ایسا دھچکا لگا کہ وہ بہت دنوں تک سنبھالا نہ لے سکے۔ سرسیّد نے ۱۸۵۷ء کے خون آشام واقعات کو ایک چالیس سالہ بالغ النظر اور ذی ہوش فرد کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ وہ اس سے کس حد تک متاثر ہوئے تھے اس کا اظہار جا بجا ان کی تحریروں میں ملتا ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ مسلمانوں کا مفاد صرف اس امر میں مضمر ہے کہ وہ اب حکمراں طبقے سے معاندانہ روش کے بجائے مفاہمت کی روش اختیار کر کے اپنی پسماندگی اور بدحالی کو دور کریں۔ سرسیّد کا یہ نظریہ، احساسِ کمتری، بزدلی یا حکومتِ وقت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے نہیں تھا، بلکہ اس یقین پر مبنی تھا کہ مسلمانوں کی شیرازہ بندی صرف اسی حکمت عملی کو اختیار کر کے ہی ممکن ہے۔ سرسیّد تمام تر مخالفتوں، بہتان تراشیوں، یاوہ گوئیوں اور دشنام طرازیوں کے باوجود آخر دم تک اپنی حکمت عملی پر قایم رہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ انھیں کیوں مطعون کیا جا رہا ہے لیکن وہ خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہے۔ بہتان تراشیوں اور دشنام طرازیوں نے ان کے حساس دل کو چوٹ پہنچائی تھی۔ ایک خط میں اپنے غم کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"میں تو ہدف تیر ہائے ملامت ہو گیا ہوں اور روز بروز ہوتا جاؤں گا، شاید میرے بعد کوئی زمانہ آئے جب لوگ میری دل سوزی کی قدر کریں۔"[1]

سرسیّد کی دوررس نگاہیں ہندوستان سے باہر بھی مسلمانوں کی زبوں حالی اور سیاسی زوال کو دیکھ رہی تھیں۔ انیسویں صدی عیسوی میں انگریزوں کا عروج اور دنیا کے بیشتر ممالک، خصوصاً عہدِ وسطیٰ اور افریقہ کے مسلم ممالک پر قبض و اختیار اور اثر و نفوذ نے، ان کو دنیا کی طاقتور ترین قوموں کی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔ ایک ایسی ابھرتی ہوئی متحد اور فعال قوم کے برخلاف مسلمانوں کی غیر متحد، علمی اور اقتصادی طور پر پس ماندہ اور معاشرتی طور پر زوال پذیر قوم کیسے مدمقابل ہو سکتی تھی۔ مسلمانوں کے بچے کھچے قدیم خاندان جس طرح ایام غدر میں اور اس کے بعد پامال ہوئے تھے، سرسید اس کے چشم دید گواہ تھے اور خود ان کے مطابق ان حالات نے ان کو قبل از وقت بوڑھا کر دیا تھا۔ سرسیّد فکرمند تھے کہ کوئی ایسی صورت پیدا کی جائے کہ مسلمانوں کی فلاح کی صورت

---

* ریڈر شعبہ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

نکل سکے۔ مسلمانوں کی اصلاح اور تعلیم و تربیت کی فکر کشاں کشاں انھیں ایک ایسے نظریے کی طرف لے آئی جس نے بالآخر علی گڑھ تحریک کو جنم دیا۔ علی گڑھ تحریک صرف مسلمانوں کی تعلیم و تربیت، ان کی سماجی اور مذہبی اصلاح تک محدود نہ تھی۔ اس مختصر مضمون میں یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی جا سکے۔ یہاں صرف چند امور کی طرف توجہ دلانی ہے جو سرسید نے ابتدائے تحریک سے ہی تحریک کے بعض پہلوؤں کے مقاصد کی وضاحت کر دی تھی۔

علی گڑھ تحریک کا ایک بڑا مقصد مسلمانوں میں روایتی تعلیم کے حصول کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم کا حصول بھی رہا ہے۔ سرسید کو یقین تھا کہ مسلمانوں کی فلاح اسی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے۔ لیکن روایتی اور جدید تعلیم کے حصول کے ساتھ ساتھ سرسید نے اس امر پر بھی زور دیا کہ مسلمان ہنر بھی حاصل کریں۔ غدر کے بعد مسلمانانِ ہند فراریت اور قنوطیت کا شکار ہو کر جہل اور گمنامی کے غار میں اترتے جا رہے تھے۔ سرسید خوب سمجھتے تھے کہ علم و ہنر سے دوری مسلمانوں کو اور بدحال اور پسماندہ کر دے گی۔ انھوں نے بے علمی کے معائب کا ذکر اپنے لکچر میں یوں کیا ہے:

> "بے علمی مفلسی کی ماں ہے۔ جس قوم میں علم و ہنر نہیں رہتا وہاں مفلسی آتی ہے اور جب مفلسی آتی ہے تو ہزاروں جرموں کے سرزد ہونے کی باعث ہوتی ہے۔ اب تم اپنی قوم کے حال پر غور کرو کہ یہ بدبخت دن اُن پر آ گئے ہیں۔ بڑے بڑے قدیمی خاندان سب گر پڑے ہیں۔ تمام قوم پر مفلسی محتاجی اور قرضداری اور ذلت چھا گئی ہے۔ اگر جیل خانوں میں خیال کرو گے تو مسلمانوں کو بلحاظ آبادی اور قوموں سے بہت زیادہ پاؤ گے۔" [3]

علم سے بے بہرہ وری (جدید تعلیم) کا ہی نتیجہ تھا کہ بنگال جس پر مسلمانوں کی کئی سو سال تک حکومت قائم تھی، حاکم سے محکوم، زمین دار اور جاگیردار سے رعیت اور مزدور بن گئے تھے۔ ملازمتوں میں بھی ان کا تناسب اتنا گر چکا تھا کہ سرسید کے علاوہ ہنٹر بھی اس صورتِ حال سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ میر مہدی کو سرسید نے اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے ۲۰ اگست ۱۸۶۹ء کو لکھا تھا:-

> "بھائی مہدی اتم پانیر (Pioneer) اخبار الہ آباد میں سے ایک آرٹیکل کا ترجمہ سنو۔ وہ لکھتا ہے کہ آج کل ہندوستان میں خاندان مسلمانوں کے روز بروز گھٹتے جاتے ہیں۔ چنانچہ بنگال میں تمام سلطنت کے ملازمین میں چند مسلمان ہیں وہ بھی ضعیف ہیں، جلد پنشن لیں گے اور ان کی جگہ یقینی کوئی مسلمان معزز عہدہ پر نہیں ہوگا۔ دیکھو جو میں کہتا تھا اور جس کا غم کرتا تھا اب سب لوگ وہی کہتے ہیں۔" [4]

سرسید کا ذہن سفرِ لندن کے بعد کچھ اور کھلا۔ ہندی مسلمانوں کا حال زار اُن کے سامنے تھا۔ ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان انھوں نے مسلم ممالک کے حالات دیکھے اور سمجھے۔ لندن میں قیام کے دوران وہ قوم کی پسماندگی سے اور متاثر ہوئے۔ وہاں کی ہر اچھی چیز کا موازنہ ہندوستان سے کیا۔ آزادیٔ تحریر و تقریر، علوم و فنون کی ترقی اور ایجادات نے ان کے ذہن میں انقلاب برپا کر دیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ برطانیہ اور یورپ کی دیگر اقوام کی ترقی وہاں کی حکومتوں کی توجہ کی مرہونِ منت نہیں تھی بلکہ عوام کی دلچسپی اور توجہ کی بنا پر تھی۔ وہ اپنے ایک دوسرے خط میں میر مہدی کو لکھتے ہیں:-

> "زیادہ تعجب یہ دیکھ کر ہوتا ہے کہ یہ سب ہو رہا ہے صرف نج سے اور آپس میں لوگوں نے کیا ہے۔ گورنمنٹ سے علاقہ کچھ نہیں ہے اور یہ دیکھ کر آدمی یقین کر سکتا ہے کہ ہندوستان میں اگر بہت سے آدمی متوجہ ہوں اور علوم و فنون اور سویلیزیشن پر کوشش کریں تو وہ بلا اعانت گورنمنٹ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔" [5]

لندن میں مستقل غور و فکر نے سرسید کو ہندوستان میں مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے ایک تعلیمی ادارہ قائم کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر مسلمانوں کی تربیت کے لیے جداگانہ مدرسہ قائم ہو جائے تو بہتر ہے۔ بقول سرسید

> "کوئی رات نہیں جاتی کہ ایسے مدرسے کے تقرر کی باتیں اور تجویزیں یہاں نہیں ہوتیں۔" [6]

سرسید کا ذہن بہرحال اس مدرسے کے مقاصد کے متعلق بالکل صاف

تھا۔ اس کا مقصد صرف مغربی تعلیم دینا نہ تھا بلکہ مسلمانوں کو "کامل درجہ کی سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے کی طرف راغب کرنا تھا"[۷]

مجوزہ مدرسہ کے قیام کے لیے دس لاکھ روپئے کی خطیر رقم کی ضرورت تھی[۸] اور یہ بڑا مشکل کام تھا۔ سرسید نے اپنا تعلیمی مشن کیسے چلایا۔ ایم۔ اے۔ او اسکول اور پھر ایم۔ اے۔ او کالج کی منزل تک پہنچنے میں سرسید کو کیا کچھ کرنا پڑا۔ اس کے متعلق بہت کچھ لکھا جاچکا ہے[۹] بہرحال یہ سرسید کے عزم محکم کا ایک نمونہ ہے کہ تمام بے سروسامانیوں اور مخالفتوں کے باوجود انھوں نے مسلمانوں کی اصلاح اور تعلیم و تربیت کی بنیاد ڈال دی۔ ہرچند تحریک کا آغاز ہی بڑا مشکل کام تھا لیکن اس سے زیادہ مشکل کام تحریک کو فعال رکھنا تھا اور تیزی کام لینا تھا۔ گوکہ سرسید نے ایام غدر میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا اور وہ ان کی نگاہوں میں محترم بھی تھے لیکن عام مسلمانوں کی کیفیت بالکل برعکس تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد حکومت وقت کی پالیسی "مسلم کشی" اور "ہندو نوازی" پر قائم ہوئی[۱۰] خود مسلمانوں میں علماء کا بڑا اور فعال طبقہ جدید تعلیمات کا صرف اس لیے مخالف تھا کہ یہ انگریزوں کے توسط سے ہندوستان میں رائج ہو رہا تھا۔ انگریز اور ان کی تمام چیزیں قابل نفرت تھیں۔ سرسید کے لیے ایسی صورت حال میں مسلمانوں کی جدید تعلیم اور اصلاح کا مسئلہ اس لیے اور پیچیدہ تھا۔ یہ صورت حال راجہ رام موہن رائے، مشہور مفکر اور مصلح کے ساتھ نہ تھی انھیں حکومت وقت کی زبردست حمایت اور قوم کے دونوں طبقے کی خواہ وہ رجعت پسند رہا ہو یا ترقی پسند، جدید تعلیم کے حصول میں ایک رائے تھی۔ برعکس اس کے سرسید کو ہر طرف مخالفتوں کا سامنا تھا۔ پھر بھی سرسید نے ہمت نہیں ہاری اور وہ اپنے کام میں لگے رہے۔ سرسید کی قدرشناسی اپنوں سے زیادہ اغیار کر رہے تھے[۱۱]

کیا سرسید کے مدرستہ العلوم کے قیام کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کر کے سرکاری ملازمتوں پر مامور کرادیا جائے؟ بلاشبہ کالج کی تعلیم کے حصول کا ایک مقصد یہ بھی تھا لیکن سرسید زمانہ شناس تھے۔ انہیں بخوبی احساس تھا کہ مسلمانوں کو جدید تعلیم صرف سرکاری ملازمتوں کے حصول کا ذریعہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ انھوں نے مولوی عبدالحق دہلوی (مولف تفسیر حقانی) کو اپنے مراسلے میں علی گڑھ تحریک کے مقصد کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا ہے۔

"آپ نے تصور فرمایا ہے کہ مدرستہ العلوم کی تعلیم سے ہاتھ آنا سرکاری نوکریوں کا اصلی مقصود ہے۔ اس لئے آپ فرماتے ہیں کہ سرکار میں اتنی نوکریاں کہاں ہیں جو مسلمانوں کو دے گی؟ جناب من آپ نے مقصود مدرستہ العلوم پر غور نہیں فرمایا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان علوم و فنون میں ایسی تعلیم پاجائیں کہ بلا ذریعہ نوکری خود اپنے بازو سے اپنی معاش پیدا کریں اور جو مدارس سرکاری میں بجز نوکری پیشہ بننے کے یہ بات حاصل نہیں ہوتی اس لیے مستقل مدرسے کے قائم کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے۔"[۱۲]

علی گڑھ تحریک میں سرگرم عمل، سرسید کے قریبی رفیق مولوی نذیر احمد نے بھی سرسید کے خیالات کی یوں ترجمانی کی ہے:۔

"اگر مسلمانوں نے سرکاری نوکری کے لالچ میں آکر انگریزی پڑھنی شروع کی ہے اور مجھے خوب معلوم ہے کہ جنھوں نے پڑھی اسی غرض سے پڑھی اور جو پڑھ رہے ہیں اسی غرض سے پڑھ رہے ہیں۔ اگرچہ یہ کہتے ہوئے میرا جی کڑھتا ہے مگر بے کہے رہا نہیں جاتا کہ امتحان میں فیل نہ بھی ہوں تو اس توقع میں ضرور فیل ہوں گے۔ اس واسطے کہ اسٹور کچا پکا بھرا پڑا ہے اور ڈیمانڈ ہے مگر سپلائی کے مقابلہ میں گویا کہ نہیں۔"[۱۳]

چنانچہ جدید تعلیم صرف سرکاری ملازمتوں اور مسلمانوں کی معاشی بہتری کا ذریعہ نہیں بن سکتی تھیں۔ اسی لیے سرسید اس کے بڑے حامی کہ مسلمانوں کو تجارت کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے اور یہ تجارت صرف ملک کے اندر ہی محدود نہ ہو بلکہ بیرون ملک تک محیط ہو۔ سرسید نے اپنے ایک آ میں اس کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا تھا:۔

"تجارت جو بڑا وسیلہ دولت اور سیاحت کا ہے وہ ہماری قوم میں بالکل نہیں ہے۔ کل ہندوستان کے مسلمان تجارت پیشوں کی اگر تعداد بمشکل حاصل کی جائے تو وہ ایسی قلیل و ذلیل ہوگی کہ جس کو بیان کرتے ہوئے بھی

شرم آوے گی۔ چند معدود مسلمان جو تجارت کرتے ہیں ان
کی بڑی سے بڑی تجارت یہ ہے کہ غیر ملک اور قوم کے
لوگ جو کلکتہ اور بمبئی میں مال لاتے ہیں ان کو نفع دے
کر خریدتے ہیں اور پھر اپنے ہی ملک میں اپنے بھائی
بندوں کے ہاتھ نفع پر بیچتے ہیں۔ پس ان سے بعوض اس
کے کہ قوم کو فائدہ پہونچے الٹا نقصان پہنچتا ہے[۱۲]

صرف سر سیّد ہی نہیں بلکہ ہندوستان میں مسلمانوں کا دانشور طبقہ بھی تجارت اور صنعت و حرفت کی اہمیت سے آگاہ تھا۔ اکبر الہ آبادی ان میں سے ایک تھے۔ گو کہ آپ عمر میں سر سیّد سے چھوٹے تھے لیکن ہم عصر تھے علی گڑھ میں قیام ملازمت کے درمیان ان کی سر سیّد سے ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں اور دونوں قومی اور ملّی مسائل پر گفتگو بھی کرتے رہتے تھے۔ ممکن ہے کہ سر سیّد کی صحبت ہی سے متاثر ہو کر اکبرؔ نے یہ شعر کہا ہو ؎

کچھ صنعت و حرفت پہ بھی لازم ہے توجہ
آخر یہ گورنمنٹ سے تنخواہ کہاں تک[۱۳]

سر سیّد کی طرح اکبر بھی قومی اور ملّی مسایل پر اپنی ایک مخصوص رائے رکھتے تھے۔ وہ مغربی اقوام کے اقتدار اور عروج کے اسباب کو سمجھ رہے تھے :۔

حکومت ایشیا پر قسمت مغرب میں ہے جب تک
کمالات اس کے جو ہیں ہم کو حاصل ہو نہیں سکتے

سر سیّد کے انتقال کے بعد علی گڑھ تحریک کی زمام قیادت محسن الملک کے ہاتھوں آئی۔ محسن الملک کی درخواست پر اکبرؔ نے "نظم قومی" لکھی۔ یہ نظم مسلمانوں کے شاندار تاریخی پس منظر کے ساتھ ان کی جہل، نفاق، نفس پرستی، بد اخلاقی اور بے ہنری پر بڑا پُر اثر مرثیہ ہے۔ آخری بند میں اکبرؔ قوم کو وہی پیام دیتے ہیں جو سر سیّد کی زندگی کا سب سے بڑا مشن تھا :۔

وہ باتیں جن سے ہو رہی ہیں نام ور، سیکھو۔
اٹھو تہذیب سیکھو، صنعتیں سیکھو، ہنر سیکھو
بڑھاؤ تجربے اطراف دنیا میں سفر دیکھو
خواص خشک و تر سیکھو، علوم بحر و بر سیکھو

خدا کے واسطے اے نوجوانوں ہوش میں آؤ
دلوں میں اپنے غیرت کو جگہ دو جوش میں آؤ[۱۴]

۲

سر سیداور ان کے رفقا نے علی گڑھ تحریک کو جاری رکھنے کے لیے خاصی محنت کی اور قربانیاں دیں۔ بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہندوستانی سیاست میں بہت سے تغیّرات پیدا ہوئے۔ برطانوی حکمرانوں کی حکمت عملی نے علی گڑھ تحریک کے ایک فعال اور جاندار شعبہ "مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کو تعلیمی سرگرمیوں سے ہٹا کر سیاست کے میدان میں لا کھڑا کیا۔ بالآخر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ایک غیر فعال تنظیم ہو کر رہ گئی۔ اس کا اثر علی گڑھ تحریک پر بھی پڑا۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی سے ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی تک علی گڑھ تحریک مختلف مراحل سے گزر کر ایک ایسے نازک موڑ پر آچکی تھی جس کا جاری رکھنا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا۔ مولانا آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی کاوشوں سے تحریک زندہ تو رہی لیکن سر سیّد کے ذہن میں تحریک کا جو نقشہ تھا وہ آہستہ آہستہ ملک کی سیاست اور تغیرات زمانہ کی نذر ہو گیا۔ مدرسۃ العلوم نے اس دور میں یقیناً کئی جہتوں میں ترقی کی۔ قدیم علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کے شعبے ترقی کرتے رہے۔ انجینرنگ اور میڈیکل کالج بھی وجود میں آ گئے لیکن بد قسمتی سے قوم اپنی ترقی کا راز سرکاری نوکریوں کے حصول ہی کو سمجھتی رہی۔ سائنس، میڈیسن، انجینرنگ اور دوسرے علوم رائجہ کے حصول کے بعد فرزندان مدرسۃ العلوم کا بیشتر انحصار ملازمتوں کے حصول پر ہی ہے۔ میڈیکل اور انجینرنگ کالج سے فارغ شدہ طلبا میں کتنے ہیں جو اپنی آزاد پریکٹس کرنے یا صنعتیں قائم کرنے کا منصوبہ بنا کر اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں؟ سائنس اور آرٹس کے فارغ شدہ کان طلبا بھی اسیر حصول ملازمت ہی ہوتے ہیں اور جب کوئی صورت نہیں نظر آتی ہے تو بدرجۂ مجبوری تجارت کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ مگر یہ بھی بہت محدود پیمانہ پر ہوتی ہے۔ حکومت ہند کی پالیسی کے تحت کئی قومی بنک اور بہت سی صوبائی حکومتیں اب اقلیتوں کو صنعتیں لگانے کے لیے سرمایہ اور تکنیکی تعلیم کے لئے امداد دے رہی ہیں۔ موجودہ دور میں جہاں بہتر اور باوقار زندگی کے لیے ترقی یافتہ اقوام کو قدم قدم پر مقابلوں کا سامنا ہے، بد قسمتی سے

ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت، مسلمان، سہاروں کی تلاش میں بھٹک رہی ہے۔ علی گڑھ تحریک کا مقصد یہ تو نہ تھا کہ قوم دوسروں کے سہاروں کی تلاش میں اپنی خود اعتمادی کھو دے۔ قوموں کے زندہ رہنے کا راز علی گڑھ تحریک کے بانی نے پالیا تھا۔ لندن سے ۱۱ر فروری ۱۸۷۰ء کے مکتوب میں محسن الملک کو لکھتے ہیں:۔

"افسوس کہ مسلمانانِ ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کا نکالنے والا نہیں۔ ہائے افسوس! امرت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں۔ ہائے افسوس! ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور مگر کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ اے بھائی مہدی، فکر کرو اور یقین جان لو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آگیا ہے۔ اب ڈوبنے میں کم فاصلہ باقی ہے۔ اگر تم یہاں آتے تو دیکھتے کہ تربیت کس طرح ہوتی ہے اور تعلیم اولاد کا کیا قاعدہ ہے اور علم کیوں کر آتا ہے اور کس طرح پر کوئی قوم عزت حاصل کرتی ہے۔"[۱]

آج ۱۱۸ سال گزرنے کے بعد بھی مسلمانوں کا جو حال ہے وہ عیاں ہے مگر آج نہ سرسیّد جیسی کوئی شخصیت ہے اور نہ ہی میر مہدی جیسی۔ ملک کے مختلف گوشوں میں گنے چنے لوگ مسلمانوں کی فلاحی اسکیم ضرور چلا رہے ہیں۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ علی گڑھ تحریک کو حالات زمانہ اور قومی ضروریات کے مطابق متحرک کر دیا جائے اور ہندی مسلمانوں میں از سر نو حصول علم کے ذریعے خود اعتمادی بحال کرنے کی کوشش کی جائے۔

حوالہ جات

۱ مکتوبات سرسیّد بنام مہدی ۲۱ر جنوری ۱۸۷۰ء صفحہ ۸۷

۲ تقریر پٹنہ، ۲۶ر مئی ۱۸۷۳ء مجموعہ ہائے لکچرز ص ۷۵

۳ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو The Indian Mussalmans ص ۱۲۳—۱۵۰

۴ مکتوبات سرسیّد، ۲۰ر اگست ۱۸۶۹ء ص ۶۳

۵ مکتوبات سرسیّد۔ ص ۴۳، ۴۷-۴۸، ۶۳-۶۴، ۶۵-۶۶

۶ مکتوبات سرسید ص ۱۰۶

۷ تہذیب الاخلاق جلد دوم بحوالہ عابد حسین، ہندوستانی مسلمان

۸ مکتوبات سرسیّد۔ ص ۱۰۶

۹ تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو 'حیاتِ جاوید'۔

۱۰ رام گوپال۔

۱۱ "The most Famous of Those whom I met was undoubtedly Sir Syed Ahmad, The founder of Aligarh College, one of The greatest leader of The Muslim Community under British rule"

A nation in Making. 1927 - PP 48-49

بعد ازاں پنڈت جواہر لال نہرو نے زیادہ موثر اور واضح الفاظ میں سرسیّد کے متعلق اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ ملاحظہ ہو 'میری کہانی' جلد دوم۔ ص ۳۱۵

۱۲ مکتوبات سرسیّد، ص ۲۲۰

۱۳ لکچرز نذیر احمد ص ۲۱—۲۲

۱۴ مجموعہ لکچرز ص ۱۰۰

۱۵ کلیات اکبر، حصہ اول ص ۳۰

۱۶ کلیات اکبر ص ۲۰۳

۱۷ مکتوبات سرسیّد ص ۹۰۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ج ۷۔ ش ۹ (ستمبر ۸۸ء)

سائنس کے میدان میں پاکستان کی پسماندگی

ایک تجزیہ

پرویز امیر علی ھودبھائی*

ارضِ پاکستان میں سائنس کا پودا کیوں پنپ نہیں سکا ہملک میں سائنسی تعلیم و تحقیق کی موجودہ کیفیت اس قدر مایوس کن کیوں ہے؟ کیا اس حالت کو فقط عارضی تصور کرنا واقعی درست ہے؟ یا عرصۂ دراز تک ملک کا سائنسی مستقبل تاریکی میں گھرا رہے گا؟ سائنس کے میدان میں پاکستان کی پسماندگی کے اہم موضوع پر کئی تجزیے سننے میں آتے ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ سائنس پر رقم کم خرچ ہوتی ہے اور وہ تجویز کرتے ہیں کہ اقوام متحدہ کی تجاویز پر عمل کرتے ہوئے اس شعبے میں اخراجات پانچ گنا بڑھا کر GNP (کل قومی پیداوار) کے ایک فی صد کے برابر کیے جائیں۔ پھر ایک عظیم الشان یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کی تعمیر زیر غور ہے۔ اس کے علاوہ ایک یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ اگر انگریزی کو خارج کر کے اردو رائج کی جائے تو سائنس کے مضامین عام فہم ہو جائیں گے۔ اس طرح کے کئی اور نسخے بھی ہیں۔

مذکورہ بالا تجاویز اور تدابیر کی بابت ہم فی الحال کچھ نہیں کہیں گے، لیکن ان میں اس مرض کا کہیں ذکر نہیں جو ہمارے سائنسی انحطاط کا اہم ترین سبب ہے۔ نہ کبھی اسپرو سے سرطان نے علاج پایا ہے اور نہ ہی اس طرح کی تدبیروں پر عمل کرنے سے وہ سماجی اور فکری رکاوٹیں دور ہو سکتی ہیں جو پاکستان کی سائنسی ترقی کی راہ میں کوہ گراں کی طرح حائل ہیں۔ چنانچہ ہم پر لازم ہے کہ پہلے اس سماجی مرض کی تشخیص کریں جو پاکستان میں سائنس کی ناتوانی کا بنیادی سبب ہے۔ ورنہ ہم ابد تک کریلے کی بیل سے خوشۂ انگور کی امید کرتے رہیں گے۔

سائنسی تحقیق و تعلیم کی موجودہ کیفیت

سب سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ پاکستان میں سائنس کی تحقیق اور تعلیم کی موجودہ کیفیت کا مختصر جائزہ لیا جائے۔

اس وقت پاکستان میں سائنسی و ٹیکنیکی تحقیق کے اداروں کی تعداد ۱۲۷ ہے اس میں PAEC (پاکستان اٹامک انرجی کمیشن)، PCSIR وغیرہ شامل ہیں مگر ان تمام اداروں کی کل سائنسی یا ٹیکنیکی پیداوار امریکہ کی صرف ایک ریسرچ لیبارٹری سے بھی کم ہے۔ PCSIR کے چیرمین نے حال میں اعتراف کیا کہ ان کا ادارہ، جو کئی ہزار افراد پر مشتمل ہے اور جس پر کروڑوں روپیے خرچ ہوئے ہیں، ناکام رہا ہے۔ غالباً یہی بات PAEC پر صادق آتی ہے۔ ایسے ادارے زیادہ تر بیوروکریسی کے دفاتر کا کام ہی سرانجام دیتے ہیں۔ یہ ایک سبب ہے کہ ہم ہر قسم کی مشینیں، آلات اور چھوٹی و بڑی سائنسی اشیاء درآمد کرنے پر مجبور ہیں۔

۱۹۸۰ء کے UNCST (اقوام متحدہ کمیشن برائے سائنس اور ٹیکنالوجی) کی ایک رپورٹ کے مطابق سائنسی لٹریچر کی پیداوار کے اعتبار سے ہندوستان میں درجہ دنیا میں ساتواں ہے، جب کہ تمام اسلامی ممالک، بشمول پاکستان، ساٹھویں درجے پر ہیں۔

تمام پاکستان میں صرف ۲۵ یا ۳۰ ایسے طبعیات داں

* فزکس ڈپارٹمنٹ قائد اعظم یونیورسٹی، اسلام آباد، پاکستان

ہیں جو دو سال میں ایک، یا ایک سے زیادہ تحقیقی مقالہ لکھتے ہیں۔ اس کے برعکس ہندوستان میں ایسے طبعیات دانوں کی تعداد ۶۰۰۰ سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ شعبہ ریاضی میں صورت حال اس بھی زیادہ مایوس کن ہے، جب کہ کیمیا اور بیالوجی کے شعبوں میں حالات قدرے بہتر ہیں۔

ملک میں معیاری اور مفید سائنسی تحقیق کا فقدان یقیناً افسوس کا باعث ہے۔ آخر، زمانہ جدید میں ملکی معیشت کی کونسی چیز ہے جس کا دار و مدار سائنس و ٹیکنالوجی پر نہ ہو؟ لیکن پاکستان میں سائنس کی تعلیم کی موجودہ کیفیت ملک میں سائنسی تحقیق کی ناکامی سے بھی زیادہ تشویشناک ہے۔ کیونکہ سائنسی ترقی کا مستقبل اسی تعلیم پر منحصر ہے گو کہ شعبہ تعلیم کی بدحالی ایک نمایاں حقیقت ہے لیکن اس کا صحیح اندازہ اعداد و شمار کی مدد کے بغیر نہیں لگایا جاسکتا ہے۔ چند حقائق ذیل میں پیش ہیں۔

۱۹۸۴ء کے اوائل میں وزیر تعلیم جناب ڈاکٹر محمد افضل کے احکام پر پاکستانی طلبا و طالبات کا تعلیمی معیار جانچنے کی غرض سے سائنس اور ریاضی کے مضامین میں ایک امتحان کا اہتمام کیا گیا۔ یہی امتحان فرانس، کینیڈا، آسٹریلیا، امریکا، سویڈن، جاپان، برطانیہ اور سوئزرلینڈ کی چھٹی جماعت کے بچوں کو دیا جا چکا تھا۔ امتحان کئی چھوٹے چھوٹے سوالوں پر مشتمل تھا اور ان کے جواب میں "صحیح" یا "غلط" بتانے کی ضرورت تھی۔ پاکستان میں اس امتحان کا بندوبست N.I.P. (نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سائیکلوجی) کے ذمہ کیا گیا جس کے بعد راولپنڈی کے مختلف اسکولوں سے چھٹی جماعت کے بچے چنے گئے اور انھیں امتحان دیا گیا۔ نتائج کی تمام تفصیلات N.I.P. کی ایک تازہ رپورٹ میں قلم بند ہیں۔ یہاں پر یہ کہنا کافی ہے کہ ان بچوں کی کارگردگی اس قدر خراب تھی کہ بیرونی ممالک کے بچوں سے موازنہ قطعاً ناممکن تھا۔ لہذا وہی امتحان ساتویں جماعت کو دیا گیا لیکن اس سے بھی حوصلہ افزا نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اس کے بعد آٹھویں نویں، دسویں اور بالآخر گیارھویں کے طلبا کو آزمایا گیا۔ نتائج سے پتہ چلا کہ ریاضی اور سائنس کے میدان میں چھٹی جماعت کا عام جاپانی بچہ پاکستان کے F.Sc کے عام طالب علم کا مقابلہ کرتا ہے! تعلیم

کی شکستہ حالی کے اس ثبوت کو منظر عام پر ابھی تک نہیں لایا گیا ہے۔

طالب علموں سے بُری خود اساتذہ کی حالت ہے۔ چند م
قبل قائد اعظم یونیورسٹی کے زیر اہتمام ایک کالج ٹیچرز رفریشر کورس منعقد ہوا۔ تمام پاکستان کے کالجوں سے ایسے اساتذہ چنے گئے کے پاس M.Sc کی ڈگری تھی اور جو مدتوں سے پڑھا رہے تھے۔ ک کی ابتدا میں ان کو میٹرک اور انٹر کے چند آسان ریاضی اور طبعیا کے سوال حل کرنے کے لیے دیے گئے۔ گو کہ یہ اساتذہ عرصہ دراز سے B.Sc کی سطح پر پڑھاتے رہے تھے لیکن ان کی بنیادیں اس ق کھوکھلی اور کمزور تھیں کہ ۸۰ فی صد اساتذہ اس امتحان میں کامیاب ہو سکے۔

سرکاری ذرائع کے مطابق ملک میں ناخواندگی کی شرح فی صد ہے۔ اگرچہ باخبر افراد ان اعداد پر شک و شبہ کا اظہار کرتے لیکن ان کو درست قبول کرنے کے باوجود دنیا کے کل ۱۸۴ ممالک خواندگی کے اعتبار سے پاکستان کا درجہ ۱۴۲ بنتا ہے۔ ملک کے اسک کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم پر اندھی تقلید کی پرانی روایت اب ز سے زیادہ حد تک اثر انداز ہوتی جارہی ہے۔ سائنس کے مضامین کو ع اسلامیات یا مطالعۂ پاکستان کی طرز سے پڑھایا جاتا ہے۔ گویا مکھی مکھی مارنا قابل ستائش اور اچھے نمبروں کا ضامن ہے جب کہ ب اور پرکھنے کو ناپسند کیا جاتا ہے۔ چنانچہ رٹے ہوئے حقائق کے ا تلے نوجوان ذہن پس کر مفلوج ہو جاتے ہیں اور ان میں تجسس اور علم شوق باقی نہیں رہتا۔ اگرچہ تعلیمی نظام کے یہ عیب پرانے ہیں لیک حالات کا رجحان بہتری کی جانب نہیں ہے۔

سائنس کی تعلیم و تحقیق کی اس المناک حالت کو سمجھنے کی غرض سے ہم ایک تفصیلی تجزیے کا آغاز کرتے ہیں۔

سائنس کیا ہے ؟

گو کہ اس مضمون میں لفظ "سائنس" کئی بار استعمال ہو چکا ہے، مگر اس کا مفہوم ابھی تک واضح نہیں کیا گیا ہے۔ عام طور پر یہ خیا کیا جاتا ہے کہ سائنس کا مطلب مشینیں ہیں، یا کیمیادی اشیا، یا آلات یا اس طرح کی دیگر چیزیں۔ پھر بیشتر طلبا، سائنس کو فارمولے اور انتھا

کا ایک بڑا ڈھیر سمجھتے ہیں جن کو نمبروں کی خاطر امتحان سے پہلے حفظ کرنا ضروری ہے اور فوراً بعد بھولنا ناگزیر ہے مگر اس کو سائنس کہنا بہت بڑی زیادتی ہوگی۔ دراصل سائنس ایک طرزِ فکر کا نام ہے جس کے استدلال کی بنیادیں منقولاتی نہیں بلکہ تجرباتی ہیں۔ کسی مفروضے کو ثابت کرنے کے لیے ڈاروِن یا نیوٹن یا آئن سٹائن یا عبدالسلام کی شہادتوں کا سہارا نہیں لیا جاتا بلکہ اس کو تجربوں سے ثابت یا رد کیا جاتا ہے گو کہ ہمیں بچپن ہی میں پڑھایا جاتا ہے کہ پانی ہائیڈروجن اور آکسیجن کا مرکب ہے لیکن اس کو اندھے یقین کے یہ قبول کرنا ہرگز ضروری نہیں۔ ہر خاص و عام اس حقیقت کو ایک آسان تجربے سے خود پرکھ سکتے ہیں۔ سائنس کے نہ پیر ہیں نہ پیغمبر۔ لہٰذا اس میں اختراعی قوتیں مسلسل کارفرما رہتی ہیں۔

سائنس کے نظریات اور غیر سائنسی نظریات میں واضح فرق ہے۔ ایک سائنسی تھیوری کی پہچان یہ ہے کہ اس میں نئی پیش گوئیاں کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ گویا ایسی تھیوری کے استعمال سے نہ صرف تمام موجودہ تجربات اور مشاہدات سمجھے جا سکتے ہیں بلکہ مزید تجرباتی نتائج اور انوکھے مشاہدات کی پیش گوئی بھی کی جاتی ہے۔ سائنس داں کسی سائنس کی تھیوری کو حرفِ آخر نہیں سمجھتے ہیں۔ وہ تھیوری کو مسلسل پرکھتے ہیں اور اس کی پیش گوئیوں کا مقابلہ مشاہدات یا تجرباتی نتائج سے کرتے ہیں۔ سر کارل پاپر کے بقول کوئی تھیوری "سائنسی" کہلانے کی حقدار نہیں اگر اس کو یوں غلط ثابت کرنا ممکن نہ ہو۔

ان باتوں کی وضاحت ہم ایک تاریخی مثال سے کریں گے: ۱۶۸۶ء میں نیوٹن نے کششِ ثقل کی تھیوری مرتب کی تھی۔ اس زمانے میں دم دار ستارے یعنی COMET کے متعلق دو قسم کے نظریات پائے جاتے تھے۔ ایک طرف انگلینڈ کے سارے عوام اس نظریے کے قائل تھے کہ خدا ان دم دار ستاروں کو قحط، سیلاب، زلزلے اور مختلف قدرتی آفات کے پیش خیمہ کے طور پر بھیجتا ہے۔ دوسری طرف ایک ماہر فلکیات ہیلی نے خیال ظاہر کیا کہ پتھروں کی حرکت کی طرح دم دار ستارے بھی نیوٹن کی تھیوری کے پابند ہیں۔ اگر یہ محض خیال کی حد تک رہتا تو شاید عوام کے وہمی نظریے سے مختلف نہ ہوتا۔ مگر ہیلی نے چند مہینوں تک ایک ایسے دم دار ستارے کا مشاہدہ کیا جس سے عوام خاصہ مرعوب تھے۔ پھر اس نے نیوٹن کے قوانین کی مدد سے یہ پیش گوئی کی کہ وہی ستارہ ۷۶ سال بعد آسمان کے ایک خاص مقام پر نظر آئے گا۔ یہ بات انتہائی حیران کن تھی، مگر ٹھیک ۷۶ سال بعد جب ہیلی اور نیوٹن کب کے دفن ہو چکے تھے، ہیلی کا کومیٹ عین اسی مقام پر نمودار ہوا۔

جدید سائنس کی مختصر تاریخ

یہ ایک حقیقت ہے کہ سائنس ہر قسم کے معاشرتی اور معاشی حالات میں ترقی اور فروغ نہیں پاتی تو پھر وہ کون کون سے حالات ہیں جو سائنس کی نشو و نما کے لیے سازگار ماحول فراہم کرتے ہیں؟ اس اہم ترین سوال کا جواب تاریخ کے مطالعے کے بغیر نہیں دیا جا سکتا۔

جدید سائنس کے دور کا آغاز فقط چار سو سال پہلے یورپ میں ہوا ۱۷ویں اور ۱۸ویں صدیاں یورپ میں صنعتی انقلاب، سیاسی انقلاب اور روشن خیالی کا دور تھا۔ ڈیکارٹ، نیوٹن، والٹیر، روسو، ڈیڈرو، کانٹ، بے شمار ایسے مفکرین اور سائنس داں پیدا ہوئے جنھوں نے معاشرے کے افکار اور اقدار کا رُخ بدل دیا۔ اس دور سے قبل کلیسا کے ہزار سالہ دورِ اقتدار نے یورپ کو علوم و فنون سے بیگانہ کر دیا تھا اور ہر سمت تعصب، تنگ نظری اور توہمات کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ قدیم زمانے کے عیسائی مفکر اور پروہت سینٹ آگسٹین کا فلسفہ عقیدے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اُن کی تحریروں میں پُرزور انداز سے خبردار کیا گیا تھا کہ بنی نوع انسان کو جن معلومات کی ضرورت ہو سکتی ہے وہ انجیل کے اوراق میں نقش ہیں۔ انھوں نے سختی سے تلقین کی تھی کہ دنیاوی علوم کو مذہبی علوم کے تابع ہونا چاہیے ورنہ ان کے بقول، انسان کبر و غرور کا شکار ہو جائے گا۔

اپنی آمریت برقرار رکھنے کی خاطر کلیسا نے عقل اور خرد پر پہرے بٹھائے ہوئے تھے اور کسی کی مجال نہ تھی کہ کلیسائی عقائد سے سرمو اختلاف کرے۔ ہر جگہ مذہبی عدالتیں قائم تھیں جن کے فیصلوں کی نہ داد تھی نہ فریاد۔ چنانچہ لاکھوں بے گناہ بے دینی اور جادوگری کے جرم میں گرفتار ہو گئے۔ ان کو ٹکٹکی پر باندھ کر پہلے کوڑے لگائے جاتے تھے، پھر ان کی ہڈیاں توڑ دی جاتی تھیں اور لاشوں کو سڑکوں پر گھسیٹا جاتا

تھا۔ مُردوں کو بھی بخشا نہیں جاتا تھا۔ مشہور زمانہ آرچ بشپ اُشر ایک کلیسائی پروہت تھے جنھوں نے انجیل کے مطالعہ سے اخذ کیا کہ زمین بروز اتوار ۲۳ر اکتوبر ۴۰۰۴ بی سی (قبل مسیح) کو بنائی گئی تھی۔ اس انکشاف سے کچھ سال پہلے وائکلف نامی ایک سائنس داں نے قدیم زمانے کے جانوروں کی ہڈیوں کا تجزیہ کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ زمین کم از کم دس لاکھ سال پُرانی ہے۔ اُشر کے حکم پر وائکلف کی لاش قبر سے کھود کر نکالی گئی، اس کی ہڈیوں کو پیسا گیا اور جو کچھ باقی رہا اسے دریا میں بہادیا گیا تاکہ بغاوت اور اختلاف کے جراثیم ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں۔

اس ہولناک ماحول میں علوم وفنون کیا ترقی کرتے؟ تعلیم پر کلیسا کی اجارہ داری تھی۔ لہٰذا درس گاہوں میں فقط وہی علوم پڑھائے جاتے تھے جن سے کلیسا کے عقائد کو تقویت ملتی۔ معقولات کی جگہ منقولات، درایت کی جگہ روایت اور اجتہاد کی جگہ تقلید۔ کسی استاد کو شرعی احکام پر شک کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ کلیسا کی خرد دشمنی نے ذہنوں کو مفلوج کر دیا تھا اور اسی سبب اسلامی تہذیب کے شاندار سائنسی کارناموں سے یورپ عرصۂ دراز تک مستفید نہ ہو سکا۔ اس کے باوجود یورپ میں سائنسی تجربات عربی تصانیف کے لاطینی ترجموں کے بعد ہی شروع ہوئے۔ اس دور کے ممتاز سائنس داں روجر بیکن نے ابن ہیثم کی بصریات پر تجربے شروع کیے تو کلیسا کی طرف سے باقاعدہ نگرانی شروع ہو گئی۔

بیکن پر مذہبی عدالت نے الزام لگایا کہ

"تمہاری تحریروں میں عجیب وغریب خیالات پائے جاتے ہیں۔"

اور قید کی سزا سناتے وقت عدالت نے اسے تنبیہ کی کہ

"علم وحکمت کا درخت بہتوں کو شرعیات سے گمراہ کر دیتا ہے اور جہنم کے ہولناک عذابوں کی تمہید ہوتا ہے۔"

مسلمانوں کی سائنس کا طلوع اور زوال

جس زمانے میں یورپ اندھیری قوتوں کی گرفت میں تھا، وہی زمانہ مسلمانوں کے سیاسی اور سائنسی عروج کا دَور تھا۔ مشہور سائنسی رسالہ نیچر کا اقتباس پیش ہے

"آج سے ہزار سال قبل اپنے عروج کی انتہا پر عالم اسلام نے سائنس میں اور خصوصاً ریاضی اور طب کے میدانوں میں نمایاں کارنامے سرانجام دیے۔ اپنے دورِ عروج میں بغداد اور جنوبی اسپین میں یونیورسٹیاں قایم کیں جہاں تحصیل علم کے لیے ہزاروں افراد جوق در جوق آتے تھے حاکموں کے گرد سائنس دانوں اور فن کاروں کا مجمع ہوتا۔ آزاد خیالی کی فضا میں یہودی، عیسائی اور مسلمان باہم مل کر کام کر سکتے تھے۔ آج یہ سب بس ایک یادِ رفتہ ہے"

[انگریزی سے ترجمہ]

مسلمان مفکروں نے ارسطو، سقراط، افلاطون اور دیگر یونانی فلسفیوں کے علم کا بغور مطالعہ کیا تھا اور اسی لیے اس میں وسعت اور جدّت پیدا کر سکے۔ ان عظیم کارناموں کی تفصیل یہاں پر دینا ضروری نہیں ہے۔ البتہ بیشتر مغربی مورخین بھی اقرار کرتے ہیں کہ مسلمان سائنس دانوں نے ایک بہت اہم کردار ادا کیا تھا مگر اس زمانے کی سائنسی ترقی کے اسباب اور محرکات کیا تھے، اس مختصر مضمون میں کوئی مفصل تجزیہ پیش نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ یاد رہے کہ تجارت اور جنگی فتوحات کے باعث مسلمانوں کا معاشرہ مالی طور پر خاصہ خوش حال تھا۔ جس کی وجہ سے ایک ایسا طبقہ وجود میں آسکا جو علم وفن کے اعلیٰ ذوق کا حامل تھا۔ روشن خیالی اور رواداری اُس معاشرے کی پہچان تھی۔ جب تک کسی نہ کسی صدر مقام میں شہزادے اور وزرا، سائنس کی سرپرستی میں مسرت، فائدہ یا شہرت پاتے رہے مشعل راہ جلتی رہی۔

کیونکہ قدیم اسلامی سائنس کی پرورش معاشرے کے اونچے طبقوں کی مرہون منت رہی تھی، لہٰذا عوام سائنس کی روح سے قطعًا ناآشنا رہے چنانچہ طرح طرح کے شبہات نے جنم لیا جس نے بالآخر سائنس کی مخالفت کی شکل اختیار کی۔ شرفا کی حمایت نے سائنس دانوں کو ملائیت کے غیظ وغضب سے کچھ وقت تک تحفظ بخشا۔ خصوصًا المامون (۸۱۳-۸۳۳) نے معتزلوں کی تائید کی اور اُن کو اشعری اور دیگر مذہبی انتہا پسندوں سے بچایا۔ معتزلہ دعویٰ کرتے تھے کہ اسلام کی بنیاد صرف ایمان ہی نہیں سائنس اور منطق بھی ہیں۔ انھوں نے احادیث کے مستند یا غیر مستند ہونے کا فیصلہ عقلی بنیادوں پر کرنے کی کوشش کی اور یوں اشعریوں

کے غصے کا ہدف بنے۔

آخر کار مسلمانوں کی سائنس کٹر ملاؤں کی بھینٹ چڑھ گئی۔ کئی مسلمان مفکر اور سائنس داں وطن بدری پر مجبور ہو گئے اور ان میں ابن سینا اور ابن خلدون کے نام بھی ہیں۔ ابن رشد کے خلاف ان گنت کفر اور ارتداد کے فیصلے سنائے گئے تھے۔ اگرچہ مسلمانوں کی سائنس کے زوال میں بیرونی حملوں کا عنصر یقیناً شامل ہے۔ تاہم مورخین کا کہنا ہے کہ روشن خیالی اور رواداری کا ختم ہونا ایک بہت اہم وجہ تھی۔

مسلمانوں کی سائنسی نشاۃ ثانیہ کی کوششیں (۲)

کئی مسلمان مفکروں نے ماضی کی عظمتوں کا تجزیہ کیا ہے اور نشاۃ ثانیہ کی تمنا کی ہے۔ سرسید احمد خاں کو اس ضمن میں خاص مقام حاصل ہے۔ سرسید ایک دور اندیش اور روشن خیال شخص تھے۔ گو کہ آج کل کے اسکول اور کالج کی نصابی کتابوں سے ایسا تاثر نہیں ملتا۔

سرسید نے برصغیر کے مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کا اس وقت بیڑا اٹھایا جب مسلمان انگریزوں کے ظلم کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ اصلاح احوال جلد ہونا چاہیے۔ ورنہ اُن کے بقول "مسلمان سائیس، خانساماں، خدمت گار اور گھاس کھودنے والوں کے سوا اور کچھ نہیں رہیں گے۔" انھوں نے دیکھا کہ مسلمان توہم پرستی کو اصل اسلام سمجھتے ہوئے مولویوں کے پیچھے دوڑتے ہیں اور انگریزی زبان اور مغربی علوم کو نفرت سے دیکھتے ہیں۔ سرسید سے دو سو سال پہلے شیخ احمد سرہندیؒ اور دیگر مشائخ و علماء نے ریاضی اور سائنس کے خلاف فتوے سنادیے تھے اور سختی سے تلقین کی کہ مسلمانوں کی تعلیم خالصتاً مذہبی نوعیت کی ہونی چاہیے۔ مگر سرسید نے انہیں رویوں کو مسلمانوں کے ذلیل و خوار ہونے کی وجہ بتائی۔ مروجہ مذہبی تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں (۲۲)

"اب میں نہایت ادب سے پوچھتا ہوں کہ جو کتب مذہبی اب تک ہمارے ہاں موجود ہیں اور پڑھانے میں آتی ہیں ان میں سے کون سی کتاب ہے جس میں فلسفہ، مغربیہ اور علوم جدیدہ کے مسائل کی تردید یا تطبیق مسائل مذہبیہ سے کی ہو۔ اثبات حرکت زمین اور ابطال حرکت ودوری آفتاب پر جو دلیلیں ہیں ان کی تردید کس سے جا کر پوچھیں؟ پس، ایسی حالت میں ان مذہبی کتابوں کا نہ پڑھنا ان کے پڑھنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ ہاں مسلمان مرد میدان ہیں اور اپنے مذہب کو سچا سمجھتے ہیں تو بے دھڑک میدان میں آویں اور جو کچھ ان کے بزرگوں نے فلسفۂ یونانیہ کے ساتھ کیا وہ مغربیہ اور علوم محققہ جدیدہ کے ساتھ کریں تب ان کا پڑھنا پڑھانا مفید ہوگا، ورنہ اپنے میاں مٹھو کہہ لینے سے کوئی فائدہ نہیں۔"

سرسید کا موقف یہ تھا کہ منقولات کی اندھی تقلید کو رد کر کے اجتہاد اور تحقیق کا راستہ اختیار کیا جائے۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ سائنس کی دریافتوں اور ایجادوں نے کائنات کی اصل حقیقت ہم پر روشن کر دی ہے۔ سائنسی علوم سے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ قوانین قدرت کو کوئی ماورائی طاقت نہیں بدلتی۔ بلکہ دنیا میں جو کچھ وقوع پذیر ہے، خواہ اس کا تعلق مادی اشیاء سے ہو یا انسانی معاشرے سے، اس کے اسباب دنیاوی ہوتے ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کے دنیاوی مسائل دعا، تعویذ، پیروں کی جھولیاں بھرنے سے نذر و نیاز، وغیرہ سے حل نہیں ہوں گے بلکہ توہمات کا سحر توڑنے ہی سے نجات ممکن ہے۔

سرسید نے قرآن پاک کی تشریح و تاویل کا ایک طریق کار پیش کیا جو تین حصوں پر مشتمل تھا۔ اول کسی قرآنی آیت کے اصلی معنیٰ جاننے کی خاطر تمام متعلقہ عربی کے الفاظ کے تمام تر مختلف معنیٰ و مفہوم پر تحقیق کی جائے۔ دوم، کسی آیت کی ایک سے زیادہ تفسیر ممکن ہونے کی صورت میں صرف وہ تفسیر قبول کی جائے جو منطق اور سائنس کے تقاضوں کو پوری کرتی ہو۔ سوم۔ قرآن کی تاویل ابن رشد کی قائم کردہ فکری روایت کے مطابق کی جائے۔ گویا جہاں جہاں کسی قرآنی آیت سائنسی حقائق سے بظاہر متصادم معلوم ہوتی ہو، وہاں تمثیلی (ALLEGORICAL) تشریح کی جائے۔

سرسید کے طریق کار کے برعکس علماء دین فرماتے تھے کہ موجودات عالم کی جو تشریح سائنس داں کرتے ہیں وہ قرآن سے ٹکراتی ہیں مگر کلام اللہ چونکہ غلط نہیں ہو سکتا لہٰذا سائنس کی تشریحات لا محالہ غلط

ہیں۔ سرسیّد نے اس منطق کو قبول نہیں کیا۔ وہ کہتے تھے کہ موجوداتِ عالم کی سائنسی تشریحیں صحیح اور ثابت شدہ ہیں۔ لہٰذا ہم کو کلامِ خدا کے معنیٰ اور مفہوم انھیں سچائیوں سے متعین کرنے ہوں گے۔ چنانچہ انھوں نے کائنات کی تخلیق آدم وحوّا کا ہبوط، آسمانی وحی اور الہام کی اصل حقیقت فرشتے، جن اور شیطان، حشر و نشر، معراج، معجزے اور کرامات وغیرہ کی تمثیلی اور عقلی تشریحیں کیں۔ حضرت موسیٰؑ حضرت عیسیٰؑ، حضرت نوحؑ وغیرہ کے قصوں میں جو واقعات قانونِ قدرت کے خلاف معلوم ہوتے تھے وہاں عقلی تشریحیں کیں۔ اس کے بعد سرسیّد پر علما، گرجتے اور برستے رہے اور ہر طرف سے کفر اور الحاد کے فتوے لگائے گئے۔ اس حد تک کہ کعبہ شریف کے متولی نے سرسیّد کو واجب القتل قرار دیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بائیکاٹ کا اعلان کیا گیا۔ گوکہ یہ یونیورسٹی جدید تعلیم کے لیے مسلمانوں کو بہترین مواقع فراہم کرتی تھی۔

توہمات اور جدید تعلیم

اب تاریخی مطالعہ کو چھوڑ کر ہم دورِ حاضر کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ سرسیّد کے زمانے کے مقابلے میں برصغیر کے مسلمانوں کے حالاتِ زندگی یقیناً بہتر ہوئے ہیں۔ اغیار کا تسلط اب نہ رہا اور مسلمانوں کا ایک الگ ملک موجود ہے جس میں سیکڑوں تعلیمی اور تحقیقی ادارے قائم ہیں لیکن ؎

"وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں"

ملکی اداروں میں نہ تعلیم ہے نہ تحقیق۔ اتفاقاً جو تھوڑی بہت باقی رہ گئی ہے وہ بھی تیزی سے معدوم ہوتی جارہی ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نوآزاد ملک میں سائنس کا نازک پودا پنپنے کے بجائے کیوں جھلس گیا؟ اس کی نشو و نما کے لیے ایک سازگار فکری ماحول کیوں نہیں میسر ہوسکا؟ ان مسئلوں کو سمجھنے کے لیے سائنس اور توہمات کا رشتہ جاننے کی ضرورت ہوگی اور یہ کہ مروج توہمات کیوں اور کیسے برقرار رہتے ہیں۔

اپنی اساس میں سائنس توہم پرستی کی نفی ہے۔ پانی اور آگ کی طرح یہ ایک دوسرے کے لیے انتہائی مہلک ہیں۔ اگر تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ توہمات صرف انسان کی جہالت اور لاعلمی کے باعث پیدا ہوئے۔ بادل، بارش، بجلی، گرہن، قحط، بیماری، وبائیں، زلزلے اور دیگر قدرتی آفات سب کے پیچھے کسی ناقابلِ فہم ماورائی طاقت کا ہاتھ تصور کیا جاتا تھا۔ ساری مصیبتوں کا سرچشمہ بدروحیں تھیں اور ان سے نمٹنے کے لیے ہزارہا ترکیبیں ایجاد ہوئیں۔ آسیبی قوتوں کی گرفت میں ہونے کے الزام پر عورتوں کو کھمبوں کے ساتھ باندھ کر زندہ جلایا جاتا تھا۔ سانپ کا گوشت کھانا درازیٔ عمر کا نسخہ مانا جاتا تھا اور سیماب کی خاصیتیں بھی کسی پُراسرار غیبی قوت کا باعث تھیں۔ مگر جوں جوں انسان کے علم میں وسعت آتی گئی اس قسم کی ناقابلِ فہم اور پراسرار باتوں کی اصل حقیقت بھی واضح ہوتی گئی۔ نتیجتاً بھوتوں کا عقیدہ کمزور ہوگیا اور انسان میں اپنی صلاحیتوں کا احساس اجاگر ہوا۔ اگرچہ دنیا کا کوئی معاشرہ توہمات سے بالکل پاک نہیں ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جہاں اس کا پلہ بھاری ہو اور اسے معقولیت پر فوقیت حاصل ہو وہاں سماجی اور سائنسی ترقی سست رفتار ہوتی ہیں۔ کئی بیرونی ممالک کے مقابلے میں پاکستان کے معاشرے میں توہمات کو ایک غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ یہ ملک کے ہر گوشے اور ہر طبقے میں رچی بسی ہوئی ہے۔ چاہے معاملہ کھانے پینے کا ہو یا بچوں کی پرورش کا، یا شادی بیاہ کا، یا روزگار کا۔ زندگی کا کوئی پہلو ان سے محفوظ نہیں ہے۔ توہمات کا مسکن صرف گھریلو ماحول ہی نہیں بلکہ عام اخبارات، موت کا منظر، مرنے کے بعد کیا ہوگا اور "بہشتی زیور" جیسی کتابیں اور ڈائجسٹ وغیرہ، ان کو مشتہر کرتے ہیں اور تقویت پہنچاتے ہیں۔

بعض اوقات توہم پرستی کے نتائج انتہائی المناک ہوتے ہیں۔ ہاکس بے کا مشہور واقعہ ایک ایسی مثال ہے جب جذبۂ ایمانی سے سرشار عقیدت مند مکۂ معظمہ کی زیارت کی آرزو لے کر کراچی کے سمندر میں کود پڑے۔ حالانکہ تیس سے زیادہ لاشیں پانی سے برآمد ہوئیں لیکن کراچی کے ہزاروں شہریوں نے اس عمل کو خوب سراہا۔ باقی ماندہ لوگوں کی تلافی کی گئی اور ان کو پی۔ آئی۔ اے کے ذریعے منزلِ مقصود پر پہنچا دیا گیا۔ پھر وہ واقعہ ہے جس میں ایک صاحب نے خواب دیکھا جس میں ان کو حکم ہوا تھا کہ اپنے بیٹے کو قربان کردو۔ چنانچہ انھوں نے سنتِ ابراہیمؑ کی تقلید میں بیٹے کو ذبح کر دیا۔ اخبارات

میں اس آدمی کا قصہ بھی آچکا ہے جس نے قائدِ اعظم کا خواب دیکھنے کے بعد اپنے بچے کی گردن قائدِ اعظم کے مزار پر جا کر کاٹ دی۔ پھر اس بانجھ عورت کا قصہ آپ نے شاید سنا ہوگا جس نے کسی پیر کے کہے میں آکر اپنے پڑوسی کے بچے کو ذبح کر دیا اور اس کے خون سے نہائی تاکہ اولاد ہو اور آپ کو جنگ اخبار کے صفحوں سے اس مجذوب کا علم بھی ہوگا جو بائپ سے پانی چھڑک کر ہزارہا دائمی مریضوں کو شفا پہنچاتا ہے۔

ہم اس طرح کے مزید سیکڑوں اور ہزاروں قصے بیان کر سکتے ہیں بظاہر تو یہ دیوانوں کے افعال معلوم ہوتے ہیں لیکن درحقیقت یہ ایک تباہ کن سماجی مرض کی علامت ہیں۔ اگر یہ مرض ان پڑھ طبقوں تک محدود ہوتا تو بات شاید قابلِ فہم ہوتی۔ آخر صدیوں کی جمی ہوئی فرسودہ سوچ یک لخت نہیں بدل سکتی۔ البتہ یہ ضرور توقع کی جاتی ہے کہ تعلیم کے حصول سے ایسی سوچ ختم ہونے لگے گی۔ مگر یہ ایک مایوس کن حقیقت ہے کہ اعلیٰ ڈگری یافتہ لوگوں میں بھی توہم پرستی اور خرد دشمنی اکثر اوقات عین اسی شدت سے پائی جاتی ہے۔ نہ صرف سائنس پڑھنے والے طالب علموں کا رویہ غیر سائنسی ہوتا ہے بلکہ پاکستان کی درس گاہوں میں بیشتر اساتذہ خود سائنس کی روح سے نا آشنا ہوتے ہیں۔ ان حالات میں توہم پرستی اور عقل دشمنی کو تعلیم سے کوئی خطرہ لاحق نہیں بلکہ ایسی تعلیم توہم پرستی کے مرض کو اور زیادہ سخت جان بنا دیتی ہے سائنس کے نام پر یہ غیر سائنسی سوچ کی تشہیر ایک معمول بن چکا ہے۔ اس کی ایک مثال پیش ہے

حال ہی میں مجھے "فکرِ نو" نامی ایک سائنسی رسالے کا ۱۹۸۴ء کا شمارہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ رسالہ کراچی کے کسی ڈگری کالج کے سائنس کلب کا شائع کردہ ہے۔ رسالہ قابلِ ذکر صرف اس لیے ہے کہ وہ موجودہ دور کے اساتذہ اور طلبا کی مفلوک الحال فکری کیفیت کی عکاسی کرتا ہے۔ پہلے اور سب سے نمایاں مضمون کا عنوان ہے "قرآن اور سائنس" جس میں ایک سائنس کے ٹیچر نے ڈارون کے ارتقاءِ آدم کی تھیوری پر اپنے قلم سے زبردست گولہ باری کی ہے ایک دوسرے مضمون کا عنوان ہے "حیرت انگیز" جس میں متعدد معجزات اور کرامات بیان کرنے کے بعد مصنف سائنس دانوں کو للکارتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک کی بھی تاویل پیش کرے۔ گویا وہ سائنس کی تحقیق کرنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ پھر ایک اور مضمون سائنس دانوں کی زندگی کے دلچسپ واقعات کی بابت ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ بھاپ کا انجن اس وقت بنا جب جارج اسٹیفن نے کیتلی میں پانی ابلتے دیکھا اور کششِ ثقل کی تھیوری اس حادثہ کا نتیجہ ہے کہ نیوٹن باغ میں بیٹھا تھا اور ایک سیب درخت سے ٹوٹ کر اس کے سر پر گرا گویا سائنس کی ترقی محض ان حادثات اور اتفاقات کی مرہونِ منت ہے!

نئی "اسلامی سائنس" اسلام اور سائنس کی توہین ہے۔

گزشتہ چند برسوں سے توہم پرستی اور خرد دشمنی نے ایک نئی اور محفوظ رہائش گاہ کو آباد کیا ہے۔ ایک نئی قسم کی "سائنس" تیزی سے پروان چڑھ رہی ہے جس کو ناحق "اسلامی سائنس" کا نام دیا گیا ہے۔ نومبر ۱۹۸۳ء کی اسلامی سائنس کانفرنس سے جو اسلام آباد میں منعقد ہوئی تھی (اور جس پر ۴۰ لاکھ روپے صرف ہوئے) اور اس طرح کی دیگر کانفرنسوں سے ایک نیا رجحان سامنے آتا ہے جو اصل سائنس کو رد کرتا ہے اور اسے مغرب زدگی کی ایک علامت قرار دیتا ہے مغربی سائنس کا جواب ایک ایسی سائنس سے دیا جاتا ہے جس کے علم بردار ملک کے چند عظیم سائنس داں" ہیں۔

دورِ حاضر کے چند اسلامی سائنس دانوں کی عجیب و غریب خیال آرائیاں ملاحظہ فرمایئے:

پہلے ایک پروفیسر کی مثال پیشِ خدمت ہے جو فزکس کے Ph.D ہونے کے علاوہ ایک مذہبی جماعت کے لیے مبلغ کے فرائض بھی سرانجام دیتے ہیں۔ پروفیسر صاحب ATDO اور PCSIR کے سابق چیرمین ہیں اور اب بھی ملک کے سائنسی معاملات میں پیش پیش ہیں۔ ایک تازہ خبر کے مطابق وہ اقوامِ متحدہ کے سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کمیشن میں پاکستان کی نمائندگی فرما رہے ہیں۔ پروفیسر صاحب بہت سی تھیوریز کے موجد ہیں۔ ان کی ایک تھیوری میں ثابت کیا گیا ہے کہ جنت زمین سے دور بھاگتی جا رہی ہے۔ بتاتے ہیں کہ آئن سٹائن کی خصوصی نظریہ اضافیت کے اطلاق سے انھوں نے دریافت کیا ہے کہ اس حرکت کی رفتار روشنی کی رفتار سے ایک سینٹی میٹر فی سکنڈ

کم ہے۔ پھر ایک دوسری تھیوری میں سات آسمانوں کو ایٹم کی مانند بتایا گیا ہے۔ ان کے بقول جیسے ایٹم کی مختلف سطحیں ہوتی ہیں اور توانائی جذب یا خارج کرنے سے ایک سطح سے دوسری سطح تک پہنچا جاتا ہے۔ ویسے ہی ثواب یا گناہ پانے سے ایک دوسرے آسمان تک جایا جاتا ہے۔ [کراچی کے چند کالج ٹیچروں سے گفتگو کے دوران میں نے پروفیسر صاحب کی جنت والی مثال پیش کی تو ایک صاحب یک دم اس تھیوری کی صداقت کے قائل ہو گئے۔ انھوں نے مجھے للکارا کہ اسے غلط ثابت کروں۔ جواب میں میں نے عرض کیا کہ روز حساب سے قبل اس تھیوری کو کسی طرح غلط نہیں ثابت کیا جا سکتا۔ حالانکہ پروفیسر صاحب کا دعویٰ انتہائی نامعقول معلوم ہوتا ہے لیکن سائنس کے پاس کوئی ایسا آلہ نہیں جس کی مدد سے جنت کے بھاگنے کی رفتار معلوم ہو سکے۔ چنانچہ دعوے کو مسترد کرنا ممکن نہیں۔ میں اسی سبب پروفیسر صاحب کی تھیوری دراصل سائنس کی تھیوری نہیں]۔

ایک دوسرے سائنس داں کی انتہائی مفید اور حیرت انگیز تجویز پر غور فرمائیں: ڈاکٹر S.M.A. پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ انھوں نے قرآن شریف کے بغور مطالعے سے جان لیا ہے کہ جنّات ایک آزاد اور آتشی قوت ہیں۔ جن میں بے پناہ توانائی پوشیدہ ہے۔ لہٰذا وہ تجویز کرتے ہیں کہ اس آتشی قوت کو ایندھن کے طور پر استعمال میں لانا چاہیے اور یوں تیل کے بحران کا مستقل حل پایا جائے۔ پھر ڈاکٹر صاحب کے مطابق جنت ایک بلیک ہول ہے (بلیک ہول ہے ایسا ستارہ ہے جس میں سے کوئی شے برآمد نہیں ہو سکتی اور روشنی بھی اس سے باہر نہیں نکل سکتی)

آج کل پاکستان کے کتب خانوں میں ایسی کتابوں کی بھرمار نظر آتی ہے جو مذہبی استدلال سے ہر قسم کے سائنسی حقایق کی تاویل کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ ایک انجینئر کی نئی کتاب میں دعوے پیش ہے کہ جنت نہیں بلکہ دوزخ ایک بلیک ہول ہے۔ پھر ایک اسلام آباد کے رہنے والے محمد منیر صاحب ہیں جو اپنی کتاب میں کہتے ہیں کہ ایٹم کے اندر باروں کی کشش میکانیکی نہیں بلکہ روحانی ہے۔ لکھتے ہیں :

"ہمیں ان برقی باروں کو روحانی کشش سے تشکیل دیا ہوا سمجھنا چاہیے نہ کہ محض اندھی برقی مقناطیسی (electromagnetic)"

قوتوں سے جیسا کہ مادہ پرست ہمیں باور کروانا چاہتے ہیں۔ کس قدر تعجب خیز ہے کہ ایک طرف جہاں مرد و عورت کی حیثیت سے افراد ایک دوسرے سے عشق کرتے اور ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہیں۔ وہاں وہ جنس کی بنیاد پر فرق کی حقیقت سے ناآشنا ہیں" [انگریزی سے ترجمہ]

ایک آخری مثال ایک ایسے سائنس داں کی جو غیر ملکی ہے مگر جس نے اپنا مقالہ اسلام آباد کی منعقدہ اسلامی سائنس کانفرنس میں پڑھا۔ ان کے مقالے سے ایک اقتباس ذیل میں درج ہے (۵)

God cannot be one highest monad, a source where all the universal carrousel of space. high multiplicity N-1 is overstrained by congestion/stagnation/deflection under souls start and rest: a cross-point of II/N. God can be identified with the substance-free and immovable rotation axis, of time in the angle

یہ لفاظی مطلب سے بالکل عاری ہے اور اس کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا ہے البتہ سمجھنے والے حضرات نے پہچان لیا ہوگا کہ اس شخص نے اللہ تعالیٰ کا زاویہ of rotation نکالنے کی کوشش کی ہے!

بریں عقل و دانش بباید گریست۔

اسلامی سائنس داں نہ صرف سائنسی اصطلاحات بلکہ جدید سائنسی ایجادات کو بھی بروئے کار لا رہے ہیں۔ جنگ اخبار کی ایک خبر (۱۶ اکتوبر ۱۹۸۴) کے مطابق ایک ملائیشین خاتون کے صاحبزادے نے ایک "اسلامی کمپیوٹر" ایجاد کیا ہے۔ ملک کے اعلیٰ حکام نے اس کاوش کو بہت سراہا ہے اور تجویز پیش کی ہے کہ دینی مدارس ایسے کمپیوٹر سے استفادہ کریں۔ پھر ایک ڈاکٹر راشد خلیفہ ہیں جو دعوے کرتے ہیں کہ انھوں نے کمپیوٹر کی مدد سے قرآن پاک کو کلام اللہ ثابت کر دیا ہے ان کے بقول کمپیوٹر کے استعمال سے یہ معلوم کیا گیا ہے کہ بعض حروف اور الفاظ کے اعداد انیس (۱۹) سے قابلِ تقسیم ہیں ـــ یہ محض حادثاتی نہیں ہو سکتا لہٰذا وہ اسے بطور ثبوت استحقاق پیش کرتے ہیں۔ لیکن ہم ان ڈاکٹر صاحب سے

استفسار کرتے ہیں؛ کیا قرآن شریف کو آپ کے استدلال کی واقعی ضرورت ہے؟ بالفرض آپ کے کمپیوٹر یا اس کے لاجک میں کسی نقص کا پتہ چل جائے تو کیا آپ قرآن پاک کو انسان کا تحریر کردہ کہیں گے؟ اور اگر نہیں تو پھر آپ کے "ثبوت" سے کیا ثابت ہوا؟

یقیناً اس زمانے کے "اسلامی سائنس دانوں" کو یورپ کا بیتا ہوا دور خوب راس آتا۔ مورخوں کا کہنا ہے کہ اس عہدِ تاریک میں عالموں کی توجہ چڑیلوں کی شناخت، دوزخ کی ہیبت ناک اذیتوں، آسیب اور عفریتی قوتوں کی پہچان پر مبذول تھی۔ منطق کے حوالے سے بحث کی جاتی تھی کہ کیا خدا ایسا پتھر بنا سکتا ہے جو وہ خود نہ اُٹھا سکے یا ایک ایسی چھڑی جس کا صرف ایک ہی سرا ہو؟ پھر ایک سوئی کی نوک پر کتنے فرشتے بیک وقت کھڑے ہو سکتے ہیں؟ اگرچہ ہم ان کو بیکار اور بیہودہ سوال سمجھتے ہیں لیکن اس زمانے میں ان کے جوابات سختی سے منوائے جاتے تھے اور اس شخص کی خیر نہ ہوتی جو اختلاف کی مجال کرتا۔

نئی "اسلامی سائنس" کا تعلق درحقیقت نہ سائنس سے ہے اور نہ اسلام سے۔ یہ خرافات صرف عقل کی نفی اور توہمات کا مظہر ہیں۔ اگرچہ ظلمت کے پرچاری اور رفبلی دنیا کے ہر ملک میں بستے ہیں۔ تاہم پاکستان کے برعکس انھیں ہر ملک میں اونچے عہدوں سے نوازا نہیں جاتا، نہ سائنس کی تعلیم و تحقیق اُن کے سپرد کی جاتی ہے اور نہ اُن کو عالمی سطح کی کانفرنسوں میں نمائندگی سونپی جاتی ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نئی اسلامی سائنس نے ایسا رُخ کیوں اختیار کیا ہے جو فضولیات سے بھرپور اور معقولات سے عاری ہے اس کے محرکات کیا ہیں اور یہ کس فلسفے پر استوار ہے؟ ہمارے خیال میں ایک بہت بڑی وجہ نری موقع پرستی ہے۔ ملک کی مروجہ فکری کیفیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے بعض افراد اپنے ذاتی مفادات کو آگے بڑھانے کی متواتر کوشش کرتے ہیں۔ انھیں علم ہے کہ اصل سائنس کے حدود میں رہتے ہوئے سائنسی تحقیق کرنا ایک دشوار عمل ہے۔ لہٰذا سستی شہرت کی خاطر وہ اپنا اُلو بھی مگر انتہائی نامعقول تھیوریوں کو اسلامی کہہ کر پیش کرتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف ایسے افراد بھی کم نہیں جو اپنے کیے کو حق بجانب اور قابلِ ستائش تصور کرتے ہیں۔ وہ ایک ایسے فلسفے کے قائل ہیں جس میں مغرب کی اندھی دشمنی کو ایک مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ اس فلسفے کی تشریح ہم ذیل میں کرتے ہیں۔

علمائے کرام اور جدید سائنس

گزشتہ چند سالوں میں ملک کے فکری ماحول میں ایک اہم تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ یہ روز افزوں انداز میں سائنس کو ایک نظریاتی معتوب قرار دیا جاتا ہے اور اسلامی سائنس کو مغربی سائنس سے علیحدہ اور برتر بتایا جاتا ہے۔ ایسے افکار جماعت اسلامی کی مطبوعات میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ مثلاً محترمہ مریم جمیلہ، جو اس تنظیم کی ایک اہم دانشور کہلاتی ہیں، لکھتی ہیں:

"جدید سائنس کی رہنمائی نری مادہ پرستی اور غرور پیدا کرتی ہے نہ کہ اخلاقی قدریں۔ انہی برائیوں نے علم کی تمام شاخوں اور اس کی اخلاقیات کو آلودہ کر رکھا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کا مکمل انحصار ایسی اقدار اور مطمحِ نظر پر ہوتا ہے جو سائنس دانوں کو عزیز ہوتے ہیں۔ اگر جڑیں سڑی ہوئی ہوں تو درخت بھی سڑا ہوا ہوگا اور نتیجتاً اس کے ثمر بھی سڑے ہوئے ہوں گے۔"

[انگریزی سے ترجمہ]

محترمہ جمیلہ کے بقول مغربی سائنس مادہ پرستی اور گھمنڈ پر استوار ہے اور اسی سبب وہ الحاد اور لادینیت پر اکساتی ہے۔

• جماعتِ اسلامی کے بانی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بھی مغربی سائنس سے بیزار تھے۔ مولانا صاحب اپنی ایک تحریر میں شکایت کرتے ہیں کہ جغرافیہ، طبیعیات، کیمیا، حیاتیات، حیوانات، ارضیات، معاشیات اور دیگر سائنسی مضامین خدا اور رسول کا نام لیے بغیر پڑھائے جاتے ہیں اور یوں گمراہی کے باعث ہیں۔ فرماتے ہیں کہ:

"جدید تعلیم و تہذیب کے مزاج اور اس کی طبیعت پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت کے بالکل منافی ہے۔ آپ نوخیز نسلوں کو فلسفہ پڑھاتے ہیں جو کائنات کے مسئلے کو خدا کے بغیر حل کرنا چاہتا ہے۔ آپ اُن کو وہ سائنس پڑھاتے

ہیں جو معقولات سے منحرف اور محسوسات کا غلام ہے
آپ اُن کو معاشیات، قانون اور تمام علوم عمرانیہ کی وہ تعلیم
دیتے ہیں جو اپنے اصول سے لے کر فروع تک اور نظریات
سے لے کر عملیات تک اسلام کے نظریات اور اصول سے
یکسر مختلف ہے۔ اس کے بعد کس بنا پر آپ یہ امید رکھتے
ہیں کہ ان کی نظر اسلامی نظر ہو گی؟"

سید مودودی صاحب تمام برائیوں کا سدّ باب ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔(۸)

"یہ ساری خرابی دینی اور دنیوی علوم کی تقسیم کا نتیجہ ہے اور
جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں یہ تقسیم بالکل اسلامی نقطہ
نظر کے خلاف ہے۔ نئے نظام تعلیم میں دینیات کے الگ
کورس کی ضرورت نہیں بلکہ سارے کورس کو دینیات
کے کورس میں تبدیل کر دینا چاہیے۔"

قرآن پاک کی تشریح اور تاویل کے معاملے میں سرسید اور مولانا مودودی کے خیالات میں واشگاف فرق ہے۔ سرسید کا موقف تھا کہ کلام اللہ کے معنی اور مفہوم سائنس کی ثابت شدہ حقیقتوں کی روشنی میں متعین کرنے ہوں گے۔ اس کے برعکس مولانا صاحب کا نقطہ نظر تھا کہ اگر سائنسی مشاہدات اور قرآنی تشریحات میں کوئی ٹکراؤ نظر آئے تو اُن مشاہدوں پر ہی شک کرنا چاہیے۔

اس طرح کے خیالات جماعتِ اسلامی کی حد تک محدود نہیں ہیں، بلکہ ان سے ملتے جلتے افکار باقی اسلامی ممالک میں بھی پائے جاتے ہیں مثلاً ایران کے سید حسین نصر صاحب بخوشی اقرار کرتے ہیں کہ اسلام جدید سائنس کو رد کرتا ہے۔ لندن سے شائع کردہ ایک کتاب میں وہ فرماتے ہیں(۹)،

"یہ حقیقت کہ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی نے اسلامی معاشرے
میں پرورش نہیں پائی کسی فرسودگی کی علامت نہیں جیسا کہ
دعویٰ کیا جاتا ہے بلکہ اسلام کی طرف سے ہر قسم کے خالصتاً
سیکولر علم کو قبول کرنے سے انکار کا نتیجہ ہے۔"

[انگریزی سے ترجمہ]

گویا سید نصر صاحب کے بقول، اسلام تمام ایسے علم کو فوراً مسترد کرتا ہے جن کی نوعیت مذہبی نہ ہو۔ شاید یہی سبب ہے کہ ایک اسلامی جریدہ جو لندن سے شائع ہوتا ہے، پروفیسر عبدالسلام کی کمزور اور برق مقناطیسی Weak & Electromagnetic قوتوں کے اتحاد کو مسترد کرتا ہے کیونکہ اس جریدے کے بقول، پروفیسر سلام "بدعتی صوفیوں کے عقیدۂ وحدت الوجود" کے پیروکار بن گئے ہیں۔(۱۰)

اگرچہ یہ مضمون پاکستان کی سائنسی صورت حال کی بابت ہے لیکن اس کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا کہ بعض اسلامی ممالک میں جدید سائنس کی مخالفت اور بھی زیادہ شدت سے کی جاتی ہے۔ اب سے چند ماہ قبل ایک اعلیٰ سطح کی کانفرنس کویت میں منعقد ہوئی تھی جس میں عرب کی سترہ یونیورسٹیوں کے ریکٹروں نے شرکت کی۔ کانفرنس کا مقصد تھا کہ ان مسائل پر غور و خوض کرنا جو سائنس اور ٹیکنالوجی کے حصول کو متاثر کرتے ہیں۔ مگر فقط ایک ہی مسئلہ زیر غور رہا کہ آیا سائنس اسلامی ہے یا غیر اسلامی۔ ہمارے سعودی برادران کی متفقہ رائے تھی کہ ٹیکنالوجی کا حصول درست اور اسلامی ہے مگر خالص سائنس لادینیت کی جانب اکساتی ہے اور اس کی زیادہ حوصلہ افزائی نہ کی جائے۔

معاشی تقاضے اور سائنسی ترقی

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ سائنس کی اساس آزاد خیالی، انسانی تجسس، منطقی سوچ اور قوت تخلیق ہے۔ چنانچہ سائنس کو فروغ دینے کے لیے اسے تمام نظریاتی بندشوں سے آزاد کرنا ہوگا۔ لیکن یہ گمان کرنا غلط ہوگا کہ سائنسی ترقی یا عدم ترقی صرف سوچ کی آزادی ہی سے وابستہ ہے۔ کیونکہ فکری معاملوں کے علاوہ سائنس کا معاشرے کی پیداواری ضروریات سے گہرا تعلق ہے۔

یہ فرض کیجیے کہ آپ کسی بڑے کارخانے کی سیر کر رہے ہیں۔ ہر جانب بڑی بڑی خودکار مشینیں انتہائی نفاست اور مستعدی سے مصروفِ عمل ہیں۔ بائلروں میں پانی کے لاکھوں گیلن گردش کرتے ہیں اور ارد گرد کے بے شمار آلات، بجلی کے ساز و سامان اور چھوٹی رنگ برنگی بتیوں کا ایک عجیب و غریب منظر ہے۔ ٹیکنالوجی کے اس شاہکار کو دیکھ کر آپ سوچتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان نے ایسا کارنامہ انجام

ہو؟ یقیناً یہ کسی ایک ذہن کی تخلیق نہیں بلکہ ہزاروں افراد نے برسوں کی ...ن کے بعد اس کارخانے کے مختلف اجزا اور پرزے ایجاد کیے۔ اگرچہ ...ں منظر سے بجا طور پر مرعوب ہوتے ہیں لیکن اصل کمال صرف یہ نہیں ...ہے کہ اس جیسے کارخانوں کی تخلیق و تعمیر کے لیے ایک بہت وسیع ...پیچیدہ سماجی و معاشی نظام درکار ہوتا ہے۔ ایک طرف سرمایہ ...، خام مال کا حصول، تیار شدہ مال کی تقسیم اور دیگر اہم انتظامات ...ضرورت ہے۔ دوسری طرف انجینئرنگ اور سائنس کی اعلیٰ تدریس ...لیے ایک مکمل اور معیاری تعلیمی نظام کا ہونا لازمی ہے لیکن اگر ...خانوں کے تمام اجزاء اور پرزے غیر ممالک کے بنے ہوئے ہوں تو ...، معیاری تعلیم و تدریس کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی۔ نتیجتاً اعلیٰ ٹیکنالوجی ...امد کرنے کے باوجود وہ ملک ہنرمندوں سے خالی رہتا ہے

گزشتہ دس سالوں سے پاکستان کی معیشت زبردست تغیر اور ...یلی کے دور سے گزر رہی ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ مشرقِ ...ٰی میں مقیم پاکستانی تارکین وطن کی ارسال کردہ رقوم کے باعث ملک ...ے خوش حال ہوا ہے اور ٹیکنالوجی کے حصول کی رفتار خاصی تیز ہوئی ...۔ کھیتوں میں ہل کے بجائے ٹریکٹر نظر آتے ہیں اور رہٹ کی جگہ ...ب دیل شہروں میں پلازا اور اونچی اونچی عمارتیں زیر تعمیر ہیں اور ...ی سی۔ آر ریڈیو کی طرح عام ہوتا چلا جا رہا ہے۔ جہاں تانگے چلا ...تے تھے وہاں جاپانی سوزوکی ویگنیں دوڑتی ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ...ہے کہ ملک کی ایک بالکل نئی صورت تشکیل ہو رہی ہے لیکن اس ...دیت اور حصول ٹیکنالوجی کی بڑھتی ہوئی روش کے باوجود ملک ...ں سائنس کا معیار و وقار بلند نہیں ہوا ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنا ...یادہ مشکل نہیں۔ مغربی ممالک کی سیاسی تحویل میں ہونے کے باعث ...کستان کی سرزمین ایک کھلی منڈی رہی ہے۔ جدھر امریکہ، یورپ ...ر جاپان سے ہر قسم کی چھوٹی و بڑی درآمد شدہ اشیا فروخت ہوتی ...یں۔ ان حالات میں ملک کے سرمایہ دار صنعتوں میں سرمایہ کاری ...رنے سے جھجکتے ہیں۔ کیوں کہ انھیں اندازہ ہے کہ کھلی منڈیوں میں ...و مغرب کے کارخانہ داروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں۔ اسی لیے ...ی سرمایہ بیرونی ممالک یا غیر صنعتی شعبوں کا رخ کرتا ہے۔ نتیجتاً عرب ممالک کی طرح پاکستان بھی ان ملکوں میں شمار ہونے لگا ہے جو محض ٹیکنالوجی کے صارفین ہیں۔ معاشی اور سیاسی عوامل کے باعث ان ملکوں میں خود مختار اور آزادانہ ترقی کی راہیں تنگ ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو سازگار حالات فراہم نہیں ہو سکتے جس کی وجہ سے معاشرے کی سائنس اور عقل دشمن قوتوں کو مزید تقویت پہنچتی ہے۔

ایک نئی تحریک کی ضرورت ہے۔

آخر میں ہم اس بات پر پھر زور دیتے ہیں کہ سائنس کی ترقی کے لیے سازگار ماحول کا ہونا اشد ضروری ہے۔ بین الاقوامی اداروں کے سامنے جھولی پھیلانا، یا نئے نئے تعلیمی اور تحقیقی اداروں کی تعمیر کرنا، یا ذریعہ تعلیم کو انگریزی سے اردو کرنا یا اردو سے انگریزی کرنا یا نصابی کتب میں ردوبدل کرنا، سب کے سب ناکافی ہیں۔

لیکن اصل نجات کی راہ اس سے کہیں زیادہ کٹھن ہے کیونکہ معاشرے کی اقدار اور روایات اس طرح سے بدلنی ہوں گی کہ روشن خیالی، رواداری اور آزادی فکر و تحریر معاشرے کا بنیادی جزو بن سکیں۔

منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے عوام الناس کو ہر صورت میں سائنس کی روح سے آشنا کرنا ہوگا تاکہ وہ مروجہ توہمات کا مقابلہ عقل و دانش کی طاقت سے کر سکیں۔ ان کے ذہن کے دریچے علم کی روشنی کے لیے کھل جائیں اور ان میں اپنی صلاحیتوں کا احساس اجاگر ہو۔

سائنس کو مقبول عام کرنے کے لیے ہمیں ملک کی درس گاہوں پر انحصار نہیں کرنا چاہیے، ایک الگ تحریک کی ضرورت ہے جو پاکستان کے شہروں اور گاؤں کے عوام میں وسیع پیمانے پر سائنس اور سائنسی سوچ کو عام کرے۔ ایک مشعل ہمارے لیے پہلے سے موجود ہے۔ ہندوستان کی عوامی سائنسی تحریک KSSP گزشتہ ۲۲ سال سے صوبہ کیرالہ کے گاؤں اور شہروں میں مصروف کار ہے۔ اس کے بانی چند دانشور تھے لیکن اب یہ تحریک ۸۰۰۰ سے زائد کارکنوں پر مشتمل ہے اور اس کی سرگرمیاں ہر سال تیز ہوتی جا رہی ہیں۔ KSSP نے عام فہم سائنس کی

۴۰۰ مختلف کتابیں شائع کی ہیں اور ۲۰ سائنسی رسالے باقاعدگی سے چھپتے ہیں۔ صرف بچوں کے سائنسی رسالے کی ۳۰۰۰۰ کاپیاں ماہوار تقسیم ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ KSSP نے عوام میں دلچسپی پیدا کرنے کی خاطر کئی سائنسی میلوں کا اہتمام کیا ہے۔ اسکولوں کے نصابات میں ترمیم کی پیشکش کی۔ صحت اور طب پر خصوصی پروگرام شروع کیے اور صنعتوں کی پیدا کردہ آلودگی کے مسائل کو منظر عام پر لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

پاکستان کے عوام کو بھی ایک نئی راہ پر چلنے کی ضرورت ہے۔ فیض مرحوم کے بقول ؎

اب صدیوں کے اقرار اطاعت کو بدلنے
لازم ہے کہ انکار کا کوئی فرمان اُترے
اس فرمان کا نام سائنس ہے اور صرف اسی کی مدد سے ہم!
ام دقیانوسی اور فرسودہ روایات کو ترک کر سکیں گے۔

اظہار تشکر

اس مقالے کی تیاری کے دوران ڈاکٹر عبدالحمید نیر سے تبادلۂ خیال مفید اور کارآمد رہا اور مصنف اُن کا بہت ممنون ہے۔

حوالہ جات

۱تا۲ دین اور سائنس کے موضوع پر سرسید کے خیالات سبط حسن کی کتاب نوید فکر میں بہت فصاحت سے بیان کیے گئے ہیں۔

۳ مقالاتِ سرسید - جلد اول - ص ۹۷-۹۸ - لاہور - ۱۹۶۲ء

4. God Universe, and Life" Mohammed Munir, Page 45, Islamabad 1983

5. Abstracts of Papers, International Conference On Science in Islamic Polity - Its Past Present and Future. Page 82.

6 Modern Technology and the Dehumanization of Man" Maryam Jameelah, Page 8, LAHORE. 1983

۷ تعلیمات۔ ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامک پبلشرز لاہور، ص ۲۰۔

۸ ایضاً ایضاً ص ۹۳

۹ پروفیسر عبدالسلام، اسلامی ممالک میں سائنسی و تکنیکی ترقی - "ماضی حال اور مستقبل" مترجمہ ڈاکٹر انیس عالم لاہور - پاکستان

10. The Encounter of Man with Nature" Seyyed Hossein Nasr, Geog Allen and Unwin Ltd, London. 1968- Page 94

اچھا استاد

محمد اسحاق*

ایک پرانا لیکن سچا قصہ یوں ہے کہ کوئی مہتمم تعلیمات ایک تحتانیہ مدرسے
، معائنہ کے لیے تشریف لے گئے۔ بچے ہیں کہ شور و شغب اور کھیل کود میں مصروف
ں۔ استاد ہیں کہ بیٹھے تماشہ دیکھ رہے۔ مہتمم صاحب کو غصہ آنا ضروری تھا۔ کہا
لوی صاحب! میں چاہتا ہوں کہ مدرسے میں پن ڈراپ سائلنس ہو"۔ استاد
، جواب دیا۔ ایسی خاموشی آپ کو صرف قبرستان میں مل سکتی ہے۔ یہ بچوں کا
ر زندگی کا مدرسہ ہے۔

استاد کو دو فائدے ایسے حاصل ہیں جو کسی بڑے سے بڑے
دی کو حاصل نہیں۔ ایک تو اس کا تعلق راست زندگی، ابھرتی، اچھلتی پھرتی،
بلتی کودتی زندگی سے ہوتا ہے۔ طلبا چاہے بچے ہوں کہ بڑے ان کی بے پناہ
انائیاں، جذبات، شوخیاں اور شرارتیں اس عمل کی فضا کو بے حد حسین بنائے
لتی ہیں۔ استاد کا تعلق راست اس بجلی کے تار سے ہوتا ہے جس کی وجہ یہ
ں کے دل و دماغ کی روشنی تیز ہوتی جاتی ہے اس کی روح اور جذبات
ایسی غذا ملتی ہے جس سے وہ سرشار رہتا ہے۔ دوسری بات جس
ے دوسرے اکثر محروم رہتے ہیں وہ "جذبۂ اظہار" ہے۔ بہت سے قابل ترین
ل ہیں جو کسی دفتری کام یا کاروبار میں لگ گئے ہیں۔ انھیں اپنے خیالات و
ہات کے اظہار کا شاید ہی کبھی موقع ملتا ہو۔ ان کی باتیں ان کے دل ہی میں رہ
تی ہیں۔ وہ ایک قسم کی گھٹن محسوس کرنے لگتے ہیں۔ شخصیت کی نشو و نما کے لیے
لہار بھی ضروری ہے اور استاد کو یہ موقع ساری عمر نصیب رہتا ہے۔ وہ اپنی
امت میں سبق ہی نہیں پڑھاتا بلکہ سبق کے دوران میں وہ اپنے دل کی بات
کچھ اس طرح پہنچا دیتا ہے جو طلبا کی شخصیت کے نکھار اور ابھار کے لیے وہی
بات اس کی زندگی کا اثاثہ بن جاتی ہے۔ اس کی ایک اچھی مثال شیر کشمیر شیخ عبداللہ
نے اپنی سوانح حیات "آتشِ چنار" میں دی ہے۔ وہ اپنے قیام علی گڑھ
کا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں؛

"وہ واقعہ مجھے کبھی نہ بھولے گا جو ہمارے استادِ فلسفہ، ایم
ایم شریف کی ذات سے وابستہ ہے۔ انھوں نے ایک
بار طلبا، سے خطاب کیا، انھوں نے نصیحت کی کہ اپنے جائز
حقوق کے لیے کسی سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ ان کی زبان میں
ایک رعد کی سی کیفیت تھی اور یہ بات اُن کی زبان سے نکلی
اور میرے دل میں تراز و ہو گئی۔ ۔ ۔ ۔ میں نے زندگی
کے مشکل مرحلوں میں اسے یاد کیا ہے۔"

اچھا استاد پڑھانے میں بھی استاد ہوتا ہے۔ وہ اپنے مضمون
میں نہ صرف کمال پیدا کرتا ہے بلکہ مختلف طریقہ ہائے تعلیم سے وہ اچھی طرح
واقف رہتا ہے۔ وہ اچھے اساتذہ سے بہت کچھ سیکھتا ہے اور پڑھانے
میں اپنی انفرادیت قایم رکھتا ہے۔

ماہرین تعلیم جانتے ہیں کہ پڑھانا بھی ایک فن ہے۔ بلکہ ہر اچھا سبق
آرٹ کا نمونہ ہوتا ہے۔ پڑھانا یہ نہیں کہ کوئی شخص ایک بکٹ سے پانی دوسری
بکٹ میں انڈیل دے (ہمایوں کبیر) اور نہ ذاکر صاحب کی زبان میں "استاد
کی نوٹ بک سے طالب علم کی نوٹ بک میں منتقل کر دے"۔ تعلیم کا ذریعہ

* پرنسپل سلطان العلوم کالج آف ایجوکیشن۔ حیدر آباد۔

ذہن و دماغ اور روح کے راستوں سے ہے۔ استاد کے ذہن کی رسائی طلبا کے ذہن تک ضروری ہے جو ظاہر ہے بہت پیچیدہ ہے جس کا بیان الفاظ میں آسان نہیں۔ یہ سب اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ استاد کو اپنے پیشے سے عشق ہو، اخلاص ہو، خونِ جگر دیا ہو۔ ورنہ

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

آخر استاد طلبا کو کیا دیتا ہے۔ وہ سب اسباق جو اس نے پڑھائے ہیں وہ تو سب چند دن کے اندر اندر امتحان کے ساتھ ہی دل و دماغ سے غبارِ خاطر کی طرح اُڑ جاتے ہیں۔ صرف چند باتیں اور یادیں رہ جاتی ہیں۔ اچھا استاد طلبا میں غیر محسوس طریقے سے رواداری، دوسروں کے ساتھ رہنے بسنے، اچھے شہری بننے اور چند بنیادی اقدار سے واقف کرا دیتا ہے جیسے حسن و خوبی کی پرکھ، سچائی کی تلاش کا جذبہ اور نیکی پر عمل کرنے کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ یہی وہ سب اجزا ہیں جو شخصیت کا حصہ بن جائیں تو کلچر کہتے ہیں۔ اس کو غلام السیدین "روح تہذیب" کہتے ہیں۔ اسی کو ڈاکٹر رادھا کرشنن

"FRAGRANCE OF THE SOUL"

کہتے ہیں۔

اچھے استاد کی پہچان کسی صدر ادارہ یا ماہر تعلیم کے لیے بھی مشکل ہے۔ اس کی کسوٹی چھوٹے معصوم بچوں سے لے کر یونیورسٹی سطح کے طلبا ہی ہو سکتے ہیں۔ کسی چھوٹے بچے سے پوچھیے تمہارے ہاں کون سب سے اچھے ٹیچر ہیں، وہ فوراً نام بتا دے گا۔ اب پوچھیے ان میں کیا خاص بات ہے وہ کچھ سوچے گا، سر ہلائے گا لیکن کچھ کہہ نہ سکے گا۔ بچوں میں اپنے ٹیچر کو جانچنے اور پرکھنے کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ وہ ٹیچر کی ذات میں وہ سب کچھ دیکھ لیتے ہیں جو شاید ٹیچر بھی اپنے متعلق نہ جانتا ہو۔ ان کے نزدیک جو اچھا ہے وہی اچھا استاد ہے۔ طلبا اس کی عظمت سے واقف نہیں لیکن اس کی عزت و محبت ا[ن] کے دل میں گھر کر جاتی ہے۔ اچھے استاد کے لیے دنیا کا کوئی انعام ا[س] سے بڑا نہیں۔

استاد کو یہ عزت و شہرت بس یوں ہی حاصل نہیں ہو جاتی۔ و[ہ] خاموش اپنے پیشے میں کوئی تہائی صدی تک مصروف رہتا ہے۔ اس [کا] کام کوئی دو چار دن، دو چار مہینوں میں ختم نہیں ہوتا۔ اس کے مزا[ج] کو طوفانی ہواؤں سے کوئی نسبت نہیں۔ وہ ایک نسیم سحری ہے جو ہم[یشہ] خراماں خراماں چلتی رہتی ہے۔ نہ اس کا نام اخباروں میں آتا ہے او[ر] نہ اسے کوئی پھولوں کے ہار پہناتا ہے۔ وہ ایک گمنام اور نیک نام شخص[یت] کا مینار ہے۔ اس کا کام بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ برسوں کی عرق ریزی [کے] بعد بے ہنگم پتھروں کو تراش کر وہ ہیروں میں تبدیل کرتا رہتا ہے۔

اس کی ذات ہمدردی اور محبت کا جیتا جاگتا سرچشمہ ہوتی ہے۔ مشہور زمانہ ماہر تعلیم پستالوزی کے متعلق مشہور ہے کہ جب وہ کلا[س] روم میں داخل ہوتا تو چھوٹے بچوں کو پہلے سلام کرتا۔ کسی نے وجہ پوچھ[ی] جواب دیا ——— مجھے معلوم نہیں کہ ان بچوں میں کون بڑا فلسفی کون بڑا آدمی یا معلم انسانیت بیٹھا ہوا ہے ——— میں شاید اس وقت ان کی تعلیم کے لیے زندہ نہ رہوں گا۔

"جب سب لوگ کسی بچے کی تعلیم و تربیت
سے مایوس ہو جاتے ہیں تو پھر بھی دنیا
میں دو آدمی ایسے ہیں جو اس بچے سے مایوس
نہیں ہوتے۔ ایک اس کی ماں اور دوسرا
شفیق استاد۔"

(ڈاکٹر ذاکر حسین)

"جو آدمی کبھی اپنی رائے نہیں بدلتا وہ بند پانی کی طرح ہے، جس میں دماغی کیڑے جنم لیتے ہیں۔"

ولیم بلیک

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - ج ۷ - ش ۹ (ستمبر ۸۸ء)

دبستانِ دلی اور دبستانِ لکھنؤ کی شاعری کا ایک دوسرے پر اثر

شباب الدین★

دلی اور لکھنؤ کی شاعری ایک زمانے سے ہمارے نقادوں کا موضوعِ بحث رہی ہے اور مختلف نقادوں نے اردو کے ان دونوں دبستانوں پر مختلف انداز سے نظر ڈالتے ہوئے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کی کوشش کی ہے، چونکہ یہ مطالعے "سخن فہمی" کے لیے نہیں بلکہ "غالب کی طرفداری" کے لیے کیے گئے، اس لیے افراط و تفریط کا شکار ہو کر رہ گئے۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے ان دونوں دبستانوں کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے لیے ایک مجتہدانہ راہ نکالی اور اپنے مطالعے کا موضوع اس بحث کو قرار دیا کہ لکھنؤ کے دبستان شاعری کا دلی کے دبستان شاعری پر اور دلی کے دبستان شاعری کا لکھنؤ کے دبستان شاعری پر کیا اثر پڑا؟ مولانا مرحوم کی یہ طویل اور مبسوط تحریر اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اب تک لکھنؤ اور دلی کے دبستانوں پر جو مقالے لکھے گئے تھے وہ دونوں دبستانوں کے فرق و اختلاف کو واضح کرتے تھے اور ایک کے دوسرے سے تاثر پذیری کو ناقابلِ اعتنا سمجھتے تھے۔ غالباً مولانا عبدالسلام ندوی اردو کے وہ پہلے نقاد ہیں جنھوں نے دونوں دبستانوں کے اشتراک کو تلاش کیا اور اس بات کی نشاندہی کی کہ ایک دبستان دوسرے دبستان سے کس طرح اور کس کس انداز سے متاثر ہوا اور اس کے کیا کیا خوشگوار یا ناخوشگوار نتائج برآمد ہوئے؟ اپنے مقالے کی تمہید میں انھوں نے تحریر کیا ہے "انشا اور مصحفی کی شاعری پر قدما کا دور ختم ہو جاتا ہے اور اسی کے بعد سے متوسطین کا دور شروع ہوتا ہے۔ لکھنؤ میں اس دور کی بنیاد رکھنے والوں میں آتش اور ناسخ اور دلی میں غالب اور مومن کے نام خاص طور سے قابل۔۔۔" مولانا کے نزدیک اس دور کی سب سے زیادہ قابلِ بحث شخصیت شیخ امام بخش ناسخ کی تھی جنھوں نے بقول مولانا قدما کی سادہ روش ترک کر کے ایک جدید شاعرانہ روش اختیار کی۔ مولانا کے نزدیک ناسخ کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اردو زبان کی اصلاح کی، یوں تو وہ اس بات کے قایل ہیں کہ اصلاح زبان کا کام حاتم کے زمانے سے شروع ہو گیا تھا، جس کی تکمیل میر و سودا کے ہاتھوں ہوئی اور جو کچھ چیزیں قابلِ اصلاح رہ گئی تھیں ان کی اصلاح انشا اور مصحفی نے کی۔ مولانا کا خیال ہے کہ ناسخ سے پہلے جو اصلاحات کی گئی تھیں ان کا زبان پر چنداں اثر اس لیے نہ پڑا کہ خود اصلاح کرنے والوں نے اپنی مجوزہ اصلاحوں کی پابندی نہ کی، ناسخ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی نظری اصلاح کو عملی اصلاح کی شکل میں ظاہر کیا اور اس کی اپنے اشعار میں سختی سے پابندی کی۔

مولانا نے ناسخ کی اصلاحات کو اردو شاعری پر ان کا احسان قرار دیتے ہوئے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ

> "زبان، شعر اور شاعری الگ الگ تین لفظ ہیں اور تینوں کے معنی جُدا جُدا ہیں۔"

ان کو اس بات کا اعتراف ہے کہ ناسخ نے اردو زبان کی مکمل اصلاح کی اور اردو شعر کو ایک متوازن قالب میں ڈھالا، مگر اس کے باوجود انھوں نے اس موقع پر یہ سوال اٹھایا ہے کہ ناسخ نے اصلاح یافتہ زبان میں جو شعر کہے ہیں ان میں شاعری بھی ہے یا نہیں؟ مولانا کے نزدیک اس سوال کے جواب میں ان کا دیوان اردو غزل گوئی کا بدترین نمونہ پیش کرتا ہے۔

ناسخ کے مقابلے میں آتش کی شاعری مولانا کے نزدیک قابلِ اعتنا ہی

★ اسسٹنٹ اڈیٹر ماہنامہ تہذیب الاخلاق، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ۔

ہیں اہم بھی ہے۔ اپنے اس مقالے میں مولانا نے آتش کی شاعری سے ناسخ کی شاعری کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ناسخ جا بجا ثقیل الفاظ استعمال کرتے ہیں، فارسی اشعار کے جو ترجمے انھوں نے کیے ہیں وہ ان اشعار کے ہیں جو ترجمہ کرنے کے قابل نہ تھے۔ ایسی خیال بندی کرتے ہیں جو کوہ کندن و کاہ برآوردن کی مصداق ہوتی ہے ناسخ کے کلام کی ان خرابیوں کی نشاندہی کرنے کے باوجود وہ انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ مولانا کی اس خصوصیت کا اظہار درج ذیل اقتباس سے ہوتا ہے:

> "ان کے کلام کے بعض حصے ایسے بھی ہیں، جن میں صفائی، شستگی، سادگی، برجستگی اور کیف و اثر سب کچھ موجود ہے۔ بالخصوص اخیر عمر میں آتش کی ریس میں انھوں نے اس طرف زیادہ توجہ کی ہے۔ اس لیے ان کے دوسرے دیوان میں اس قسم کے اشعار زیادہ ملتے ہیں۔ بعض انشاپردازوں نے لکھا ہے کہ انھوں نے عمر بھر میں صرف گیارہ شعر لکھے ہیں لیکن ہمارے نزدیک اگر ان کے دیوان کا انتخاب کیا جائے تو کم از کم چار جزو کا ایک چھوٹا سا دیوان تو ضرور مرتب ہو جائے گا، جس پر غالب کو فخر تھا۔ اس موقع پر ہم ان کے چند منتخب شعر نقل کرتے ہیں"

نامہ بر ہے نازِ احباب ہے
ہائے بیداری ہے یہ یا خواب ہے

عشق جب کامل ہوا، ہے عین حسن
آگ میں پڑ جائے جو شے آگ ہے

دل کو خوش آتی ہیں صحرا کی ہوائیں پُر خار
اب کسی سرو گل اندام سے کچھ کام نہیں

نہیں ممکن غم گردوں میں ٹھہرنا میرا
مستیِ عشق سے وہ بادۂ سر جوش ہوں میں

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں
ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

بھول کر او چاند کے ٹکڑے ادھر آ جا کبھی
میرے ویرانے میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی

ایک طول طویل بحث کے بعد مولانا نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے، وہ ان کے الفاظ میں یہ ہے:

> "غرض ان کے منتخب کلام میں خواجہ آتش کی تمام خصوصیات موجود ہیں، لیکن یہ تمام پھول خس و خاشاک کے ڈھیر میں اس طرح گم ہو گئے ہیں کہ صرف ایک متجسس دیدہ ور ہی کو نظر آسکتے ہیں۔ اس لیے ان کے کلام پر صحیح تنقید وہ ہے جو مرزا غالب نے کی ہے۔ یعنی یہ کہ ناسخ کے یہاں نشتر اور آتش کے یہاں بیشتر یہ تیر و نشتر ملتے ہیں"

مولانا کے نزدیک ابھی لکھنؤ اور دلی کا رنگ کلام الگ الگ نہ ہوا تھا، اس لیے شعرائے دلی نے ناسخ کا رنگ اختیار کرنے میں کوئی تکلف نہ کیا۔ اس اثر پذیری کی سب سے زیادہ واضح مثال شاہ نصیر کے کلام میں دکھائی دیتی ہے۔ جن کے کلام کو مولانا نے ناسخ کے کلام کی صدائے بازگشت قرار دیا ہے اور اس کے بہت سارے نمونے زیر بحث مقالے میں نقل کر دیے ہیں تاکہ ان کی بات زیادہ واضح ہو سکے۔ اس کے باوجود مولانا شاہ نصیر کی اس برتری کے قائل ہیں کہ "وہ اکثر محاورات کو اس برجستگی کے ساتھ باندھ جاتے ہیں کہ طبیعت کو نہایت لطف و انبساط حاصل ہوتا ہے۔" شاہ نصیر کے علاوہ حکیم مومن خاں مومن بھی ناسخ کے رنگ کلام سے متاثر ہوئے جن کی مثالوں سے ان کا دیوان بھرا پڑا ہے۔

غالب کی جدت پسند طبیعت نے ناسخ کا رنگ کلام اختیار کرنے کے بجائے بیدل کی تقلید کرتے ہوئے اپنی ایک الگ راہ نکالی جس کے بارے میں مولانا کا خیال ہے کہ

> "یہ پہلا دن تھا کہ دلی کا شاعرانہ رنگ لکھنؤ سے بالکل الگ ہو گیا اور دور جدید کے شعرا نے اسی رنگ میں کہنا شروع کیا، لیکن بعد کو خود مرزا کو نظر آیا کہ اعلیٰ درجہ کی شاعری وہی ہے جو جذبات کو متاثر کرے اور یہ بات مضمون آفرینی اور جدت طرازی سے حاصل نہیں ہوتی۔ اس لیے انھوں نے اپنے کلام میں کیف و اثر پیدا کرنے کے لیے اخیر عمر کی روش اختیار کرلی اور ان کے کلام کا یہی حصہ پڑھنے سے دل میں ایک تڑپ پیدا ہوتی

محاکمے کے بعد مولانا نے اپنے مقالے کے دوسرے جزو کی طرف توجہ فرماتے ہوئے سب سے پہلے غزل گوئی پر نظر ڈالی ہے۔ مولانا نے عہد زیر بحث کو مجموعہ اضداد قرار دیتے ہوئے اپنی اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ ایک طرف تو ناسخ، ذوق اور شاہ نصیر نے غزل گوئی کو "ذروۂ کمال" سے گرا کر "تحت الثریٰ" میں پہنچا دیا اور دوسری طرف آتش، مومن اور غالب نے "اس کو اوج ترقی تک پہنچا دیا جو اس کے عروج کی آخری سرحد ہے۔" اس دور کی غزل گوئی پر یہ اجمالی تبصرہ کرنے کے بعد انھوں نے قصیدہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے ذوق، مومن اور غالب کے قصائد کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

"اساتذۂ دلی کے مقابلے میں اساتذۂ لکھنؤ نے قصیدہ گوئی کو مطلق ترقی نہیں دی۔"

اس لیے اس صنف شاعری میں دلی کو لکھنؤ پر تفوق حاصل ہے۔ شعرائے لکھنؤ نے قصیدہ گوئی سے جس اجتناب کا مظاہرہ کیا اس کی وجہ مولانا کے نزدیک یہ تھی کہ ان لوگوں نے اخلاقی شان سے زندگی بسر کی۔ اس لیے اگر "انھوں نے قصیدہ جیسی مبتذل صنف سخن کو ہاتھ نہیں لگایا تو اچھا کیا۔" ہم کو سخت تعجب ہے کہ مولانا نے صنف قصیدہ کو ایک مبتذل صنف کیوں قرار دیا ہے؟

اس دور کی غزل اور قصیدہ پر ناقدانہ نظر ڈالنے کے بعد مولانا نے صنف مرثیہ کو اپنے مطالعے کا موضوع بنایا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ مثنوی کے بارے میں یہ تحریر کیا ہے کہ:

"اس دور میں مثنوی اپنے پائے سے بالکل گر گئی اور اساتذۂ دلی، اساتذۂ لکھنؤ میں کسی نے بھی کوئی قابل ذکر مثنوی نہیں لکھی۔"

اردو مرثیہ نگاری پر مختصر مگر جامع طور سے بحث کرتے ہوئے انھوں نے تحریر کیا ہے کہ اس صنف سخن کو:

"انیس اور دبیر نے درجۂ تکمیل تک پہنچا دیا اور اردو [شا]عری میں ایک ایسی صنف پیدا ہو گئی جس کی نظیر سے عربی [illegible] بھی زبان بھی خالی ہے۔"

مولانا کے ن[زدی]ک [illegible] شاعری کا یہ دور انقلاب کا دور تھا۔ اس انقلاب کے بارے میں وہ رقم طراز ہیں:

"غرض یہ دور اردو شاعری کی تاریخ میں ایک دور انقلاب تھا جس میں بہت سی قدیم یادگاریں مٹ گئیں اور ان کے بجائے نئی نئی عمارتیں تعمیر ہوئیں اور ہم کو اس کے کہنے میں مطلق تامل نہیں ہے کہ ان عمارتوں کی تعمیر میں لکھنؤ نے دلی سے بہت زیادہ حصہ لیا اور دلی کے مقابل میں یہ اس کے فخر و مباہات کے لیے کافی سے زیادہ ہے۔ بالخصوص مرثیہ گوئی تو لکھنؤ کی مخصوص چیز ہے۔"

مولانا کے نزدیک متوسطین کے پہلے دور میں ناسخ اور تلامذۂ ناسخ کا رنگ کلام دلی کے شعرا پر حاوی رہا۔ لیکن اس کے دوسرے دور میں ناسخ کا اقتدار بالکل ختم ہو گیا اور دلی کے شعرا نے آتش اور تلامذۂ آتش کے رنگ کلام سے اثر قبول کیا۔

مولانا نے تلامذۂ آتش کی ایک خاص خصوصیت روانی اور برجستگی تحریر فرمائی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تلامذۂ آتش کے اس رنگ سخن سے شعرائے دلی میں مومن اور غالب کی پیچیدہ گوئی کا خاتمہ ہو گیا" اور ان دونوں حضرات کے زیر اثر ان کے تلامذہ بھی پیچیدہ گوئی کو چھوڑ کر سادگی بیان کی طرف راغب ہو گئے۔" اس طرح مومن اور غالب کے تلامذہ بھی آتش کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے" اور وہی آتش اور تلامذۂ آتش کی بولی بولنے لگے۔"

مولانا کا یہ نکتہ انتہائی باریک اور اہم ہے، اس پر نئے سرے سے مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ان تمام شواہد کو جمع کر کے آج کی تنقیدی روش کے مطابق ان سے استخراج نتائج کیا جائے تو امید ہے کہ اردو شاعری کے بہت سے مخفی گوشے بے نقاب ہو کر ہمارے سامنے آئیں گے اور بہت سے مسلمات ٹوٹ پھوٹ کر معدوم ہو جائیں گے۔ اس مقالے میں غالباً اتنی گنجائش نہ تھی کہ مولانا اور تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے، اس لیے انھوں نے صرف اشارات پر اکتفا کیا ہے۔ اگر ہم ان کے فرمودات کو مشعل راہ بنا کر تلاش و جستجو کے لیے نکل کھڑے ہوں تو شاید بہت سے گوہر نایاب ہمارے ہاتھوں میں آ جائیں۔

ایک طرف تو مولانا لکھنؤ کی شاعری بالخصوص تلامذۂ آتش کے رنگ کلام

اس مقالے میں مولانا نے بعض بڑی نادر باتیں کہی ہیں، مثلاً انھوں نے داغ کی شاعری کو تلامذۂ آتش کے رنگ کی توسیع کہا ہے یا جلال لکھنوی کو ایک منفرد انداز اور رنگ کا شاعر قرار دیا ہے اگر مولانا کے مجوزہ خاکے میں مزید تحقیق کے بعد رنگ آمیزی کی جائے تو ان دونوں دبستانوں کے بارے میں بہت سے نئے اور نادر حقائق کا انکشاف کیا جاسکتا ہے۔

حواشی

۱	مقالات عبدالسلام ندوی	دار المصنفین، اعظم گڑھ،	۱۹۶۸ء	ص ۳۲۱
۲	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص ۳۳۰
۳	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص ۳۳۲
۴	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص ۳۳۳
۵	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص ۳۴۱
۶	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص ۳۴۵
۷	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص ۳۴۸
۸	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص ۳۴۹
۹	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص ۳۴۹ – ۳۵۰
۱۰	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص ۳۵۰
۱۱	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص ۳۵۵
۱۲	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص ۳۵۹
۱۳	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص ۳۶۱ – ۳۶۲
۱۴	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص ۳۷۳
۱۵	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص ۳۷۴
۱۶	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص ۳۷۶
۱۷	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص ۳۸۸
۱۸	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص ۳۸۸

جانوروں میں جنس کی ابتدا ارتقا اور عروج

عبدالحسیب*

عالم قدرت میں نسل بڑھانے کے آلات و ذرائع ہر جاندار کو عطا کیے گئے ہیں خواہ درخت ہوں یا جانور انسان ہوں یا خورد بینی کرۂ حیات سب ہی کسی نہ کسی طرح اپنی نسل کو بڑھانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر جانداروں میں تولید و تناسل کے ذرائع بند ہو جائیں تو کچھ دنوں کے بعد یہ عالم جانداروں سے خالی ہو جائے گا۔

یہ ظاہر ہے کہ انسانی نسل کو بڑھانے کے لیے دو جنسوں کی ضرورت ہوتی ہے اور انسانوں ہی پر کیا موقوف ہے تمام اعلیٰ جانوروں میں بغیر نر و مادہ کی موجودگی کے نسل قائم نہیں رہ سکتی۔

لیکن اب ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ اس جنسی تفریق کی ابتدا کیسے ہوئی؟ ہم کو یہ تو معلوم ہے کہ صفحۂ دنیا پر کسی نہ کسی زمانے میں زندگی کا آغاز مادۂ حیات یا ایک خلیہ سے ہوا۔ تمام جاندار دفعتاً تو اس عالم میں آ نہیں گئے۔ ابتدائے عالم میں ضرور ادنیٰ جانور تشریح اور زندگی کے ہر شعبے میں ہم سے سادہ ہوتے ہوں گے۔

اسی کے ساتھ ہم کو اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ یہ جنسی تفریق جو اعلیٰ قسم کے جانوروں میں پائی جاتی ہے کوئی ایک بار تو پیدا نہ ہو گئی ہو گی بلکہ اس کا عروج بھی تدریجاً ہوا ہو گا اور واقعہ بھی یہی ہے۔

اس چھوٹے سے خورد بینی سادہ ایک خلیے کے جانور امیبا (Amoeba) حالاتِ زندگی پر غور کیجیے۔ اس میں جنس کی کسی تفریق کا تو پتہ ہی نہیں مگر اپنی نسل کو اپنے جسم کے حصے کر کے بڑھاتا ہے جیسے کہ ایک آٹے کے گولے کو بیچ سے ایک تاگے سے زور سے باندھا جائے تو وہ گولا ڈگڈگی کی شکل کا ہو کر دو حصوں میں منقسم ہو جائے گا اسی طرح امیبا کے جسم کے بھی دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ امیبا چونکہ جاندار ہے اس لیے اس کے جسم کے منقسم ہونے کے ساتھ اس کے نواۃ کا تقسیم ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔

اس کے بعد دوسرے ایک خلیے کے جانور پیرامیشیم (PARAMOECIUM) کو ملاحظہ کیجیے۔ مسئلہ ارتقا کے نظریے سے یہ جانور امیبا سے بلند ہے۔ اس میں بھی کوئی جنسی تفریق نہیں پائی جاتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اپنی نسل کو بڑھانے کے لیے دو یکساں پیرامیشیم قریب قریب آ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے سے مس ہو کر ہم جنسی مباشرت کرتے ہیں۔ اس کے بعد ایک خاص طریقے سے ان کے نواۃ کا ایک دوسرے کے ساتھ ملاؤ ہوتا ہے اور پھر یہ نواۃ سات حصوں میں منقسم ہو کر سات جانوروں کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں۔

جنسی تفریق کی ابتدا سمجھنے کے لیے اب اگر ہم ارتقاء کے ایک اور زینہ پر چڑھیں تو ہم کو ایک دوسرے ایک خلیے کے جانور ورٹی سیلا (Vorticella) کی جنسی تفریق پر غور کرنا ہو گا۔ ورٹی سیلا الٹی گھنٹی کی شکل کا ایک جانور ہوتا ہے۔ اس جانور میں اچھی خاصی جنسی تفریق نمودار ہو جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ ایک جوان ورٹی سیلا اپنے نیچے کے دم کا حصے سے پانی میں کسی چیز سے اٹکا رہتا ہے۔ اب ایک دوسری وضع کا

* سابق استاد شعبہ علم الحیوانیات۔ اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

ورٹی سیلا اُس کے قریب آکر اس سے مس ہو جاتا ہے۔ یہ دوسرا ورٹی سیلا پہلے اٹکے ہوئے ورٹی سیلا سے حسب ذیل باتوں میں مختلف ہوتا ہے۔

(۱) مقابلتاً اس کا جسم چھوٹا ہوتا ہے۔
(۲) نیچے کا دم نما حصہ موجود نہیں ہوتا۔
(۳) علاوہ اوپر کی ادنیٰ آبی جانوروں کی حرکی روئیں[1] کی ٹوپی کے اس کے جسم کے پچھلے حصے میں حرکی روئیں موجود ہوتے ہیں۔
(۴) یہ چھوٹا ورٹی سیلا اپنے دوران زندگی میں کسی ایک جگہ اٹکا نہیں رہتا بلکہ تیزی کے ساتھ پانی میں ایک جگہ سے دوسری جگہ تیرتا پھرتا ہے

پس ہم نے دیکھ لیا کہ ان دونوں ورٹی سیلا کی صورتوں اور عادتوں میں بین فرق نظر آنے لگا۔ اس چھوٹے ورٹی سیلا کو ہم نر اور بڑے کو مادہ سے تشبیہ دے سکتے ہیں کیونکہ

(۱) عام طور سے نر ہی بہ نسبت مادہ کے زیادہ ہلکا اور پھرتیلا ہوتا ہے۔
(۲) عام طور سے نر ہی اپنی خواہشات کے زیر اثر مادہ کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔
(۳) مادہ کا جسم عام طور سے بھدا اور بڑا ہوتا ہے جیسے کہ چھوٹے ورٹی سیلا کے مقابلے میں اٹکے ہوئے ورٹی سیلا کا جسم ہوتا ہے۔
(۴) مادہ عام طور سے جھول ہوتی ہے اور ایک جگہ ٹھہری رہتی ہے جیسے کہ اٹکے ہوئے ورٹی سیلا میں ہوتا ہے۔

آئیے اب ان ایک خلیے کے جانوروں میں جنسی تفریق کی ابتدا کا پتہ لگانے کے بعد دو یا دو سے زیادہ خلیات کے جانوروں پر ایک سرسری نظر ڈالیں۔

ہائیڈرا (HYDRA) میں جو کہ تالابوں وغیرہ میں پایا جاتا ہے انیشن اور بیضہ دان ایک ہی فرد میں موجود رہتے ہیں۔ جسم کے کچھ خلیات انیشن یا بیضہ دان کی خاصیت اختیار کر لیتے ہیں اور یہ خصوصی خلیات جسم کے اندر سے بدن کے کناروں پر اُبھر آتے ہیں۔

اس سے زیادہ منضبط اور صاف مثال کینچوؤں کی ہے۔ کینچوؤں میں نر اور مادہ کے اعضائے تناسل ایک ہی فرد میں ہوتے ہیں یعنی نہ تو کوئی کینچوا محض نر اور نہ محض مادہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ نر اور مادہ کے اعضائے تناسل ہمیشہ کیڑے کے مخصوص حصوں میں ہوتے ہیں۔ مثلاً بیضہ دان اور متعلقہ نلکیاں جسم کے تیرھویں اور چودھویں خانوں میں ہوتی ہیں۔ نر اور مادہ کے اعضا الگ الگ راستوں سے جسم کے باہر کھلتے ہیں اس کے ساتھ یہ بھی امر واقعی ہے کہ ایک کیڑے کا مادہ منویہ اسی کیڑے کے انڈوں کو زرخیز نہیں بنا سکتا۔ بلکہ ایک فرد کا مادہ منویہ دوسرے کے انڈوں کو زرخیز کرتا ہے۔ زرخیز کرنے سے قبل دو کیڑے جو ظاہری اور اندرونی تشریحی نقطۂ نظر سے بھی بالکل یکساں ہوتے ہیں ایک دوسرے کو چمٹا لیتے ہیں اور اس کے بعد انڈے زرخیز بنتے ہیں۔ اسی طرح سے ایسی اور سیکڑوں نر مادی جانوروں کی مثالیں ملیں گی۔ مثلاً جونک وغیرہ۔ اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک کیچوا کسی وقت بچوں کی ماں بنتا ہے اور کسی وقت وہی کیچوا باپ ہو جاتا ہے۔

خیر یہ نر مادی پن بے ریڑھ کی ہڈی کے بہت سے چھوٹے درجے کے جانوروں میں تو پایا ہی جاتا ہے مگر ایسی شاذ و نادر شہادتیں بھی ملیں گی جہاں کہ اعلیٰ ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں میں بھی جو کہ ارتقائی حیثیت سے ایک بلند درجے پر ہیں۔ کبھی کبھی یہ نر اور مادین حالت ایک ہی فرد کی زندگی کے دو مختلف اوقات میں دیکھی گئی ہے۔ مثلاً ایڈنبرا یونیورسٹی کے مشہور ڈاکٹر کریو (Crew) اپنے ایک مشاہدے کی بنا پر لکھتے ہیں کہ ایک مرغی میں جو کئی جھول انڈے دے چکی تھی اور اس کے ان انڈوں میں سے بچے بھی نکل چکے تھے۔ بڑھاپے میں مرغ جیسے پر اور عادات نمایاں ہونے لگیں۔ یہ "مرغ نما" مرغی کچھ دنوں کے بعد ایک دوسری مرغی کے انڈوں کو زرخیز بنانے میں بھی کامیاب ہو گئی۔ اور ان زرخیز کیے ہوئے انڈوں میں سے بچے بھی نکل آئے۔ پس یہ مرغی اپنے دوران زندگی میں ماں اور باپ دونوں بن گئی۔ اس کی تشریح کرنے کے بعد یہ پتہ چلا کہ بیماری کی وجہ سے اس کے بیضہ دان بالکل بیکار ہو گئے تھے اور ان کی اندرونی تہ کے خلیوں سے ایک انیشن پھوٹ آیا تھا۔

[1] حرکی روئیں (CILIA)

ہم نے دیکھا کہ ایک پرند جو کہ ارتقا کی کئی سیڑھیاں طے کر کے اپنی اس اعلیٰ حالت کو پہنچا ہے۔ کبھی کبھی اپنی دورانِ زندگی میں اپنی پچھلی ارتقائی تاریخ کے مدارج جن سے ہو کر وہ گزرا ہوگا، پھر کسی نہ کسی طریقے پر طے کرنے لگتا ہے۔

یہ امر واقعی ہے کہ اس پرند کی زندگی کے دو جنسی رُخ اور کینچوؤں کے نرمادی پن میں بین فرق نمایاں ہے۔ کینچوا اپنی پوری زندگی نرمادی حالت میں گزارتا ہے۔ جب کہ یہ بچوں کا باپ ہونے کا فرض ادا کرتا ہے اس وقت بھی اس میں بیضہ دان اپنی درست حالت میں موجود رہتے ہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ جب ایک جنس کے اعضا کام کرتے ہیں تو دوسری جنس کے اعضا اپنے کام سے رُکے رہتے ہیں لیکن اس مرغی میں ماں اور باپ بننے کی صلاحیت اس کی زندگی کے دو مختلف اوقات میں پیدا ہوئی اور جب وہ ماں باپ سے بنی تو اس کے بیضہ دان ہمیشہ کے لیے بالکل نیست و نابود ہو گئے۔ ان مشاہدات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شاید کینچوؤں کی نرمادی حالت جس میں کہ دونوں اجناس بہ یک وقت ایک ہی فرد میں ہوتے ہیں۔ ارتقائی درجوں کی سیڑھیوں کو طے کرتے ہوئے دونوں اجناس ایک دوسرے سے الگ الگ ہونے لگے۔ یہاں تک کہ ایک زمانے کے بعد دونوں اجناس میں پیدائشی تفریق ہونے لگی اور یہ دونوں مختلف اجناس اپنے ایسے عروج و انتہا پر پہنچے کہ دونوں کی زندگی میں تشریحی فرق ممتاز حیثیت سے نمایاں ہونے لگا۔ مذکورہ بالا عجیب و غریب مرغی نے تو شاید اپنے جنس کو بدل کر کینچوؤں کی نرمادی حالت کو اپنی زندگی کے دو مختلف ادوار میں پیش کیا اور جنسی تفریق کے ارتقا کی بکھری ہوئی کڑیوں میں ایک اور سلسلہ پیدا کرنے کی طرف ایک اشارہ سا کیا۔

مینڈکوں، چڑیوں اور دودھ پلانے والے جانوروں کو دیکھیے دونوں جنسوں میں کتنا بین اور ممتاز فرق پایا جاتا ہے۔ علاوہ اعضاء تولید و تناسل اور دیگر متعلقہ نلکیوں کے بہت سی ضمنی جنسیاتی تفریقات بھی نظر آتی ہیں، مثلاً نر اور مادہ کی آوازوں میں فرق مرد کی مونچھیں اور داڑھی، عورتوں اور مردوں کے اطوار اور عادات میں اختلاف وغیرہ وغیرہ۔

ہم کو یہ معلوم ہے کہ انسان کا درجۂ ارتقائی نقطۂ نظر سے نہایت بلند ہے۔ اس میں اجناس کی تفریق نہایت ممتاز اور بین ہے اور اعضائے تناسل اور متعلقہ نلکیاں نہایت مکمل اور منضبط ہوتی ہیں۔

اب اگر ہم انسان کی جنسی تفریق کے مکمل ہونے اور اس کی شہوانی تحریک کے ارتقا پر ایک نظر ڈالیں تو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ انسان باوجود اشرف المخلوقات ہونے کے اپنی زندگی وہی ایک سادہ خلیہ سے شروع کرتا ہے۔ اس خلیے میں کوئی ظاہری جنسی عنصر نظر نہیں آتا۔ جب یہ خلیہ آہستہ آہستہ جنین کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے تو اس میں نر یا مادہ اعضاءِ تولید و تناسل کا نمو شروع ہو جاتا ہے اور جنین کے مکمل ہونے کے ساتھ یہ اعضا بھی تکمیل کو پہنچ جاتے ہیں لیکن ابھی تک اس میں شہوانی جنسی خواہشات پیدا نہیں ہوتیں۔

جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس میں نر یا مادہ کے تمام اعضاء تناسل مکمل ہوتے ہیں۔

اب ایک سوال یہ ہے کہ آیا باوجود ان مکمل اعضاء تناسل کے بچہ میں شہوانی تحریکات پیدا ہو جاتی ہیں یا نہیں۔ عام طور سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ بچوں میں بالغ ہونے تک شہوانی خواہشات نہیں پائی جاتیں لیکن حال میں نفسیات کے ماہر ڈاکٹر فراڈ (FREUD) نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس میں شہوانی لہریں موجود ہوتی ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ شہوانی لہریں اس وقت اعضاء تناسل یا اس کے اردگرد جمع نہیں ہوتیں یا وہ مباشرت کی صورت میں اپنا اظہار نہیں کرتیں۔

(۱) شہوانیت کی نشوونما کا پہلا درجہ "خود عاشقانہ پیار" Autoerotism (EROTISM) کا ہے۔ اس درجے کے دوران میں بچہ خود اپنے جسم کی عاشقانہ دھاریوں یا حصوں سے اپنی شہوانیت کو بجھاتا ہے۔ ان حصوں میں

> اور اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرو اور اسی کے فرمان بردار بن جاؤ (مگر) اس وقت کے قبل ہی کہ تم پر عذاب آ نازل ہو (اور) پھر تمہاری مدد نہ کی جا سکے۔
>
> (سورۃ زمر آیۃ ۵۴)

اعضا، تناسل کو بھی شمار کیا جاسکتا ہے لیکن بچوں میں یہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ پہلے عاشقانہ دھاریاں ہونٹوں میں نشو و نما پاتی ہیں۔ کیوں کہ پہلے بچے کے ہونٹوں ہی کا تعلق ماں کے پستان سے وابستہ ہوتا ہے۔ ہم لوگ روزانہ یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ روتے ہوئے بچے کے منہ میں چوسنی دے دینے سے ان کو ایک قسم کی تسکین سی ہو جاتی ہے اور یہ صرف اس لیے کہ چوسنی کے چوسنے سے بغیر کسی غذائی مدد کے بچوں کو ایک خاص قسم کا مزہ حاصل ہوتا ہے اور یہ لطف ان کے ہونٹوں کی فطری شہوانی تحریک کو اطمینان دیتا ہے۔ اسی وجہ سے بچے اپنے انگوٹھوں کو بھی چوسا کرتے ہیں یا وہ کسی کھلونے کو منہ میں ڈال کر چوستے رہتے ہیں۔ اس درجہ پر گو کہ بچہ خود اپنے جسم سے اپنی شہوانی خواہشات کو عمل میں لا کر ان سے لطف حاصل کرتا ہے۔ مگر وہ اس بات کو محسوس نہیں کرتا کہ جس سے وہ لطف حاصل کر رہا ہے وہ خود اسی کا جسم ہے۔

۲۔ شہوانیت کی نشو و نما کا دوسرا درجہ جہاں بچہ کہ اپنی عاشقانہ دھاریوں کی خود پرستی کرتا ہے۔ اسی درجے کو نارسیزم (NARCISSISM) بھی کہتے ہیں۔ ادبی روایات کے قصوں کے مطابق نارسی سس ([illegible]) ایک خوبصورت نوجوان تھا جو کہ اپنے جسم پر خود اتنا فریفتہ ہو گیا تھا کہ اس نے اپنی زندگی ایک تالاب میں اپنا عکس دیکھتے دیکھتے گزار دی۔ یہاں تک کہ وہ کمزور ہو کر گھلنے لگا اور یونانی دیوتاؤں نے اسے ایک پھول کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ نارسی ازم اسی کے نام سے موسوم ہے۔

۳۔ شہوانیت کے نشو کے تیسرے درجے پر بچہ یہ معلوم کر کے کہ اس کا جسم خود ہی ایک لطف اُٹھانے والی شے ہے اپنے جسم میں دوسرے عاشقانہ حصّوں کی تلاش اور جستجو کرنے لگتا ہے۔ یہ حصے وہ اپنے جسم کے ان اعضا میں پاتا ہے جو کہ جسم کے فضلہ کے اخراج میں مدد کرتے ہیں۔ چنانچہ بچے کو پائخانہ کرنے میں خاص قسم کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ اس زمانے میں بچے کو شور و غل اور ظلم کرنے سے محبت ہوتی ہے۔ ہم لوگوں کو تو سوسائٹی میں پائخانہ یا پیشاب کے متعلق ذکر کرنے سے شرم آتی ہے اور اپنی ذات کو

"تمہارے دل کی بات تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے اگر تم (واقعی) نیک ہو گے (اور بھولے سے خطا کی ہے تو وہ تم کو بخش دے گا) کیوں کہ وہ تو توبہ کرنے والوں کو بڑا بخشنے والا ہے۔"

(سورۂ بنی اسرائیل آیۃ ۲۵)

بھی اس قسم کی چیزوں سے نفرت و کراہیت ہوتی ہے لیکن بچوں کا رد
کے متعلق بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ان کو پائخانہ کرنے میں ایک عجیب قسم
دلچسپی حاصل ہوتی ہے اور وہ پائخانہ کے متعلق بات چیت کرنے میں
خاص لطف حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ دیکھا گیا ہے کہ وہ زیادہ سے
دیر تک پائخانوں میں بیٹھے رہتے ہیں اور وہاں اپنی فطری خواہشات
تحریک سے اپنے کو مسرور کیا کرتے ہیں۔

اسی زمانے میں بچوں کی فطری خواہشات اور ماں باپ
پند و نصائح کے درمیان بچے کے دماغ میں ایک خوفناک قسم کی جنگ
ہے اور یہی زمانہ بچوں کی مستقبل کی عادات و اطوار بنانے کا ہوتا
اگر بچہ اپنے بڑوں کی باتوں کو آسانی سے مان لیتا ہے تو خیر ٹھیک ہے
اگر بزرگوں کو مار پیٹ سے زبر
منوانے کی ضرورت پڑتی ہے تو
میں اس کے نتائج نہایت خراب
ہیں۔ بچوں کی خواہشات اس وقت
ڈرانے اور دھمکانے سے دب
ہیں لیکن وہ ڈائنامیٹ کی طرح د
رہتی ہیں اور بالغ ہونے پر خوفناک
صورتوں سے اظہار کرتی ہیں۔

بچوں کے یہ تینوں مدارج پانچ برس کی عمر کے لگ بھگ گزر جا
ہیں۔ زندگی کے اس پنج سالہ دور کو فراڈ اور اس کے ساتھی اور تمام د
ماہرین نفسیات نہایت اہمیت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

مندرجہ بالا حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ا
میں اعضاء تناسل اور جنسی تفریق کے دوسرے نشانات وغیرہ تدر
ترقی پاتے ہی ہیں۔ نیز یہ بھی ہوتا ہے کہ انسانی جنسی شہوانیت کا جذبہ ا
تحریکات بھی ایک خاص طریقے سے تدریجاً عروج پاتی ہیں۔ بچوں کی شہوا
تحریکات اور ان کے مختلف افعال سے مظاہرہ اور اس کے بعد بالغ
پر ان خواہشات و افعال کا تدریجاً ایک دوسرے روپ میں آنا ہم کو اس
طرف توجہ دلاتا ہے کہ انسانی جنسی شہوانیت و خواہشات کے مظاہرے م
مباشرت ہی کی شکل میں نمودار نہیں ہوتے بلکہ زندگی کے مختلف ادوار

لف رویوں سے رونما ہوتے ہیں۔

پس ہم نے دیکھ لیا کہ ایک خلیے کے جانور میں جنس کی ابتدا کیسے ہ؟ پیرامیشیم کی ہم جنسی مباشرت ورٹی سیلا میں جنسی تفریق کی ابتدا وں وغیرہ میں دو زوجیا یا مخنثانہ پن (نرمادی حالت) پھر مینڈکوں چڑیوں وغیرہ میں صاف جنسی تفریق اور یہاں تک کہ اشرف المخلوقات انسان جنسی تفریقات کی تکمیل ہمارے سامنے جنسی ارتقا کی تاریخ کا خاکہ پیش تے ہیں۔ اس کے علاوہ ماہرین نفسیات کے تجربات و مشاہدات انسانی والی جذبات و تحریکات کے نشوونما کی تاریخ بھی پیش کرتے ہیں اور اس ں کا مکمل ثبوت دیتے ہیں کہ انسان دراصل ہر لحاظ سے دوسرے ورون سے زیادہ بلند و اعلیٰ و ارفع ہے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ ان ہات کی بنا پر اپنے کو اشرف المخلوقات کہنے کا حق رکھتا ہے۔

ثاقب لکھنوی نے کیا خوب کہا ہے۔

طینت آدم میں تھی اللہ کیا نشوونما\
ایک مٹھی خاک یوں پھیلی کہ انساں ہوگئی

لیکن انسان بھی آخر انسان ہی ہے فرشتہ نہیں اور اس لیے وہ کبھی کبھی اپنے بعض افعال جیسے ہم جنسی مباشرت یا کثرت مجامعت (جیسا کہ ادنیٰ جانوروں میں زیادتی کے ساتھ پایا جاتا ہے) سے اپنی ارتقائی تاریخ کے بعض مدارج کا ثبوت دیتا ہے اور یہ بتا دینا چاہتا ہے کہ وہ باوجود اعلیٰ و ارفع اور مہذب ہونے کے ان ادنیٰ اور ذلیل افراد " قوم" مثلاً پیرامیشیم اور دیگر ادنیٰ جانوروں کی عادات کو بھولا نہیں ہے۔

نوٹ: ڈاکٹر عبد الحق صاحب نے HERMOPHRODITE کا ترجمہ مخنث یا دو زوجیا یا نرمادی کیا ہے۔

" جو شخص سچے دل سے اور نیک نیتی سے کسی کام کو کرتا ہے، اس کو بُرا کہنے والوں سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ اس کو خدا سے غرض ہوتی ہے اور جب کہ خدا سے غرض ہے تو لوگوں کے بُرا کہنے سے اس کے دل پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ بلکہ ان لوگوں کے ساتھ اس کی محبت بڑھتی جاتی ہے اور وہ زیادہ کوشش کرنے لگتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ان لوگوں کو فائدہ پہنچانے اور سمجھانے کے لیے زیادہ کوشش درکار ہے اور جوں جوں مخالفت بڑھتی جاتی ہے اس کی کوشش بھلائی کے واسطے ترقی کرتی جاتی ہے۔"

سرسید

تخریب جنوں کے پردے میں

محمد اللہ خاں*

میرے گھر کے صحن میں روٹی کا ایک ٹکڑا پڑا تھا۔ ایک چروٹا آیا اور اس پر چونچیں مارنے لگا۔ دوسرا چروٹا بھی آگیا۔ اس نے روٹی کے ٹکڑے پر چونچ ماری تو اس کی وہ کارروائی پہلے چروٹے کو ناگوار ہوئی اور وہ اس سے لڑنے لگا۔ تیسرے چروٹے نے میدان خالی دیکھا تو روٹی پر جھپٹا۔ دو تین چروٹے اور دو تین چڑیاں اور بھی آگئیں اور اس طرح وہ روٹی کا ٹکڑا جنگ و جدال کی بنیاد بن گیا اور سب چروٹے پر پھلا کر ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ طاقتور کمزور کو ڈھکیلتا ہوا دور لے جاتا اس دوران دوسرے چروٹے روٹی کے ٹکڑے کی طرف بڑھتے۔ ان میں بھی آپس میں لڑائی ہونے لگتی۔ کبھی دو میں کبھی چار چھ میں۔ کون مار رہا تھا، کون پٹ رہا تھا، یہ اندازہ کرنا مشکل تھا۔ چڑیاں نہیں لڑتی تھیں۔ کوئی چروٹا اُن کی طرف لپکتا تو وہ اس جگہ سے پرامن طور پر ہٹ جاتیں۔ اور جب بھی موقع ملتا روٹی کے ٹکڑے میں دو چونچیں مار دیتیں۔

کئی منٹ تک یہی ہنگامہ ہوتا رہا۔ اپنا اپنا پیٹ بھرنے کے لیے چروٹے اور چڑیاں روٹی کے ٹکڑے پر چونچیں مارتے رہے، ایک دوسرے سے لڑتے بھی رہے۔ پھر یکایک سب کے سب پھر سے اُڑ گئے اور روٹی کا بچا ہوا ٹکڑا صحن میں پڑا رہ گیا۔

اس بہت ہی چھوٹے واقعے کی روشنی میں تاریخ کا جائزہ لیا جائے اور ہمارے ارد گرد جو واقعات پیش آتے رہتے ہیں ان کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ تاریخ کے ہر دور میں مختلف قومیں اور افراد دنیا کے وسائل بزورِ طاقت اپنے تصرف میں لانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اور وہ بھی اس بھونڈے انداز میں کہ روٹی کا جو ٹکڑا اُن کے سامنے پڑا ہو وہ اُن کی ضرورت سے کتنا بھی زیادہ ہو دوسرے ضرورت مند اور بھوکے پیاسے لوگ اس کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ اس طرف رخ کریں گے تو انھیں طاقت کے ذریعے پیچھے ڈھکیل دیا جائے گا۔

دنیا میں لاکھوں جنگیں وسائل پر قبضہ کرنے کی بنیاد پر ہی لڑی گئی ہیں۔ اس کے لیے بڑے بیچیدہ فلسفے بنائے گئے۔ اپنی برتری قائم رکھنے اور اسے حق بجانب ثابت کرنے کے لیے بڑی باریک دلیلیں پیش کی گئیں۔ اپنی حیوانی خواہشوں کو خوبصورت بنانے کے لیے مذہب کی سیدھی سچی تعلیمات کو بیچیدہ بنا دیا گیا۔ اس سے ناجائز فائدے حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ کمزور افراد اور کمزور قوموں کو یہ سبق پڑھایا گیا کہ وہ اپنی سنگین خطاؤں کی سزا بھگت رہے ہیں۔ اس کے لیے وہ اپنے اعمال کا جائزہ لیں، تپسیا کریں، خدا سے معافی مانگیں اور صبر اختیار کریں۔ اس سے طاقت ور اور چالاک گروہوں کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ کمزوروں میں مدافعت کی جو تھوڑی بہت طاقت ہو وہ اسے بھی استعمال نہ کر سکیں اور غالب قوموں کو دنیا کے زیادہ سے زیادہ وسائل استعمال کرنے کا بہ آسانی موقع ملتا رہے لیکن طاقت اور چالاکی کسی خاص انسانی گروہ کا ورثہ نہیں ہے۔ دوسرے گروہ بھی ان ہتھیاروں سے مسلح ہو سکتے ہیں۔ جو کمزور رہتے ہیں وہ اپنی طاقت بڑھانے کی

* چوک سہاور۔ ضلع ایٹہ۔ اترپردیش۔

کوشش کرتے ہیں اور اس میں کامیاب ہوتے ہیں اور اس طرح دنیا کے زیادہ سے زیادہ رسائل پر قبضہ جانے اور قایم رکھنے کی لڑائی ہمیشہ جاری رہتی ہے۔

انسان کی بھوک حیوانوں سے کہیں زیادہ شدید ہوتی ہے۔ چرونٹے روٹی کے ٹکڑے میں اتنے ریزے کھا لیتے ہیں جن سے اُن کا پیٹ بھر جائے تو وہ اسے چھوڑ کر اُڑ جاتے ہیں اور اس کے بعد نسبتاً کمزور چڑیوں یا دوسروں کو اس میں ریزے چننے کا موقع مل جاتا ہے۔ لیکن انسان کی بھوک کبھی ختم نہیں ہوتی۔ پیٹ بھر جائے تو دوسری لاانتہا خواہشیں پوری کرنے کی ہوس ہو جاتی ہے جس کا سلسلہ اتنا لمبا ہوتا ہے کہ ان کی تکمیل کی نوبت ہی نہیں آتی۔

اللہ تعالیٰ نے زمین بہت وسیع بنائی ہے اور اُس کے اوپر اور اندر انسان کی فطری خواہشوں کی تکمیل کے لیے اتنے زیادہ وسائل مہیا فرما دیے ہیں کہ جن کا احاطہ کر لینا انسان کے بس سے باہر ہے۔ چنانچہ جب بھی کوشش کی جاتی ہے۔ نئے وسائل جستجو کرنے والوں کی گرفت میں آجاتے ہیں، لیکن انسان اُن پر اکتفا نہیں کرتا۔ نہ سہولت اور صبر کے ساتھ اپنے دائرے میں مزید وسائل دریافت کرنے اور ان سے لطف اندوز ہونے پر منحصر رہنا چاہتا ہے۔ بلکہ آنکھیں گھما گھما کر یہ دیکھتا ہے کہ دوسرے لوگوں کو جو وسائل اور سہولتیں حاصل ہیں اُن پر کس طرح قبضہ کیا جائے۔

انسانوں کی بہت بڑی اکثریت اپنے کھیتوں میں زیادہ بہتر فصل پیدا کرنے سے زیادہ اس بات سے دلچسپی رکھتی ہے کہ دوسروں کے کھیتوں کی فصلیں کاٹ کر اپنے گھروں میں کیسے لائی جائیں؟ اس قسم کی کارروائی انھیں لوگوں کے کھیتوں میں کی جاسکتی ہے جو نسبتاً کمزور ہوں جو لوگ زیادہ مضبوط اور طاقتور ہوں گے اُن کے ہرے بھرے کھیتوں کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا تو جاسکتا ہے، اس طرف قدم نہیں بڑھایا جا سکتا۔ لیکن طاقتور گروہ کمزوروں کی وسائل بھی بزور شمشیر اپنے تصرف میں لانا چاہتے ہیں تو کمزور ان وسائل کو چھوڑ کر بھاگ نہیں جاتے بلکہ اپنی کمزوری اور ناتوانی کے باوجود مقدور بھر اُن کے بچاؤ کی کوشش کرتے اور اس کے لیے لڑتے ہیں۔ کیونکہ اپنے وسائل دوسروں کے قبضے میں چلے جانے دیں تو وہ اپنی بنیادی ضرورتیں کس طرح پوری کریں۔ اس صورت میں انھیں ننگا بھوکا رہ کر مرنا پڑتا ہے لہذا وہ بھوک سے مرنے کے بجائے لڑ کر جان دینے کو ترجیح دیتے ہیں اور انسانی گروہوں اور قوموں کے آپس میں ٹکرانے کی یہی بنیادی وجہ ہے اور یہی وہ مصیبت ہے جس سے محفوظ رہنے کے لیے خاندانوں، برادریوں، قوموں اور حکومتوں کی تشکیل ہوتی ہے۔

ہزاروں سال پہلے انسانوں کی زندگی حیوانوں کی زندگی کی طرح سادہ اور یک رنگ تھی۔ جنگلی پھل اور جانوروں کا کچا گوشت کھا لیا۔ غاروں میں گھس کر موسم کی شدت سے محفوظ ہو گئے اور نسل کشی کر لی۔ لیکن انسانوں کے لیے قدرت کا فیصلہ حیوانوں سے مختلف تھا۔ اس کے اندر اپنی حالت سے ترقی کرنے اور کائنات کو تسخیر کرنے کا مادہ رکھا گیا تھا۔ اسی لیے اس نے اُس سادہ اور یک رنگ زندگی پر اکتفا نہ کیا اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے اپنے وسائل میں اضافہ کرنے کے ساتھ دوسروں کے حاصل کیے ہوئے وسائل پر بھرپور حملے کرنے اور ان پر زبردستی قبضہ کرنے کی تدبیریں عمل میں لانے لگا۔ اُس کے لیے گروہ قایم کیے گئے، ہتھیار بنائے گئے۔ دوسرے لوگوں نے بھی اپنی مدافعت کرنے اور اپنے وجود کو قایم رکھنے کے لیے خود کو منظم کیا۔ اپنی جماعتیں قایم کیں۔ چنانچہ اُسی تگ و دو میں بڑی بڑی برادریاں بنیں پنچایتیں قایم ہوئیں۔ سردار مقرر کیے گئے۔ حکومتیں تشکیل کی گئیں اور اس طرح وسائل کی چھین جھپٹ اور بچاؤ کی تگ و دو میں تخریب کے پہلو بہ پہلو تعمیر و ترقی کے مینار بھی بلند ہونے لگے۔ امن و امان قایم رکھنے اور باہمی اشتراک و رفاقت کے لیے اصول و ضابطے مقرر کیے گئے۔ کچھ لو اور کچھ دو کے اصولوں پر کام کیے جانے لگے۔ لیکن دوسروں کی ہری بھری کھیتیوں کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے اور موقع مل جانے پر انھیں زبردستی یا دھوکے سے کاٹ کر اپنے گھروں میں ڈال لینے کے حیوانی جذبات سے انسانوں کے دل کبھی خالی نہیں ہوئے اور نہ اب ہیں۔ اور یہی وہ جذبات ہیں جو دنیا کو دارالفساد بنا دیتے ہیں اور دنیا کے عظیم الشان وسائل کو باہمی اشتراک سے مل جل کر استعمال کرنے کے بجائے نفسانی خواہشوں کے بندے ان

پر وحشیانہ انداز میں بری طرح جھپٹتے ہیں اور اُس کاروائی میں بہت سے لوگ پامال ہو جاتے ہیں۔

لیکن سب ہی انسان اس ذہن کے نہیں ہوتے۔ بہت سے لوگوں کے دلوں میں دردمندی اور قربانی کے جذبات بھی ہوتے ہیں — وہ دوسروں کی مدد کر کے خوش ہوتے ہیں۔ خود تکلیفیں اُٹھا کر دوسروں کو آرام پہنچاتے ہیں۔ دوسروں کے وسائل پر نگاہ ڈالنے کے بجائے اپنے وسائل سے دوسروں کو فائدے پہنچانے کی فکر میں رہتے ہیں، یہی لوگ انسانیت کا خلاصہ اور آبرو سمجھے جانے کے مستحق اور خالص انسانی قدروں کے امین ہیں اور یہی لوگ مشینوں میں تیزی سے گردش کرنے والے پرزوں کے درمیان استعمال کیے جانے والے تیل کا کام کرتے ہیں۔ یعنی جس طرح مشینوں میں تیزی سے گھومنے والے پرزوں کو آپس میں رگڑ رگڑ کر ٹوٹنے پھوٹنے سے محفوظ رکھنے کے لیے چکنے تیل استعمال کیے جاتے ہیں، اسی طرح انسانی سوسائٹی کے درمیان، شدید ہمدردی اور قربانی کا جذبہ رکھنے والے لوگ انسانی سوسائٹی کے خود غرض افراد کی کبھی تسکین نہ پاسکنے والی خواہشوں کی کشمکش میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔

لیکن حالات کی یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ تاریخ کے تقریباً ہر دور میں اثر و رسوخ اور اقتدار و اختیار عموماً انھیں لوگوں کے ہاتھوں میں رہا ہے جو کمزور لوگوں کی ہڈیوں پر اپنے محل تعمیر کرنے کے ماہر رہے ہیں۔ لوگ انھیں کے گرد جمع ہوئے ہیں۔ انھیں کی بات مانی گئی ہے انھیں کے ظالمانہ اصولوں کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ وہی تاریخ کے عنوان بنے ہیں۔ اس سب کے باوجود دردمندوں اور قربانیاں پیش کرنے والوں کی اہمیت بھی ہمیشہ رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی بلکہ۔ انسانی سماج میں حقیقی عزت و توقیر انھیں لوگوں کو حاصل ہوئی ہے۔ وہی لوگ دلوں میں بسائے گئے ہیں انھیں کی یادیں لوگوں کو اشک آلود کرتی رہی ہیں اور انھیں کی بارگاہوں میں لوگوں کے دل جھکے ہیں۔

یہی لوگ انسانی سماج کو مرلوط رکھنے اُسے بہتر بنانے اور اونچا اٹھانے کے لیے ہر وقت اس دھن میں لگے رہتے ہیں کہ اپنے نیک مقاصد حاصل کرنے کے لیے نئی نئی تدبیریں عمل میں لائیں اور انسانوں کے دلوں میں چھپی ہوئی حیوانیت کا زور توڑ کر انسانی ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبات کو فروغ دیں۔ یہی لوگ اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق بڑے بڑے سماجی اور فلاحی کارنامے انجام دیتے اور انتہائی خلوص سے عموماً عمر بھر اپنے سماج کی خدمت کرتے رہے ہیں اور انھیں کے نتیجے میں عظیم تعلیم گاہیں، تربیت گاہیں، سماج کی خدمت کرنے جماعتیں اور ادارے قایم ہوتے اور قایم رہتے ہیں۔

آج کے ایٹمی دور میں جب کہ پوری انسانی مکمل تباہی و بربادی کے دہانے پر کھڑی اپنی زندگی کے دن گن رہی ور وسائل کی چھین جھپٹ اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ اہل دل اور انسان دوست افراد کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ انھوں نے اپنی ذمہ کو پوری طرح محسوس نہ کیا اور منظم ہو کر حالات کا انتہائی صبر و است اور دل جمعی سے مقابلہ نہ کیا تو خود غرض، ظالم اور دوسروں کا رزق کر خوش ہونے والے نفس پرست لوگ پہلے کمزور قوموں اور بالآخر انسانی آبادی کو بھڑکتی ہوئی آگ

کی بھٹیوں میں جھونک

کر تباہ و برباد

کر دیں

گے۔

"تم لوگوں کے ساتھ اس طرح کا طرز معاشرت اختیار کرو کہ تم مر جاؤ تو لوگ تم پر آنسو بہائیں اور اگر زندہ رہو تو تم سے میل جول کا اشتیاق رکھیں۔" نہج البلاغہ

جھیل بیکال

BAYKAL

قدرت کا لازوال تحفہ

سید محی الرضا*

یہ جھیل تقریباً ۲۵ میلین سال پرانی ہے۔ پوربی سائبریا کے دکھن منگولیا (چین) کے اوپر واقع ہے۔

اس جھیل کی گہرائی ۱۶۲۰ کیلو میٹر ہے۔

اس کی لمبائی ۶۴۰ کیلو میٹر ہے۔

اس کا پانی اس قدر شفاف ہے کہ اس کی سطح سے اندر چالیس میٹر تک دیکھا جا سکتا ہے۔

اس کے نباتات اور حیوانات کی قسموں کی تعداد ۱۸۰۰ تک پہنچتی ہے۔

اس میں تقریباً ۳۳۶ ندیاں آکر گرتی ہیں۔

جھیل بیکال دنیا کی سب سے زیادہ گہری اور تازہ پانی کی جھیل ہے۔ خوبصورت اور نایاب فطری مناظر کے درمیان اس جھیل کا حسن اور بھی دل کش نظر آتا ہے۔ جو لوگ بھی اس جھیل کے اطراف کا نظارہ کرتے ہیں ان کے دلوں میں ایک عجیب سرور کا عالم پیدا ہوتا ہے۔ یہ جھیل صنوبر کے گھنے جنگل سے گھری ہوئی ہے۔ ہوا میں ایسی خوشبو بھری ہوئی ہے کہ جس کو ہم صحت مند خوشبو سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ غالبؔ کا یہ شعر اس جھیل کے تعلق سے پڑھا جا سکتا ہے ؎

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادہ پیمائی

سائبریا (روس) کے علاقے کی اس جھیل کے آس پاس ۱۲۰۰ قسم کے جانور آزادانہ طور پر اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جن میں سے چوتھائی جانور اُسی ملک کے ہیں۔ باقی باہر سے لاکر اس میں رکھے گئے ہیں۔ یہ پورا علاقہ روس کے اکیڈمی آف سائنس کے شعبۂ انسٹی ٹیوٹ آف لمنولوجی (limnology) تالاب کے جانور اور جھیلوں کے طبعی حالات کا مطالعہ) کے ماتحت ہے اور یہی شعبہ اس کی دیکھ ریکھ کرتا ہے۔

یہ جھیل ساری دنیا میں عمدہ اور شفاف پانی کی وجہ سے شہرت رکھتی ہے۔ پانی اس کا بے حد صاف اور شفاف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ۱/۵ حصہ تازہ پانی دنیا کا اس جھیل میں موجود ہے۔ اس جھیل کے علاقے اس قدر حسین اور خوبصورت ہیں کہ تمام دنیا کے تماشائی اس کو دیکھنے کے لیے آتے رہتے ہیں۔ ہر سال تقریباً ایک لاکھ افراد دنیا کے مختلف علاقوں سے اس جگہ آتے ہیں اور قدرت کی بے پناہ نعمتوں اور حسن سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ لیکن اس جھیل کے آس پاس دور کے علاقے ایسے ہیں جہاں پہاڑیوں کے سلسلے اس طرح پھیلے ہوئے ہیں کہ ان کو پار کرکے جانا اور دیکھنا انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس پورے علاقے میں دو خطّے محفوظ کر لیے گئے ہیں اور روس کا پہلا نیشنل پارک ۴۰۰۰ مربع کیلو میٹر کا بہت جلد تیار ہو جائے گا۔ یہیں پر داوشا (DAVSHA) ایک سنہری خلیج ہے۔ اس کے پہاڑی سطح مرتفع پر چھوٹے چھوٹے مکانات

---

* ۴۴۰۰/۲ سرجے جے روڈ ۔ بمبئی ۸

بنے ہوئے ہیں۔ ان مکانات کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ یہ سب ایک دوسرے کے ساتھ مل کر تائیگا (TAIGA) کے حملوں کو روکنے کے لیے تیار ہیں جو ان کو دھکا دے کر جھیل بیکال میں پھینک دینا چاہتا ہے۔ یہ اس علاقے کے بارگوزن اسٹیٹ (BARGUZIN STATE) کا رہائشی علاقہ ہے اور ۲۵۰۰ مربع کیلو میٹر کا محفوظ علاقہ ہے۔ یہاں پر ریسرچ کرنے والے اور جنگلات کے ماہرین رہتے ہیں۔

یہ بارگوزن (BARGUZIN) کا علاقہ سمور کے لیے مشہور ہے (سمور جسے سابل بھی کہا جاتا ہے ایک قسم کا گوشت خور چوپایہ جو ایشیا اور یورپ کے شمالی علاقے میں پایا جاتا ہے) اس سمور کی سنہری کھال دنیا کے بازاروں میں بڑی مہنگی بکتی ہے۔ روس کے ماہروں کے کہنے کے مطابق گزشتہ صدی میں ایک کھال کی قیمت اتنی تھی کہ چار افراد کے خاندان کے لیے سال بھر کا خرچ دیتی تھی۔ اس وقت شکار پر کوئی پابندی نہیں تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس صدی کی ابتداء میں صرف تین سو سمور بیکال جھیل کے علاقے میں بچ گئے تھے۔

۱۹۱۶ء میں روسی ماہر حیاتیات (Biologist) نے فیصلہ کیا کہ بارگوزن (BARGUZIN) میں ایک محفوظ علاقہ تیار کیا جائے اور سمور کی نسل کو زندہ رکھنے اور بڑھانے کے لیے ان لوگوں نے بارگوزن کے سمور اور دوسرے سمور کے جنسی ملاپ سے نسل تیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تجربہ بہت ہی کامیاب رہا ہے اور اس طرح کی دوغلی سمور کی نسل اس علاقے میں تیار کی جا رہی ہے۔ ان کی کھال بہت خوبصورت اور اعلیٰ قسم کی ہوتی ہے

اس محفوظ علاقے میں ۵۰۰ سے زیادہ مختلف قسم کے پودے ہیں۔ گرم ملک اور ٹنڈرا کے علاقے کے چھوٹے درخت بھی پائے جاتے ہیں۔ جھیل بیکال کے علاقے کے جانوروں اور پیڑوں کی پوری حفاظت کی جا رہی ہے اور انڈسٹریل ترقی کے باوجود اس علاقے کو محفوظ رکھا گیا ہے اور یہاں کے قدرتی اور فطری ماحول کو قائم رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ ایک بے مثال جگہ ہے، جہاں کے ماحول اور فضا کو سائنٹفک طریقے پر محفوظ رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

"ہنر، فن اور علم ایسی عمدہ چیزیں ہیں کہ ان میں ہر ایک چیز کو نہایت اعلیٰ درجے تک حاصل کرنا چاہیے۔ ایک متعصب انسان ان تمام دلچسپ اور مفید باتوں سے جو نئی نئی تحقیقات اور نئے نئے علوم سے حاصل ہوتی ہیں، محض جاہل اور ناواقف رہتا ہے۔ اس کی عقل اور اس کے دماغ کی قوت محض بے کار ہو جاتی ہے اور تربیت و شائستگی تہذیب و انسانیت کا مطلق نشان نہیں پایا جاتا۔"

سر سید

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
پرنٹر پبلشر: اسرار احمد
مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق ایڈمنسٹریشن ۔۱۰۱۔ ایم یونیورسٹی
پریس: ایس کے آفسیٹ پریس۔ دلی۔

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

شمارہ ۱۰

جلد ۷

اکتوبر ۸۸ء

ترسیل زر کا پتہ :
ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۔

Editor : TAHZIBUL AKHLAQ & NISHANT.
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

زر رسالانہ
انڈیا 30.00 RS
بیرونی ممالک US $ 20.00 ہوائی ڈاک
عام ڈاک US $ 8.00

مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ
ڈاکٹر کبیر احمد جائسی
ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
- انڈیا -

مندرجات

[تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہر حال ان سے متفق ہو]

اداریہ

آج سے تقریباً سو سال پہلے سر سید نے ہمیں یہ تعلیم دی تھی:

بدگمانی کے عوض اگر نیک گمان کریں اور نیک کام میں مدد دیں اور غلطیوں کی اصلاح پر
کوشش فرمائیں تو صرف مخالفت کرنے سے ہزار درجہ ہمارے اور ہماری قوم کے
لیے بہتر ہوگا۔"

مگر ہمارا حال آج بھی یہ ہے کہ

کوئی چاہے کتنی نیک نیتی اور خلوص دل سے کوئی نیک کام کیوں نہ کرے اور اس کے لیے کتنی ہی بڑی قربانی کیوں نہ دے، ہم بدگمانی کا کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر ہی لیں گے اور اس نیک کام کی پُرزور مخالفت کریں گے

" اسلام کا صحیح مسئلہ یہی ہے کہ اسی کام کے کرنے میں ثواب ہے جس کی ضرورت ہے۔"

مگر آج بھی رونا اسی بات کا ہے

"یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقت قیام آیا۔"

" یہ لوگ نہایت ہمدردی اور قومی محبت سے اپنی قوم کے عیبوں اور نقصانوں سے مطلع کرتے ہیں ان کا
دل اپنی قوم کی حالت پر، بہ نسبت اُن کے جو قوم کی طرف داری کرتے ہیں اور اس کے عیبوں کو چھپاتے
ہیں، بہت زیادہ جلتا ہے، اور حقیقت میں وہی لوگ محب وطن اور محبّ قوم ہیں۔"

مگر ہم آج بھی اسی روش پر قائم ہیں کہ

اپنی قوم کے عیبوں سے آگاہ کرنے والے ہمدردوں کو غدار اور ان کو چھپانے والے
منافقوں کو محبّ قوم سمجھتے ہیں۔

"جب تم کسی کے برخلاف کوئی بات کہنی چاہو یا کسی بات کی تردید کا ارادہ کرو تو خوش اخلاقی اور تہذیب
کو ہاتھ سے مت جانے دو۔"

مگر ہمارا رویہ آج بھی یہی ہے کہ

جب تک غصّے سے چہرہ سرخ کر کے، منہ سے جھاگ نکال کر بدتمیزی سے مخالفانہ بات

نہ کہی جائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مخالفانہ بات کہنے کا حق ادا نہیں ہوا۔

" اپنے پوشیدہ عیبوں کو معلوم کرنے کا ایک عمدہ قاعدہ یہ ہے کہ ہم اس بات پر غور کریں کہ ہمارے دشمن ہم کو کیا کہتے ہیں" ؟

مگر ہماری ایک بڑی اکثریت آج بھی
خود کو ہر عیب سے پاک اور دشمن کی ہر بات کو نا قابل اعتنا اور جھوٹ سمجھتی ہے۔

" حد سے زیادہ سرگرمی اور تعصب اور کسی خاص فرقے کو یا کسی خاص رائے کے لوگوں کو بُرا اور حقیر سمجھنا یہ ایسی باتیں ہیں جن سے ہزاروں آفتیں پیدا ہوتی ہیں"

مگر ہمارے ذہن میں آج بھی یہ ہے کہ
اپنے فرقے سے وفاداری کا یہ عین تقاضا ہے کہ دوسرے فرقوں کو بُرا اور حقیر سمجھیں

" انسان کو چاہیے کہ اپنے مخالف سے بھی مخالفت کرنے میں سچائی اور راست بازی، نیکی اور نیک دلی کو کام میں لاوے کیوں کہ یہی طریقہ اپنے مخالف پر فتح پالینے کا ہے"

مگر ہم ہیں کہ آج بھی
اپنے رفقاء سے بھی رفاقت کرنے میں سچائی اور راست بازی، نیکی اور نیک دلی کو کام میں نہیں لاتے اور انھیں اپنا مخالف بنالیتے ہیں

کتنا اچھا ہوتا کہ اگر ہم یوم سرسیّد منانے سے پہلے صدق دل سے اس بات کا بھی جائزہ لیتے کہ سرسیّد کی تعلیمات پر ہم کتنا عمل کر رہے ہیں۔

اسرار احمد

مکتوب شیخ الجامعہ

SYED HASHIM ALI
VICE CHANCELLOR

Aligarh Muslim University

OFFICE OF THE VICE CHANCELLOR
UNIVERSITY ROAD ALIGARH-202001
TELEPHONE OFF 3994 RES 3173 TLX 564-230 CEA-IN

عزیزو! جس وقت میری یہ تحریر آپ کی نظروں سے گزرے گی آپ یوم سرسیّد کی تقریبات منانے میں ہمہ تن مصروف ہوں گے آج کے اس تخاطب میں مَیں آپ سے اسی دن کے تناظر میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ سرسیّد احمد خاںؒ نے جس زمانے میں مسلمانوں میں علوم جدیدہ کی ترویج و اشاعت کا منصوبہ بند لائحہ عمل تیار کیا اس زمانے میں معاشی، معاشرتی اور تعلیمی لحاظ سے برصغیر کے مسلمان کس قدر پسماندہ تھے، سرسیّد احمدؒ نے اپنی صدائے حق بلند کی، ان کا ساتھ دینے کے لیے انہی کی طرح کے چند "دیوانے" سامنے آئے، جنھوں نے اتحاد و اتفاق کا راستہ اپناتے ہوئے علی گڑھ کی سرزمین میں ایک پودا لگایا جو ان دیوانوں کے اتحاد و اتفاق، انتھک محنت، شبانہ روز کی جدوجہد کے نتیجے میں آج ایک سایہ دار گھنا درخت بن چکا ہے جس کو دنیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام سے جانتی ہے۔ جہاں اتحاد و اتفاق ہوتا ہے، نیتوں میں خلوص اور دلوں میں دردمندی ہوتی ہے، اپنی انا کی نفی کرکے اجتماعی مفاد کا خیال رکھا جاتا ہے، وہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت نازل ہوتی ہے، بگڑتے کام بن جاتے ہیں اور ڈوبتے جہاز اُبھر کر اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو جاتے ہیں۔ جہاں اتحاد و اتفاق نہیں ہوتا، نیتیں خلوص سے عاری ہوتی ہیں، دلوں میں دردمندی کی جگہ بغض، کینہ اور فساد بھرا ہوتا ہے، وہاں اللہ کا عذاب نازل ہوتا ہے، سونا بے وقعت ہو کر مٹی بن جاتا ہے اور انسانی تدبیروں کے سارے قلعے زمیں بوس ہو جاتے ہیں۔

یہاں پر یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اختلاف رائے اور مجرد مخالفت میں بڑا فرق ہے۔ اختلاف رائے سے افہام و تفہیم کے دروازے کھلتے ہیں، ذہنوں کے دریچوں میں تازہ ہوا آتی ہے، نگاہیں نادیدہ مناظر سے آگاہ و آشنا ہوتی ہیں اور اختلاف رائے کے مرحلے سے گزر کر متفقہ طور پر جو فیصلہ کیا جاتا ہے وہ بہترین انسانی فیصلہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں میں شوریٰ کو بڑی اہمیت حاصل تھی مجلس شوریٰ کے ارکان جب کسی مسئلہ پر غور و فکر کے لیے جمع ہوتے تو آپس میں بحث و مباحثہ ہوتا، ایک دوسرے کے خیالات سے اختلاف کیا جاتا، نرم اور گرم ہر طرح کی گفتگو ہوتی، مگر جب مجلس شوریٰ کی اکثریت کوئی فیصلہ کر لیتی تو پھر اس سے کوئی بھی فرد واحد اختلاف نہ کرتا اور وہ فیصلہ سب کا فیصلہ بن جاتا۔ جہاں تک مجرد مخالفت کا سوال ہے تو یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو مختلف وضع قطع رنگ اور لباس اختیار کرکے متحد و متفق رہنے والوں میں نفاق کا بیج بویا کرتا ہے، بنے کام بگاڑنے کا درپے رہتا ہے اور کسی بھی مثبت فعل و عمل کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ **یوم سرسیّد** کے اس مبارک اور اہم دن کے توسط سے میں آپ تک اپنی بات پہنچانا چاہتا ہوں کہ آپ اختلاف رائے اور مجرد مخالفت کے فرق کو سمجھیں اور کسی بھی ایسے عمل کے مرتکب نہ ہوں جو صرف مخالفت کے جذبات کے زائیدہ و پروردہ ہوتے ہیں۔

سو سید احمدؒ نے اتحاد و اتفاق کے لیے کیا کچھ نہیں کیا ؟ اپنی انا کا طوق اپنی گردن سے اتار کر قوم کے قدموں میں ڈال دیا۔ اپنی ساری صلاحیتیں اور ساری ذہنی قوتیں صرف اسی راہ میں صرف کیں کہ مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کے جذبات پیدا ہوں، چھوٹی چھوٹی بے معنی اور بلا سبب رقابتیں ختم ہوں، لوگ ایک دوسرے کے جذبات و خیالات کا احترام کرنا سیکھیں، جس فرد یا افراد کے گروہ کے کسی عمل یا خیال سے ان کو اختلاف ہو اس کی بات بھی صبر و سکون اور غور و فکر کے ساتھ سن کر اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کریں۔ آج بھی اتحاد و اتفاق کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی سر سید احمدؒ کے زمانے میں تھی۔ اتحاد و اتفاق قائم رکھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اتہام تراشی سے گریز کیا جائے۔ یاد رکھیے اگر کسی شخص نے کسی دوسرے شخص کو ایسے عیب سے متہم کیا جس کا اس کی ذات میں دور دور تک کوئی نام و نشان نہیں ملتا تو متہم کرنے والا عند اللہ ماخوذ ہوگا اور سراپا رحمت، سرکار دو عالم حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم اس کی شفاعت نہ فرمائیں گے۔ اس لیے میں اپنے طلبا سے درخواست کروں گا کہ آپ اپنی فکر کی تربیت اس طرح کریں کہ آپ کو خیر، خیر کی شکل میں، اور شر، شر کی شکل میں دکھلائی دے۔ اگر خدا نخواستہ آپ کی نظر آپ کو فریب مسلسل دیتی رہی اور آپ خیر کو شر اور شر کو خیر سمجھتے رہے تو عاقبت کی بات تو اللہ جانے خود یہ دنیا آپ کے لیے جہنم بن جائے گی۔

آپ میں سے بہتوں کو معلوم ہوگا اور جن کو نہ معلوم ہو وہ جان لیں کہ سر سید احمد نے اپنے مشن کی ترویج و اشاعت کے لیے تہذیب الاخلاق کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا تھا۔ اس زمانے میں تہذیب الاخلاق نے لوگوں کی فکر کے دھارے کو موڑا، اصلاح رسوم کی طرف راغب کیا اور تعلیمی میدان میں جدوجہد کے لیے اکسایا اور جب اس کو اپنے مشن میں کامیابی حاصل ہوگئی تو اس کو بند کر دیا گیا۔ ۱۹۸۲ء میں یہ محسوس کیا گیا کہ آج پھر اس بات کی ضرورت ہے کہ تہذیب الاخلاق کا اجرا کیا جائے۔ اس لیے اس زمانے کے وائس چانسلر برادر محترم جناب سید حامد نے بے سروسامانی کے عالم میں ایک ٹرسٹ قائم کر کے تہذیب الاخلاق کو پھر سے نکالنا شروع کیا اور اس کی ادارت کے فرائض پروفیسر نور الحسن نقوی کے سپرد کیے۔ میں نے اپنے عہدے کا جائزہ لیتے ہی اس کی اہمیت و ضرورت کو محسوس کیا اور کوشش پیہم کے بعد اس بات میں کامیاب ہو سکا کہ تہذیب الاخلاق یونیورسٹی بجٹ پر آگیا۔ جون ۱۹۸۶ء سے اس کی ادارت کا بار پروفیسر اسرار احمد اور ان کے پُرخلوص اور لائق ساتھی ڈاکٹر کبیر احمد جائسی اٹھائے ہوئے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ تہذیب الاخلاق کی علمی و ادبی حلقوں میں پذیرائی ہوئی اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک مقبول عام رسالہ بن گیا۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ سب حضرات نہ صرف اس رسالے کا مطالعہ کریں گے بلکہ ایک خفیف سا مالی ایثار کر کے اس کو اپنے پیروں پر کھڑے ہونے میں مدد دیں گے۔ سر سید احمدؒ کے مشن کو جاری رکھنا ہم سب کا فرض ہے۔ آئیے اس فرض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بارگاہ ایزدی میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھائیں اور عرض کریں کہ یا اللہ ہم صراطِ مستقیم سے کبھی بھٹکنے نہ پائیں، ہم کو سیدھی اور سچی راہ چلا اور اس راہ پر چلنے سے بچا جس پر چلنے سے تیرا غضب نازل ہوتا ہے۔ آمین

دعا گو

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حسب و نسب

سر سیّد احمد خانؒ

عرب کے لوگ زمانہ جاہلیت میں نہایت اکھڑ گنوار جاہل ان لکھے اور ان پڑھے تھے۔ علم ادب بھی جس کو ٹھیک ٹھیک علم ادب کہتے ہیں اُن میں نہ تھا اور نہ اور کسی فن کو اچھی طرح جانتے تھے۔ ہاں دو باتیں ان میں بے مثل تھیں۔ ایک نہایت موثر اور پُر مطلب گنواری فصاحت جو بالتخصیص دہقانیوں میں پائی جاتی تھی اور اس سبب سے اس کے مضامین طبعی جوشوں پر مبنی ہوتے تھے اور دلوں پر زیادہ اثر کرتے تھے۔ دوسرے بے مثل اور بے نظیر حافظہ۔ اگرچہ ان لکھے پڑھوں کا حافظہ ہمیشہ قوی ہوتا ہے مگر عرب والوں کا حافظہ بہت قوی تھا ۔ اسی قوت حافظہ کے سبب وہ اپنی قوموں کی تمام نسلوں کو یاد رکھتے تھے اور نسلوں کے یاد رکھنے کو نہایت فخر سمجھتے تھے جو رفتہ رفتہ ایک علم ہو گیا اور "علم الانساب" اس کا نام پڑ گیا۔ اہل عرب کی عادت تھی کہ اپنے نسب پر بہت فخر کرتے تھے اور ہر موقع پر اس کا ذکر کرنے اور اس پر شیخی بگھارنے سے نہ چوکتے تھے اور اسی سبب سے ان کو صرف اپنا ہی نسب نامہ بھی یاد رکھنا کافی نہ تھا۔ اپنے مخالفوں اور رقیبوں اور ہمسایوں کا نسب نامہ یاد رکھنا بھی ضروری ہوتا تھا۔ تاکہ اپنی شیخی کے سامنے دوسرے کی شیخی نہ چلنے دیں۔ لکھنا ان کو آتا نہ تھا۔ اس لیے ان کے نسب نامے لکھے ہوئے نہ تھے۔ جہاں تک یاد تھی یا جو باتیں یاد رکھنے کے قابل تھیں وہ سب بر زبان یاد تھیں۔ ان کا حافظہ ہی ان کے لیے لوح محفوظ تھا۔ حافظہ کیسا ہی قوی ہو مگر تمام پشتوں کا بترتیب یاد رکھنا ایک غیر ممکن بات تھی اسی سبب سے بڑے بڑے جلیل القدر اپنے مشہور معروف اشخاص کے نام تو ضرور یاد رہتے۔ باقی لوگوں کے نام جس قدر یاد رہ سکتے تھے اس قدر رہتے تھے۔ ان مشہور آدمیوں کے نام یاد رہنے کا یہ بھی بڑا سبب تھا کہ ان کے نام اور ان کے حالات شعروں میں ہوتے تھے جو بڑے بڑے معرکوں اور میلوں اور لڑائیوں میں نہایت فخر کے ساتھ پڑھے جاتے تھے۔ ان سب رسموں اور عادتوں کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر شخص اپنے آپ کو اور اپنے ہمسایہ اور اپنے مخالف اور رقیب کو بخوبی جانتا تھا کہ وہ کس قوم اور کس نسل کا ہے اور کسی کو ایسی جرأت اور ایسی طاقت نہ تھی کہ اپنی قوم اور نسل کو بدل سکے یا جھوٹ موٹ اپنے آپ کو کسی ایسی نسل کا جس کا درحقیقت وہ نہیں ہے کہنے لگے مگر بایں ہمہ سلسلہ وار تمام پشتوں کو بتلا دینا ہر ایک کو نام بنام مورث اعلیٰ تک گن دینا ایک غیر ممکن امر تھا۔ اس لیے ہر شخص اپنے باپ دادا کے نام وہاں تک بیان کر سکتا تھا'

جہاں تک یاد ہوتے تھے۔ پھر بیچ کی پشتوں کو چھوڑ کر ان کے نام
لے دیتا تھا جن کے نام اشعار میں مذکور ہوتے تھے۔ پس جس مورخ
نے ایسے لوگوں کا پورا سلسلہ وار نسب نامہ بیان کرنا چاہا، اس
کو یہ سب دقتیں پیش آئیں اور یہ ایسی مشکلیں تھیں جن کا حل ہونا
کچھ آسان نہ تھا۔

ایک اور مشکل عرب کے نسب ناموں میں یہ تھی کہ ایک
ہی نام کے کئی کئی شخص نسب ناموں میں ہوتے تھے اور اس لیے
مورخ دھوکے میں پڑ جاتے تھے اور پچھلے شخص کو وہ شخص سمجھ جاتے
تھے جو اگلوں میں اسی نام کا کوئی گزرا ہے اور جو پشتیں ان دونوں
شخصوں کے درمیان میں فی الحقیقت گزری ہیں ان کا ذکر چھوٹ
جاتا تھا اور جب کہ ایک شخص کے کئی نام ہوتے تھے تو دوسری
قسم کا دھوکا پڑتا تھا تجنیس خطی کے سبب سے ایک ہی نام کو بعضوں
نے کچھ پڑھا اور بعضوں نے کچھ شام میں اور عرب میں یہ بھی دستور
تھا کہ بجائے باپ کے نام کے اس شخص کا نام لے دیتے تھے
جو نسب نامہ کے اشخاص میں معروف و مشہور ہوتا تھا یا جس سے
نسل گنی جاتی تھی۔ چنانچہ سینٹ متی حواری نے اپنی انجیل میں
حضرت عیسیٰ کے نسب نامے میں لکھا ہے کہ "کتاب نسب نامہ عیسیٰ
مسیح ابن داؤد .... ابن ابراہیم" حالانکہ مسیح سے داؤد تک
اور داؤد سے ابراہیم تک بہت سی پشتیں ہیں مگر داؤد جو ایک
مشہور نام تھا اُن ہی کا بیٹا حضرت مسیح کو بتا دیا اور ابراہیم کا
بیٹا داؤد کو کہہ دیا جس سے نسل چلی تھی اور بیچ کے سب نام چھوڑ
دیے۔

عرب کے لوگوں کی یہ بھی عادت تھی کہ اپنے باپ داداؤں
کے ناموں کو جہاں تک ان کو یاد ہوتے تھے، بیان کرتے جاتے
اور جب ان کی یاد کے نام ختم ہو جاتے تھے تو اخیر یاد میں رہے
ہوئے شخص کو اس کا بیٹا کہہ دیتے تھے جس سے وہ نسل چلی ہے
یا جب وہ ایسے شخص پر پہنچتے تھے جس کو ہر کوئی یقیناً اس کی اولاد
میں جانتا ہے جس سے نسل چلی ہے تو اس شخص کو اسی کا بیٹا کہہ
دیتے تھے اور اس سبب سے مورخوں کو ایسے لوگوں کا سلسلہ وار
نسب نامہ لکھنے میں اور بھی مشکل پڑی ہے۔

جب کہ ہم اپنے پیغمبر خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کا نسب نامہ سلسلہ وار لکھنا چاہتے تھے تو اس میں بھی یہ سب
مشکلات پیش آتی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب نامہ کے
بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی اور اسی سبب سے کوئی صحیح حدیث
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب نامہ کی موجود نہیں ہے۔ یہ
بات بے شک انھوں نے فرمائی کہ:

"ابراہیم خلیل اللہ میرے باپ اور میرے
ولی ہیں"

جیسا کہ ترمذی نے عبداللہ بن مسعود کی روایت سے بیان کیا
ہے مگر کرسی نامہ کے طور پر نہ کبھی اپنا نسب نامہ بیان فرمایا اور
نہ اس کے بیان کرنے کی ضرورت تھی کیوں کہ تمام عرب کے لوگ یقینی
بلا کسی شک و تردد کے جانتے تھے کہ محمد رسول اللہ قبیلۂ قریش
سے ہیں اور اس بات پر بھی سب کو یقین تھا کہ قبیلۂ قریش کا معد ابن
عدنان کی اولاد میں ہے۔ عدنان اولاد ہے قیدار ابن اسمٰعیل
ابن ابراہیم کی اور اتنی ہی بات اس امر کے ثبوت کے لیے کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم اولاد اسمعیل ابن ابراہیم کی اولاد میں ہیں،
کافی تھی گو ان کے درمیان میں کتنی ہی پشتیں گزری ہوں جن کی
تعداد میں اختلاف ہو۔

ہاں اس بات میں کچھ شک نہیں کہ جب لوگوں نے
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ بترتیب لکھنا چاہا تو
اس میں اختلاف ہوا۔ اسی بنا پر کاتب الواقدی نے ایک قول
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے لکھا ہے کہ
"کذب النسابون" یعنی نسب بیان کرنے والے جھوٹے ہیں
اور مسعودی نے اپنی کتاب مروج الذہب میں ایک روایت
بیان کیا ہے

وكذالك (اى لتنازع الناس فى النسب) نهى
النبى صلى الله عليه وسلم عن تجاوز معد لعلمه
من تباعد الانساب وكثرة الاراء فى طول

هذا لاحصاء موج الذهب (مسعودی)
سی اختلاف کے سبب جو نسب نامہ میں لوگ کرتے تھے، فرمایا ہے کہ معد ابن عدنان سے آگے مت بڑھو کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نسب نامہ کے بڑے دور تک ہونے سے اور اُس کے زمانۂ دراز میں متعدد رائیں ہونے سے بخوبی واقف تھے۔ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "انا ابن الذبیحین" یعنی میں دو قربانی کیے گئے شخصوں کا بیٹا ہوں اور اس قربانی سے لوگ سمجھتے ہیں کہ اُن دونوں شخصوں سے اسمٰعیل ابن ابراہیم اور عبد اللہ اب محمد رسول اللہ مراد ہیں۔ ابو الفدا نے ام سلمہؓ سے روایت بیان کی ہے۔

"وروی عن ام سلمة زوجة النبی صلی اللہ علیہ
وسلم انها قالت قال رسول اللہ علیہ وسلم
عدنان ابن اود بن زید بن برا بن عراق الثری
فقالت ام سلمة زید همیسع و برا نبت اسمعیل
عراق الثری۔"

اور ام سلمہ زوجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی گئی ہے۔ ام سلمہؓ نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عدنان بیٹا اود کا اور وہ بیٹا زید کا اور وہ بیٹا برا کا اور وہ بیٹا عراق الثری کا۔ اور ام سلمہ نے یہ بھی کہا کہ زید اور ہمیسع ایک ہی شخص کا نام ہے اور برا نبت اور اسمٰعیل اور عراق الثری ایک ہیں [ ]۔

یہ تمام روایتیں جو اوپر بیان ہوئیں محض بے سند اور غلط ہیں اور ...ا بھی اعتبار کے لائق نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو کبھی آنحضرت کے نسب نامہ کی نسبت ذکر نہیں ہوا۔ صرف ان کے نسب کا یقین کہ قریش ہیں تمام عرب کے دلوں پر جما ہوا تھا اور اس کی کوئی وجہ نہ تھی کہ اس زمانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب نامہ پر کچھ بحث ہوتی۔ کئی صدی بعد جب کتابوں کی تحریر کا رواج شروع ہوا اور مورخین کو نسب نامہ کی تحقیق میں مجبوری ہوئی تو انھوں نے اپنی کتابوں کے رونق دینے کو جھوٹی روایتیں خود گھڑ لیں یا افواہاً سنی سنائی اپنے مطلب کے موافق سمجھ کر بلاتحقیق مندرج کر دیں۔ انا ابن الذبیحین کی روایت نہایت غلط ہے۔

ہاں بلاشبہ ترمذی نے جو روایت عبد اللہ ابن مسعودؓ سے بیان کی ہے وہ کسی قدر اعتبار کے لائق ہے۔ عبد اللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ

"رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر ایک نبی کے لیے ایک مربی نبیوں میں سے ہوتا ہے اور میرا مربی میرا باپ میرے پروردگار کا دوست (یعنی ابراہیم) ہے۔ پھر قرآن کی یہ آیت پڑھی کہ سب سے زیادہ دوست ابراہیم کے وہ ہیں جنھوں نے اس کی پیروی کی ہے اور یہ نبی یعنی محمد رسول اللہ اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور اللہ سب ایمان والوں کا دوست ہے۔"

پانچ شخص ہیں جن کے تحقیق کیے ہوئے نسب ناموں میں معد ابن عدنان سے لے کر ابراہیم تک پشتوں کا بیان ہوا ہے۔ ایک بیہقی دوسرے ابن ہشام، تیسرے ابن الاعرابی، چوتھے برخیا کاتب الوحی ارمیا نبی علیہ السلام۔ پانچویں الجرا۔

ان میں سے پہلے یعنی بیہقی نے عدنان سے ابراہیم تک دس پشتیں اس طرح لکھی ہیں"

عدنان ابن عدد ابن المقوم یاحور بن یارح بن یعرب
یشجب بن نابت بن اسمٰعیل بن ابراہیم۔

اور دوسرے شخص ابن ہشام نے اپنی کتاب المغازی و سیر میں نو پشتیں اس طرح پر لکھی ہیں۔

"عدنان ابن عدد ابن ناحور ابن مود ابن یعرب ابن
یشجب ابن نابت ابن اسمٰعیل ابن ابراہیم"

اور اسی کتاب کے دوسرے نسخہ میں گیارہ پشتیں اس طرح پر لکھی ہیں۔

"عدنان ابن اود ابن سام ابن یشجب ابن یعرب ابن
الہمیسع ابن ساقو ابن یامد ابن قیدار ابن اسمٰعیل

ابن ابراہیم"۔

اور تیسرے شخص یعنی ابن الاعرابی نے اس طرح پر نو پشتیں نسب نامہ میں مندرج کی ہیں؛

" عدنان ابن اد ابن ادد ابن الہیسع ابن نابت ابن سلامان ابن قیدار ابن اسمٰعیل ابن ابراہیم"۔

اول تو ان نسب ناموں کو اسمٰعیل تک سمجھنا غلطی ہے۔ کیونکہ اس کے لکھنے والوں نے جہاں تک ان کو نام یاد تھے وہاں تک لکھ کر اس کے مشہور اشخاص قیدار اور اسمٰعیل کا نام لے دیا ہے اور بیچ کے نام جو یاد نہ رہے تھے چھوڑ دیے ہیں، جن لوگوں نے ان کو پورا سمجھا ہے بڑی غلطی کی اور خود اس زمانہ سے جو عدنان اور ابراہیم کے درمیان میں گزرا ہے، ان کی غلطی ثابت ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ نسب نامے خود بھی غلط ہیں۔ ابن ہشام کے دونوں نسخے آپس میں مختلف ہیں اور نابت کے ذریعہ سے اسمٰعیل تک قریش کا نسب نامہ پہنچانا ایک ایسی غلطی ہے جو خود عرب جاہلیت کی روایتوں سے جو تاریخی وقعت کے درجہ کو پہنچ گئی ہیں، غلط ثابت ہوتی ہے۔ ابن الاعرابی کے نسب نامہ کا بھی کچھ ثبوت روایتاً یا درایتاً نہیں۔

پس دو نسب نامے باقی رہ گئے۔ ایک بارو خ یا برخیا کاتب الوحی ارمیا نبی کا اور دوسرا الجرا کا۔ ابو الفدا نے بھی لکھا ہے کہ جو نسب نامہ الجرا نے لکھا ہے وہی درست ہے۔ اور وہی اختیار کرنے کے لائق ہے۔ کوئی وجہ اس بات کی نہیں ہے کہ حضرت اسمٰعیل کی اولاد کا جو سلسلہ برخیا کاتب الوحی حضرت یرمیا نبی نے اپنے زمانہ تک کا لکھا ہے اس پر ہم اعتبار نہ کریں۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ معد ابن عدنان حضرت یرمیا نبی کے وقت میں تھے اور بخت نصر کے ہنگامہ میں حضرت یرمیا نے ان کو بچایا تھا اور ساتھ لے گئے تھے اور یہ ایک قوی قرینہ اس بات کا ہے کہ برخیا کاتب الوحی یرمیا نبی کو معد کا نسب نامہ لکھنے کی اسمٰعیل ابن ابراہیم تک ضرورت پڑی ہوگی۔ یہ شجرہ حضرت اسمٰعیل کی اولاد کا یا یوں کہو کہ معد ابن عدنان کا ابراہیم تک نسب نامہ جو برخیا کاتب الوحی نے لکھا، ہمارے ہاں کی کتابوں میں بھی مندرج ہے۔ چنانچہ مسعودی نے اپنی کتاب مروج الذہب میں اس کو بعینہ نقل کیا ہے۔ ہشام کلبی کی روایت واقدی میں ہے، اس میں اس شجرہ کو بیان کیا ہے، مگر ناموں کے تلفظ میں بہ سبب عدم مجانست الفاظ کے اور نقل کے فرق ہوگیا ہے مثلاً ایک نے ایک نام لکھا ہے اقناد کاف اور نون سے، دوسرے نے لکھا ہے اقتاد فے اور تے سے۔ یا مثلاً ایک نے لکھا ہے بالیا اور دوسرے نے لکھا عیسر بالراء، اور غالباً کاتب کشش دار حرف یا کو حرف را کے سمجھ لیا ہے۔ اسی طرح ناموں کے تلفظ و نقل میں اختلاف ہے۔ ورنہ وہ دونوں واحد ہیں وہی شجرے ہیں جو برخیا کاتب الوحی نے اپنے زمانے تک لکھے ہیں۔

الجرا کا نسب نامہ درحقیقت اسمٰعیل ابن ابراہیم تک نہیں ہے بلکہ حمل ابن میدا ابن عدنان اول تک ہے یعنی وہاں تک جہاں برخیا کاتب الوحی نے شجرہ لکھا تھا مگر جو کہ الجرا نے بھی ان ناموں کو جو برخیا کاتب الوحی نے لکھے تھے چھوڑ کر حسب دستور عرب و شام اس کے آخیر میں قیدار ابن اسمٰعیل اور ابراہیم کا نام لکھ دیا تھا۔ لوگوں کو شبہ پڑا کہ یہ مستقل جداگانہ نسب نامہ ہے۔ حالانکہ درحقیقت وہ برخیا کاتب الوحی کے نسب نامہ کا تتمہ ہے۔ ایک اور وجہ غلطی میں پڑنے کی یہ بھی ہوئی ہے کہ برخیا کاتب الوحی اور الجرا کے نسب نامہ میں مکرر نام آتے ہیں۔ خصوصاً معد اور عدنان کے اور اس سبب سے لوگوں نے اس کو جداگانہ نسب نامہ خیال کیا۔ حالانکہ مکرر ناموں کا آنا کوئی امر قابل اشتباہ کے نہیں ہے۔ پس اب ہم برخیا کاتب الوحی کے نسب نامہ کے نیچے الجرا کا نسب نامہ جو اس کا تتمہ ہے لگا دیتے ہیں، جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ اسمٰعیل ابن ابراہیم تک پورا ہو جاتا ہے۔ جن وجوہات سے کہ ہم نے الجرا کے نسب نامہ کو برخیا کاتب الوحی کے نسب نامہ کا تتمہ بیان کیا اور دونوں کی صحت کو تسلیم کیا اس کی وجوہات یہ ہیں:

اول یہ کہ اسمٰعیل سنہ ۲۰۹۴ دنیاوی مطابق سنہ ۱۹۱۰ قبل مسیح کے پیدا ہوئے تھے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سنہ ۴۵۸۰ دنیاوی

مطابق ۵۳۸ بعد مسیح کے پیدا ہوئے تھے۔ پس دونوں ولادتوں میں چوبیس سو چھتر برس کا فاصلہ ہے اور اسمٰعیل سے آنحضرتؐ تک اس نسب نامہ کی ستر پشتیں گزرتی جو از روے حساب اُس سلسلۂ نسب کے جو علی العموم علوم طبعی کی تحقیقات سے اختیار کیا جاتا ہے بالکل صحیح ہے یعنی قریب تین پشت کے ایک صدی میں۔

دوسرے یہ کہ معد وارمیانی دونوں ایک وقت میں تھے، چنانچہ مروج الذہب مسعودی جلد ۴ صفحہ ۱۱۹ میں لکھا ہے کہ معد ابن عدنان کے ارمیا نبی کے ساتھ جو حالات گزرے ہیں وہ بہت طولانی ہیں۔ وہ حالات یہ ہیں کہ جب بخت نصر نے عرب پر حملہ کیا اور عدنان اور بنی جرہم کو شکست دی اور مکہ کو لوٹ لیا اور صدہا آدمیوں کو پکڑ کر بابل میں لے لیا، اُس وقت اللہ تعالیٰ نے معد ابن عدنان کو اس سے بچایا اور ارمیا نبی اور برخیا خدا کے حکم سے معد کو اپنے ساتھ لے گئے اور حیران میں اُن کو بحفاظت رکھا۔ ارمیا نبی کا زمانہ سال دنیوی کے حساب سے بیتالیسویں صدی میں یعنی چھٹی صدی قبل مسیح میں تھا اور جو نسب نامہ ہم نے صحیح قائم کیا ہے اس میں بھی نسلوں کا عام سلسلہ بموجب معد بھی اُسی زمانہ میں ہوتا ہے جو ایک نہایت قوی دلیل اس سلسلہ کی صحت کی ہے اور برخیا کاتب الوحی کی تاریخانہ تحریر اور عام عرب کی مشہور روایت سے عجب طرح پر مطابقت پائی جاتی ہے۔

سر ولیم میور نے اپنی کتاب لائف آف محمد جلد ا صفحہ ۱۹۴ میں لکھا ہے کہ یہ روایت معد اور ارمیا نبی کی صحیح نہیں معلوم ہوتی اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم و عدنان میں اٹھارہ پشتیں ہیں اور نسل کے صحیح حساب سے عدنان کی پیدائش ۱۳۰ قبل مسیح سے پہلے کی نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ بخت نصر کے حملوں کا زمانہ ۵۷۷ قبل مسیح میں پایا جاتا ہے۔

مگر سر ولیم میور کو ناموں کے متحد ہونے سے یہ شبہ پڑا ہے۔ عدنان بھی دو ہیں اور معد بھی دو ہیں۔ ایک وہ ہیں جو برخیا کاتب الوحی کے شجرہ میں ہیں اور دوسرے وہ ہیں جو الجرادالے نسب نامے میں ہیں۔ پس وہ روایت نسبت پہلے معد ابن عدنان کے ہے۔ سر ولیم میور نے دوسرے معد ابن عدنان کی نسبت وہ روایت تصور کی ہے۔ عک بلا شبہ معد کا بھائی تھا مگر اس سے پہلے معد کا نہ دوسرے معد کا جیسا کہ سر ولیم میور نے تصور کیا ہے، عرب کے ضلع حضرموت میں جو قلعہ قوم عاد کا از نام حصن الغراب تھا اور جس میں سے ایک کتبہ نکلا جس میں ہود پیغمبر کا ذکر ہے اور اس میں عک کا بھی نام ہے۔ یہ عک اسی پہلے معد کا بھائی معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے اس خطبہ کے پڑھنے والوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے **عدنان** تک جو ہمارے مرتبہ شجرے میں بچاسویں نمبر پر ہے پشتوں کا سلسلہ عموماً تسلیم کیا گیا ہے اور کسی مورخ کو اس میں اختلاف نہیں ہے۔ مگر عدنان سے آگے بلحاظ اُن وجوہات کے جو اوپر ذکر ہوئیں مورخوں میں اختلاف ہے۔ بیہقی کا قول ہے کہ اس کے استاد حافظ ابو عبداللہ کہتے تھے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب عدنان تک صحیح ہے اور اس سے اوپر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر بھروسہ کیا جائے، مگر یاد رکھنا چاہیے کہ یہ قول اگر بیہقی کا صحیح ہو تو اس کے استاد کی ایک رائے ہے اور سمجھ ہے کوئی مذہبی حدیث نہیں ہے جس پر یہ استدلال ہو سکے کہ **مذہبی روایت** کے بموجب اس کی صحت نہیں ہے۔

بلا شبہ اہل عرب بنی اسرائیل سے نہایت قرابت قریبہ رکھتے تھے۔ وہ اسمٰعیل کی اولاد تھے اور یہ اس کے بھائی اسحاق کی وہ ان پڑھ جاہل تھے اور یہ لکھے پڑھے قابل۔ پس یہ ایک قدرتی اور طبعی بات تھی کہ جس بات سے وہ ناواقف ہوں اپنے اسرائیلی بھائیوں سے اُس کو دریافت کریں یا جس بات کی تفصیل محمد رسول اللہ صلعم نے نہیں فرمائی تھی اس کا مفصل حال اپنے اسرائیلی بھائیوں سے پوچھیں۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گزشتہ حالات و تاریخی واقعات کی نسبت بنی اسرائیل سے روایت کرنے کو منع نہیں فرمایا تھا بلکہ اجازت

دی تھی اور جس کسی بات میں کوئی خاص حکم نہ تھا تو یہود کے تتبع کو جو اہل کتاب تھے مناسب سمجھا تھا۔ پس جب کہ مسلمانوں کو اپنے پیغمبر کے نسب نامہ لکھنے کا خیال ہو جس کا کبھی مذکور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نہ ہوا تھا تو بلا شبہ انھوں نے یہودیوں اپنے اسرائیلی بھائیوں سے جو لکھے پڑھے تھے اور جن کے ہاں تاریخ نویسی اور نسب ناموں کی تحریر کا بھی سلسلہ جاری تھا، مدد لی اور ان کی کتابوں کی بھی تحقیق کی اور نسب نامہ مرتب کیا اور یہی وجہ ہوئی کہ بہ سبب مشابہ ہونے حروف تہجی عبری کے پھر اس کے دوسرے خط کوفی میں نقل ہونے پھر خط ثلث میں نقل ہونے اور پھر موجود خط عربی میں نقل ہونے سے الفاظ کا الٹ پھیر و تلفظ کا ادل بدل ہوا اور کاتبین کی غلطی سے کوئی نام رہ گیا کوئی بڑھ گیا جو منشاء اختلاف ہے مگر جب کمال غور و فکر سے اس پر لحاظ کیا جائے تو اس کی صحت بخوبی ہو سکتی ہے جیسے کہ بقدر اپنے فہم کے ہم نے کی ہے۔ چنانچہ ان ہی واقعات کا ذکر واقدی نے اپنی کتاب میں کیا ہے کہ میں نے اس بات میں کہ معد اولاد قیدار ابن اسمٰعیل میں ہے کسی کا اختلاف نہیں دیکھا اور یہ اختلاف جو آپ کے نسب میں ہے اس بات کی دلیل ہے کہ اہل عرب کو یا مسلمانوں کو نسب نامہ یاد نہیں تھا۔ انھوں نے یہ نسب نامہ اہل کتاب سے لیا ہے۔ انھوں نے اس کو ترجمہ کر دیا اور پھر اُن کو اس میں اختلاف ہو گیا اور اگر یہ نسب نامہ صحیح ہوتا تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سب لوگوں سے زیادہ اس کو جاننے والے تھے۔ پس ہمارے نزدیک بہتر یہ ہے کہ معد ابن عدنان تک ٹھہر جانا چاہیے اور اس سے آگے اسمٰعیل تک کچھ نہ کہنا چاہیے۔

واقدی کے اس فقرہ کو سر ولیم میور نے بھی اپنی کتاب لائف آف محمد میں نقل کیا ہے مگر اس میں کوئی ایسی بات جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اولاد اسمٰعیل ہونے میں شبہ پڑے نہیں ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ ہم کو نسب نامہ ابراہیم تک یاد نہ تھا، یہ بھی سچ ہے کہ ہم نے یہودیوں سے جو ہمارے اسرائیلی بھائی ہیں یا اُن کی کتابوں سے اُس کی تحقیق کرنے پر مدد لی ہے — جو وجہ اختلاف ہم نے بیان کی ہے، اسی کی طرف واقدی نے بھی اشارہ کیا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اعلم الناس تھے اگر ان کے سامنے اس کا تذکرہ ہوتا یا اُس کے بیان کرنے کی ضرورت ہوتی یا آنحضرتؐ سے پوچھا جاتا تو خدا کی ہدایت سے بالکل صحیح و درست بتلا دیتے۔ مگر نہ اس کی ضرورت ہوئی نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا اور اسی وجہ سے ہم کو اور ذریعوں سے تحقیق کرنے کی بھی ضرورت پڑی۔ باقی جو کچھ واقدی نے کہا ہے وہ خاص واقدی کی رائے ہے۔ اس کے نزدیک معد بن عدنان تک نسب نامہ کی تحقیقات میں کچھ شبہ نہیں رہا۔ اس سے زیادہ اس کو تحقیق نہیں۔ اس لیے وہ کہتا ہے کہ معد بن عدنان سے زیادہ بیان کرنا کچھ ضرور نہیں۔ مگر ہماری تحقیق یہ ہے کہ برخیا کاتب الوحی ارمیا نبی کا لکھا ہوا شجرہ صحیح ہے اور وہ اسمٰعیل ابن ابراہیم تک پہنچا ہوا ہے۔

سر ولیم میور صاحب کا یہ کہنا ہم دل سے قبول کرتے ہیں کہ " یہ بات صاف صاف تسلیم کی جاتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ عدنان تک خالص عرب کی ملکی روایتوں سے لیا گیا ہے اور عدنان سے آگے یہودیوں سے"۔ مگر ہماری تحقیق اور سر ولیم میور کی تحریر میں اتنا فرق ہے کہ وہ اس عدنان تک عرب کی ملکی روایتوں کا نسب نامہ بتلاتے ہیں جو ہمارے مرتبہ کرسی نامہ میں پچاس نمبر پر ہے اور ہم اس عدنان تک ملکی روایتوں کا نسب نامہ قبول کرتے ہیں جو اکتالیس نمبر پر ہے۔ اور باقی کو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہود کی تاریخ سے لیا ہوا ہے۔

ہم کو اس بات کے دیکھنے سے نہایت تعجب ہوتا ہے کہ عیسائیوں نے اپنی کتابوں اور تحریریں کیوں اس امر کے ثابت کرنے میں بے فائدہ سعی کی ہے اور اپنا وقت ضایع کیا ہے اور قوائے عقلیہ و دماغیہ کو صرف کیا ہے جس سے ہم مسلمان کبھی منکر نہیں ہوئے۔ یعنی یہ امر کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے مذہب میں ایک تعلق ہے اور پچھلا پہلے پر مبنی ہے اور جب وہ اس امر کو نہایت سعی بے حاصل سے ثابت کر چکتے ہیں تو

ازراہ طعن ہم پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ ہم نے فلاں فلاں بات یہودیوں کے مذہب سے لی ہے۔ گویا مذہب اسلام میں ایسی بات نہیں ہے جو خود وہ اپنے اصول پر قایم ہو، بلکہ یہودیوں کے ہاں سے چرایا ہوا ہے اور جیسے کہ مذہب عیسائی بالکل مذہب یہود کا محتاج ہے ویسا ہی مذہب اسلام بھی یہود کا محتاج ہے۔ اگرچہ یہ امر کہ کونسا مذہب مسلمانی یا عیسائی زیادہ تر بلکہ بالکل مذہب یہود کا محتاج ہے ہر ایک پر روشن ہے مگر ہم خوشی سے اس امر مذکور کو تسلیم کریں گے کیونکہ جو مشابہت ان دونوں ربانی الہامی مذہبوں میں پائی جاتی ہے، اس سے انکار کرنے کے بدلے ہم اس کو اپنا نہایت فخر سمجھیں گے کہ ہم مسلمان ہی ہیں جو ہر ایک سچے اور خدا کے بھیجے ہوئے نبی کے سچے پیرو ہیں۔ ہم ہی یقین کرتے ہیں کہ آدم و نوح اور ابراہیم و یعقوب و اسحاق و اسمٰعیل و موسیٰ و عیسیٰ اور محمد صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین سب کا ایک ہی دین تھا۔ ہمارے پیغمبر کو خدا نے فرمایا کہ " یہودیوں اور عیسائیوں سے کہہ دے کہ ایک بات کو مان لو جو تمہارے ہاں بھی وہی ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا کے سوا اور کسی کو مت پوجو۔" ہم مسلمانوں کا ذاتی فخر یہی ہے کہ ہم یہودیوں سے زیادہ موسیٰ کلیم اللہ کے اور عیسائیوں سے زیادہ عیسیٰ روح اللہ کے پیرو ہیں جنھوں نے یحییٰ و عیسیٰ اور محمد رسول اللہ کے مبعوث ہونے کی خبر دی تھی اور ان کی پیروی کی ہدایت کی تھی۔ مگر یہودیوں نے ان تینوں کو اور عیسائیوں نے اس پچھلے کو جس پر ایمان کا خاتمہ تھا نہ مانا۔ مگر سچی پیروی عیسیٰ و موسیٰ کی ہم مسلمانوں ہی نے کی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب نامہ کی نسبت کیا بیہودہ گفتگو عیسائیوں نے کی ہے۔ خدا تعالیٰ کے اس وعدہ کا پورا ہونا جو اس نے بنی اسرائیل سے موسیٰ کی زبانی کیا کہ میں تمہارے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل میں سے موسیٰ کی مانند ایک نبی پیدا کروں گا، کچھ اس بات پر منحصر نہ تھا کہ بنی اسمٰعیل کی نسلیں محمدؐ سے لے کر اسمٰعیل تک ہم کو کامل ترتیب اور پوری تعداد سے یاد ہوں اور نہ اس بات پر اس کا انحصار تھا کہ وہ کرسی نامہ ہم عرب کی ملکی روایتوں سے یاد کریں یا یہود کی روایتوں اور برخیا کاتب الوحی ارمیا نبی کی تحریروں سے۔ وہ تو اسمٰعیل کی اولاد میں سے ایک کے لیے ہونا تھا تو محمد رسول اللہؐ کی نسبت پورا ہوا۔ تمام عرب اور یہود اور عرب کے قرب و جوار کی تمام قومیں اور تمام اگلے اور پچھلے مورخ خواہ وہ عرب کے رہنے والے ہوں یا کسی اور ملک کے مسلمان ہوں یا کسی اور مذہب کے اس بات میں ذرا بھی شبہ نہیں رکھتے بلکہ بالکل تسلیم کرتے ہیں کہ محمد رسول اللہؐ بنی ہاشم قریش اسمٰعیل ابن ابراہیم کی اولاد میں ہیں محمد رسولؐ نے قریش کو پکار کر مخاطب کیا کہ "ابیکم ابراھیم" جس کو سب نے تسلیم کیا اور کون ایسا شخص ہے کہ جس میں اس قدر جرأت ہو کہ وہ سچ بات کو تسلیم نہ کرے۔ چنانچہ ہم اس مقام پر چند رائیں عالم مورخوں کی نقل کرتے ہیں۔

ابو الفداء لکھتا ہے کہ

" نسب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عدنان تک متفق علیہ ہے، بغیر اختلاف کے اور اس میں بھی کہ عدنان اولاد اسمٰعیل ابن ابراہیم میں ہے کچھ اختلاف نہیں ہے لیکن اُن پشتوں کی تعداد میں اختلاف ہے جو عدنان اور اسمٰعیل کے درمیان میں ہیں پس بعضوں نے تو چالیس پشتوں کے قریب گنی ہیں اور بعضوں نے سات۔"

جن لوگوں نے جس شبہ سے سات گنی تھیں اس کی تفصیل ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، پس اصل میں وہ بھی کچھ اختلاف نہ تھا بلکہ صرف سمجھ کی غلطی تھی۔

مشہور مورخ مسٹر گبن جو تمام عالم میں مشہور ہے لکھتا ہے کہ محمدؐ کو حقیر اور مبتذل نسل سے کہنا عیسائیوں کا ایک احمقانہ افترا ہے۔ ایسا افترا کرنے سے بجائے اس کے کہ اپنے مخالف کی خوبیوں کو گھٹائیں، اس کی خوبیوں کو اور زیادہ بڑھاتے ہیں اسمٰعیل سے ان کی نسل کا ہونا ایک قومی تسلیم کی ہوئی بات اور ملکی روایت سے ثابت شدہ امر ہے۔ بالفرض اگر کرسی نامہ کی پہلی نسلیں بخوبی معلوم نہ ہوں اور ابہام میں ہوں تو اور بہت سی پشتیں ایسی ہیں جو صاف صاف شریف و نجیب ہیں۔ وہ

قریش اور بنی ہاشم ہیں جو اہل عرب میں نہایت نامی اور مکہ کے فرماں روا اور کعبہ کے موروثی محافظ تھے۔"

رونلڈ مسٹر فارسٹر صاحب بھی یہی گواہی دیتے ہیں اور ان کی گواہی ایسی ہے جو غالبًا انھوں نے خوشی سے نہ دی ہوگی۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اب تک ہم نے قیدار کا سراغ قدیمی جغرافیہ سے لگایا ہے۔ اب اس بات کا دیکھنا باقی ہے کہ قدیمی روایتوں کو عرب کی روایتوں کے ساتھ مقابلہ کرنے سے کیا ثبوت حاصل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یورپ کے نکتہ چینوں کی رائے میں عرب کی ایسی روایت جس کی تائید میں اور کوئی ثبوت نہ ہو گو کیسے ہی اعتراض کے قابل ہو مگر روایت کی جانچ اور پڑتال کے جو قوانین مسلّم ہیں ان کے مطابق اُن پر غور کرنے سے اس بات کا انکار ناممکن ہے اور وہ روایت مذہبی اور دنیاوی دونوں طرح کی تاریخ کے مطابق ہے۔ خاص عرب لوگوں کی یہ خاص قدیمی روایت ہے کہ قیدار اور اس کی اولاد ابتدا میں حجاز میں آباد ہوئی تھی۔ چنانچہ قوم قریش اور خصوصًا مکہ کے بادشاہ اور کعبہ کے متولی ہمیشہ اس بزرگ کی نسل میں ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اور خاص حضرت محمدؐ نے اسی بنیاد پر کہ اسمٰعیل کی نسل اور قیدار کی اولاد میں اپنی قوم کی دینی اور دنیوی عظمتوں کے استحقاق پر تائید کی ہے۔

صرف سر ولیم میور نے اپنی کتاب لائف آف محمد میں علما کی متفقہ رائے سے اختلاف کیا ہے۔ ہم اس اختلاف کے جانچنے پر مستعد و آمادہ ہیں۔ انھوں نے صرف اپنی قیاسی باتوں سے اُن حقیقتوں پر اعتراض کیا ہے جو آفتاب کی طرح روشن ہیں اور مذہبی اور دنیوی دونوں طرح کی تاریخ سے بلا کسی شبہ کے ثابت ہوتی ہیں۔ چنانچہ سر ولیم میور کہتے ہیں کہ جو کوششیں ہمیشہ مذہب اسلام کی روایتوں اور عرب کے قصوں کو توریت اور یہودیوں کی روایتوں سے مطابق کرنے کے واسطے کی گئی ہیں، اس کو بھی ہم اسی سبب سے منسوب کر سکتے ہیں۔ اس کلیہ کو خاص حضرت محمدؐ کے حالات حیات سے بہت کم تعلق ہے لیکن وہ اُن کے بزرگوں اور عرب کی قدیمی روایتوں سے ایک وسیع اور موثر تعلق رکھتا ہے۔ یہ خواہش کہ مذہب اسلام کے پیغمبر کو اسمٰعیل کی اولاد میں سے خیال کیا جاوے اور غالبًا یہ کوشش کہ وہ اسمٰعیل کی اولاد میں سے ثابت کیے جائیں اُن کی عین حیات میں پیدا ہوئے تھے اور اس پر محمدؐ کے ابراہیمی نسب نامہ کے ابتدائی سلسلہ گھڑے گئے تھے اور اسمٰعیل اور بنی اسرائیل کے بے شمار قصے نصف یہودی اور نصف عربی سانچہ میں ڈھالے گئے تھے۔

مگر سر ولیم میور کے اس خیال کی غلطی کیسی علانیہ ظاہر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کبھی اس بات کا خیال بھی نہیں ہوا کہ کوئی نسب نامہ ابراہیمؑ تک درست کیا جائے نہ کبھی اس بات کا دعویٰ ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اولاد ابراہیمؑ ثابت کرنے میں کوشش ہو۔ یہ ایک ایسی بات ثابت شدہ اور محقق تھی کہ جس میں کسی کو کسی جدید ثبوت کے تلاش کی حاجت نہ تھی۔ کیا آفتاب نصف النہار کے اثبات کا دن دہاڑے کسی کو خیال آسکتا ہے تمام قرآن مجید میں کہیں اس بات پر زور نہیں ڈالا گیا۔ تمام معتبر کتابیں حدیثوں کی اس مباحثہ سے خالی ہیں۔ چند نامعتبر روایتیں جو کئی صدی بعد وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیدا ہوئیں اور اس وقت پیدا ہوئیں جب کتابوں کی تصنیف کا سلسلہ شروع ہوا اور مصنفوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ لکھنا چاہا۔ ان کا بھی سلسلہ سند آنحضرتؐ تک نہیں پہنچایا گیا۔ پس یہ قیاس کرنا کیسا غلط قیاس ہے کہ یہ خواہش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں پیدا ہوئی تھی۔ ہمارے علماء نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ لکھنا چاہا تو اس کی تحقیقات کی اور اس کی نسبت جو ان کی رائے اور تحقیقات ہوئی بلا کسی تامل کے، بلا کسی خیال کے، بلا کسی تردد کے، بلا کسی دھکڑ پکڑ کے نہایت بے پروائی اور سادگی و صفائی سے لکھ دی، جس سے خود یہ بات ثابت ہوئی کہ مسلمانوں کے دل میں کبھی اس امر میں شبہ تھا نہ اُن کو تردد تھا نہ کبھی اُن کو اس بات کے ثابت کرنے کی فکر تھی اور نہ کبھی وہ چوری و فریب اُن کے دل میں تھا اور نہ کبھی اس کے ثبوت کے درپے تھے جس کا قیاس سر ولیم میور نے اپنی رائے

ں کیاہے۔ پس وہ اُن کا قیاس محض غلط ہے اور مطلق اعتبار کے
ئق نہیں ہے۔

اب ہم اس خطبہ کے خاتمہ میں اپنے پیغمبرؐ کا نسب نامہ جس
رح پر کہ ہم نے تحقیق کیا، مندرج کرتے ہیں اور جو کچھ مجھ کو بھی اس
ت کا فخر حاصل ہے کہ میں بھی اُسی آفتاب عالمتاب کے ذرّوں میں
ے ہوں۔ اس لیے اپنے نسب نامہ کو بھی اس کے ساتھ شامل کر دیتا
ں تاکہ جو روحانی ارتباط مجھ کو اس سرور دوجہاں سے ہے اور
جو خون کا اتحاد مجھ میں اور اس سرورِ عالم میں ہے اور جس کے سبب
"لحمک لحمی دمک دمی"
کا ہمارا موروثی خطاب ہے، اس ظاہری ارتباط سے بھی معزز
ہو جائے۔

گرچہ خوردیم نسبتے ست بزرگ
ذرّہ آفتاب تابانیم

سب نامہ محمد رسول اللہؐ تا حضرت ابراہیمؑ مع نسب نامہ مؤلف خطبات

تا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ابراہیم	۱۹۱۶ قبل مسیح	۱۷	بمنی	۳۳	ناسل	۴۷	الیسع
اسمٰعیل	۱۹۱۰ قبل مسیح	۱۸	یحرے	۳۴	ابی العوام	۴۸	اود دوم
قیدار		۱۹	یہری	۳۵	تساول	۴۹	ادو
عوام		۲۰	یلحن	۳۶	برو	۵۰	عدنان دوم
عوص اول		۲۱	حمران	۳۷	عوص دوم	۵۱	معد ثانی
مُر		۲۲	الرصا	۳۸	سلامان اول	۵۲	نزار
ے		۲۳	عبید	۳۹	الیسع اول	۵۳	مضر
رزاخ		۲۴	عنقد	۴۰	ادواول	۵۴	الیاس
ناجب		۲۵	عسقی			۵۵	مدرکہ
معصر		۲۶	ای	۴۱	عدنان اول سنہ ۶۰۰ قبل مسیح	۵۶	خزیمہ
ابہام		۲۷	ناحور	۴۲	معد اول سنہ ۵۰۰ قبل مسیح تک	۵۷	کنانہ
افتاد		۲۸	فاجم		ہمعصر ارمیا نبی	۵۸	النضر
عیسٰی		۲۹	کالح	۴۳	حل	۵۹	مالک
حسان		۳۰	یدلان	۴۴	ثابت	۶۰	فہر
عنقا		۳۱	یلدرم	۴۵	سلامان دوم	۶۱	غالب
ارعوا		۳۲	حرا	۴۶	الیسع دوم	۶۲	لوے۔

۶۳ کعب
۶۴ مرہ
۶۵ کلاب
۶۶ عبد مناف
۶۷ ہاشم
۶۸ عبد المطلب
۶۹ عبد اللہ

محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم

۲ فاطمہ زہرا رض امیر المومنین علی رض
ابن ابی طالب
ابن عبد المطلب
۳ امام حسین
۴ امام زین العابدین
۵ امام محمد باقر
۶ امام جعفر صادق
۷ امام موسیٰ کاظم

۸ امام علی موسیٰ رضا
۹ امام محمد تقی
۱۰ سید موسیٰ مبرقع
۱۱ سید ابی عبد اللہ احمد
۱۲ سید محمد اعرج
۱۳ سید محمد احمد
۱۴ سید احمد
۱۵ سید موسیٰ
۱۶ سید احمد
۱۷ سید محمد
۱۸ سید علی
۱۹ سید جعفر
۲۰ سید محمد
۲۱ سید عیسیٰ
۲۲ سید ابو الفتح
۲۳ سید علی
۲۴ سید یار حسین
۲۵ سید کاظم الدین حسین

۲۶ سید جعفر
۲۷ سید باقر
۲۸ سید موسیٰ
۲۹ سید شرف الدین حسین
۳۰ سید ابراہیم
۳۱ سید حافظ احمد
۳۲ سید عزیز
۳۳ سید محمد دوست
۳۴ سید برہان
۳۵ سید محمد عماد
۳۶ سید محمد ہادی — سید محمد مہدی
۳۷ سید محمد متقی

۳۸ سید محمد — سید احمد

سید محمد احمد
ولادت
۸ ربیع الاول
۱۲۵۹ ہجری
مطابق ۹ مئی
۱۸۴۳ء

سید احمد
مولف ہذا الطبقات
ولادت
پنجم ذیحجہ ۱۲۳۲ھ
مطابق
۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء

۳۹ سید حامد — سید محمود

سید حامد
ولادت
۲۲ صفر
۱۲۶۵ھ
مطابق
۲۰ فروری
۱۸۴۹

سید محمود
ولادت
۱۱ رجب
۱۲۶۶ھ
مطابق
۲۴ مئی
۱۸۵۰ء

مجھ کو اس بات کا رنج ہے کہ میں اپنی قوم میں ہزاروں نیکیاں دیکھتا ہوں، پر ناشایستہ، اُن میں نہایت دلیری اور جرأت پاتا ہوں، پر خوفناک؛ ان میں نہایت قوی استقلال دیکھتا ہوں، پر بے ڈھنگا؛ ان کو نہایت دانا اور عقل مند پاتا ہوں، پر اکثر مکر و فریب اور زور سے ملے ہوئے ان میں صبر و قناعت بھی اعلیٰ درجے کی ہے مگر غیر مفید اور بے موقع، پس میرا دل جلتا ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ اگر یہی ان کی عمدہ صفتیں عمدہ تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو جاویں تو دین و دنیا دونوں کے لیے کیسی کچھ مفید ہوں۔

سرسید

سرسید اور ہم

آل احمد سرور ★

ہر سال، ۱۷ اکتوبر کو ہم یوم سرسید مناتے ہیں۔ اس موقع پر یونیورسٹی میں ایک شاندار تقریب ہوتی ہے، جس میں سرسید کو خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ ایک سالانہ ڈنر بھی ہوتا ہے جس میں طلبا اور اساتذہ کے علاوہ اولڈ بوائے اور مہمان شریک ہوتے ہیں۔ سرسید ہاؤس میں آزاد لائبریری کی طرف سے سرسید کی تصانیف کی نمائش ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ سرسید میموریل لیکچروں کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ بعض شعبے ایسے جلسے کرتے ہیں جن میں سرسید پر مقالات پڑھے جاتے ہیں اور تقریریں ہوتی ہیں، تہذیب الاخلاق میں اس مہینے کے شمارے میں کچھ خصوصی مضامین بھی رہتے ہیں۔

یہ سب چیزیں بظاہر بہت کچھ معلوم ہوتی ہیں مگر دراصل ہم سرسید کو سال میں ایک دن ہی یاد کرتے ہیں باقی دنوں میں زیادہ تر بھلائے رہتے ہیں۔ ان سالانہ تقریبات پر مجھے اعتراض نہیں، یہ ضرور ہونی چاہیں مگر ان کو کافی سمجھنا، اس عظیم رہنما، معلم، مصلح اور مجاہد کے ساتھ بڑی بے انصافی ہے۔ سرسید اور ان کے کارناموں کی یاد تازہ رکھنا، سرسید کے سوز نفس سے اپنے دل کا آتش خانہ روشن کرنا، سرسید کے علمی ذوق، مذہبی جذبے، تہذیبی شعور، تعلیمی جد و جہد، سیرت گری کے اسرار و رموز، زبان و ادب سے شغف کو ذہن میں رکھ کر، ان کے چراغ سے چراغ جلا کر، آج کی پر آشوب اور پُر پیچ زندگی کی راہوں میں روشنی کے مینار بنانا، آج کے مسائل سے عہدہ برا ہونا اور آج کے سوالوں کے تسلی بخش جواب تلاش کرنا شاید ہی عقیدت کے اظہار سے زیادہ ضروری ہے۔ ہم مشرقی لوگ جذبات کے بندے ہیں۔ ذہن سے ابھی ہم نے پورا کام نہیں لیا ہے۔ ہم گل افشانی گفتار کو کام کا بدل سمجھتے ہیں۔ بت پرست نہ ہوتے ہوئے بھی ہم بت بنا لیتے ہیں اور اُن کی پرستش کرتے ہیں، ہم کسی تحریک کی روح کو نہیں دیکھتے ہم علی گڑھ تحریک کے حیات بخش اور حیات آفریں پہلو سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ ہم عرس مناتے ہیں عمل نہیں کرتے۔ ہم شاندار دعوتوں، جلسوں کی گرما گرمی، بلند آہنگ الفاظ کے طلسم وزیروں اور سیاست دانوں کی شرکت کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ اور ہمارا حال یہ ہے کہ ہمارے بیشتر طلبا، سرسید اور علی گڑھ تحریک کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ ہمارے بیشتر اساتذہ اپنے محدود دائرے میں مگن ہیں ان میں علمی کاموں اور تصنیف و تالیف کے لیے ولولہ کم ہے ہاں ترقی کے موقع پر کچھ جلدی میں تیار کی ہوئی کتابیں ضرور نکل آتی ہیں علاوہ برایں انھوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم، اقتصادی حالت، سماجی زندگی ادبی میلان کے سلسلے میں سارے اعداد و شمار جمع کیے ہیں نہ اُن کا پورا جائزہ لیا ہے۔ خود سرسید کی تصانیف کا کوئی اچھا ایڈیشن نہیں ہے جس میں آثار الصنادید، آئین اکبری، اسباب بغاوت ہند سرسید کی تفسیر، تہذیب الاخلاق اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے سارے مضامین مناسب حواشی اور تنقید کے ساتھ مل جائیں۔ حیات جاوید کے ایک ایسے ایڈیشن کی بھی ضرورت ہے جس میں جدید معیار کے مطابق حالی کے اس شاہکار کو پیش کیا جائے۔ عیسائیوں کے کالجوں

★ سابق صدر شعبۂ اردو۔ اے ایم یو، علی گڑھ

سرسید نگر۔ علی گڑھ

میں ایک بہت اچھی رسم یہ ہے کہ ہر ہائی اسکول پاس طالب علم کو "عہد نامہ جدید" کی ایک جلد اور ہر گریجویٹ کو پوری بائبل تحفے میں دی جاتی ہے۔ ہم یہ بھی نہیں کر سکتے کہ ہر طالب علم کو داخلے کے بعد سرسید اور ان کے کارناموں کے متعلق ایک کتابچہ ہی پیش کر دیں۔ یہ کتابچہ اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندی میں بھی ہونا چاہیے۔

سرسید کی تحریک ایک تعلیمی، تہذیبی، ادبی اور سیاسی تحریک تھی لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اس کے کچھ دور رس منصوبے تھے اور کچھ وقتی پروگرام۔ انگریزی زبان کے ذریعے سے مغربی علوم کی تعلیم مقصود تھی، تاکہ ہم عالمی معیاروں تک پہنچ سکیں صرف انگریزی پڑھ کر "بی۔ اے کیا نوکر ہوئے، پنشن ملی اور مر گئے" منزل مقصود نہ تھی۔ انگریزی ذریعۂ تعلیم، عالمی معیاروں کے لیے کنجی تھی، صرف ملازمت کی کلید نہ تھی۔ اس تحریک کا مقصد جاگیردارانہ تہذیب کے تصور کو بدلنا تھا اور علم و عمل کے ذریعے سے صرف بالائی طبقے کی خوش حالی نہیں، عوام کے معیار زندگی کو بہتر بنانا اور ان کو اخلاقی، سماجی اور جمالیاتی قدروں سے آشنا کرنا تھا۔ اس کا مقصد ادب کو بدلتی ہوئی زندگی کا ترجمان علم کے فروغ سے پرمغز اور تاریخ اور تہذیب کے جامع تصور سے نوائے سینہ تاب بنانا تھا۔ یہ اگر اس وقت سیاسی سرگرمیوں کے مقابلے میں تعلیمی اور تہذیبی کوششوں کو زیادہ اہمیت دیتی تھی تو بقول جواہر لال نہرو درست تھا، مگر یہ کوئی ایسا اصول نہ تھا کہ جس کی اندھی تقلید کی جائے اس وقت سیاسی سرگرمیوں کے مقابلے میں ذہن کو جدید بنانا اور تعلیمی پسماندگی کو دور کرنا زیادہ ضروری تھا۔ ذہن کو جدید بنانے اور تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کا کام ابھی پورا نہیں ہوا، مگر آزادی کے بعد اس کے ساتھ ایک سیاسی شعور بھی ضروری ہے۔ اس وقت ہم مغرب کے غلام تھے، آج ہم آزاد ہیں مگر آزادی کچھ نئے مسائل اور نئے امکانات بھی لائی ہے جن کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آزاد ہندوستان میں ملک سے وفاداری کے معنی کسی طرح حکومت وقت سے وفاداری کے نہیں، جمہوری، سیکولر اور سوشلسٹ سماج کی طرف گامزن ملک سے وفاداری کا سوال ہے۔ ہمارے اساتذہ اور طلبا، کو جمہوری اور سیکولر مزاج پیدا کرنا ہے۔ اپنے مذہبی اور تہذیبی تشخص پر اصرار کرتے ہوئے قومی تشخص پیدا کرنا ہے۔ غالب نے غلط نہیں کہا ہے ؎

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

گویا معاملہ رنگوں کی کثرت پر جبیں بر جبیں ہونے کا نہیں، بہار کے اثبات پر زور دینے کا ہے۔ بہار کا اثبات ایک سائنسی مزاج چاہتا ہے جو کار کشا بھی ہو، کارساز بھی اور کار آفریں بھی۔ یہ ایک اجتماعی شعور چاہتا ہے تاکہ ہم پورے سماج اور خصوصاً پسماندہ حصوں کے سارے حالات کا علم رکھیں۔ یہ انہیں ایسی قدریں دینے کا مطالبہ کرتا ہے جو ذاتی خوش حالی اور صارفیت سے ذہن ہٹا کر، مادی اور ذہنی آسودگی کی منزل کی طرف لا سکے۔ یہ اپنے کلاسیکی ادب کا عرفان چاہتا ہے تاکہ اس عرفان کے ذریعے سے ہمیں اظہار و ابلاغ کے مینار ملیں اور ان کی روشنی میں ہم جدید ادبی فضا سے روشناس ہو سکیں۔ یہ زبان کی وہ پکی بنیاد چاہتا ہے جس کے وسیلے سے خیالوں کے رنگ محل بنائے جا سکیں۔ یہ یگانہ کے اس شعر کو سب کے دل کی آواز بنانا چاہتا ہے۔

صد رفیق و صد ہمدم پر شکستہ و دل تنگ
داورا نمی زیبد بال و پر بمن تنہا

سچی بات یہ ہے کہ ہم وقت کے دھارے پر تنکے کی طرح بہہ رہے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی پروگرام نہیں، کوئی منصوبہ نہیں، قدروں کا کوئی تصور نہیں۔ بے شک ملک میں لاقانونیت، فرقہ پرستی، تشدد، تنگ نظری، رشوت ستانی بڑھ رہی ہے۔ ہم ان کا ماتم کرتے ہیں، ان کا مقابلہ نہیں کرتے۔ ہر شخص اپنے خانہ باغ کی آرائش میں لگا ہوا ہے ہمیں نہ فضا میں آلودگی کا احساس ہے نہ ہم ہاتھ سے کام کرنے کی فضیلت کے دل سے ماننے والے ہیں۔ ہم تعلیم اور ہنر مندی میں فرق نہیں کرتے اور سچی بات یہ ہے کہ ہنر مندی کے لیے وہ ریاض بھی نہیں کرتے جس کی ضرورت ہے۔ ہمارے عوام تو بہر حال مشکل حالات میں اپنی بہتری کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں مگر ہمارا متوسط طبقہ اپنی ذات کو خلاصۂ کائنات سمجھتا ہے۔ وہ کتابوں سے زیادہ تعیش کے

کے ساز و سامان Luxury Goods پر نظر رکھتا ہے۔ ہمارے طلبا کو مراعات کا عادی بنا دیا گیا ہے۔ ہمارے اساتذہ ذہنی قیادت نہیں کر سکتے۔ سماجی، اخلاقی، جمالیاتی قدریں عام نہیں کر سکتے۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو ملازمت کے ساتھ دوسرے نفع بخش کام بھی کرتے ہیں مگر ان سے کوئی باز پرس نہیں کرتا۔ سینٹ جانسن کالج میں ہم لوگ ہفتے میں ایک دن جا کر بستی کی گندی گلیوں کی صفائی کرتے تھے۔ علی گڑھ کے طلبا اپنے ہوسٹل کے گرد گندگی کو بھی دور نہیں کر سکتے۔ ان ہوسٹلوں میں چمن بندی کے کام بھی مالی کرتے ہیں۔ ہماری تجربہ گاہیں روشنائی اور ضرورت کی معمولی چیزیں بھی تیار کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتیں۔ ہم میں چند ہی ایسے ہیں جو علم کی پیاس رکھتے ہیں اور جدید ترین معلومات و مسائل سے آشنا ہیں۔ ہم اعتراض کر سکتے ہیں، اصلاح نہیں کر سکتے۔ ہمارے پریس سے جو کتاب چھپتی ہے وہ بازار کے نرخ سے مہنگی چھپتی ہے ہمارے اسٹور سے جو چیزیں ملتی ہیں وہ دوسری جگہوں سے مہنگی ہیں ہمارے طلبا میں صلاحیت ہے مگر اس صلاحیت کا اظہار مقابلے کے امتحانوں میں نہیں ہوتا کیوں کہ ان کی تیاری اس طرح نہیں ہوتا جس طرح کتنے لوگ ایسے ہیں جو جدید ترین معلومات پر نظر رکھتے ہیں جو کتابیں خرید کر پڑھتے ہیں جو صرف لکچروں کی تعداد پوری نہیں کرتے بلکہ علم عطا کرتے ہیں، جو طلبا کو اعلیٰ قدروں کا احساس دلاتے ہیں جو ان کی ذہنی تربیت کرتے ہیں۔

سرسید نے کام کرنے والوں کی ایک ایسی فوج تیار کر دی تھی جن میں نظر تھی، دھن تھی، استقلال تھا اور عمل کی صلاحیت تھی۔ آج کی دنیا ہم سے سرسید کی سیرت گری مانگتی ہے، سرسید کی روشن خیالی مانگتی ہے، سرسید کا تصنیف و تالیف سے شغف مانگتی ہے سرسید کی ادبی بصیرت مانگتی ہے۔ سرسید کا انتھک عزم مانگتی ہے جو مشکلات میں سپر ہو اور سب سے زیادہ وہ دور بین و دوررس وژن (VISION) مانگتی ہے جو قوموں کی تقدیر بناتا ہے اور وقت کی آواز کہلاتا ہے۔ سرسید کا نام لیتے رہنا اور سرسید کے مشن کی روح کو نظر انداز کرنا کیا یہی ہمارا شیوہ رہ گیا ہے؟

ارسطو نے تعلیم کے اثر کو مجسم مورتوں کے بنانے کی تشبیہ میں نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ موہنی مورت ایک پتھر کے ڈھوکے میں چھپی ہوئی ہوتی ہے، مگر مورت بنانے کا ہنر صرف فضول چیزوں کو اس میں سے گھڑ دیتا ہے۔ مورت تو پتھر ہی میں ہوتی ہے، مگر آذر صرف اس کو نمود کر دیتا ہے۔ جو نسبت کہ مورت گھڑنے والے کو اس پتھر کے ڈھوکے سے ہے، وہی نسبت تعلیم کو انسان کی روح سے ہے۔

سرسید

سرسید احمد خاں ـــ ایک روشن خیال مذہبی مفکر

محمد سالم قدوائی★

سرسید جس عہد کے پروردہ تھے اس میں لوگوں کا اندازِ فکر بدلنے لگا تھا، دورِ جدید کے تقاضے ابھر کر سامنے آگئے تھے اور مسلمانوں کو بالخصوص اپنی راہ کا تعین پورے عقل و ہوش کے ساتھ کرنا تھا۔ مختلف قسم کی تحریکیں اس سلسلہ میں شروع ہو چکی تھیں۔ سرسیّد کو اللہ تعالیٰ نے وہ نظر عطا کی تھی جو آئندہ صدیوں میں ہونے والی تبدیلیوں اور مسلمانوں کی پستی زوال اور کم ہمتی کو پوری طرح سے دیکھ رہی تھی۔ سرسیّد نے اپنی خداداد صلاحیتوں اور بھرپور عزم و حوصلہ کی بنیاد پر اس کا علاج بھی سمجھ لیا تھا اور ایک اچھے ڈاکٹر کی طرح اپنی ذمہ داری کو پورا کرنے میں لگ گئے۔ اپنی تشخیص کو انھوں نے بغیر کسی جھجک کے قوم کے سامنے پیش کیا۔ اپنے وسائل اور اپنی جد و جہد صرف اس نقطہ پر مرکوز کی کہ سوتوں کو جگائیں، کڑوی اور بدمزہ دواؤں کو آبحیات سمجھ کر پینے کی ترغیب دیں اور لوگوں کو اس بے خبری سے آگاہ کریں جو ان کی زندگی کو گھن کی طرح لگ چکی ہے۔

سرسیّد نے اپنے اس مشن کے لیے ایک طرف تو تعلیمی ترقی کا بیڑا اُٹھایا، دوسری طرف سماجی اصلاح اور گھسے پٹے مذہبی تصورات کو یکسر بے بنیاد اور محض خیالی اور وہمی ثابت کیا، اس سلسلے میں انھوں نے بے شمار مضامین، کتابیں اور رسائل لکھے اور اپنی آواز کو ہر جگہ اور ہر مکتب فکر کے سامنے پیش کیا۔ اس وقت میں ان کے مذہبی افکار کو ان کی تفسیر کی روشنی میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ویسے تو اُن کے یہ خیالات دوسری اور بھی جگہوں پر نمایاں طور پر نظر آتے ہیں لیکن جو فکری انداز انھوں نے اپنی تفسیر میں پیش کیا ہے وہ یقیناً غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور اگر پہلے سے تعصب کی عینک نہ لگائی جائے تو بہت سے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔

سرسیّد کی تمام تصانیف میں ان کی تفسیر سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے، بہت سے علما اسی تفسیر کی بنیاد پر ان سے خفا تھے اور ملحد و کافر سمجھتے تھے۔ اس تفسیر کا سرورق اگر ہٹا دیا جائے اور اسے ایک عام تفسیر کی طرح پڑھا جائے تو اس بات کا اندازہ ہوگا کہ تفسیر لکھتے وقت سرسیّد کا ہرگز وہ مقصد نہ تھا جو لوگوں نے بعض مخصوص وجوہ سے ان کی طرف بعد میں منسوب کر دیا۔ سرسیّد ایک سچے مسلمان تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اسلام کے تمام اصول و ضوابط عقل کے مطابق ہیں اور قرآن مجید میں کوئی بات ایسی نہیں کہی گئی ہے جو عقل انسانی کی حدود سے بالاتر ہو۔ ان کے عقائد کا خلاصہ یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ خدا ایک ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا وہ دنیا کا پیدا کرنے والا اور کائنات کو بنانے والا ہے۔

۲۔ اللہ اور اس کے رسول کا کلام حقیقت اور واقعہ کے خلاف نہیں ہو سکتا۔

۳۔ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اس میں بیان کی گئی باتیں بالکل

★ ریڈر شعبۂ علوم اسلامیہ ـ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سچ نہیں۔ جن آیات کو بظاہر خلاف واقع یا متضاد سمجھا جاتا ہے، ان کو سمجھنے سے ہم قاصر ہیں اسی لیے ایسا سمجھتے ہیں۔

۴۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی بھی انسان ایسا نہیں ہے جس کے قول و فعل کو مذہبی امور میں رہنما تسلیم کیا جا سکتا ہو۔

۵۔ جو احادیث مذہبی امور سے متعلق ہیں اور جو دنیاوی امور سے متعلق ہیں ان میں فرق کرنا چاہیے اور صرف اوّل الذکر کو اگر ان کا قولِ رسول ہونا حتمی طور پر ثابت ہو تو واجب العمل تسلیم کرنا چاہیے۔

۶۔ انسان خارج از طاقت کاموں کے لیے مکلف نہیں ہے۔

۷۔ اسلام کے تمام احکام فطرت کے عین مطابق ہیں اور فطرت کا خالق خدا تعالیٰ ہے۔

قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر پر نازل کیا چونکہ آپ کے بعد کوئی دوسرا نبی آنے والا نہیں تھا، اس لیے جو کتاب آپ پہ نازل کی گئی اس کو لازمی طور پر ایسا ہونا چاہیے تھا کہ جب تک دنیا قائم ہے، اس سے ہر قسم کے مسائل کو حل کیا جا سکے۔ قرآن مجید کا سب سے اہم معجزہ اور اہمیت یہی ہے کہ نازل ہونے کے بعد سے اب تک وہ ایک ایسے دستور کا کام دیتا رہا ہے جو دینی اور دنیوی مسائل کے حل اور ان کی ہم آہنگی کے لیے اپنی مثال آپ ہے۔

رسول اللہ صلعم قرآن کے پہلے مفسر تھے۔ صحابۂ کرام کو جو مسائل پیش آتے وہ آپ سے پوچھ لیتے اور آپ حالات اور قرآنی دستور کی روشنی میں ان کا حل بیان کر دیتے۔ آگے چل کر جب تفسیر ایک باقاعدہ فن بنا تو مفسرین کے الگ الگ اسکول بن گئے اور مختلف نقطۂ نظر اور انداز فکر پر تفسیریں لکھی جانے لگیں۔

جوں جوں زمانہ ترقی کرتا رہا۔ لوگوں کے سوچنے اور سمجھنے کے انداز بھی بدلتے اور آگے بڑھتے رہے۔ ہر زمانے میں اس بات کی کوشش ہوتی رہی کہ قرآن کے مفہوم و مطالب کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھا جائے اور چونکہ یہ ہمیشہ باقی رہنے والی کتاب ہے جو ہر زمانہ اور ہر قسم کے لوگوں کے لیے رہنما اصول اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس لیے اسے زیادہ سے زیادہ حالات اور سماج سے ہم آہنگ رکھا جائے۔ ہندوستان کے بدلتے ہوئے حالات میں سرسید نے اس ضرورت کو سب سے پہلے محسوس کیا۔ انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی اصلاح اور ان کی فلاح کا بیڑا اٹھایا اور اپنی زندگی کو مسلمانوں اور اسلامی علوم کی ترقی کے لیے وقف کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو اپنے عقائد و معاملات میں پختہ اور علوم جدیدہ سے پوری طرح واقف ہونا چاہیے یہ ان کی ترقی کے لیے ضروری ہے اور اس کی بنیاد قرآن اور سنت پر ہونا چاہیے۔ وہ کہتے تھے کہ مسلمانوں میں اوہام پرستی عقائد کی شکل اختیار کر گئی ہے اور اسی وجہ سے وہ مذہب کی سچی روح کو پوری طرح سمجھ نہیں پاتے۔ انھوں نے خود مذہب کو سمجھنے کے لیے قرآن مجید کا اور اس دور کی مروجہ تفسیروں کا مطالعہ کیا تو اُن کو اندازہ ہوا کہ وہ زیادہ تر کمزور روایات اور مفروضہ قصوں سے بھری ہوئی ہیں اور قرآن مجید کے بنیادی اصولوں اور قانون فطرت سے میل نہیں کھاتیں۔ اس کے بعد انھوں نے اصول تفسیر کی کتابوں کا مطالعہ کیا تا کہ اندازہ کر سکیں کہ تفسیر لکھنے کے بنیادی اصول کیا ہیں لیکن یہاں بھی ان کو ایک ایسی بات نہ مل سکی جس سے ان کی تشفی ہوتی۔ اس کے بعد انھوں نے اس سلسلہ میں خود قرآن مجید کا غور سے مطالعہ کیا۔ خود لکھتے ہیں؛

"پھر میں نے بقدر اپنی طاقت کے خود قرآن مجید پر غور کیا اور چاہا کہ قرآن ہی سے سمجھنا چاہیے کہ اس کا نظم کن اصولوں پر واقع ہوا ہے اور جہاں تک میری طاقت میں تھا میں نے سمجھا اور پایا کہ جو اصول خود قرآن مجید سے نکلتے ہیں ان کے مطابق کوئی مخالفت علوم جدیدہ میں نہ اسلام سے ہے، نہ قرآن سے، پھر انھیں اصولوں پر ایک تفسیر قرآن مجید کی لکھنی شروع کی۔"

سرسید نے جس وقت یہ تفسیر لکھی مخالفتوں کا سیلاب امنڈ پڑا اور ادھر کفر کے فتوے لگنے لگے مگر انھوں نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہ دی۔ اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ جو لوگ ان کی جدید تعلیم اور انگریزی کے حصول کی تحریک کو پسند نہ کرتے تھے، وہ قرآن مجید کی اس تفسیر کو جو علوم جدیدہ کے تقاضوں کے پیش نظر لکھی گئی تھی اور جس میں اندھی تقلید کے مقابلے میں عقل کی ترجمانی کی گئی تھی کسی طرح پسند نہ کریں گے لیکن جب ان کے قریبی دوست بھی ان کی طرف سے شکوک و شبہات میں مبتلا ہونے لگے تو انھوں نے جن اصولوں کے پیش نظر یہ تفسیر لکھنی شروع کی تھی انھیں ایک رسالہ کی شکل میں لکھ دیا جس کا نام انھوں نے "تحریر فی اصول التفسیر" رکھا۔ یہ پندرہ اصول ہیں جو مع تشریح کے اس رسالے میں موجود ہیں۔

نواب محسن الملک کے نام ایک خط میں سرسیّد نے اپنی تفسیر کے انداز اور اصولوں پر اس طرح روشنی ڈالی ہے :

"جانِ من! حقیقت یہ ہے کہ تم نے خدا کی عظمت کا جس عظمت کے وہ لائق ہے اور قرآن مجید کی صداقت کا جس صداقت کے وہ لائق ہے اور مذہب اسلام کی سچائی اور عظمت کا جس عزت اور سچائی کے وہ لائق ہے اپنے دل پر نقش کا لحاظ نہیں کی ہے۔ اس لئے تمہاری رائے اور تمہارا دل اور تمہارا ایمان ڈانواڈول ہوتا ہے۔ اگر تمام خیالات کو دل سے محو کرکے یہ سچائی اور دلی یقین کر لو کہ خدا سچا ہے اور قرآن اس کا کلام اور بالکل سچا ہے تو تم کو اس قسم کے شبہات ہرگز پیدا نہ ہوں گے"۔

اس خط میں آگے چل کر وہ اصول بھی مختصراً بیان کیے ہیں جو انھوں نے تفسیر لکھنے کے لیے طے کیے تھے۔

پہلا اصول یہ ہے کہ خدا سچا ہے اور قرآن مجید اس کا کلام اور بالکل سچ ہے اور صحیح ہے اور کوئی علم یعنی سچ اس کو جھٹلا نہیں سکتا بلکہ اس کی سچائی پر زیادہ روشنی ڈالتا ہے۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ اب ہمارے سامنے دو چیزیں موجود ہیں ۱۔ ورک آف گاڈ یعنی خدا کے کام۔ ۲۔ ورڈ آف گاڈ یعنی خدا کا کلام یعنی قرآن مجید۔ ورک آف گاڈ اور ورڈ آف گاڈ کبھی مختلف نہیں ہو سکتا۔ اگر مختلف ہو تو ورک آف گاڈ تو موجود ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا اور اس لیے ورڈ آف گاڈ جس کو کہا جاتا ہے اس کا جھوٹا ہونا لازم آتا ہے۔ نعوذ باللہ منہا اس لیے ضرور ہے کہ دونوں متحد ہوں۔

تیسرا اصول۔ ورک آف گاڈ یعنی قانون قدرت ایک عملی عہد خدا کا ہے اور وعدہ اور وعید یہ قولی معاہدہ ہے اور ان دونوں میں سے کوئی بھی خلاف نہیں ہو سکتا۔

چوتھا اصول۔ خواہ یہ تسلیم کرو کہ انسان مذہب یعنی خدا کی عبادت کے لیے پیدا ہوا ہے خواہ یہ کہو کہ مذہب انسان کے لیے بنایا گیا ہے دونوں حالتوں میں ضرور ہے کہ انسان میں بہ نسبت دیگر حیوانات کے کوئی ایسی چیز ہو کہ وہ اس بار کے اٹھانے کا مکلف ہوا اور انسان میں وہ شے کیا ہے۔ عقل ہے اس لیے ضرور ہے کہ جو مذہب اس کو دیا جاوے وہ عقل انسانی کے ما فوق نہ ہو۔ اگر وہ عقل انسانی کے ما فوق ہے تو انسان اس کا مکلف نہیں ہو سکتا۔

یہی وہ بنیادی اصول تھے جن کو تفسیر لکھتے وقت سرسیّد نے اپنے سامنے رکھا۔ سرسیّد کے دور میں نئی فکریں، نئی قدریں اور نئے تخیلات اُبھر کر سامنے آ رہے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کی پستی اور ابتری حالت کو اچھی طرح سے سمجھ لیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ مسلمانوں نے اپنے مذہب کی سچی روح کو نہیں سمجھا ہے۔ وہ محض تقلید کے قائل ہیں اور ان کے نزدیک خدا کی کتاب بجائے عملی چیز کے نمازوں میں پڑھی جانے والی سورتوں کی کتاب بن کر رہ گئی ہے۔ سرسیّد اسلام کو صحیح معنوں میں سچا مذہب سمجھتے تھے اور اُن کا یقین تھا کہ جو مذہب سچا ہے وہ ہر زمانے اور ہر ماحول کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے وہ کہتے تھے کہ اگر مسلمان قرآن کو پوری طرح سمجھیں تو اُن کو اس کا پتہ چلے گا کہ اس میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ کسی خاص وقت یا مخصوص حالات کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہیں۔

سرسیّد کے نزدیک قرآن کا معجزہ محض اس کی ظاہری فصاحت و بلاغت نہیں ہے بلکہ اس کا اصل اعجاز وہ تعلیمات و احکامات ہیں جو قانون فطرت کے مطابق ہیں، ہر زمانے کے لیے ہیں اور ہر شخص کی سمجھ میں آسانی سے آ سکتے ہیں۔ ان کے مذہبی عقیدے کی بنیاد اس پر تھی کہ قرآن مجید اور قانون فطرت میں مکمل ہم آہنگی ہے۔ چونکہ ان دونوں کا تعلق ذات واحد سے ہے۔ اس لیے ان دونوں میں کسی قسم کا اختلاف کسی لمحہ بھی نہیں ہو سکتا۔ کائنات اللہ کا عمل اور قرآن مجید اس کا قول ہے۔ اللہ کے قول اور فعل میں تضاد کیونکر ممکن ہے۔ وہ قرآن کے احکامات کو ہر زمانے کے لیے واجب العمل سمجھتے تھے لیکن ان کو اس کی بہت سی تفسیروں اور تاویلوں سے جو بعض مفسرین نے کی تھیں، اختلاف تھا۔ ان کے نزدیک قرآن مجید اللہ کی وحدانیت اس کے احکامات، اچھے اخلاق اور حسن معاشرت کی تعلیم دیتا ہے۔ سرسید قرآن مجید کو تاریخی یا کوئی فنی کتاب نہیں سمجھتے، وہ قرآن مجید میں کسی ناسخ و منسوخ کے بھی قائل نہیں

تفسیر لکھتے وقت سرسید کے پیش نظر یہی باتیں تھیں، اسی وجہ سے ان کی تفسیر میں بہت سی ایسی باتیں ملتی ہیں جو دوسرے مفسرین سے بالکل مختلف

ہیں۔ خاص طور سے ان مقامات پر جہاں وہ ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور صرف قصے کہانیوں کو تسلیم نہیں کرتے۔ مثلاً حضرت عیسیٰ کے بغیر باپ کے پیدا ہونے اور آسمان پر زندہ اٹھائے جانے سے انکار کرتے ہیں۔ بڑی تفصیل سے اس بات پر بحث کی ہے، وہ ان دونوں باتوں کو قرآن ہی کی روشنی میں غلط ثابت کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ قرآن مجید میں کوئی ایسی مثال نہیں ہے جس سے کوئی غیر فطری بات ہونے کا پتہ چلتا ہو اور کوئی بات قانونِ فطرت کے خلاف پڑتی ہو۔

جنوں کے متعلق بھی سرسید کا دعویٰ ہے کہ ایسی مخلوق کا وجود قرآن سے ثابت نہیں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جنوں کا ذکر ہے وہاں انسانوں کی ایک قدیم وحشی قوی ہیکل قوم مراد ہے۔ اس سلسلے میں بھی انھوں نے بہت تفصیل سے بحث کی ہے اور اپنی بات کا ثبوت اشعار عرب اور لغات عرب سے پیش کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ جن کا اطلاق زمانۂ جاہلیت میں جنگلی و وحشی قوموں پر ہوتا تھا اور وہ سب انسان تھے اور وہ وہمی اور خیالی وجود جن کی عرب پرستش کرتے تھے اور جنھیں جن سے تعبیر کرتے تھے قرآن مجید سے ان کا وجود ثابت نہیں ہے۔

اسی طرح سرسید نے حضرت آدمؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت یوسفؑ، ہاروت ماروت، طالوت و جالوت اصحاب فیل، ملائکہ و شیطان اور معجزات وغیرہ کے واقعات و حالات کی تفسیر کے افسانوی انداز بیان کو عقل و فہم سے دور قرار دیا ہے اور تفسیر کرتے وقت اس بات کی کوشش کی ہے کہ افسانہ اور حقیقت کو الگ الگ کرکے دکھایا جائے۔ انھوں نے بار بار عقل انسانی کو جھنجھوڑا ہے اور یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ قرآن مجید میں جو بھی واقعات پرانے زمانے اور لوگوں کے بیان کئے گئے ہیں وہ قرین قیاس اور عقل انسانی کی حدود کے اندر ہیں۔ قرآن مجید کی ان باتوں کو عقلی انداز سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اسرائیلی اور یہودی روایات کو اس سلسلے میں بنیاد نہیں بنانا چاہیے۔ پروفیسر محمد عمر الدین نے اپنے ایک مضمون "سرسید کا نیا مذہبی طرز فکر" میں سرسید کے مذہبی خیالات پر یوں روشنی ڈالی ہے جس سے سرسید کے مذہبی خیالات و عقائد کی پوری ترجمانی ہوتی ہے:

"اس میں شک نہیں کہ سرسید کے مذہبی فکر کا یہ مرکزی عقیدہ کہ الاسلام ھو الفطرۃ و الفطرۃ ھی الاسلام" آج اصولی اعتبار سے تمام مفکرین و مویدین اسلام کے نزدیک شرف قبولیت حاصل کر چکا ہے۔ اقبال، مودودی بلکہ قدیم طرز پر تعلیم پائے ہوئے حضرات علما بھی اسلام کو دین فطرت تسلیم کرنے میں سرسید کے ہمنوا ہیں۔ یہی ان کے کارنامے کی اہمیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ لیکن ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ سرسید نے اپنے زمانے کے شبہات اور ضروریات کے لحاظ سے اس زمانے کے مسلمات اور معلومات کی روشنی میں اپنے اجتہادات پیش کیے ہیں۔ ان میں سے بعض چیزیں صرف وقتی اہمیت کی حامل تھیں لیکن بعض مستقل قدر و قیمت بھی رکھتی ہیں۔ ہمیں ان کے فلسفے اور تصانیف میں سے ان عناصر کو جو زندہ رہنے والے ہیں اور مستقل قدر و قیمت رکھتے ہیں، لینا چاہیے۔ اور ان کی بنیاد پر نئی ضروریات نئے مسائل اور نئی معلومات کی روشنی میں اسلامی فکر کو آگے بڑھانا چاہیے۔ اسلامی فکر کی نئی تشکیل کے سلسلے میں ہمیں پوری سنجیدگی اور ذمہ داری سے سرسید کے پیش کیے ہوئے ان اصولوں پر غور کرنا ہوگا۔ ان مسائل سے متعلق ہم چاہے کسی نتیجے پر پہنچیں لیکن ان کی جسارتِ فکر، ان کے خلوص نیت اور اس راہ میں ان کی اولیت سے انکار ممکن نہیں۔"



سر سیّد

عالم عرب کے چند ممتاز مفکرین کی نظر میں

فیضان احمد*

انیسویں صدی میں دنیا بھر میں آزادی، بیداری اور خود شعوری کی جو لہر اٹھی اس سے کوئی خطۂ ارض محفوظ نہ رہ سکا۔ ہر جگہ ایسی شخصیات اور تحریکیں وجود میں آئیں جنھوں نے اپنے ملک و ملت کو ترقی و عظمت کے مقام پر پہنچانے کے لیے تگ و دو شروع کی۔ عالم اسلام میں بیداری کی لہر تو آگئی تھی مگر واضح مقصد اور لائحہ عمل کے فقدان کی وجہ سے راہِ راست کا تعین نہیں ہو پا رہا تھا۔

برصغیر ہند و پاک میں ایک غیر ملکی استعمار برسر اقتدار تھا۔ اس کے اقتدار کو سب سے بڑا خطرہ آزادی اور بیداری کی ہی تحریک سے تھا اس وجہ سے اس نے اسے کچلنے کے لیے ہر اس حربے کو استعمال کیا جو کسی نہ کسی شکل میں کارگر ثابت ہو سکتا تھا۔ اسلام چونکہ غلامی اور جبر و استبداد کے عین مخالف ہے، اس وجہ سے مسلمان آزادی اور بیداری کی اس تحریک میں پیش پیش رہے۔ نتیجتاً انگریزوں کے جبر و استبداد کا قہر ان پر سب سے زیادہ ٹوٹا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں تو ان کی کمر ہی ٹوٹ گئی۔ خوف و ہراس اور سراسیمگی کا یہ عالم ہوا کہ وہ زندہ بدست مردہ کی عملی تصویر بن گئے۔ ان کو دور دور تک کوئی راہ فرار دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اب صرف ذلت و مسکنت اور پستی ان کا مقدر بن گئی تھی۔ اس صورت حال کی تبدیلی کے لیے کافی غور و فکر کے بعد ایک واضح مقصد اور لائحہ عمل کے ساتھ ایک شخص میدان میں آتا ہے اور اس راہ میں اپنا پورا سرمایۂ حیات لٹا دیتا ہے۔ اس کے افکار و نظریات سے آپ لاکھ اختلاف کریں لیکن ایک قلیل عرصے میں اس نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور اصلاح کے لیے جو کارنامہ انجام دیا ہے اس کی نظیر اس صدی میں کم ہی ملے گی۔

سر سیّد کا کہنا تھا کہ ہم ایک لمبی مدت سے برسر اقتدار طبقے سے جنگ میں مصروف ہیں اور حالتِ جنگ میں انسانوں کی تمام سعی و جدوجہد کا دائرہ میدان جنگ اور جنگی ساز و سامان تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی غور و فکر کی تمام صلاحیتیں اسی پر مرتکز ہو کر رہ جاتی ہیں اور متحارب قوم کا ہر طرح کا نشو و نما منجمد ہو کر رہ جاتا ہے اور صورت حال اس وقت زیادہ نازک ہو جاتی ہے جب کہ محکوم قوم کمزور و ناتواں ہو، ایسی صورت میں نقصانات یک طرفہ ہوتے ہیں اور مغلوب قوم تھوڑے ہی عرصے میں اپنے وجود سے محروم ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کی صورت حال اس طویل کشمکش میں یہی تھی مگر مسلمانوں نے اپنی جذباتیت کی وجہ سے صورت حال کا صحیح تجزیہ نہیں کیا۔ نتیجتاً اس جنگ میں ان کو غیروں کے مقابلے میں زیادہ نقصان اٹھانا پڑا اور وہ تعلیمی اور اقتصادی میدان میں پس ماندہ قوموں کی صف میں آکھڑے ہوئے۔ سر سیّد کا کہنا تھا کہ عظمتِ رفتہ کی بحالی کے لیے جنگ و جدال کی اس صورت حال سے نکل کر مسلمانوں کو اپنے لیے صحیح راہ متعین کرنی ہوگی۔ اگر مسلمانوں نے اس جوہر کے حصول کی طرف توجہ کی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان کا شمار بھی ترقی یافتہ قوموں میں نہ ہونے لگے۔ سر سیّد کا تجزیہ بروقت اور حقیقت پر مبنی تھا مگر قوم کو اس کے سمجھنے

---

* شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

میں کافی وقت لگا، اس کے مختلف عوامل و محرکات ہیں لیکن جہاں تک عوام و خواص کی جانب سے سرسید کی مخالفت کا سوال ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس بات کا تعین کرنا ہوگا کہ سرسید کی مخالفت آیا ان کے تعلیمی نظریات اور کالج کے قیام کی بنا پر ہوئی یا اُن کے مذہبی افکار کی وجہ سے؟ ساتھ ہی اس بات کا بھی تعین کرنا ہوگا کہ مخالفت کن لوگوں نے کی اور اس کے پیچھے کس قسم کی ذہنیت کام کر رہی تھی؟ ایک الزام جس کا اعادہ ہر زبان عام اور خاص سے بار بار کیا جاتا ہے کہ علماء اور فضلا نے سرسید کی، کالج کے قیام کی اور جدید علوم و فنون کی مخالفت کی۔ لہٰذا قوم کی تعلیمی ترقی میں یہی طبقہ سب سے زیادہ حائل ہے، یہ الزام سراسر بے بنیاد اور قطعی طور پر جانب دارانہ ہے۔ قرآن و حدیث میں تعلیم کے حصول کو فرض قرار دیا گیا ہے اور اس میں کسی قسم کی تخصیص نہیں کی گئی ہے۔ اس میں ان تمام علوم و فنون کی تحصیل شامل ہے جو براہ راست اسلام سے متصادم نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض علمائے کرام نے دنیاوی علوم کو دینی علوم کا تتمہ اور ضمیمہ بتایا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس صریح نص کی ہوتے ہوئے علما نے سرسیّد کی مخالفت کیوں کی؟ جب کہ حقیقت یہ تھی کہ بہت سے علماء، علوم جدیدہ کے حصول کے جواز کے قائل تھے، ان علما کے اقوال خود سرسیّد تصنیف آثار الصنادید میں دیکھے جا سکتے ہیں جس میں انھوں نے شاہ عبدالعزیز اور دوسرے ان علمائے کرام کے اقوال نقل کیے ہیں جنھوں نے جدید علوم کے حصول کی ترغیب دی ہے۔ شاہ عبدالعزیز سے انگریزی کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کے متعلق فتویٰ لیا گیا تھا تو انھوں نے بزور کہا تھا:

> "جاؤ! انگریزی کالجوں میں پڑھو اور انگریزی زبان سیکھو، شرعاً ہر طرح جائز ہے۔"

اسی طرح شیخ الہند مولانا محمود حسن نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے خطبۂ افتتاحیہ میں فرمایا تھا:

> "آپ میں جو حضرات محقق و باخبر ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔"[۲۶]

دوسری بات جو قابل غور ہے وہ یہ کہ سرسید کے قریبی ساتھیوں میں سے ایک بڑی تعداد علما کی تھی جنھوں نے سرسیّد کے تعلیمی نظریات کو آگے بڑھانے اور کالج کے قیام میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ تیسرے بنیادی طور پر سرسید نے مذہب کی آغوش میں پرورش پائی تھی اور مذہب ہی کی گود میں ہوش سنبھالا تھا[۲۷]۔ اس وجہ سے انھوں نے اپنی کتابوں میں علما کا تذکرہ حسن فرط ادب و محبت سے کیا ہے، اس سے ان کی علماء سے عقیدت و احترام کا پتہ چلتا ہے۔ وہ سید احمد شہید رائے بریلوی کی تحریک اصلاح سے غایت درجہ متاثر تھے[۲۸]۔ ان کی ذہنی و فکری تربیت میں اس تحریک کے اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ بقول مولانا حالی:

> مولانا اسماعیل شہید نے ان کے خیالات کی اور زیادہ اصلاح کی اور انھیں کسی قدر تقلید کی بندشوں سے آزاد کیا[۲۹]۔"

سرسیّد سے علما کو اختلاف درحقیقت ان کے مذہبی افکار اور بعض اصلاحی خیالات سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مذہبی افکار کی پذیرائی تو کم ہی ہوئی مگر ان کے تعلیمی افکار کو آج بھی لوگ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ بیرونی ممالک میں بھی علما اور ادبا نے یکساں طور پر ان کے خیالات اور افکار کو موضوع بحث بنایا اور اس کی افادیت اور ضرورت کو اجاگر کیا۔ اس سلسلے میں عالم عرب کے علما و فضلا کسی سے پیچھے نہ رہے۔ درج ذیل سطور میں ہم عالم عرب کے چند ممتاز علما کی تحریروں کا خلاصہ نقل کر رہے ہیں جن میں سرسیّد کی تحریک کی معنویت و افادیت کا کھل کر اعتراف کیا گیا ہے ان تحریروں سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سرسیّد کی حقیقت اور عظمت کو بیرون ہند کے اکابرین نے زمان و مکان کے بعد کے باوجود کس کس پہلو سے محسوس کیا ہے

۱- احمد امین: (۱۸۸۶—۱۹۵۴ء) ہم سب سے پہلے احمد امین کی رائے پیش کرتے ہیں۔ احمد امین دورِ حاضر کے ایک ممتاز ادیب، ناقد اور تاریخ نگار تھے۔ انھوں نے جدید عربی ادب اور تنقید کو عالمی ادب اور تنقید کے اصول و مبادی سے روشناس کرایا اور

زبان عربی میں ایک نئے اسلوب بیان کی بنا رکھی۔ دورِ جاہلیت سے لے کر اسلام کے آخری عہد تک کی تاریخ کا انھوں نے تجزیاتی مطالعہ کیا ان کے مطالعہ کا حاصل فجر الاسلام، ضحی الاسلام اور ظہر الاسلام نامی کتابیں ہیں۔ کتاب اپنے مباحث کے اعتبار سے انفرادی نوعیت کی حامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے علمی اور تحقیقی خدمات کا دائرہ بہت وسیع رہا ہے۔ وہ عالم عرب کی ممتاز اکیڈمیوں کے ممبر اور مختلف اخبارات وجرائد کے ایڈیٹر رہے ہیں۔

سرسید کے متعلق انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار اپنی مشہور زمانہ کتاب زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث میں کیا ہے اس کی تلخیص ذیل میں دی جارہی ہے۔

"نظریاتی اعتبار سے شیخ محمد عبدہٗ اور سرسید احمد خاں کے خیالات میں بڑی حد تک یگانگت ہے۔ دونوں کے نزدیک اصلاح کا مقصد عقل وفہم کو جلا اور ترفع بخشنا اور مذہبی سطح پر مذہبی رواداری اور کشادہ ظرفی کو فروغ دینا ہے۔ اس کے بعد حریت وآزادی کے لیے جدوجہد کا نمبر آتا ہے کیونکہ آزادی جاہل اور عقل وفہم سے کورے شخص کے لیے بے معنیٰ چیز ہے۔ آزادی کا بنیادی ستون علم ہے۔ دنیاوی علم بھی اور دینی علم بھی۔ علم کا دائرہ بہت وسیع ہے، اس میں علم طبیعات و کیمیا، ریاضی وفلکیات، سماجیات وسیاسیات اور دوسرے انتظامی اور اداراتی علوم شامل ہیں۔ یہ تمام علوم وفنون درحقیقت ایک ایسے دین ومذہب کی طرف رہنمائی کرتے ہیں جو قلب وذہن کو بیدار رکھے، عقل وفہم پر قدغن نہ لگائے، نفس ووجدان کو غذا فراہم کرے اور غور وفکر میں فتور پیدا نہ کرے۔ اس کسوٹی پر اسلام وہ واحد مذہب ہے جو پورا اترتا ہے کیوں کہ اسلامی تعلیمات ومتعقدات میں کہیں سے کوئی چیز ایسی نہیں ملتی ہے جو اس راہ میں مانع ثابت ہو بلکہ وہ ان چیزوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ دونوں کے عہد میں مصر اور ہندوستان میں انگریزی حکومت برسراقتدار تھی، انگریزی مادی وسائل وذرائع، سامان حرب اور اثر ورسوخ کے لحاظ سے ناقابل فتح تھے، اہل ہند ومصر کے پاس ان سے مقابلے کی طاقت وقوت موجود نہ تھی۔ دوسرے مقابلہ آرائی کے لیے جس اتحاد واتفاق کی ضرورت تھی اس سے بھی وہ جہالت اور فساد اخلاق کی بنا پر تہی دامن تھے، دونوں نے ایسی صورت حال میں برسراقتدار حکومت سے صلح وصفائی اور مصالحانہ رویہ کو ملک اور ملت کے لیے زیادہ مفید سمجھا۔ انھوں نے اپنے مصالحانہ رویہ سے برسراقتدار حکومت کے سامنے یہ بات گوش گذار کرانے کی کوشش کی کہ اگر محکوم ملک کے افراد تعلیمی اور اقتصادی محاذ پر پسماندہ رہ گئے تو تاریخ اس کی ذمہ دار حکمراں طبقہ کو قرار دے گی اور یہ چیز اس کے حق میں بہتر نہ ہوگی۔ دوسری طرف مصالحانہ رویے سے عوامی سطح پر ایسی فضا ہموار ہوگی جس میں وہ خیر وشر کی تمیز کر سکیں گے اور ٹھنڈے دل سے غور وفکر کے ترقی وعظمت کے حصول کے لیے لائحہ عمل کی تیاری کر سکیں گے[۵]

اس نقطۂ نظر کی وجہ سے دونوں کی شدید مخالفت ہوئی، دونوں کو ملک کا غدار، ننگ ملت اور ننگ وطن کہا گیا۔ دوسری طرف مذہبی ٹھیکیداروں نے ان کو بالخصوص نشانۂ تنقید بنایا۔ کیوں کہ ان کے نزدیک تمام جدید علوم وفنون خلاف شرع ہیں کیونکہ سماجی حوادث زراعتی نفع ونقصان اور مرض وصحت میں سبب ومسبب کے تلاش کرنے کی وجہ سے عقیدۂ قضا وقدر پر آنچ آتی ہے اور مشائخ واولیاء کے کشف وکرامات کا انکار ہوتا ہے۔ اس نوع کے علما نے دونوں بزرگوں کی شدید مخالفت کی لیکن دونوں نے ان مزاحمتوں اور مخالفتوں کے باوجود سمت سفر میں کوئی تبدیلی نہ کی۔ کیوں کہ دونوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ انگریزوں سے مفاہمت اور مصالحت کے ذریعے اپنی ملت کے تعلیمی اور مادی فروغ کے لیے وہ سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں جو جنگ وجدال کی صورت میں

ناممکن ہے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد اہلِ ہند بالخصوص، مسلمانوں پر جو سراسیمگی، وحشت اور خوف و ہراس چھایا تھا، اس نے ان کو جیتے جی موت کے قریب کر دیا تھا۔ سرسیّد نے جب یہ صورت حال دیکھی تو ان کی دینی اور ملّی غیرت جاگ اُٹھی اور دکھیاری ملت کے زخموں کو مندمل کرنے کے لیے میدانِ عمل میں آگئے۔ سرسیّد نے مسلمانوں کی اجتماعی صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد دو چیزوں پر اپنی توجہ مبذول کی۔ ایک تعلیمی محاذ، دوسرا معاشرتی اور سماجی اصلاح۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مسلمانوں کے اکابرین نے انگریزوں سے ہر طرح کے تعلقات کو خلافِ شرع قرار دے دیا تھا جس کی وجہ سے انگریزوں کے قایم کردہ اسکولوں اور مدارس میں انھوں نے اپنے بچّوں کی تعلیم و تربیت کو گناہِ کبیرہ تصور کر لیا تھا لیکن اس کے برعکس اکثریتی طبقے کے افراد ان مدارس سے بھرپور فائدہ اُٹھاتے تھے اور حکومت کے اعلیٰ مناصب اور عہدوں پر انگریزی تعلیم کی بدولت جگہ پا جاتے تھے۔ دوسری طرف مسلمانوں کے سماج اور معاشرے میں مذہب کے نام سے ایسی بدعات اور رسم و رواج جگہ پا چکے تھے جو سماجی فساد اور معاشرتی تباہی کا باعث تھے۔ سرسید نے سوچا جب تک دونوں محاذ پر بیک وقت کام نہیں ہوگا، مسلمان قوم ترقی کی شاہراہ پر گامزن نہیں ہو سکتی۔[۶]

ہندوستان میں سرسیّد کے علاوہ بھی مختلف دینی افراد نے تحریکیں چلائیں، مگر ان کی نوعیت سلبی تھی ۱۸۰۴ء میں حاجی شریعت اللّٰہ نے ایک اصلاحی تنظیم کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد اس بات کی تبلیغ کرنا تھا، کہ ہندوستان میں نمازِ جمعہ شرعاً جائز نہیں ہے کیونکہ یہ دارالسلام نہیں ہے۔ پنجاب کے مسلمانوں کی اکثریت نے اس کی حمایت کی۔ دوسرے مصلح سید احمد شہید ہیں (۱۷۸۲ء ــــ ۱۸۳۱ء) جنھوں نے حج کے دوران وہابی مسلک اختیار کیا اور ہندوستان واپسی کے بعد قبر پرستی اولیاء کی شفاعت اور اسی نوع کی دوسری بدعات کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور مزید انھوں نے کہا کہ ہندوستان دارالحرب ہے اور اس میں مسلمانوں پر جہاد فرض ہے۔ نتیجتاً انھوں نے انگریزوں کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا اور اس کے نتیجے میں شدید خوں ریزی ہوئی جس میں بے شمار جانیں ضائع ہوئیں مگر کوئی بہتر نتیجہ نہ نکلا۔ سرسیّد نے ان دونوں تحریکوں کے برعکس اپنی تحریک کی اساس تعقل اور علم و عرفان پر رکھی۔ ان کا کہنا تھا کہ اس وقت تعلیم و تربیت ہی مسلمانوں کے تمام امراض کا علاج ہے۔

۱۸۶۹ء میں سرسیّد اپنے لڑکے سید محمود کے ہمراہ انگلستان کا قصد سفر کرتے ہیں، لندن کے دوران قیام انھوں نے وہاں کی تہذیب و تمدن، ادب و ثقافت اور مادّی ترقیوں کا مشاہدہ بہت قریب سے کیا۔ وہاں کی جامعات اور مدارس کے نصابِ تعلیم اور طرزِ تعلیم و تربیت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا لندن کے دورانِ قیام ہی ان کے سامنے یہ حقیقت آئی کہ علوم و فنون کی تدریس کا سب سے بہترین ذریعہ مادری زبان ہے۔ کیونکہ اگر انگریزوں کو ان جدید علوم و فنون کی تدریس لاطینی، یونانی عربی یا فارسی زبان میں دی جائے تو وہ بھی اہلِ ہند کی طرح جاہل ہی رہیں گے۔

لندن سے واپسی کے بعد سرسید مسلمانوں کے اصلاحِ حال کے لیے مکمل طور پر کمر بستہ ہو گئے۔ انھوں نے سب سے پہلے اسلامی معتقدات و تعلیمات اور جدید تہذیب و ثقافت اور جدید علوم و فنون کے درمیان واقع خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی۔ ان کا کہنا تھا کہ اسلام اور جدید علوم و فنون میں کوئی ٹکراؤ نہیں بلکہ اسلام اپنی اصلیت اور حقیقت کے اعتبار سے ایک تعقل پسند مذہب ہے

اور اس کے دامن میں ہر وہ چیز سموسکتی ہے جو فہم وادراک اور عقل ودانش سے قریب ہو۔ سرسید بتدریج اس منزل پر پہنچ گئے کہ اپنے تعلیمی اور اصلاحی مقاصد کو عملی شکل میں پیش کرنے کے لیے ایک علمی دانش گاہ کی بنیاد ڈال سکیں جو آج مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے۔ انھوں نے اس علمی درسگاہ کے تین بنیادی مقاصد بیان کیے ہیں۔

۱۔ مسلمانوں کو بلا کسی تعصب اور جمود کے مشرقی اور مغربی ثقافت سے آگاہ کرنا

۲۔ طلبا کے لیے اجتماعی رہائش کا انتظام کرنا۔ تاکہ ان کو ایسی فضا میسر آسکے جس میں وہ تمدنی مفاسد سے محفوظ رہیں تاکہ ان کے سرپرست اور والدین کو اطمینان ہو کہ ان کے بچے ایسے معاشرے میں ہیں جو ان کے اخلاق و عادات کے لیے موزوں ترین ہے۔

۳۔ کالج کا نظم ونسق اس طرح ہو کہ وہاں عقلی ترقی، جسمانی تربیت اور اخلاقی بالیدگی بیک وقت ممکن ہو سکے یعنی اس نظام کا مقصد صرف تعلیم وتدریس نہ ہو بلکہ تربیت بھی اس کا جزو لازم ہو سکے

تھوڑے ہی عرصے میں یونیورسٹی کے فارغ التحصیل طلبا کی ایک بڑی تعداد ملک کے گوشے گوشے میں پہنچ گئی جن کے رہن سہن اور طور طریقے کی ایک الگ چھاپ تھی اور جو علی گڑھ کے نام منسوب ہو گئی۔ اس طرح علی گڑھ کا اطلاق اب صرف ایک جامعہ اور کالج پر نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ ایک چلتی پھرتی تحریک ہو گئی جس کا ایک مخصوص عقلی رجحان اور اخلاقی رنگ ہوتا تھا۔ سرسید نے طلبا کی تعلیم وتربیت میں جو ایک مخصوص قسم کی چھاپ ڈالی تھی یعنی علم وثقافت کی طرف میلان اور سیاست سے بعد، اس کے اثرات کالج سے نکلنے کے بعد بھی طلبا پر نمایاں رہتے۔

کالج کے قیام کے بعد سرسید نے دوسرا اہم کام جو کیا ہے وہ "تہذیب الاخلاق" نامی پرچے کا اجرا ہے۔ اس میں انھوں نے بیش قیمت اصلاحی اور تعلیمی مضامین قلم بند کیے۔ ساتھ ہی قرآن کی تفسیر لکھنے کا بھی آغاز کیا۔ تفسیر لکھنے کا مقصد ان کے پیش نظر مسلمانوں کے مابین معقولیت اور عقلیت کو فروغ دینا تھا۔ اس امر میں کوئی شک نہیں ہے کہ آیات کی تفسیر میں انھوں نے جگہ جگہ ٹھوکریں کھائیں تفسیر کو معقولیت کے رنگ میں رنگنے کے لیے انھوں نے انتہا پسندی سے بھی کام لیا، جس کی وجہ سے عوام الناس اور علما دونوں نے ان کی شدید مخالفت کی۔ تیسرا اہم کام جو انھوں نے انجام دیا وہ یہ کہ سال کے اختتام پر ایسی ایک کانفرنس کرائی جائے جس میں ملک کے گوشے گوشے سے مسلم قائدین اکٹھا ہوں اور جس میں مسلمانوں کے امراض اور مسائل پر مقالات پڑھے جائیں اور تبادلۂ خیال ہو۔ تاکہ ان کے حل کے لیے جامع منصوبہ بندی کی جا سکے۔ سرسید اس مہم میں بھی کامیاب ہوئے اور ان کی زندگی میں پانچ سال تک یہ کانفرنس ان کی سربراہی میں منعقد ہوتی رہی۔ ان کی موت کے بعد ان کے رفقا مدتوں اس کا انعقاد کرتے رہے۔

سرسید اس کانفرنس کے ذریعے پورے ملک میں اپنے تعلیمی اور اصلاحی نظریات وخیالات کی توسیع واشاعت چاہتے تھے۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ شمالی ہند کے ساتھ جنوبی ہند اور ملک کے دوسرے گوشوں میں جہاں مسلمان آباد ہیں وہاں مدارس اور علمی درسگاہوں کا قیام ہو تاکہ پورے ملک میں مسلمانوں کے اندر تعلیمی بیداری لائی جا سکے اور ان کے سماج و معاشرے سے بدعات وخرافات کا قلع قمع کیا جا سکے۔ اس کانفرنس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو جدید علوم وفنون سے قریب لایا جا سکے اور مغربی تہذیب وتمدن کی مفید اور لائق استفادہ چیزوں کی تحصیل کے لیے مسلمانوں کو رغبت دلائی جائے۔ سرسید کا کہنا تھا کہ جدید علوم وفنون کا سورج پہلے مشرق میں طلوع ہوا اور اہل مغرب نے اس کی روشنی حاصل کر کے ترقی کے

منازل طے کر لیے اور مشرق پیچھے ہو گیا۔ اب اہلِ مغرب سے ان ہی علوم وفنون کی تحصیل کو ہم کیوں خلافِ شرع قرار دے رہے ہیں جب کہ ان علوم کی تحصیل سے ہمارے تشخص اور دین پر کوئی آنچ نہیں آئے گی بلکہ اس سے جہالت اور جمود کے پردے چاک ہوں گے۔ یہ نظریہ درحقیقت دینی اور دنیوی علوم کے مابین تفریق کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے اور یہی خلافِ شرع چیز ہے۔ سرسیّد کا کہنا تھا، آج علوم وفنون کی نئی نئی شکلیں پیدا ہو گئی ہیں۔ آج ارسطو، ابن سینا، فارابی، خیام اور جابر بن حیان کے نظریات بے معنیٰ ہو کر رہ گئے ہیں۔ آج ضرورت ہے کہ نئے علوم وفنون کو حاصل کر کے ہم پھر دوبارہ ابن سینا، جابر، خیام اور فارابی کو جنم دیں۔ اس کانفرنس اور تہذیب الاخلاق کے ذریعے سرسیّد دوسری اہم خدمت اردو زبان کی کرنا چاہتے تھے۔ کیوں کہ اردو ہی مسلمانوں کی مادری زبان تھی اور ان کے عہد میں اردو زبان تنگ دامنی کا شکار تھی۔ اس میں لب و رخسار اور داستان وقصص کا بیان تو ہوتا تھا مگر کسی سنجیدہ موضوع پر اظہارِ خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ سرسیّد نے سید الاخبار اور تہذیب الاخلاق کے ذریعے اس میں سیاسی، اجتماعی، تاریخی، ادبی اور اخلاقی موضوعات پر خامہ فرسائی کی اور ایک نئے اسلوبِ بیان کی بنیاد رکھی جو سلاست وروانی سادگی و برجستگی اور معنوی اور ظاہری حسن وجمال سے مرکب تھا۔

سرسیّد نے زبان اردو کے دائرے کو اتنا متنوع اور وسیع کر دیا کہ اس میں ہر طرح کے علمی اور تحقیقی مقالات لکھے جانے لگے۔ شبلی نعمانی جیسے عظیم ادیب کا کہنا ہے کہ سرسیّد کے مذہبی افکار سے شدید اختلاف ہونے کے باوجود، میں ان کے اسلوبِ نگارش کا دل سے قدر دان ہوں۔ جو اپنی انفرادیت، اچھوتے پن اور حسنِ ظرافت میں یکتا اور یگانہ ہے۔

سرسیّد کی ابتدا میں شدید مخالفت ہوئی۔ عوام وخواص دونوں نے ان کے نظریات وخیالات کو نشانۂ تنقید بنایا۔ مگر زندگی کے آخری ایام میں انھوں نے اپنی کوششوں کو بار آور ہوتے ہوئے بھی دیکھ لیا، وہی لوگ جو کالج کے قیام کے مخالف تھے اب ان ہی کے خاندان کے چشم وچراغ وہاں حصولِ تعلیم کے لیے آ رہے تھے، آخری دنوں میں جب پنجاب کا دورہ کیا تو وہاں ان کا شاہانہ استقبال ہوا۔ اسی طرح ۸۱ سال کی عمر میں جب انتقال ہوا تو اُن کے انتقال پر پورا ملک آبدیدہ ہو گیا، تمام مذاہب اور مکاتبِ فکر کے لوگ بلا کسی امتیاز کے ان کی موت پر سوگوار ہوئے اور غم میں شریک ہوئے، اس میں ہندو، مسلم اور انگریز سبھی شامل تھے۔[۵]

۲ محب الدین الخطیب (۱۸۸۶ — ۱۹۶۹ء)

مصر کا مجلہ "الزھراء" اپنے دور کا ایک ممتاز علمی دینی اور معاشرتی جریدہ تھا، جس میں عالمِ عرب کے چوٹی کے مفکرین اور علما کی فکری کاوشیں شائع ہوتی تھیں۔ ان کے مدیرِ اعلیٰ محب الدین اپنے عہد کے ایک ممتاز دینی مصلح اور ادیب تھے۔ ان کے بیش قیمت علمی مقالات اور کتابیں ان کی شخصیت کا بہترین تعارف ہیں۔

عالمِ عرب میں دینی فکر اور اصلاحی وتعلیمی تحریک کو فروغ دینے میں اس مجلے نے جو اہم کردار ادا کیا ہے اس کو کسی صورت میں فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت جب کہ پورا ملک قومیت اور اشتراکیت کے جنگل میں پھنسا ہوا تھا اس جریدہ نے صحیح اسلامی فکر اور مسلمانوں کے مابین تعلیمی اور اصلاحی رجحانات کو قائم اور دائم کرنے کے لیے بیش بہا مقالات لکھے جن کے اثرات سے کسی صورت میں انکار ناممکن ہے۔ ذیل میں سرسیّد کے متعلق ان کے خیالات کو پیش کیا جا رہا ہے۔

"انیسویں صدی میں عالمِ اسلام کے ہر گوشے میں ایسی عبقری شخصیات ابھرتی رہی ہیں جنھوں نے مختلف میدانوں میں ملک اور ملت کی نمایاں خدمات انجام دی

ہیں، سرسید کا شمار بھی ایسی ہی شخصیات کے زمرے میں ہوتا ہے۔ سرسید کی پیدائش برصغیر کے ایک علمی اور دینی گھرانے میں ہوئی۔ حصول تعلیم کے بعد انھوں نے سرکاری نوکری کرلی اور ملک کے مختلف حصوں میں فرائض منصبی کو انجام دیا۔

ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کا انقلاب مسلمانوں کے حق میں بدتر ثابت ہوا۔ انقلاب کی ناکامی کے بعد حکومت وقت نے اپنی انتقامی کاروائی کا نشانہ خاص مسلمانوں کو بنایا جس کی وجہ سے ان پر ایسا خوف و دہشت طاری ہوا کہ وہ مردہ بدست زندہ ہو کر رہ گئے۔ سرسید نے جب یہ صورتحال دیکھی تو ان کے عزائم کو بھی لگنے لگا اور وہ مصر فرار ہونے کے لیے پر تولنے لگے مگر مظلوم اور بے بس ملت کو ایسی حالت میں چھوڑنے کے لیے ان کا دل آمادہ نہ ہوا۔ بالآخر انھوں نے عزم صمیم کیا کہ وہ ہندوستان میں اپنی مظلوم اور بے بس امت کے ساتھ رہیں گے اور جو کچھ ان کے لیے بن پڑے گا کرنے کی کوشش کریں گے۔

مسلمانوں کو ذلت اور پستی سے نکالنے کے لیے سرسید نے سب سے پہلے انگریزوں کے خلاف معاندانہ اور مخالفانہ رویہ کی مخالفت کرتے ہوئے اُن کے ساتھ صلح و آشتی کے رویہ کو اپنانے کی وکالت کی، دوسرے مسلمانوں کو جدید تقاضوں اور اقتدار سے ہم آہنگ کرنے کے لیے انگریزی زبان تعلیم اور جدید علوم و فنون کی تحصیل کی ترغیب دی۔ تاکہ مسلمان مادی اور تعلیمی میدان میں آگے بڑھ جائیں اور حکومت کے مناصب پر ان کی مناسب نمائندگی ہو جائے۔ سرسید نے اپنے ان مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے عملاً یہ اقدام کیا کہ جہاں جہاں وہ گئے مسلمانوں کے لیے ابتدائی مدارس کی بنیاد ڈالتے گئے۔ غازی پور، بنارس اور مرادآباد میں انھوں نے اس طرح کے مدارس کو قایم کیا [9]

سرسید کا اصل کام اس وقت شروع ہوتا ہے جب وہ علی گڑھ میں قیام پذیر ہوتے ہیں۔ یہاں انھوں نے علی گڑھ کالج کی بنیاد ڈالی جو عالم اسلام کی عظیم یونیورسٹی کی شکل میں موجود ہے۔ سرسید اس کالج کو "قرطبۂ ھند" کی شکل دینا چاہتے تھے تاکہ مسلمانوں کے اس عظیم مرکز کی یادگار ہندوستان میں دوبارہ قایم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا نظام تعلیم وتربیت کا خاکہ وقت کی دو عظیم یونیورسٹیوں، کیمبرج اور آکسفورڈ کے طرز پر بنایا۔ دوسرا اہم کام جو سرسید نے انجام دیا ہے وہ "اسباب بغاوتِ ہند" کی تالیف ہے۔ اس کتاب میں سرسید نے پورے انصاف اور بے باکی کے ساتھ ۱۸۵۷ء کے حادثۂ عظیم کا جائزہ لیا ہے۔ کتاب میں انھوں نے انگریزوں اور ہندوستانیوں دونوں کی ان خامیوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس حادثہ کی باعث بنیں۔ انھوں نے واضح طور پر لکھا ہے کہ اہل ہند کو سرکاری مناصب سے محرومی، حاکم و محکوم کے درمیان واقع خلیج اور انگریزوں کا ان کے مذہبی امور میں مداخلت اس حادثہ کی باعث بنیں۔ انھوں نے اس جرات کا اظہار اس وقت کیا ہے جب کہ پورا ملک انگریزوں کے جبر و استبداد کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ کتاب میں حقائق و واقعات کا جائزہ دلائل و براہین کی روشنی میں لیا گیا تھا۔ اس وجہ سے کتاب کے مندرجات پر فریقین نے سنجیدگی سے غور و فکر کا آغاز کیا جس کی وجہ سے باہمی مصالحت اور مفاہمت کی ایک فضا ہموار ہو گئی [10]

سرسید کا دوسرا اہم کام علی گڑھ تحریک کی بنا ہے اس تحریک کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ملک کے قریہ و دیار میں مسلمانوں کے مابین تعلیمی تحریک عام کی جائے اور مسلمانوں کو جدید علوم و فنون کی طرف مائل کیا جائے، ان کے مسائل پر بحث و مباحثہ کا آغاز ہو اور ان کے حل کے لیے عملی اقدام کیا جائے۔ یہ تحریک سرسید کے بعد بھی

مدتوں جاری رہی۔ پورے ملک کے اہم اور ممتاز افراد اس کے نمائندوں میں شامل رہے اور پورے ملک میں اصلاحی تعلیمی اور اقتصادی میدان میں اس کے نمایاں اثرات مرتب ہوئے۔

سرسید نے اردو کی ترویج و ترقی اور اس کو زندہ زبانوں کی صف میں لا کھڑا کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ ساتھ ہی وہ ہندوستان کی دوسری زبانیں بالخصوص ہندی کے مخالف نہ تھے۔ اس کے باوجود اس کا ردعمل یہ ہوا کہ بنارس میں ۱۸۶۷ء میں ملک کے اکثریتی طبقے نے ایک قرارداد کے ذریعے اردو کی ترویج و ترقی کی مخالفت کی اور ہندی کو فروغ دینے کے لیے حکومت وقت پر زور ڈالا۔ یہیں سے اردو اور ہندی میں ٹکراؤ کی جو بنیاد پڑی وہ آج کافی مستحکم ہو گئی ہے۔ سرسید اس صورت حال کی وجہ سے بہت کبیدہ خاطر ہوئے۔ باوجود کوشش کے ان کے سامنے فریقین کے مابین اتحاد و یگانگت کے تمام راستے مسدود ہو گئے۔ بالآخر انھیں یہ کہنا پڑا کہ اب دونوں قومیں یکجا نہیں رہ سکتی ہیں اور جس کا نتیجہ پاکستان کی صورت میں بعد کے ادوار میں برآمد ہوا۔

یہ بات شک و شبہ سے بالا ہے کہ برصغیر میں تعلیمی تحریک اور علمی فروغ کے بانی مبانی اور مرکز و محور سرسید ہیں۔ انھیں کی بدولت اس خطہ میں علمی بیداری اور جدید علوم و فنون کی تحصیل کی رغبت پیدا ہوئی۔[۵]

۳۔ جرجی زیدان (۱۸۸ء -- ۱۹۶۹ء)

جرجی زیدان ایک مسیحی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ ان کی پیدائش مصر میں ہوئی۔ جرجی زیدان عربی ادب کے ایک ممتاز صحافی، ادیب، تاریخ نگار اور ناول نگار کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ انھوں نے عربی ادب کی تاریخ چار ضخیم جلدوں میں پورے اختصار اور ایجاز کے ساتھ لکھی ہے اور عربی ادب کی تاریخ پر لکھی جانے والی کتابوں میں ایک امتیازی شان اور انفرادیت کی حامل ہے۔ انھوں نے ایک کتاب "تاریخ التمدن الاسلامی" کے نام سے لکھی۔ کتاب میں مصنف نے عہد اسلامی کے مختلف ادوار میں اسلامی تمدن اور ثقافت کا نقشہ پیش کیا ہے، جس سے ان کی تاریخ پر گہری گرفت اور تاریخی واقعات اور حقائق پر دقت نگاہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کتاب کے بعض مباحث پر شبلی نعمانی نے تنقید کی اور شبلی کے تنقیدی مضامین "المنار" میں قسط وار شائع ہوئے۔

جرجی زیدان نے مختلف اخبارات و جرائد میں ادارتی فرائض بھی انجام دیے ہیں اور بہت سے اخبارات و جرائد کا اجرا انھوں نے خود کیا۔ صحافتی اعتبار سے وہ اپنے عہد کے ایک ممتاز صحافی تھے۔ اپنے صحافتی مقالات میں انھوں نے مصریوں کو جدید علوم و فنون کی تحصیل اور جدید اقدار و تقاضوں کے مطابق معاشرے اور سماج میں تبدیلیاں برپا کرنے کی مہم چلائی۔

ادب و تنقید کے پیچیدہ اور گنجلک مسائل کو وہ اتنی چابکدستی اور سلیس اور شیریں زبان میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں کہ عام قاری کو اس کے فہم و ادراک میں کوئی زحمت نہیں ہوتی ہے۔ ان کا اسلوب بیان استدلالی اور استقرائی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ ذیل میں سرسید کے متعلق ان کے خیالات کی تلخیص پیش کی جا رہی ہے۔

"انیسویں صدی کی تاریخ کا مطالعہ اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس صدی میں جدید علوم و فنون کا ارتقا شروع ہوا۔ علوم کا یہ ارتقا کسی کرۂ ارضی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اس عمل کا آغاز پوری دنیا میں ہوا ہر جگہ جہالت، لاعلمی، جمود و تعطل اور تقلید کے جوے کو اتار پھینکنے کی تحریکیں چلیں۔ ہندوستان، عراق، شام اور مصر میں بھی اس جد و جہد کا آغاز ہوا۔ مغربی ممالک نے

اس عمل میں پیش قدمی کی اور وہاں علوم و فنون کے آفتاب و ماہتاب ہر جگہ روشن ہو گئے۔ اہل مشرق نے بھی ان کی تقلید میں علمی مدارس اور اداروں کے قیام اور جدید علوم و فنون کے حصول کی تحریک چلائی۔ اہل مصر نے حکومت کی مدد سے بے شمار علمی ادارے اور مدارس قائم کیے اور ایسے اخبارات و جرائد کا اجرا کیا جس میں تعلیمی اور اصلاحی مضامین شائع ہوتے تھے[۳۱]

ہندوستان میں اس تعلیمی اور اصلاحی تحریک کا سہرا صرف شخص واحد کے سر جاتا ہے۔ جو عزم و حوصلہ، صبر و ثبات، غیرت و حمیت اور حسن نظر اور اخلاص کا پتلا تھا ہماری مراد سر سیّد احمد خاں سے ہے۔ سر سیّد احمد خاں ظاہری وجاہت اور جاہ و جلال کے ساتھ ساتھ ایک خالص النسب اور نجیب الطرفین خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ناںہالی اور دادیہالی دونوں خاندان ہمیشہ سے مغل سلطنت کے مختلف علمی اور انتظامی مناصب پر فائز رہا ہے۔ سر سید احمد خاں ایّام طفولیت ہی سے حسن سیرت، حسن اخلاق، شرافت و متانت اور دینی غیرت و حمیت سے متصف تھے۔ ملی خدمت، حب الوطنی اور وفاداری ان کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھی۔

سر سیّد کے وقت ہندوستان میں غیر ملکی حکومت تھی۔ اہل ملک کا ان کے خلاف ہونا ایک فطری امر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل ہند بالخصوص مسلمانوں نے انگریزوں کا مکمل مقاطعہ کیا۔ ان سے ہر طرح کے تعلقات اور لین دین کو شرعاً جرم قرار دیا۔ ان کے ساتھ کھانا پینا تجارت اور صنعت کرنا حتی کہ ان کے قائم کردہ اسکولوں میں بچوں کی تعلیم و تدریس بھی ان کے نزدیک دائرہ کفر میں داخل ہو گئی۔ اس کے مقابلے میں انگریز مادّی وسائل حربی اسلحہ جات اور طاقت و قوت کے اعتبار سے ناقابل تسخیر تھے۔ ایسی حالت میں ان سے سر ٹکرانا حماقت اور بیوقوفی تھی، دوسرے باہمی جنگ و جدال کی صورت میں غالب قوم کا تو کوئی خاص نقصان نہیں ہوتا ہے مگر مغلوب قوم کو ہر طرح کا نقصان ہوتا ہے۔ مادی اعتبار سے بھی اور تعلیمی و ثقافتی اعتبار سے بھی، وہ ہر لحاظ سے پسماندہ ہو جاتی ہے سیّد احمد خاں نے اس نکتہ کو سمجھ لیا اور انھوں نے اپنی قوم اور ملت کے مفاد کے لیے انگریزوں سے دوستی اور مصالحت کو ترجیح دی۔ اس کے لیے انھوں نے سب سے پہلے ایک کتاب "اسباب بغاوت ہند" لکھی، جس میں پورے عدل و انصاف کے ساتھ، ۱۸۵۷ء کے حادثے کے حقیقی محرکات اور عوامل پر روشنی ڈالی۔ کتاب میں انھوں نے جہاں بہت سے امور میں انگریزوں کو دوشی قرار دیا اسی کے ساتھ ہندوستانیوں کے سخت گیر اصول اور انتہا پسندی کو بھی قابل جرم قرار دیا۔ سیّد احمد خاں کی اس بے باک تنقید اور جائزے کے اثرات انگریزوں اور اہل ہند دونوں پر پڑے اور دونوں کے نقطۂ نظر میں تبدیلی آئی۔ انگریزوں سے دوستی اور مصالحت کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت کی جانب سے ان کی اصلاحی اور تعلیمی تحریک کی مخالفت کے بجائے حمایت کی گئی اور ہر طرح سے ان کی معاونت بھی کی گئی اور خود علی گڑھ کالج کے قیام میں انگریزوں نے جو خدمات انجام دی ہیں اس کو کسی صورت میں فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔

سر سیّد نے اپنے لڑکے سید محمود کے ہمراہ لندن کا سفر کیا۔ لندن کے دوران قیام انھوں نے مغربی اقوام کی علمی اور مادی ترقی کا مشاہدہ کیا تو اہل ہند کی علمی پسماندگی اور مادی تنزلی پر بہت ترس آیا اور انھوں نے عزم کر لیا کہ ہندوستان واپسی کے بعد آکسفورڈ اور کیمبرج جیسی کسی علمی دانش گاہ کی بنیاد ہندوستان میں ڈالیں گے کیوں کہ دنیوی اور مادی ترقی کا راز جدید

علوم وفنون کے حصول میں پنہاں ہے۔ جب تک اہل ہند جہالت جمود وتعطل اور تقلیدی رسوم ورواج سے رستگاری حاصل نہیں کریں گے وہ ترقی کی شاہ راہ پر گامزن نہیں ہو سکتے۔ [13]

لندن سے واپسی کے بعد مسلمانوں کی ہمہ گیر اصلاح اور ان میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے کی غرض سے انھوں نے "تہذیب الاخلاق" نامی پرچے کا اجرا کیا۔ یہ پرچے میں زیادہ تر مضامین تعلیمی اور اصلاحی نوعیت کے ہوتے تھے۔ مضامین میں جدید علوم وفنون، اس کی افادیت اور ضرورت اور اسلامی شریعت کی رو سے اس کے حصول کے وجوب پر دلائل اور براہین کی روشنی میں گفتگو کی جاتی تھی۔ ہندوستان میں یہ پرچہ اور اس کے مضامین اپنی نوعیت کے اعتبار سے انفرادیت کے حامل تھے۔ حق تو یہ تھا کہ عوام الناس اس تعلیمی اور اصلاحی تحریک کا استقبال کرتے اور سرسیّد کو عزت اور احترام کا مقام دیتے مگر اس کے برعکس ان کی شدید مخالفت ہوئی۔ عوام کی جانب سے بھی اور خواص کی جانب سے بھی ان کو ملک کا دشمن اور انگریزوں کا ایجنٹ قرار دیا گیا۔ مگر سرسیّد کے عزم وحوصلہ کو مخالفت سے مزید قوت اور غذا فراہم ہوئی۔ بالآخر وہ علی گڑھ میں کالج کے قیام میں کامیاب ہو گئے جو ان کے تعلیمی اور اصلاحی خیالات اور نظریات کا آئینہ دار اور عکاس ہے۔ کالج کے قیام کے بعد اس کی در و دیوار مخالفت کے باوجود بہت جلد ہندوستان کے گوشے گوشے سے آنے والے طالبانِ علم سے پُر ہو گئیں۔ کالج مشرقی اور مغربی دونوں طرح کے علوم وفنون کا حسین سنگم اور خوشنما امتزاج ہے جہاں شبلی نعمانی جیسے عظیم محقق اور ادیب تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔

سرسیّد کا آج انتقال ہو گیا ہے مگر انھوں نے جس اصلاحی اور تعلیمی تحریک کی بنا رکھی تھی وہ اُن ہی کے نام سے منسوب ہے اور ہمیشہ ان کا ذکر خیر اہلِ ہند کرتے رہیں گے۔ [14]

۴۔ سیّد محمد رشید رضا (۱۸۶۷ — ۱۹۳۶ء)

محمد رشید رضا شیخ محمد عبدہٗ کے شاگرد رشید اور ان کے افکار ونظریات کے ترجمان تھے۔ ان کا شمار اپنے عہد کے جلیل القدر علما اور افاضل میں ہوتا تھا۔ مصر میں ان کی ادارت میں نکلنے والا جریدہ "المنار" پہلا اسلامی جریدہ تھا جس میں اسلامی علوم وفنون پر مضامین شایع ہوتے تھے۔ ان کی تفسیر "المنار" دورِ جدید کی ایک استدلالی اور سائنٹفک تفسیر ہے جس میں انھوں نے جدید تقاضوں اور ضروریات کے پیشِ نظر قرآن کی حقانیت اور معنویت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ محمد عبدہ کی طرح رشید رضا مسلمانوں کی ترقی کے لیے تعلیم وتربیت کو شاہ کلید قرار دیتے تھے۔ انھوں نے "المنار" میں اس موضوع بالخصوص موضوع بحث بنایا ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر بے شمار مضامین لکھے ہیں۔

رشید رضا نے جب ہندوستان کا سفر کیا تو علی گڑھ بھی تشریف لائے۔ یہاں انھوں نے مختلف لوگوں سے تعلیمی اور اصلاحی موضوعات پر تبادلہ خیال کیا اور تعلیم وتربیت پر ایک لیکچر بھی دیا جس کا اردو ترجمہ بعد میں آفتاب احمد خاں نے شایع کرایا۔ علی گڑھ کے دورانِ قیام ان کے قلب وذہن پر سرسیّد کی عظمت کا سکہ بیٹھ گیا اور مصر پہنچ پر انھوں نے سرسیّد کا تعارف ایک نئے انداز سے کرایا اور سرسیّد کے نقشِ قدم پر قوم کو چلنے کی ترغیب دی۔ یہی وجہ ہے کہ مصر میں ان کو سرسیّد ثانی کا خطاب ملا جس کا تذکرہ انھوں نے بڑے فخر ومباہات سے کیا ہے۔ ذیل میں ان کے خیالات کو مختصراً پیش کیا جا رہا ہے:

"اس صدی کے اوائل میں تمام مشرقی اور مغربی اقوام نے تعلیم وتربیت کی اہمیت اور افادیت کو سمجھ لیا لیکن

مسلمان اپنی تساہلی کی وجہ سے ابھی خواب غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، اس پر مزید ستم ظریفی یہ ہے کہ بعض لوگ جدید علوم و فنون کی تحصیل کو خلاف اسلام قرار دیے ہوئے ہیں جب کہ دین اسلام نے دین و دنیا دونوں کے حصول کی ترغیب دی ہے اور جمہور علما نے ایک صابر فقیر کے بمقابل ایک شکر گزار امیر کو افضل قرار دیا ہے اور مشہور دعا میں بھی دین و دنیا دونوں کی بہتری کی دعا مانگی گئی ہے۔

ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة"[11]

اہل مصر کو بار بار یاد دہانی کرائی گئی ہے کہ ان کی عظمت اور ترقی کا راز تعلیم و تربیت میں مضمر ہے۔ بیشتر اخبارات و جرائد بالخصوص "الاہرام" نے جدید تعلیم کو اسلام کے عین مطابق بتایا اور دلائل سے ثابت کیا کہ ان دونوں کے مابین کوئی ٹکراؤ نہیں۔ اور اس پر کثرت سے مقالات شائع کیے گئے، مگر مسلمان اپنی پرانی روش پر برقرار ہیں۔ اس کے مقابلے میں ہندوستان کے اخبارات و جرائد نے اس موضوع کو بہت ہی موثر انداز میں موضوع بحث بنایا اور ہندوستانی مسلمانوں نے اس میدان میں آگے بڑھنے کے لیے عملی اقدام بھی کیا۔

ہندوستان میں عملاً جس شخصیت نے اس کام کا بیڑا اٹھایا وہ سرسید احمد خاں کی ہے جنھوں نے علی گڑھ کے نواح میں ایک کالج کی بنا رکھی جو آج ایک عظیم یونیورسٹی کی شکل میں موجود ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سرسیّد نے جب دیکھا کہ ملک کے تمام فرقے تعلیم و تربیت حاصل کر کے دنیاوی مناصب حاصل کر رہے ہیں اور ایک نئے سماج اور معاشرے کی بنیاد رکھ رہے ہیں دوسری طرف مسلمان ہیں کہ جو ابھی تک صحرا کے شتر مرغ کی طرح خواب غفلت میں منہ چھپائے ہوئے ہیں تو سرسیّد کی ملی غیرت کو ٹھیس پہنچی اور وہ عملاً میدان میں کود پڑے۔ سرسید علی گڑھ میں آکسفورڈ اور کیمبرج کے طرز پر ایک تعلیمی ادارہ قایم کرنا چاہتے تھے جہاں تعلیم و تربیت کا یکساں بند و بست ہو۔ ابتدا میں سرسیّد کی شدید مخالفت ہوئی۔ ان پر مختلف قسم کے الزامات اور بہتان لگائے گئے۔ اپنے اور بیگانوں نے ہر طرح کا طنز و تعریض کیا لیکن ان کا عزم و حوصلہ سرد نہیں پڑا۔ بلکہ وہ اپنے مشن کی کامیابی کے لیے ہر طرح کی قربانی اور مشکلات کے لیے تیار ہو گئے۔ بالآخر کامیابی ان کے حصّے میں آئی۔ اس طرح بتدریج سرسیّد کی قدر و منزلت میں اتنا اضافہ ہو گیا کہ جب وہ دار فانی سے کوچ کرتے ہیں تو پورا ملک ان کے انتقال پر آبدیدہ ہو جاتا ہے۔ ہر ذات اور ہر طبقے کے لوگ بلا کسی امتیاز کے یکساں طور پر حزن و ملال کا اظہار کرتے ہیں۔ بعض اکابرین نے تو ان کی قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ " یہ ہماری امت کی قبر ہے"۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ گوشت پوست کا یہ لوتھڑا اپنی ذات میں ایک انجمن تھا اور اس کے لبادے میں پوری ایک قوم کی تعلیمی اور اصلاحی خدمات مستور تھیں۔ سرسیّد نے علم و فن کا جو چراغ جلایا اس کی روشنی میں اہل ہند اور بیرون ہند دونوں ہدایت یاب ہو رہے ہیں۔[12]

حوالہ جات

۱۔ موج کوثر۔ شیخ محمد اکرام لاہور ص ۷۷

۲ ایضاً ایضاً ص ۶۹

۳۔ حیاتِ جاوید — مولانا الطاف حسین حالی — پنجاب اکیڈمی — ۱۹۵۷ء — ص ۱۲۲
۴۔ موج کوثر — شیخ محمد اکرام — ص ۷۰
۵۔ زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث۔ احمد امین ۔ دار الکتاب العربی، بیروت ۱۹۶۵ء ص ۱۲۴ — ۱۲۸
۶۔ ایضاً — ایضاً — " — ص۔ ۱۲۹ — ۱۳۰
۷۔ ایضاً — ایضاً — ص۔ ۱۳۱ — ۱۳۳
۸۔ ایضاً — ایضاً — ص۔ ۱۳۴ — ۱۳۶
۹۔ مجلۃ الازھر — مارچ ۱۹۵۹ء ج ۳۰۔ ص ۷۴۸ — ۷۴۹
۱۰۔ ایضاً — ص ۷۵۰ — ۷۵۱
۱۱ ایضاً — ص ۷۵۲ — ۷۵۳
۱۲۔ تراجم مشاہیر الشرق — جرجی زیدان — ج ۲۔ مصر ۱۹۲۲ء — ص ۶۲ — ۶۳
۱۳۔ ایضاً — ایضاً — ص ۶۴ — ۶۵
۱۴ ایضاً — ایضاً — ص ۶۶ — ۶۸
۱۵ المنار — رشید رضا — ج ۱ — ۱۳۱۵ھ — ص ۳۶۹ — ۳۷۱
۱۶ ایضاً — ایضاً — ج ۲۔ — ۱۳۱۶ھ — ص ۳۸۹ — ۳۹۲

میں سمجھتا ہوں کہ انسان کی روح بغیر تعلیم کے چٹکبرے سنگ مرمر کے پہاڑ کی مانند ہے، کہ جب تک سنگ تراش اس میں ہاتھ نہیں لگاتا، اس کا دھوندلا اور کھُردرا پن دور نہیں کرتا، اس کو خراش تراش کر سڈول نہیں بناتا، اس کو پالش اور جلا سے آراستہ نہیں کرتا، اس وقت تک اس کے جوہر اسی میں چھپے رہتے ہیں، اور اس کی خوشنما نسیں اور دلربا رنگینی اور خوبصورت بیل بوٹے ظاہر نہیں ہوتے۔ یہی حال انسان کی روح کا ہے۔ انسان کا دل کیسا ہی نیک ہو، مگر جب تک اس پر عمدہ تعلیم کا اثر نہیں ہوتا، اس وقت تک ہر ایک نیکی اور ہر ایک قسم کے کمال کی خوبیاں جو اس میں چھپی ہوئی ہیں اور جو بغیر اس قسم کی مدد کے نمود نہیں ہو سکتیں، ظاہر نہیں ہوتیں۔

سر سید

لوکل سیلف گورنمنٹ بل پر سرسید کی تقریر

عارف الاسلام *

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان پر ۱۸۵۸ء میں باقاعدہ تاج برطانیہ کی حکومت قائم ہوئی اور بجائے ایسٹ انڈیا کمپنی کے برطانوی پارلیمنٹ کی براہ راست حکومت ہندوستان پر قائم ہوگئی۔ ہندوستان میں پہلی بار کسی عوامی نمائندہ مجلس قانون ساز کو اختیارات حاصل ہوئے۔ چاہے وہ نمائندہ مجلس کسی دوسرے ملک کے عوام نے بنائی تھی۔ اس کا لازمی اثر ہندوستانی نظامِ حکومت پر بھی ہونا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب کہ ہندوستان نئے جمہوری نظام سے آشنا ہونے کا سبق سیکھ رہا تھا۔ اسبابِ بغاوتِ ہند کی اشاعت اور اس پر برطانوی پارلیمنٹ میں بحث کے بعد وائسرائے کی کونسل میں ہندوستانیوں کو شریک کیا جانے لگا تھا۔ یہ ایک طرح سے عوام کی حکومت کی سمت میں پہلا قدم تھا۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ کونسلوں میں عوامی نمائندگی کی شروعات تھی۔ اس خیال کو قانون بنانے کے لیے ۱۸ مئی ۱۸۸۲ء کو وائسرائے کی کونسل میں لوکل سیلف گورنمنٹ بل پیش ہوا۔

اس بل پر سرسید نے ہندوستان میں جمہوری اداروں کی شروعات کے سلسلے میں بہت اہم تقریر کی اور برطانوی ڈیموکریسی کو ہندوستان میں جوں کا توں لاگو کیے جانے کے بارے میں اپنے اشکالات کا اظہار کیا۔

اس تقریر میں اپنے اس نظریے کا بھی اظہار کیا کہ ہندوستان میں ہندو مسلمان اور دوسری قومیں رہتی ہیں اور ایک کی بالادستی دوسری قوم کے لیے نقصان دہ ہوگی۔ یہ تقریر قیام کانگریس سے تین سال پہلے کی ہے اور جب سرسید نے ان خیالات کا اظہار کیا اس وقت تک کانگریس کا تصور بھی نہ تھا اور بیک صاحب لندن میں زیر تعلیم تھے۔ لہٰذا یہ نظریہ کہ سرسید کے سیاسی خیالات کانگریس کی مخالفت میں قائم ہوئے اور بیک صاحب کے زیر اثر سرسید نے اپنے نظریات وضع کیے، غلط ہے۔

اپنے ان نظریات کی بنیاد پر کہ ہندوستان میں تمام قوموں کی تعلیمی و اقتصادی حالت برابر نہیں ہے اور تعداد میں بھی بہت زیادہ فرق پایا جاتا ہے، سرسید نے اس بل پر بہت مدلل تقریر کی اور اپنی کوششوں سے ایک بہت اہم ترمیم اس میں پاس کرائی جس کی رو سے ایک تہائی ممبروں کا تقرر حکومت نے اپنے ہاتھ میں رکھا، تاکہ مسلمان جو اپنی تعداد کم ہونے کی وجہ سے ان انجمنوں میں نہیں منتخب ہو پائیں گے، ان کو نامزد کیا جا سکے۔

> "گورنمنٹ کو لوکل بورڈوں اور ضلع کی کونسلوں کے واسطے ممبروں کو مقرر کرنے کا اختیار دیا گیا ہے، جس کی تعداد کل ممبروں کی ایک ثلث سے زیادہ نہ ہو، مسودہ کی اس دفعہ کو میں بالکل پسند کرتا ہوں اور چوں کہ یہ اول ہی موقع ہے جب کہ لوکل سیلف گورنمنٹ کا معاملہ قانونی کونسل میں پیش ہوا ہے۔ اس وجہ سے میں اس امید کے ظاہر کرنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ وہ اس پالیسی کا اظہار ہے جو گورنمنٹ قانون بنانے کے باب میں اور صوبوں کے واسطے بھی اختیار کرنا چاہتی ہے۔"[1]

★ شعبۂ شماریات۔ اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

سرسیّد کے ذہن دور رس میں یہ اشکال ابھرنے لگا تھا کہ چونکہ حکومت لوکل بورڈوں میں عوامی نمائندگی کا اصول جاری کر رہی ہے لہٰذا آئندہ یہ اصول پورے طور سے ملک کی ہر انجمن میں رائج ہوگا۔ اس لیے سرسیّد نے اسی وقت اس کی نشاندہی کی اور ظاہر کیا کہ اس اصول کو برطانیہ کی طرح رائج کرنے میں بہت سی خرابیاں ہیں اور چونکہ برطانیہ کی طرح ہندوستان میں ایک قوم نہیں بستی اس لیے برطانیہ کا اصول ریپریزنٹیشن جوں کا توں ہندوستان میں لاگو نہیں کیا جا سکتا۔

"مجھ کو یقین ہے کہ ہندوستان کا کوئی حصّہ اب تک اس درجے کو نہیں پہنچا ہے، جب کہ ریپریزنٹیشن کا اصول معاملات مختص المقام کے لحاظ سے پورا پورا ہندوستان میں جاری کیا جاوے۔ ریپریزنٹیڈ اداروں کے ذریعے سے سیلف گورنمنٹ کا اصول شاید سب سے عمدہ سبق ہے جو انگلستان کی فیاضی ہندوستان کو سکھادے گی۔ لیکن انگلستان سے اس اصول کو مستعار لینے میں ان سوشل اور پولیٹکل معاملات کو یاد رکھنا نہایت ضروری ہے جس کے لحاظ سے ہندوستان اور انگلستان کے درمیان امتیاز پایا جاتا ہے۔ ہندوستان کی موجودہ سوشل اور پولیٹکل حالت کئی صدیوں کی خود مختار حکومت اور ایک قوم کی دوسری قوم پر، ایک مذہب کے دوسرے مذہب پر غلبہ حاصل کرنے کا نتیجہ ہے۔"[25]

ہندوستان میں بسنے والی مختلف قوموں کے مذہبی تمدنی اختلافات اور ان کی باہمی تعلیمی فرق کو واضح کرتے ہوئے ظاہر کیا کہ ان حقایق کو مدّنظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔

"ہندوستان فی نفسہٖ ایک براعظم ہے اور اس میں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب کے آدمی کثرت سے رہتے ہیں۔ مذہبی دستورات کی سختی نے اب تک ہمسایوں کو بھی ایک دوسرے سے جدا رکھا ہے اور ذات کا قاعدہ اب تک بہت زور شور سے جاری ہے۔ ممکن ہے کہ ایک ہی ضلع میں مختلف مذاہب اور مختلف فرقوں کے باشندے ہوں اور جس حالت میں کہ باشندوں کا ایک گروہ دولت مند اور صاحب تجارت ہو تو دوسرا گروہ باعلم اور ذی رعب ہو۔ ممکن ہے کہ ایک گروہ بہ لحاظ تعداد کے دوسرے گروہ سے بڑا ہو . . . . ایک قوم بخوبی اس سے واقف ہو کہ لوکل بورڈوں اور ضلع کی کونسلوں میں ان کی طرف سے ممبروں کا شریک ہونا نہایت ضروری ہے اور دوسری قوم کو مطلق اس کی پرواہ نہ ہو۔ پس ان صورتوں میں اس بات سے انکار کرنا شاید ہی ممکن ہے کہ ہندوستان میں ریپریزنٹیشن کے جاری کرنے سے بڑی مشکل اور سوشل و پولیٹکل خطرات پیدا ہوں گے۔"[26]

سرسیّد نے خیال ظاہر کیا کہ جس ملک میں اس طرح کے اختلافات نہ پائے جاتے ہوں، عوامی نمائندگی کا سادہ اصول نہایت مناسب ہے۔ لیکن ہندوستان کی حالت ایسی نہیں ہے جیسی کہ برطانیہ میں رہنے والے وطن اور مذہب کے متحد ہونے سے ایک قوم ہو گئے ہیں۔ بلکہ عیسائیوں کو یہودیوں کی بھلائی کے کسی کام میں ان کا ساتھ دینے سے انکار نہیں ہوتا اور حقیقتاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ سوشل اور پولیٹکل معاملات میں کل برطانیہ کے باشندے ایک قوم ہیں مگر ہندوستان کے باشندے مذہبی، سوشل و پولیٹکل اختلافات کی وجہ سے مختلف قوموں میں بٹے ہوئے ہیں۔

"قوم اور مذہب کے متحد ہونے سے انگریزی قوم ایک قوم ہو گئی ہے اور تعلیم کی ترقی سے خفیف اختلافات کل ان معاملات میں جو بیشتر ملک کی بہبودی سے متعلق ہیں بالکل ناچیز ہو گئے ہیں۔ عیسائیوں کو پارلیمنٹ میں اپنے مطلب کی حمایت کے واسطے یہودیوں کی نسبت ووٹ دینے میں کچھ عذر نہیں ہوتا اور درحقیقت سوشل و پولیٹکل مقاصد کے واسطے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انگلستان کی کل آبادی ایک ہی قوم ہے۔ بلاشبہ یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان کی نسبت ایسا نہیں کہا جا سکتا.... ان ملکوں میں جہاں کی آبادی صرف ایک قوم اور ایک مذہب سے مرکب ہوئی ہے۔ یہ قاعدہ بلاشبہ سب سے عمدہ ہے جو جاری کیا جا سکتا ہے۔"[27]

ہندوستان میں بسنے والی مختلف قوموں میں تعلیمی و اقتصادی

نابرابری کو دیکھتے ہوئے سرسید نے ریپریزنٹیشن کے سارے اصول کو جاری کیے جانے کی مخالفت کی اور کہا کہ اگر ایسا کیا تو ملک میں بدامنی پھیلنے کا اندیشہ ہے اور قوم و مذہب کا اختلاف نظر انداز کرنے سے بہت سے خطرات در پیش آجائیں گے۔

"لیکن مائی لارڈ! ایک ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے جہاں کہ ذات کے اختلافات اب تک موجود ہیں اور جہاں مختلف قومیں خلط ملط نہیں ہوئی ہیں اور یہاں کہ مذہبی اختلافات اب تک زور شور پر ہیں اور جہاں کے علم نے اپنے جدید معنی کے لحاظ سے باشندوں کے تمام فرقوں میں ایک مساوی مناسبت سے ترقی نہیں کی ہے، مجھ کو یقین ہے کہ لوکل بورڈوں اور ضلع کی کونسلوں میں مختلف مطالب کی حمایت کی غرض سے الیکشن کے خالص اور سادہ اصول کے جاری کرنے سے محض تمدنی خیالات کی نسبت زیادہ تر بڑی بڑی خرابیاں پیدا ہوں گی جب تک کہ قوم اور مذہب کے اختلافات کا امتیاز ہندوستان کی سوشل و پولیٹکل حالت میں ایک جزو اعظم رہے گا.. اس وقت تک الیکشن کا خالص قاعدہ طمانیت کے ساتھ جاری نہیں کیا جاسکتا۔"[۵۳]

الیکشن کے خالص اور سادہ اصول سے مراد وہ طریقہ ہے جو اکثر جمہوری ملکوں میں رائج ہے کہ بلا لحاظ کیے ہوئے مختلف فرقوں میں تعداد اور تعلیمی اختلافات کے سب انسانوں کے ووٹ کی قیمت برابر قرار دی جائے۔ سرسید کا خیال تھا کہ اگر سادہ اصول جاری ہوا تو بڑی قوم چھوٹی قوم پر حاوی آجائے گی اور مذہبی اختلافات زیادہ بڑھ جائیں گے جس میں تمام فرقوں کا نقصان ہے۔

"بڑی قوم چھوٹی قوم کے مطالب پر بالکل غالب آجاوے گی ..... قوم اور مذہب کے اختلافات بہ نسبت سابق کے اور بھی زیادہ سخت ہو جاویں گے مائی لارڈ! میں نے اس معاملے کی نسبت اس قدر تفصیل کے ساتھ اس امر کی تشریح کرنے کی غرض سے گفتگو کی ہے کہ میں نے ریپریزنٹیو طریقے کا سچا حامی ہو کر کس وجہ سے اس مسودہ کے ان احکام کی دلی تائید کی ہے جو الیکشن کے خالص طریقے کے خلاف معلوم ہوتے ہیں۔ گورنمنٹ نے جو لوکل بورڈوں اور ضلع کونسلوں کے ایک ثلث ممبروں کے مقرر کرنے کا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ اس سے گورنمنٹ نے یہ تدبیر اختیار کی ہے جو ہندوستانی رعایا کے مختلف فرقوں کی طرف سے ممبروں کے تقرر میں اس قسم کی مناسب اور واجبی مساوات قائم رکھے جو الیکشن کے خالص قاعدے کے ذریعے سے حاصل نہ ہوگی۔"[۵۴]

سرسید نے سادے اصول کے مقابلے میں ریزرویشن کے اصول کو پسند کیا۔ بلکہ یہ ترمیم سرسید نے ہی پیش کی تھی کہ حکومت ایک تہائی ممبروں کا تقرر اپنے ہاتھ میں رکھے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جو تعداد طبقات کی کمی کی وجہ سے نمائندہ انجمنوں میں اپنی پسند کے نمائندے نہ بھیج سکیں۔ ان کے نمائندوں کا نومینیشن حکومت اپنی طرف سے کر دے تاکہ ہندو مسلمان و دیگر اقوام کے ممبران کی تعداد برابر ہو سکے۔ سرسید اگر قومی اختلافات کی نشاندہی نہ کرتے تو سادہ اصول ہی جاری ہوتا اور مسلمانوں کی نمائندگی اپنی تعداد کے لحاظ سے نہ ہو پاتی۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد سرسید کی اس خدمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"۱۸۸۲ء میں جب کہ لوکل سیلف گورنمنٹ بل کونسل میں پیش ہوا تھا تو انھوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ چونکہ ہندوستان میں مختلف مذہبوں کے اور مختلف رسم و رواج کے لوگ آباد ہیں، اس لیے یہ ضروری ہے کہ بورڈ کی کچھ نشستیں اس طریقے پر پُر کرنی چاہیں تاکہ ایسے آدمیوں کو حکومت منتخب کر کے کمی پوری کر دے تاکہ جو کسی مخصوص فرقے کے نمائندے تو ہیں لیکن انتخاب میں نہیں آئے ہیں۔"[۵۵]

سر سید کی اس ترمیم سے بہت سے فوائد مسلمانوں کو ہوئے [1] مختلف میونسپلٹیوں و ضلع کونسلوں میں مسلمانوں کو نامزد کیا گیا کہ الیکشن میں زیادہ تر مسلمان ہار گئے تھے۔ سر سید نے اپنے اس کارنامے کا ذکر اپنی مشہور لکھنؤ کی تقریر میں کیا۔ کانگریس کے سارے جمہوری اداروں کے مطالبے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا!

"اس وقت (یعنی جب سر سید وائسرائے کی کونسل کے ممبر تھے ۱۸۸۲ء میں) لوکل بورڈ اور میونسپل بورڈ کا قانون پیش تھا اور اس کا منشا یہ تھا کہ سب لوگ الیکشن کے ذریعے ممبر منتخب ہوں۔ اے صاحبو! میں کنزرویٹو نہیں ہوں، میں بہت بڑا لبرل ہوں، لیکن ان خیالات سے قوم کی بھلائی کو بھول جانا کسی عقل مند کا کام نہیں ہے۔ جو شخص کہ اس طرح کے الیکشن کے خلاف تھا وہ میں تھا۔ اگر میں شیخی نہ کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ لارڈ کی رائے صرف میری ہی اسپیچ کے زور سے بدلی کہ ایک ثلث کا تقرر گورنمنٹ کے ہاتھ میں رہا اور دو ثلث انتخاب الیکشن سے۔" [8]

حواشی

۱ہ	مجموعۂ لیکچرز : مرتبہ محمد امام الدین گجراتی	صفحہ ۱۴۰
۲ہ	ایضاً ایضاً	
۳ہ	ایضاً ایضاً	
۴ہ	ایضاً ایضاً	
۵ہ	ایضاً ایضاً	
۶ہ	ایضاً ایضاً	
۷ہ	ہندوستان کا مستقبل۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد	صفحہ ۱۹۵
۸ہ	مجموعۂ لیکچرز : مرتبہ محمد امام الدین گجراتی	صفحہ ۳۱۰

"سر سید احمد خاں کو کسی بھی پہلو سے دیکھا جائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑا سا پتھر ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کے ٹھہرے ہوئے پانی میں لڑھکا دیا گیا ہو۔ اس نے جو لہریں اٹھائیں وہ اب تک حرکت میں ہیں۔ خواہ ہمیشہ اس سمت میں نہ ہوں جو سر سید پسند کرتے۔"

(خالدہ ادیب خانم)

سرسید ـــــ بحیثیت صحافی

قمر الہدیٰ فریدی ★

سرسید کی صحافتی زندگی کا نقطۂ آغاز "سید الاخبار" ہے جو اُن کے بھائی سید محمد نے ۱۸۳۷ء میں دلی سے جاری کیا تھا لیکن وہ باقاعدہ صحافی کی شکل میں "اخبار سینٹیفک سوسیٹی" کے حوالے سے سامنے آتے ہیں۔ یہ اخبار ۳۰ مارچ ۱۸۶۶ء کو علی گڑھ سے جاری ہوا۔ شروع میں اس کی صورت یہ تھی کہ پہلے صفحے پر اوپر کی جانب انگریزی میں "دی علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" اور اس کے نیچے اردو میں "اخبار سینٹیفک سوسیٹی" درج ہوتا تھا۔ ستمبر ۱۸۶۷ء میں جب راجہ جگت سنگھ نے اپنا پریس اور انگریزی اخبار "پروگرس" سائنٹفک سوسائٹی کے حوالے کر دیا تو اردو میں "اخبار سینٹیفک سوسیٹی علی گڑھ" جس میں اخبار پروگرس مل گیا ہے" لکھا جانے لگا اور انگریزی میں اس مفہوم کے لیے یہ عبارت شائع ہونے لگی۔

"THE ALIGAR INSTITUTE GAZETTE WITH WHICH IS INCORPORATED THE PROGRESS."

لیکن جون ۱۸۷۷ء سے انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں اس اخبار کا نام "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" قرار پایا اور بطور اطلاع یہ جملہ برقرار رہا "جس میں اخبار پروگرس مل گیا ہے۔"

یہ ایک دو لسانی اخبار تھا۔ عموماً ہر صفحہ پر ایک جانب اردو میں اور دوسری طرف انگریزی میں خبریں اور مضامین ہوتے لیکن یہ کچھ ضروری نہ تھا۔ بعض اوقات پورا پورا صفحہ اردو یا انگریزی کے لیے وقف ہوجاتا۔ یہ بھی کچھ طے نہ تھا کہ دونوں زبانوں کا مواد یکساں ہی ہو، بلکہ قاری کے ذوق کے مطابق حسب ضرورت حذف و اضافہ سے کام لیا جاتا تھا۔ البتہ مشترک دلچسپیوں سے متعلق تحریریں یکساں طور پر دونوں زبانوں میں ہوتی تھیں۔

اردو زبان چونکہ دائیں سے بائیں لکھی جاتی ہے اس لیے ابتداً اخبار کی ترتیب میں بھی یہی قاعدہ ملحوظ رکھا گیا تھا۔ لیکن ۱۸۷۰ء سے اس میں تبدیلی آئی اور یہ بائیں طرف سے شروع ہونے لگا۔

اول اول یہ سولہ صفحات پر مشتمل ایک ہفتہ وار اخبار تھا اور جمعہ کا دن اس کی اشاعت کے لیے مقرر تھا لیکن جون ۱۸۷۷ء سے یہ سہ روزہ ہوگیا اور ہفتہ میں دو بار چھپنے لگا۔ ایک شنبہ کو، ایک سہ شنبہ کو۔ شنبہ کو شائع ہونے والا اخبار تو سولہ صفحہ کا ہی رہا البتہ سہ شنبہ کا اخبار بارہ صفحہ کا کر دیا گیا۔ اس سلسلے میں سرسید کا وضاحتی بیان ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں:

"واضح ہو کہ جو اخبار بروز شنبہ کو نکلتا ہے اس کی مقدار آٹھ ورق یعنی سولہ صفحہ کی ہے۔ اس میں چھ ورق یعنی بارہ صفحہ اخبار سے متعلق ہیں اور دو ورق اشتہارات کے لیے ہیں۔ لیکن اگر اشتہار دو ورق سے کم ہوں یا نہ ہوں تو ان میں بھی اخبار یا مضامین چھاپ دیے جاتے ہیں۔

جو اخبار کہ بروز سہ شنبہ نکلتا ہے، اس کی مقدار

★ ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

چھ ورق یعنی بارہ صفحے ہیں۔ اس میں بھی دو ورق واسطے
اشتہارات کے موضوع ہیں مگر بہ حالت نہ ہونے یا کم
ہونے اشتہارات کے، ان میں بھی مضامین یا خبر چھاپ
دیتے ہیں۔
اگر اشتہارات دو ورق سے زیادہ ہوتے ہیں
تو مقدار صفحوں کی زیادہ بڑھا دی جاتی ہے۔۔۔۔ مگر
جس قدر صفحات کہ مضامین کے لیے معین ہیں، ان میں
کبھی کمی نہیں ہونے پاتی۔
علاوہ اس کے کبھی بہ لحاظ کسی مضمون کے مقدار
معینہ سے اخبار بڑھ جاتا ہے۔"

۱۸۷۹ء میں جب "تہذیب الاخلاق" کو تیسری بار بند کرنے کی نوبت آئی تو سرسید نے اسے بھی "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" میں شامل کر لیا۔ چنانچہ ایک بار پھر یہ اخبار ہفتہ وار ہو گیا اور شنبہ کو شائع ہونے لگا۔

ایک مدت تک اخبار کے اخراجات کی "سائنٹفک سوسائٹی" کفیل رہی لیکن جب سوسائٹی کی مالی حالت کمزور ہوئی تو جولائی ۱۸۸۷ء سے یہ مدرسۃ العلوم کی مجلس منتظمہ کے زیر اہتمام نکلنے لگا۔

شروع میں پچاس روپے ماہوار پر محمد یار خاں اخبار کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ خبروں کی رپورٹنگ انگریزی سے ترجمہ شدہ عبارتوں کی تصحیح اور نظر ثانی کا کام ان کے سپرد ہوا۔ نومبر، ۱۸۶۷ء سے تیس روپے ماہوار تنخواہ پر ان کی جگہ مولوی محمد اسماعیل نے یہ ذمہ داری سنبھالی اور جب سرسید بنارس سے ریٹائر ہو کر علی گڑھ آ گئے تو یکم مئی ۱۸۷۷ء سے وہ گزٹ کے اعزازی مدیر ہو گئے لیکن ۱۸۷۸ء میں انھوں نے اپنی مصروفیات کے سبب اس ذمہ داری سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ ان کے بعد موقع موقع سے بالو درگا پرشاد، خواجہ محمد یوسف اور مولوی سمیع اللہ خاں وغیرہ گزٹ کی ترتیب و تنظیم میں ہاتھ بٹاتے رہے۔

اگرچہ سرسید عدیم الفرصتی کے باعث گزٹ کو مستقل وقت دینے سے معذور تھے، تاہم ہم عصر اردو اخبارات میں اسے جو امتیاز حاصل ہوا وہ اسی مرد آزاد کی ذاتی دلچسپی اور طے کردہ پالیسی کا نتیجہ ہے۔

سرسید پریس کی آزادی کے زبردست حامی تھے۔ اخبار "سینٹیفک سوسیٹی" کے پہلے صفحے پر درج ذیل ماٹو شائع ہوا کرتا تھا۔

"آزادی چھاپہ کی ہے۔ ایک بڑا فرض گورنمنٹ کا اور
ایک اصلی اور جبلی حق رعایا کا۔"

جنوری ۱۸۶۷ء سے یہ جملہ قدرے بدل کر اس طرح لکھا جانے لگا۔

"جائز رکھنا چھاپہ کی آزادی کا ہے کام ایک دانا گورنمنٹ
کا اور برقرار رکھنا اس آزادی کا ہے کام ایک آزاد
رعیت کا۔"

سالہا سال تک یہ عبارت اسی طرح چھپتی رہی، بعد میں اس کی اشاعت موقوف ہو گئی۔

"اخبار سینٹیفک سوسیٹی" کا ماٹو یہ بتاتا ہے کہ سرسید صرف پریس کی آزادی کے ہی خواہاں نہ تھے بلکہ ان کی نظر میں گورنمنٹ کے لیے بھی یہ ضروری تھا کہ وہ اسے برقرار رکھے، اسی میں اس کی بھلائی اور دانش مندی پوشیدہ ہے۔ چنانچہ انھیں اپنے اخبار میں بار بار اس نوعیت کی تحریریں شائع کرنا پڑیں۔

"بلا شبہ یہ بات نہایت صحیح ہے کہ عام رائے کی اطلاع
کے واسطے گورنمنٹ کو کوئی ذریعہ ملکی اخبارات سے بہتر
نہیں مل سکتا اور رعایا کے پاس بھی اپنی ہر قسم کی
عرض داشت کو گورنمنٹ کے حضور میں پیش کرنے کے
لیے اخبار سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔ مگر اخبار کو بہ اس
اطلاع کا ذریعہ تسلیم کرنا میں چند شرطیں ہیں۔ اگر ان
میں سے ایک بھی شرط نہ ہوگی تو پھر اخبار کامل اطلاع
کا ذریعہ نہ ہوگا اور اس حالت میں جو امیدیں اخبار
کے ساتھ باندھی جاویں گی وہ سب نکمی ہو جاویں گی۔
سب سے اول شرط یہ ہے کہ گورنمنٹ وقت چھاپہ خانوں
یعنی اخباروں کی آزادی کو ملک کے اصول حکمرانی میں تسلیم

کرے اور جو مزاحمتیں اخبار کی اصلی آزادی کے خلاف
ہوں ان کو ناجائز سمجھے۔"

سرسید کو علم تھا کہ ابھی ہماری صحافت اپنے فرائض سے پوری طرح آشنا نہیں لیکن ساتھ ہی وہ اس خیال سے بھی متفق تھے کہ

"علم اصول و اخلاق و قوانین اور علم انتظام سیاستِ مدن روز بروز ہندوستان میں پھیلتا جاتا ہے اور جوں جوں اس کی ترقی ہوگی اخباروں کی رائیں نسبت پالیٹکل باتوں کے زیادہ صائب و صحیح ہوتی جاویں گی اور یہ نقص جو اب دکھلائی دیتا ہے، از خود رفتہ رفتہ رفع ہو جاوے گا لیکن اگر گورنمنٹ کی مداخلت ہوگی تو ہماری رائے میں بہت مضرت ہوگی۔"

انھیں احساس تھا کہ انگریزی اخبار نویس ہندوستان میں اس قدر کسی فرقے سے ناراض نہیں ہیں جس قدر کہ وہ ہندوستانی اخبار نویسوں کی آزادی سے۔ اس وجہ سے انھوں نے کبھی ہندوستانی اخباروں پر خوشامد کا الزام لگایا ہے، کبھی بغاوت کا الزام لگایا ہے، کبھی ہندوستانی راجاؤں کی جھوٹی طرف داری کا خیال خام لگایا ہے۔

جب سرسید لندن میں تھے تو انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے سکریٹری راجا جے کشن داس کو ایک خط میں تاکید کی تھی۔

"اپنی سوسائٹی اور اخبار کی آزادی کو ہرگز ہاتھ سے مت دینا۔"

آزادیٔ رائے سرسید کو اس قدر عزیز تھی کہ اس کے لیے وہ ہمیشہ بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے کو تیار رہتے تھے۔ سرکاری ملازم ہونے کے باوجود انھوں نے "اسبابِ بغاوتِ ھند" میں بڑی بے باکی سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ناقص پالیسی پر اظہارِ خیال کیا تھا۔ ایک موقع پر آگرہ قلعہ میں منعقد ہونے والی سرکاری تقریب سے وہ اس لیے احتجاجاً واپس ہو گئے تھے کہ وہاں ہندوستانیوں اور انگریزوں کی نشستیں الگ الگ تھیں۔ ولیم میور لیفٹننٹ گورنر اضلاع شمال و مغرب نے جب "لائف آف محمد" میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر نامناسب اور بے بنیاد اعتراضات کیے تو سرسید سے برداشت نہ ہو سکا اور

انھوں نے مسکت جواب لکھ کر ہی دم لیا۔ یوں ہی ۱۸۷۱ء میں و
کی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" شائع ہوئی تو علی گڑھ ا
ٹیوٹ گزٹ میں ۲۴ نومبر ۱۸۷۱ء سے ۲۳ فروری ۱۸۷۲ء تک
انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں اس کی قسط وار تردید
رہی۔"

یہ صحیح ہے کہ "اخبار سائنٹفک سوسائٹی" کے اکثر مندر
سے گورنمنٹ کی خیر خواہی جھلکتی ہے لیکن اس کے صفحات پر گور
کی پالیسیوں پر تنقید بھی کی گئی ہے اور حکام وقت کو مشورے
دیے گئے ہیں۔ ایک مثال ملاحظہ ہو — جب عدالتوں کے ا
میں کمی کا سوال اٹھا تو اخبار سائنٹفک سوسائٹی" نے اس کی م
مخالفت کی۔

"آج کل سرکاری عدالتوں میں تخفیف کی خبر گرم ہونے سے ایک عجیب کھلبلی پڑی ہوئی ہے اور جو شخص ہے اسی فکر میں مبتلا ہے۔ جو لوگ معرضِ تخفیف میں ہیں، ان کو اس بات کا خیال ہے کہ اول تو روزگار ہاتھ سے جاتا ہے دوسرے وہ تمام استحقاق جو مدتوں جان مار کر اور اپنا اچھا وقت سرکاری ملازمت میں گزران کر پیدا کیا تھا ہاتھ سے جاتا ہے۔۔ اور بہت سے ایسے لوگ جو تخفیف کے دغدغہ سے ایمن ہیں، اس فکر میں سرشار ہیں کہ جب تخفیف ہوگی اور ملازم کارکن کم ہو جاویں گے اور کام عدالتوں کا بدستور رہے گا تو بہر کیف ان ہی عدالتوں میں ان ہی باقی ماندہ ملازموں سے وہ کام پورا کرایا جاوے گا، کیوں کہ اس کا سرانجام بجز اس کے اور کس طرح ہو سکتا ہے کہ جو شخص موقوف ہو اس کا کام اوروں پر منقسم ہو جاوے اور یہی باقی ماندہ لوگ اس کے کفیل ہوں بس ایک تو پہلے ہی سے ہم لوگ مر رہے ہیں کہ کام حد سے زیادہ ہے۔۔ اور جب تخفیف شدہ ملازموں کا کام بھی ہمارے سر آپڑا تو دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ جرمانوں کے ہی مارے کام تمام ہو جاوے گا اور کام پورا نہ

ہو گا۔۔۔غرض کہ جو لوگ تخفیف کے لائق بھی ہیں وہ بھی
اور جو تخفیف سے بچے ہوئے ہیں وہ بھی دونوں مصیبتوں میں
گرفتار ہیں اور یہ بھی ضرور ہے کہ تخفیف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی
چاندی کا نرخ گھٹ گیا ہے، روپیہ کی ضرورتیں پیش ہیں آمدنی
بدستور ہے، پھر تخفیف نہ ہو تو کیا ہو۔ مگر ہم کو حیرانی یہ ہے
کہ اس قسم کی تخفیف سے جو سردست گورنمنٹ نے تجویز
فرمائی ہے، نتیجہ کیا ہوگا۔ کیا گورنمنٹ کی کچہریوں میں دو چار
چپراسیوں اور دو چار بیچارے محرروں اور دو چار بستہ برداروں
ایک دو دفتریوں اور بڑے سے بڑے ایک دو سے زائد
پیش کاروں کی تخفیف سے کوئی ایسا معتد بہ خزانہ جمع
ہو جاوے گا جو قابل اعتنا ہے یا اس کے سبب سے
کوئی بڑا خرچ موقوف ہو جاوے گا جس کی گورنمنٹ
برداشت نہیں کر سکتی۔۔۔ ہماری دانست میں ایسے
لوگوں کی تخفیف سے سوائے واویلا اور فریاد کے پیدا
ہونے کے اور کوئی نتیجہ نہیں معلوم ہوتا اور ایسے لوگوں کی
تخفیف سے علاوہ فریاد کے، انتظام کی ابتری کا بڑا
اندیشہ ہے۔ اگر بجائے دس چپراسیوں کے آٹھ تجویز ہوں
ہوں گے تو سوائے اس کے اور کیا ہوگا کہ دس کا کام
آٹھ کو کرنا پڑے گا اور اس کے سبب سے جو کام جلد
ہوتا تھا وہ دیر میں ہوگا۔ اگر دس محرروں سے دو کم کیے جاویں
گے تو جو کام ایک گھنٹہ میں ہوتا تھا وہ سوا گھنٹہ میں ہوگا۔
ہم حیران ہیں کہ گورنمنٹ کی نظر ایسی تخفیف پر
کس غرض سے ہے۔ اگر وہ تخفیف ہی کرنا چاہتی ہے تو
ایسا کیوں نہیں کرتی کہ جو ضلع قریب قریب ہیں ان میں
سے جس ضلع کو چھوٹا خیال کرے اس کو توڑ کر اور بڑے
ضلعوں میں شامل کر دے اور اس تدبیر سے لاکھوں
روپیہ کی بچت حاصل کرے اور اگر ضلعوں کو توڑنے میں
دقت معلوم ہوتی ہو تو جو لوگ بڑے بڑے تنخواہ دار ہیں ان
کی تنخواہوں میں سے ایک معتد بہ حصہ کی تخفیف کر دے
تاکہ جو انتظام ہے وہ بجنسہٖ باقی رہے اور کسی طرح کا ہرج
بھی نہ ہو اور تخفیف بھی ہو جائے۔۔۔

ہماری گورنمنٹ اس بات پر بھی نظر فرماوے کہ اب
پولس کے سررشتہ کی بدولت کیا صرف ہوتا ہے اور پہلے
کیا صرف ہوتا تھا۔۔۔ پہلے دو دو سو روپے کے
تھانیدار اور ہزار ہزار پان پان سو کے سپرنٹنڈنٹ کہاں
تھے اور اس قدر صرف کی کب ضرورت تھی اور اب تو کچھ
ٹھکانا نہیں ہے۔ پس اگر گورنمنٹ تخفیف کی ہی خواستگار
ہے تو پولس کی طرف کیوں نہیں متوجہ ہوتی اور بڑے
بڑے یوروپین صاحب کیوں معرض تخفیف میں نہیں آتے
خصوصاً اس حالت میں کہ اب پولیس کے انتظام کا
انقلاب ہو گیا ہے اور افسران پولیس کی ذمہ داری بہت
کم ہو گئی ہے اور ان کا کام بہت کم ہو گیا ہے"[۱۱]

کسی زمانے میں خورجہ ضلع بلند شہر کے بنیوں اور سراوگیوں کے
درمیان فساد ہوا تو "اخبار سائنٹیفک سوسائٹی" نے گورنمنٹ کی
توجہ اس جانب مبذول کراتے ہوئے مشورہ لکھا:

"ہم کو تعجب ہے کہ حکام نے اس موقع پر پہلے سے کیوں
نہ ایسا انتظام کر لیا جو یہاں تک نوبت نہ پہنچنے دیتا اور
جو خرابی اب ہوئی وہ نہ ہوتی۔ ہمارے رائے میں ہمیشہ ایسے
موقع پر اگر ادنیٰ بھی احتمال فساد ہو تو بخوبی انتظام
کر لیا جاوے"۔[۱۲]

اسی طرح انگریزوں کے ہاتھوں مختلف مقامات پر یکے بعد دیگرے
چھ ہندوستانیوں کے قتل کے افسوسناک واقعات رونما ہوئے تو
"اخبار سائنٹیفک سوسائٹی" نے پُرزور صدائے احتجاج بلند کی۔

"یہ چھ خبریں قتل کی ہیں، جن میں چھ غریب ہندوستانی
مقتول اور چھ صاحب بہادر قاتل ہیں اور ان جملہ مقدمات
میں اب تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ قاتلوں سے کیا مواخذہ
ہوا۔۔۔

کیا غریب ہندوستانی اسی طرح کام میں آویں گے

کہ ہمیشہ صاحب لوگوں کے گھونسوں اور لاتوں اور رولوں سے پٹ کر جان دیں گے ۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر گورنمنٹ انگریزی میں جان کی حفاظت کا دعویٰ شاید صحیح نہ ہوگا۔[۱۳]

اخبار سین ٹیفک سوسیٹی'' کی ایک اور اشاعت میں انگریزوں کی زیادتی کا شکوہ ان لفظوں میں کیا گیا ہے :

ہمارے اخبار مطبوعہ ۲۱ر اپریل ۱۸۷۶ء میں ہمارے ناظرین اخبار نے اس خبر کو پڑھا ہوگا جس میں مسٹر نیو جنٹ صاحب اسسٹنٹ مجسٹریٹ سیتامڑھی اور اس بے چارہ امیدوار کا ذکر ہے جس کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر صاحب نے اس سے کہا تھا کہ اگر تم آئندہ سے ہم کو دیکھ کر گھوڑے سے نہ اترو گے تو ہم تم کو سخت سزا دیں گے ۔ اگر یہ شریف ہندوستانی ہندوستانی نہ ہوتا بلکہ بجائے اس کے ایک یورپین ہوتا گو وہ کیسا ہی کم رتبہ ہوتا تو شاید اسسٹنٹ صاحب موصوف کو اس سے ایسی گفتگو کرنے کا منصب نہ ہوتا

اس بے چارے امیدوار کے ساتھ ایک اور غریب معزز آدمی پالکی میں سوار تھا اور اس نے صاحب کو سلام بھی کیا تھا، مگر صاحب نے اس کا سلام نہیں لیا اور اس سے بھی یہی کہا کہ اگر تم پالکی سے نہ اترو گے تو ہم تم کو سخت سزا دیں گے ۔۔۔ علاوہ اس قصّے کے بسا اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ گو کیسا ہی معزز اور شریف ہندوستانی ہے اور گو وہ بگھی یا ٹم ٹم ہی پر کیوں نہ جاتا ہو اور اگر ادنیٰ صاحب بہادر تشریف لے جاتے ہوں اور وہ ہندوستانی صاحب کو سلام کرے تو صاحب ہرگز اس کا سلام نہیں لیتے اور ان کی اس بے پروائی سے صرف یہی نہیں ثابت ہوتا کہ صاحب کی بد خلقی اور تند مزاجی تھی، بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی نہایت ذلیل سمجھے جاتے ہیں اور شاید وہ کسی عزت کے اس وقت تک مستحق نہیں ہیں جب تک کہ وہ ہندوستانی ہونے کا سیاہ ٹیکا اپنی پیشانی پر سے نہ چھٹا دیں ۔

ہماری گورنمنٹ جس کی بیدار مغزی نہایت شہرہ آفاق ہے کیا وہ اس بات کو نہ جانتی ہوگی کہ ہندوستانیوں کو اپنی اس ذلت سے کیسا صدمہ ہوتا ہے ۔''[۱۴]

ان مثالوں سے ''اخبار سین ٹیفک سوسیٹی'' کی پالیسی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور چوں کہ یہ پالیسی سرسید کی طے کردہ تھی، اس لیے اس سے ان کی بے باکی و بے خوفی بھی ظاہر ہوتی ہے ایک دیانت دار صحافی سے اس بات کی بھی توقع کی جاتی ہے کہ جس طرح وہ اپنے خیالات کے اظہار میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا اسی طرح دوسروں کی آرا کو بھی توجہ سے سننے اور انھیں اپنے قارئین کے سامنے پیش کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو ۔ خواہ وہ رائیں خود اسے کیسی ہی ناپسند کیوں نہ ہوں ۔ سرسید کی صحافت اس معیار پر پوری اترتی ہے ۔ وہ اردو کے طرف دار بلکہ عاشق زار تھے، لیکن اس کے باوجود ۱۸۶۷ء کے آغاز میں بنارس کے ہندوؤں نے جب فارسی رسم خط میں تحریر ہونے والی اردو کی جگہ، دیوناگری لپی میں لکھی جانے والی ہندی کو عدالتوں کی زبان قرار دینے پر اصرار کیا اور نتیجتاً اردو کے حامیوں اور مخالفوں کے درمیان باقاعدہ رسہ کشی شروع ہوگئی، تو ''اخبار سین ٹیفک سوسیٹی'' نے کسی ایک گروپ کی حمایت کرنے کے بجائے دونوں فریقوں کی تحریروں کو یکساں اہمیت دی ۔ اخبار سین ٹیفک سوسیٹی'' پر سرسید کا جو اثر تھا، اس کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر وہ چاہتے تو ہندی کے پرستاروں کے خطوط اور مضامین کی اشاعت کی نوبت ہی نہ آتی ۔ یا کم از کم یہ سلسلہ تادیر جاری نہ رہ سکتا، لیکن اس کے برعکس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ناگری رسم خط کی وکالت میں نہ صرف یہ کہ موصولہ تحریریں گزٹ میں شائع ہوئیں بلکہ اس نوع کی تحریریں بعض دیگر اخبارات سے اخذ بھی کی گئیں ۔ ان مضامین کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ لکھنے والوں کی اہمیت کے پیش نظر ان کی اشاعت ناگزیر تھی لیکن ایسا سمجھنا درست نہیں ۔ یہیں گزٹ میں ایک ایسا مضمون بھی ملتا ہے جو گمنام ہے اس میں ہندی کی پرزور

وکالت کی گئی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"اس ملک کا نام ہندوستان ہے اور اس کے قدیم باشندے ہندو کہلاتے ہیں اور ان کی اصل زبان ہندی اور برج بھاشا تھی۔ پس چوں کہ اس زبان کو اصل خلقت اہل ہند سے ایک مناسبت ہے جس کو عرف میں مناسبت طبعی سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی مناسبت کے سبب سے یہاں کے قدیم باشندے اسی زبان کو پسند کرتے ہیں جو ان کی اصل طبع اور جبلت کے مناسب ہے اور ان کو بہت خوش معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے خیالات اور ضروری کاروبار کا سرانجام اپنی جبلی زبان کے ساتھ کریں اور اسی نظر سے ان کی یہ درخواست بجا ہے کہ سرکاری دفتروں میں ناگری زبان جاری کر دی جاوے تاکہ اس کے ذریعے سے اپنی طبیعت کی تمنا کے موافق تمام معاملات دنیوی اور خیالات قلبی پورا کر سکیں"۔[۱۵]

اس مضمون کے ساتھ ایک وضاحتی بیان بھی ہے، ملاحظہ ہو۔

"یہ مضمون ہمارے پاس ایک صاحب نے اخبار میں مندرج ہونے کی غرض سے بھیجا تھا، چنانچہ ہم اُن کی درخواست کے موافق اس کو ذیل میں درج کرتے ہیں"۔

"اخبار سینٹیفک سوسیٹی" میں شایع ہونے والے مضامین کے ساتھ مضمون نگار کا نام بھی ہوتا تھا لیکن مذکورہ مضمون کے ہمراہ لکھنے والے کا نام کا نہ چھپنا دو سبب سے ہو سکتا ہے۔ یا تو مراسلہ گم نام ہے یا پھر ایڈیٹر سے گزارش کی گئی ہے کہ نام نہ شایع کیا جائے۔ دونوں صورتوں میں اس تحریر کو ناقابل اشاعت قرار دینے کی گنجائش موجود تھی، لیکن اس گنجائش سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ لہٰذا اب یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ہندی کے حامیوں کے مضامین کی اشاعت کسی دباؤ یا مصلحت کی بنیاد پر نہیں بلکہ صحافت کے تقاضے کے تحت کی گئی ہے اور اس خیال سے کی گئی ہے کہ قارئین معاملہ کے ہر پہلو سے اچھی طرح واقف ہو جائیں اور خود اپنے طور پر کوئی رائے قایم کر سکیں۔

سرسید نے اپنے اخبار میں اداریہ نگاری کا بھی خصوصی اہتمام کیا تھا۔ ان اداریوں پر نظر ڈالیے تو نہ صرف یہ کہ موضوعات کے تنوع کا احساس ہوتا ہے، بلکہ اہم معاملات اور مسائل میں عوام کی رہنمائی کا رجحان بھی ملتا ہے۔ ایک اداریہ دیکھیے، لکھتے ہیں۔

"ہماری قوم نے تعلیم کی طرف سے جس کی اس زمانہ میں حد سے زیادہ ضرورت ہے اور اس زمانہ میں وہی ایک ذریعہ اقبال مندی اور دولت مندی کا ہے یک لخت توجہ ہٹالی ہے اور خود اپنے تئیں ایسا نالایق کر دیا ہے کہ کسی کام کے لایق نہیں رہے ہیں، جن لوگوں کی اقبال مندی اور عروج روز افزوں پر ہم رشک کرتے ہیں وہ تو ایک زمانے میں ہم سے بھی کم درجے پر تھے۔ ہم سوئے وہ جاگے۔ ہم بیٹھے وہ کھڑے ہوئے ہم کھڑے ہوئے وہ چل نکلے، ہم چلے وہ دوڑ گئے۔ پس وہ آگے بڑھ گئے، ہم پیچھے رہ گئے۔ اگر ہم کو کچھ مانگنا ہے یا کچھ شکایت کرنی ہے تو ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ ہم اول اس کے ملنے کے لایق ہو جاویں جس کو مانگتے ہیں اول ہم اپنے تئیں اس شکایت کے لایق کر لیں، جس کی شکایت کرتے ہیں۔

ہم اپنی قوم کو بارہا جتا چکے ہیں کہ جب تک مسلمان خود اپنی تعلیم کا بوجھ آپ نہیں اُٹھاویں گے اس وقت تک ان کی ذلت، ان کا ادبار دور نہیں ہو سکتا۔ اس ہمارے قول کی تصدیق بہت ہو چکی ہے اور جو رہی سہی باقی ہے وہ بہت جلد ہو جانے والی ہے۔ قوم کی جو حالت ہونے والی ہے اور جو ہماری آنکھوں کے سامنے کھڑی ہے، اس نے ہمارے دل کو دکھایا ہے اس ہمدردی اور دل دکھنے سے ہم نے مسلمانوں کے لیے مدرسۃ العلوم کے قایم کرنے کا بوجھ اُٹھایا ہے مگر افسوس کہ بہت تھوڑے آدمیوں نے اس کے

ساتھ ہمدردی کی۔ اگر ہماری قوم کو خدا توفیق دے تو مدرستہ العلوم کی تکمیل (جو اُن کی نسل کے لیے آب حیات کا حکم رکھتا ہے) کیا چیز ہے۔ ایسے ایسے متعدد مدرستہ العلوم وہ قایم کر سکتے ہیں۔ مگر خدا نے اُن کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے، کانوں کو بہرا کر دیا ہے، عقل کو الٹا کر دیا ہے کہ نہ کچھ دیکھتے ہیں، نہ سمجھتے ہیں۔ یا سمجھتے ہیں اور کچھ نہیں کہتے۔

اے مسلمانو! دیکھو وقت چلا جاتا ہے۔ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا۔ تم سب پر فرض ہے کہ مدرستہ العلوم کی تکمیل پر توجہ کرو۔ صرف اس کو روپیہ کی مدد درکار ہے۔ محنت کرنے والے موجود ہیں۔ پس ہمت کرو اور چندہ سے امداد کرو۔ دیکھو کہاں تک اس نے ترقی کی ہے اور کس درجہ تک اس کو پہنچا دیا ہے۔ صرف تھوڑی سی مدد سے وہ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ گر تم نے مدد نہ کی اور وہ تکمیل کو نہ پہنچا تو تمہاری قوم پر یہ شعر کسی شاعر کا بالکل صادق آوے گا۔

قسمت کی خوبی دیکھو کہاں ٹوٹی جا کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا" [۱۵]

اس اداریے سے سرسیّد کی دردمندی کا اظہار ہوتا ہے، وہیں اُن کی دور اندیشی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ فی الحال مسلمانوں کے لیے تعلیم سے زیادہ اہم کوئی شے نہیں ہے۔ چنانچہ اس کے لیے انھوں نے ہر ممکن کوشش کی۔ مدرستہ العلوم کا قیام بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

دور اندیشی کے ساتھ ساتھ ایک صحافی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ چیزوں اور معاملوں کو جاننے اور سمجھنے کی شدید خواہش رکھتا ہو۔ سرسیّد اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ جب وہ انگلستان جا رہے تھے تو اس سفر کی روداد "مسافران لندن" کے عنوان سے "اخبار سینٹی فِک سوسائٹی" کے لیے قسط وار بھیجتے رہے تھے، بعد میں اسی نام سے اسے کتابی شکل میں بھی شائع کیا گیا۔ اس کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ تجسس کا مادہ ان میں کتنا شدید تھا اور جزئیات پر وہ کس قدر توجہ دیتے تھے۔ یہاں بس ایک اقتباس پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

"عدن سے سوئیس تک متعدد مینار روشنی کے ہیں جہاں کہیں جہاز کو خطرہ ہے یعنی پانی کم ہے اور پانی کے نیچے پہاڑ چھپے ہوئے ہیں جن سے جہاز کی پیندی کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے، وہاں روشنی کے مینار بنائے ہیں، آدمی متعین ہیں، شام سے صبح تک برابر ایک بہت بڑی لالٹین میں روشنی ہوتی رہتی ہے۔ اور بہت دور سے دکھائی دیتی ہے۔ میں نے قصد کیا تھا کہ تمام میناروں کو جو رستے میں پڑیں دیکھوں اور غالباً سب کو دیکھا۔ شاید کوئی ایک آدھ رہ گیا ہو اور رات کو سوتے میں گزر گیا ہو۔ مگر جتنے مینار کو میں نے دیکھا ان کی تفصیل بقید عرض و طول مقام کے لکھتا ہوں۔" [۱۶]

رائے عامہ پر اثر انداز ہونے اور لوگوں کے خیالات کو موڑ دینے کی جو زبردست طاقت پریس کو حاصل ہے اس کے پیش نظر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ملک کی سالمیت، تحفظ اور بقا کی بہت بڑی ذمّہ داری صحافی پر عاید ہوتی ہے۔ اس کا فرض ہے کہ شہریوں کے درمیان بھائی چارے کی فضا قایم کرے۔ باہمی چپقلش اور کشیدگی کو ہوا دینے کے بجائے امن و امان کی بحالی میں مدد دے۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے اجرا کا منصوبہ بناتے وقت یہ بات سرسیّد کے ذہن میں تھی، اور جب اخبار جاری ہو گیا تو یہ کام اس نے بہ خوبی انجام دیا اور اس نقطۂ نظر سے سرسیّد کی صحافت ایک ایسی صحافت ہے جس کا پیغام محبت ہے۔ ایک اداریہ کی چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

"اگر کوئی مذہب سچ ہے اور معتقد اس کو خدا کی طرف سے جانتے ہیں تو اُن کو یقین کرنا چاہیئے کہ اس میں باہم انسانوں میں محبت اور ہمدردی پیدا کرنا سب سے بڑا فرض ہے۔ پس اگر اس فرض کو ہمیشہ خیال میں رکھیں تو کسی مذہب سے انسان کے دل میں بغض و حسد، کینہ پیدا نہیں

ہو سکتا۔ ہمارا تو یہی یقین ہے اور اسی پر برتاؤ ہے۔"[۱۸]

"اخبار سائنٹفک سوسائٹی" کی فائلوں کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں بلا تفریق مذہب و ملت ہر قوم کے جذبات کی نمائندگی کا خصوصی خیال رکھا گیا تھا۔ ایک خبر ملاحظہ ہو۔

"صاحب اخبار دہلی گزٹ لکھتے ہیں کہ جین مت کا جو نہایت پرانا مندر اجمیر میں ہے اس کی جانب لوگوں کو توجہ کرنی چاہیے کہتے ہیں کہ اس مندر کو بنے ہوئے قریب ڈھائی ہزار برس کے ہوئے مگر اب وہ روز بروز مسمار ہوتا جاتا ہے اور سررشتہ تعمیرات سرکاری کی دست اندازی نے اس کو اور بھی زیادہ برباد کر دیا ہے۔"[۱۹]

مذکورہ بالا عبارت سے جہاں اخبار کی سیکولر پالیسی پر روشنی پڑتی ہے، وہیں صحافیانہ ذمہ داری کا ایک نکتہ بھی سامنے آتا ہے۔ خبر دہلی گزٹ سے لی گئی ہے اور اسی کے حوالے سے نقل بھی کی گئی ہے۔ واضح ہو کہ یہ اس زمانے کی بات ہے جب حوالے کی اہمیت کا احساس عام نہیں ہوا تھا۔ بیشتر اخباروں کے ایڈیٹر عام طور سے اپنے مطلب کی چیزیں کسی حوالے کے بغیر دوسرے اخبارات سے اڑا لیا کرتے تھے۔ سرسید اس کو برا سمجھتے تھے۔ "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کی ایک اشاعت میں "ہمارے ہم پیشہ" کے عنوان سے انھوں نے اس موضوع پر اظہار خیال بھی کیا ہے، لکھتے ہیں:

"ہم بہت دفعہ اخباروں میں اس بات کی شکایت پڑھ چکے ہیں کہ بعض صاحب ایک اخبار سے کوئی مضمون یا خبر اپنے اخبار میں نقل کرتے ہیں اور منقول عنہ کا حوالہ نہیں دیتے یا حرف مقطعات یا ایک جزو نام سے حوالہ دیتے ہیں اور پھر دور تک منہ یا دو زیر جو ایضاً کی دم ہے، لکھتے ہیں۔ اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ ان بزرگوں کا برتاؤ دوستی کا اور آپس کی معاونت کا نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس خیال سے منقول عنہ کا نام نہیں لکھتے یا اس کو خراب کر کر لکھتے ہیں کہ منقول عنہ کا فروغ تصور نہ ہو۔ بلاشبہ یہ برتاؤ دوستانہ نہیں ہے۔"[۲۰]

"علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" میں زیادہ تر خبریں انگریزی اخباروں سے لی جاتی تھیں، جن میں لندن نیوز لندن، انگلش میل لندن، دی ٹائمز لندن اور لینڈ میل لندن، اڈنبرا ریویو اڈنبرا، گزٹ آف انڈیا شملہ، ہندو پیٹریاٹ کلکتہ، فرینڈ آف انڈیا کلکتہ، بنگالی کلکتہ، پایونیر الہ آباد، اودھ گزٹ لکھنؤ قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ مواد کی فراہمی میں اردو، فارسی، عربی، سنسکرت اور ترکی زبان کے اخبارات سے بھی مدد لی جاتی تھی۔ اس فہرست میں اودھ اخبار لکھنؤ، کارنامہ لکھنؤ، مظہر الاخبار مدراس، شمس الاخبار مدراس، نجم الاخبار میرٹھ، اخبار عالم میرٹھ، جلوۂ طور میرٹھ، اکمل الاخبار دہلی، شعلۂ طور کانپور، پنجابی اخبار لاہور، کوہ نور لاہور، مجمع البحرین لدھیانہ، وکیل امرت سر، مراۃ الاقالیم غازی آبادی، زبدۃ الاخبار آگرہ، نور الانوار آگرہ، اخبار الاخبار مظفر پور، روہیل کھنڈ اخبار مراد آباد، دار السلطنت کلکتہ، دوربین کلکتہ، قاسم الاخبار میسور، اخبار پنڈت بنارس، اخبار النحلہ مصر، اخبار الجوائب قسطنطنیہ وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

"اخبار سائنٹفک سوسائٹی" میں اشاعت کے لیے انگریزی کے اخباروں سے جو خبریں منتخب کی جاتی تھیں، ان کو اردو میں منتقل کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ عبارت سے ترجمہ پن ظاہر نہ ہو یعنی لفظی ترجمے کے بجائے مفہوم کی ادائی پر توجہ دی جاتی تھی اور یہی ہونا بھی چاہیے۔ ہر زبان کا ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے اس کی اپنی نحوی ساخت ہوتی ہے۔ اگر اس کا خیال رکھے بغیر لفظی ترجمہ کرتے چلے جائیں تو نہ صرف یہ کہ جملہ کی روانی متاثر ہوتی ہے بلکہ قاری کی دلچسپی میں بھی کمی آتی ہے۔ "اخبار سائنٹفک سوسائٹی" کی ترجمہ شدہ خبریں اس خامی سے تقریباً مبرا ہیں۔

"علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" میں خبروں کی صحت پر بھی نظر رکھی جاتی تھی۔ سرسید اخبار کو "ضروری تصدیق کا ذریعہ" تصور کرتے تھے وہ اس روش کے خلاف تھے کہ عوام کی دلچسپی کی خاطر چٹ پٹی اور بے بنیاد خبروں کو شائع کر کے خریداروں کی تعداد میں وقتی اضافہ کیا جائے۔ انھیں معاصر صحافت سے شکایت تھی۔

"کوئی ہفتہ نہیں گزرتا جس میں دو چار خبریں ہم کو ایسی نہیں معلوم ہوتیں جو "قدرت خدا" کے عنوان سے تعبیر ہوتی ہیں اور جب ہم ان سے کسی خبر کی تفتیش کے درپے ہوتے ہیں تو کسی کی تصدیق نہیں ہوتی۔ پس خیال کرنا

چاہیے کہ جو اخبار ضروری تصدیق کا ذریعہ ہے' افسوس ہے
کہ اس سے بے اصل خبروں کا کام لیا جاتا ہے۔"[21]

یہ صحیح ہے کہ خبروں کو مکمل چھان بین کے بعد شایع کرنا صحافی کا فرض ہے لیکن اخبار کا کام جلدی کا ہوتا ہے۔ یہاں اس کی گنجائش نہیں کہ تحقیق میں بہت سا وقت صرف کیا جائے۔ اس لیے کبھی کبھی غلط خبروں کا چھپ جانا حیرت کی بات نہیں ہے۔ ایسی صورت میں ایڈیٹر کا فرض ہے کہ وہ اس کی تصحیح نمایاں طور پر شایع کرے۔ احتیاط کے باوجود "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کے مدیر کو بھی اس صورت حال سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک شمارے میں داغ کے انتقال کی غلط اطلاع شایع ہو گئی۔ دوسرے شمارے میں اس کی معذرت اس طرح کی گئی۔

"ہم کو نہایت رنج و افسوس ہے کہ عنایت اللہ خاں قیس نے جو تاریخ داغ کی وفات کی بہ خیال "موتوا قبل ان تموتوا' ہمارے پاس بھیجی' وہ اخبار میں چھپ گئی۔ اکمل الاخبار دہلی سے ہم کو مژدہ ملا کہ وہ فضل الٰہی سے زندہ و صحیح و سلامت ہیں۔ خدا ان کو زندہ رکھے۔ مگر اس غلطی کا ہم کو داغ ہے۔ زندگی میں موت کی خبر درازی عمر کا شگون سمجھا جاتا ہے۔ خدا ایسا ہی کرے مگر اس غلطی سے ہمارے شفیق داغ کو یہ لطف ضرور آیا ہوگا کہ لوگ ان کی کیسی قدر کرتے ہیں اور جو امر ناگزیر سب کو پیش آنے والا ہے' جب ان کو بھی پیش آوے گا تو لوگ ان کو کس طرح یاد کریں گے۔"[22]

مندرجہ بالا اقتباس میں غلط اطلاع کی تردید اور معذرت کے علاوہ ایک اور بات قابل غور ہے۔ یہ جملے دوبارہ ملاحظہ فرمائیں "زندگی میں موت کی خبر درازی عمر کا شگون سمجھا جاتا ہے۔ خدا ایسا ہی کرے مگر اس غلطی سے ہمارے شفیق داغ کو یہ لطف ضرور آیا ہوگا کہ لوگ ان کی کیسی قدر کرتے ہیں اور جو امر ناگزیر سب کو پیش آنے والا ہے جب ان کو بھی پیش آوے گا تو لوگ ان کو کس طرح یاد کریں گے" ______ غور کیجیے لکھنے والے نے کتنی چابک دستی سے اپنی غلطی کو گوارا بنا دیا ہے۔ خبر موت کی تھی تکلیف دہ تھی لیکن یہ کہہ کر کہ اس سے داغ کو اپنی مقبولیت کا احساس ہونا چاہیے' اس تکلیف کو دوسرا رنگ دے دیا گیا ہے۔ ایک صحافی کے لیے ضروری ہے وہ اپنی تحریر میں ایسے دل چسپ گوشے نکال سکے۔ "اخبار سائنٹفک سوسائٹی" کی جلدوں کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید اس نکتہ سے واقف تھے اور وہ اس سے فائدہ بھی اُٹھایا کرتے تھے۔

اخبارات میں مختصر خبروں کے علاوہ ایسی خبریں بھی ہوتی ہیں' جن کے لیے تفصیل میں جانا ضروری ہوتا ہے۔ یہی تفصیلی خبریں بعض اوقات پھیل کر تبصرہ کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ ایسی صورت میں مناسب یہ ہے کہ اخبار نویس شروع کے چند جملوں میں ہی نفس مضمون کو واضح کر دے' تاکہ اگر قاری جلدی میں ہے تو وہ ایک نظر ڈال کر معاملے کی نوعیت سے واقف ہو جائے۔ لیکن ایک کامیاب صحافی سے اس بات کی بھی توقع کی جاتی ہے کہ اس کے مضمون کی ابتدا ایسے دل نشیں انداز میں ہو کہ بہ شرط فرصت قاری پورا مضمون پڑھنے پر مجبور ہو جائے عام طور پر اگر شروعات دلچسپ نہیں ہوتی تو لوگ تفصیلات کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں اور لکھنے والے کی محنت اپنا صلہ پانے سے محروم رہ جاتی ہے۔ لیکن یہی بات سرسید کی صحافت کے حوالے سے نہیں کہی جا سکتی۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں روس اور ترکی کی جنگ سے متعلق ایک خبر بہ عنوان "لڑائی کی حالت"[23] ملاحظہ ہو' جس کی شروعات اس طرح ہوتی ہے:

"گو روسیوں نے پلیونا کا پورا پورا محاصرہ کر لیا ہو اور گو اس کے قرب و جوار کے چند دمدمے بھی انھوں نے لے لیے ہوں اور گو درہ شپکا کو اب تک روسیوں نے نہ چھوڑا ہو اور گو سلیمان پاشا دریائے لام سے پیچھے ہٹ گئے ہوں مگر اب تک ترکوں کے لیے یورپ کے معرکہ جنگ میں کچھ مایوسی نہیں ہے۔"

یہ چند سطریں فوری طور پر قاری کی توجہ مبذول کراتی ہیں۔ پلیونا پر روسیوں کے مکمل محاصرے' قرب و جوار کے بعض دمدموں پر قبضہ' درہ شپکا کو پر روسیوں کے تسلط اور سلیمان پاشا کے دریائے لام

سے پیچھے ہٹ جانے کے باوجود آخر کیا بات ہے کہ یورپ کے معرکۂ جنگ میں ترکوں کے لیے مایوسی نہیں ہے؟ یہ سوال آگے بڑھنے کے لیے اُکساتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

> ترکوں نے از خود روسیوں سے لڑنے کا کبھی ارادہ نہیں کیا تھا روسی ان پر چڑھ کر آئے اور ترکوں نے صرف اپنا بچاؤ کیا جس کو دفاع یا جنگ مغلوبہ کہتے ہیں۔ پس جو واقعات کے ترکوں کو محصور ہو جانے یا مورچوں اور دمدموں کی آڑ میں لڑنے کے پیش آئے ہیں وہ تو اس قسم کی لڑائی کے اصول میں داخل ہیں جس قسم کی لڑائی کہ ترک لڑ رہے ہیں۔ پس نہ پلیونا کے محصور ہو جانے میں اندیشہ ہے، نہ سلیمان پاشا کے دریائے لام سے پیچھے ہٹ جانے اور ایک نہایت عمدہ اور مستحکم مورچے کی آڑ میں ہو جانے سے اندیشہ ہے۔"

یہاں پہنچ کر بات مکمل ہو گئی۔ ابتدا میں جو دعویٰ کیا گیا تھا، اس کو دلیل سے استحکام ملتا جا چکا۔ اب مزید آگے بڑھیے ویسے تو مذکورہ بالا صورتِ حال سے تبصرہ نگار کو کوئی اندیشہ نہیں ہے لیکن ـــــ "اندیشہ جو ہے وہ صرف اس بات کا ہے کہ محصورین کے پاس رسد و سامان و مدد پہنچنے کا رستہ بند نہ ہو جاوے ہم اس بات کے دیکھنے سے نہایت خوش ہیں کہ سلیمان پاشا نے نہایت ہوشیاری سے اس رستہ کی جس سے بہ ذریعہ سمندر اور ریلوے کے ان کے پاس فوج و رسد و مدد پہنچ سکتی بہ خوبی حفاظت کی ہے جس سے ان کو اور اُن تمام قلعہ جات کو جہاں جہاں فوج محصور یا مقیم ہے امداد پہنچ سکتی ہے۔ صرف جو کچھ خطرہ ہے وہ پلیونا میں رسد پہنچنے کے رستے کا ہے۔ جس قدر نقشہ جات ہمارے پاس موجود ہیں، گو ان پر ہم نے بہت غور کیا مگر اس کا تصفیہ نہ ہو سکا کہ تمام رستے پلیونا میں مدد و رسد پہنچنے کے بند ہو گئے یا ابھی کوئی رستہ کھلا ہوا ہے لیکن اگر پہلے ہی امر کو تسلیم کر لیں تو بھی اب تک ارکنچ اور صوفیا ترکوں کے قبضے میں ہے۔ اگر ان دونوں مقاموں کو کافی مدد پہنچ جاوے تو وہ ضرور اپنی اس کوشش میں کہ روسیوں کی فوج کو ارکنچ کے گرد و نواح سے ہٹا دیں اور صوفیا سے پلیونا کا رستہ صاف کر دیں، کامیاب ہوں گے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں مقاموں پر ترک فوج جمع کر رہے ہیں اور وہ بہت جلد اس رستہ کو صاف کرنے میں کوشش کریں گے اور اس عرصے تک کے لیے عثمان پاشا کے پاس اگر جانوروں اور گھوڑوں کے لیے نہیں تو آدمیوں کے لیے تو ضرور رسد موجود ہے۔ لیکن اگر اس تدبیر کے ہونے میں تاخیر ہو تو بلاشبہ عثمان پاشا کو بہت بڑی دقت پیش آوے گی۔

سترھویں تاریخ کی تار برقی سے ہم کو خبر ملی ہے کہ عثمان پاشا نے پندرھویں کی شب کو روسیوں کے مورچوں پر تین دفعہ حملہ کیا۔ مگر اس حملہ کا راز کھلنا نہایت مشکل ہے اور اس کا عقدہ قیاس سے کسی طرح حل نہیں ہو سکتا۔ یعنی عثمان پاشا کا ان حملوں سے کیا مقصد ہے۔ خود اپنے مقام پر قایم رہنا اور دشمن کو مغلوب کرنا یا مدد پہنچنے کے رستے کو صاف کرنا یا دشمن کو اپنے اصلی مقصد سے غافل کرنا اور دھوکے میں ڈالنا یا اپنے نکل جانے کے لیے رستہ ڈھونڈنا۔ ان مقاصد میں سے ضرور کوئی مقصد ہوگا۔ مگر بجز ان لوگوں کے جو پلیونا کے محاصرے کے اندر ہیں اور اپنی قوت اور اپنے پاس سامان رسد کے موجود ہونے یا نہ ہونے سے واقف ہیں اور کوئی اس کا مقصد نہیں جان سکتا۔"

یہ ساری باتیں اپنی جگہ لیکن **مبصر** کو اب بھی یقین ہے کہ "اگر پلیونا ترکوں کے ہاتھ سے نکل جاوے تو بلاشبہ روسی اس کو اپنی ایک بہت بڑی فتح سمجھیں گے اور ان کا ایسا سمجھنا کچھ خلاف بھی نہ ہوگا اور بلاشک ترکوں کا بہت بڑا نقصان مال و اسباب اور جانوں کا ہوگا لیکن اس کا نکل جانا لڑائی کا خاتمہ نہ ہوگا بلکہ روسیوں کو بہت سے مقاموں میں جو غالباً پلیونا سے بھی زیادہ مستحکم ہوں گے، لڑنا پڑے گا اور روسیوں کی کامیابی اسی طرح خطرہ میں رہے گی جیسی کہ اب ہے۔"

روس اور ترکی کی اس جنگ میں، جس کا ذکر اوپر کیا گیا، مسلمانانِ ہند کی ہمدردیاں اور نیک خواہشات ترکوں کے ساتھ

تھیں۔ چنانچہ اس معاملہ میں اردو صحافت کا رویہ کافی جذباتی تھا۔ یہاں نمونے کے طور پر اقتباسات دے کر گفتگو کو خواہ مخواہ طول دینا غیر ضروری ہے۔ بس اس جانب توجہ دلانا مقصود ہے کہ جب آدمی جذباتی ہوتا ہے تو اس کی تحریر و تقریر میں استدلالی انداز بیان برقرار نہیں رہتا۔ ہم آج بھی دیکھتے ہیں کہ بہت سے موقعوں پر اردو اخبار نویس جذبات کی رو میں مشتعل ہو کر دلیل سے کام لینے کے بجائے لفاظی پر اتر آتے ہیں۔ لیکن انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی مذکورہ بالا عبارت ایک بار پھر سے پڑھیے۔ شروع سے آخر تک لب و لہجہ سنجیدہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ لکھنے والے کو بس حقائق کے بیان سے سروکار ہے مگر ایسا نہیں ہے۔ تبصرہ نگار دراصل دل سے روسیوں کی شکست چاہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اسے اپنے جذبات پر قابو ہے۔ وہ سلیقے سے واقعات قلم بند کرتا ہے۔ پھر ان پر بحث کرتا ہے اور آخر میں یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ روسی ترکوں کے خطرے سے بچ نہیں سکتے۔ اس طرح قارئین کے جذبات کی ترجمانی بھی ہو جاتی ہے اور صحافت کے تقاضوں سے روگردانی کا الزام بھی وارد نہیں ہوتا۔

"علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" میں سیاسی خبروں کے علاوہ سائنسی معلوماتی، سماجی اور اصلاحی نوعیت کی تحریریں بھی جگہ پاتی تھیں۔ دوسرے اخبارات میں شائع شدہ مضامین بھی حوالے کے ساتھ نقل کیے جاتے تھے اس انتخاب کا سبب کبھی تو ان مضامین کے مندرجات سے اتفاق ہوتا تھا اور کبھی اختلاف۔ موخرالذکر صورت میں تردید بھی پہلو بہ پہلو چھاپی جاتی تھی۔ ایک مثال ملاحظہ ہو۔

> "اودھ اخبار میں پاینیر سے ایک مضمون ترجمہ ہو کر چھپا ہے، جس کا عنوان قانون وراثت اسلام ہے۔ اس مضمون کو ہم نے بھی اپنے آج کے اخبار میں مندرج کیا ہے۔ ہم اس مضمون کے ماحصل سے متفق ہیں، مگر اس بات سے اختلاف کرتے ہیں کہ قرآن مجید کے احکام قابل ترمیم یا تبدیل ہیں۔ قرآن مجید بطور کلیہ کے ایسے عمدہ اصول پر نازل ہوا ہے کہ کسی زمانے میں بھی اس کی ترمیم کی حاجت نہیں ہے۔" [۲۴]

اس طرح کے تردیدی مضامین کا منشا بعض غلط فہمیوں کا ازالہ اور صحیح معلومات بہم پہنچانا ہوتا تھا جو کہ ایک صحافی کے فرائض میں داخل ہے۔

اب تک کی بحث سے واضح ہوتا ہے کہ بہ حیثیت صحافی سرسید کا قلم آزاد، دل دردمند، نظر وسیع، ذہن کھلا، مشاہدہ گہرا اور شعور پختہ تھا۔ ان کے نزدیک "ایک معزز اخبار نویس کا یہ کام ہے کہ وہ گورنمنٹ کی تدابیر کی نسبت معقول طور سے نکتہ چینی کر کے اس کو صلاح نیک دے اور مختلف دلچسپ معاملات کا ذکر کر کے عوام کی تربیت کرے اور لوگوں کی رایوں میں ایک عمدہ اتفاق پیدا کر کے ان خرابیوں کو رفع کرے جو ان کی حالت معاشرت سے تعلق رکھتی ہیں پس اخبار کے لکھنے والے کے فرائض کسی طرح پر آسان یا ناچیز نہیں ہیں اس کے فرائض تین قسم کے ہوتے ہیں۔ یعنی وہ صلاح دینے والا اور تربیت کرنے والا اور لوگوں کی حالت معاشرت کی اصلاح کرنے والا ہوتا ہے۔"[۲۵] سرسید کی صحافت ان ہی اصولوں پر قائم ہے انھوں نے اپنے اخبار کے ذریعے آزادیٔ رائے پر زور دیا۔ حکام وقت کی خامیوں کی نشان دہی کی، سماجی مسائل پر توجہ دی گورنمنٹ اور عوام کے تعلقات کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ ہندوستانیوں کو جدید علوم و فنون کی اہمیت کا احساس دلایا۔ صرف مقامی اور ملکی خبروں کو ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی خبروں کو بھی مناسب طور پر پیش کیا۔ خبروں کی صحت اور حوالے کی ضرورت پر زور دیا۔ اداریہ نگاری کا خاص اہتمام کیا اور جذباتی معاملات میں بھی سنجیدگی کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ انھوں نے کتابت کی دقتوں کو محسوس کیا اور اخباری ضرورت کے پیش نظر ٹائپ کو ترجیح دی۔ گویا انھیں اپنی صحافیانہ ذمہ داریوں کا خیال بھی تھا اور وہ صحافت کی فنی دشواریوں کا احساس اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ سرسید کے زمانے کو نظر میں رکھ کر بہ حیثیت صحافی ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگائیں تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ بلاشبہ ایک اچھے صحافی تھے اور ان کے اخبار نے ہم عصر صحافت کو وزن و وقار عطا کیا تھا۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر نادر علی خاں کی تحقیق کے مطابق سید الاخبار کا سنہ اجرا ۱۸۴۱ء ہے۔ ملاحظہ ہو "اردو صحافت کی تاریخ" (۱۸۴۲ء - ۵۷) ص ۱۲۷۔ سن اشاعت ۱۹۸۷ء

۲۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مع پروگرس۔ ۳۰ اپریل ۱۸۶۸ء

۳۔ ذکر عملہ سوسیٹی، اخبار سین ٹیفک سوسیٹی، ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۹ء۔

۴۔ اخبار سین ٹیفک سوسیٹی، ۱۳ ستمبر ۱۸۶۷ء

۵۔ اصغر عباس، سرسید کی صحافت، ص ۸۸ دسمبر ۱۹۷۵ء انجمن ترقی اردو ہند۔

۶۔ اخبار سین ٹیفک سوسیٹی، ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۷ء

۷۔ ایضاً ۱۰ مارچ ۱۸۶۷ء

۸۔ مکتوب سرسید لندن ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۹ء بنام سکریٹری سائنٹفک سوسائٹی۔ مشمولہ ص ۳۶۔ مکاتیب سرسید احمد خاں، مرتبہ مشتاق حسین ص ۳۶۔

۹۔ ولیم ہنٹر نے اس کتاب میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ ہندوستانی مسلمان انگریزوں سے جنگ کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتا ہے۔

۱۰۔ سرسید کا جوابی مضمون علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھپنے سے قبل انگریزی میں روزنامہ پانیر الہ آباد میں شایع ہو چکا تھا۔

۱۱۔ اخبار سین ٹیفک سوسیٹی علی گڑھ ۲۲ ستمبر ۱۸۶۷ء

۱۲۔ ایضاً یکم دسمبر ۱۸۶۷ء

۱۳۔ ایضاً ۱۵ ستمبر ۱۸۶۷ء

۱۴۔ ایضاً ۵ مئی ۱۸۶۷ء

۱۵۔ ایضاً ۱۴ مئی ۱۸۶۹ء

۱۶۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۷ مارچ ۱۸۸۲ء

۱۷۔ اخبار سین ٹیفک سوسیٹی ۹ جولائی ۱۸۶۹ء

۱۸۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۹ ستمبر ۱۸۸۲ء

۱۹۔ اخبار سین ٹیفک سوسیٹی ۱۳ فروری ۱۸۷۴ء

۲۰۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مع پروگرس ۲۳ فروری ۱۸۶۸ء

۲۱۔ اخبار سین ٹیفک سوسیٹی ۳۰ مئی ۱۸۷۳ء

۲۲۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۱ ستمبر ۱۸۸۰ء

۲۳۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مع پروگرس ۲۴ نومبر ۱۸۷۷ء

۲۴۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۲ دسمبر ۱۸۸۲ء

۲۵۔ اخبار سین ٹیفک سوسیٹی ۱۰ ستمبر ۱۸۷۵ء

مسلمانانِ ہند کے لیے سرسید کا نظریۂ تعلیم

توقیر عالم فلاحی ★

قوموں اور ملکوں کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کی تاریخ ہند کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں سے ایک قوم کی عظمت و حشمت کا آفتاب غروب ہوتا ہے تو ایک دوسری قوم کی جاہ و اقتدار اور سلطنت و حکمرانی کی تابناک اور درخشاں تاریخ کا فتح باب ہوتا ہے۔ اگرچہ بغاوت کے بعد ہندو اور مسلمان دونوں ہی کو نزاکت حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ مسلمان ہر لحاظ سے ہندوؤں کے مقابلے میں پستی و انحطاط اور ذلت و نکبت کی کھائیوں میں گرتے چلے گئے۔ سیاسی، معاشی، سماجی اور تہذیبی اقدار کا جنازہ نکل گیا۔ چونکہ برطانوی حکومت بالخصوص مسلمانوں کو شکوک و شبہات کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی اس لیے مسلمانوں کے خون سے ہولیاں کھیلی گئیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو کے بقول:

> "وہ مقابلتاً ذرا زیادہ جنگجو اور لڑاکو بھی سمجھے جاتے تھے، اس لیے حکومت بھی ان کو زیادہ خطرناک سمجھتی تھی۔"

مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی

انگریزی تعلیم سے متعلق عام مسلمانوں کا خیال یہ تھا کہ یہ تشکیک و الحاد پیدا کرتی ہے۔ مکاتب و مدارس میں پرانا ہی نظام تعلیم مروج تھا۔ قدیم تعلیمی روایات جدید زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے سے عاجز و قاصر تھیں۔ مغربی علوم و فنون سے نفرت پوری سوسائٹی پر مسلط تھی۔ جدید تقاضوں کے مطابق انگریز نئے نئے اور موثر حربے اختیار کر رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ اپنی پالیسیٔ عمل سے پھر جائیں گے تو خواب کی تعبیر ممکن نہ ہو سکے گی۔ دوسری طرف مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ "نتبعُ مَا وَجَدْنا عَلیہ آباء نا" کی آوازیں لگا رہے تھے۔ مغربی تعلیم کو وہ سمِ قاتل قرار دیتے ہوئے وہ بعد و اجتناب بلکہ نفرت و عداوت کی روش پر گامزن تھے۔ اس طرح وہ سازشوں کے دام میں گرفتار ہو کر ایک طرف تو انگریزی حکومت کے رسوخ و ثبات کا مواد فراہم کر رہے تھے تو دوسری طرف معاشی تعلیمی اور ثقافتی لحاظ سے اپنے پاؤں پر کلہاڑیاں مار رہے تھے۔ یہ تو خود ان کی ناعاقبت اندیشی، کوتاہ نظری اور کج فکری کا خمیازہ تھا۔ عیسائی مشنریاں بھی جارحانہ طور پر مذہب اسلام کو اپنی ناپاک کوششوں کا ہدف بنا رہی تھیں۔ دوسرا خطرہ جو مسلمانوں کو لاحق تھا، اس کا تعلق سیاسی حالات سے ہے۔ مسلمانوں کے خلاف طرح طرح کی غلط فہمیوں کا اشتہار کیا گیا جس کی بنا پر انگریز اپنے وجود کو مخدوش و پُر خطر پانے لگے۔ تیسرا اور انتہائی اہم خطرہ اسلام کو انگریزی تعلیم کی طرف سے تھا ان تمام تر سنگین حالات کے باوجود مسلمان خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے، ان کے دلوں سے احساس زیاں جاتا رہا۔ وہ اپنے قلم و زبان کو جنبش ہی کیوں دے سکتے تھے جب کہ وہ حالات کے تقاضوں کو سمجھنے سے تنفر کی حد تک گریز کرتے تھے۔ وہ فتح و غلبہ کے حصول کے نئے طریقوں سے واقف نہ تھے۔ جہالت، اوہام و خرافات اور اندھی تقلید کے بار سے دبے ہوئے مسلمان اپنے مخالفین و معاندین

★ ریسرچ اسکالر، شعبۂ عربی، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

سے نبرد آزمائی کی جرأت ہی کیوں کر سکتے تھے۔ الغرض مسلمانوں کے سیاسی، معاشی اور تہذیبی زوال و انحطاط کے ڈانڈے تعلیمی زبوں حالی سے جا کر مل جاتے ہیں۔

سرسیّد — وقت کی ایک ناگزیر ضرورت

خوشگوار اور سازگار حالات میں فلاح و اصلاح کی علمبردار شخصیتوں کا پیدا ہونا حیرت و تعجب کی بات نہیں ہے۔ حیرت تو اس وقت ہوتی ہے کہ جہالت و بے جا تعصب، کج فکری و ہٹ دھرمی اور کورانہ تقلید پرستی کا دور دورہ ہو۔ قومی و ملی وجود خطرے میں پڑ گیا ہو۔ ماضی کی روایتوں کو ہی شان امتیاز سمجھ کر جدید دور کے تقاضوں سے بے اعتنائی اور تنفر کا مظاہرہ کیا جا رہا ہو۔ سیاسی، سماجی اور تعلیمی و تہذیبی لحاظ سے پورا ماحول پُر خار و بنجر ہو۔ ایسے ہی پر آشوب اور سنگین ترین حالات میں سرسیّد علیہ الرحمۃ قوم و ملت کے عظیم ترین معمار بن کر سامنے آتے ہیں۔ ہندوستان کی فلاکت زدہ معاشرت میں بالخصوص مسلمانوں کی تباہی و بربادی پر سرسیّدؒ کا حساس دل لرز اٹھتا ہے۔ بغاوتِ ہند کے بعد مسلمانوں کی زبوں حالی پر اپنی تقریر میں کہتے ہیں۔ :

> "جس حساب سے یہ تنزل شروع ہوا ہے، اگر اسی واسطے سے اس کا اندازہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ چند ہی برس اِس بات کو باقی ہیں کہ مسلمان سائیسی، خانسامانی، خدمت گاری اور گھس کھودنے کے سوا اور کسی درجے میں نہ رہیں گے اور کوئی گروہ جس کو دنیا میں کچھ بھی عزت حاصل ہو مسلمانوں کے نام سے نہ پکارا جائے گا۔"

بلا شبہ مسلمانوں کو انگریزوں نے اپنے ناپاک عزائم اور مذموم کاوشوں کا نشانہ بنایا۔ جگہ جگہ مسلمانوں کی لاشیں جنگل کی پتیوں کی طرح بکھری نظر آنے لگیں اور حکومت وقت کے مظالم سے انسانی خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ صرف دہلی شہر میں ہزاروں افراد لقمۂ تر بنا لیے گئے۔ ہزاروں کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا اور ہزاروں لاشوں کے تقدس کو پامال کیا گیا۔ اس کے علاوہ برطانوی حکومت نے سیاست و معیشت اور تعلیم و ثقافت کو بھی منحوس عزائم کا ہدف بنا کر دلوں کی بھڑاس مٹائی لیکن ان تمام تر دشوار گزار حالات کے باوجود سرسیّدؒ نے مسلم قوم کی اصلاح حال سے قدم روک لینے کو شقاوت و بدبختی اور بزدلی و نامردی قرار دیا۔ سرسیّدؒ کا مسلم قوم کی فلاح و خوش حالی کی طرف توجہ دینے کا یہ اقدام اس وقت اور بھی تاریخ ساز کارنامے کی ناطق شہادت فراہم کرتا ہے۔ جب کہ اپنوں اور غیروں دونوں ہی کے مخالفانہ کردار و عمل کو پیش نظر رکھا جائے۔ برطانوی حکومت نے جب سرسیّدؒ کو لاکھ روپیے سے زیادہ کی ملکیت دے کر خریدنا چاہا تو یہی نہیں کہ محض پائے حقارت سے ٹھکرا دیا بلکہ قوم کی بربادی پر ماتم کناں ہوئے اور محض اسی کے لیے ترک ہندوستان کا ارادہ موقوف کر دیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ

> "جب میں مراد آباد آیا جو ایک بڑا غم کدہ قوم کے رئیسوں کی بربادی کا تھا تو اس کو اور ترقی ہو گئی۔ مگر اسی وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں اس کی مصیبت میں شریک رہنا چاہیے اور جو مصیبت پڑے اس کو دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔ میں نے ارادۂ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔" ؎

سرسیّد کا تعلیمی جہاد

۱۸۵۷ء کی تحریک بغاوت کے بعد مسلمانوں کی تباہی و بربادی سے سرسیّد بہت متاثر ہوئے۔ اول مرحلہ میں انھوں نے سمجھا کہ اس عظیم تباہی و بربادی کے بعد اب مسلمان اپنا سر اونچا نہیں کر سکتا۔ خوش حالی اور فارغ البالی کا دور اب نہیں لوٹ سکتا اور ان کی قسمت میں اب شکست و ہزیمت کا ہی منہ دیکھنا ہے لیکن آپ غم میں گھلتے گئے۔ تباہی و بربادی کے مقدمات و موثرات پر تدبّر و تفکر کیا اور پھر آپ نے حالات کے سیاق و سباق میں یہ فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کی ذلتوں اور محرومیوں کا راز تعلیم میں ہی مضمر ہے اور وہ پھر اس نتیجے پر بھی پہنچے کہ جو قوم دوسری اقوام

کی تہذیب وتمدن سے فائدہ نہیں اُٹھاتی وہ تنزل پذیر ہو جاتی ہے۔ [۴]

ہندوستان کے مسلمانوں میں اتباعِ بے جا اور کورانہ تقلید پرستی کے وہ امراض موجود تھے جنھیں دور کرنے کے بعد ہی تعلیم کے لیے فضا خوشگوار ہو سکتی تھی۔ سرسیدؒ جنھوں نے مسلم قوم کی اصلاح و تربیت کے کارِ عظیم کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ شب و روز تعلیمی رکاوٹوں کے سدّباب کے لیے کوشاں اور فکرمند رہے۔ اسی جذبہ و جستجو نے سرسیدؒ کو انگلینڈ سفر کرنے پر مجبور کیا۔ اس سفر میں بہت سے کالجز اور تعلیمی اداروں کا بنظرِ غائر مشاہدہ کیا انھیں اداروں کو سامنے رکھتے ہوئے بعد میں سرسید نے تعلیم کے سلسلے میں ہندی مسلمانوں کے ترقیاتی منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا۔ انگلینڈ سے واپسی کے بعد یہ ناگزیر تھا کہ عام مسلمانوں کو اوہام و خرافات کی وادیوں سے نکال کر عمقِ فکر اور وسعتِ فکر اور وسعتِ نظر کی شاہراہ پر گامزن کیا جائے جبھی سرسید کی تعلیمی پالیسی کا بڑے پیمانے پر فروغ ممکن تھا۔ چنانچہ ہندوستان واپس آنے پر "تہذیب الاخلاق" جاری کیا جو ہندی مسلمانوں سے متعلق سرسید کے افکار و خیالات کا بے باک ترجمان تھا۔

اس رسالے میں سرسید نے اخلاق و معاشرتی، انفرادی و اجتماعی اور مادّی و روحانی ہر شعبۂ زندگی پر تنقیدی و اصلاحی مضامین لکھے۔ مسلمانوں کے تعصبات و تقلیدات پر کاری ضرب لگایا، ان کے دلوں کو جھنجھوڑا، جاہلیت کے بندھنوں کو کاٹا اور انھیں اعلیٰ تعلیم کے مضمرات سے واقف کرایا۔ رسالہ تہذیب الاخلاق کے اجراء کے ساتھ سرسیدؒ نے ہندی مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کو فروغ دینے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ جو کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان ہند کے نام سے موسوم ہوئی۔ [۵]

اس کمیٹی کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے اسباب پر غور کرے اور جدید تعلیم کی طرف ان کی توجہات مبذول کرائے۔ اس کا پہلا جلسہ بنارس میں ۲۶ دسمبر ۱۸۷۰ء کو ہونا طے پایا تو ان کے رفیق کار محسن الملک ایک دن پہلے ہی بنارس پہنچ گئے۔ رات میں محسن الملک کا بستر سرسید نے اپنی خواہش کے مطابق اپنے کمرے میں ہی لگوایا۔ گھنٹوں گفتگو کے بعد محسن الملک سو گئے۔ رات کے دو بجے جب آنکھ کھلی تو پایا کہ سرسیّد زار و قطار رو رہے ہیں۔ برآمدے میں ٹہل رہے ہیں اور اضطراب و بے قراری کی کیفیت طاری ہے۔ محسن الملک نے گھبرا کر دریافت کیا کہ خدانخواستہ کہیں سے کوئی افسوسناک خبر تو نہیں آئی اس پر سرسیّد اور بھی زیادہ رونے لگے اور کہا کہ اس سے زیادہ اور کیا مصیبت ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کے حالات دن بہ دن خراب ہوتے جا رہے ہیں اور ان کی ترقی کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ [۶]

سرسیّد جدید علوم کے فروغ و اشاعت کے لیے دیوانہ وار آگے بڑھے۔ اپنے قول و عمل اور فکر و نظر سے تعلیم کے قدیم و رسمی طریقوں کے خلاف جہاد کیا۔ وہ اس وقت کے مروجہ علوم کے مخالف نہیں تھے بلکہ ان کی مخالفت تو اس امر میں تھی کہ تعلیم کے رائج طریقے درست ہیں یا نہیں۔ جب عامۃ المسلمین کے علاوہ علماء اور فضلا نے بھی سرسیّد کی اس تعلیمی تحریک سے بغاوت کی بلکہ ملحدانہ طریقۂ تعلیم قرار دیا تو سرسیّد نے اس کا کوئی منفی اثر قبول نہیں کیا بلکہ روز افزوں قوتِ عمل میں تیزی آتی گئی۔ وہ نئی تعلیم پر جہاں وقت کے چیلنج کو قبول کرنے کے لیے زور دے رہے تھے وہیں ماضی کے علمی سرمایوں کے بقا و تحفظ کے لیے بھی ضامن سمجھ رہے تھے۔ بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں انھیں یقین تھا کہ نئی تعلیم سے آراستہ ہوئے بغیر مہذب دنیا میں کوئی مقام حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ [۷]

نئی تعلیم کے نفاذ کی داستان جد و جہد بہت طویل ہے۔ اس میں انگلستان کا سفر بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ آکسفورڈ اور کیمبرج کے تعلیمی نظام کا جائزہ لینا، یہاں کی اقامتی زندگی کا عینی مشاہدہ کرنا اور سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" کا جواب لکھنا۔ یہ وہ محرکات تھے جنھوں نے سرسیّد کو سفرِ انگلستان کے لیے مہمیز کیا۔ اس کی خاطر انھوں نے اپنا کتب خانہ بھی بیچ دیا۔ گھر کو رہن رکھ دیا اور بدرجۂ مجبوری آتشِ اضطراب کو فرو کرنے کے لیے سود پر روپیے بھی قرض لیے۔ یہ اور ایسا کیوں نہ ہوتا جب کہ قومی فلاح و بہبود کا مستحسن جذبہ آپ کے خرمنِ دل میں روز افزوں نشو و نما پا رہا تھا۔ اور قومی ہمدردی کو ہی

آپ نے اوڑھنا اور بچھونا بنا لیا تھا۔ ایم۔ ایس جین کے بقول

"IT WAS ONLY AFTER FROM ENGLAND THAT HE CAME TO KNOW A DEFINITE PLAN OF MUSLIM REGENERATION, BETTER KNOWN AS ALIGARH MOVEMENT" 8

[انگلینڈ سے واپسی کے بعد ہی مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے ایک متعین ومخصوص پروگرام سے واقف ہوئے جسے علی گڑھ تحریک کے نام سے جانا جاتا ہے]

پھر اس سلسلے میں کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان ہند کی جدوجہد بھی فی الحقیقت اسی سفر انگلستان ہی کی طرف منسوب ہے۔ اس کمیٹی نے تعلیمی مزاحمتوں کے سدباب کے لیے جو قابل قدر کوششیں کیں ان میں بڑے پیمانے پر ایک تحریری مقابلے کا انعقاد بھی ہے۔ اس مقابلے میں بڑے بڑے فضلا اور مفکرین بھی شریک ہوئے۔ محسن الملک، وقار الملک اور دوسرے تمام لوگوں کے مضامین دلائل و براہین کی بنیاد پر ایک وزن رکھتے تھے۔ کمیٹی کا متفقہ فیصلہ گویا کہ جدید خیال کے تمام حضرات کا فیصلہ تھا۔ اس میں طے یہ پایا کہ سرکاری مدارس اور ان کا طریقۂ تعلیم مسلمانوں کی ضروریات کے لیے کافی نہیں ہے۔ اگر گورنمنٹ ان کے طریقۂ تعلیم میں کچھ تبدیلی بھی لائے تو مسلمانوں کے مسائل حل نہیں ہو سکتے اس لیے مسلمانوں کی تعلیم کا خود انتظام کیا جائے 9

سرسید نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا اور مسلمانوں کے انحطاط و تنزلی کا سبب تعلیمی پسماندگی کو قرار دیا۔ پھر وہ میدان میں نکل کھڑے ہوئے قوم کے مزاج کو بدلنے کی جدوجہد کی، انگلینڈ کا سفر کیا، تہذیب الاخلاق نکالا اور ترقی تعلیم کے لیے ایک انجمن تشکیل دی۔ یہ تمام چیزیں اس کی شہادت کے لیے کافی ہیں کہ سرسید جذبات کی طوفانی لہروں میں غوطہ زن ہو کر نہیں بلکہ سوچی سمجھی تدبیر اور منظم منصوبے کے تحت تعلیم کے میدان میں آئے۔ اس سلسلے میں انھوں نے خود کو خطبات، مقالات اور لکچرس کے دائرے میں ہی محدود نہیں رکھا بلکہ جدید طرز کی درس گاہیں اور سوسائٹیاں بھی قائم کیں۔ ۱۸۵۹ء میں مرادآباد کا مدرسہ، ۱۸۶۴ء میں غازی پور میں اسکول کا قیام اور ۱۸۶۳ء میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کی تشکیل۔ یہ تمام ادارے سرسید کی منصوبہ بند اور منظم کوششوں پر سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی تعلیمی سفر کی آخری کڑی ایم۔ اے۔ او کالج کا قیام ہے جو بلاشبہ سرسید کی دیرینہ آرزوؤں اور قیمتی خوابوں کی تعبیر ہے اور اب جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے دنیا میں ایک قابل ذکر حیثیت کی حامل ہے۔

نئی تعلیم ـــ سرسید کے اقوال و افکار کے آئینے میں

آج بھی ایک خاصی تعداد ایسے افراد کی ہے جو سرسید کی نئی تعلیمی جدوجہد کو شکوک و شبہات کا ہدف بناتے ہیں۔ کبھی اسے الحاد و دہریت کا شاخسانہ قرار دیا جاتا ہے تو کبھی نری معیشت کی اصلاح و ترقی کا پیش خیمہ۔ اس میں شبہ نہیں کہ جانی اور مالی لحاظ سے مسلمان بغاوتِ ہند میں پس کر رہ گئے تھے اور اس موقع پر سرسید کا حساس دل بے قرار ہو اٹھا تھا۔ اس کا علاج انھوں نے جدید تعلیم سے دلچسپی و استفادہ کو بتایا۔ لیکن تاریخ کی اس حقیقت سے انحراف نہیں کیا جاتا ہے کہ بے جا حمایت، جہل، تعصب پرستی جیسے امراض نے خصوصاً مسلمانوں کی قوت فکر کو شل کر دیا تھا۔ دوسروں کی زبانوں کو سیکھنا اور ان کی ثقافت و تہذیب سے روشناس ہونا باعث عار اور وجہ بربادی سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ اسلام دشمن طاقتیں بھی پورے جوش وخروش کے ساتھ اسلام کے خلاف صف آرا تھیں۔ معاندین اسلام کے اعتراضات کا دنداں شکن جواب دینے کے لیے اسلام سے متعلق پھیلائی گئی غلط فہمیوں کے رفع و ازالہ کے لیے اور ایک مسلم قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کے لیے ضروری تھا کہ بدلتے ہوئے حالات میں ان کی تعلیم سے استفادہ کیا جائے اور ان کے تمدن کو قریب سے دیکھا جائے۔ سرسید نے جدید تعلیم کی ترویج و اشاعت میں جن جن مصائب و شدائد کا سامنا کیا محض اس جذبے کے ساتھ کہ قوم اپنی عظمت رفتہ کو پا لے اس کے علاوہ کوئی اور محرک نہ تھا۔ لکھنؤ میں ایک بار تقریر کرتے ہوئے کہا تھا 10

" مجھے اس سے زیادہ خوشی نہیں کہ کسی نے بی۔ اے

یا ایم۔اے کی ڈگری حاصل کرلی بلکہ میری خوشی تو قوم کو قوم بنانے میں ہے۔"

امرت سر کے ٹاؤن ہال میں "اتحاد باہمی" پر خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:[11]

"اگر گورنمنٹ نے ہمارے کچھ حقوق اب تک ہم کو نہیں دیے ہیں تو ہائی ایجوکیشن وہ چیز ہے کہ خواہ مخواہ طوعاً و کرہاً ہم کو دلا دے گی۔"

جدید تعلیم سے آراستہ ہونے والوں کا قافلہ کس طرح سرگرم سفر رہے، اس کے لیے ایک کار نقشہ اور نشان راہ ان الفاظ میں واضح کیا:[12]

"فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس ہمارے بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الہ الا اللہ کا تاج ہمارے سر پر۔"

دسمبر ۱۸۸۸ء میں مسلمانانِ طلبۂ پنجاب کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:[13]

"اے میرے عزیزو! یہ میری آرزو ہے کہ میں اپنی قوم کے بچوں کو آسمان کے تاروں سے اونچا اور سورج کی طرح چمکتا ہوا دیکھوں۔ ان کی روشنی اس نیلے نیلے گنبد کے اندر ایسی پھیلے کہ سورج، چاند اور ستارے سبھی اس کے آگے ماند ہو جائیں۔"

تیسرے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے موقع پر طلبۂ لاہور کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:[14]

"آپ یقین کریں گے جس طرح میں یورپین سائنسز و لٹریچر اپنی قوم میں اعلیٰ درجے کی ترقی پر ہونے کی کوشش کرتا ہوں، اس سے زیادہ میری کوشش اس پر ہے کہ وہ اسلام کو برحق سمجھیں اور لا الہ الا اللہ پر ثابت قدم رہیں۔"

قومی فلاح و بہبود ہی وہ محرک خاص تھی جس نے سرسید کو تامین حیات سیمابی کیفیت میں ہونے پر مجبور کیا۔ تعلیم و تربیت دونوں کی اہمیت کو گوش گزار کرتے رہے۔ بلکہ تربیت پر امتیاز در دیا کہ تعلیم ثانوی چیز بن کر رہ جاتی ہے۔ سرسید اپنی ایک تقریر میں کہتے ہیں:

"صرف تعلیم سے آدمی انسان نہیں بنتا بلکہ تربیت سے بنتا ہے۔ بولنے میں تو یوں آتا ہے کہ "تعلیم و تربیت" مگر تربیت میری سمجھ میں تعلیم پر مقدم ہے۔"[15]

اپنے ایک خطبے میں کہتے ہیں:

"عزیزو! تعلیم! اگر اس کے ساتھ تربیت نہ ہو اور جس تعلیم سے قوم قوم نہ بن سکے، وہ تعلیم درحقیقت کچھ قدر کے لائق نہیں ہے۔ بس انگریزی پڑھ لینا اور بی۔اے اور ایم۔اے ہو جانا جب تک کہ اس کے ساتھ تربیت اور قومیت کی فیلنگ نہ ہو ہم قوم کو قوم اور ایک معزز قوم نہیں بنا سکتے۔"[16]

تعلیم و تربیت کے متعلق سرسید کے افکار و اقوال یہ بات تشنۂ وضاحت نہیں چھوڑتے کہ ناسامد حالات سے نبرد آزمائی کا سبق دیتے ہوئے قوم کے گلشن حیات میں رونق بہار کی واپسی ہی ان کی عظیم ترین کوششوں اور قربانیوں کا مرکز و محور تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سرسید نے نئی تعلیم کی روح پھونک کر قوم کے خوابیدہ ضمیر کو جگایا ہے اور اصلاح تربیت کے بیش بہا جوہر کے ذریعے قوم و ملت کے لیے مفید و کارآمد ہونے کا قیمتی سبق دیا ہے۔ ایس۔کے بھٹناگر مسلم اینگلو اورینٹل کالج کی تاریخ میں لکھتے ہیں:

BY AND LARGE, EDUCATION LACKED IN TRAINING SIR SYED WANTED THAT THE EDUCATED CLASS SHOULD BE USEFUL FOR THE COMMUNITY AS A WHOLE AND SHOULD PROVE ITS WORTH IN THE FORMATION OF A DEVELOPING SOCIETY IN

KEEPING WITH THE DEMANDS OF THE TIME"

ترجمہ ۔ فی الجملہ تعلیم تربیت سے خالی تھی، سرسید نے چاہا کہ تعلیم یافتہ طبقے کو مجموعی طور پر اپنی قوم کے لیے مفید و کار آمد ہونا چاہیے اور حالات کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک ترقی یافتہ معاشرہ کی تشکیل میں اپنی قیمت منوانی چاہیے ۔ [۱۷]

حکومت کی نوازش و کرم پر چلنے والے ادارے مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کے لیے سم قاتل تھے۔ ان اداروں سے بلاشبہ معاشی فلاح و بہبود کی توقعات وابستہ تھیں لیکن ہاں یہ بھی صداقت ہے کہ انھیں اداروں سے الحاد و تشکیک کے گھونٹ پلائے جاتے تھے۔ سرسید بلاشبہ مسلمانوں کی معاشی بدحالی سے متاثر ہوئے لیکن جس غم نے آپ کو زیادہ پگھلایا وہ ہے سیاسی انحطاط و تنزلی اور تہذیب و ثقافت کی پامالی ۔ مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بحالی کے لیے سرسید اور ان کے حلقۂ احباب یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کا مخصوص ادارہ ہو جو تعلیم و تربیت کا سنگم ہو، جہاں سے ایسے جیالے تیار ہوں جو دین کی دولت سے مالا مال ہوں اور دنیا کے بازار میں چمک رہے ہوں ۔ اس طرح کے دینی اور ملی ادارے کے قیام کی غرض و غایت اس کے سوا کچھ اور نہیں تھی کہ مسلم نوجوانوں کو بے دینی کی آندھیوں سے نجات دلائی جائے ۔ [۱۸]

مخالفتوں کے طوفان سے گزرتے ہوئے

قوموں کے عروج و زوال اور اصلاحی تحریکوں اور تنظیموں کی تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ جب بھی کوئی علم بردار اصلاح اور خیر و فلاح کا پیامی تعمیری کردار ادا کرنے کے لیے منظر عام پر آیا ہے تو اس کے خلاف غیروں کے علاوہ اپنوں نے بھی محاذ آرائیاں کی ہیں انفرادی اور اجتماعی کوششوں کے ذریعے صدائے حق کو دبایا گیا ہے انھیں تاریخ ساز ہستیوں میں سرسید علیہ الرحمۃ ہیں جن کا شمار انیسویں صدی کے گنے چنے افراد میں ہوتا ہے ۔ اس تاریخ ساز شخصیت کے زریں باب کا آغاز فی الحقیقت ۱۸۵۷ء کے بعد سے ہوتا ہے ۔ اس بغاوت میں بالخصوص مسلمان ہی انگریزوں کے مظالم کا نشانہ بنے اور ہر شعبۂ حیات میں ہزیمت و پسپائی کا منہ دیکھنا پڑا۔ سرسید اس دور گراں خوابی میں بانگ درا بن کر سامنے آتے ہیں ۔ اور قوم کی تمام تر بدحالیوں کا نسخۂ شفا تعلیم کو قرار دیتے ہیں ۔ لیکن یہ بات ذہنوں میں رہنی چاہیے کہ سرسید نے مغربی تعلیم کو اگرچہ ایک کامیاب نسخہ کی شکل میں پیش کیا لیکن اسلام میں ایمان کی قیمت کے مثل نہیں ۔ [۱۹]

سرسیدؒ نے جب انگریزی تعلیم کی اہمیت لوگوں کے گوش گذار کی اور سائنٹفک سوسائٹی اور تہذیب الاخلاق کے ذریعے اپنی تحریک کو فروغ دیا تو ماضی کی سنت کے مطابق بہتیرے افراد میدان مخالفت میں آنکلے ۔ سرسید کے نظریات کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھا جانے لگا اور جس کالج کے قیام کا نقشہ ابھی ذہنوں میں تھا اور جس کی تعمیر کے لیے آپ جھاڑ جھنکاڑ کو صاف کر رہے تھے اس کے خلاف بھی طرح طرح کی چہ مہ گوئیاں کی جانے لگیں ۔ خاصے افراد پر مشتمل مسلمانوں کا ایک طبقہ یہ سمجھتا تھا کہ یہ تعلیم نوجوان نسل کو عیسائی اور ملحد بنا دے گی ۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی تعلیم کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا گیا لیکن سرسیدؒ کے پایۂ ثبات میں لغزش نہیں آئی ۔ آپ کو کافر، ملحد، دہریہ اور نیچری کہا گیا ۔ جب مخالفین نے سرسید کو نئی تعلیم سے روکنے کے سلسلے میں اپنی زبانوں کو بے اثر سمجھا تو اب پریس کے ذریعے عناد و مخالفت میں برسرپیکار ہو گئے، اور چند پرچے جن میں سے کانپور کا "نور الآفاق" اور "نور الانوار" زیادہ مشہور تھا، تہذیب الاخلاق کے بالمقابل جاری کیے گئے ۔ رسالہ اشاعۃ السنۃ جو اہل حدیث کا پرچہ تھا اس میں بھی تہذیب الاخلاق کے افکار و خیالات سے ہر زاویہ مخالفت کی گئی ۔ ان میں سرسید کی تکفیر کے فتوے بھی جاری کیے جانے لگے ۔ یہاں تک کہ ان کے ساتھ ان کے دوست اور اعوان و انصار بھی نیچری بلکہ کرسٹان کہلانے لگے [۲۰]

سرسید چونکہ نئے طرز کی درس گاہ کے ذریعے اپنی قوم کو تہذیبی، سیاسی اور معاشی زبوں حالی کے قعر مذلت

سے نکال کر عزت و احترام کی شاہراہ عام پر لا کھڑا کرنا چاہتے تھے اور قوم کے افراد کو بحیثیت مسلمان آسمان کے درخشاں تاروں سے بھی اونچا دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے سرسید نے دینی تعلیم کو جزوِ لاینفک قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ شروع ہی سے دینی تعلیم یہاں داخل نصاب رہی۔ اس شعبے کو مضبوط کرنے کے لیے آپ نے حتی المقدور کوششیں کیں۔ علماء دیوبند کے تعاون سے بھی اپنے آپ کو بے نیاز نہیں سمجھا لیکن علما بھی آپ کا ساتھ نہ دے سکے اور یہ بھی مخالفین کی صف میں آکھڑے ہوئے۔ رشید احمد صدیقی کے بقول علما حضرات نے وہ روش اختیار کی جو ان کے رہنمایانِ منصب کے شایانِ شان نہ تھی۔ [۲۱]

ان تمام نامساعد حالات میں سرسید صبر و استقلال کا پیکر بنے رہے۔ چوں کہ آپ پر جس چیز کا جنون سوار تھا وہ آپ کے ذاتی یا سیاسی مفاد کے تحت نہ تھا۔ قوم کی فلاکت و ادبار کو ختم کرکے اس کی شوکت و حشمت کا عروج دیکھنا چاہتے تھے۔ یہی وہ خلوص تھا جس کی بنا پر آپ نے مخالفین و معاندین کے اعتراضات پر کان نہ دھرے، اپنوں کے الزامات کی پروا کیے بغیر منزلِ مقصود کی طرف سرگرم عمل رہے۔ ایس۔ کے۔ بھٹناگر لکھتے ہیں:

> "سرسید اعتراضات کی آندھیوں میں بھی ثابت قدم رہے اور شیخ عبدالقادر جیلانی"، امام غزالی"، شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی" اور دوسری ان تمام متبرک اور پاک ہستیوں سے روحانی قوت حاصل کرتے رہے جو اپنے زمانوں میں کفر و الحاد کے فتووں سے نوازے گئے۔" [۲۲]

قوم کے بچوں کی خاطر امراء و روسا کے سامنے اپنے کشکول گدائی کو بھی پھیلایا۔ در در کی ٹھوکریں کھائیں، نیتوں پر شک کیا گیا اور ہر طرح سے آپ کے فقیرانہ کردار کا مذاق اڑایا گیا۔ لیکن سرسید چونکہ یہ سب کچھ اپنی ذات کے لیے نہیں کر رہے تھے، کوئی وقتی مفاد اور سیاسی جوڑ توڑ آپ کو سرگرم عمل نہیں رکھے ہوا تھا بلکہ قومی زبوں حالی کا درد اور تعلیمی صورت حال کی کسک تھی جو یک لحظہ بھی چین و سکون سے نہیں رہنے دیتی تھی۔ سرسید نے مجوزہ درس گاہ کی تعمیر کے لیے لوگوں سے چندہ وصول کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ ڈرامائی اسٹیج کے کردار بھی بنے۔ علی گڑھ نمائش میں ڈرامائی اسٹیج پر قوم کے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔ [۲۳]

> "خود لوگوں سے بھیک مانگی، بہت ہی قلیل ملی والنٹیر بنانے چاہیے، بہت کہنے اور جو بنے ان سے بھی کچھ بن نہ آئی۔ پس آج میں اس اسٹیج پر اس لیے آیا ہوں کہ قوم کے بچوں کی تعلیم کے لیے کچھ کر سکوں۔"

سرسید اپنے سینے میں ایک دھڑکتا دل رکھتے تھے۔ وہ اپنی قوم کو تباہی و بربادی کے دہانے پر کھڑا ہوا نہیں دیکھنا چاہتے تھے یہی وجہ ہے کہ بغاوت ہند میں مسلم لاشوں کی حرمت و تقدس کی پامالی، سیاست و معیشت اور تمدن و معاشرت کے انحطاط اور تعلیمی زوال و پسماندگی کو حقیقت کی نگاہوں سے دیکھنے کے بعد ان کا سکون کھو دیا اور راتوں کی نیندیں حرام کرلیں۔ وہ مسلمانوں کو قعر مذلت سے نکالنے، تابناک ماضی کی طرف واپس لانے اور اقوام عالم میں عزت و احترام کا تمغہ دلانے میں ہر لحظہ سرگرم عمل رہے۔ تعلیم کو مسلمانوں کی پستی کے امراض کا نسخۂ شفا قرار دیا اور سبھی حوادث سے نبرد آزما ہوتے ہوئے منزل مقصود کی طرف رواں دواں رہے۔ بالآخر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں سرسید کا حسین خواب شرمندۂ وفا ہوا۔ سرسید کی مختلف شعبہ ہائے زندگی کی منظم کوششوں اور عظیم ترین قربانیوں کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ سرسید محض ایک شخصیت نہیں بلکہ ایک کارواں ہیں جو اقوام و ملل کے عروج و اقبال اور زوال و ادبار کی تاریخ میں گوہر نایاب کی حیثیت رکھتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ کم از کم اصلاح معاشرت اور فلاح قوم کی تاریخ سرسید کے بغیر ہمیشہ تشنۂ تکمیل رہے گی۔

حوالہ جات

۱۔ خلیق احمد نظامی ۔ جدید ہندوستان کے معمار ۔ ص ۷
جون ۱۹۷۱ء ۔ دہلی۔

۲ـہ تقریر بمقام مظفرنگر ۷ رفروری ۱۸۸۴ء بحوالہ خلیق احمد نظامی۔ ارمغان علی گڑھ ص ۱۱۔ طبع اول ۱۹۷۴ء
۳ـہ عبدالحق۔ سرسید احمد خاں۔ حالات و افکار۔ ص ۱۸۵۔ اردو بازار دہلی' ۱۹۶۱ء
۴ـہ خلیق احمد نظامی۔ جدید ہندوستان کے معمار ص ۷۴۔ جون ۱۹۷۱ء۔ دہلی۔
۵ـہ سید طفیل احمد ملیگ۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ ص ۲۱۳۔ طبع پنجم ۱۹۴۵ء، دہلی۔
۶ـہ خلیق احمد نظامی۔ جدید ہندوستان کے معمار۔ ص ۸۱۔۸۰۔ جون ۱۹۷۱ء دہلی۔
۷ـہ خطبات سرسید۔ مرتب محمد اسماعیل پانی پتی۔ ج ۲۔ ص ۳۷۷۔ طبع اول۔ جون ۱۹۷۳ء۔ لاہور

THE ALIGARH MOVEMENT BY M.S JAIN 1961- AGRA. ۸ـہ

۹ـہ سید طفیل احمد ملیگ۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ ص ۲۱۷-۲۱۳۔ طبع پنجم۔ دہلی ۱۹۴۵ء، دہلی۔
۱۰ـہ مجموعہ لکچر سرسید احمد خاں مرتبہ محمد امام الدین گجراتی۔ ص ۲۸۷ لاہور
۱۱ـہ ایضاً ص ۲۸۷ لاہور

SIR SYED SPEAKS TO YOU - SIR SYED HALL October, 16, 1968 ۱۲ـہ

۱۳ـہ مجموعہ لکچرس و اسپیچز۔ سرسید احمد خاں۔ مرتب محمد امام الدین گجراتی۔ ص ۳۳۶۔ لاہور
۱۴ـہ خطبات سرسید۔ مرتب محمد اسماعیل پانی پتی ج ۲۔ ص ۷۱۔ طبع اول۔ جون ۱۹۷۳ء۔ لاہور
۱۵ـہ مجموعہ لکچرز و اسپیچز۔ سرسید احمد خاں۔ مرتب محمد امام الدین گجراتی ص ۲۱۱۔ لاہور
۱۶ـہ خطبات سرسید۔ محمد اسماعیل پانی پتی۔ ج ۲۔ ص ۳۶۱۔ طبع اول۔ جون ۱۹۷۳ء لاہور

HISTORY OF THE M.A.O COLLEGE BY S.K. BHTNAGAR. P.P. 9. 1969. Bombay. ۱۷ـہ

THE ALIGARH MOVEMENT BY MUMTAZ MOIN. P. 105 1976, Karachi ۱۸ـہ

" " " " ۱۹ـہ

۲۰ـہ الطاف حسین حالی۔ حیات جاوید ص ۱۶۳۔ ترقی اردو بورڈ۔ نئی دہلی
۲۱ـہ نورالحسن نقوی۔ سرسید اور ہندوستانی مسلمان ص ۱۱۷ طبع اول۔ الہ آباد

HISTORY OF THE M.A.O. COLLEGE BY S.K BHATNAGAR - P7. ۲۲ـہ
1969 Bombay.

۲۳ـہ خطبات سرسید۔ محمد اسماعیل پانی پتی۔ ج ۲ ص ۱۶۷۔ طبع اول۔ جون ۱۹۷۳ء لاہور

> "سرسید کے اندر بڑی صلاحیتیں تھیں لیکن اس سے زیادہ ان کا اعلیٰ اخلاق تھا
> مجھے پورے انگلستان اور ہندوستان میں کوئی شخص ایسا نہیں ملا جس نے
> میرے اندر اپنے لیے اتنا جذبۂ پسندیدگی اور عزت پیدا کیا ہو۔"
>
> تھیوڈر بک

سرسید اور مسلمان

مختار الحق *

تاریخ عالم شاہد ہے کہ خدا کو جب کبھی روئے زمین پر کسی خاص مقصد کی تکمیل منظور ہوئی ہے تو اس نے انسانوں میں سے کسی ایسے شخص کا انتخاب کرلیا ہے جو اس کے مقررہ معیار پر پورا اترتا ہو۔ اس آفاقی حقیقت کی روشنی میں یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ سرسید بھی ایسے ہی برگزیدہ افراد میں سے تھے جن سے خدا نے عہد سازی کا نہایت دشوار گزار اور صبر آزما کام لیا۔ سرسید احمد خاں ایک ایسی ذات کا نام ہے جو بظاہر عام انسانوں کی طرح گوشت پوست کا بنا ہوا تھا مگر اس کے رگ و پے میں کچھ اور ہی سمایا ہوا تھا، جس نے نہ صرف زوال آمادہ عہد کو سنبھالا دیا بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے روشنی کی کرنیں بکھیر گیا۔ یہ انھیں کرنوں کا فیض ہے کہ آج برصغیر ہند و پاک میں مسلمان سر اٹھا کر جینے کے قابل ہیں۔ اس سے یہ مطلب نکالنا کہ سرسید کو صرف اپنے فرقے کی بھلائی کی فکر تھی، سراسر بہتان تراشی ہے اور یہ تاریخی ناواقفیت پر دلالت کرتا ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو سرسید انجمن پنجاب کے ایڈریس کے جواب میں یہ الفاظ ادا نہ کرتے:

"..... میری تمام آرزو یہ ہے کہ بلا لحاظ قوم اور مذہب کے تمام انسان آپس میں ایک دوسرے کی بھلائی پر متفق ہوں۔ مذہب سب کا بے شک علیحدہ علیحدہ ہے مگر اس کے لحاظ سے آپس میں کوئی دشمنی کی وجہ نہیں۔ فرض کرو کہ ایک دسترخوان پر مختلف قسم کے کھانے موجود ہیں، ان میں سے کوئی کسی کھانے کو پسند کرتا ہے اور کوئی کسی کو۔ مگر اس اختلاف طبائع کی وجہ سے اس دسترخوان پر بیٹھنے والوں کو باہم کچھ رنج نہیں ہوتا۔ اس طرح اس دنیا میں مختلف مذہبوں کی وجہ سے مختلف مذہب والوں میں کوئی وجہ باہمی رنج کی پیدا نہیں ہوسکتی۔ ہر شخص اپنے ایمان کا مختار بلکہ میری رائے میں اس پر مجبور ہے۔ اس لیے کہ جس چیز کا یقین اس کے جی میں ہے، اس کو وہ اختیار کرے گا۔ وہ یقین دوسروں کے دل پر اثر نہیں کرتا۔ اچھا ہے تو اس کے لیے اور برا ہے تو اس کے لیے لیکن آپس کی محبت میں جو انسانوں کی راحت میں سب سے بڑا جز ہے، اس سے کچھ نقصان نہیں آسکتا۔"

سرسید تو ایسے تھے کہ انگریزوں کے لیے بھی اپنی گردن کٹانے کو تیار ہو گئے۔ کیا وہ واقعہ ہم بھول گئے۔ جب ۱۸۵۷ء کے غدر میں بجنور کی صورت حال انگریزوں کے حق میں انتہائی خراب ہو گئی تو سرسید نے مسٹر شیکسپیر کے پاس جاکر ان کو تشفی دیتے ہوئے کہا تھا:

"جب تک ہم زندہ ہیں آپ کو گھبرانا نہیں چاہیے۔ جب آپ دیکھیں کہ ہماری لاش کوٹھی کے سامنے پڑی ہے تو اس وقت گھبرانے کا مضائقہ نہیں۔"

اور جب کلکٹر کی کوٹھی میں موجود انگریزوں (جن کی تعداد بیس[۳۰] تھی) کا کام تمام کرنے کے لیے "باغیوں" کی ٹولی آپہنچی تو سرسید جان ہتھیلی

* کانکی نارہ، ۲۴ پرگنہ (شمالی) مغربی بنگال

پہ لے کر جوشِ انتقام میں بھرے ہوئے مجمع میں داخل ہوگئے اور جماعت کے لیڈر سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ :

چند انگریزوں کے مار ڈالنے سے کیا ہاتھ آئے گا
بہتر یہ ہے کہ ان کو صحیح و سالم یہاں سے جانے دو
اور تم ملک کے مالک ہو جاؤ ۔"

مذکورہ حقایق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سرسیّد کسی بھی فرقے کے مخالف نہیں تھے ۔ ان کی نظر میں تمام انسان بہرحال انسان ہیں۔ اور جس طرح ایک مسلمان کو زندہ رہنے اور پھلنے پھولنے کا حق حاصل ہے، اسی طرح ہندو، عیسائی اور دیگر مذاہب کے ماننے والوں کو بھی زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے ۔ اب یہاں بجا طور پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ سرسیّد جب تمام مذاہب کے ماننے والوں کی فلاح و کامرانی کے متمنّی تھے تو پھر انھوں نے مسلمانوں پر ہی اپنی ساری توجہ کیوں صرف کی ۔ اس کا جواب دینے سے پہلے آیئے تاریخ کے چند اوراق پلٹ لیں ۔

۱۸۵۷ء کے غدر کی ناکامی کے بعد انگریزوں کا سارا عتاب مسلمانوں ہی پر نازل ہوا کیوں کہ غدر کے اصل ذمہ دار انگریز ان کو ہی تصور کرتے تھے ۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ :

" مسلمانوں کو مجرم قرار دینے کے لیے کوئی ثبوت
درکار نہ تھا، ان کا مسلمان ہونا ہی ان کے جرم ٹھہرانے
کے لیے کافی تھا ۔"

سرسیّد نے مسلمانوں کی تباہی و بربادی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو ان کی روح بلبلا اُٹھی ۔ کیوں کہ اس پرآشوب دور نے مسلمانوں سے نہ صرف ان کا سب کچھ چھین لیا تھا بلکہ انھیں وقت کے اندھے کنویں میں دھکیل دیا تھا ۔ سرسیّد کا ضمیر جس طرح ہر کسی کی مصیبت میں چیخ پڑتا تھا، اُسی طرح مسلمانوں کے حالِ زار پر بھی چیخ پڑا ۔ اور یہی وہ چیخ ہے جو مسلمانوں کو اندھے کنویں سے نجات دلانے کا باعث بنی ۔ اب یہ ہماری صواب دید پر ہے کہ اس چیخ کو ہم مسلمانوں کی طرف داری کا نام دے لیں یا کچھ اور . . . . . .

اس توضیح کے بعد میرے خیال سے اب یہ بتانے کی چنداں گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ سرسیّد نے مسلمانوں کو قعرِ مذلت سے نکالنے کے لیے تن، من، دھن کی بازی کیوں لگادی

سرسیّد نے اس ضمن میں سب سے پہلا کام یہ کیا کہ بغاوتِ ہند کے اسباب پر ایک رسالہ لکھا اور اس میں بڑی بے باکی سے انگریزوں کو ٹوکا کہ بغاوت کی ساری ذمّہ داری صحیح معنوں میں خود اُنھی پر عاید ہوتی ہے۔ کیونکہ اقتدار کے نشے میں انھوں نے اپنے اور ہندوستانی عوام بالخصوص مسلمانوں کے درمیان بڑی ناگواری پیدا کرلی تھی ۔ یہ سرسیّد کا ہی کلیجہ تھا کہ ایسے وقت میں جب کہ حکومت کے خلاف لب کشائی کرنا اور وہ بھی سرکاری منصب پر رہ کر گویا موت کو دعوت دینا تھا ۔ انھوں نے جرات رندانہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے " رسالہ اسباب بغاوت ہند" لکھا اور اس کی کاپیاں نہ صرف ولایت بھیجیں، بلکہ اس کی ایک کاپی گورنمنٹ آف انڈیا کو بھی ارسال کر دی ۔ اس موقع پر سرسید کے ایک ہندو دوست رائے شنکر داس نے منع کیا تھا کہ :

" ان تمام کتابوں کو جلا دو، خواہ مخواہ اپنی جان
کیوں خطرے میں ڈال رہے ہو ۔"

اس پر سرسیّد نے جو جواب دیا وہ اُن کی بے تعصبی اور وسیع القلبی کی ایک اور روشن دلیل ہے ۔ انھوں نے کہا کہ :

" میں ان تمام باتوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا ملک
قوم اور خود گورنمنٹ کی خیر خواہی سمجھتا ہوں ۔
پس اگر ایک ایسے کام پر جو سلطنت اور رعایا
دونوں کے لیے مفید ہو مجھ کو کچھ گزند بھی پہنچ جائے
تو گوارا ہے ۔"

غور کیجیے سرسیّد نے قوم اور رعایا جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں اور یہ دونوں الفاظ کسی مخصوص مذہب کے ماننے والوں یا کسی خاص گروہ کی ترجمانی نہیں کرتے ۔ اسی طرح انھوں نے گورنمنٹ کا بھی بھلا چاہا ہے ۔ اب یہ کون نہیں جانتا کہ گورنمنٹ کس کی تھی یہاں پر لفظ قوم کی تشریح کے لیے سرسیّد کے ان الفاظ کو پیش کرنا قطعی نامناسب نہ ہوگا ۔ وہ کہتے ہیں :

"قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے
گو اُن میں بعض بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں۔ اے ہندو
مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے
رہنے والے ہو؟ کیا اس سرزمین پر تم دونوں نہیں
بستے؟ کیا اس زمین میں تم دفن نہیں ہوتے یا اسی
گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے؟ اسی پر مرتے ہو
اور اسی پر جیتے ہو؟ تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان
ایک مذہبی لفظ ہے۔ ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی
بھی جو اس ملک میں رہتے ہیں، اس اعتبار سے
سب ایک ہی قوم ہیں۔"

دیکھا آپ نے سرسید کا اندازِ تخاطب۔ انھوں نے ہندو اور مسلمانوں دونوں کو بیک وقت مخاطب کیا ہے۔ مختصر یہ کہ سرسید نے مسلمانوں کو ان کا کھویا ہوا مقام دلانے کے لیے وقت اور حالات کے لحاظ سے ہر وہ کوشش کی جس کی فی الحقیقت ضرورت تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے 'لائل محمڈنز آف انڈیا' (Loyal Mohammedans of India) نامی ایک رسالہ بھی جاری کیا اور ایک مختصر رسالہ "تحقیق لفظ نصاریٰ" بھی لکھا۔ مسلمانوں کی بے بضاعتی اور کم ہمتی کی وجہ سے 'لائل محمڈنز آف انڈیا" کے صرف تین نمبر نکل سکے۔ حالی کہتے ہیں کہ

"اگر یہ تذکرہ مکمل ہو جاتا تو مسلمانوں کے حق میں
ایک نہایت مفید اور کار آمد چیز ہوتی اور ان
دعووں کا ایک عملی اور قطعی ثبوت ہوتا جن کے ثابت
کرنے کے لیے اصول اسلام کے موافق دلیلیں
اور شہادتیں پیش کرنے کی ضرورت ہوتی۔"

رسالہ "تحقیق لفظ نصاریٰ" کی حقیقت یہ ہے کہ غدر کے دوران مسلمانوں نے انگریزوں کو لفظ نصاریٰ سے تعبیر کیا تو وہ چراغ پا ہو گئے۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ جس طرح یہودی حضرت عیسیٰ کو حقارت سے ناصری (یعنی قریۂ ناصرہ کا رہنے والا) کہتے تھے، اسی طرح مسلمانوں نے انگریزوں کو نصاریٰ قرار دیا ہے۔ سرسید نے لکھا کہ لفظ نصاریٰ، ناصرہ سے مشتق نہیں بلکہ نصر سے مشتق ہے۔ کیوں کہ قرآن سے ایسا ہی ثابت ہے قرآن میں صاف آیا ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ نے کہا

من انصاری الی اللہ

تو حواریوں نے کہا:

نحن انصار اللہ

اسی لیے حواریوں کی پیروی کرنے والوں اور عیسیٰ پر ایمان لانے والوں کو "نصاریٰ" کہا گیا ہے۔ قرآن میں کہیں قریۂ ناصرہ کا ذکر نہیں آیا ہے اور نہ کہیں حضرت عیسیٰؑ کو ناصری کہا گیا ہے۔ مزید برآں قرآن سے یہ بھی ظاہر ہے کہ عیسائی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں خود کو نصاریٰ کہتے تھے۔

غرض یہ کہ اس دور میں سرسید نے ایسے بہت سے چھوٹے موٹے آرٹیکل اور مضامین لکھے جو اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے پائی جانے والی غلط فہمیوں کے تدارک کا باعث بنے۔ مگر یہ سب چیزیں اپنی نزاکت کے لحاظ سے وقتی نوعیت کی تھیں۔ وہ تو ایسی پائیدار اور مستحکم بنیادوں کی تلاش میں تھے جن کے سہارے وہ مسلمانوں کو زمانے سے پنجہ لڑانے کے قابل بنانا چاہتے تھے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں سے سرسید کی زندگی ایک نئے موڑ میں داخل ہوئی اور انھوں نے اپنی حیات کو ایک مقصد سے جوڑ دیا۔ ایسا مقصد جس نے مسلمانوں کی تقدیر کو بدل ڈالا اور ان کے اندر یہ احساس بیدار ہو گیا کہ دنیا میں رہنا ہے تو دنیا کے تقاضوں کو بھی پورا کرنا پڑے گا۔

سرسید نے جب اپنے اس مقصد کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا تو اُن پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا اور یہ کام غیروں نے نہیں بلکہ اپنوں نے کیا۔ وہی اپنے جن کے لیے سرسید نے اپنی زندگی کا سکھ چین تج دیا۔ سرسید نے اس بات کا بخوبی اندازہ کر لیا تھا کہ انگریزی تعلیم کے بغیر مسلمانوں کا ایک قدم بھی آگے بڑھنا ناممکن ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی سرگرمیوں کا

محور اسی نقطے کو بنایا کہ مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کرلیں لیکن مسلمان انگریزی تعلیم کا حاصل کرنا گناہ تصور کرتے تھے۔ ان کی نظر میں انگریزی تعلیم کے حصول کا مطلب اپنے مذہب سے دستبردار ہو کر عیسائی بننا تھا۔ ایسی نازک گھڑی میں سرسیّد نے اپنے ہوش و حواس درست رکھے اور اپنی دھن میں لگے رہے۔ چنانچہ انھوں نے مغربی علوم اور لٹریچر کی اہمیت اور وقعت سے مسلمانوں کو آگاہ کرنے کے لیے انگریزی کی علمی اور تاریخی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کرانے کا جامع منصوبہ تیار کیا۔ تاکہ انگریزی تعلیم کے حصول کی خواہش پیدا ہو سکے۔ اس غرض سے ۱۸۶۳ء میں انھوں نے غازی پور میں "سائنٹفک سوسائٹی" قایم کی۔ ایک سال بعد جب سرسیّد علی گڑھ منتقل ہو گئے تو یہ سوسائٹی بھی ان کے ساتھ وہاں چلی گئی۔ یہاں اس سوسائٹی نے سائنس، معاشیات اور تاریخ کے علاوہ دیگر موضوعات کی ڈھیر ساری کتابوں کے تراجم کا انبار لگا دیا۔ ۱۸۶۶ء میں سرسیّد نے سوسائٹی سے "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" نامی ایک اخبار جاری کیا جس سے مسلمانوں کو نہ صرف خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کا کام لیا گیا بلکہ انھیں اخبار نویسی کے علم سے بھی روشناس کرایا گیا۔ اس اخبار کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس کا ایک کالم انگریزی میں اور ایک اردو میں ہوتا تھا اور بعض مضامین اردو میں الگ اور انگریزی میں الگ چھاپے جاتے تھے۔ اس زمانے میں سرسیّد کے پاس محسن الملک، نواب اعظم یار جنگ، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی اور ڈپٹی نذیر احمد جیسے مخلص رفیقوں کی جماعت موجود تھی۔ جنھوں نے ان کا حقِ دوستی اس طرح ادا کیا کہ خود علم و دانش کے روشن ستارے بن گئے۔

سرسیّد اپنے مشن کو ہر طرح سے تکمیل کی منزل تک پہنچانے میں دیوانے بنے بیٹھے تھے۔ لہٰذا انگریزی اور جدید طرزِ تعلیم کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیے انھوں نے انگلستان کا سفر کیا اور وہاں کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں کو قریب سے دیکھا۔ وہاں سے واپسی کے بعد ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں "مدرسۃ العلوم" قایم کیا جو بعد میں "ایم۔ اے۔ او کالج" اور ۱۹۲۰ء میں "علی گڑھ مسلم یونیورسٹی" بن گیا۔ یہ سرسیّد کا سب سے عظیم کارنامہ ہے کیونکہ انھوں نے علم کا ہمیشہ جاری رہنے والا چشمہ جاری کر دیا تھا۔

سرسیّد ایک طرف مسلمانوں کو آگے لے جانے کی فکر میں اپنا سب کچھ ایک کیے ہوئے تھے تو دوسری طرف ان کی ٹانگ پکڑ کر کھینچنے والوں کی گرفت ذرا بھی ڈھیلی نہیں ہوتی تھی۔ ان کے مخالفین نے ان کو اپنی راہ سے ہٹانے کے لیے کیا کیا نہیں کیا۔ ان کے خلاف مکّہ معظمہ سے کفر کے فتوے منگائے گئے اور ان کو کافر، مرتد، ملحد، مشرک جیسے ناموں سے نوازا گیا مگر واہ رے سرسیّد کہ گالیاں کھا کے بھی بے مزا نہ ہوا۔

اپنے مخالفین کے سلسلے میں سرسیّد نے مولوی سیّد مہدی علی خاں کو لکھے گئے خط میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ بلاشبہ آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ سرسیّد لکھتے ہیں:

"...... آج تک کوئی نیکی چاہنے والا ایسا نہیں ہوا جس کے مقابل میں کوئی نہ کوئی مخالف نہ کھڑا ہو آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ، محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) خلفائے اربعہؓ، محی الدین جیلانیؒ، مجدد الف ثانیؒ، محمد اسمٰعیل دہلویؒ وعلیٰ ہٰذا القیاس پس میں تو اُن کی جوتیوں کی برابر بھی نہیں ہوں، میری مخالفت پر کمر باندھی ہے بڑی بات نہیں۔ دوسرے اس خیال سے کہ میں دیکھتا ہوں جوں جوں مخالفوں نے نیکی کا مقابلہ کیا ہے، ووں ووں نیکی بڑھتی گئی ہے۔ پس اگر میرا کاروبار و میری نیت سچی اور نیک ہے تو انشاء اللہ تعالیٰ اس میں کچھ نقصان نہیں ہونے کا اور اگر وہ نیک نہیں ہے اور میں غلطی سے اس کو نیک خیال کر رہا ہوں تو بلاشبہ ٹوٹ جائے گا اور مخالف جو اس صورت میں ضرور ہے کہ نیکی پر ہوں گے، کامیاب ہوں گے اور ایسی حالت میں مجھ کو بھی ان کی کامیابی پر خوشی کرنی ہو گی۔ نہ اپنی تدابیر کے ٹوٹنے اور اپنے دھوکے میں پڑنے ہونے کا رنج۔"

اور اس طرح سرسید نے اپنی مخالفتوں کی پرواہ کیے بنا موج حوادث کو عبور کر لیا اور مسلمانوں کو صحرائے جہالت سے نکال کر وادئ علم میں پہنچا دیا اور دنیا میں یہ مثال قایم کر دی کہ اگر جواں ہمتی اولوالعزمی اور مستقل مزاجی موجود ہو تو چاہے کیسی بھی رکاوٹ رہے اسے دور کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

سرسید چونکہ انسان تھے اس لیے ان سے خطا اور نسیان کا سرزد ہونا عین قانون فطرت ہے کیوں کہ اگر انسان میں خوبیاں ہی خوبیاں ہوں تو وہ انسان کب رہے گا مگر ہم یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہیں گے کہ سرسید خوبیوں اور خامیوں کے حسین امتزاج سے پیدا ہونے والے ایک ایسے انسان تھے جن کی خوبیاں اس کی خامیوں کو ایسے ڈھک لیتی ہیں جیسے سورج کی روشنی سارے جہاں کو ڈھک لیتی ہے۔

آیئے! ہم سرسید کے نقش پا سے اپنے تلووں کو آشنا کرنے کا عزم کریں۔ تاکہ ہم بھی ایک ایسی زندگی گزار سکیں جو بیکار نہ جائے۔ آخر میں میں نواب عماد الملک کی اس آرزو کا حوالہ دیے بغیر نہ رہوں گا جو انھوں نے ۱۸۹۱ء میں نظام کلب، حیدر آباد میں کی تھی کہ

"کاش مسلمانوں میں سرسید احمد خاں کے سوا کوئی دوسرا شخص ایسا ہی پیدا ہو جائے جو اپنی ناموری اور شہرت کے خیال سے قوم کے لیے ایسے مفید کام کر کے دکھا دے جیسے کہ اس شخص کے ہاتھ سے سرانجام ہوئے ہیں۔"

"ایک دوسری بات جس پر میں زور دینا چاہتا ہوں وہ ہمارا انکشاف ماضی ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں جو صرف ماضی سے محبت کرتے ہیں۔ میں تو مستقبل کا معتقد ہوں مگر ماضی کی ضرورت مجھے اس لیے ہے کہ میں حال کو سمجھوں اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ سرچشمۂ تہذیب و شائستگی کو سمجھا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ آج دنیائے اسلام میں کیا ہو رہا ہے۔ چونکہ ہم جدید تہذیب و شائستگی کے اصولوں سے ناواقف ہیں، اس لیے ہم علوم جدیدہ کو حاصل کرنے میں دیگر اقوام سے پیچھے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان گم گشتہ رفعتوں پر نظر ڈالیں جن کے ذریعے سے ہم ماضی و مستقبل سے وابستہ ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ علوم جدیدہ پر اصول استقرائی عاید کیا گیا ہے۔"

علامہ اقبالؒ

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۔ بزنس منیجر: اسرار احمد ۔ ناظم اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق
ایڈیشنز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۔ پریس ۔ ایس کے آفسیٹ پریس دہلی

MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۱۱ :

شمارہ

نومبر ۸۸ء

ترسیل زر کا پتہ :

ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۔

Editor : TAHZIBUL AKHLAQ & NISHANT.

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

زر رسالانہ

انڈیا 30.00 Rs.

بیرونی ممالک US $ 20.00 ہوائی ڈاک

US $ 8.00 عام ڈاک

مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی

ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

انڈیا ۔

مندرجات

[تہذیب الاخلاق میں جو مضامین شایع کیے جاتے ہیں، ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہر حال ان سے متفق ہو۔]

اداریہ

ہم میں سے شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جو رشوت ستانی، اقربا پروری، فرض ناشناسی، بے ایمانی، فرقہ وارانہ منافرت اور فسادات کو زبانی طور پر اچھا کہتا ہو۔ جس سے بھی ان مسائل پر گفتگو کی جائے وہ برملا ان چیزوں کو سماج کے لیے زہر قرار دیتا ہوا ان لعنتوں کو ختم کرنے بلکہ بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کی بات کرے گا۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ اگر ہمارے سماج کا ہر فرد درج بالا لعنتوں سے نہ صرف متنفر ہے بلکہ اس کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کا متمنی بھی ہے تو پھر رشوت کی یہ گرم بازاری کیوں نظر آتی ہے؟ ہر جگہ اقربا پروری کا دور دورہ کیوں ہے؟ دفاتر اور دیگر اداروں میں فرض ناشناسی عام کیوں ہے؟ ہر ہر قدم پر بے ایمانی اور دھوکہ بازی سے ہمارا سابقہ کیوں پڑتا ہے؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فرقہ وارانہ فسادات کیوں ہوتے رہتے ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ تعصبات و تاملات کے مضبوط اور خاردار جال نے ہم کو اس طرح اپنی گرفت میں لے لیا ہے کہ ہم "دوہری شخصیت" کے حامل ہو کر رہ گئے ہیں؟ ہماری ایک شخصیت تو وہ ہے جو خیر کو خیر اور شر کو برملا شر نہ صرف کہتی ہے بلکہ اس سے اظہار تنفر بھی کرتی ہے لیکن ہماری دوسری شخصیت وہ ہے جو تعصبات و تاملات کے طلسم کی اسیر ہو کر شر کو خیر اور خیر کو شر بنایا کرتی ہے کیوں کہ اسی الٹ پھیر کے ذریعے لیڈری بھی چمکتی ہے اور جیب میں سکے بھی کھنکتے ہیں۔

آزادی کے چالیس برسوں کے بعد بھی ہمارے ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کا جو سلسلہ جاری ہے وہ زبان حال سے اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ ان فسادات کو شر سمجھنے والے بہت ہی کم اور خیر سمجھنے والے افراد بہت زیادہ ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آزاد، جمہوری اور سیکولر ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ جاری نہ رہتا۔ اگر واقعی ہمارے ملک کے افراد کی ایک بہت بڑی تعداد رشوت ستانی، اقربا پروری، فرض ناشناسی، بے ایمانی، فرقہ وارانہ منافرت اور فسادات کو اپنے سماج کے لیے زہر سمجھتی تو ہمارے معاشرے میں نہ تو رشوت ستانی کا وجود ہوتا نہ اقربا پروری کا، نہ فرض ناشناسی کے مناظر نظر کے سامنے آتے اور نہ ہی جلتے ہوئے مکانات، روتے ہوئے بچے، بلکتی ہوئی مائیں اور بہنیں، سڑتی ہوئی لاشیں، کٹے پھٹے اعضا دکھلائی دیتے۔

معاشرے کی کوئی بھی برائی ہو کوئی بھی لعنت یا مذموم حرکت ہو اس کو دنیا کی کوئی بھی حکومت بزور مٹانے پر قدرت نہیں رکھتی۔ حکومت عوام کے منتخب نمائندوں کے مجموعے کا نام ہے۔ ان نمائندوں کے فیصلوں کو نافذ کرنے اور ان کے

دفاتر کو چلانے کے لیے سماج کی ایک خاصی بڑی آبادی کے افراد کو تنخواہ دار ملازم رکھا جاتا ہے اور ان افراد سے بجا طور پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ منتخب نمائندوں کے فیصلوں کو ان کی صحیح روح کے تناظر میں نافذ کریں گے۔ اگر منتخب نمائندے مخلص ہوں اور دل و جان سے اس بات کے متمنی ہوں کہ فرقہ وارانہ فسادات نہ ہوں مگر ان کے فیصلوں کو نافذ کرنے والی ایجنسیاں اپنے فرائض کو مکمل طور پر ادا نہ کرتی ہوں تو منتخب نمائندوں کا ہر فیصلہ نقش بر آب نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا؟ اسی طرح اگر منتخب نمائندے اور فیصلوں کو نافذ کرنے والی ایجنسیاں دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر مخلص ہوں مگر عوام اُن کا ساتھ نہ دیں تو بھی کسی فیصلے یا کسی قانون کا نفاذ ناممکن ہے۔ اسی لیے ہمارا یہ خیال ہے کہ ہندوستانی معاشرہ کو جو بھی لعنتیں گھن کی طرح کھائے جا رہی ہیں خاص طور سے فرقہ وارانہ فسادات کی لعنت جس طرح ہمارے وجود کو کھوکھلا کر رہی ہے وہ عوام کے منتخب نمائندوں، ان کے فیصلوں کو نافذ کرنے والی ایجنسیوں اور عوام کے جم غفیر سب ہی کی مرضی کے عین مطابق ہے۔

اگر ہندوستان کا ہر شہری، منتخب نمائندے، قوانین نافذ کرنے والی ایجنسیاں سب کی سب فرقہ وارانہ منافرت اور فسادات کو مضر سمجھتی ہیں اور اُن کی مضرت سے واقف ہیں تو کیا آسمان سے کوئی دوسری مخلوق نازل ہو کر بستیوں کی بستیاں جلا کر راکھ کر دیتی ہے؟ ہندوستان کے کونے کونے، چپے چپے اور قریہ قریہ میں جو کچھ ہو رہا ہے، ہندوستان کا کوئی بھی شہری اس کی ذمہ داری سے بری نہیں ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم نہایت ایمان داری کے ساتھ یہ بات تسلیم کر لیں کہ ہمارے سماج میں جو لعنتیں در آئی ہیں ان پر ہم صرف قانع ہی نہیں ہیں بلکہ ان کو دل و جان سے پسند کرتے ہیں اور ان کو اپنے سماج کا "اٹوٹ انگ" شمار کرتے ہیں۔ ہم کو رشوت ستانی، اقربا پروری، فرض ناشناسی، بے ایمانی، فرقہ وارانہ منافرت اور فسادات پر کوئی شرمندگی نہیں ہے بلکہ ان لعنتوں کو ہم اپنے معاشرے کا ایک ارفع و اعلیٰ پہلو سمجھتے ہیں جس پر ہم کو ناز ہے۔ اگر ہمارا یہ خیال "دیوانے کی بڑ" ہے تو فرقہ وارانہ فسادات کیوں ختم نہیں ہوتے، رشوت ستانی کا سد باب کیوں نہیں ہوتا، اقربا پروری حرف غلط کی طرح لوح جہاں سے کیوں نہیں مٹتی، فرقہ وارانہ منافرت اور فسادات کیوں نیست و نابود نہیں ہوتے؟ یہ سوچنے کی بات ہے۔

کبیر احمد جائسی

تہذیب الاخلاق کی ادبی خدمات

سرسید احمد خانؒ

ترقی علم انشا

جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعے سے کوشش کی۔ مضمون کے ادا کا ایک سیدھا طریقہ اختیار کیا۔ جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی الفاظ کی درستی، بول چال کی صفائی پر کوشش کی۔ رنگینی عبارت سے جو تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، پرہیز کیا۔ تک بندی سے جو اس زمانہ میں مقفیٰ عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اٹھایا۔ جہاں تک ہو سکا سادگیٔ عبارت پر توجہ کی۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو، وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے۔ تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری یہ کوشش کہاں تک کارگر ہوئی اور ہمارے ہم وطنوں نے اس کو کس قدر پسند کیا۔ مگر اتنی بات ضرور دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے خیالات میں ضرور تبدیلی آگئی ہے اور اس کی طرف لوگ متوجہ بھی معلوم ہوتے ہیں۔ اخباروں کی عبارتیں نہایت عمدہ اور صاف ہوتی جاتی ہیں۔ وہ پہلا ناپسندیدہ طریقہ ادائے مضمون کا بالکل چھوٹتا جاتا ہے۔ بھاری بھاری لفظوں اور موٹے موٹے لفظوں سے اردو زبان کا خون نہیں کیا جاتا۔ صفائی اور سادگی روز بروز عبارتوں میں بڑھتی جاتی ہے۔ خیالات بھی بالکل بدلے ہوئے ہیں۔ [illegible] کوئی نہ کوئی آرٹیکل

عمدہ و سلیس عبارت میں کسی نہ کسی مضمون پر نہ لکھا جاتا ہو۔ صرف اس بات کی کمی ہے کہ وہ سامان ہمارے پاس موجود نہیں ہے جس سے ہماری معلومات زیادہ ہوں اور ہمارے خیالات کو وسعت ہو۔ جو مضمون ہم لکھنا چاہیں ان کے ماخذ اور ان کے حالات اور جو بحثیں کہ ان پر ہو چکی ہیں اور جو امور ان کی نسبت متحقق ہو چکے ہیں، ان سے آگاہی ہو اور یہی سبب ہے کہ بعض دفعہ ہماری قوم کے آرٹیکلوں میں غلطی ہو جاتی ہے اور جن امور کا تصفیہ ہو چکا ہے ان ہی کو پھر کہے جاتے ہیں۔ یہ نقص اسی وقت رفع ہوگا جب کہ انواع و اقسام علوم و فنون کی کتابیں ہماری زبان میں موجود ہو جاویں گی اور ہماری قوم کو عموماً ان پر دسترس ہوگی۔ سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ نے اس کام کے پورا کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ قوم کو اس طرف توجہ نہیں ہے اور اسی سبب سے اس کا کام ادھورا پڑا ہے۔

نئی اردو نے درحقیقت ہماری ملکی زبان میں جان ڈال دی ہے۔ میرؔ و دردؔ و ظفرؔ نے اردو اشعار میں جو کچھ سحر بیانی کی ہو، کی ہو، میر امن دہلوی نے کوئی کہانی شستہ بول چال میں کہہ دی ہو، کہہ دی ہو، جو اس سے زیادہ فصیح و دل چسپ و بامحاورہ نہ ہوگی جو ایک پوپلی بڑھیا بچوں کے سلاتے وقت ان کو کہانی سناتی ہے۔ مضمون نگاری دوسری چیز ہے جو آج تک اردو زبان میں نہ تھی۔ یہ اسی زمانے میں پیدا ہوئی اور ابھی نہایت بچپن کی حالت میں ہے اگر ہماری قوم اس پر متوجہ رہے گی اور ایشیائی خیالات کو نہ ملائے

گی جواب حد سے زیادہ اجیرن ہو گئے ہیں تو چند روز میں ہماری ملکی تحریریں بھی میکالے و اڈیسن کی سی ہو جاویں گی۔

بعض لوگوں کو شکایت ہے کہ جو لوگ اس زمانے میں اردو لکھتے ہیں وہ انگریزی لفظ اپنی تحریروں میں ملاتے ہیں مگر ان کو غور کرنا چاہیے کہ زندہ زبان میں ہمیشہ نئے نئے لفظ ملتے اور بنتے ہیں اور جب کوئی زبان محدود ہو جاتی ہے، مردہ کہلاتی ہے۔ غیر زبان کے الفاظ کو اپنا کر لینا اہل زبان کا کام ہے مگر ان کا ملا لینا آسان کام نہیں۔ اہل زبان غیر زبان کے لفظ کو ایسی عمدگی سے ملا لیتے ہیں جیسے تاج گنج کے روضہ میں سنگ مرمر پر عقیق و یاقوت و زمرد کی پچکاری ہے۔ بے شک وہ دوسرا پتھر ہے مگر ایسا وصل ہوا ہے کہ غور سے دیکھنے پر بھی اوپر سے جڑا ہوا نہیں معلوم ہوتا، اسی میں سے پیدا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات اہل زبان کے سوا دوسرے سے نہیں ہو سکتی اور نہ سب اہل زبان سے بلکہ صرف اس سے جسے خدا نے ایسا ملکہ دیا ہو۔

یہ بات بھی غور کرنی چاہیے کہ اہل زبان کے لفظوں کے لینے کی کیوں ضرورت پڑتی۔ اس کے متعدد اسباب ہوتے ہیں، ایک مورخ جو کسی ملک کی تاریخ لکھتا ہے اس کو ضرور ہوتا ہے کہ اس ملک کے تاریخی الفاظ یعنی جو تاریخ سے متعلق ہیں اور ملکوں کی تقسیم اور مناصب اسی ملک کی زبان میں قایم رکھے۔ کیوں کہ اگر ان کے لیے اپنی زبان کے الفاظ اور اصطلاح بدل دے تو وہ تاریخ نہایت نکمی اور غیر مفید ہو جاوے گی۔

قرآن مجید کو پڑھو اور دیکھو اس میں کس قدر الفاظ دوسری زبانوں کے داخل ہیں۔ اگر عربی زبان کے علم و ادب اور علوم و فنون میں الفاظِ جدیدہ شامل ہونے بند ہو جاتے تو وہ زبان بھی مثل عبرانی و سنسکرت و ژند کے مردہ زبان ہو جاتی۔

علوم و فنون پر کتابیں لکھنے والا بعض دفعہ مجبور ہوتا ہے کہ جس زبان سے اس علم کو لیا ہے، اسی زبان کے بعض الفاظ اور مصطلحات بدستور قایم رکھے۔ دیکھو یونانی زبان سے علم طب عربی میں ترجمہ ہوا کس قدر یونانی الفاظ اس میں شامل ہیں۔ اگر کسی کو پیشہ عشق نہ ہو تو ضرور اس کو تسلیم کرے گا۔ عربی زبان سے

کمسٹری انگریزی میں گئی۔ آج تک بہت سے عربی لفظ انگریزی زبان کی کمسٹری میں شامل ہیں۔

پوچھو کہ اس مقام پر میں نے کیوں لفظ کمسٹری بولا اور کیمیا کا لفظ جس سے خود انگریزوں نے لفظ کمسٹری بنایا ہے، کیوں نہ بولا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم لوگوں میں کیمیا کے لفظ کے سننے سے چاندی سونا بنانے کا خیال پیدا ہوتا ہے جو ایک محض غلط خیال ہے۔ اب وہ شخص جو اپنی قوم کی ہمدردی رکھتا ہے اور ان غلط خیالات کو مٹانا چاہتا ہے۔ کسی جگہ کمسٹری اور کسی جگہ کیمیا کا لفظ بول جاتا ہے تاکہ کمسٹری کا لفظ اس غلط خیال کو نہ آنے دے اور کیمیا کا لفظ کمسٹری اور کیمیا کے ایک ہونے کا خیال نہ پیدا کرے۔

لٹریچر یعنی علم و ادب اہل زبان کے لیے نہایت وسیع جولان گاہ ہے۔ اس میں وہ اپنی طبیعت کا زور دکھلاتا ہے۔ اسی کے ذریعہ سے وہ اپنے دل کی بات دوسرے کے دل میں ڈالتا ہے۔ اپنی شستہ تقریر اور مناسب الفاظ سے لوگوں کے دلوں کو جس بات پر چاہتا ہے ابھارتا ہے، ان ہی لفظوں سے کبھی ہنسا دیتا ہے اور کبھی رلا دیتا ہے۔ پرانے دقیانوسی خیالوں کو مٹاتا ہے اور نئے نئے خیالات دلوں میں ڈالتا ہے۔ کبھی واحد کے بدلے جمع اور جمع کے بدلے واحد کے صیغے بولتا ہے۔ کبھی حاضر کو غائب اور غائب کو حاضر کہہ دیتا ہے کبھی ترکیب جملہ کی دوسری زبان کی ترکیب پر گھڑ دیتا ہے اور اس سب میں ایک لطف اور ایک قسم کا مزہ رکھا جاتا ہے۔ اگر وہی چال وہ چلے جو اہل زبان نہیں ہے تو سینکڑوں ٹھوکریں کھاتا ہے یہ مطلب نہیں ہے کہ اہل زبان جو کہے سو صحیح ہے اور غیر اہل زبان وہ چال چلے تو غلط ہے۔ نہیں، درحقیقت اس کا کہنا صحیح اور اس کا بولنا غلط ہوتا ہے اور اہل زبان ہی اس میں تمیز کر سکتا ہے۔

دوسری زبان کے لفظوں کو اپنی زبان میں بولنا کبھی عبارت کا لطف بڑھانے کے لیے ہوتا ہے، کبھی اپنی زبان کو وسعت دینا اور نئے لفظوں کو اس میں داخل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ کبھی سامعین کو مطلب کی طرف زیادہ متوجہ کرنے کے لیے بولا جاتا ہے۔ کبھی اس مطلب کی عظمت جتلانے کو کہا جاتا ہے جو عظمت اس

مرادف لفظ سے جو اس زبان میں مستعمل ہے دل میں نہیں بیٹھتی۔ مثلاً بعضے اہل زبان تحریر و تقریر میں مناسب موقع پر جس کی مناسبت کو اہل زبان ہی جان سکتے ہیں، جنٹلمین کا لفظ بولتے ہیں۔ اگر وہ اس کی جگہ شریف یا شریفوں کا لفظ بولیں تو اس لفظ یا مطلب کی عظمت خاک میں مل جاتی ہے۔ اس لیے کہ ہماری زبان اور عام استعمال میں لفظ شریف کا ذلیل ہو گیا ہے۔ اس سے بجز اس خیال کے کہ اس کی حسب و نسب میں کچھ نقصان نہیں ہے، شیخ، سید، مغل، پٹھان ہے اور کوئی خیال پیدا نہیں ہوتا مگر اس لفظ کا بولنے والا اس خیال سے زیادہ تر وسیع اور اعلیٰ خیال دل میں بٹھانا چاہتا ہے۔ وہ اس لفظ سے ایسا شخص بتانا چاہتا ہے جو رذیل آدمیوں کی بہ نسبت، خاندان میں، تعلیم میں، حیثیت میں، اطوار میں افضل ہو۔ اس کی تعلیم و تربیت اس کا چال چلن اچھا ہو۔ نیک اور خوش اخلاق ہو۔ وہ ہر بات میں جو اس سے متعلق ہو، حلیم ہو، چال چلن میں، حوصلہ و مزاج میں، خواہش اور ارادہ میں سلیم ہو ایسا ہونا تعلیم سے شروع ہوتا ہے اور پڑھے کو گنا اور نیک صحبت میں بیٹھنا اس کو پورا کرتا ہے۔ اگرچہ شریف کے بھی یہی معنی ہونے چاہئیں مگر چوں کہ اس کا استعمال ایک خاص بات پر ہو گیا ہے تو یہ پورا پورا خیال اس لفظ سے دل میں نہیں آتا۔ پس ایک محب قوم اہل زبان ان خیالوں کو دل میں ڈالنے کے لئے اپنی زبان کو وسعت دیتا ہے اور دوسری زبان کا نیا لفظ اپنی زبان میں ملاتا ہے۔ تاکہ نئے لفظ کے ساتھ نیا خیال دل میں پیدا ہو۔ یہی حال اس قسم کے اور لفظوں کا ہے، اگر ہم ان سب کی تفصیل لکھیں تو ہمارا یہ آرٹیکل لغت یا اصطلاحات کی ایک کتاب ہو جاوے۔ اسی نمونے سے ہمارے ہم وطن خیال کر سکیں گے کہ ہماری قوم کو اپنی زبان کی نسبت بھی کیا کیا کرنا ہے اور ان لغو خیالات کو چھوڑیں گے کہ وہ شخص تو انگریزیت پر مرتا ہے۔ انگریزی ہی لفظ بولتا ہے۔ اپنی واقف کاری انگریزوں کی جتاتا ہے۔

اُردو نظم

ہماری زبان کے علم و ادب میں بہت بڑا نقصان یہ تھا کہ نظم پوری نہ تھی۔ شاعروں نے اپنی ہمت، عاشقانہ غزلوں اور واسوختوں اور مدحیہ قصیدوں اور ہجر کے قطعوں اور قصہ و کہانیوں کی مثنویوں میں صرف کی تھی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان مضامین کو چھونا نہیں چاہیے تھا۔ نہیں، وہ بھی نہایت عمدہ مضامین ہیں اور جودت طبع اور تلاش مضمون کے لئے نہایت مفید ہیں۔ مگر نقصان یہ تھا کہ ہماری زبان میں صرف یہی تھی، دوسرے، دوسری قسم کے مضامین، جو درحقیقت وہی اصلی مضامین ہیں اور نیچر سے علاقہ رکھتے ہیں، نہ تھے۔ نظم کے اوزان بھی وہی معمولی تھے۔ ردیف و قافیہ کی پابندی گویا ذات شعر میں داخل تھی۔ رجز اور بے قافیہ شعر گوئی کا رواج ہی نہیں تھا اور اب بھی شروع نہیں ہوا۔ ان باتوں کے نہ ہونے سے حقیقت میں ہماری نظم صرف ناقص ہی نہ تھی بلکہ غیر مفید بھی تھی مگر نہایت خوشی کا مقام ہے کہ زمانے نے اس کو بھی رفارم کیا۔ ہم نے جو بہت ہائے پکار کی تو اب شاعروں نے اس کی طرف توجہ کی اور اہل پنجاب اس نقص کے رفع کرنے پر متوجہ ہوئے۔

اردو زبان کے علم و ادب کی تاریخ میں ۱۸۷۴ء کا وہ دن جب لاہور میں نیچرل پوئٹری کا مشاعرہ قایم ہوا، ہمیشہ یاد رہے گا۔

ہز آنر لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب اور مسٹر ہالرائڈ ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب نے اس مشاعرہ کے قائم ہونے پر بڑی توجہ کی ہے، جس کی شکر گزاری ہماری قوم پر واجب ہے۔ ہماری قوم کے لائق و فائق لوگوں نے بھی اس پر بہ خوبی توجہ کی ہے۔ مولوی محمد حسین صاحب آزاد پروفیسر عربی گورنمنٹ کالج لاہور نے اس مشاعرہ کے بقا اور قیام میں سب سے زیادہ ہمت مصروف کی ہے۔ ان کی طبیعت کے زور اور پاکیزگی مضامین اور شوکت الفاظ اور طرز ادا سے ہم لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اُن کی مثنوی "خواب امن" جو "آفتاب پنجاب" میں چھپی، ہمارے دلوں کو خواب غفلت سے جگاتی ہے۔ مولوی خواجہ الطاف حسین حالی اسسٹنٹ ٹرانسلیٹر محکمہ ڈائرکٹر پنجاب کی مثنویوں نے تو ہمارے

دلوں کے حال کو بدل دیا ہے۔ ان کی مثنوی "حب الوطن" اور مثنوی "مناظرہ رحم و انصاف" جو پنجابی اخبار میں چھپی ہیں درحقیقت ہمارے زمانے کے علم و ادب میں ایک کارنامہ ہیں ان کی سادگی الفاظ، صفائی بیان، عمدگی خیال، ہمارے دلوں کو بے اختیار کھینچتی ہے۔ وہ مثنویاں آبِ زلال سے زیادہ خوشگوار ہیں۔ بیان میں، زبان میں، آمد میں، الفاظ کی ترکیب میں، سادگی و صفائی میں کیسی عمدہ ہیں کہ دل میں بیٹھی جاتی ہیں۔ ہاں یہ بات سچ ہے کہ ہمارے ان باعث افتخار شاعروں کو ابھی نیچر کے میدان میں پہنچنے کے لیے آگے قدم اٹھانا ہے اور اپنے اشعار کو نیچرل پوئٹری کے ہم سر کرنے میں بہت کچھ کرنا ہے۔ مگر ان مثنویوں کے دیکھنے سے اتنا خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ خیالات میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے اور اس کا بھی تصور ہو سکتا ہے کہ ہماری قوم اس عمدہ مضمون نیچر کی طرف متوجہ رہے اور ملٹن اور شیکسپیر کے خیالات کی طرف توجہ فرمائے اور مضامین عشقیہ اور مضامین خیالیہ اور مضامین بیانِ واقع اور مضامین نیچر میں جو تفرقہ ہے اس کو دل میں بٹھالے تو ان بزرگوں کے سبب ہماری قوم کا لٹریچر کیسا عمدہ ہو جاوے گا اور ضرور وہ دن آوے گا کہ ہم بھی اپنی قوم کے کسی نہ کسی فرد پر ایسا ہی فخر کریں گے، جیسے کہ یورپ کے لوگ ملٹن اور شیکسپیر پر ناز کرتے ہیں۔ مضامین بیان واقع اور مضامین نیچر ایسے پاس پاس ہیں کہ ان میں دھوکا پڑ جاتا ہے مگر درحقیقت پہلا دوسرے سے بالکل علیحدہ ہے۔ پہلا تو ایک بیرونی حالت ہے اور دوسرا اندرونی۔ اسی پچھلے میں وہ طاقت ہے جو دل میں اثر کرتی ہے۔ ابھی تک ہماری قوم کا کلام بیرونی حالت سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے، مگر ہم کو امید ہے کہ بہت جلد وہ اندرونی حالت تک بھی پہنچ جاوے گا۔

ایک دانا نے ایک پہلوان کو دیکھا کہ واہی تباہی بک رہا ہے اور منھ سے جھاگ بہہ رہے ہیں۔

دانا نے پوچھا: "کیا ہوا؟"

کسی نے بتایا: "فلاں شخص نے اس کو گالی دی ہے۔"

انھوں نے کہا:

"یہ ہزار من کا پتھر تو اٹھا لیتا ہے، لیکن ایک چھوٹی
سی بات برداشت نہیں کر سکتا۔"

[حکایاتِ سعدی]

علیگ برادری سے ایک گذارش

اشتیاق حسین قریشی*

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا ہر فرد اتنی بات تو بہرحال جانتا ہی ہے کہ سر سید احمد خاںؒ نے جس محاذ پر سب سے زیادہ محنت کی وہ تعلیمی محاذ تھا۔ انھوں نے بہت واضح الفاظ میں یہ بات کہی کہ :

”اے دوستو! مجھ کو یہ بات کچھ زیادہ خوش کرنے والی نہیں ہے کہ کسی مسلمان بی۔اے یا ایم۔اے کی ڈگری حاصل کرلی ہے، میری خوشی قوم کو قوم بنانے کی ہے۔ کوئی قوم جس کو اپنے بچوں اور قوم کی تعلیم کی خواہش ہو جب تک وہ تعلیم اپنے ہاتھ میں نہ ہوئے اس کا پورا ہونا غیر ممکن ہے، میں تم سے سچی بات کہتا ہوں کہ قومی تعلیم اور قومی عزت ہم کو اس وقت حاصل نہیں ہونے کی جب تک ہم اپنی تعلیم کا کام خود اپنے ہاتھ میں نہ لے لیں، گورنمنٹ کی قدرت سے خارج ہے کہ وہ ہمارے تمام مقاصد کی تکمیل کرسکے۔ مسلمانوں کو یہ شرم نہیں آتی کہ مشنری تعلیم گاہوں میں وہ اپنے لڑکوں کو بھیجتے ہیں ان کو جوش پیدا نہیں ہوتا، ان کو غیرت نہیں آتی۔“

علیگ برادری اس وقت ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہر سال ۱۷ اکتوبر کو سر سیدؒ کی یاد میں مختلف پروگرام کرتی ہے لیکن اس کی حیثیت نشستن وگفتن و برخاستن کی ہوتی ہے۔ کام و دہن کی لذت آفرینی کا شاندار پروگرام ہوتا ہے اور مجازؔ کے ولولہ انگیز اشعار کے برخلاف یہ ابر بغیر برسے نکل جاتا ہے: تقریباً ایک صدی ہونے کو آئی ہر سال سر سیدؒ کو خشک خراج عقیدت پیش کرنے کی رسم جاری ہے۔ خراج اگر کوئی وصول کرتا ہے تو وہ ہمارا معدہ

کیا ایسا ممکن نہیں کہ کم سے کم اکتوبر کے مہینے میں ہم جہاں بھی ہوں وہاں ہم ایک مدرسہ قایم کردیں، ایک اسکول کھول دیں، ایک اسکول کو فرنیچر مہیا کردیں، کسی سمینار یا انعامی مقابلہ کا انعقاد کرکے مسلمان بچوں کی حوصلہ افزائی کردیں، کوئی لائبریری قایم کردیں، کسی اخبار کے دس بیس خریدار بنادیں۔

ضرورت مند بچوں کی تعلیم کے لیے کوئی فنڈ قایم کردیں۔ کوئی کوچنگ اسکول کھول دیں، لڑکیوں کی تعلیم کا کوئی ادارہ

* اکبری گیٹ، لکھنؤ، یو۔پی

قایم کر دیں۔ یونیورسٹی میں ذہین ترین طلبا، کے داخلے کی کوشش کر دیں، کچھ مسلمانوں کو کاروبار سے لگا دیں۔ سرسیدؒ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے سیکڑوں طریقے ہیں۔ سرسیدؒ نے قوم کو قوم بنانے کا عزم کیا تھا اس لیے کسی قوم کو قوم بنانے کے لیے اُس کا تشخص ضروری ہے۔ مسلمانوں کے تشخص کے لیے سب سے پہلے دین کی ضرورت ہے۔ ہمیں ہر پروگرام میں اس کو اولیت دینی ہوگی اور اس کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ سرسیدؒ نے انگریزوں کے دبدبہ اور طنطنہ کے دور میں جب بڑے بڑوں کا جگر پانی تھا اسلام کا جھنڈا بلند کیا اور اپنی ساری پونجی داؤں پر لگا دی علیگ برادری ساری پونجی نہ سہی کم سے کم اپنی ایک ہفتہ کی آمدنی سرسید مشن پر لگا دے۔ ۷ اکتوبر کو ایسے تمام پروگراموں کا اعلان اور نفاذ ہو اور اس کی تفصیل ماہنامہ تہذیب الاخلاق "مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور دوسرے تمام اخبارات کو بھیج دی جائے۔

اگر ہر سال پورے عزم اور ہوشمندی کے ساتھ یہ پروگرام عمل میں لایا جائے گا تو پورے ملک کا نقشہ بدل جائے گا۔ سرسیدؒ کو خراج عقیدت پیش کرنے کا یہ بہترین طریقہ ہے۔

" اتفاق کی خوبیاں لوگوں نے بہت کچھ بیان کی ہیں اور وہ ایسی ظاہر ہیں کہ کوئی شخص اتفاق سے بھی اُن کو بھول نہیں سکتا۔ بہت بڑے بڑے واقعات دنیا میں گزرے ہیں جن کو پرانی تاریخیں یاد دلاتی ہیں اور جن کی یاد سے ایک عجیب اثر ہمارے دلوں میں ہوتا ہے، وہ سب باہمی اتفاق کا نتیجہ ہے۔ ایک ناچیز ریشۂ گیاہ جو تنہا نہایت کمزور ہوتا ہے باہمی اتفاق سے ایسا قوی اور زبردست ہو جاتا ہے کہ بڑی سے بڑی قوت کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس وقت تعلیم یافتہ دنیا میں جو کچھ ترقی ہے، یا نامہذب ملکوں میں جو کچھ طاقت ہے، وہ سب اتفاق کی بدولت ہے۔"

سرسیدؒ

ذیابیطس کے اسباب اور اس کا علاج

محمد بابر مرزا*

مترجم

مرزا محمد اقبال مسعود

انہضامِ غذا کے بعد شکر انگوری (Grape Sugar) اور
ونرشے (Amiono Acids) وریدِ کبدی کے راستے جگر میں سب
پہلے پہنچتے ہیں۔ خلیات کبدی خون سے ان دونوں مرکبات کو جذب کر لیتے
، اور یہ جگر میں ناقابلِ تحلیل مرکبات میں تبدیل ہو جاتے ہیں شکر انگوری
یں گلائیکوجن کی ماہیت اختیار کر لیتی ہے۔ لہٰذا اگر کسی جانور کو عمدہ غذا
نے کے چند گھنٹے بعد ہلاک کر کے اس کے جگر کا کیمیائی امتحان کیا جائے
علوم ہوگا کہ خلیات کبدی میں گلائیکوجن کثرت سے موجود ہے۔
ئیکوجن جگر میں زیادہ عرصے تک اسی حالت میں برقرار نہیں رہتی بلکہ کچھ
بعد عمل تخمیر (Fermentation) سے دوبارہ شکر انگوری میں
ل ہو جاتی ہے اور یہ شکر انگوری خون میں حل ہو کر وریدوں کے راستے
ج جسمانی تک پہنچتی ہے۔ لہٰذا جگر ایک بڑے گودام کے مشابہ ہے۔
کا کام امعاء سے شکر انگوری کو حاصل کر کے جمع رکھنا ہے تاکہ وہاں
وہ جسم کے ہر حصے کو مہیا ہو سکے۔ جگر کے اس فعل کی بنا پر کہ وہ خون سے
ئے شکری جذب کر لیتا ہے، خون کی کیمیاوی ترکیب ایک خاص نہج پر قائم
ہے۔ یعنی اس میں اجزائے شکری ایک مقررہ مقدار سے زیادہ جمع
ہوتے۔ تندرست آدمی کے خون میں اجزائے شکری کا تناسب
۔ فی صد ہوتا ہے۔ یعنی پانچ لیٹر خون میں ایک چائے کے چمچے جتنی شکر
ی ہے خواہ انسان تمام دن فاقہ مستی میں بسر کرے خواہ نہایت
یں غذا کھائے اس کے خون میں شکر کی مقدار مندرجہ بالا تناسب
سے تجاوز نہیں کرتی۔ یہ سوال کہ شکر زیادہ مقدار میں جگر سے کیوں
نہیں خارج ہوتی ایک پیچیدہ مسئلہ ہے جس کا اب تک کوئی شافی
جواب نہیں دیا جا سکا حالانکہ سائنس داں گزشتہ ستر برس سے اس
گتھی کو سلجھانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن ان کی پیہم کوششوں اور
عرق ریزیوں کے باوجود ابھی تک جگر اور اس کے ملحقات کے افعال
پوری طرح معلوم نہیں ہو سکے۔

افعال الاعضا کے مشہور فرانسیسی ماہر کلاڈ برنارڈ (Claude Bernard) نے ۱۸۵۵ء میں ایک تہلکہ مچا دینے والی حقیقت دریافت کی۔ اُس نے معلوم کیا کہ اگر دماغ کے بعیدی کیسہ (Posterior Brain vesicle) کی زیریں دیوار کو تحریک پہنچائی جائے تو خون میں اجزائے شکری اپنے تناسبِ عمومی سے متجاوز ہو جاتے ہیں۔ شکر کی یہ زیادتی بول کے ہمراہ نظامِ جسمانی سے خارج ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ دماغ کا وہ حصّہ جس کا فعل خون میں شکری اجزا کو ایک خاص تناسب سے قائم رکھنا ہے اعصاب کے ذریعے جگر سے علاقہ رکھتا ہے اور اس علاقہ کی بدولت یہ حصّہ دماغ جگر میں ناقابلِ تحلیل گلائیکوجن کو قابلِ تحلیل شکر انگوری میں ایک خاص رفتار سے تبدیل کراتا رہتا ہے۔

اس انکشاف کی صداقت کا امتحان کرنے کے لیے مندرجہ ذیل طریقہ بروئے کار لایا گیا:

---

* سابق صدر شعبۂ حیوانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اعشائے شکم کو آنے والے تمام اعصاب کا تعلق دماغ سے منقطع کردینے کے بعد دماغ کے بعیدی کیسہ کو تحریک پہنچائی گئی لیکن خون میں اجزائے شکری اپنے تناسب عمومی سے متجاوز نہ ہوئے۔ لہذا یہ ثابت ہوا کہ خون میں شکری اجزا کی افزونی دماغ کے بعیدی کیسہ کے احکامات کے تحت ہے۔

مندرجہ بالا انکشاف سے افعال الاعضا کے جملہ ماہرین مطمئن تھے کہ ایک بہت ہی ناخوشگوار حقیقت عالم ظہور میں آئی وہ یہ کہ جب دماغ سے اعشائے شکم کو آنے والے اعصاب کا سلسلہ منقطع کردیا گیا اور دوسرے اعصاب جو دماغ سے اعشائے شکم کو آتے تھے وہ اُسی طرح برقرار رکھے گئے تو دماغ کے بعیدی کیسہ کو تحریک دینے سے خون میں اجزائے شکری اپنے تناسب مقررہ سے متجاوز ہو گئے۔ حالانکہ پہلے تجربے کے ماتحت یعنی اگر اعشائے شکم کو آنے والے تمام اعصاب (مع جگر کو آنے والے اعصاب کے) منقطع کر دیئے جائیں تو مذکرہ بالا دماغی تحریک اپنا اثر نہیں دکھاتی لہذا یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ:

ا۔ اگر دماغ کے ایک خاص حصے کو تحریک پہنچائی جائے تو جگر سے شکر انگوری خارج ہونے لگتی ہے۔ اور خون میں شکری اجزا کے تناسب میں کافی اضافہ ہو جاتا ہے۔

ب۔ اگر اعشائے شکم اور دماغ کے اعصابی تعلق کو قطع کر دیا جائے تو "دماغی تحریک" بے اثر ثابت ہوتی ہے۔

ج۔ لیکن اس صورت میں جب کہ محض جگر اور دماغ کا اعصابی تعلق منقطع ہو اور دیگر اعشائے شکم کا اعصابی رابطہ دماغ سے برقرار رہنے دیا جائے تو "دماغی تحریک" جگر سے شکر کا اخراج کرانے میں کامیاب رہتی ہے۔

د۔ دماغی تحریک کے موثر ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ جگر اور دماغ کا رابطہ استوار رکھا جائے۔ محض دیگر اعشائے شکم کو دماغ سے مربوط رکھنا کافی ہے۔

ہ۔ لہذا ثابت ہوا کہ کوئی عضو اعشائے شکم میں ایسا ہے جو دماغ اور جگر کے مابین نامہ بری کی خدمات سرانجام دیتا ہے کیونکہ دماغ سے جگر کا تعلق منقطع ہونے کے بعد "دماغی تحریک" جگر کو اخراج شکر کا حکم بلا واسطہ تو دے نہیں سکتی۔

اب رہا یہ سوال کہ وہ عضو جو نامہ بر کی حیثیت رکھتا ہے اپنے فرائض کس طرح سرانجام دیتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کو دماغ سے اعصاب کے ذریعے پیغامات پہنچتے ہیں۔ کیوں کہ اس کا اعصابی تعلق دماغ سے قایم ہے۔ یہ احکامات اس عضو سے یا تو ... کے وسیلے سے یا کسی اور ذریعے سے جگر تک ارسال ہوتے ہیں۔

جب معلومات کا دائرہ یہاں تک وسیع ہو چکا تو مسئلہ کی پیچیدگی ایک بڑی حد تک دور ہو گئی۔ لیکن اب یہ چیز سائنس دانوں کی متجسس فطرت کو پریشان کیے ہوئے تھی کہ وہ عضو کون سا ہے جو نامہ بر کا کام دیتا ہے اور وہ جگر تک دماغ کا پیغام کس طرح پہنچاتا ہے۔ آیا اعصاب کا رہین منت ہو کر یا ان کی خدمات سے مطلقاً بے نیاز رہ کر؟ اس گتھی کو سلجھانے کے لیے انھوں نے مندرجہ ذیل تجربہ کیا:۔

ا۔ دماغ سے جگر کو آنے والے اعصاب کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

ب۔ دماغ سے اعشائے شکم کو آنے والے اعصاب جوں کے توں رہنے دیے۔

ج۔ اعشائے شکم اور جگر کے مابین جملہ اعصابی تعلقات منقطع کر دیے گئے۔

د۔ دماغ کے بعیدی کیسہ کی زیریں دیوار کو تحریک پہنچائی گئی۔

ہ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جگر سے شکر کا اخراج ہونے لگا۔

لہذا یہ چیز پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ وہ عضو جو دماغ اور جگر کے درمیان نامہ بری کی خدمت سرانجام دیتا ہے، دماغ سے تو اعصاب کے ذریعے احکامات وصول کرتا ہے (ب) لیکن ان احکامات کو جگر تک اعصاب کے ذریعے نہیں بلکہ کسی اور وسیلے سے پہنچاتا ہے (ج) اب وہ وسیلہ ظاہر ہے کہ سوائے خون کے کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اب ماہرین کے دل میں شبہ پیدا ہوا کہ اگر وہ وسیلہ خون ہے تو نامہ بر کی حیثیت کسی غدہ کو ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ کیونکہ وہ دماغ سے احکامات وصول کرنے کے بعد اپنے افراز کا ترشح شروع کر دیتا ہوگا اور یہ افراز خون میں مل کر جگر تک پہنچتے ہوں گے، جہاں سے ان

کے اثر کے ماتحت شکر کا اخراج ہونے لگتا ہے۔ بعد کی تحقیقات سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ وہ نامہ بر سرگردئی (Adrenal) ہے۔ سرگردئی ایک چھوٹا سا غدہ ہے جو گردے کے بالائی حصّے کے قریب واقع ہے اور اس کے افراز کو ایڈرینلین (Adrenalin) کہتے ہیں۔ ایڈرینلین خون کے ہمراہ جب جگر میں پہنچتی ہے تو اس کے زیر اثر گلائیکوجن شکر انگوری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد یہ شکر انگوری (جس کی خاصیت ہے کہ وہ فوراً خون میں حل ہو جاتی ہے) خلیات کبدی سے خارج ہو کر خون کے اجزائے شکری میں بہت اضافہ کر دیتی ہے۔

سرگردئی کا فعل

یہ انکشاف کہ محض سرگردئی کو تحریک پہنچنے سے جگر سے شکر کا اخراج ہونے لگتا ہے (خواہ دماغ کے بعیدی کیسہ کو تحریک نہ بھی دی جائے) بہت دلچسپ تھا۔ اس سے یہ امر قطعی ثابت ہو گیا کہ جگر میں گلائیکوجن کا شکر انگوری میں تبدیل ہونا اور شکر انگوری کا اخراج قطعی طور سے غدہ سرگردئی کے افراز ایڈرینلین کے زیر اثر ہے۔ لہٰذا چند اور تجربات کیے گئے اور اُن سے یہ معلوم ہوا کہ اگر ایڈرینلین کو زیر جلد پچکاری سے خون میں شامل کر دیا جائے تو جگر سے شکر کا اخراج ہونے لگتا ہے۔ اب ایڈرینلین ایسا مرکب ہے جس کو معمل میں مصنوعی طور سے عمل کیمیا کے ذریعے تیار کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا مصنوعی طریق سے تیار شدہ ایڈرینلین کو جب بذریعہ پچکاری خون میں شامل کیا گیا تو آدھ گھنٹے کے بعد بول میں شکر آنے لگی۔

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ غدۂ سرگردئی سے کن حالات کے ماتحت ایڈرینلین کا ترشح شروع ہوتا ہے۔

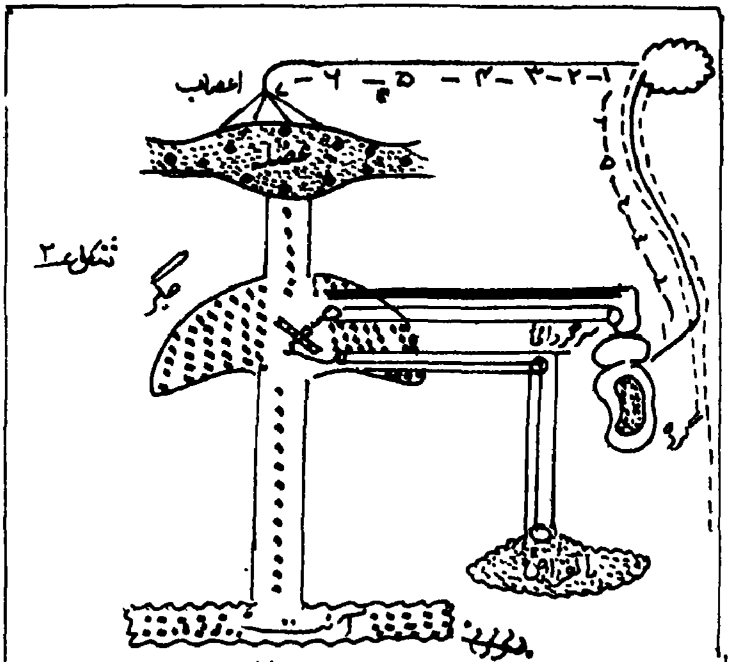
ہر شخص جانتا ہے کہ زندگی نام ہے حرکت و عمل کا۔ مختلف حرکات عضلات کے انقباض و انبساط سے عالم وجود میں آتی ہیں عضلات کی ان حرکات سے قوت خرچ ہوتی ہے، قوت پیدا ہوتی ہے۔ نشاستہ اور شکر کے "جلنے" سے۔ لہٰذا عضلات کی بافت میں اجزائے شکری مجتمع رہتے ہیں اور جب کوئی عضلہ حرکت کرتا ہے تو مجتمع شکر کا کچھ حصّہ اُسے قوت پہنچانے میں صرف ہو جاتا ہے۔ اب اگر صرف شدہ شکر کی کمی پوری نہ کی جائے تو کچھ عرصے بعد شکر کا تمام ذخیرہ ختم ہو جائے گا اور پھر چونکہ قوت پیدا کرنے کے لیے کوئی چیز موجود نہیں ہوگی، اس لیے عضلات ذرا بھی حرکت نہیں کر سکیں گے۔ لہٰذا عضلات حرکت پذیر ہونے کے بعد اعصاب کے ذریعے دماغ کے بعیدی کیسہ کو متحرک کن پیغامات بھیجتے ہیں کہ ہمیں شکر کی اشد ضرورت ہے۔ دماغ کا بعیدی کیسہ غدّہ سرگردئی کو حکم دیتا ہے کہ اپنے افراز کا ترشح شروع کر دو۔ یہاں یہ بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ دماغ محض بائیں طرف کے غدۂ سرگردئی کو حکم دیتا ہے اور یہ غدہ پھر اپنے دائیں سمت کے ساتھی کو دماغ کا پیام بذریعہ اعصاب اِرسال کرتا ہے اور دونوں مل کر ایڈرینلین کا ترشح شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ایڈرینلین جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے خون میں مل کر جگر تک پہنچتی ہے اور وہاں اس کے زیر اثر گلائیکوجن شکر انگوری میں تبدیل ہونے لگتی ہے۔ شکر انگوری خون میں حل ہو کر مختلف عضلات تک پہنچتی ہے اور وہاں اُن کے صرف میں آتی ہے۔

زمانۂ حال تک خون میں شکری اجزا کا ایک خاص تناسب سے برقرار رہنا ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ سمجھا جا رہا ہے اور اصلی معنوں میں تو یہ پیچیدگی اب شروع ہوئی ہے۔ آج دنیا کی مختلف زبانوں کا تمام لٹریچر جو اِس مسئلہ کے متعلق موجود ہے تقریباً سب کا سب بجائے اِس کے کہ عضلات کی شکر کو جذب کرنے کی خاصیت سے بحث کرے وہ بانقراس (Pancreas) سے بحث کرتا ہے بانقراس اثنا عشری آنت سے متصل ایک غدّہ ہے اس کی ساخت غددی بافت سے ہوئی ہے اور اس کی رطوبت ایک نالی کے ذریعے اثنا عشری آنت میں پہنچ کر انہضام غذا میں مدد دیتی ہے۔ بانقراس کی غددی بافت — Glandular Tissue) میں خوردبین کی مدد سے چند چھوٹے چھوٹے گول یا بیضوی جزیرے دیکھے جا سکتے ہیں۔ اِن جزیروں کو ان کے دریافت کنندہ کے نام پر لانگر ہان کے جزیرے کہا جاتا ہے

بول میں شکر کی مقدار ایک کلوگرام یومیہ کے حساب سے خارج ہوتی ہے۔ اس لیے بول میں شکر کی آمیزش تیسری علامت ہے۔

چوں کہ بدن کے (۵) عضلات شکر کو جذب کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ اس لیے غذا نہ ملنے سے وہ رفتہ رفتہ کمزور اور مضمحل ہونے لگتے ہیں۔ اگرچہ مریض کی خوراک میں کوئی کمی نہیں آتی اور وہ خوب کھاتا ہے لیکن نہ تو اس کی اشتہا کو تسکین ہوتی ہے اور نہ ہی وہ اپنے میں قوت توانائی محسوس کرتا ہے کیونکہ اس کی خوراک کے نشاستہ کے تمام اجزا جزو بدن ہوئے بغیر بول کے ہمراہ خارج ہوتے ہیں۔ مریض ایک ایسے آتش دان کے مانند ہوتا ہے جس میں خواہ کتنا ہی کوئلہ کیوں نہ جھونک دیا جائے وہ کبھی اچھی طرح گرم نہیں ہوتا لہٰذا اشتہا کی زیادتی بغیر حصول توانائی چوتھی علامت ہے۔

۶۔ کیوں کہ ذیابیطس کے مریض کے جسم میں شکر جزو بدن نہیں ہوتی۔ لہٰذا وہ خون میں جمع ہوتی رہتی ہے اور اس کی مقدار میں بتدریج اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ شکر کی افزونی کو روکنے



شکل بالا میں دکھایا گیا ہے کہ عضلات کس طرح جگر سے شکر انگوری حاصل کرتے ہیں۔ خوراک کی شکل میں نشاستہ معدہ میں پہنچتا ہے اور امعاء میں پہنچ کر شکر انگوری میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ شکر انگوری کو شکل بالا میں موٹے نقطوں سے دکھایا گیا ہے شکر انگوری خون میں حل ہو کر جگر میں پہنچتی ہے اور وہاں خلیات کبدی کے تخمیری عمل سے گلائیکوجن کی شکل اختیار کر کے جمع رہتی ہے۔ جب عضلات کو شکر کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ اعصاب کے ذریعے دماغ کے شکری مرکز کو پیغامات بھیجتے ہیں (شکل بالا میں ہندسے ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷ پیغامات کی تعداد کو ظاہر کرتے ہیں) دماغ غدہ سرگردہ کو ایڈرینلین کے اخراج کا حکم دیتا ہے۔ ایڈرینلین خون میں مل کر جگر میں پہنچتی ہے اور گلائیکوجن کو دوبارہ شکر انگوری میں تبدیل کر دیتی ہے۔ یہ شکر انگوری خون میں حل ہو کر عضلات تک پہنچتی ہے۔ جب عضلات کو حسب ضرورت شکر مہیا ہو جاتی ہے تو بانقراس کا افراز انسولین جگر میں گلائیکوجن کا شکر انگوری میں تبدیل ہونا بند کر دیتا ہے۔

کے لیے مریض کو ایسی غذا دی جاتی ہے جس میں نشاستہ یا شکر اجزا مفقود ہوں اور جو محض شحمی اور البومنی (…bl… اجزا پر مشتمل ہو لیکن … قسم کا تغذیہ دو خا… کا حامل ہوتا ہے۔ … تو البومن نشاستہ … اجزا سے بالکل پاک … ہوتا۔ البومن کے ا… پر شکر کے سالمات (… Molecules) کثیر تعداد میں بنتے ہ… ان کی مقدار البومن … پچاس فیصدی تک … ہو سکتی ہے۔ لہٰذا غیر … اور بالواسطہ طور پر … مریض کے جسم میں پہنچ… ہے اور اس طرح د… مطلب فوت ہو جا… جس کو مد نظر رکھ کر … کو البومن دی گئی … ثانیاً چونکہ غذا میں … کے اجزا نہیں ہوتے … غذا کے شحمی جز کو حل … کے لیے کافی آکسیجن … نہیں آتی (۷) ایسیٹو… نوشہ - …cetic Acid) … سے کاربن ڈائی آکسائڈ نکل کر اُسے ایسیٹون … میں تبدیل کر دیتی ہے۔ شحمی اجزا کے انہضام میں فتور آ جانے

سانس اور بول میں بجائے کاربن ڈائی آکسائڈ اور پانی کے ایسٹیون نکلنے لگتا ہے جس کی بو تازہ پھلوں کی بو کے مشابہ ہوتی ہے۔

ایسیٹو ایسیٹیک ترشہ۔ کاربن ڈائی آکسائڈ + ایسٹیون

$$CH_3\ COCH_2\ H = COO - CH_3\ COCH_2\ COOH.$$

ایسٹیون کا اخراج خطرہ سے خبردار کرنے والی علامت ہے جو بظاہر کرتی ہے کہ اجزائے شحمی کا آکسیجن سے مرکب ہونا بند ہو چکا ہے۔ اگر حالات بد سے بدتر ہونے لگیں تو جسم میں ایسٹیو ایسٹیک ترشہ کی مقدار اور بڑھ جاتی ہے۔

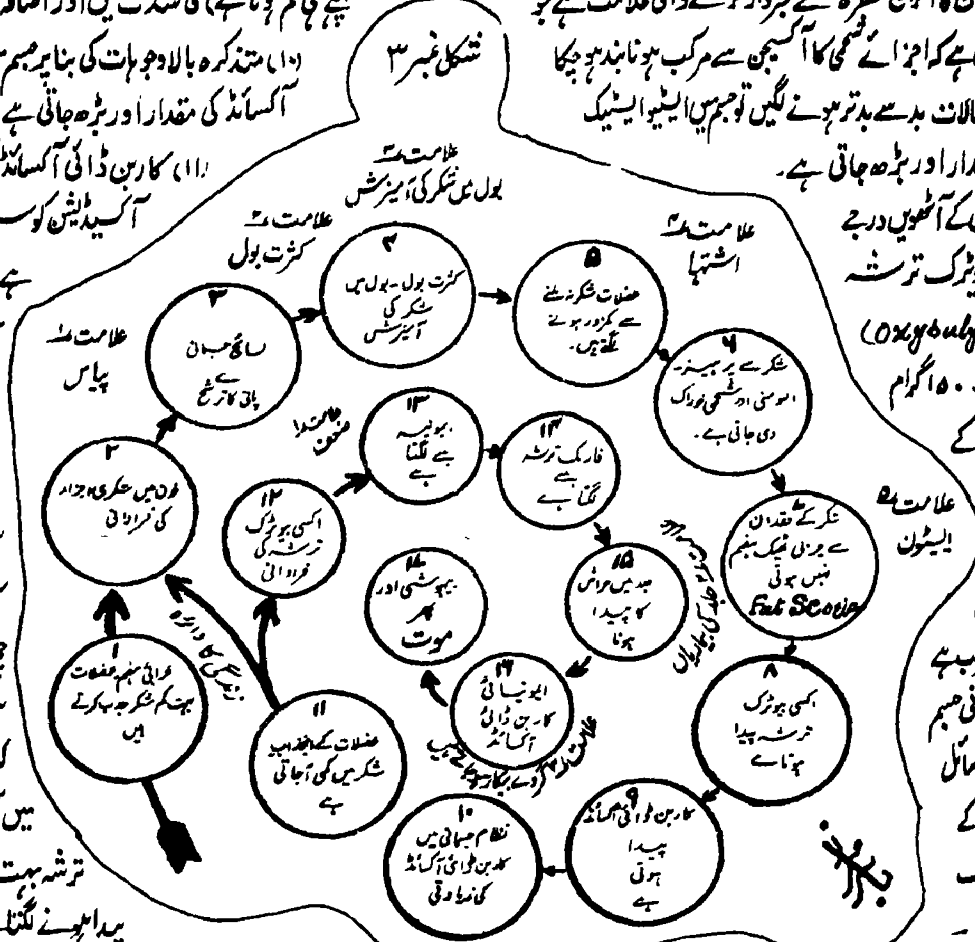
۸۔ مرض کے آٹھویں درجے میں آکسی بیوٹرک ترشہ (Oxybutyric Acid) ۱۵۰ گرام یومیہ بول کے ہمراہ خارج ہوتا ہے یہ بہت ہی زہریلا مرکب ہے اور انسانی جسم اپنے تمام وسائل سے اس کے خلاف جنگ کرتا ہے۔

۹۔ سب سے پہلے کھار کی مدد سے اس ترشہ کے اثر کو باطل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سوڈیم کاربونیٹ (Sodium Carbonate) کی جو مقدار جسم میں ہوتی ہے اس میں سے سوڈیم متذکرہ صدر مقصد کے لیے صرف میں آتی ہے۔ اس سے سوڈیم آکسی بیوٹریٹ (Sodium Oxybutrate) بن جاتا ہے اور یہ مرکب سمی صفات کا حامل نہیں ہوتا۔ اسی طرح آکسی بیوٹرک ایسیڈ سے تو نجات مل جاتی ہے لیکن بدن میں کاربن ڈائی آکسائڈ کی مقدار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ سوڈیم کاربونیٹ میں سے سوڈیم نکل جانے کے بعد کاربن ڈائی آکسائڈ کا بننا لازمی ہے۔ کاربن ڈائی آکسائڈ آلاتِ تنفس کے لیے سخت مضر ہے اور عمل آکسیڈیشن کو سست کر دیتی ہے۔ اس طرح مرض (جس میں آکسیڈیشن پہلے ہی کم ہوتا ہے) کی شدت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

(۱۰) متذکرہ بالا وجوہات کی بنا پر جسم میں کاربن ڈائی آکسائڈ کی مقدار اور بڑھ جاتی ہے۔

(۱۱) کاربن ڈائی آکسائڈ کی فراوانی عمل آکسیڈیشن کو سست کر دیتی ہے۔ اس لیے عضلات بہت ہی کم شکر جذب کرتے ہیں۔

۱۲۔ اب زندگی کا چکر اپنی گردش کا پہلا راستہ چھوڑ کر دوسری سمت اختیار کر لیتا ہے۔ جسم میں آکسی بیوٹرک ترشہ بہت کثیر تعداد میں پیدا ہونے لگتا ہے اور مریض کی حالت بہت نازک ہو جاتی ہے۔



۱۳۔ آکسی بیوٹرک ترشہ کے اثر کی مدافعت کے لیے چونکہ سوڈیم ناکافی ہوتا ہے اس لیے نسائج جسمانی کے دوسرے کھار (Alkalies) مثلاً کیلشیم، میگنیشیم حتیٰ کہ تیز ترین کھار امونیہ (Ammonia) سے امداد لی جاتی ہے۔ امونیہ کے حصول کے لیے البومن صرف میں آتی ہے اور البومن کے ضائع ہونے سے مریض کمزوری اور اضمحلال محسوس کرتا ہے۔ لہٰذا ضعف ان علامات میں سے پہلی علامت ہے

جو مرض کے آخری درجوں میں نمودار ہوتی ہیں۔ ایلو یہ آکسی بیوٹرک ترشہ اور کاربن ڈائی آکسائڈ دونوں کے فعل کو باطل کر دیتا ہے اور اس طرح جسم کو اِن سمیات کے تباہ کن اثرات سے تو نجات مل جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی البومن کے غیر ہضم شدہ ذرّات کے سڑنے سے جہاں ایلونیہ بنتا ہے وہیں آکسیڈیشن کی کمی کی بدولت چند اور مرکبات بھی ترتیب پاتے ہیں جو کہ خود زہریلے خواص کے حامل ہوتے ہیں۔ مثلاً فارمک ترشہ (Formic Acid) اور بیوٹرک ترشہ

(۱۴) - (۱۵) متذکرہ صدر بیوٹرک ترشہ اور فارمک ترشہ جسم سے جلد کے راستہ خارج ہوتے ہیں اور جلد میں ناقابل برداشت جلن پیدا کر دیتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد جلد میں ورم ہو کر کسی جگہ ناسور ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جلدی امراض اُن علامات میں سے دوسری علامت ہیں جو مرضِ ذیابیطس کے آخری درجوں میں نمودار ہوتی ہیں۔

(۱۶) البومن کے ذرّات (جو بدن میں کثیر تعداد میں جمع ہو چکے ہیں) کے سڑنے سے آکزیلک ترشہ (Oxalic Acid) بنتا ہے اور غیر طبعی مقدار میں جسم میں جمع ہو جاتا ہے۔ آکزیلک ترشہ گردے کی نلکیوں کو مسدود کر دیتا ہے اور اُن کی دیواروں میں خراش پیدا کرتا ہے۔ آکزیلک ترشہ سے کہیں زیادہ نقصان رساں ایلونیہ ثابت ہوتا ہے۔ ایلونیہ بھی البومن کے ذرات کے سڑنے سے ترکیب پاتا ہے اور یہ کاربن ڈائی آکسائڈ سے مل کر ایلونیائی کاربن ڈائی آکسائڈ (Ammoniated Carbon Dioxide) بناتا ہے۔ ایلونیائی کاربن ڈائی آکسائڈ گردوں کے لیے سم قاتل ہے۔ اس کے اثرات کے تحت گردے متورم ہو کر اپنا فعل چھوڑ دیتے ہیں۔ گردوں کا اپنا فعل چھوڑ دینا اُن علامات میں سے تیسری علامت ہے جو مرض ذیابیطس کے آخری درجوں میں ظاہر ہوتی ہیں۔

(۱۷) پیمانہ حیات اب لبریز ہو چکا ہے! خون میں طرح طرح کے زہریلے مادے کثیر مقدار میں شامل ہو گئے ہیں۔ مریض کچھ عرصہ شدید بے چینی اور اضطراب میں بسر کرتا ہے۔ پھر اس کا دم گھٹنے لگتا ہے اور تشنج کے دورے پڑتے ہیں اس کے بعد مریض پر بے ہوشی کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ اور پھر مرض اور مریض دونوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

ذیابیطس کے چنگل میں گرفتار انسان کی رہائی کی محض ایک صورت ہے وہ یہ کہ انسانی جسم کی بھٹی میں اس آگ کو جس کا ایندھن نشاستہ بنتا ہے خوب روشن رکھا جائے تاکہ وہ تمام زہریلے مرکبات جو جسم میں جمع ہوں اس آگ سے جل کر خاک ہو جائیں اور جسم انسانی غیر طبعی اثرات کا شکار نہ ہو سکے لیکن اس آگ کو محض انسولین کی مدد سے ہی روشن رکھا جا سکتا ہے۔ اگر ذیابیطس کے مریض کو جو اپنی زندگی کے مراحل نہایت سبک رفتاری سے طے کرتا ہوا موت کی منزل کی طرف گامزن ہوتا ہے انسولین کا انجکشن دے دیا جائے تو اس کی بیماری بہت بڑی حد تک دور ہو جاتی ہے اور اس کا عرصہ زندگی ایک مرتبہ پھر وسیع ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی کو اعجاز مسیحائی پر کچھ شبہ ہو، لیکن "اعجاز انسولین" ایک حقیقت ہے۔ انسولین کا انجکشن دیتے ہی عضلات خون سے شکر کو جذب کرنے لگتے ہیں۔ اجزائے شحمی پھر طبعی حالت میں آکسیجن سے مل کر نئی ترتیب پاتے ہیں۔ ایسیٹون، ایسیٹو ایسیٹک اور آکسی بیوٹرک ترشے تحلیل ہو کر کاربن ڈائی آکسائڈ اور پانی پیدا کرنے لگتے ہیں۔ البومن کے غیر ہضم شدہ زہریلے ذرّات غائب ہو جاتے ہیں اور مریض جو بیکسی اور بے چارگی کی حالت میں موت کا انتظار کر رہا تھا ایک دفعہ پھر اپنے میں طبعی حالات پا کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

(ملاحظہ ہو شکل نمبر ۲) پہلے آٹھ روز تک جسم سے بول کے ہمراہ اسی مقدار میں نشاستہ خارج ہوتا ہے جس مقدار میں وہ خوراک کے ذریعے جسم کے اندر پہنچتا ہے۔ ساتویں اور آٹھویں روز مریض کو اس خیال سے نشاستہ کی زیادہ مقدار دی جاتی ہے۔ (یعنی چالیس گرام) کہ شاید نشاستہ کا کچھ حصہ اُس کے جزو بدن ہو سکے لیکن نتیجہ برعکس نکلتا ہے کیوں کہ نویں اور دسویں روز شکر کی وہ مقدار جو بول کے ہمراہ خارج ہوتی ہے، اس مقدار سے کہیں زیادہ ہوتی ہے جو مریض کے جسم میں خوراک کے

ہمراہ پہنچتی ہے۔

گیارہویں روز انسولین سے مرض کا علاج شروع ہوتا ہے اور اس روز مریض کو پہلے دس یوم کے مقابلے میں کہیں زیادہ نشاستہ دیا جاتا ہے اور یہ مقدار بتدریج بڑھائی جاتی ہے لیکن انسولین کے اثرات کے تحت شکر کا اخراج بتدریج کم ہوتا جاتا ہے اور آخر کار بالکل بند ہوجاتا ہے۔

یہ ہے انسولین کا معجزہ جو ثابت کر دیتا ہے کہ انسولین زمانۂ حال کی سب سے زود اثر اور سب سے حیرت ناک دوا ہے۔ لیکن ہمیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ انسولین مرض ذیابیطس کا مکمل علاج نہیں، بلکہ محض مریض کے ایام زندگی کو طویل بنا دیتی ہے۔

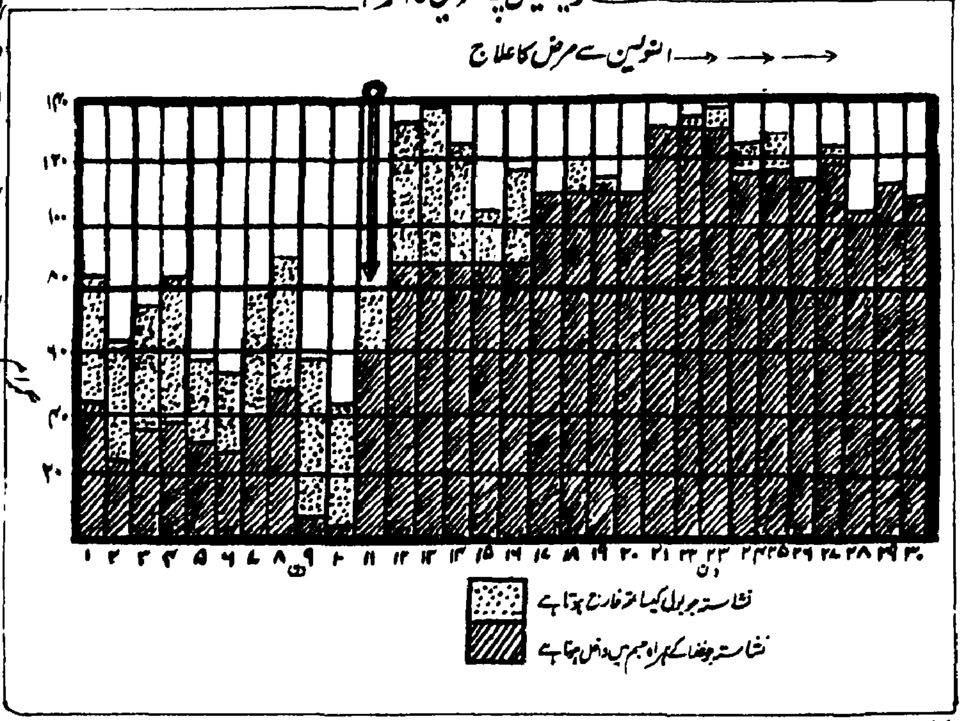
مرض ذیابیطس کافی عام ہے لیکن عموماً یہ مرض مہلک ثابت نہیں ہوتا بشرطیکہ کسی ہوشیار معالج سے رجوع کیا جائے۔ وہ مریض جو پوری طرح احتیاط برتتے ہیں، اس مرض سے نہیں مرتے حتیٰ کہ ان کی زندگی یا تو کسی حادثہ یا کسی اور مرض سے ختم ہوجائے یا وہ طبعی موت کا سامنا کریں۔ ان مریضوں کی تعداد جن کا مرض لا علاج ہو جاتا ہے پانچ فیصدی سے زیادہ نہیں ہوتی اور یہ امر مریضان ذیابیطس کی تسلی کا باعث ہونا چاہیے اور حقیقت تو یہ ہے کہ خواہ کوئی سرسام سے راہی ملک عدم ہو، یا حرکت قلب بند ہوجانے سے داعیٔ اجل کو لبیک کہے، یا ذیابیطس کی بدولت اس دنیا سے کوچ کرے بات ایک ہی ہے کیونکہ ہمیں سب کو ایک نہ ایک دن شربتِ مرگ پینا ہی پڑے گا جب موت کی دیوی ہم سے بغل گیر ہو کر اپنے سرد ہونٹوں سے ہمارا بوسہ لے کر کہے گی کہ

"میرے پیچھے چلے آؤ۔"

تو جانا ہی پڑے گا۔ لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے۔ اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے۔" ذیابیطس کے مریض کو جس کا خون شکر کی موجودگی سے بہت شیریں ہو گیا ہے، اپنی زندگی کو موت کے غم سے تلخ نہیں کرنا چاہیے۔

شکل نمبر ۴

ذیابیطس پر انسولین کا اثر



"فرائض شرعی کے بعد حلال روزی کا حاصل کرنا فرض ہے۔" مشکوٰۃ ص ۲۴۲

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۷۔ شمارہ ۱۱ (نومبر ۸۸ء)

رشید صاحب کے دو خط

اطہر صدیقی*

جب اس سال یومِ رشید کی محفل کا دعوت نامہ مجھے موصول ہوا تو میں نے اس کو اردو ڈپارٹمنٹ کے ارباب حل وعقد کی ایک اور نوازش جانا۔ حامل رقعہ کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ضرور حاضر ہونے کی کوشش کروں گا۔ لیکن وہ صاحب کھڑے رہے اور قدرے تأمل کے بعد بولے :

مقالہ لینے کب حاضر ہو جاؤں ؟"

پہلے میں نے ان کو غور سے دیکھا پھر اپنے کو کسی آئینے میں دیکھنا چاہا کہ یہ بات مجھ ہی سے کہی جا رہی ہے یا کسی اور سے ! دوبارہ دعوت نامہ کھولا اور غور سے پڑھا۔ پتہ چلا کہ "یوم رشید" پر مجھے مقالہ لکھنا ہے ! اور دعوت نامہ پر دستخط بلاشبہ پروفیسر قاضی عبدالستار صاحب چیرمین اردو ڈپارٹمنٹ کے تھے۔

قاضی صاحب سے میرے تعلقات پچھلے ۲۰-۲۲ سال سے ہیں اور میں ان کو پایہ کا ناول نگار مانتا ہوں لیکن میری اہلیتوں کو اس لمبے عرصے میں نہ پہچان سکنے پر ان کے مردم شناس ہونے پر شک ضرور کرنے لگا۔ ایسا لگتا ہے کہ قاضی صاحب نے کسی چشمک کا بدلہ لینے کو مجھے سربازار رسوا کرنے کی نہایت خوبصورت ترکیب نکالی اور میری سادہ لوحی دیکھیے کہ میں یہاں آپ کے سامنے رشید صاحب جیسی عظیم شخصیت پر کچھ کہنے کی جرأت بھی کر بیٹھا۔ کہاں میں سائنس کا طالب علم اور کہاں رشید صاحب ! میں نے مانا کہ میں رشید صاحب کے پڑوس میں ۱۲ سال رہا ہوں۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ رشید صاحب کے گھر میں میرا آنا جانا عزیزوں اور رشتہ داروں سے بڑھ کر رہا ہے لیکن یہ سب کچھ اس بات کی ضمانت تو نہیں دیتا کہ میں رشید صاحب پر مقالہ لکھ دوں۔ اس کے لیے پہلے تو اردو زبان پر قدرت ہونا ضروری ہے۔ بعد ازاں جس پر آپ کچھ لکھ رہے ہوں اس سے خاص قربت ہونا بھی لازمی ہے۔ میں رشید صاحب سے ان کی تحریروں کے ذریعے زیادہ اور ذات سے کم واقف تھا۔

دراصل جب میں رشید صاحب کے پڑوس میں آیا (یعنی ۱۹۶۲ء میں) تو وہ رٹائر ہو کر تقریباً گوشہ نشین ہو چکے تھے اور صرف چند "محرموں" سے ہی ملتے تھے جن میں مسعود حسین خاں صاحب، اسلوب انصاری صاحب اور ان جیسے ہی چند اور لوگ شامل تھے۔ میں اور میرے گھر والے گو کہ نہایت بے تکلفی سے وقت بے وقت ان کے یہاں چلے جاتے لیکن رشید صاحب جب کبھی سامنے پڑ جاتے تو بالکل اس طرح سے منہ پھیر لیتے جیسے پڑوس کی کوئی لڑکی کسی نامحرم یا محلے کے کسی لڑکے کو دیکھ کر شرما جائے اور اگر کہیں چھپ نہ سکے تو کم از کم کسی اور طرف دیکھنے لگے۔ ان کی اس محجوبیت کو برقرار رکھنے کے لیے میں بھی ان کے پائیں باغ یا صحن یا برآمدے سے ایسے گزر جاتا کہ انھیں محسوس ہی

* ڈین فیکلٹی آف لائف سائنس۔ اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

ہو کہ میں نے ان کو دیکھا ہے۔ ویسے برسوں یہ خواہش رہی کہ کاش رشید صاحب چند ہی لمحوں کو پاس بیٹھنے یا بات کرنے کا موقع دیتے۔ لیکن یہ سعادت بھی میرے نصیب میں نہیں تھی۔ اس طرح رشید صاحب کو اچھی طرح جاننے کی یا اُن کے متعلق کچھ معلوم ہونے کی نوبت ہی نہ آئی۔ اب میں ان کے متعلق کیا کہوں۔ مقالہ لکھنا تو درکنار میں تو اُن کی ذات کے بارے میں بھی کچھ زیادہ کہنے کا مستحق نہیں ہوں۔ سوائے اس کے کہ جو تھوڑا بہت ۱۲ سال ہی بعد دور سے ان کو جان کر سمجھ پایا تھا وہ آپ کے سامنے پیش کر دوں یہ بھی اس لیے کہ قاضی صاحب کی بات رکھ لوں۔ اس میں کس حد تک خاطر خواہ کامیابی ہوئی ہے۔ یہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔

رشید صاحب کی طرح Capricornian صدیقی اور معلم ہونے کے علاوہ میرا بھی حساب بے حد کمزور ہے رشید صاحب نے اپنی اس کمزوری کا ذکر اپنے مضامین میں کئی جگہ کیا ہے۔ حساب میں کمزوری پر مجھے چیخوف کی ایک کہانی یاد آتی ہے جس میں ایک شخص اپنی بلی کے بچے کو شروع ہی سے چوہا پکڑنا سکھاتا ہے اور ہر مرتبہ جب بلی کا بچہ چوہا نہیں پکڑ پاتا تو اسے مارتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ جب وہ بلی کا بچہ بڑا ہو کر نہایت موٹا تازہ بلا بن گیا تب بھی چوہا کو دیکھ کر اسی طرح خوف سے لرز جاتا جس طرح وہ بچپن میں لرزتا تھا۔ میرا اب بھی حساب کے سوال کو دیکھ کر لرزنا اور کانپ اُٹھنا تو خیر میرے والد صاحب کے حساب سکھانے کے سر جاتا ہے لیکن رشید صاحب نے اپنے حساب کی کمزوری کی وجہ نہیں بیان کی۔ اس لیے میں بھی اس پر مزید روشنی نہیں ڈال سکتا۔

۱۲ سال کے عرصے میں رشید صاحب سے شاید بارہ [۱۲] ہی مرتبہ آمنا سامنا ہوا ہوگا۔ اس لیے یہ جاننا کہ وہ میرے متعلق یا اور ملنے والوں کے متعلق کیا محسوس کرتے تھے، مشکل ہے میں یہی سمجھتا رہا کہ وہ ایک گوشہ نشین انسان تھے اور لوگوں سے زیادہ ملنے جلنے کے قایل نہیں تھے۔ لیکن میرا یہ خیال غلط نکلا۔ وہ بہت دور رہ کر بھی دوسروں سے قریب تھے۔ ان کے لیے خلوص محبت اور دوستی کے جذبات رکھتے تھے۔ اس بات کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب ۱۹۷۲ء میں میرے والد کا انتقال کراچی میں ہوا اور ایسے وقت میں جب کراچی جانا بند تھا۔ اس وقت رشید صاحب نے مجھے درج ذیل تعزیتی خط بھیجا۔ اس خط کے مضمون سے رشید صاحب کی شخصیت کا یہ پہلو واضح ہو کر سامنے آتا ہے کہ وہ باوجود گوشہ نشین ہونے کے دوسروں سے کس قدر دلی تعلق رکھتے تھے۔ وہ عظیم اور پایہ کے انشا پرداز ہونے کے علاوہ سینے میں ایک دردمند دل بھی رکھتے تھے۔ ان کا خط پاکر مجھے ان کی انسان دوستی اور ایک دم چونکا دینے کی حد تک قربت کا احساس پیدا ہوا۔ اس کے علاوہ علی گڑھ برادری میں جو ایک دوسرے کے غم میں شریک ہو کر غم بانٹ لینے کا مثبت پہلو ہے اس پر بھی انھوں نے اشارہ کیا ہے۔

خط ملاحظہ ہو:—

جمعرات ۲ر نومبر ۱۹۷۲ء

مشفق۔ سلام و رحمت۔ سانحہ کی خبر کل معلوم ہو گئی تھی۔ میرے لیے آپ تک پہنچنا اب دشوار ہونے لگا ہے، تقریبًا ناممکن، اس لیے آپ سے قریب تر ہونے اور آپ کے غم میں شریک ہونے کی جو تقویت اور یگانت بجائے خود مجھے محسوس ہوتی اس سے محروم رہا لیکن یونیورسٹی میں ہم سب ایک دوسرے سے اتنے قریب اور ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک رہتے ہیں کہ دوری کا احساس نہیں ہوتا آپ پر اس سانحہ کا جو اثر ہوا ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ حادثے جتنے المناک ہوتے ہیں اتنے ہی ناگزیر ہوتے ہیں جیسے روزمرہ کی باتیں ہوتی ہیں، لیکن جن پر گزرتی ہے ان پر تو قیامت گزر جاتی ہے۔ باپ سب کے مفارقت

کرتے ہیں لیکن اس سعادت مند بیٹے سے پوچھیے جسے یہ سانحہ پیش آیا ہو تو معلوم ہو گا کہ مفارقت دوام کسے کہتے ہیں ! باپ کی شفقت اور شادمانی کی کیسی کیسی یادیں ذہن میں ہجوم کر کے آتی ہیں اور بے قرار کر جاتی ہیں جیسے وہ آج ہی یاد آنے کے لیے حافظہ میں گوشہ گیر تھیں ۔

ہندوستان اور پاکستان کے کیسے ناگفتہ بہ تعلقات ہو گئے ہیں کہ ایسے موقع پر جلد سے جلد پہنچ نہیں سکتے تاکہ دوسرے عزیزوں اور بزرگوں سے مل کر ایک دوسرے کی تقویت اور تسلی کا باعث ہو سکیں اور جو بن پڑے وہ کر سکیں۔ یہ صورت حال اور حسرت بھی کتنی دردناک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہر طرح کی فراغت اور نیک نامی عطا فرمائی ہے۔ خیال آتا ہو گا کہ حالات سازگار ہوتے اور یہ حادثہ پیش نہ آیا ہوتا تو اپنے سارے ذرائع اور وسائل کو جب تک ہو سکتا باپ کی خدمت کے لیے وقف رکھتے لیکن اللہ کی مرضی ہمارے چاہنے نہ چاہنے سے کہیں بلند و برتر ہوتی ہے۔ اس لیے دنیا کے بڑے سے بڑے اور اچھے سے اچھے لوگوں نے ہر زمانے میں اور ہر حال میں متفق ہو کر ہدایت کی ہے کہ رضائے الٰہی کی تعمیل میں سر جھکا دینا چاہیے۔ اسی میں انسان کے لیے فوز و فلاح ہے۔

آپ کا اچھا چاہنے والوں کی دعا ہے کہ خدا مرحوم کو اپنی رحمت کے سائے اور ٹھنڈک میں جگہ دے اور آپ سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

آپ کے درد و غم میں شریک مخلص
رشید احمد صدیقی

دوسرا خط رشید صاحب نے مجھے اس وقت لکھا تھا جب پیرا سائٹولوجی (Parasitology) پر میرا ایک مقالہ ہندوستان ٹائمز کی سنڈے میگزین میں شائع ہوا تھا پیراسائٹ (Parasite) طفیلیہ کا لفظ قدیم یونان میں ان لوگوں کے لیے رائج تھا جو رؤسا کی تعریف اور خوشامد کر کے اپنے دو وقت کے کھانے کا انتظام کرتے تھے اور پیراسی ٹوس (Parasitos) کہلاتے تھے۔ علم الحیاتیات میں طفیلیے (Parasite) ان چھوٹے چھوٹے کیڑوں کو کہتے ہیں جو بڑے جانوروں اور انسانوں کے جسم سے اپنی غذا حاصل کرتے ہیں اور اس عمل میں خلصے پیدا ہو جاتے ہیں۔ معمولی دوائیں وغیرہ ان پر اثر نہیں کرتیں۔

رشید صاحب کو نہ صرف میرا مضمون پسند آیا تھا بلکہ ان کے اس خط سے جو انھوں نے اس مضمون کی توصیف میں مجھے لکھا اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ انھیں سائنس کے مضامین سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ ان کا خط اس بات کی غمازی بھی کرتا ہے کہ جہاں بھی ممکن ہو ایک معلم کو نوجوانوں کی ہمت افزائی کرنا چاہیے۔ اردو سے محبت اور اس میں سائنس کے عام فہم مضامین لکھے جانے کی خواہش کا جذبہ بھی کارفرما ملتا ہے اور اس خط میں ان کے طنز و مزاح کی جھلک بھی شامل ہے۔ آخری حصے میں یونیورسٹی کے دشمنوں (طفیلیوں) کی طرف اشارہ ہمارے حسب حال ہے۔ ماضی میں بھی تھا اور مستقبل میں بھی ہو گا۔ اس سے ہم لوگوں کو کسی طرح بھی دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیے۔

خط ملاحظہ ہو :-

۲۵ مئی ۷۲ء

اطہر صاحب ۔ بسلامت وقت ۔ آپ کے کرم سے ہندوستان ٹائمز میں آپ کا مضمون Parasites (طفیلیوں) پر پڑھنے کا موقع ملا۔ اس کے ہم صفت ہونے کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ میری سمجھ میں بھی آیا اور خوش بھی ہوا۔ مجھ سے بہتر سمجھ والوں کے نزدیک بھی اتنا ہی اچھا ہو تو عجب نہیں۔ ایسے سائنسی مضامین انگریزی میں دیکھنے میں آتے ہیں

تو ذہن فی الفور اردو کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس کا ترجمہ یونیورسٹی کے رسالہ فکر و نظر میں کیوں نہ شائع ہو جو فی صفحہ پانچ روپیہ بطور معاوضہ پیش کرتا ہے اور اس کے منتظمین ایسے مضامین کے لیے برابر کوشاں رہتے ہیں لیکن کامیابی نہیں ہوتی آپ کا یہ مضمون معیاری، جامع، معلومات افزا اور مفید عام ہے۔ آپ کو اچھی اردو آتی ہے۔ مضمون بھی مختصر ہے، کیوں نہ اسے اردو میں منتقل کر دیجیے۔ ترجمہ کی اتنی ضرورت نہیں ہے۔ اردو میں Render (منتقل کر دینا بالکل کافی ہوگا۔ فکر و نظر میں بڑی خوبصورتی سے شائع ہو جائے گا۔ معاوضہ کسی شریف آدمی کو دے دیجیے گا جس کے ہاں طرح طرح کے Parasites (طفیلیے) پرورش پا رہے ہوں۔ غریب کے خربزے اور آم کے دو ایک دن آپ کے طفیل اچھے گزر جائیں گے۔

کبھی فرصت ہو تو Parasites کے نسب نامہ یا جنم پتر دیکھ کر بتلایئے گا کہ ہماری آپ کی یونیورسٹی کے Black - یا Bungles mailers کس قبیلے کی زد یا رحم و کرم پر ہے۔ عام طور پر یہ خبر عام ہے کہ یہ چاہے جس قبیلے کے ہوں ہر دوا دارو Germicide سے Immune (محفوظ مصئون) ہو چکے ہیں۔

امید ہے آپ مسرور و مع الخیر ہوں گے۔ باوجود موسم کی تاخت اور نازبائیوں کے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی۔

مکرر عرض ہے

مستند اور مفید سائنسی مضامین کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ ایک روایت ہے جو سرسید اور تہذیب الاخلاق اور سائنٹفک گزٹ کے عہد سے چلی آ رہی ہے اس پر آپ عمل کریں گے تو دوسرے بھی آپ کی تقلید کریں گے۔

رشید صاحب کے ان دونوں خطوط کو اس محفلِ دانشورانِ اردو اور شناسانِ رشید احمد صدیقی میں پیش کرنے سے رشید صاحب کی ذات پر تو یقیناً روشنی پڑتی ہے لیکن مجھ جیسے اردو سے بے بہرہ اور نا اہل کو رشید صاحب کی انسان دوستی، کرم فرمائی، عظمت، قابلیت اور علمیت پر کچھ کہنے کی جرأت کرنا آفتاب کو روشنی دکھانے کے مترادف ہے۔

دراصل رشید صاحب کی ذات اور اُن کے خطوط کو ذریعۂ عزت بنا کر مجھے خود انعکاسی کا موقع مل گیا۔ اس کے لیے میں پروفیسر قاضی عبدالستار صاحب اور امتیاز احمد صاحب کا مشکور رہوں۔

سید صاحب کا سفر پاکستان

ابو علی اثری *

[۲۲ر نومبر ۱۹۸۸ء کو مولانا سید سلیمان ندوی کے انتقال کو پینتیس ۳۵ برس ہو جائیں گے۔ سید صاحب کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے جو قلبی لگاؤ تھا، اس کے اعتراف کے طور پر تہذیب الاخلاق نومبر کے شمارے میں مولانا ابو علی اثری کا درج ذیل مقالہ شائع کر رہا ہے۔ ——— (ادارہ) ———]

سید صاحب کے سفر پاکستان پر پہلے صدق جدید لکھنؤ میں، پھر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند میں میرے قلم سے الگ الگ دو مضمون شائع ہوئے تھے۔ ان میں میں نے سید صاحب کی زندگی کے آخری خط سے جو وہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام اپنے لائق صاحبزادے سید سلمان سلمہٗ سے لکھوا رہے تھے کہ ضعف غالب آگیا اور وہ پورا نہ ہو سکا، ثابت کیا ہے کہ سید صاحب پر پاکستان میں آباد ہونے کا اتہام تمام تر نیشنلسٹ پریس کی بدباطنی کا نتیجہ ہے، جس کی سرے سے کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس ناتمام خط کو سید سلمان نے مولانا دریابادی کے پاس بھیج دیا، اور انھوں نے تبرک سمجھ کر اپنی مرتبہ مکاتیب سلیمانی کی دوسری جلد کے دوسرے ضمیمہ میں جوں کا توں شائع کر دیا، جو سید صاحب کے سفر پاکستان سے متعلق ایک اہم تاریخی دستاویز ہے، ذیل کی چند سطریں اس سفر سے متعلق قارئین کی خدمت میں پیش ہیں۔ اس سے مقصود یہ معلوم کرنا ہے کہ سید صاحب کے دشمنوں، معاندوں، بدخواہوں، حاسدوں نے جو کچھ کیا وہ تو کیا، خود مخلصوں، بہی خواہوں، دوستوں اور اپنوں نے اس سلسلہ میں کیا رول ادا کیا، تاکہ ان کے سوانح حیات کا یہ خلا بھی پُر ہو جائے اور ان کی زندگی کا کوئی گوشہ تشنہ نہ رہ جائے۔

پاکستان کا سفر تو سید صاحب نے بلاشبہ ذاتی ضرورت سے کیا تھا اور دو بچیوں کے ایک ساتھ بیمار پڑ جانے کی خبر نے ان کو بے چین اور مضطرب کر دیا اور وہ بادل ناخواستہ پاکستان جانے کے لیے تیار ہو گئے، اور اس کے لیے اتفاق سے ایک تقریب بھی نکل آئی اور وہ پاکستان پہنچ گئے، اور اس سفر کے پورے اخراجات انھوں نے خود اپنی جیب سے ادا کیے اور اس سلسلے میں کسی کا بھی ان کو زیر بار احسان نہیں ہونا پڑا۔ شروع ہی سے لوگ اپنے عزیزوں سے ملنے پاکستان جاتے ہیں۔ اسی طرح جب سید صاحب کو بھی اپنی بچیوں کی علالت کی خبر ملی تو وہ بھی اور لوگوں کی طرح عازم پاکستان ہو گئے، اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی، جس طرح اور لوگ وہاں جا کر واپس چلے آتے ہیں اور ان کے لیے کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی اسی طرح

---

* دار المصنفین، اعظم گڑھ ۔ یو۔ پی

بچیوں کے اچھے ہو جانے اور ان کی صحت کی طرف سے پورے طور پر مطمئن ہو جانے کے بعد وہ بھی ہندوستان واپس آجاتے۔ ہندوستان کے ہائی کمشنر کے دفتر کو اس میں کوئی چوں وچرا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر وہ سیاسی نہیں خالص علمی آدمی تھے، جن کے مشاغل علم و ادب کی خدمت تک محدود تھے اور سوائے لکھنے پڑھنے کے اور کسی کام سے سروکار نہیں تھا۔ یوں تو اُن کے حلقۂ احباب میں ہر شعبۂ زندگی کے مشاہیر و اعیان شامل تھے لیکن ان کے تعلقات اہلِ علم اور اصحابِ قلم ہی سے زیادہ تھے۔ اور ان میں مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی پارسی، یورپین، امریکن، ایشیائی، عرب، غیرعرب سب ہی سے مکاتبت و مراسلت کا سلسلہ بھی قایم تھا۔ سیاست سے عملاً کسی دور میں بھی ان کو دلچسپی نہیں تھی، نہ اس کا وہ ذوق ہی رکھتے تھے۔ ان کے پاکستان سے واپس آنے پر ہائی کمشنر کے دفتر والوں نے کیوں روک ٹوک کی، کم از کم ان کی اصل حیثیت تو ان کو سمجھ لینی چاہیے تھی۔ خیرسگالی کا جو وفد پاکستان گیا تھا، اس میں شامل ہونے کے لیے اُن کا بھی انتخاب ہوا تھا۔ جس کی اطلاع ان کو ایسے وقت ملی کہ جب وہ دلّی گئے، تو وفدِ پاکستان دلی سے روانہ ہو چکا تھا اور وہ اس میں شامل نہ ہو سکے اور جب وہ خود پاکستان پہنچے تو وفد وہاں کا دورہ کر کے ہندوستان روانہ ہو چکا تھا۔ اس پس منظر میں ان کی راہ میں جو رکاوٹ پیدا کی گئی اس کو سوائے بوالعجبی کے اور کس چیز سے تعبیر کیا جاسکتا ہے؟ اس طرح کے خیرسگالی کے وفود میں جو دوسرے ملکوں میں بھیجے جاتے ہیں، قابلِ اعتماد اشخاص ہی کو شامل کیا جاتا ہے۔ یہی تو اس میں شامل ہونے کے لیے سید صاحب پر اعتماد کیا گیا اور ان کا انتخاب بھی کیا گیا اور تار کے ذریعے ان کو باقاعدہ اس کی اطلاع بھی دی گئی، لیکن پاکستان پہنچنے کے بعد ان پر سے اعتماد اُٹھا لیا گیا اور ان کی ذات کے ساتھ ایسی باتیں منسوب کر دی گئیں جن کو انھوں نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا۔ پھر بھی دار المصنفین کے ذمہ داروں کو پاکستان سے واپس لانے میں کوشش کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھنا چاہیے تھا جیسے کہ مولانا حسین احمد مغفرلہٗ، مولانا قاری محمد طیب صاحب کو جو پاکستان چلے گئے

تھے اور وہاں کے شہری ہو گئے تھے، پنڈت جواہر لال نہرو وزیراعظم ہند کے ذریعے وہاں کی شہریت ختم کرا کے دوبارہ ہندوستان لائے اور ان کو یہاں کا شہری بنایا اور دار العلوم کا اہتمام اُن کے سپرد کیا۔ اب کسی کو خیال بھی نہیں گزرتا ہوگا کہ یہ بھی پاکستان گئے ہوں گے اور وہاں کے شہری ہو گئے ہوں گے۔ اگر سید صاحب کے ساتھ اخلاص ہوتا تو یہی سب کچھ ان کے لیے بھی کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت پنڈت جواہر لال نہرو بھی زندہ تھے، مولانا ابو الکلام آزاد بھی زندہ تھے اور رفیع احمد قدوائی بھی زندہ تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے پاس بہت اہم پورٹ فولیو تھے۔ جواہر لال نہرو تو وزیراعظم ہی تھے ان سب سے سید صاحب کے بہت غیرمعمولی تعلقات تھے اور وہ ان کے سیاسی نظریات سے پورے طور سے واقف بھی تھے اور اسی کے ساتھ ان کے فضل و کمال کے قدردان بھی۔ پھر سید صاحب ایک زمانے میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی رہ چکے تھے اور ان کا انتخاب احمد آباد کانگریس اجلاس کے موقع پر، جس کے صدر حکیم اجمل خاں تھے، خود گاندھی جی نے اپنی پسند سے کیا تھا۔ اگر ان حضرات کے ذریعے خلوص کے ساتھ کوشش کی جاتی تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ سید صاحب واپس نہ آتے۔ اگر پاکستان میں مختلف حلقوں کی طرف سے اُن کا پرجوش خیرمقدم ہوا، ان کے شایانِ شان ان کا اعزاز واکرام ہوا، ان کی آمد کی خوشی میں طرح طرح سے لوگوں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا، بیانات دیے، جلسے کیے، خیرمقدمی نظمیں لکھیں، اخبارات نے اداریے لکھے تو یہ نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے عالمِ اسلام کے ایک زبردست عالم، اردو زبان کے ایک عظیم مصنف، وقت کے ایک ممتاز سیرت نگار اور دار المصنفین جیسے ایک عالمی تصنیفی ادارے کے بانی اور ناظمِ اعلیٰ کی حیثیت سے ہوا۔ وہ جس ملک میں بھی جاتے، ان کا اسی طرح اعزاز واکرام ہوتا۔ اگر پاکستان میں ہوا تو تعجب کی کیا بات ہے۔ اس گرم جوشانہ پذیرائی اور پُرخلوص استقبال سے یہ نتیجہ کہاں نکلتا ہے کہ سید صاحب نے اپنے محبوب وطن پر جہاں اُن کا سب کچھ تھا، جس کے لیے انھوں نے مسلسل قلمی جہاد کیا، زندگی بھر کانگریس کے نظریات کے ہم آہنگ

رہے، پاکستان کو ترجیح دے دی اور وہاں خدانخواستہ بسنے اور آباد ہونے کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ یہ سراسر ہندوستان کے ہائی کمشنر کے دفتر کی بدگمانیاں تھیں۔ ان کا کوئی تعلق حقیقت اور واقعیت سے نہیں تھا۔ اگر اس ظلم کی طرف پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کو توجہ دلائی جاتی تو یہ حضرات اس پر ضرور عمل کرتے اور ان کی وہاں سے واپسی کی کوئی شکل ضرور سوچتے۔ اس کام کو ایک مہم کے طور پر انجام دینا چاہیے تھا اور جب تک یہ کام پورا انجام نہ پا جاتا، نچلا بیٹھنا نہیں چاہیے تھا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ دارالمصنفین کے اس وقت کے ذمہ داروں نے اس سلسلے میں کیا کوششیں کیں کتنی مرتبہ دہلی جا کر جواہر لال سے ملے، مولانا ابوالکلام آزاد سے ملے۔ حکومت کے دوسرے ذمہ داروں سے ملے، ان کی صفائی میں کتنے بیانات دیے، خود معارف میں کتنا لکھا گیا؟

لوگ کہتے ہیں کہ خود مولانا مسعود علی ندوی جن کے پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد اور رفیع احمد قدوائی سے براہ راست تعلقات تھے اور بارہا وہ نہرو خاندان کی میزبانی کا شرف بھی حاصل کر چکے تھے۔ ان کو پاکستان سے واپس بلانا پسند نہیں کرتے تھے کہ ان کے دارالمصنفین میں کوس لمن الملک کے بجنے میں فرق آجاتا۔ وہ اس کے بلا شرکت غیرے مالک رہنا چاہتے تھے اور وہ کہتے بھی تھے کہ "دارالمصنفین کو دارالمصنفین بنانے میں میرا دخل ہے۔ اس سلسلے میں میری خدمات سید صاحب سے بہت زیادہ ہیں۔ سید صاحب تو زیادہ تر باہر رہتے تھے۔ آج مدراس میں ہیں، کل بمبئی میں اور پرسوں کہیں اور، دارالمصنفین کے تعلق کے زمانے میں ان کے سفروں کا طویل سلسلہ آخر وقت تک قائم رہا اور میں ان کی عدم موجودگی میں دارالمصنفین کا اندرونی نظام قائم کیے ہوئے تھا اور اس میں فرق نہ آنے دیا۔"

اگر یہ صحیح ہے تو کیا دارالمصنفین کے اندر کے لوگ بھی خدانخواستہ ان کا پاکستان سے آنا پسند نہیں کرتے تھے۔ خود ان کی کوششوں کا ریکارڈ کیا ہے، ان کی جد و جہد کی روداد کیا ہے، ان کی تگ و دو کی تفصیل کیا ہے؟ دارالمصنفین کی ایک مجلس انتظامیہ بھی ہے جس کے ممبر ملک کے با اثر حضرات بھی ہیں۔ ان لوگوں نے کیا کوششیں کیں اور اپنے اثرات کہاں تک استعمال کیے۔ ان سب کا تاریخ کے صفحات میں آنا ضروری ہے۔

کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ سید صاحب کے ان کی مر کے خلاف قیام کا جو حادثہ پیش آیا اس پر صبر کر لیا گیا اورا کی وہاں سے واپسی کی کوشش کو ضروری نہیں سمجھا گیا اور فور دوسرا انتظام قائم کر لیا گیا اور اس پر سید صاحب سے مہر تصدیق بھی ثبت کرا لی گئی اور ان کی اپنی زبان سے یہ بھی کہلوا دیا گیا "میں نے اپنے بعد کا نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا" مگر ان کے دل پر بیت گئی ہوگی، اس کا اندازہ بھی ہر شخص کر سکتا ہے۔ معارف کے فائل سے ان کا نام بھی نکال دیا گیا۔ گو اس کا اعتراف نہ کیا جائے لیکن اس سے معارف کی ساکھ پر ضرور اثر پڑا ہوگا۔ لوگ معارف کے محققانہ، عالمانہ، فاضلانہ اور فنی مضامین تو بہت کم پڑھتے تھے سید صاحب کے شذرات اور وفیات کے تحت ان کی نگارشات بڑی دلچسپی اور شوق سے پڑھتے تھے۔ وفیات کو تو ایسی مقبولیت حاصل ہو گئی تھی کہ بہت سے لوگوں کے دلوں میں یہ تمنا پیدا ہو جاتی تھی کہ کاش ہم سید صاحب کی زندگی میں مرتے اور سید صاحب ہمارا مرثیہ لکھتے۔ ان کے شذرات کو بھی اسی طرح کی مقبولیت حاصل تھی۔ اس کے تیر و نشتر سے لوگوں کے دل برما جاتے تھے۔ یہ اردو ادب کی ایک نئی صنف قرار پا گئی تھی اور جو بھی شخص یہ رسالہ دیکھتا تھا اپنے ادارہ کے لیے یہی عنوان یا اسی کے ہم وزن دوسرا عنوان اختیار کرتا تھا۔ جب لوگوں نے دیکھا ہوگا کہ معارف کے فائل سے سید صاحب کا نام نکال دیا گیا ہے تو مجھے پورا یقین ہے کہ بہت سے لوگوں نے اس کی خریداری بند کر دی ہوگی۔

دارالمصنفین، معارف، سید سلیمان ندوی ایک ہی مسمیٰ کے تین نام تھے اور ایک کا تصور بغیر دوسرے کے تصور کے ناممکن تھا۔ سید صاحب کا نام لیتے ہی دارالمصنفین اور معارف کا نام آنا ضروری تھا۔ اسی طرح معارف اور دارالمصنفین

کے تصور کے ساتھ سید صاحب کا تصور بھی ضروری تھا اور سید صاحب کی زندگی ہی میں یہ تصور ختم کر دیا گیا۔

اب سید صاحب بھی دنیا میں نہیں رہے اور ان کو پاکستان سے واپس نہ لانے والے بھی ایک ایک کرکے دنیا سے اٹھ گئے اور اب یہ معاملہ خدا کے سپرد ہو گیا ہے مگر تاریخ میں تو آجانا چاہیے کہ ان کو واپس لانے کے لیے دارالمصنفین کے ذمہ داروں اور اس کی مجلس عاملہ و منتظمہ کے بااثر و معزز و مقتدر ارکان نے کیا کوششیں کیں۔ انھوں نے یہاں کی حکومت کو، پنڈت جواہرلال نہرو کو، اور کیبنٹ کے دوسرے ارکان کو اس طرف توجہ دلائی یا نہیں، اگر دلائی تو کیا؟ کیا دارالمصنفین میں اس کا ریکارڈ محفوظ ہے؟ حیات سلیمان مولفہ شاہ معین الدین ندوی میں اس کے متعلق ایک حرف موجود نہیں ہے، بلکہ ہجرت پاکستان کے عنوان کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے تو یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ ازخود یہاں سے ہجرت کرکے پاکستان چلے گئے تھے اور پھر وہیں ہمیشہ کے لیے مقیم ہو گئے۔ وہ پاکستان میں خدانخواستہ رہنے کے لیے نہیں بلکہ بیمار لڑکی اور نواسی کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے تھے اور جب وہ صحت یاب ہو گئیں اور سید صاحب کو ان کی صحت کی طرف سے پورا اطمینان ہو گیا تو وہاں سے اور لوگوں کی طرح واپسی کی تیاریاں شروع کر دیں، لیکن اس سلسلہ میں ہندوستان کے سفارت خانہ نے ان کے ساتھ سخت قساوت قلبی کا ثبوت دیا اور ان کو پریشان کرنے کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے مالوف وطن ہندوستان واپس جانے کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے اور وہیں رہ پڑے۔ بعد کو اپنے متعلقین کو بھی وہیں بلا لیا۔ لیکن جب تک وہ زندہ رہے، اعظم گڑھ اور دیسنہ کے لیے تڑپتے رہے۔ تاآنکہ ۱۹۵۳ء میں ان کا انتقال بھی ہو گیا اور وہیں پیوند زمین بھی ہو گئے، جس کا انھوں نے اپنی زندگی میں خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو دارالمصنفین ہی میں اپنے استاد مولانا شبلیؒ کے مزار پرانوار کے پہلو میں وہاں کی مسجد سے بالکل متصل اپنی ابدی خواب گاہ بنانا چاہتے تھے۔ افسوس کہ حالات کی نامساعدت سے ان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔

> "اگر دو آدمی ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں تو تمہارا رویہ ایسا ہو کہ اگر کل ان میں صلح ہو جائے تو تمہیں شرمسار نہ ہونا پڑے"
>
> شیخ سعدی شیرازیؒ

بنگال میں تعلیم نسواں کا آغاز

کلیم سہسرامی*

بنگال میں مسلمانوں کی تعلیم کی تحریک نواب بہادر عبداللطیف (۱۸۲۸ء — ۱۸۹۳ء) کی ذاتی کوششوں اور شخصی دلچسپی کی بدولت شروع ہوئی، موصوف کی کوششوں سے مدرسہ عالیہ (کلکتہ مدرسہ) کے نصاب کے مطابق جو طلباء کامیاب ہوکر نکلتے تھے ان کی اعلیٰ انگریزی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا۔ نواب بہادر صاحب کی کوششوں سے ۱۸۷۳ء میں کلکتہ میں پریسیڈنسی کالج قایم کیا گیا تاکہ مسلمان طلباء انگریزی تعلیم میں بھی دوسری قوموں سے پیچھے نہ رہیں۔ نوشیر علی خاں یوسف زئی، باشندۂ بنگال نے بھی اپنی کتاب "بنگالی مسلمان" میں مسلمانوں کی عام تعلیمی پستی اور بے توجہی پر بڑی ہمدردی سے اظہار افسوس کیا ہے لیکن مذکورہ بالا اصحاب کی تحریروں یا کوششوں میں بنگال میں تعلیم نسواں کے سلسلے میں کوئی حوالہ نہیں پایا جاتا، اگرچہ مسلم طبقے کی خواتین میں جہالت عام تھی۔

تاریخی نقطۂ نظر سے اگر جائزہ لیا جائے تو بنگال میں تعلیم نسواں کی پیش رو دراصل نواب فیض النساء چودھرانی کو کہنا کسی طرح مبالغہ نہ ہوگا۔ موصوفہ پچم گاؤں ضلع کملا کی رہنے والی تھیں اور انھوں نے کملا شہر میں فیض النساء گرلز انگلش ہائی اسکول ۱۸۷۳ء میں قایم کیا تھا، ترقی دے کر اب یہ اسکول خواتین کے لیے ڈگری کالج بنا دیا گیا ہے۔

اس کے بعد دوسری خاتون رقیہ سخاوت حسین نے م
طبقے میں تعلیم نسواں کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا اور ۱۱
میں سخاوت میموریل گرلز ہائی اسکول کلکتہ میں قایم کیا۔ اپنے مق
کی تکمیل کے لیے موصوفہ نے ۱۹۱۶ء میں "انجمن خواتین اسلام"
بنیاد کلکتہ میں رکھی تاکہ ان کی تحریک مسلم خواتین کے درمیان عا
اور مقبول ہو۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ بنگلا دیش کی مختلف یونیورسٹیو
میں "رقیہ ہال" کے نام سے لڑکیوں کے لیے رہائشی ہال بنا دیے
گئے ہیں اور اس طرح ان کی یاد تازہ ہوتی رہتی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے بڑا اور اہم کارنامہ "انجمن مس
احباب" (ڈھاکا) نے انجام دیا۔ چند نوجوان مسلم طلباء کے
ایک گروپ نے جو ڈھاکا سرکاری کالج میں پڑھتے تھے یہ انجمن
۲۴ فروری ۱۸۶۳ء میں تشکیل دی، ان کے نام یہ ہیں۔ عبدالعز
فضل الکریم، بذل الرحمٰن اور عبدالمجید۔ یہ تمام طلباء منشی نور بخش
کے مکان محلہ مہادت ٹولی، ڈھاکا میں رہتے تھے، اس انجمن کے
عہدہ داروں کے نام یہ ہیں:

۱. صدر: ہمت علی بی۔اے
۲. سکریٹری: عبدالمجید بی۔اے
۳. شریک معتمد: (الف) حمایت الدین احمد (ب) زاہد الرحمٰن زاہد
۴. خزانچی: مقبول احمد۔

---

* [illegible]

حسب ذیل حضرات کو مختلف ضلعوں کے نمائندے کی حیثیت سے مجلس عاملہ کا ممبر بنایا گیا:

آزاد علی —— مدثر حسین —— محمد صادق
محمد فاضل —— نوازش علی اور سید حضرت علی

اس انجمن کا ممبر ہونے کے لیے بعض شرائط یہ تھیں کہ ہر مسلمان جو سالانہ ڈیڑھ روپیہ چندہ ادا کر سکتا تھا اسے انجمن ممبر کی حیثیت سے قبول کر لیتی تھی، اتنی ہی رقم کی ادائیگی کے بعد ایک ہندو کو بھی ممبر بننے کی اجازت تھی، لیکن ہر ممبر کو خزانچی کے پاس مہینے کی دس تاریخ تک چندہ ادا کرنا ضروری تھا۔ اگر کوئی شخص چھ مہینے تک چندہ ادا نہیں کرتا تو اس کی ممبری ختم ہو جاتی۔ بہر صورت، کل ممبروں کی تعداد پہلے سال ۲۳، دوسرے سال ۴۸ اور تیسرے سال ۱۰۲ تھی۔

اس انجمن کے خزانچی کی ذمہ داری یہ تھی کہ انجمن کا حساب یعنی آمدنی اور خرچ کی تفصیلات محفوظ رکھتا تھا، چندہ وصول کرتا تھا اور اس کی رسیدیں دیتا تھا لیکن اس کا سکریٹری اصل میں ایک سرگرم اور متحرک رکن تصور کیا جاتا تھا جو انجمن کے قواعد و ضوابط کے مطابق میٹنگ کرتا تھا اور اس کی تمام تجویز اور ریکارڈ کی حفاظت اس کی ذمہ داری تھی۔ ضرورت کے مطابق مجلس عاملہ کے ممبروں کو بھی انجمن کے کاموں سے اطلاع دیتا تھا۔ سکریٹری کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ انجمن کے زیر اہتمام جو امتحانات مختلف جگہوں پر ہوتے تھے انھیں چھپواتا اور ٹھیک وقت پر بھیجتا تھا۔

اور ذمہ داریوں کے علاوہ مجلس عاملہ کی ایک ذمہ داری یہ تھی کہ انجمن کے لیے فنڈ فراہم کرتی تھی اور مختلف ضلعوں میں سرگرم کارکنوں کا تقرر کرتی تھی، نصاب تعلیم تیار کرتی، ممتحنوں کا تقرر کرتی اور طلباء کو ان کے امتحانات کے نتیجوں پر انعامات عطا کرتی تھی۔

انجمن کا اصل مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے عام طبقے میں ترقی اور تعلیم کی سرگرمیاں پیدا کر دی جائیں۔ عورتوں میں تعلیم شروع کی جائے اور سماجی طور پر ان میں بیداری پیدا کی جائے۔ خاص طور پر عورتوں کے طبقے سے جب تک جہالت دور نہ ہوگی، سماج میں انھیں کوئی مقام حاصل نہیں ہو سکتا اور نہ آئندہ نسل ترقی کر سکتی ہے۔ اسلامی پردے کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا گیا کہ عورتوں کے والدین اور شوہر انھیں اپنے اپنے گھر پر قرآن مجید اور اسلام کے بنیادی اصولوں کی تعلیم دیں۔ اس طرح تعلیم کا بنیادی مقصد حاصل ہو جائے گا اس کے بعد عورتوں کو اس بات کی اہمیت بتائی جائے کہ شوہروں کی فرماں برداری سے کیا فائدہ ہے اور روزمرّہ کی زندگی میں انھیں خانگی امور کس طرح انجام دینا چاہیے۔ انھیں یہ طریقہ بھی سکھانا چاہیے کہ مہمانوں کے ساتھ کس طرح سلوک کرنا چاہیے۔ اس کے بعد گھر ہی پر عورتوں کو پرائمری تعلیم دینا چاہیے اور ذریعۂ تعلیم ان کی مادری زبان ہو۔ اگر عورتیں تعلیم یافتہ ہوں گی تو اُن کے بچے بھی تربیت یافتہ ہوں گے۔

انجمن نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کی نگرانی میں پرائمری تعلیم دی جائے پہلے کلاس سے پانچویں کلاس تک کے لیے نصاب تعلیم مرتب کیے گئے اسلامی نقطۂ نظر سے پردے میں رہنے والی خواتین سے یہ توقع نہ تھی کہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے گھر سے باہر جاسکیں گی۔ اس لیے ان کے شوہروں اور سرپرستوں کو مشورہ دیا گیا کہ گھر ہی میں انجمن کے نصاب کے مطابق انھیں تعلیم دیں۔ انجمن نے امتحان کے لیے اردو اور بنگلہ دونوں زبانوں کی اجازت دے دی، انجمن کا نصاب تعلیم برائے (۱۸۸۳ــ۱۸۸۴ء) پہلے کلاس سے پانچویں کلاس تک جس کا اردو سیکشن سے تعلق ہے ضمیمہ (الف) میں نیچے درج ہے۔ دوسرے سال یعنی (۱۸۸۴ــ۱۸۸۵ء) کے نصاب تعلیم میں کچھ مفید تبدیلیاں کی گئیں اور چھٹی کلاس کا بھی اضافہ کر دیا گیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آہستہ آہستہ طالبات کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور تعلیم ان میں مقبول ہوتی گئی۔ اس کا اندازہ ۱۸۸۴ــ۱۸۸۵ء سال کے نصاب تعلیم سے کیا جاسکتا ہے جو نیچے ضمیمہ (ب) میں درج ہے۔ امتحانات ملک کے مختلف مرکزوں میں ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں انجمن نے بہت سارے اصول بنائے تھے جن کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا

۱۔ (۱) بنگال کے مسلم طبقے کی کوئی خاتون امیدوار مقررہ نصاب تعلیم کے مطابق امتحان میں شریک ہوسکتی ہے۔

۲۔ خواتین امیدوار اپنے گھر میں سرپرست کی نگرانی میں

امتحان میں شریک ہو سکتی ہے۔

۳ زبانی امتحان کے لیے ممتحن امیدوار کے سرپرست کے مشورے سے مقرر کیا جائے گا

۴۔ اگر کوئی امیدوار کسی کتاب یا ناجائز طور پر کسی اور طرح امتحان میں مدد لے گا تو اس کا امتحان منسوخ کر دیا جائے گا۔

۵۔ زبانی امتحان کے لیے سو نمبر ہوں گے اور اس کا معیار اس طرح مقرر ہو گا جو نیچے درج ہے:

(الف) درجۂ اول: ۶۰ فیصد اور اس سے زیادہ

(ب) درجۂ دوم: ۵۰ سے ۵۹ فیصد

(ج) درجۂ سوم: ۴۰ سے ۴۹ فیصد

اسی طرح تحریری امتحان میں معیار کا شمار اس طرح ہو گا:

(الف) درجۂ اول: ۵۰ فیصد اور اس سے زیادہ

(ب) درجۂ دوم: ۴۰ سے ۴۹ فیصد

(ج) درجۂ سوم: ۳۰ سے ۳۹ فیصد

۶۔ پہلے اور دوسرے کلاس کے امیدواروں کا بنگلہ زبان کا امتحان زبانی ہو گا لیکن بقیہ کلاسوں میں بنگلہ زبان کا امتحان تحریری ہو گا۔ اسی طرح چوتھے اور پانچویں کلاس کے امیدوار کے لیے اردو زبان کا امتحان تحریری ہو گا اور بقیہ کلاسوں میں اردو زبان کا امتحان زبانی ہو گا۔

۷۔ ممتحن کو ایک ہفتے کے اندر کاپیاں جانچ کر، نمبر کے ساتھ انجمن کے سکریٹری کے حوالے کرنا ہو گا۔

۸۔ امتحان کا نگراں سکریٹری کو علاحدہ رپورٹ پیش کرے گا کہ کسی امیدوار نے امتحان میں ناجائز طریقہ استعمال نہیں کیا ہے۔

۹۔ امیدوار یا اس کے سرپرست کو امتحان دینے کے لیے ہر سال اپریل کے مہینے تک تحریری طور پر اطلاع دینا ضروری ہے۔

۱۰۔ امیدواروں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ امتحا شروع ہونے سے ایک مہینہ پہلے مقررہ فارم کو خانہ پری کرنے کے بعد انجمن کے سکریٹری کو بھیج دیں

۱۱۔ بنگلہ سیکشن میں امیدوار کا امتحان بنگلہ زبا کے ذریعہ ہو گا۔

۱۲۔ ادب کے امتحان میں شریک ہونے والے امید کو امتحان کی کاپی کے ساتھ الگ کاغذ پر اپنی تحریر کا نمونہ دینا لازمی تھا۔

۱۳۔ کامیاب امیدوار کو سند دی جائے گی اور اسی کے ساتھ ہمت افزائی کے طور پر اسے زیادہ نمبر حاصل کرنے پر انعام دیا جائے گا۔

اردو سیکشن کے امتحانات کے نتیجے ضمیمہ (ج) میں شامل ہیں لیکن بنگلہ سیکشن کے امتحانات کے نتیجے کوشش کے باوجود دستیاب نہ ہو سکے۔ ورنہ ہمارے علم میں کچھ اور اضافہ ہوتا۔ پہلے تعلیمی سال میں امتحان کا نتیجہ غیر متوقع طور پر حوصلہ افزا رہا، جس کی تفصیل یوں ہے، ۵۸ امیدواروں نے امتحان کے لیے درخواست دی، ۳۹ امیدواروں نے امتحان کے فارم کی خانہ پری کی - ۳۷ امیدواروں نے امتحان میں شرکت کی جن میں ۲۳ بنگلہ سیکشن اور ۱۴ اردو سیکشن میں تھے۔ ۲۲ امیدوار بنگلہ سیکشن اور ۱۲ امیدوار اردو سیکشن میں کامیاب ہوئے۔

پہلے سال انجمن کے اغراض و مقاصد کتابچے کی صورت میں مختلف مقامات مثلاً باریسال، کلکتہ، نواکھالی، چاٹگام، کملا، میمن سنگھ اور مدنا پور وغیرہ میں بھیجے گئے، جس کا مثبت نتیجہ نکلا، یہاں تک کہ کلکتہ کے مولوی محمد قاسم نے انجمن کی امداد کے طور پر امتحان کے سوالات اپنے ذاتی اخراجات سے چھپوائے۔ اس انجمن کا پہلا سالانہ اجلاس ۲۴ نومبر ۱۸۸۵ء میں ہوا جس میں اس کی کارگزاری کی تفصیلی رپورٹ پیش کی گئی۔ اس کی صدارت مولوی ضیاء الدین احمد (زمیندار ڈھاکا) نے کی، مسلمانوں کے علاوہ اس میں دو ہندو حضرات بابو راجندر موہن دتا (ہیڈ ماسٹر)

اور بابو پروشنو کمار گوہا بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی نے بھی شرکت کی۔ انجمن کا دوسرا اجلاس ۱۳ جنوری ۱۸۸۴ء کو کلکتہ میں منعقد ہوا۔ مولوی محمد عبدالکریم نے اس کی صدارت کی۔ اس میں انجمن کی سرگرمی اور لائحہ عمل پر اظہار اطمینان کیا گیا۔ مزید پندرہ اصحاب نے چندہ دینے والوں کی فہرست میں اپنے نام درج کرائے اس کی تفصیل ضمیمہ (د) میں درج ہے۔ اس کے علاوہ ۱۸۸۳ء اور ۱۸۸۴ء سال کے دوران انجمن کی آمدنی اور اخراجات کی تفصیل نیچے ضمیمہ (ھ) میں درج کی جاتی ہے۔ تاکہ اس کی مالی حالت کا اندازہ لگایا جا سکے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ "انجمن مسلم احباب ڈھاکا" نے آج سے تقریباً ایک سو برس پہلے مسلم طبقے کی خواتین میں تعلیمی بیداری کی ایک منظم تحریک شروع کی اور اس میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ اس تحریک کے پس منظر میں کوئی اعلیٰ دماغ نہ تھا بلکہ ڈھاکا کالج کے چند طلباء کا سرگرم اور متحد گروپ تھا جسے اس تحریک کا پیش رو کہنا چاہیے۔ یہ تحریک تمام غیر منقسم بنگال میں پھیل گئی اور عوام کے طبقے نے اس کے ساتھ تعاون کیا۔ اس انجمن کے کردار میں کوئی تنگ نظری نہ تھی۔ اس لیے غیر مسلموں کو بھی اس کا ممبر بننے کی اجازت تھی، یہ تحریک خواتین اور ان کے سرپرستوں کے طبقے میں یوں پسندیدگی کی نظروں سے دیکھی گئی کہ اس کی بدولت تعلیمی سرگرمی کی لہر دوڑ گئی تھی اور خواتین نے امتحان میں شرکت کی رضامندی کا اظہار کیا اور اس طرح آہستہ آہستہ ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا جیسا کہ انجمن کے اصول وضوابط سے معلوم ہوتا ہے جو امتحان کے سلسلے میں بنائے گئے تھے۔ اس کے بنیادی ممبر یعنی نوجوان گریجویٹ بہت منظم، مخلص اور اپنے تعلیمی نقطۂ نظر میں بہت مرتب تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم طبقے کے لوگوں کے درمیان سماجی تعلقات بڑھتے گئے۔ کسی دستاویزی ثبوت کی غیر موجودگی میں یہ بتانا ممکن نہیں "انجمن مسلم احباب ڈھاکا" کب تک اپنے فرائض انجام دیتی رہی اور بعد میں اس کے عہدے دار کون کون حضرات ہوئے۔

ضمیمہ۔ الف

نصاب تعلیم نصاب تعلیم برائے سال ۱۸۸۳۔ ۱۸۸۴ء

اردو سیکشن

۱۔ کلاس اول: (ا) مکمل حروف تہجی
(ب) لکھنے کی تعلیم (تحریر)
۲۔ کلاس دوم (ا) اردو کی پہلی کتاب (مکمل)
(ب) تحریر
(ج) گنتی۔ سو تک
۳۔ کلاس سوم: (ا) اردو کی دوسری کتاب (مکمل)
(ب) تحریر
(ج) گنتی۔ ایک ہزار تک
۴۔ کلاس چہارم (ا) مفتاح الجنت (ص ۱۔ ۴۰)
(ب) تحریر
(ج) حساب۔ جمع
۵۔ کلاس پنجم: (ا) مفتاح الجنت ص ۴۱ سے آخر تک)
(ب) زبانی تحریر
(ج) حساب۔ جمع اور تفریق

ضمیمہ۔ ب

نصاب تعلیم برائے سال ۱۸۸۴۔ ۱۸۸۵ء

(اردو سیکشن)

۱۔ کلاس اول: (ا) حروف تہجی کی مکمل تعلیم
(حصۂ اول) (ب) حروف تہجی کی تحریر
(ج) قرآن مجید۔ پارۂ عم
(د) نماز پڑھنے کا طریقہ
(ہ) حساب۔ لکھنا اور پڑھنا۔ ایک سو تک

(حصہ دوم): (ا) حروف تہجی مع فواید عزیزیہ (ابتدا سے صفحہ ۳۲ تک)

(ب) آسان الفاظ کو زبانی لکھوانا۔

(ج) اعداد پڑھنا اور لکھنا

۲) کلاس دوم: (ا) حروف تہجی مع فواید عزیزیہ (صفحہ ۳۲ سے آخر تک)

(ب) راہ نجات (مکمل)

(ج) کتاب دیکھ کر مختصر جملوں کو نقل کرنا

(د) حساب - (i) جمع اور تفریق

(ii) پہاڑا - ایک سے پانچ تک

۳- کلاس سوم: (ا) مفتاح الجنت (مطبوعہ کلکتہ) ص ۱-۹۲

(ب) مرآۃ النساء (مطبوعہ نظامیہ پریس) صفحہ ۱-۴۴

(ج) اردو کا قاعدہ۔ مرتبہ گلکرسٹ (پہلا ایک چوتھائی حصہ)

(د) تحریر

(ه) حساب - جمع، تفریق- پہاڑا (۵ سے ۱۰ تک)

۴- کلاس چہارم (ا) مفتاح الجنت (صفحہ ۹۳ سے آخر تک)

(ب) مرآۃ النساء (صفحہ ۴۴ - ۱۲۰ تک)

(ج) مرآۃ العروس (پہلا نصف حصہ)

(د) اردو کا قاعدہ مرتبہ گلکرسٹ (دوسرا ایک چوتھائی حصہ)

(ه) کمپوزیشن: آسان اور سادہ پیراگراف لکھنا

(و) حساب: جمع، تفریق، ضرب اور تقسیم

۵- کلاس پنجم (ا) تنبیہ الغافلین (مطبوعہ کلکتہ) ابتدا سے صفحہ ۱۰۹ تک

(ب) مرآۃ النسا (صفحہ ۱۲۰ سے آخر تک)

(ج) مرآۃ العروس (دوسرا نصف حصہ)

(د) اردو کا قاعدہ مرتبہ گلکرسٹ (تیسرا ایک چوتھائی حصہ)

(ه) زبانی تحریر

(و) تاریخ: ہندوستان کے اہم واقعات

(ز) جغرافیہ ہندوستان

(ح) حساب، تفریق، ضرب، تقسیم، جمع مرکب اور تفریق مرکب۔

۶- کلاس ششم: (ا) تنبیہ الغافلین (صفحہ ۱۰۹ سے ۲۷۵ تک)

(ب) بنات النعش (مطبوعہ نظامیہ پریس) مکمل

(ج) کنز الدقائق: اردو (پہلا حصہ)

د- قصص الانبیاء: حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت محمدؐ اور چار خلفاء کا قصہ۔

(ه) اردو کا قاعدہ مرتبہ گلکرسٹ (بقیہ چوتھائی حصہ)

(و) زبانی تحریر

(ز) تاریخ: ہندوستان کی فتح

(ح) جغرافیہ: دنیا کا جغرافیہ

(ط) حساب: جمع مرکب، تفریق مرکب ضرب مرکب اور تقسیم مرکب

ضمیمہ ج

کامیاب امیدواروں کے نام

اردو سیکشن

نام	مقام	کلاس	ڈویژن
۱- زیب النساء	کلکتہ	پنجم	درجہ اول
۲- خیر النساء	باریسال	"	"
۳ حکیم النساء	"	"	"
۴- اشرف النساء	"	"	"
۵- فاطمہ عرف کلثوم	کلکتہ	پنجم	درجہ اول
۶ نجم النساء	"	چہارم	"

۷۔ نورجہاں بی بی	"	"	درجۂ دوم
۸۔ قمرالنساء	"	پنجم	درجۂ اول
۹۔ بی بی حمیدن	"	"	"
۱۰۔ وحیدالنساء	"	دوم	"
۱۱۔ رشیدالنساء	باریسال	اول	"
۱۲ نجم النساء	"	"	"

ضمیمہ (د)

ان حضرات کے نام جنھوں نے مالی معاونت فرمائی

سال ۱۸۸۳-۱۸۸۴ء

۱۔ مولوی محمد سعید	(مترجم ہائی کورٹ	۱۰ روپے
۲۔ مولوی ضیاءالدین احمد	(زمیندار ڈھاکا)	۵ روپے
۳۔ مولوی عبدالقدوس	(زمیندار ڈھاکا)	۵ روپے
۴ مولوی یقین الدین بی۔اے		۵ روپے
۵۔ مولوی عبدالحق عابد	(مدرس ڈھاکا مدرسہ)	۳ روپے
۶۔ مولوی امداد علی	(کلکتہ)	۲ روپے
۷ مولوی سید عباس علی	(کلکتہ)	ا روپیہ
۸ مولوی محمد نذیر (ناظر)	(کلکتہ	ا روپیہ

مجموعی رقم ـــــــــ ۳۲ روپے

ضمیمہ ـ (ھ)

آمدنی اور اخراجات کی تفصیل

سال ۱۸۸۳ء ۔ ۱۸۸۴ء

آمدنی	پائی	آنہ	روپیہ
۱۔ عطیہ	۲	۲	۴۴
۲ چندہ	۰	۱۳	۷۶
مجموعی رقم	۲	۱۵	۱۲۰

اخراجات	پائی	آنہ	روپیہ
۱۔ کتابچے کی طباعت	۰	۸	۳
۲۔ سند کی طباعت	۰	۲	۵
۳ کاغذ اور روشنائی	۳	۸	۴
۴ ڈاک خرچ	۱	۱۳	۲
۵ ایک طالبہ کی امداد	۱	۰	۲
۶ انعامات	۱	۱۴	۶۶
۷ چیزوں کی فروخت	۱	۵	۱
مجموعی رقم	۷	۲	۸۶

	پائی	آنہ	روپیہ
مجموعی آمدنی	۲	۱۵	۱۲۰
مجموعی اخراجات	۷	۲	۸۶
پس ماندہ رقم	۷	۱۲	۳۴

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۷۔ شمارہ ۱۱ (نومبر ۸۸ء)

ابن الہیثم

ایک مظلوم عبقری

شبیر احمد خاں غوری★

"ابن الہیثم" کے عنوان سے ایک فاضل مقالہ نگار کا مقالہ اسی رسالہ میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے بعد کسی اور قلم کار کے لیے اس موضوع پر طبع آزمائی و خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں رہتی۔

لیکن دو باتیں سنجیدہ غور و فکر کی متقاضی ہیں:

اولاً اکثر عباقرہ اسلام متنوع علمی و تحقیقی صلاحیتوں سے متصف تھے جن کے ساتھ مجموعی طور پر کماحقہٗ انصاف کرنا شخص واحد کے لیے محال نہیں تو دشوار ضرور ہے۔

ثانیاً: یہ بھی ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ نئی نسل کا اپنے ماضی سے رشتہ تقریباً منقطع ہو چکا ہے جس کے نتیجے میں ہماری ثقافتی روایات، ان روایتوں کے علم بردار اور ان علم برداروں کی مساعی علمیہ بھولی بسری داستان بن چکی ہیں پھر بھی اس مایوس کن صورتِ حال میں اگر کسی جواں ہمت اولوالعزم کو ان سے واقفیت کا شوق دامن گیر ہوتا ہے تو سہولت پسندی اولین ماخذ و مصادر سے استفادہ کے بجائے مستشرقین و محققین یورپ کی "تحقیقات انیقہ" کا سہارا لینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ویسے اس اخذ و استفادہ میں اصولاً کوئی قباحت نہیں ہے۔ روشنی جہاں سے بھی ملے، بہرحال روشنی ہے کہ

پروانہ چراغ حرم و دیر نداند

مگر مستشرقین کے ساتھ دقت یہ ہے کہ ان کے یہاں عموماً حقیقت نگاری پر مصلحت کوشی غالب رہتی ہے۔

مثال کے لیے ابن الہیثم ہی کو لیجیے۔ جن وجوہ سے بھی ہو، وہ قرون وسطیٰ کے یورپ میں 'علم الابصار' یا "بصریات" (قدیم اصطلاح علم المناظر یا آپٹکس - Optics) کا ماہر خصوصی سمجھا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد اس سے اس کی کہیں زیادہ بیش قیمت متاعِ علمی پر ڈاکہ ڈالا گیا اور پھر اس علمی ڈاکے پر پردہ ڈالنے کے لیے اس کے بصریاتی تبحر و تمہر کی اس شدت سے پبلسٹی کی گئی کہ علم الابصار optics اور ابن الہیثم دو مترادف لفظ بن گئے اور اس طرح یہ تاثر دیا گیا کہ گویا اس نے خود کو اس علم کے رموز و نکات کی عقدہ کشائی کے لیے اس درجہ وقف کر دیا تھا کہ کسی اور علم کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھا ظاہر ہے جب غیر شعوری طور پر یہ تاثر مستحکم ہو جائے کہ اس نے علم الابصار کے علاوہ کسی اور علم میں کمال ہی حاصل نہیں کیا تو پھر اس کے کسی اور علمی کمال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جو کسی نے اس پر ڈاکہ ڈالا ہو۔

غرض کہ بیکن (Bacon) کے زمانے سے تا امروز "بصریات" میں اُس کے تبحر و تمہر کی غیر معمولی شدت سے پبلسٹی کی گئی یہاں تک کہ عہد حاضر میں سائنس کے یورپی مورخوں کے ساتھ اہلِ مشرق بھی اس طلسم فرنگ میں پھنس کر رہ گئے۔ حتیٰ کہ عرب فضلا بھی جو قدیم ماٰخذ و مراجع کا بالاستقصاء مطالعہ کر سکتے تھے، حقیقی ابن الہیثم کو

★ سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی، الٰہ آباد بورڈ، الٰہ آباد۔ فروزاں" دودھ پور، علی گڑھ

منظر عام پر لانے کی ضرورت کا احساس نہ کر سکے۔

یہ نتیجہ تھا اپنے ثقافتی ماضی کو یورپ سے مستعار لی ہوئی عینک کی مدد سے دیکھنے کا۔ مگر یہ کوئی پسندیدہ صورت حال نہیں ہے

کرمک نادان طواف شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کی تجلی زار میں آباد ہو

آیئے اس مقدس فریضے کی انجام دہی کے لیے خود ابن الہیثم ہی سے بسم اللہ کی جائے اور تاریخ و تراجم کی کتابوں کو کھنگال کر اس عظیم عبقری کو ڈھونڈا جائے۔

۱۔ اس کی کثیر الجہات علمی صلاحیتوں کے اندر پتہ لگایا جائے کہ اس کی کون سی علمی صلاحیت اولین اہمیت کی مستحق ہے اور کون سی ثانوی اہمیت کی حامل ہے۔؟

۲۔ وہ کون سا در ثمین ہے جسے سفید فام ڈاکوؤں نے اس سے چھین کر اپنے ماتھے کا کلنک بنالیا ہے؟

۳۔ اور کیا جوہر شناس مبصروں نے اس "در ثمین" کی قیمت کا اندازہ لگایا ہے اور کیا؟

ابن الہیثم کا تفصیلی تذکرہ تین کتابوں میں ملتا ہے:

۱۔ بیہقی (وفات ۵۶۵ھ/مطابق ۱۱۶۹ء یعنی ابن الہیثم کی وفات کے کوئی ایک سو پینتیس سال بعد[۱۳۵]) کی تتمہ صوان الحکمۃ[۱۲] میں

۲۔ ابن القفطی (وفات ۱۲۴۸ء) کی تاریخ الحکماء[۱۳] میں اور

۳ ابن ابی اصیبعہ (وفات ۱۲۷۰ء) کی عیون الانباء فی طبقات الاطباء[۱۴] میں۔

"تتمہ صوان الحکمۃ" میں ابن الہیثم کا تذکرہ خاصا طویل ہے مگر اس کے حالات و سوانح پر مشتمل ہے۔ پھر بھی اس کی علمی کارکردگی کے بارے میں چند مجمل مگر معلومات افزا تبصرے ملتے ہیں

ابن ابی اصیبعہ نے عیون الانباء فی طبقات الاطباء" میں اس کا جو تذکرہ دیا ہے اس کا بیشتر حصہ خود ابن الہیثم ہی کی خود نوشت تحریروں سے منقول ہے۔

اب آیئے ان ماخذوں کی مدد سے ادھر اٹھائے ہوئے سوالات کا جواب تلاش کریں:

۱۔ خود ابن الہیثم کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ علم ہندسہ میں نابغہ روزگار ہے۔ چنانچہ حسب روایت بیہقی اس نے اپنے انتقال کے وقت کہا تھا:

ضاعت الھندسۃ وبطلت المعالجۃ وعلوم الطب[۱۵]

[ہندسہ (جیومٹری کا علم) ضائع ہو گیا اور معالجہ اور علم طب باطل ہو گئے]

یعنی وہ (ابن الہیثم) خود کو "ہندسہ (Geometry) اور طب کا دانائے راز سمجھتا تھا اور اقبال کی طرح کہنا چاہتا تھا۔

سرآمد روزگار این فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

علم الابصار بالخصوص اپنی کتاب المناظر" کے بارے میں اس نے کچھ نہیں کہا۔

ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطباء میں اس کے تذکرہ کا بیشتر حصہ خود ابن الہیثم کی تحریروں سے نقل کیا ہے۔ ابن الہیثم نے لکھا تھا کہ ۴۱۷ھ مطابق ۱۰۲۶ء تک اس نے کتابوں کے دو[۲] سیٹ تصنیف کیے تھے۔ پہلا ریاضیاتی علوم میں اور دوسرا طبیعیات وغیرہ میں۔

پہلے سیٹ کی ابتدا وہ ریاضی وہیئت کی کتابوں سے کرتا ہے اور لکھتا ہے:

قال محمد بن الحسن وانا اشرح ما صنعتہ فی الاصول الثلثۃ فما صنعتہ فی العلوم الریاضیۃ خمسۃ و عشرون کتاباً احدھا شرح اصول اقلیدس فی الھندسۃ والعدد وتلخیصہ والثانی کتاب جمعت فیہ الاصول الھندسیۃ والعددیۃ من کتاب اقلیدس وابلونیوس ونوعت فیھا الاصول وقسمتھا وبرھنت علیھا ببراھین نظمتھا من الامور التعلیمیۃ والحسیۃ والمنطقیۃ حتی انتظم ذلک مع انتقاض توالی اقلیدس وابلونیوس والثالث شرح المجسطی وتلخیصہ شرحاً وتلخیصاً

برهاناً۔ ثم اخرج منہ شیئاً الی الحساب
الا الیسیر۔

والرابع: الکتاب الجامع فی اصول الحساب
وھو کتاب استخرجت اصولہ لجمیع انواع الحساب
من اوضاع اقلیدس فی اصول الھندسۃ و
العدد وجعلت السلوک فی استخراج المسائل
الحسابیۃ بجھتی التحلیل الھندسی والتقدیر العددی
وعدلت فیہ من اوضاع المھندسین و
الفاظھم"۔

۳۔ محمد بن الحسن (ابن الہیثم) نے لکھا ہے کہ جو کتابیں
ان تین اصولی فنون میں تصنیف کی ہیں، ان کی تفصیل
بتاتا ہوں: میں نے جو کچھ علوم ریاضیہ۔ Mathematics
میں لکھا ہے وہ پچیس کتابیں ہیں
ان میں سے ایک اقلیدس کی "اصول الھندسہ و
العدد" کی شرح اور اس کا اختصار ہے۔

دوسری وہ کتاب ہے جس میں میں نے اقلیدس اور
ابلونیوس (Apolonnius) کی کتابوں کے
ہندسی اور عددی اصولوں کو جمع کیا ہے، ان کے
اصولوں کے انواع بیان کیے ہیں، ان کی تقسیم کی ہے
ان پر دلائل و براہین قایم کیے ہیں جنھیں میں نے تعلیمی
(ریاضیاتی) حسی اور منطقی امور کی مدد سے منظم
کیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اقلیدس اور ابلونیوس کی
کتابوں کے سلسلے میں مرتب ہو گئے۔ تیسری بطلیموس
کی کتاب المجسطی" کی شرح و اختصار ہے۔ یہ شرح اور
اختصار دلائل و براہین کے ساتھ موید ہے، جن کے
اندر حساب کی بہت ہی معمولی سی ضرورت ہے۔

اور چوتھی وہ کتاب ہے جو علم الحساب کے اصول
کی جامع ہے۔ یہ میری وہ کتاب ہے جس کے اصول
میں نے اقلیدس کی اصول الھندسہ والعدد کی اوضاع
میں سے علم الحساب کے جملہ انواع کے لیے مستخرج کیے ہیں
اور جسے میں نے ہندسی تحلیل اور عددی اندازہ کی غرض
سے حسابی (Arithmetical) مسائل کے استخراج
کے لیے راستہ بتایا ہے میں نے اس کتاب میں مہندسین
(Geometricians) کی اوضاع (Methods)
اور ان کی اصطلاحوں سے ہٹ کر نیا انداز اختیار
کیا ہے۔[۳]

پانچویں کتاب اقلیدس کی "کتاب المناظر" اور اسی فن میں
بطلیموس کی کتاب کے کھوئے ہوئے پہلے مقالے کا Revised
ایڈیشن ہے۔

"والخامس کتاب لخصت فیہ علم المناظر من کتاب
اقلیدس وبطلیموس و تممت معانی المقالۃ الاولیٰ
المفقودۃ من کتاب بطلیموس"۔[۳]

پانچویں وہ کتاب ہے جس میں میں نے اقلیدس اور
بطلیموس دونوں کی کتابوں کی تلخیص (اختصار) کی
ہے اور بطلیموس کی کتاب المناظر کا پہلا مقالہ جو
مفقود ہو گیا ہے اس کے معانی کو (از سر نو) مکمل کیا ہے۔[۳]
یہی علم المناظر (Optics) میں اس کی پہلی کوشش ہے اور
موجودہ "کتاب المناظر" کا نقش اولین ہے۔ غرض اگر آج ابن الہیثم
زندہ ہوتا تو غالب کے لفظوں میں کہتا

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعہ اردو کہ بیرنگ من است

جن کتابوں پر اسے ناز تھا کہ

"نوعت فیہ الاصول وقسمتہا و برھنت علیہا ببراہین
نظمتہا من الامور التعلیمیۃ والحسیۃ والمنطقیۃ"۔[۳]

اور جنھیں وہ اپنا حاصل حیات سمجھتا تھا کہ اپنے علمی کارناموں کا
افتتاح انھیں کے ذکر سے کیا، ان سے زمانے نے صرف نظر
کر لیا اور جنھیں وہ ثانوی حیثیت دیتا تھا اسے اس کا شاہکار
سمجھ لیا۔ فیا للعجب

مگر یہ صورتِ حال اس کے بعد کے آنے والوں بالخصوص فضلائے مشرق کے یہاں نہیں تھی۔ وہ اسے صرف ایک عظیم ماہرِ ریاضیات ہی کی حیثیت سے متعارف کراتے تھے۔ چنانچہ بیہقی جو اس کے سو سوا سو سال بعد تھا اس کا تعارف اس طور سے کراتا ہے:

"الحکیم بطلیموس الثانی ابو علی بن الہیثم کان تلو بطلیموس فی العلوم الریاضیہ والمعقولات وتصانیفہ اکثر من ان یحصی"

وہ (بیہقی) نہ تو "بصریات" میں اس کی دستگاہ عالی کا ذکر کرتا ہے نہ اس فن میں اُس کی کسی کتاب کا نام لیتا ہے۔ حالانکہ دوسرے فنون میں اُس کی مصنفات کی تعریف کرتا ہے

اگلی صدی میں ابن القفطی اس کا تعارف بدیں طور کراتا ہے:-

الحسن بن الحسن بن الہیثم ... صاحب التصانیف والتوالیف المذکورہ فی علم الھندسہ کان عالماً بہذا الشان متقناً لہ متفنناً فیہ قیماً بغوامضہ ومعانیہ مشارکاً فی علوم الاوائل"

[الحسن بن الحسن بن الہیثم .... ان کتابوں کا مصنف ہے جن کا علم الہندسہ کے اندر (خصوصیت سے) ذکر کیا جاتا ہے۔ وہ ان علوم کا عالم (ماہرِ خصوصی) تھا اور ان کے اندر اتقان کامل اور دستگاہ عالی رکھتا تھا۔ ان کے مختلف فنون پر عبور رکھتا تھا، ان کے غوامض ومشاکل کے حل پر قدرت رکھتا تھا، علوم الاوائل میں تبحر رکھتا تھا۔]

اس کے کچھ عرصے بعد ابن ابی اُصیبعہ نے عیون الانباء فی طبقات الاطباء میں اُس کے ذکر کا اس طرح آغاز کیا:-

ھو ابو علی محمد بن الحسن بن الہیثم کان فاضل النفس قوی الذکاء، متقناً فی العلوم لم یماثلہ احد من اہل زمانہ فی العلم الریاضی ولا یقرب منہ

[وہ ..... ان علوم میں اتقان کامل رکھتا تھا، اُس کے معاصرین میں سے کوئی بھی علم ریاضی میں اس کے مانند تو کیا اس کے قریب بھی نہیں تھا۔]

گویا کہ ابن الہیثم کے سیکڑوں سال بعد تک علم وفضل کے پارکھ شناس مبصر اُسے ریاضیات ہی میں عدیم المثال وفقید القرین نابغۂ روزگار سمجھتے تھے۔ بصریات میں اس کی کوئی خاص شہرت نہیں تھی اگرچہ ابن ابی اصیبعہ نے اس فن میں اس کی کئی کتابیں گنائی ہیں لیکن حاشا وکلا اس تفصیل سے مقصود اس کی "کتاب المناظر" کا استخفاف منظور نہیں ہے جو اپنے موضوع پر حرف آخر سمجھی جانے کی مستحق ہے۔ چنانچہ جب تیرھویں صدی کے آخر میں کمال الدین فارسی نے اس فن کو حاصل کرنا چاہا تو اس کے استاد علامہ قطب الدین شیرازی نے انھیں اسی کتاب کے پڑھنے کا مشورہ دیا اور جب بڑی تلاش کے بعد انھیں یہ کتاب ملی تو انھوں نے "تنقیح المناظر" کے نام سے اس پر ایک مبسوط شرح لکھی۔

بہر حال اس تفصیل سے مقصود اس حقیقت کو متقرر کرنا ہے کہ ابن الہیثم کے علم وفضل میں اولین اہمیت اس کی ریاضیاتی تصانیف کو حاصل ہے اور ثانوی اہمیت دوسرے فنون کو مگر ہمارے فاضل محققین کی سہولت پسندی عموماً اسی موضوع کو منتخب کرتی ہے جس پر یورپی محققین کام کر چکے ہوتے ہیں۔ کاش وہ ان مرغزاروں کی بھی سیر کرتے جو قوم کی بے اعتنائی سے سنگلاخ وادیوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔

۲۔ ابن الہیثم کا ایک عظیم کارنامہ خطوط متوازی کے "اقلیدسی" مصادرہ کے بدل کی دریافت ہے۔ یہ بجائے خود کتنا بڑا کارنامہ تھا اور اس کی قدر وقیمت بعد کے محققین نے کیا بتائی، اس کی تفصیل آگے آرہی ہے مگر اس سے پہلے خود اس مصادرہ کا تعارف

ریاضیاتی وطبیعاتی تحقیقات کا دار ومدار بڑی حد تک اقلیدس کے اصول ہندسہ Eucid's Element of Geometry پر ہے۔ اس کتاب میں تیرہ مقالے ہیں جن کی اشکال (Theorems) کی مجموعی تعداد محقق طوسی کے لفظوں میں ۴۶۸ یا ۴۷۸ ہے مگر ان کی

صحت چند بنیادی مقدمات یا First Principles پر موقوف ہے۔ ان بنیادی مقدمات میں کچھ تو اس قدر واضح بالذات (Self Evident) ہوتے ہیں کہ انھیں اپنی صحت تسلیم کرانے کے لیے کسی ثبوت کی حاجت نہیں ہوتی۔ انھیں علوم متعارفہ (Axiom) کہتے ہیں، کچھ اتنے واضح بالذات تو نہیں ہوتے پھر بھی مخاطب یا شاگرد ان کی صحت کو بطیب خاطر مان لیتا ہے۔ انھیں اصول موضوعہ (Hypothesis) کہتے ہیں مگر کچھ کو قابل تسلیم ہونے کے باوجود مخاطب یا شاگرد بلا پس و پیش تسلیم کرنے کے لیے خود کو تیار نہیں پاتا۔ انھیں مصادرہ یا (Postulate) کہتے ہیں۔ شیخ بو علی سینا نے کتاب الشفا کے جزء البرہان میں مصادرہ کی بہترین مثال اقلیدس کے خطوط متوازی کے مصادرہ کو بتایا ہے

و بالحری ان یکون ما وضع فی کتاب اقلیدس وھو
النقاء خطین فی جہۃ الناقص عن قائمتین مصادرہ"

لائق بیان بات یہ ہے کہ اقلیدس کی کتاب میں جو یہ بیان ہوا ہے کہ اگر ایک خط مستقیم دو خطوط مستقیم کو قطع کرے اور خط قاطع کے ایک طرف کے دو داخلہ زاویے مل کر دو قائموں سے کم ہوں تو جس طرف کے داخلہ زاویے دو قائموں سے کم ہیں، اس طرف کے دونوں خط بڑھائے جانے سے کہیں نہ کہیں ایک دوسرے سے مل جائیں گے۔ یہ دعوی ایک مصادرہ ہے۔

اور یہ واقعہ ہے کہ اقلیدس کے بعد جو ریاضی داں ہوئے ان میں سے اکثر کو اس مقدمہ کی مصادراتی حیثیت تسلیم کرنے میں تامل رہا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ بھی ایک مسئلہ اثباتی Theorem ہے جسے اصول اقلیدس کی دوسری بسیط تر اشکال کی مدد سے ثابت کیا جانا چاہیے۔ عہد قدیم میں اس جماعت کا گل سر سبد بطلیموس تھا۔ ممکن ہے اس سے پہلے بھی ماہرین ہندسہ نے اسے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس وقت سے لے کر آج کے دن تک اکثر ماہرین ہندسہ نے اسے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جن کے ناموں کی فہرست بقول کی۔ ایل۔ ہیتھ پینتالیس صفحوں میں آتی ہے۔

جب اصول اقلیدس دوسری صدی ہجری (آٹھویں صدی مسیحی) میں مسلمانوں میں ترجمہ ہوئی تو انھوں نے بھی اپنے پیش رو حکمائے یونان کی اس علمی روایت کو جاری رکھا۔ ان میں پہلا نام عباس بن سعید الجوہری کا ہے اور آخری نام اثیر الدین ابہری کا۔ ان دونوں کے درمیان متعدد فضلا نے اس کڑی کمان کو زہ کرنے کی کوشش کی۔ محقق طوسی نے اپنے "الرسالۃ الشافیہ عن الخطوط المتوازیہ" میں ان فضلاء میں سے تین فاضلوں کی کوششوں کا ذکر کیا ہے۔ چوتھی خود ان کی کوشش ہے۔ ان میں سے دوسرا فاضل ابن الہیثم ہے۔ اس کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"اما ابن الہیثم رحمہ اللہ فقد استعمل فی کتابہ الموسوم بحل شکوک کتاب اقلیدس مکان ہذہ المقدمۃ مقدمۃ اخری و زعم انھا ابین منہا عند الحس واوقع فی النفس من ہذہ وذلک بعد احالتہ تصحیح ہذہ المصادرۃ مع اخواتہا علی کتاب آخر لہ سماہ شرح المصادرات لم یقع الی نسختہ الا انہ قد اوما فی ہذا الکتاب اعنی حل الشکوک الی بیاناتہا المذکورۃ فی ذلک الکتاب"

اور رہا ابن الہیثم تو اس نے اپنی کتاب مسمی بہ حل شکوک اقلیدس میں اس مقدمہ (خطوط متوازی کے مصادرہ) کے بجائے ایک دوسرا مقدمہ استعمال کیا ہے اور اس کا خیال ہے کہ یہ اقلیدس کے مصادرہ کے مقابلہ میں زیادہ واضح اور ذہن میں زیادہ راسخ ہونے والا ہے۔ اس نے اس مصادرہ اور اس جیسے دوسرے مصادرات کے ثبوت کے لیے اپنی ایک اور کتاب کا حوالہ دیا ہے جس کا نام اس نے شرح مصادرات بتایا ہے مگر مجھے اس کا کوئی نسخہ نہیں ملا۔ صرف اتنا ہے کہ اس نے اس کتاب حل شکوک اقلیدس میں ان بیانات کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس کتاب میں (تفصیلی طور پر) مذکور رہیں۔

پھر اس (محقق طوسی) نے خط متوازی کے اقلیدسی مصادرہ
کے ابن الہیثم کے مجوزہ متبادل مقدمہ کو بیان کیا ہے:۔

اما المقدمۃ التی زعم انھا ابین عند الحس واوقع
فی النفس من ھذہ المصادرۃ واستعملھا فی المواضع
التی یحتاج فیھا الی تلک المصادرہ بدلاً عنھا، ھی
ان الخطین المستقیمین المتقاطعین لا یمکن ان یوازیا
خطاً واحداً مستقیماً۔

[اور وہ مقدمہ جس کے لیے اس (ابن الہیثم) کا خیال
ہے کہ وہ (اقلیدس) کے اس مصادرے کے مقابلے
میں زیادہ واضح اور ذہن میں زیادہ راسخ ہو جانے
والا ہے اور جسے اس نے ان مقامات میں جہاں
اس کی ضرورت پڑتی ہے، اقلیدس کے مصادرے
کے بجائے استعمال کیا ہے حسب ذیل ہے ۔
دو خط مستقیم جو ایک دوسرے کو قطع کرتے ہیں ان
کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ دونوں ایک ہی خط مستقیم
کے متوازی ہوں۔]

اس متبادل مقدمے کے بارے میں خود ابن الہیثم کا یہ خیال
تھا (محقق طوسی کی روایت کے مطابق) کہ

انھا ابین عند الحس واوقع فی النفس من ھذہ

[وہ (اقلیدس کے مصادرہ کے بارے میں) زیادہ
واضح اور جلد تر ذہن میں راسخ ہو جانے والا ہے]

لیکن کیا یہ بدل (Substitute) ایسا ہی ہے، اس کی
تحقیق تو آگے آ رہی ہے، پہلے اس پر مہذب رہزنوں کی غارتگری
کی تفصیل ۔

ہوا یہ کہ جب ۱۷۹۵ء میں برطانیہ کے ایک ہندسہ داں
پلے فیر (Playfair) نے اصول اقلیدس کا نیا ایڈیشن مرتب
کیا تو اس میں لکھا کہ اقلیدس کے بارھویں علوم متعارفہ (خطوط
متوازی کے مصادرہ) کی جگہ ایک نیا علوم متعارفہ داخل کیا جا رہا
ہے جس کا مقصد خطوط متوازی کے کچھ خواص کو زیادہ آسان طریقے
سے ثابت کرنا ہے:۔

"A new axiom is introduced in the room of the 12th for the purpose of demonstrating more easily some of the properties of parallel lines."

یہ نیا علوم متعارفہ خود پلے فیر کے لفظوں میں حسب ذیل تھا:۔

Two st. lines which intersect one another cannot be parallel to the same st. line.

اور یہ وہی متاع عزیز ہے جسے آٹھ سو سال قبل مظلوم ابن الہیثم
نے خون جگر کھا کھا کر دریافت کیا تھا کہ دو ایک دوسرے کو قطع
کرنے والے خطوط مستقیم ایک ہی خط مستقیم کے متوازی نہیں ہو سکتے۔

"ان الخطین المستقیمین المتقاطعین لا یوازیان
خطاً واحداً مستقیماً۔"

سائنس کی تاریخ میں علمی و عملی قزاقی کی اس سے زیادہ شرمناک
مثال شاید ہی مل سکے ۔

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

اور پھر اس قزاقی پر بعد کے فضلاء (مثلاً مشہور برطانوی ریاضی
داں کیلے Cayley نے مہر توثیق ثبت کر دی جس کی
تفصیل آگے آ رہی ہے اور پھر یہ ڈاکہ ایک حقیقت مسلمہ بنا دیا گیا
اور پھر ایک امر واقعی کی حیثیت سے اس کی شہرت ہو گئی اور بعد میں
جیومیٹری کی جو Text Books نو آموز طالب علموں کے
لیے مرتب کی گئیں ان میں اقلیدس کے مجوزہ مصادرہ کے بجائے
اسی بدل کو غریب ابن الہیثم کے بجائے غاصب "پلے فیر صاحب" کا
علوم متعارفہ بتا کر خطوط متوازی سے متعلقہ اشکال (Theorems)
کا سنگ بنیاد بنا دیا گیا۔ چنانچہ جس زمانہ ۲۳-۱۹۲۲ء میں راقم السطور
تحصیلی اسکول علی گڑھ میں چھٹے درجے کا طالب علم تھا، جیومیٹری کے

اندر پیرلو ائنٹ کی جیومیٹری پڑھائی جاتی تھی، اُس میں خطوط متوازی سے متعلق اثباتی مسائل (Theorems) کا سنگِ بنیاد یہی نام نہاد "پلے فیر صاحب کا علوم متعارفہ" تھا۔

لیکن آج کے دن تک مدعیانِ تحقیق نے اس قزاقی کی تحقیق نہیں کی کہ اس متاعِ بے بہا کا مالک کون ہے اور کس طرح اس پر ڈاکہ ڈالا گیا۔ حالانکہ یہی محققین آج تک فیصلہ نہیں کر سکے کہ Differential Calculus کا بانی کون ہے۔ نیوٹن یا لیبنیز اور ان میں سے سارق کون ہے۔

۳۔ بہرحال پلے فیر کے اقلیدس کے ایڈیشن ۱۷۹۵ء کے کوئی ۳۷ سال بعد ۱۸۳۲ء میں مشہور برطانوی ریاضی داں Cayley نے سائنس دانوں کے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے اس متبادل مقدمہ کے واضح البرہان ہونے کے ثبوت میں کہا:

"My own view is that Euclid's twelfth axiom in the playfairs form of it does not need demonstration, but is part of our notion of space of physical space of our experience, which is the representation lying at the bottom of all external experience"

کیلے کا یہ تبصرہ جو اس کی عدم واقفیت کی وجہ سے پلے فیر سے متعلق تھا، ابن الہیثم کی اس عظیم دریافت کی عظمت و رفعت کا ثبوت ہے۔

والفضل ما یشھد بہ الاعداء

ابن الہیثم کی دوسری عظیم دریافت بطلیموسی شمسی نظام سے Planetary Model کی اصلاح ہے۔

افلاطون کے زمانے سے ابن الہیثم کے زمانے تک ہیئت دانوں کا خیال تھا کہ مختلف سیاروں Planets کے مدار (Orbits) وہمی دوائر (imaginary circles) ہیں۔ مگر ابن الہیثم نے اس کے برخلاف "افلاک مجسمہ - (Solid spheres)" کا نظریہ پیش کیا، چنانچہ الخرقی (وفات ۵۳۲ھ) نے التبصرہ فی الھیئۃ (مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری عبدالحی کلکشن) میں لکھا ہے:-

مقتدیاً بابی علی ابن الھیثم فی تقسیم الافلاک کلھا من الحوامل والتداویر الا کرۃ المجسمۃ .... دون الاقتصار علی الدوائر المتوھمۃ... کما ھو دأب اکثر المتقدمین

[میری کتاب ابن الہیثم کے اتباع میں لکھی گئی ہے) جس نے جملہ افلاک کی حوامل (Deferents) ہوں یا تداویر (Epicycles) مجسم کردی۔ Solid Spheres میں تقسیم کی تھی۔ اس نے وہمی دائروں پر اقتصار نہیں کیا... جیسا کہ قدیم ہیئت والوں کا انداز تھا]

اور پھر قدرت نے ابن الہیثم کے نظریۂ افلاک مجسمہ" کو یہ قبولِ عام بخشا کہ اس کے بعد سے آخر تک (یعنی جامع بہادر رضانی" کی تصنیف ۱۸۳۵ء تک (جو اسلامی علم الہیئت کا آخری شاہکار ہے) اسلامی علم الہیئت کے محققین نے اسے ایک مسلم الثبوت اور ناقابلِ انکار حقیقت کی حیثیت دی۔

مگر اس کی تفصیل ایک مستقل پیش کش کی مقتضی ہے جو انشاء اللہ العزیز پھر اور کبھی۔

تعلیقات و مراجع

۱۔ البیہقی، ظہیر الدین ابو الحسن علی بن ابی القاسم زید: تتمہ صوان الحکمۃ (لاہور۔ ۱۳۵۱ھ)

۲۔ ابن القفطی، جمال الدین ابو الحسن علی بن یوسف: تاریخ الحکماء (لیپزگ۔ ۱۹۰۳ء)

۳۔ ابن ابی اصیبعہ: موفق الدین ابو العباس احمد بن القاسم الخزرجی: عیون الانباء فی طبقات الاطباء (مطبعۃ الوھبیہ مصر، ۱۲۹۹ھ

۴۔ البیہقی، صوان الحکمۃ ۔ ص ۷۹ ۔ ۸۰

۵۔ ابن ابی اصیبعہ: طبقات الاطباء جلد دوم ص۔ ۹۳

۶۔ ایضاً ایضاً ص۔ ۹۳ ۔ ۹۴

۷۔ ایضاً ایضاً ص۔ ۹۳

۸۔ البیہقی: تتمہ صوان الحکمہ ص ۷۷

۹۔ ابن القفطی: تاریخ الحکماء ص ۱۶۵

۱۰۔ ابن ابی اصیبعہ: طبقات الاطباء، جلد دوم ص ۹۰

۱۱۔ کمال الدین فارسی: تنقیح المناظر (دائرۃ المعارف، حیدرآباد، ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۹۲۸ء) جلد اول ص ۴ ۔ ۸

۱۲۔ محقق طوسی، خواجہ نصیرالدین: تحریر اقلیدس (طہران ۔ ۱۲۹۸ ۔ ص ۲)

۱۳ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ شیخ بوعلی سینا: کتاب الشفا

۲۔ شیخ بوعلی سینا: کتاب النجاۃ

۳ قطب الدین رازی: قطبی (شرح شمسیہ)

۴۔ بحرالعلوم: شرح سلم العلوم

۱۴۔ محقق طوسی، خواجہ نصیرالدین: الرسالۃ الشافیہ عن الشک فی الخطوط المتوازیہ مشمولہ رسائل طوسی الجزء الثانی (دائرۃ المعارف حیدرآباد ۱۳۵۹ھ) ص ۴، ۱۷

۱۵ قاضی زادہ رومی: شرح اشکال التاسیس (استانبول ۱۲۶۸ھ) صفحہ ۳۴

۱۶۔ محقق طوسی، خواجہ نصیرالدین: الرسالۃ الشافیہ عن الشک فی الخطوط المتوازیہ، ص ۵

۱۷۔ ایضاً ایضاً ص ۵

۱۸ ایضاً ایضاً ص ۵

۱۹ ایضاً ایضاً ص ۵

۲۰۔ الخرقی، عبدالوہاب: التبصرہ فی الھیئۃ (مولانا آزاد لائبریری، عبدالحی کلکشن نمبر ۳۱/۶) ورق ا ۔ ب

قاضی خورشید احمد

سعید الظفر چغتائی ★

جوش ملیح آبادی نے "یادوں کی بارات" میں قاضی خورشید احمد پر ایک باب لکھا ہے۔ سر شاہ سلیمان کے ہم عصر تھے۔ ان کی ذہانت، لاابالی طبیعت، ان کے تبحر علمی اور اذکار واشغال کے تذکرے بارہا سننے میں آتے ہیں۔ وہ ہفت زبان تھے۔ اپنے زمانۂ شباب (قریب ۱۹۳۰ء) کی رائج ریاضیات میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ رندی سے بھی آگاہ تھے، طریقت سے بھی وابستہ۔ ۱۹۵۲ء اور پھر ۱۹۵۵ء میں مجھے ان سے تین چار بار نیاز حاصل ہوا۔ اُن دنوں لکھنؤ آتے تو اپنے وطن مہونہ (ضلع لکھنؤ) کے بڑے حد تک ہم مزاج عبدالباری عباسی علیگ کے ساتھ جہانگیر آباد پیلس حضرت گنج میں ٹھہرتے۔ دونوں کا تصوف زور پر تھا۔ عباسی صاحب عشا بعد ضربیں لگاتے، مگر یہ خفی ہوتیں۔ وہ سونے لیٹتے تو قاضی صاحب جاگ اٹھتے اور تہجد سے پہلے "لا الٰہ الا اللہ" کے نعرے لگاتے۔ ان کی شدید ضربوں سے پڑوس کے شقی دلوں کی سیاہی تو دور نہ ہوتی، نیندیں ضرور خراب ہوتیں اور لوگ پوچھنے لگتے کہ یہ ولی کامل کہاں سے آگئے ہیں۔

۱۹۵۲ء میں شروع جولائی کی کوئی تاریخ تھی۔ ہم دو طالب علم اسی مکان کے دوسرے حصے میں آ ٹھہرے، جہاں عباسی صاحب فروکش تھے۔ ایک کاکل دراز، کھچڑی گھنیری داڑھی والے مولوی صاحب، اُن کی طرف کوری کھاٹ پر بیٹھے تھے۔ بعد مغرب انھوں نے آم کاٹے اور مجھے مدعو کیا۔ میں شریک تو نہ ہوا مگر گفتگو شروع ہوگئی۔

کیا پڑھتے ہو؟

ہائی اسکول میں کیا مضامین تھے

عربی، سائنس، ریاضی۔ خوب! اچھا بتاؤ، منصرف کسے کہتے ہیں اور اسباب منع صرف کتنے ہیں؟ یہ بحث مع مثالوں کے یاد ہونا چاہیے تھی!

ابھی تک میں نے ان کی شخصیت پر زیادہ توجہ نہ دی تھی۔ مولوی صاحبان کو عربی تعلیم کے مسائل میں دلچسپی ہونا ہی چاہیے تھی لیکن اب موضوع بدلا۔

$ax^2 + bx + c = 0$ ایک مساوات ہے بتاؤ x کی قیمت کیا ہوگی؟ میں خوش ہوا کہ پچھلی ہزیمت کی تلافی کیے دیتا ہوں جواب دیا۔ ابھی قیمت نکالے دیتا ہوں۔ فرمایا۔ حل کرنے کو نہیں کہتا۔ زبانی بتاؤ۔ یہ تمہاری نہیں، تمہارے استاد کی غلطی ہے کہ یاد نہ کرایا ــــــ اس کے بعد حل انھوں نے مجھے یاد کرا دیا پھر پوچھا۔ ایک سے بیس تک گنتی کا جوڑ کتنا ہوگا؟ میں جوڑنے لگا۔

نہیں، ایک سانس میں بتاؤ! اس کا کوئی قاعدہ ہوگا نا! اس کے بعد پندرہ منٹ تک وہ مختلف قسم کے اعدادی

★ پروفیسر، فزکس ڈپارٹمنٹ، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

ـسلوں پر گفتگو کرتے رہے اور میں 'گو یا کہ' جادوگری کے
سیکھتا رہا۔ ان میں جڑنے والے (حسابی) سلسلے بھی تھے اور
رب پانے والے (ہندسی) سلسلے بھی۔

اس کے بعد کہا انٹرمیڈیٹ الجبرا کا نصاب انھیں بکھنوں سے
روع ہوتا ہے ــــ اور اگلے چار مہینوں تک مجھے الجبرا کے سوال
ل کرنے کے لیے کوئی نیا قاعدہ نہیں سیکھنا پڑا۔

اندھیرا ہو چکا تھا اور ہم لوگ باتیں کر ہی رہے تھے کہ دو
ور صاحبان قاضی صاحب سے ملنے آئے۔ ان میں سے ایک
فتخار احمد اعظمی تھے جو سامنے ہی عبدالغنی انصاری صاحب کے ساتھ
ہتے تھے۔ دوسرے اُن کے دوست، جن کا نام یاد نہیں رہا

آپ آمد و تیم برخاست

ب گفتگو ان صاحبان سے ہونے لگی۔ معلوم ہوا نو وارد نے
ونیورسٹی میں فرانسیسی اور جرمن پڑھی ہے اور ان میں قاضی صاحب
سے استفادہ کرنے آئے ہیں، جنھوں نے یہ دونوں زبانیں
اپنی طالب علمی میں، ایک ایک کرکے اہلِ زبان سے سیکھی تھیں۔ انکسار
برتتے رہے اور اپنے جرمن استاد کا یہ قول دہرایا۔

"نئی زبان سیکھتے وقت، اپنے ذہن سے ہر
دوسری زبان نکال دو۔ جب تک کہ اس پر
کامل دستگاہ نہ ہو جائے۔"

اس ہدایت پر عمل نہ کرنے سے اس ہیچداں کو کئی موقعوں پر
جو الجھن پیش آئی، قاضی صاحب کی بات کی، اُس سے بڑھ کر تائید
ممکن نہیں۔

پھر افتخار صاحب نے فارسی کا ذکر کیا تو بولے
فارسی میں آج بھی قصیدہ لکھوں تو کوئی تمیز نہیں کرسکتا، فیضی
نے لکھا ہے یا خورشید احمد نے!

میں ہمیشہ سے 'اقبالی مجرم' ہوں اور قاضی صاحب اقبال شکن
تھے۔ ایک دن فرمائش کی۔ اقبال کے جو شعر بہت اچھے سمجھتے ہو، سناؤ
میں نے ان کی چند مشہور شعر پڑھے۔ قاضی صاحب نے ہر ایک
پر سمجھ لور تنقید کی اور کسی قابل نہ بتایا۔ میں اقبال کے
بارے میں ان کی رائے کا تو قائل نہ ہو سکا، مگر ان کی دقت نگاہ کا
ضرور قائل ہوگیا۔ اس بات کا بھی کہ اقبال کے ہاں زبان و بیان
کے واضح اغلاط ملتے ہیں اور کسی کو من و عن سند مان لینا صحیح نہیں
خود اقبال کا شعر ہے ؎

صاحب ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے۔
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش

کچھ دن بعد ریڈیو پہ مشاعرہ ہوا۔ قاضی صاحب اتفاق سے
ان دنوں بھی موجود تھے۔ میں نے اشعار لکھ لیے۔ صبح انھوں نے صرف
اقبال سہیل کی غزل سنی اور اس میں بھی مین میخ نکالتے رہے۔

صیاد، مژدہ باد، عنادل میں چھڑ گئی
اب کشمکش میں فکر کسے آشیاں کی ہے

بس سیاسی شعر ہے۔ ہے ناسیاسی! جگر اور جوش کو بھی نہیں گردانا
ــــ یہ اقبال سہیل کا آخری زمانہ تھا۔ عبدالغنی انصاری
صاحب ہی کے ساتھ ٹھہرے تھے۔ اِسی موقع پر میں نے انھیں
رکشے پر جاتے ہوئے ایک جھلک دیکھا ہے۔

ایک بار قاضی صاحب آئے تو میں ٹری گونومیٹری کے
سوال لگا رہا تھا۔ دیکھا۔ پوری مشق میں بس ایک سوال اچھا ہے
اور چاہو تو فلاں فلاں چار پانچ اور حل کرلو۔ بقیہ رطب و یابس ہے
دو سال کے عرصے میں قاضی صاحب کا پسندیدہ سوال ٹسٹ اور
امتحانات ملا کے تین چار بار پوچھا گیا۔ کسی اور وقت الجبرا پر متوجہ
ہوئے۔

یہ سب مساواتیں بیکار ہیں۔ تین مساواتوں سے
تین قیمتیں نکلیں تو کیا نکلیں۔ دیکھو یہ میرے عباتی
سوال۔ دو مساواتوں سے تین قیمتیں نکل آتی ہیں۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ان کے سوالوں میں ایک نامساوات
(INEQUALITY) پنہاں تھی جو قاضی صاحب بتلاتے نہ تھے۔

ان مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کالج سطح کے کتنے غیر معمولی
استاد رہے ہوں گے۔ زندگی جھانسی اور الٰہ آباد کی انھی درسگاہوں
میں گزاری تھی۔ جومیٹری، الجبرا وغیرہ پر کچھ درسی کتابیں بھی لکھی تھیں

جن میں اپنے جودتِ طبع کی داد دی ہوگی لیکن زمانہ بدل چکا تھا۔ میک ملن نے یہ لکھ کے نسخے واپس کر دیے کہ ہندی میں لکھ دو تو چھاپ دیں۔ قاضی صاحب اتنی مزدوری کہاں کر سکتے تھے۔ ہرن پہ کہیں گھاس لادی جاتی ہے۔

انھیں اعلیٰ ریاضیاتی اور طبیعیاتی نظریوں سے بھی مَس تھا۔ کہتے تھے اگر شاہ سلیمان کو اچھی ریاضی آتی ہوتی تو اُن کا نظریۂ اضافیت کامیاب ہو جاتا، کیوں کہ وہ آئن اسٹائن سے زیادہ قابلِ فہم مفروضوں پر قایم تھا۔ اس طرح کے دعوے بہتوں نے کیے ہیں۔ مجھے ان سے تفصیل میں جانے کا موقع نہ ملا۔

آخری بار ملاقات ہوئی تو بالکل سنک گئے تھے، پہلے جیسی ذہنی بیداری باقی نہ تھی۔ پھر بھی دبروئی کی مادّے سے متعلق لہروں کا ذکر آیا تو بولے

یہ نظریہ ناقص ہے۔ لہروں کو کہیں مرکوز ہونا
چاہیے ورنہ مادے کا مقامی تعین کیسے ہوگا

وہ لہروں کے پیکٹ کی وکالت کر رہے تھے۔ جب کہ ہمارے یونیورسٹی استاد مکانیکی طور پر ریاضی کر دیتے تھے اور اس بات سے غالباً آشنا ہی نہ تھے کہ اشیا، کی ماہیت بتانے والا سائنس زندگی کے فلسفے کو بھی ڈھالتا جا رہا ہے!

قاضی صاحب ذہانت اور فطانت کے پتلے تھے۔ کسی نے ایک بار اُن سے پوچھا۔ میرے دو لڑکوں کے نام طفیل اور رفیل ہیں تیسرے کا نام کیا رکھوں گا تو برجستہ جواب دیا۔

لڑکا ہو تو غلیل، لڑکی ہو تو چڑیل!

افسوس کہ وہ زندگی بھر بھٹکتے رہے اور ملک کی فضا علمی طور پر ہی نہ تھی کہ ان کی تخلیقی صلاحیتوں سے کام لیا جا سکتا۔ ارنسٹ ہاکنگ کے انواعِ فلسفہ کے مترجم ظفر علی خاں سے قاضی صاحب کی دوستی تھی۔ مرنے سے کچھ دن پہلے ان سے کہنے لگے:

"سنسکرت بڑی آسان زبان ہے۔ ابھی چند
برس ہوئے میں نے سیکھی ہے۔ چاہو تو تمھیں تین
مہینے میں پڑھا دوں۔"

مولانا عبد الماجد دریابادی کی زبانی سنا۔ ایک بار قاضی صاحب الٰہ آباد یونیورسٹی کے ماہر لسانیات ڈاکٹر عبد الستار صدیقی کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ یکایک فرمائش کی۔ مجھے لسانیات کا فلاں مسئلہ سمجھائیے۔

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا کہ یہ باریک علمی مسئلہ ہے، کیسے سمجھا دوں۔ مثلاً میرا خادم، فلاں، اگر آپ سے پوچھے کہ ڈفرنشل کیل کولس کیا ہے تو اسے کیا بتائیے گا۔ قاضی صاحب بپھر پڑے۔

'یہ فرمائش کر کے دیکھیے۔ ابھی ابھی پانچ منٹ میں
اسے آپ کے سامنے سمجھائے دیتا ہوں۔"

لوگوں نے تعلّی سمجھا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ ان کا دعویٰ بجا تھا۔ اُنھیں جو کچھ آتا تھا، اتنی اچھی طرح آتا تھا اور انھیں فنِ تعلیم پر وہ غیر معمولی مہارت حاصل تھی کہ جسے جو چاہتے اس کی عقل کے مطابق سمجھا دیتے۔

ع

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی۔

"اخلاقی تعلیم صرف کتابوں کی تعلیم سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ عمدہ سوسائٹی اس کی تعلیم دیتی ہے۔" ———— سرسیدؒ

تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۷، شمارہ ۱۱ (نومبر ۸۸ء)

پروفیسر مگدی یعقوب — ایک ماہر جراح

محمد فاروق اعظم ★

کسی نسیج یا عضو کو بے کار ہو جانے پر کاٹ کر نکال دینے اور اس کی جگہ صحت مند نسیج یا عضو کو پیوست کر دینے کے عمل کو نسیجی یا عضوی پیوند کاری — (TISSUE/ORGANIC TRANSPLANTATION) کہا جاتا ہے۔ یہ عمل میڈیکل سائنس کے میدان میں مسلسل اور عظیم جد و جہد اور جدید آلات و وسائل کے صحیح استعمال کا نتیجہ ہے۔

پیوند کاری کا آغاز روس اور امریکا نے کیا لیکن انگلستان بھی اس میدان میں پیش پیش ہے اور روس و امریکا کے کاندھے سے کاندھا ملا کر اپنی منزل کی طرف گامزن ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان میں بھی پیوند کاری کا کام شروع ہو چکا ہے اور یہیں گوناگوں کامیابی بھی حاصل ہو رہی ہے۔ آنکھ اور قرنیہ کی پیوند کاری (Eye and Corneal Transplantation) میں یہیں اس قدر کامیابی ملی ہے کہ اب حکومت ہند نے اس کا ایک علیحدہ شعبہ قائم کر دیا ہے جہاں لوگ موت کے بعد اپنی آنکھیں ایسے نابیناؤں کے لیے بطور عطیہ پیش کر رہے ہیں جو معذور ہیں اور اس دنیا کے حسن و خوبصورتی کے دیدار سے مطلق محروم ہیں۔ گردے کی پیوند کاری میں بھی کامیابی مل رہی ہے مگر قلب کی پیوند کاری (Heart-Transplantation) میں یہیں اب تک کامیابی نہیں مل سکی ہے۔ ادھر چند سالوں میں چند مغربی ممالک نے اس میں کامیابی حاصل کی ہیں خصوصاً امریکا، روس اور انگلینڈ نے اس طرف پیش قدمی کی ہے اور انھیں کامیابیاں ملی ہیں اور مل رہی ہیں۔

گریٹ برطانیہ کے ایک پروفیسر مگدی یعقوب کا نام قلب کی کامیاب پیوند کاری کرنے والوں کی فہرست میں سر فہرست ہے پروفیسر مگدی یعقوب ایک مصر نژاد مسلمان ہیں۔ انھوں نے برطانیہ میں رہ کر اعلیٰ تعلیم و تربیت حاصل کی ہے۔ انھیں جراحی (سرجری) میں گہری دلچسپی رہی ہے۔ اس لیے طبی تعلیم کے دوران ان کا مضمون خاص جراحی رہا ہے۔ وہ علم جراحت میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ مقام دیا۔ وہ کافی ذہین اور محنت کش واقع ہوئے ہیں۔ انھیں اپنے کاموں میں کافی دلچسپی ہوتی ہے اور جو کام وہ کرتے ہیں بڑی لگن اور محنت سے کرتے ہیں۔ ان کی زندگی ہمارے نئے طلبا کے لیے مشعل راہ ہے۔ ان کی زندگی کے چند اہم واقعات جو حقائق پر مبنی ہیں انھیں سمجھنے میں معاون ثابت ہوں گے۔

عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ ایک ڈاکٹر یا سرجن کسی ادارہ سے جڑا ہوتا ہے لیکن پروفیسر مگدی یعقوب کے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ کئی ادارے (INSTITUTIONS) جڑے ہوئے ہیں اور وہ ادارے صرف برطانیہ ہی میں واقع نہیں ہیں بلکہ دنیا بھر کے مختلف ادارے ان سے وابستہ ہیں اور ان پر منحصر

★ صدر شعبۂ پیتھولوجی، سبور الیکٹرو ہومیومیڈیکل اینڈ ہاسپٹل، سبور، بھاگلپور۔

بھی ہیں۔ جتنے ادارے پروفیسر مگدی یعقوب سے وابستہ ہیں ان سب کا حق ادا کرنا وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں اور وہ قلب کی جراحی کے کام مشین کی سی تیزی سے کرتے ہیں۔

ڈاکٹر مگدی یعقوب حسب معمول صبح سویرے اُٹھ جاتے ہیں اور دن بھر کے کام کی تیاری میں لگ جاتے ہیں۔ گھریلو ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد وہ ہسپتال کے لیے نکل جاتے ہیں۔ پہلے ایک ہسپتال میں جاتے ہیں جہاں تقریباً بیس معاون سرجنوں کی ایک ٹیم مریضوں کو آپریشن کے لیے بالکل تیار رکھتی ہے۔ وہ آپریشن تھیٹر میں داخل ہوتے ہیں اور آپریشن پہ آپریشن کیے چلے جاتے ہیں۔ پھر دوسرے اسپتال کا رخ کرتے ہیں اور وہاں بھی ان کا یہی عمل رہتا ہے۔ اسپتال کے علاوہ پرائیویٹ کلینک میں بھی جاتے ہیں لیکن وہاں آپریشن رات میں کرتے ہیں عموماً رات کو دس بجے کے بعد یا پھر ہفتہ کے دن۔ ایک سرجن جو نصف صدی (پچاس سال کی عمر) گزار چکا ہو وہ مسلسل پے در پے آپریشن کرتا چلا جائے یقین نہیں آتا ہے لیکن پروفیسر مگدی یعقوب کی عظیم شخصیت نے اس ناقابل یقین کو یقین میں تبدیل کر دکھایا ہے۔ اس سلسلے میں جب ان سے معلوم کیا گیا تو پروفیسر صاحب نے کہا:

"میرے مریضوں کو میری ضرورت پڑتی ہے
اور میں نے کسی کو انکار کرنا نہیں سیکھا ہے۔"

پروفیسر مگدی یعقوب دن رات جراحت القلوب میں مصروف رہتے ہیں اور اس میں وہ کبھی اکتاتے نہیں ہیں۔ انھیں اس کام سے اس قدر دلچسپی ہے کہ وہ اپنا زیادہ تر وقت گھر سے باہر ہی گزارتے ہیں۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ انھیں گھر سے اور گھر کے لوگوں سے بہت کم دلچسپی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ حالاں کہ پرسکون اور خوشگوار زندگی گزارنے کے لیے ان کے پاس سب کچھ موجود ہے۔ ان کی مصروفیت اور گھر سے عدم دلچسپی کا اندازہ آپ ایک واقعے سے لگا سکتے ہیں۔ ایک بار پروفیسر مگدی یعقوب گھر سے صبح سویرے نکل کر اسپتال میں آپریشن میں مشغول تھے کہ اسی وقت سعودی عربیہ سے وہاں کے بادشاہ کی طرف سے بلاوا آیا۔ بادشاہ نے انھیں آپریشن کرنے ہی کے لیے بلوایا تھا۔ جب اس اسپتال کا کام ختم ہوگیا تو وہ سیدھے ہوائی اڈہ پہنچے اور ریاض پہنچ گئے۔ انھوں نے کسی کو بتایا بھی نہیں کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور جانے کی اطلاع گھر والوں کو بھی نہ دی۔ وہاں انھیں پانچ روز ٹھہرنا پڑا۔ اس درمیان میں انھوں نے کئی ایک آپریشن کیے۔ پانچ دن کے بعد انھوں نے اپنی بیوی کو جو لندن میں تھیں فون کے ذریعے بتایا کہ وہ پانچ دن سے ریاض میں ہیں اور دو گھنٹے بعد لندن پہنچ رہے ہیں۔ اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انھیں قلب کے آپریشن سے کس قدر دلچسپی ہے اور وہ اپنے کام میں کس قدر مصروف رہتے ہیں۔

یہ اور اس طرح کے واقعات اکثر پیش آتے رہتے ہیں اس لیے گھر کے افراد بھی ان کی زیادہ کھوج نہیں رکھتے ہیں وہ اپنے کام اور وقت کے اتنے پابند ہیں کہ ان کے کام میں کسی قسم کا رخنہ ڈالنے یا ان کے کام اور وقت کو گھٹا بڑھا کر اِدھر اُدھر کرنے کی ہمت کسی میں نہیں ہوتی۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ لندن کے اولڈ کورٹ اسپتال میں دل کے کرونری سرجری کے دو آپریشن پروفیسر مگدی یعقوب کو کرنے تھے۔ یہ آپریشن صبح ہی ہونا چاہیے تھے لیکن آپریشن تھیٹر تین بجے سہ پہر تک بک تھا اور اس درمیان میں اُن کو ہرگز کبھی جانا تھا۔ لہٰذا انھوں نے تین بجے مذکورہ کیس کا وقت طے کیا اور ہرگز چلے گئے لیکن تین بجے کے بعد ایک آرتھوپیڈک سرجری ہونے والی تھی لہٰذا تین بجنے سے چند منٹ پہلے ایک آرتھوپیڈک سرجن وہاں آگئے۔ لیکن جب اُنھیں معلوم ہوا کہ عین اسی وقت پروفیسر مگدی صاحب کرونری سرجری کرنے والے ہیں تو لامحالہ اس آرتھوپیڈک سرجن کو اپنا وقت بدلنا پڑا۔

وقت کی اہمیت اور اس کی قدر ان کے نزدیک کچھ دوسرا ہی مفہوم رکھتی ہے۔ وقت ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ان کے لیے مریضوں کے امداد و خدمات وقت

ہوتا ہے جن کو انھوں نے نئی زندگی دی اور یہی ان کے لیے دن و رات ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جن اوقات میں میں قلب کے مریضوں کو موت کے گڈھے سے نکالتا ہوں ۔ بس انھیں ہی اپنی زندگی کا اصل اور بہترین وقت سمجھتا ہوں ۔

انسانی نظام حیات میں قلب کی حیثیت مسلّم ہے۔ قلب کی حرکت و سکون پر ہی حیات اور موت کا انحصار ہے۔ دوسرے امراض کی طرح اکثر لوگ مختلف امراض القلوب میں مبتلا ہیں اور حیات و موت میں کشمکش برپا ہے۔ پروفیسر صاحب موصوف کہتے ہیں کہ ایک انسان جب پیدا ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ ایک انسان کو زندگی ملی لیکن یہ زندگی اسے کم و بیش نو مہینے (شکم مادر میں) میں حاصل ہوتی ہے جب کہ پروفیسر صاحب موت کے کنارے کھڑے مریضوں کو چند گھنٹوں میں نئی زندگی دے دیتے ہیں۔ اس لیے تو وہاں کے ایک بڑے سیاست داں کا کہنا ہے :

پروفیسر مگدی یعقوب ہیں تو چند حروف کے آدمی لیکن ان کی شخصیت بہت بڑے کام کی ہے ۔

ڈاکٹر مگدی یعقوب نے جب سرجری کی ڈگری حاصل کرلی تو انھیں ''مسٹر'' کا خطاب ملا ۔ انگلینڈ میں ایک بڑے سرجن کو مسٹر ہی کہا جاتا ہے۔ کچھ دن مسٹر یعقوب کہلانے کے بعد اب وہ پروفیسر مگدی یعقوب ہو گئے ہیں اور جراحت القلب کے استاد مانے جاتے ہیں۔

ابھی ان کا کام دنیا بھر کے ڈاکٹروں کو پڑھا کر علم جراحت میں بہترین ٹریننگ دے کر اپنے اپنے وطن میں بھیجنا ہے۔ ہمارے ملک کے بھی بہت سے سرجن ان سے فیض یاب ہو کر آئے ہیں ۔

امید ہے کہ اب ہمارے ملک میں بھی قلب کی پیوند کاری ممکن ہو جائے گی اور اس طرح لاکھوں انسانوں کی جانیں بچ جائیں گی ۔

"نااتفاقیوں نے ہماری قوم کو نہایت ضعیف اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے، جمعیت کی برکت ہماری قوم سے جاتی رہی ہے۔ قومی ہمدردی اور قومی ترقی اور قومی امور کے سرانجام دینے میں اس نالائق نااتفاقی نے بہت کچھ اثر بد پہونچایا ہے۔ پس ہماری قومی ترقی کا سب سے اول مرحلہ یہ ہے کہ ہم سب آپس کی محبت سے اس عداوت و نفاق کو یکتائی اور یک جہتی سے مبدل کریں۔"

سید

احساس کمتری

حکیم محمد مختار اصلاحی

احساس کمتری کئی طرح کا ہوتا ہے۔ اسے تین بڑی قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ۱۔ جسمانی۔ ۲۔ ذہنی ۳۔ معاشی۔

جسمانی احساس کمتری

قد کے چھوٹے بڑے ہونے، جسم کی رنگت، چہرہ، آنکھ یا کسی عضو کی خرابی، جسم کے کسی عیب یا مسلسل خرابی صحت کی بنا پر ہوتا ہے۔ یہ عیوب و نقائص اور مجبوریاں دوسروں کو انگشت نمائی اور طعنہ زنی کا موقع دیتے ہیں اور یہی طعنہ زنی احساس کمتری کا سبب بنتی ہے۔

ذھنی احساس کمتری

کم عقلی، بے وقوفی، صلاحیت و قابلیت کی کمی اور غیر ضروری حساسیت کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔

معاشی احساس کمتری

اپنے ارد گرد ساتھیوں اور دوستوں کے مقابلے میں مالی کمزوری کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔ مفلس و نادار انسان سوچتا ہے کہ سوسائٹی و معاشرہ میں اسے کوئی عزت کا مقام حاصل نہیں۔ یہ تینوں اقسام تین مختلف قسم کے احساس کمتری کو جنم دیتی ہیں۔

جسمانی طور سے کمزور عموماً ڈانٹ ڈپٹ اور غصہ کرکے دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔ پستہ قد عام طور سے تن کر اور اکڑ کر چلتے ہیں اور کبھی اونچی ٹوپی یا پگڑی باندھ کر اپنے ناٹے اور ٹھگنے پن کی تلافی کرتے ہیں اور کبھی دوسروں کی پگڑیاں اچھال کر دل کو تسلی دیتے ہیں۔ لولے، لنگڑے اچھا لباس پہن کر اور رعب و داب اور فتنہ انگیزی اختیار کرکے اس کمی کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔

ذہنی طور پر پسماندہ عموماً جسمانی طاقت کا مظاہرہ یا بے جا کرکے اپنی بے وقوفی، کند ذہنی اور کم علمی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسکولوں و کالجوں میں زیادہ تر ایسے ہی طلبا اسٹرائک اور لڑائی جھگڑوں میں پیش پیش رہتے ہیں۔ یہی کالج و یونیورسٹی سے نکلنے کے بعد اپنی ڈگری کے ساتھ گھر بیٹھے کچھ اضافی ڈگریاں اور بھی لگا لیتے ہیں تاکہ لوگ ان کو بہت لائق و قابل سمجھیں، جو ہوتے نہیں اس سے کئی گنا زیادہ اپنی صلاحیت و قابلیت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔

معاشی طور پر پسماندگی، جھنجھلاہٹ، احتجاج، حسد اور انتقام کو جنم دیتی ہے۔ کسی غریب بستی یا جھونپڑپٹی کے قریب کوئی خوب صورت سی کار کھڑی کر دی جائے تو وہ اچھی نظر سے نہیں دیکھی جاتی۔ موقع ملے تو پنکچر یا کوئی خرابی ضرور پیدا کر دی جائے گی۔ یہ احساس و احتجاج اس بات کا ہے کہ ایسی کار ہمارے پاس کیوں نہیں ہے؟ اس سے ملتا جلتا احساس کمتری خراب پسماندہ

★ اصلاحی دواخانہ، محمد علی روڈ — بمبئی۔

اور بگڑے ہوئے معاشرے والوں میں بھی دیکھا جاتا ہے۔

احساس کمتری کسی طرح کا بھی ہو اور کسی بھی قسم سے تعلق رکھتا ہو اگر شروع میں توجہ کرکے اسے دور کرنے کی کوشش کی جائے تو دور ہو سکتا ہے ورنہ پھر یہ ایک ایسی بری عادت بن جاتا ہے جس سے چھٹکارا پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ جس شخص میں بھی احساس کمتری حد سے بڑھ جاتا ہے وہ اپنی زندگی کو ہر وقت ایک مصیبت اور وبال جان تصور کرتا ہے۔ ادنیٰ و معمولی سا کام بھی اس کے لیے پہاڑ بن جاتا ہے۔ وہ ہر طرح کی ذمہ داری سے بھاگتا اور مقابلہ آرائی سے گھبراتا ہے۔ ناکامی کا خوف اسے کچھ کرنے نہیں دیتا۔ اس کو ہمیشہ یہ اندیشہ و خطرہ لگا رہتا ہے کہ اگر اپنے محدود حلقے سے نکل کر اس نے کسی جماعت یا سوسائٹی میں شرکت کی تو اس کی نا اہلیت کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔

احساس کمتری جس نوعیت کا ہو اسی لحاظ سے اس کے تدارک کی کوشش کرنا چاہیے۔ جسمانی طور سے جس میں کوئی کمی ہو وہ سوچیں اور غور کریں تو انھیں معلوم ہو جائے گا کہ قدرت کسی ایک نقص یا کمی کی تلافی دوسری طرح سے کر دیا کرتی ہے۔ میں نے زمانۂ طالب علمی میں ایک کاتب صاحب کو دیکھا تھا ان کا داہنا ہاتھ بچپن میں مشین سے کٹ گیا تھا لیکن وہ اپنے بائیں ہاتھ سے اتنا اچھا لکھ لیتے تھے کہ اس دیار میں ان سے بہتر کوئی اور کاتب نہ تھا۔ وہ صرف کتابت کی بدولت نیک نام اور بہت خوش حال تھے۔ شہر میں ایک ڈاکٹر صاحب ہاتھ سے معذور تھے لیکن یہی ڈاکٹر لولے صاحب اپنے حلقے میں سب سے کامیاب ڈاکٹر تھے۔ ایک مشہور روحانی عالم کے کوئی اولاد نہ تھی لیکن ان کی معنوی و روحانی اولاد کا کوئی شمار نہ تھا۔ ابھی حال ہی میں تمام اخباروں میں نمایاں طور پر یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ بارہ سالہ مشہور امریکی اداکارہ جس کو فلم کا سب سے بڑا اعزاز "اوسکر ایوارڈ" ملا ہے وہ گونگی بہری ہے لیکن اس نے اپنی دوسری صلاحیتوں کو کام میں لا کر یہ غیر معمولی اعزاز حاصل کیا۔ جسمانی نقائص کے باوجود اگر عزم و ہمت کے ساتھ دوسری صلاحیتوں سے کام لیا جائے تو زندگی کو کامیاب بنایا جا سکتا ہے۔ پیر سے معذور ایک جوان لڑکے سے میں واقف ہوں، بچپن ہی میں پولیو کے غلط انجکشن کے نتیجے میں اس کا ایک پیر بیکار ہو گیا تھا لیکن اس نے اپنی ہمت قایم رکھی۔ محنت کرکے اچھے نمبروں سے بی کام کیا اور باپ کے انتقال کے بعد اس نے اپنی علمی صلاحیت سے کاروبار کو خوب ترقی دی جس کے نتیجے میں مالدار گھرانے میں ایک تعلیم یافتہ خوب صورت لڑکی سے اس کی شادی ہوئی۔ دونوں خوش و مطمئن ہیں۔ اس کے برعکس یہ دیکھا گیا ہے کہ جسمانی نقائص کے بعد جو لوگ مایوس ہو کر احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں وہ زندگی بھر اپنے ناقص اعضا کو صرف بھیک مانگنے کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔

ذہنی طور سے جو لوگ کمزور ہوتے ہیں، ان کو بھی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ انھیں اپنی ہر صلاحیت کا جائزہ لینا چاہیے اور جس صلاحیت پر انھیں اعتماد ہو، اسی کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں۔ ایک طالب علم انٹر سائنس میں دو سال سے فیل ہو رہا تھا۔ ایک شفیق استاد نے اس کے رجحان کا اندازہ کرکے اس کو آرٹ کے شعبہ میں داخل ہونے کا مشورہ دیا۔ آرٹ میں داخل ہونے کے بعد اس نے اچھے نمبروں سے بی۔ اے اور ایل ایل بی کیا۔

معاشی کمزوری پر بھی کڑھنے اور قسمت کا رونا رونے سے کچھ حاصل نہیں۔ صحیح ڈھنگ سے مسلسل جدوجہد ایسی چیز ہے جو مفلسی و تنگ دستی کو خوش حالی اور رفاغ البالی میں تبدیل کر دیتی ہے۔ کوشش کے باوجود اگر کسی وجہ سے مواقع حاصل نہ ہو سکیں تو پھر صبر و قناعت احساس کمتری سے نجات پانے کا بہترین ذریعہ ہے۔

مشہور مفکر و سیاح سعدی شیرازیؒ کوفہ کا سفر کر رہے تھے اور اُن کے پاؤں میں جوتا نہ تھا۔ اس احساس سے وہ بہت کبیدہ خاطر تھے لیکن جب کوفہ پہنچے تو شہر کے دروازے ہی پر ایک ایسے شخص کو دیکھا جس کے سرے سے دونوں پاؤں ہی نہ تھے۔ اس وقت انھوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں جس

حال میں بھی ہوں۔ اس لولے واپاہج سے تو بہتر ہی ہوں۔ احساس کمتری کے مقابلے میں سوچنے کا یہ انداز اور صبر و شکر کا یہ ہتھیار نہایت ہی کار آمد ہے۔

خالق دو جہاں حکیم بھی ہے اور منصف بھی، اس لیے اس کے ہر کام میں حکمت بھی ہے اور انصاف بھی حکمت و انصاف کا تقاضا ہے کہ نظام عالم کا توازن برقرار رہے۔ چھوٹے قد کے ساتھ لمبے قد، کالے رنگ کے ساتھ گورے رنگ کے جوڑے عام طور سے دیکھے جاتے ہیں۔ کالے کے ساتھ گورے سے جوڑا لگانے میں نئی مصلحتیں کار فرما ہیں۔ ایک طرف کالے صاحب کا احساس کمتری گھٹ جاتا ہے دوسری طرف غرور حسن کا پارہ آسمان پر چڑھنے نہیں پاتا اور اس کے نتیجے میں ایک اوسط رنگ کا خاندان پروان چڑھتا ہے۔

جس طرح ایک بڑی مشین میں ہر طرح کے پرزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کوئی پرزہ خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو اپنی جگہ اس کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کسی دوسرے بڑے پرزے کی۔ اسی طرح قدرت کے اس کارخانہ میں بھی انتظام و اہتمام اور رنگا رنگی کو قایم رکھنے کے لیے، مرد و عورت، چھوٹے بڑے، کالے گورے، بدصورت و خوبصورت، غریب و امیر، کمزور و توانا سبھی ضروری ہیں۔ ؎

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں
(اقبالؒ)

جب اپنی جگہ سبھی اہم ہیں تو پھر کمتر سمجھ کر کسی کو دل جلانے سے فائدہ کیا؟ فائدہ صرف اس میں ہے کہ یقین، امید اور عزم کے چراغ اپنے سینہ میں ہر وقت روشن رکھے اور محنت و لگن کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کو بروکار لائے اور کسی طرح کے احساس کمتری کو پاس نہ آنے دے۔

افراد ہی پر منحصر نہیں ہے، جماعتوں اور قوموں کے لیے بھی قدرت کا یہی دستور اور قانون جاری و ساری ہے جو قومیں اپنی خامیوں اور کمزوریوں پر نگاہ رکھ کر ان کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہیں وہ بلا شبہ عزت و شہرت کے بلند مقام پر پہنچ جاتی ہیں لیکن جو احساس کمتری کا شکار ہو کر غفلت و مایوسی کی کال کوٹھریاں میں بند ہو جاتی ہے وہ بالآخر مفلوج ہو کر صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہیں۔

راز کی ہر بات دوست کو نہ بتاؤ ممکن ہے کہ کسی وقت وہ دشمن بن جائے
اور
دشمن کو نقصان نہ پہنچاؤ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت وہ دوست ہو جائے۔
(مولانا جلال الدین رومی)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد نمبر ۷ شمارہ ۱۱ (نومبر ۸۸ء)

قسم کی اخلاقی و دینی اہمیت

محمد بدیع الزماں*

قسم کی اخلاقی و دینی اہمیت قرآن مجید میں اس طرح ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ یہ آپس میں ایک دوسرے کو دھوکا دینے کا ذریعہ نہ بنا لیا جائے۔ فرمایا گیا:

(اور اے مسلمانو) تم اپنی قسموں کو آپس میں ایک دوسرے کو دھوکا دینے کا ذریعہ نہ بنا لینا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی قدم جمنے کے بعد اکھڑ جائے اور تم اس جرم کی پاداش میں کہ تم نے لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکا، بُرا نتیجہ دیکھو اور سزا بھگتو۔"

(سورۃ النحل ۱۶ - رکوع ۱۳)

دوسری جگہ سرزنش کی گئی کہ:

"تم اپنی قسموں کو آپس کے معاملات میں مکر و فریب کا ہتھیار بناتے ہو۔ تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ کر فائدہ حاصل کرے۔"

(سورۃ النحل ۱۶ - رکوع ۱۳)

قدم جمنے کے بعد اکھڑنے سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص اسلام کی صداقت کا قائل ہو جانے کے بعد، جھوٹی قسموں کی وجہ سے کسی کی بد اخلاقی دیکھ کر اُس دین سے برگشتہ نہ ہو جائے اور اس وجہ سے وہ اہل ایمان کے گروہ میں شامل ہونے سے رُک جائے کہ اس گروہ کے جن لوگوں سے اس کو سابقہ پیش آیا اُن کو اخلاق اور معاملات میں اس نے کفار سے کچھ مختلف نہ پایا۔ دنیاوی فوائد کی خاطر جھوٹی قسمیں کھا کر آپس میں ایک دوسرے کو دھوکا دینے کا ذریعہ بنا لینا اللہ کے عہد کی قیمت میں بہت تھوڑا ہے اور اس بیش بہا چیز کو اس جھوٹی چیز کے عوض بیچنا بہرحال خسارہ کا سودا ہے۔ اس قسم کی قسمیں صرف اخلاقی نقطۂ نظر سے ہی جرم نہیں بلکہ خدا کے نزدیک بدترین گناہ میں شمار ہوتی ہیں۔ ارشاد باری ہے:

"وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں، تو اُن کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اللہ قیامت کے روز نہ ان سے بات کرے گا، نہ اُن کی طرف دیکھے گا اور نہ انھیں پاک کرے گا، بلکہ ان کے لیے تو سخت دردناک سزا ہے۔"

(سورۃ آل عمران ۳ - رکوع ۸)

"اللہ کے عہد کو پورا کرو، جب کہ تم نے اس سے کوئی عہد باندھا ہو اور اپنی قسمیں پختہ کرنے کے بعد توڑ نہ ڈالو۔ جب کہ تم اللہ کو اپنے اوپر گواہ بنا چکے ہو۔ اللہ تمہارے سب افعال سے باخبر ہے۔ تمہاری حالت اس عورت کی سی نہ ہو جائے جس نے آپ ہی محنت سے سوت کاتا اور پھر آپ ہی اسے ٹکڑے ٹکڑے

* رٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، ہارون نگر کالونی۔ فرسٹ سیکٹر، پھلواری شریف۔ پٹنہ۔

کر ڈالا۔"

(سورۃ النحل ۱۶ - رکوع ۱۳)

جس شخص نے کسی بات کی قسم کھائی ہو اور بعد میں اس پر واضح ہو جائے کہ اس قسم کو توڑ دینے میں ہی خیر اور بھلائی ہے، اُسے قسم توڑ دینی چاہیے اور کفارہ ادا کرنا چاہیے۔ کیوں کہ معصیت کی قسم کھانے پر قایم رہنا جائز نہیں۔ مگر جو قسمیں زبان سے بلا ارادہ نکل جاتی ہیں ایسی قسموں پر نہ کفارہ ہے اور نہ ایسی قسموں پر کوئی مواخذہ ہی ہوگا۔ فرمایا گیا:

"اللہ کے نام کو ایسی قسمیں کھانے کے لیے استعمال نہ کرو جن سے مقصود نیکی اور تقویٰ اور بندگانِ خدا کی بھلائی کے کاموں سے باز رہنا ہو۔ اللہ تمہاری ساری باتیں سن رہا ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔"

(سورۃ البقرہ ۲ - رکوع ۲۸)

مہمل قسموں کے متعلق ارشاد ہے:

"جو بے معنیٰ قسمیں تم بلا ارادہ کھا لیا کرتے ہو، ان پر اللہ گرفت نہیں کرتا مگر جو قسمیں تم سچے دل سے کھاتے ہو، اُن کی باز پرس وہ ضرور کرے گا۔ اللہ بہت درگزر کرنے والا اور بُردبار ہے۔"

(سورۃ البقرہ ۲ - رکوع ۲۸)

"تم لوگ جو مہمل قسمیں کھا لیتے ہو اُن پر اللہ گرفت نہیں کرتا، مگر جو قسمیں تم جان بوجھ کر کھاتے ہو اُن پر وہ ضرور تم سے ضرور مواخذہ کرے گا۔"

(سورۃ المائدہ ۵ - رکوع ۱۲)

ایسی قسموں کو توڑنے کا کفارہ جو جان بوجھ کر کھائی گئی ہیں اور جن میں خیر اور بھلائی کا کوئی پہلو نہ ہو، یہ فرمایا گیا کہ:

"کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو وہ اوسط درجے کا کھانا کھلاؤ جو تم اپنے بال بچوں کو کھلاتے ہو، یا انھیں کپڑے پہناؤ، یا ایک غلام آزاد کرو اور جو اس کی اطاعت نہ رکھتا ہو وہ تین دن کے روزے رکھے۔ یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب کہ تم قسم کھا کر توڑ دو۔"

(سورۃ المائدۃ : ۵۔ رکوع ۱۲۔ آیت ۸۹)

کفارہ کے لغوی معنیٰ ہیں "چھپانے والی چیز" کسی کارِ خیر کو کفارہ قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ یہ نیکی اُس گناہ پر چھا جاتی ہے اور اسے ڈھانک لیتی ہے اور اس طرح بندہ کارِ خیر کے ذریعے اس کا اثر اپنی روح سے دھو دیتا ہے اور شرمساری اور ندامت کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ تاکہ نہ صرف یہ گناہ معاف ہو بلکہ آئندہ کے لیے اس کا نفس ایسی غلطیوں کے اعادہ سے بھی محفوظ رہے۔

سورۃ المائدۃ (۵) کے اسی رکوع (۱۲) میں یہ بھی تاکید فرمائی گئی ہے کہ:

"اپنی قسموں کی حفاظت کیا کرو۔"

قسموں کی حفاظت کے کئی مفہوم ہیں۔ ایک یہ کہ قسم کو صحیح مصرف میں استعمال کیا جائے۔ فضول [illegible] معصیت کے کاموں میں استعمال نہ کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ جب کسی بات پر آدمی قسم کھائے تو اُسے یاد رکھے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اسے بھول جائے اور پھر اس کی خلاف ورزی کرے اور تیسرے یہ کہ جب کسی صحیح معاملے میں بالارادہ قسم کھائی جائے تو اسے پورا کیا جائے اور اگر اس کی خلاف ورزی ہو جائے تو اس کا کفارہ ادا کیا جائے۔

قرآن مجید میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ذریعہ کھائی گئی ایک قسم اور اس کے توڑنے پر چند آیات نازل ہوئیں جن کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ اسے توڑنے پر کفارہ ادا کیے جانے کی کوئی ہدایت نہیں نازل ہوئی جس پر فقہا، میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ یہ قسم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر واقعہ، افک کے سلسلے میں لگائی گئی تہمت سے ہے۔ اس تہمت کا اور فتنہ کا اصل بانی تو مدینے کے قبیلہ خزرج کا رئیس عبداللہ بن اُبی بن سلول تھا مگر تین مومنین بھی غلطی اور کمزوری سے اس فتنے میں پڑ گئے تھے ان تین میں ایک مسطح بن اثاثہ تھے، [illegible]

عنایت وشفقت رہا کرتی تھی۔ جب سورۃ النور ۲۴ کی آیات نازل ہونے پر اللہ تعالےٰ حضرت عائشہؓ کی برأت فرمادی تو حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے میری برأت فرمادی تو حضرت ابو بکر صدیقؓ نے قسم کھالی کہ وہ آئندہ کے لیے مسطح بن اثاثہ کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیں گے کیوں کہ انھوں نے نہ رشتہ داری کا کوئی لحاظ کیا اور نہ اُن احسانات ہی کی کچھ شرم کی جو ساری عمران پر اور ان کے خاندان پر کرتے رہے تھے۔ اس پر سورۃ النور ۲۴ کی درج ذیل آیت (۲۲) نازل ہوئی کہ ؛

"تم میں سے جو لوگ صاحب فضل اور صاحب مقدرت ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھا بیٹھیں کہ اپنے رشتہ دار مسکین اور مہاجر فی سبیل اللہ لوگوں کی مدد نہ کریں گے، انھیں معاف کر دینا چاہیے اور درگزر کرنا چاہیے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کرے ؟ اور اللہ کی صفت یہ ہے کہ وہ غفور اور رحیم ہے۔"

ان آیات کو سنتے ہی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے فوراً فرمایا؛

"واللہ! ضرور ہم چاہتے ہیں کہ اے ہمارے رب تو ہماری خطائیں معاف فرمائے۔"

چنانچہ آپؓ نے پھر مسطح کی مدد شروع کر دی اور پہلے سے زیادہ ان پر احسان کرنے لگے۔

ان آیات کی توضیح وتفسیر میں فقہاء میں یہ اختلاف ہے کہ خدائے تعالےٰ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو قسم توڑنے کا حکم تو دیا مگر کفارہ ادا کرنے کی ہدایت نہیں فرمائی۔ اس لیے کچھ فقہاء کا یہ کہنا ہے کہ بھلائی کو اختیار کر لینا ہی ایک قسم کا کفارہ ہے اور اس کے سوا اور کسی کفارہ کی ضرورت نہیں۔ مگر چوں کہ سورۃ المائدۃ (۵) رکوع ۱۲، آیت ۸۹ (جس کا ذکر اس مضمون میں پہلے گزر چکا ہے) نہ تو منسوخ ہی کی گئی تھی اور نہ صاف الفاظ میں اس کے اندر کوئی ترمیم ہی کی گئی۔ اس لیے اس سے زیادہ تر فقہاء یہ رائے لیتے ہیں کہ اگر حضرت ابو بکر صدیقؓ کو قسم توڑ دینے کے حکم کے ساتھ کفارہ ادا کرنے کی ہدایت نہیں کی گئی تو اس سے یہ معلوم ہوا کہ قسم توڑنے کا کفّارہ اور چیز ہے اور بھلائی نہ کرنے سے گناہ کا کفّارہ اور چیز۔ ایک چیز کا کفّارہ بھلائی کو اختیار کر لینا ہے اور دوسری چیز کا کفارہ وہ ہے جو قرآن نے مقرر کر دیا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صاف طور پر ارشاد فرمایا؛۔

"جس نے کسی بات کی قسم کھائی ہو، پھر اسے معلوم ہو کہ دوسری بات اس سے بہتر ہے، اسے چاہیے کہ وہی بات کرے جو بہتر ہے اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دے۔"

دوسرے موقع پر تجرید "صحیح بخاری شریف" (اردو) کے نمبر شمار ۲۰۴۲ میں حضرت عبدالرحمٰن ابن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

"ایک دن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عبدالرحمٰن... تم جب کسی کام کی قسم کھا لو لیکن اس کے خلاف میں بہتری دیکھو تو قسم کو توڑ کر وہی خلاف کر لیا کرو اور قسم کا کفارہ دے دیا کرو۔"

کفّارہ کے سلسلے میں قرآن مجید کی سورۃ صٓ (۳۸) کے رکوع ۴ میں حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری کی حالت میں کسی کو مارنے کی قسم کھا لینے (روایات میں ہے کہ بیوی کو مارنے کی قسم کھائی تھی) پر حضرت ایوبؑ کو قسم نہ توڑنے اور اس کے بدلے اس کا کفارہ ادا کرنے کی ایک خاص ہدایت فرمائی گئی ہے۔ حضرت ایوبؑ کسی سخت مرض میں مبتلا تھے اور ان کی بیماری میں سوا آپؑ کی بیوی کے اور سب نے اُن کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ حتیٰ کہ اولاد تک ان سے منھ موڑ گئی تھی۔ جب آپؑ کی دعا پر خدا تعالےٰ نے آپؑ کو شفا عطا فرمائی تو قسم نہ توڑنے اور اس کا کفارہ ادا کرنے پر یہ آیات نازل ہوئیں:

"اور ہمارے بندے ایوب کا ذکر کرو، جب اُس نے

اپنے رب کو پکارا کہ شیطان نے مجھے تکلیف اور عذاب میں ڈال دیا ہے (ہم نے اسے حکم دیا) اپنا پاؤں زمین پر مار، یہ ہے ٹھنڈا پانی نہانے کے لیے اور پینے کے لیے۔ ہم نے اسے اس کے اہل و عیال واپس دیے اور ان کے ساتھ اُتنے ہی اور اپنی طرف سے رحمت کے طور پر اور عقل و فکر رکھنے والوں کے لیے درس کے طور پر (اور ہم نے اس سے کہا) تنکوں کا ایک مٹھا لے اور اُس سے مار دے، اپنی قسم نہ توڑ۔ ہم نے اسے صابر پایا۔ بہترین بندہ، اپنے رب کی طرف بہت رجوع کرنے والا۔"

فقہاء میں کفارہ کی اس رعایت پر بھی اختلاف ہے۔ بعض اس رعایت کو حضرت ایوبؑ کے لیے خاص سمجھتے ہیں اور بعض فقہاء کے نزدیک دوسرے لوگ بھی اس رعایت سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس آیت کا بتایا ہوا طریقہ استعمال فرمایا ہے۔ مسند احمد، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، طبرانی اور دوسری کتب حدیث میں بھی اس کی تائید کرنے والی کئی حدیثیں موجود ہیں جن سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مریض اور ضعیف پر حد جاری کرنے کے لیے یہی طریقہ مقرر فرمایا۔ علامہ ابوبکر حصاص نے حضرت سعید بن سعد بن عبادہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ قبیلہ بنی ساعدہ میں ایک شخص سے زنا کا ارتکاب ہوا اور وہ ایسا مریض تھا کہ بس ہڈی اور چمڑہ رہ گیا تھا۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ

"کھجور کا ایک ٹہنا لو جس میں سو شاخیں ہوں اور اس سے بیک وقت اس شخص کو مار دو۔"

(احکام القرآن)

قطع نظر اس اختلاف کے جس پر بحث اس مضمون کا موضوع نہیں اس کا ذکر لانے سے صرف یہ ذہن نشین کرانا ہے کہ ان آیات کو حیلۂ شرعی کے لیے دلیل قرار دیا جانا جائز نہیں۔ اِس لیے کہ یہ رعایت کسی فرض سے بچنے کے لیے نہیں بلکہ ایک بُرائی سے بچنے کے لیے بتائی گئی تھی۔ لہٰذا شریعت میں صرف وہی حیلے جائز ہیں جو آدمی کو اپنی ذات سے یا کسی دوسرے شخص سے ظلم اور گناہ اور بُرائی کو دفع کرنے کے لیے اختیار کیے جائیں۔ ورنہ حرام کو حلال کرنے یا فرائض کو ساقط کرنے یا نیکی سے بچنے کے لیے حیلہ سازی گناہ در گناہ ہے، بلکہ اس کے ڈانڈے کفر سے جا ملتے ہیں کیوں کہ جو شخص ان ناپاک اغراض کے لیے حیلہ کرتا ہے وہ گویا خدا کو دھوکا دینا چاہتا ہے۔

جہاں تک کفّارہ ادا کرنے کا سوال ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ذاتی طور پر سورۃ المائدۃ (۵) کے رکوع ۱۲ آیت ۸۹ میں نازل شدہ احکام کے مطابق ہی کفارہ ادا کر کے قسموں کی پابندی سے نکلنے کے طریقے کو اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی گئی، جس پر عمل کر کے آپؐ کو اُس عہد کو توڑ دینے کا حکم دیا گیا جو آپؐ نے ایک حلال چیز کو اپنے اوپر حرام کرنے کے لیے کیا تھا۔

ایک موقع پر آپؐ نے اپنی بیویوں کو خوش کرنے کے لیے شہد نہ کھانے کا عہد کر لیا تھا جس کی تفصیل بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی اور دوسری متعدد کتب حدیث میں خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ گرچہ بعض روایات میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"میں ہرگز نہ پیوں گا، میں نے قسم کھالی ہے"۔

اور بعض میں ——"میں نے قسم کھالی ہے"—— کا ذکر نہیں مگر پھر بھی اس عہد کی پابندی سے نکل جانے کے لیے جو آیات آپؐ پر نازل ہوئیں، اُن کے فقروں سے قسم ہی کھا لینے کا ذکر آتا ہے۔ ارشاد ہوا:-

"اے نبیؐ، تم کیوں اس چیز کو [illegible] تے ہو جو اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہے (کیا اس لیے کہ) تم اپنی بیویوں کی خوشی چاہتے ہو؟ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اللہ نے تم لوگوں کے لیے اپنی قسموں کی پابندی سے نکلنے کا طریقہ مقرر کر دیا ہے۔ اللہ تمہارا مولیٰ ہے اور وہی علیم و حکیم ہے۔"

[سورۃ التحریم ۶۶:۱، رکوع ۱.۶ ۲

اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریم کا یہ فعل اپنی کسی خواہش کی بنا پر نہیں کیا تھا بلکہ محض اپنی بیویوں کو خوش کرنے کے لیے کیا تھا مگر فقہا میں اس پر بھی اختلاف ہے کہ محض تحریم قسم ہے یا نہیں۔ مگر قطع نظر اس بحث و اختلاف کے اس واقعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، انھیں اللہ نے جو طریقے اور قوانین مقرر کیے ہیں وہ سب علم و حکمت پر مبنی ہیں اور ہماری بھلائی اسی میں ہے کہ ہم اُس کے دیے ہوئے احکام کی پیروی کریں۔

قسم کی اخلاقی و دینی اہمیت کے سلسلے میں شہادت کے لیے قسم کھانے کی بات بھی آتی ہے۔ گواہ بننے کا نصاب قرآن مجید کی سورۃ المائدہ ۵ کی آیت ۱۰۶ میں "صاحب عدل" آدمی ہی کو گواہ بنائے جانے کا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ دین دار، راست باز اور قابل اعتماد آدمی ہو۔ اور یہی اصول دنیا کے ہر متمدن ملک کے عدالتی قانون میں رائج ہے۔ شہادت کے لیے اسی سورۃ کے رکوع ۱۴ میں یہ بھی شرط رکھی گئی ہے کہ قبل شہادت دینے کے گواہ خدا کی قسم کھا کر کہے کہ:

"ہم کسی ذاتی فائدے کے عوض شہادت بیچنے والے نہیں ہیں اور خواہ کوئی ہمارا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ (ہم اس کی رعایت کرنے والے نہیں) اور نہ خدا واسطے کی گواہی کو ہم چھپانے والے ہیں۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو گناہ گاروں میں شمار ہوں گے۔"

اگر ہم اس آیت کے الفاظ پر غور کریں تو آج ہمارے اور ہر متمدن ملک کی عدالتوں میں شہادت دینے کے قبل جو قسم گواہ کھاتا ہے وہ ان ہی قرآنی اصولوں پر مبنی ہے۔

قسم کی اخلاقی اور دینی اہمیت کا ایک پہلو قرآن مجید میں وہ طریقہ تصفیہ ہے جسے اسلامی قانون کی اصطلاح میں "لعان" کہتے ہیں۔ جہاں اگر شوہر اپنی بیوی کو زنا کی تہمت لگائے اور کوئی گواہ نہ ہو۔ ایسے اخلاقی جرائم کا یہ طریقہ تصفیہ نازل کرنے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ ایسے بہت سے مقدمات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لائے جانے لگے تھے مگر چوں کہ اُس وقت حدِ قذف کا حکم تو نازل ہو چکا تھا مگر ایسے واقعات جن میں کوئی شہادت موجود نہ ہو، کے تصفیہ کے لیے شرعی احکامات نازل نہ ہوئے تھے۔ تو آپؐ نے خدا تعالیٰ سے دعا کی کہ:

"خدایا! اس مسئلے کا فیصلہ فرما"

(مسلم، بخاری، ابوداؤد، احمد، نسائی)

حضرت ابن عباسؓ کی روایت بخاری، احمد اور ابوداؤد میں منقول ہے کہ ہلال بن امیہؓ نے آکر جب اپنی بیوی کا ایسا ہی معاملہ پیش کیا تو یہ آیات نازل ہوئیں:

اور جو لوگ اپنی بیویوں پر الزام لگائیں اور ان کے پاس خود ان کے اپنے سوا دوسرے کوئی گواہ نہ ہوں تو اُن میں سے ایک شخص کی شہادت (یہ ہے کہ وہ) چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر گواہی دے کہ وہ (اپنے الزام میں) سچا ہے اور پانچویں بار کہے کہ اس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ (اپنے الزام میں) جھوٹا ہو اور عورت سے سزا اس طرح ٹل سکتی ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر شہادت دے کہ یہ شخص (اپنے الزام میں) جھوٹا ہے اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اس بندی پر اللہ کا غضب ٹوٹے۔ اگر وہ (اپنے الزام میں) سچا ہو۔"

(سورۃ النور ۲۴۔ رکوع ۱)

ان آیات لعان اور روایات اور شریعت کے اصول عامہ اسلام میں قانون لعان کے وہ ماخذ ہیں جن کی روشنیوں میں فقہا نے لعان کا مفصل ضابطہ بنایا ہے۔ اگرچہ لعان کے قانونی نتائج سے بعض متفق علیہ ہیں اور بعض میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے مگر اس کا ذکر صرف شہادت کے معاملے میں قسموں کی اخلاقی اور دینی اہمیت کو ذہن نشین کراتا ہے۔

قرآن مجید میں اس کی بھی تاکید آئی ہے کہ بغیر "ان شاء اللہ"

کچھ صرف اپنی قدرت اور اپنے اختیار پر بھروسہ رکھ کر قسم کھا کر یہ نہ کہہ دینا چاہیے کہ میں فلاں کام ضرور کروں گا۔ اس نکتہ کی صراحت تمثیلی پیرایہ بیان میں سورۃ القلم ۶۸ کے رکوع ۱ میں بیان فرمائی گئی ہے جس میں ایسا کرنے کے بُرے نتائج کو بھی سامنے لایا گیا ہے کیونکہ ایسا کرنا خدا فراموشی اور بدنیتی میں مبتلا ہونا ہے۔ فرمایا:

"ہم نے اِن (اہلِ مکہ) کو اسی طرح آزمائش میں ڈالا ہے جس طرح ایک باغ کے مالکوں کو آزمائش میں ڈالا تھا، جب اُنھوں نے قسم کھائی کہ صبح سویرے ضرور اپنے باغ کے پھل توڑیں گے اور وہ کوئی استثنا، نہیں کر رہے تھے۔ رات کو وہ سوئے پڑے تھے کہ تمہارے رب کی طرف سے ایک بلا اس باغ پر پھر گئی اور اس کا ایسا حال ہو گیا جیسے کٹی ہوئی فصل ہو۔ صبح ان لوگوں نے ایک دوسرے کو پکارا کہ اگر پھل توڑنے ہیں تو سویرے سویرے اپنی کھیتی کی طرف نکل چلو۔ چنانچہ وہ چل پڑے اور آپس میں چپکے چپکے کہتے جاتے تھے کہ آج کوئی مسکین تمہارے پاس باغ میں نہ آنے پائے۔ وہ کچھ نہ دینے کا فیصلہ کیے ہوئے صبح سویرے جلدی جلدی اس طرح وہاں گئے جیسے کہ وہ (پھل توڑنے پر) قادر ہیں۔ مگر جب باغ کو دیکھا تو کہنے لگے۔ "ہم راستہ بھول گئے ہیں، نہیں بلکہ ہم محروم رہ گئے۔"

مگر جب انھوں نے اپنے کو محروم پایا تو اُن ہی میں سے ایک ایمان رکھنے والے خدا کی قدرت اور اختیار کا ذکر کیا جو انسان کی تدابیر کو الٹ سکتی ہیں اگر اس میں خدا کی رضا اور خوشنودی کا اظہار نہیں کیا گیا ہے۔ چنانچہ متذکرہ بالا آیات کے بعد ہی ارشاد ہے کہ:۔

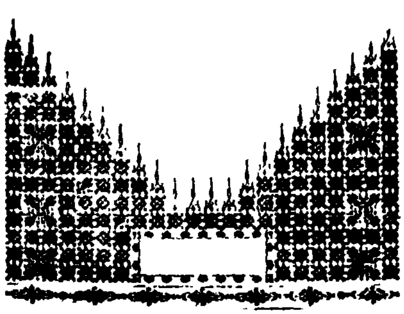
اُن میں سے جو سب سے بہتر آدمی تھا اس نے کہا: "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم تسبیح کیوں نہیں کرتے؟ (یعنی اللہ کو یاد کیوں نہیں کرتے) وہ پکار اُٹھے، "پاک ہے ہمارا رب، واقعی ہم گناہ گار تھے۔" پھر اُن میں سے ہر ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگا۔ آخر کو انھوں نے کہا: "افسوس ہمارے حال پر، بے شک ہم سرکش ہو گئے تھے۔"

بہت سے لوگ معاشرے میں ایسے ہوتے ہیں جو بات بات پر اس لیے قسمیں کھاتے ہیں، چونکہ ان کو خود یہ احساس ہوتا ہے کہ لوگ اسے جھوٹا سمجھتے ہیں اور اس کی بات پر اس وقت تک یقین نہ کریں گے جب تک وہ قسم نہ کھائیں۔ ایسے آدمی کو قرآن مجید میں "حلّافٍ مہین" (بے وقعت آدمی) کہا گیا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی کہ:

"ہرگز نہ دبو کسی ایسے شخص سے جو بہت قسمیں کھانے والا بے وقعت آدمی ہے۔ (ولا تطع کل حلّافٍ مہینٍ)، طعنے دیتا ہے، چغلیاں کھاتا پھرتا ہے، بھلائی سے روکتا ہے، ظلم و زیادتی میں حد سے گزر جانے والا ہے، سخت بداعمال ہے، جفاکار ہے اور ان سب عیوب کے ساتھ بد اصل ہے۔ اس بنا پر کہ وہ بہت مال اور اولاد رکھتا ہے"

(سورۃ القلم ۶۸۔ رکوع۔ ۱)

بہت قسمیں کھانے والے ایسے 'بے وقعت آدمی' کی دیگر خصوصیات بھی ان آیات میں واضح کر دی گئی ہیں۔



ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۷، شمارہ ۱۱ (نومبر ۸۸ء)

قطب جنوبی کا سفر

سیّد مصباح العارفین رضوی*

۶ر دسمبر ۱۹۸۱ء کو صبح ۷ بج کر ۴۵ منٹ پر گوا کی بندرگاہ سے ایک بحری جہاز دور دراز کے انتہائی خطرناک مہم پر روانہ ہوا۔

اس بحری جہاز میں ماہرین ارضیات، ماہرین موسمیات بحری مظاہر کے سائنس داں، ارضی مقناطیس کے ماہرین اور ہندوستانی بحریہ کے افسران شامل تھے۔ ان کے سربراہ ڈاکٹر سید ظہور قاسم تھے جو آن دنوں گوا کے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوشنوگرافی کے ڈائرکٹر تھے۔

اس بحری جہاز کا نام پولر سرکل تھا جو ناروے کی ایک کمپنی جی۔ ایس۔ رائبر اینڈ کمپنی سے کرایہ پر حاصل کیا گیا تھا۔ دہلی کوپٹر کے ساتھ قطب جنوبی کی طرف ایک نئے عزم کے ساتھ روانہ ہوا — ہندوستان کے جنوب میں مدوّر شکل کا یہ براعظم ۵۴ لاکھ مربع میل پر محیط ہے۔ یہ براعظم برف کے بڑے بڑے پہاڑوں اور خوفناک گلیشروں سے بھرا پڑا ہے۔ درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے ۶۰ سے ۸۰ ڈگری کم رہتا ہے۔ موسم انتہائی سرد اور خشک رہتا ہے جس کی وجہ سے سر درد متلی اور بے خوابی کا ہونا لازمی ہے۔ ان امکانات کے پیش نظر جو لوگ اس بحری سفر کے لیے منتخب کیے گئے تھے اُنھیں قطب جنوبی کے موسم کا مقابلہ کرنے کے لیے کئی ہفتوں تک ڈاکٹروں کی نگرانی میں رکھا گیا تھا۔ اس کے باوجود جب یہ ٹیم قطب جنوبی کے ساحل پر اتری تو انتہائی خشک اور سرد ہواؤں کی وجہ سے مختلف امراض میں مبتلا ہو گئی۔ مگر ڈاکٹروں کی فوری پیش بندی کے سبب ہفتہ بھر میں تمام عارضوں سے نجات مل گئی۔

جب یہ جہاز ماریشس پہنچا تو خبر ملی کہ جرمنی کا جہاز جو انٹارکٹکا کی مہم پر روانہ ہوا تھا، راستے میں ڈوب گیا۔ خبر انتہائی حوصلہ شکن تھی مگر ڈاکٹر ظہور قاسم کے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ انھوں نے مزید مزید ایندھن لیا، ریڈیو آلات کا جائزہ لے کر انھیں ازسرِنو درست کرایا اور ۱۰ر دسمبر ۸۱ء کو ماریشس کی بندرگاہ سے نئے عزم و ارادے کے ساتھ قطب جنوبی (انٹارکٹکا) کی طرف روانہ ہوئے۔ روانگی کے وقت موسم خوشگوار تھا لیکن جوں جوں مسافت طے ہوتی جاتی تھی۔ سمندر کے بلاخیز تلاطم میں تیزی آتی جاتی تھی سمندر کے سینے پر تیرتے ہوئے برف کے فلک بوس پہاڑ قدم قدم پر دشواریاں پیدا کر رہے تھے۔ سمندری طوفان کے باعث جہاز تنکے کی طرح ڈولنے لگتا تھا مگر ان تمام دشواریوں کے باوجود سفر جاری تھا اور قطب جنوبی کا فاصلہ روز بروز کم ہوتا جاتا تھا۔

بالآخر تمام دشواریوں اور خطرات کا مقابلہ کرتے ہوئے پولر سرکل ۹ر جنوری ۱۹۸۲ء کو قطب جنوبی کے برفیلے ساحل

---

* ہسپورہ، اورنگ آباد، بہار

بر آ لگا۔ یہ ایک ایسی محیر العقول کامیابی اور عظیم الشان فتح تھی جس سے ہندوستانیوں کے دلوں میں ولولہ خیز امیدوں کو از سر نو بیدار کر دیا انھوں نے مسرت سے نعرہ بلند کیا اور ڈاکٹر ظہور قاسم کی قیادت میں اس پُر اسرار بر اعظم کی زمین پر قدم رکھا۔ حد نگاہ تک برف ہی برف تھی۔ صرف ۵ فیصد حصہ ایسا تھا جو بنجر زمینوں پر مشتمل تھا اس میں پیڑ پودے اور جانور بھی دیکھے گئے۔

ٹیم نے ترنگا جھنڈا نصب کرنے کے بعد اپنا ایک کیمپ لگایا۔ ایک چوبی ہٹ بھی کھڑا کیا جس میں دوائیں، غذائی اشیاء، ایندھن اور دیگر ضروری استعمال کی چیزیں رکھی گئیں۔ تاکہ اگر دوسری کوئی ٹیم وہاں پہنچے تو اُن اشیاء سے فائدہ اُٹھائے۔ چوبی ہٹ میں ایک تختی بھی لگائی گئی جس میں ٹیم کے ممبران کے نام درج تھے۔

سائنس دانوں نے ۲۰ ہزار کلو میٹر کی گہرائی تک کی مقناطیسی لہروں کا مشاہدہ کیا۔ انھیں سمندر کے اندر پیدا ہونے والی گونج سے پتہ چلا کہ تہہ میں ایک عظیم پہاڑی سلسلہ ہے۔ سائنس دانوں نے اس پہاڑ کا نام "اندرا ماونٹ" رکھا۔

ایک موسمیاتی اسٹیشن، دکھشن گنگوتری کے نام سے قایم کیا گیا موسمیاتی مستول شمسی توانائی کی مدد سے خود بخود کمپیوٹر کی ذریعے موسم کا حال ریکارڈ کرے گا۔ یہ کمپیوٹر ایک سال تک کے لیے کار آمد رہا۔

سائنس دانوں نے اپنے مشاہدات کی بنا پر بتایا کہ بحر قطب جنوبی میں قدرتی دولت کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔ شرمپ کی طرح چھوٹی چھوٹی مچھلیاں انتہائی کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ انھیں کرل کہا جاتا ہے۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ قطب جنوبی کے سمندر میں کرل کی مقدار ۱۲۵ ارب میٹرک ٹن سے لے کر ۶ ارب میٹرک ٹن ہے۔ یہ مچھلیاں سطح سمندر پر جھنڈ کی شکل میں تیرتی رہتی ہیں اور آسانی سے پکڑی جاتی ہیں۔ ان مچھلیوں میں پروٹین کی کافی مقدار پائی جاتی ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ان مچھلیوں سے خوراک کا مسئلہ بہ آسانی حل کیا جا سکتا ہے۔ امریکی جیولوجیکل سروے کی ایک رپورٹ کے مطابق قطب جنوبی کے زمینی حصے میں ۴۵۰ کھرب بیرل تیل موجود ہے۔ اس کے علاوہ سونا، لوہا، پلاٹینم، کوئلہ، بالٹ، فاسفورس اور دیگر معدنیات بھی کثرت میں موجود ہیں۔ ہندوستان کی تجویز ہے کہ قطب جنوبی کے موسمی اسٹیشن میں ہندوستانی سائنس داں اور بحری امور کے ماہرین رہیں تاکہ وہاں کے قدرتی ذخائر سے ملک و قوم کو فائدہ پہنچے۔ اس کے علاوہ خلائی پرواز جنوبی حصۂ فلک کے مطالعے کے لیے یہ بر اعظم بہت موزوں ہے۔ مقناطیسی کشش کے مشاہدے کے لیے بھی یہ ایک اہم ترین جگہ ہے۔ کیوں کہ جغرافیائی اصول کے مطابق مقناطیسی قطبین کی جگہ یہی ہے۔ آب و ہوا ایسی ہے کہ نہ تو کسی چیز میں زنگ لگتا ہے اور نہ ہی کسی چیز میں سڑن پیدا ہوتی ہے۔

اس عظیم کامیابی کے بعد ہندوستان بھی انٹارکٹکا کلب کا ممبر بن گیا ہے۔ ایشیا میں یہ جاپان کے بعد دوسرا ملک ہے جسے اس کلب کا ممبر بننے کا شرف حاصل ہو گیا۔ آسٹریلیا، امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس، نیوزی لینڈ، ناروے، ارجنٹائن، چلی، جنوبی افریقہ اور بلجیم بھی اس کلب کے ممبر ہیں۔

ڈاکٹر قاسم کی قیادت میں ہندوستانی ٹیم کو اس مہم میں جو شاندار کامیابی حاصل ہوئی وہ تاریخ کا ایک جز و بن چکی ہے۔ ۱۱ جنوری کو اس وقت کی وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی نے ڈاکٹر سید ظہور قاسم اور ٹیم کے دیگر ممبروں کو مبارک باد کا پیغام بھیجا تھا۔ ملک کو بجا طور پر ڈاکٹر ظہور قاسم اور اُن کے معاونین کے اس عظیم کارنامے پر فخر ہے۔ جن کی کاوش اور جستجو نے ہمیں قطب جنوبی کے جغرافیائی نقشے کو سمجھنے اور وہاں پائی جانے والی معدنیات سے باخبر کیا۔

انٹارکٹکا ٹیم کی واپسی کے بعد لگاتار ہندوستانی سائنس داں اور انجینئروں نے چھٹی بار بھی قطب جنوبی کا سفر کیا اور بہت سے تاریک پہلوؤں کو اجاگر کر کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستان نے دیگر کلب ممبروں پر سبقت حاصل کر لی ہے اور مستقبل روشن دکھائی دیتا ہے۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۷، شمارہ ۱۱ (نومبر ۸۸ء)

سوپر کنڈکٹرس

احرار حسین*
مترجم
صغیر افراہیم**

سوپر کنڈکٹرس کی دریافت نے آج سائنس کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ اس دریافت کا سلسلہ ۱۹۰۸ء سے شروع ہوتا ہے جب ہالینڈ کی لیڈن یونیورسٹی کے پروفیسر قمرلنگ آنس نے ABSOLUTE ZERO کے قریب 4.2 کیلوین پر ہیلیم گیس کو پہلی بار رقیق مادے کی شکل میں حاصل کیا تھا۔ قمرلنگ نے ۱۹۱۱ء میں پارے کو ہیلیم میں ملا کر ایک ٹھوس شکل (مادہ) بنائی تھی اور اس کو ایک تار کی شکل میں منتقل کر کے بجلی کو اس میں سے گزارا تھا۔ اس تجربے سے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ 4.2° کیلوین پر بجلی بغیر کسی رکاوٹ کے تار کے ذریعے بآسانی بہہ سکتی ہے اس کے باوجود تار کا درجۂ حرارت اپنی جگہ برقرار رہتا ہے۔ قمرلنگ نے مذکورہ تجربے سے یہ بات ثابت کر دی کہ ان کے بنائے ہوئے اس نئے مادے میں بجلی کی قوت مدافعت بالکل نہیں ہے۔ اس لیے اس نئے مادے کا نام سوپر کنڈکٹر دیا اور 4.2° کیلوین کو ناقدانہ درجۂ حرارت کے نام سے منسوب کیا۔

سائنس دانوں نے مختلف قسم کے میٹل کے آکسائڈس تیار کیے جو سوپر کنڈکٹرس کی خصوصیت رکھتے تھے جیسے سی زیم، ٹن، پارہ اور سیسا وغیرہ کا ناقدانہ درجۂ حرارت 1.5 کیلوین سے 7.2° کیلوین تک ہوتا ہے، بنانے میں کامیابی حاصل کی لیکن کچھ ایسے ملے جلے مادے بھی تیار کیے جیسے وینیڈیم، سلی کون، نیوبیم ٹن، نی اوبیم، جرمینیم، نی اوبیم، ایلومینیم جن کا ناقدانہ درجۂ حرارت 18° کیلوین سے 23.2° کیلوین تک ہوتا ہے۔

مے ایزنر ایفکٹ:

لیڈن یونیورسٹی کے سائنس دان میزنر اور اوسن فیلڈ نے ۱۹۳۳ء میں ایک تجربہ کیا اور یہ پایا کہ جب کسی سوپر کنڈکٹر کو مقناطیسی ماحول میں رکھا جائے تو مقناطیسی شعاعیں (Magnetic Lines) اس کے اندر سے نہیں گزر پاتی ہیں، اس دریافت کو مے ایزنر ایفیکٹ کے نام سے جانا گیا۔ میزنر اور اوسن فیلڈ نے مذکورہ تجربے سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مقناطیسی ماحول سوپر کنڈکٹرس کے ناقدانہ درجۂ حرارت کو کم کر دیتا ہے اور ایک خاص نقطے پر پہنچنے کے بعد سوپر کنڈکٹر مادے کی سوپر کنڈکٹی وٹی کو ختم کر دیتا ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ کسی سوپر کنڈکٹر کا ناقدانہ درجۂ حرارت صفر ہوتا ہے اور بجلی بہت زیادہ گزر سکتی ہے۔ لیکن ان تجربوں کے نتائج غلط پائے گئے کہ زیادہ مقدار میں بجلی کے گزارنے سے اس میں مقناطیسی اثر پیدا ہو جاتا ہے اور ایک خاص نقطے کے بعد وہ اپنی سوپر کنڈکٹیو ٹی کی خصوصیت کو

* یونیورسٹی پالی ٹیکنک، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ
** شعبۂ اردو، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

ضائع کر دیتا ہے۔

بی۔ سی۔ ایس نظریہ:

سائنس دانوں نے تجربہ گاہوں میں اپنے تجربات سے یہ ثابت کیا کہ میٹلس اور میٹل آکسائڈ میں ایب سولیوٹس زیرو کے نزدیک بجلی کی قوت مدافعت بالکل ختم ہو جاتی ہے اور بجلی بغیر کسی رکاوٹ کے گزر سکتی ہے۔ اس نظریے کی تلاش کمرلنگ نے ۱۹۱۱ء میں کی تھی لیکن باڈن، کیورا اور سرائفر (بی۔ سی۔ ایس) نے ۱۹۵۷ء میں ایب سولیوٹس زیرو پر سوپر کنڈکٹیوٹی کی خصوصیت پیدا ہونے کی اصل وجہ بتائی جس پر ان کو نوبل انعام سے بھی نوازا گیا۔

علم طبیعیات کے سائنس داں:

سوپر کنڈکیٹوٹی کی خصوصیت رکھنے والے مادے آکسائڈ بنانے میں ۱۹۵۸ء سے معروف ہیں لیکن ۱۹۷۳ء تک 4.2° کیلوین سے 23.2° کیلوین تک کے ناقدانہ درجۂ حرارت رکھنے والے سوپر کنڈکٹر بنانے میں کامیابی حاصل کی جا سکی۔ ۱۹۷۳ء میں جان گیوا ایبر نے ایک ایسا سوپر کنڈکٹر بنایا جو 23.2° کیلوین پر کام کر سکتا تھا۔ ۱۹۸۶ء میں آئی۔ بی۔ ایم زیوریچ کے جارج بیڈنارڈ اور ایلیکس میولر نے ناقدانہ درجۂ حرارت کو 30° کیلوین تک پہنچایا اور لینتھنیم، بیریم اور کاپر آکسائڈ کو ملا کر سوپر کنڈکٹرس تیار کیے جس پر ۱۹۸۷ء کا نوبل انعام عطا کیا گیا۔ ان کے بنائے ہوئے آکسائڈس کے نام La, Ba_2CuO_4, $YBa_2Cu_3O_7$ وغیرہ ہیں۔ پروفیسر پال چو نے ۱۹۸۷ء میں بھاری دباؤ کے ذریعے ناقدانہ درجۂ حرارت کو 90° کیلوین تک پہنچانے میں کامیابی حاصل کی۔ اسی سال جیومین چین نے بھی کچھ سوپر کنڈکٹرس اعلیٰ درجے کے بنائے جن کا ناقدانہ درجۂ حرارت 240° کیلوین تک پہنچ گیا۔ جاپان کے سائنس دانوں نے جلد ہی یہ انکشاف کیا کہ ان کے پاس ایسے سوپر کنڈکٹرس ہیں جو 140° پر سوپر کنڈکیٹوٹی کی خصوصیت رکھتے ہیں۔ مارچ ۱۹۸۷ء میں نیشنل فزیکل لیباریٹری، دہلی کے سائنس دانوں نے کچھ ایسے نمونے بنانے میں کامیابی حاصل کی جو 27°C پر (300° کیلوین) پر سوپر کنڈکٹرس کی خصوصیت رکھتے تھے۔ اس طرح سوپر کنڈکٹرس کا ناقدانہ درجۂ حرارت 2°K سے 300°K تک پہنچ گیا۔

ہم سوپر کنڈکٹرس کی اہمیت مندرجہ ذیل عبارت سے سمجھ سکتے ہیں۔ سوپر کنڈکٹرس کو بجلی کے تار کی شکل میں بنا کر ہزاروں کیلو میٹر دور تک بنا کسی نقصان کے دور دراز علاقے تک بھیج سکیں گے اور بجلی ہیٹنگ کے ذریعے ضائع بھی نہیں ہوگی۔ ان کا استعمال میگلیو ریل گاڑیاں بنانے میں کیا جائے گا اور ایسی ریلیں تیار کی جائیں گی جن کی رفتار تقریباً پانچ سو کیلو میٹر تک ممکن ہوگی۔ سوپر کنڈکٹرس کا استعمال علم ادویہ میں بھی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کا استعمال رسولی اور سرطان جیسے بھیانک امراض کے مطالعے میں معاون و مددگار ثابت ہوں گے۔ لو فریکونسی سپر کنڈکٹنگ میگنیکس کا استعمال سب میرین سے رابطہ قائم کرنے کے لیے بھی کیا جا سکے گا۔ سوپر کنڈکٹنگ بیریرس کے استعمال سے کارڈیاک اور دماغی نقل و حرکت سے پیدا ہونے والی مقناطیسی شعاعیں جو Gauss 10^{-7} — 15 ہوتا ہے، کے بارے میں بھی معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ سوپر کنڈکٹرس کا استعمال جوسیفسن جنکشنس میں بھی کیا جائے گا۔ سوپر کنڈکٹرس کا استعمال کمپیوٹرس میں ہائی کرنٹ ڈینسٹیز حاصل کرنے کے لیے بھی کار آمد ثابت ہوگا۔ سائنس دانوں نے لارج کرنٹ ڈینسٹیز کے مسئلے پر بغور مطالعہ اور مشاہدہ کیا ہے۔ اس کنڈکٹرس کا استعمال سوپر کنڈکٹنگ میگنیٹس کے بنانے میں بھی کام آئے گا جس کا استعمال نیوکلیئر میگنیٹک ریزوننس ڈیوائز بھی ہوگا۔ مختصراً ہم اس کے دیگر استعمال پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

۱۔ نیوکلیئر فیوژن
۲۔ میگنیٹو ہائڈرو ڈائنامکس۔
۳۔ اے۔ سی اور ڈی۔ سی جنریٹرس
۴۔ انرجی اسٹوریج
۵۔ پاور کیبلس
۶۔ ایکسیلیریٹرس۔

۷۔ پارٹیکل ڈیٹیکٹرس۔
۸۔ ڈی۔سی۔ موٹرس
۹۔ میگنیٹک سپریشن
۱۰۔ الیکٹرومیگنیٹک تھرسٹرس
۱۱۔ این۔ایم۔آر
۱۲۔ میگنیٹو کارڈی اوگرافی
۱۳۔ جوسفسن جنکشن۔
۱۴۔ سگنل پروسیسرس اور کمپیوٹرس وغیرہ

مندرجہ بالا سے سوپر کنڈکٹرس کی اہمیت اور اس کے استعمال کے بارے میں ہمیں مختصراً اطلاعات فراہم ہوسکی ہیں اس بات سے ہم بخوبی واقف ہوئے کہ سوپر کنڈکٹرس کی تحقیق سے الیکٹرانکس کے میدان میں اب ایک نئے اور تابناک عہد کا آغاز ہو رہا ہے۔ ہمارے ملک کے سائنسدان بھی اس میدان میں پوری طرح لگے ہوئے ہیں جن میں ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف فنڈامنٹل ریسرچ، بمبئی، نیشنل فزیکل لیبوریٹاری، دہلی، بھابھا اٹمک ریسرچ سینٹر بمبئی، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس، بنگلور اور انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی، مدراس اہمیت کے حامل ہیں۔ ہماری حکومت نے اس کی اہمیت اور مقبولیت کے پیش نظر خصوصی توجہ دیتے ہوئے ایک اعلیٰ کمیٹی بنائی ہے جو ہائی ٹمپریچر سوپر کنڈکٹیوٹی کو بڑھانے کے سلسلہ میں مددگار ثابت ہوگی۔

تعلیم کا منشا یہ نہیں ہے کہ چند آدمیوں کی دولت بڑھ جائے تاآنکہ غرباء کے مقابلہ باقی ماندہ اشخاص کی زیادہ رعایت کی جائے اور نہ تعلیم کا منشا یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے یہ لوگ صرف اپنی باہمی محافظت کریں یا سوداگری اور تجارت ہی کو ترقی دیں بلکہ تعلیم کی خاص غایت اور اصل منشا یہ ہے کہ لوگ نیک محضر اور عمدہ قسم کے باشندے ہوجاویں اور لوگوں کے سوشیل اور اخلاقی خصائل کی تکمیل کریں اور ان بھاری اور عمدہ کاموں کا حوصلہ دیں جن سے ملک کی عزت اور زینت ہوتی ہے۔"

سرسیدؒ

اترپردیش کے بیس گرلز انٹر کالجوں اور ہائی اسکولوں میں بورڈ امتحانات میں پوزیشن لانے والی

تراسی ہونہار طالبات کو شیروانی انعامات ۱۹۸۸ء

احمد رشید شیروانی*

الحاجہ بیگم نار رشید شیروانی (چیرمین بھارت سیوا ٹرسٹ چیرمین جیب انڈسٹریل سنڈیکیٹ لمیٹڈ اور منیجنگ ڈائرکٹر شیروانی شوگر سنڈیکیٹ لمیٹڈ) کی طرف سے اترپردیش کے تیرہ گرلز انٹر کالجوں اور سات گرلز ہائی اسکولوں میں فرسٹ ڈویژن کے ساتھ اپنے ادارے میں پوزیشن لانے والی تراسی ہونہار طالبات کے لیے ان اداروں کی پرنسپل صاحباؤں کی معرفت انعامات بھیجے گئے۔ ہر ایک ادارے میں م۱ نے ڈھائی سو روپیے م۲ نے ڈیڑھ سو روپیے اور م۳ نے سو روپیے کا انعام جیتا۔

عبدالسلام مسلم گرلز انٹر کالج۔ مرادآباد

(ہائی اسکول) کماری مشہود الور سلمہا م۲ کماری عطیہ پروین سلمہا م۳ کماری شبینہ خانم سلمہا

(انٹر) کماری نسیم کوثر سلمہا م۲ کماری طلعہ رسول سلمہا م۳ کماری ثمر جہاں سلمہا۔ م۴ کماری غزالہ جمال سلمہا (م۳ اور م۴ کو سو سو روپیے)

آل احمد گرلز انٹر کالج۔ امروھہ۔ ضلع مرادآباد

(ہائی اسکول) م۱ کماری دردانہ شمیم صدیقی سلمہا م۲ کماری شاہین سلمہا۔ م۳ کماری گلناز بانو سلمہا۔

(انٹر) کماری شمع روحی سلمہا م۲ کماری عائشہ سلطانہ سلمہا۔ م۳ کماری نوفیہ انجم سلمہا۔ م۴ کماری منور سلطانہ سلمہا (تیسرا انعام سو روپیہ م۳ اور م۴ میں برابر تقسیم)

حمیدیہ گرلز انٹر کالج۔ الہ آباد

(ہائی اسکول) م۱ کماری نشاط فاروقی سلمہا م۲ کماری خوشنود فاروقی سلمہا م۳ کماری قمر النساء سلمہا

(انٹر) م۱ کماری نشاط انجم سلمہا۔ م۲ کماری صفیہ انجم سلمہا م۳ کماری شاہین آرا سلمہا۔

امام باڑہ مسلم گرلز انٹر کالج۔ گورکھپور

(ہائی اسکول) م۱ کماری نادرہ خاتون سلمہا م۲ کماری زینت فاطمہ سلمہا م۳ کماری سنتوش سری واستو سلمہا۔

(انٹر) م۱ کماری عمرانہ خان سلمہا م۲ کماری نسیم جہاں سلمہا م۳ کماری ہما پروین سلمہا

اسمٰعیل گرلز نیشنل انٹر کالج۔ میرٹھ

(ہائی اسکول) م۱ کماری نیرا دھون سلمہا م۲ کماری ارچنا رانی سلمہا م۳ کماری زاہدہ بانو سلمہا

(انٹر) کماری ریکھا سنگھل سلمہا م۲ کماری ثمیم ریاض سلمہا م۳ کماری نسرین سلمہا۔

---

* ۱۲-اے کناٹ پلیس۔ نئی دہلی

تعلیم گاہ نسواں انٹر کالج ۔ لکھنؤ
ئی اسکول) ۱ کماری حسین فاطمہ سلمہا ۲ کماری نسرین
ہاں سلمہا ۳ کماری رخسانہ جبین سلمہا
نٹر) ۱ کماری نور جہاں سلمہا ۲ کماری نغمہ اکبر سلمہا ۔
۳ کماری زرینہ خاتون سلمہا ۔
سلم جوبلی گرلز انٹر کالج ۔ کانپور
ہائی اسکول) ۱ کماری ریحانہ شکیل سلمہا ۲ کماری عذرا
مال سلمہا ۳ کماری صبوحی تسنیم سلمہا ۔
انٹر) ۱ کماری شہانہ بیگم سلمہا ۲ کماری شائستہ پروین
سلمہا ۔ ۳ کماری ارمانہ بی سلمہا ۔
بیگم خیبر گرلز انٹر کالج ۔ بستی
ائی اسکول) ۱ کماری رجنی سنگھ سلمہا ۲ کماری ندھی
سنگھل سلمہا ۳ کماری انجو تر پاٹھی سلمہا ۔
انٹر) کماری اسمیتا سری واستو سلمہا ۲ کماری رنجنا
سریواستو سلمہا
درسہ نسواں انٹر کالج ۔ اعظم گڑھ
ائی اسکول) ۱ کماری مہناز بانو سلمہا ۲ کماری دیبا عزیز
سلمہا ۳ کماری کلثوم خان سلمہا ۔
نٹر) کماری نعمانہ نعیم سلمہا ۔
نڈسٹریل مسلم گرلز انٹر کالج ۔ سہارنپور
۱ کماری حنا کوثر سلمہا ۲ کماری امیر فاطمہ سلمہا ۳ کماری
نسرین ناز سلمہا ۔
ماجدہ گرلز انٹر کالج ۔ جون پور
۱ کماری عطیہ نسیم واسطی سلمہا ۔ ۲ کماری افشاں بانو سلمہا
کماری ہما رحمٰن سلمہا ۔
سلامیہ گرلز انٹر کالج ۔ بریلی
۱ کماری شبانہ خان سلمہا ۔ ۲ کماری تحسین فاطمہ سلمہا ۳ کماری
شیبا عمر سلمہا ۔
والکلام آزاد گرلز انٹر کالج لکھیم پور کھیری ۱ کماری حمیرا خاتون سلمہا

۳ کماری شاداں خان سلمہا ۔
محمد یہ بنکر نسواں ہائر سکنڈری اسکول، کانپور
۱ کماری عذرا خاتون سلمہا ۔ ۲ کماری فرزانہ بانو سلمہا
۳ کماری افروز جہاں سلمہا ۔
رفیع میموریل گرلز ہائر سکنڈری اسکول یسولی
ضلع بارہ بنکی
۱ کماری سنیتا دیوی سلمہا ۔ ۲ کماری ثمینہ قدوائی سلمہا
۳ کماری سریتا ورما سلمہا ۔
گورنمنٹ گرلز ہائر سکنڈری اسکول سنبھل ضلع مراد آباد
۱ کماری مسرت احسان سلمہا ۔ ۲ کماری سبینہ فرحت سلمہا
۳ کماری غزالہ اسلام سلمہا ۔
فتح پور گرلز ہائر سکنڈری اسکول ضلع اعظم گڑھ
۱ کماری سنیتا پانڈے سلمہا ۔ ۲ کماری مادھری
یادو سلمہا ۔ ۳ کماری معفری خاتون سلمہا ۔
عالیہ گرلز ہائی اسکول ۔ مئوناتھ بھنجن ضلع اعظم گڑھ
۱ کماری عقیلہ خاتون سلمہا ۔ ۲ کماری فرحت بانو سلمہا
۳ کماری ریحانہ خاتون سلمہا
مفتی گنج گرلز ہائر سکنڈری اسکول ۔ لکھنؤ ۔
۱ کماری کنیز مہدی سلمہا ۔ ۲ کماری طلعت پروین سلمہا
۳ کماری ذیشان فاطمہ سلمہا (۲ اور ۳ کو ایک سو
پچیس روپے)
رحمانیہ گرلز ہائر سکنڈری اسکول
چاندپور ۔ ضلع بجنور
۱ کماری شائستہ ناظمی سلمہا ۔

اس طرح تمام بیشں اداروں میں ملا کر
نواسی ہونہار طالبات نے انعامات
جیتے ۔

سائنس کے میدان میں مسلمانوں کا کردار

سید فخر الدین اشرف*

سائنس کے میدان میں مسلمان کیوں اتنا پیچھے ہے۔ مسلمانوں کی سائنسی تعلیم اس قدر مایوس کن کیوں ہے۔ مسلمانوں کا سائنسی مستقبل تاریکی میں کیوں گھرا ہے۔ میری سمجھ سے علما کی اختلافِ رائے کی وجہ سے مسلمانوں کی اکثریت علم سائنس سے متنفر ہے کیونکہ علما نے مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات ڈال دی ہے کہ علم سائنس انسان کو گمراہ کر دیتا ہے۔ علما حضرات نے سائنس کی کھلم کھلا مخالفت کی اور اس علم کو اسلام کا باغی قرار دیا جب کہ سائنس اور اسلام سے کوئی تقابل ہی نہیں۔ کیوں کہ سائنس ایک علم ہے جو انسان کی بقا اور ضرورت کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کیا گیا۔ جہاں پر سائنس کی پرواز ختم ہوتی ہے، وہاں سے اسلام کا آغاز ہوتا ہے۔ اس لیے سائنس اور اسلام کا تقابل کرنا کم علمی کا ثبوت ہے۔ اگر لوگوں کے ذہنوں پر سائنس دشمنی کی یہی رفتار رہی تو مسلم معاشرے کو تباہ کن حالات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم کی حالت نہیں سدھاری جسے اپنی حالت سدھارنے کی فکر نہ ہو۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ (سورۃ رعد)

اسی غفلت کی وجہ سے ہم اپنے اسلاف کے کارہائے عظیم کو بھول چکے ہیں ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ اس سائنس کی ترقی میں ہمارے اسلاف کا مرکزی کردار رہا ہے۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ عربوں کی مرہونِ منت ہے جس وقت یورپ پر جہالت و بربریت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی، اس وقت بغداد، قرطبہ اور طلیطلہ سے تہذیب نمودار ہو رہی تھی جس نے انسان کو ایک نئی سمت عطا کی۔

اسپین کا ایک مسلم سائنس داں جس کا نام ابن فرناس تھا جس نے عینک کا شیشہ، وقت بتلانے کی گھڑی، ایک مشین جو ہوا میں اڑتی تھی ایجاد کر کے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔

یہی نہیں بلکہ عبد الرحمٰن الداخل کے احکامات مسلمانوں کے ایجاد کردہ پریس سے چھپتے تھے۔ ۹۵۰ء میں وہاں پر کاغذ بننے لگا تھا (دی عربس مشرق)

مسلمانوں نے ایسی ایسی ایجادات کیں جن کی روشنی یورپ کی ترقی کی بنیاد ثابت ہوئی۔ ابن رشد ۱۱۹۸ء میں زبردست اسلامی اسکالر تھا جس نے علم طب پر ۱۶ کتابیں لکھیں۔ لسان الدین ابن خطیب ۱۳۷۴ء میں جامع العلوم تھے۔ ساٹھ کتابیں تصنیف فرمائیں جس میں تاریخ، فلسفہ، جغرافیہ اور تصوف تھا۔ عبد اللہ بن عبد العزیز اندلس کا ایک نہایت عظیم جغرافیہ داں گزرا ہے۔ جغرافیہ دانوں میں ابو عبد اللہ کا نام سرفہرست ہے۔ اس نے ۱۱۵۴ء میں علم جغرافیہ پر ایک نہایت اہم تصنیف تصنیف کی جس کا نام "نزہتہ المشتاق فی اختراق الآفاق" ہے۔ یہ کتاب عرصۂ دراز تک یورپ کی درس گاہوں میں داخل نصاب رہی۔ یورپ کے تاریک اندھیروں میں ابن رشد کا فلسفہ، ابن بیطار کے علم نباتات، ابوالقاسم کے علم جراحی، ابن العوام کے علم زراعت، ابن خطیب کے علم تاریخ نے اہل یورپ کے تاریک ذہن کو روشن کر دیا۔ اس میں دو رائے نہیں کہ دورِ حاضر کی تمام ایجادات میں عربوں کا اہم کردار ہے۔ پھر بھی اتنا ہونے کے باوجود ہم اپنے علمی سرمائے کو فراموش کر کے پسماندگی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

حواشی

ہسٹری آف دی مورش امپائر ص ۵ ۸ تا ۱۰۵۔ تمدن عرب ص ۴۳۲

تمدن عرب۔ ص ۴۳۲۔

اندلس میں آٹھ دن۔ بدر القادری۔ ایج آف فیتھ ص ۲۹۸۔

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۷ دسمبر ۸۸ء شمارہ ۱۲

سرپرست : جناب سید ہاشم علی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

جوائنٹ ایڈیٹر	ایڈیٹر
کبیر احمد جائسی	اسرار احمد

تزئین	اسسٹنٹ ایڈیٹر
سرفراز	شباب الدین

انچارج سرکولیشن

مستقیم احمد خان

ترسیل زر کا پتہ

ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

Editor : TAHZIBUL AKHLAQ & NISHANT,
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY.

زر سالانہ

انڈیا —	RS. 30·00
بیرونی ممالک ہوائی ڈاک	US $ 20·00
عام ڈاک	US $ 8·00

مقالہ وخط بھیجنے کا پتہ

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی

اڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ۔

______ انڈیا

مندرجات

اداریہ

ہم بڑی سبک خرامی سے اکیسویں صدی کی طرف گامزن ہیں۔ اِس صدی کی آمد آمد کا ڈنکا کچھ اس طرح پیٹا جا رہا ہے گویا اس کے آتے ہی جہل، ناداری، بھوک، فرض ناشناسی اور تعصب سب ہی کافور ہو جائیں گے اور ہمارا معاشرہ ایک مثالی معاشرہ بن کر پیش رفت کی راہوں پر گامزن ہو جائے گا، اُس معاشرے میں سکون ہوگا، فرض شناسی ہوگی، بے تعصبی ہوگی، علم کی روشنی پھیلے گی، جہالت کا اندھیرا دور ہوگا اور انسان چھوٹے چھوٹے آلام و مصائب سے نجات پا جائے گا۔ خدا کرے اکیسویں صدی ایسی ہی ہو مگر اس کو کیا کیجیے کہ ہمیں اکیسویں صدی سے اس طرح کی کوئی توقع نہیں ہے۔ ہمارا نصف صدی پرانا دماغ جو ممکن ہے سوچتے سوچتے اب مزید سوچنے کے قابل نہ رہ گیا ہو، وہ اکیسویں صدی کی شکل کچھ اس طرح کی دیکھتا ہے کہ "جہل" اور بڑھے گا، بھوک کی زیادتی ہوگی، ناداری عزت نفس کا خون کرتی رہے گی، فرض ناشناسی عام ہوگی اور تعصب ہمارے معاشرے کا جزو اعظم بن چکا ہوگا۔ ہم یہ سطریں کسی وقتی تاثر کے تحت سپرد قلم نہیں کر رہے ہیں بلکہ اس تحریر کی محرک "سیاست" حیدرآباد کی ایک خبر ہے جو مذکورہ روزنامہ کے ۱۹ر نومبر ۹۰ء کے شمارے میں یوں شائع ہوئی ہے:

> "شہر کے ایک ڈپٹی کمشنر پولیس مسٹر درگا پرشاد (ساؤتھ زون) سے ایک ٹریفک ہوم گارڈ نے ۵۰ روپے بطور رشوت طلب کیے جب کہ ڈپٹی کمشنر پولیس سادہ لباس میں اپنی ذاتی فیٹ کار کے ذریعے معظم جاہی مارکیٹ سے گزر رہے تھے۔ ان کی کار کی ایک جانب کا "ہیڈ لائٹ" کام نہیں کر رہا تھا، جسے دیکھ کر وہاں موجود ایک ٹریفک ہوم گارڈ نے جو متذکرہ ڈپٹی کمشنر پولیس سے ناواقف تھا فوری ان کی کار رکوا دی اور انھیں سب انسپکٹر ٹریفک کے پاس حاضر ہونے کی ہدایت دی جس پر ڈپٹی کمشنر نے ٹریفک ہوم گارڈ سے کہا کہ "اس معاملے کو کیوں سب انسپکٹر تک لے جاتے ہو! کیوں اسے یہیں پر ختم نہیں کرتے؟" جس پر ہوم گارڈ نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے ڈپٹی کمشنر پولیس سے ۵۰ روپے کی رقم کا مطالبہ کیا۔ ڈپٹی کمشنر نے ہوم گارڈ کو بتایا کہ ۵۰ روپے کی رقم تو زیادہ ہے، ہو سکتا ہے کہ اس رقم کو تم ہی ہڑپ کر جاؤ۔ تو ہوم گارڈ نے کہا کہ مجھے اس رقم میں سے صرف ۵ روپے ملتے ہیں جب کہ ماباقی ۴۵ روپے کی رقم سب کو تقسیم کرنی پڑتی ہے جس میں ملازمین اور عہدیدار بھی شریک ہیں۔" اس بحث و تکرار کے بعد ڈپٹی کمشنر اپنی کار سے اتر کر سیدھے ٹریفک سب انسپکٹر کے پاس پہنچے جہاں طرفہ تماشا یہ ہوا کہ ٹریفک سب انسپکٹر بھی ڈپٹی کمشنر کی شناخت اس وقت تک

نہیں کرسکے جب تک انھوں نے (ڈپٹی کمشنر) اپنا شناختی کارڈ ان کے سامنے پیش نہیں کیا۔ چنانچہ ڈپٹی کمشنر پولس نے فوری اس واقعہ کو کمشنر پولس کے علم میں لاتے ہوئے انھیں تمام واقعہ سنایا جس کے ساتھ ہی کمشنر پولس نے سخت برہمی کا اظہار کرتے ہوئے تمام ٹریفک ہوم گارڈز ڈیوٹی کو ٹریفک سے برخاست کرتے ہوئے ان کو دیگر شعبہ جات سے منسلک کر دیا ہے۔"

اس خبر کا سب سے عبرت ناک مگر کسی قدر دلچسپ پہلو یہ ہے کہ مذکورہ فرض ناشناسوں کو ان کی ملازمتوں سے برخواست نہیں کیا گیا بلکہ اُن کو "دیگر شعبہ جات سے منسلک کر دیا گیا ہے۔" دیگر شعبوں سے منسلک کرنے کی بات بھی خوب رہی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ فرض ناشناس افراد صرف اسی وقت تک راشی تھے جب تک یہ ٹریفک ڈپارٹمنٹ سے وابستہ تھے، جیسے ہی ان کو دوسرے شعبہ جات میں منتقل کر دیا گیا ان کی نافرض شناسی' فرض شناسی' اور رشوت خوری' ایمان داری سے بدل گئی۔ حالاں کہ یہ بات نہیں ہے۔ اصل بات ہے گرفت کے ڈھیلے پن کی۔ جب سے ہمارے معاشرے میں دونوں کی سیاست دخیل ہوئی ہے اسی طرح کے عجوبے ہر روز ہمارے سامنے آتے ہیں اور ان کا سدّباب صرف اس لیے نہیں ہو پاتا کہ اول تو ان سے اوپر کا طبقہ ہے وہ خود دودھ کا دُھلا نہیں ہے اور اگر کہیں کوئی ہے بھی تو وہ اقدام سے گھبراتا ہے' اس کے گھبرانے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہر بے ایمان' فرض ناشناس اور شقی القلب فرد کے پس پشت کسی کا آہنی ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ آہنی ہاتھ برسر اقتدار پارٹی کے نیتا کا بھی ہو سکتا ہے اور حزب مخالف کے نیتا کا بھی۔ ووٹوں کو حاصل کرنے کے لیے ہمارے نیتاؤں کو مہاتماؤں کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ شورہ پشتوں کی ضرورت ہوتی ہے جو اُن کے لیے دنگا' فساد' بدعنوانی' بے ایمانی سب کچھ کر سکیں۔ اگر ایسے افراد کی پشت پناہی نہ کی جائے تو پھر لیڈری چمکے تو کیسے؟ غالباً یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد دکن کے کمشنر پولس نے راشی ہوم گارڈوں کے خلاف صرف اتنی کارروائی کی کہ ان کو ٹریفک کے محکمے سے ہٹا کر دوسرے محکموں میں بھیج دیا' ان کو یک قلم برخاست نہ کر دیا۔ اگر وہ ایسے کرنے کی جرأت کرتے تو غالباً ان کا آذوقہ' شام وسحر معرض خطر میں پڑجاتا۔ اس لیے انھوں نے دانش مندی اسی میں سمجھی کہ ان کے خلاف کارروائی بھی ہو جائے اور کوئی نیتا اُن کو "کمزوروں کو پریشان کرنے والا، غریبوں کے ساتھ ناانصافی کرنے والا" قرار دے کر خود اُن کے درپے آزار نہ ہو جائے۔ بے ایمانی کے سدّباب میں جب محکمۂ پولس اتنا بے بس ہے تو دوسرے محکموں کا تو ذکر کرنا ہی فضول ہوگا۔ کیا "فرض شناسی" کی یہی مثالیں اکیسویں صدی کا خاصّہ ہوں گی؟ یہ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے مگر اس کا جواب کون دے؟

قوموں کے تنزل کے اسباب

خواجہ غلام السیدین

جب کوئی مورخ دنیا کی مختلف قوموں پر نظر اُٹھا کر دیکھتا ہے تو وہ عموماً یکساں اسباب ان کے تنزل اور کمزوری عقل کے پاتا ہے۔ اور وہ اسباب مختصر صورت میں یہ ہیں

۱۔ کاہلی۔ آرام طلبی، عیش ۲۔ غرور ۳۔ نااتفاقی اور ان سب پر حاوی وہی اندھی خود غرضی ہے جو عقل کی کمزوری سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر جب بعض خاص صفات بعض قوموں میں ترقی پکڑ گئے تو وہ قومیں گر گئیں مثلاً:

۱۔ ۱۔ قدیم یونان کی ترقی آزادیٔ خیالات کی وجہ سے تھی اور وہ ترقی علم و فن میں تھی۔ جب وہ اپنی حد سے باہر ہو کر دنیا کو فتح کرنے لگے اور علم کو پس پشت ڈال دیا تو ان کا تنزل شروع ہو گیا۔

۲۔ رومن قوم نے خود ضبطی اور جفاکشی کی وجہ سے ترقی کی اور عیاشی اور دولت کی وجہ سے ان میں وہ ہزاروں عیب پیدا ہو گئے جن کی تفصیل گبن کے منور صفحات میں نظر آتی ہے۔

۳۔ اہل چین کی ترقی رک گئی اور ٹھہرے پانی کی طرح اس میں بدبو پیدا ہو گئی، وہ اُن کے عقلی تنگ حوصلگی کی وجہ سے ہے۔ یعنی اپنے غرور میں دوسری قوموں کو وہ ایسا حقیر سمجھنے لگے کہ ان سے کوئی بات سیکھنا گوارا نہیں کرتے

۴۔ قریب قریب اسی وجہ سے اور نیز آرام طلبی کی وجہ سے ایران کا تنزل ہے، مگر اس میں ملک اور قوم کی محبت اگرچہ عاقلانہ طور پر نہیں مگر پھر بھی بہت کچھ موجود ہے۔ اس لیے یہ قوم کبھی عرصے تک پست نہیں رہ سکتی۔

۵۔ ترکوں کی اور عموماً مسلمان قوموں کی ترقی اور تنزل دونوں کا اصلی سبب ایک ہی ہے۔ تلوار سے انھوں نے ترقی کی مگر جب دنیا میں تلوار کی جگہ علم سے لڑائی ہونے لگی اور انھوں نے حسب ضرورت علم نہ سیکھا تو وہ اس دوڑ میں کم رہ گئے۔

۶۔ تمدنی حیثیت سے مسلمانوں کی ترقی کا ایک بہت بڑا سبب یہ تھا کہ چند صدیوں تک خُذْ مَا صَفَا کی پاک اور جامع نصیحت پر عمل کرتے تھے۔ جب سے ان میں خود بینی اور دوسری قوموں سے تعصب اور مغایرت پیدا ہو گئی اور اپنی رسوم و عادات میں ایسے پکے ہو گئے کہ دوسری قوموں سے سیکھنا عار بلکہ گناہ سمجھنے لگے، اسی وقت سے دنیا کی تمدنی اور علمی افسری بھی ان کے ہاتھ سے نکل گئی۔ نااتفاقی، کم فہمی اور خود غرضی ہمیشہ ان لوگوں میں پیدا ہوتی ہے جن کا علم اور واقفیت محدود ہے۔ یعنی جاہل لوگوں میں یا ان لوگوں میں جن کا علم خود جہالت ہے اور روشن ضمیری سے نفرت کرتا ہے۔ پس مسلمانوں کے تنزل کے اسباب میں نااتفاقی کوئی خاص جز نہیں ہے بلکہ ان کے ترک علم کا ضروری نتیجہ ہے۔

اس بحث میں ہم چند لفظ اگر ان اسباب کی نسبت بھی بیان کر دیں جو غالباً یورپ کی ترقی کو تباہ کرنے والے ہوں گے تو دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ ہمارے نزدیک یورپ کو جو خطرہ درپیش ہے وہ دولت کی بہتات اور عیش پسندی ہے۔ عیش پسندی کو دولت کی ضرورت ہوتی ہے اور حصول دولت کے لیے بوجہ ضرورت بہت سے خلاف مصلحت اور خلاف انصاف کام کرنے

تے ہیں جن کا نتیجہ بقول لارڈ سالسبری وزیراعظم انگلستان کے موں کی موت ہے۔ دولت اعلیٰ سے اعلیٰ طبائع کو بگاڑ دیتی ہے دعلم کو اپنے ماتحت کرکے بدکاموں کو نیک شکل میں ظاہر کرتی ہے ر نیک کاموں کو بدشکل میں۔ الغرض اس وقت یورپ کو وہی خطرہ درپیش ہے جو آخر زمانے میں رومن ایمپائر کو، خلافت بغداد کو اطین مصر کو اور اسپین کو پیش آیا تھا اور یہ خطرہ ایسا زبردست تھا کہ ان میں سے کوئی اس کا مقابلہ نہ کر سکا۔

دولت مند جماعتیں خواہ وہ یزدجرد کے زمانے کے ایرانی ہوں یا دکن کے امیر یا لندن اور پیرس کے تاجر یا امریکہ کے صراف ہوں عموماً اصلی صفات گم کر دیتے ہیں۔ اُس وقت جری اور بلند وصلہ قومیں جن کی قوتیں سلب نہیں ہوئی ہیں، تازہ دم ہو کر ان پر حملہ کرتی ہیں۔ کچھ عرصے تک پرانی تہذیب اور علم اس رَو کا مقابلہ کرتا ہے مگر آخر میں جس طرح مشرقی رومی سلطنت مسلمانوں کے حملہ کے سامنے اور مغربی سلطنت اہل جرمن کے سامنے اور عباسیوں کی عالی شان خلافت مغلوں کے سامنے نہ ٹھہر سکی، اسی طرح ممکن ہے کہ آئندہ صدی میں ایشیا اور یورپ، افریقہ کے حبشیوں اور سوڈانیوں کی اطاعت قبول کر کے اُن کی تقلید کرنے اور اُن سے تہذیب سیکھنے کو سرمایۂ ناز سمجھیں۔ جو جماعتیں آج نہایت پست ہیں کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا وہ آئندہ ایسی ہی رہیں گی۔ بشرطیکہ وہ ان قوانین تمدن کی پیروی کریں جو انسان کو بلندی کی طرف لے جاتے ہیں۔ جو قومیں نہایت عروج کی حالت میں ہیں یا جن کی خراب حالت ابھی آخری درجے تک نہیں پہنچی ہے وہ اگر تاریخ سے سبق حاصل نہ کریں گی تو آرام طلبی اور غرور کی بدولت زمانۂ مستقبل میں ان کا بھی نام ہی نام رہ جائے گا اور زمانۂ سلف کی تاریخی عبرت نامہ میں مورخ یہ نام اور زیادہ کر دے گا۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ
ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ۔

دنیا بمراد راندہ گیر آخر چہ
وین نامۂ عمر خواندہ گیر آخر چہ
گیرم کہ بکام دل بماندی صد سال
صد سال دگر بماندہ گیر آخر چہ

مورخہ ۵ محرم الحرام ۱۳۱۸ھ

"کاہلی یہ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی سمجھنے میں لوگ غلطی کرتے ہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں سے محنت نہ کرنا، کام کاج، محنت مزدوری میں چستی نہ کرنا، اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے میں سستی کرنا کاہلی ہے۔ مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ دلی قویٰ کو بیکار چھوڑ دینا سب سے بڑی کاہلی ہے۔"

سرسید احمد خاںؒ

مولانا سلیمان ندوی کا پاکستان جانا

حیات اللہ انصاری*

مولانا سید سلیمان ندوی کا پاکستان جاکر نہ آنا' اس پر تہذیب الاخلاق (نومبر ۸۸ء) میں ایک مضمون ابو علی اثری صاحب کا شایع ہوا ہے۔ اس میں واقعات تشنہ ہیں اس وجہ سے غلط نتائج نکل آئے ہیں۔

حکومت خیرسگالی کا ایک وفد پاکستان بھیج رہی تھی' اس میں مولانا سلیمان ندوی کو ممبر نامزد کیا گیا تھا۔ مولانا نے اس میں شرکت کی یہ شرط لگائی کہ وہ وفد کے ہمراہ واپس نہیں آئیں گے۔ وفد کا اصول یہ ہے کہ اس کو اپنے عمل سے یہ ظاہر کرنا چاہیے کہ جس کام کے لیے وہ آیا ہے' وہی اس کی خاص غرض ہے۔ اس لیے مولانا کی شرط تسلیم کرنے میں حکومت کو ذرا دیر لگی لیکن آخر اس نے تسلیم کرلیا اور اس بات کی خبر مولانا کو تار سے دے دی گئی جو وقت پر پہنچ گئی تھی لیکن مولانا وفد میں شامل نہیں ہوئے اور اپنے طور پر چلے گئے۔

مولانا سلیمان ندوی کا قیام پاکستان طویل ہوتا چلا گیا اور ان کے خطوط جو اُن کے دوستوں کے پاس آتے تھے ان سے ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ اُن کی واپسی مشکوک ہے۔

پاکستان میں مولانا کے بیانات اور ملاقاتیں بھی کچھ مشکوک سی رہیں۔ وہاں کے اخباروں نے جو تبصرے کیے اُن سے ان شکوک کو تقویت ملتی گئی۔ ہوسکتا ہے کہ ان باتوں کی وجہ سے ہندوستانی سفارت خانے نے مولانا کی واپسی میں رکاوٹ ڈالی ہو' لیکن مولانا کے لیے راستہ کھلا ہوا تھا کہ وہ رفیع صاحب یا مولانا آزاد کو لکھ سکتے تھے کہ میں واپس آنا چاہتا ہوں۔ چاہتے تو براہ راست جواہر لال جی کو بھی لکھ سکتے تھے۔

مولانا طیب کا معاملہ دوسری طرح کا تھا۔ انھوں نے وہاں جاکر پاکستان کی شہریت لے لی تھی لیکن جس غرض سے یہ کام کیا تھا وہ غرض جب پوری نہ ہوئی تو انھوں نے مولانا مدنی اور مولانا آزاد دونوں کو دستی خطوط بھیجے کہ انھوں نے پاکستان آکر غلطی کی ہے اب ہندوستان واپس آنا چاہتے ہیں لیکن چاہتے ہیں کہ واپسی ایسی ہو کہ ان کی پوزیشن بھی بنی رہے اور دارالعلوم کا عہدہ بھی برقرار رہے۔ پھر انھوں نے خود ہی تجویز پیش کی تھی کہ مولانا مدنی آکر ان کو لے جائیں۔ مولانا آزاد اور مولانا مدنی دونوں نے یہ تجویز منظور کرلی اور مولانا مدنی جاکر ان کو لے آئے اور بدستور دارالعلوم کے مہتمم بنادیے گئے۔

اگر مولانا سلیمان ندوی ہندوستان آنا چاہتے تو وہ بھی اس طرح کا پیام بھجوا سکتے تھے۔ انھوں نے ایسا کیوں نہیں کیا؟

پاکستانی اخباروں نے جب مولانا سے پوچھا کہ آپ نے تو زندگی بھر دارالمصنفین کی خدمت کرنے کی قسم کھائی تھی' پھر اس کو چھوڑ کر کیسے چلے آئے؟ تو انھوں نے کہا کہ آنے کی جہاں اور وجہیں ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ دارالمصنفین کا محکمۂ مالیات ان کے

* ممبر راجیہ سبھا – ۲۴-۲۵ ویسٹرن کورٹ، جن پتھ – نئی دہلی۔

پیسے دینے میں بہت پریشان کرتا تھا۔ جب یہ بات مولانا آزاد کو معلوم ہوئی تو وہ مسعود علی ندوی پر جو کہ انتظامات کے ذمہ دار تھے، ناراض ہوئے۔ مسعود صاحب نے مجھ سے کہا کہ اس بات پر انھوں نے مولانا آزاد کو لے جاکر وہ رجسٹر دکھادیے جن سے ثابت ہوتا تھا کہ مولانا سلیمان کا الزام صحیح نہیں ہے۔ پھر مسعود علی صاحب نے مولانا آزاد سے کہا کہ مولانا سلیمان ہندوستان آجائیں تو وہ (مسعود علی صاحب) استعفا دے کر الگ ہو جائیں گے۔ اس کے بعد مسعود علی اعظم گڑھ چھوڑ کر اپنے وطن بھیارہ (بارہ بنکی) میں رہنے لگے لیکن پھر شاید مولانا آزاد کا حکم ہوا کہ دار المصنفین ہی میں رہو۔ تب وہ پھر وہاں جاکر اپنا کام بدستور کرنے لگے۔

اگر واقعات کا سلسلہ دیکھا جائے تو اس میں شک نہیں رہتا ہے کہ مولانا سلیمان ندوی کا پاکستان میں رہ جانا ویسا سادہ نہیں تھا جیسا کہ اثری صاحب نے پیش کیا ہے۔

مولانا کے پاکستان پہنچنے کے چند ہی دنوں کے بعد ان کی لڑکیاں جن کی عیادت کو مولانا گئے تھے وہ اچھی ہو گئی تھیں۔ لیکن اپنی واپسی کی تاریخیں برابر بڑھاتے چلے گئے، جس کی بظاہر کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ اس درمیان میں انھوں نے اعظم گڑھ کے علمی کاموں کے بارے میں بھی کوئی خاص پوچھ گچھ نہیں کی۔ یہ سب باتیں بتاتی ہیں کہ واقعات کا رنگ کچھ اور تھا۔ مولانا سلیمان کے خطوط جن صاحبان کے پاس آتے رہتے (جن میں علی میاں بھی ہیں) ان خطوط کو اگر دیکھا جائے تو جو میں نے کہا ہے وہ ثابت ہو جائے گا۔

یہ بھی دیکھیے کہ پاکستانی بننے کے بعد مولانا کس قسم کے کام کرنے لگے تھے۔ ایک مرتبہ وہ بنگلا دیش سے جو کہ مشرقی پاکستان کہلاتا تھا، واپسی پر لکھنؤ ٹھہرے تھے اور تب میں ندوہ جاکر ان سے ملا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ وہ بنگالیوں کو یہ سمجھانے گئے تھے کہ وہ بنگالی رسم خط چھوڑ کر اردو رسم خط اختیار کرلیں۔ دلیل یہ دی تھی کہ

"اگر اردو میں بنگالی لکھی ہوئی ہوتی تو میں پڑھ لیتا"

جب میں نے کہا کہ کیا زبان کے پڑھ لینے سے زبان سمجھ میں آسکتی ہے؟ تو وہ بات ٹال گئے۔

مولانا سلیمان پاکستان جانے سے پہلے بھوپال جاکر ایک طویل عرصے تک مقیم رہے تھے اور وہاں کوئی عہدہ چاہتے تھے لیکن اس دوران میں ریاستیں ختم ہو گئیں۔ مسعود صاحب کا خیال تھا کہ مولانا جو ایک عرصے تک پبلک زندگی میں رہ چکے تھے اور خلافت کمیٹی کے ساتھ بیرونی ملک میں بھی جا چکے تھے۔ اب اُن کو وہ زندگی یاد آنے لگی تھی۔

یہ بھی یاد رہے کہ مولانا ندوی سے پہلے بھی ہمارے بعض اکابر یا تو طرح طرح کی معذرتوں کے ساتھ یا ان کے بغیر پاکستان جا چکے تھے اس کام میں پہلی شہرت ہوئی تھی چودھری خلیق الزماں صاحب کی۔ وہ ہندوستان سے وفاداری کا حلف لے چکے تھے۔ اس کے چند دنوں کے بعد یہ کہہ کر کہ

"ہم جا رہے ہیں تاکہ پاکستان کی ہندوستان دشمنی کو کچھ کم کریں"

ہندوستانی حکومت کا ہوائی جہاز لے کر پاکستان چلے گئے، اور وہاں سے دوسرے ہی دن اپنے خاندان والوں کو پاکستان بلا لیا۔ پاکستان جاکر جب وہ کافی عرصے تک گمنام رہے تو انھوں نے عبدالماجد صاحب کے ہفتہ وار "صدق جدید" میں ایک مراسلہ شائع کرایا جس میں لکھا کہ وہ آئے تو تھے دونوں ملکوں میں دوستانہ تعلقات پیدا کرنے، لیکن جب اس میں کامیاب نہیں ہوئے تو گوشہ نشین ہو گئے، اور اب سیاست سے کنارہ کشی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ جس دن یہ خط صدق جدید میں شائع ہوا ہے قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اسی دن کے اخبار میں یہ خبر آگئی کہ خلیق الزماں صاحب پاکستان مسلم لیگ کے صدر بنا دیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ عہدہ اس طرح تو مل نہیں سکتا تھا جس طرح لاٹری کا انعام دفعتاً نکل آتا ہے۔ یہ بات یقینی ہے کہ چودھری صاحب اس کے لیے بہت پہلے سے جد و جہد کر رہے ہوں گے۔

پھر جوش صاحب پاکستان چلے گئے۔ ان کو خطاب بھی مل چکا تھا اور "آجکل" میں اچھی تنخواہ پہ ملازمت بھی۔

جاتے وقت انھوں نے بھی طرح طرح کی باتیں بنائیں اور وہاں جاکر بھی ویسی ہی باتیں بناتے رہے۔ وہ اس طرح دکھاتے تھے کہ وہ کسی مجبوری کے تحت آگئے ہیں پاکستان۔

اس کے بعد گئے نیاز فتح پوری صاحب لیکن وہ جس عذر پر گئے اس میں کچھ جان ہے اور پھر وہ پاکستان میں جس طرح رہے وہ بتاتا ہے کہ ان کا عذر کسی حد تک صحیح تھا۔

حالت یہ تھی کہ لوگ حج یا عمرہ کرنے جاتے اور راستے میں پاکستان اُتر کر رہ جاتے۔ چند لوگ مختلف وفود کے ممبر بن کر بیرونی ملکوں میں گئے لیکن واپسی میں پاکستان میں رہ پڑے۔ کچھ طالب علم سرکاری وظیفے لے کر بیرونی ملکوں میں اعلیٰ علوم کی تکمیل کے لیے گئے اور کام ختم کرکے پاکستان جاکر رہ پڑے۔ بعض علماء وہاں کسی مذہبی جلسے کو خطاب کرنے گئے اور پھر رُک گئے۔ مولانا طیب بھی اسی طرح گئے تھے۔

ایسے ہی پس منظر میں جاچکے تھے سجاد ظہیر، سبط حسن، سید مطلبی اور ان کے ساتھی صاحبان۔ یہ لوگ کمیونسٹ تھے لیکن پاکستان بنوانے میں آگے آگے تھے مگر وہ اس زمانے میں اپنے کو ہندوستان سے وابستہ ظاہر کرتے اور اپنے کو مسلم کہتے تھے۔ اس لیے اُن کے جانے سے بھی مسلمانوں کی ساکھ پر چوٹ لگی۔

ایسے ایسے ذمہ دار علماء اور بڑے لوگوں کے جانے پر غیروں میں جو تبصرے ہوتے تھے اور جو کہ صحیح ہوتے تھے ان کو سن سن کر ہمارے ایسے لوگوں پر گھڑوں پانی پڑ جاتا تھا۔ ایک بڑے مسلم لیڈر نے مجھ سے کہا تھا کہ

"آپ لوگ کچھ کیجیے ایسے افراد کو روکنے کے لیے۔ اس سے تو ہم لوگوں کی ساکھ دن بدن گرتی چلی جارہی ہے۔ لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ ہم سب ہی ایسے ہیں۔"

حالات کی اس بساط پر جمائیے مولانا سلیمان ندوی کا پاکستان جانا۔ پھر وہاں کا طویل قیام اور واپسی کے لیے ادھوری کوشش۔ پھر بتائیے کہ ان کے لیے کیا رائے قائم کی جائے۔

پاکستان نقل وطن کرنے والوں میں سے جن حضرات سے میری وابستگی تھی ان میں مولانا سلیمان ندوی بھی تھے۔ ان سے میں ملتا رہتا تھا اور ایک معاملے میں خط وکتابت بھی ہوئی تھی۔ اگر وہ ہندوستان واپس آنا چاہتے تھے اور بڑے لوگوں کو لکھتے ان کو جواب آرہا تھا تو مجھ خورد کو تو لکھ ہی سکتے تھے، اس میں کیا رکاوٹ تھی؟

"پس اے میرے پیارے نوجوان ہم وطنو! اور اے میری قوم کے بچو! اپنی قوم کی بھلائی پر کوشش کرو، تاکہ اخیر وقت میں اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤ ہمارا زمانہ تو اخیر ہے۔ اب خدا سے یہ دعا ہے کہ کوئی نوجوان اُٹھے اور اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے۔"

سر سید احمد خاںؒ

سائنس اور ٹکنالوجی کے فروغ کا طریقۂ کار اور روایات کا ایک سرسری جائزہ*

محمد ظل الرحمٰن خان**

قدرتی طور پر سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سائنس کسے کہتے ہیں۔ جو جائزہ ہم لینے والے ہیں اس کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ جواب دینا مشکل ہے۔ ہم لفظ سائنس کو بہت وسیع معنیٰ میں استعمال کرنے جا رہے ہیں۔ مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مناظر قدرت کو سمجھنے کی کوشش، مادے اور مختلف قسم کی توانائیوں کو، ان کی خصوصیات کو سمجھنا اور ان کے آپسی تعلق کو جاننے کی کوشش کرنا وغیرہ سائنس کے زمرے میں شمار کیے جاتے ہیں۔ جب سائنس روزمرہ کی ضروریات میں استعمال میں لائی جاتی ہے تو ٹکنالوجی کہلاتی ہے۔ ہم سردست اس بحث میں نہیں جائیں گے کہ کس قسم اور کتنی طرح کی سائنس دینی مدارس میں پڑھائی جانی چاہیے۔

سائنس کی خاص خاص شاخوں کے نام ہیں

طبعیات، کیمیا، ارضیات، نباتیات، حیوانیات اور ان کے علاوہ پچھلی چند دہائیوں میں کچھ اور شاخیں بھی بن گئی ہیں۔ ریاضی سائنس کی کئی شاخوں میں استعمال کی جاتی ہے۔ وہ خود سائنس کی شاخ نہیں ہے البتہ اس کو سائنس کی شاخ کی حیثیت حاصل ہے

سائنس کے رویہ اور طریقۂ کار کو مختصراً بتانا باعثِ دلچسپی ہوگا۔ چنانچہ چند نکات ملاحظہ ہوں۔ سائنس یہ دیکھتی ہے کہ بات کیا کہی گئی ہے۔ یہ اسے مشاہدے اور تجربے کے ذریعے پرکھتی ہے۔ یہ نہیں دیکھتی کہ بات کس نے کہی ہے۔ سائنس کا بنیادی اصول مشاہدہ ہے قرآن شریف میں بھی بار بار اس کائنات پر غور و خوض کرنے اور مشاہدہ کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

ایسی چند مثالیں ہیں کہ کسی شخصیت سے متاثر ہو کر کبھی کبھی سائنس کے لوگ بھی غلط بات کو عرصے تک مانتے رہے اور اس سے نقصانات بھی ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک عرصے تک برطانیہ کے سائنس داں نیوٹن (Newton) کے بتائے ہوئے نور کے غلط نظریے کو مانتے رہے۔ جس کی وجہ سے مبصرین کا خیال ہے کہ انگلستان میں آج تک کوئی قابلِ ذکر نوریائی آلات کی صنعت (Optical industry) جنم نہیں لے سکی ہے اور جرمنی کو اس میدان میں برابر سبقت حاصل رہی ہے۔

سائنس ایک بین الاقوامی سرگرمی ہے جو مذہب، نسل، زبان، دولت، عمر وغیرہ کی بنا پر کوئی تفریق نہیں کرتی۔ کسی سائنس داں کا درجہ صرف اس کے کام سے متعین ہوتا ہے۔ مجھے سائنس کے رویہ میں ذراسی ایک کمی یہ معلوم ہوتی ہے کہ بعض دفعہ جب بنیادی بات موٹے طور پر صاف ہو جاتی ہے تو سائنس اس کو تقریباً چھوڑ دیتی ہے۔ وہ کام پھر پرانے لوگوں کے لیے رہ جاتا ہے۔ مقتدر سائنس وہ ہے جسے لوگ سمجھے نہ ہوں۔

---

* مدارس کے اساتذہ کیلیے مرکز فروغ سائنس، مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقد کیے گئے سائنس کے تعارفی/تربیتی کورس (۲۵ اکتوبر - ۳ نومبر ۸۸ء) میں دیا گیا۔

** پروفیسر ڈپارٹمنٹ آف فزکس، اے۔ ایم۔ یو، علی گڑھ یو۔پی۔

ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ بیشتر دوسرے علوم میں عالم کا رتبہ تجربے اور عمر کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔ سائنس میں اکثر ہونہار نوجوان آدمی عمر رسیدہ سائنس دانوں پر سبقت لے جاتے ہیں ویسے یہ کہنا بہتر ہوگا کہ علمیت (Seniority) عمر رسیدہ سائنس دانوں کی زیادہ ہو سکتی ہے۔ مگر تخلیقی صلاحیتیں جن کی زیادہ اہمیت ہے نوجوانی میں زیادہ ہوتی ہیں۔

سائنس کے اچھے طالب علم نصاب کو رٹنے اور یاد کرنے کے بجائے ان کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح سائنس کے لوگ بحث و مباحثے کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے خیالات کی نکتہ چینی کرتے ہیں لیکن ان اختلافات سے عام طور پر ذاتی تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔ البتہ کبھی کبھی کسی تحقیق یا دریافت کی اولیت کے بارے میں اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔ شدید اختلافات بھی پیدا ہوئے ہیں۔ مثلاً علم الاحصار (Calculus) کی دریافت پر مشہور برطانوی سائنس دان و ریاضی دان نیوٹن (Newton) اور جرمنی کے دانش ور اور ریاضی دان لیبنیز (Leibniz) کے درمیان جھگڑا رہا ہے کہ اس کی دریافت میں سبقت کسے حاصل ہے اس بات پر کہ عناصر کی دوری درجہ بندی (Periodic Classification of Elements) کے لیے کس کو سبقت حاصل ہے مشہور روسی سائنس دان ماندلیف (Mendeleyev) اور جرمن سائنس دان میئر (Meyer) کے درمیان بھی زبردست اختلاف اور ناخوشگواری رہی ہے۔ حتیٰ کہ ماندلیف نے میئر پر چوری کا الزام لگایا۔ یہ جھگڑے اختلاف رائے کی بنا پر نہیں ہوئے۔ صرف اس بنا پر ہوئے کہ دریافت پہلے کس نے کی۔ کم از کم سائنس میں کوئی جھگڑا میرے علم میں نہیں ہے جس کی وجہ محض اختلاف رائے رہی ہو۔ دوسرے علوم میں اکثر مضمون میں اختلاف رائے کی بنا پر ذاتی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ سمجھنا مشکل نہیں ہے۔

سائنس یہ کوشش کرتی رہتی ہے کہ بظاہر بالکل مختلف مظاہر قدرت کو ایک ہی جامع نظریہ پیش کر کے سمجھائے۔ مثلاً نیوٹن کے قوانین حرکت اور مادی کشش نہ صرف سیاروں کی حرکات کو پوری طرح سمجھنے میں مدد دیتے ہیں بلکہ مصنوعی سیاروں (Artificial Satellites) اور مختلف اجسام کی زمین پر حرکات کو بھی اتنی ہی وضاحت اور خوبی سے سمجھاتے ہیں۔ اسی طرح کی ایک مثال یہ ہے کہ بظاہر ایسی مختلف چیزیں جیسے مقناطیسی قوت، تار میں بہنے والی بجلی، نور، فضا میں چلنے والی ریڈیائی لہریں وغیرہ۔ مشہور برطانوی سائنس دان میکسویل (Maxwell) کے ایک ہی نظریے سے سمجھی جاتی ہیں۔ ان مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سائنس تنوع میں وحدت ڈھونڈتی ہے۔ بلکہ اب تو یہ کوشش ہے کہ طبیعات کی تمام قوتوں کے لیے ایک ہی جامع نظریہ بنایا جائے۔ اسے ہم عظیم ترین وحدت نظریے (Super Unification Theories) کہتے ہیں۔ اس کاوش میں اور لوگوں کے علاوہ برصغیر کے دو سائنس دان پروفیسر عبدالسلام اور جوگیش پتی نمایاں حصہ لے رہے ہیں۔

سائنس کا اچھا نظریہ وہ ہے کہ جو کسی ایک مظہر قدرت کو پوری طرح سمجھا سکے اور ساتھ ہی کئی اور مظاہر قدرت کی وضاحت کر سکے انھیں سمجھا سکے اور نئے مظاہر قدرت کی پیشین گوئی کر سکے جن کو تجربے اور مشاہدے سے دیکھا اور پرکھا جا سکے۔

سائنس کے تجربے اور مشاہدات صرف تجربہ گاہ میں ہی نہیں ہوتے ہیں بلکہ آسمان کے تاروں کے مطالعے اور مشاہدے سے بھی بہت مفید معلومات حاصل ہو سکتی ہیں ان مشاہدات سے بہت سی چیزیں تو ایسی دیکھی جا سکتی ہیں جو نہ صرف آج بلکہ شاید کبھی بھی تجربہ گاہ میں نہیں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ اس طرح گویا خدا نے انسان کی محدود صلاحیتوں کو جانتے ہوئے اس کے لیے ایک ایسی تجربہ گاہ بنا دی اور اسے مفت دے دی جسے انسان خود نہیں بنا سکتا تھا۔ انسان کو تو صرف اس کا مشاہدہ کرنا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اسی لیے خدا نے بار بار قرآن شریف میں آسمانوں کا مشاہدہ کرنے کی دعوت دی ہے۔ خدا چاہتا ہے کہ انسان اسی مشاہدے سے استفادہ کرے اور نہ صرف نظریے کو فروغ دے بلکہ اس کو بنی نوع انسان کی بہبود کے لیے استعمال کرے۔ اب تک کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ انسان نے سائنس کو اچھے اور برے دونوں قسم کے کاموں کے

لیے استعمال کیا ہے۔

پرانے زمانے میں حتیٰ کہ دوسری عالمی جنگ سے پہلے تک زیادہ تر تجرباتی طبعیات میں کام کرنے والے سائنس داں اکیلے یا دو تین لوگوں کے ساتھ میں کام کرتے تھے۔ نظریاتی طبعیات میں تو عام طور پر لوگ اکیلے ہی کام کرتے تھے۔ ان کے آلات اکثر بہت بہت سستے ہوتے تھے۔ اور وہ ایسے تھے جو بہت آسانی سے بنائے جاسکتے تھے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد سائنس کی اہمیت کا احساس کافی عام ہوگیا اور یورپ اور امریکہ میں سائنسی تحقیق کے لیے خطیر رقوم منظور کی گئیں۔ اس کے بدولت بڑی قیمتی اور پیچیدہ مشینیں اور آلات سائنسی تجربات کے لیے بنائے گئے یہ سلسلہ برابر بڑھ رہا ہے۔ مالدار اور ترقی یافتہ ملکوں میں آج سائنس پر خطیر رقوم خرچ کی جارہی ہیں جو غریب ملکوں کے کل بجٹ سے کئی گنا زیادہ ہیں۔ سائنس پر اب اتنا خرچ بڑھ گیا ہے کہ کئی سائنسی ادارے مختلف ملکوں نے مل کر بنائے ہیں۔ اس صورت حال میں انفرادی کام کرنے کی گنجائش تجرباتی طبعیات میں تو نہیں کے برابر رہ گئی ہے نظریاتی طبعیات میں گو کہ بہ ظاہر صرف کاغذ اور قلم کی ضرورت ہے مگر اتنے بڑے بڑے شمار کرنے پڑتے ہیں کہ تیز سے تیز تر کمپیوٹروں کی ضرورت پڑتی ہے، جس کی وجہ سے وہاں بھی اکثر تین چار آدمیوں سے کم لوگ کوئی اہم تحقیقاتی کام نہیں کر پاتے ہیں۔ چنانچہ سائنس میں اب انفرادی کام کے بجائے اجتماعی کام زیادہ ہو رہا ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف مذہب، زبان، ملک، قوم، سیاسی عقیدے وغیرہ کے لوگ مل کر کام کرتے ہیں۔ یہ لوگ کام کرتے وقت اپنے اختلافات اپنے تک محدود رکھتے ہیں تاکہ فکری تنازعے سے سائنسی تحقیق کا کام اثر انداز نہ ہو۔ اس طرح سائنس لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لا رہی ہے۔

سائنس دانوں کی یہ ایک بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی تحقیقات کے نتائج چھپ کر منظر عام پر آئیں جن سے ان کے کام کی اہمیت کا اعتراف کیا جا سکے۔ جب کسی سائنسداں کے کام کی تعریف ہوتی ہے تو اسے جو خوشی ہوتی ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اس لیے سائنس داں اس بات پر متفق ہیں کہ ان کے کام کے چھاپنے میں صرف کام کی خوبی کو مد نظر رکھا جائے کسی اور وجہ سے اس کی اشاعت کو نہ روکا جائے۔ لہٰذا سائنس کے رسالے جن میں تحقیقی مضامین شائع ہوتے ہیں صرف کام کی خوبی پر نظر رکھتے ہیں وہ یہ نہیں دیکھتے کہ لکھنے والے کا مذہب، رنگ، نسل، زبان، سیاسی رجحان وغیرہ کیا ہے۔ اب پہلے کے مقابلے میں علمی رسالوں میں شائع ہونے والے تحقیقاتی مقالوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی ہے اور متواتر بڑھتی چلی جارہی ہے۔

جنگی اسلحہ بنانے میں جو سائنس داں کام کرتے ہیں، البتہ اُن کو اپنے کام کے چھاپنے کی پوری آزادی نہیں ہے۔ ان پر پابندیاں ہیں وہ صرف خفیہ رپورٹیں لکھتے ہیں اور اپنے افسران کی جب تک اجازت نہیں ملتی اپنی تحقیق کو عام سائنسی رسالوں میں شائع نہیں کروا سکتے۔ یہ بات سائنس کی روایات اور قدروں کے خلاف ہے۔ اس پر کوئی عالمی سمجھوتہ ہونا چاہیے جس سے سائنس دانوں کو اپنے مقالوں کی اشاعت کی پوری آزادی ملنی چاہیے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ جو انسانی نسل کو جڑ سے ختم کرنے کے شیطانی منصوبے بنا رہے ہیں، ان میں کمی آئے گی۔ وہ حضرات جو سلمان رشدی کی کتاب پر پابندی لگائے جانے کے خلاف ہیں ان کو اپنی آواز پہلے سائنس پر جو پابندیاں لگائی گئی ہیں، اس کے خلاف اُٹھانا چاہیے۔

عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ چونکہ سائنس داں نئی چیزیں دریافت کرتا رہتا ہے اس لیے اس کا ذہن نئے خیالات کو فوراً قبول کرتا ہوگا بدقسمتی سے ایسا نہیں ہے۔ بے شمار مثالیں موجود ہیں جن سے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سائنس داں اپنے خیالات کو بدلنے کے معاملے میں خاصے قدامت پسند واقع ہوئے ہیں۔ مثلاً ارہینیس (Arrhenius) کا واقعہ جسے اس کے آئن کاری (IONIZATION) کے نظریہ پر بعد میں نوبل انعام ملا سائنس دانوں نے شروع میں نہ صرف یہ کہ اس کے نظریے کی شدید نکتہ چینی کی بلکہ اس کے لیے معمولی ملازمت ملنا بھی مشکل کر دیا۔ اسی طرح بوہر (Bohr) کے ایٹمی نظریے کو بھی شروع میں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا جب کہ آج اس کی انقلابی

حیثیت مانی جاتی ہے اور اس کو نئی میکانیات کی بنیاد مانا جاتا ہے۔ ایسی بے شمار مثالیں ہیں۔ گزشتہ زمانے میں جول (Joule) کے حرارت کے نظریے کا بھی ایسا ہی حشر ہوا تھا۔ لوگوں کے ڈر سے نیوٹن اور ڈارون نے اپنے نظریے عرصے تک نہیں چھاپے تھے۔

یہ غلط فہمی کافی عام ہے کہ جب کسی نئے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں کسی پرانے نظریے سے کام نہیں بنتا اور کوئی نیا نظریہ پیش کیا جاتا ہے تو وہ پرانے نظریے کو بالکل باطل اور گمراہ کن قرار دیتا ہے۔ دراصل عام طور پر نئے تجربات کی بنا پر جو نظریہ سامنے آتا ہے وہ پرانے نظریے کے مقابلے میں زیادہ وسیع اور جامع ہوتا ہے اور پرانا نظریہ اس کی ایک خاص صورت ہوتی ہے۔ اس طرح یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ آئن اسٹائن (Einstein) کے نظریۂ اضافیات نے نیوٹن کی میکانیات کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ نئے نظریے نے میکانیات کو ایک نئی وسعت بخشی ہے اور یہ بتایا ہے کہ جب کسی جسم کی رفتار نور کی رفتار سے بہت کم ہو تو نیوٹن کی میکانیات اس کی حرکت کو سمجھنے کے لیے بالکل کافی ہے مگر جب جسم کی رفتار نور کی رفتار کے قریب ہو تو صرف آئن اسٹائن کی میکانیات استعمال کی جائے گی ورنہ غلط نتائج ملیں گے۔ اس طرح میکانیات کو وسعت ملی ہے اور ہم کو نیوٹن کی میکانیات کے حدود معلوم ہوئے ہیں۔

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سائنس میں صرف نیوٹن اور آئن اسٹائن وغیرہ جیسے دیو قامت سائنس دانوں نے دنیا سے الگ ڈھنگ پر سوچ کر انقلاب برپا کیے ہیں اور چھوٹے اور درمیانی درجے کے سائنس دانوں کے کام کی حیثیت کچھ محض خانہ پری سے زیادہ نہیں ہے۔ سائنس کی تاریخ ہمیں اس کے برخلاف بتاتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ خیالات میں ایک تسلسل پایا جاتا ہے۔ یہ بہت ہی کم ہوا ہے کہ کوئی انوکھا خیال کسی کو بالکل اپنے آپ آ گیا ہو جس کا پہلے کوئی نام و نشان نہ ہو۔ مثلاً نیوٹن سے پہلے مشہور اطالوی سائنس داں گیلیلیو نے حرکت کو بڑی حد تک سمجھ لیا تھا لیکن اُن کی کاوشوں کا زیادہ فائدہ نیوٹن نے اُٹھایا اور عام آدمی یہ سمجھتے ہیں کہ نیوٹن نے سارے خیالات خود دیے، یہ صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح آئن اسٹائن کے کام کو کئی لوگوں خصوصاً لورینز (LORENTZ) نے بہت آسان کر دیا تھا۔ اس طرح کی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

موجودہ سائنس زیادہ تر ہمیں یہ بتاتی ہے کہ کوئی مظہر قدرت کیسے ہوتا ہے، وہ کن کن منزلوں سے گزرتا ہے، کیا حالات اس کے لیے سازگار ہیں اور کیا اس میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ اب بھی سائنس بہت کم یہ بتا پاتی ہے کہ بنیادی سطح پر کوئی چیز کیوں ہو رہی ہے مگر سائنس متواتر اس طرف بڑھنے کی کوشش کر رہی ہے۔

پرانے زمانے میں سائنسی معلومات آج کے مقابلے میں بہت ہی کم تھیں اور سائنس کا طریق کار اور روایات بھی مختلف تھیں۔ مثلاً آج کی یونیورسٹیوں اور دوسرے سائنسی اداروں میں سائنس داں باقاعدہ ملازم ہیں، ان کا کام صرف تحقیق و تدریس ہے۔ پرانے زمانے میں ایسے ادارے بہت کم تھے اور اس طرح بہت کم لوگ سائنس اور ریاضی کے کام میں لگے ہوئے تھے۔ کیوں کہ جو تھوڑے بہت ادارے تھے بھی تو اُن میں سائنسی مضامین پر بہت کم زور تھا۔ پرانے زمانے میں سائنس کا کام زیادہ تر متمول لوگ شوق کے طور پر کرتے تھے۔ رسل و رسائل میں بڑی دشواریاں تھیں جس کی وجہ سے ان لوگوں کو تبادلۂ خیالات کرنے میں بڑی دقت ہوتی تھی پھر دستاویزات ہاتھ سے تیار کی جاتی تھیں جس کی وجہ سے ان پر بہت لاگت آتی تھی اور اس وجہ سے ان سے صرف متمول لوگ ہی استفادہ کر سکتے تھے۔ ایسے متمول لوگوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی ان سب مختلف وجوہات کی وجہ سے سائنس پرانے زمانے میں کچھ زیادہ ترقی نہیں کر سکی۔ اسلام کے عروج کے زمانے میں اور اس سے پہلے قدیم یونان میں کسی حد تک منظم کوششیں سائنس کو فروغ دینے کی ہوئیں لیکن سائنس کو آج جتنا فروغ حاصل ہو رہا ہے وہ اس زمانے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ سائنس نے اس زمانے میں آج جیسی ترقی کیوں نہیں کی، ایک دلچسپ سوال ہے۔ حصہ دوم میں اس پر بحث کی جائے گی۔

ان باتوں سے قطع نظر پرانے زمانے کی سائنس کے بہت سے طریقے بھی اب سے کافی مختلف تھے۔ اس وقت کی بہت سی چیزوں

میں سائنس اور جادو میں بہت کم فرق تھا۔ شخصی رائے کی بہت اہمیت سمجھی جاتی تھی۔ چیزوں کے پرکھنے کے معیار بہت سطحی تھے۔ چنانچہ وہ مظاہر قدرت سے عمومی نتائج بہت کم نکال پاتے تھے۔ سائنسی علم و شعور بہت کم تھا۔ مثلاً لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ پانی ایک مرکب چیز ہے جو آکسیجن اور ہائیڈروجن کے آپس میں جڑ جانے سے بنتا ہے۔ وہ اسے عنصر سمجھتے تھے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ہوا کئی گیسوں کا مخلوط ہے۔ موجودہ زمانے کے بہت سے سائنس کے مورخ تو یہ کہتے ہیں کہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ پرانے زمانے میں سائنس نام کی کوئی چیز تھی۔ ان کے خیال میں اسلاف کو قدرت کی کچھ معلومات لمبے عرصے کے تجربے سے حاصل ہوئی تھیں لیکن وہ اس سے کوئی خاص سودمند نتائج نہیں نکال سکے تھے۔ لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اسلاف کی سائنس میں کوئی کارکردگی نہیں تھی اور انھوں نے کچھ نہیں کیا۔ کیوں کہ اگر وہ سب نہ ہوا ہوتا تو جدید زمانے کی سائنس اور ریاضی شروع نہ ہو پاتی ان کی کاوشوں سے جدید سائنس کے بننے میں بڑی مدد ملی ہے۔

ریاضی کے میدان میں صورت حال قدرے بہتر تھی۔ مثلاً یونان میں جیومیٹری (علم الہندسہ) نے کافی عروج حاصل کیا تھا جس میں عربوں نے کچھ اضافے کیے۔ علم مثلث (Trigonometry) بھی شروع ہو چکا تھا۔ اس میں بھی عربوں نے خاصے اضافے کیے۔ صفر کی ایجاد ہو چکی تھی۔ اب تک یہ سنا جاتا ہے کہ صفر ہندوستان کی دین ہے لیکن میں نے حال میں کسی مستند جگہ یہ پڑھا ہے کہ صفر کسی مسلم ریاضی داں نے سب سے پہلے استعمال کیا۔ ہندوستان میں اس کا ذکر چند سال بعد شاید متھرا کے کسی کتبے میں ملتا ہے۔ جو ہندسے آج ہم استعمال کرتے ہیں ان کو مغرب میں عربی ہندسے کہا جاتا ہے ایسا خیال ہے کہ ان ہندسوں کی دریافت میں عربوں کو قدیم ہندوستان کے ریاضی دانوں سے کافی مدد ملی۔ چند اور چھوٹی موٹی چیزیں بھی معلوم تھیں۔

لیکن ریاضی کی بڑی بڑی اہم شاخیں مثلاً لوگورتمس (Logarithms) تفاعلات (Functions) تجزیاتی جیومیٹری (Analytical Geometry) الجبرائی مساوات کا نظریہ (Theory of Algebraic Equation) علم الاحصاء (Calculus) حقیقی اعداد کا نظریہ Theory of real numbers: دوجزی اعداد اور تفاعلات کا نظریہ (Theory of - Complex numbers & functions) دوجزی علم مثلث (Complex Trigonometry) میٹریسیز ٹینسرز (Matrices, Tensors) عددی تجزیہ (Numerical Analysis) وغیرہ کی دریافت کا سلسلہ سترہویں صدی کے آغاز سے شروع ہوا جب سب سے پہلے لوگورتمس وغیرہ دریافت ہوا اور حساب میں قوسین (Brackets) کا استعمال شروع ہوا۔ اس کے بعد سے مسلسل ریاضی ترقی کر رہی ہے۔ پرانے زمانے میں ان سب چیزوں کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ بس اتنا کہا جا سکتا ہے کہ علم حساب (Arithmetic) کافی حد تک فروغ پا چکا تھا۔

چوں کہ معلومات بہت کم تھیں۔ اس لیے اس زمانے کے بڑے بڑے عالم ریاضی، طب، نجوم، فلسفہ وغیرہ تقریباً سار ہی علوم میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ آج علم اتنا بڑھ چکا ہے کہ نوبل ا یافتہ سائنس داں بھی دوسرے مضامین کی بات تو درکنار اپ مضمون کی کوئی ایک دو شاخ کے بارے میں ٹھیک سے جانتے جس کا ان کو ماہر مانا جاتا ہے۔ باقی موٹے موٹے اصول س طور پر جانتے ہیں۔ اس میں ان کو خطاوار قرار نہیں دیا جا سکتا زمانے میں طبیعیات میں ساری دنیا میں صرف دو سائنس دانو بارے میں یہ متفقہ طور پر مانا جاتا ہے کہ ان کو تقریباً ساری طبیعیا پر عبور رہے۔ ایک ہیں روسی سائنس داں لونڈاؤ Landau اور دوسرے امریکی سائنس داں ہانس بیتھے (Hans Bethe) بقید حیات ہیں۔ چونکہ معلومات بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے' آئند زمانے میں ایسے کسی سائنس داں کا جس کو پورے مضمون پر عبور پایا جانا ناممکن معلوم ہوتا ہے۔

لنڈاؤ کے بارے میں ایک بات بتانا باعث دلچسپی ہوگا۔ س اچھے سائنس داں مضمون کی اپنی شاخ کے علمی رسالے برابر پابند سے پڑھتے ہیں۔ یہ محسوسات معلوم ہوئی ہے کہ لنڈاؤ نے کافی عر

پہلے سے علمی رسالے پڑھنا بالکل بند کر دیا تھا مگر ان کے طلباء کی یہ ڈیوٹی تھی کہ وہ برابر رسالوں کو دیکھتے رہیں اور جب بھی کوئی قابلِ ذکر چیز دیکھیں تو اس پر وہ سیمینار دیں۔ جس میں لنڈاؤ بڑے انہماک کے ساتھ حصہ لیتے تھے۔ میں نوجوان سائنس دانوں سے یہ عرض کروں گا کہ وہ اس معاملے میں لنڈاؤ کی تقلید نہ کریں۔

ایک اور قابلِ ذکر بات جو پہلے آ چکی ہے وہ یہ ہے کہ پرانے زمانے میں سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کی رفتار بہت ہی سست تھی جب کہ آج کچھ ضرورت سے زیادہ ہی تیز ہے اس کی وجہ اور باتوں کے علاوہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ پرانے زمانے کی سوسائٹی ایسی تھی جسے سائنس سے بظاہر کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آتا تھا۔ کیوں کہ سوسائٹی بہت ابتدائی حالت میں تھی، اس کی ضروریات بہت کم تھیں۔ رسل و رسائل کے ذرائع بہت کم تھے۔ سفر کرنا خطرناک کام تھا، اس لیے تجارت بہت کم تھی۔ ایسی سوسائٹی کو سائنس اور ٹکنالوجی کی کیا ضرورت ہوتی۔ وہ سائنس کو ایک دماغی تعیش سمجھتی تھی۔ ان باتوں کے علاوہ سائنس جب تک ترقی تیزی سے نہیں کر سکتی۔ جب تک مفید سائنسی نظریے موجود نہ ہوں جو پرانے زمانے میں نہیں تھے۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ بعض چیزیں اس وقت تک دریافت نہیں ہو سکتی تھیں جب تک کہ کچھ اور چیزیں پہلے دریافت نہ ہو چکی ہوتیں۔ مثال کے طور پر جتنی ریاضی چاہیے تھی وہ موجود نہیں تھی۔

پرانے زمانے میں ٹکنالوجی میں آہستہ آہستہ آزمائش اور خطا (Trial & Error) سے ارتقا ہوا جس میں ہزاروں سال لگے اس میں سائنس کو بہت کم دخل تھا۔ بلکہ شروع کے زمانے میں حتیٰ کہ اٹھارویں صدی تک ٹکنالوجی نے سائنس کو زیادہ دیا اور اس سے خود کم استفادہ کر سکی اس کے بعد سے الٹی صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔ موجودہ دور میں سائنس بہت جلد ٹکنالوجی میں بدل جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے اس کی افادیت کا سبھی کو اندازہ ہو گیا ہے۔ لہٰذا بڑی بڑی رقوم سائنس کو بہ آسانی مل جاتی ہیں، حکومتیں سائنس کو فروغ دینے کے لیے بغیر کہے تیار رہتی ہیں۔ مفید نظریات کی موجودگی، بڑی رقوم کی سائنس پر لگنے کی منظوری اور دن بدن سائنس دانوں کی تعداد میں اضافے کی وجہ سے سائنس بڑی تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔

میں اس بات کی طرف خاص طور پر توجہ دلانا چاہوں گا جس طرف پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ سائنس اور ریاضی کی ترقی اس زمانہ میں زیادہ ہوئی ہے جب ان چیزوں کی سوسائٹی میں ضرورت کسی کام کے لیے پڑی ہے۔ بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ مگر اس سے مضمون بہت طویل ہو جائے گا۔ اس لیے صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔ دریائے نیل میں قدیم زمانے میں ہر سال سیلاب آیا کرتا تھا اور دریا اپنا راستہ بدل لیتا تھا جس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کے کھیت دریا میں گم ہو جاتے تھے جس کی وجہ سے بہت سے جھگڑے پیدا ہوتے تھے۔ چنانچہ زمین کی باقاعدہ پیمائش کی ضرورت پیش آئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس ضرورت نے جیومیٹری کو جنم دیا جس کے معنی ہیں زمین کی پیمائش اسی سے علم مثلث پیدا ہوا۔ ویسے یہ بحث زمانے سے چلی آ رہی ہے کہ خیالات و نظریات پہلے وجود میں آئے یا مادّی ترقی کے ہونے سے خیالات پیدا ہوئے۔ میرا خیال یہ ہے کہ زیادہ تر مادی ضروریات خیالات کو جنم دیتی ہیں لیکن جب ایک دفعہ خیالات کی رد کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے تو ضرورتیں پوری ہونے کے بعد بھی یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہتا ہے لیکن اگر آگے چل کر ان کی کوئی افادیت نہیں ہوتی تو وہ مزید آگے نہیں بڑھ پاتے اور ان کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں جس طرح ریت میں جا کر پانی کی دھار جذب ہو جاتی ہے۔

میرے خیال میں دینی مدرسوں میں سائنس برائے سائنس شاید زیادہ نہ چل سکے۔ جس کا استعمال نہ ہو وہ بیکار ہے۔ قدیم زمانے میں کسی نے بھاپ سے چلنے والا ایک پہیا بنایا تھا۔ ضرورت نہیں تھی ہزاروں سال بیکار رہا۔ اس لیے میرے خیال میں شروعات میں کچھ ہنروں میں تربیت دینا نصاب میں شامل کیا جائے، اس کے لیے کچھ معمولی سائنس پڑھائی جائے۔

آخر میں پروفیسر عبدالسلام صاحب کا ایک قول آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو بات بات پر سائنس کی عدالت میں نہیں جانا چاہیے کیونکہ سائنس کے نظریے کبھی بدلتے بھی ہیں۔ سائنس کی روح ہمیں جان لینا چاہیے اور اس کو زندگی کو بہتر بنانے کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔

سر سید کا کام اور پیام

محمد اسحاق*

سرسیّد احمد خانؒ کی یاد منانا، سرسیّد کی روح پر کچھ احسان کرنا نہیں ہے بلکہ اس مردِ مجاہد کی یاد خود ہمارے لیے باعث رحمت ہے۔ اس کی یاد میں بھی وہ اثر ہے کہ قوم کے خوابیدہ ذہن وفکر میں آج بھی حرکت پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ سرسید کا ہی احسان ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں میں پڑھنے لکھنے اور جدید علوم سے واقف ہونے کا خیال پیدا ہوا اور ان علوم کے حصول کا کسی حد تک ذوق وشوق بڑھا۔

سرسیّد کی تعلیمی تحریک کو شروع ہوئے آج ایک سو برس سے زیادہ ہو گئے۔ حالات اب اتنے مایوس کن نہیں ہیں۔ خصوصاً آزادی کے بعد سے کوئی ۲۰، ۲۵ برس تک، تقسیم ہند کی وجہ سے مسلمان کچھ ایسے سیاسی حالات اور تباہی سے دوچار ہوئے کہ انھیں سنبھلنے، اُٹھنے، چلنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ گزشتہ کوئی پندرہ، بیس برسوں سے کچھ مخلص بندے مسلمان بچوں کی تعلیم وتربیت پر توجہ دے رہے ہیں لیکن ابھی اس ملک میں مسلمانوں کی تعلیم کا فیصد ۱۵ سے زیادہ نہیں ہے۔ جدید قومی تعلیمی پالیسی کے ایکشن پلان میں تعلیمی پسماندگی میں مسلمانوں اور نیو بدھسٹ کی نشان دہی کی گئی ہے۔ نیو بدھسٹ وہ ہریجن ہیں جو ڈاکٹر امبیڈکر کے ساتھ بدھ مت قبول کیا تھا، (اُس وقت اُن کی تعداد ۲ لاکھ تھی اب ساٹھ لاکھ کے لگ بھگ ہوگی) اس بستی میں وہ قوم شامل ہو چکی ہے جس کے دین وایمان کی جان، قرآن حکیم کی پہلی آیت ہی پڑھنے اور قلم سے سیکھنے سے متعلق ہے اور ہر وہ علم جاننے کی ہدایت ہے جو وہ نہ جانتا تھا علم الانسان مالم یعلم یہاں پر کوئی قید دین و دنیا کے علم کی نہیں ہے اور پھر

علّم آدم الاسماء کلّھا (۱- ۳۱)

یعنی آدمؑ کو اشیائے کائنات کے تمام اسما، آثار وخواص کا علم دیدیا۔" (تفسیر ماجدی) آثار وخواص کا علم سائنٹفک کھوج ہی سے ممکن ہے اور ساری سائنسی تحقیقات سب کچھ اس دائرے میں آجاتی ہیں۔

مسلمانوں کے پست تعلیمی معیار کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بجا ہے کہ ہم جہاں سے چلے تھے ابھی وہیں ہیں کیوں کہ ملک کے تعلیم یافتہ طبقے کا اوسط ۳۶/۵ فیصد ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہم ایک سو برس تک تعلیم کی وادی میں چلتے رہنے کے باوجود ابھی صرف ہم نے ۱۵ کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا ہے۔ اگر ہم پیچھے مڑکر دیکھتے ہیں تو ہماری خواتین کوئی دس کلومیٹر دوری پر ہیں، منزل تو بہت دور کی بات ہے۔ لیکن یہ صورت حال قوم اور ملک کے لیے بڑی تشویشناک ہے۔

اس صورت حال کی چند بنیادی وجوہات ہیں:

۱- مسلمان فطرتاً ہر نئی چیز کو سمجھنے، پرکھنے اور اسے قبول کرنے کے معاملے میں متشکی واقع ہوئے ہیں۔ وہ نوشتۂ دیوار پڑھنے کے لیے برسوں لگا دیتے ہیں اور جب جاگتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ دوسری قومیں بہت آگے نکل چکی ہیں۔ اس قسم کا

---

* ریٹائرڈ پرنسپل سلطان العلوم کالج آف ایجوکیشن، حیدرآباد،

فکری ڈھانچہ کوئی برس ہا برس میں تیار ہوا ہے جب کہ مذہبی علما نے دنیوی اور مادی علوم، معاش، کسب، ایجادات وغیرہ کا کچھ اس طرز سے مضحکہ اُڑایا کہ امّت مسلمہ کا ذہن اس طرف سے مفلوج ہو گیا۔ اب اس شخص کا لڑکھڑا کر چلنا ہی محال ہے۔ وہ اس برق رفتار زمانے کی دوڑ میں کیا حصّہ لے سکتا ہے۔

۲۔ مسلمانوں میں جہاں تک علم و عمل کا تعلق ہے، قناعت پسندی کا رجحان عام ہے جو تحقیق و تجربہ اور کسی علم میں کمال پیدا کرنے میں سنگِ راہ ہے۔

۳۔ سرسیّدؒ کے انتقال کو آج نوّے برس ہو گئے لیکن اس سارے عرصے میں کوئی ایسا دانش ور نہیں پیدا ہوا جس نے مسلمانوں کی تعلیم کے کام کو اپنی زندگی کا واحد مقصد اور اوڑھنا بچھونا ہی بنا لیا ہو۔ بے شک مسلمانوں میں کل ہند سطح کے بڑے سیاسی لیڈر اور مذہبی رہنما پیدا ہوئے لیکن ان کی تقاریر اور تحریریں پڑھ جائیے کسی نے مسلمانوں کی جہالت دور کرنے اور تعلیم حاصل کرنے پر چند جملے بھی نہیں کہے ہیں۔ ہاں سرسیّد کے بعد سارے ملک میں کسی نے تعلیمی مشن کو چلانے کے لیے ۲۵ برس تک خاموش کوشش جاری رکھی، تاکہ کوئی چشمہ ہی جاری ہو جائے، وہ اکیلا نام ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کا نظر آتا ہے اور پھر اُن کے پُرخلوص ساتھی پروفیسر محمد مجیب اور ڈاکٹر عابد حسین نظر آتے ہیں۔

۴۔ قوم غریب اور مفلس ہے، اس لیے تعلیم نہیں پاتی اور وہ تعلیم سے نابلد ہے، اسی لیے تو غریب ہے۔ غربت تب ہی دور ہو سکتی ہے جب کہ لوگ تعلیم یافتہ ہوں اور تعلیم کے راستے میں غربت ایک بڑا پتھر ہے، جو ہٹتا نہیں۔ غربت اور جہالت ایک ایسا منحوس چکّر ہے جس کا سرا ملتا نہیں۔

سرسیّد کی دانش مندی

سرسیّدؒ ۱۸۵۷ء کے غدر سے پہلے اور بعد کے حالات دیکھ رہے تھے۔ شمالی ہند اور بنگال میں مسلمانوں کی حکومت ایک ہزار برس رہی۔ دولت افراد کی برائیوں پر اور حکومت کسی قوم کی بہت سی کمزوریوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ جیسے ہی حکومت ہاتھ سے گئی مسلمان سورج کی دھوپ میں آگئے۔ ان کی غربت و جہالت کاہلی و لاپرواہی، مایوسی و ناامیدی، زندگی سے فرار، اپنوں سے حسد و رشک سب عیب ظاہر ہو گئے۔ سرسیّدؒ نے محسوس کر لیا کہ اگر مسلمان تعلیم حاصل نہ کریں تو پھر وہ "سائیس، خانساماں، نوکر چاکر اور گھسیارے رہ جائیں گے"۔ یہاں پر سرسیّدؒ کے کردار اور بالغ نظری کی چند مثالیں ایسی ہیں جن کی طرف اشارہ کیے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔

۱۔ سرسیّدؒ کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ ہندوستانی اب انگریزوں کو کسی طرح شکست نہیں دے سکتے۔ انگریزوں کی فوجی اور عصری طاقت سے زیادہ وہ انگریزوں کے سائنسی علوم میں ترقی، انجینئرنگ میں مہارت، جدید ایجادات، علمی کمالات اور روشن خیالی سے بہت متاثر تھے۔

۲۔ انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کا غم و غصہ بالکل فطری تھا کیوں کہ حکومت ان ہی سے چھینی گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں میں انگریزی زبان اور ہر وہ جدید علم جو سمندر پار سے آیا، اس سے سخت نفرت اور بیزارگی پیدا ہو گئی۔

۳۔ سرسیّدؒ نے حالات کا بغور مطالعہ کر کے چند باتیں طے کر لیں۔

(۱) مسلمانوں کو انگریزوں کی مہمل مخالفت سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ ان سے جب تک کوآپریشن نہ کیا جائے وہ سخت نقصان میں رہیں گے۔

(۲) انگریز حکومت کے ساتھ اسی وقت کوآپریشن کیا جا سکتا تھا جب کہ وہ انگریزی زبان جانتے ہوں تعلیم یافتہ ہوں، حکومت کے کام کے ہوں، تب ہی وہ انگریز حاکم کے دل میں وقعت کی جگہ بنا سکتے ہیں۔

(۳) تیسرے وہ اردو، فارسی کو چھوڑ کر انگریزی ذریعۂ تعلیم

کے اس لیے دلدادہ تھے کہ ان زبانوں کا دامن جدید علوم سائنس، انجینئرنگ، ایجادات اور موجودات کی ماہیت سے خالی تھا۔ تحقیق کا سرمایہ برائے نام بھی نہ تھا۔

سرسیدؒ نے ایک حکیم دانا اور طبیب مستند کی طرح قوم کی نبض پر ہاتھ رکھا اور مرض کی صحیح تشخیص کی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلم قوم کے سارے امراض کا ایک ہی بنیادی سبب ہے اور وہ ہے تعلیم سے محرومی۔ دوستو تعلیم وہ شاہ کلید ہے جو ایک فرد کی پوشیدہ صلاحیتوں اور قابلیتوں کے قفل کو کھول دیتی ہے۔ جو شخص تعلیم سے محروم ہے وہ خود اپنی صلاحیتوں سے واقف نہیں رہتا۔ اس کا حال کچھ ایسا ہے کہ وہ ساری عمر ایک بند کمرے کے سامنے چوکیدار کی طرح بیٹھا ہوا ہے۔ اسے خود نہیں معلوم کہ وہ کن خزانوں کا مالک ہے۔ اس کی محرومیاں اس کی جہالت ہے۔

انگریزوں نے زمین داری اور تعلقہ داری کی پیش کش کی لیکن سرسیدؒ کو بڑی غیرت اور شرم آئی کہ سارے مسلمان تو گردشِ ایام کی چکی میں آٹے کی طرح پسے جا رہے ہیں اور وہ خود عیش و عشرت میں موج کریں۔ وہ یہ کر بھی سکتے تھے لیکن یہی وہ مقام ہے جہاں کھرے کھوٹے کی پہچان ہوتی ہے۔ وقت کی کسوٹی بتا دیتی ہے کہ کون سونا ہے اور کون کھوٹا سکہ ہے۔

اپنے تعلیمی مشن کو چلانے کے لیے سرسیدؒ کو اپنے سوا کوئی اور نظر نہ آتا تھا۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ نے اپنی مسدس کے دیباچے میں اس مردِ مجاہد کی شان اور دوسروں سے کام لینے کے طریقے کا نقشہ خوب کھینچا ہے:۔

"ناگاہ دیکھا ایک خدا کا بندہ جو اس میدان کا مرد ہے، ایک دشوار گزار راستہ میں رہ نورد ہے۔ بہت سے لوگ جو اس کے ساتھ چلے تھے، تھک کر پیچھے رہ گئے ہیں، بہت سے ابھی اس کے ساتھ افتاں و خیزاں چلے جاتے ہیں، مگر ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہیں، پیروں میں چھالے پڑے ہیں دم چڑھ رہا ہے، چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں لیکن وہ اولوالعزم آدمی جو ان سب کا رہنما ہے وہ اسی طرح تازہ دم ہے، نہ اسے رستے کی تکان ہے نہ ساتھیوں کے چھوٹ جانے کی پرواہ ہے، نہ منزل کی دوری سے ہراس ہے۔ اس کی چتونوں میں غضب کا جادو بھرا ہے کہ جس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے وہ آنکھیں بند کر کے اس کے ساتھ ہو لیتا ہے اس کی ایک نگاہ ادھر بھی پڑی اور کام کر گئی۔ بیس برس کے تھکے ہارے، خستہ و کوفتہ اسی دشوار گزار رستے پر پڑ گئے۔ نہ یہ خبر کہ کہاں جاتے ہیں نہ یہ معلوم کیوں جاتے ہیں، نہ طلب صادق ہے، نہ قدم راسخ ہے نہ عزم ہے نہ استقلال، نہ صدق ہے نہ اخلاص۔ مگر ایک زبردست ہاتھ ہے کہ کھینچے لیے جاتا ہے۔"

اقبالؒ نے یہ شعر شاید سرسیدؒ کے لیے ہی کہا ہوگا ؎

نگاہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

غدر کے بعد سرسیدؒ کے تاثرات کچھ اس قسم کے تھے:

"قوم کی حالت تباہ ہے، عزیز ذلیل ہو گئے، شریف خاک میں مل گئے ہیں، علم کا خاتمہ ہو چکا ہے، دین کا صرف نام باقی ہے، افلاس کی گھر گھر پکار ہے اخلاق بالکل بگڑ چکے ہیں، تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے، امرا غافل و بے پرواہ ہیں، علماء زمانے کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔"

خود حالیؔ نے اس کیفیت کی تصویر اس طرح کھینچی ہے ؎

یہی حال دنیا میں اس قوم کا ہے — بھنور میں جہاز آ کے جس کا گھرا ہے
کنارا ہے دور اور طوفاں بپا ہے — گماں ہے یہ ہر دم کہ اب ڈوبتا ہے

نہیں لیتے کروٹ مگر اہلِ کشتی
پڑے سوتے ہیں بے خبر اہلِ کشتی
گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے   فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے
نحوست پس و پیش منڈلا رہی ہے   چپ و راست سے یہ صدا آ رہی ہے
کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے ہم
ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے ہم
پر اس قومِ غافل کی غفلت وہی ہے   تنزل پہ اپنے قناعت وہی ہے
ملے خاک میں پر رعونت وہی ہے   ہوئی صبح اور خوابِ راحت وہی ہے
نہ افسوس انھیں اپنی ذلت پہ ہے کچھ
نہ رشک اور قوموں کی عزت پہ ہے کچھ

مدرسۃ العلوم کی بنیاد

اب وہ خود ایک تعلیمی کمیٹی کی بنیاد رکھتے ہیں۔ کمیٹی نام بھی دلچسپ ہے۔ "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان"، جو مخلص دوست ہیں وہ اس دیوانہ پن پہ ہنستے ہیں۔ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء مدرسۃ العلوم کی بنیاد رکھی گئی اور اس تقریب کے متعلق خود ہی لکھتے ہیں:

" جب کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان" قائم ہوئی تو میں اس کا سکریٹری تھا۔ خالص احباب جو ممبر تھے وہ بھی یہ کہتے تھے مسلمان اور اُن کی ترقی تعلیم کا خیال ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتا... چندہ جمع کرنے کا ذکر ہوا تو.... اس خیال کو جنون اور دیوانہ پن تصور کرتے تھے۔ مجھے وہ دن خوب یاد ہے جب میں نے اپنے ایک دوست کے بازو پر حضرت امام ضامن کی نیاز کا روپیہ بندھا دیکھا تو میں نے سوال کیا کہ کیا مسلمانوں کی قوم سے زیادہ کوئی اور اس روپیے کا مستحق ہے۔ وہ سبز کپڑا جس میں نذر بندھی ہوئی تھی انھوں نے مجھ کو دیا۔ جب اس کو کھولا تو ایک روپیہ اور دو منصوری پیسے تھے۔ یہ پہلا سرمایہ تھا جو ہماری کمیٹی کے خزانہ میں ڈالا گیا۔"

چندہ کا کام

چندہ وصول کرنے کا کام آسان نہیں وہ بھی تعلیم کے نام پر۔ "جان حاضر ہے مگر چندہ کس کے پاس ہے"۔ تعلیمی مشن کے چلانے کے لیے سرمائے کی سخت ضرورت تھی۔ طلباء کی جانب سے ڈرامہ کا اسٹیج تیار ہے۔ اس اسٹیج پر ناظرین کے سامنے ایک مردِ درویش، گھنی ریش مبارک کے ساتھ فقیروں کا لباس پہنے ہوئے سامنے آتا ہے۔ تہمد باندھے ہوئے، پرانے کپڑے پہنے ہوئے، سر پر میلی ٹوپی ہے، کاندھے سے جھولی لٹکی ہوئی، ہاتھ میں کشکول ہے۔ اس کی آنکھوں میں وہی مایوسی ہے اور اس کے گالوں میں وہی قحط نمایاں ہے جو فقیروں کی صورت میں عیاں ہوتا ہے۔ زبان پر غالب کا شعر ہے ؎

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

اور صدا لگاتا ہے۔ صاحبو! قوم کے بچوں کی تعلیم کے لیے ایک پیسہ ہی دے دو۔ آپ اس منظر کو کچھ دیر کے لیے اپنی آنکھوں کے سامنے لائیے۔ عجب نہیں اس منظر کو دیکھ کر کچھ ناظرین کے آنسو نکل پڑے ہوں۔

سرسید کی بذلہ سنجی

علی گڑھ تحریک، سرسید کے تعلیمی مشن اور اصلاح امت پر مشتمل ہے۔ اُس زمانے کے حالات میں یہ کوئی معمولی کام نہ تھا۔ کفر کے فتوے اور گالیوں کی ڈاک آتی۔ وہ ایک نظر ڈالتے، کچرے کی ٹوکری میں پھینکتے پھر اپنے کام میں لگ جاتے اسی زمانے میں "تہذیب الاخلاق" کے نام سے پرچہ جاری کیا جو شاید اردو کا پہلا میگزین تھا جس میں اصلاح تعلیم و ترقی پر مضامین نکلنے لگے۔ اس رسالے نے سارے ملک میں ایک نئی شاہراہ کھول دی۔ پروفیسر محمد مجیب کا خیال ہے کہ سرسید کے مخالف بھی ان کے مضامین کی افادیت کے قائل تھے۔ اصلاح مذہب سے متعلق بھی مضامین شائع ہونے لگے۔ یہ ایک ایسی

پرخار وادی ہے جس میں قدم رکھنا ملّت کے غیض وغضب کو دعوت عام دینا تھا: اس زمانے میں سرسیّدؒ سے ملنے کے لیے بھی لوگ کتراتے تھے۔ اکبرالٰہ آبادی نے اس رباعی میں اسی طرف اشارہ کیا ہے ؎

حاضر ہوا میں خدمت سیّد میں ایک رات
افسوس کچھ ہو نہ سکی زیادہ بات
کہنے لگے کہ دین کی اصلاح فرض ہے
میں چل دیا یہ کہہ کے آداب عرض ہے

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں کہ اسی زمانے میں سرسیّد کا ایک مضمون خلافت راشدہ پر کسی رسالے میں نکلا۔ اس مضمون کے بین السطور سے کچھ اس طرح کا مطلب نکلتا تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت علیؓ کو خلافت ملنی چاہیے تھی۔ بنارس کے ایک شیعہ عالم اس مضمون کو پڑھ کر پھڑک گئے۔ وہ بنارس سے علی گڑھ کا سفر کرکے پرچہ ہاتھ میں لیے ہوئے سرسیّدؒ کے پاس پہنچے۔ اس شیعہ عالم نے مضمون کی بہت تعریف کی اور ایک نازک سوال کر ڈالا

"اگر آپ حضور اکرمؐ کی وفات کے وقت موجود ہوتے تو آپ حضرت ابوبکرؓ کی تائید کرتے یا حضرت علیؓ کی؟"

سرسیّد کہنے لگے۔

"اجی حضرت میں اِن کی اُن کی تائید کیوں کرنے چلا، میں خود اپنی خلافت کا ڈول ڈالتا۔ کیا ایسا گولڈن چانس دوسروں کے لیے چھوڑ دیتا۔"

سرسیّدؒ میں اگر یہ مزاح نہ ہوتی تو وہ ان نشتروں کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے جو اُن کے دل ودماغ پر ہر روز کسی نہ کسی جانب سے لگتے رہتے تھے۔

سرسیّد کا پیام ہمارے نام

سرسیّدؒ پر آپ جتنا کچھ سن چکے ہیں۔ یہ سمجھ لیجیے کہ دریا کے بہاؤ کا منظر آپ نے کنارے پر بیٹھ کر کرلیا۔ خود دریا میں اپنی کشتی ڈالنے کے بعد ہی کچھ اس کے تلاطم اور طوفان کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ سرسیّد کی زندگی، تعلیمی مشن اور کام کے طریقہ کار سے آج ہمیں بہت سی کام کی باتیں مل جائیں گی۔ جو شخص چلتا ہی نہیں، بیٹھا ہوا راستہ کی دوری کو تکتا رہتا ہے۔ اس کے لیے سرسیّد کی زندگی میں کوئی پیغام ہے ہی نہیں۔ ہاں جو اس راہ پر چل نکلا ہے یا وہ جو چلنے کے لیے تیار ہے۔ اس کے لیے بہت سی کام کی باتیں مل جائیں گی

آج وقت کی اہم پکار یہ ہے کہ ہمارے سارے دانشور ادیب، لیڈر، سماجی کارکن جن کسی کے دل میں مسلم قوم کی بھلائی کا ذرا سا بھی اگر جذبہ ہے تو وہ مسلمانوں کی تعلیم کے پروگرام کو سرفہرست رکھیں۔ اٹھتے بیٹھتے ہر مجلس میں بچوں کی تعلیم کے متعلق گفتگو ہو، ہر روز اپنے بچوں کے ساتھ ایک آدھ گھنٹہ ان کے تعلیمی کام کی نگرانی کے لیے بیٹھ جائیں۔ گندی بستیوں اور غریب محلوں میں بچے گلی کوچوں میں جنگلی پودوں کی طرح اُگ آتے ہیں۔ ان کی تعلیم کا کوئی پرسان حال نہیں۔ انھیں سرکاری اسکولوں میں شریک کروانے کی مہم چلانے کی ضرورت ہے۔ گو یہ ایک دشوار کام ہے۔ اصل کام دیہات، تعلقہ جات سے شروع ہوتا ہے۔ شہروں میں تعلیم کا بہت چرچا ہے۔ ہر ضلع کی سطح پر مذہبی، سیاسی، سماجی جماعتیں کام کررہی ہیں۔ ان سب حضرات کے تعاون سے ایک مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی قایم کریں جو اس ضلع کے دیہات اور تعلقہ جات کے مسلم گھرانوں کا سروے کریں اور بچوں کی تعلیم کے پروگرام کو منظم شکل دیں۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی (آندھرا پردیش) اس کام کو اگر چاہے تو بخوبی انجام دے سکتی ہے۔ وقت کا شدید تقاضا ہے کہ ہر ضلع کی سطح پر اس مرکزی سوسائٹی کی شاخیں قایم کی جائیں

مختصر بات یہ ہے کہ سارے ملک میں مسلمانوں کی تعلیم کا کام ایک بڑی مہم کے طور پر شروع کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے با اثر لیڈر اور علمائے کرام اس کام کی اہمیت کو آج بھی سمجھ جائیں تو اس ملت کے دن ۲۵، ۵۰ برس میں ضرور پھریں گے۔ حال ہی میں معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی تعلیمی، تہذیبی ترقی کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک مرکز سینٹر فار پروموشن آف ایجوکیشنل اینڈ کلچرل ایڈوانسمنٹ

آف مسلمس آف انڈیا - Centre for Promotion of Educational and Cultural Advancement of Muslims of India."

قائم کیا گیا ہے۔

سرسید کے اخلاص کی وجہ سے علی گڑھ کے نام میں وہ تاثیر ہے کہ یہاں سے جو بھی تعلیمی اور اصلاحی تحریک شروع ہو گی وہ سارے ہندوستانی مسلمانوں کے دل کی دھڑکن ہو گی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی جڑیں اضلاع اور تعلقہ جات تک پہنچ جائیں۔

تنقید و تعریض، رشک و حسد، ناشکری و احسان فراموشی غلط فہمیاں وغیرہ ہر اس مرد مومن کا مقدر ہیں جو کوئی بھلائی کا کام کرنا چاہتا ہو۔ اگر سرسیدؒ کی زندگی کا کوئی جیتا جاگتا پیام ہے۔ تو بس یہی ہے کہ ان سب تیر و نشتر کی پرواہ نہ کرو۔ اگر منزل واضح ہے، نیت صالح ہے اور منزل تک پہنچنے کے لیے سید ھا راستہ اختیار کیا ہو تو پھر چل نکلو۔ اس لیے کہ:

چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

(علامہ اقبال)

اکبرالہٰ آبادی جو بظاہر انگریزی تعلیم کے مخالف رہے ہیں، سرسید کی وفات پر کہہ اٹھے ع

"ہماری باتیں ہی باتیں تھیں اور سید کام کرتا تھا"

ہر وہ شخص جو اپنے محدود وسائل اور دائرہ ہی میں کوئی تعلیم کا کام کر رہا ہو تو سمجھے کہ وہ سرسیدؒ کے مشن کا اہم کردار ہے

"اب ہم میں سرسیدؒ سا پیدا ہونا مشکل ہے، البتہ ضرورت ہے کہ کئی ایک چھوٹے سرسید کھڑے ہو جائیں۔"

(سید حامد)

"ایک سچے مسلمان کے قول اور عمل میں مطابقت ہونی چاہیے، جو کچھ کہے اسے کر دکھائے اور کرنے کی ہمت یا نیت نہ ہو تو زبان سے بھی نہ نکالے۔ کہنا کچھ اور کرنا کچھ، یہ انسان کی ان بدترین صفات میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں نہایت مبغوض ہیں، کجا کہ ایک ایسا شخص اس اخلاقی عیب میں مبتلا ہو جو اللہ پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتا ہو۔"

مولانا مودودیؒ
(تفہیم القرآن)

تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۷، ش ۱۲ (دسمبر ۸۸ء)

جانوروں کے اخلاق و آداب

محمد افضال حسین قادری *

جانوروں کے اخلاق اور آداب کا انسانوں کے طور طریقوں سے مقابلہ کرتے ہوئے مطالعہ کیا گیا ہے۔ لہٰذا ان کے نام بھی ویسے ہی رکھ دیے گئے ہیں جیسے انسانی تہذیب اور اخلاق کے مختلف پہلوؤں کے ہیں۔ بحیثیت ایک سائنس داں میرا فرض ہے کہ میں آگاہ کر دوں کہ جانوروں کے فعل یا کام بالکل انسانوں کے افعال کی طرح نہیں ہوتے انسانوں کی سمجھ بوجھ اور اچھے برے میں تمیز کرنے کی قوت نے ان کے اکثر افعال کو اس قدر پیچیدہ کر دیا ہے کہ وہ اصلی حیوانی عادتیں اور جبلی افعال سے بالکل مختلف ہو گئے ہیں۔ بہت سے جانوروں کی حرکتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کے دیکھنے اور مطالعہ کرنے والوں کو بجز تعجب کرنے اور ان کی داد دینے کے کوئی چارہ نہیں رہتا اکثر اوقات تو ایسے دیکھنے میں آئے ہیں کہ جن سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ان جانوروں کی حرکتوں میں عقل وشعور کو بھی کچھ نہ کچھ دخل ہے۔ کئی سال گزرے کہ حیوانات کے ایک ماہر نے اپنی گفتگو کے دوران میں یہ کہا کہ متعدد جانوروں میں انسانوں سے زیادہ انسانیت ہوتی ہے۔ اس قول کے بعد بہت سے تجربے اور مشاہدے حیوانی زندگی کے کیے گیے ہیں۔ ان مشاہدوں اور تجربوں کی بنا پر یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ بہت سے جانوروں کی حرکتوں اور کاموں میں ایسے جذبات کو دخل ہوتا ہے جو اگر انسان سے زیادہ نہیں تو اس کی برابر ضرور لطافت اور شائستگی سے لبریز نظر آتے ہیں۔ اب میں چند مشاہدے اور قصے حیوانوں کے پیش کروں گا جن سے میرا مطلب پہلے اپنے دعوے کی دلیل پیش کرنا ہے اور اس کے بعد آپ کے دل میں حیوانی زندگی کے مطالعے کا شوق پیدا کرنا ہے جس کے لیے ہندوستان ایک بہت مناسب ملک ہے۔

حیوانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ایک ترتیب کے ساتھ بیان کرتے ہوئے پہلے میں جانوروں کے رہنے اور بسنے کے طریقوں کو بیان کروں گا۔ مکانوں کا بنانا اور رہائش کا خاص طور پر انتظام کرنا تمام جانوروں کی عادتوں میں داخل ہے۔ چاہے وہ حقیر کیڑے مکوڑے ہوں یا بڑے اور ارتقاشدہ جانور۔ اس سلسلے میں چند مشاہدات کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ سمندر کے پہاڑی کناروں پر آپ نے بہت سے گھونگے پتھروں سے چمٹے ہوئے دیکھے ہوں گے۔ یہ گھونگے اپنے چمٹنے سے پتھروں میں چھوٹے چھوٹے گڑھے کر دیتے ہیں۔ یہ گڑھے ان گھونگوں کے مکان ہوتے ہیں۔ جہاں سمندر کی لہریں آکر ان کے کھانے کے لیے چھوٹے کیڑے ڈال دیتی ہیں اور ان کو دھوپ کی گرمی سے بچانے کا اور پانی کے اندر سانس لینے کا پورا انتظام کر دیتی ہیں۔

جانوروں کے مکانوں کے بنانے کا مطالعہ نہایت دلچسپ ہے۔ چھوٹے کیڑوں سے لے کر چڑیوں اور چوپایوں کی دست کاری اور صنعت کے بہت سے ایسے نمونے ملتے ہیں

★ سابق استاد شعبۂ زولوجی، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

جن پر ان کو پوری داد دینی چاہیے۔ کئی قسم کی بھڑیں اور مکھیاں کمہار اور معمار کہی جاتی ہیں۔ ان میں کئی ایسے گھر بناتی ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں مکان کی خوبی اور عمارت کی خاص بناوٹ کا خیال موجود ہے۔ ہندوستان کے بہت سے قدیم برتنوں اور ہانڈیوں کے نمونے انھیں مکھیوں کے گھروں کی نقل ہیں۔ اس کے علاوہ اگر شہد کی مکھیوں کے چھتے کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں ہوا اور صفائی کا خاص طور پر انتظام ہوتا ہے۔ چھتے کے مختلف خانوں میں آپ کو کئی مکھیاں ایسی ملیں گی جو صفائی کرنے اور جھاڑنے میں مصروف ہوں گی۔ صفائی اور حفظان صحت کا خاص اہتمام اودھ بلاؤں کے گھروں میں بھی ہوتا ہے۔ اودھ بلاؤ سوشل جانور ہے۔ یعنی بہت سے مل کر ساتھ رہتے ہیں۔ ان کے گھر زمین کے اندر کسی چشمے یا دریا کے کنارے بنے ہوتے ہیں۔ ہر گھر میں مختلف کوٹھریاں ہوتی ہیں۔ کچھ ان میں سے رہنے بسنے کے کام میں آتی ہیں اور کچھ میں اُن کی خوراک کا سامان جمع رہتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر مکان میں نہانے کے تالاب ہوتے ہیں اور روشنی اور ہوا کے لیے خاص طور پر کھڑکیاں بنی ہوئی ہوتی ہیں۔

اب اس کے بعد جانوروں کے خوراک حاصل کرنے کی تدبیروں کو لیجیے۔ شاہین، عقاب اور چرخ وغیرہ اپنی ہمت، بے باکی اور پھرتی کے لیے مشہور ہیں لیکن ان کی زندگی کا ایک قابل تعریف پہلو بہت سے لوگوں کو معلوم نہیں پہاڑوں کی چوٹیوں کے اوپر اڑتا ہوا بھوکا عقاب کسی خرگوش یا بھیڑ پر بجلی کی طرح ٹوٹ پڑتا ہے اور آناً فاناً اپنے مضبوط پنجوں میں دبا کر آسمان کے اندر غائب ہو جاتا ہے۔ باوجود اپنی بھوک کے وہ یہ نہیں کرتا کہ اپنے شکار کو خود ہی کھالے بلکہ سالم جوں کا توں اپنے گھونسلے میں اپنی مادہ اور بچوں کے سامنے لاکر حاضر کر دیتا ہے۔ جہاں سب ساتھ بیٹھ کر مزے لے لے کر کھاتے ہیں۔

بہت سے جانور لوٹ اور چوری سے اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں۔ ان کی ترکیبیں، دھوکے، فریب اور بے ایمانیاں عجب عجب طرح کی ہوتی ہیں۔ ان کے چند حالات کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ایک چھوٹا سا کیڑا ہے جس کا نام نمازی مینٹس ہے۔ کھیتوں کے کناروں پر یہ کیڑا خاموش اگلے ہاتھ باندھے ہوئے اپنے پچھلے پیروں پر کھڑا ہوا آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ ڈھب اس قدر مودبانہ اور سنجیدہ ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف ملکوں کے رہنے والے کسان کہا کرتے ہیں کہ یہ کیڑا عبادت کرتا ہے۔ لیکن تجربے سے معلوم ہوگا کہ اس ادا کے اندر ایک زبردست دھوکا چھپا ہوا ہے۔ یہی خاموش مینٹس جو کہ یہ ظاہر کر رہا ہے کہ وہ عبادت کے ذریعہ اپنی روحانیت اور اخلاق کی ترقی میں مشغول ہے، درحقیقت اس وقت کا انتظار کرتا ہوتا ہے جب کہ کوئی معصوم کیڑا اس کے قریب آجائے۔ جب کوئی بدنصیب سیدھا سادہ کیڑا اس کے قریب آجاتا ہے تو مینٹس کے جسم میں بجلی کی طرح ایک تیز حرکت ہوتی ہے اور وہ بندھے ہوئے ہاتھ جن کے اندر کا حصہ قینچی کے پھل کی طرح تیز ہوتا ہے اس کیڑے کو ایک پل کے اندر پکڑ کر مینٹس کا نوالہ بنا دیتے ہیں۔

اسی طرح سے ایک چھپکلی کی ترکیب بھی قابل حیرت ہے یہ چھپکلی اپنے منھ کو خوب چوڑا کھول لیتی ہے اور زبان کو ساکت کر لیتی ہے۔ پھر وہ لال پھولوں کے جھنڈ میں جا کر بیٹھ جاتی ہے۔ زبان اور منھ کا طرز اور رنگ تمام پھول کی مانند خوشنما اور دل کش معلوم ہوتا ہے۔ یہ نقل اس قدر کامیاب ہوتی ہے کہ بہت سے کیڑے یہی سمجھتے ہیں کہ یہ بھی ایک لال پھول کھلا ہوا ہے۔ چنانچہ بے چارے کئی ایک کیڑے جو پھولوں پر شہد یا تفریح کی خاطر بیٹھتے ہیں بلا کھٹکے اس چھپکلی کے منھ کے قریب آجاتے ہیں۔ لیکن ان بیچاروں کو خوشگوار مستقبل نصیب نہیں ہوتا اور سیدھے موت کے منھ میں پہنچ کر چھپکلی کی غذا بن جاتے ہیں۔

بہت سے جانور اپنی خوراک کے لیے ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ ایک بے حد دلچسپ مثال کرکس کی ہے۔ کرکس ایک چھوٹا سا دودھ پلانے والا جانور ہے۔ یہ اس جگہ رہتا ہے جہاں بہت سے حواصل یا Pelican (Pelecanus) رہا کرتے ہیں۔ حواصل غالباً آپ نے دیکھے ہوں گے۔ ان کی شکل سارس کی طرح

ہوتی ہے۔ البتہ ان کے گلے کی کھال بہت لٹکی ہوتی ہے اور یہ اپنے پوٹے میں بڑی بڑی مچھلیاں نگل لیتے ہیں۔ یہ حواصل روزانہ بڑی تعداد میں جھیلوں اور تالابوں کے کنارے مچھلیاں پکڑنے کے لیے جاتے ہیں اور اپنے پوٹوں میں بہت سی مچھلیاں بھر کر واپس آجاتے ہیں۔ جس وقت حواصل مچھلیاں پکڑنے کے لیے جاتے ہیں اس وقت کرکس ایک اچھے ہمسائے کی طرح ان کو خدا حافظ کہتا ہے مگر جب حواصل لوٹتے ہیں تو کرکس ان کے قریب آکر چیخنے اور دہاڑنے لگتا ہے۔ چنانچہ کبھی سامنے اور کبھی پیچھے آکر اس ہیبت ناک طرح سے شور کرتا ہے کہ بیچارے حواصلوں کا ناک میں دم آجاتا ہے اور وہ تنگ آکر اپنی مچھلیاں اگل دیتے ہیں۔ کرکس نہایت اطمینان سے ان مچھلیوں کو کھالیتا ہے اور پھر حواصلوں کا پیچھا چھوڑ دیتا ہے۔

ڈاکو اور رہزنوں کے مقابلے میں چور جانوروں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ چھوٹے جانوروں میں شہد کے چھتوں کے چور بہت مشہور ہیں۔ یہ مختلف قسم کے پروانے یا اور کیڑے ہوتے ہیں جو چوری سے اپنے انڈے شہد کے چھتے کی کوٹھریوں میں دے جاتے ہیں۔ جب انڈوں میں سے بچے نکلتے ہیں تو شہد کی مکھیاں ان کی ویسی خدمت کرتی ہیں جو اپنے بچوں کی اور یہ بغیر کوئی فکر و تکلیف اٹھائے اپنی غذا حاصل کر لیتے ہیں۔ بڑے جانوروں میں انڈوں کی چوری عام ہے۔ بہت سی چھپکلیاں اور چڑیاں چور ہوتی ہیں — یہ دوسروں کے گھونسلوں کی تاک میں رہتی ہیں اور موقع پاتے ہی انڈا چرا کر بھاگ جاتی ہیں۔ ٹیٹریاں اور کوّے عام طور پر انڈوں کی چوری کرتے ہیں۔ آپ لوگوں میں سے اکثر نے فاختہ اور کوّے کی لڑائی دیکھی ہوگی۔ بیچاری فاختہ اپنے انڈے اور بچوں کا بدلہ لینے کے لیے کوّے کا پیچھا کرتی ہے اور اس پر بار بار حملہ کرتی ہے کوئل کی چوری بھی ایک مشہور بات ہے۔ کوئل ہمارے شمالی ہندوستان کے میدانوں میں برسات سے پہلے آجاتی ہے اور چپکے سے کوّے کے گھونسلے میں انڈا دے دیتی ہے۔ پھر اس کے بعد اس کو انڈوں بچوں کی کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کوئل کا بچہ کوّے کے گھونسلے میں پیدا ہوتا ہے اور وہ غریب اس کو اپنا بچہ سمجھ کر پالتا ہے۔

انڈوں اور بچوں کی محبت حیوانی فطرت کا عام تقاضا ہے۔ چھوٹے سے لے کر بڑے جانوروں تک سیکڑوں دلچسپ مثالیں بیان کی جاسکتی ہیں۔ یہاں صرف چند مثالیں بیان کی جائیں گی۔ ایک کالا سا کیڑا جو گوبر کے قریب پایا جاتا ہے، گوبریلا کہلاتا ہے۔ نر و مادہ گوبریلے مل کر زمین کے اندر اپنے لیے گھر بناتے ہیں ان کے گھروں میں کئی کوٹھریاں ہوتی ہیں۔ انڈے دینے سے قبل یہ گوبر کوٹ پیس کر گولیاں اور ٹکیاں بنا لیتے ہیں اور اپنے مکان کی مختلف کوٹھریوں میں رکھ دیتے ہیں۔ ہندوستان میں بہت سے گوبریلے بڑی بڑی گولیاں بنا لیتے ہیں۔ چنانچہ جب یہ گولیاں پہلی بار کھودی گئی تھیں تو بہت سے لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ ہندوستان کی پرانی توپوں کے گولے ہیں۔ ہر ایک گولی کے اوپر ایک انڈا یا رکھ دیا جاتا ہے اور مادہ ان کی نگہداشت کرتی ہے۔ جب بچے نکل آتے ہیں تو والدین ان کو پالتے ہیں۔ فابرے بیان کرتا ہے کہ اگر کوئی خطرہ پیش آئے تو یہ گوبریلے اپنے بچوں کو ایک محفوظ مقام پر اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ انڈوں کی نگہبانی اور فکر چڑیاں بھی کرتی ہیں۔ شتر مرغ اس بات کے لیے ایک خاص شہرت رکھتے ہیں۔ جب صبح کو ریگستان میں دھوپ تیز ہوجاتی ہے تو یہ ایک گہرا گڑھا کھود کر اس کے اندر انڈے رکھ دیتے ہیں اور اسے ریت سے چھپا دیتے ہیں اور جب شام ہوتی ہے تو اسے دوبارہ ریت سے نکال لیتے ہیں۔

کلکتہ کے علی پور چڑیا گھر کے ایک اورنگوٹان کا قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ ایک اورنگوٹان کا بچہ کسی بیماری سے مر گیا۔ اس بچے کی لاش کو چڑیا گھر سے باہر پھینکنے کے لیے لوگ لے گئے۔ باپ نے جب اپنے بیٹے کی لاش کو جاتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ ہو لیا اور اپنے احاطے کی دیوار سے لپٹ کر کھڑا ہو گیا۔ باوجودیکہ دھوپ بہت تیز تھی اس نے وہاں سے حرکت نہ کی۔ یہاں تک کہ اسے لو لگ گئی اور وہ مر گیا۔

جانوروں کی زندگی کے ازدواجی پہلو کے مطالعے کے دوران میں جانوروں کی حرکتیں اکثر ایسی دیکھنے میں آئی ہیں جن سے یہ نتیجہ نکالا

جاتا ہے کہ یہ سمجھ بوجھ کے ساتھ کی گئیں ہیں۔ مادہ کے حاصل کرنے کے لیے اور اس کے تنہا مالک بننے کے لیے جانوروں میں بڑی بڑی خوفناک لڑائیاں ہوا کرتی ہیں۔ قطب شمالی اور جنوبی کے برفستانوں میں سمندری شیروں کی لڑائیاں بہت مشہور ہیں۔ بارہ سنگھے کے خوبصورت سینگ صرف اس کام آتے ہیں کہ وہ اُن کی مدد سے اپنی مادہ کو حاصل کرنے کے لیے جنگ کرے۔ بہت سے جانور اپنی شادی منانے میں نفاست پسندی اور خوش مذاقی کا اظہار کرتے ہیں۔ گانا، ناچ، خوشبو کا استعمال عجیب عجیب طریقوں سے چھوٹے کیڑوں سے لے کر بڑے بڑے جانوروں تک میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ پروفیسر کارپینٹر نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ ایک دو پَر والی مکھیوں کا گروہ جس کا نام "ایمپیڈے" ہے، دریاؤں اور چشموں کے کنارے پر پایا جاتا ہے۔ اس گروہ کے نر ہوا میں منڈلاتے ہوئے اکثر دیکھے جاتے ہیں۔ یہ نر پانی کے چھوٹے چھوٹے کیڑوں کو اپنے پنجوں میں پکڑ کر ہوا میں منڈلاتے رہتے ہیں لیکن اپنے شکار کو خود نہیں کھاتے۔ اگر کوئی مادہ قریب سے اُڑتی ہوئی آ پہنچتی ہے تو نر اس کی طرف نہایت مودبانہ طریقے سے بڑھتا ہے اور شکار کو اس کی خدمت میں شادی کے تحفے کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس تحفے کے پیش ہونے کے بعد مادہ اس کو بحیثیت اپنے شوہر کے قبول کر لیتی ہے۔

بہت سے جانوروں کی ازدواجی زندگی میں ایک خودداری کا جذبہ اور اپنی مادہ کی محبت پائی جاتی ہے۔ بہت سے جانوروں کے نر اور مادہ اپنے بچوں کی پرورش مل کر کرتے ہیں۔ شتر مرغ اور بہت سی چڑیوں کے نر اپنی مادہ کو جب کہ وہ انڈے سیتی ہے موقع دیتے ہیں کہ وہ جا کر سیر اور آرام کرلے اور اس دوران میں خود انڈوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ سانپوں کے نر و مادہ کی باہمی محبت کے بہت سے افسانے مشہور ہیں جن میں سب سے زیادہ مشہور قصہ یہ ہے کہ کوبرے کی مادہ یعنی ناگن ناگ کے قاتل سے بدلہ لینے کی کوشش کرتی ہے۔

ازدواجی زندگی کی خودداری کا ایک دلچسپ قصہ لندن کے چڑیا گھر کے بندروں کی لڑائی کی متعلق ہے۔ ایک بار ایک کنوارا بندر بندروں کے چند جوڑوں میں رہنے کے لیے چھوڑ دیا گیا اس سے قبل یہ جوڑے ایک خاموش زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس نو وارد نے ایک شادی شدہ مادہ کو اپنی طرف راغب کرنا چاہا نر اس کی تاب نہ لا سکا اور نو وارد اور نر میں ایک مہلک لڑائی شروع ہو گئی۔

جذبات کے تاثرات بہت سے جانوروں کی حرکات سے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ ہاتھیوں کے جھنڈ میں یہ قاعدہ ہے کہ سب سے بڑا اور سب سے مضبوط ہاتھی اُن کا سرگروہ ہوتا ہے۔ جب یہ سرگروہ کسی دوسرے طاقتور ہاتھی سے ہار جاتا ہے تو پھر اس کی طبیعت میں ایک نفرت اور جھنجھلاہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے ہاتھی جو چیز بھی ان کے سامنے آئے اس پر حملہ کرنے لگتے ہیں اور بعض بعض دفعہ آدمیوں کو بھی مار ڈالتے ہیں۔ بچوں پر مہربانی اور محبت کا جذبہ خواہ وہ غیر کے ہی کیوں نہ ہوں، جانوروں میں بھی پایا جاتا ہے۔

لوبیر نے لندن کے چڑیا گھر کے ایک ہاتھی کا قصہ بیان کیا ہے۔ چڑیا گھر میں کسی سیر کرنے والے نے ایک بچّہ کو گاڑی میں اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ ہاتھی نے خیال کیا کہ یہ کوئی لکڑی ہے یا کھانے کی چیز ہے۔ چنانچہ اس نے بچّے کو گاڑی میں سے اُٹھا لیا۔ جب بچّے کو اس نے سونڈ میں پکڑ کر اُٹھایا تو اسے معلوم ہوا کہ اس نے غلطی سے ایک بچّہ کو اُٹھا لیا ہے چنانچہ اس نے اس بچّے کو پھر اس گاڑی میں رکھ دیا۔

غیر کے بچّوں کے پالنے کے واقعات اکثر جانوروں میں دیکھے گئے ہیں۔ پین گوئینس قطب شمالی و جنوبی کی برفستان کی چڑیاں بڑے بڑے گروہوں میں رہتی ہیں اور اپنی رحم دلی کے لیے مشہور ہیں۔ یہ ان چھوٹے چھوٹے بچوں کی جن کی مائیں یا تو کسی حادثے سے مر جائیں یا جنھیں انسانوں نے گولی سے مار دیا ہو، اپنے بچوں کی طرح نگہداشت اور پرورش کرتی ہیں۔

یونیورسٹی کی سالگرہ

نسیم النہاری *

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کو اب کی دسمبر میں اڑسٹھ ۶۸ برس ہو جائیں گے۔ ان اڑسٹھ برسوں میں ہم نے ایک لمبا سفر طے کیا ہے۔ سفر کا آغاز ۱۹۲۰ء میں اس وقت ہوا جب سارے ملک میں آزادی کی نئی لہر دوڑ رہی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی شکست کے بعد پہلی دفعہ چاروں کونوں سے اس عزم کا اعلان کیا جا رہا تھا کہ ملک کو غیروں سے چھڑانے کا وقت آن پہنچا ہے اور لڑائی اس وقت تک جاری رہے گی جب تک آزادی نہ ملے۔ ایسی تحریک جس میں ہندو اور مسلمان دل و جان سے شریک ہوں، ۵۷ء کے بعد پہلی دفعہ شروع ہوئی تھی۔

علی گڑھ کالج کے لوگ اس طوفان کا نظارہ کنارے پر کھڑے ہو کر نہیں کر رہے تھے اور نہ کر سکتے تھے۔ آزادی کے جذبے سے سرشار نوجوانوں کا ایک قافلہ لڑائی میں شرکت کے لیے بے تاب تھا۔ انھوں نے کانگریس اور خلافت کمیٹی کی آواز پر کالج چھوڑ کر ستیہ گرہ کا راستہ اختیار کیا۔ نہ معلوم کتنے جیلوں میں گئے۔ انھوں نے اپنا سب کچھ چھوڑ کر قریہ قریہ گاؤں گاؤں جا کر آزادی کا پیغام پہنچایا۔ لڑائی کے رہنماؤں میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے پڑھے ہوئے محمد علی، شوکت علی، ظفر علی خاں، حسرت موہانی، سیف الدین کچلو، ڈاکٹر خان صاحب، خان عبدالغفار خاں اور ان کے بہت سے ساتھی تھے جن کے ناموں کی یاد بھی دھندلانے لگی ہے۔ دوسری صف کے لیڈروں میں چودھری خلیق الزماں، ذاکر حسین، ڈاکٹر سید محمود اور عبدالمجید خواجہ تھے۔ ادھر قافلے کے چند لوگوں میں ایسا جوش تھا کہ وہ عوامی تحریک کی کامیابی کا انتظار نہیں کر پائے اور جنھوں نے ترک وطن کر کے پردیس میں ایک قومی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ ان میں سر سید کے کالج کے پڑھے ہوئے راجہ مہندر پرتاب سنگھ تھے جنھوں نے ۱۹۱۵ء ہی میں کابل میں ایک ہندوستانی حکومت بنائی تھی جس کے صدر وہ خود تھے۔ مولوی برکت اللہ وزیر اعظم اور عبیداللہ سندھی وزیر داخلہ تھے۔ حسرت موہانی بھی انقلابی طبیعت کے تھے۔ جب ۲۵ء میں کمیونسٹ پارٹی کی پہلی کانگریس کانپور میں ہوئی تو وہ اس کی مجلس استقبالیہ کے چیرمین تھے۔

ایک طرف تو سر سید کے کالج کے پڑھے ہوئے نوجوان آزادی کی لڑائی میں شریک ہو رہے تھے تو دوسری طرف کالج کے بہت سے لوگ اس فکر میں تھے کہ یونیورسٹی جلد بن جائے۔ ان سب کی رہنمائی کالج کے سیکریٹری محسن الملک اور ان کے بعد وقار الملک کر رہے تھے۔ لیکن اس معاملے میں بھی انگریزی حکومت سے اختلاف تھا۔ کالج والے اور اُن کے ساتھ قوم کے دوسرے با اثر حضرات چاہتے تھے کہ یونیورسٹی ایسی بنے کہ ہندوستان کے تمام مسلم تعلیمی ادارے اس سے الحاق کر سکیں۔ حکومت اس پر بالکل تیار نہیں تھی۔ کیونکہ

* پروفیسر ڈپارٹمنٹ آف سرجری، جے این میڈیکل کالج۔ اے۔ ایم۔ یو علی گڑھ

اس طرح مجوزہ یونیورسٹی مسلمانوں کی سیاست کا مرکز بن جاتی، اس بات کو انگریزی حکومت تو کیا کوئی حکومت بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی چاہے حکومت بدیشی ہو یا دیسی۔ بالآخر مسلم رہنماؤں کو جن میں آغا خاں، مہاراجہ محمود آباد، مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی شامل تھے گورنمنٹ کی بات ماننا پڑی اور طوعاً و کرہاً اس شرط پر یونیورسٹی قبول کر لی کہ اسے کسی کالج کو ملحق کرنے کا اختیار نہیں ہوگا۔

اس سلسلے میں ایک دل چسپ واقعہ سنا ہے۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی بھی پہلے گورنمنٹ کی شرائط پر یونیورسٹی کے قیام کی مخالفت کر رہے تھے۔ انھیں مہاراجہ محمود آباد نے اپنے یہاں بلا کر مسئلے کے ہر پہلو پر گفتگو کی۔ ملاقات کی جگہ دو تین دفعہ بدلی گئی۔ پہلے رائے ہوئی کہ قیصر باغ میں مہاراجہ کے دولت کدہ پر سب جمع ہوں۔ پھر کوئی اور جگہ تجویز ہوئی اور آخر میں طے ہوا کہ جلسہ قیصر باغ ہی میں ہو۔ اس پر مولانا آزاد نے (جو اس اسکیم کے خلاف تھے) لکھا

یاں سے واں، واں سے یاں حکم ہوا وصل کی شب
ہم اٹھاتے ہی بچھاتے رہے بستر اپنا

اس کے جواب میں مولانا محمد علی نے ایک مضمون لکھا جس میں بڑی سخت باتیں مولانا آزاد کے خلاف تھیں۔ مولانا نے اس کا جواب اس طرح شروع کیا ؎

غصہ میں اُن کو کچھ نہ رہا تن بدن کا ہوش
کیا شب کو ہم نے لطف اُٹھائے عتاب میں

غرض بات مذاق میں ٹل گئی اور یونیورسٹی کی اسکیم منظور کر لی گئی۔

اسی زمانے میں کالج کے ایک ہونہار طالب علم ڈاکٹر ضیاءالدین محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے پرنسپل تھے۔ وہ پہلے ہندوستانی تھے جن کا تقرر اس عہدے پر ہوا تھا۔ انھوں نے محمد علی اور شوکت علی سے ٹکر لی اور انھیں مجبور کیا کہ وہ کالج بند کرانے کا پروگرام ترک کر دیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ گاندھی جی سے بھی ملے تھے اور انھیں یاد دلایا تھا کہ انھوں نے (گاندھی جی نے) دہلی کالج کے پرنسپل سے وعدہ کیا تھا کہ ایک مینی فیسٹو کے ذریعے طلباء سے اپیل کی جائے گی کہ وہ عملی سیاست سے الگ رہیں۔ ادھر مولانا محمد علی اور شوکت علی کو سمجھایا کہ علی گڑھ کا ادارہ تو خلافت کے والینٹر مین تیار کرنے کی ایک فیکٹری ہے، اسے کیوں ختم کیا جائے۔ ایک مہینے کے لیے کالج بند کر دیا گیا۔ جب کالج کھلا تو یونیورسٹی کے قیام کا اعلان ہو چکا تھا۔ یہ سب اکتوبر اور دسمبر ۱۹۲۰ء کے درمیان کے واقعات ہیں۔

یونیورسٹی کی پہلی چانسلر سلطان جہاں بیگم صاحبہ والیٔ بھوپال، پرو چانسلر سر آغا خاں، وائس چانسلر مہاراجہ محمود آباد اور پرو وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین بنائے گئے۔

اس طرح سرسید کے کارواں نے اپنی دوسری منزل طے کی۔ پہلی منزل پر ۱۸۷۵ء سے ۱۸۷۷ء تک کے سفر کے بعد پہنچے جب مدرسۃ العلوم کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج بنایا گیا۔ یہ بڑا سخت مرحلہ تھا۔ کالج سے یونیورسٹی کے قیام تک تینتالیس سال لگے۔ اس عرصے میں پوری ایک نسل ایسی تیار ہو گئی جو یونیورسٹی کا بوجھ سنبھال سکے۔ اس نسل کی تیاری میں جن لوگوں نے مدد دی ان میں ماریسن، بیک، ٹامس آرنلڈ، پروفیسر چکرورتی، مولانا شبلی، مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، محسن الملک اور نواب وقار الملک کے نام ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ ان لوگوں کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ سرسید کی قیادت میں انھوں نے مسلمانوں کو مغرب یعنی نئی دنیا سے روشناس کیا۔

ان لوگوں کی وجہ سے مسلم دانشوروں کا ایک ایسا گروپ تیار ہو گیا جو بطلیموس سے آگے کی ہیئت، اقلیدس سے آگے کی جامیٹری، ابن سینا سے آگے کی طب اور ابن الہیثم سے آگے کی طبعیات سے واقف ہو گئی۔ یہ لوگ والٹیر، روسو، بیکن، جارج واشنگٹن سے بھی روشناس ہوئے اور شیکسپیر، ملٹن اور سارولنتے سے بھی۔ اس طرح وہ بنیاد پڑی جس پر مسلم یونیورسٹی بن سکے، جن کی بنیاد پر مسلم یونیورسٹی بنی۔ ان لوگوں میں ڈاکٹر ضیاء الدین، پروفیسر حبیب، رشید احمد صدیقی، طاہر رضوی، بابر مرزا، عبد المجید قریشی، شیخ عبداللہ بانی ویمنس کالج کے نام ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

مسلم یونیورسٹی کے سفر کی پہلی منزل سنہ۱۹۲۰ء میں آئی جب ہندوستان آزاد ہوا لیکن بدقسمتی سے آزادی کے ساتھ ملک تقسیم بھی ہو گیا، جس کی وجہ سے یونیورسٹی کو بالکل نئے حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ اب دوسری منزل نہ جانے کب آئے، سفر جاری ہے۔

سنہ۱۹۲۰ء سے سنہ۱۹۴۷ء کے مختصر عرصے میں ایک طرف تو سائنس اور آرٹس میں نئے نئے شعبے قایم ہوئے تو دوسری طرف انجینرنگ کالج اور ٹریننگ کالج اور ویمنس کالج بھی بنائے گئے۔ گویا پڑھنے لکھنے کا سلسلہ جاری رہا اور یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے لڑکے اور لڑکیاں زندگی کے ہر شعبے میں اپنا مقام پیدا کرنے لگے۔ شاید ۱۹۳۰ء میں سائنس میں پہلی پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی گئی جو ڈاکٹر عمر فاروقی کو کیمسٹری میں ملی۔

سیاسی اعتبار سے یونیورسٹی میں دوسری جنگ عظیم کے شروع ہونے سے قبل یعنی ۱۹۳۹ء سے پہلے تین طرح کے خیالات کے لوگ تھے سب سے موثر گروپ نیشنلسٹ مسلمانوں کا تھا یہ لوگ بہت حد کانگریس سے متعلق تھے۔ دوسرا گروپ والیان ریاست اور تعلقہ داروں سے متعلق تھا اور یہ لوگ انگریزی حکومت کی طرف داری کرتے تھے، تیسرا گروپ جس میں زیادہ تر لوگ تھے، سیاست سے بالکل کنارہ کش تھا۔ اسی گروپ کے لوگ جلد سے جلد تعلیم حاصل کر کے اعلیٰ تعلیم کی ملازمتوں کے متمنی تھے۔

۲۰ــــ۲۲ء کی نان کوآپریشن تحریک کی ناکامی کے بعد مسلم عوام قومی تحریکوں سے الگ ہو گئے تھے، وہ لوگ بھی جو آزادی کے جذبے سے سرشار تھے کانگریس سے بے تعلق سے ہو گئے۔ مولانا محمد علی مولانا شوکت علی، ظفر علی خاں، حسرت موہانی اور چودھری خلیق الزماں نے تو مسلم لیگ میں شرکت کر لی تھی۔ علی گڑھ کالج کے ایک اور فرزند سکندر حیات خاں نے اپنی علیحدہ پارٹی بنائی تھی، ان کی پارٹی کا نام یونینسٹ پارٹی تھا اور یہ پارٹی پنجاب کی نیشنل پارٹی ہو گئی تھی اور سر سکندر کی رہنمائی میں اس کی حکومت پنجاب میں قایم تھی۔

بنگال کے سر ناظم الدین بھی علی گڑھ کالج کے پڑھے ہوئے تھے وہ بھی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ اس طرح آہستہ آہستہ مسلم لیگ ایک بڑی سیاسی جماعت بنتی جا رہی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی اس جماعت کی مقبولیت بڑھنے لگی۔

لیکن سرحد کے ڈاکٹر خاں صاحب اور عبد الغفار خاں مسلم ل
سے الگ رہے۔ انھوں نے کانگریس کی حمایت نہیں چھوڑی اور اپنے صو
میں خدائی خدمت گار تحریک بڑے جوش و خروش سے چلاتے رہے

• ادھر کشمیر میں یونیورسٹی کے ایک اور پرانے طالب علم شیخ محمد عبد اللہ نے علم بغاوت بلند کر دیا۔

ایک طرف تو مسلم لیگ کی مقبولیت بڑھ رہی تھی تو دوسری طرف اشتراکیت کا چرچا بھی ہونے لگا۔ یونیورسٹی کے استادوں میں انگر
کے محمود صاحب، اسکول کے سید محمد صاحب ٹونکی، تاریخ کے عارضی لکچرر ڈاکٹر محمد اشرف اور لائبریرین بشیر الدین صاحب کے گرد ایک حلقہ ایسے نوجوانوں کا بننے لگا جنھیں اشتراکیت میں بڑی کشش معلوم ہوئی۔ طالب علموں میں ان خیالات سے سب سے پہلے متاثر ہو والوں میں خواجہ احمد عباس، حیات اللہ انصاری، سردار جعفری اسرار الحق مجاز اور سبط حسن تھے۔

علی گڑھ سے باہر بھی یہاں کے کالج اور یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے لوگوں نے اشتراکی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کمیونسٹ پارٹ
کے صف اول کے لیڈروں میں ڈاکٹر اشرف اور ڈاکٹر زیڈ۔ اے۔ ا
نے اسی ادارے میں تعلیم پائی تھی۔

اس دور کے آخر میں جماعت اسلامی کا قیام ہوا، یونیورسٹی کے انگریزی ڈپارٹمنٹ کے جلیل صاحب اس کی رہنمائی کرتے تھے، لیکن مسلم لیگ کی مقبولیت کی وجہ سے اس جماعت کا اثر زیادہ نہیں تھ
ان لوگوں نے اپنی تنظیم کا ڈھانچہ ویسا ہی بنایا جیسا کہ کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم کا تھا۔ یعنی چھوٹے چھوٹے گروپ تھے جن میں نظریاتی بحث اور تلقین ہوتی تھی۔

خاکسار تحریک کی بھی ابتدا دوسری جنگ عظیم کے دوران ہو گئی تھی۔ اس کے لیڈر کیمسٹری ڈپارٹمنٹ کے کچھ نوجوان اساتذہ تھے۔

شعر و ادب کی محفلیں بہت مقبول تھیں۔ سال میں دو مشاعرے تو بہت بڑے پیمانے پر ہوتے تھے۔ ایک نمائش کے موقع پر وہیں دربار ہال میں اور دوسرا یونیورسٹی کے میرس ہال میں۔ ان مشاعروں میں

جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی، احسان بن دانش، روش صدیقی، احسن مارہروی، جگر مرادآبادی اور مجروح سلطان پوری حصّہ لیتے تھے۔ مشاعرے کی روایت یہاں بہت پرانی ہے۔ مولانا محمد علی کے زمانے سے ہی کرکٹ لان پر چاندنی رات کو مشاعرہ منعقد کیا جاتا تھا، جس میں کالج کے نوجوان شعراء شرکت کرتے تھے۔ ان لوگوں کے بعد اس محفل میں اقبال سہیل صاحب اور اُن کے ہم عصر حضرات شریک ہوتے تھے۔

اسٹوڈنٹس یونین کا قیام تو سرسید کے زمانے ہی میں ہو گیا تھا۔ کالج کے دور میں اس میں بڑی ترقی ہوئی۔ اس زمانے کے نامور مقررین میں خواجہ غلام السیدین کا شمار ہوتا تھا۔ یونیورسٹی کے دور میں یہ روایت جاری رہی۔ خواجہ احمد عباس، مونس رضا اور خورشید الاسلام کے نام اب تک یونین ہال کی دیواروں پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ آگے چل کر ان سب نے ہندوستان میں اور اس کے باہر بڑا نام پیدا کیا۔

کھیل کود کے میدانوں میں کرکٹ، ہاکی، ٹینس، شہسواری، تیراکی، فٹ بال تو کالج ہی کے زمانے سے بہت مقبول تھے۔ ۱۹۳۷ء میں لارڈ ویلنگڈن وائسرائے کو ایل۔ ایل۔ ڈی کی اعزازی ڈگری دینے کے لیے نظام حیدرآباد میر عثمان علی خاں آئے تھے جو یونیورسٹی کے چانسلر تھے۔ اس موقع کی یادگار کے لیے ایک نیا کرکٹ پویلین بنایا گیا جو آج بھی قائم ہے۔ یہاں اس سے پہلے ایک پویلین تھا، اس کا نام کرکٹ کے مشہور سرپرست نواب معین الدولہ کے نام پر معین الدولہ پویلین تھا۔ ۱۹۰۵ء میں نواب صاحب بھوپال جو اس زمانے میں شہزادہ تھے علی گڑھ کالج میں پڑھنے کے لیے بھیجے گئے۔ انھیں کرکٹ اور شہسواری کا بہت شوق تھا، ان سے پہلے شوکت علی بھی خوب کرکٹ کھیلتے تھے۔ یہ بھی سنا ہے کہ ایم۔سی۔سی ٹیم کا مقابلہ علی گڑھ کالج کی ٹیم سے ہوا تھا اور یہ پہلا موقع تھا کہ کسی تعلیمی ادارے کی ٹیم سے ایم۔سی۔سی کا میچ ہوا ہو۔

اس صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائیوں میں ہاکی ٹیم نے بھی ملک میں بڑا نام پیدا کیا۔ جمنیزیم کی عمارت شاید ۱۹۳۷ء میں بنی سوئمنگ باتھ تو غالباً ۱۹۱۳ء کی تعمیر ہے۔ رائڈنگ کلب کی باقاعدہ بنیاد ۱۸۹۳ء میں پڑی تھی۔

غرض جب آزادی کا سورج طلوع ہوا تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایک ایسا ادارہ بن چکی تھی جہاں تعلیم و تربیت کے سب سامان مہیا تھے۔

اگر اس منزل پر ٹھہر کر اس سفر کا جائزہ لیا جائے جو سرسید کے کارواں نے ۱۸۷۵ء سے شروع کیا تھا تو معلوم ہوگا کہ پچھتر برس کی لگاتار محنت مشقت کے بعد ایک ایسی جماعت تیار ہو گئی تھی جو نئے ہندوستان میں اپنے ہم وطنوں کے دوش بدوش کھڑے ہو کر ملک کی باگ دوڑ سنبھال سکے۔ ایک طرف تو یہ بات طے ہو چکی تھی کہ انگریزی اقتدار ختم ہونا چاہیے اور دوسری طرف اس پر بحث ہو رہی تھی کہ نئے ہندوستان کا انتظام کیا ہوگا۔ اقتدار کس کے ہاتھ میں ہوگا اس پر ہندوستان کے لیڈر متفق نہیں ہو سکے اور ناچار ملک کی تقسیم ہو گئی۔ یہ بات غور کرنے کی ہے کہ اُس وقت دو پارٹیاں میدان میں تھیں، کانگریس اور مسلم لیگ۔ کانگریس والے کہتے تھے کہ ہندوستان میں ایک وفاقی حکومت بنے جس میں ہر یونٹ کو زیادہ سے زیادہ آزادی ملے گی۔ دوسری طرف مسلم لیگ والے سوال کرتے تھے کہ اس جمہوریت میں اقلیتوں کی کیا پوزیشن ہوگی۔ کانگریس والے اپنے جواب سے مسلم لیگیوں کو مطمئن نہ کر سکے۔ مسلم لیگ کے علاوہ یہی سوال کمیونسٹ پارٹی نے بھی اٹھایا تھا اور وہ لوگ بھی کانگریس کے جواب سے مطمئن نہیں تھے۔ یہاں اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ علی گڑھ کے زیادہ تر پڑھے ہوئے لوگ اس معاملے میں کانگریس کے مخالف کیمپ میں تھے۔ چنانچہ جب اقتدار کی باگ ڈور کانگریس کے ہاتھ میں آئی تو اس کے بہت سے ممبروں کا علی گڑھ کی طرف ویسا ہی رویّہ تھا جیسا کہ ایک فاتح کا اپنے مخالف کی طرف ہوتا ہے۔ ایسے آڑے وقت میں مسلم یونیورسٹی کی مدد ان باوقار، شریف اور دانش مند کانگریسی لیڈروں نے کی جن کی مخالفت میں علی گڑھ کے نوجوان بہت پیش پیش تھے۔ یعنی جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد۔ ان لوگوں نے بڑی جرأت سے اعلان کر دیا کہ مسلم یونیورسٹی باقی رہے گی۔ آفریں ہے ان کی ہمت، شرافت اور دوراندیشی پر۔ تقسیم کے وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر زاہد حسین صاحب تھے۔ وہ تھوڑے دنوں کے بعد پاکستان چلے گئے۔ کورٹ نے

ان کی جگہ نواب محمد اسماعیل خاں کو وائس چانسلر منتخب کیا۔ وہ علی گڑھ میں برسوں ٹرسٹی رہ چکے تھے اور سر راس مسعود کے جانے کے بعد ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۵ء تک قائم مقام وائس چانسلر بھی تھے۔ ان کے والد نواب اسحاق خاں نواب وقار الملک کے بعد کالج کے سکریٹری رہ چکے تھے۔ سیاست میں وہ کانگریس کے مخالف تھے لیکن تقسیم کے بعد وہ ہندوستان ہی میں رہے۔

گورنمنٹ نے یہ سوچا کہ اس نازک وقت میں یونیورسٹی کا انتظام ایسے شخص کے ہاتھ میں دیا جائے جو ملکی سیاست میں کانگریس کا مخالف نہ رہا ہو اور جس کا تعلق تعلیم اور تعلیمی اداروں سے بہت گہرا ہو۔ نظرِ انتخاب ذاکر صاحب پر پڑی جو علی گڑھ کے پرانے طالب علم تھے اور جنھوں نے ساری عمر مسلمانوں کے ایسے ادارے کی خدمت کی جو قومی یک جہتی کا علم بردار مانا جاتا تھا۔

سنا ہے کہ مولانا آزاد نے نواب اسمٰعیل خاں صاحب سے ملاقات کی اور فرمایا کہ بدلے ہوئے حالات میں شاید یہ بہتر ہو کہ کسی ماہرِ تعلیم کو یونیورسٹی کے انتظام سے متعلق کیا جائے جو بگڑتی ہوئی حالت سنبھال سکے۔ نواب صاحب سمجھ گئے اور واپس آ کر اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔

ادھر نواب صاحب چھتاری سے بھی اسی قسم کی گفتگو ہوئی اور یہ اشارہ کیا گیا کہ حکومت ذاکر صاحب کو وائس چانسلر بنانا چاہتی ہے۔ نواب صاحب چھتاری پرو چانسلر تھے۔ ان کے ذریعے کورٹ کے ممبروں کو گورنمنٹ کی منشاء بتا دی گئی۔ جب میٹنگ ہوئی تو نواب اسمٰعیل خاں نے ذاکر صاحب کا نام وائس چانسلری کے لیے پیش کیا جو اتفاق رائے سے منظور کر لیا گیا۔

ذاکر صاحب نے جن حالات میں یونیورسٹی کی باگ ڈور سنبھالی وہ حالات بہت مشکل تھے۔ قوم پر بقول شخصے بپتا کا وقت پڑا تھا: سارا شمالی ہندوستان فرقہ واریت کے شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ علی گڑھ کے اساتذہ میں سے بہتوں کا تعلق ان علاقوں سے تھا جو پاکستان میں شامل کر لیے گئے تھے۔ کچھ ایسے تھے جو تقسیمِ ملک کے علم برداروں میں تھے۔ ادھر طلباء کی تعداد بہت گھٹ گئی تھی۔

فرقہ پرست یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ مسلم یونیورسٹی کو ایک عام یونیورسٹی میں تبدیل کر دیا جائے۔ کیوں کہ لفظ مسلم سے فرقہ واریت کی بو آتی ہے۔

ذاکر صاحب نے ایک طرف تو یونیورسٹی والوں کو دلاسا دیا اور ان کی ہمت بڑھائی کہ حالات کا مقابلہ بڑے صبر، استقلال اور ہمت سے کرنا ہوگا۔ دوسری طرف انھوں نے بہت سے شعبوں پر ماہرینِ فن کا تقرر کیا۔ جیسے اقتصادیات میں پروفیسر ڈی۔ پی۔ مکرجی، عربی میں ڈاکٹر علیم اور ڈاکٹر مقبول احمد، تاریخ میں پروفیسر نورالحسن، فزکس میں ڈاکٹر گل، ڈاکٹر رئیس احمد اور اسلامک اسٹڈیز میں ڈاکٹر منیب الرحمٰن۔ یہ سب لوگ وہ تھے جن پر کوئی بھی مسلم لیگی ہونے کا الزام نہیں لگا سکتا تھا۔ اسی کے ساتھ یونیورسٹی کے انتظام میں ایسے ہی لوگوں کو سامنے لائے جن پر غیر مسلم فرقہ پرست انگلی نہ اٹھا سکیں۔ چنانچہ انگریزی کے محمود الحسن صاحب کو یونیورسٹی کا رجسٹرار بنا دیا۔ اس زمانے میں یونیورسٹی کو اس کے مخالفوں کے حملے سے بچانے کے لیے یہ سب کچھ کیا گیا تھا اور اس پالیسی سے مسلم یونیورسٹی کو زندہ رکھنے میں بڑی مدد ملی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان اقدامات سے خود مسلمانوں کا ایک طبقہ غیر مطمئن تھا۔ وہ اس پالیسی کو مخالفوں کی منہ بھرائی کہتے تھے ہو سکتا ہے کہ جو وہ کہتے ہوں اس میں کچھ سچائی بھی ہو، لیکن اس کے علاوہ اور کوئی پالیسی ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ علی گڑھ کی خوش قسمتی تھی کہ ایسے وقت میں جب یونیورسٹی والے دیکھ رہے تھے کہ

شبِ تاریک و بیمِ موج و گرداب چنیں مایل

انھیں ذاکر صاحب جیسا ناخدا مل گیا، ورنہ سفینہ کی جو حالت ہوتی اس کے تصور ہی سے دل کانپ جاتا ہے۔

بہر حال انھوں نے آٹھ برس کی کوشش کے بعد ایسے حالات پیدا کر دیے کہ یونیورسٹی کا وجود خطرے میں نہیں رہا۔ لیکن ان کے جانے کے بعد یہاں دو گروہ پیدا ہو گئے: ایک وہ جنھیں یہ پالیسی پسند تھی اور جنھوں نے اس کو کامیاب بنانے میں ذاکر صاحب کی مدد

کی۔ظاہر ہے کہ ان لوگوں کا انتظام میں دخل زیادہ ہوگیا، جس کی وجہ سے ایک بہت بڑا طبقہ ان کا مخالف ہوگیا۔ یہی بنیاد ہے اس جھگڑے کی جسے ترقی پسندوں اور رجعت پسندوں کی جنگ کہا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ذاکر صاحب کی پالیسی کے نتیجے میں جن لوگوں کا اقتدار یونیورسٹی میں بڑھا ان میں بہت سے کمیونسٹ پارٹی کے ممبر بھی تھے لیکن اساتذہ اور طلبا، دونوں میں ان کی تعداد بہت کم تھی۔ اسی طرح ان کے مخالفوں میں جماعتِ اسلامی کے ممبروں کی تعداد بہت کم تھی لیکن دونوں کے مفاد میں یہ تھا کہ اسے ترقی پسندوں اور رجعت پسندوں کی لڑائی قرار دیا جائے۔

افسوس صد افسوس کہ یونیورسٹی میں اس طرح کی کوئی نظریاتی جنگ نہیں ہوئی۔ نظریات کا نام لے کر ایک فریق دوسرے فریق پر حملہ ضرور کرتا ہے لیکن زیادہ تر جن باتوں پر ہنگامہ ہوتا ہے، وہ بالکل ثانوی حیثیت کی ہیں اور ان کا کسی نظریے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مثلاً وہ لوگ جو بظاہر مخلوط تعلیم کے خلاف ہیں وہ بھی اپنی بچیوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے ایم۔اے، ایم۔ایس سی، طبیہ کالج اور بعد میں انجینئرنگ کالج اور میڈیکل کالج میں بھیجنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں ایسے لوگوں کی تعداد جو واقعی قدامت پسند ہیں بہت کم ہے، اسی طرح وہ لوگ بھی انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے جو واقعی اشتراکی ہیں — نظریاتی اختلافات پر نہ تو کوئی مباحثہ یا سمینار ہوتا تھا اور نہ ہی تحریری طور پر کسی نظریے کی اشاعت یا تردید کی جاتی تھی۔ بین الاقوامی اشتراکی تحریک میں کیسے کیسے انقلابات آئے، کرسچوف کا اسٹالینی طریقوں اور نظریوں پر حملہ، چینی اور سوویٹ کمیونسٹ پارٹیوں کا اختلاف، برلن پراگ اور بوڈاپسٹ کے دردناک واقعات، یورو کمیونزم کی تحریک اور اب گرباچوف کی نئی پالیسی ان میں سے کسی موضوع پر اشتراکی دانشوروں نے کوئی بحث نہیں چھیڑی۔ غرض ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں فریق "حق را بسجودے و نبی را بدرودے" پر ایمان رکھتے ہیں

یہ باتیں اس لیے لکھی جا رہی ہیں تاکہ یونیورسٹی کے اندر جو اختلافات ہیں انھیں صحیح پس منظر میں دیکھا جا سکے۔ یہاں مختلف مذاق کے لوگ رہتے ہیں اور ہم مذاق لوگ ساتھ [illegible] ... ات

عموماً الیکشن کے موقع پر ظاہر ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کا مظاہرہ اساتذہ کے تقرر کے وقت بھی ہوتا ہے اور اس وقت بھی جب انتظامیہ کی ذمہ داریاں دی جاتی ہیں۔ لیکن ایسا ہونا قدرتی بات ہے۔ شادی اور غمی کے موقعوں پر اختلافات بھلا دیے جاتے ہیں۔ اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ یونیورسٹی کے لوگوں میں نظریاتی اختلاف نہیں ہے۔ اختلاف ہے اور اس کا رہنا قدرتی بات ہے۔ جس دن کسی یونیورسٹی میں نظریاتی اختلاف ختم ہوا اور سب ایک ہی خیالات کے ہو گئے تو یہ ذہنی موت کی علامت ہے اس کے بعد کوئی ترقی نہیں ہو سکتی۔

ایک بات جو بہت امید افزا ہے وہ یہ کہ پچھلے بیس بائیس برسوں سے یہ احساس جاگ رہا ہے کہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے اور اس لیے ہر میدان میں دوسروں سے سبقت لے جانے کی تیاری کی جائے۔ چنانچہ پڑھنے لکھنے کا جتنا چرچا اب ہوتا ہے اتنا پہلے کبھی نہیں تھا۔ غالباً دنیا کی ہر یونیورسٹی میں یہ ہو رہا ہے۔ لیکن قابلِ لحاظ بات تو یہ ہے کہ قومی اور بین الاقوامی سیمیناروں میں شرکت کی وجہ سے عام اساتذہ کے خیالات میں بڑی وسعت پیدا ہو رہی ہے۔ آہستہ آہستہ لیکن یقینی طور پر علی گڑھ برادری عالمی برادری کا حصہ ہوتی جا رہی ہے ذہنی طور پر اور اکثر غیر شعوری طور پر کوشش اس کی ہے کہ مسلم یونیورسٹی کا جو مقام آزاد ہندوستان میں ہے اس کا تعین ہو جائے۔ میرا خیال تو یہ ہوتا ہے کہ سماجی اور سیاسی ارتقا ایسا ہوا ہے کہ اب مسلم یونیورسٹی والوں کا زور اپنے حقوق پر اتنا نہیں جتنا کہ اپنی ذمہ داریوں پر ہونا چاہیے۔ وہ دن گئے جب اس کا ڈر تھا کہ ان کی تہذیب کے نقوش ہندوستان سے مٹ جائیں گے۔ اب ہندوستان میں ایک نئی تہذیب جنم لے رہی ہے جس میں لباس اور کھانے پینے کے طریقوں میں وہ باتیں شامل ہوتی جا رہی ہیں جنھیں بعض لوگ صرف مسلمانوں سے متعلق سمجھتے تھے۔ آج سے سو برس پہلے کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ عام ہندو اور مسلمان ایک ہی میز پر بیٹھ کر کھانا کھائیں گے اور کھانے میں ویجیٹیرین اور نان ویجیٹیرین دونوں مذاق کا سامان ہوگا۔ اسی طرح تیس چالیس برس

پہلے یہ تصور کرنا مشکل تھا کہ بنگالی اور مدراسی بیبیاں چوڑی دار پائجامہ اور قمیص پہنیں گی۔ مطلب یہ ہے کہ اب ایک نیا ہندی شہری کلچر جنم لے رہا ہے جو واقعی ہماری گنگا جمنی تہذیب کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کلچر کو نکھارنے کی ذمہ داری میں علی گڑھ والوں کا بھی حصہ ہوگا کہ پچھلے چالیس برسوں میں انھوں نے اس تہذیب کے کچھ پہلوؤں کی حفاظت کی ہے۔

ایک اہم بات جس کی طرف بہت کم توجہ دلائی گئی ہے وہ یہ ہے ہے کہ ہندوستان کے رہنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد کی فلاح اور بہبود کی ضامن وہ اقلیت ہے جس کا تعلق علی گڑھ یونیورسٹی سے ہے۔ میں نے یہ بات اکثر اپنے دوستوں سے کہی ہے کہ اس وقت جب کہ شمالی ہند کے ہر گوشے سے یہ آواز اُٹھائی جا رہی ہے کہ ہریجنوں کو جو رعایات ملازمتوں میں اور تعلیم گاہوں میں ملتی ہیں وہ ختم ہونا چاہیں کہ ان کی وجہ سے انتظامیہ اور تعلیم دونوں کا معیار گرتا جا رہا ہے۔ اگر دولت مند لوگوں کو یہ خوف نہ ہو کہ پالیسی میں ایسی کسی تبدیلی کے نتیجہ میں ہریجن بڑے پیمانے پر تبدیلیٔ مذہب کر سکیں گے تو شاید وہ اپنے اثر و رسوخ سے ہر قسم کا ریزرویشن ختم کروا دیں۔ گویا جمہوری نظام کو اپنی بقا کے لیے مسلمانوں کی ضرورت ہے۔ ورنہ اس کا ڈر ہے کہ اس ملک کے رہنے والے پسماندہ لوگ اپنے ان حقوق سے محروم ہو جائیں جن کی ضمانت آزادی کی جدوجہد کے زمانے میں قومی رہنماؤں نے دی تھی۔

شاید لوگوں کو یاد ہو کہ آزادی کی جدوجہد میں ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب مسلمانوں کے علاوہ ہریجنوں نے بھی مطالبہ کیا تھا کہ انھیں ایک علیحدہ گروپ سمجھا جائے اور ان کے لیے بھی ویسا ہی انتظام ہو جیسا کہ مسلمانوں کے لیے سوچا جا رہا ہے۔ گاندھی جی نے دھمکی دی کہ وہ فاقہ کر کے مرجائیں گے، اگر ایسی کوئی صورت ہوئی۔ انھوں نے

> ”اپنے آپ میں خودی پیدا کرو۔ اس فقیر کی مانند نہ بنو جو بھیڑوں میں پل کر جوان ہوا اور اپنے آپ کو بھیڑ ہی سمجھنے لگے۔“
>
> ”بھیڑیا ہمیشہ اس بکری کو کھاتا ہے جو گلے سے باہر رہتی ہے۔“

ڈاکٹر امبیڈکر سے ایک سمجھوتا کیا جس میں یہ طے کیا گیا تھا کہ حکومت میں ہریجنوں کو بعض مخصوص رعایتیں ملیں گی جو دوسروں کو نہیں دی جائیں گی۔ چنانچہ انھیں بنیادوں پر ہندوستان کے دستور میں ہریجنوں کو مخصوص رعایتیں دی گئیں۔ اگر یہ رعایتیں منسوخ کی گئیں تو قیامت آجائے گی۔

ان حالات میں علی گڑھ والوں کو یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ ہندوستان کی جمہوریت کو قایم رکھنے کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر بھی ہے۔ جب تک وہ یہ ذمہ داری قبول کر کے جمہوریت کے دفاع میں آگے نہیں بڑھتے ہیں، ہندوستانی عوام کے دل میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں بن سکتی۔

یہ بات بہت اچھی طرح ذہن نشین ہو جانا چاہیے کہ جمہوریت کا دفاع صرف سیاسی معاملہ نہیں ہے بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ علمی مذاکرات میں شرکت، ملک کے تعلیمی مسائل میں دلچسپی، کھیل کود، شعر و سخن، رقص و موسیقی کے میدانوں میں سبقت لے جانے کی جدوجہد۔ ان سب باتوں سے وہ رشتے مضبوط ہوتے ہیں جو ہمیں سارے ملک کے عوام سے باندھے ہوئے ہیں۔ ہمیں ہر اس موقعے سے فائدہ اُٹھانا چاہیے جس میں ہمارا تعلق ملک کے دوسرے باشندوں سے ہو، جن کی تہذیب ہماری تہذیب سے مختلف ہے۔ آپس کے میل جول سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔

سنا ہے کہ جب وی۔وی گری صاحب یو۔پی کے گورنر تھے اور ایک دفعہ کانوکیشن کا ایڈریس پڑھنے یہاں آئے تو انھوں نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ میں سمجھتا تھا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں صرف مسلمان لڑکے ہی پڑھتے ہیں لیکن یہاں دیکھا تو میڈل پانے والوں میں ہندو اور مسلمان دونوں ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ جو ہمارے

میڈیکل کالج میں کانفرنسوں، امتحانوں اور سیمیناروں میں آتے ہیں وہ بلا تکلف کہتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے تھے کہ علی گڑھ میں یہ سب کچھ بھی ہوتا ہے۔

آج کے ہندوستان میں ہندو مسلم ملاپ میں جتنا فائدہ مسلمانوں کا ہے اتنا کسی کا نہیں۔ اوّل تو وہ فرقہ وارانہ فسادات کی لعنت سے بچے رہتے ہیں، جن میں ہمیشہ انھیں نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اگر میل ملاپ کی فضا قائم ہو جائے تو ہندوستان کے سب لوگوں کو موقع ملے گا اردو زبان کے سمجھنے اور بولنے کا۔ وہ اسے غیروں کی زبان نہیں سمجھیں گے۔ غزل اور کتھک سے لطف اٹھائیں گے اور ان لوگوں کی عزت کریں گے جنھوں نے خسرو، غالب، اقبال اور فیض احمد فیض کی یادوں کو پچھلے چالیس برسوں میں اپنے سینوں میں چھپائے رکھا ہے۔ اس ملن سے ہندوستان کی تہذیب پر نکھار آئے گا۔

جو لوگ اس میل ملاپ کی مخالفت کرنے والے ہیں وہ کسی ایک فرقے سے نہیں بلکہ ہندوستان کی تہذیب سے دشمنی کرتے ہیں۔

علی گڑھ والوں کو ہندوستانی
تہذیب کی حفاظت کا علم اٹھانا
پڑے گا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”عورت کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے شوہر کا مال اس کی اجازت کے بغیر کسی کو دے۔ دیکھو! تم پر تمہاری عورتوں کے کچھ حقوق ہیں اور اسی طرح ان پر تمہارے حقوق ہیں؛

عورتوں پر تمہارا یہ حق ہے کہ وہ اپنے پاس کسی ایسے شخص کو نہ بلائیں جسے تم پسند نہیں کرتے اور وہ کوئی خیانت نہ کریں۔ کوئی کام کھلی بے حیائی کا نہ کریں اور اگر وہ ایسا کریں تو خدا کی جانب سے اس کی اجازت ہے کہ تم انہیں معمولی سزا دو اور وہ باز آجائیں تو انہیں اچھی طرح کھلاؤ، پہناؤ۔“

گوری لال شنکر اختر اور ان کے رسالے

محمد انصار اللہ*

داتا دیال مہرشی شیو برت لال ورمن نہایت بیدار مغز اور دوراندیش شخص تھے۔ زبانِ اردو کی خوبیوں اور صلاحیتوں سے وہ بہت اچھی طرح واقف تھے۔ اس زبان کی افادیت کے پیشِ نظر اُنھوں نے ہندو عقاید سے متعلق نثر و نظم لکھ کر اس کو ہندوؤں میں مقبول بنا دینے اور ہندو اہلِ قلم کی تحریروں کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں بے مثال خدمات انجام دی ہیں۔ اُنھوں نے اپنے زیرِ اثر صاحب استعداد اور بالیاقت اہلِ قلم کی ایک نہایت مخلص جماعت تیار کرلی تھی۔ اپنی زندگی میں مہرشی جی نے کئی رسالے خود نکالے تھے اور کئی کی براہِ راست اور بالواسطہ طور پر سرپرستی کی تھی۔ اِن رسالوں میں جن حضرات کی نثر و نظم چھپتی تھی اُن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ چند نام یہ ہیں۔

مہاراجا کشن پرشاد پراگ نراین شمس سدرشن میلا رام وفا اقبال ورما سحر ہتگامی۔ دوارکا پرشاد گہر لکھنوی۔ ونایک پرشاد طالب بنارسی۔ بشیشر پرشاد منور لکھنوی گوری شنکر لال کشنوی اختر۔

گوری شنکر لال اختر مہرشی جی کے داماد اور عقیدت مند تھے۔ وہ مہرشی جی کے تمام کاموں میں بہمہ وجوہ شریک رہتے تھے۔ خود مہرشی جی بھی اُن کی لیاقتوں اور خوبیوں کے نہایت معترف تھے۔ مہرشی جی نے بغیر کسی شبہ کے اردو میں سب سے زیادہ ناول لکھے تھے اور اُن کے ناول غیر معمولی حد تک مقبول بھی ہوئے تھے۔ اِس لیاقت کے باوجود اُنھوں نے اختر صاحب کے کاموں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا تھا؛

"اب ناول خوانی کا تازہ شوق پھر پیدا ہو چلا ہے اور شکر ہے کہ عزیزی گوری شنکر لال جی قلم کے میدان میں آکر مردانہ وار بنگالی، مرہٹی وغیرہ کے اخلاق آموز ناولوں کے ترجمے مہیّا کر رہے ہیں۔ اِس شوق کو دیکھ کر میں بھی اِس پیرانہ سالی میں ناول نویس بن رہا ہوں"۔

(شاہی بھکاری ص ۵)

یہی بات ذیل کے اقتباس میں بھی مختلف انداز سے کہی گئی ہے:

"عزیزی گوری شنکر لال اختر... کی ہر دل عزیزی بھی مسلّمہ ہے اور وہ دلچسپی اور ذوق و شوق کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں مگر وہ بھی چھوٹے چھوٹے قصّے ہیں۔ اختر صاحب کے ناولوں کا سلسلہ دیکھ کر میں نے سوچا کہ .... الخ"

(ایضاً ص ۴)

اختر صاحب علمی معاملات میں مہرشی جی کے دستِ راست تھے داماد اور سسر کے مابین اتحادِ کامل کی صورت تھی۔ مہرشی جی بعض کتابوں کی نشاندہی کرتے تھے اور اختر صاحب اُن کی ترتیب و تصحیح اور اشاعت کا اہتمام کرتے تھے۔ مثلاً ایک کتاب کے بارے میں اختر صاحب نے لکھا ہے؛

"مہرشی شیو برت لال جی نے مجھ سے فرمایا کہ میری طالب علمی کے زمانے میں 'من پھول' نامی ایک قصہ چھاپا گیا تھا۔ وہ 'شاہی لکڑ ہارا' سے کم دلچسپ نہیں ہے... اُس کی زبان ذرا پُرانی تھی۔ مجھ کو اصلاح و ترمیم کی بھی اجازت

★ ریڈر، اردو ڈپارٹمنٹ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

فرمائی اور پہلے 'شیو شنبھو' کے کالم میں نکالنے کا حکم دیا میں نے اپنے طور پر جا بجا ردّ و بدل سے کام لیا۔ کتاب کو تمام و کمال نکالنا مشکل تھا۔ اِس لیے اُس کو کسی قدر مختصر کر کے یکبارگی رسالے کے ایک ہی نمبر میں نکال دیا تا کہ پڑھنے والے مزہ لے کر پڑھ سکیں جس کسی کو پوری کتاب دیکھنی ہو وہ منشی بانکے بہاری صاحب کے مطبع (نظایر قانونِ ہند' الٰہ آباد) سے منگا کر اپنا شوق پورا کر لیں۔"

('شیو شنبھو' نومبر ١٩١٧ء)

اختر صاحب کے ایک بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خود مہرشی جی کی بعض تحریروں میں بھی حسبِ ضرورت ردّ و بدل کر لیتے تھے۔ لکھتے ہیں :

"اس بار میں خفیف تغیّر و تبدل اور معقول اضافہ کر کے پیش کرتا ہوں... دلچسپی کے خیال سے اس میں آخری دو واقعات کا اور بھی اضافہ کر دیا گیا ہے"۔

('شعلہ خیز بھبھوکا' بار دوم' ص ۵)

اِس اتحاد و ارتباط کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود اختر صاحب کی بعض تحریریں مہرشی جی کے نام سے منسوب ہو گئیں۔ مثلاً محاصرۂ چتوڑ' روحانی کتھائیں' گونگی کی ڈایری وغیرہ۔ اختر صاحب نے مہرشی جی کے "مشن" کو آگے بڑھانے اور کامیاب کر دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اپنے رسالہ 'مان سرووَر' میں انھوں نے لکھا تھا :

"رسالہ مان سرووَر کی اشاعت کی علتِ غائی خالص ہندو لٹریچر کی حفاظت اور اس کا پرچار ہے۔ اِس وقت ملک میں کوئی ایسا رسالہ نہیں ہے جو علی الاعلان محض ہندو اہلِ قلم کے مضامین پیش کر کے قومی خدمت انجام دیتا ہو اور قوم کے لیے خالص ہندو لٹریچر فراہم کرتا ہو۔ ... آپ اس قومی یگیہ میں میرے معاون و مددگار بن کر اس مشن کو کامیاب بنائیں"۔

(زمان سرووَر' دسمبر ١٩٣٠ء)

اختر صاحب اِس "قومی یگیہ اور مشن" کو کامیاب بنانے کے لیے بہت پہلے سے کوشاں تھے۔ بیسویں صدی عیسوی کے عشرۂ دوم کے آغاز کے ساتھ اُنھوں نے لاہور سے ایک ماہوار رسالہ "شیو شنبھو" کے نام سے نکالنا شروع کیا۔ اِس نام میں غالباً مہرشی جی کے نام کی رعایت بھی ملحوظ تھی جو مختصراً اپنا نام "شیو" لکھتے تھے۔

رسالے کے نام سے گمان ہوتا ہے کہ شاید یہ خالص بلکہ ٹھیٹھ مذہبی رسالہ ہوگا لیکن حال میں راقم کو اس کے کچھ شمارے دستیاب ہو گئے۔ ان سے پتا چلا کہ یہ ایک ایسا ادبی ماہنامہ تھا جس میں صرف ہندو اہلِ قلم کی تحریریں چھپتی تھیں اور نظم و نثر کی بعض اصناف کی ترویج و ترقی کی طرف توجہ زیادہ تھی۔ رسالہ بطورِ مجموعی مذکورہ "قومی یگیہ" کا داعی تھا اور سرورق پر اس کا نام اس طرح لکھا جاتا تھا :

"اردو زبان کا سب سے زیادہ مشہور' ہر دل عزیز اور کثیر الاشاعت اور سب سے زیادہ دلچسپ' دلاویز' نصیحت آموز' علمی' اخلاقی رسالہ
شیو شنبھو' لاہور" (ستمبر ١٩١٠ء)

اور ایڈیٹر کا نام اس طرح چھپتا تھا :

جناب منشی گوری شنکر لال صاحب اختر' رئیس زادہ اودھ"

سالانہ چندہ دو روپے ایک آنہ اور قیمت فی پرچہ تین آنہ تھی۔ یہ ہر مہینہ کی پانچ تاریخ کو لاہور سے شایع ہوتا تھا۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ تھی۔ اِس میں شایع ہونے والی بعض تحریروں کے عنوان درج ذیل ہیں :-

جنوری ١٩١٧ء	چند شاعروں کے کلام — اِس میں اُن کے حالات بھی لکھے ہیں۔ لکھے پڑھے گدھے (پر مذاق مضمون) برق شباب (مسدس)
مارچ ١٩١٧ء	قدیم جین کتب خانے' ہندی شاعری یعنی تہذیب' با اصول زندگی سوامی چوکھٹانند (پر مذاق مضمون)
اپریل ١٩١٧ء	بادشاہ پسند دھن' بانجھ (قصہ) یعنی تہذیب کے دور میں قدیم علوم' جرمن مظالم

مئی ۱۹۱۷ء تصویرِ وفا ، ہندو جاتی کا مول منتر
علمِ قیافہ ہندوستانی جادو
جرمنی کی سفید بھوتنی ، ملکِ عدم کے خطوط

اس رسالے میں اکثر ناٹک اور ناول چھپتے تھے یعنی بالاقساط اور کچھ مکمل ایک ہی شمارے میں چنانچہ ودّیا دتی (ناٹک) اور شاہی ڈاکو (ناول) وغیرہ پہلی بار اِسی میں چھپے تھے۔ اوپر جو مذکور ہوا، اُس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اقسامِ نظم میں مسدّس اور اصنافِ نثر میں قصہ (افسانہ)، ناول، ناٹک (ڈراما)، خطوط، مضمون نگاری اور طنز و مزاح کی طرف توجہ زیادہ تھی۔

شیو شنبھو بابت فروری ۱۹۱۷ء میں ایک مکمل ناول چھپا ہے اُس کے سرورق کی عبارت اس طرح ہے:

"مناظرِ ہیولیٰ الموسوم بہ پدما کے حیرت انگیز خواب۔
تصنیف لطیف منشی گوری شنکر لال اختر رئیس زادہ ایڈیٹر شیو شنبھو، منیجر وگیانی، و پروپرائیٹر سرسوتی بھنڈار مصنف داہ رے ہیں، اچھوتے قصے، روحانی کہانیاں، دیوار قہقہہ بہارِ تصوف، راز خوبصورتی، مہامرہ چتوڑ، بھرتری ہری شتک مخزن المضامین حصہ ۱، ۲، ۳، ۴ وغیرہ وغیرہ۔"

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اختر صاحب مہرشی جی کے دونوں رسالوں وگیانی اور سرسوتی بھنڈار میں بھی کام کرتے تھے۔ یہ دونوں رسالے ۱۹۱۵ء میں لاہور سے جاری ہوئے تھے اور عملاً یہ بھی اُسی مشن کو پورا کر رہے تھے جس کا ذکر اوپر کیا گیا۔

شیو شنبھو کے آخر میں چھپنے والے اشتہاروں سے پتا چلتا ہے کہ ۱۹۱۸ء میں اختر صاحب نے لاہور ہی سے ایک رسالہ "ناول میگزین" کے نام سے جاری کیا تھا۔ اِس میگزین میں بیشتر خود اختر صاحب کے ترجمہ کیے ہوئے ناول چھپتے تھے۔ شروع کے چار ناول یہ ہیں:

ترچھی چتون ، رسیلی چتون ، اتھاہ ساگر ، کپال کنڈلا

ترچھی چتون کے اشتہار میں کہا گیا ہے کہ

"اِس کا ہر نمبر بجائے خود ایک مکمل ناول ہوگا۔ ترتیب، تصحیح اور نظرِ ثانی کا کام منشی گوری شنکر لال صاحب اختر ایڈیٹر شیو شنبھو کے سپرد کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں کم از کم چھ اور زیادہ سے زیادہ آٹھ مختلف النوع مگر دلچسپ ناول سال بھر میں نکلیں گے۔"

(شیو شنبھو، مارچ ۱۹۱۸ء)

"مناظرِ ہیولیٰ" اختر صاحب کی سترھویں کتاب تھی۔ اس کے بعد اختر صاحب کی اُن کتابوں اور تحریروں کے علاوہ جو شیو شنبھو وغیرہ رسالوں میں بالاقساط چھپ رہی تھیں، ناول میگزین میں بھی ان کی کتابیں چھپنے لگیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ قلم برداشتہ لکھتے تھے اور ہمہ وقت تصنیف و تالیف ترجمہ، ترتیب اور تصحیح کے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔

یہ متعین نہیں ہے کہ شیو شنبھو کب تک جاری رہا اور کیوں بند کیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۲۴ء میں لاہور ہی سے اختر صاحب نے ایک ماہوار رسالہ "مان سروور" کے نام سے جاری کیا۔ مزاج اور مندرجات کے اعتبار سے اِسے شیو شنبھو ہی کی ایک ارتقائی صورت سمجھنا چاہیے۔ اِس کے "دستور العمل" میں یہ باتیں شامل تھیں:

"اِس میں اردو زبان کے بہترین مضامین شامل ہوں گے۔ نئے خریداروں کو اختر صاحب کی ایک دلچسپ کتاب مفت نذر کی جائے گی،
اِس کے صفحات مخربِ الاخلاق اشتہارات اور ایسے مضامین سے جن میں کسی کی تو تو میں میں ہو، خالی رہیں گے"

یہ رسالہ بھی ہر مہینے کی پانچ تاریخ کو شایع ہوتا تھا۔ فرق یہ تھا کہ یہ سایز پر ہوتا تھا۔ اِس کا سرورق نسبتاً سادہ ہوتا تھا اور سرورق پر بہت اختصار کے ساتھ "ماہوار ادبی رسالہ" لکھا ہوتا تھا۔ یہ فرق اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اب خیالات میں زیادہ متانت اور توازن کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ زبان میں بھی کسی قدر صفائی کا احساس ہوتا ہے۔ بعض عنوان مثلاً "معجونِ مذاق" جن کی حیثیت شیو شنبھو میں ضمنی تھی، مان سروور میں اُن کو باقاعدہ صورت مل گئی تھی۔ بعض اصناف مثلاً ناول اور ناٹک کے بہتر نمونے سامنے آ رہے تھے اور اب قصہ اور کہانی کو ایک ادبی صنف کا درجہ مل گیا تھا اور "افسانہ" کی اصطلاح استعمال کی جانے لگی تھی۔ مان سروور کا سالانہ چندہ تین روپے اور

قیمت فی پرچہ پانچ آنے مقرر کی گئی تھی۔

رسالہ مان سرور کے صفحات میں ایسے کئی اہلِ قلم کی کاوشیں چھپنے لگی تھیں جو بعد میں اردو دنیا میں ممتاز ہوئے۔ ایسے کچھ نام درج ذیل ہیں:
منشی پریم چند' بی۔اے ایڈیٹر مادھوری' مہاراج بہادر برقؔ، سورج نرائن مہرؔ' سکھ دیو پرشاد بسملؔ الہ آبادی' پیارے لال رونقؔ دہلوی' لچھمن پرشاد صدرؔ لکھنوی' شیام موہن لال جگرؔ بریلوی' لبھورام جوشؔ' جگت موہن لال رواںؔ۔ تلوک چند محرومؔ' بنواری لال شعلہؔ' رگھوپت سہائے فراقؔ گورکھپوری۔

مان سرور میں چھپنے والے مضامین کا اندازہ ذیل کے عنوانات سے کیا جاسکتا ہے:

اگست ۱۹۲۷ء

ہندو فلسفہ (مذہب کیا ہے)	مہرشی شیوبرت لال جی
برسات کی شام	مہاراج بہادر برقؔ
مستعار گھڑی (قصہ)	منشی پریم چند بی۔اے
کافور کی صنعت اور پیداوار	جرنلسٹ
عجیب معلومات (جاسوسی قصہ)	لالہ شانتی نراین
جذبات بسملؔ	بسملؔ الہ آبادی
ناگ پنچمی کے تیوہار کی اصلیت	شریمتی راج دلاری
معجون مذاق ۔ نمک	سندر لال ساغرؔ
لطیفے	شریمتی تارا سندری
موتی کے اقسام	شریمتی برج رانی
دنیا کے رسم و رواج و توہمات	بابو بھیروں دیال

اکتوبر ۱۹۳۲ء

حسن وعشق (نظم)	شیام لال سحرؔ
پانی کے بلبلے	مہرشی شیو برت لال
عیار محبوبہ (افسانہ)	امین چند سرورؔ
ہجر کی رات (نظم)	نراین پرشاد مہرؔ
نادان دوست (افسانہ)	پریم ناتھ سادھو
شب فرقت (نظم)	بھیم سین ظفرؔ
چشمۂ طب	حکیم چھدامی لال قمرؔ دہلوی

مان سرور کے کئی خاص نمبر شائع کیے گئے اور ان سب کا تعلق یا تو علم کے کسی شعبے سے ہوتا تھا یا کسی مخصوص صنفِ ادب سے۔ مثلاً بعض یہ ہیں:

جوتش نمبر	اپریل ۱۹۳۰ء
ناٹک نمبر	جون ۱۹۳۰ء (اس میں چھ ڈرامے ہیں)
افسانہ نمبر	ستمبر ۱۹۳۰ء
ناول نمبر	دسمبر ۱۹۳۰ء
افسانہ نمبر	ستمبر ۱۹۳۲ء
طبی نمبر	جنوری ۱۹۳۳ء
ناٹک نمبر	جولائی ۱۹۳۳ء

اختر صاحب اب ایک کہنہ مشق ناول نویس اور افسانہ نگار ہو چکے تھے۔ ان کے ناولوں کی ستایش کرتے ہوئے ۱۹۱۸ء میں مہرشی جی نے لکھا تھا:

> اِس طرف عزیز گوری شنکر لال صاحب اخترؔ ایڈیٹر شیو شمبھو نے ناولوں کا ایک نیا سلسلہ (ناول میگزین کی صورت میں) شروع کر دیا جو واقعی نہایت قابلِ قدر ہے اور اردو کے تمام موجودہ ناولوں سے بہتر ہیں۔ کہنے کے لیے تو وہ بنگالی ناولوں کے ترجمے ہیں مگر قابل مترجم نے کچھ ایسی خوبصورتی کے ساتھ اُن کو ترتیب دیا ہے کہ ترجمہ میں اصل کتاب کا لطف آتا ہے اور طبیعت پڑھ کر خوش ہو جاتی ہے۔" (شاہی بھکاری ص ۴)

مان سرور کی ادارت کے زمانے میں اُن کی صلاحیتیں اور لیاقتیں شباب پر تھیں۔ اِس رسالے میں بیشتر معیاری تخلیقات شائع ہوتی تھیں اور افسانے، ناول، ڈرامے کے سلسلے میں اس رسالے نے امتیازی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ شیو شمبھو اور مان سرور دونوں میں غزلیں عموماً نہیں ہوتی تھیں۔

۱۹۴۰ء میں مہرشی جی نے چولا چھوڑا۔ اختر صاحب بھی لاہور سے اپنے وطن یعنی الہ آباد آگئے اور یہیں سے اپنا رسالہ مان سرور نکالتے رہے۔ الہ آباد کے ماحول نے اختر صاحب کے خیالوں کو مثبت انداز سے تبدیل کر دیا۔ اب وہ ملامتی پسندی کے قائل

نہیں رہ گئے تھے۔ زبان و ادب کو اب وہ کسی مذہب یا قوم تک محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ اب انھوں نے اپنے رسالے میں مسلمانوں کی تخلیقات کو بھی جگہ دینی شروع کی۔ اس زمانے میں ایڈیٹر کا نام بھی مختصر ہو کر صرف "گوری شنکر لال اختر" رہ گیا تھا اور رسالے کے سرورق پر یہ الفاظ ہوتے تھے:۔

"ادب، اخلاق، فلسفہ، بھگتی بھاؤ، طب و دیگر نہایت قیمتی معلومات سے لبریز ماہوار رسالہ مان سرور، الٰہ آباد۔"

ستمبر ۱۹۴۱ء کے شمارے کے بعض مندرجات اس طرح ہیں:

زمانہ حال کی تعلیم اور انسان	پرم سنت مہرشی شیو برت لال جی مہاراج
سرورِ کونین (نظم)	آرزو سہارنپوری
دلشی پریم (افسانہ)	للت موہن پنت
تلسی داس کا شاعرانہ کمال	شنکر موہن لال ماتھر
مطلب کی ہشیار ہے دنیا (نظم)	مرتضیٰ حسن دمّاڈبائیوی
روداد حیات (نظم)	پرویز شاہدی
چونکہ مسافر رات نہیں ہے (نظم)	شاد عظیم آبادی
تلافی (افسانہ)	سریندر پرشاد
جلیل القدر ہستیوں کے اہم خطوط	منور سہائے انور
اُنیائے (ناٹک)	مسلسل
ہچکیاں (نظم)	سید محمد جعفری

مان سرور کے مزاج اور مندرجات میں یہ تبدیلی بہت خوش آیند تھی۔ رسالے نے قبولِ عام حاصل کیا اور اس کی اشاعت میں بھی توسیع ہوئی۔ جناب ستر اکمار نے بتایا کہ رسالہ مان سرور لاہور سے ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۸ء تک نکلتا رہا تھا۔ پھر نومبر ۱۹۴۰ء سے یہ الٰہ آباد سے نکلنا شروع ہوا اور ۱۹۶۶ء تک جاری رہا۔ آخر زمانے میں اس رسالے میں اردو اپنی حقیقی صورت میں جلوہ گر تھی۔

حواشی

۱ اختر صاحب کے مفصل حالات اُن کے لائق و فائق فرزند جناب ستر اکمار لکھ رہے ہیں۔ جناب ستر اکمار نہایت مخلص اور نیک دل شخص ہیں۔ بعض کتابوں کے مصنف بھی ہیں لیکن تا حال اُن کو چھپوانے کی طرف متوجہ نہیں ہوئے ہیں۔ اب راقم کی خاطر سے بعض چیزوں کو شایع کر دینے پر رضامند ہو گئے ہیں۔

۲ مصنف کا نام اختر صاحب نے نہیں لکھا ہے۔

۳ یہ مہرشی جی کی تصنیف ہے۔

۴ گلستانِ ہزار رنگ میں (ص ۴۵۸، ۵۵، ۴۵۷) یہ تینوں نام مہرشی جی کی تصانیف میں شامل ہیں، لیکن شیو شنبھو بابت اپریل ۱۹۱۷ء اور بعد کے رسالوں میں محاصرۂ چتوڑ اور روحانی کتھائیں دونوں نام اختر صاحب کی تصانیف کی فہرست میں موجود ہیں۔ اسی طرح مان سرور بابت ستمبر ۱۹۳۲ء اور بعد کے شماروں میں اختر صاحب کے ناولوں میں گونگی ڈایری کا نام دیکھا جا سکتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جناب ستر اکمار بھی اول الذکر کو مہرشی جی کی تصنیف خیال کرتے ہیں۔ اپنے گرامی نامہ مورخہ ۱۴-۸-۱۹۸۸ء میں فرماتے ہیں:

"سورج نرائن مہر صاحب نے مہرشی جی کی بہت سی کتب گورنمنٹ سے لائبریری کے لیے منظور کرا دی تھیں۔ محاصرۂ چتوڑ اُن میں سے ایک تھی۔"

۵ ایسے رسالہ اس زمانے میں کئی تھے مثلاً دگیانی، سرسوتی بھنڈار، اپنشد میگزین وغیرہ

۶ افسوس کہ مہرشی جی اور اختر صاحب کے زمانے میں بھی ایک طبقہ اردو کی مخالفت کر کے اس "قومی یگیہ" کو ناکام بنانے کے لیے کوشاں تھا۔

پھر مہر قیمتی جی کے چولا چھوڑنے کے سات برس بعد تو اعلاترین سطح سے اردو دشمنی بلکہ اردو کشی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ے بعد میں غالباً اسی کا نام 'ناولستان' ہو گیا تھا۔

ہ ان سنین میں فرق بھی ہو سکتا ہے۔ صحیح صورت حال کا تعین رسالوں کو دیکھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔

مآخذ

شاہی سبھکاری — از شیو برت لال ورمن — مطبوعہ لاہور

شعلۂ خیز سبھبوکا — مصنفہ شیو برت لال ورمن، مرتبہ، مولفہ و مصوّر گوری شنکر لال اختر، بار دوم، مطبوعہ لاہور۔

گلستان ہزار رنگ — مرتبہ — موہن لال نیّر — اپریل ۱۹۶۴ء — بار اول

رسالہ شیو شنبھو، لاہور — جنوری تا دسمبر ۱۹۱۷ء

رسالہ مان سرور، لاہور، — اگست ۱۹۲۷ء، دسمبر ۱۹۳۰ء، اکتوبر ۱۹۳۲ء

رسالہ مان سرور، — الہ آباد، — ستمبر ۱۹۴۱ء

"مسلمان مجموعی آبادی میں اپنے آپ کو اکثریت اور اقلیت کے پیمانے سے نہ ناپیں بلکہ یہ دیکھیں کہ نمک یا شکر کی تھوڑی سی مقدار کس طرح پوری دیگ کو متاثر کرتی ہے اور پورے کھانے میں پیوست ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مسلمان جس ملک میں رہتے ہیں، اس ملک کی رگوں میں خون کی طرح پیوست کر جائیں۔ ان کا وجود اتنا ضروری اور اہم ہو کہ ان کے بغیر سارے ملک کا جسم بے جان سمجھا جائے۔"

سید ابوالحسن علی ندوی

(کلکتہ کی ایک تقریر سے اقتباس)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۷، شمارہ ۱۲ (دسمبر ۸۸ء)

بنیادی تعلیم کے مسائل

احمد رشید (علیگ)*

کمیشن فار لنگوئسٹک مائنارٹیز (Commission - For Linguistic Minorities) آئین کی دفعہ ۳۵۰ کے تحت اقلیت کے لسانی مسائل پر نہ صرف غور و فکر ہوگا بلکہ ان کو دور کرنے کے لیے حکومت کوشش کرے گی اور زبان کے فروغ اور بقا کے لیے ہر قسم کا تعاون فراہم کرے گی۔ اس کے تعلق سے حکومت نے ہر صوبے میں کمیشن قائم کیے ہیں جو لسانی مسائل کی تلاش میں ہنگامی دورے کرتے ہیں اور اقلیت کی زبان کے درس و تدریس کے مسائل کو حل کرتے ہیں اور جو ان کے دائرۂ اختیار سے باہر ہوتے ہیں، ان کو حکومت کے سامنے پیش کرنے کے علاوہ ان کو دور کرنے کے لیے مشورہ بھی دینا ہے۔

۹ر مارچ ۸۸ء کو کمشنر نے ہنگامی دورہ علی گڑھ کا کیا۔ علی گڑھ کے بیسک شکشا ادھیکاری جناب عبدالصبور خاں صاحب نے ضلع علی گڑھ ٹیچرس یونٹ کے سابق سکریٹری اور موجودہ مشیر خاص کی حیثیت سے خادم کو ان سے ملاقات کے لیے بھیجا۔ اردو زبان کی درس و تدریس کے در پیش مسائل زیر بحث آئے۔ جنہیں میں آگے چل کر بیان کروں گا یہاں ایک اہم نکتہ کی طرف آپ کی توجہ مبذول کروں گا۔ حکومت زیادہ تر قوانین ہر زبان کے ایک سے ہی مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے بناتی ہے، جس کی وجہ سے کچھ علاقائی اور شہری مسائل نظرانداز ہو جاتے ہیں۔ دوسری بات مجھے یہ کہنی ہے کہ قومی مسائل اپنی جگہ مسلم ہیں لیکن کچھ مسائل صرف ایسے ہیں جو کسی خاص زبان اور اس زبان کے بولنے والوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ چوں کہ ہر زبان کا اپنا ایک نجی مزاج اور اپنی تہذیبی و ثقافتی قدریں ہوتی ہیں، اس کی اپنی ادبی اور اخلاقی شناخت ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں مجھے یہ کہنا ہے کہ جہاں حکومت سیکولر اور جمہوری روایتوں کو مضبوط اور برقرار رکھتے ہوئے بغیر کسی امتیاز اور فرق کے اقلیتی لسانی مسائل اور درس و تدریس کے مسائل حل کرنے کے لیے قوانین بنانی ہے وہاں وہاں کسی زبان اور زبان کے بولنے والوں کے مزاج، نبض اور تہذیبی تقاضوں کو بھی دھیان میں رکھنا ہوگا۔ دوسرے یہ کہ آئین کا وقار اور عظمت برقرار رکھنے کے لیے تفریق، منافرت اور تعصب کی پالیسی کو بھولنا ہوگا۔ مثلاً صوبائی اور مرکزی حکومت نے جامعہ اردو بورڈ علی گڑھ سے دی جانے والی اسناد ادیب کو ہائی اسکول کے مساوی، ادیب ماہر کو انٹرمیڈیٹ کے مساوی اور ادیب کامل کو بی۔ اے کے مساوی تسلیم کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں نے بھی ان اسناد کو تسلیم کیا ہے۔ یہاں تک کہ آگرہ یونیورسٹی سے ادیب کامل پاس شدہ طالب علموں نے ایم اے میں بھی داخلہ لیا ہے۔ یہ یقیناً بڑی خوشی کی بات ہے لیکن حیرت انگیز اور تاسف کی بات یہ ہے کہ ضلع شکشا پریشد نے اردو اساتذہ کی تقرریوں کے سلسلے میں ادیب ماہر کو انٹرمیڈیٹ کے برابر تسلیم

---

* سرائے رحمان، علی گڑھ (یوپی)۔

نہیں کیا بلکہ امیدوار کا انٹرمیڈیٹ ہونا ضروری تھا۔ اگر انٹر میں اردو نہیں ہے اور اس امیدوار نے ادیب ماہر کیا ہے تو اس کو انٹرویو میں شریک ہونے کا مجاز قرار دیا گیا۔ اس کے برعکس سنسکرت استاد کے لیے الٰہ آباد بورڈ سے دی جانے والی سند مدھیما ـــــ ~~مدھیما~~ کو انٹر کے مساوی مانا گیا ہے اور اس کے لیے انٹر کی کوئی قید نہیں۔ مدھیما پاس شدہ سنسکرت استاد ہو سکتا ہے یعنی اردو زبان جو ہندوستان کی ایک کثیر تعداد کا ذریعہ اظہار ہے اور جس کا شمار جدید زبانوں میں ہوتا ہے، اس کی حیثیت کمزور ہے۔ اس زبان کے مقابلہ میں جو قدیم ہے اور پورے ہندوستان میں کہیں بھی نہیں بولی جاتی ہے۔

اتر پردیش میں کافی تگ و دو اور جد و جہد کے بعد ۱۹۷۳ء میں اردو اساتذہ کی تقرریاں عمل میں آئی تھیں۔ آج پندرہ سال کے بعد بھی حکومت نے اردو زبان کی پرائمری اسکول میں حیثیت متعین نہیں کی ہے۔ اردو اساتذہ کو ابھی تک نہیں معلوم کہ اردو کو لازمی مضمون کی حیثیت سے یا اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جائے۔ اس ناقص تعلیمی نظام کی وجہ سے نہ تو اردو زبان کو فروغ حاصل ہو رہا ہے اور نہ ہی اردو بولنے والوں کو کوئی فائدہ ہو رہا ہے۔ حکومت اور اردو کے بہی خواہ اساتذہ کی کارگزاریوں پر غور کرتے ہیں تو سب سے پہلے اردو طلبا کی تعداد پر نظر جاتی ہے یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ اردو اساتذہ کی تقرریوں کے سلسلے میں حکومت کا بنیادی مدعا اقلیت کی بے روزگاری کو دور کرنا اور ضمنی طور سے اردو زبان کو مراعات دینا بھی شامل ہے کسی بھی زبان کی بقا اور فروغ، توانا اور معتبر ادب کی تخلیقات اور عصری تقاضوں سے زبان کا جڑا ہونا اور ساتھ ہی اس زبان کے پڑھنے اور بولنے والوں کی تعداد اور اس کے اضافہ میں پوشیدہ ہے۔ لیکن ۷۳ء سے ۱۹۸۸ء تک اردو طلباء کی تعداد میں قابل اطمینان اضافہ نہیں ہوا ہے۔ اس معاملے میں اردو اساتذہ کی کاوشوں پر شک و شبہ کی گنجائش ہے

اس کی ایک بنیادی وجہ ہمارے نظام تعلیم میں ربط و تسلسل کا نہ ہونا ہے۔

ضلع بریلی شہر کے جونیئر بیسک اسکولوں میں داخلہ اردو میڈیم یا ہندی میڈیم میں کیا جاتا ہے اور میڈیم کے مطابق سب ہی مضامین (حساب + زبان + سوشل اسٹڈیز + سائنس) پڑھائے جاتے ہیں۔ پرائمری سطح پر درجہ اول تا پنجم انگریزی پڑھانے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ نصاب بھی نہایت غیر معقول اور فرسودہ ہے جو وقت کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ جس کی وجہ سے پرائمری سطح تک کے اسکولوں میں طلبا کی تعداد کافی گری ہے جو ایک الگ بحث طلب موضوع ہے۔ مسئلہ اردو طلباء کی تعداد گھٹنے کا ہے، جب کہ ہر اسکول میں ایک اردو استاد موجود ہے جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ ضلع جونیئر اور سینیئر بیسک اسکولوں کا نصاب تعلیم ناقص ہے۔ داخلہ درجہ اول تا پنجم تک ہوتا ہے ظاہر ہے ہر درجے کا نصاب علیحدہ ہے اور پرائمری اسکولوں میں ٹائم ٹیبل کے مطابق پڑھانے کی کوئی اجازت نہیں ہے۔ دیگر یہ کہ استاد کا تقرر علیحدہ علیحدہ مضمون پڑھائے جانے کے لیے نہیں کیا جاتا۔ سال کے شروع میں استاد کو کوئی ایک کلاس سونپ دی جاتی ہے اور وہی اس کے سیاہ سفید کا مالک ہوتا ہے۔ یعنی بیسک ایجوکیشن سسٹم کے تحت اس کو ہندی یا اردو میڈیم میں چاروں مضامین پڑھانے ہوں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر درجہ اول سے پنجم تک پانچ پانچ یا چھ چھ بچے اردو میڈیم میں داخل ہو بھی گئے تو اس ایک اردو استاد کو الگ الگ درجے کے طلباء کو ایک ہی ساتھ ایک ہی کمرے میں بٹھا کر پورے سال پڑھانا ہوگا۔ کیوں کہ ٹائم ٹیبل کا نظام ان اسکولوں میں نہیں ہے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جو غیر اہم خیال کیا جائے گا لیکن نظام تعلیم میں اس کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

ابھی دو سال قبل صوبے کے کچھ اردو اکثریت والے علاقوں اور شہروں میں اردو اساتذہ کی آسامیاں آئیں جن میں مراد آباد، لکھنؤ، بریلی، رام پور، میرٹھ اور علی گڑھ وغیرہ ہیں۔ ان شہروں میں علی گڑھ اپنی تہذیبی اور ادبی شناخت اور امتیازی شان کا

کا مالک ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وجہ سے اس کی اپنی تاریخی عظمت ہے۔ اردو استاد کے لیے اردو مضمون کے ساتھ انٹرمیڈیٹ پاس ہونا لازمی تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ امیدوار کو Domicile سرٹیفکیٹ دینا بھی ضروری تھا۔ یہ اس لیے کہ شہر کے رہنے والے بیروزگار اردوجان کاروں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ ہو سکے۔ مگر علی گڑھ شہر کی یہ بدنصیبی رہی کہ وہ اردو مضمون کے ساتھ انٹرمیڈیٹ پاس شدہ امیدواروں کو مہیا نہ کر سکا۔ آخرکار محکمہ نے اس شرط میں لچک پیدا کی اور چوں کہ تقرریاں ہونی تھیں اس لیے جس شہر کا بھی انٹرمیڈیٹ پاس شدہ استاد ملا اس کا تقرر ہو گیا اور علی گڑھ جو کہ علم و ادب کا گہوارہ اور ہندوستان کا اردو مرکز خیال کیا جاتا ہے وہ روزگار کی مراعات سے محروم رہ گیا۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ یہ استاد چاہے لکھنؤ کے رہنے والے ہوں، یا میرٹھ کے یا کسی اور مقام کے مگر اردو داں تو ہیں۔ لیکن مسئلہ تو یہ ہے کہ ہر شہر کے اردو داں استادوں کو جگہیں ملیں علی گڑھ کے اردو دانوں کو کیوں نہیں؟ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا علی گڑھ میں پڑھے لکھے نہیں تھے؟ جواب ہے: "تھے"۔ کیا علی گڑھ میں انٹر پاس نہیں تھے؟ جواب ہے: "نہیں تھے"۔ کیوں نہیں تھے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ علی گڑھ میں اردو داں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروڈکٹ (Product) تھے جو کہ (۱۰+۱+۳) سسٹم سے تعلیم حاصل کر کے نکلے ہیں اور مذکورہ جگہوں کے لیے تعلیمی شرط انٹرمیڈیٹ پاس تھی اور اس کی میرٹ (Merit) بناتے وقت یہ دھیان رکھا گیا کہ جس نے انٹرمیڈیٹ پہلے پاس کیا اس کو اولیت ملی۔ اب مسلم یونیورسٹی میں (۱۰+۲+۳) والا سسٹم نافذ ہو چکا ہے جس کا دوسرا اسیشن جاری ہے۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ اردو کو اختیاری یا لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھانے کا جونیر بیسک اسکولوں میں کوئی قاعدہ نہیں ہے۔ چوں کہ یہ Extra Burden of Subject ہوگا۔ اس کے علاوہ داخلہ ہونے میں ایک دشواری اردو کے ساتھ ہیڈ ماسٹروں اور دیگر افسران کا متعصبانہ رویہ بھی ہے۔

بہرحال ان تمام مسائل اور پریشانیوں سے نمٹتے ہوئے اور برداشت کرتے ہوئے اگر طالب علم اردو میڈیم سے درجہ پنجم پاس بھی کر لے تو جونیر ہائی اسکولوں میں اردو میڈیم میں تعلیم دینے کا سرے سے کوئی انتظام نہیں ہے۔ وہاں طالب علم کو ہندی میڈیم سے واسطہ پڑتا ہے اور اردو اور سنسکرت اختیاری مضمون ہیں جن میں سے طالب علم کو ایک مضمون لینا ہوتا ہے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ انگریزی جونیر ہائی اسکول میں لازمی مضمون کی حیثیت رکھتی ہے مگر پرائمری اسکولوں میں انگریزی پڑھانے کا سرے سے کوئی انتظام نہیں ہے۔ درجہ ششم میں وہ چھٹے درجے کے سطح کی انگریزی پڑھے گا اور اسی درجے میں اختیاری مضمون کی حیثیت سے اردو دوسرے درجے کے سطح کی اور ہفتم میں تیسرے درجے کے سطح کی اور ہشتم میں چوتھے درجے کی بیسک ریڈر کا حصہ سوئم پڑھے گا۔ آٹھویں درجے کے بعد دسویں تک اترپردیش کے محکمۂ تعلیم نے اردو پڑھانے کا کوئی معقول انتظام نہیں کیا ہے۔

میری ان معروضات سے اس کا بخوبی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ درجہ اول سے درجہ دہم تک تعلیمی نظام کس قدر ناقص، غیر منطقی اور بے ربط ہے۔

ایک بنیادی مسئلہ نصاب میں داخل اردو اسباق کا ہے۔ درجہ اوّل سے درجہ ہشتم تک سب ہی اسباق ہندی زبان سے ترجمہ کیے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ ہر زبان کا اپنا ایک تہذیبی مزاج ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اردو زبان کی کتابوں پر نظرثانی کی جائے اور اردو زبان کے ماہرین ان کتابوں

> "دنیا میں کسی قوم کی ترقی کے یہی دو نشان ہیں۔ ایک یہ کہ وہ سمجھنے لگیں کہ وہ ذلت اور خرابی میں مبتلا ہیں اور دوسرا نشان یہ ہے کہ اس ذلت سے نکلنے کی کچھ کوشش شروع کر دیں۔"
>
> سرسید

کو مرتب کرتے وقت دھیان رکھیں کہ نصاب میں شامل اسباق اردو ادب سے ماخوذ ہوں۔ کیوں کہ اردو کے طالب علم کو آئندہ درجات میں میرؔ، غالبؔ، حالیؔ، سرسیدؔ، شبلیؔ اور اقبالؔ سے واسطہ پڑے گا، نہ کہ تلسی داس یا کبیر داس وغیرہ سے۔

محکمۂ تعلیم اردو کتابوں کو فراہم کرے۔ اس لیے کہ نصابی کتابیں نہ تو بازار میں ملتی ہیں اور نہ ہی ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ کی طرف سے مہیا ہوتی ہیں۔ کتابوں کی نایابی کی وجہ سے اردو طلباء کا بہت نقصان ہوتا ہے۔

محکمۂ تعلیم اردو داں ہیڈ ماسٹر، ایس۔ڈی۔آئی ڈی۔آئی، بی۔ایس۔اے اور دیگر افسران کو مقرر کرے۔ کیونکہ غیر اردو داں افسران اساتذہ کو یہ تو دیکھ سکتے ہیں کہ وہ پڑھاتے ہیں لیکن اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے ہیں کہ وہ کیا پڑھا رہے ہیں افسران کے اردو نہ جاننے کی وجہ سے بھی اردو زبان کو بہت نقصان ہو رہا ہے۔

" اور تمہارے پروردگار نے یہ حکم قطعی دے دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرتے رہو۔ اگر ان دونوں میں سے ایک یا دونوں تمہاری موجودگی میں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو اُن کے سامنے اُف بھی نہ کرو اور نہ اُن کو جھڑکو اور اُن سے ادب و اخلاق کی باتیں کرو اور رحم و مروت سے سرِ عجز اُن کے سامنے خم کرو اور یہ کہا کرو کہ اے میرے پروردگار تو اِن دونوں پر ایسا ہی رحم فرما جیسا کہ ان دونوں نے مجھے ننھا سا پالا تھا۔ تمہارا پروردگار جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اُن سے خوب واقف ہے۔ اگر تم نیک رہو گے تو وہ بھی توبہ کرنے والوں کے لیے بڑا ہی بخشنے والا ہے اور (اے رسولؐ) تم قرابت والوں کو اس کا حق دے دو، اور مسکین و مسافر کو اس کا۔ ادب بجا نہ اُڑاؤ۔"

(سورۃ الاسراء : آیت ۲۳)

تھوک پیداوار

تھوک پیداوار سے مراد پیداوار میں بے تحاشا اضافہ ہے صنعتی انقلاب سے تھوک پیداوار کا آغاز ہوتا ہے۔ قبل ازیں پیداواری ذرائع محدود اور فرسودہ تھے۔

تھوک پیداوار کی طرف پہلا قدم افرادی قوت کی تقسیم اور تخصیص کے ذریعے اٹھایا گیا۔ قدیم دستور تھا کہ ایک شخص ایک شعبے میں مکمل مہارت رکھتا تھا۔ مثلاً موچی پہلے درجے سے لے کر آخری درجے تک جوتے کی تیاری کا ماہر تھا۔ نئے دستور کے مطابق کام کو بانٹ لیا گیا اور الگ الگ حصوں کے الگ الگ ماہر پیدا کیے گئے۔ یہ ماہر اپنے شعبے میں تو اعلیٰ درجے کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن دوسرے امور میں معمولی شد بد کے سوا کچھ نہیں جانتے۔ مثلاً ایک پلانٹ کا ماہر دوسرے پلانٹ کی مہارت نہیں رکھتا۔ اس طرح الگ الگ ماہرین مل کر ایک شے کی تیاری میں اپنا اپنا حصہ ادا کرنے لگے اور مصنوعات کا معیار اور تعداد تیزی سے بڑھنے لگی۔

کسی شعبے میں خصوصی مہارت رکھنے والے افراد کو اصل عروج تو صنعتی انقلاب کے بعد حاصل ہوا لیکن انسانی معاشرت میں ایسے افراد لوہے کے زمانے سے چلے آتے ہیں۔ چنانچہ اس زمانے سے انسان نے مختلف کاموں کو بانٹنا سیکھا اور تیر اور کلہاڑی بنانے والے اپنی خوراک اور لباس کے بدلے ان ہتھیاروں کو کسانوں اور چرواہوں کے ہاتھ فروخت کرنے لگے۔

انسان نے پہلی باقاعدہ اور مستقل تہذیب کی بنیاد میسوپوٹیما (عراق) میں آج سے کوئی گیارہ ہزار سال پہلے (۹۰۰۰ قبل مسیح) میں رکھی۔ تہذیب نے انسان کو مختلف ہنرمندیوں کی طرف مائل کیا۔ مثلاً برتن سازی، لباس کی بنائی اور دھاتی کاریگری۔

پہلی تہذیب کے قیام کے، پانچ ہزار سال بعد (۴۰۰۰ ق م) میں انسان اس قابل ہو گیا کہ دھاتوں کو پگھلا سکے۔ دھاتوں کو پگھلانے کا علم صنعتی انقلاب کی اصل بنیاد بنا۔ اس لحاظ سے صنعتی انقلاب کی ابتدا اسی دن ہو گئی تھی جب انسان نے پہلی بار دھاتوں کو پگھلانا سیکھا۔ انسان نے ایسے سانچے بنا لیے جن میں پگھلی ہوئی دھاتیں ڈال کر مطلوبہ شکل کے اوزار بنانا ممکن ہو گیا۔ اسی طرح انسان کی بنائی ہوئی اشیاء کی تعداد بڑھنے لگی۔

تہذیب کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ کانسی، شیشے اور لوہے کی مصنوعات بڑھتی چلی گئیں۔ جس کے نتیجے میں پہیا ایجاد ہوا۔ پہیے سے انسان نے دو بہت بڑے کام لیے۔ ایک تو اس کی مدد سے وہ دور دراز جانے لگا۔ دوسرے پانی کو بلند کر کے آب پاشی اور دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کرنے لگا اسی طرح کی اور کئی ایک بنیادی ایجادات کی مدد سے انسان نے ہر آنے والے دن کو پچھلے سے بہتر پایا۔

قرون وسطیٰ کے دور میں یورپ نے صنعت پر خصوصی توجہ مرکوز کرنا شروع کی۔ انسان نے پہلی بار افرادی قوت کا ادراک کیا۔ کام اور محنت کے اصول، اشیاء کی قیمتیں اور مزدوروں کی بہبود پر توجہ دی گئی۔

مشینوں کے ذریعے سب سے پہلے انسان نے لباس کی پیداوار شروع کی۔ سولھویں صدی عیسوی کے وسط تک کپڑے کی بھی فیکٹریاں قایم ہو چکی تھیں جن میں سیکڑوں مزدور ایک ہی چھت تلے کام کرتے تھے۔ ان فیکٹریوں میں البتہ یہ خامی تھی کہ روایتی طریقوں ہی سے پیداوار کی جاتی تھی۔ اس کے بعد ۱۷۳۳ء میں ایک انگریز جولاہے "جون کے" نے مشینی چرخہ بنایا۔ بہت جلد اور لوگوں نے بھی مفید اختراعات کیں اور کپڑے کی صنعت دنیا کی پہلی جدید صنعت بن کر ابھرنے لگی۔ ۱۷۷۱ء میں انگریز موجد 'آرک رائٹ' نے ایک ہی عمارت میں بہت سی مشینیں لگائیں جو پانی سے چلتی تھیں۔ ان مشینوں کو چلانے کے لیے آرک رائٹ نے مردوں، عورتوں اور بچوں کو ملازم رکھا۔

ابتدا میں جو فیکٹری نظام رائج تھے ان میں مزدوروں کی آزادی سلب کرلی جاتی تھی۔ اپنی ایک خاص رفتار سے گھر پر کام کرنے کے بجائے اب انھیں شور و ہنگامے سے بھری ہوئی جگہوں پر کام کرنا پڑتا تھا جہاں مشینوں کی حکومت ہوتی۔ مشینوں کو جتنا زیادہ چلایا جاتا اتنا ہی زیادہ منافع ہوتا۔ مشینوں اور کارخانوں کے مالک زیادہ نفع کے لالچی تھے۔ وہ ہر وقت مشینیں چلاتے رہتے تھے اور اس بات کا خیال نہیں رکھتے تھے کہ مشین نہیں تھکتی لیکن انسان تھک جاتا ہے۔ اکثر مزدوروں کو سولہ سولہ گھنٹے انتہائی تکلیف دہ حالت میں کام کرنا پڑتا تھا۔

صنعتوں اور فیکٹریوں میں کام ملنے کی امید پر چھوٹے قصبات اور گاؤں کے لوگ صنعتی شہروں کی طرف نقل مکانی کرنے لگے۔ شہروں کی طرف دیہاتی آبادی کی منتقلی نہایت تیز رفتاری سے ہونے لگی۔ صنعتی علاقوں کی آبادی کس قدر تیزی سے بڑھی اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ برطانیہ میں ۱۸۰۰ء تک پانچ ہزار سے زائد آبادی والے صنعتی شہر او رقصبات صرف ۱۰۰ تھے۔ یہ تعداد ۱۸۵۰ء تک ۲۵۰ ہو گئی۔

کارخانوں کے مالکان کی لالچ اور مزدوروں کی معاشی [illegible]

بالخصوص زیادہ دیر تک کام کرنے کی وجہ سے خاندانی زندگی تباہ و برباد ہو گئی۔ خاندانی زندگی کی ٹوٹ پھوٹ نے معاشرتی مسائل میں بے پناہ اضافہ کردیا۔ معاوضوں میں اضافے اور کام کی بہتر سہولتوں کے مسائل بھی اٹھ کھڑے ہوئے جس کے نتیجے میں معاشرتی و معاشی مصلحین (مثلاً آدم سمتھ، ریکارڈو، مالتھس، کارل مارکس وغیرہ) سامنے آئے اور انھوں نے صنعتی انقلاب سے پیدا ہونے والے مسائل کو اپنے اپنے انداز سے حل کرنے کی کوشش کی۔ نیز ٹریڈ یونین کی ضرورت پیدا ہو گئی۔

صنعتی انقلاب سے مجموعی انسانیت کو کم اور صنعتی امرا کو زیادہ فائدہ پہنچا۔ فیکٹریوں اور کارخانوں کے مالکوں نے مزدوروں کی محنت سے اپنی خوشحالی میں بے پناہ اضافہ کرلیا۔ مجموعی طور پر معاشرہ کو یہ فائدہ ہوا کہ اشیاء زیادہ تعداد میں اور مختلف معیار کی بننے لگیں جن کے باعث بہت سے لوگ جو پہلے کسی شے کو ترستے تھے اب اسے حاصل کرنے لگے۔

انیسویں صدی کا آغاز صنعتی انقلاب کا بھرپور زمانہ ثابت ہوا۔ ایسے پرزوں کی تیاری شروع ہو گئی جو مختلف کارخانوں میں استعمال ہو سکتے تھے۔ اس طرح صنعتوں کا قیام تیز تر ہو گیا۔ مشینوں ہی سے مشینوں کے پرزے بننے لگے جن میں زیادہ نفاست بھی تھی اور پائیداری بھی۔

بیسویں صدی کے آغاز تک صنعتی امور تین عوامل کے تحت انجام پا رہے تھے: شعبہ جاتی مہارت، مشینیں اور مشینی پرزہ جات۔ ۱۹۱۳ء میں امریکی صنعت کار ہنری فورڈ نے ان میں ایک نیا اضافہ کیا۔ اس نے متحرک کارخانوں کی بنیاد رکھی۔ ان کارخانوں میں تیار کی گئی گاڑیاں عام لوگوں تک پہنچنے لگیں اور بہت جلد امریکہ میں کاروں کی بہتات ہو گئی۔

بیسویں صدی تھوک پیداوار کی صدی ثابت ہوئی۔ بازار اشیاء سے لبریز ہو گئے، لیکن مزید اشیاء کی ضروریات بڑھتی چلی گئیں۔ زیادہ سے زیادہ مزدوروں کی ضرورت پیش آنے لگی صنعتیں [illegible] بڑھنے کی وجہ سے مشینیں چلانے والوں کے

ساتھ ساتھ اور افراد کی بھی ضرورت بڑھی۔ ہر صنعتی ادارے کو اپنے اپنے سیلز مین، فورمین، منیجر اور اکاؤنٹنٹ رکھنے پڑے۔ بالخصوص مصنوعات کی تقسیم، منڈی میں فروخت (مارکیٹنگ) عام لوگوں میں شہرت (اشتہار بازی) کے شعبوں نے ہوش ربا ترقی کی۔

۱۷۳۳ء مشینی دور کی ابتدا برطانیہ سے تعلق رکھنے والے 'جان کے' نے کئی ایک ایجادات کیں۔ ان ایجادات نے کپڑے کی بنائی کا عمل تیز کر دیا۔ ۱۷۳۳ء میں اس نے ایک متحرک نلی بنائی جو کھڈی (Shuttle) کے آر پار حرکت کرتی تھی۔ اس نلی سے وہ سست عمل ختم ہو گیا۔ جس کے تحت کپڑا بننے کے دوران ایک ہاتھ سے نلی پھینک کر دوسرے سے پکڑنا پڑتی۔ اس سے بنے جانے والے کپڑوں کا عرض بھی زیادہ ہوتا تھا اور ایک ہی آدمی کھڈی چلا لیتا تھا۔ اس سے قبل کھڈی چلانے کے لیے دو آدمیوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ نلی کے متحرک ہو جانے سے بنائی کا عمل تیز ہو گیا اور ضرورت پیش آئی کہ تیزی سے دھاگہ فراہم کرنے والے پرزے بنائے جائیں جیمز ہارگریوز، رچرڈ آرک رائٹ اور سیموئیل کرومپٹن نے ایسی مشینیں بنائیں جن میں دھاگے کی تیز فراہمی ممکن تھی۔ ان موجدوں میں سب سے پہلے جیمز ہارگریوز نے ۱۷۶۴ء میں ایسی مشین بنا کر ۱۷۷۰ء میں پیٹنٹ کرائی۔ اس مشین میں ایک کی جگہ آٹھ دھاگے کی ریلیں بیک وقت دھاگہ فراہم کرتی تھیں۔

۱۷۷۱ء۔ توانائی سے چلنے والی پہلی فیکٹری کا قیام

رچرڈ آرک رائٹ نے ۱۷۶۹ء میں ایک ہی جگہ پر مختلف مشینیں لگانے اور ایک مرکزی ذریعۂ توانائی سے چلانے کا خیال پیش کیا۔ ۱۷۷۱ء میں اس نے اسی خیال کی بنیاد پر ایک کپڑے کی مل قائم کی۔ یہ مل برطانیہ میں کرومفورڈ (ڈربی شائر) کے مقام پر قائم ہوئی۔ اس مل کو چلانے کے لیے پانی کی توانائی کا استعمال کیا گیا۔ پانی کی اس توانائی کا حصول ایک بڑے پہیے کی مدد سے کیا گیا۔ مختلف حصوں کو چلانے کے لیے مزدوروں کو ملازم رکھا گیا۔ اس طرح دنیا میں پہلا مشینی کارخانہ قائم ہوا جسے توانائی کی مدد سے چلایا جا سکے۔ پانی کو ذریعۂ توانائی کے طور پر استعمال کرنے سے البتہ مشکلات پیدا ہوئیں۔ اس لیے کہ کبھی کبھار بارشوں کے نہ ہونے یا اور وجوہات کے باعث پانی کی کمی ہو جاتی تھی۔

۱۷۸۱ء۔ واٹ کا گردشی بھاپ انجن

اسکاٹ لینڈ کے موجد جیمز واٹ نے بھاپ کے انجن کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ ۱۷۶۹ء سے ۱۷۹۰ء کے دوران اس نے نیوکومن کے بنائے ہوئے بھاپ انجن میں کئی ایک ترامیم کر کے نئے ماڈل پیٹنٹ کرائے ان میں سے ۱۷۸۱ء کا بھاپ انجن جو گیئر سسٹم پر مشتمل تھا کامیاب ترین رہا۔ اس طرح بھاپ انجن کارخانوں کے پہیے گھمانے کے لیے ایک قابل اعتماد ذریعہ بن گیا۔

بھاپ انجن لگانے والوں میں پہلا کارخانہ دار آرک رائٹ تھا جس نے ۱۷۸۰ء میں اپنی ہارٹم مل (ورکس ورتھ) میں بھاپ انجن نصب کیا۔

۱۷۹۷ء۔ بہتر مشینی پرزہ جات

صنعت کا انحصار مشینوں پر بڑھنے کے ساتھ ساتھ بہتر سے بہتر مشینوں کی مانگ بڑھی۔ مشینوں کو بہتر بنانے کے لیے بہتر پرزہ جات کی ضرورت پیش آنے لگی۔ ۱۷۷۵ء میں جون ولکنسن نے ایک "سلنڈر بورر" بنایا۔ پھر ۱۷۹۷ء انگریز انجینئر ہنری ماڈسلے نے لیتھ مشین بنائی۔ اس لیے ہنری ماڈسلے کو "مشینی پرزہ جات کا بانی" قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے شاگردوں نے بھی اس ضمن میں شہرت پائی۔ چنانچہ جیمز نیسمتھ اور جوزف وائٹ ورتھ نے میکانکی انجینئرنگ کی بنیاد رکھی۔ رفتہ رفتہ ٹھیک ٹھیک پیمائش کے ساتھ نفیس پرزے بنائے جانے لگے اور مشینیں دن بدن زیادہ سے زیادہ کارگر ہوتی چلی گئیں۔

۱۷۹۸ء۔ بنیادی حصے بنانے کا آغاز

ایلی وہائٹی نام کے امریکی نے ۱۷۹۲ء میں "کاٹن جن" کی ایجاد کی۔ پھر ۱۷۹۸ء میں اسے امریکی حکومت کو دس ہزار دستی بندوقیں فراہم کرنے کا دو سالہ ٹھیکہ ملا۔ اس زمانے کے لحاظ سے یہ ناممکن تھا۔ سال بھر تک ایک ماہر بندوق ساز صرف درجن بھر بندوقیں بنا سکتا تھا۔ اس لیے کہ اسے ایک ایک

پرزہ خود بنا کر نصب کرنا پڑتا۔ اس طرح ہر بندوق دوسری سے کچھ نہ کچھ مختلف ضرور ہوتی تھی۔ اگر کوئی پرزہ خراب ہو جاتا تو خاص طور پر بنانا پڑتا تھا۔ جنگ کی حالت میں یہ ممکن نہ ہوتا۔ اس لیے وہ بندوق بیکار سمجھ کر پھینک دی جاتی' جس کا کوئی پرزہ خراب ہو جاتا۔

ٹھیکے کو پورا کرنے کے لیے وہاٹنی نے ایک نیا طریقہ نکالا۔ اس نے مشینی اوزاروں میں ہونے والی ترقی سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے ایسے آلات بنا لیے جو الگ الگ پرزے بنانے لگیں۔ پھر ان الگ الگ پرزوں کو جوڑ لیا جاتا۔ اس طرح اس نے بنیادی حصے یا پرزے بنانے کی ٹکنالوجی ایجاد کی۔

۱۸۰۸ء۔ چرخی کی ایجاد

۱۸۰۸ء میں ایک انگریز مارک اسامبرڈ برونل نے "پورٹس ماؤتھ ڈاک یارڈ" کے مقام پر دنیا کی پہلی تھوک فیکٹری قائم کی۔ اس نے سمندری جہازوں کے لیے چرخیاں بنانے کا ایسا کارخانہ قائم کیا جس میں مرحلہ وار کام ہوتا تھا۔ اس نے ہنری ماوڈسلے سے ایسی مشینیں بنوائیں جو الگ الگ پرزے بناتی تھیں اور پھر اُن پرزوں کی مدد سے چرخیاں بنائی جاتی تھیں۔ مرحلہ وار سلسلے میں ۴۳ مشینیں کام کرتی تھیں جن سے ۱۲۰۰۰۰ چرخیاں سالانہ بننے لگیں۔ ہر مشین کا ماہر الگ تھا اور وہ اُس مشین کی مدد سے اپنا کام انجام دیتا۔

۱۸۵۶ء۔ سستا لوہا بازار میں بکنے لگا

انیسویں صدی کے وسط میں صنعتی انقلاب نے ایک نئے جوش و خروش سے پیش رفت شروع کی جب ایک انگریز ہنری بسمر نے ۱۸۵۶ء میں لوہا سازی کی نئی ٹکنالوجی ایجاد کی۔ بسمر کے زمانے تک خام لوہے سے مضبوط لوہے کا حصول ایک ہفتے میں ہوتا تھا۔ اور وہ بھی کم مقدار میں۔ بسمر نے ایسی بھٹی بنائی جس سے آدھ گھنٹے کے اندر اندر یہ سب ممکن ہو گیا۔ چنانچہ اس وقت جب کہ لوہے کی قیمت ۵۰ پونڈ فی ٹن تھی' بسمر کے طریقے سے بنا ہوا لوہا ۳ پونڈ فی ٹن کی قیمت پر بازار میں آ گیا۔

۱۸۸۱ء۔ وقت اور حرکت کی ٹکنالوجی

۱۸۸۱ء میں امریکا کے انجینئر فریڈرک ڈبلیو ٹیلر نے وقت اور حرکت کی نئی ٹکنالوجی ایجاد کی۔ وہ "مڈویل سٹیل کمپنی" کا چیف انجینئر تھا۔ اس نے ہر کارکن کا بغور سائنسی مشاہدہ کیا تاکہ غیر ضروری اور فضول حرکات کا خاتمہ ہو سکے۔ ان مشاہدات کی بنیاد پر اس نے نئے اصولوں کی تشکیل کی اور پیداواری منصوبہ بندی اور سائنسی انتظام کی ابتدا کی۔ اس نے ۱۹۰۰ء میں ٹنگسٹن اور کرومیم کی ایک آہنی بھرت بنائی۔

> "میزان اعمال میں حسن اخلاق سے زیادہ بھاری
> کوئی چیز نہ ہوگی اور
> اچھے اخلاق والا آدمی اپنے حسن اخلاق
> سے ہمیشہ روزہ رکھنے والے اور نماز پڑھنے
> والے کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔"
>
> رسول اکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

۱۹۰۹ء۔ ابتدائی پلاسٹک متعارف ہوئے۔

بلجیم میں پیدا ہونے والے کیمیا داں لیو بیک لینڈ نے ۱۹۰۹ء میں دنیا کا پہلا پلاسٹک "بیک لائٹ" ایجاد کیا۔ پلاسٹک کی ایجاد سے کارخانہ داروں کو مصنوعات بنانے میں بے پناہ سہولت ہو گئی۔ تھوک پیداوار کے لیے یہ خام مال سے بہتر ثابت ہوا۔ اس لیے کہ ہر سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے۔

۱۹۱۸ء۔ اسمبل کرنے کا چلتا کارخانہ

۱۹۰۱ء میں امریکہ کی پہلی کار "تھوک بیوپار" کے اصول پر بنائی گئی۔ اس کا نام "اولڈز کی گاڑی" تھا۔ اس لیے کہ اس کا بنانے والا ریلیم ای اولڈز تھا۔ اور یہ وہ پہلی گاڑی تھی جو ہزاروں کی تعداد میں بنائی گئی۔ اولڈز کے بعد ۱۹۰۳ء میں ہنری فورڈ

نے کاریں بنانا شروع کیں۔ تین سال کے اندر اندر وہ ملکِ امریکا کا سب سے بڑا "کارساز" بن گیا۔ ۱۹۰۸ء میں اس نے کار کا ایک نیا ماڈل "ٹی ماڈل" تیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس ماڈل میں وہ بہترین پرزے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ٹی ماڈل کار پہلے سال ہی ۱۸ ہزار کی تعداد میں فروخت ہوئی۔ اس کی قیمت ۸۵۰ ڈالر تھی۔ ۱۹۱۳ء میں ہنری فورڈ نے کاریں اسمبل کرنے (یعنی پرزوں کو جوڑنے) کی ایک نئی ٹکنالوجی ایجاد کی۔ اس نے حرکت کرنے والے فریم (CONVEYOR) بنائے۔ بعد میں تقریباً ہر صنعت نے اس ٹکنالوجی کو اپنا لیا۔ پہلے پہل یہ ٹکنالوجی مخصوص حصوں سے وابستہ رہی۔ لیکن پھر تمام گاڑی اس کے ذریعے اسمبل ہونے لگی۔ نتیجتاً گاڑیوں کا معیار بہتر ہوا اور قیمت کم ہو گئی۔ اس لیے کہ اس ٹکنالوجی سے وقت اور محنت کی بے پناہ بچت ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء میں ہنری فورڈ نے دس لاکھ سے زیادہ کاریں فروخت کیں جن میں سے ہر ایک کی قیمت ۲۶۰ ڈالر تھی۔

۱۹۵۱ء خودکار اسمبل پلانٹ

۱۹۵۱ء میں "فورڈ موٹر کمپنی" نے ایک اور بڑا قدم اٹھایا خودکار آلات کے ذریعے انجنوں کی تیاری ہونے لگی۔ کوئی ۵۰۰ الگ الگ عمل ۴۰ خودکار مشینیں انجام دینے لگیں۔ اس طرح جو انجن کئی گھنٹوں میں بنتا تھا، اب صرف ۱۵ منٹ میں تیار ہونے لگا۔

۱۹۶۹ء — مائیکرو پروسیسر کی ایجاد

کمپیوٹر نے رفتہ رفتہ تمام صنعت میں بالعموم اور اسمبل پلانٹس میں بالخصوص قدم جما لیے۔ ٹرانزسٹر اور سلی کون چپ کے آجانے سے ۱۹۶۰ء کے عشرے میں کمپیوٹر بتدریج چھوٹا ہوتا گیا۔ ۱۹۶۹ء میں امریکہ سے تعلق رکھنے والے الیکٹرونکس انجینئر ایم ای ہوف نے مائیکرو پروسیسر ایجاد کیا۔ یعنی ¼ انچ کا سلی کون ٹکڑا جو کسی بھی مشین کو کنٹرول کر سکتا ہے۔

(ماخوذ)

علم تو ایک مادر مہربان ہے کہ اپنے بچوں کو تمام غلاظتوں اور نجاستوں سے پاک صاف کرتی ہے۔ ان میں توانائی بڑھاتی ہے نرمی اس کی فطرت ہے۔ وہ اپنی اولاد میں عزت و شان پیدا کرنے کی فکر میں رہتی ہے اور ان کو بتلاتی ہے کہ تم ان عمدہ خوبیوں کو کیوں کر باقاعدہ اور منظم بنا سکتے ہو۔ جس کے بغیر تمہاری زندگی تکلفات کے سبب سے وبال جان ہے

منشی ذکاءاللہ

اختر انصاری کی یاد میں

امتیاز احمد*

کچھ لوگ زندہ ہوتے ہوئے بھی زندہ نہیں رہتے اور کچھ زندہ نہ ہوتے ہوئے بھی زندہ رہتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ دونوں ہی صورتیں شخص واحد میں مجتمع ہوجاتی ہیں لیکن یہ بہت کم ہوتا ہے، شاید و باید، کبھی کبھی نہیں کے برابر۔ بہت کم لوگ یہ پسند کرتے ہیں کہ وہ زندہ ہوتے ہوئے بھی زندہ نہ رہیں۔ ہاں اس کی اکثر و بیشتر لوگ کوشش کرتے ہیں کہ جب وہ جسمانی طور پر زندہ نہ ہوں تب بھی زندہ رہیں۔ لیکن یہ دونوں صورتیں نہ آسان ہیں نہ ہر کس و ناکس کے لیے ممکن ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی طبعی زندگی میں واقعتاً زندہ انسانوں جیسی زندگی گزارے اور کوئی اس کے بارے میں یہ نہ کہہ سکے کہ ؎

ایسا جینا بھی ہے کس کام کا جینا یارو

لیکن اس خواہش کی تکمیل کی کوشش میں اکثر و بیشتر اُن کی دوسری خواہش تشنۂ تکمیل رہ جاتی ہیں اور وہ اس قابل نہیں ہو پاتا کہ اپنی طبعی موت کے بعد بھی زندہ رہ سکے

لیکن ہر بڑا آدمی عامیوں سے مختلف ہوتا ہے۔ اختر انصاری بھی اپنی نوع کے دوسرے لوگوں کی طرح عامیوں سے مختلف تھے لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ وہ اپنی نوع کے دوسرے لوگوں سے بھی مختلف تھے۔ انھوں نے اپنی طبعی زندگی میں زندہ رہنے، زندگی سے لطف اُٹھانے یا اُسے گوارا بنانے کی حریصانہ کوشش نہیں کی، اس لیے وہ مرنے کے بعد زندہ جاوید ہو گئے۔ اس بات کی تردید میں ان کی نظم "وقت کی بانہوں میں" پیش کی جاسکتی ہے جس میں اُن کی "ابھی کچھ اور جی لیتا، ابھی کچھ اور جی لیتا" کی خواہش جاگتی ہوئی نظر آتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ جینے کی خواہش محض شراب تلخیٔ ایام پینے، کچھ روز اور اپنے جگر کے چاک سینے اور زمانے کے حوادث سے خراج دوستی لینے کے لیے تھی، درحقیقت جینے کے لیے نہیں۔

اختر انصاری کی پوری حیات مستعار زندگی اور زمانے کے آلام و مصائب میں گھری رہی، لیکن وہ اُن سے بیزار، آزاد اور بے تعلق رہے۔ اپنے باہر کی دنیا سے ان کی کبھی نبھ نہ سکی اور خود ان ہی کے قول کے مطابق ان کو کبھی "جینا نہیں آیا" اس لیے وہ زندہ رہتے ہوئے بھی زندہ نہ رہے اور جب موت نے ان کو زندگی سے عاری بنا دیا تو وہ زندہ ہو گئے۔ بظاہر یہ کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن اختر انصاری کے سلسلے میں یہ دونوں متضاد اور متخالف باتیں ایک جگہ جمع ہو گئیں۔ غالباً اسی وجہ سے ایک محترم استاد نے ان کی وفات پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"اختر انصاری کی موت نے یہ یاد دلایا کہ وہ زندہ بھی تھے۔"

زندگی کی ابتدا عناصر کے ظہور ترتیب سے ہوتی ہے لیکن اس کی انتہا یہ نہیں ہوتی۔ اس لیے ہر وہ آدمی جسے ہم زندہ سمجھتے ہیں یا جو ہمیں زندہ نظر آتا ہے، جو چلتا پھرتا ہے، جو ہنستا بولتا ہے، کھیلتا کودتا ہے

* متعلم ایم۔ اے سال اول (اردو) اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

کھاتا پیتا ہے، زندہ نہیں ہوتا - اصل زندگی جو حقیقی ہوتی ہے دائمی اور لافانی ہوتی ہے وہ قید حیات اور بند غم سے آزادی کے بعد ہی ملتی ہے۔ زندگی کی قید سے رہائی کے بعد ہی انسان زندۂ جاوید ہو سکتا ہے، ہوا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اس آزادی کے بعد لے عناصر کی ترتیب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ وہ دنیاوی پابندیوں، جسم، جان، روح اور سماج و معاشرہ ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے اور ب شروع ہوتی ہے اس کی اپنی زندگی، جس میں کسی کا کوئی حق نہیں ہوتا سی کا کوئی حصہ نہیں ہوتا، کوئی ساجھی نہیں ہوتا۔ اختر انصاری کو بھی ن کی موت نے ایسی ہی زندگی عطا کر دی، لافانی اور لامتناہی!

اختر انصاری ۱۹۰۹ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے اور ر اکتوبر ۱۹۸۸ء کو علی گڑھ میں اپنے مکان شہرزادؔ جامعہ اردو ڈ میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس پوری زندگی میں اپنے آپ کو ود اپنے حصار میں محصور رکھنے اور عملی زندگی کی بوقلمونی اور رنگارنگی ے اعتبار سے ایک بے کیف اور مضمحل سی زندگی گزارنے کے باوجود لمی اور ادبی اعتبار سے ان کی پوری زندگی بڑی اہمیت رکھتی ہے ن کا آخری مجموعۂ کلام "ایک قدم اور سہی" ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا اس وقت تک کا ان کی زندگی کا ایک مختصر خاکہ خود انھیں کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

"مولد بدایوں اور سنہ پیدائش ۱۹۰۹ء ہے۔ والد بسلسلۂ ملازمت ایک مدت تک دہلی میں رہے اور پھر دہلی میں مستقلاً سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ اس لیے تعلیم و تربیت کی منزلیں دہلی میں طے کیں۔ ۱۹۳۰ء میں دہلی یونیورسٹی سے تاریخ میں بی۔ اے آنرز کیا۔ ۱۹۳۱ء میں اعلیٰ تعلیم کے مقصد سے انگلستان گیا لیکن والد کی ناوقت موت کے باعث وہاں کی تعلیم نامکمل چھوڑ کر ہندوستان واپس آیا اور چند سال بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔ ٹی اور پھر ایم۔ اے کے امتحانات پاس کیے۔ پہلے یونیورسٹی کے ایک سکنڈری اسکول میں پھر شعبۂ اردو میں اور آخر میں شعبۂ تعلیمات میں مصروف رہا۔ ۱۹۷۱ء میں ریٹائر ہوا اور علی گڑھ میں قیام کیا۔"

(دستاویز، یو۔ پی اردو اکاڈمی، لکھنؤ)

اختر انصاری کے والد ڈاکٹر محفوظ اللہ دہلی کے صفدر جنگ اسپتال میں سول سرجن تھے۔ انھوں نے اسکول کی حد تک قدیم اینگلو عربک ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی میں داخل ہوئے، جہاں سے انھوں نے تاریخ میں بی۔ اے کیا۔ علی گڑھ آنے کے بعد انھوں نے بی۔ ٹی کیا اور ۱۹۳۴ء میں یونیورسٹی کے سٹی ہائی اسکول میں استاد ہو گئے، جہاں وہ ۱۹۴۷ء تک رہے۔ اسی دوران انھوں نے ایم۔ اے (اردو) کا امتحان پاس کیا۔ جذبی صاحب کے بیان کے مطابق اُن کا ایم۔ اے (اردو) کرنے کا واقعہ بہت دلچسپ ہے بی۔ اے اور بی۔ ٹی کے بعد وہ سٹی اسکول میں استاد ہو گئے تھے لیکن ان کی ادبی صلاحیتوں کے پیش نظر یہ عہدہ اُن کے لیے مناسب نہیں تھا۔ لہٰذا دوستوں نے انھیں ایم۔ اے کرنے کا مشورہ دیا اور بہت اصرار کے بعد وہ تیار بھی ہو گئے۔ امتحان کی تیاری شروع کی لیکن ہر سال ٹھیک امتحان کے وقت فیصلہ بدل دیتے۔ وجہ معلوم کی گئی تو کہنے لگے (بقول جذبی صاحب) یار! اگر ٹاپ نہیں کر سکا تو بڑی بے عزتی ہوگی۔ بہرحال بڑی مشکل سے ایک سال وہ اس کے لیے بھی تیار ہو گئے اور جی کڑا کر کے امتحان دے ڈالا اور اول پوزیشن بھی آ گئی۔ ایم۔ اے کر لینے کے بعد ۱۹۴۷ء میں یونیورسٹی (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کے شعبۂ اردو میں لکچرر کی حیثیت سے اُن کا تقرر ہو گیا یہاں وہ ۱۹۵۰ء تک رہے بعد ازاں یونیورسٹی کے شعبۂ تعلیمات میں لکچرر کی حیثیت سے چلے گئے جہاں سے وہ ۱۹۷۱ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

اختر صاحب کی شادی اپنی بنت عم رئیسہ خاتون سے ہوئی تھی جن کے والد یو پی پولس میں کمشنر تھے۔ رئیسہ خاتون سے ان کے یہاں سات اولادیں پیدا ہوئیں؛ نزہت اختر، رفعت اختر، راشد اختر، عادل حیات اختر، نور النہار اختر، طارق ایاز اختر اور ایک شیر خوار جس کا شاید دو ماہ کی عمر میں انتقال ہو گیا اس وجہ سے اس کا کوئی نام نہیں رکھا جا سکا۔ اس شیر خوار مرحوم کے علاوہ نزہت اختر کا جنوری

میں، رفعت اختر کا اکتوبر ۱۹۸۶ء میں اور راشد اختر کا چار پانچ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ اب اُن کے دو صاحب زادے عادل حیات اختر اور طارق ایاز اختر کے علاوہ ایک صاحب زادی نور النہار اختر زندہ ہیں مذکورہ اولادوں کے انتقال کے علاوہ جنوری ۱۹۸۰ء میں اُن کی اہلیہ بھی اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئیں۔

اختر انصاری نے ۱۹۰۹ء سے ۱۹۸۸ء تک ایک طویل زندگی گزاری نہ صرف گزاری بلکہ اسے برتا اور پرکھا، اس کا عرفان حاصل کیا اور پھر اسے اپنی شاعری کا روپ عطا کر دیا۔ ان کی پوری شاعری زندگی اور زمانہ کے پیچ و خم اور پُر خار راہوں کی شدّت تکلیف کی داستان ہے، جس سے انھیں پوری زندگی دوچار ہونا پڑا تھا۔ ان کی شاعری میں غم و یاس کا بھپکا، ٹیس کا لپکا، آنسو کا ٹپکنا، قہر، زہر، آہ للّٰہ شبِ غم، آنسو، طرب زار، لقمہ، سیل ابدی، ماتم، جلنا، زخم، جلادِ فلک، قتل، چاک جگر، راحت مرگ، خوگر آزار، زخمِ جگر، چوٹ، کرب، جورشیت، فطرت سفاک، دلِ بیمار، روئے زرد، آہِ سرد، لب خشک، جہانِ درد، فریاد، اشخاص کے پرزے، افراد کے ٹکڑے، دلِ ناشاد، فشارِ نفس، بیکار عناصر، تباہی کے مزے حسرت برباد، نکیلے سنگ ریزے، تیشۂ فرہاد، لختِ جگر، وحشتِ جاں، سہم کے پیلیلے، آنسو، کہنیوں سے لہو ٹپکنا، خون کے آنسو بہنا آنسوؤں سے وضو کرنا وغیرہ لغات کا استعمال بڑی اہمیت رکھتا ہے اس سے اردو غزل کی لغات میں وسعت آئی اور مجموعی اور عمومی تجربات اور احساسات کے بجائے انفرادی تجربات و احساسات کا انداز پیدا ہوا۔ اردو کی کلاسیکی شاعری کی طرح ان کے یہاں 'سب جیسا حال' نہیں بلکہ کچھ نیا احساس ملتا ہے۔

اختر انصاری کی شاعری کا غالب حصّہ ان کی اپنی زندگی اور اس کے تجربات پر مشتمل ہے۔ انھیں اپنی زندگی میں جس طرح حسرتوں آرزوؤں اور تمناؤں کے خون کا سامنا کرنا پڑا۔ اعلیٰ تعلیم کے شوق کی عدم تکمیل، والد کی ناوقت موت، ملازمت کی پریشانی، مالی ناآسودگی، پے در پے اپنے کئی بچوں کی موت اور سب سے بڑھ کر شکوک و شبہات کی زیادتی اور عدم اعتماد، منافقوں کی منافقت وغیرہ نے مل کر ان کی زندگی کو بالکل تلخ بنا دیا تھا جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو خود اپنے حصار میں قید کر لیا۔ ان کے یہاں سماجی تعلقات نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ بہت سے لوگوں کو وہ اپنے یہاں سے ڈانٹ کر بھگا دیتے تھے۔ حالت یہ تھی کہ اگر کوئی شخص برسوں برس اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا اور اتفاق سے کبھی اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آجاتا تو بھی وہ اس کے بارے میں کبھی تفتیش کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ یہ اس لیے بھی تھا کہ اُن کے پاس اس کے لیے فرصت نہیں ہوتی تھی۔ وہ دن رات اپنے مطالعے میں غرق رہتے تھے اور اس لیے بھی تھا کہ ان کی ناکامیوں نے اُن کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ ہر شخص اُن کے خلاف کسی نہ کسی سازش میں شریک ہے اور اس لیے بھی تھا کہ ان کی فنکارانہ انا اپنے آگے کسی دوسرے کو اہمیت نہیں دیتی تھی۔ وہ اپنے گھر والوں سے بھی بہت کم تعلق رکھتے تھے۔ ان کے ذہن میں یہ بات گھر کر گئی تھی کہ وہ اس دار المنافقین میں زندگی گزار رہے ہیں۔ جہاں کا شوہر اپنی بیوی کے لیے منافق ہے، بیوی اپنے شوہر کے لیے منافق ہے، باپ اپنے بیٹے کے لیے منافق ہے، ماں اپنی بیٹی کے لیے منافق ہے اور بیٹی اپنی ماں کے لیے منافق ہے۔ شاید اسی لیے انھوں نے کہا تھا؎

یادِ ماضی عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

اختر انصاری صاحب ساری زندگی اپنے ماحول کو دار المنافقین ہی سمجھتے رہے۔ اس کا دار المخلصین والا پہلو ان کی نظروں سے اوجھل رہا یا اُن کے تجربات کی تلخی نے انھیں اس کے اس دوسرے پہلو کی طرف نظر کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

استاد گرامی قدر پروفیسر منظر عباس نقوی کے مطابق ملازمت کے دوران اُن کی زندگی کا معمول یہ تھا کہ وہ صبح نو دس بجے سو کر اُٹھتے ضروریات سے فارغ ہوتے، ناشتہ کرتے، لباس تبدیل کرتے اور شعبہ چلے جاتے۔ وہاں سے ڈیڑھ یا دو بجے واپس آتے، کھانا کھاتے اور سو جاتے۔ یہ سلسلہ مغرب کے بعد تک چلتا۔ اس کے بعد وہ کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر مطالعے میں مشغول ہو جاتے

ورصبح چار یا پانچ بجے تک مطالعہ اور تصنیف وتالیف میں مشغول رہتے۔ رٹائرمنٹ کے بعد انھیں مطالعہ اور تصنیفی وتالیفی کاموں کے لیے نسبتاً زیادہ مواقع مل گئے تھے اور وہ ہر وقت اسی میں لگے رہتے تھے۔ اپنے اس معمول زندگی کی وجہ سے انہیں ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ وہ بھانت بھانت کے ملنے جلنے والوں کی بھانت بھانت کی گفتگو کو انگیز کرنے اور کہتے رہنے سے محفوظ رہتے تھے۔ پھر بھی ہر وہ اہم شخص جو علی گڑھ آتا تھا اس کے پروگرام میں اختر انصاری کا دیدار ضرور شامل ہوتا۔

اختر صاحب نے ایک طرح سے عسرت کی زندگی بسر کی۔ استاد گرامی قدر پروفیسر قاضی عبدالستار کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ اختر صاحب کالا کپڑا پہنے ہوئے تھے جب کہ غم کا کوئی موقع نہ تھا نہ ہی محرم کا مہینہ۔ میں نے وجہ دریافت کی تو فرمانے لگے۔ قاضی صاحب میں جیسے کپڑے پہننا چاہتا ہوں ویسے AFFORD نہیں کر سکتا اس لیے ایسے کپڑے پہنتا ہوں۔ اپنی اسی نسبتاً عسرت اور تنگ دستی کی وجہ سے وہ اپنے پائپ کا تمباکو خریدتے نہیں تھے بلکہ خود بناتے تھے لیکن یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس مالی پریشانی کے باوجود وہ کتب و رسائل پر خاصی رقم خرچ کرتے تھے۔ ۱۹۳۰ء کے بعد کے اکثر رسائل کی فائلیں انھوں نے اپنے یہاں مجلد کرا کے رکھ رکھا تھا۔

لباس وغیرہ کے سلسلے میں ان کی اپنی خصوصی پسند تھی۔ شوخ رنگ انہیں پسند تھے۔ کوٹ اور پینٹ کے ساتھ ٹائی کا اہتمام کرتے تھے۔ اکثر و بیشتر وہ رنگ برنگے کپڑے بھی استعمال کرتے تھے جس کی وجہ سے لوگ اُن کا مذاق اُڑاتے تھے لیکن انھوں نے کبھی اپنی عادت اور پسند ناپسند میں کوئی تبدیلی لانے کی کوشش نہیں کی۔ شاید وہ اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے تھے۔ گھر کے باہر بہت اہتمام سے نکلتے۔ ہمیشہ دو رومال استعمال کرتے ایک چہرے کے لیے دوسرا جوتے کے لیے۔ اپنی منزل مقصود پر پہنچ کر ایک جیب سے رومال نکالتے، چہرہ صاف کرتے جیب میں رکھ لیتے۔ دوسری جیب سے جیب سے کنگھی نکالتے، بال درست کرتے اور اس کے بعد اندر داخل ہوتے۔ اس طرح انھوں نے زندگی گزارنے کا ایک خاص انداز بنا رکھا تھا اور تاحیات اس پر قائم رہے۔

اختر انصاری اپنی ادبی زندگی کے متعلق رقم طراز ہیں:

" ۱۹۲۸ء کے لگ بھگ شعر گوئی کا آغاز ہوا اور ۱۹۳۲ء میں پہلا مجموعہ کلام (نغمۂ روح) چھپا۔ ۱۹۸۰ء تک تقریباً دس شعری مجموعے اشاعت پذیر ہوئے ۱۹۷۱ء میں اُن دس مجموعہ ہائے کلام کا ایک جامع و ضخیم انتخاب "دہانِ زخم" کے نام سے مرتب اور شائع کیا۔ ۱۹۷۷ء میں طویل نظم "وقت کی باہوں میں" لکھی جو ۱۹۷۹ء میں کتابی شکل میں منظر عام پر آئی گزشتہ چند سال کا کلام (نظمیں، غزلیں اور رباعیات) 'ایک قدم اور سہی' کے عنوان سے زیر طباعت ہے۔

شعر گوئی کے ساتھ ساتھ مجھے افسانہ نگاری سے بھی شغف رہا اور اس باب میں تاثراتی افسانے کی ترویج و اشاعت کو اپنی خصوصی خدمت خیال کرتا ہوں۔ شاعری اور افسانہ نگاری کے متعدد مجموعوں کی اشاعت کے بعد میں نے تنقید بھی لکھی اور اس میں عمرانیاتی اور مارکسی زاویۂ نقد کے مسلک پر گامزن رہا۔ اس سلسلے میں 'افادی ادب'، 'ایک ادبی ڈائری'، 'مطالعہ و تنقید' اور دوسری تصانیف کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ انشائیہ نگاری کے ذیل میں آنے والی تحریریں بھی قلم سے نکلتی رہیں۔

ادبیات کے ان اہم شعبوں سے ہٹ کر بعض علمی موضوعات پر بھی کام کیا اور بالخصوص تعلیم

چند تالیفات پیش کیں۔ غالب کے بعض مطائبات کو
انگریزی زبان میں منتقل کیا۔ نیز اپنی کہانیوں کو
انگریزی زبان کا جامہ پہنایا۔"
(دستاویز، اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ)

مذکورہ خود نوشت اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۲۸ء سے لے کر ۱۹۸۸ء تک کی مکمل ۶۰ سالہ علمی و ادبی زندگی میں انھوں نے جو اندوختہ چھوڑا ہے، وہ درج ذیل ہے۔

۱۔ نغمۂ روح (قطعات، غزلیں اور نظمیں) اشاعت اول ۱۹۳۲ء
۲۔ اندھی دنیا اور دوسرے افسانے " ۱۹۳۹ء
۳۔ نازو اور دوسرے افسانے " ۱۹۴۰ء
۴۔ آبگینے (قطعات) " ۱۹۴۱ء
۵۔ افادی ادب (تنقید) " ۱۹۴۱ء
۶۔ " اشاعت دوم ۱۹۵۹ء
۷۔ غولی اور دوسرے افسانے۔ اشاعت اول ۱۹۴۳ء
۷۔ خوناب (غزلیات) " ۱۹۴۳ء
۸۔ خندۂ سحر (نظمیں) " ۱۹۴۴ء
۹۔ ایک ادبی ڈائری (تنقید) " ۱۹۴۵ء
۱۰۔ روح عصر (قطعات، غزلیات، نظمیں) " ۱۹۴۵ء
۱۱۔ لو ایک قصہ سنو (منتخب افسانے) " ۱۹۵۲ء
۱۲۔ انتخاب اختر انصاری (منتخب کلام) " ۱۹۵۶ء
۱۳ " " اشاعت دوم ۱۹۶۲ء
" " اشاعت سوم ۱۹۸۲
۱۳۔ یہ زندگی اور دوسرے افسانے (منتخب افسانے) اشاعت اول ۱۹۵۸ء
۱۴۔ غزل اور درس غزل (تعلیم) اشاعت اول ۱۹۵۹ء
۱۵۔ بادۂ شبانہ (منتخب کلام) " ۱۹۶۱ء
۱۶۔ حالی اور نیا تنقیدی شعور (تنقید) " ۱۹۶۳ء
۱۷۔ ٹیڑھی زمین (قطعات) " ۱۹۶۳ء
۱۸۔ سرود جاں (غزلیات) " ۱۹۶۳ء
۱۹۔ مطالعہ و تنقید (تنقیدی مقالات) اشاعت اول ۱۹۶۵ء
۲۰۔ پرطاؤس (منتخب قطعات) " ۱۹۶۵ء
۲۱۔ چند نظمیں " ۱۹۶۷ء
۲۲۔ درد و داغ (مثنوی) " ۱۹۶۷ء
۲۳۔ شعلۂ بجام (رباعیات) " ۱۹۶۸ء
۲۴ دہانِ زخم (شاعری کا انتخاب) " ۱۹۷۱ء
۲۵ شعلۂ بکف (رباعیات کا انتخاب) " ۱۹۷۳ء
۲۶۔ روح نغمہ (ہندی) منتخب رباعیات " ۱۹۷۴ء
۲۷۔ غزل کی سرگزشت (تنقید) " ۱۹۷۵ء
۲۸ دلی کا روڑا (سوانح) " ۱۹۷۷ء
۲۹ وقت کی باہنوں میں (طویل نظم) " ۱۹۷۹ء
۳۰۔ غزل اور غزل کی تعلیم (تعلیم) " ۱۹۷۹ء
۳۱۔ تعلیم، سماج اور کلچر (ترجمہ) " ۱۹۷۹ء
۳۲ اردو فکشن بنیادی اور تشکیلی عناصر (تنقید) " ۱۹۸۴ء
۳۳ ایک قدم اور سہی (غزلیات، نظمیں اور رباعیات) ۱۹۸۴ء
۳۴ اردو میں افسانہ نگاری (تنقید) "
۳۵ اردو نظم و نثر کی تعلیم (تعلیم) "
۳۶ یادوں کے چراغ (انشائیے) "
۳۷ قافلۂ نوبہار (منتخب نظمیں) "
38- Studies in Language and Languageteaching (تعلیم) اشاعت اول ۱۹۶۳ء
39. Background to Educational Theory. (تعلیم) اشاعت اول ۱۹۶۵ء
40 Anecdotes from the life of Ghalib اشاعت اول ۱۹۷۱ء
۴۱۔ الف لیلہ کی کہانیاں
(الف) قصہ سوداگر اور جن کا
(ب) قصہ شاہ یونان اور حکیم دومان
(ج) قصہ ماہی گیر کا۔ (د) قصہ تین بیویوں کا

۱۹۷۶ میں اختر انصاری کو اردو شعر و ادب کی مجموعی خدمات
راف میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے اعزاز سے نوازا گیا۔ انھوں
دو شعر و ادب کی جو خدمات انجام دیں اس کا ادبی حلقوں
ے جوش و خروش سے استقبال کیا گیا اور اردو کے مقتدر
ں اور فن کاروں نے اُن کے کاموں کو سراہا۔ نیاز فتحپوری
ی عبدالحق، سید عابد حسینی، مرزا ادیب، جعفر علی خاں اثر
یب شادانی، فراق گورکھپوری، میرا جی، محمد حسن، خلیل الرحمٰن
، وحید اختر، نظیر صدیقی اور وارث کرمانی کی تحریریں اس
لے میں خاصی اہمیت رکھتی ہیں۔

۱۹۳۸ء میں عندلیب شادانی نے ان کے متعلق لکھا تھا:

"کون ہے وہ تابناک ستارہ؟ یہ نہ پوچھیے ورنہ حسن عقیدت یا سوء گمان نقد و نظر کی صلاحیتیں چھین کر آپ کو جادۂ اعتدال سے منحرف کر دے گا فعلاً اس قدر جان لینا کافی ہے کہ وہ ایک شاعر ہے اور ایک جوان شاعر۔ وہ ایک دردمند دل اور شاعرانہ طبیعت لے کر پیدا ہوا ہے۔ محبت اور ناکامیوں نے ان جوہروں پر جلا کی اور اسے ایک آتش نقش سحر نگار بنا دیا۔"

"اس کے اشعار نہیں، ایک دل سوختہ کی شرربار آہیں، ایک نامراد کے اشک خونیں اور ایک غم نصیب کی بے اختیار چیخیں ہیں جو الفاظ کی شکل میں کاغذ پر منتقل ہو گئی ہیں۔ وہ شاعر کہلانے کے لیے شعر نہیں کہتا۔ اس لیے اُسے نقالی اور عجالی کی ضرورت نہیں۔ اس کا موضوع سخن آپ بیتی ہے۔ اس لیے وہ سرقہ سے بے نیاز ہے۔ وہ جذبات کا مصور ہے، محسوسات و مدرکات کی تصویریں کھینچتا ہے۔ اس کے اشعار بیک وقت اشعار بھی ہیں، تصویریں بھی اور نغمے بھی۔ جس کا اچھوتا پن ہر صاحب ذوق کا دل موہ لیتا ہے۔"

اختر انصاری کی یہی شاعرانہ فن کاری ہے جس نے ان کی عظمت کا لوہا منوا لیا، لیکن وہ صرف شاعر نہیں افسانہ نگار اور نقاد بھی ہیں اس لیے اردو ادب میں ان کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور سارے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اپنے غلاموں کا خیال رکھو۔ انھیں وہ کھلاؤ، جو خود کھاتے ہو، وہی پہناؤ جیسا تم پہنتے ہو"

ضامن صحت

ابو وراثت جمیل*

مشہور زمانہ فلسفی و طبیب قاضی ابو الولید محمد بن احمد بن محمد بن رشد اندلسی نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف 'کتاب الکلیات' کے فصل ریاضت میں ورزش کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"ورزش صحت کی ضامن ہے"

لغتاً ورزش یا ریاضت معنیٰ کے اعتبار سے اپنے اندر بہت وسعت رکھتا ہے۔ جیسا کہ ماہر فن ریاضت گڑ مین اپنے مضمون "درسگاہوں میں ریاضت کی ضرورت" میں لکھتا ہے کہ

ریاضت نہ صرف عضلاتی ورزش ہے اور نہ فوجی پریڈ بلکہ یہ ایک ایسا فن ہے جو ہمیں ایسے قوانین سکھاتا ہے جس کی مدد سے ہم دنیا میں زیادہ دن زندہ رہ سکیں اور خلق اللہ کی بہتر خدمت انجام دے سکیں"۔

مشہور مقولہ ہے کہ "تندرستی ہزار نعمت ہے"۔ اپنے ملک کی اکثریت کا اگر ہم جائزہ لیں تو دیکھیں گے کہ وہ اپنی صحت اور جسمانی نشو ونما کا بالکل خیال نہیں رکھتے۔ جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہ اس فن سے ناواقف ہوتے ہیں کہ جس کے ذریعے صحت کو برقرار رکھا جاسکے۔ تندرستی قایم رکھنے کے لیے ہر شخص کو ہر عمر میں مناسب ورزش کی ضرورت ہے۔ ورزش یا ریاضت کسی خاص طبقے کے لیے مخصوص نہیں بلکہ یہ ہر ایک طبقے کے لیے یکساں مفید ہے۔ انھیں وجوہ کی بنا پر ورزش کا صحیح مفہوم، ضرورت اور افادیت کو صحت کلی کے تحت طب اور جدید سائنس کی روشنی میں واضح کرنے کی سعی کر رہا ہوں۔

جو لوگ ورزش نہیں کرتے اس کا اثر ان کے چہرے سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کے چہرے زرد پڑ جاتے ہیں اور بدن میں امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ یہ لوگ ایک ہی مقام پر پڑے رہتے ہیں اور حرکت ارادیہ سے قاصر ہوتے ہیں۔ اس طرح بیّن فرق اُن جانوروں اور پرندوں میں دیکھنے کو ملتا ہے جو قید ہیں اور جو آزاد رہتے ہیں۔"

بقول شیخ الرئیس بوعلی سینا

"اگر صحیح اوقات میں اعتدال کے ساتھ ورزش کی جائے تو تمام امراض مادیہ اور سوء مزاج سادہ و مادی سے انسان محفوظ رہے گا۔"

شیخ کے مطابق ریاضت کی بعض قسمیں تو اعمال انسانیہ پر مشتمل ہیں جس کے لیے کوئی ارادہ نہیں کرنا پڑتا اور بعض حرکات ارادۃً کرنے پڑتے ہیں جس کو حرکات ارادیہ کہتے ہیں اور یہ حرکات ارادیہ وہ ہیں جو ریاضت کے خیال سے کی جاتی ہیں اور اس سے مقصود اس سے حاصل ہونے والے فوائد ہوتے ہیں۔

شیخ الرئیس نے ورزش کی تعریف یوں کی ہے:

"ورزش جسم کی وہ ارادی اور سخت حرکت ہے جس کی موجودگی میں انسان کو لمبے لمبے اور گہرے گہرے جلد جلد سانس لینے پڑتے ہیں۔"

★ ایم۔ڈی اسکالر۔ ڈپارٹمنٹ آف کلیات، اجمل خاں طبیہ کالج۔ اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

ورزش کا عمل کثیر الفوائد ہے جس کو شمار کرنا مشکل ہے۔ پھر بھی اس کی افادیت پر مختصراً روشنی ڈالی جاتی ہے۔

ورزش ایک ایسا عمل ہے جو ابتداء سے ہی فضلات اور مواد ردیہ کا دفیعہ کرتا اور حرارت غریزی (جسم کی طبعی حرارت) کو اُبھارتا ہے جس سے جسم توانا، چست اور پھرتیلا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ورزش سے جسم کے اندر ایک لطیف قسم کی حرارت پیدا ہوتی ہے جو اُن فضلات اور مواد ردیہ کو تحلیل کرتی ہے۔ اس کے علاوہ عمل ورزش بذات خود ان مواد کو حرکت میں لاتی جسم میں پھیلنے اور آگے بڑھنے میں اور فضلات کے اخراج میں مدد کرتا ہے جس کے نتیجے میں کچھ روز تک اس عمل کے استقامت پر یہ فاسد مواد جسم میں اکٹھا نہیں ہو پاتا اور جسم ان کے سمّی اثرات سے محفوظ رہتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ حرارت غریزیہ کو بڑھا کر جوڑوں اور عضلات کو مضبوط بنا دیتا ہے جس سے ان اعضاء کے افعال قوی ہو جاتے ہیں اور ان اعضاء میں غذا کو قبول کرنے کی استعداد بڑھ جاتی ہے۔ کیوں کہ ورزش اعضاء کے اندر تحلیل کرتی اور فضلات کو برابر کم کرتی رہتی ہے جس سے انجذاب اور اخراج فضلات کا عمل ایک دوری طریقے سے چلتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ اعضاء کی قوت جاذبہ کو بڑھا کر اعضاء میں وسعت اور چستی پیدا کرتا ہے۔

ورزش کے عمل پر مداومت سے عضلات رگ اور پٹھے مضبوط ہوتے ہیں جس سے جسم توانا، طاقت ور اور سڈول بنا رہتا ہے اور دوران خون تیز ہو کر تمام اعضاء کی دھلائی و مرمت کرتا اور تغذیہ بخشتا ہے۔ کھانا اچھی طرح ہضم ہوتا ہے، نیند خوب اچھی آتی ہے اور قوائے عقلیہ تیز ہوتی ہیں۔ اس کے برخلاف مناسب ورزش نہ کرنے سے سارے بدنی افعال میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔ مثلاً دوران خون سست ہو جانے سے فضلات کا دفیعہ اچھی طرح نہیں ہو پاتا جو کہ اعضاء کے رخنوں میں جمع ہو کر مرض کا سبب بنتے ہیں۔ ہضم ناقص ہو جانے سے بھوک اچھی طرح نہیں لگتی، نیند اچھی طرح نہیں آتی، جسم میں سستی، دماغ کند، طبیعت میں کسل اور اعضاء ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور کبھی کبھی جگر میں اجتماع خون ہو کر بواسیر کا عارضہ بھی لاحق ہو جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ غرضیکہ جو لوگ زیادہ کھاتے اور کم ورزش کرتے ہیں وہ مختلف قسم کے امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ورزش کے لیے ہمیشہ ایسی ریاضت کا انتخاب کرنا چاہیے جس سے کہ کم و بیش تمام عضلات جسم اور نظام جسم کی ورزش ہو سکے۔ مثلاً ڈنڈ بیٹھک، مگدر گردانی، کشتی لڑنا، تیرنا وغیرہ۔ کمزور لوگ یا عورتوں کے لیے ٹینس اور بیڈمنٹن، نوجوانوں اور طالب علموں کے لیے دوڑ، کرکٹ، فٹ بال، والی بال، کشتی رانی، گھوڑے کی سواری وغیرہ۔ اگر ایسی ورزش ہوگی جس میں عضلات کے چند گروہ یا کوئی ایک نظام کام کرتے ہوں تو ایسی ریاضت سارے جسم کے لیے مفید نہیں ہوگی۔

عمل ورزش تمام نظام جسمانی اور ان کے اعمال پر اثر انداز ہوتی ہے جس کا مختصراً یہاں تذکرہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو کہ درج ذیل ہے۔

نظام قلب اور عروق دمویہ

معتدل ورزش کے سبب پیدا ہونے والی حرارت غریزیہ حرکت قلب کو بڑھا کر دوران خون کو تیز کر دیتی ہے، جس کی علامت چہرہ اور بشرہ کی سرخی اور پسینہ کا اخراج ہے۔ جب کہ ریاضت کثیر میں تھکان کے سبب قلب اور دوران خون کی رفتار کم ہو جائے گی۔

نظام تنفس

معتدل ریاضت سے نسیم ۔ ۔ کا انجذاب اور اجزاء دخانیہ کا اخراج بڑھتا ہے۔ عضلات میں اجزاء دخانیہ زیادہ بنتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ تیزی سے خارج ہوتے رہتے ہیں۔ انجذاب نسیم کی شرح آرام اور ریاضت یا حرکات کے دوران اور اخراج اجزاء دخانیہ کی شرح دونوں میں بڑا فرق ہو جاتا ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل جدول سے واضح ہوتا ہے۔ لہٰذا اس جدول سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انجذاب نسیم اور اخراج اجزاء دخانیہ کے لیے ریاضت بدنی ایک بہترین شئے ہے۔

یوم راحت	نسیم ۷۰۸،۹ گرام	اجزاء دخانیہ ۹۱۱،۵ گرام
یوم العمل	نسیم ۹۵۴،۵ گرام	اجزاء دخانیہ ۱۲۴۴،۲ گرام
فرق	نسیم ۲۴۶،۶ گرام	اجزاء دخانیہ ۳۳۲،۷ گرام

شرح انجذاب نسیم واخراج اجزاء دخانیہ بحالت آرام وریاضت

نظامِ ہضم

ریاضت کا عمل ہضم کے فعل کو بڑھا دیتا ہے۔ کیوں کہ دوران خون تیز ہونے سے احشاء اور غدد میں تحریک پہنچ غدد سے مواد کا ترشح بڑھ جاتا ہے اور آنتوں کی حرکت دودیہ تیز ہو جاتی ہے جس سے غذا جلد ہضم ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ورزش کرنے والوں کو زیادہ کھانے کی ضرورت پڑتی ہے۔

James Blake لکھتا ہے کہ "سوءِ ہضم میں ٹہلنے کی ریاضت مفید ہے اور ریاضت نہ کرنے سے اشتہاء کمزور اور غیر صادق ہو جاتی ہے۔"

نظامِ عصبی

ریاضت سے جسمانی نشوونما کے ساتھ دماغی نشوونما بھی ہوتی ہے۔ کیوں کہ دوران خون تیز ہو جانے سے دماغ کی بھی دموی پرورش اچھی ہوتی ہے۔ ماہرین ریاضت کا خیال ہے کہ ریاضت نہ کرنے سے مراکز کی حس و حرکت غیر طبعی ہو جاتی ہے۔ جس سے مختلف قسم کے بدنی و دماغی عوارضات پیدا ہوتے ہیں

نظامِ بول و براز

ورزش کے ذریعے پسینہ کی صورت میں پانی اور نمکیات کا کافی اخراج ہو جانے کے سبب بول کی مقدار کم ہو جاتی ہے اور مادہ بولیہ Uric acid کی مقدار بول میں بڑھ جاتی ہے جس سے نقرس اور وجع المفاصل جیسے عوارضات سے حفاظت رہتی ہے۔

مقدارِ ورزش

ورزش کتنی کرنی چاہیے، اس بارے میں تین چیزوں پر نظر رکھنا چاہیے۔ ۱۔ جلد کا رنگ ۲۔ حرکاتِ اعضا ۳۔ اعضاء کا پھولنا۔

دوران ورزش جب تک جلد کے اندر سرخی بڑھتی جائے بدنی حرکات آسانی کے ساتھ جاری رہیں اور اعضا پھولتے رہیں ورزش جاری رکھنی چاہیے اور جب جلد کے رنگ میں سرخی آنا بند ہو جائے جسم میں بھاری پن اور تھکن پیدا ہونے لگے، اعضاء کا پھولنا بند ہو جائے اور پسینہ سوکھنے کے بجائے بدن پر پانی کی طرح بہنے لگے تو ورزش بند کر دینی چاہیے اور جسم پر فوراً تیل کی مالش کرنی چاہیے۔ ورزش کے اوقات، مقدار اور غذا پر دوسرے روز بھی پہلے روز کی طرح مداومت کرنی چاہیے۔

اقسامِ ورزش

اطباء نے ورزش کی مختلف اقسام بیان کی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:-

(۱) ریاضتِ عرضیہ: یہ وہ ورزش ہے جو غیر ارادی طور پر کاروباری حرکات کے سبب ہو جاتی ہے۔ جیسے لوہاروں، کاشتکاروں، دھوبیوں وغیرہ کا پیشہ۔

(۲) ریاضتِ خالصہ: یہ حرکات ارادی کے تحت ہونے والی ورزشیں ہیں۔ یہ دو طرح کی ہوتی ہیں۔

(۱) ریاضتِ قلیلہ (کم درجے کی ورزش)

(۲) ریاضتِ کثیرہ (طویل و کثیر قسم کی ورزش)

(۳) ریاضتِ قویہ شدیدہ: اس میں کافی قوت استعمال کی جاتی ہے۔

۴۔ ریاضتِ ضعیفہ: جس میں قوت کم استعمال کرنی پڑتی ہے۔

۵۔ ریاضتِ سریعہ: جس میں حرکات بہت جلد جلد کی جاتی ہیں۔

۶۔ ریاضتِ بطیئہ: جس میں حرکات بہت آہستہ آہستہ اور دیر دیر میں کی جاتی ہیں۔

۷۔ ریاضتِ حثیثہ: اس میں حرکات قوی اور جلد جلد کرنے پڑتے ہیں۔

۸۔ ریاضتِ متراخیہ: اس میں حرکات سستی کے ساتھ اور دیر دیر میں کیے جاتے ہیں۔

۹۔ ریاضتِ معتدلہ: یہ مذکورہ بالا آٹھوں قسم میں اُن کے درمیانی درجے کی ریاضت ہے۔

اوقاتِ ورزش:

موسم کے اعتبار سے موسم گرما میں ورزش کا وقت

علی الصباح ہے اور سردیوں میں شام کا وقت مناسب ہوتا ہے۔ ورزش بھی ہر روز مناسب اور وقت مقررہ پر کرنی چاہیے۔ صبح کو رفع حاجت کے بعد ورزش کرنا چاہیے۔ خلوِ معدہ کے وقت ہرگز ورزش نہ کی جائے۔ بلکہ ورزش کرتے وقت معدہ میں تھوڑی بہت غذا موجود ہو۔

ورزش کے بعد ٹھنڈے پانی سے نہایا جائے۔ نہانے میں تین باتوں کا خیال رکھنا انتہائی ضروری ہے۔

۱۔ ورزش سے پہلے دلک استعداد خوب زور سے ہونی چاہیے۔

۲۔ دلک استعداد کے بعد ورزش حسب معمول روزمرہ ہونی چاہیے بلکہ اگر قدرے زیادہ ہو تو بہتر ہے۔

۳۔ بعد ورزش ٹھنڈے پانی سے غسل کیا جائے اور تب تک غسل کیا جائے جب تک کہ سردی کا احساس نہ ہو۔

ورزش ترک کرنے کے نقصانات

ورزش کا عمل شروع کرنے کے بعد اس پر مداومت کرنی چاہیے۔ کیوں کہ اعضاء کی قوتیں ورزش چھوڑ دینے پر ضعیف ہو جاتی ہیں۔ اور یہ حرکت روح غریزی کو جو کہ ہر ایک عضو کی حیات اور زندگی کا سرچشمہ ہے، اعضاء کی طرف جذب کیا کرتی ہیں جس سے عضو میں قوت پیدا ہوتی ہے لیکن جب ورزش چھوڑ دی جاتی ہے تو پھر یہ روح اعضاء کی طرف جذب نہیں ہوتی جس سے قوت بھی پیدا نہیں ہوتی اور مختلف قسم کے امراض اعضاء میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً دق، امراض قلب، امراض مفاصل وغیرہ

ذیل میں ورزش کے مختلف طریقے تصویروں کے ذریعے دکھلائے گئے ہیں۔ جن کے ذریعے انسان اپنے تمام جسمانی افعال کو متحرک رکھ کر فوائد حاصل کر سکتا ہے اور بہت سے امراض سے نجات بھی حاصل کر سکتا ہے۔



تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۷، شمارہ ۱۲ (دسمبر ۸۸ء)

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے

مظفر بلخی*

حال ماضی کا آئینہ دار ہے۔ قومی و ملّی زندگی بھی اس سے الگ نہیں۔ لت کی تاریخ خواہ کتنی ہی تابناک اور اس کے اسلاف کے گراں قدر کارناموں رہی ہو، اگر حال کی زندگی اخلاقی و روحانی زوال کا شکار ہو گئی تو ماضی کی تاریخ ـ اور مسخ ہو کر ناپید ہو جایا کرتی ہے۔ سابقہ تاریخ سے ثابت ہے کہ جب سنے اپنے لیے غیر انبیائی کردار کو پسند کر لیا تو ان کی مذہبی اور اخلاقی تاریخ ، کا شکار ہو گئی۔ یہاں تک کہ آج مذہبی تاریخ سے ان کی حقیقی شناخت شکل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایسی تاریخ صحت مند معاشرے کی تشکیل و تعمیر کی صلاحیت رکھتی۔ حقیقی عملی زندگی سے ان اقدار کی کوئی مطابقت نہیں ہے۔ وقت کے ، تاریخ کے واقعات ایک قصۂ پارینہ بن گئے اور اب اُن کی حیثیت پُرانے ہانیوں' اساطیر الاولین سے زیادہ کی نہیں رہی۔ انھیں وقت کا ناکام قرار دے کر نئے تجربات کی تلاش ہے۔ دنیا اب کسی نئے طریقے کو اپنا کے فلاح کا سامان چاہتی ہے۔ مجرد جدیدیت کے علمبردار آج یہ جاننا تے تھے کہ اگر ماضی کے فرسودہ دلوں اور کہنہ روایات کو مٹا دیا جائے ن سے زندگی پر کیا بُرے اثرات لازم آئیں گے؟ انھیں یہ روایتیں ستقبل کی تعمیر و ترقی میں قابل تقلید نہیں معلوم ہوتیں۔ کیوں کہ سابقہ زندگی کے ت میں زندگی کے حقیقی تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ نئی اور اب زندگی کے لیے اب نئی قدروں کی ضرورت ہے۔ انسانی زندگی تجربات ترقی رہی ہے۔ اس کا ہر نقش ثانی پہلے سے بہتر ہے۔ نئے مسائل آئندہ امیابیوں کا زینہ ہیں۔ منزل بہ منزل انسان اسی طرح بڑھتا رہے گا یہاں تک کہ اپنی منتہا کو پہنچ جائے جہاں زندگی کی حقیقی راحت نصیب ہو۔ عصر حاضر کے جدید نظریات خواہ وہ جدلی عمل، فلسفۂ اضداد، معاشی مساوات، عمل ارتقا اور روح مطلق ہوں یا تحلیل نفسی کے عنوان سے کیے جانے والے انسانی نفسیات کے تجزیے اور ان میں اختلاف رائے، یا دیگر مادہ پرستانہ اور اباحیت پسند نظریاتِ زندگی، سب کا مدار فکر کم و بیش یہی ہے کہ تاریخ کے گزرے اوراق انسانی سماج کی نئی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتے۔ جن نظریوں کو پچھلے وقت نے ایک عرصے تک فراموش کیا وہ آج اس دور کے تقاضے کا موثر حل نہیں ہے۔ اب انسانیت کو ایک نئے دستور کی ضرورت ہے جس سے زندگی میں قرار آئے۔ تلاش و جستجو ختم ہو اور زندگی کی بے ثباتی دور ہو سے

آدم کو ثبات کی طلب ہے
دستورِ حیات کی طلب ہے

لیکن اس طلب کے جواب میں ہمارے پاس تو وہی سرمایہ ہے جو آدمؑ اور ابراہیمؑ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے بعد ہمارے اسلاف میں منتقل ہوتا رہا۔ اور اب ہم اس کے نقیب اور امین ہیں۔ ہماری دعوت ماضی کے رشتوں سے کٹ کر نہیں ہے۔ رائج الوقت ضرورت میں ہماری دعوت کا انحصار ماضی کے واقعات اور اسلاف کے ہی کارنامے ہیں۔ ایسی صورت میں حال کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر ہمیں اپنے ماضی کا ایسا ہی ترجمان ہونا چاہیے تھا جہاں ہماری زندگی حال کے تقاضوں کی ضامن ہو لیکن آج ہم ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جو ترجمانی کر رہے ہیں وہ ہماری

---

* عالم گنج، گلزار باغ ۔ پٹنہ ۔ بہار۔

ت و فلاکت، دریوزہ گری اور ذلت وخواری ہے۔ دوسری ملتوں کے
ان ہمارا کوئی نشان امتیاز نہیں۔ ملی تشخص نہ ہونے کی وجہ سے ہم دوسری
ں میں گم ہو گئے۔ آج ہم اپنی زندگی میں اسلاف کو نمونۂ عمل نہ بنا کر ان
دار کو بے وزن اور ناقابلِ عمل قرار دے رہے ہیں۔ اگر ایک نظر اپنی
زندگی پر اور دوسری نظر اجداد صالحین پر تو نسبت اور تعلق تو کجا، مزید
ن کی رسوائی کا سامان معلوم ہوتے ہیں۔ جب ہمارے حال اور ماضی کی
ں میں توافق اور ربط دیکھنے کے لیے ایک حساس اور درد مند شاعر بیٹھ
ہے تو وہ شدید مایوسی کا شکار ہو کر اس تفاوت کے اظہار پر خود کو
ر پاتا ہے۔

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسمان نے ہم کو دے مارا
تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت وہ سیارا

ہمارے پاس اسلاف کا جو بیش بہا نمونۂ عمل تھا اس پر بھروسہ کرتے
ئے ہمیں وقت کے ہر چیلنج کے مقابلے میں برملا کہنا چاہیے تھا کہ کسی بھی دوسرے
قۂ زندگی کے برخلاف رازِ زندگی کی شناسائی تو اسوۂ ابراہیمی میں ہے اور
دگی کے معیار کا تعین اور اس کی تقویم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی
ائے ہوئے اصولوں سے ممکن ہے ؎

دیں مسلکِ زندگی کی تقویم
دیں سرِ محمدؐ و براہیمؑ

لیکن آج کے حالات میں مسلمانوں کے ماضی کو جو کچھ قیاس کیا جا سکتا ہے
وہ صرف یہی ہے کہ مسلمان دنیا کی دوسری ملتوں جیسی ایک ملت ہے بلکہ اس
سے بھی زیادہ غیر موثر، بے سود اور بے وقعت۔ جب کہ اصل حقیقت میں مسلمانوں
کا ماضی تو ایک نادر روزگار اور قیمتی سرمایہ تھا۔ اس سرمائے کے بغیر انسانی
ریخ ناقص اور نامکمل ہے۔ بلکہ اگر اسے فراموش کر دیا جائے تو ملی زندگی
کی تعمیری بنیادیں منہدم ہو جائیں گی۔ یہ تو وقت کی ستم ظریفی ہے کہ ہم نے اسے
اپنی خالص شکل میں متعارف نہیں کرایا اور اب ہمارے لیے یہ ایک مسئلہ
ہے کہ ہم اپنی تاریخ کے متعلق یہ یقین دلا سکیں کہ اب بھی یہ نمونہ اور قابل عمل
ہے اور اس پر عمل کر کے ہم حال تو حال مستقبل کو بھی تابناک اور خوشگوار بنا سکتے

ہیں مگر یہ سب اس وقت ممکن ہے جب ہم اپنے حال کی زندگی سے اپنی ناکا
کا خود ہی اعلان نہ کریں۔ جب ہم ملی حیثیت سے خود مقامِ اسفل پر ہوں تو
اپنے سابقہ کارناموں کو کس طرح قابل قبول بنا سکیں گے۔ پھر ہماری عظمت
رفتہ کی داستان بھی اتنی آسان اور اتفاقی تو ہے نہیں کہ جس وقت چاہ
صرف خواہش سے تجربے میں لے آئیں۔ بلکہ یہ برسوں کی محنت کا ثمرہ اور ا
کی آبیاری میں اسلاف کا خون جگر ہے۔ یہ زندگی خوش آئند کوئی آسان نہ
محکم یقین، جاں گسل محنت، صبر و آزمائش اور بے ستائش قربانی کو داؤ
پر لگانے کے بعد کہیں کامیابی کا امکان ہو سکتا ہے۔

حالات کے یہ دو رخ ہیں اور اس کے ایک رخ میں سنت ابرا
کی یادگار۔ اس کی تجدید و بازدید کا مقصد ہے کہ ہم حضرت ابراہیمؑ کے اس
حیات کو دنیا کے سامنے پیش کرتے رہیں۔ اس یادگار کے ذریعے ہم اس
ابراہیمی کو مشعل راہ بنانے اور اللہ کے راستے میں اپنی متاع گراں بہا
کرنے کا تقاضہ کرتے ہیں۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ قبولیتِ اسلام کے بعد اپنی جا
مال اور اولاد کو بھی مطالبۂ خداوندی میں قربان کرنے سے تغافل نہ کیا
جب تک یہ جذبہ پیدا نہ ہوگا انسانیت کو تکلیف اور بے اطمینانی سے نجات
نہ ہوگی۔ راہ خدا کی قربانی سے ہی زندگی آسودہ اور پر اطمینان ہوتی ہے۔
کے چار ہزار پہلے گزری حضرت ابراہیمؑ کی ذات اسی پہلو سے آج دنیا
لیے قابل تقلید ہے۔ وہ ابو الانبیاء تھے۔ ساری ملتوں کے لیے مینا
عظمت۔ اس لیے ہر ملت کے لیے قابل قبول اور قابل تقلید بھی۔ انھوں
زندگی کی حقیقی آسودگی اور کامرانی کے لیے راہ خدا میں اپنے اکلوتے، بڑ
کی تمناؤں کے نشان بیٹے کو بھی قربان کر دیا۔

آج جب کہ تاریخ کے چھوٹے چھوٹے واقعات قصۂ پارینہ بن
جن کی موجودہ زندگی میں کوئی جگہ نہیں وہاں قربانی کا ایسا محیر العقول او
غیر معمولی واقعہ کیا قابل حیرت نہیں ہے؟ کیا دنیا حالات کے اس پس منظ
یہ مطالبہ نہیں کرے گی کہ اگر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے ہر دلعزیز بیٹے کو راہ
میں قربان کر دیا تو پیروان ابراہیم میں کچھ تو قربانی کی مثال ملنی چاہیے؟
ذبیحۂ اسماعیل تو تاریخ کا نہایت حیرت انگیز اور بے نظیر واقعہ ہے۔ کل
دنیا حضرت ابراہیمؑ کی سراپا زندگی کو دیکھتے ہوئے اس واقعہ پر حیران و ب
تھی تو آج زوال پذیر ملت کے ذریعے کی جانے والی سالانہ تجدید کیا

پیدا کر سکتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے تاریخ کے کسی دور میں ایسی ایک نادر قربانی کا نمونہ بھی پیش کیا تھا۔ ایک طرف یہ حیرت انگیز واقعہ ہے اور اس واقعہ کو ہم محض جانوروں کی قربانی کی شکل میں پیش کر کے تازہ کرتے ہیں۔ ہمارا جو قابلِ حیرت سرمایہ ہے وہ یہی جانوروں کی قربانی ہے اور ایسی ہی کچھ دیرینہ روایتیں۔ یہ قربانی دنیا کے لیے کچھ بھی قابلِ حیرت نہیں ایسے ذبیحے دنیا کی سبھی قوموں میں ہیں اور اگر بالفرض دنیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہی یاد میں ذبیحے کرنے لگے تو کیا اسوۂ ابراہیمی کی یادگار کا مدّعا پورا ہو جائے گا۔ دنیا کو نہ تو اس انداز سے سمجھنا ہے اور نہ ہمیں سمجھانا۔ وقت کی آزمائشیں، انسانی دکھوں کا مداوا اور ایمان آزما مسائل کا حل اتنا ہی آسان ہوتا تو دنیا کب اسے قبول کر چکی ہوتی۔

حقیقت میں دنیا کو ایسے نمونۂ عمل کا مطالبہ ہے جو ماضی کے تجربات کے بجائے حالیہ تجربات کے ذریعے ظہور میں آئیں۔ اس حالت میں یہ ذمہ داری ہم پر اس طرح عاید ہوتی ہے کہ ہم اپنے ماضی کی تاریخ سے حال بنائیں — انبیائی سنتوں کو رائج کریں۔ اسلاف کے ان کارناموں کو پھر زندہ کریں جو انھوں نے نوعِ انسانی کے لیے پیش کیے۔ راہِ خدا میں ساری عصبیتوں کو تج دیں۔ محض ذاتی اور بیجا اغراض کی خاطر دوسروں کے درپۂ آزار ہونے کے بجائے خود مرمٹنے کا جذبہ بیدار کریں۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی وہ آپسی زندگی جس کی توصیف میں کہا گیا کہ وہ

”دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں خواہ خود
حاجت مند کیوں نہ ہوں“

اس کا کچھ پر تو اپنی زندگی میں بھی لانے کی کوشش کریں۔ ہمارے تعلقات کی تمام بنیادیں کسی بھی دوسرے مفادات سے بالاتر ہو کر محض خدا کی خوشنودی کے ہی تابع ہونی چاہییں۔ ہمیں یہ یقین کرنا چاہیے کہ باہمی ربط کے سبھی تقاضے خدا کی خوشنودی کے بغیر باعثِ خیر نہیں ہیں۔ نام نہاد باہمی محبت محض ایک فریب ہے اور مسائل کو حل کرنے میں ان روابط کی حیثیت جز وقتی، فروعی بلکہ مصنوعی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ ایسے ہی ایمان و ایقان اور اصول و اقدار کے پیامبر اور ترجمان تھے جسے خدا نے خالص قرار دیا اور جب اس سراپا خیر اور روشن زندگی کے ترجمان بن کر انھوں نے دعوتِ حق لگائی تو اس راہِ پر سنگ کا انھیں ہم منزل بھی نہ ملا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس منزل کو طے کرنے اور آسان بنانے کے لیے دنیا کو صدق و صفا، عشق و ایثار اور جذبۂ ایمانی کا واسطہ دیا مگر پھر بھی کہیں سے ہم نوائی نہ ہوئی۔ حضرت ابراہیمؑ منزلِ عشق کے تنہا مسافر تھے۔ وقت انھیں آزماتا رہا۔ حالات نے مصالحت اور یک جہتی کی شکلیں بھی پیش کیں مگر ان کے ایمان نے سب کو یکسر مسترد کر دیا۔ ان کے پیشِ نظر رضائے الٰہی کے بغیر نہ تو کوئی یک جہتی قابلِ قبول تھی اور نہ مسئلہ کا حل۔ ایسے نامانوس، ناموافق اور صبر آزما وقت میں بھی حضرت ابراہیمؑ کہتے ہیں کہ:

میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا سب
اللہ رب العالمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی
کا حکم مجھے دیا گیا ہے اور سب سے پہلا حکم بردار میں ہوں“

ماضی کی یہی وہ تاریخ ہے جو آج کے لیے قابلِ حیرت ہے لیکن قابلِ عمل اور قابلِ تقلید بھی۔ جانوروں کا ذبیحہ نہ تو قابلِ حیرت ہے اور نہ ہی اس کی تقلید ہی ہوگی۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ جانوروں کے گلے پہ چھری چلنے کے ساتھ ہمارے دل اور کلیجے پر بھی چھری چلے ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

جانوروں کے ذبیحے سے جب تک ہمارے دل میں راہِ حق کی قربانی اور شہادت کا جذبہ پیدا نہیں ہوگا۔ دنیا کے مسائل اور ہمارے مسائل یکساں برقرار رہیں گے۔ پھر جب ہمارے ہی مسئلے برقرار ہوں تو دنیا کے مسئلوں کو حل کرنے میں ہماری کوئی حیثیت متعین نہیں ہوتی ہے۔ اپنے مسئلوں کے ساتھ دنیا کے مسئلوں کو بھی حل کر دینا ہمارے لیے ایک کارِ مبشہ ہے۔ جب تک ہم غیر اسلامی اقدار کے پابند ہیں ہم میں بدامنی اور پراگندگی ہے۔ ہماری دعوت کی قبولیت کی راہیں بھی مسدود ہیں۔ اس حالت میں ہمارے دعوے لایعنی اور دعوتیں بے سود قرار پاتی ہیں۔ صرف جانوروں کے ذبیحے سے دلوں میں ایمانی چنگاریاں روشن نہیں ہوتیں جب تک کہ دل و نظر کی دنیا نہ بدل جائے۔ دل کا انقلاب صحبتوں، مدرسوں اور مکتبوں کی تاثیری صلاحیتوں سے بھی ماوراء ہے ؎

وہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیلؑ کو آدابِ فرزندی

ابراہیمی ایمان اور قربانی اسی کیفیت کا نام ہے نہ کہ محض جانوروں کی قربانی۔ ارشاد خداوندی ہوا ہے:

"نہ تو ان کے گوشت اللہ کو پہنچتے ہیں نہ خون مگر اس کے
یہاں تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔"

ہم اپنے دعووں اور خوش خیالیوں میں سنت ابراہیمی کی تجدید کرتے رہے لیکن حقیقی ایمان سے بھی اس کا تعلق ہے یا نہیں۔ خدا ہی کو معلوم ہے

ابراہیمی نظر لیکن بڑی مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایمان راسخ اور ان کی ذات بڑی ہی اعلیٰ و ارفع تھی۔ ایسے حالات میں بھی جب کہ ان کا کوئی ہمنوا اور مونس نہیں تھا تنہا مسائل سے الجھتے اور آزمائشوں سے کھیلتے چلے گئے۔ ان کی زندگی کے بے شمار پہلوؤں میں بعض پہلو نہایت اہم اور قابل امتیاز ہیں۔ ایک طرف وہ حضرت نوحؑ کی طرح عالمی نبی کے منصب پر فائز ہو کر ساری دنیا کی دعوت کا بار گراں تنہا اٹھائے تھے اور پھر اس عالم میں انھیں اس دعوت کا کوئی مونس اور رفیق نہیں ملتا۔ ایسے نازک وقت میں مشیت ایزدی کا بھی عجیب تقاضا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو کچھ زیادہ آزما کر دیکھا جائے۔ شعور کو پہنچتے ہی آزمائش شروع ہو جاتی ہیں۔ پے در پے آزمائش کے بعد ایک وقت وہ بھی آیا جب ان سے ان کی سب سے بڑی متاع عزیز کو قربان کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ اس مطالبے کی بجا آوری میں حضرت ابراہیمؑ اپنے ہر دل عزیز بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کو راہ خدا میں قربان کر کے کامیاب و کامران اتر آئے۔ بارگاہ خداوندی میں جب حضرت ابراہیمؑ نے اتنا بڑا نذرانہ کسی پس و پیش کے بغیر دے دیا تو رب کریم کی الطاف و محبت جوش میں آگئی۔ اس نذرانے کو اللہ تعالیٰ نے قبول کر کے قیامت تک کے لیے یادگار کی شکل میں زندہ جاوید کر دیا۔ ساری دنیا کے لیے حضرت ابراہیمؑ کی قربانی یادگار بنا دی گئی۔ ملت ابراہیمی کے لیے یہی قربانی بلکہ ابراہیمی زندگی کی تجدید ہے نہ کہ محض جانوروں کی قربانی! ابراہیمی قربانی ہی آج کے وقت کے تقاضوں کا جامع ہے اور ہمارے حوصلے اور جذبات کا بھی۔ اس کے ذریعے ہماری یہ خیالی اور شاندار تاریخ آج کے تقاضوں کو پورا کرنے کا یقین پیدا کر سکتی ہے۔ ورنہ جدید دور میں ان جیسے واقعات کو متعارف کرانے کی دوسری کیا شکل کارگر ہے۔ یہ واقعہ تو خود حضرت اسمٰعیلؑ کے لیے اتنا بڑا تھا کہ انھوں نے اپنے اپنی جان کی قربانی پر بھی مقدم قرار دے کر نہ صرف یہ کہ مقدم کیا بلکہ عملاً اپنی جان کی قربانی دے کر وہ اس منزل تک پہنچے۔ ذبیح اسمٰعیل کی جگہ اپنی جان کی قربانی تو ان کا ابتدائی امتحان تھا یہ ابتدائے عشق جو حضرت ابراہیم کے لیے ابتدائی تھا ہماری زندگی میں اس انتہائی جگہ کی حاصل نہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے ابتدائی آزمائشوں کی منزلیں کامیابی سے سر کر لیں۔ دنیائے عقل محو تماشا اور عشق ابراہیم آتش نمرود جھلنے کو تیار۔ آج ہمارے لیے تہذیب جدید کے مسائل جو امتحان آتش ہیں اور اسی کے ساتھ ہم سے یہ مطالبہ بھی کہ مسائل کے الاؤ میں کود کر وہ جو سودائے عشق کرے۔ وقت ہمارے ایمان اور نسبت خداوندی دعوت آزمائش دیتا ہے۔ راہ خدا میں اولاد ابراہیم سے قربانی کا مطالبہ ہے۔ سنت ابراہیمی کے نام پر جانوروں کا ذبیحہ دینے والے کسی جگر میں تڑپ بھی ہے جو مطالبۂ وقت پر لبیک کہے اور خدائی نصرت پر بھروسہ کرتے ہوئے آتش مسائل میں کود جائے ؎

آگ ہے، اولاد ابراہیم ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

حقیقت تو یہ ہے کہ ابراہیمی ایمان کی حلاوت اس آگ کی بھٹی میں جلنے کے بعد ہی قابل احساس ہے۔ قربانیوں کے ایسے ہی سودائی مسائل کو سلجھا سکتے اور ابراہیمی ایمان کی قیمت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ آج ہم میں جذبۂ قربانی نہیں۔ ہم مسلمان تو ہیں لیکن ابراہیمی شان اور حلاوت ایمانی کے بغیر۔ یہ ابراہیمی طریقہ نہیں کہ وقت ہم سے نبرد آزما ہو۔ حالات کی گرہ بند یاں ہم سے عقدہ کشائی کا مطالبہ کرتی ہوئی متصادم ہوں تو ہمارے عزائم سرد پڑ جائیں اور مزاج زمانہ سے ہماری ناآشنائی ہماری شکست خوردگی کا سامان بن جائے۔ حقیقت میں ابراہیمی شان یہ ہے کہ وقت آزمانا چاہے تو ہم ہر قیمت پر ایمان کی بالادستی ثابت کر دیں اور مسائل وقت خود اپنی شکست کا اعتراف کر لیں۔ آگ گل و گلزار ہو، اور حضرت ابراہیمؑ تماشائیوں کے لیے دیدۂ حیرت بن جائیں ؎

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل

آج وقت نے اپنے تیور بدل لیے۔ دنیا کے مسائل ایسے ہیں کہ برائیاں محض برائیاں نہ رہ کر نظریات زندگی بن چکی ہیں اور اسلامی طرزِ زندگی کے لیے باعثِ چیلنج۔ کل برائیوں کو مٹانا تھا لیکن آج اس احساس اور خیالات کو بھی کہ برائیاں بھی ایک نظام زندگی بننے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ آج کی آزمائشوں کے چہرے کچھ دوسرے ہیں۔ باطل نظام زندگی نئی انگڑائیاں لینے لگیں جیسے ان کے اندر توانائی آنے والی ہو ؎

تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

اور دوسری طرف ہم سنت ابراہیمی کے وارث اور امامت اور خلافت کے علمبردار بن کر صرف رسم قربانی کی حدود میں محصور اور حالات زمانہ سے بے خبر، مزاج وقت سے ناآشنا۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ہم اسوۂ ابراہیمی کا عملی نمونہ بن کر دنیا کے سامنے آئیں۔ ابراہیم کے جیسا جذبۂ دل ہو اور روح۔ ایسی روح جس سے آج کے آذر اور نمود خائف ہونے لگیں اور انھیں اپنے تراشیدہ بتوں کو بچانے کی فکر دامن گیر ہو مگر یہ فقط جانوروں کی قربانی سے ممکن نہیں۔ دنیا کی قیادت و سیادت کے اس سے بڑے کچھ تقاضے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ امام وقت عالمی نبی کے حیثیت سے ان ہی تقاضوں کے داعی تھے۔ ایک ایسی دعوت کے علمبردار جس کے ذریعے امامت کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے۔ امامت کی عملی تعبیر اگرچہ ان کے سامنے نہ آسکی لیکن ان کی قربانیاں بہرحال نتیجہ بخش تھیں۔ آج بھی یہ اس سے خالی نہیں۔ جس طرح ابراہیمؑ سے ڈھائی ہزار سال بعد کے ادوار میں اس کی عملی تعبیر سامنے آئی اور قیصر و کسریٰ جیسی بڑی طاقتیں ملکی و مدنی امامۃ کے آگے جھک گئیں آج یہ اسوۂ ابراہیمؑ اور دین محمدیؐ اس طاقت سے خالی ہو ممکن نہیں ؎

سبق پھر پڑھ صداقت کا، شجاعت کا، عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

"زندگی حرکت ہے، زندگی علم ہے، زندگی شعور ہے، زندگی بیداری ہے زندگی کا ناخن کائنات کی گتھیوں کو سلجھاتا ہے۔ جہاں ایک گتھی کو سلجھایا، دوسری گتھیاں اس کے ناخنوں کی پذیرائی کرتی ہیں۔ جہاں ایک ہفت خواں طے کیا، ستر اور ہفت خواں اس کو دعوت مبارزت دینے کے لیے سامنے آجاتے ہیں۔ جیسے ایک دانہ سے ستر دانے نکلتے ہیں اسی طرح ایک سفر، ہر ایک سفر ستر اور سفروں کا پیش خیمہ ہوتا ہے سفر کو ترک کرنا زندگی کو خیرباد کہنا ہے۔"

سید حامد

ہماری کچھ ایجنسیاں

۱۔ محمد الیاس نیوز ایجنسی
۹۱ کالو ٹولہ اسٹریٹ
کلکتہ

۲ میسرز کتاب منزل
سبزی باغ ۔ پٹنہ

۳ مسٹر طالب حسین
الیہ ڈی ہائر سکنڈری اسکول
کاٹھ دروازہ ۔ مراد آباد۔

۴ میسرز اظہر حسین
جمال بکڈپو باری روڈ، گیا۔ بہار

۵ میسرز عبدالستار بک سیلر۔
کمپنی باغ، مظفر پور۔
یوپی

۶ مسٹر اعظم خان
ٹاؤن ایریا پوسٹ آفس تھریا بخاست خان۔
جیبلی ۔ یوپی۔

۷ میسرز مکتبہ معارف الاسلام
نظام پورہ بھیونڈی

۸ میسرز آزاد بک ڈپو
ساکچی بازار
جمشید پور

۹ آزاد اسٹور۔
اردو بازار، دربھنگہ ۔ بہار۔

۱۰ طارق نیوز ایجنسی،
مکتبہ معصوم شاہ ۔ مومن پورہ ناگپور

۱۱ کتاب محل
تکیہ، اعظم گڑھ یو۔پی۔

۱۲ میسرز عبدالقدیر بک اسٹال۔
مین روڈ، موتی ہری، ڈسٹرکٹ چمپارن

۱۳ میسرز نیوز ریڈرز ولیوز
بھولی موڑ
دھنباد بہار

۱۴ میسرز سٹی پبلی کیشن
ایچ ۔ ۳۲ گارڈن ۔ ایچ روڈ، کلکتہ

۱۵ فردوسی کتاب گھر
بک سیلر اینڈ پبلشر
بھوسیا چوک دھارواڑ

۱۶ میسرز محمد پرویز اقبال ۔ میگزین ایجنٹ
پوسٹ محمد میموریل پرائمری اسکول، دھنباد

۱۷ صدیق اختر انصاری
اردو نیوز پیپر ایجنٹ
وارث پورہ کامٹی

[illegible] مقام اشاعت ادارہ تہذیب الاخلاق [illegible] علی گڑھ [illegible]


بہار نونہال ٹانک
بچوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشتا ہے اور دانت
نکلنے کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے
دماغین
تمام دماغی کام کرنیوالوں
کے لئے نایاب تحفہ
شربت
نزلہ
کھانسی
زکام۔ نزلہ کے لئے
خون صفا
خون کی خرابی پھوڑے
پھنسی، خارش اور
داد وغیرہ کی
دوا
چند مشہور اور پیٹنٹ دوائیں
DAWAKHANA TIBBIYA COLLEGE M.U.
ALIGARH
دواخانہ طبیہ کالج - مسلم یونیورسٹی علی گڑھ



Litho Colour Printers, Achal Tal, G. T. Road, Aligarh Phone 4185